صلی اللہ علیہ وسلم

رسول نمبر

نقوش

۴

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۱۲ ٹیلی فون نمبر ۵۲۵۲۵

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

رسول نمبر

جلد چہارم

شمارہ نمبر ۱۳۰

جنوری ۱۹۸۳ء

مدیر:

محمد طفیل

ادارۂ فروغِ اُردو ، لاہور

قیمت لائبریری ایڈیشن ، ۱۲۵ روپے
بار دوم

ترتیب

طلوع

ایک عظیم انقلاب کا بانی و رہبر

علوم انسانی کے فروغ پر ہمارے رسولؐ کا اثر

اخلاقی اصلاح

ہمارے رسولؐ بہ حیثیت سپہ سالار

ہمارے رسولؐ غیر مسلموں کی نظر میں

متعلقاتِ سیرت

محمد طفیل پرنٹر، پبلشر و ایڈیٹر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغِ اردو لاہور سے شائع کیا۔

طلوع

مَیں نے ۱۹۶۴ء میں "آپ بیتی نمبر" چھاپا تھا، جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد اور اپنی ضخامت کے اعتبار سے، میرا سب سے قیمتی اور ضخیم پرچہ تھا، جو ۱۹۶۴ء کی رعایت سے ۱۹۶۴ صفحات کا تھا۔

اُس نمبر میں دُنیا کی تقریباً تمام بڑی شخصیتوں کی آپ بیتیاں تھیں، جو مجھے اُن موجود شخصیتوں نے خود بھجوائی تھیں یا اُن کے سیکرٹریوں نے، مثلاً امریکہ کے صدر آئزن ہاور نے، ہندوستان کے صدر رادھا کرشنن نے، پاکستان کے صدر جنرل محمد ایوب خان نے۔ ان کے علاوہ آغا خان، ایزرا پاؤنڈ، جواہر لعل نہرو، برٹرینڈ رسل، اہلیا اہرن برگ، طٰہٰ حسین نے ——— اور سرونسٹن چرچل نے، جمال عبدالناصر نے، رضا شاہ پہلوی نے، ملکہ ایلزبتھ نے۔ غرض اس نمبر میں تمام دنیاوی بادشاہوں کے مضامین تھے۔

جب وُہ نمبر شائع ہُوا تو دنیا بھر سے توصیفی خطوط آئے اور مجھے باور کرایا گیا کہ اس سے بہتر پرچہ چھاپنا ناممکن ہے۔ مگر میرے دل میں کوئی اور ہی ارمان تھا، کوئی اور ہی خاکہ تھا۔

آج ۱۹۸۲ء میں، پُورے اٹھارہ برس کے بعد، اپنی محنت کے اعتبار سے، اپنی لگن کے اعتبار سے، وہ حاصلِ زندگی نمبر پیش کر رہا ہُوں کہ جو میرا مُنتہا تھا۔

۱۹۶۴ء میں چھپنے والا نمبر دنیا دی شخصیتوں کے بارے میں تھا۔ ۱۹۸۲ء میں چھپنے والا یہ نمبر، صرف ایک ہستی کے بارے میں ہے جو دنیا کی تمام موجود اور مرحوم شخصیتوں سے اُتم ہے، افضل ہے، جو بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔ جس سے دین اور دُنیا کا ٹانکا جُڑا ہوا ہے۔

آج میری وُہ آرزو پُوری ہُوئی، جس کے لیے برسوں بے کل رہا۔ آج میں کہہ سکتا ہُوں کہ حضورؐ سے میری بھی کوئی نسبت ہے۔ اس اعزاز پر خدا کی بارگاہ میں جتنے بھی سجدے کروں، وُہ کم ہوں گے۔

کیونکہ آج میں بھی کسی شمار قطار میں ہُوں!

○

محمد طفیل

اس شمارے میں

یہ چوتھی جلد ہے۔ تین جلدیں اس سے پہلے پیش کی جا چکی ہیں۔ ایک جلد اور پیش کروں گا، وہ اس لئے کہ جو ضروری عنوانات رہ گئے ہیں یا جو ضروری کام بہ سلسلہ سیرت رہ گیا ہے اُسے پورا کیا جا سکے۔ پانچویں جلد بھی میں اپنے شوق سے پیش کروں گا۔ باقی پانچ جلدیں آپ کے شوق کی پذیرائی میں پیش کروں گا۔ تب میرا منصوبہ مکمل ہو گا۔ مگر ایسا ہونا آپ کی حوصلہ افزائی پر بھی منحصر ہوگا۔ اپنی بساط اسی حد تک تھی۔ وہ بھی اپنے پریس کی ایک مشین بیچ کر! مگر اس پر ملول نہیں، نازاں ہوں!

اس جلد میں مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت مضامین چھاپے گئے ہیں۔ مثلاً:

۱ —— ایک عظیم انقلاب کا بانی و رہبر

۲ —— علومِ انسانی کے فروغ پر ہمارے رسولؐ کا اثر

۳ —— اخلاقی اصلاح

۴ —— رسولِ اکرمؐ بہ حیثیت سپہ سالار

۵ —— ہمارے نبیؐ غیروں کی نظر میں

۶ —— متعلقاتِ سیرت

چاروں جلدوں میں تین ہزار سے زاید صفحات پیش کیے گئے ہیں۔ اس کے باوجود ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی کام کا آغاز ہوا ہے۔ یہ سلسلہ تو اب چلے گا۔ نہ حضورؐ کی صفات گنوائی جا سکیں گی اور نہ نقوش کے صفحات بہ آسانی گنے جا سکیں گے۔

میرا کام تو جب تک سانس ہے کچھ نہ کچھ کرنا ہے۔ اگر وقت رسولؐ کے دربار میں گزرے تو میری خوش بختی پر کون رشک نہ کرے گا؟

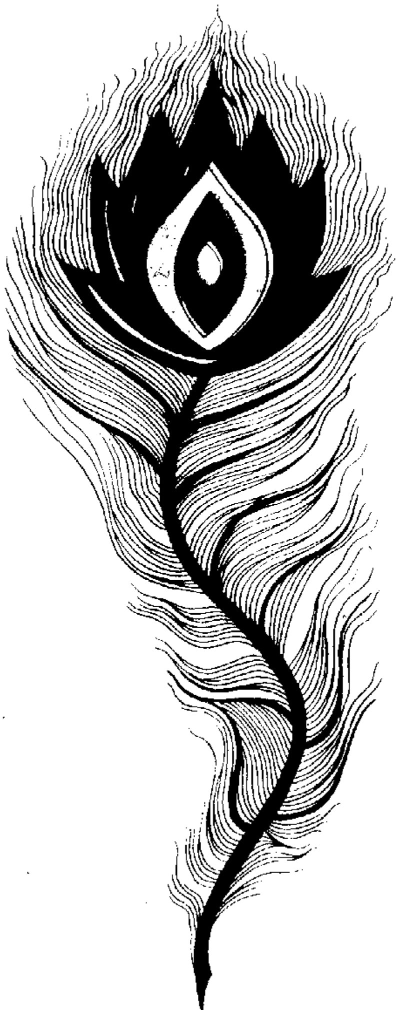
باقی جو اللہ کو منظور!

محمد طفیل

قُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا

کہ دو کہ حق آگیا ہے اور باطل چلا گیا ہے، بے شک باطل جانے والا ہی تھا۔

(بنی اسرائیل: ۸۱)



ایک عظیم انقلاب کا بانی و رہبر

ہمارا پرچم انقلاب ـــــ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ

سید قطب شہید

مکّی دور کا بنیادی مسئلہ

قرآن کریم کا وہ حصہ جو مکی سورتوں پر مشتمل ہے پورے ۱۳ سال تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتا رہا۔ اس پوری مدت میں قرآن کا مدارِ بحث صرف ایک مسئلہ رہا۔ اس کی نوعیت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی مگر اسے پیش کرنے کا انداز برابر بدلتا رہا۔ قرآن نے اسے پیش کرنے میں ہر مرتبہ نیا اسلوب اور نیا پیرایہ اختیار کیا اور ہر مرتبہ یوں محسوس ہوا کہ گویا اسے پہلی بار ہی چھیڑا گیا ہے۔

قرآن کریم پورے مکی دور میں اسی مسئلہ کے حل میں لگا رہا۔ اس کی نگاہ میں یہ مسئلہ اس نئے دین کے تمام مسائل میں اولین اہمیت کا حامل ہے۔ عظیم تر مسئلہ تھا، اساسی اور اصولی مسئلہ تھا، عقیدہ کا مسئلہ تھا۔ یہ مسئلہ دو عظیم نظریوں پر مشتمل تھا، ایک اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور انسان کی عبودیت، اور دوسرے ان کے باہمی تعلق کی نوعیت۔ قرآن کریم اسی بنیادی مسئلہ کو لے کر انسان سے بحیثیت انسان خطاب کرتا رہا کیونکہ یہ مسئلہ ایسا تھا کہ اس سے تمام انسانوں کو یکساں تعلق ہے وہ چاہے عرب کے رہنے والے انسان ہوں یا غیر عرب۔ نزولِ قرآن کے زمانہ کے لوگ ہوں یا کسی بعد کے زمانہ کے۔ یہ وہ انسانی مسئلہ ہے جس میں کسی ترمیم و تغیر کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ یہ اس کائنات میں انسان کے وجود و بقا کا مسئلہ ہے۔ انسان کی عاقبت کا مسئلہ ہے۔ اسی مسئلہ کی بنیاد پر یہ طے ہوگا کہ انسان کا اس کائنات کے اندر کیا مقام ہے؟ اور اس کائنات میں بسنے والی دوسری مخلوقات کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے؟ اور خود کائنات اور موجودات کے خالق سے اس کا کیا رشتہ ہے؟ یہ وہ پہلو ہے جس کی وجہ سے اس مسئلے میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ یہ اس کائنات اور کائنات کے ایک حقیر جز انسان کے ساتھ براہِ راست تعلق رکھتا ہے۔

مکی زندگی میں قرآن انسان کو یہ بتاتا رہا کہ اس کے اپنے وجود اور اس کے ارد گرد پھیلی ہوئی کائنات کی اصل حقیقت کیا ہے؟ وہ انسان کو یہ بتاتا ہے کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ اور کس غرض کے لیے آیا ہے؟ اور آخر کار وہ کہاں جائے گا؟ وہ معدوم تھا، اسے کس نے خلعتِ وجود بخشا؟ کون سی ہستی اس کا خاتمہ کرے گی؟ اور خاتمہ کے بعد اسے کس انجام سے دوچار ہونا ہوگا؟

وہ انسان کو یہ بھی بتاتا ہے کہ اس وجود کی حقیقت کیا ہے جسے وہ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے؟ اور وہ کون ہستی ہے

جسے وہ پردۂ غیب میں کارفرما محسوس کرتا ہے، لیکن دیکھ نہیں پاتا؛ اِس طلسماتی کائنات کو کس نے وجود بخشا اور کون اس کا منتظم و مدبر ہے؟ کون اسے گردش دے رہا ہے؟ کون اسے بار بار نیا پیراہن بخشتا ہے؟ کس کے ہاتھ میں ان تغیرات کا سررشتہ ہے جن کا ہر چشمِ بینا مشاہدہ کر رہی ہے۔ وہ اسے یہ بھی سکھاتا ہے کہ خالقِ کائنات کے ساتھ اس کا رویّہ کیا ہونا چاہیے؛ اور خود کائنات کے بارے میں اسے کیا روش اختیار کرنی چاہیے؟ اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی واضح کرتا ہے کہ انسانوں کے باہمی تعلقات کیسے ہونے چاہئیں۔

یہ ہے وہ اصل اور بنیادی مسئلہ جس پر انسان کی بقا اور وجود کا دار و مدار ہے اور رہتی دنیا تک اسی عظیم مسئلہ پر انسان کی بقا اور وجود کا انحصار رہے گا۔ اس اہم مسئلے کی تحقیق و توضیح میں مکی زندگی کا پورا تیرہ سالہ دَور صرف ہوا۔ اس لیے کہ انسانی زندگی کا بنیادی مسئلہ یہی ہے، اور اس کے بعد جتنے مسائل ہیں وہ اسی کے تقاضے میں پیدا ہوتے ہیں اور ان کی حیثیت اس کی تفصیلات اور جزئیات سے زیادہ کچھ نہیں۔ قرآن نے مکی دَور میں اسی بنیادی مسئلے کو اپنی دعوت کا مدار بنائے رکھا، اور اس سے صرفِ نظر کر کے نظامِ حیات سے متعلق فروعی اور ضمنی بحثوں سے تعرض نہیں کیا اور اس وقت تک انھیں نہیں چھیڑا جب تک علمِ الٰہی نے یہ فیصلہ نہیں فرما دیا کہ اب اِس مسئلہ کی توضیح و تشریح کا حق ادا ہو چکا ہے اور یہ اس انتخاب روزگار جماعت کے دلوں میں پوری طرح جاگزیں ہو چکا ہے، جسے قدرتِ الٰہی اقامتِ دین کا ذریعہ بنا کر اس کے ہاتھوں اس دین کو عملی شکل میں برپا کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ جو لوگ دینِ حق کی دعوت لے کر اٹھے ہیں اور وہ دنیا کے اندر ایک ایسا نظام برپا کرنا چاہتے ہیں جو بالفعل اس دین کی نمائندگی کرے، انھیں اس عظیم حقیقت پر پہروں غور کرنا چاہیے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے راسخ کرنے کے لیے قرآن کریم نے مکی زندگی کے پورے ۱۳ سال صرف کیے اور اس دوران میں کبھی اس سے توجہ ہٹا کر نظامِ زندگی کی دوسری تفصیلات کو نہیں چھیڑا، نہ ان قوانین و احکام بیان کرنے کی حاجت محسوس کی جو آگے چل کر مسلم معاشرے میں نافذ ہونے والے تھے۔

کارِ رسالت کا آغاز اسی مسئلہ سے ہوا

یہ عین حکمتِ خداوندی تھی کہ آغازِ رسالت ہی میں اس اہم مسئلہ کو جو عقیدہ و ایمان کا مسئلہ ہے دعوت کا محور و مرکز بنایا جائے۔ یعنی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم، راہِ حق میں پہلا قدم ہی اس دعوت سے اٹھائیں کہ "لوگو! گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں ہے"۔ اور پھر اسی دعوت پر اپنا تمام وقت صرف کر دیں۔ انسانوں کو ان کے حقیقی پروردگار سے آگاہ کریں اور انھیں صرف اسی کی بندگی کی راہ پر لگائیں۔

اگر ظاہر بیں نگاہ اور محدود انسانی عقل کی روشنی میں دیکھا جائے تو یُوں محسوس ہوتا ہے کہ عرب اس طریقِ دعوت سے بآسانی رام ہونے والے نہیں تھے۔ عرب اپنی زبان دانی کی بدولت "الٰہ" اور "لا الٰہ الا اللہ" کا مدعا خوب سمجھتے تھے۔ انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ الوہیت کو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص گرداننے کے صاف معنی یہ ہیں کہ اقتدار پورے کا پورا

کاہنوں، پروہتوں، قبائل کے سرداروں اور امراء و حکام کے ہاتھ سے چھین کر اللہ کی طرف لوٹا دیا جائے۔ ضمیر و قلب پر، مذہبی شعائر و مناسک پر، معاملاتِ زندگی پر، مال و دولت اور عدل و قضا پر، الغرض ارواح و اجسام پر بہمہ وجوہ اللہ اور صرف اللہ کا اقتدار رہو۔ وُہ خوب جانتے تھے کہ لا الٰہ الّا اللہ کا اعلان درحقیقت اس دنیاوی اقتدار کے خلاف ایک چیلنج ہے، جس نے الوہیت کی سب سے بڑی خصوصیت (حاکمیت) کو غصب کر رکھا ہے۔ یہ ان تمام قوانین اور نظاموں کے خلاف اعلانِ بغاوت ہے جو اس قبضۂ غاصبانہ کی بنیاد پر وضع کیے جاتے ہیں۔ اور ان تمام قوتوں کے خلاف اعلانِ جنگ ہے جو خانہ ساز شریعتوں کی بدولت دنیا میں کوس لمن الملک بجاتی ہیں۔ عرب اپنی زبان کے نشیب و فراز سے بخوبی آگاہ تھے اور وہ لا الٰہ الّا اللہ کے حقیقی مفہوم کو پوری طرح سمجھ رہے تھے۔ ان سے یہ امر بھی پوشیدہ نہ تھا کہ ان کے خود ساختہ نظاموں اور ان کی پیشوائی اور قیادت کے ساتھ یہ دعوت کیا سلوک کرنا چاہتی ہے۔ اسی وجہ سے انھوں نے اس دعوت کا' یا بالفاظِ دیگر اس پیامِ انقلاب کا اس تشدد اور غیظ و غضب کے ساتھ استقبال کیا اور اس کے خلاف وہ معرکہ آرائی کی جس سے ہر خاص و عام واقف ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس دعوت کا آغاز اس انداز سے کیوں ہوا؟ اور حکمتِ الٰہی نے کس بناء پر یہ فیصلہ کیا کہ اس دعوت کا افتتاح ہی مصیبتوں اور آزمائشوں سے ہو؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے قومیت کے نعرے سے کیوں کام کا آغاز نہیں کیا؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے دینِ حق کو لے کر مبعوث ہوئے تو اس وقت حالت یہ تھی کہ عربوں کے سب سے زیادہ شاداب و زرخیز اور مالدار علاقے عربوں کے ہاتھ میں نہیں تھے بلکہ دوسری اقوام ان پر قابض تھیں۔ شمال میں شام کے علاقے رومیوں کے زیرِ نگیں تھے جن پر عرب حکام رومیوں کے زیر سایہ حکومت چلا رہے تھے، جنوب میں یمن کا پورا علاقہ اہلِ فارس کے قبضہ میں تھا، جنھوں نے اپنے ماتحت عرب شیوخ کو فرائضِ حکمرانی سونپ رکھے تھے۔ عربوں کے پاس صرف حجاز اور نجد کے علاقے تھے یا وہ بے آب و گیاہ صحرا تھے جن میں اِکّا دُکّا نخلستان پائے جاتے تھے۔ یہ بات بھی محتاجِ دلیل نہیں ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم میں صادق اور امین کی حیثیت سے معروف تھے۔ آغازِ رسالت سے ۱۵ سال قبل اشرافِ قریش حجرِ اسود کے تنازعہ میں آپ کو اپنا حاکم بنا چکے تھے اور آپ کے فیصلہ کو بخوشی مان چکے تھے نسب کے لحاظ سے بھی آپ بنو ہاشم کے چشم و چراغ تھے جو قریش کا معزز ترین خاندان تھا۔ ان حالات و اسباب کی بناء پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات پر پوری طرح قادر تھے کہ اپنے ہموطنوں کے اندر عرب قومیت کے جذبہ کو بھڑکاتے۔ اور اس طرح ان قبائلِ عرب کو اپنے گرد جمع کر لیتے جنہیں باہمی جھگڑوں نے پارہ پارہ کر رکھا تھا اور کشت و خون اور انتقام کی چکی میں بری طرح پِسے ہوئے تھے۔ حضورؐ اگر چاہتے تو ان سب عربوں کو ایک جھنڈے تلے جمع کر کے انھیں قومیت کا درس دیتے اور شمال کے رومی اور جنوب کے ایرانی استعمار کے تسلط سے عرب سرزمین کو آزاد کرانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے، عرب قومیت اور عربیت کا پرچم بلند کرتے اور جزیرۂ عرب کے تمام اطراف و اکناف کو ملا کر متحدہ عرب ریاست

کی داغ بیل ڈال دیتے۔

یہ حقیقت ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قوم پرستی کے نعرہ کو لے کر اُٹھتے تو عرب کا بچہ بچہ اس پر لبیک کہتا ہوا لپکتا، اور آپ کو وہ مصائب و آلام نہ سہنے پڑتے جو آپ کو ۱۳ سال تک صرف اس بنا پر سہنے پڑے کہ آپ کی دعوت اور نظریہ جزیرۃ العرب کے فرماں رواؤں کی خواہشات سے متصادم تھا۔ مزید برآں یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ میں یہ صلاحیت موجود تھی کہ جب عرب آپ کی قومی دعوت کو جوش و خروش کے ساتھ قبول کر چکتے اور قیادت کا منصب آپ کو سونپ دیتے اور اقتدار کی ساری کنجیاں پوری طرح آپ کے قبضے میں آجاتیں اور رفعت و عظمت کا تاج آپ کے مبارک سر پر رکھ دیا جاتا تو آپ اپنے اس بے پناہ طاقت اور اثر کو عقیدۂ توحید کا سکہ رواں کرنے کے لیے استعمال کرتے اور لوگوں کو اپنے انسانی اقتدار کے سامنے سرنگوں کرنے کے بعد بالآخر لے جا کر خدا کے آگے سرنگوں کر دیتے لیکن خدائے علیم و حکیم نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اس راستہ پر نہیں چلایا، بلکہ انہیں حکم دیا کہ صاف صاف اعلان کر دیں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے اور ساتھ ہی متنبہ بھی کر دیا کہ اس اعلان کے بعد آپ خود اور وہ مٹھی بھر افراد جو اس اعلان پر لبیک کہیں ہر قسم کی تکلیف و اذیت برداشت کرنے کے لیے بھی تیار رہیں۔

قومی نعرے کو اختیار نہ کرنے کی وجہ

آخر یہ کٹھن راستہ اللہ تعالیٰ نے کیوں منتخب فرمایا؟ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اہلِ ایمان ساتھیوں کے حق میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ تشدد اور ظلم کا نشانہ بنیں۔ لیکن وُہ جانتا تھا کہ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ اس دعوت کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہے اور نہ یہ کوئی صحیح بات ہوتی کہ مخلوقِ خدا رومی یا ایرانی طاغوت کے پنجے سے نجات پاکر عربی طاغوت کے پنجہ میں گرفتار ہو جائے۔ طاغوت خواہ کوئی ہو وہ طاغوت ہی ہے۔ یہ ملک اللہ تعالیٰ کا ہے اور اس پر صرف اللہ کا ہی اقتدار ہونا چاہیے۔ اور اللہ کا اقتدار صرف اس صورت قایم ہو سکتا ہے کہ اس کی فضاؤں میں صرف " لا الٰہ الا اللہ " کا پرچم لہرائے۔ یہ بات کیونکر مقبول اور درست ہو سکتی تھی کہ خدا کی زمین پر بسنے والی مخلوق رومی اور ایرانی طاغوتوں سے نجات پاتے ہی عربی طاغوت کا طوقِ غلامی اپنے گلے میں ڈال لے۔ طاغوت جس قبا میں بھی ہو وہ طاغوت ہے۔ انسان صرف خدائے واحد کے بندے اور غلام ہیں اور وہ صرف اس صورت میں بندے اور غلام رہ سکتے ہیں کہ ان کی زندگیوں میں صرف اللہ کی الوہیت کا بول بالا ہو۔ ایک عرب لا الٰہ الا اللہ کا لغوی لحاظ سے جو مفہوم سمجھتا تھا وہ یہ تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی حاکمیت نہ ہو، اللہ کے سوا کوئی اور ہستی قانون اور شریعت کا منبع و ماخذ نہ ہو اور انسان کا انسان پر غلبہ و اقتدار باقی نہ رہے کیونکہ اقتدار بہمہ وجوہ اللہ ہی کے لیے ہے اور اسلام انسانوں کے لیے جس "قومیت" کا علمبردار ہے وہ اسی عقیدہ کی بنیاد پر طے ہوتی ہے اور تمام اقوام خواہ کسی رنگ و نسل کی ہوں، عربی یا رومی یا ایرانی، سب کی سب اس عقیدہ کی نگاہ میں پرچم الٰہی کے تحت مساویانہ حیثیت رکھتی ہیں۔ قرآن کے نزدیک اسلامی

دعوت کا یہی صحیح اور فطری طریق کار ہے۔

آپؐ نے اقتصادی انقلاب کا طریقِ کار کیوں نہ اختیار کیا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت عرب معاشرہ دولت کی منصفانہ تقسیم اور عدل و انصاف کے صحت مندانہ نظام سے یکسر بیگانہ ہوچکا تھا۔ ایک قلیل گروہ تمام مال و دولت اور تجارت پر قابض تھا اور سُودی کاروبار کے ذریعہ اپنی تجارت اور سرمائے کو برابر بڑھاتا اور پھیلاتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے مقابلے میں ملک کی غالب اکثریت مفلوک الحال اور بُھوک کا شکار تھی۔ جن لوگوں کے ہاتھ میں دولت تھی وہی عزّت و شرافت کے اجارہ دار تھے۔ رہے بیچارے عوام تو وہ جس طرح مال و دولت سے تہی دامن تھے اسی طرح عزّت و شرافت سے بھی بے بہرہ تھے۔

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر کہا جا سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی اجتماعی تحریک کیوں نہ اٹھائی اور دعوت کا مقصد دولت کی منصفانہ تقسیم ٹھیرا کر، امراء و شرفاء کے خلاف طبقاتی جنگ کیوں نہ چھیڑ دی تاکہ سرمایہ داروں سے محنت کش عوام کو ان کا حق دلواتے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دور میں بھی ایسی کوئی اجتماعی تحریک اور دعوت لے کر اُٹھتے تو عرب معاشرہ لازماً دو طبقوں میں بٹ جاتا۔ مگر غالب اکثریت آپؐ کی تحریک کا ساتھ دیتی اور سرمائے اور جاہ و شرف کی ستم کیشیوں کے سامنے ڈٹ جاتی اور آپؐ کے مقابلے میں وہ معمولی سی اقلیت ہی رہ جاتی جو اپنے پشتینی مال و جاہ سے چمٹی رہتی۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ نہج اختیار فرماتے تو زیادہ موثر اور کارگر ہوتا۔ اور یہ صورت پیش نہ آتی کہ پُورا معاشرہ لا الٰہ اِلّا اللّٰہ کے اعلان کے خلاف صف آرا ہوجائے، اور صرف چند نادر روزگار ہستیاں ہی دعوتِ حق کے افق تک پہنچ سکیں۔

کہنے والا یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ صلاحیت بدرجۂ کمال موجود تھی کہ جب اکثریت آپ کی تحریک سے وابستہ ہوکر اپنی زمامِ قیادت آپ کے ہاتھ میں دے دیتی اور آپؐ دولت مند اقلیت پر قابو پاکر اس کو اپنا مطیع و فرماں بردار بنا چکتے تو آپ اپنے اس منصب و اقتدار کو اور اپنی پُوری قوت و طاقت کو اس عقیدۂ توحید کے منوانے اور اسے قایم و راسخ کرنے میں استعمال کر دیتے جس کے لیے در اصل اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو مبعوث فرمایا تھا۔ آپؐ انسانوں کو پہلے انسانی اقتدار کے آگے جھکا کر پھر انھیں پروردگارِ حق کے آگے جھکا دیتے۔

ایسا طریقِ کار اختیار نہ کرنے کی وجہ

لیکن خدائے علیم و حکیم نے آپؐ کو اس طریقِ کار پر بھی چلنے کی اجازت نہ دی۔ خدا کو معلوم تھا کہ یہ طریقِ کار دعوتِ اسلامی کے لیے موزوں و مناسب نہیں ہے۔ وہ جانتا تھا کہ معاشرے کے اندر حقیقی اجتماعی انصاف کے سوتے صرف ایک ایسے ہمہ گیر نظریہ کے چشمۂ صافی سے ہی پھوٹ سکتے ہیں جو معاملات کی زمام کار کلیتہً اللہ کے ہاتھ میں دیتا ہو۔ اور معاشرہ ہر اس فیصلے کو

برضا و رغبت قبول کرتا ہو۔ جو دولت کی منصفانہ تقسیم اور اجتماعی کفالت کے بارے میں بارگاہِ الٰہی سے صادر ہو اور معاشرے کے ہر فرد کے دل میں پانے والے کے دل میں بھی اور دینے والے کے دل میں بھی یہ بات پوری طرح منقش ہو کہ وہ جس نظام کو نافذ کر رہا ہے اس کا شارع اللہ تعالیٰ ہے اور اس نظام کی اطاعت سے اُسے نہ صرف دنیا کے اندر فلاح کی امید ہے بلکہ آخرت میں بھی وہ جزائے خیر پائے گا۔ معاشرے کی یہ کیفیت نہ ہو کہ کچھ انسانوں کے دل حرص و آز کے جذبات سے امنڈ رہے ہوں اور کچھ دُوسرے انسانوں کے دل حسد و کینہ کی آگ میں جل رہے ہوں۔ معاشرے کے تمام معاملات تلوار اور ڈنڈے کے زور پر طے کیے جا رہے ہیں۔ تخویف اور دھونس اور تشدد کے بل پر فیصلے نافذ کیے جا رہے ہیں۔ انسانوں کے دل ویران اور ان کی روحیں دم توڑ رہی ہیں جیسا کہ آج ان نظاموں کے تحت ہو رہا ہے جو غیر اللہ کی الوہیت پر قائم ہیں۔

آپؐ نے اصلاحِ اخلاق کی مہم سے دعوت کا آغاز کیوں نہ کیا؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے وقت جزیرۃ العرب کی اخلاقی سطح ہر پہلو سے انحطاط کے آخری کنارے تک پہنچی ہوئی تھی صرف چند بدویانہ فضائل اخلاق خام حالت میں موجود تھے۔

ظلم اور جارحیت نے معاشرے کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ جاہلی دَور کا نامور شاعر زہیر ابن ابی سلمیٰ اسی معاشرتی فساد کی طرف اپنے اس شعر میں حکیمانہ انداز سے اشارہ کرتا ہے : ؎

ومن لم یذد عن حوضہ بسلاحہ

یھدم و من لا یظلم الناس یظلم

جو ہتھیار کی طاقت سے اپنا دفاع نہیں کرے گا تباہ و برباد ہو گا۔ اور جو خود بڑھ کر لوگوں پر ظلم نہیں کرے گا تو وہ خود (بالآخر) ظلم کا شکار ہو جائے گا۔

اسی خرابی کی طرف جاہلی دور کا یہ مشہور و معروف مقولہ بھی اشارہ کرتا ہے :

انصُر اخاك ظالما او مظلوما۔

(اپنے بھائی کی مدد کر خواہ وہ ظلم کر رہا ہو یا اس پر ظلم ہو رہا ہو)

شراب خوری اور جُوا بازی معاشرتی زندگی کی روایت بن چکے تھے اور ان پر فخر کیا جاتا تھا۔ جاہلی دور کی تمام شاعری خمر اور قمار کے محور پر گھومتی ہے۔

زناکاری مختلف شکلوں میں رائج تھی اور اس جاہلی معاشرے کی قابلِ فخر روایت بن چکی تھی۔ یہ ایک ایسا حمام ہے جس میں ہر دور کا جاہلی معاشرہ ننگا نظر آتا ہے، خواہ وہ دورِ قدیم کا جاہلی معاشرہ ہو یا عہدِ حاضر کا (نام نہاد مہذب معاشرہ)

سوال کیا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تو ایک اصلاحی تنظیم کے قیام کا اعلان کر کے اس کے

ذریعہ اصلاحِ اخلاق، تزکیۂ نفوس اور تطہیرِ معاشرہ کا کام شروع کر دیتے۔ کیونکہ جس طرح ہر مصلحِ اخلاق کو اپنے ماحول کے اندر چند پاکیزہ اور سلیم الفطرت نفوس ملتے رہے ہیں اسی طرح آپ کو بھی ایک ایسا پاک سرشت گروہ بالیقین دستیاب ہو جاتا جو اپنے ہم جنسوں کے اخلاقی انحطاط اور زوال پر دلی دکھ محسوس کرتا۔ یہ گروہ اپنی سلامتیِ فطرت اور نفاستِ طبع کے پیشِ نظر آپ کی دعوتِ تطہیر و اصلاح پر لازماً لبیک کہتا۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کام کا بیڑا اٹھاتے تو بڑی آسانی سے اچھے انسانوں کی ایک جماعت کی تنظیم میں کامیاب ہو جاتے۔ یہ جماعت اپنی اخلاقی طہارت اور روحانی پاکیزگی کی وجہ سے دوسرے انسانوں سے بڑھ کر عقیدۂ توحید کو قبول کرنے اور اس کی گرانبار ذمہ داریوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار ہوتی اور اس حکیمانہ آغاز سے آپؐ کی یہ دعوت کہ الوہیت صرف خدا کے لیے مخصوص ہے پہلے ہی مرحلہ میں تند و تیز مخالفت سے دوچار نہ ہوتی۔

اس طریقہ میں کیا کمزوری تھی؟

لیکن اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ یہ راستہ بھی منزلِ مقصود کو نہیں جاتا۔ اسے معلوم تھا کہ اخلاق کی تعمیر صرف عقیدہ کی بنیاد پر ہی ہو سکتی ہے، ایک ایسا عقیدہ جو ایک طرف اخلاقی اقدار اور معیارِ ردّ و قبول فراہم کرے، اور دوسری طرف اس "طاقت" کا تعین بھی کرے جس سے یہ اقدار و معیار ماخوذ ہوں اور انھیں سند کا درجہ حاصل ہو اور اس جزا و سزا کی نشان دہی بھی کرے جو ان اقدار و معیارات کی پابندی یا ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کو اس طاقت کی طرف سے دی جانے گی۔ دلوں پر اس نوعیت کے عقیدہ کی ترمیم اور بالاتر قوّت کے تصور کے بغیر اقدار و معیارات خواہ کتنے ہی بلند پایہ ہوں مسلسل تغیّر کا نشانہ بنے رہیں گے۔ اور ان کی بنیاد پر جو بھی اخلاقی نظام قائم ہوگا وہ ڈانواں ڈول رہے گا۔ اس کے پاس کوئی ضابطہ نہ ہوگا۔ کوئی نگران اور محتسب طاقت نہ ہوگی، کیونکہ دل جزا و سزا کے کسی لالچ یا خوف سے بالکل خالی ہوں گے۔

ہمہ گیر انقلاب

صبر آزما کوششوں سے جب عقیدۂ الوہیت دلوں میں راسخ ہو گیا اور اس "طاقت" کا تصور بھی دلوں میں اتر گیا جس سے اس عقیدہ کو سند حاصل ہوتی تھی۔ دوسرے لفظوں میں جب انسانوں نے اپنے رب کو پہچان لیا اور صرف اسی کی بندگی کرنے لگے، جب انسان خواہشاتِ نفس کی غلامی سے اور اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کی آقائی سے آزاد ہو گئے، اور لا الٰہ الا اللہ کا نقش دلوں میں پوری طرح مرتسم ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس عقیدہ اور اس عقیدہ کے ماننے والوں کے ذریعہ وہ سب کچھ فراہم کر دیا جو وہ تجویز کر سکتے تھے۔ خدا کی زمین رومی اور ایرانی سامراج سے پاک ہو گئی۔ لیکن اس تطہیر کا مدعا یہ نہیں تھا کہ اب زمین پر عربوں کا سکہ رواں ہو، بلکہ اس لیے کہ اللہ کا بول بالا ہو۔ چنانچہ زمین خدا کے سب باغیوں سے خواہ وہ رومی تھے یا ایرانی اور عربی، پاک کر دی گئی۔

نیا اسلامی معاشرہ اجتماعی ظلم اور لوٹ کھسوٹ سے بالکل پاک تھا۔ یہ اسلامی نظام تھا اور اس میں عدلِ الٰہی پوری طرح جلوہ گر تھا۔ یہاں صرف میزانِ الٰہی میں ہر خوب و زشت اور صحیح و غلط کو تولا جاتا تھا۔ اس عدل اجتماعی کی بنیاد توحید تھی اور اس کا اصطلاحی نام "اسلام" تھا۔ اس کے ساتھ کسی اور نام یا اصطلاح کا اضافہ کبھی گوارا نہیں کیا گیا۔ اس پر صرف یہ عبارت کندہ تھی:

"لا الٰہ الا اللہ"

ع سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے

نفوس اور اخلاق میں نکھار آ گیا۔ قلوب و ارواح کا تزکیہ ہو گیا۔ اور یہ اصلاح اس انداز سے ہوئی کہ چند مستثنیٰ مثالوں کو چھوڑ کر ان حدود و تعزیرات کے استعمال کی نوبت ہی نہ آئی جن کو اللہ تعالیٰ نے قائم فرمایا تھا۔ اس لیے کہ اب ضمیروں کے اندر پولیس کی چوکیاں قائم ہو گئیں۔ اب خدا کی خوشنودی کی طلب، اجر کی خواہش، خدا کے غضب اور عذاب کا خوف، محتسب کا فرض انجام دے رہا تھا۔ الغرض انسانی نظام، انسانی اخلاق اور انسانی زندگی کمال کی اس بلندی تک پہنچ گئی جس تک نہ پہلے پہنچی تھی اور نہ صدرِ اوّل کے بعد آج تک پہنچ سکی ہے۔

یہ انقلابِ عظیم کیسے برپا ہوا؟

یہ انقلابِ عظیم اور کمالِ انسانیت صرف اس بنا پر حاصل ہوا کہ جن لوگوں نے دینِ حق کو ایک ریاست، ایک نظام اور جامع قانون و شریعت کی شکل میں قایم کیا تھا وہ خود پہلے اسے اپنے قلب و ضمیر اور اپنی زندگی میں قایم کر چکے تھے۔ اسے عقیدہ و فکر کے طور پر تسلیم کر چکے تھے، اپنے اخلاق کو اس سے آراستہ و پیراستہ کر چکے تھے، اپنی عبادت میں اسے سند دے چکے تھے اور اپنے معاملات میں اس کا سکہ رواں کر چکے تھے۔ اس دین کے قیام پر ان سے صرف ایک ہی وعدہ کیا گیا تھا۔ اس وعدہ میں غلبہ و اقتدار عطا کر دینے کا کوئی جز شامل نہیں تھا۔ حتّٰی کہ یہ جُز بھی شامل نہ تھا کہ یہ دین لازماً انھی کے ہاتھوں غالب ہو گا۔ ان سے جو کچھ کہا گیا وہ صرف اتنا تھا کہ اقامتِ دین کے عوض انھیں جنّت ملے گی۔ جو صبر آزما جہاد ان لوگوں نے کیا، جو زہرہ گداز آزمائشیں انہوں نے سہیں، جس پامردی اور استقامت کے ساتھ وہ راہِ دعوت پر رواں دواں رہے اور پھر بالآخر جس طرح اُنھوں نے جاہلیت کے مقابلے میں اس حقیقت کبریٰ کا ساتھ دیا جو لا الٰہ الا اللہ کے اندر پنہاں ہے اور جو ہر زمان و مکان کے فرماں رواؤں کے لیے ناگوار رہی ہے، ان سب خدمات کے عوض ان سے صرف ایک وعدہ کیا گیا جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ یعنی فقط وعدۂ فردا!

جب اللہ تعالیٰ نے انھیں آزمایش کی بھٹی میں ڈالا اور وہ ثابت قدم رہے اور ہر نفسیاتی خواہش اور حظ سے دست بردار ہو گئے، اور جب اللہ تعالیٰ نے جان لیا کہ وہ اس دنیا کے اندر اب کسی طور جزا اور صلہ کے منتظر نہیں ہیں، نہ انھیں اس کا انتظار ہے کہ یہ دعوت لازماً انھی کے ہاتھوں غلبہ حاصل کرے، اور یہ دین انھی کی قربانیوں اور کوششوں سے

بالاتر و برتر ہو۔ ان کے دلوں میں نہ آباؤ اجداد کا تفاخر باقی رہا نہ قومی گھمنڈ کے جراثیم، نہ وطن و ملک کی بڑائی کا جذبہ رہا اور نہ قبائلی اور نسبی عصبیتوں کی خُو بُو رہی۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے انھیں ان خوبیوں سے آراستہ دیکھا تب جا کر ان کے حق میں یہ فیصلہ دیا کہ یہ لوگ اب "امانتِ عظمٰی" یعنی خلافتِ ارضی کے بار کو اٹھا سکتے ہیں۔ یہ اس عقیدے میں کھڑے ہیں جس کا تقاضا ہے کہ ہر طرح کی حاکمیت صرف خدائے واحد کے لیے مخصوص ہو۔ دل و ضمیر پر، اخلاق و عبادات پر، جان و مال پر اور حالات و ظروف پر صرف اسی کی حاکمیت ہو۔ خدا کو معلوم تھا کہ یہ اس سیاسی اقتدار کے سچے محافظ ثابت ہوں گے جو ان کے ہاتھوں اس غرض کے لیے دیا جائے گا تاکہ شریعتِ الٰہی کو نافذ کریں اور عدلِ الٰہی کو قائم کریں مگر اس اقتدار میں سے ان کی اپنی ذات کے لیے یا اپنے قبیلے اور برادری کے لیے یا اپنی قوم کے لیے کوئی حصہ نہ ہو بلکہ وہ سراسر اللہ تعالیٰ کے لیے خالص ہو اور اللہ کے دین اور اس کی شریعت کی خدمت کے لیے ہو۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس اقتدار کا منبع صرف اللہ ہے اور اسی نے ان کی تحویل میں دیا ہے۔

نظامِ حق کی کامیابی کا واحد راستہ

اگر دعوتِ اسلامی کا قافلہ اس انداز سے روانہ سفر نہ ہوتا، اور دوسرے تمام جھنڈوں کو پھینک کر صرف اسی جھنڈے یعنی لا الٰہ الا اللہ کے پرچم توحید کو بلند نہ کرتا، اور اس راہ کو اختیار نہ کرتا جو ظاہر میں دشوار گزار اور جان گسل راہ تھی۔ مگر حقیقت میں آسان اور برکت بداماں تھی، تو اس مبارک اور پاکیزہ نظام کا کوئی جُز بھی اتنے بلند معیار کے ساتھ ہرگز بروئے عمل نہ آسکتا تھا۔ اسی طرح اگر یہ دعوت اپنے ابتدائی مراحل میں قومی نعرہ بن کر سامنے آتی یا اقتصادی تحریک کے لبادہ میں ظاہر ہوتی، یا اصلاحی مہم کا قالب اختیار کرتی یا لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ ساتھ کچھ دوسرے شعار اور نعرے بھی شامل کر لیتی تو یہ پاکیزہ و مبارک نظام جو اس دعوت کے نتیجے میں قایم ہوا کبھی خالص ربانی نظام بن کر جلوہ گر نہ ہو سکتا۔

قرآن حکیم کا مکی دور اسی شان و شوکت کا حامل ہے۔ یہ دور قلوب و اذہان پر اللہ کی الوہیت کا نقش ثبت کرتا ہے، انقلاب کے فطری راستے کی تعلیم دیتا ہے، خواہ اس میں بظاہر کتنی ہی دشواریوں اور صعوبتوں کا سامنا ہو، اور دوسری پگڈنڈیوں پر جانے سے منع کرتا ہے، خواہ عارضی طور پر انھیں اختیار کرنے کا ارادہ ہو۔ وہ ہر حال میں صرف فطری راستے پر گامزن رہنے کی تلقین کرتا ہے۔

پیغمبرِ انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم

مولانا کوثر نیازی

ساتویں صدی عیسوی میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب میں جو انقلاب برپا کیا تاریخ زمانہ مابعد میں اس کے اثرات اتنے دوررس تھے کہ اسے بعد کے دور کے تمام انقلابات کی بنیاد و اساس قرار دیا جاسکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی افکار و عادات کے دائرہ میں جو تبدیلی پیدا کی تھی وہ بعد کی صدیوں میں جاری رہی اور اس نے کئی جدید تحریکات پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ مثلاً جدید سائنسی تحریک جو گلیلیو اور کیپلر سے شروع ہوتی ہے، جمہوریت کی تحریک جس نے انقلاب فرانس کی شکل اختیار کی اور اشتراکی تحریک جس نے جدید روس اور چین کو جنم دیا، یہ تمام جدید انقلابات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عطا کردہ افکار کو عملی جامہ پہنانے کی جزدی اور ناقص کوشش ہیں۔ اس دعوے کے ثبوت میں پہلے ہمیں لفظ "انقلاب" کی توضیح اور اس کے مضمرات کی تصریح کرنی چاہیے۔ اپنے عام مفہوم میں انقلاب سے مراد یہ ہے کہ نظامِ حکومت میں طاقت کے ذریعہ تبدیلی پیدا کی جائے۔ "انقلاب کے معنے یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ معیشت، ثقافت، سماجی ڈھانچہ غرضیکہ انسانی مساعی کے کسی شعبہ میں کوئی بنیادی تبدیلی عمل میں لائی جائے"

(انٹرنیشنل انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائینسز۔ جلد ۱۴)

انقلابات عموماً اس وقت برپا ہوتے ہیں جب کوئی قدیم نظام پورے طور سے یا جزدی طور سے شکست و ریخت ہو جاتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ یا تو حکمران طبقہ نااہل ہوتا ہے یا جنگ، معاشی بحران اور اسی طرح کا کوئی دوسرا واقعہ ظہور پذیر ہوتا ہے۔

انقلابات کی تمام اقسام میں ایک خالص سیاسی انقلاب جس کا مقصد صرف حکومت کے مقتدر اشخاص کی تبدیلی ہو سب سے زیادہ عارضی ہوتا ہے۔ محض حکومت کی تبدیلی سے انسانی زندگی میں کوئی بڑا انقلاب نہیں آتا، جب تک کہ اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کے طرز فکر، عادات اور رسوم و رواج میں تبدیلی نہ ہو اور کچھ نئی اخلاقی اقدار کو نہ اپنایا جائے۔ اگر کسی انقلاب کو دیرپا اور مستقل نتائج پیدا کرنا ہوں تو اس کو لوگوں کے سارے طرزِ فکر کو تبدیل کرنا ہوگا۔ نئے قوانین پر عملدرآمد کرنا ہوگا اور ایک نیا نصب العین ساتھ لانا ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس انقلاب کے نقیب تھے وہ محض ایک سیاسی انقلاب نہ تھا بلکہ اس نے اساسی اور اخلاقی اقدار بدل ڈالے تھے۔ لوگوں کے طرزِ فکر میں تبدیلی پیدا کی اور سماجی عادات و اطوار کا ایک نیا ڈھانچہ وضع کیا تھا۔ ان تبدیلیوں کی اہمیت سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اسلام سے قبل کی دنیا پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالیں تاکہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عظیم کارنامہ کا صحیح طور سے اندازہ لگا سکیں جو آپؐ نے ایک بالکل جدید نظام زندگی کے قیام اور قدیم دنیا سے کامل انقطاع کی صورت میں انجام دیا۔

روم اور ایران

تیسری صدی کے اختتام پر سلطنت روما کے بارے میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد (۱۴) کا ایک مضمون نگار رقمطراز ہے:

"اگرچہ سلطنت روما کا کوئی بڑا علاقہ ہاتھ سے نہ نکلا تھا لیکن تیسری صدی کے بحرانی حالات نے سلطنت کی عام حالت پر مہلک اثرات مرتب کیے تھے۔ رومی امن و امان ختم ہو چکا تھا۔ نہ صرف سرحدی علاقے بلکہ یونان کے وسطی اضلاع، ایشیائے کوچک اور خود اطالیہ کی سرزمین جنگ کی تباہ کاری کا منظر پیش کر رہے تھے اور شہنشاہ آریلین نے روما میں جو قلعہ بندیاں کی تھیں وہ حالات کی تبدیلی کی غماز تھیں۔ جنگ و جدل، طاعون و قحط کے باعث آبادی کم رہ گئی تھی اور صوبوں کے مالی وسائل تقریباً ختم ہو گئے تھے۔ سرحدوں کی حفاظت کے لیے جتنی رقم درکار ہوتی تھی وہ غریب اور مفلوک الحال رعایا سے زبردستی وصول کی جاتی تھی۔ بحیرۂ روم کی صدیوں سے قائم شدہ تہذیب و ثقافت کو تیزی سے گھن لگ رہا تھا اور دربار میں وحشت و بربریت کی علامات کے ساتھ مشرقی عیش و تنعم کی جو کیفیات نمایاں تھیں اور جن سے شہنشاہ آریلین جیسے صالح حکمران بھی مستثنیٰ نہ تھے، عام ابتلاء و خرابی کی غماز تھیں۔"

ڈیاکلیشن کے دورِ حکومت میں رومی سینیٹ بالکل بے اختیار ہو کر رہ گئی تھی۔ جمہوری اداروں کی آخری علامات بھی مٹ گئی تھیں اور حکومت بالکل مطلق العنان شہنشاہیت میں تبدیل ہو گئی تھی۔ ڈیاکلیشن کے زمانہ سے بلدیاتی خود مختاری رفتہ رفتہ محو ہوتی گئی اور سلطنت روما کا نظم و نسق نوکرشاہی کے ہاتھوں میں آ گیا جو شہنشاہ کے اشارۂ چشم و ابرو پر کام کرتی تھی۔ ڈیاکلیشن اور قسطنطین نے سلطنت کی حفاظت کی خاطر عوام کے مفادات کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔

روما اور ایران دونوں سلطنتوں میں عوام الناس کی حالت قابلِ رحم تھی۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ان کی حالتِ زار کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

"تاریخ شاہد ہے کہ روم اور ایران میں شہنشاہیت ایک مدت تک قایم رہی۔ چنانچہ انھوں نے اپنے عہد کے عروج میں امراء و رؤسا کے عادات و اطوار کو اپنایا اور حالات کے مطابق تہذیب و تمدن کے لوازم اور اسباب رفاہیت و تعیش میں معتدبہ ترقی کی۔ آخرت کو پسِ پشت ڈال کر دنیاوی زندگی کو عیش و عشرت سے بسر کرنے کو انہوں نے اپنا نصب العین قرار دیا۔ چار دانگ عالم سے موجد اور سائنس دان کھنچ کر ان دو ملکوں میں جمع ہو گئے اور آسایش حیات کے متعلق انھوں نے کئی ایک نئی چیزیں اور نئے طریقے دریافت کیے۔ تمام علماء اور اہلِ ثروت عیش پرستی میں منہمک تھے اور ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں کوشاں رہتے تھے۔ ہر امیر کبیر اور اہلِ ثروت کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ اس کے پاس ایک شاندار محل ہو جس کے صحن میں باغ، حمام وغیرہ اور دیگر لوازم موجود ہوں۔ اس کے دسترخوان پر الوان نعمت چنے جائیں اور اس کی زرق برق پوشاک سب لوگوں کی توجہ کا باعث ہو، نیز اس کے پاس عمدہ نسل کے گھوڑوں اور راحت بخش گاڑیوں کی کمی نہ ہو۔ خدمت کے لیے لونڈیاں اور

کمر بستہ غلام حاضر ہوں۔ عصرِ حاضر کے ملوک و سلاطین اور والیانِ ریاست کے ٹھاٹھ باٹھ کو دیکھ کر آپ ان حضرات کی عیش و عشرت کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں۔ یہ طریقِ تعیش ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا جس کی وجہ سے عام تمدن اور معاشرت میں ایک لاعلاج روگ پیدا ہو گیا تھا۔ سب لوگ ان کے دیکھا دیکھی عیش و عشرت کی زندگی پر مائل ہو گئے تھے۔ اپنی حیثیت کے مطابق رعیت کے ہر ایک طبقہ میں یہ مرض پھیل گیا تھا، جس نے وبائے عام کی صورت اختیار کر لی تھی اور اس سے وہ عاجز آ گئے تھے۔ اس کے نتیجہ کے طور پر وہ قسم قسم کی پریشانیوں میں مبتلا ہو گئے۔ کیونکہ ایسی زندگی بسر کرنے کے لیے جس ساز و سامان کی ضرورت تھی اس کا حاصل ہونا دولت کثیر خرچ کیے بغیر ناممکن تھا۔ اس لیے ان ملوک و سلاطین نے اپنی رعایا و تجار پر اور امراء نے اپنی اپنی آسامیوں پر بھاری ٹیکس لگا دیے۔ اب ان مفلوک الحال عوام کے لیے دو ہی راہیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ علمِ بغاوت بلند کریں اور تلوار اپنے ہاتھ میں لیں۔ ایسا کرنا ان بے سرو سامان لوگوں کی قوت سے باہر تھا۔ دوسرا راستہ ان کے سامنے یہ تھا کہ ان کی اطاعت سے سرتابی نہ کریں اور جیسے بھی ہو زندگی کے دن پورے کریں۔

اس نظامِ تعیش کو قایم رکھنے کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ ان کے پاس اس قسم کے لوگوں کی فوج ظفر موج ہو جو ان کے لیے خوب صورت محل تعمیر کرے، انواع و اقسام کے کھانے تیار کرے اور ان کے لیے مختلف فیشن کے کپڑے اور دیگر سامان زینت و آرائش بنائے۔ چونکہ لوگوں کی کثیر تعداد لایعنی اشغال میں مصروف تھی اس لیے اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ بہت سے ایسے ضروری پیشے متروک ہو گئے تھے جن کا وجود اصل تمدن کے لیے ناگزیر تھا مزید برآں جیسے کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے جن لوگوں کا تعلق طبقۂ امراء اور اہلِ ثروت سے تھا ان کے دلوں میں بھی یہ شوق موجزن تھا کہ وہ بھی بڑے پیمانہ پر نہ سہی، کم از کم چھوٹے پیمانہ پر ان سے ملتی جلتی طرزِ معاشرت اختیار کریں۔ بصورتِ دیگر وہ ان کی نظروں میں ذلیل اور حقیر بن جائیں گے۔ اس صورت حال کے پیشِ نظر سب کی خواہش یہ تھی کہ کسی نہ کسی طرح دامنِ حکومت سے وابستہ رہیں اور جس طرح بھی ممکن ہو حکومت کے خزانہ سے کچھ نہ کچھ پا کر اپنی زندگی بسر کریں۔ چنانچہ ان کی ایک کثیر تعداد اس قسم کی تھی جنہوں نے حکومت کی ملازمت کو اپنا مقصدِ حیات قرار دے لیا تھا۔ لیکن چونکہ ان کے پیشِ نظر یہ بات نہ تھی کہ حکومت کی مشینری احسن طریقہ پر کام کرے اور نظامِ تمدن کو بہترین صورت پر قایم رکھا جائے بلکہ ان کا مقصد صرف پیسے بٹورنا ہوتا تھا لہٰذا انھوں نے عوام کی کوئی خدمت نہ کی اور یہ بدنظمی بہت بڑی خرابی کا باعث ہوئی۔

الغرض جب یہ مرض اپنی انتہائی شدت کو پہنچ گیا اور اس صورت حال میں مزید بگاڑ کی گنجایش باقی نہ رہی تو اللہ تعالیٰ نے اس مرض کا قلع قمع کرنے کا فیصلہ کیا اور ایک نبی اُمّی کو مبعوث فرمایا جو اس قسم کے تمدن اور معاشرت سے بالکل ناآشنا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ بالا عجمی نظامِ تعیش کی مذمت فرمائی ... اور اپنی امت کو

ان عادات سے بچنے کا حکم دیا جو اس عجمی زندگی کا جزو لازم اور ان کے لیے سرمایۂ فخر و ناز تھے۔ آپ نے اپنی امت کو بتایا کہ آپؐ کی بعثت ان قوموں کے زوال کا باعث ہوگی اور آپؐ کی نبوت کا مقصد قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کو مٹا دینا ہے۔" (حجۃ اللہ البالغہ ص ۸۴-۸۳ ج ا مطبع خیریہ ۱۳۲۲ھ)

اسلام سے پہلے دنیا کی مذہبی حالت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے انقلاب کی قدر و قیمت سمجھنے کے لیے آپ کی بعثت سے پہلے دنیا کی مذہبی حالت کا ایک مختصر جائزہ پیش کرنا ضروری ہے۔

دنیا کے تین بڑے مذاہب عیسائیت، یہودیت اور ہندومت میں سے پہلا مذہب (یعنی عیسائیت) کلامی بحثوں میں الجھا ہوا تھا۔ مورخ گبن کے الفاظ میں:

"بت پرستی کے خاتمہ کے بعد عیسائیت کے پیرو امن و امان اور تقویٰ و طہارت کی فضا میں اپنی کامیابی سے لطف اندوز ہو سکتے تھے لیکن فتنہ و فساد ان کی طبیعتوں میں رچا ہوا تھا اور انھیں اپنے بانیٔ مذہب کے قوانین اور احکام کی اطاعت کی اتنی فکر نہ تھی جتنی اس بات کی تحقیق کی کہ اس کی فطرت کیا تھی۔" (گبن۔ تاریخ انحطاط و زوال سلطنت روما، جلد ۴۔ ص ۳۲۸)

عیسائی مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ان میں سے ہر فرقہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش و تخلیق کے متعلق مختلف خیالات رکھتا تھا یعنی مسیح کی فطرت الوہی تھی یا انسانی یا الوہیت اور انسانیت دونوں اس کی فطرت میں مدغم تھیں۔ ایبونی فرقہ کا اعتقاد تھا کہ حضرت مسیحؑ عام انسانوں کی طرح ایک انسان تھے:

"یہ لوگ مسیحؑ کے ساتھی تھے اور آپ سے مانوس تھے۔ انھوں نے اپنے ہموطن مذہبی رہنما اور دوست سے دوسرے انسانوں کی طرح گفتگو کی تھی۔ انھیں مسیحؑ اپنی حیوانی اور عقلی زندگی میں بالکل نوع انسانی کا ایک فرد نظر آیا تھا۔" (گبن۔ حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے۔ ص ۳۲۹-۳۳۰)

ڈوکسٹی فرقہ کو اس سے انکار تھا کہ مسیحؑ انسانی فطرت کا حامل تھا۔ ان کا اعتقاد تھا کہ وہ دریائے اردن کے کنارے ایک کامل مرد کی صورت میں نمودار ہوا، مگر یہ صورت صرف ظاہری تھی نہ کہ حقیقی۔ مسیحؑ ایک نورانی پیکر تھا جس کے جسم سے کوئی چیز گزر نہیں سکتی تھی اور اس کا جسم برائی اور فساد سے پاک تھا۔ ولنیٹن اور بیسلیڈ فرقہ کا اس کے برخلاف یہ اعتقاد تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام ایک بالکل فانی انسان تھا۔ جب اس کو دریائے اردن میں بپتسمہ دیا گیا تو مسیحؑ ایک فاختہ کی شکل میں اس کے اندر سما گیا اور اس کی بعثت کے دوران اس کے اعمال و افعال میں اس کی ہدایت کرتا رہا۔ اپالینیرس کا اعتقاد یہ تھا کہ الوہیت ایک انسان کے جسم میں مجسم تھی اور کلمہ یا عقل ابدی نے اس کے اندر روح کی جگہ لے لی تھی۔ آریوسی فرقہ کے نزدیک بیٹا دوسری مخلوقات سے کتنا ہی بہتر کیوں نہ ہو لیکن بالآخر وہ بھی مخلوق تھا۔ مسیحؑ کی فطرت کے بارے میں یہ تنازعات قسطنطین اعظم کے لیے پریشانی کا

باعث بن گئے اور اس نے ۳۲۵ء میں بمقام نیقیہ ایک مجلس مذاکرہ منعقد کی جس میں آریوسی فرقہ کے اعتقاد کے برعکس یہ فیصلہ کیا گیا کہ باپ اور بیٹے کا جوہر ایک ہے اور بیٹے کے متعلق یہ خیال ہرگز صحیح نہیں کہ وہ مخلوق ہے یا کم از کم باپ سے کم رتبہ ہے۔ مسیح کی فطرت کے بارے میں ان مباحث سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ عیسائیوں کو اخلاقی کردار کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہ تھی بلکہ وہ مابعد الطبیعاتی مسائل سے دلچسپی رکھتے تھے۔ اس طرح اخلاقی مسائل کو کلامی مسائل کے مقابلہ میں نظر انداز کر دیا گیا جس کا نتیجہ اخلاقی زوال کی صورت میں ظاہر ہوا۔ پھر عیسائیت نے رہبانیت اور خانقاہیت کی حوصلہ افزائی کی۔ اس کے نتیجہ میں عیسائیوں کے بہترین دل و دماغ رکھنے والے افراد نے تہذیب و تمدن کا کام دوسرے اور تیسرے درجہ کے لوگوں پر چھوڑ دیا اور خود ریگستانوں اور صحراؤں کی راہ اختیار کی تاکہ وہاں دنیا سے الگ تھلگ خدا کی عبادت کر سکیں۔ اس طرح تہذیب و تمدن کی رفتار ترقی سست پڑ گئی۔

دوسری طرف یہودی دنیا پرستی میں مبتلا تھے۔ وہ ایک ضدی طبیعت رکھتے تھے اور ہمیشہ اپنے پیغمبروں کی نافرمانی کرتے تھے۔ اپنی تاریخ کے ابتدائی دور میں انہوں نے حضرت ہارون علیہ السلام کی پیہم تنبیہہ کے باوجود گائے کے بچھڑے کی پرستش شروع کر دی۔ ان کے مذہبی رہنما اپنی مقدس کتابوں کی غلط سلط تاویلات کرتے تھے تاکہ اس طرح وہ مقبول عوام بن جائیں اور سوسائٹی میں ان کا درجہ بلند رہے۔ وہ نسل اور قوم کے پرستار تھے اور اپنے آپ کو تمام قوموں اور نسلوں سے افضل سمجھتے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ میں انھیں ایک نجات دہندہ پیغمبر کا انتظار تھا لیکن جب وہ نجات دہندہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت میں نمودار ہوا تو انھوں نے اس بنا پر اس کو ماننے سے انکار کر دیا کہ وہ ان کی نسل سے نہ تھا۔ اس طرح نسل پرستی ان کے مذہبی اعتقاد کا جزو لازم تھی۔

ہندومت نے ذات پات کے نظام کو جنم دے کر ایک ایسا معاشرہ پیدا کیا تھا جو مصنوعی عدم مساوات سے معمور تھا۔ برہمن سب سے اعلیٰ ذات سمجھی جاتی تھی۔ یہ لوگ مذہب اور علم کے اجارہ دار تھے۔ کھتری دوسرے درجہ کی ذات تھی۔ یہ لوگ سپاہی تھے اور حرف فنون جنگ کے ماہر تھے۔ ویش ذات زراعت و کھیتی باڑی کی ذمہ دار تھی۔ سب سے نیچی ذات شودروں کی تھی جن سے روزمرہ کے کاموں میں خدمت لی جاتی تھی۔ ان کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا تھا۔ اگر وہ کسی برہمن کو چھو لیتے تو انہیں موت کی سزا دی جاتی۔ وہ عبادت گاہوں اور مندروں کے قریب نہیں جا سکتے تھے۔ اگر وہ کسی مقدس کتاب کا کوئی اشلوک سن لیتے تو ان کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا جاتا۔ ان کے مکانات، شہروں اور قصبوں سے دور ہوتے تھے اور وہ اکثر صورتوں میں شہروں یا قصبات میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ اگر انھیں کسی قصبہ یا شہر میں داخل ہونے کی اجازت مل جاتی تو ان کو وہاں ننگے سر اور ننگے پاؤں جانا پڑتا۔ گھڑ سواری کی ان کو قانونی طور پر ممانعت تھی۔ نیز ذات پات کے ان امتیازات کو مذہبی حیثیت حاصل تھی۔

ظہور اسلام سے پہلے ایک اور مذہبی تحریک نوفلاطونی تحریک تھی۔ جس کے اثر سے انسانی ذہن اپنے حقیقی اور مادی مسائل سے بیگانہ ہو گیا تھا۔ اس تحریک کے ماننے والے اس لاحاصل کوشش میں لگے رہتے تھے کہ مادی تقاضوں سے آنکھیں بند کر کے وہ خدا کا قرب حاصل کر لیں گے۔ نوفلاطونیوں کے اعتقاد کی رو سے حقیقی سعادت اسی وقت حاصل ہو سکتی تھی جب انسان اپنے حال سے بے خبر و بے حال ہو کر وجد و سرمستی کی کیفیت سے آشنا ہو جائے، جس میں وہ اپنے آپ اور خارجی عالم دونوں کو یکسر فراموش کر دے۔ سائنس اور علم کی اتنی ناقدری کبھی نہیں ہوئی جتنی نوفلاطونیوں کے ہاتھوں ہوئی۔

مذہبی رواداری کا ارتقاء

ظہور اسلام سے قبل دنیا میں مذہبی تشدد انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ برسر اقتدار طبقہ اپنے مخالف فرقوں کو مٹانے کے درپے رہتا تھا۔ عیسائیت کے پیروکاروں نے نسطوری فرقے کے لوگوں کو بازنطینی مملکت سے نکال باہر کیا تھا۔ چنانچہ ان لوگوں نے سلطنت فارس میں جا کر پناہ لی۔ ۴۱۲ء میں اسکندریہ کے بشپ (پادری) سینٹ سائرل نے مخالف فرقوں اور مذاہب پر بڑے مظالم کیے۔ اس نے نولیشی فرقہ (نوویشین) کے گرجاؤں میں لوٹ مار کر کے ان کو بند کرا دیا اور ہزاروں یہودیوں کو شہر بدر کر دیا۔ لیکن اس کا بدترین جرم یہ تھا کہ اس نے زمانہ قدیم کی ایک نہایت فاضل خاتون ہائی پیشیا (HYPATIA) کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ گبن رقمطراز ہے:

"ریاضی دان تھیون کی بیٹی ہائی پیشیا نے اپنے باپ کے علوم کی اشاعت و ترویج کا آغاز کیا۔ اس کی فاضلانہ تشریحات نے اپالونیس کی جیومیٹری کی وضاحت کی۔ وہ اسکندریہ اور ایتھنز میں افلاطون اور ارسطو کے فلسفہ کا عام درس دیتی تھی۔ یہ اس کے انتہائی حسن جمال، پختگی اور عقل و دانش کا زمانہ تھا۔ یہ شرمیلی دوشیزہ اپنے مداحوں کو ٹھکرا کر اپنے شاگردوں کی تعلیم و تدریس میں لگی رہی۔ اس دور کے نمایاں اہل علم و فضل حضرات اس فلسفی خاتون سے ملنے کے لیے بے چین رہتے تھے۔ سائرل اس کے مرکز علم و فضل میں آنے والوں کے گھوڑوں کی قطاروں اور غلاموں کے ہجوم کو رشک اور حسد کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ عیسائیوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ تھیون کی یہ بیٹی رومن فرمانروا اور آرک بشپ کے درمیان تفاہم و تعاون پیدا کرنے میں واحد رکاوٹ ہے۔ چنانچہ جلد ہی یہ رکاوٹ دور کر دی گئی اور لینٹ (LENT) کے مقدس موسم میں وہ ہلاکت خیز دن بھی آیا جب ہائی پیشیا کو اس کی راحت بخش گاڑی سے کھینچ کر باہر گرایا گیا اور پیٹر کے وحشی اور بے رحم متعصبوں کے ایک گروہ نے اس کو برہنہ کر کے نہایت غیر انسانی طریقے سے اسے ذبح کر ڈالا۔" (گبن۔ انحطاط و زوال سلطنت روما جلد چہارم ص ۱۴۴)

قبل از اسلام عرب کا ایک اور واقعہ یہودیوں کے مذہبی تعصب پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔ یمن کے ایک فرمانروا ذونواس نے یہودیت قبول کر لی تھی۔ وہ جنوبی عرب میں مسیحیت کو پھیلتا پھولتا نہ دیکھ سکتا تھا۔ جنوبی عرب میں مسیحیت کا بڑا مرکز نجران تھا۔ اس نے نجران کے باشندوں سے کہا کہ وہ یا تو یہودیت قبول کر لیں یا مرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ انھوں نے موت کو ترجیح دی۔ اس نے ان کے لیے خندقیں کھدوائیں، کچھ کو آگ میں جلا دیا، کچھ کو تلوار سے ذبح کر دیا اور کچھ کی شکلیں بگاڑ دیں۔ یہاں تک کہ اس نے ان کے بیس ہزار آدمی موت کے گھاٹ اتار دیے۔" (ابن اسحاق۔ سیرت رسول اللہؐ، ص ۱۷)

یہ تھی دنیا کی حالت جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا۔ آپؐ نے ان تمام قدیم برائیوں کا خاتمہ کر کے ایک عادلانہ اور منصفانہ معاشرے کی بنیاد رکھی۔ اس معاشرے میں انسان کی آزادیٔ ضمیر کا احترام کیا گیا۔ یہ معاشرہ

ذات پات سے پاک تھا۔ یہ معاشرہ علم و معرفت کے حصول پر زور دیتا تھا۔ اس معاشرے میں آدمی کو جانچنے کا پیمانہ اس کی اپنی لیاقت اور قابلیت تھی نہ کہ وہ طبقہ جس سے اس کا تعلق تھا۔

اس بات کی وضاحت کے لیے مختلف نظریات پیش کیے گئے ہیں کہ ایک ایسے عظیم انقلابی کا ظہور کیونکر ہُوا۔ لیکن ان میں سے کوئی نظریہ بھی حقائق پر پُورا نہیں اُترتا۔ پہلے نظریہ کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نظریۂ توحید عرب کے صحرائی حالات کا نتیجہ تھا۔ جو ایک خدا کے تصور کے لیے بہت زیادہ سازگار تھے۔ لیکن اگر یہی بات ہے تو توحید کا کوئی مذہب ہندوستان کے صحرائے راجپوتانہ یا گوبی کے صحرائے اعظم میں کیوں نہ پیدا ہوگیا؟ دُوسرا نظریہ یہ ہے کہ پورا جزیرۂ عرب ایک تبدیلی کا متقاضی تھا اور لوگ اس انتظار میں تھے کہ انھیں کب ان لامتناہی قبائلی جنگوں سے نجات ملتی ہے۔ آئیے اس ضمن میں سر ولیم میؤر کی رائے معلوم کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

> "رسول اللہ صلعم کی بعثت سے قبل جزیرۂ عرب کے امکانی حالات کسی مذہبی اصلاح، سیاسی اتحاد یا قومی نشاۃ ثانیہ کے لیے انتہائی سازگار تھے۔" (لائف آف محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ سر ولیم میؤر۔ دیباچہ صفحہ)

یہی مصنف مزید لکھتا ہے:

> "بعض اوقات اسباب و علل ان نتائج کے ساتھ ہم آہنگ ہوجاتے ہیں جو کسی ایسے شخص نے پیدا کیے ہوں جو بظاہر اس کا اہل نظر نہیں آتا۔ جونہی محمد صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، سارا عرب ایک نئے روحانی مذہب کے لیے اٹھ کھڑا ہُوا۔ اسی سے بعض لوگوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ جزیرہ عرب ایک تبدیلی کا آرزومند تھا اور اسے قبول کرنے کے لیے تیار تھا۔ لیکن اگر ٹھنڈے دل کے ساتھ ماضی کا جائزہ لیا جائے تو میرا خیال ہے کہ قبل از اسلام کی تاریخ اس مفروضے کو غلط ثابت کرتی ہے۔" (لائف آف محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ سر ولیم میؤر۔ حوالہ بالا)

تیسرا نظریہ مارکس کا ہے، جو کہتا ہے کہ ہر انقلابی تبدیلی ایک نئے طبقے کے ظہور کا نتیجہ ہوتی ہے۔ مارکسسٹوں کی رائے میں جب کوئی نئی پیداواری قوت معاشرے میں ظاہر ہوتی ہے تو معاشرے میں پہلے سے موجود پیداواری حالات سے اس کا تصادم ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں ایک نیا طبقہ ظہور پذیر ہوتا ہے اور یہ نیا طبقہ ایک انقلابی تبدیلی لے آتا ہے۔ لیکن مارکسی حضرات اس کی وضاحت کرنے سے قاصر رہے ہیں کہ ظہور اسلام کے وقت عرب معاشرے میں کوئی نئی پیداواری قوت کیوں ظاہر نہ ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے قبل عرب میں نہ تو کوئی نئی پیداواری قوت ظاہر ہوتی نظر آتی ہے اور نہ ہی ان حالات میں کوئی تبدیلی نظر آتی ہے اور نہ ظہور اسلام کے وقت عرب میں کوئی نیا طبقہ اٹھا۔ جن لوگوں نے رسول اللہؐ کا ساتھ دیا ان میں غریب بھی تھے اور امیر بھی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کسی حد تک دولت مند تھے۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ تو خاصے مالدار تھے۔ قیادت کا منصب اسلام سے قبل اور بعد قریش ہی کے ہاتھ میں رہا اور معاشرے کے طبقاتی ڈھانچے میں کوئی تبدیلی رونما نہ ہُوئی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انقلابی تعلیمات

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی تمام جدید انقلابات کے اصل بانی ہیں۔ لیکن صرف اسی حد تک جس حد تک کہ ان انقلابات نے انسان کی حالت میں فی الواقع کوئی بہتری پیدا کی۔ جہاں تک ان انقلابات نے صراط مستقیم سے منہ موڑا ہے وہاں انھوں نے دراصل تعلیمات نبوی سے انحراف کیا ہے۔ یہ جدید انقلابات کیا ہیں؛ سیاسی میدان میں یہ انقلاب جمہوریت کا انقلاب ہے، جس نے انسانوں میں سیاسی مساوات قایم کی ہے۔ سماجی شعبہ میں یہ عورت کے حقوق اور اس کے صحیح مقام کے بارے میں انقلاب ہے۔ معاشی میدان میں یہ کمیونسٹ انقلاب ہے جس نے معاشی مساوات قائم کر کے بھوک اور افلاس کے شکار عوام کو نجات دلائی ہے۔ علم اور سائنس کے میدان میں یہ سائنسی انقلاب ہے، جس کا آغاز کوپرنیکس، گلیلیو اور کپلر سے ہوا۔ آیندہ سطور میں ہم اس بات کا جائزہ لیں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات نے ان انقلابات کی بنیاد کیسے رکھی؛

سیاسی تعلیمات

داخلی اور خارجی سیاست کے معاملات میں عوام کے نمائندوں سے مشورہ کرنا جدید جمہوریت کی بنیاد ہے۔ لیکن یہ اصول سب سے پہلے قرآن کریم ہی نے بتایا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

"وامرھم شوریٰ بینھم" (شوریٰ آیت ۳۸)

ترجمہ: "اور ان کے معاملات آپس کے مشورے سے طے ہوتے ہیں"۔

یہ درست ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شوریٰ کی کوئی متعین شکل بیان نہیں فرمائی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شوریٰ کی صورتیں زمانہ کی ضروریات کے ساتھ ساتھ بدلتی رہی ہیں۔ جدید نمایندہ جمہوریت بھی شوریٰ کی انہی قسموں میں سے ایک ہے۔

جدید جمہوریت کی ایک دوسری بنیاد قانون کی رُو سے مساوات کا اصول ہے۔ یہ بنیاد بھی سب سے پہلے رسول اللہ صلعم نے واضح طور پر بیان فرمائی۔ حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں:

عن عروۃ عن عائشۃ ان اسامۃ کلم النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی امرأۃ فقال انما هلك من كان قبلكم انهم كانوا يقيمون الحد على الوضيع ويتركون على الشريف والذی نفسی بیدہ لو ان فاطمۃ فعلت ذٰلك لقطعت یدھا۔ (بخاری کتاب الحدود)

ترجمہ: "حضرت عائشہؓ عروہؓ سے روایت کرتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت اسامہؓ نامی ایک صحابی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک عورت کے بارے میں کچھ سفارشات پیش کیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم سے پہلے بہت سی قومیں صرف اس لیے تباہ ہوگئیں کہ وہ نچلے طبقے کے لوگوں پر حدود جاری کیا کرتی تھیں۔ اللہ کی قسم! اگر میری بیٹی فاطمہ سے بھی اس قسم کا فعل سرزد ہوتا تو میں اس کے ہاتھ کاٹنے سے بھی دریغ نہ کرتا"۔

دورِ حاضر میں جمہوریت کا دُوسرا اصول مذہبی رواداری اور انسانی ضمیر کی آزادی کا اعتراف ہے۔ گزشتہ سطور میں ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ دورِ جاہلیت میں اس اصول کو کس طرح نظر انداز کیا گیا ہے۔ اس دور میں مذہبی اختلافات کو برداشت نہیں کیا جاتا تھا اور مختلف مذہبی گروہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ نبرد آزما رہتے تھے۔ مگر ظہورِ اسلام کے بعد قرآن مجید میں مذہبی رواداری کا اصول نہایت تاکید کے ساتھ بیان کیا گیا۔ ارشاد ہوتا ہے:

"لا اکراہ فی الدین" دین میں کوئی جبر نہیں ہے۔ (البقرہ: ۲۵۶)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجران کے عیسائیوں کے ساتھ معاہدہ کر کے مذہبی رواداری کی عملی طور پر خود ایک عظیم الشان مثال قائم فرمائی۔ ابن قیم نے اس معاہدہ کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

"من محمد النبی الی اسقف ابی الحارث واساقفہ نجران وکہنتہم ورھبانہم واھل بیعھم ورقیقھم وملتھم وسواطتھم وعلی کل ما تحت ایدیہم من قلیل وکثیر جوار اللہ ورسولہ لا یغیر اسقف من اسقفتہ وراھب من رھبانیۃ ولا کاھن من کہانتہ ولا یغیر حق من حقوقہم ولا سلطانہ ولا مما کان علیہ۔" (زاد المعاد۔ ابن قیم۔ ص ۴۱۔ جلد ۳)

"یہ معاہدہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے پادری ابی الحارث اور نجران کے دُوسرے پادریوں کے ساتھ ہے۔ نیز ان کے کاہن، راہب، خانقاہ نشین، غلام، اہل قوم اور ان تمام لوگوں کے ساتھ ہے جو ان کے ماتحت ہیں خواہ وہ تعداد میں کم ہوں یا زیادہ۔ ان سب کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے امان ہے۔ کسی پادری کو اس کے عہدے سے نہیں ہٹایا جائے گا نہ کسی راہب کو اس کی رہبانیت سے منع کیا جائے گا اور نہ کسی کاہن کو اس کی کہانت سے۔ ان کے حقوق، اختیارات اور مراعات جو ان کو پہلے سے حاصل ہیں ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔" (ابن قیم۔ زاد المعاد، ج ۳۔ ص ۴۱)

کسی دینی نظام میں اس سے زیادہ فیاضانہ شرائط کا تصور کرنا مشکل ہے جو ایک فاتح نے اپنے مفتوح عوام کے ساتھ روا رکھی ہوں۔

جمہوری مساوات کے ضمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کارنامے کو ایک عیسائی مصنف نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں ایک ایسا مکمل جمہوری مساوات کا نظام وجود میں آیا جس سے زیادہ مکمل نظام دنیا میں آج تک کہیں موجود نہ تھا۔ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ میریڈتھ ٹاؤنسنڈ)

آزادیٔ نسواں

موجودہ دنیا کو اس بات پر فخر ہے کہ اس نے عورت کو مساوی حقوق دیے اور اسے اس کا صحیح مقام عطا کیا۔ لیکن یہ حقیقت سب کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ تاریخ کا ایک مسلسل عمل ہے جس کی ابتداء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے ہوتی ہے

اسلام سے پہلے تمدنوں میں عورت کو مال وجائیداد میں حقوق حاصل نہ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے سب سے پہلے اس کو مال وجائیداد میں حقوق دلوائے۔ قرآن مجید نے ذیل کے الفاظ میں عورتوں اور مردوں کے درمیان مساوات کا درس دیا ہے:

"ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف" (البقرہ - ۲۲۸)

"اور عورتوں کا حق مردوں پر ایسا ہی ہے جیسے دستور کے مطابق مردوں کا حق عورتوں پر"

"ھن لباس لکم وانتم لباس لھن" (البقرہ - ۱۸۷)

"وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو"

انہی تعلیمات کی گونج حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ میں سنائی دیتی ہے۔ آپ نے فرمایا:

اما بعد ایھا الناس فان لکم علی نساءکم حقا ولھن علیکم حقا ...... واستوصوا بالنساء خیرا۔ (ابن ہشام۔ سیرت النبی۔ المکتبۃ التجاریہ قاہرہ جلد ۴ ص ۲۷۵ - ۲۷۶)

"اے لوگو! تمہارا عورتوں پر حق ہے اور ان کا تم پر حق ہے اور میں تمہیں عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت کرتا ہوں" (سیرۃ ابن ہشام۔ ج ۴۔ ص ۲۷۵ - ۲۷۶)

دور حاضر میں عورتوں کو اگر کچھ زیادہ حقوق حاصل ہیں تو اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ موجودہ طرز زندگی نے ان کیلئے ایسے مواقع فراہم کیے ہیں جو ظہور اسلام کے وقت عرب معاشرہ میں موجود نہ تھے۔ یہ اسلام کا ہی طفیل ہے کہ آج وہ ان اطواق و سلاسل سے آزاد ہیں جن میں صدیوں سے وہ جکڑی ہوئی تھیں۔

اقتصادی تعلیمات

کیمونزم کو دعویٰ ہے کہ اس نے عوام کی معاشی بحالی و ترقی کے لیے جو کام کیا ہے وہ کسی دوسری تحریک نے نہیں کیا۔ ہوسکتا ہے کہ جزوی طور پر یہ بات صحیح ہو۔ تاہم اس سلسلہ میں ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ صنعتی انقلاب کے بعد موجودہ دنیا کو جو اقتصادی ذرائع حاصل تھے اور جن کے نتیجہ میں مشینی دور وجود میں آیا، اسلام کو اس سے کہیں کمتر ذرائع حاصل تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جو انتظامیہ تھی وہ ابھی اپنے ابتدائی مراحل سے گزر رہی تھی اس لیے آپ کو اپنے زمانہ کے محدود حالات کے تحت کام کرنا پڑا۔ ہمیں آپ کی معاشی اصلاحات کو ان تجدیدی عوامل کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ آپ نے معاشی مساوات میں جو اساسی اصول قایم کیا کیمونزم نے درحقیقت اسی اصول سے تقویت حاصل کی ہے۔

قرآن مجید نے واضح الفاظ میں اعلان کیا ہے کہ:

"وہ معاشرہ میں ایسا اقتصادی نظام قائم کرنا نہیں چاہتا جہاں دولت مساوی طور پر افراد کے درمیان گردش نہ کرتی ہو"؛

ما افاء اللہ علی رسولہ من اھل القری فللہ وللرسول ولذی القربیٰ والیتامیٰ

والمساکین وابن السبیل کی لایکون دولة بین الاغنیاء منکم۔ (سورۂ حشر۔ آیت ۷)

"جو کچھ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو دوسری بستیوں کے لوگوں سے دلوا دے، وُہ اللہ کا حق ہے اور رسول کا ۔ اور قرابت داروں کا اور یتیموں کا اور غریبوں کا اور مسافروں کا "تاکہ جو تم میں دولت مند ہیں انہی کے ہاتھوں میں نہ پھرتا رہے۔"

قرآن مجید نے ارتکازِ دولت کی مذمت کی ہے اور مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اس کو عام فلاحی کاموں میں خرچ کریں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

والذین یکنزون الذھب والفضة ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم۔
(سورۃ التوبہ۔ آیت ۳۴)

"جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو اس دن کے دردناک عذاب کی خبر سنا دو۔"

غریب اور مظلوم لوگوں کے حقوق کا اسلام کس قدر خیال رکھتا ہے، اس کا اندازہ قرآن مجید کی ان آیات سے لگایا جا سکتا ہے:

ارئیت الذی یکذب بالدین فذٰلک الذی یدع الیتیم ولا یحض علیٰ طعام المسکین۔
(الماعون: ۱-۳)

"کیا تم نے اس شخص کو نہیں دیکھا جو روزِ جزا کو جھٹلاتا ہے؛ یہ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے کے لیے (لوگوں کو) ترغیب نہیں دیتا۔"

ایک دُوسرے مقام پر ارشادِ ربانی ہے:

وما ادرٰلک ماالعقبة فک رقبة، اواطعام فی یوم ذی مسغبة، یتیما ذا مقربة اومسکینا ذا متربة۔ (البلد: ۱۲-۱۶)

"اور تم کیا سمجھے کہ گھاٹی کیا ہے؛ کسی کی گردن چھڑانا یا بھوک کے دن کھانا کھلانا یتیم رشتہ دار کو یا مسکین خاکسار کو۔"

معاشی انصاف و مساوات کے جذبہ کی یہی جھلک ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں بھی نظر آتی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ تعالیٰ یقول یوم القیٰمة یا ابن آدم مرضت فلم تعدنی قال یا رب کیف اعودک وانت رب العٰلمین؟ قال اما علمت ان عبدی فلان مرض فلم تعدہ اما علمت انک لوعدتہ لوجدتنی عندہ یا ابن آدم

استطعمتك فلم تطعمني قال یا رب کیف اطعمك و انت رب العالمین؟ قال اما علمت انه استطعمك عبدی فلان فلم تطعمه اما علمت انك لو اطعمته لوجدت ذلك عندی یا ابن آدم استسقیتك فلم تسقنی قال یا رب کیف استقیك وانت رب العالمین؟ قال استسقاك عبدی فلان فلم تسقه اما علمت انك لو سقیته وجدت ذلك عندی۔

(مشکوٰۃ کتاب الجنائز۔ باب عیادۃ المریض، ص ۱۳۴)

"اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا اے آدم کے بیٹے! میں بیمار تھا تو نے میری عیادت نہیں کی۔ وُہ کہے گا اے پروردگار! میں تیری کیسے عیادت کرتا، تُو تو رب العالمین ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا تجھے نہیں معلوم کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا، تونے اُس کی عیادت نہیں کی۔ کیا تو نہیں جانتا کہ اگر تو اس کی عیادت کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے کھانا مانگا، تونے مجھے کھانا نہیں دیا۔ وہ کہے گا اے پروردگار! میں تجھے کیسے کھانا کھلاتا، تُو تو خود رب العالمین ہے۔ اللہ تعالیٰ جواب میں فرمائے گا کہ کیا تجھے نہیں معلوم کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا، اور تونے اس کو کھانا نہیں کھلایا، کیا تجھے معلوم نہیں کہ اگر تُو اس کو کھانا کھلاتا، تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے پانی مانگا، تُو نے مجھے پانی نہیں پلایا۔ وہ کہے گا کہ اے پروردگار! میں تجھے کیسے پانی پلاتا، تُو تو خود رب العالمین ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی مانگا تھا تُو نے اس کو پانی نہیں پلایا، کیا تجھے نہیں معلوم کہ اگر تو اس کو پانی پلاتا، تو مجھے اس کے پاس پاتا۔" (مشکوٰۃ، کتاب الجنائز، باب عیادۃ المریض، ص ۱۳۴)

آج کی مادہ پرست دنیا میں آنحضرت صلعم کی ان تعلیمات پر کیونکر اور کیسے عمل ہو رہا ہے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ بیمار کو ہسپتال میں داخل کیا جانا چاہیے، غیر تعلیم یافتہ افراد کو سکولوں میں تعلیم دلوائی جائے، بے روزگار کو روزگار مہیا کیا جائے اور ہر ضرورت مند کی جائز ضرورت کو پورا کیا جائے۔ کیا جدید دور کی کوئی فلاحی مملکت یا کوئی کمیونسٹ نظام اس سے بہتر صورت پیدا کر سکتا ہے؟

ایک دوسری حدیث میں حضرت ابن عباسؓ سرورِ کائنات صلعم سے روایت کرتے ہیں:

لیس المؤمن الذی یشبع وجاره جائع الی جنبه۔ (مشکوٰۃ ـ باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق۔ ص ۴۲۴)

ترجمہ: مومن وہ نہیں جو خود تو پیٹ بھر کر کھائے مگر اس کا پڑوسی اس کے قرب میں بھوکا رہے۔

(مشکوٰۃ، باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق، ص ۴۲۴)

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور روایت میں ارشاد فرمایا کہ اس قسم کے تمام زوائد ایسے لوگوں کے حوالے کر دیے جائیں جن کے پاس یہ چیزیں نہ ہوں۔ حضرت ابوسعیدؓ سے مروی ہے:

عن ابی سعید ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نظر الی رجل یصرف راحلته فی

نواحی القوم فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من کان عندہ فضل عن ظہر فلیعد بہ علی من لا ظہر لہ و من کان لہ فضل من زاد فلیعد بہ علی من لا زاد لہ حتی رأینا ان لا حق لاحد منا فی فضل۔ (مسند احمد بن حنبل۔ جلد ۳ ص ۳۴)

ترجمہ، حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے ایک شخص کو دیکھا جو اپنی سواری کو ایک آبادی کی طرف موڑ رہا تھا تو رسول اللہؐ نے فرمایا جس کے پاس زائد سواری ہو وہ اس زائد سواری کو اس شخص کو دے دے جس کے پاس سواری نہ ہو اور جس کے پاس خوراک کا زائد ذخیرہ ہے وہ ایسے شخص کو دے دے جس کے پاس کھانے کو نہیں۔ حتیٰ کہ ہم یہ خیال کرنے لگے کہ ہم میں سے کسی کے پاس اپنی ضرورت سے زائد کوئی چیز نہیں ہے۔ (مسند احمد بن حنبل۔ ج ۳، ص ۳۴)

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ایک جدید فلاحی مملکت حتیٰ کہ کمیونزم بھی اقتصادی انصاف میں ان حدود سے آگے نہیں جاسکتی جو سرورِ کائناتؐ نے متعین فرمائی ہیں۔ قرآن مجید کی اصطلاح میں ان دونوں کا مقصد "ضرورت مندوں کو کھانا کھلانا" ہے بشرطیکہ "اس کھلانے" کو اس کے لغوی معانی میں نہ لیا جائے۔

علم ومشاہدہ کی ضرورت پر زور

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم تاریخ کے ایسے دور میں مبعوث ہوئے جبکہ عیسائیت رہبانیت کی حوصلہ افزائی کر رہی تھی اور نوفلاطونیت اپنے پیروکاروں کو اس امر کی تعلیم دے رہی تھی کہ اپنے ذہن اور آنکھیں بند رکھیں اور عیش وتنعم کی تلاش میں مصروف رہیں۔ اگر یہ دونوں رجحانات جاری رہتے تو تمام سائنس اور علم عنقا ہو جاتا۔ لیکن سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رجحان کا رُخ پلٹ دیا اور حصولِ علم اور انسانی قوتِ مشاہدہ کو بروئے کار لانے پر زور دیتے ہوئے موجودہ تجرباتی سائنس کی اساس رکھی۔ قرآن مجید اس بات پر زور دیتا ہے کہ انسان کو مناظرِ فطرت کا مطالعہ کرنا چاہیے اور بیرونی دنیا میں اپنے اللہ کی نشانیاں تلاش کرنا چاہییں۔ ذیل کی آیت میں قرآن مجید مومنوں کو انتباہ کرتا ہے کہ انھیں اس بات کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے گا کہ انہوں نے اپنی دیکھنے، سننے اور سوچنے کی صلاحیتوں کو کس طرح استعمال کیا ہے:

"ولا تقف ما لیس لک بہ علم۔ ان السمع والبصر والفؤاد کل اولئک کان عنہ مسئولا"

(سورۃ اسریٰ۔ آیت ۳۶)

ترجمہ: اور اے بندے جس چیز کا تجھے علم نہیں اس کے پیچھے نہ پڑ۔ کہ کان اور آنکھ اور دل ان سب سے ضرور باز پرس کی جائے گی۔ (سورۃ اسریٰ: ۳۶)

ذیل کی آیات میں انسان کی توجہ فطرت کے خارجی مظاہر کی طرف دلائی گئی ہے اور اسے ہدایت کی گئی ہے کہ اللہ کی نشانیاں مراقبہ اور استغراق میں تلاش نہ کرے بلکہ فطرت کے ٹھوس حقائق میں ان کی جستجو کرے۔

" افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت و الی السماء کیف رفعت و الی الجبال کیف نصبت و الی الارض کیف سطحت ۔" (سورہ غاشیۃ آیت ۲۰)

ترجمہ: کیا وہ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ وہ کیسے بنایا گیا ہے؟ اور آسمان کو کہ کیسے بلند کیا گیا ہے اور پہاڑوں کو کہ وہ کیسے نصب کیے گئے اور زمین کو کہ کیسے بچھائی گئی۔ (سورۃ غاشیۃ آیت ۲۰-۱۹-۱۸-۱۷)

ان فی خلق السموات والارض واختلاف الیل والنہار والفلک التی تجری فی البحر بما ینفع الناس وما انزل اللہ من السماء من ماء فاحیا بہ الارض بعد موتہا و بث فیہا من کل دابۃ و تصریف الریاح والسحاب المسخر بین السماء والارض لاٰیٰت لقوم یعقلون ۔ (سورہ بقرہ: ۱۶۴)

ترجمہ: "بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے میں اور کشتیوں (اور جہازوں) میں جو دریا میں لوگوں کے فائدے کے لیے رواں ہیں اور مینہ جس کو خدا آسمان سے برساتا اور اس سے زمین کو مرنے کے بعد زندہ کر دیتا ہے اور زمین پر ہر قسم کے جانور پھیلانے میں اور ہواؤں کے چلانے میں اور بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان گھرے رہتے ہیں عقلمندوں کے لیے خدا کی قدرت کی بہت نشانیاں ہیں۔"

محسن انسانیت صلعم نے درج ذیل حدیث میں سائنس سمیت ہر قسم کے علم کے حصول کی اہمیت پر زور دیا ہے:

" الحکمۃ ضالۃ المومن فحیث وجدھا فھو احق بہا۔"

(ترمذی ابواب العلم، جلد ۴، صفحہ ۱۵۵)

ترجمہ: حکمت یعنی علم مومن کی گم شدہ شے ہے، جہاں وہ اسے پالے وہ اس کا دوسروں کی بہ نسبت زیادہ حقدار ہے۔ (ترمذی ابواب العلم جلد ۴ ص ۱۵۵)

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر مسلمان پر طلب علم فرض قرار دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

" طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم و مسلمۃ۔"

ترجمہ: "علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور مسلمان عورت کا فریضہ ہے۔"

اسی طرح ایک اور قول ہے:

" اطلبوا العلم ولو کان بالصین۔"

"علم حاصل کرو خواہ اس کے لیے تمہیں چین کیوں نہ جانا پڑے۔"

اگرچہ یہ حدیث نہیں ہے لیکن یہ قول مسلمانوں میں اس قدر مقبول ہو چکا ہے کہ بعض اوقات غلطی سے اسے حدیث قرار دیا جاتا ہے۔ مسلمانوں میں اس قول کی اس قدر وسیع اشاعت اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ سرورِ کائنات کی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔

لیکن اس میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ سیکولر علوم کے حصول کے بارے میں مسلمانوں کے ذوق و شوق کی مظہر ہے کیونکہ چین سے یہ توقع ہرگز نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہاں سے مسلمانوں کو دینی تعلیم حاصل ہوگی۔

یہ تعلیمات قرونِ وسطیٰ میں علم سائنس کی آفرینش کا باعث ہوئیں اور اگر مسلمانوں کے دورِ عروج کے مسلم سائنسدانوں نے عظیم خدمات انجام نہ دی ہوتیں تو کوپرنیکس، گلیلیو اور نیوٹن دنیا کو اس قدر متاثر نہ کر سکتے۔ اس لیے بلا جھجک یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ موجودہ سائنس بڑی حد تک سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی مرہونِ منت ہے۔

اب تک ہم نے صرف ان حقائق پر روشنی ڈالی ہے اور ثابت کیا ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات نے جدید انقلابات پر کس طرح گہرے نقوش چھوڑے ہیں، لیکن اس بات کی طرف اشارہ کر دینا بھی ضروری ہے کہ عصرِ حاضر کے انقلابات کے تمام پہلو اور خوبیاں سرورِ کائنات کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق نہیں ہیں۔ سرورِ کائنات صلعم نے جو اصول وضع فرمائے ہیں وہ بعض امور میں ان انقلابات سے بھی بہت آگے ہیں اور آپ نے جو نصب العین مقرر فرمایا ہے جدید دنیا کو اسے ابھی حاصل کرنا ہے۔ مثلاً جدید دنیا ابھی تک تنگ نظری اور خود غرضی پر مبنی نیشنلزم کے دلدل میں پھنسی ہوئی ہے اور یہ نیشنلزم انسان کی عالمگیر برادری کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اسی طرح جدید دنیا نسلی تعصبات اور امتیازات پر قابو پانے میں بھی ناکام رہی ہے۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر ہر قسم کے قومی اور نسلی تعصبات سے منع فرمایا تھا۔ آپؐ نے فرمایا:

"یاایھا الناس ان ربکم واحد وان اباکم واحد لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی العربی ولا لاحمر علی اسود ولا لاسود علی احمر الا بالتقوی"

(نیل الاوطار۔ جلد ۵ طبع مصر ص ۸۸)

ترجمہ: اے لوگو! بے شک تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ ایک ہے۔ کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں اور نہ کسی عجمی کو عربی پر فضیلت ہے۔ نہ سرخ کو سیاہ فام پر اور نہ سیاہ فام کو سرخ پر برتری حاصل ہے۔ یہ اگر ہے تو صرف تقویٰ کی بنا پر ہے۔ (نیل الاوطار۔ جلد ۵۔ طبع مصر ص ۸۸)

یہ بنی نوعِ انسان کی حتمی وحدت کا واضح اعلان ہے اور قوم پرستی اور نسل پرستی کی نفی ہے۔ مسلمان، ہو سکتا ہے کہ دوسرے امور میں سرورِ کائناتؐ کی تعلیمات کو صحیح معنوں میں عملی جامہ پہنانے میں ناکام رہے ہوں لیکن اس ضمن میں انھوں نے بلاشبہ ایک قابلِ فخر کردار کا مظاہرہ کیا ہے۔ حتیٰ کہ غیر مسلم مصنفین بھی اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ مقابلتاً مسلمان قومی اور نسلی تعصبات سے آزاد ہیں۔ ایک غیر مسلم مصنف کا یہ اعتراف قابلِ توجہ ہے:

"یہاں انسانی اخوت کے بارے میں اسلامی رویہ اور ان لاکھوں انسانوں کے رویہ کا ذکر نہایت ضروری ہے جو دولت اور نسل کے اختلافات کو نہایت معمولی سمجھتے ہیں اور جن کا تصورِ جمہوریت قدیم یونانیوں سے سبقت لے گیا ہے" (اورلنتر۔ ٹرائمفنٹ پلگرمیج)

ایک عیسائی مصنف افریقہ کے سیاہ فاموں سے متعلق مسلمانوں اور عیسائیوں کے رویہ کا موازنہ ان الفاظ میں کرتا ہے:

"عیسائی سیاح اس شدید خواہش کے باوجود کہ ان کی سوچ مخالفانہ ہے یہ بیان کرتے ہیں کہ ان سیاہ فام لوگوں میں جنہوں نے اسلام قبول کر لیا ہے فوری طور پر انسانی وقار کا وہ احساس پیدا ہو گیا ہے جو عیسائیت قبول کرنے والے سیاہ فاموں میں بہت کم پیدا ہو سکا ہے۔" (اسلام کی اقدار۔ از ریورنڈ بوسورتھ سمتھ)

فرانسیسی انقلاب اور کمیونسٹ انقلاب دونوں بین الاقوامی نصب العین اور اعلیٰ اقدار کے بلند بانگ دعووں کی بنا پر رو پذیر ہوئے تھے، لیکن ان میں سے کوئی بھی نیشنلزم کے تنگ دائرے سے باہر نہیں نکل سکا یورپ میں نیشنلزم کو فروغ دینے کا زیادہ تر ذمہ دار فرانسیسی انقلاب ہے اور جہاں تک روسی کمیونزم کا تعلق ہے، اس بارے میں انٹر نیشنل انسائیکلو پیڈیا آف سوشل سائنسز کے مصنف کی رائے ملاحظہ فرمائیے:

"دوسری جنگ عظیم کے دوران قومی جذبۂ حب الوطنی کا وہ رجحان جو اس سے قبل بھی دیکھنے میں آتا تھا کمیونسٹ روس میں نہایت شدید ہو گیا۔ سٹالن نے اس ضمن میں خود پہل کی اور ۲۰ جولائی ۱۹۴۲ء کو روسی عوام سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ وہ اپنے عظیم اسلاف کے ہمت و حوصلہ سے فیضان حاصل کریں اور اس طرح روس کے جاگیردارانہ ماضی کے فوجی ہیروز کو روس کے کمیونسٹ جوانوں کے لیے مثال اور نمونہ قرار دیا گیا۔"

(جلد ۳ و ۴، صفحہ ۱۰۸)

اسلامی انقلاب دوسرے معاملات میں بھی جمہوری انقلاب اور کمیونسٹ انقلاب سے مختلف ہے۔ جمہوریت کے برعکس، جو غریب اور ضرورت مند افراد کو غاصب سرمایہ داروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتی ہے اور انھیں اقتصادی تحفظ دینے کے لیے کچھ نہیں کرتی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حاجت مندوں کی ضروریات کی کفالت کے لیے لازمی زکوٰۃ کا نظام قایم کیا ہے۔ زکوٰۃ کی تعریف سرور کائنات صلعم نے خود ان الفاظ میں کی ہے،

"ان اللہ قد افترض علیہم صدقۃ توخذ من اغنیائھم وترد فی فقرائھم۔"

(بخاری کتاب الزکوٰۃ۔ ص ۱۸۷۔ جلد ۶)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے تم پر ایک صدقہ فرض کیا ہے جو تمہارے تونگروں سے لیا جائے گا اور تمہارے محتاجوں کو دے دیا جائے گا۔ (بخاری کتاب الزکوٰۃ۔ ص ۱۸۷، ج ۶)

غریبوں کو دینے کے لیے امیروں سے لینے کے اس اسلامی نظام نے غریب طبقات کو اقتصادی تحفظ کی ضمانت دی اور مسلم معاشرے میں آمدنیوں میں توازن پیدا کیا۔ اسی طرح کمیونزم کے برعکس اسلام نے آزادیِ فکر اور اظہار کو کچلنے کی کوشش نہیں کی۔ کیمونزم میں کوئی دین اور مسلک نہ زندہ رہ سکتا ہے نہ پنپ سکتا ہے، جب کہ سرور کائنات کے اسلامی معاشرے میں عیسائی، یہودی اور مشرک مسلمانوں کے پہلو بہ پہلو پورے ربط و ضبط اور امن و سکون سے بستے تھے۔ مذہب اسلام میں اتنے مکاتب فکر کا وجود بجائے خود اس کے وسیع القلب اور عالمگیر مذہب ہونے کا ثبوت ہے جو سرور کائنات کی تعلیمات کی روح ہے۔

کیمونسٹ اور جدید جمہوریت کے داعی اکثر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے

دور میں کسی نمائندہ ادارہ کا کوئی وجود نہ تھا اور اصل طاقت عوام کے پاس نہ تھی۔ یہ اعتراض کرتے وقت اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ نمایندہ اور منتخب اداروں کے قیام کے لیے بعض مادی شرائط مثلاً صنعت کی ترقی، تیز رفتار ذرائع آمد و رفت اور پرنٹنگ پریس کا وجود لازمی ہے۔ جب تک یہ شرائط پوری نہ ہوں کوئی منتخب اور نمایندہ ادارہ وجود میں نہیں آسکتا۔ محسن انسانیت صلعم اور ان کے ابتدائی جانشینوں کے دور میں کوئی مطبوعہ لفظ نہ تھا اور کوئی منظم پریس نہ تھا۔ فاصلے اتنے تھے کہ سفر کرنا مشکل تھا۔ مختلف اضلاع اور صوبوں کے لوگ ایک دوسرے سے بآسانی رابطہ قایم نہیں کر سکتے تھے۔ پھر اس وقت منتخب نمایندہ ادارے کیسے قایم ہو سکتے تھے؟ اس قسم کے اعتراضات کرنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ جمہوریت کی ایک سے زاید صورتیں ہو سکتی ہیں اور جو بات اسے دوسری طرز کے نظاموں سے ممتاز کرتی ہے وُہ مساوات کی رُوح اور حکومت کے کاموں میں عوام کی شرکت ہے۔

جمہوریت محض سیاسی طریقوں اور اقتصادی اصلاحات کا نام نہیں بلکہ یہ ایک بنیادی نظریہ ہے اور اقتدار جانچنے کا ایک پیمانہ ہے۔ یہ انسان اور اس کے معاشرہ میں صحیح مقام کا ایک واضح تصور ہے۔ اگر اسے اس معیار پر جانچا جائے تو سرورِ کائنات صلعم کا انقلاب پُورے طور پر ایک جمہوری انقلاب تھا۔

میں اپنا یہ مقالہ ایک غیر مسلم مورّخ کے اقتباس پر ختم کرتا ہُوں جس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانیت کی ترقی کے لیے کیا عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔ سر فلپ گبز "عظمت محمد صلعم" میں لکھتے ہیں:

"اسلام جسے بجا طور پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین کہا جا سکتا ہے اس نے انسانی تہذیب اور اخلاقیات کی ترقی اور فروغ کے لیے ان تمام مذاہب سے کہیں زیادہ کام کیا ہے جو انسان کی تخلیق سے لے کر اب تک اس کی رُوح کو گرمانے کا باعث ہُوئے ہیں۔" (سر فلپ گبز۔ عظمت محمد صلی اللہ علیہ وسلم)

رحمتِ عالمؐ کا ہمہ گیر انقلاب

سیّد ابوبکر غزنوی

وہ انقلاب جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام لائے اس کی ابھری ہُوئی خصوصیات کیا ہیں ؛ اس رُوئے زمین پر جو انقلاب برپا ہُوئے، ان کے تقابلی مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ ان میں سے بعض انقلاب محض سیاسی تھے بعض اقتصادی تھے بعض ثقافتی تھے۔ مگر وُہ انقلاب جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس روئے زمین پر برپا کیا وہ اخلاقی بھی تھا، روحانی بھی تھا، ثقافتی بھی تھا، سیاسی اور اقتصادی بھی تھا طبیعاتی بھی تھا۔ لینن اور ماؤ کا انقلاب محض اقتصادی اور سیاسی تھا، اخلاقی اور روحانی نہ تھا۔ لینن اور ماؤ جدلیاتی مادیت (DIALECTICAL MATERIALISM) کے قائل ہونے کی وجہ سے مابعد الطبیعات کے سرے سے منکر ہیں۔ پس لینن اور ماؤ کے برپا کیے ہوئے انقلاب بھی ناقص اور ادھورے ہیں۔ مختلف انقلابوں کے تقابلی مطالعہ سے یہ بات مجھ پر منکشف ہُوئی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے انقلاب سے زیادہ جامع، ہمہ گیر اور بھرپور انقلاب اس روئے زمین پر آج تک برپا نہیں ہُوا۔

محمدی انقلاب ابتدائی مرحلوں میں

یہ کہنا حقایق کی سراسر تکذیب ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام جو انقلاب لائے وہ ابتدائی مرحلوں میں صرف اخلاقی اور روحانی انقلاب تھا اور معاشی مسائل پر توجہ بہت بعد میں منعطف کی گئی اگر ابتدائی مکی سورتوں کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ ابتدائی مرحلے میں جہاں نماز کی تلقین کی گئی، اللہ سے تعلق جوڑنے کی ترغیب دی گئی، معاشی انقلاب کا آغاز بھی اسی مرحلے میں ہوگیا تھا۔

سورہ ہمزہ مکی سورت ہے، جس میں فرمایا گیا ہے کہ ؛

ہلاکت ہے ہر طعنہ زنی اور عیب چینی کرنے والے کے لیے جس نے مال سمیٹا اور گن گن کر (تجوریوں میں) رکھا۔ اس کا گمان ہے کہ اس کا مال اس کے ساتھ رہے گا، ہرگز نہیں، ہڈیوں کو چٹخا دینے والی دوزخ میں اسے جھونک دیا جائے گا۔

سورۂ تکاثر دیکھیے ؛

مال کی بہتات کی ہوس نے تمھیں غافل کر دیا ہے اور یہ ہوس تمھیں مرتے دم تک لگی رہتی ہے۔ ہوش کرو (اس ہوس کا انجام تمھیں بہت جلد معلوم ہوجائے گا)۔

ابولہب بہت مالدار آدمی تھا۔ انقلاب کے ابتدائی مکی دور میں اس کا نام لے کر اعلان کیا گیا :

ابولہب کے ہاتھ ٹوٹ گئے اور وُہ ہلاک ہوا۔ اس کا مال اور دولت جو اس نے سمیٹی تھی اس کے کام نہ آسکی۔

پھر سورۂ ماعون ملاحظہ فرمائیے :

کیا تونے اس شخص کو دیکھا جو جھٹلاتا ہے ارتکازِ دولت کی سزا کو، یہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو خود کھانا کھلانا

تو درکنار اس کی ترغیب بھی نہیں دیتا۔

ایک دُوسرے کی ضد ہیں، ایک دُوسرے کے ساتھ حریفانہ کش مکش میں ہم نے حقیقتوں کا چہرہ مسخ کیا، ہم نے اس انقلاب کا حلیہ بگاڑا۔

حضورؐ نے معاشرے کو معاشی اعتبار سے شدت سے جھنجھوڑا اور اس انقلاب کا آغاز اپنی ذات سے کیا ؎

لوح بھی تُو، قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب

آغاز اپنی ذات سے کیا اسبابِ راحت اور اسبابِ تعیش کا تو وہاں گزر نہ تھا، اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی بھی معاشرے کے حوالہ کریں خود فقر و فاقہ کی سختیاں جھیلتے رہے اور غریبوں، مسکینوں اور بے نواؤں کی چارہ سازی کرتے رہے۔ حضرت فاطمہؓ کے ہاتھوں پر چکی چلانے سے گٹے پڑ گئے تھے۔ خود جھاڑو دیتی تھیں اور گرد اڑ کر ان کے کپڑوں پر پڑتی تھی۔ خود پانی بھرتی تھیں اور مشکیزے کے پٹے کے نشان ان کے کندھوں پر پڑ گئے تھے۔ ایک دن اپنے بابا سے خادم مانگا، تو حضورؐ نے فرمایا:

اے فاطمہ! اللہ سے ڈرتی رہو، اپنے رب کے فرائض ادا کرتی رہو اور اپنے گھر والوں کے کام کاج میں لگی رہو۔ خادم ہونے سے یہ زندگی جو تم بسر کر رہی ہو تمہارے لیے بہتر ہے۔

اس انقلاب کا آغاز حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات اور گھر سے ہُوا۔ انقلاب مارکس اور لینن کا ہو یا ماؤ کا ہو یا حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ہو، یاد رکھیے کہ وہ ہمیشہ انقلابی کی ذات اور گھر سے شروع ہوتا ہے۔ تاریخ عالم اس بات کو جھٹلاتی ہے کہ کبھی ایسا ہُوا ہو کہ انقلابی خود راحت اور تعیش میں ڈوبا ہُوا ہو اور اس نے معاشی انقلاب برپا کیا ہو۔

محنت کش اور مزدور کو عزت بخشی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جھوٹے وقار کے خلاف جہاد کیا۔ وہ گھر کا کام اپنے ہاتھوں سے کرتے تھے صحاح ستہ کی مختلف روایات جو حضرت عائشہؓ، حضرت حسن بصری اور ابو سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مروی ہیں، سے پتا چلتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بکری کا دُودھ خود دوہ لیتے تھے، کپڑے کو پیوند خود لگا لیتے تھے، اپنی جوتیاں خود گانٹھ لیتے تھے۔ گھر میں جھاڑو دینے میں بھی عار نہ تھا۔ بازار سے سودا سلف خود اٹھا کر لاتے۔

مسجد قبا کی تعمیر شروع ہُوئی تو صحابہ کرامؓ کے ساتھ آپؐ بھاری پتھر اٹھا کر لاتے تھے۔ صحابہ عرض کرتے:

یا رسول اللہؐ! آپ رہنے دیجیے، ہم جو اٹھا رہے ہیں۔

مگر آپؐ برابر پتھر اٹھا اٹھا کر لاتے رہے۔ پھر مسجد نبویؐ تعمیر ہُوئی تو آپؐ صحابہ کے ساتھ مل کر کچی اینٹیں بنانے کا کام کرتے رہے اور خود اینٹیں اٹھا اٹھا کر لاتے اور صحابہ کرامؓ یہ شعر پڑھتے تھے: ؎

لئن قعدنا و النبی یعمل

فذاک منا العمل المضلل

(اگر ہم بیٹھ جائیں اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کام کریں تو ہمارا بیٹھ جانا بہت ہی بُرا عمل ہوگا)

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

کسب معاش کرنے والوں میں سب سے بہتر محنت کش ہے جب وہ اخلاص سے کام کرتا ہے۔

حدیث میں ہم حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں پڑھتے ہیں کان یاکل مع الخادم۔ وہ اپنے خادم کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ یہ اسلامی نظامِ حیات کی ابجد ہے۔ ایک المیہ ہے کہ جو لوگ معاشرے میں اسلام کی طرف دعوت دینے والے ہیں وہ عملی طور پر اس کی ابجد ہوز سے بھی محروم ہیں اور وہ نوکر کو اپنے دسترخوان پر بٹھانا توان کے لیے ناقابلِ تصور ہے۔ لاہور میں گزشتہ دنوں ایک ڈنر میں شرکت کا اتفاق ہوا، جس میں بڑے بڑے حامیانِ دین اور مفتیانِ شرع متین شریک تھے میں نے میزبان سے کہا کہ میرے ڈرائیور کو اندر بلا لیجیے، وہ کھانا میرے ساتھ کھائے گا۔ میرے ڈرائیور کو تو انہوں نے ذرا سی پیش و پس کے بعد بلا لیا مگر بیسیوں ڈرائیور اور چپڑاسی رات گیارہ بجے تک باہر بھوکے بیٹھے رہے۔ میرے ڈرائیور نے مجھے بعد میں بتایا کہ سب ڈرائیور اور چپڑاسی ان اسلام کے علمبرداروں کو گالیاں دیتے رہے اور ان پر لعنتیں بھیجتے رہے۔ یہ ایک المیہ ہے کہ ہم اسلام کا نام محض SLOGAN کے طور پر بولتے ہیں اور اس ملک میں سوشلزم کا لفظ بھی محض SLOGAN کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ ؎

رُخ پر نقاب مصلحتوں کے پڑے ہوئے
لب پر زمانہ سازی کی مُہریں لگی ہوئیں

جیسے زبان و دل میں کوئی ربط ہی نہیں۔ ؎

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا
دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو

اپنی نظم "سرمایہ محنت" میں کہا: ؎

دست دولت آفریں کو مُزد یوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکوٰۃ

اور اپنی نظم "الارض" میں جاگیرداروں کو شدت سے جھنجھوڑا: ؎

دہ خدایا یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں

اپنے ایک مضمون میں یوں رقمطراز ہیں:

مجھے افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کے اقتصادی پہلو کا مطالعہ نہیں کیا ورنہ انھیں معلوم ہوتا کہ اس خاص اعتبار سے اسلام کتنی بڑی نعمت ہے۔

فاصبحتم بنعمته اخوانا۔

اس کی نوازش سے تم بھائی بھائی ہو گئے۔

میرا اسی نعمت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ کسی قوم کے افراد صحیح معنوں میں ایک دوسرے کے اخوان نہیں ہو سکتے، جب تک کہ وہ ہر پہلو سے ایک دوسرے کے ساتھ مساوات نہ رکھتے ہوں اور اس مساوات کا حصول بغیر ایک ایسے سوشل نظام کے ممکن نہیں، جس کا مقصود سرمایہ کی قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھ کر مذکورہ بالا مساوات کی تخلیق اور تولید ہو۔ (زمیندار، ۲۴ جون ۱۹۲۳ء)

قرآن مجید بار بار دولت مندوں سے کہتا ہے کہ تمہارے مال میں غریبوں کا حق ہے یعنی تم ان پر کوئی احسان نہیں کرتے ہو۔

ارض وسما کے مالک ہم ہی ہیں اور نحن ترزقکم و ایاھم اور ہم ہی ہیں کہ تمہیں بھی اور انہیں بھی رزق دیتے ہیں۔ اسی لیے قرآن و حدیث میں بار بار کہا گیا ہے کہ تمہارے مال میں غریبوں کا حق ہے۔

ان کے مال میں سائل اور محروم کا حق ہے۔ اور فرمایا:

یعنی یتیموں اور مسکینوں کا حق انہیں دے دو۔

اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

یقیناً مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے۔

حضورؐ نے بھی لفظ "حق" ہی استعمال فرمایا۔ ساری دقتیں اور دشواریاں دولت کو گردش میں لانے کے سلسلے میں اسی لیے اُبھرتی ہیں کہ ہمیں اس بات کا یقین نہیں آتا کہ ہمارے مال میں غریبوں کا حق ہے۔ حقدار کو حق دلانا ہر حکومت کا فرض ہوتا ہے اور جب بھی کوئی حق غصب کرتا ہے تو حکومت جبراً حقدار کو حق دلاتی ہے۔ اگر ہمیں یہ یقین آجائے کہ غریبوں اور مزدوروں کا ہمارے مال میں حق ہے تو منطقی اعتبار سے ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ اگر غاصبانِ حق برضا و رغبت حقداروں کو ان کا حق دینے پر آمادہ نہ ہوں تو حکومت جیسے دُوسرے حق، حقداروں کو جبراً دلاتی ہے، یہ بھی غریبوں کو جبراً دلائے۔ "تشکیل الٰہیات جدیدہ" میں علامہ اقبالؒ نے امام ابن حزمؒ کا چھ بار ذکر کیا ہے۔ امام ابن حزم بہت بڑے محدث تھے۔ المحلی کی چھٹی جلد میں لکھتے ہیں کہ ایک دن حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے صحابہ سے فرمایا کہ:

تم میں سے جس کے پاس فالتو سواری ہو وہ اسے لوٹا دے، جس کے پاس سواری نہیں ہے اور جس کے پاس اپنی ضرورت سے زاید غذا ہے وہ ان لوگوں کو لوٹا دے جن کے پاس غذا نہیں ہے۔ (ص ۱۵۷)

آپ غور کیجئے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہمیں فرمایا کہ عطا کر دیجئے یا بخش دیجئے بلکہ لوٹانے کا لفظ استعمال فرمایا۔ اس لفظ کے استعمال سے یہ وضاحت فرما دی کہ تم حقداروں کو ان کا حق لوٹا رہے ہو کوئی احسان تو نہیں کر رہے ہو۔ ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے ایک ایک جنس اور مال کی ایک ایک قسم کا جدا جدا ذکر کیا حتیٰ کہ ہمیں یقین آگیا کہ فالتو مال پر ہمارا کوئی حق نہیں رہا۔ حضرت ابو عبیدہ بن جراحؓ نے ایک سال جب غلے کا شدید قحط ہوا، احکام صادر کیے کہ میں نے غلہ سٹاک کرنے کے مختلف مرکز بنا دیئے ہیں اور وہ تمام لوگ جن کے گھروں میں غلہ پڑا ہے ان مرکزوں میں اس غلے کو اکٹھا کر دیں۔ حضرت ابو عبیدہ ہر گھر کے تناسب کے اعتبار سے اس غلے کو مساوی طور پر تقسیم فرماتے رہے۔

میں پُوچھتا ہوں کہ ابو عبیدہ بن جراح نے ان جاگیرداروں کو اس غلّے کا کون سا معاوضہ دیا تھا۔ بلال بن حارث المزنی کو ایک بہت بڑا رقبہ حضورؐ نے عطا کیا۔ حضرت عمرؓ نے جب زرعی اصلاحات شروع کیں تو زمین کا وہ تمام حصہ جسے وہ کاشت نہ کر سکے ان سے چھین لیا اور مسلمانوں میں اسے بانٹ دیا۔ یہ واقعہ "کتاب الخراج" میں بھی لکھا ہے اور "کنز العمال" میں بھی ہے۔ میں پھر اس بات کی وضاحت کرتا ہوں کہ بلال بن حارثؓ کو حضرت عمرؓ نے اس چھینی ہُوئی زمین کا کوئی معاوضہ نہیں دیا تھا۔

بعض دوستوں نے کہا کہ یہ باتیں تو درست ہیں لیکن ان باتوں کو ذاتی انتقام کے لیے استعمال کیا جائے گا، اس لیے ان باتوں کا اظہار نہ کرنا ہی مناسب ہے۔ میں کہتا ہُوں کہ ذاتی انتقام کے لیے تو تمام تعزیرات کو استعمال کیا جا سکتا ہے تو کیا اس خدشے کی بناء پر تمام

تعزیرات میں تحریف اور تاویل کی جائے۔ اگر کوئی احکامِ الٰہی کو ذاتی انتقام کی خاطر استعمال کرتا ہے تو وہ اللہ اور معاشرے کے سامنے جواب دہ ہے اور اللہ کے قانون جزا و سزا سے نہ بچ سکے گا۔

سب کچھ لٹا دیا

ام المومنین حضرت خدیجہؓ حجاز کی ممتاز، متمول خاتون تھیں اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ان کے مال سے تجارت کرتے تھے جب اس ہمہ گیر اور بھرپور انقلاب کو برپا کرنے کا کام آپ نے شروع کیا تو ان کا کاروبار مندا پڑنے لگا۔ جب آپ نے یہ آواز بلند کیا کہ تمام انسان اللہ کی نظر میں برابر ہیں۔ بلال حبشیؓ سردارانِ قریش سے افضل ہے تو عربوں کی جبیت جاہلیہ کو سخت دھچکا لگا۔ پھر ہمہ تن انقلاب کے کام میں مصروف ہو جانے کی وجہ سے حضور کو تجارت کا کام بند کر دینا پڑا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے پاس جس قدر اندوختہ تھا اسلام پھیلانے کی خاطر خرچ کر ڈالا۔ تمام اثاثہ اس راہ میں لٹا دیا گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام طائف تشریف لے گئے تو ان کے لیے سواری کے لیے کوئی جانور بھی نہ تھا۔

سردارانِ قریش نے جب اس تحریک کو شدت سے اُبھرتے ہُوئے اور جھوٹی قدروں کو مسمار ہوتے دیکھا تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حجاز کا حکمران بنانے کے لیے تیار ہو گئے اور کہا کہ ہم آپ کو اپنا فرماں روا بنالیں گے، ہم عرب کی حسین ترین عورت آپ کے نکاح میں دینے کیلئے تیار ہیں۔ ہم دولت کے ڈھیر آپ کے قدموں میں لگا دیں گے بشرطیکہ آپ اسلامی نظریۂ حیات کے پرچار سے باز آجائیں۔ مگر اس انسان نے جو تمام کائنات کی فلاح و بہبود کے لیے اٹھا تھا اور جو دونوں جہاں کی سعادتیں بنی نوع انسان کی جھولی میں ڈالنا چاہتا تھا، ان تمام پیش کشوں کو ٹھکرا دیا اور گالیاں اور پتھر کھاتے پر راضی ہو گیا۔

قریش اور عرب کے سرداروں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کہا:

"ہم تمہارے پاس کیسے آکر بیٹھیں، تمہاری مجلس میں ہر وقت غریب، مفلس اور نچلے طبقے کے لوگ بیٹھے رہتے ہیں۔ ان لوگوں کو اپنے پاس سے ہٹاؤ تو ہم آکر بیٹھیں"۔

مگر وہ انسان جو رنگ، نسل، خون اور خاک کے بتوں کو توڑنے کے لیے آیا تھا، اس نے ان سرداروں کی خاطر غریبوں کو دھتکارنے سے انکار کر دیا۔

اس تحریک کی اُبھری ہُوئی خصوصیت یہ ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے ملک، اپنی قوم، اپنے قبیلے اور اپنے خاندان کے مفاد کو بنی نوع انسان کے مفاد پر ترجیح نہیں دی۔ آپ ہر قسم کی کنبہ پروری اور اقربا نوازی سے برتر رہے۔ اسی بات سے دنیا والوں کو یقین دلایا کہ آپ تمام اقوام کے لیے سراپا رحمت بن کر آئے ہیں۔ اسی وجہ سے آپ کی آواز پر ہر قسم کے انسانوں نے لبیک کہا۔ اگر آپ اپنے گھرانے کی برتری کے لیے کام کرتے تو غیر ہاشمیوں کو کیا پڑی تھی کہ آپ کا ساتھ دیتے، اگر آپ کو یہ فکر لاحق ہوتی کہ قریش کی برتری اور اقتدار کو کسی طرح بچاؤں تو غیر قریشی عربوں کو کیا دلچسپی ہوسکتی تھی کہ وہ اس کام میں شریک ہوتے۔ اگر آپ عرب کا بول بالا کرنے کے لیے اُٹھتے تو بلال حبشیؓ، صہیب رومیؓ اور سلمان فارسیؓ کو کیا پڑی تھی کہ آپ کا ساتھ دیتے۔ وہ بات جس کی وجہ سے تمام بنی نوع انسان آپ کی طرف کھنچتے چلے آئے۔ وہ آپ کی بے لوث خدا پرستی تھی اور آپ کا تمام ذاتی، خاندانی اور نسلی مفاد اغراض سے بلند و برتر ہونا تھا۔

جب آپ نے یہ آواز بلند کیا کہ بلال حبشیؓ سردارانِ عرب سے افضل ہیں اور ہر طرح کی فضیلت اور شرف تقویٰ اور پرہیزگاری کی بنا پر ہے اور قریشی اور ہاشمی ہونے کی بنا پر تمہیں کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے تو قریش اور عرب کے سردار حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خون کے

پیاسے ہوگئے۔ آپ کے قتل کی سازشیں کرنے لگے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مکہ کو خیرباد کہنا پڑا۔ جب آپ مکہ سے جا رہے تھے تو آپ نے حضرت علیؓ سے کہا:

"علی! تم یہیں رہ جاؤ، یہ لوگ جو میرے قتل کے درپے ہیں، ان کی امانتیں میرے پاس ہیں۔ تم ان میں سے ایک ایک کی امانت لوٹا دینا۔"

حضور علیہ السلام اپنے جانی دشمنوں اور خون کے پیاسوں کی امانتیں بھی لوٹا دینے والے اور ہم سیاست کی بنیاد ہی غنڈہ گردی اور شُہدا پن پر قایم کرنے والے۔ ہمیں ان سے کیا نسبت؟

جب مکہ فتح ہُوا تو آپ کی راہ میں کانٹے بچھانے والے آپ پر اوجھڑیاں پھینکنے والے، آپ کے قتل کی سازشیں کرنے والے سب سر جھکائے ہُوئے کھڑے تھے۔ آپ نے فرمایا:

"جاؤ میں تم سب کو رہا کرتا ہُوں، آج کے دن کے بعد تم پر کوئی ملامت نہیں ہے، آج بات ختم ہوگئی اور میں نے تم سب کو معاف کیا۔"

بات بات پر اپنے مسلمان بھائیوں سے یہ کہنا کہ "میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا" صد درجہ غیر اسلامی بات ہے۔ یہ فقرہ ابوجہل اور ابولہب کہتے تھے کہ ہم تمہیں کبھی معاف نہیں کریں گے۔ پس ہر وُہ شخص جو بار بار مسلمان بھائیوں سے یہ کہتا ہے کہ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔ ابوجہل اور ابولہب کی رُوح اس کے اندر حلول کر گئی ہے۔

منتشر اجزاء کو مرتّب کیا محمدی انقلاب کی ایک اُبھری ہُوئی خصوصیت یہ ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے معاشرے کے منتشر اجزا کو مرتب اور مربوط کیا اور اسے باطل سے ٹکرا دیا۔ انہوں نے یہ نہیں کیا کہ جوانوں کو بوڑھوں سے ٹکرا دیا ہو اور (GENERATION GAP) کا سوال پیدا کر دیا ہو۔ انہوں نے یہ نہیں کیا کہ مزدوروں کو صنعت کاروں سے اور کسانوں کو زمینداروں سے ٹکرا دیا ہو اور معاشرے کے مختلف طبقوں کو آپس میں گتھم گتھا کر دیا ہو، جیسا کہ کارل مارکس اور لینن نے کیا۔ آپ نے جوانوں سے کہا کہ بوڑھوں کے سفید بالوں کا خیال کرو۔ آپ نے بوڑھوں سے کہا کہ بچوں پر شفقت کرو۔ حضورؐ نے اپنا سب کچھ معاشرے کی فلاح و بہبود پر لگا دیا۔ اپنے قائد کے اس ایثار کو دیکھ کر معاشرے کے متموّل افراد کے اندر غریب پروری کا جذبہ خود بخود اُبھرنے لگا۔ اور کسی جبر اور تشدد کے بغیر، بلکہ شدید رضا و رغبت کے ساتھ معاشرے کی خوشحالی پر بے دریغ خرچ کرنے لگے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے امیروں سے کہا کہ تمہارے پاس جو کچھ مال و منال ہے، سب اللہ کا بخشا ہُوا ہے اور غریبوں کا تمہارے مال میں حق ہے ان کا حق ان کو لوٹا دو۔ اور یُوں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے معاشرے کے مختلف طبقوں کو باہم متحد اور منظم کیا اور حق کی حمایت میں باطل کے خلاف سب کو صف آراء کر دیا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

"خدا کی قسم دعوتِ اسلام کا جو کام شروع ہُوا ہے پایۂ تکمیل کو پہنچ کر رہے گا، یہاں تک کہ صنعا یمن سے حضر موت تک مسافر چلا جائے گا اور اسے کسی کا کھٹکا نہ ہوگا۔"

عدی بن حاتمؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا: "لتفتحن کنوز الکسریٰ"۔ وہ وقت یقینی طور پر آنے والا ہے جب کسریٰ کے خزانے

تمہارے قدموں پر ڈھیر ہوں گے۔ حضورؐ نے جب یہ الفاظ فرمائے، مسلمانوں کی بیچارگی کا یہ حال تھا کہ خود ان کے وطن کے دروازے بھی ان پر بند تھے، قیصر و کسریٰ کے خزانوں کا نام سُن کر متعجب ہُوئے۔ عدی بن حاتمؓ ضبط نہ کر سکے۔ حیران ہو کر پُوچھا: کون کسریٰ؟ کسریٰ بن ہرمز شہنشاہِ ایران؟" فرمایا: ہاں، وہی اور کون۔ آپ نے فرمایا: عدی!

یعنی عدی تمہیں اس پر تعجب کیوں ہے، اگر تم زندہ رہے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے کہ اسلامی معاشرے کی خوشحالی کا یہ حال ہوگا کہ ایک شخص مٹھی بھر سونا لے کر صدقہ و خیرات کے لیے نکلے گا مگر کوئی لینے والا نہ ہوگا، سب آسُودہ حال ہوں گے۔ عدیؓ کہتے ہیں کہ میں زندہ رہا اور میں ان لوگوں میں سے ہُوں جنہوں نے فتحِ ایران کے بعد کسریٰ کا خزانہ کھولا اور صحابہؓ نے اسلامی معاشرے کی خوشحالی کا وہ دور دیکھا کہ صدقہ و خیرات لینے والا کوئی شخص نہ ملتا تھا۔

محمدؐی انقلاب امن اور سلامتی، آسُودگی اور خوشحالی کا ضامن ہے۔ ایک لمحے کے لیے غور کیجئے کہ اپنے آقاؐ سے بے وفائی کر کے ہم نے کیا پایا ہے، چوریاں اور ڈکیتیاں جن کے تذکرے سے آدھا اخبار بھرا ہُوا ہوتا ہے۔ افلاس، بھُوک، چیتھڑے اور دھجیاں۔

ساتھیو! وقت کا سب سے اہم تقاضا یہ ہے کہ اس ملک میں محمدؐی انقلاب برپا کرنے کے لیے ہم اپنا مال، اپنا وقت، اپنی توانائی، اپنی تمام جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کو کھپا دیں۔ نتائج تو اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں۔ تمام عواقب اور نتائج سے بے پروا ہو کر اس عظیم مقصد کے لیے جسم و جاں کی بازی لگا دینا چاہیے۔ اس انقلاب کو برپا کرنے کے لیے اگر میں اور آپ سب پھانسیوں پر بھی لٹک جائیں تو میں یہ سمجھوں گا کہ ہماری زندگیاں کام آگئی ہیں۔ ؎

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے، اس جان کی تو کوئی بات نہیں

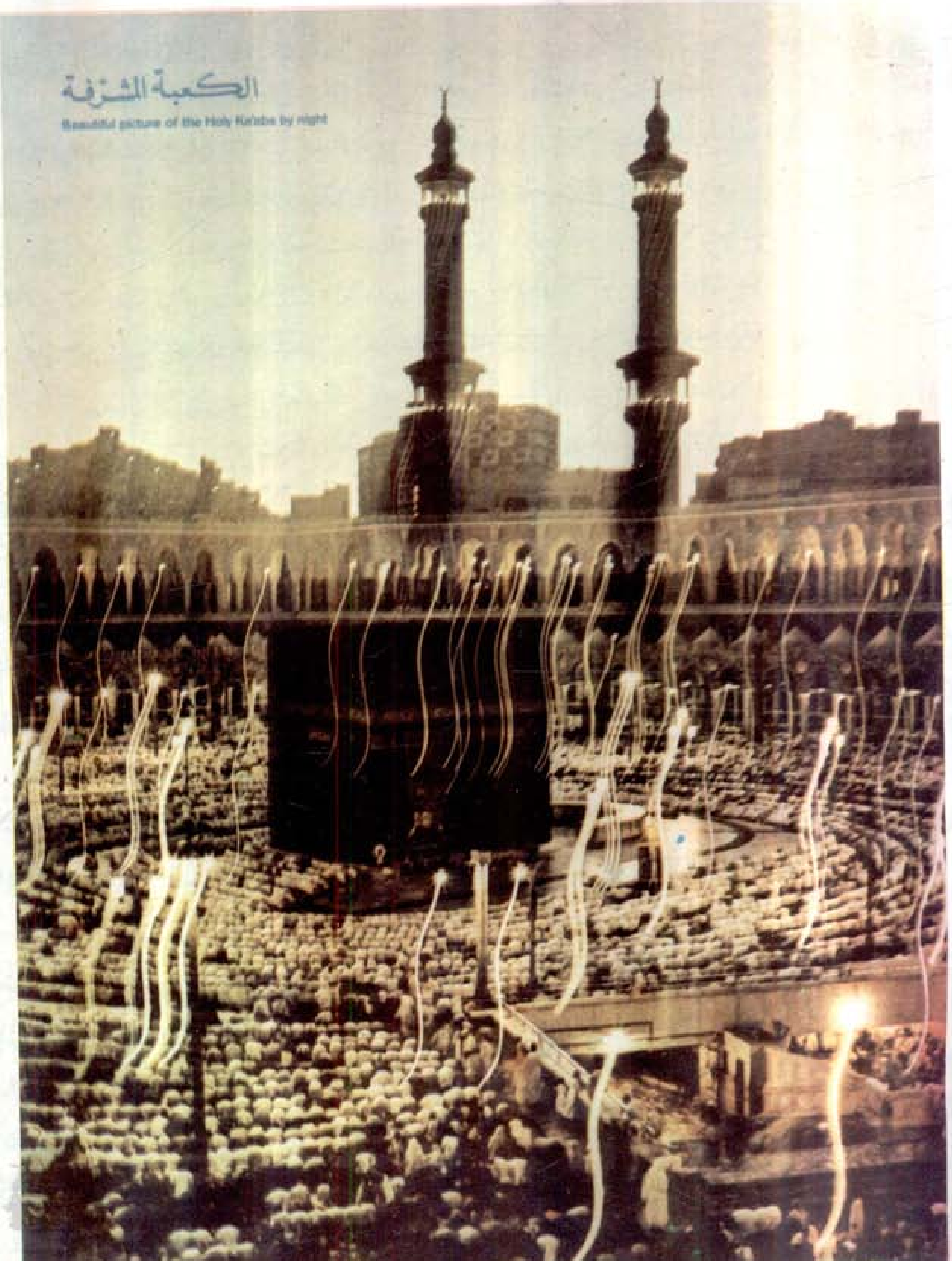
انقلابِ محمدیؐ

عبدالواحد ہالے پوتا

سلسلۂ رسالت اور بعثتِ انبیاءؑ کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انبیاءؑ جو صاحبِ کتاب یا حاملِ صحیفہ ہوئے اور جن کی اپنی قومیں تھیں، جن کی تعلیم و تربیت کے لیے وہ مبعوث ہوئے۔ ایسے انبیاءؑ کی آمد نے ان اقوام کی کایا پلٹ دی اور ان کی زندگیوں میں ایک عظیم انقلاب آگیا۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کی آمد سے پہلے کے دور اور آمد کے بعد کے دور کا اگر تقابلی مطالعہ کریں تو دونوں میں بڑا فرق پائیں گے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے بعد کے دور میں یہودیوں کی زندگی کا ان کی آمد سے پہلے کی زندگی سے مقابلہ کریں تو معلوم ہوگا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وجہ سے ان کی قوم کی تاریخ میں نمایاں تبدیلی ہوئی۔ ان کے عقائد میں انقلاب آگیا۔ ان کے رہنے سہنے کے طریقوں میں انقلاب پیدا ہوا۔ زندگی کے متعلق ان کے نقطۂ نظر میں انقلاب رونما ہوا۔ اسی طرح ایک نبی کا دور دوسرے نبی کے دور سے مختلف معلوم ہوگا۔ حضرت عیسیٰؑ کا دور حضرت موسیٰؑ کے دور سے الگ اور جداگانہ نظر آئے گا۔ ان کے دور میں بہت سی ایسی اہم خصوصیات نظر آئیں گی جو حضرت موسیٰؑ کے دور میں نہیں تھیں۔

حضرت موسیٰؑ کی تعلیمات کی وجہ سے یہودیوں کی زندگی میں ایک اجتماعی اور قومی نظام مرتب ہو چکا تھا، لیکن ان میں ایک طرف قومی عصبیت پیدا ہو چکی تھی تو دوسری طرف دنیوی اسبابِ عیش اور مادی فوائد کی جستجو میں انہماک بھی حد سے گزر چکا تھا، روحانی تقاضوں کے مقابلہ میں دنیوی زندگی کی ضروریات ان کے لیے زیادہ پُرکشش تھیں۔ جن کے باعث ان میں وہ تمام خرابیاں پیدا ہو گئیں جو مادہ پرستی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی اصلاح کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھیجا۔ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم سے ان کی زندگیوں میں ایک انقلاب پیدا ہوا۔ لوگوں کی توجہ دنیوی اور مادی زندگی میں انہماک سے ہٹ کر اُخروی اور روحانی زندگی کی طرف ہو گئی۔ آخرت کا تصور ان کی دنیوی زندگی کے رہن سہن پر بھی اثر انداز ہوا۔ رفتہ رفتہ لوگ ترکِ دنیا کر کے اپنے شب و روز کو آخرت کے لیے وقف کرنے کو اعلیٰ دینی نصب العین سمجھنے لگے۔ رہبانیت کو فروغ ہوا۔ حضرت عیسیٰؑ کی اتباع کرنے والوں میں خانقاہوں کی تعداد بڑھنے لگی جہاں دیندار لوگ دنیا سے منہ موڑ کر اپنی عمریں گذار دیتے تھے۔ اس دور میں خانقاہوں میں بیٹھنا، سادھوؤں کی طرح ایک جگہ بیٹھ کر سادھنا کرنا اور جسم کو فاقہ کشی اور دوسرے طریقوں سے اذیت دینا، یہ اور اس قسم کے دوسرے اعمال بہترین روحانی کام سمجھے جاتے تھے۔ ترکِ دنیا اور گوشہ نشینی سے تعلق رکھنے والی مختلف اقدار زندگی کی اہم قدریں شمار ہونے لگیں اور ان سے وابستہ لوگ سب سے زیادہ قابلِ عزت اور لائقِ احترام ہستیاں تصور کیے جانے لگے۔



خانہ کعبہ کا ایک منظر

اس کے بعد جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ظہور ہوا تو دنیا میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ حضورؐ کی بعثت سے ایک نئی صبح طلوع ہوئی۔ سارے جہان میں ایک نئی روشنی لمعہ افگن ہوئی۔ "سراج اور قمر منیر" کی آمد سے ساکنانِ ارض کے شب و روز کی تیرگی کافور ہو گئی۔ کائناتِ ارضی میں اس تاریخ کا عظیم ترین انقلاب رُونما ہوا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دینِ اسلام دنیائے موجود کے تمام مذہبی نقطہ ہائے نظر پر حاوی ہو گیا۔ ماقبل اسلام کی ایسی اقدار جو اس بین الاقوامی دستورِ حیات اور عالمِ انسانیت میں وحدت پیدا کرنے والے تاریخی انقلاب سے متصادم تھیں سب کی سب کم عیار ٹھہریں۔ بغرض تاریخِ انسانی کا نیا دور شروع ہوا جسے دورِ مصطفوی کہا جاتا ہے۔ اس دور میں نورِ مصطفوی کی شعاعیں مشرق سے مغرب تک اور چین سے یورپ تک بلکہ دنیا کے ہر خطہ میں منعکس ہوئیں جن کے اثرات کے نتیجہ میں نئے علوم و فنون، طبیعیاتی سائنس اور جدید فلسفہ الٰہیات وجود میں آیا جس سے عالمِ بشریت ابھی تک ناآشنا تھا۔ اس کے ساتھ ہی انسان کی اجتماعی زندگی، مادی ترقی اور رُوحانی ارتقا کی راہیں کھل گئیں جو تہذیب و تمدن کی ہمہ جہتی نشو و نما کے لیے محرک ثابت ہوئیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے انقلابی منشور قرآن کریم کی تعلیمات سے ہمہ گیر تبدیلیوں کا آغاز ہوا۔ ارشادِ خداوندی "اقرأ" (پڑھ) سے علم و فن کے دروازے کھل گئے تفکر و تدبر کی آیات نے سائنس اور دانائی و حکمت کو فروغ بخشا۔ "فک رقبة" نے غلامی کی زنجیریں کاٹ دیں۔ غلاموں کو آزادی ملی اور انسان نے حریت و استقلال کا سبق سیکھا۔ توحید کی تعلیم سے وحدتِ انسانی اخوت، مساوات، ہمدردی، بھائی چارہ اور بین الاقوامیت کے تصورات وجود میں آئے۔ قیصر و کسریٰ کو بھیجے گئے مکتوبات میں "ھلک کسری فلا کسری بعدہ۔ ھلک قیصر فلا قیصر بعدہ" کی پیشین گوئی کے بعد استبدادی حکومتوں کا دور ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

یہ نبی کریمؐ کی تعلیمات کا انقلاب آفریں اثر تھا جس کی وجہ سے ہزاروں برس سے قائم استبدادی حکومتوں کا یکلخت خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد اگر کہیں کہیں اکا دکا اس قسم کی حکومتیں رہ گئیں تو وہ برائے نام تھیں اور ان کی حیاتِ مستعار کے دن تھوڑے تھے۔

قرآن مجید کا ایک کلمہ "قم" (یاایھا المدثر قم فانذر) سے روحانی دنیا میں ایک انقلاب آ گیا جس کے بعد رہبانیت کی زندگی بسر کرنے یا گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر سادھنا کرنے کی اہمیت ختم ہو گئی اور اس کی جگہ ایسے کاموں نے لے لی جن میں دین و دنیا دونوں کی بھلائی موجود ہو۔ کسبِ حلال، خدمتِ خلق اور رفاہِ عام کے کام کرنا، لوگوں کو صحیح تعلیم سے آراستہ کرنا، حق کی تائید و حمایت میں جد و جہد کرنا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض ادا کرنا، لوگوں کو تعلق باللہ اور تقرب الی اللہ کے مفہوم سے آشنا کرنا، عزلت میں بیٹھنے کی بجائے اُٹھ کر زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کے لیے کوشش کرنا مطلب یہ کہ بیک وقت مادی اور دینی، جسمانی اور روحانی، دنیوی اور اخروی زندگی کی صلاح و فلاح کے لیے سعیٔ پیہم اور جہدِ مسلسل کو انسان کا منتہائے مقصود قرار دیا گیا۔ جس کی وجہ سے وہ پرانی قدریں بدل گئیں جو ہزارہا برس سے سادھوؤں، راہبوں اور جوگیوں کا شعار بنی ہوئی تھیں۔ اس نئے دور میں زندگی کو مذہبی (SACRED) اور لا مذہبی (SECULAR) میں تقسیم کرنے

کا تصور بھی بے معنی ٹھہرا۔ اس لیے کہ مصطفوی تعلیم کے نور سے زندگی کا ہر پہلو مکمل طور پر روشن ہوتا ہے۔ اس میں مادی خوشحالی، روحانی ترقی سے وابستہ رہتی ہے اور روحانی ترقی مادی زندگی کو اُجاگر کرتی ہے۔

نظامِ مصطفےٰ میں یہ جامعیت اسی لیے ہے کہ حضورِ اکرمؐ کی شخصیت جامع کمالات ہے۔ قرآن کریم کی تعلیمات جو آپؐ پر نازل ہوئیں وہ انسان کی دنیوی و اخروی، انفرادی و اجتماعی زندگی نیز زمانہ حال و مستقبل سب کے لیے جامع اور مکمل ضابطۂ حیات اور کامل نمونہ ہے، جس کے مقابلہ میں دنیا کا کوئی دوسرا نظام یا نظریۂ حیات نہیں لایا جا سکتا۔ قرآن حکیم کا یہ چیلنج فاتوا بسورۃ من مثلہ چودہ سو سال سے چلا آ رہا ہے اور آج تک اس کا جواب نہیں دیا جا سکا۔

بحیثیت خاتم النبیین حضورِ اکرمؐ کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ بین الاقوامی سطح پر پوری انسانیت کے لیے ایک ایسا دستورِ زندگی اور اجتماعی نظام مرتب کیا جائے جو انسانی فطرت کے عین مطابق ہو اور جس کے ذریعے فرد، معاشرہ اور اقوام عروج اور ترقی کی منزلیں طے کر سکیں۔ یہ جامع دستور کامل دین اور مکمل نظام جو ہر خطۂ زمین اور ہر زمانہ کے لیے کارآمد اور قابلِ عمل ہے اور جس کو اختیار کئے بغیر انسانیت کی ترقی و خوشحالی ممکن نہیں حضورِ اکرمؐ کے واسطے سے عطا کیا گیا اور ظاہر ہے کہ ایسا دین کسی ایسے ہی پیغمبر پر اتارا جا سکتا تھا جو جامع، کامل اور مکمل شخصیت کا مالک ہو۔

اس جامع کمالات اور بے مثال شخصیّت کا تعارف کرانے کے لیے شاہ ولی اللہ دہلوی لکھتے ہیں :۔

حضورِ اکرمؐ کی شخصیّت اور مقامِ نبوت کا اندازہ لگانے کے لیے مناسب یہ ہوگا کہ آپؐ کی ایک شخصیّت میں چار قسم کی شخصیّتوں کا تصوّر کریں جو تنِ واحد میں جمع کر دی گئی ہیں (۱) ایک شخصیت بادشاہِ عادل کی جو بالطبع شاہ عالم ہو اور جس کے اندر اس قدر جذب کی کیفیت ہو کہ اس کے پرتو سے لوگوں میں اتحاد و اتفاق روز بروز ترقی پذیر ہو اور لوگوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے ساتھ یگانگت، اُلفت اور موانست پیدا ہو۔ اس وصف کی طرف قرآن کریم نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔ الف بین قلوبھم لو انفقت مافی الارض جمیعا ما الفت بین قلوبھم۔ اور اس نے ان کے دلوں کو جوڑ دیا۔ اگر تم دنیا جہان کی دولت صَرف کرتے تو بھی ان کے دلوں کو نہ جوڑ سکتے (۲) دوسری شخصیّت حکیم، مفکّر اور مدبّر کی ہے۔ یہ صفت بھی حضورِ اکرمؐ کی شخصیّت میں بدرجۂ کمال پائی جاتی ہے جس سے حکمت کی تعلیم، علم الاخلاق، تدبیرِ منزل اور سیاست مدن کے فیوض صادر ہوتے ہیں۔ اس صفت کی طرف ان الفاظ میں اشارہ ہے۔ یؤتی الحکمۃ من یشاء ومن یؤت الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا۔ اللہ جس کو چاہتا ہے حکمت دیتا ہے اور جس کو حکمت دی گئی اُسے بڑی دولت دی گئی (۳) تیسری شخصیّت عارفِ کامل کی ہے جو روحانیت اور تزکیہ قلب و تہذیب نفس کے طریقوں کو سکھاتا ہے اور جس کی کرامات اور خوارق ثابت ہوتے ہیں اور جس کے روحانی ارشادات اور اثرِ صحبت سے گم گشتگانِ راہ ہدایت پاتے ہیں۔ اس صفت کی طرف آیت "ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ" میں اشارہ کیا گیا ہے (۴) چوتھی شخصیت جبرائیلیت کی ہے جس میں تعلق باللہ، روحانی اور الٰہی علوم اخذ کرنے کے لیے واسطہ بنا' ان علوم کو انسانیت کی طرف منتقل کرنا، اور جو علوم ملأ اعلیٰ سے اس کے قلب و دماغ پر القا ہوں، ان کو بہ سہولت جذب کرنا

شامل ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ ستودہ صفات بیک وقت ان چاروں شخصیتوں کی جامع تھی اور یہ آپ کی اس جامعیت کا ہی فیضان تھا کہ آپؐ نے ایک ایسی قوم کو جو آگ کے کنارے کھڑی تھی، نفاق اور ابتری کا شکار تھی، باہمی لڑائی جھگڑوں میں جس کی توانئیں صرف ہو رہی تھیں اور جو خود اپنے محسن کی ایذا رسانی کے درپے تھی، ایسی قوم کو آپؐ کی نگاہِ کیمیا اثر نے ایک متحد و متفق اُمّت میں تبدیل کر دیا جس نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا، فتوحات حاصل کیں، کفّار کو شکست دی، جاہلیت کو مٹایا، کفر و شرک اور ظلم و ستم کا خاتمہ کیا، علم کی روشنی پھیلائی، اخلاق مفاسد کا قلع قمع کیا، بغض و عناد، حقد و حسد، عداوت اور کینہ جیسے امراض کا علاج کیا۔ جس کے بعد دینِ حق کے پیرو اس طرح باہم شیر و شکر ہو گئے کہ اس کے آگے خون کے رشتے بھی ہیچ تھے، اللہ تعالیٰ نے اس کیفیت کو اُمّتِ مسلمہ پر اپنا خاص احسان بتایا ہے۔" واذكروا نعمة الله عليكم اذ كنتم اعداء فالف بين قلوبكم فاصبحتم بنعمته اخوانا" اور اس اُمّت نے بعد میں بھی یہ مشن جاری رکھا اور ان کی کوششوں سے علوم و فنون، سائنس اور تہذیب و تمدن کا کارواں آگے بڑھتا رہا۔

تاریخِ انسانی کا یہ ایک ایسا انقلاب ہے جس کی نظیر نہ ماضی میں تلاش کی جا سکتی ہے اور نہ آئندہ کبھی دنیا پیش کر سکے گی۔ اس لیے کہ دُنیا میں اب کسی ایسی شخصیت کا ظہور نہیں ہوگا جو ان صفات کی حامل ہو، جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں جمع کر دی گئی تھیں، البتہ آپؐ کے اسوہ کی پیروی کر کے آئندہ بھی بقدر سعی و کوشش اس قسم کے نتائج حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

آنحضرتؐ کا اسلوبِ دعوت و ارشاد

مولانا محمد حنیف ندوی

آنحضرتؐ نے جس طرح کہ قرآن حکیم تبدریج نازل ہوتا رہا، اسی طرح تعلیم و ارشاد میں بھی تدریج سے کام لیا اور تئیس برسوں میں برابر لوگوں تک اس کے پیغام کو پہنچاتے رہے۔ یہی نہیں، آپ نے عملاً امت کی باقاعدہ تربیت کی، اُن کے اخلاق کو سنوارا، عبادات و رسوم کی اصلاح کی اور ان تمام باتوں کی تشریح و وضاحت کی جن کا تعلق انسان کی انفرادی، اجتماعی اور سیاسی و روحانی زندگی سے ہو سکتا ہے۔ آپ اُٹھتے، بیٹھتے، سفر و حضر، صلح و جنگ، ہر حالت میں قرآن حکیم کی عملی تطبیق میں کوشاں رہے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قرآنِ حکیم کے ساتھ احادیث و سنن کا ذخیرہ بھی جمع ہوتا رہا اور ترتیب پاتا رہا۔

اوّل اوّل آپ نے دارالارقم کو تعلیم و ارشاد کا مرکز قرار دیا۔ اس کے بعد مسجد کو یہ اہمیت حاصل ہوئی کہ یہاں ہر نوع کے معاملات طے کیے جائیں اور مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا جائے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ آپ کی مبلغانہ کوششیں صرف مساجد ہی تک محدود ہو کر رہ گئی تھیں۔ آپ کو جب بھی اور جہاں بھی احکام کی تشریح و توضیح کا موقع میسر آتا۔ اس سے فائدہ اٹھاتے اور مناسب ہدایات دیتے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا کہنا ہے :

انما کانوا اذا صلوا الغداة قعدوا حلقا حلقا یقرء ون القران ویتعلمون الفرائض والسنن۔

صحابہ کی یہ عادت تھی کہ صبح کی نماز کے بعد مختلف حلقوں اور دائروں میں منقسم ہو جاتے اور اپنے اپنے حلقے اور دائرے میں قرآن پڑھتے، اور آنحضرتؐ سے فرائض و سنن کی تعلیم حاصل کرتے۔

جس کے یہ معنی ہیں کہ آنحضرتؐ صحابہ کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں وقتاً فوقتاً ایسی علمی مجالس کا اہتمام بھی فرماتے جن سے استفادہ کر کے اس لائق ہو جاتے کہ اپنی زندگیوں کو اسلام کے عملی سانچوں میں ڈھال سکیں۔ ان علمی مجالس میں عورتوں کو بھی شریک کیا جاتا، جیسا کہ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ آپ نے ان کے لیے خود ان کی خواہش پر ایک مقام اور وقت کا تعین فرمایا اور کہا کہ تم فلاں گھر پہنچ جاؤ، میں بھی وہاں آ جاؤں گا۔ چنانچہ آپ وقت مقررہ پر تشریف لائے اور ان کو وعظ و نصیحت سے نوازا۔

آپ کے اندازِ وعظ و نصیحت کی کچھ خصوصیات تھیں، مثلاً یہ کہ :

۱۔ آپ اس بات کو ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھتے کہ صحابہ کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں مناسب اوقات کا انتظار کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ کب اور کس وقت یہ نصائح کو صدقِ دل سے قبول کر سکتے ہیں۔

ابن مسعود کا کہنا ہے :

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یتخوّلنا بالموعظة فی الایام کراھیة السّامة علینا۔

یعنی آنحضرت وعظ و ارشاد میں تخول سے کام لیتے، تاکہ روزانہ اور ہر وقت کی نصیحت سے طبائع اکتا نہ جائیں۔

تعلیم و تربیت کا یہ ایسا انداز ہے جس کی اہمیت و افادیت کو اس دور کے بہت سے تربیتی اداروں نے اپنا لیا ہے اور اس حقیقت کو مان لیا ہے کہ تعلیم اسی وقت صحیح نتائج پیدا کر سکتی ہے جب طلبہ کی نفسیات کا خیال رکھا جائے اور دیکھا جائے کہ کب اور کس وقت اُن کا ذہن و قلب حاضر ہے اور اس لائق ہے کہ تعلیم و تربیت کے اصولوں سے صحیح معنوں میں بہرہ مند ہو سکے۔

۲۔ ہر شخص کی ذہنی سطح اور مدارج عقلی میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ آنحضرتؐ کا قاعدہ تھا کہ وہ دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں ہر شخص کی ذہنی سطح اور اس کے مدارج عقلی کا پورا پورا خیال رکھتے۔ حضری اور شہری لوگوں سے ان کے انداز و معیار کے مطابق گفتگو فرماتے اور بدوی سے اس کی ذہنیت کے مطابق بات کرتے۔ اس کی بہترین مثال ابوہریرہ کی اس روایت سے ملے گی جس میں بنی فزارۃ کے ایک شخص کا ذکر کیا ہے جو بدوی تھا، اُن کا کہنا ہے کہ یہ شخص آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ میرے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا ہے، جو سیاہ رنگ کا ہے۔ میں نے اُسے قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ کیونکہ ہم میاں بیوی میں کوئی بھی سیاہ رنگ کا نہیں ہے۔ آنحضرتؐ نے اس کی سمجھ اور پیشہ کے مطابق جواب مرحمت فرمایا۔ اس سے پوچھا:

هل لك من إبل — کیا تمہارے پاس کچھ اونٹ ہیں؟

اس نے کہا "جی ہاں"۔

آپ نے پھر دریافت فرمایا۔ "وہ کس رنگ کے ہیں؟"

اُس نے کہا "سرخ رنگ کے"۔

آپؐ نے اس پر سوال کیا کہ کیا ان میں کوئی اورق یعنی خاکستری رنگ کا یا کم سیاہ رنگ کا کوئی اونٹ بھی ہے"؟

اس نے کہا "ہاں ہے"۔

آنحضرتؐ نے فرمایا۔ "اب تم ہی بتاؤ کہ سرخ رنگ کے اونٹوں میں یہ سیاہی کیسے آگھسی"۔

اس نے اس کے جواب میں کہا "ممکن ہے اس کے نسب میں کوئی اونٹ خاکستری یا سیاہ رنگ کا ہو۔ اور اس کی جھلک ہو"۔

جب بات یہاں تک پہنچ چکی تو آپ نے یہ کہہ کر اس کے شبہے کو دور کر دیا:

وهذا عسى ان يكون نزعة عرق

کہ یہاں بھی معاملہ ایسا ہو سکتا ہے کہ یہ نسب کا کرشمہ کارفرما ہو اور اس میں تمہاری بیوی کا کوئی قصور نہ ہو۔

طبرانی کی روایت ہے کہ قریش کا ایک نوجوان جو حیوانیت کے جذبات سے مغلوب تھا۔ آنحضرتؐ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ مجھے زنا کی اجازت مرحمت فرمایئے۔ اس کا کہنا تھا کہ حاضرین اس پر لپکے اور اس گستاخی پر اس کو خوب ڈانٹا ڈپٹا۔ آپؐ نے یہ دیکھا تو فرمایا۔ اس سے تعرض نہ کرو۔ اس کو اپنے قریب بلا کر پوچھا:

اتحبه لامك —

"کیا تم اسے اپنی ماں کے لئے پسند کرو گے"؟

اُس نے کہا: "بخدا، ایسا نہیں ہو سکتا۔"

اس پر آپؐ نے فرمایا: "تو کیا تم چاہو گے کہ تمہاری بیٹی کے ساتھ کوئی شخص یہ سلوک روا رکھے۔"

اس نے جواب میں یہی کہا کہ "جی نہیں، میں اسے ہرگز پسند نہیں کرتا۔"

اسی طرح آپؐ نے اس کی دیگر رشتے دار خواتین کا ایک ایک کر کے ذکر کیا اور پوچھا، کہ کیا تم پسند کرو گے کہ ان سے یہ معاملہ روا رکھا جائے۔ اس نے ہر سوال کے جواب میں یہی رویہ اختیار کئے رکھا اور کہا کہ ہرگز نہیں۔ اس کے بعد آپؐ نے اس کی مغفرت کی دعا فرمائی۔ راوی کا کہنا ہے کہ تفہیم و تعلیم کے اس انداز سے یہ اس درجہ متاثر ہوا کہ اس کے بعد یہ ہمیشہ کے لیے تائب ہو گیا، اور پھر کبھی اس گناہ کی طرف ملتفت نہ ہوا۔

۳۔ آپؐ کی عادت مبارکہ کا یہ پہلو بھی قابلِ ذکر ہے کہ آپؐ جب بھی اپنے صحابہ کو کوئی دینی حکم سمجھانا چاہتے تو اس کو تین تین مرتبہ دہراتے، تاکہ بات نہ صرف دل کی گہرائیوں میں اتر جائے بلکہ لوحِ قلب پر مرتسم بھی ہو جائے۔

انس بن مالک سے روایت ہے:

ان النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کان اذا تکلم کلمۃ اعادھا ثلاثا حتی تفھم منہ۔	آنحضرتؐ جب کچھ ارشاد فرمانا چاہتے تو ہر ایک کلمہ کا تین تین دفعہ اعادہ کرتے تاکہ سننے والا اچھی طرح فہم و ادراک کی گرفت میں لے آئے۔

اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ آپؐ کا دائمی معمول تھا۔ آپؐ موقع اور مناسبت کا خیال رکھتے اور اسی انداز میں گفتگو فرماتے، جو مقام و محل کے موافق ہو۔

۴۔ آسانی اور تیسیر بھی ایک اصول تھا، جس کو آنحضرتؐ احکام و عبادات میں خصوصیت سے ملحوظ و مرعی رکھتے اور لوگوں کو اس بات سے باز رکھتے کہ احکام و مسائل میں تضییق یا تنگی سے کام لیں، یا عبادات میں تصنع اور سختی کو اپنائیں۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

عِلّمُوا ویسروا ولا تعسروا۔

لوگوں کو تعلیم دو اور آسانی پیدا کرو اور مشکلات سے پرہیز کرو۔

حضرت انسؓ سے مروی ہے:

خیر دینکم الیسر وخیر العبادۃ الفقہ۔

تمہارے دین کا وہ حصہ بہتر ہے جو زیادہ آسان اور سہل ہو، اور بہترین عبادت احکام کی سمجھ بوجھ ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ آپؐ اغلوطات سے منع فرمایا کرتے تھے۔ امام اوزاعی کا کہنا ہے کہ اس سے مقصود یہ تھا کہ لوگوں کے سامنے مشکل اور پیچیدہ مسائل نہ بیان کئے جائیں، جن سے وہ کچھ بھی اخذ نہ کر سکیں۔ بلکہ صرف وہی باتیں بیان کی جائیں جن کو وہ آسانی سے سمجھ بوجھ سکیں۔

۵- آں حضرتؐ گفتگو میں سامع کے لب و لہجہ کا بھی خیال رکھتے اور یہ بھی دیکھتے کہ اس کا تعلق کس قبیلے سے ہے اور اس قبیلے میں کس نوعیت کی زبان رائج ہے۔

خطیب بغدادی نے عاصم الاشعری سے روایت کی ہے کہ آپؐ نے اس کو مخاطب فرمایا:

لیس من امبر امصیام فی امسفر اس میں اشعریین کی اس عادت کو ملحوظ رکھا کہ یہ اکثر 'لام' کو 'میم' کے ساتھ بدل دیتے ہیں۔ اس کو فصیح عربی میں اگر ادا کریں تو یوں کہا جا سکتا ہے:

لیس من البر الصیام فی السفر کہ سفر کے دوران روزہ رکھنا نیکی نہیں۔

اس طرزِ تخاطب سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ اگرچہ افصح العرب تھے۔ اور فصیح ترین زبان میں گفتگو فرماتے تھے تاہم تیسیر، آسانی اور تفہیم کو ہر شئی سے مقدم جانتے تھے۔

بندگی کا انقلابی تصوّر

عبد الرحمٰن عزام بک

ہم یہاں پر رسولُ اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی عبادت پر روشنی ڈالیں گے۔ آپؐ کی طبع فیاض میں یہ صفت حد درجہ روشن تھی۔ نماز آپؐ کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور نفس کی طمانیت تھی، آپ اگر ان عبادت گزاروں میں سے ہوتے جنہوں نے رہبانیت اختیار کر کے دنیا سے قطع تعلق کر لیا یا ان صوفیا میں سے ہوتے جنہوں نے دُنیا کی تمام لذتوں کو خیر باد کہہ کر گوشہ نشینی اختیار کر لی، تو آپؐ کی عبادت کوئی نئی چیز نہ ہوتی۔ ایک مؤرخ اور ناقد آنحضرتؐ کی زندگی میں خاص طور سے جس چیز پر نگاہ ڈالتا ہے، وہ یہ ہے کہ دنیا کے امُور کی انجام دہی اور زندگی کی دیگر ضروریات و علائق سے وابستہ ہو کر دینی فرائض بالخصوص انتہا درجہ کی عبادت کی ادائیگی نہایت ہی تعجب خیز اور حیرت انگیز اَمر ہے، کیونکہ دین و دنیا کو ہم آہنگی کے ساتھ گزارنا انتہائی مشکل چیز ہے، ایک طرف آنحضرتؐ اپنے اہل و عیال خاندان اور مسکینوں کی تربیت و سرپرستی کرتے ہیں، تو دوسری جانب اپنی اُمت کے اہم امُور میں مشغول نظر آتے ہیں، سیاسی و حکومتی مہمات انجام دیتے ہیں، بادشاہوں کے پاس اپنے سفیر روانہ کرتے ہیں اور ان کو اسلام کی دعوت دیتے ہیں،

آپ کی خدمت میں وفد آتے ہیں۔ آپ ان کا استقبال کرتے ہیں، فوج تیار کرتے اور بذاتِ خود ان کی قیادت فرماتے ہیں، غیر قوموں اور سلطنتوں سے جنگ کرتے ہیں، فتح و کامرانی کی تدابیر سوچتے اور شکست خوردگی کے اسباب کا انسداد کرتے ہیں، گورنروں کا تقرر کرتے اور بیت المال کی نگرانی کرتے ہیں، اموال خود اپنے ہاتھ سے اپنے روبرو تقسیم فرماتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ارشاد فرماتے ہیں۔ اگر میں خود عدل و انصاف نہ کروں، تو دوسرا کون کرے گا؟ دینِ حق کی تبلیغ کرتے، وحی و رسالت کے اسرار و رموز لوگوں کو سمجھاتے ہیں، اخبار و سنن کی تشریح اور اللہ کے احکام کی توضیح فرماتے ہیں۔

الغرض آپ نے اپنے ہر شعبۂ حیات میں اپنا جو مثالی کردار پیش کیا ہے۔ وہ دنیا کے بہادروں کے لیے سبق آموز ہے، اِن تمام مصروفیتوں اور مشاغل کے باوجود آنحضرتؐ رات دن عبادت میں محو نظر آتے ہیں، ان عابدوں اور زاہدوں سے بڑھ کر اللہ کی محبت میں سرشار تھے جو پہاڑوں کی چوٹیوں اور جنگلوں کے گوشوں میں بیٹھ کر اللہ کے دیدار کی طلب کرتے رہتے ہیں۔

بطلِ اعظم کے اس طرح سے دین و دُنیا کو ہم آہنگ کرنے کی مثال انسانی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ آپ نے اپنے دن کا ایک حصّہ عبادت کے لیے ایک حِصّہ لوگوں کے لیے اور ایک حصّہ اپنے گھر والوں کے لیے تقسیم کر رکھا تھا، لوگوں کی خدمت گزاری میں اگر زیادہ وقت صرف ہو جاتا، تو اپنے گھر کے مقررہ اَوقات میں کمی واقع ہو جاتی۔ لیکن آپ اوقات عبادت کی ہمیشہ حفاظت و نگہداشت فرماتے، اور اپنی تمام زندگی اسی مداومت اور پابندی میں گزاری، جو آپ کے دوستوں اور دشمنوں سب کے لیے موجبِ حیرت ہے؛

آپ توجّہ خالص اور سعی پیہم کا مجسمہ تھے، جب عبادت کی طرف رجوع ہوتے، تو اپنی ساری توجّہ اسی طرف مرتکز کر دیتے اور جب

کسی کام کا ارادہ فرماتے، تو اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے بغیر لمحہ بھر چین نہ لیتے مختلف قوموں اور ملتوں کے مؤرخین کا اس پر اجماع ہے، کہ آپ جو کام بھی کرتے اپنا دل و دماغ اسی میں صرف کر دیتے' آپ کی یہ بلند و برتر صفت لوگوں سے میل جول رکھنے کے وقت زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔ جب آپ کسی سے گفتگو فرماتے اپنا سارا دھیان اسی طرف مرکوز کر دیتے۔ جب تک خود مخاطب قطع کلام نہ کر لیتا' آپ اس کے سلسلۂ گفتگو کو منقطع نہ کرتے۔

یہی جد و جہد ہر نفس انسانی کے لیے ضروری ہے' دین و دنیا کے تمام شعبوں میں فلاح و بہبودی کا راز اسی میں مضمر ہے' بطلِ اعظم اپنے ان پیرووں کے لیے اس کا عملی نمونہ تھے' جنھوں نے اپنی زندگی کا نصب العین اور لائحہ عمل اسی جد و جہد کو قرار دیا' جس کی بنا پر وہ حکومتوں کے بادشاہ قوموں کے سیاست داں اور زمانے کی سربرآوردہ ہستیاں کہلائے' اُسی کا نتیجہ تھا کہ رسول اکرمؐ نے بکریوں اور اونٹوں کے چرانے والوں' تجارت و زراعت پیشہ لوگوں' دیہقانوں اور تہذیب سے ناآشنا انسانوں کو قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کا مالک بنا دیا' یہ اس قابل ہو گئے کہ دُنیا کے حکمرانوں کو عدل و انصاف اور اخوت و مساوات کا سبق دے سکیں۔

آنحضرتؐ عہد طفولیت ہی سے فطری طور پر عبادت کی طرف مائل تھے۔ اسی میں آپ اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک اور روح کا سکون پاتے تھے' رسالت کے پیشتر مہینہ بھر مکہ کے باہر غارِ حرا میں خلوت گزیں ہو کر اللہ کی عبادت میں سرشار ہو جاتے' ایک شاعر نے کیا ہی بلیغ انداز میں کہا ہے:

"آپ کو بچپن ہی سے عبادت اور گوشہ نشینی سے محبت تھی' اور یہی شریفوں اور نیک طبع لوگوں کی عادت ہے' جب آپ کے دل میں ہدایت کا چشمہ پھوٹ نکلا' تو اسی چشمۂ نور سے آپ کے اعضاء نے سیرابی حاصل کی۔"

فقہاء اور ماہرین اصول و شرائع نے اس امر میں اختلاف کیا ہے کہ آپ کی عبادت کی صورت نوعیہ کیا تھی اور آپ کس شریعت کے پابند ہو کر عبادت کرتے تھے۔ اس کا طریقہ کیا تھا؟ اس اختلاف کی وجہ سے ان کے تمام اقوال باہم مشتبہ نظر آتے ہیں' لیکن یہ امر تاریخ سے پلۂ ثبوت و تحقیق کو پہنچ چکا ہے کہ آپ کی عبادت اس طرح تھی کہ آپ خالق کائنات میں غور و فکر فرمایا کرتے اور موجودات عالم کو دیکھ کر وحدانیت اور خالقیت پر استدلال کیا کرتے تھے' لیکن تاریخ سے کہیں یہ معلوم نہ ہو سکا' کہ آپ اگلی شرائع و ادیان کے طریقہ سے عبادت کرتے تھے۔ آپ نے عہدِ رسالت اور رشد و ہدایت سے سرفراز ہونے کے پیشتر اس نظریۂ توحید کی تردید کی' جو گذشتہ ادیان و مذاہب میں گھڑ لیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ عربوں کے بعض عبادات مثلاً حج وغیرہ کے رائج شدہ طریقوں کو مذموم ٹھہرایا اور شعائر حج کی ادائیگی میں اپنے قبیلہ کے طریقے اختیار نہیں کیے' بلکہ عرفہ میں ٹھہرنے اور افاضہ کرنے میں دیگر لوگوں کا اتباع کیا' قریش کی ان اکثر و بیشتر چیزوں کو اپنے اوپر حرام کر لیا۔ جن کو وہ جاہلیت میں حلال سمجھتے تھے' آپ کی عقل سلیم نے جس کو صحیح سمجھا' اسی کی پیروی کی' ہمیشہ طالب حق رہے' آپ کی عبادت محض غور و فکر اور ربوبیت میں تدبر پر منحصر تھی' آخر کار آپ کا سینہ ایمان و یقین کی تجلیات سے منور ہو جاتا ہے۔

وکذالک اوحینا الیک روحا من امرنا	اسی طرح بھیجی ہم نے تیری طرف ہمارے امر کی روح تو
ماکنت تدری ما الکتاب ولا الایمان۔	نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا۔

ووجدک ضالا فھدیٰ اس نے تجھے محبت میں خود رفتہ پایا تو ہدایت کی' جب آپ کو ہدایت کا نور حاصل ہو گیا' تو آپ نے

نماز پڑھنی شروع کر دی۔ آپ اور حضرت علیؓ مکہ کی گھاٹیوں میں جاتے اور خفیہ طور پر نماز پڑھتے اور شام کے وقت واپس آجاتے۔ آنحضرتؐ کا دل نورِ ہدایت سے منور ہوگیا، تو آپؐ نے اللہ سے مسلسل ربط و تعلق پیدا کر لیا۔ اور آپؐ کا نفس خدا کی محبت میں سرشار ہوگیا، ہم بلاخوف تردید یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ آپؐ اپنی حرکت و سکون، خواب و بیداری غرض کہ ہر حال میں اللہ ہی سے تعلق رکھتے تھے، ذاتِ خداوندی میں اس درجہ انہماک تھا، کہ اپنے خالق کے روبرو اتنی دیر تک کھڑے ہوتے کہ آپؐ کے پاؤں متورم ہو جاتے۔

مغیرہ بن شعبہ کہتے ہیں آنحضرتؐ جب نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہوتے تو آپ کے قدم یا پنڈلیاں سوج جاتیں، آپؐ سے جب اس کے متعلق پوچھا جاتا، تو فرماتے کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟

ابن مسعود بیان کرتے ہیں، کہ ایک رات میں نے آنحضرت کے ساتھ نماز پڑھی، بڑی دیر تک آپ نے قیام کیا، یہاں تک کہ میں ایک برا ارادہ کرنے پر آمادہ ہوگیا، پوچھا گیا، کہ آپ نے کیا ارادہ کیا تھا؟ کہنے لگے کہ میں نے قصد کیا کہ بیٹھ جاؤں اور آنحضرتؐ کا ساتھ چھوڑ دوں۔

عبداللہ بن عمرو بن عاص روایت کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے ان سے فرمایا خدا کو داؤد علیہ السلام کی نماز سب سے زیادہ پیاری تھی اور ان کا روزہ تمام سے زیادہ عزیز، آپ نصف رات سوتے اور باقی تیسرے حصہ میں عبادت کے لیے کھڑے ہوتے اور پھر چھٹے حصے میں سوتے۔ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار فرماتے۔

آپ کو اپنی عمر بھر تمام شب اور تہجد گزاری کی عادت رہی جس میں آپ دعائیں مانگتے اور اللہ سے التجائیں کرتے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ محبت الٰہی میں کس قدر سرشار اور خشیتِ ایزدی سے کتنے لبریز تھے۔ آپ اکثر اس وقت یہ دعا فرماتے تھے۔

اللھم لک الحمد انت قیم السموات و الارض ومن فیھن، ولک الحمد انت نور السموات والارض ومن فیھن، ولک الحمد انت ملک السموات والارض ومن فیھن، ولک الحمد انت الحق و وعدک الحق ولقاءک الحق وقولک الحق والجنۃ حق والنار حق، والنبیون حق ومحمدؐ حق، والساعۃ حق، اللھم لک اسلمت وبک آمنت وعلیک توکلت والیک انبت وبک خاصمت والیک حاکمت، فاغفرلی ما قدمت وما اخرت وما اسررت وما اعلنت انت المقدم وانت المؤخر لا الٰہ الا انت ولا حول ولا قوۃ الا باللہ

اے اللہ تمام تعریف تیرے لیے ہے، تو ہی آسمان اور زمین کی تمام چیزوں کو قائم رکھنے والا ہے، تیرے ہی لیے حمد ہے، تو آسمان و زمین کی تمام چیزوں کا نور ہے، تو ہی تعریف کے سزاوار ہے، تو آسمان و زمین اور ان کی تمام چیزوں کا بادشاہ ہے۔ تو ہی تعریف کا مستحق ہے، تو ہی حق ہے، تیرا وعدہ حق، تجھ سے ملنا حق، تیرا قول حق، جنت و دوزخ حق، انبیاء اور محمدؐ حق ہیں اور قیامت حق ہے، اے اللہ میں تیرے لیے اسلام لایا، تجھ پر ایمان لایا، تجھ ہی پر بھروسا کیا، تیری ہی جانب رجوع کیا تیری خاطر دشمنی کی اور تیری ہی راہ میں فیصلے چکایا، میرے اگلے اور پچھلے گناہ بخش دے، میرے پوشیدہ اور ظاہری گناہ معاف کر دے، تو ہی سب سے پہلے تو ہی سب سے آخر ہے تیرے سوا اور کوئی معبود نہیں، تمام قوت و طاقت کا سرچشمہ صرف اللہ ہی ہے۔

اللہ تعالےٰ آپ کے تہجد کی شان میں اس طرح ارشاد فرماتا ہے۔

یٰاَیُّھَا المزمل قم الیل الا قلیلا نصفہ او انقص منہ قلیلا او زد علیہ ورتل القراٰن ترتیلا۔ انا سنلقی علیک قولا ثقیلا، ان ناشئۃ الیل ھی اشد وطئا واقوم قیلا۔

اے کپڑوں میں لپٹنے والے! رات کو کھڑے رہا کرو مگر تھوڑی سی رات یعنی نصف رات یا اس نصف سے کسی قدر کم کردو یا نصف سے کچھ بڑھا دو اور قرآن کو خوب صاف صاف پڑھو، ہم تم پر ایک بھاری کلام ڈالنے کو ہیں، بے شک رات کے اٹھنے میں دل اور زبان کا خوب میل ہوتا ہے اور بات خوب ٹھیک نکلتی ہے۔

چنانچہ آنحضرت اس حکم کی تعمیل پر کمر بستہ ہوجاتے ہیں، اسی کو صحابہ کے ایک شاعر ابنِ رواحہ آنحضرتؐ کی شان میں فرماتے ہیں:

"آپ ہم کو ہدایت کرتے اور جب آئندہ کے واقعات وحوادث سے ہمیں آگاہ کرتے ہیں، تو ہمارے دل اس کا یقین کرتے اور اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ آپ نے جو کچھ کہا ہے، وہ یقیناً ہو کر رہے گا، جس وقت مشرکین گہری نیند کے عالم میں مدہوش ہوتے ہیں، تو اس وقت آنحضرتؐ اپنے بستر سے علیحدہ ہو کر اللہ کی یاد میں مصروف ہوجاتے ہیں۔"

آنحضرتؐ کے قلب ودماغ پر باری تعالیٰ کی ہدایت کا تصور اس طرح چھا گیا تھا کہ ایک لمحہ بھی الٰہی ربط وضبط کا دامن آپ سے نہیں چھوٹتا ——— آپ کا دل محبتِ الٰہی، خشیتِ ایزدی، یادِ خداوندی اور اطاعت وفرماں برداری کے جذبات سے ہمیشہ لب ریز رہتا۔ رات دن کے اکثر وبیشتر حصوں میں خشوع وخضوع کے ساتھ آپ عبادت الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔ آپ کے حسبِ منشا کوئی کام صادر ہوجاتا، تو آپ فرماتے تھے "الحمد للہ الذی بنعمتہ تتم الصالحات" سب تعریف اللہ ہی کو سزاوار ہے جس کی نعمت کے طفیل اچھے کام سرانجام پاتے ہیں، آپ کی خلاف مرضی جب کوئی کام پیش ہوتا تو فرماتے: الحمد للہ علی کل حال، ہر حال میں اللہ کا شکر ہے، جب کسی کام کا ارادہ فرماتے تو یہ دعاء پڑھتے: "اللھم خرلی واخترلی" اے اللہ مجھے بھلائی عطا کر اور مجھے پسند کرلے۔" جب سفر کا قصد فرماتے تو یہ دعاء کرتے: "اللھم بک اصول وبک اجول" اے اللہ میں تیری راہ میں جارہا ہوں اور تیری ہی راہ میں سفر کرتا ہوں، سوتے وقت یہ دعا کرتے "اللھم باسمک وضعت جنبی وباسمک ارفعہ" اے اللہ میں تیرا نام لے کر سویا اور تیرے ہی نام سے اٹھوں گا۔ بیدار ہوتے وقت فرماتے: الحمد للہ الذی احیانا بعد ان اماتنا والیہ النشور" تمام تعریف اللہ ہی کے لیے ہے، جس نے ہمیں مردہ کرنے کے بعد پھر زندگی بخشی اور اسی کی طرف اٹھنا ہے، نئے کپڑے پہنتے وقت فرماتے "الحمد للہ الذی رزقنی ما اتجمل بہ فی حیاتی" شکر وتعریف ہے اس خدائے پاک کے لیے جس نے مجھے ایسی چیز عطا کی جس کے ذریعہ میں اپنی زندگی میں زیب وزینت حاصل کرسکتا ہوں۔

کھانا کھانے کے وقت یہ دعا پڑھتے: الحمد للہ الذی اطعمنا وسقانا وجعلنا مسلمین "سب تعریف خدا ہی کو سزاوار ہے، جس نے ہمیں کھلایا، سیراب کیا اور ہم کو مسلمان بنایا۔

یہ دعا پڑھ کر پانی پیتے: الحمد للہ الذی جعل الماء عذباً فراتاً برحمتہ ولم یجعلہ ملحاً اجاجاً بذنوبنا "حمد و شکر ہے، اس خدائے پاک کا، جس نے پانی کو اپنی رحمت سے شیریں بنایا اور ہمارے گناہوں کی وجہ سے اس کو کھارا نمکین نہیں بنا دیا" اپنے بستر پر رات کے وقت کروٹ بدلتے تو فرماتے: لاالٰہ الا اللہ الواحد القہار رب السموات والارض وما بینھما العزیز الغفار "اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی اکیلا بڑے قہر والا ہے، آسمان، زمین اور ان کے درمیان جتنی چیزیں ہیں ان سب کا پروردگار ہے، غالب ہے اور زیادہ مغفرت کرنے والا ہے۔

رات میں نیند سے جب بیدار ہوتے تو فرماتے: "رب اغفر وارحم واھد للسبیل الاقوم" اے پروردگار بخش دے اور رحم فرما اور سیدھے راستہ پر چلنے کی ہدایت دے۔

اللہ سے آنحضرتؐ کا رشتہ توجہ ایک لمحہ کے لیے بھی جدا نہ ہوتا تھا۔ آپ کی طبیعت میں عبادت کا گہرا میلان پایا جاتا تھا، رات اور دن کی اکثر و بیشتر گھڑیوں میں آپ نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے، نماز میں اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک، دل کا سرور اور روح کی تسکین پاتے، اپنے صحابہؓ کو ان کی برداشت سے بڑھ کر کام کرنے کو منع فرماتے تھے۔ حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں، کہ آنحضرتؐ کو جب کوئی کام کرنے کی رغبت ہوتی، تو آپ محض اس خوف سے اس کو ملتوی کر دیتے، کہ مبادا لوگ اُسے فرض سمجھ کر کرنے لگ جائیں۔

حضرت انس رضؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے دو یا تین دن تک مُسلسل صوم وصال رکھا۔ اس وقت رمضان کے آخری دن تھے۔ لوگوں نے بھی آپؐ کے اتباع میں صوم وصال رکھا، آپ کو جب اس کی اطلاع ہوئی، تو فرمایا کہ اگر ماہ رمضان کے اور دن باقی رہتے، تو میں دیکھ لیتا کہ کون کون میرا ساتھ دیتے تھے، زیادتی کرنے والے تو باز رہ جاتے، میں تمہاری طرح سے نہیں ہُوں۔ مجھے خدا کھلاتا پلاتا ہے۔ یعنی میری مدد کرتا ہے اور مجھے قوت و توانائی عطا کرتا ہے۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ آنحضرتؐ نے مسجد میں نماز پڑھی، تو آپ کے پیچھے بہت سے لوگوں نے بھی نماز پڑھی، دوسری شب بھی آپ نماز پڑھ رہے تھے، تو لوگوں کی تعداد پہلے سے زیادہ تھی، تیسری رات لوگ جمع ہُوئے لیکن آپ تشریف نہیں لائے، جب صبح ہوئی، تو آپ نے ارشاد فرمایا: میں نے تمہارا عمل مشاہدہ کر لیا، میں اس لیے نہ آسکا، کیونکہ مجھے خوف تھا کہ یہ تم پر فرض نہ ہو جائے۔

حضرت انس رحؒ فرماتے ہیں کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ماہِ رمضان میں نماز پڑھ رہے تھے۔ میں آپ کے بازو کھڑا ہو گیا۔ ایک اور شخص آیا وہ بھی کھڑا ہو گیا۔ یہاں تک کہ ہماری ایک جماعت بن گئی۔ جب آپ کو احساس ہُوا کہ ہم آپ کے پیچھے کھڑے ہیں، تو نماز میں جلدی کرنی شروع کر دی، اس کے بعد آپ گھر تشریف لے گئے اور نماز پڑھی جو پہلی نماز سے زیادہ طویل تھی، میں نے صبح کے وقت پوچھا کہ کیا آپؐ نے ہمیں محسوس کر لیا تھا، آپ نے فرمایا ہاں اسی امر نے تو مجھے اس طرح کرنے پر آمادہ کیا۔

اس میں کوئی شک نہیں، کہ آنحضرتؐ کے اندر اللہ سے اتصال و تعلق پیدا کرنے کی صلاحیت و استعداد بہ نسبت دوسروں کے بہت زیادہ تھی، آپ اپنی برداشت اور طاقت سے بڑھ کر کام کرنے کو اپنے لیے بہتر اور محبوب سمجھتے تھے۔ اس چیز کو صرف اپنے لیے مخصوص کر لینے

تھے، جب آپؐ کے صحابہ آپ کی اس بارے میں اتباع کرتے، تو آپ کو ان کی اس مشقت بر داری اور غلو پسندی سے خوف دامن گیر ہو جاتا، ایک وہ ہستی جو عبادت کے اس اعلیٰ مقام پر پہنچ چکی ہو، جہاں تک کوئی شخص رسائی نہیں کر سکتا، اور خدا کا وہ رسول، جس نے ایک ایسا سہل اور آسان دین پیش کیا ہو، جو زندگی کے تمام حقائق کا حامل ہے - اگر لوگوں سے صرف اس وجہ سے ناراض ہو جائے کہ وہ دنیا سے قطع تعلق کر لینے اور عبادت گزاری ہی میں منہمک ہو جانے کا ارادہ کرتے ہیں، تو یہ برہمی و برافروختگی اسی کے سزاوار ہے، اسی ہم آہنگی کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے۔

وابتغ فیما اتاک اللہ الدار الآخرۃ ولا تنس نصیبک من الدنیا واحسن کما احسن اللہ الیک -	اللہ نے جو کچھ تجھے عطا کیا ہے، اس سے آخرت کے گھر کا سامان تلاش کر اور دنیا کے اپنے حصّہ کو بھی نہ بھول جا، اور جس طرح اللہ نے تجھ پر احسان کیا ہے، اسی طرح تو بھی احسان کر۔

ایک مرتبہ کسی سفر میں آپ کے اصحاب میں سے ایک شخص نے ایک غار دیکھا، جس کے اطراف سبزہ اُگا ہوا تھا، اس کا دل گوشہ نشینی اور عبادت کرنے کی طرف مائل ہو گیا، آپ برہم ہوئے اور فرمایا کہ میں یہود و نصاریٰ کا دین لے کر نہیں آیا۔ بلکہ حضرت ابراہیمؑ کا آسان اور سہل دین لایا ہوں۔

بعض صحابہ نے رہبانیت اور دُنیا سے قطع تعلق اختیار کرنے کا ارادہ کیا، آپ سخت غضب ناک ہوئے اور اس سے باز رکھا ایک اور شخص نے ارادہ کیا تھا کہ وہ عبادت کی غرض سے گوشت نہیں کھائے گا۔ آپ نے اس کو منع کر دیا۔

حضرت انس فرماتے ہیں کہ ہم نبی اکرمؐ کے ساتھ ایک سفر میں تھے۔ ہم میں سے بعض روزہ دار تھے اور بعض افطار کرنے والے سخت گرمی کے دن تھے۔ آپ ایک مقام پر اُترے، ہم میں سے اکثر لوگ چادروں کو سائبان بناتے اور بعض اپنے ہاتھوں سے سُورج کی تیز شعاعوں کو روکتے تھے۔ روزہ دار شدّت تمازت کی تاب نہ لا کر گر پڑے، اور افطار کرنے والوں نے اپنے خیمے نصب کیے اور جانوروں کو پانی پلایا، آنحضرتؐ نے فرمایا: "آج افطار کرنے والوں نے ثواب لُوٹ لیا۔"

آنحضورؐ نے ہر چیز میں اعتدال پسندی اور میانہ روی کے جو اوامر و احکام نافذ کیے، وہ تمام صحابہ کے دلوں میں سرایت کر گئے۔ اُنھوں نے اپنے اور استادِ اعظم کے مقصد کو پہچان لیا، اور انہی قوانین و اصول پر کاربند رہے۔ ایک مرتبہ سلمان فارسی رضؓ ابو درداؓ کے گھر آئے، یہ وہ اشخاص تھے۔ جن کے درمیان آنحضرتؐ نے مدینہ میں برادری اور بھائی چارہ پیدا کر دیا تھا۔ سلمان رضؓ نے دیکھا کہ ابُو درداءؓ کی بیوی غم زدہ بیٹھی ہوئی ہیں، اُنھوں نے اس کا سبب دریافت کیا، ان کی بیوی نے جواب دیا، آپ کے بھائی ابو درداءؓ کو دُنیا سے کوئی سروکار نہیں رہا ہے، اتنے میں ابُو درداءؓ بھی آ پہنچے، اُنھوں نے اپنے بھائی کے لیے دسترخوان چنا اور کہنے لگے آپ تناول فرمائیے میں روزہ سے ہوں، سلمانؓ نے کہا "میں تمھارے بغیر نہیں کھاؤں گا" چنانچہ یہ سن کر وہ بھی ان کے ساتھ کھانے میں شریک ہو گئے۔ جب رات ہوئی تو ابو درداء نے جانے کا قصد کیا، تو انھوں نے کہا سو جائیے تو وہ سو گئے، کچھ دیر بعد اُٹھ گئے اور جانے کا ارادہ کیا، پھر انھوں نے کہا سو جائیے۔ جب رات کا آخری حصّہ آ پہنچا، تو سلمان نے کہا اب اُٹھیے۔ ان دونوں نے نماز پڑھی، اس وقت سلمان رضؓ نے کہا تم پر اپنے پروردگار کا حق ہے، اپنے نفس کا حق ہے اور اپنے گھر بار والوں کا حق ہے، تم ہر حق دار کا حق ادا کرو۔ اس کے بعد سلمان رضؓ آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے

اور یہ ماجرا بیان کیا، آپ نے سُن کر فرمایا سلمان نے سچ کہا ہے؛

انس بن مالک سے روایت ہے کہ تین شخص آنحضرت ؐ کے گھر آئے اور آپ کی بی بیوں سے آپ کی عبادت کا حال پوچھا جب انہوں نے اس کی خبر دی، تو انہوں نے آپ کی عبادت کو کم سمجھا اور کہنے لگے کہ ہم کہاں اور حضورؐ کہاں؟ خدا نے آپ کے اگلے اور پچھلے گناہ کو معاف کر دیا ہے، ان میں سے ایک نے کہا میں ہمیشہ رات بھر نمازیں پڑھتا رہوں گا، دوسرے نے کہا میں ہمیشہ روزے ہی رکھا کروں گا اور افطار نہ کروں گا، تیسرے نے کہا میں عورتوں سے علٰحدہ رہوں گا، اور کبھی شادی نہ کروں گا۔ آنحضرت ؐ تشریف لائے اور آپ کو اس کی خبر ملی، تو فرمایا "کیا تم لوگوں نے ایسا ایسا کہا ہے؟ سنو! قسم اللہ کی میں تم سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں لیکن مَیں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور شادی بھی کرتا ہوں، جو شخص میری سنت سے روگردانی کرے گا، وہ میری اُمت سے نہیں " یہی وہ میانہ روی اور اعتدالی روش ہے، جس پر آنحضرت ؐ نے سب کو قائم رکھنا چاہا تھا، چنانچہ آپ کو اس مقصد میں حیرت انگیز کامیابی نصیب ہوئی - آپ کو ہمیشہ یہ کھٹکا لگا رہتا تھا، کہ لوگ کہیں جادۂ اعتدال سے نہ بھٹک جائیں اور اپنے نفسوں کو ناقابل برداشت امُور پر آمادہ کرلیں، جس طرح آپ دنیاوی امُور انجام دینے اور شجاعت و بہادری کے جوہر دکھلانے میں لاثانی تھے۔ اسی طرح آپ عبادت اور اطاعتِ خداوندی میں بے مثال تھے۔

ہم یہاں پر عبادت کی جس بلند پایہ تصویر کو پیش کرنا چاہتے ہیں، وہ آپ کی دعا ہے، آپ فرماتے ہیں کہ دعا بھی عبادت میں داخل ہے۔

"وقال ربکم ادعونی استجب لکم" اور کہا تمہارے پروردگار نے تم مجھے پکارو تو میں تمہاری پکار کا جواب دوں گا؛

مندرجۂ ذیل دعائی انداز پر غور کیجیے کہ اس کے اندر خشوع و خضوع اور تسلیم و رضا کے کتنے بے شمار جلوے نظر آتے ہیں:

ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی	میری نماز اور قربانی اور میری موت و حیات جہانوں
للہ رب العلمین لاشریک لہ وبذالک	کے پروردگار ہی کے لیے ہے جس کا کوئی ساجھی نہیں اور
امرت وانا اول المسلمین، اللھم اھدنی	اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور مَیں سب میں پہلا مسلمان
لاحسن الاعمال واحسن الاخلاق، لا	ہُوں، اے خدا مجھے بہترین کام اور حُسنِ اخلاق کی
یھدی لاحسنھا الا انت وقنی سیٔ الاعمال	توفیق عطا فرما، تو ہی اچھے اور بھلے اعمال کی ہدایت
وسیٔ الاخلاق، لایقی سیٔھا الا انت،	کرسکتا ہے، مجھے بُرے کاموں اور بُرے اخلاق سے
اللھم لک رکعت وبک آمنت ولک	محفوظ رکھ، تو ہی ان سے بچا سکتا ہے۔ اے اللہ میں
اسلمت وعلیک توکلت، انت ربی خشع	تیرے ہی لیے جھکا ہوں تجھی پر ایمان لایا، تیرے ہی لیے
سمعی وبصری ولحمی ودمی وعظمی للہ	اطاعت کی تجھی پر بھروسا کیا، تو ہی میرا پروردگار ہے میرے
رب العلمین، اللھم اغفرلی ما قدمت	کان، میری آنکھیں، میرا گوشت، میرا خون اور میری

وَمَا اخرت وما اسررت وما اعلنت وما اسرفت وما انت اَعْلَمُ بِه منی انت المقدم وانت الموخر لَا الٰه الا انت	ہڈیاں جہانوں کے پروردگار کی خشیت سے معمور ہوگئیں، اے اللہ میرے اگلے اور پچھلے، میرے ظاہر و باطن گناہوں کو بخش دے، میری زیادتیوں سے درگزر فرما اور ان خطاؤں کو بھی معاف کردے، جن سے تو واقف ہے، تو ہی سب سے پہلے اور تو ہی سب کے آخر ہے، تیرے سوائے کوئی معبود نہیں۔

الغرض آنحضرتؐ اپنی عبادت میں اخلاص کے اعلیٰ منازل اور اطاعت و محبتِ الٰہی میں محویت کے اونچے مراتب پر فائز ہوگئے تھے اور بارگاہِ الوہیت میں تقرب اور باریابی کا شرف حاصل کرلیا تھا۔ اس کے باوجود دنیوی امور کی انجام دہی اور سلطنت کے قیام و استحکام میں بھی گراں قدر حصہ لیا اور سوسائٹی سے فتنہ و فساد اور ہیجان و اضطراب کو دور کیا، الحاصل آپ کی شخصیت کے اندر زندگی کی تمام حوائج و ضروریات۔ کاحل اور اہم مقاصد کی تکمیل کے ذرائع اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود تھے۔

بطلِ اعظم کی اس جلیل القدر صفت کے سامنے تمام لوگوں کو اپنا سر تسلیم خم کر دینا پڑتا ہے، دنیا کے بہادروں اور مشاہیرِ عالم کی کیا مجال کہ آنحضرتؐ کی جانب آنکھ اٹھا کر دیکھیں، اگر وہ یہ جرأت بھی کر بیٹھیں، تو آخر میں حیرانی اور درماندگی کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں، تاریخِ عالم میں کوئی ایسا شخص نظر نہیں آئے گا، جو اپنے روحانی انہماک اور شب و روز کی عبادت گزاری کے ساتھ ساتھ دنیاوی مہمات کو اور اپنی قوم اور خود اپنے نفس کی خدمت کو بہتر صورت اور خوش اسلوبی سے انجام دے سکے اور دشمنوں کا مقابلہ اور ان کی مدافعت کرتے ہوئے مستحکم و مضبوط سلطنت کی بنیاد ڈالے جیسا کہ آنحضرتؐ نے اپنا یہ فریضہ پورا کرکے دنیا کے روبرو اپنے آپ کو ایک بے مثال ہستی ثابت کردی۔

خدا جنھیں پسند کرتا ہے

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ	(البقرہ)	اللہ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔
إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ	(مائدہ)	عدل و انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔
إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ	(توبہ)	تقویٰ والوں سے اللہ محبت کرتا ہے۔
إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ	(البقرہ)	رجوع الی اللہ کرنے والوں سے اللہ محبت کرتا ہے۔
وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصَّابِرِيْنَ	(آل عمران)	صبر کرنے والوں سے اللہ محبت کرتا ہے۔
وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ	(توبہ)	پاک صاف رہنے والوں طہارت والوں سے اللہ محبت کرتا ہے۔

خدا جنھیں ناپسند کرتا ہے

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ	(نساء)	برائی کی اشاعت اللہ کو ناپسند ہے۔
إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ	(البقرہ)	حدود الٰہی کو توڑنے والے قانون شرعی کا احترام نہ کرنے والے اللہ کو ناپسند ہیں۔
إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا ۔		اللہ تعالےٰ حیلہ باز، اترانے والے کو ناپسند کرتا ہے۔
إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ	(انفال)	خیانت والوں کو اللہ ناپسند کرتا ہے۔
إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ	(حج)	خیانت کرنے والے احسان کو ملیا میٹ کرنے والے اللہ کو ناپسند ہیں۔

يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ
جو ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے
(البقرۃ: ۱۲۹)

علومِ انسانی کے فروغ پر ہمارے رسول کا اثر



صدرِ اسلام میں دینی علوم کے ارتقا کا اجمالی جائزہ

مولانا شبیر احمد خاں غوری

علومِ دینیہ کا سرچشمہ قرآن کریم اور وہ ذاتِ مقدس ہے، جس پر قرآن نازل ہُوا۔ اس لیے ان علوم کا آغاز انھی کے ساتھ ہُوا۔

سیرتِ مقدسہ ایتھنز کے مدرسہ فلسفہ کی قفل بندی (۵۲۹ء) کے چالیس سال بعد فاران کی چوٹیوں سے ہدایت ربّانی کا نور آخری مرتبہ چمکا، جس کے بریق ولمعان نے عالم کو بقعۂ نور بنا دیا۔ جس سال ابرہہ کی فیل سوار فوج "طیراً ابابیل" کی سجیل باری سے "کعصفٍ ماکول" ہوئی تھی، مکہ معظمہ میں اللہ کے آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہُوئی اور اس طرح دعائے خلیل "ربّنا وابعث فیھم رسولاً من انفسھم یتلوا علیھم اٰیاتك ویعلمھم الکتاب والحکمۃ"

"اے رب ہمارے اور بھیج ان میں ایک رسول انھی میں سے کہ ان پر تیری آیتیں تلاوت فرمائے اور انھیں (تیری) کتاب اور حکمت سکھائے۔"

اور نویدِ مسیحا:

"یا بنی اسرائیل انی رسول اللہ علیکم مصدقاً لما بین یدی من التوراۃ ومبشراً برسول یاتی من بعدی اسمہٗ احمد۔" (صف-۶)

"اے بنی اسرائیل! میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہُوں۔ اپنے سے پہلی کتاب توریت کی تصدیق کرتا ہُوں اور اس رسول کی بشارت سناتا ہُوں، جو میرے بعد تشریف لائیں گے، اُن کا نام احمدؐ ہے۔"

پوری ہُوئیں۔

اللہ کا یہ آخری رسول عرب کے شریف ترین گھرانے میں پیدا ہُوا۔ بچپن ہی میں والدین کے سایہ سے محروم ہو گیا۔ لہٰذا رسمی تعلیم و تربیت کا کوئی سوال ہی نہ تھا اور یہ اس لیے کہ تورات مقدس کی پیش گوئی پوری ہو کہ:

"مردِ اُمّی حکیم ہوگا"

بااین ہمہ اُن اخلاقِ فاضلہ سے متصف تھے جو "مثالی" ہیں اور ابرار و اخیار کے اخلاق جن کا پرتو ہیں۔ اس لیے صحیح معنوں میں،

اِنّك لعلیٰ خلقٍ عظیم۔

کے مصداق تھے۔

چالیس سال کی عمر شریف تھی کہ خلعتِ نبوۃ سے مشرف فرمائے گئے۔ اس رسالت کا مقصد بھی توحیدِ ربوبیت تھا، جس کے لیے انبیائے سابقین مبعوث فرمائے گئے تھے۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

"وما ارسلنا من قبلك من رسولٍ الاّ نوحی الیہ انہ لا الٰہ الا انا فاعبدون"

(انبیاء - ۲۵)

جن نفوسِ زکیہ کے نصیب میں سعادتِ دارین مقدر ہو چکی تھی، انھوں نے اس دعوت کو بطیبِ خاطر قبول کیا اور مشرف باسلام ہو گئے۔ مگر اہلِ غرض کا طبقہ جس نے اس حیاتِ عاجلہ ہی کو سب کچھ سمجھ لیا تھا اور جسے نئے دین کے فروغ اور اشاعت میں اپنی عیش کوشی و عاقبت فراموشی کی موت نظر آ رہی تھی، اسلام اور پیروانِ اسلام کے مٹانے پر کمر بستہ ہو گیا۔ دنیا جہان کا کوئی ظلم ایسا نہ رہا، جو ان غرض کے بندوں نے حق پرستوں کے حق میں اٹھا نہ رکھا ہو۔

لہٰذا ۶۲۲ء میں اللہ کے رسولؐ نے اللہ کے حکم سے مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ میں ہجرت فرمائی۔ اب اپنے دین کی حفاظت کیلیے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو جہاد کا حکم دیا۔ ۱۷ رمضان ۲ھ کو غزوۂ بدر میں مسلمانوں نے کفارِ قریش کو شکست دی۔ اگلے سال غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کو سخت جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ مگر اس سے انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔ ۵ھ میں قریش دوسرے دشمنانِ اسلام قبیلوں اور یہود کے ساتھ مدینہ منورہ پر حملہ آور ہوئے، مگر اللہ تعالیٰ کا کرنا ایسا ہوا کہ دشمنانِ دین خود محاصرہ چھوڑ کر بھاگ گئے۔

۶ھ میں حدیبیہ کے مقام پر مسلمانوں اور کفارِ قریش کے درمیان صلح ہو گئی۔ مگر ۸ھ میں قریش نے نقضِ عہد کیا۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ پر حملہ کیا لیکن کسی لڑائی کی نوبت نہیں آئی اور مکہ فتح ہو گیا۔ آپ نے کعبہ شریف میں پہنچ کر سارے بُت توڑ ڈالے اور اب اللہ کے گھر میں صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت ہونے لگی۔ اکثریت مسلمان ہو گئی اور عرب میں اسلام کی حکومت قایم ہو گئی۔ اب رومیوں اور ایرانیوں نے اس نئی مملکت کے تباہ کرنے کی تیاریاں کیں۔ لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فوج رومیوں کی تادیب کے لیے تبوک کی طرف روانہ کی۔

۱۰ھ میں آپ نے حج (حجۃ الوداع) فرمایا۔ اس حج میں آپؐ کے ہمراہ ۱۱۴۰۰۰ مسلمان تھے۔ اس موقعہ پر آپ نے جو خطبہ فرمایا، وہ "خطبہ حجۃ الوداع" کہلاتا ہے اور اسلام کی تاریخ میں یادگار رہے۔

اب دین کی تکمیل ہو چکی تھی، لہٰذا آیت کریمہ:

"الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دیناً"

کا نزول ہُوا اور کچھ دن بعد ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ کو آپؐ نے سفرِ آخرت فرمایا۔

اسلام کوئی سیاسی یا مذہبی تحریک نہ تھی بلکہ ایک کامل دین تھا۔ اور اس حیثیت سے اس نے انسان کی شئونِ حیات کے جملہ پہلوؤں کی اصلاح کی۔ اس میں اس کی ثقافتی ترقی بھی شامل ہے، اس لیے اسلام نے علم و حکمت کے حصول پر خاص طور سے زور دیا اور اسے زندگی کی قدرِ اعلیٰ قرار دیا:

"ومن یؤت الحکمۃ فقد اُوتی خیراً کثیراً۔"

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے طلبِ علم کو مسلمانوں پر فرض مقرر کیا:

"طلب العلم فریضۃٌ علیٰ کلّ مسلم و مسلمۃ۔"

دوسرے موقعہ پر ارشاد فرمایا کہ جہاں بھی مل سکے، علم کو حاصل کرو:

"اطلبوا العلم ولو کان بالصین"

حصولِ علم میں پہلا مرحلہ نوشت وخواند میں مہارت کا ہے۔ اسلام نے شروع ہی سے نوشت وخواند کی اہمیت پر زور دیا۔ یہاں تک کہ وحیِ الٰہی کا آغاز ہی "اقراء" (پڑھ) کے مبارک ومسعود حکم سے ہُوا:

"اقراء وربك الاکرم الذی علم بالقلم علم الانسان مالم یعلم" (علق)

بعثتِ اسلام کے وقت صرف سترہ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے اللہ تعالیٰ کی یہ نعمت عام ہوگئی اور اسلامی تعلیم کی رُو سے نوشت وخواند معاشرہ کا اہم فریضہ ہوگئے۔ قرآن کہتا ہے:

"یآیھا الذین آمنوا اذا تداینتم بدین الیٰ اجلٍ مسمی فاکتبوہ ولیکتب بینکم کاتب بالعدل" (بقرہ)

لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نوشت وخواند کی اشاعت پر خاص توجہ کی۔ چنانچہ بدر کی لڑائی کے قیدیوں میں جو لوگ اپنا زرِ فدیہ ادا نہیں کر سکتے تھے، آپ نے ان کا فدیہ یہ ٹھہرایا کہ ہر ایسا شخص مدینہ منورہ کے دس بچّوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے۔

پھر نوشت وخواند کی تقسیم میں اسلام نے شریف ووضیع، آقا وغلام اور مرد وعورت کی کوئی تمیز وتفریق نہیں برتی۔ خواتین میں بھی یہ نعمت عام تھی۔ چنانچہ ام المومنین حضرت عائشہؓ پڑھ سکتی تھیں، لکھتی نہیں تھیں اور ام المومنین حضرت حفصہؓ پڑھ بھی سکتی تھیں اور لکھ بھی سکتی تھیں۔

اسلامی ثقافت کی بنیاد اس کا دین ہے۔ لہٰذا اصولی طور پر اس کی ثقافتی سرگرمیوں کا محور علومِ دینیہ ہی رہے ہیں۔ پھر دینی علوم کا سرچشمہ قرآن ہے۔ اس لیے عہدِ رسالت ہی سے مسلمانوں نے اس کے ساتھ اعتناء کو سرمایۂ سعادتِ دارین سمجھا۔

قرآن ایک ساتھ نہیں اُترا، بلکہ تھوڑا تھوڑا کرکے نازل ہُوا۔ نزولِ وحی کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسے فوراً قلمبند کرا دیتے تھے۔ صحابہ میں سے جن خوش نصیبوں نے اس مقدس خدمت کو انجام دیا، اُن میں خلفائے اربعہ کے علاوہ اُبی بن کعب اور زید بن ثابت الانصاری زیادہ مشہور ہیں۔

اس زمانہ میں کاغذ نایاب تھا۔ لہٰذا قرآن سنگین لوحوں، ہڈیوں، یا لان کی لکڑیوں اور درختوں کی چھالوں پر لکھا جاتا تھا۔

اس تحریری قلمبندی کے علاوہ اکثر صحابہؓ نے عہدِ رسالت ہی میں قرآن کو حفظ بھی کر لیا تھا۔ ان حفاظِ قرآن میں سے اُبی بن کعب، معاذ بن جبل، ابوزید انصاری اور زید بن ثابت رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین بہت زیادہ مشہور ہیں۔

خلافتِ راشدہ

جنابِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سیدنا ابوبکر صدیقؓ آپ کے خلیفہ ہُوئے۔ زمامِ خلافت سنبھالتے ہی صدیق اکبرؓ کو گوناگوں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ سرحد پر رومیوں کے حملے کا اندیشہ تھا۔ لہٰذا آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کے مطابق اُن کی تادیب کے لیے اُسامہ بن زید کو روانہ فرمایا اور آخرکار رومیوں کو شکست ہُوئی۔ دُوسری مشکل مانعینِ زکوٰۃ کی تھی۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ نے ان کے مطالبہ کو سختی سے دبا دیا۔ یہاں تک کہ انھیں زکوٰۃ دینا پڑی۔ تیسری مشکل

مُرتدینِ عرب کی جانب سے تھی۔ اُدھر مدعیانِ نبوت مدینہ منورہ پر حملے کی تیاریاں کر رہے تھے، مگر آپ نے ان کا بھی سختی سے مقابلہ کیا اور انجام کار ان کا قلع قمع ہوگیا۔

اسی دوران میں معلوم ہُوا کہ عرب فتنہ پردازوں کو ایرانیوں کی شہ حاصل تھی۔ لہٰذا اس خطرے کے سدِباب کے لیے فارورڈ پالیسی کے اصول کو اپنایا گیا اور مجاہدین کا ایک لشکر ایران کی طرف بھیجا گیا۔ رومیوں کے خلاف تادیبی کارروائی تو ہو ہی چکی تھی مگر اس کی تکمیل کے لیے مزید فوجی مہیں روانہ کی گئیں۔

حضرت ابوبکرؓ نے ۱۳ھ میں وفات پائی اور حضرت عمرؓ ان کے جانشین ہُوئے۔ اُن کا عہدِ خلافت اسلامی فتوحات کا عہدِ زریں ہے۔ خالد ابن الولید اور ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہما نے ۱۴ھ (مطابق ۶۳۵ء) میں دمشق فتح کیا۔ اسی سال سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے قادسیہ کی جنگ میں ایرانی لشکر کو شکست فاش دی۔ اگلے سال ۱۵ھ (مطابق جنوری ۶۳۷ء) میں فلسطین کے اندر یروشلم کے بطریق نے بیت المقدس حضرت عمرؓ کے حوالے کیا۔ ۱۶ھ میں ساسانیوں (شاہانِ ایران) کا پایۂ تخت مدائن فتح ہوگیا ساتھ ہی عراق بھی عربوں کے قبضہ میں آگیا اور حضرت عمرؓ کے حکم کے بموجب بصرہ اور کوفہ میں چھاؤنیاں قائم کی گئیں۔

۱۹۔۲۰ھ (مطابق ۶۴۱۔۶۴۰ء) میں عمروؓ بن عاص نے مصر کو اسلامی حکومت میں شامل کر لیا۔ ۲۱ھ (مطابق ۶۴۲ء) میں نہاوند کی فیصلہ کن جنگ ہُوئی۔ جس میں مسلمانوں کی فتح ہُوئی۔ اس طرح ۲۲ھ میں ایران کی فتح مکمل ہوگئی۔

حضرت عمرؓ نے ۲۳ھ میں وفات پائی اور حضرت عثمانؓ ذی النورین خلیفہ ہُوئے۔ اُن کے زمانہ میں بھی فتوحات کا سلسلہ جاری رہا۔ مگر اسلام دشمن طاقتیں اندر ہی اندر خفیہ سازشیں کر رہی تھیں، جو بیکایک ۳۵ھ میں منظرِ عام پر آگئیں۔ اس کے نتیجے میں حضرت عثمانؓ شہید ہُوئے۔ ان کی جگہ حضرت علیؓ خلیفہ ہُوئے، مگر خانہ جنگیاں بڑھتی ہی گئیں۔ صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت قاتلین عثمانؓ سے قصاص لینے پر مُصر تھی۔ حضرت علیؓ بھی چاہتے تھے مگر اُن کے ساتھیوں میں سے ایک گروہ مزاحمت کر رہا تھا۔ فتنہ بڑھتا گیا۔ پہلے جنگِ جمل ہوئی۔ بعد میں امیر معاویہ نے، جو شام کے والی اور حضرت عثمانؓ کے رشتہ دار تھے، ان کے خون کا دعویٰ کیا اور فوجیں لے کر آگے بڑھے۔ صفین کے مقام پر لڑائی ہُوئی۔ قریب تھا کہ حضرت علیؓ کی فوج کو فتح ہو کہ امیر معاویہ کی طرف سے تحکیم کا شور ہُوا۔ یعنی یہ مسئلہ دو حکموں (پنچوں) کے سپرد کر دیا جائے۔ حضرت علیؓ اس تجویز کو ماننا نہیں چاہتے تھے۔ مگر فتنہ پردازوں نے جو مشکلات کو کم کرنے کی بجائے بڑھانا ہی چاہتے تھے، انھیں اس تجویز کے ماننے پر مجبور کر دیا اور آپ نے مجبور ہو کر عارضی صلح کر لی۔ کچھ دن بعد فتنہ پردازوں نے کچھ سر پھرے عربوں کو اُکسایا اور اُنھوں نے حضرت علیؓ سے آکر کہا کہ "تحکیم" مان کر ہم سب نے کفر کیا۔ آپ بھی اس کفر کا اقرار کیجیے۔ آپ نے انھیں بہت کچھ سمجھایا، مگر اُن میں سے ایک جماعت اپنی بات پر اڑی رہی اور آخر میں حضرت علیؓ سے علیحدہ ہوگئی۔ یہ لوگ خارجی تھے۔ مجبوراً آپ کو ان کے خلاف تادیبی کارروائی کرنا پڑی۔ ادھر حکموں نے غلط فیصلہ دیا اور آپ نے پھر شامیوں کے خلاف تیاری شروع کی۔ مگر خارجی اپنی فتنہ پردازیوں سے باز نہ آتے تھے۔ آخر کار ۴۰ھ میں ایک خارجی عبدالرحمٰن بن ملجم نے آپ کو شہید کر ڈالا۔ آپ کے بعد آپ کے صاحبزادے سیدنا امام حسنؓ آپ کے جانشین ہُوئے مگر ساتھیوں کی نیت میں فتور دیکھ کر چھ ماہ بعد آپ نے امیر معاویہ سے صلح کر لی اور اُن کے حق میں خلافت سے دست بردار ہوگئے۔

عہدِ صدیقی میں مسیلمہ کذاب کے مقابلے میں یمامہ کے مقام پر گھمسان کی لڑائی ہوئی جس میں بہت زیادہ مسلمان شہید ہوئے۔ ان میں ایک کثیر تعداد حفاظِ قرآن کی تھی۔ اس سے اندیشہ ہونے لگا کہ اگر حفاظ اسی طرح ختم ہوتے گئے تو قرآن کس طرح باقی رہے گا اس لیے حضرت عمرؓ نے صدیقِ اکبرؓ سے قرآن کریم کو جمع کرنے کی تجویز کی۔ وہ اس نئے کام کے لیے تیار نہ ہوتے تھے۔ مگر آخر حضرت عمرؓ کے پیہم اصرار سے راضی ہو گئے اور یہ اہم کام انہوں نے حضرت زید بن ثابتؓ کے سپرد کیا، جو کاتبِ وحی بھی رہ چکے تھے۔ انھوں نے کمال احتیاط و ذمہ داری کے ساتھ قرآن مجید کو جمع کیا۔ اس سے پہلے عربوں میں کوئی کتاب نہ تھی اور مشیت ایزدی بھی یہی تھی کہ اس قوم میں پہلی کتاب جو مدوّن ہو "اللہ کی کتاب" ہو۔

بعد میں حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں جب اختلافِ قرأت بڑھا تو آپ نے "مصحفِ صدیقؓ" کی نقلیں کرا کر مختلف اقطارِ ملک میں بھیج دیں۔

بعض صحابہ کرامؓ نے احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مجموعے بھی جمع کیے تھے۔ ان میں سے حضرت عبداللہؓ بن عمر اور حضرت علیؓ کے مجموعے زیادہ مشہور تھے۔ حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں بیت المال قایم ہوا، جس سے علم الحساب کو ترقی ہوئی۔ آپ نے "علم الفرائض" MUSLIM LAW OF INHERITENCE کی بھی ہمت افزائی کی۔ چنانچہ آپ فرمایا کرتے تھے:

"اذا لھوتم فالھوا بالرمی و اذا تحدثتم فتحدثوا بالفرائض"

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد بعض صحابہ کرام غیر جانبدار ہو گئے اور انھوں نے حضرت علیؓ سے بیعت نہیں کی ۔ یہ "معتزلہ" کہلائے۔ اور اس طرح اسلامی تاریخ میں معتزلہ کا لفظ پہلی مرتبہ سننے میں آیا۔ اگرچہ بعد کے اصطلاحی معتزلہ سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

حضرت علیؓ کے زمانۂ خلافت میں خارجہ فرقہ ظہور میں آیا۔ یہ "تحکیم" کے خلاف تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ "لاحکم الا اللہ" (اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو "حکم" کا حق حاصل نہیں ہے) یہ لوگ محکمہ یا خارجی کہلاتے ہیں۔ خود یہ لوگ اپنے کو "شراۃ" کہتے ہیں۔ (یعنی انھوں نے اپنی جانیں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے عوض میں بیچ دی ہیں) خارجی فرقہ بڑا آتش مزاج تھا۔ وہ گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کافر کہتا تھا۔ اجلّ صحابہ کی تکفیر میں بھی اسے باک نہ تھا۔ اس کے علاوہ حکومت کی خرابیوں کی اصلاح بزورِ شمشیر کرنے کا قائل تھا۔ ان کی شورشیں بعد کے خلفاء کے لیے دردِ سر بنی رہیں۔

دین اسلام کا سارا دارومدار قرآن پر ہے۔ اس لیے مسلمانوں نے اس کے حفظ و جمع کے ساتھ ساتھ اس کے صحیح سمجھنے میں بہت زیادہ اہتمام برتا۔ یہ علم "تفسیر" کہلاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فہم قرآن کے بارے میں چار شخصوں کی خصوصیت سے سفارش کی تھی یعنی عبداللہ بن مسعود، اُبی بن کعب، معاذ بن جبل اور سالم مولیٰ حذیفہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔ عہدِ صحابہ کے مفسرین میں خلفائے اربعہ کے علاوہ عبداللہ بن مسعود، عبداللہ ابن عباس، اُبی بن کعب، زید بن ثابت، ابو موسیٰ الاشعری اور عبداللہ بن زبیر خصوصیت سے مشہور رہیں۔ ان میں حضرت علیؓ "انا مدینۃ العلم و علی بابھا" کے مصداق تھے۔ دوسرا درجہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا تھا، جو "حبرالامۃ" اور "ترجمان القرآن" کہلاتے ہیں اور تیسرا درجہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ

دیباچہ

دُوسرا علم جس کے ساتھ مسلمانوں نے اعتنائے شدید برتا، حدیث تھا۔ دنیا کی کسی قوم نے اپنے ہادی و پیشوا کے اقوال و اعمال کی تلاش و تحقیق اور حفظ و تدوین، نیز اس کی بنیاد پر ایک ہمہ گیر دستورِ حیات مرتب کرنے میں اس درجہ اہتمام نہیں کیا، جس قدر مسلمانوں نے کیا ہے اگرچہ شروع میں اس اندیشے سے کہ کہیں غیر شعوری طور پر قرآن اور حدیث میں التباس نہ ہو جائے، حدیث کی اشاعت پر پابندی لگ گئی تھی، مگر جونہی اس التباس کا اندیشہ ختم ہُوا، مسلمانوں نے غیر معمولی شغف کے ساتھ حدیث رسولؐ کے سماع و روایت میں اہتمام کیا۔ عہدِ صحابہ میں یہ علم بہت زیادہ شایع رہا، کیونکہ ہر شخص صحابی تھا، جس نے آنحضرتؐ کو دیکھا تھا یا آپؐ کے ارشاداتِ گرامی سُنے تھے۔ ابن الجوزی نے لکھا ہے کہ صحابہ کرام کی تعداد کا احاطہ متعذر ہے۔ ابو زرعہ سے کسی نے کہا کہ احادیث کی تعداد صرف چار ہزار ہے، تو انہوں نے فرمایا: یہ دشمنِ اسلام زنادقہ کا قول ہے ورنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے وقت ایک لاکھ چودہ ہزار صحابی تھے۔

محدثین میں شرفِ اولیت عشرہ مبشرہ یعنی خلفائے اربعہ اور طلحہ، زبیر، عبدالرحمٰن بن عوف، سعد بن ابی وقاص، ابو عبیدہ بن الجراح اور سعید بن زید رضی اللہ عنہم کو حاصل ہے۔ لیکن کثرت روایت حدیث کے لیے چار صحابی مشہور ہیں: ابو ہریرہ، عبداللہ بن عمر، انس بن مالک اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔ ان کے بعد عبداللہ بن عباس، جابر بن عبداللہ، ابو سعید خدری، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمرو بن عاص، امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ، حضرت عمر فاروق، ام المومنین ام سلمیٰ، ابو موسیٰ الاشعری، براء بن عاذب، ابو ذر غفاری اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم کا درجہ ہے۔

حدیث کے بارے میں صحابہ کا عموماً اپنے حافظہ پر اعتماد تھا، کیونکہ عرب کا حافظہ بے مثل ہوتا تھا، لیکن بعض صحابہ نے اپنی مرویات کو قلمبند بھی کر لیا تھا۔ حدیث کے ان صحائف میں حضرت انس بن مالکؓ، عبداللہ بن عمرؓ، ابو ہریرہؓ، عبداللہ ابن عباسؓ، حضرت علیؓ اور عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ کے مجموعے مشہور ہیں۔

قرآن و حدیث کے بعد دینی علوم میں فقہ کا درجہ ہے، جو دستورِ حیات کا نام ہے۔ اس لیے علمائے کرام نے اس کے ساتھ بھی غیر معمولی شغف و اہتمام سے کام لیا۔ عہدِ رسالت میں جن حضرات کو فتویٰ دینے کا حق تھا، وُہ تین مہاجر اور تین انصار تھے۔ مہاجرین میں حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی اور انصار میں ابی بن کعب، معاذ بن جبل اور زید بن ثابت رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔ ان کے علاوہ مشاہیر فقہائے صحابہ میں خلیفہ اوّل حضرت ابو بکر صدیق، عبداللہ بن مسعود، ابو موسیٰ الاشعری، عویمر بن مالک، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن زبیر، عبداللہ بن عمرو بن عاص اور ام المومنین حضرت عائشہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین قابلِ ذکر ہیں۔

لسانی علوم براہِ راست تو دینی علوم کا حصّہ نہیں، لیکن چونکہ فہم قرآن و حدیث ان علوم میں تبحر و مہارت پر ہی موقوف ہے، اس لیے انھیں بھی شروع سے دینی علوم اور دینی مدارس کے نصاب میں ایسی ہی اہمیت حاصل رہی ہے۔ ان میں دو علم خاص طور سے اہم ہیں، نحو اور لغت۔

نحو کی ابتداء ابوالاسود دوئلی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زیرِ ہدایت کی۔ بعد میں ابوالاسود کے شاگردوں نے اس فن کو ان سے سیکھ کر مزید ترقی دی۔

پھر چونکہ قرآن عربوں کی زبان میں نازل ہُوا تھا، اس لیے فہم قرآن کے لیے قدیم عربی زبان کا مطالعہ ناگزیر تھا۔ چنانچہ عہدِ صحابہ میں شعراء کے کلام سے استشہاد کیا جاتا تھا، اور حضرت عمرؓ نے شعراے عرب کے کلام کا خصوصیت سے مشورہ دیا۔

امیر معاویہؓ اور ان کی اولاد کا عہد حکومت حضرت علیؓ کی شہادت (۴۰ھ) کے بعد اُن کے بڑے صاحبزادے سیدنا امام حسنؓ خلیفہ ہوئے، مگر ساتھیوں کی بے وفائی سے مجبور ہو کر چھ مہینا بعد امیر معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہو گئے۔ اس طرح "خلافت علیٰ منہاج النبوۃ" کا زمانہ ختم ہوا اور "ملک عضوض" کا آغاز ہوا۔

نئے خلیفہ کے خاندان میں عرصہ سے وجاہت و ریاست چلی آتی تھی اور حکومتی داؤ پیچ کے بیچ میں ان کی پرورش ہُوئی تھی۔ لہذا سیاسی تدبر کے اندر وہ قیصر و کسریٰ کے ہم پایہ سمجھے جاتے تھے۔ حافظ جلال الدین سیوطیؒ نے مقبری کا قول نقل کیا ہے:

"تم لوگ ہرقل اور کسریٰ کے سیاسی تدبر سے تعجب کرتے ہو اور امیر معاویہؓ کو بھُول جاتے ہو"

عامۂ اہلِ اسلام اس تبدیلیِ حکومت سے مطمئن نہ تھے۔ سختی کا کوئی موقعہ نہ تھا۔ اس لیے انھوں نے ایک جانب علم و تحمل کو اپنا شعار بنایا (یہاں تک کہ اس باب میں ان کا نام ضرب المثل بن گیا)، اور اپنے مقدور بھر اہلِ بیت نبوت اور ان کے ہوا خواہوں کے تالیفِ قلب کی کوشش کی۔ دُوسری جانب "پھُوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی پر عمل کیا اور سب سے زیادہ یہ کہ اسلام کی جمہوری رُوح کے خلاف سب سے پہلے انہوں نے خاندانی حکومت کی بنیاد ڈالی اور اپنے بیٹے یزید کو ولیعہد مقرر کیا۔

امیر معاویہ نے ۶۰ھ میں وفات پائی اور ان کا بیٹا یزید اُن کا جانشین ہُوا۔ وہ بجا طور پر "عرب کا نیرو" کہلانے کا مستحق ہے۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ" سیدنا امام حسینؓ کی شہادت ہے (۶۱ھ) اگلے سال اس نے اہلِ مدینہ کے خلاف ایک لشکر بھیجا، جس نے دیارِ رسولؐ کی بے حُرمتی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ تیسرے اور آخری سال مکۂ معظمہ عبداللہ بن زبیر کے مقابلے میں ایک لشکر بھیجا، جس کی آتش زنی سے غلافِ کعبہ بھی جل گیا۔ آخر حرمین شریفین کی بے حرمتی اور خاندانِ رسالت پر ظلم ڈھانے کے بعد عرب کے اس "نیرو" نے ۶۴ھ میں انتقال کیا۔

یزید کے بعد اس کا بیٹا معاویہ بن یزید تخت نشین ہُوا، مگر باپ کے مظالم سے وہ اس قدر دل برداشتہ تھا کہ چالیس دن بعد ہی انتقال کر گیا۔

امیر معاویہ کے زمانہ میں مذہبی افتراق شروع ہُوا، جس کی اصل سیاسی تحزب و جماعت بندی تھی۔ ایک جماعت خلافت کو حضرت علیؓ اور ان کی اولاد میں دیکھنا چاہتی تھی۔ یہ لوگ آگے چل کر شیعہ (شیعانِ علیؓ) کہلائے۔ دُوسری جماعت شخصی حکومت کی منکر تھی اور امراء و خلفاء کی خلافِ شرع من مانیوں سے بیزار۔ وہ بزورِ شمشیر حکومت میں اصلاح پر مُصر تھی۔ یہ لوگ خارجی تھے، جو امویوں کے لیے ایک مستقل خطرہ بنے رہے۔ تیسری جماعت عامہ اہلِ اسلام کی تھی جو تفریق و انتشار بین المسلمین کو ناپسند کرتی تھی اور مسلمانوں میں اجتماعِ کلمہ کو بہرحال دیکھنا چاہتی تھی۔ یہ "اہل السنت و الجماعت" تھے۔

ان میں خارجی فرقہ بڑا آتش مزاج تھا، اس نے اپنے سیاسی معتقدات میں تفریط کے علاوہ جو "فلسفیانہ مزاجیت" کے قریب پہنچ گئی تھی۔ اسلام کے دینی تصور میں بھی افراط سے کام لیا اور گناہِ کبیرہ کو کفر کا مترادف قرار دیا۔ یہ لوگ گناہِ کبیرہ کے مرتکب کو

کافر کہتے تھے۔ اعتدال پسند طبقہ (اہل السنت والجماعت) گناہ کو بُرا سمجھتا تھا اور گنہ گار کو گنہ گار اور فاسق کہتا تھا۔ بایں ہمہ اسے دائرہ اسلام سے خارج قرار نہیں دیتا تھا۔ لیکن خوارج کے افراط و تشدد کے مقابلے میں ایک تیسرا فرقہ بھی تھا، جس نے خارجیوں کی شدت پسندی کے ردِ عمل کے نتیجے میں جانب تفریط کو اختیار کیا۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ جس طرح کسی کافر کا نیک عمل اسے فائدہ نہیں پہنچاتا، کسی مسلمان کی بدعملی بھی ایمان کو نقصان نہیں پہنچاتی، "لا تضر مع الایمان معصیۃ کما لا ینفع مع الکفر طاعۃ" ان لوگوں کا مقولہ تھا، یہ لوگ "مرجئہ" کہلاتے تھے۔

اوپر اُن لوگوں کا ذکر آچکا ہے، جو حضرت عثمانؓ کی شہادت پر حضرت علیؓ کی بیعت میں شریک نہیں ہُوئے۔ نیز ان لوگوں کا بھی جو متحاربین میں سے کسی کے ساتھ ہو کر نہیں لڑے یہ لوگ "معتزلہ" کہلاتے تھے۔ (تاریخ طبری و تاریخ ابوالفدا) اب نئے "معتزلہ" پیدا ہُوئے۔ سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ کے منصبِ خلافت سے دست بردار ہو جانے کے بعد ان کے معتقدین کے لیے سیاسی سرگرمیوں میں کوئی دلچسپی نہیں رہی اور انھوں نے مساجد کے اندر علم و عبادت کے واسطے گوشہ نشینی اختیار کی۔ اسی گوشہ نشینی و عزلت گزینی (اعتزال) کی وجہ سے وُہ "معتزلہ" کہلائے۔ مگر عہدِ مرتضوی کے معتزلہ اور عہدِ معاویہ کے ان معتزلہ کا بعد کے معتزلی فرقے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ملک کے عام سیاسی حالات نے بھی ثقافتی حالات کو متاثر کیا اور مختلف علمی تحریکوں کو پیدا کیا۔

امیر معاویہ عرب کے "دہاۃ اربعہ" (چار مدبروں) میں محسوب ہوتے تھے۔ ان کے تدبر اور سیاست کاری کی بدولت مختلف علوم کو ترقی ہُوئی۔

انھوں نے قبائلی عصبیت سے فائدہ اٹھانے کے لیے اپنے طرفدار قبائل کے شعراء کو نوازا۔ اس طرح شعر و شاعری کا مشغلہ جو بعثتِ اسلام کے بعد سے مُردہ ہو گیا تھا، پھر سے زندہ ہو گیا۔

سیاسی بصیرت کے لیے وہ اپنا بیشتر وقت ملوکِ گزشتہ کی سیرت سے واقفیت بہم پہنچانے میں صرف کرتے تھے۔ اس کے لیے انھوں نے یمن سے عبید بن شریہ کو بلوا کر تاریخ پر کتابیں لکھوائیں۔ اس طرح ان کے زمانہ میں تاریخ کے فن کی بنیاد پڑی۔

امیر معاویہ کا ایک اور کارنامہ "استلحاق" ہے۔ ایک شخص زیاد جو ایک لونڈی سمیہ کے بطن سے تھا مگر امیر معاویہ کے باپ کی ناجائز اولاد سے تھا، اسے حضرت علیؓ سے منحرف کرنے کے لیے اپنا سوتیلا بھائی قرار دے کر اپنے خاندان میں ملا لیا۔ حالانکہ یہ بات شرعاً ناجائز ہے اس سے لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور لوگ زیاد کی اس ناجائز پیدائش پر طعن و تشنیع کرتے تھے۔ اس لیے اس نے عربوں کے مختلف خاندانوں کے عیوب اور اخلاقی کمزوریوں پر ایک کتاب بعنوان "مثالب العرب" لکھی، جس سے آگے چل کر شعوبیوں نے بڑا فائدہ اٹھایا۔

یزید خلفائے اسلام میں پہلا شخص ہے، جس نے ملاہی و ملاعب میں انہماک کیا۔ سرجون رومی جو دیوانِ خراج کا افسرِ اعلیٰ اور عیسائی تھا، اس کے ساتھ بادہ گساری میں شریک ہوا کرتا تھا۔

اس عہد میں تفسیر قرآن کے تین اہم مرکز تھے: مکہ معظمہ میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ، مدینہ منورہ میں حضرت اُبی بن کعبؓ اور

عراق میں حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ تفسیر قرآن کا درس دیتے تھے۔ موخرالذکر کے تلامذہ میں سے بعد میں علقمہ بن قیس (المتوفی ۶۱ھ) سروق (المتوفی ۶۳ھ) اور اسود بن یزید (المتوفی ۷۴ھ) بھی یہی خدمات انجام دے رہے تھے۔

حدیث کے سلسلے میں اپنے ہادی و پیشوا کے ارشاداتِ گرامی اور اندازِ زندگی کے ساتھ مسلمانوں کا شغف و اہتمام اپنی آپ ہی مثال ہے اور اگرچہ وقتاً فوقتاً خود شارع نے اس سلسلے میں کچھ پابندیاں عاید کیں، مگر ان کے شوقِ بے پایاں میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ اکثر مشاہیر صحابہ نے اس عہد میں بھی حدیث کی روایت کو جاری رکھا۔ جن میں ام المومنین حضرت عائشہؓ، ابوہریرہؓ، عبداللہ ابن عمرؓ، عبداللہ ابن عباسؓ، عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ خاص طور پر مشہور ہیں۔ دوسرے طبقہ میں ابوسعید خدری، عقبہ بن عامر، جابرؓ بن عبد اللہ، انسؓ بن مالک، علقمہ بن قیسؓ، مسروق بن الاجدعؓ، اسود بن یزیدؓ، جبیرؓ بن نفیر الحضرمی، سویدؓ بن عقلہ، ام الدرداءؓ وغیرہم زیادہ مشہور ہیں۔

فقہ کے سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس عہد میں صحابہ کرامؓ قلمرو خلافت کے بڑے بڑے شہروں میں پھیل گئے تھے۔ ان کی وجہ سے جگہ جگہ مکاتبِ فقہ قایم ہوگئے۔ مشاہیر فقہائے صحابہ میں حضرت عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر، عبداللہ بن عمرو بن عاص خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ یہ چاروں بزرگ جن میں سے ہر ایک کا نام عبداللہ تھا "العبادلہ الاربعۃ" کہلاتے ہیں۔ عبداللہ بن عباس فقہ کے علاوہ تفسیر میں بھی سرآمد مفسرین روزگار تھے اور عہدِ صحابہ ہی میں "ترجمان القرآن" کہلاتے تھے۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں دعا دی تھی: اللھم فقھہ فی الدین وعلمہ التاویل۔ عبداللہ بن عمرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سے تقریباً ساٹھ سال تک افتا کا فریضہ ادا کرتے رہے۔ عبداللہ ابن زبیرؓ پہلے مسلمان تھے، جو مدینہ منورہ میں ہجرت کے بعد پیدا ہوئے۔ وہ یزید کے مقابلے میں مکہ معظمہ کے اندر خلیفہ ہو گئے تھے۔ مگر بعد میں جب حجاج نے حملہ کیا، تو اس میں شکست کھائی اور شہید ہوئے۔ وہ مناسکِ حج کے سب سے زیادہ واقف کار تھے۔

ان کے علاوہ اور بھی فقہا تھے، جیسے ابوسعید الخدری، ابوہریرہ، جابر بن عبداللہ الانصاری، رافع بن خدیج، سیدنا امام حسن، سیدنا امام حسین، زید بن ارقم، نعمان بن بشیر، سمرہ بن جندب الفزاری۔ ان میں سے منصب افتاء عبداللہ بن عباس، عبداللہ ابن عمر، ابوسعید الخدری، ابوہریرہ اور جابر بن عبداللہ انصاری کو حاصل تھا۔

لسانیات کے سلسلہ میں فنِ نحو کو حضرت علیؓ کے ایما سے ابوالاسود الدوئلی نے مدون کرنا شروع کیا تھا مگر اموی عہد میں کچھ ایسے واقعات پیدا ہوگئے کہ اس تدوین کو باقاعدہ طور پر مدون کرنا پڑا۔

زیاد بن ابیہ نے ابوالاسود الدوئلی سے استدعا کی کہ وہ نحو کے فن کو مدون کریں تاکہ لوگوں کو اس کی مدد سے فہمِ قرآن میں سہولت ہو۔ مگر ابوالاسود اس علم کو جسے انہوں نے حضرت علیؓ سے حاصل کیا تھا، عام کرنا نہیں چاہتے تھے، اس لیے انہوں نے زیاد سے معذرت کر لی۔ اب زیاد نے ایک شخص کو متعین کیا، جس نے قرآن غلط پڑھا۔ اس سے ابوالاسود کو بڑی تشویش ہوئی۔ وہ زیاد کے پاس پہنچے اور کہا، میں نہیں سمجھتا تھا کہ صورتِ حال اس درجہ بگڑ چکی ہے۔ اب زیاد نے قبیلہ بنی عبدالقیس کا ایک آدمی انھیں دیا اور وہ ان کے حسب تلفظ قرآن میں اعراب لگاتا جاتا تھا، مگر اس زمانہ میں اعراب کا طریقہ آجکل کے طریقوں سے مختلف تھا۔ اس زمانہ میں فتح کے لیے اُوپر نقطہ لگاتے تھے، کسرہ کے لیے نیچے اور ضمہ کے لیے حرف کے سامنے۔

اس زمانہ میں زندخاں کے کچھ ایرانی بصرہ میں آئے اور قدامہ بن مظعون کے ہاتھ پر ایمان لائے۔ ان میں ایک سعد نام کا بھی تھا۔ ابوالاسود نے اسے دیکھا کہ گھوڑے کو لیے جا رہا ہے اور پوچھا سوار کیوں نہیں ہوتے؟ سعد نے کہا "ان فوسی ضالعٌ"۔ حاضرین ہنسنے لگے مگر ابوالاسود نے کہا: یہ غیر عرب ہمارے بھائی ہیں۔ رغبتِ اسلام کی غرض سے عربی بولنا چاہتے ہیں مگر صحیح نہیں بول سکتے۔ اس لیے ہمیں ان کی مدد کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ اس کے بعد انھوں نے "فاعل ومفعول" کا باب مرتب کیا۔ یہ مبحث ابوالاسود کے شاگرد یحییٰ بن لیعمر کے ہاتھ کا لکھا ہُوا ابن الندیم (المتوفی ۳۸۰ھ) کے زمانہ تک موجود تھا اور اس نے اسے دیکھا۔

ابن الاسود دؤلی کے شاگردوں میں یحییٰ بن لیعمر کے علاوہ عنبسہ بن معدان (عنبسۃ الفیل)، میمون بن اقرن اور نصر بن عاصم کو خاص طور سے شہرت نصیب ہُوئی۔

مروانیوں کا عروج یزید بن معاویہ کے آخر عہدِ حکومت میں خانہ جنگی کا آغاز ہوا۔ مکہ معظمہ میں عبداللہ بن زبیرؓ نے اپنی خلافت کا اعلان کر دیا۔ یزید نے ان کے مقابلے میں ایک لشکرِ جرار بھیجا۔ مگر اس کی کامیابی سے پہلے ہی یزید کے دن پورے ہو گئے۔ اس کے بعد اس کا بیٹا معاویہ بن یزید خلیفہ ہوا مگر چالیس دن بعد وہ بھی راہیِ ملکِ عدم ہُوا۔ اب خود لشکرِ یزید کا رجحان اجتماع کلمہ ملت کی خاطر عبداللہ بن زبیر کی جانب تھا، مگر مروانیوں نے جو اُمویوں کے چچیرے بھائی ہوتے تھے، اسی خاندان میں خلافت قایم رکھنے کے لیے مروان بن الحکم کو خلیفہ بنا لیا۔ اُدھر سیدنا امام حسینؓ کے انتقام کی آگ عام مسلمانوں کے سینہ میں آتش زن تھی، ان کے اس جذبہ سے فائدہ اٹھا کر ایک شخص مختار ثقفی نے ان کے انتقام کے نام پر اموی حکام کے خلاف خروج کیا اور قاتلینِ حسینؓ کو چُن چُن کر ان کے کیفرِ کردار کو پہنچایا۔ اس کے بعد اس کا تصادم عبداللہ بن زبیر کی افواج سے ہُوا اور اسے شکست ہُوئی۔ اس طرح عبداللہ بن زبیر کی قوت بٹ گئی۔ اتنے میں مروان مر گیا اور اس کا بیٹا عبدالملک اس کا جانشین ہوا۔ اس کے سپہ سالار حجاج نے عبداللہ بن زبیر کو شکست دے کر انھیں قتل کر ڈالا۔ اس طرح عبدالملک پھر سے پُورے عالمِ اسلامی کا خلیفہ ہو گیا۔ (۷۳ھ)

عبدالملک نے ۸۶ھ میں وفات پائی اور اس کا بیٹا ولید خلیفہ ہُوا۔ اس نے بھی حجاج کو عراق کی گورنری پر برقرار رکھا۔ ولید کا زمانہ عظیم الشان فتوحات کے لیے مشہور ہے۔ مغرب میں طارق نے اندلس (اسپین) کو فتح کیا اور مشرق میں محمد بن قاسم نے ۹۳ھ میں سندھ کو اور ۹۵ھ میں ملتان کو فتح کیا اور اس طرح برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی حکومت قایم ہُوئی۔

ولید نے ۹۶ھ میں وفات پائی اور اس کا بھائی سلیمان بن عبدالملک خلیفہ ہُوا۔ وہ بڑا عادل اور نیک منش خلیفہ تھا۔ اسی نیک نفسی کا نتیجہ ہے کہ اس نے اپنے بعد اپنے بیٹے کو ولی عہد نہیں بنایا بلکہ اپنے چچا زاد بھائی عمر بن عبدالعزیز کے لیے وصیت کی۔

سلیمان کی وفات ۹۹ھ پر حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہُوئے۔ وُہ حضرت عمر فاروقؓ کے نواسے تھے۔ اس لیے خلیفہ ہو کر انھوں نے بھی حضرت عمرؓ کی طرح عدل و انصاف کو اپنا شعار بنایا مگر وُہ زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہے اور ۱۰۱ھ میں وفات پا گئے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے بعد امویوں کا زوال شروع ہُوا۔ یوں بھی پہلی صدی ختم ہو رہی تھی اور لوگ انقلاب کی توقع کر رہے تھے۔

خارجیوں کی شورشیں اس زمانہ میں بھی جاری رہیں اور ان کے مختلف فرقے ظہور میں آتے رہے۔ ان کے مقابلے میں فرقہ مرجئہ کی سرگرمیاں جاری رہیں۔ عقیدہ ارجاء کے سب سے سرگرم علمبردار اس زمانہ میں محمد بن حنفیہ (جو حضرت علیؓ کے صاحبزادے اور حضرات حسنینؓ کے سوتیلے بھائی تھے) کے صاحبزادے ابو ہاشم تھے۔

عہد صحابہ کے آخر میں عبداللہ بن زبیر یا عبدالملک کے عہدِ خلافت میں "قدریت" اسلامی فکر میں داخل ہُوئی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ بدعت یہود سے آئی۔ بعض کے نزدیک مجوسیوں سے آئی اور ایک قول یہ ہے کہ امویوں کے مظالم کے نتیجہ میں خود مسلمانوں ہی میں پیدا ہُوئی۔ بہرحال صحابہ کرام اس بدعت سے بیزار تھے۔ البتہ بعض اکابر تابعین کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کا اس جانب رجحان تھا ان میں حضرت حسن بصریؒ کا نام خاص طور سے مشہور ہے۔

عہدِ ماقبل کی طرح سیاسی حالات نے بھی ثقافتی حالات کو متاثر کیا، جس کے نتیجے میں مختلف علمی تحریکیں ظہور میں آئیں؛

معاویہ بن یزید کے بعد جب امویوں کا اقتدار کمزور پڑنے لگا، تو خاندان والوں نے مروان بن الحکم کو، جو خاندان میں سب سے زیادہ عمر رسیدہ تھا، اس شرط پر خلیفہ بنایا کہ اس کے بعد پہلے اس کا بیٹا عبدالملک خلیفہ ہوگا اور پھر یزید کا بیٹا خالد۔ مگر عبدالملک نے خلیفہ ہو کر خالد بن یزید کو ولی عہدی سے معزول کر دیا۔ مجبور ہو کر روپیہ کی ہوس میں خالد بن یزید نے کیمیا اور مہوسی کی طرف توجہ کی اور یونانی و قبطی زبانوں سے کیمیا، نیز طب و نجوم کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرایا اور اس طرح اس تحریک کا سنگِ بنیاد رکھا گیا، جو آگے چل کر منصور عباسی اور پھر مامون الرشید کے زمانہ میں اپنے عروج کو پہنچی۔ خالد بن یزید کا مترجم خاص اصطفن تھا۔

سیاسی مفاد کی بدولت امیر معاویہ کے زمانے سے مغربی دیوان خراج پر نصرانی اور مشرقی پر مجوسی چھائے ہُوئے تھے۔ یہ لوگ خود کو حکومتی نظام کی رُوحِ رواں سمجھتے تھے اور کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ عبدالملک نے ان کا زور توڑنے کے لیے دیوانِ خراج کو عربی میں منتقل کرا دیا۔ اس سے عربی زبان کی اہمیت بڑھ گئی اور آیندہ کے لیے ترجمہ کے واسطے فضا ہموار ہو گئی۔

عبدالملک کے بیٹے ولید کو تعمیرات سے بڑی دلچسپی تھی۔ اکثر عمارات اس کی بنوائی ہُوئی ہیں۔ ان میں دمشق کی جامع مسجد خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ تعمیرات کے علاوہ اس نے رفاہ عام کے بہت سے کام کیے؛ شفاخانے بنوائے، یتیموں کے لیے مکاتب کھلوائے، نادار، اپاہجوں اور مزمن امراض کے مریضوں کے لیے مکانات بنوائے، علماء و فقہاء کے لیے وظائف مقرر کیے۔

حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز عدل و انصاف میں عمر فاروقؓ کے ثانی تھے۔ اگر وُہ کچھ دن اور زندہ رہ جاتے، تو خارجیوں اور قدریوں کی بدعتیں ختم ہو جاتیں، کیونکہ ان دونوں بدعتوں کی اصل وجہ امویوں کا ظلم و ستم تھا۔ اُن سے پہلے بر سرِ منبر حضرت علیؓ کو بُرا بھلا کہا جاتا تھا، مگر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اسے موقوف کر کے خطبہ میں " ان اللہ یامر بالعدل والاحسان وایتائی ذی القربیٰ وینھیٰ عن الفحشاء والمنکر والبغی یعظکم لعلکم تذکرون" کا اضافہ کیا۔

جہاں تک علمی سرگرمی کا تعلق ہے، انھوں نے محدثین کو روایتِ حدیث کے لیے ترغیب دی۔ نیز محض نفع رسانی خلق کے لیے اہرن القس کی "طبی کناش" کا عربی میں ترجمہ کرایا۔

حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کے ہی عہدِ خلافت میں اسکندریہ کا مدرسہ فلسفیہ جو تقریباً ایک ہزار سال سے چلا آ رہا تھا، انطاکیہ میں منتقل ہوا۔

اوپر ذکر آ چکا ہے کہ تفسیر قرآن کے اہم مرکز تین تھے، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور عراق۔ مکہ معظمہ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے شاگرد یہ خدمت انجام دے رہے تھے۔ ان میں سعید بن جبیر (المتوفی ۹۵ھ)، مجاہد بن جبیر (المتوفی ۱۰۴ھ)، عکرمہ (المتوفی ۱۰۴ھ)، عطاء بن ابی رباح (المتوفی ۱۱۴ھ)، طاؤس بن کیسان (المتوفی ۱۰۶ھ) زیادہ مشہور ہیں۔

مدینہ منورہ میں حضرت ابی بن کعب کے تلامذہ تفسیر کا درس دیتے تھے۔ ان میں ابوالعالیہ (المتوفی ۹۰ھ)، محمد بن کعب القرظی (المتوفی ۱۱۸ھ)، زید بن اسلم (المتوفی ۱۳۶ھ) زیادہ مشہور ہیں۔

عراق میں حضرت عبداللہ بن مسعود کے شاگرد یہ خدمت انجام دیتے تھے۔ ان میں اسود بن یزید (المتوفی ۷۴ھ)، مرۃ الہمدانی (المتوفی ۷۶ھ)، عامر بن شرحبیل (المتوفی ۱۰۹ھ) اور الحسن البصری (المتوفی ۱۱۰ھ) زیادہ مشہور ہیں۔

حدیث کے ساتھ امت مسلمہ کے بے پناہ شغف و اہتمام کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، جو آج کے دن تک باقی ہے۔ حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز نے اپنے عہدِ خلافت میں مدینہ منورہ کے والی کو تدوین حدیث کے لیے تاکید کی تھی، اور جیسا کہ امام بخاری نے "صحیح" میں فرمایا ہے، لکھا تھا: "جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو تلاش کرو اور انھیں قلمبند کراؤ۔ کیونکہ مجھے علم کی بوسیدگی اور علماء کے ختم ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث قبول کرو۔ علم کی علانیہ اشاعت کرو، تاکہ نہ جاننے والے بھی جان جائیں۔ علم جبھی ضائع ہوتا ہے جب کہ چند مخصوص لوگوں کی ملکیت بن جائے۔" اس ترغیب و تشجیع کا نتیجہ ظاہر ہے۔ چنانچہ عہد کے مشاہیر محدثین میں امام زین العابدین، ابراہیم النخعی، سعید بن مسیب، سعید بن الجبیر، حسن البصری، عروہ بن الزبیر، ابو رجاء العطاردی، ابوالعالیہ، جابر بن زید، عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود، شعبی، سالم بن عبداللہ بن عمر، طاؤس بن کیسان، عطاء بن لیسار، سلیمان بن لیسار، مجاہد بن جبیر، عطا بن ابی رباح خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

ادھر صحابہ کرام نے مختلف شہروں میں جا کر فقہ کے مکاتب قایم کر دیے تھے۔ چنانچہ اس عہد میں مدینہ منورہ کے اندر جو جو فقہاء ہوئے، ان میں سعید المسیب (المتوفی ۹۴ھ)، عروہ بن الزبیر (المتوفی ۹۴ھ)، محمد بن الحنفیہ (المتوفی ۷۲ھ) علی بن الحسین زین العابدین (المتوفی ۹۴ھ) حسن بن محمد بن الحنفیہ (المتوفی ۱۰۰ھ) قاسم بن محمد بن ابی بکر الصدیق (المتوفی ۱۰۲ھ) ابوبکر بن عبدالرحمٰن (المتوفی ۹۴ھ) عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود (المتوفی ۹۹ھ) سالم بن عبداللہ بن عمر (المتوفی ۱۰۶ھ) خارجہ بن زید بن ثابت (المتوفی ۱۰۰ھ) سلیمان بن لیسار (المتوفی ۱۰۷ھ) ابوسلمہ ابن عبدالرحمٰن الزہری (المتوفی ۱۰۴ھ) زیادہ مشہور رہیں۔

ان کے علاوہ مدینہ منورہ میں دو فقیہ ایسے بھی تھے، جو بعد میں منصبِ خلافت پر فائز ہوئے: ایک عبدالملک بن مروان اور دوسرے حضرت عمر بن عبدالعزیز۔ فقہاے مکہ میں عطاء بن رباح، مجاہد بن جبیر، عبداللہ بن ابی ملیکہ اور عکرمہ مولی ابن عباس زیادہ مشہور تھے۔ فقہاے بصرہ میں حسن البصری، جابر بن یزید الازدی (المتوفی ۹۳ھ) محمد بن سیرین (المتوفی ۱۱۰ھ)

ابو العالیہ ، مسلم بن یسار، ابو قلابہ (المتوفی ۱۰۶ھ) اور فقہائے کوفہ میں ابو مسلم عبیدہ بن عمر السلمانی (المتوفی ۷۲ھ) شریح بن الحارث القاضی (المتوفی ۸۲ھ) الحارث الاعور، عامر بن شراحیل الشعبی، سعید بن جبیر اور ابراہیم بن یزید زیادہ مشہور تھے۔ ان کے علاوہ یمن میں طاؤس بن کیسان، وہب بن منبہ، عطا بن مرہود، شراحیل بن شرجیل الصنعانی، شام میں ابو ادریس الخولانی، مکحول ابن حوشب الاشعری اور مصر میں ابو عبداللہ عبدالرحمٰن بن عسیلہ الصنابحی، ابو تمیم عبداللہ بن مالک بن الجشانی وغیرہم تھے۔

اوپر ذکر آچکا ہے کہ نحو کی بنیاد حضرت علیؓ کے ایماء سے ابو الاسود الدوئلی نے ڈالی تھی۔ بعد میں انھوں نے زیاد بن ابیہ کے زمانہ میں اسے منظم طور پر مدون کیا۔ اُن کے بعد اُن کے شاگردوں نے اس علم کو ترقی دی۔ ان میں نصر بن عاصم کو خاص طور سے شہرت حاصل ہوئی۔ حتیٰ کہ بعض لوگ تو انھیں نحو کا واضع سمجھتے ہیں۔ نصر بن عاصم کے شاگرد خصوصی ابو عمر بن العلاء تھے۔

نصر بن عاصم نے حجاج بن یوسف کی ولایت عراق کے زمانہ میں حروف متشابہ پر نقطے لگا کر عربی حروف کی کتابت کو مکمل کر دیا۔

مروانیوں کا زوال حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کے ساتھ "خلافت علیٰ منہاج النبوۃ" کا ادارہ ختم ہوگیا۔ ان کے بعد یزید بن عبدالملک خلیفہ ہوا۔ (۱۰۱ھ) وہ چالیس دن تو اپنے پیشرو کے نقش قدم پر چلا مگر پھر مروانی تجبر کی طرف منحرف ہوگیا۔ اس کے زمانہ میں یزید بن المہلب نے خروج کیا۔ خلیفہ نے اس کی تادیب کے لیے اپنے بھائی مسلمہ بن عبدالملک کو بھیجا۔ یزید بن مہلب کو شکست ہوئی اور عقیر کے مقام پر، جو کربلا سے قریب ہے، قتل کیا گیا۔ مورخ کلبی نے اپنے بچپن کی سُنی ہوئی بات نقل کی ہے:

"ضحیٰ بنو امیۃ یوم کربلاء بالدین ویوم العقیر بالکرم"

"بنو امیہ نے دین اور شرافت دونوں کو ذبح کر دیا، دین کو کربلا میں اور شرافت کو میدانِ عقیر میں"

یزید بن عبدالملک نے ۱۰۵ھ میں وفات پائی اور اس کا جانشین اس کا بھائی ہشام بن عبدالملک ہوا، جس نے ۱۲۵ھ تک حکومت کی۔ مسعودی نے لکھا ہے کہ اموی خلفاء میں تین مدبرین گزرے ہیں۔ تیسرا مدبر ہشام تھا۔ اس کے بعد اس کا بھتیجا ولید بن یزید خلیفہ ہوا۔ وہ بڑا فاسق و بدکار تھا، جسے توہینِ شریعت میں بھی باک نہ تھا۔ آخر اس کے فسق و فجور سے ناراض ہو کر لوگوں نے بغاوت کی اور سال بعد اُسے محصور کر کے قتل کر ڈالا۔

ولید بن یزید کے بعد اس کا چچازاد بھائی یزید بن ولید خلیفہ ہوا۔ وہ قدیم بادشاہوں کا نواسہ ہوتا تھا، کیونکہ اس کی ماں ساسانی تاجدار یزدجرد کی پوتی اور اس کی نانی خاقانِ ترکستان اور قیصر روم کی اولاد میں سے تھی۔ اسے خود اپنی عالی نسبی پر ناز تھا۔ چنانچہ کہا کرتا تھا: ؎

انا ابن کسریٰ وابی مروان
وقیصر جدی وجدی خاقان

(میں کسریٰ کا بیٹا (نواسہ) ہوں اور میرا باپ (دادا) مروان ہے اور قیصر میرا نانا ہے اور دوسرا نانا خاقان ہے)

چونکہ اس نے خلیفہ ہوکر فوج کی تنخواہ کم کردی تھی، اس لیے وُہ یزید الناقص کہلاتا تھا ویسے وُہ بڑا دیندار تھا اور معتزلہ کے مسلک کی طرف رجحان رکھتا تھا۔ اسی لیے خلیفہ ہوکر اس نے غیلان دمشقی کے پیرؤوں کو جو فرقہ قدریہ کا سرگروہ تھا، تقرب بخشا۔ یہی وجہ ہے کہ معتزلہ یزید بن ولید کو حضرت عمر بن عبدالعزیز پر بھی ترجیح دیتے ہیں۔

مگر یزید چھ مہینے سے زیادہ زندہ نہ رہا اور اس کے کچھ دن بعد مروان الحمار خلیفہ ہوا۔ وہ بڑا جفاکش اور محنتی تھا۔ (اسی وجہ سے "حمار" کہلاتا تھا) دوسرا لقب "جعدی" تھا کیونکہ وہ جعد بن درہم کا شاگرد تھا، جو مسلمانوں میں مسلک "تعطیل" کا بانی ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے کہ اسی "تعطیل" کی نحوست اس کے ساتھ اموی خلافت کو بھی لے ڈوبی۔ اس کا زمانہ شورشوں کے فرو کرنے کی کوشش میں گزرا۔ مگر اب اموی اقتدار کے دن ختم ہو چکے تھے۔ خراسان میں عباسیوں کے طرف داروں نے خروج کیا۔ اُن کی سربراہی ابومسلم خراسانی کر رہا تھا۔ مروان کو شکست پر شکست ہُوئی اور وہ مصر کی طرف بھاگنا چاہتا تھا کہ بوصیر کے مقام پر پکڑا گیا اور قتل ہُوا۔ اس طرح اموی خلافت ختم ہوئی اور عباسی خلافت کا آغاز ہوا۔

ہشام بن عبدالملک کے زمانہ میں سیدنا زید بن علیؓ نے خروج کیا، مگر ناکام ہوکر شہید ہُوئے۔ ان کے پیرو "شیعہ زیدیہ" کہلاتے ہیں۔ وُہ خلافت کا مستحق تو آلِ علیؓ ہی کو سمجھتے ہیں مگر دُوسرے شیعہ فرقوں کی طرح "شیخین" (حضرت ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ) کو بُرا نہیں کہتے۔ جن لوگوں نے ان کا ساتھ دیا، ان میں امام ابوحنیفہ بھی تھے۔ اسی لیے ہشام نے انھیں کوڑوں سے پٹوایا تھا۔

اسی زمانہ میں اکابر تابعین میں سے حسن بصری کا حلقہ بصرہ میں قائم تھا۔ صوفیاء کرام کے سلسلے عموماً انھیں کے واسطے سے حضرت علیؓ تک پہنچتے ہیں۔ ان کے تلامذہ میں دو شخص واصل بن عطا الغزال اور عمرو بن عبید مشہور ہیں۔ اس زمانہ میں "مرتکب کبیرہ" کا مسئلہ بڑے زوروں سے چل رہا تھا۔ خارجی لوگ گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کافر کہتے تھے۔ ان کے مقابلہ میں فرقہ مرجئہ تھا، جس کے سرگرم علمبردار اس زمانہ میں محمد بن حنفیہ کے صاحبزادے ابوہاشم تھے۔ مرجئہ کا کہنا تھا کہ جس طرح کافر کا نیک عمل اسے فائدہ نہیں پہنچاتا، اسی طرح گناہ ایمان کو نقصان نہیں پہنچاتا۔

کہتے ہیں کہ ایک دن ایک شخص حسن بصریؒ کے پاس آیا اور "مرتکب کبیرہ" کا حکم دریافت کیا۔ وہ ابھی جواب بھی نہ دینے پائے تھے کہ واصل بول اٹھا کہ وہ نہ کافر ہے، نہ مسلمان، بلکہ دونوں کے "بین بین" ہے۔ اس عقیدہ کو جو "المنزلۃ بین المنزلتین" کہلاتا ہے، احداث کرنے کی بنا پر وہ دونوں حسن بصری کے حلقۂ تلمذ سے نکالے گئے یا کنارہ کش ہوگئے۔ (اعتزال) اسی لیے محض مورخین کے قول کی بنا پر وہ اور ان کے متبعین "معتزلہ" کہلاتے ہیں۔ لیکن غالباً معتزلہ کا فرقہ اس سے پہلے سے موجود تھا۔ کیونکہ ابوالفرج اصفہانی نے "الاغانی" میں لکھا ہے کہ بصرہ میں چھ آزاد خیالوں بشار بن برد، صالح بن عبدالقدوس، عبدالکریم بن ابی العوجا، واصل بن عطا، عمرو بن عبید اور ایک ازدی شخص (جس کے مکان پر ان لوگوں کی نشست ہُوا کرتی تھی) کی انجمن تھی۔ آخر میں ازدی نیربان توسمنی (بُدھ مذہب کا پیرو) ہوگیا اور باقی لوگوں نے دُوسرے مسالک اختیار کیے۔ ان میں سے واصل بن عطا اور عمرو بن عبید کے متعلق لکھا ہے:

"فصاما الی الاعتزال" (وہ دونوں اعتزال یا معتزلہ کے مذہب کی طرف مائل ہوگئے)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب اعتزال واصل اور عمرو بن عبید سے کہیں پہلے سے تھا۔

جو کچھ بھی ہو اس زمانہ میں معتزلہ کا بہت زیادہ اثر تھا کیونکہ انھیں معتزلہ کی مدد سے یزید بن ولید اپنے پیشرو ولید بن یزید کو تخت سے اتار کر خود خلیفہ ہُوا تھا۔ بہرحال اصطلاحی "معتزلہ" کا آغاز واصل بن عطا اور عمرو بن عبید نے کیا۔

اس زمانہ میں بھی "قدریت" (انسان کے فاعل مختار ہونے کا عقیدہ) آزاد خیال حلقے میں بہت زیادہ شایع رہا۔ حتیٰ کہ اکابر تابعین میں سے بعض جلیل القدر تابعی جیسے حسن بصری، مکحول، قتادہ بن دعامہ وغیرہم اس عقیدے کی جانب مائل تھے۔ کھلے ہوئے قدریوں میں غیلان دمشقی، واصل بن عطا، عمرو بن عبید تھے۔ "قدر" کے ردعمل کے طور پر "جبر" کا عقیدہ پیدا ہُوا۔ جس کا بانی جہم بن صفوان تھا۔

دوسری صدی کی ابتدا میں کلامِ باری کا مسئلہ پیدا ہُوا اور اس کے ساتھ "تعطیل" کی بدعت (یعنی اللہ تعالیٰ کسی صفت سے متصف نہیں ہے) اسلامی فکر میں در آئی۔ یہ دراصل یہودیوں کا اندازِ فکر تھا۔ ان میں سے تفلسف زدہ طبقہ توریت کے کلامِ باری ہونے کا منکر تھا۔ بعثتِ اسلام کے وقت لبید بن اعصم یہودی، جس نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو زہر دیا تھا، اس عقیدے کا قائل تھا لبید سے اس کے بھانجے طالوت نے اور طالوت سے بنان بن سمعان نے اس عقیدے کو اخذ کیا۔ بنان بن سمعان سے جعد بن درہم نے یہ عقیدہ لیا۔ اس سے بڑی بے چینی پھیلی اور ہشام نے عراق کے گورنر خالد بن عبداللہ القسری کو جعد بن درہم کے قتل کا حکم دیا۔ خالد نے عید اضحیٰ کے دن خطبہ کے بعد اسے خود اپنے ہاتھ سے ذبح کیا۔

جعد سے یہ بدعت جہم بن صفوان نے لی (جو عقیدہ "جبر" کا بھی بانی ہے) وہ بھی صفاتِ باری تعالیٰ کا منکر تھا اور اسی کے نام پر صفاتِ باری کے انکار کا عقیدہ "تجہم" یا "جہمیت" کہلاتا ہے۔ جہم ۱۲۸ ھ کی خانہ جنگیوں میں خراسان کے اندر قتل ہوا۔

بہرحال اس صفاتِ باری کے انکار (تعطیل)، بالخصوص قرآن کے مخلوق ہونے کے عقیدہ نے بڑی خطرناک شکل اختیار کر لی اور علمائے محدثین نے بڑی سختی سے اس کی مذمت کی۔ پھر بھی یہ ترقی کرتا رہا اور اسی "مسئلہ کلامِ باری" کی وجہ سے اسلام کو عقلیت کی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش کا نام "کلام"، اور اس کے علمبرداروں کا نام "متکلمین" قرار پایا۔

اہل السنت والجماعت کے حلقوں میں یہ عہد امام ابوحنیفہ کی تدوینِ فقہ کے لیے مشہور ہے وہ پہلے علم کلام کے عالم متبحر تھے مگر بعد میں فقہ کی طرف متوجہ ہُوئے اور حماد بن ابی سلیمان کی، جو اس زمانہ میں فقہائے کوفہ کے شیخ تھے، شاگردی اختیار کی۔ حماد کی وفات پر امام ابوحنیفہ ہی ان کے جانشین بنے اور اس فقہی نظام کی بنا ڈالی، جو "حنفی فقہ" کہلاتا ہے اور جو اس وقت دنیا کا عموماً اور برصغیر کے مسلمانوں کا خصوصاً مذہب ہے۔

دوسری زبانوں سے عربی میں ترجمہ کی تحریک جسے پچھلی صدی میں خالد بن یزید نے جاری کیا تھا، اس صدی میں بھی جاری رہی مگر خالد بن یزید یا حضرت عمر بن عبدالعزیز کی طرح خلفا اور امرا نے ان مترجمین کی سرپرستی نہیں کی۔ اموی خلفا کے اکثر کتاب (دیوان کتابت یا سکرٹریٹ کے عہدہ دار) محض تفننِ طبع کے طور پر یونانی اور فارسی سے عربی میں ترجمہ کیا کرتے تھے۔ ان میں جبلہ بن سالم کا نام خاص طور سے مشہور ہے۔ ۱۱۳ھ میں بعہد ہشام بن عبدالملک ایران کے اندر ساسانیوں کی ایک لائبریری ملی، جس کی

کتابیں بوسیدہ ہو چکی تھیں۔

کہتے ہیں کہ امویوں ہی کے عہد میں خراسان کے اندر کاغذ کا کارخانہ قایم ہُوا، ورنہ اس سے پہلے ایران میں کھالوں پہ لکھا جاتا تھا۔

امویوں کے عہد زوال میں نجوم اور جوتش کو بھی بڑا فروغ ہُوا۔ مگر اس کی تفصیل ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ اس لیے ذیل میں صرف دینی علوم کی ترقی کا اجمالی جائزہ پیش کیا جا رہا ہے:

سابق عہد کے مفسرین میں سے بعض اربابِ کمال اس عہد تک زندہ رہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہؓ بن عباس کے تلامذہ میں سے عطا بن ابی رباح (المتوفی ۱۱۴ھ)، حضرت ابی بن کعب کے تلامذہ میں سے محمد بن کعب القرظی (المتوفی ۱۱۸ھ) اور زید بن اسلم (المتوفی ۱۳۶ھ) اور حضرت عبداللہؓ بن مسعود کے تلامذہ میں سے عامر بن شراحیل (المتوفی ۱۰۹ھ) اور سیدنا امام حسن بصریؒ (المتوفی ۱۱۰ھ) کی سرگرمیاں اس عہد میں بھی جاری رہیں۔

ان کے علاوہ اس عہد کے مشاہیر مفسرین میں سے عمرو بن دینار، قتادہ بن دعامہ، سیدنا امام محمد بن باقر، ابو اسحاق سلیعی، ابوالزناد اور ہشام بن عروہ رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

سابق عہد میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کی دلچسپی سے حدیث کے ساتھ اعتنا کو خصوصی ترقی حاصل ہُوئی۔ اس عہد میں بھی یہ ترقی جاری رہی۔ چنانچہ اس عہد کے مشاہیر محدثین میں سے ذہبی نے "تذکرۃ الحفاظ" میں امام حسن بصری (المتوفی ۱۱۰ھ) محمد بن سیرین (المتوفی ۱۱۰ھ) میمون بن مہران (المتوفی ۱۱۷ھ) نافع (المتوفی ۱۱۷ھ) وہب بن منبہ (المتوفی ۱۱۴ھ) مکحول (المتوفی ۱۱۳ھ) زہری (المتوفی ۱۲۴ھ) عمرو بن دینار (المتوفی ۱۲۶ھ) ابوسعید مقبری (المتوفی ۱۲۵ھ) قتادہ بن دعامہ (المتوفی ۱۱۸ھ) امام محمد باقر (المتوفی ۱۱۴ھ) محمد بن المنکدر (المتوفی ۱۳۰ھ) یحییٰ بن ابی کثیر (المتوفی ۱۲۹ھ) ایوب السختانی (المتوفی ۱۳۱ھ) زید بن اسلم (المتوفی ۱۳۶ھ) سلمہ بن دینار (المتوفی ۱۴۰ھ) ابوالزناد (المتوفی ۱۳۱ھ) منصور بن زاذان (المتوفی ۱۳۱ھ) ہشام بن عروہ بن زبیر (المتوفی ۱۴۶ھ) یونس بن عبید (المتوفی ۱۳۹ھ) موسیٰ بن عقبہ (المتوفی ۱۴۱ھ) خالد الحذاء (المتوفی ۱۴۲ھ) سلیمان التیمی (المتوفی ۱۴۳ھ) حمید الطویل (المتوفی ۱۴۲ھ) ابو اسحاق الشیبانی (المتوفی ۱۳۸ھ) الاعمش (المتوفی ۱۴۸ھ) ابومسعود الحریری (المتوفی ۱۴۴ھ) اور ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن (المتوفی ۱۳۶ھ) کا تذکرہ کیا ہے۔

فقہ کے اندر مختلف شہروں میں فقہائے کرام نے جو مختلف فقہی مکاتب قایم کیے تھے، وہ ان کے تلامذہ کی مساعیٔ جمیلہ سے اس عہد میں بھی ترقی کرتے رہے، جیسے مکہ معظمہ میں عبداللہ بن ابی ملیکہ (المتوفی ۱۱۹ھ) عکرمہ مولی ابن عباس (المتوفی ۱۱۵ھ) عطا ابن ابی رباح (المتوفی ۱۱۵ھ) عمرو بن دینار (المتوفی ۱۲۶ھ) اور عبداللہ بن ابی نجیح (المتوفی ۱۳۲ھ) مدینہ منورہ میں ابن شہاب الزہری (المتوفی ۱۲۴ھ) امام باقر (المتوفی ۱۱۴ھ) عبدالرحمٰن بن القاسم بن محمد بن ابی بکر (المتوفی ۱۲۶ھ) ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن (المتوفی ۱۳۶ھ) (جو ربیعۃ الرائے کے نام سے مشہور ہیں) اور ابوالزناد (المتوفی ۱۳۰ھ) یمن میں طاؤس

بن کیسان (المتوفی ۱۰۶ھ) اور وہب بن منبہ (المتوفی ۱۱۴ھ) شام میں مکحول (المتوفی ۱۱۸ھ) سلیمان بن موسیٰ الاشدق (المتوفی ۱۱۹ھ) یحییٰ بن یحییٰ الغسانی (المتوفی ۱۳۵ھ) اور میمون بن مہران (المتوفی ۱۱۷ھ) کوفہ میں حکم بن عینیہ (المتوفی ۱۱۵ھ) حبیب بن ابی ثابت (المتوفی ۱۱۷ھ) اور حماد بن ابی سلیمان (المتوفی ۱۱۹ھ) اور بصرہ میں حسن بصری (المتوفی ۱۱۰ھ) محمد بن سیرین المتوفی ۱۱۰ھ) ابوالعالیہ (المتوفی ۱۰۶ھ) قتادہ بن دعامہ (المتوفی ۱۱۷ھ) ایوب السختانی (المتوفی ۱۳۱ھ) یونس بن عبید (المتوفی ۱۳۶ھ)

ان ناموں کی فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ علماء کرام بیک وقت تفسیر، حدیث اور فقہ میں دستگاہ عالی رکھتے تھے۔

ابھی ائمہ اربعہ کا زمانہ نہیں آیا تھا۔ البتہ اس کی ابتداء ہو گئی تھی۔ کیونکہ مروجہ مذاہب فقہیہ کے اماموں میں سب سے مقدم امام ابوحنیفہؒ تھے۔ زیر نظر عہد کا ثلث آخر ان کے علمی تبحر اور فقہی شہرت کا زمانہ ہے۔

امام ابوحنیفہؒ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے۔ وقت کے عام دستور کے مطابق تعلیم حاصل کی۔ اکثر صحابہ کرام کی بھی زیارت کی اور ان میں سے بعض سے احادیثِ رسولؐ بھی سماع فرمائیں۔ اس لیے وہ تابعین (متاخرین) میں محسوب ہوتے ہیں۔ شروع میں علم کلام کے اندر وہ دست گاہ عالی حاصل کی کہ اس فن میں سرآمد فضلائے روزگار قرار پائے۔ چنانچہ امام شافعیؒ کا قول ہے:

"الناس عیال علی ابی حنیفہ فی الکلام۔"

لیکن بعد میں فقہ کی اہمیت کے پیش نظر اس علم کو اپنا مقصدِ حیات بنا لیا۔ ہُوا یہ کہ کوفہ کی مسجد کے اندر مختلف علمائے عالی مرتبت کے حلقے قایم ہوتے تھے۔ ان میں سے ایک حلقہ درس امام ابوحنیفہ کا تھا، جس میں بکثرت طالبانِ علم شریک ہوتے تھے۔ ایک دن ایک بدوی عورت کوئی شرعی مسئلہ پوچھنے آئی۔ امام صاحب کے حلقہ تلامذہ کی کثرت سے متاثر ہو کر سیدھی امام صاحب کے پاس پہنچی اور جا کر وہ مسئلہ دریافت کیا۔ امام صاحب نے کہا مجھے نہیں معلوم۔ مگر وہ صاحب (امام حماد بن ابی سلیمان) جو سامنے بیٹھے ہیں، اُن سے پوچھ لو۔ عورت بدویہ نے بڑی ترش روئی سے کہا: کیسے عالم ہو، اتنی بڑی تعداد شاگردوں کی لیے بیٹھے ہو مگر ایک عورت کو مسئلہ نہیں بتا سکتے۔ بدوی عورت کے اس چبھتے ہُوئے طعنہ نے امام صاحب کی زندگی کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ حلقہ درس کو برخاست کیا اور اٹھ کر امام حماد بن ابی سلیمان کے پاس پہنچے اور ان سے جا کر فقہ پڑھنے کی درخواست کی پہلے تو انھیں یقین نہ آیا مگر جب امام صاحب کو بقصد دیکھا تو پھر انھیں اپنا شاگرد کر لیا اور فرمایا: روزانہ صرف پانچ مسئلے حل کیا کرو۔ ظاہر ہے امام صاحب جیسا عبقری روزگار جس کے ذہن میں مدت العمر کے علم کلام کی ممارست نے غیر معمولی حدت اور درّاکی پیدا کر دی تھی، جب ایک دن میں صرف پانچ مسئلے سیکھتا ہوگا، تو ان میں کس درجہ بصیرت و حذاقت بہم پہنچاتا ہوگا۔ اس بصیرت و حذاقت نے ان کے فقہی نظام کو یہ دیرپائی اور قبول عام بخشا کہ آج بھی وہ سوادِ اعظم کا معمول بہ ہے۔

امام صاحب نے بے شمار شیوخ سے علم حاصل کیا اور بے شمار شاگردوں نے ان سے کسبِ فیض کیا، جن میں سے دو بزرگ خصوصیت سے مشہور ہیں، امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ (جو دونوں "صاحبین" کہلاتے ہیں) مگر ان کی مساعی علمیہ اور اس طرح امام ابوحنیفہؒ کے بعد کی فقہی سرگرمیاں عباسی عہد کے پہلے دور کے تحت میں آتی ہیں، جو ہمارے موضوع سے باہر ہے۔

ادبِ نبویؐ

سیّد شمیم احمد

دوسری اقوام نے اپنے بزرگوں کے ساتھ اپنی محبت میں اتنا غلو دکھایا کہ ان کے بُت تراش کر پوجنے لگے اور انہیں خدا کا شریک بنا ڈالا۔ لیکن اسلام میں بت پرستی تو کجا بُت تراشی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر بنانے کی بھی اجازت نہیں۔ اس لیے مسلمانوں نے شعر وادب میں عشقِ رسولؐ کا اظہار کیا مگر اس میں بھی احتیاط کا دامن نہ چھوڑا اور رسولؐ کی مدح بھی اس سے زیادہ نہ کر سکے : ع

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

لیکن رسولؐ کی شان میں کسی قسم کی بے ادبی اور گستاخی کی بھی جرأت نہ ہو سکی اور ہمیشہ یہ شعر سامنے رہا کہ : ؎

ہزار بار بشویم دہن بہ مشک و گلاب
ہنوز نامِ تو گفتن کمالِ بے ادبی است

حضرت نظام الدین اولیاء جیسے بزرگ فرماتے ہیں : ؎

بنہ بہ چندیں ادب طرازی سرِ ارادت بخاکِ آں کو
صلواۃِ وافر بروحِ پاکِ جنابِ خیر الانام بر خواں

اسی عشق وادب کے سبب سلام اور نعت جیسے اصناف ادب میں داخل ہوتے۔ سلام تو خیر دوسرے بزرگوں کی شان میں بھی کہے جاتے ہیں، مگر نعت صرف رسولِ خدا کے لیے مخصوص ہے۔ نعت میں رسول کریمؐ کے ذاتی اوصاف، نسلی برتری، دوسرے پیغمبروں کے مقابلہ میں فضیلت، رسولؐ کے آبا و اجداد اور آل و اصحاب کی مدح کا ذکر ہوتا ہے۔ نیز اپنے گناہوں کا احساس اور اشکِ ندامت، رسولؐ سے شفاعت طلبی، اپنے غموں کے مداوا کے لیے رسولؐ سے فریاد، مدینہ جا کر رسولؐ کے روضہ پاک کی زیارت کی تمنا، خواب میں دیدار کی آرزو، مدینہ میں دفن ہونے کی خواہش جیسے مضامین بھی نعت کا موضوع ہیں۔ پہلے تو قصے کہانیوں اور دوسرے موضوع کی تصانیف میں عموماً یہ قاعدہ تھا کہ حمد اور نعت ضروری ہوتی تھیں۔ رسولؐ کے ساتھ اظہارِ عشق میں سب سے اچھوتا خیال شاہ علی حبیب نصر پھلواری نے پیش کیا ہے۔ عام طور سے شعراء رسولؐ سے یہی درخواست کرتے رہے ہیں کہ انہیں مدینہ بلا لیا جاتا۔ لیکن حضرت نصرؔ فرماتے ہیں : ؎

صبا بگوشش اگر توانی ز نصرؔ مسکیں بگو پیامے
کہ عمر باشد در انتظارم بیا محمدؐ بیا محمدؐ

ایسی مثالیں دوسروں کے ہاں کم ملتی ہیں۔ بہر حال مجموعی حیثیت سے رسولؐ کے ساتھ اظہارِ عقیدت کرتے وقت توازن برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی جاتی ہے۔ سخت احتیاط و توازن کے باوجود ادبِ نبویؐ کا اتنا بڑا ذخیرہ دنیا میں جمع ہو چکا ہے کہ شاید کسی اور

ایسے موضوع پر نہ ہو دنیا کی تقریباً تمام ترقی یافتہ زبانوں کے ادب کا ایک بڑا حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق بھی ملے گا۔
تنوع کے لحاظ سے بھی ادب نبویؐ کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ نظم و نثر کے جملہ اصناف میں اس پر قلم اٹھایا گیا ہے اور ہر زبان
میں۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی چیزیں ظہور میں آئیں جنھیں عربی ادب کا زریں سرمایہ خیال کیا جاتا ہے۔ مجموعی حیثیت سے
ادب نبویؐ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جس کا تعلق خود رسول اللہؐ سے ہے، جیسے احادیث، مکاتیب اور خطبات وغیرہ۔
دُوسرا وہ جو رسول اللہ کی سیرت، تعلیمات اور کارناموں سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں نظم و نثر دونوں شامل ہیں۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و احکام اور ہدایات کو آپؐ کے دورِ حیات ہی میں صحابہ نے لکھ کر محفوظ کر لیا تھا۔

احادیث بعض صحابہ کے پاس احادیث کا اچھا خاصہ مجموعہ موجود تھا مگر یہ مجموعے مختصر تھے اور ان میں عموماً وہی حدیثیں تھیں جو انہوں نے
خود سُنی تھیں۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، لوگوں میں احادیث جمع کرنے کا شوق بڑھا اور ان کی اشاعت کی ضرورت بھی زیادہ محسوس ہونے لگی۔
خلفاے عباسیہ کے دور میں لاکھوں حدیثیں جمع ہوگئیں، ان میں بہت سی غلط اور مشتبہ حدیثیں تھیں، جنھیں علماء و محققین نے روایت و درایت
کے معیار پر جانچنے کے بعد الگ الگ کیا۔ حدیثوں کے بہت سے مجموعے مرتب ہُوئے۔ جن میں حضرت امام مالک کی مؤطا، مسند امام احمد
بن حنبل، بخاری، مسلم، ابن ماجہ، ابی داؤد، نسائی، ترمذی، مشکوٰۃ اور مشارق الانوار وغیرہ کو بہت مقبولیت حاصل ہُوئی۔ یہ احادیث
عربی ادب میں بلند مقام رکھتی ہیں۔ یہ طے شدہ ہے کہ عربی ادب کا سب سے اعلیٰ نمونہ خود قرآن مجید ہے۔ اس کے بعد حدیثوں کا درجہ ہے۔
یہ بھی رسول اللہؐ کا عظیم معجزہ ہے کہ اُمّی ہونے کے باوجود زبان سے ایسے فصیح و بلیغ الفاظ نکالے، بقول سعدیؔ: ؎

یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست
کتب خانۂ چند ملت بشست

بدر اور اُحد کی جنگوں کے بعد ہی اہل مکہ کو احساس ہوگیا تھا کہ مسلمان عرب کی بڑی طاقت بن چکے ہیں اور وہ اسلام کے
مکاتیب داعی ہیں۔ اس لیے قریش نے مسلمانوں کے ساتھ جنگ بندی کا معاہدہ کر لیا۔ جو تاریخ میں صلح حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے۔
اس سے مسلمانوں کو یہ فائدہ ہُوا کہ انھیں قبائلِ عرب میں عام تبلیغ کا موقع مل گیا۔ حضرت سردرِ کائناتؐ نے پڑوسی سلاطین اور عرب سرداروں
کے نام مکاتیب بھی بھیجے، خصوصاً کسریٰ ایران، خسرو پرویز، قیصر روم، ہرقل اعظم، شاہ مقوقس، مصر اور نجاشی، شاہِ حبش کے نام جو
خطوط بھیجے گئے تھے۔ وہ فصاحت و بلاغت کے بے مثال نمونہ ہیں۔
اللہ نے ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطابت کی جملہ خصوصیات سے نوازا تھا۔ صحابہ کی مجلس ہو یا مخالفین کا

خطبات مجمع، حج کا اجتماع یا عکاظ کا بازار، آپؐ جہاں بھی بولنے کھڑے ہوتے، لوگ مسحور ہو جاتے۔ اسی وجہ سے اُبوجہل نے
آپؐ کو جادوگر مشہور کر رکھا تھا اور وُہ یہی کوشش کرتا کہ آپ کسی کے سامنے تقریر نہ کرنے پائیں۔ بعثت کے بعد جب آپؐ نے قریش کو
جمع کر کے پہلی بار اسلام کی دعوت دی اور اس موقع پر جو تقریر فرمائی، تو کھلبلی سی مچ گئی اور لوگ دریاے حیرت میں چلے گئے۔ اس کے بعد تو آپ کا
معمول ہو گیا کہ ہر سال بازار عکاظ، میدان عرفات اور دُوسرے موقعوں پر لوگوں کو خطاب کرتے۔ ارفع و جامع خطبہ وُہ ہے جو سنہ ۱۰ھ میں
آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر سوا لاکھ مسلمانوں کے مجمع کے سامنے دیا تھا۔ یہ خطبہ اپنی معنویت و ادب کے اعتبار سے بھی

افصح مانا گیا ہے۔ فنِ خطابت کے لیے ایک نمونہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ بغرض یہ کہ ان احادیث و مکاتیب اور خطبات کی حیثیت محض دینی نہیں۔ یہ عربی زبان و ادب کا شاہکار ہیں۔ بہترین اور معیاری ادب کی کون سی خوبی ہے، جو کلامِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نہیں۔

رسولؐ اور عربی ادب

رسولؐ کی زندگی، تعلیم، کارناموں پر ہر دور میں تصنیف کا سلسلہ جاری رہا۔ عربی، فارسی، اردو، انگریزی، فرانسیسی، جرمنی، روسی، ہندی، بنگلہ، گجراتی اور دوسری زبانوں میں بے شمار کتابیں لکھی گئیں۔ آپ کی بعثت عرب میں ہوئی تھی۔ آپ کی زبان عربی تھی۔ اسی زبان میں آپ نے باتیں بھی کیں، اسی زبان میں قرآن بھی نازل ہوا۔ اسی زبان میں آپ نے خطبے بھی دیئے۔ سلاطین کو دعوتِ اسلام پیش کی، لہٰذا سب سے پہلے عربی ادب متاثر ہوا۔ عربی میں ادب نبویؐ کا سب سے بڑا ذخیرہ خود احادیث ہی ہیں۔ اس کے بعد تاریخ و سیر کی کتابوں کا درجہ ہے۔ طبری، واقدی، مسعودی، بلاذری، ابن خلکان، ابن سعد، ابن کثیر، ابن اثیر، ابن خلدون، علامہ جلال الدین سیوطی اور دوسرے عرب مورخین نے اس موضوع پر بڑی بڑی کتابیں تالیف کیں یہ لوگ عربی زبان و ادب کے ممتاز علماء و مفکر تھے۔ ان کی تصانیف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر سے بھری پڑی ہیں۔ دوسری زبانوں میں بھی ان کی تاریخوں کا ترجمہ کیا گیا اور انھیں سامنے رکھ کر نئی کتابیں بھی لکھی گئیں۔ تاریخ کے علاوہ خاص سیرت پر بھی بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ ان میں سیرت ابن ہشام کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کا ترجمہ انگریزی اور اردو میں بھی ہو چکا ہے اور بعد میں لکھی جانے والی کتابوں کے لیے سیرت ابن ہشام ایک نمونہ ثابت ہوئی۔ اس کے بعد "شمائل ترمذی" کا درجہ آتا ہے۔ امام ترمذی نے حضورؐ مقبول کے عادات و اطوار، بول چال، لباس، وضع قطع، رہن سہن غرض کہ جملہ خصوصیات زندگی کو قلمبند کیا اور ہر پہلو پر تفصیل سے روشنی بھی ڈالی۔

آپ کی زندگی ہی میں حضرت زید بن ثابت نے مدح میں اشعار کہے تھے اور حضرت زید عہد نبویؐ کے ممتاز شعراء میں شمار ہوتے تھے خود رسولِ اکرمؐ کو آپ کا کلام پسند تھا۔ عہد صحابہ میں فرزدق عاشقِ رسولؐ مانے گئے۔ انہوں نے اپنی شاعری کو رسول اور اہلبیت کی مدح کیلئے وقف کر دیا تھا۔ عباسیوں کے عہد میں متنبی نعت گو شعراء میں سب سے ممتاز تھے۔

قصیدۂ بردہ

عربی کا یہ قصیدہ سب سے زیادہ مشہور ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس قصیدے کے مصنف امام بوصیری پر فالج کا حملہ ہوا تھا، اپنے دور کے تمام مشاہیر اطبا سے علاج کرایا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ زندگی اجیرن بن گئی۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر بارگاہِ رسالت میں رجوع ہوئے اور یہ قصیدہ کہا۔ یہ قصیدہ اور دعائیں مقبول ہوئیں اور وہ خود بخود صحت یاب ہونے لگے اور ایسے صحت یاب ہوئے کہ بیماری کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ اس قصیدہ میں حضورؐ کی مدح اور ان پر درود و سلام کے ساتھ عشق و عقیدت اور ادب و احترام کا بھی پورا خیال رکھا گیا ہے۔ اپنے مصائب کا ذکر اور صحت یابی کی دعا بہت قرینے سے کی گئی ہے۔ درد و اثر اور جذبات سے پورا قصیدہ مملو ہے۔ یہ قصیدہ عربی شاعری کا بھی ایک شاہکار سمجھا جاتا ہے۔ قصیدہ دس فصلوں میں ہے، جن کی ترتیب اس طرح کی گئی ہے:

فصل اوّل: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق۔
فصل دوم: اپنے کو خواہشاتِ نفسانی سے باز رکھنے کی آرزو۔
فصل سوم: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح۔
فصل چہارم: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریفہ۔

فصل پنجم: رسول اللہ کی دعوت۔ فصل ششم: قرآن پاک کا شرف و بزرگی۔
فصل ہفتم: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج۔ فصل ہشتم: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جہاد۔
فصل نہم: اللہ تعالیٰ سے بخشش طلبی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شفاعت کی آرزو۔
فصل دہم: مناجات اور عرض مدعا۔

حضرت امام بوصیری کے ساتھ اس قصیدہ کی برکت سے جو معجزہ پیش آیا اس کی وجہ سے یہ قصیدہ بہت مقدس اور متبرک سمجھا گیا۔ اقبال نے بھی مثنوی "پس چہ باید کرد" میں اس کا ذکر کیا ہے:

کار ایں بیمار نتواں برد پیش ‏ ‏ ‏ من چو طفلاں نالم از دارُوئے خویش
تلخی او را فریبم از شکر ‏ ‏ ‏ خندہ با در لب بدوزد چارہ گر
چوں بصیری از تو می خواہم کشود ‏ ‏ ‏ تا بمن باز آید آں روزے کہ بود
مہر تو بر عاصیاں افزوں تر است
در خطا بخشی چو مہر مادر است

سعدی فارسی شعراء میں خواجہ فریدالدین عطار، حکیم سنائی، شمس تبریزی، حضرت سعدی، مولانا جلال الدین رومی، نظامی گنجوی، فخرالدین عراقی اور حضرت امیر خسرو صوفی منش اور عاشقِ رسولؐ گزرے ہیں۔ ان کے کلام کا ایک بڑا حصہ نعت، مناجات اور قصائد رسولؐ پر مشتمل ہے۔ حضرت سعدی کی تینوں شہرۂ آفاق کتابوں گلستان، بوستان اور کریما میں رسولؐ سے محبت وعقیدت کا والہانہ ذکر ملتا ہے۔ گلستان حضرت سعدی کا نثری مجموعہ ہے۔ اس میں نعت کا حصہ بھی کافی طویل ہے۔ بوستان میں نعتیہ حصہ اور بھی زوردار ہے۔ حضرت سعدی کے نعتیہ کلام کی خوبی یہ ہے کہ اس میں عقیدت کے ساتھ شاعرانہ معیار بھی کافی بلند ہے اور بہت متنوع ہے۔ کریما ایک مختصر تصنیف ہے مگر اس میں بھی نسب کا ذکر بیان ہے۔ لیکن ان کا یہ شعر سب پر فوقیت رکھتا ہے:

بلغ العلیٰ بکمالہٖ ‏ ‏ ‏ کشف الدجیٰ بجمالہٖ
حسنت جمیع خصالہٖ ‏ ‏ ‏ صلوا علیہ و آلہٖ

نعتیہ کلام میں اس سے بہتر نمونہ کہیں نہیں ملتا۔ حضرت سعدی نے اس میں وہ سب کچھ کہہ ڈالا ہے جو خود وہ اور دوسرے شعراء کافی زور دکھانے کے بعد طویل نظموں میں بھی نہ کہہ سکتے تھے۔ دریا کو کوزے میں بند کرنے کی صحیح مثال صرف اس شعر پر صادق آتی ہے۔

امیر خسرو کا نعتیہ کلام حضرت امیر خسرو کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں۔ ان کی شاعرانہ عظمت سے بھی کس کو انکار ہو سکتا ہے سلاطین کے دربار میں رہنے کے باوجود وہ صوفی صفت تھے۔ سلطان المشائخ محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاء کے جاں نثار مرید تھے۔ اوّل تو طبعاً وہ اللہ والے تھے۔ پھر پیر کی نظر کیمیا اثر نے دل میں اور بھی سوز و گداز پیدا کر دیا۔ خسرو کی غزلیں، حمد، نعت اور صوفیانہ کلام سب اس پر دال ہیں۔ ان میں عجیب کیف اور تاثر ہے۔

نعت قدسی

سعدی اور خسرو کے بعد جامی اور قدسی کی نعتیں بے مثال ہیں۔ خاص کر قدسی کی نعت تو ہر عاشقِ رسولؐ کی زبان پر چڑھی ہوئی ہے۔ میلاد و سیرت کی محفلوں میں عام طور سے پڑھی جاتی ہے:

مرحبا سید مکی مدنی العربی — دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی
من بیدل بجمالِ تو عجب حیرانم — اللہ اللہ! چہ جمالست بدیں بوالعجبی
چشمِ رحمت بکشا سوے من انداز نظر — اے قریشی لقب و ہاشمی و مطلبی
نسبتے نیست بذاتِ تو بنی آدم را — بہتر از آدم و عالم تو چہ عالی نسبی
ما ہمہ تشنہ لبانیم و توئی آبِ حیات — رحم فرما کہ زحد می گزرد تشنہ لبی
نسبتِ خود بہ سگت کردم و بس منفعلم — زاں کہ نسبت بسگِ کوئے تو شد بے ادبی
عاصیانیم زمانیکہ اعمال مپرس — سوے ما روئے شفاعت بکن از بے سببی

سیدی انت حبیبی و طبیبِ قلبی
آمدہ سوے تو قدسی پئے درماں طلبی

اُردو میں سیرت نگاری

اردو ادب میں بھی حضورِ انورؐ پر کافی سرمایہ موجود ہے۔ نظم و نثر دونوں ہی اس سے مالا مال ہیں۔ تاریخ و سیرت کی کتابوں کے اردو ترجمے بھی بہت ہوئے ہیں اور تصنیف و تالیف و ترجمہ کا یہ سلسلہ جاری ہے اور یہ ترجمے زیادہ تر عربی اور کچھ فارسی اور انگریزی کتابوں سے کیے گئے۔ تراجم کے علاوہ اردو میں تاریخ و سیرت پر خود بھی تصنیف و تالیف کا کام بڑے پیمانے پر ہوا ہے۔ عموماً یہ کتابیں عربی تاریخوں کو سامنے رکھ کر ہی مرتب کی گئی ہیں۔ البتہ آزاد بلگرامی، علامہ شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی یا چند دوسرے اہل علم نے خود بھی فکر و تحقیق سے کام لیا ہے۔ شبلی اور سید سلیمان ندوی کی تصانیف میں ادبی شان بھی ہے۔ سیرت کی کتابوں میں علامہ شبلی اور سید سلیمان ندوی کی "سیرت النبی"، سید سلیمان ندوی کے "خطبات مدراس"، سرسید احمد خاں کے "خطبات احمدیہ"، مولانا عبدالرؤف داناپوری کی "اصح السیر"، مرزا بشیر الدین محمود کی "سیرت خاتم النبیین"، مولانا محمد علی لاہوری کی "سیرت خیر البشر"، قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی "رحمۃ للعالمین" (تین جلدوں میں)، مولوی فضل الدین واعظ کی سوانح عمری "پیغمبر اعظم"، مرزا حیرت دہلوی کی "سیرت محمدیہ"، مولانا عبدالماجد دریابادی کی "مردوں کی مسیحائی"، خواجہ حسن نظامی کا "میلاد نامہ"، عبدالحلیم شرر کی "خاتم المرسلین"، سیماب اکبر آبادی کی "سیرت النبوی"، نعیم صدیقی کی "محسن انسانیت" وغیرہ سیرت کے موضوع پر مشہور اور قابل ذکر کتابیں ہیں۔ عیسائی پادریوں اور آریہ سماجی کارکنوں سے مناظرہ بازی کے دور میں غیر مسلموں کے اعتراضات کا جواب دینے کے لیے بھی سیرت کے موضوع پر لاتعداد کتابیں لکھی گئیں۔ ادھر کئی عقیدت مند ہندوؤں نے بھی اس موضوع پر قلم اٹھایا۔ ان تمام تصانیف میں "خطبات احمدیہ"، "اصح السیر"، "سیرت النبی"، "خطبات مدراس" اور "محسن انسانیت" اپنی تکنیک اور منفردیت کے اعتبار سے خاص حیثیت رکھتی ہیں۔

سرسید احمد خاں نے ۱۸۷۰ء میں "خطبات احمدیہ" مکمل کی۔ یہ کتاب سر ولیم میور کی ہفوات کے جواب میں لکھی گئی تھی۔

سرسید نے خطبات احمدیہ کے سلسلہ میں اسلام اور عیسائی مذہب کی بہت سی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا اور کافی تحقیق وکاوش کے بعد اسے مکمل کیا۔ سرسید کا اندازِ بیان صالحانہ اور اسلام اور عیسائیت کو قریب تر لانے والا ہے۔ سیرت کی کتابوں میں علامہ شبلی کی "سیرت النبی" سب سے ضخیم اور جامع ہے۔ اس کی پہلی اور دوسری جلدیں خود علامہ نے مکمل کیں، باقی چار جلدیں مولانا سید سلیمان ندوی نے مرتب کیں۔ شبلی نے اس کتاب کی تالیف میں بڑی محنت وتحقیق اور جاں سوزی سے کام لیا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کی تالیف میں عشقِ رسولؐ کا جذبہ تھا۔ اس لیے خود کہا بھی: ؎

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی — مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم — خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

جہاں تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے واقعات کا تعلق ہے، وہ پہلی اور دوسری جلدوں میں مکمل ہیں۔ باقی چار جلدوں میں سیرتِ رسولؐ کے دیگر پہلوؤں پر فلسفیانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ سرسید احمد خاں اور شبلی مغربی اہلِ علم حضرات کے متعین کردہ حدود و اخلاق پر رسول اللہؐ کی سیرت کو منطبق کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کے اعتراضات کا جواب دیتے ہیں۔ یہ طریقہ بعض لوگوں نے پسند نہیں کیا۔ مولانا عبدالرؤف دانا پوری نے اس استدلال کی سختی سے مخالفت کی اور "اصح السیر" لکھی۔ ضخامت کے لحاظ سے یہ شبلی کی "سیرت النبی" کا نصف ہے لیکن خاص سیرت کے موضوع پر اس میں مواد زیادہ ہے۔ اس کتاب کی دوسری خصوصیت یہ بھی ہے کہ تحقیق و کاوش، واقعات کی صحت اور مختلف روایات کی تصدیق یا تردید تحقیقِ حق کی خاطر کی گئی۔ نہ کسی کے اعتراض کا "جواب" دینے یا مغربی علماء و مفکرین کے مقرر کردہ "معیار" پر سیرتِ رسول کو "مطابق" کرنے کی غرض سے، جیسا کہ بعض معترضین کے خیال میں سرسید اور شبلی کا اسلوب تھا۔ "خطبات مدراس" سید سلیمان ندوی کے آٹھ لکچروں کا مجموعہ ہے، جو انھوں نے اکتوبر اور نومبر ۱۹۲۵ء میں مدراس میں دیئے تھے۔ اس میں حضورؐ کی زندگی، سیرت اور تعلیم و اخلاق کے جملہ پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس مختصر سی کتاب میں مولانا ندوی نے اپنی علمی و ادبی صلاحیت اور تاریخی معلومات کا پورا نمونہ پیش کر دیا ہے جو کچھ "سیرت النبیؐ" کی چھ جلدوں میں محیط ہے، اسے ان بارہ لکچروں میں سمو دیا گیا ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ THE LIVING PROPHET کے نام سے ریڈیو پاکستان ڈھاکہ کے نیوز ایڈیٹر جناب سعید الحق نے خود مولانا ندوی کی ہدایت اور مشورہ کے مطابق کیا تھا۔ ترجمہ عالمانہ انداز میں ہے۔ ڈھاکہ سے ۱۹۶۰ء میں ترجمہ شائع بھی ہو چکا ہے۔ نعیم صدیقی نے "محسنِ انسانیت" لکھ کر سیرت کے موضوع پر نئے ڈھنگ سے قلم اٹھایا ہے اور انھوں نے جدید تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ توقع ہے کہ نئی نسل کے سیرت نگاروں کے لیے یہ کتاب نمونہ کا کام دے گی۔ مولانا عبدالحلیم شرر نے "جویائے حق" لکھ کر ناول کے طرز پر سیرت نگاری کا تجربہ کیا، جو پہلا ہونے کے باوجود سب سے کامیاب سمجھا گیا۔ اس میں حضرت سلمان فارسیؓ کی زبانی سارے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ اسی قسم کا دوسرا تجربہ صادق حسین صادق سردھنوی نے "آفتابِ علم" لکھ کر کیا۔ "جویائے حق" اور "آفتابِ علم" میں زبان و بیان اور فنی اعتبار سے وہی فرق ہے، جو شرر اور صادق سردھنوی میں ایک ادیب اور ناول نگار کی حیثیت سے ہے۔ ناول میں سیرت کو موضوع بنانے کا تیسرا تجربہ مولانا ماہر القادری نے "دُرِّ یتیم" لکھ کر پیش کیا۔

کتب مولود مسلم معاشرہ میں میلاد کی محفلیں منعقد کرنے کا سلسلہ بھی زمانۂ دراز سے قائم ہے۔ اسلامی تہذیب و

ثقافت کے قدیم مراکز لاہور، ملتان، اجمیر، دہلی، لکھنؤ، پٹنہ، بہار شریف اور جدید صنعتی شہروں بمبئی، کلکتہ اور کان پور وغیرہ میں میلاد کا رواج خوب ہُوا۔ میلاد کے موضوع پر بے شمار کتابیں لکھی گئیں۔ تکنیک کے لحاظ سے میلاد کی کتابیں تاریخ و سیرت کی کتابوں سے بالکل جدا ہوتی ہیں۔ اس میں اصل مقصد تاثر اور دلچسپی پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے میلاد کی کتابوں میں واقعات و روایات کی صحت کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔ میلاد نویس کی حیثیت سے غلام امام شہید نے سب سے زیادہ شہرت پائی۔ وہ لکھنؤ کے ممتاز شعرا میں تھے۔ عشق رسولؐ میں سرشار تھے۔ واقعات کے لحاظ سے ہوسکتا ہے کہ انھوں نے بھی صحت کا پُورا خیال نہ کیا ہو مگر فنی اعتبار سے غلام امام شہید کا میلاد سب سے زیادہ معیاری ہے اور علمی حلقوں میں بھی اسے پسند کیا گیا۔ دُوسری معیاری کتب مولود میں "مولود طپش" اور "میلاد اکبر" کا نام بہت مشہور ہے۔

بعض معروف اور ذمہ دار شخصیتوں نے بھی اس طرف قدم اٹھایا، جیسے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم نے "ذکر النبی" اور علامہ راشد الخیری نے "آمنہ کا لال" لکھی۔ اس کے بعد علامہ شفق عماد پوری نے "حدیقۂ آخرت" اور "توشۂ رحمت" لکھی، جو علی الترتیب ۱۳۲۸ھ اور ۱۳۵۹ھ میں گیا (بہار) سے شایع ہُوئیں۔

عربی میں مولود پر کافی کتابیں لکھی گئیں۔ علامہ جعفر بن حسین برزنجی کی "عقد جوہر فی مولد خیر البشر" کی مکہ اور مدینہ میں بھی بہت شہرت ہوئی۔ اس کا اردو ترجمہ ۱۲۷۹ھ میں "مولود برزنجی" کے نام سے مولانا عبد الغنی نے کیا تھا۔ ملک سراج الدین اینڈ سنز کشمیری بازار لاہور نے شایع کیا۔ ترجمہ میں یہ اہتمام رکھا گیا ہے کہ ہر عربی سطر کے نیچے اردو ترجمہ اور حاشیہ پر اردو میں تشریح ہے۔ اردو میں میلاد کی جو کتابیں ہیں، وہ اس لحاظ سے قابلِ قدر ہیں کہ عربی اور فارسی میں بھی اس انداز کی تصانیف نہیں ملتیں۔ اس سلسلہ میں اردو کو امتیازی خصوصیت حاصل ہے۔

اُردو شعرا اور مدحِ رسولؐ

اردو شعرا نے بھی حضرت انورؐ کے ساتھ اظہارِ عقیدت میں خوب زور دکھایا ہے۔ نعت، قصائد، مناجات، سلام، قطعات اور رُباعیات کا بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو چکا ہے۔ اُردو کی قدیم ترین نعتوں میں شاہ وجہ الحق ابدالی کی نعت بہت موثر اور اس وقت کے لحاظ سے نئے طرز کی ہے۔ شاہ ابدالی پھلواری شریف کے رہنے والے تھے۔ ۱۱۲۴ھ میں پیدا ہُوئے اور ۱۲۰۰ھ میں وصال فرمایا۔ نعت ملاحظہ ہو:

دو جگ کے سردار محمدؐ نبیوں کے سالار محمدؐ
امت کے غمخوار محمدؐ سب کے پالنہار محمدؐ
صلی اللہ علیہ و سلم
میں ہُوں بہت ناچار محمدؐ ناؤ پھنسی منجدھار محمدؐ
کوئی نہ کھیونہار محمدؐ تم ہی اتارو پار محمدؐ
صلی اللہ علیہ و سلم
تم پہ جان نثار محمدؐ عشق تمھارا یار محمدؐ

مشکل ہے یہ کار محمدؐ تم ہی نبا ہنہار محمدؐ
صلی اللہ علیہ و سلم
دلبر د ہم دلدار محمدؐ جی چاہے دیدار محمدؐ
ایک نظر اِک بار محمدؐ ہو جائے سب کار محمدؐ
صلی اللہ علیہ و سلم

اردو شعراء میں غلام امام شہید، شہیدی، نیاز بریلوی، بیدم وارثی، امیر مینائی، مولانا احمد رضا خاں بریلوی، حالی، شفق عماد پوری، مولانا ظفر علی خاں، اقبال، محسن کاکوروی، حفیظ جالندھری، ماہر القادری، امجد حیدر آبادی، بہزاد لکھنوی اور زائر حرم حمید صدیقی کے ہاں اس قسم کی چیزیں بہت بلند پایہ اور ادبی حیثیت سے بھی ارفع نظر آتی ہیں۔

حالی و اقبال

اُردو شعراء میں حالی اور اقبال نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا، وُہ بہت بلند پایہ، پُرتاثیر اور افصح ہے۔ اس میں پہل حالی سے ہُوئی۔ مسدس کا وُہ حصّہ جس میں حضورؐ کا ذکر ہے، سب سے عمدہ ہے اور وہی مسدس کی روح بھی ہے۔ حالی نے مختصر طور سے ولادت، بعثت، تبلیغ و تعلیم اور وفات وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ حالی کے کلام میں شعرائے عرب کے کلام کی سی روانی اور زورِ بیان ہے۔ مسدس کے علاوہ حالی کی وُہ نعت بھی جو یُوں شروع ہوتی ہے:

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دعا ہے
اُمت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

بہت مقبول ہُوئی۔ حالی نے قدیم طرز کے نعت و سلام اور قصائد سے ہٹ کر نئے انداز سے رسولؐ کا ذکر کیا۔ اُردو شاعری میں یہ نئی چیز تھی۔

اقبال نے نعتیہ شاعری کو تکنیک کے اعتبار سے بہت وسیع کر دیا۔ اقبال کے ہاں جو تنوّع ہے وہ حالی کے ہاں بھی نہیں۔ اقبال امام بوصیری، سعدی اور حالی سے بھی متاثر نظر آتے ہیں۔ اقبال کو رسولؐ سے عشق تھا۔ وہ رسولؐ کی شان میں ذرا سی شوخی بھی روا رکھنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اقبال خدا کے حضور میں تو بہت شوخ ہو گئے "گستاخ" بھی ہو گئے۔ مگر جہاں رسولؐ کا ذکر آتا ہے ادب و احترام سے ذرہ بھر آگے بڑھنے کی جرأت نہیں کرتے۔ اقبال نے پرانی روش میں "کملی والے" جیسی نعتیں بھی کہیں اور جدید اسلوب میں زورِ بیان دکھایا۔ اس باب میں ان کا مشہور تصوّر یہ تھا ؎

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بُو لہبی ست

لیکن قصیدہ بردہ یا سعدی، خسرو اور قدسی کے کلام کے نمونے اُردو میں کہیں نہیں ملتے۔ اس وقت ابوالاثر حفیظ جالندھری کے سلام کا چرچا ہے۔ سیرت اور میلاد کی محفلوں میں آج کل یہ سلام عام طور سے پڑھا جاتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ولولۂ کیف عشق محمدؐ اور سرور اظہار کا بڑا ہی دلکش نمونہ ہے:

سلام اس پر کہ جس نے بیکسوں کی دستگیری کی — سلام اس پر کہ جس نے بادشاہی میں فقیری کی
سلام اس پر کہ اسرارِ محبت جس نے سمجھائے — سلام اس پر کہ جس نے زخم کھا کر پھول برسائے
سلام اس پر کہ جس کے گھر میں چاندی تھی نہ سونا تھا — سلام اس پر کہ ٹوٹا بوریا جس کا بچھونا تھا
سلام اس پر جو سچائی کی خاطر دُکھ اٹھاتا تھا — سلام اس پر جو بھوکا رہ کے اوروں کو کھلاتا تھا
سلام اس پر جو اُمت کے لیے راتوں کو روتا تھا — سلام اس پر جو فرشِ خاک پر جاڑوں میں سوتا تھا
سلام اس پر کہ جس کا نام لے کر اس کے شیدائی — اُلٹ دیتے ہیں تختِ قیصریت اوجِ دارائی

سلام اس ذات پر جس کے پریشاں حال دیوانے
سنا سکتے ہیں اب بھی خالد وحیدر کے افسانے

سلام کے سلسلے میں سب سے زیادہ مقبول بیدلؔ کا سلام ہے، جو "مولود سعدی" میں شامل ہے اور مسدس ہے:

یا نبی سلام علیک — یا حبیب سلام علیک
یا رسول سلام علیک — صلوٰۃ اللہ علیک

سلام، نعت اور قصائد کے علاوہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے بعض واقعات اور معجزات پر بھی نظمیں اور مثنویاں لکھی گئی ہیں جیسے کہ حضرت عمرؓ کا قبولِ اسلام، قصہ آل جابر، واقعہ معراج، بیان نور محمدی، وفات نامہ وغیرہ۔ یوں حضرت حفیظ جالندھری کا "شاہنامہ اسلام" منظوم سیرتِ رسولؐ ہی ہے اور ایک عظیم کارنامہ جس طرح نثر میں علامہ شبلی کی "سیرت النبی" کا اردو میں جواب نہیں، اسی طرح نظم میں "شاہنامہ اسلام" بھی اپنی مثال آپ ہے۔

بہر حال یہ ایک مختصر جائزہ تھا ادبِ نبویؐ کا، جو یہاں پیش کیا گیا۔ سیرت وحیاتِ نبویؐ پر برابر کام ہو رہا ہے اور اردو بنگلہ میں بالخصوص سیرتِ رسولؐ پر کافی مواد حال ہی میں منظرِ عام پر آیا ہے۔ جرائد و رسائل کے رسول نمبروں نے بھی مطالعہ سیرتؐ کو نئے نئے زاویوں سے پیش کیا ہے اور جوں جوں علم و عرفان کی نئی کرنیں پھیلتی جائیں گی حضور مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکرِ جمیل محافلِ عالم میں بڑھتا ہی جائے گا۔ ورفعنا لک ذکرک۔

علومِ عرب

سید محمد عبد الستار گیلانی

مالفضل الّا لاھل العلم انھم　　علی الھدیٰ لمن استھدی ادلّاءُ
وقیمۃ المرءِ ما قدکان یحسنہٗ　　والجاھلون لِاَھلِ العلمِ اعداءُ

یہ امر ساری دنیا پہ اظہر من الشمس و ابین من الامس ہے کہ عرب کی قوم ایک جاہل اور اَن پڑھ قوم تھی ، لکھنا پڑھنا نہیں جانتی تھی۔ اس کے پاس علم کا کوئی سرچشمہ موجود نہیں تھا بجز علمِ نجوم و علمِ طب کے جن کو اس نے اپنے تجربہ اور استقرا سے حاصل کیا تھا۔

لیکن یہ قوم تیزیٔ طبع ، فصاحت لسانی اور بلند خیالی میں اعلیٰ مرتبہ پر تھی۔ انھیں صفات کے باعث فی البدیہہ اشعار کہنا اور بغیر کسی تامل و فکر کے الفاظ کو خلعتِ نظم سے آراستہ و مزین کرنا اس کے نزدیک ایک معمولی سی بات تھی اور بائیں ہاتھ کا کھیل۔ اپنے کلام میں ایسی خوبی ، لطافت ، پاکیزگی اور خوش اسلوبی دکھاتی تھی کہ بڑے بڑے ذی استعداد ، کامل فن اور ماہر علم باوجود اپنی انتھک کوششوں ، غایت تامل و تفکر کے اس کے جیسے کلام کا ایک ادنیٰ سا نمونہ پیش کرنے پر قدرت نہیں رکھتے تھے اور مجبور و معذور ہو کر اس طرح اپنے عجز کا اعتراف کرتے کہ :

ما عرفناك حق معرفتك۔

بے شک فی البدیہہ اشعار کہنا ، یہ ایک دشوار امر ہے جس کو وہی شخص خوب سمجھ سکتا ہے جس میں غور و خوض تامل و تردیہ کا اعلیٰ مادہ موجود ہو۔ وُہ اپنے توسن خیال کو مضمار افکار و میدان اشعار میں جولانی دیتا ہو اور امعانِ نظر و تعمق کے بحرِ عمیق میں برابر غوطہ زن رہتا ہو۔

اہلِ عرب کے مشغلے کی کوئی چیز نہیں تھی۔ لہٰذا "بیکار مباش کچھ کیا کر" کو مدِّ نظر رکھ کر ان لوگوں نے اپنی ہمت والا نہمت کو لغات کے تفنن و تہذیب اور الفاظ کی ترکیب و ترتیب میں مشغول و مصروف رکھا ، حتیٰ کہ ہر ایک شخص نے یہی اپنا طریقۂ عمل بنا لیا اور ہر ایک نے اپنے لیے ایک ایک راہ اختیار کر لی۔ اس تصرف و مشاغل میں ان کی حذاقت ، جودتِ طبع موافق و مساعد حال ہو کر ان کا ساتھ دیتی اور ان کی فطانت ، زیرکی و ذکاوت ان کی دستگیری و رہنمائی کرتی تھی۔ بنائً علیہ یہ لوگ ہر ایک حکم کے لیے ایک ایسا قاعدہ کلیہ ، قانون محکم اور ایسی وجہ سدید پیدا کرتے تھے کہ عقل سلیم کو اس کے تسلیم کرنے میں ذرا بھی تامل نہ ہوتا تھا۔ یہ باعتبار الفاظ کے منقول اور باعتبار احکام کے معقول ہوا کرتے تھے۔

ان لوگوں کا ہمیشہ یہی طریقِ عمل اور وتیرہ شغل رہا کیا۔ یہاں تک کہ جب اسلام کا ظہور ہوا اور اس کی صاف شعاع و

پاکیزہ روشنی سے عرب کے مستفیض و مستنیر ہونے کے علاوہ بہت سے عجم بھی مستفید ہوکر دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے اور عرب و عجم کے باہمی اختلاط و ارتباط اور میل جول کے باعث الفاظ و لغات عربیہ میں فساد کا احتمال ہوا، تو اس کے لیے روابط و ضوابط قوانین و قواعد وغیرہ مرتب کیے گئے تاکہ عربی زبان محفوظ و مصئون رہ سکے۔ چنانچہ مفصلہ ذیل علوم و فنون قایم کیے گئے۔

علمِ متن اللغۃ جس کے ذریعہ اصل وضع کے اعتبار سے الفاظ کی بنا اور اس کی اصلیت معلوم ہوتی ہے۔ اس علم کا واضع شاید احمد یا محمد بن مستنیر ہے جس کا لقب قطرب تھا۔

علم الصرف جس سے حروف کے تغیر و تبدل اور الفاظِ متداولہ کے ابنیہ کے ان احکام کی شناخت ہوتی ہے، جن کے باعث مختلف معانی پیدا ہوتے ہیں اس کا واضع غالباً معاذ الھزا ہے۔

علم النحو اس سے اجزائے کلام کی ترکیب، کلمات کے ربط و باہمی تعلق اور الفاظ کی تراکیب معلوم ہوتی ہیں۔ اس امر میں لوگوں کا اختلاف ہے کہ اس علم کا واضع اور جامع کون ہے۔ بعض حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو بتاتے ہیں اور بعض ابوالاسود دئلی کو کسی نے حماد بن سلمہ کی طرف بھی اس کو منسوب کیا ہے۔

مورخین کا اعتماد تو اس پر ہے کہ قواعد نحویہ کا جامع ابوالاسود دئلی ہے، جس کو حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے پہلی صدی ہجری میں چند قواعد بتا دیے تھے۔ چنانچہ مفردات کی نسبت آپ نے فرمایا:

"الکلام کلہ ثلثٌ۔ اسمٌ وفعلٌ وحرفٌ فالاسم ما انبأ عن المسمی۔ والفعل ما انبأ عن حولۃ المسمّٰی و الحرفُ ما انبأ عن معنی لیس باسمٍ و لا فعلٍ۔"

پھر مسمی اور اس کی حرکات سے جو کاروبار ظہور پذیر ہوتے ہیں، ان کی شناخت کا یہ طریقہ بتایا:

"کُلُّ فَاعِلٍ مَرْفُوْعٌ وَکُلُّ مَفْعُوْلٍ مَنْصُوْبٌ وَکُلُّ مُضَافٍ اِلَیْہِ مَجْرُوْرٌ۔"

مگر مغنی اللبیب کی شرح الشرح سے معلوم ہوتا ہے کہ قواعد نحویہ کے فراہم کرنے کی بنیاد اور ان کے جمع کرنے کا خیال حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے شروع ہوگیا تھا۔

اس کی حقیقت یوں منکشف ہوتی ہے کہ ایک شخص آیت "اِنَّ اللّٰہَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ وَ رَسُوْلُہٗ" میں لفظ رسولہٗ کے لام کو کسرہ (زیر) کے ساتھ پڑھا کرتا تھا۔ چونکہ اس طرح پڑھنے سے معنی میں فساد و خرابی ہوتی تھی اس لیے لوگ اس کو پکڑ کر حضرت عمرؓ کے پاس لے گئے، جب اس سے وجہ پوچھی گئی، تو اس نے کہا کہ مجھ کو ایک مدنی نے اسی طرح پڑھایا ہے۔ اس پر آپ نے ابوالاسود دئلی کو بلاکر قواعد نحویہ کے فراہم کرنے و جمع کرنے کا حکم دیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

بہرکیف یہ ایک نہایت کارآمد و مفید علم ہے اور چونکہ یہ علم اعراب و حرکات پر مشتمل ہے، اس لیے یہ ہر وقت دلیل قاری و مصباح ساری ہے۔ اسی پر مبانی و معانی کے اختلافات کا دار و مدار ہے۔ اس وقت ایک چھوٹا سا جملہ یاد آیا جو غالباً ناظرین کرام کی ضیافتِ طبع و دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ وہی ہذہ:

"لَا تَاْکُلُ السَّمَکَ وَتَشْرَبُ اللَّبَنَ۔"

اس جملہ میں لفظ تشرب کو (مرفوع، منصوب، مجزوم) تین طریقے سے پڑھ سکتے ہیں۔ ہر ایک طریقے سے ایک علٰحدہ معنی ومفہوم پیدا ہوتا ہے اور ہر ایک سے جدید لذت حاصل ہوتی ہے، لبغور ملاحظہ فرمائیں:

اوّل تَشْرَبُ (مرفوع) اس وقت اس کا مرفوع پڑھنا اکل سمك کی نہی اور شرب لبن کی اباحت پر دال ہے یعنی مچھلی نہ کھاؤ اور دودھ پیو۔

دوم تَشْرَبَ (منصوب) اب اس کا نصب (زبر) اکل سمك اور شرب لبن دونوں کی اجتماعی نہی پر دلالت کرتا ہے یعنی مچھلی اور دودھ دونوں کو ملاکر نہ کھاؤ پیو، علٰحدہ علٰحدہ پیو تو مضائقہ نہیں۔

سوم تَشْرِبْ بظاہر "ب" مکسور ہے مگر در اصل یہ جزم وسکون کی حالت میں ہے کیونکہ تشرب کا عطف تاکل پر ہے جو لا کے سبب سے فعل نہی ہے جس کا آخر مجزوم ہوا کرتا ہے۔ لہٰذا تشرب کے لا کے سبب سے فعل نہی مجزوم ہوگا اور عربی کا یہ قاعدہ ہے کہ ساکن ومجزوم حرف کو کسی دوسرے حرف کے ساتھ ملاکر پڑھنا ہو تو اس کی کسرہ (زیر) کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں۔ لانّ السّاکن اذا حُرّك حرك بالکسر جب کہ لا تاکل کے لام ساکن کو سَمَكَ کے سین کے ساتھ ملاکر پڑھنے کی وجہ سے کسرہ (زیر) دیا گیا۔ اس تیسری صورت میں اس کا مجزوم ہونا اکل سمك اور شرب لبن دونوں کی انفرادی نہی کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی نہ تو مچھلی کھاؤ اور نہ دُودھ پیو۔ ان دونوں میں سے کسی کی اجازت نہیں۔

واؤ پہلی صورت میں استئناف کے لیے ہوگا، دوسری صورت میں صرف اور تیسری میں عطف کے لیے۔ دیکھیے تبدل اعراب وتغیر حرکات سے معنی ومفہوم میں کس قدر تغیر وفرق ہوگیا۔ اسی طرح ایک اور فقرہ ہے:

"ما اَحسنُ زَیدٌ۔"

اس فقرہ میں لفظ زیدٌ کو بھی تین طرح (منصوب، مرفوع، مجرور) سے پڑھ سکتے ہیں:

اوّل زیداً (منصوب) اس صورت میں اس کا نصب (زبر) زید کے حُسن کے تعجب کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی کوئی شخص زید کو دیکھ کر تعجب سے کہتا ہے کہ زید کیا ہی اچھا ہے۔ (حُسن سے حُسنِ ظاہری و باطنی دونوں ہو سکتے ہیں)

دوم زیدٌ (مرفوع) اس کا رفع (ہ) اس امر پر دال ہے کہ زید میں مادۂ احسان موجود نہیں۔

سوم زیدٍ (مجرور) اس کا مجرور ہونا زید کے حُسن وخوبی کے استفہام پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی سائل کسی سے پُوچھتا ہے کہ "مَا اَحْسَنَ فِیْ زَیْدٍ" یعنی زید میں کون سی خُوبی اور وصف ہے؟

پہلی صورت میں چونکہ زید کے حُسن پر تعجب ہوتا ہے اس لیے ما تعجبیہ ہوگا اور احسن فعل جامد۔ دوسری صورت سے یہ مفہوم ظاہر ہوتا ہے کہ زید میں مادۂ احسان موجود نہیں۔ اس لیے اس وقت ما نافیہ ہوگا اور احسن فعل متصرف۔ تیسری صورت میں زید کے حسن سے سوال ہوتا ہے اس لیے ما استفہامیہ ہوگا اور احسن اسم تفضیل۔

یہ تو الفاظ کے اعراب وحرکات کے تغیر وتبدل کی حالت اور اس کی خُوبی معلوم ہُوئی۔ اب ذرا حروف کی طرف آئیے اور دیکھیے کہ ان کی تقدیم وتاخیر اور تقلیب سے کیسے کیسے گل بُوٹے نظر آتے اور طبیعت کو کیسے خوش آیند معلوم ہوتے ہیں۔ ایک لفظ

قلب کو لیجئے۔ اس کے حروف کی تقدیم و تاخیر وغیرہ سے کتنی صُورتیں پیدا ہوتی ہیں:

۱۔ قلب بمعنی دل
۲۔ بلق، کسی چیز کا سیاہ و سفید وغیرہ ہونا
۳۔ لقب، وہ نام جو کسی وصف کے سبب سے رکھا گیا ہو۔
۴۔ بقل، سبزی و ترکاری
۵۔ قبل، پہلے
۶۔ لبق، فطانت و زیرکی وغیرہ

اسی طرح:

۱۔ لعب بمعنی بازی کھیل
۲۔ بعل بمعنی شوہر و زمین بلند
۳۔ لبع بمعنی رائیگاں
۴۔ عبل بمعنی سینہ و کلائی وغیرہ
۵۔ علب بمعنی نشان و جائے درشت
۶۔ بلع بمعنی مرد بسیار خوار وغیرہ

ان سب الفاظ کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ ان کی صورت تبدیل ہوگئی ہے، مگر ان سب کا مادہ اور ان کے حروف ایک ہی ہیں اور سب کے سب بامعنی اور موضوع الفاظ ہیں۔

اگر ان سب امور کو وسعت دی جائے، تو سینکڑوں، ہزاروں مثالیں مختلف صورتوں میں بیان کی جا سکتی ہیں۔ ہر حرکت کی تبدیلی، ہر اعراب کے تغیر اور ہر حرف کی تقدیم و تاخیر سے علٰحدہ علٰحدہ معانی و مفاہیم پیدا ہوتے ہیں اور ہر ایک سے جدید لذت اور نیا مزہ حاصل ہوتا ہے۔ بنابریں اگر کہا جائے کہ یہ خُوبی و خوش اسلوبی، یہ لطافت و پاکیزگی اور جدّت طرازی اسی عربی زبان کے ساتھ مخصوص ہے، کسی غیر زبان میں نہیں، تو شاید بے جا و نادرست نہ ہوگا اور اس وقت دنیا میں جتنی زبانیں ہیں، اگر عربی زبان کا ان سے مقابلہ کیا جائے تو اس کی حقیقت و اصلیت ظاہر ہو سکتی ہے۔

علم المعانی یعنی وہ علم جس سے ترکیبِ الفاظ میں الفاظ اور مقصود بالذات معنی کی مطابقت معلوم ہوتی ہے۔

علم البیان جس میں ایک معنی کو مختلف طور پر بیان کرنے کا طریقہ معلوم ہوتا ہے۔ دونوں علموں کا واضع شیخ عبد القاہر جرجانی ہے۔

علم البدیع اس میں تحسین کلام کے وجوہات سے بحث ہوتی ہے۔ یعنی کلام میں کیوں اور کس وجہ سے خوبی پیدا ہوتی ہے۔ اس کا واضع عبد اللہ بن معتز ہے۔

علم القوافی اس میں اشعار کے قوافی، اوزان و مفاصیل اور اواخر اشعار کے اجزائے ملتزمہ کے احکام وغیرہ بیان کیے جاتے ہیں۔ اس کا واضع خلیل بن احمد ہے۔

علم الاشتقاق، علم اصول النحو، علم قرض الشعر، علم الشانشر، علم الفصاحت والبلاغت، علم المحاضرۃ، علم الخط و مقاطع الحروف وغیرہ بھی انھیں لوگوں کے اختراع و ایجاد کے نتائج ہیں۔

رفتہ رفتہ یہ لوگ اپنی عربی زبان کو وسعت دیتے اور نئے نئے علوم و فنون ایجاد کرتے چلے گئے۔ چنانچہ اپنی روزمرہ بول چال و گفت گو سے علم المنطق کی بنیاد ڈالی اور سب سے پہلے رئیس حسن بن عبد اللہ بن سینا بخاری نے اس کی طرف

سبقت کی ۔ یہ وہی شخص ہے جس نے صناعۃ طبیہ کو بدرجہ کمال پہنچا کر اس کا حق ادا کیا ۔ اگرچہ اوّل اوّل شیخ محمد بن زکریا رازی نے اس کی تدوین و تالیف کی بنا قایم کی تھی ۔

چونکہ علمِ طب کا تعلق علمِ نجوم ، علمِ طبیعیات اور علمِ موسیقی کے ساتھ تھا ، اس لیے محققین حکما اور حاذقین اطبا نے طب کے ساتھ ان علوم ثلثہ مذکورہ میں سے ہر ایک کو ضروری سمجھ کر علم طبیعیات کو طب کے ساتھ شامل کر لیا ، کیونکہ طب و طبیعیات کے مابین احکام مزاجیہ کا علاقہ پایا جاتا ہے ۔ علمِ نجوم کو اس لیے تاکہ اجرا علویہ کا اثر ابدان پر ہو سکے ۔ علم موسیقی کی اس لیے ضرورت پڑی تاکہ نبض شناسی میں اس سے پوری مدد مل سکے ۔ بیطرہ و زردقہ (چوپائے اور پرندوں کا علاج) وغیرہ بھی صناعۃ طبیہ کی شاخیں ہیں ۔

علم الفقہ بھی ان کی انتہائے کوشش و غایت جدوجہد کا نتیجہ ہے ، جس کے دو حصے قرار دیے گئے ہیں :

۱ ۔ عبادات : اس میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ انسان کے ذمہ خدا کے حقوق کیا کیا ہیں ۔

۲ ۔ معاملات : اس میں اس امر سے بحث ہوتی ہے کہ ایک انسان کے حقوق دوسرے انسان پر کیا کیا ہیں ۔ پھر اس کی دو قسمیں ہیں :

اوّل یہ کہ زندہ انسان پر زندہ انسان کے کیا کیا حقوق ہیں ۔ اس کو اصطلاح میں بیوع کہتے ہیں ۔

دوم یہ کہ انسان کے مرنے سے زندوں کے کیا کیا حقوق حاصل ہوتے ہیں ، یعنی میت کا جو کچھ مال متروکہ ہے ، اس میں سے حقداروں کو کیا کیا حصہ مل سکتا ہے ۔ اس کو اصطلاح میں فرائض کہتے ہیں ۔ اس تقسیم کے لحاظ سے علم فقہ کی تین قسمیں ہوئیں :

۱ ۔ عبادات

۲ ۔ بیوع

۳ ۔ فرائض

اب فرائض میں سے ہر ایک شخص کا حصہ معلوم کرنے کے لیے حساب کی اشد ضرورت تھی ، جس کا جاننا ہر ایک محقق فقیہ کے لیے ازبس ضروری تھا کیونکہ اسی کے ذریعہ سے وہ نامعلوم حقوق کا استخراج اور معلوم حصوں کی صحیح صحیح تقسیم وغیرہ کر سکتا ہے ۔ لہٰذا **علم الحساب** کی بھی تدوین ہوئی ، جس کو ریاضی بھی کہتے ہیں اور علم الہندسہ و علم المساحۃ وغیرہ بھی اس کے فروع سے ہیں ۔

علم الالہیات ، علم الآداب ، علم الانساب ، علم التواریخ ۔ ان کے علاوہ اور بہتیرے علوم و فنون ہیں ۔ مثلاً :
کہانت ، فراست ، ضرب رمل ، زجر طائر ، قیافہ وغیرہ جن کو انھوں نے بطور لہو و لعب اور ایک مشغلہ کے برابر جاری رکھا ۔

ان کی تالیفات و تصنیفات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی طبیعت کا میلان کاشتکاری و باغبانی وغیرہ کی طرف بھی تھا ۔ چنانچہ فنِ بزدرہ اور فنِ فلاحت کا تذکرہ ان کی کتابوں میں پایا جاتا ہے ۔

ایام قدیمہ کے سلاطین اور ان کے عمائد مقربین یعنی ارکان سلطنت و اعیانِ مملکت وغیرہ علوم و فنون سے کامل واقفیت

اور ان پر پوری دستگاہ و قدرت رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ بعض بعض مسئلہ میں علما کی اتفاقی غلطیوں سے ان کو متنبہ کیا کرتے تھے۔ اسی سبب سے یہ لوگ علم کی رفعت و منفعت، علما و فضلا کی شان و شوکت اور ان کے حقوق کو کماحقہٗ جانتے اور پہچانتے تھے۔ ہر جگہ حسبِ ضرورت موقع و محل کے مناسب مختلف علوم و فنون کے مدارس و سکول وغیرہ قایم کرتے تھے۔ اور چونکہ مشایخ علما و طلبہ کو اپنے عطایا سے فیضیاب کرتے تھے، اس لیے لوگ جوق درجوق ان کے یہاں آتے اور حسبِ استعداد و لیاقت جس علم و فن کے تحصیل کی استطاعت رکھتے تھے، اس کے حصول میں ہمیشہ کوشاں رہ کر ان کو حاصل کرتے۔ یہاں تک کہ جب اپنے علم کو پایۂ تکمیل تک پہنچا لیتے تھے، تو ان کو کسی اعلیٰ منصب و بڑے عہدہ پر مقرر و معین کر دیا جاتا تھا یا سلاطینِ وقت کے وظائف سے متمتع ہو کر اپنے جمیع امور سے مستغنی اور تمام مشکلات و مہمات سے سبکدوش ہو کر فراغت کے ساتھ توسیع علم و فن، تالیف و تصانیف میں اپنی زندگی کو وقف کر دیتے تھے اور طلبِ علوم و فنون وغیرہ میں اپنی ایک ایسی مثال، ایک ایسا نمونہ پیش کرتے تھے کہ لا عینٌ رات و لا اُذنٌ سمعت۔ یہ لوگ اپنی حیات کا بیش بہا اور گرانمایہ حصہ اسی مشغلے میں صرف کیا کرتے تھے۔ ایک وُہ زمانہ آیا کہ سلاطینِ وقت کی رغبت اور توجہ علوم و فنون کی طرف سے کم ہوتی گئی۔ اسباب علوم و فنون منقطع ہوتے گئے۔ تحصیل علوم کی کوششیں رائیگاں و ضائع ہونے لگیں۔ علما و فضلا کی تصنیفیں تقویم پارینہ سمجھی جانے لگیں۔ انقلابِ زمانہ نے اربابِ علوم و اصحابِ فنون کو صفحۂ ہستی پر باقی نہ رکھا۔ یہاں تک کہ علوم و فنون سب ایسے نیست و نابُود ہو گئے کہ وہ علوم تو کجا، ان کے نام و نشان تک ڈھونڈنے سے نہیں مل سکتے: ؎

سراغ عمرِ گزشتہ کا ڈھونڈیے گر ذوق
تمام عمر گزر جائے جستجو کرتے

عرب اور علومِ طبیہ

ابو محمد ثاقب کانپوری

عرب اگر ایک طرف اپنی جہالت و بربریت کے لیے مشہور ہے، تو دوسری طرف اپنی اعلیٰ تہذیب و تمدن میں تمام اقوامِ عالم پر فوقیت رکھتا ہے۔ وہ بادیہ نشینانِ عرب جنھوں نے خانہ بدوشی کی آغوش میں آنکھیں کھولیں اور کھجور و جَو کھا کر پرورش پائی، دنیا کو علوم و فنون، تہذیب و تمدن کے وہ حیرت انگیز سبق دے گئے جسے زمانہ خواہ وہ ترقی کے کسی مرکز پر پہنچ جائے، کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

تاریخِ عرب کا مطالعہ کرنے والے مورخ کو سب سے زیادہ جس حیرت کا سامنا ہوتا ہے، وہ عربوں کی ہمہ گیر قابلیت کا نظارہ ہے۔ کبھی وہ عربوں کے علم و ادب اور شعر و شاعری کی سحر طرازیوں سے وجد میں آجاتا ہے۔ کبھی مسائل فلسفہ اسے حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ کبھی علوم ریاضیہ اور علم ہیئت کی فضا میں ان کی بلند پروازی اسے دم بخود کر دیتی ہے اور جغرافیائی تحقیقات اور علم طبیعیات کی موشگافیوں سے اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔

اسی طرح علمِ طب پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عربوں نے اس بچے کو یونان کی گود سے لے کر کس محبت و شفقت کے ساتھ پروان چڑھایا۔ اس کے خط و خال کی مشاطہ گری تو انھوں نے کچھ اس انداز سے کی کہ دیکھنے والوں کو یونانی و عربی بچے میں امتیاز کرنا مشکل ہوگیا۔ حقیقت یہ ہے کہ عرب اگر اس بچے کو اپنی آغوشِ محبت میں نہ لیتے، تو شاید زمانے کو اس کا عالمِ شباب دیکھنا میسر نہ ہوتا اور انگریزی ڈاکٹری خزانہ ان مفید و بیش بہا معلومات سے خالی رہ جاتا، جو اسے آج صرف عربوں کی بدولت حاصل ہے۔

عربوں نے یونانی علوم طبیہ کی تصانیف جس کاہش و محنت کے ساتھ عربی میں منتقل کیں، وہ ان کے ذوقِ علمی اور متجسسانہ طبیعت پر شاہد ہیں۔ اگرچہ علوم طب میں اضافہ اور یونانی زبان کے تراجم کرنے والے عربوں کی تاریخ میں کثرت ہے۔ تاہم ان سب سے زیادہ مشہور رازی ہے جو ۸۵۰ء عیسوی میں پیدا ہوا اور ۹۳۲ء عیسوی میں دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگیا۔ اس نے یہی نہیں کہ فنِ طبابت پر مفید کتابیں لکھیں، بلکہ خود پچاس برس تک بغداد میں کامیابی کے ساتھ مطب کرتا رہا۔

رازی کی تصنیفات میں برالاعظم اور المنصوریہ جو اس نے شہزادہ منصور کے نام پر لکھی سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ المنصوریہ کی ترتیب میں اس نے اس سلیقے سے کام لیا ہے، جو آج بھی سبق آموز ہو سکتی ہے۔ یعنی یہ دس حصوں میں تقسیم کی گئی ہے، پہلا باب تشریح میں ہے، دوسرا امزجہ میں، تیسرا اغذیہ و معالجات میں، چوتھا حفظ صحت میں، پانچواں آرائشات جسمانی میں، چھٹا لوازمۂ سفر میں، ساتواں جراحی میں، آٹھواں سمیات میں، نواں امراض عامہ میں اور دسواں حمیات کی تشریح میں۔

رازی کی ان کتابوں کی مقبولیت کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا گیا اور متعدد بار طبع ہوئیں۔ سب سے پہلے ۱۵۰۹ء میں وینس میں طبع ہوئی۔ اس کے بعد ۱۵۲۸ء میں پیرس میں چھپی اور سب سے آخر میں اس کی وہ کتاب جو اس نے چیچک کے متعلق لکھی تھی ۱۸۴۶ء میں شایع کی گئی۔ اس کی یہ تصنیفات یہی نہیں کہ ایک عرصے تک یورپ میں شایع ہوتی رہیں بلکہ وہاں کے اکثر طبی مدارس میں نصاب کے طور پر بھی داخل رہیں۔ اس کی ان کتابوں کو معصرین یورپ نے اس قدر پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا کہ اطبائے یونان کی مشہور سے مشہور کتابیں ان کے آگے گرد ہو گئیں۔

مورخین عرب کا بیان ہے کہ رازی اپنے بڑھاپے میں موتیا بند کی وجہ سے اندھا ہو گیا تھا۔ جب لوگوں نے اس سے آنکھیں بنوانے پر اصرار کیا تو اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں دنیا کو بہت کچھ دیکھ چکا ہوں اور اب مجھے اس سے اس قدر نفرت ہے کہ میں بغیر کسی افسوس کے اس کے دیکھنے سے دست بردار ہوتا ہوں۔

رازی کے قریب قریب ہمعصر اطبا میں علی عباس کامیاب ترین طبیب تھا۔ اس کی سب سے زیادہ مشہور تصنیف ملکی ہے، جس میں اس نے اصولِ طب اور معالجات دونوں کی تشریح کی ہے اور متقدمین اطبا مثلاً جالینوس، ہیپوکراٹیز، اوری باز اور پال ویزین کی بہت سی غلطیاں نکالی ہیں۔ اس کی اس کتاب کا ترجمہ انطاکی نے ۱۱۲۷ء میں کیا اور ۱۵۲۳ء میں بمقام لیون طبع ہوئی۔

طب میں سب سے زیادہ شہرت جس نے حاصل کی اور خواص کی زبان سے گزر کر عوام کی زبانوں پر جس کا نام سب سے زیادہ آیا، وہ بو علی سینا ہے۔ اسے تمام اطبائے عرب نے اپنا "ملک الاطبا" تسلیم کیا ہے۔ اس کی پیدائش ۹۸۰ء میں ہوئی اور وفات ۱۰۳۷ء میں۔

اگرچہ یہ اپنی عیاشیوں کی زیادتی کی وجہ سے جوان ہی مر گیا، تاہم اس کی تصنیفات کی تعداد اپنے پیشروؤں سے زیادہ ہے۔ اس کی سب سے مشہور و غیر فانی تصنیف "قانون" ہے، جس میں علم ہیئت، علوم حفظ صحت، امراض و معالجات اور خواص الادویہ کی تشریح کی گئی ہے۔ اگرچہ اس کتاب میں امراض کا بیان بمقابلہ متقدمین کے بہت کم ہے، لیکن اس میں جن اصول سے بحث کی گئی ہے، وُہ اپنی جگہ غیر فانی اور ناقابلِ تغیر ہیں۔ قریب قریب دُنیا کی ہر زندہ زبان میں اس کی اس کتاب کے تراجم موجود ہیں۔ سولہویں صدی عیسوی تک یورپ کی طب کا دارومدار اس کی تصانیف پر رہا۔ فرانس و اطالیہ کے طبی دار العلوم تو محض انہی کتابوں کی درس و تدریس تک محدود تھے۔ اٹھارھویں صدی عیسوی تک عام طور پر یورپ کے طبی مدارس میں اس کی تصنیفات رائج رہیں۔ فرانس میں اس کتاب کو متروک ہُوئے ساٹھ ستّر برس سے زیادہ نہیں ہُوئے۔

اسی طرح عرب کا سب سے بڑا جرّاح قرطبہ کا البقاسس ہے، جس نے اپنی خداداد ذہانت سے فنِ جراحی میں بہت سے مفید و کارآمد آلات کا اضافہ کیا اور پتھری خارج کرنے کا طریقہ اس نے تمام اطبا سے پہلے دریافت کیا، جو اس زمانے میں بالکل جدید تھا۔ اس کے علاوہ اس نے ایک ایسی کتاب بھی تصنیف کی جس میں آنکھوں کی جراحی، فتق، بچّے جنانے اور پتھری نکالنے کا مفصل بیان ہے۔

عربوں نے علوم حفظ صحت میں بھی انتہائی ترقی کی تھی، وہ جانتے تھے کہ ایسے امراض، جو علاج سے رفع نہیں ہو سکتے، ان سے اپنے آپ کو کس طرح محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ اس قسم کے امراض سے بچنے کے لیے ان کے پاس کوئی مستقل کتاب نہ تھی بلکہ اس کے طریقے زیادہ تر اقوال و ملفوظات کی شکل میں محفوظ تھے۔ چنانچہ ایک طبیب کا قول ہے کہ:

"بڈھوں کے لیے ماہر باورچی اور جوان عورت زہر ہے۔"

عربوں کے شفاخانے عمدگی کے اعتبار سے اس قدر بہتر ہوتے تھے اور ان میں ہوا اور پانی کا انتظام اتنا اچھا ہوتا تھا کہ موجودہ زمانے کے شفاخانے بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

رازی سے جس وقت شفاخانے کی تعمیر کے لیے کہا گیا کہ وہ بغداد میں آب و ہوا کے اعتبار سے کسی عمدہ مقام کا انتخاب کر لے، تو اس نے بغداد کے مختلف مقامات کا اس طرح امتحان لیا کہ ہر جگہ تازہ گوشت کا ایک ایک ٹکڑا لٹکوا دیا۔ جس جگہ کا ٹکڑا دیر میں سڑا، اسی مقام کو منتخب کر لیا۔

آج کل کے انگریزی شفاخانوں کی طرح عربوں کے شفاخانوں میں بھی مریضوں کے لیے بڑے بڑے کمرے اور ہال ہوا کرتے تھے، جس میں طلباء کے لیے دار الاقامۃ بھی ہوا کرتا تھا، اس لیے کہ انھیں کتابوں کی بہ نسبت عملی تعلیم زیادہ دی جاتی تھی یہ دواخانے کسی واحد شخصیت کی ملکیت نہ ہوتے تھے بلکہ رفاہِ عام کے لیے اس میں شہر کے تمام معززین شریک ہوتے تھے۔ ان شفاخانوں میں مریض بغیر کسی فیس یا اُجرت کے داخل کیے جاتے تھے اور ان کا علاج مقررہ عرصے تک نہایت مستعدی کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ان مقامات کا جہاں شفاخانے نہ بن سکتے تھے، اطبا اپنے ساتھ دواؤں کا ایک معقول ذخیرہ لے کر سفر کیا کرتے تھے۔

فنِ جراحی کو عربوں نے جس حد تک ترقی دی، وہ نہایت حیرت انگیز ہے۔ یورپ کا موجودہ عملِ جراحی عربوں ہی کی کاوشوں کا ممنون احسان ہے۔ جس وقت انگریزی طب کا وجود بھی نہ تھا، اس وقت گیارھویں صدی عیسوی میں عرب آنکھوں پر عملِ جراحی کرنے کے ماہر تھے۔ کلورا فارم جو بیہوشی کے لیے جدید ترین ایجاد سمجھی جاتی ہے، آٹھ سو برس پہلے عربوں کے نزدیک معمولی چیز تھی۔

طبِ نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

حکیم سیّد امین الدین

جس طرح کلامِ پاک میں باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: "وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ" یعنی کوئی رطب و یابس چیز ایسی نہیں ہے جو کتابِ روشن میں موجود نہ ہو۔ اسی طرح انسانی حیات و ممات کا کوئی گوشہ اور پہلو ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں احادیثِ پاک میں ہم کو واضح ہدایات نہ ملتی ہوں چونکہ حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا منصبِ رسالت و نبوت تھا۔ آپ اقوام و اُممِ عالم کی رشد و ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔ حضور گم کردہ راہ انسانوں کے قلب و نظر کو جِلا بخشنے، انھیں اخلاقی اور تمدنی بلندی عطا کرنے، اُن کی معاشی، معاشرتی، سیاسی اور سماجی رہنمائی کے لیے بھیجے گئے تھے۔ آپ جسمانی اور روحانی امراض کے طبیب اور معالج تھے۔ اُمّی لقب نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر دنیا جہان کی حکمتیں نثار ہوں آپ ہر روگ اور ہر دُکھ کا درماں بن کر آئے۔ آپ کی کوئی بات حکمت سے خالی نہ تھی اس لیے یہ ناممکن تھا کہ علم الابدان کا باب اس سلسلہ میں تشنہ رہ جاتا۔

طب کا موضوع جیسا کہ آپ جانتے ہیں حفظِ صحتِ حاصلہ اور استرداد صحتِ زائلہ ہے۔ پہلے حصّہ کا مطلب یہ ہے کہ ہم حفظانِ صحت کے ان اصولوں کو اپنائیں اور حفظِ ماتقدم کے اُن طریقوں پر عمل کریں جن کے ذریعہ بیماریوں کے حملوں سے محفوظ رہا جا سکے اور دُوسرے حصّہ کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی بیماری لاحق ہو جائے تو اس کا علاج کس طرح کیا جائے۔

جہاں تک حفظانِ صحت اور صفائی کے اصولوں کا تعلق ہے تو ہم کو احادیثِ پاک میں بڑا ذخیرہ ملتا ہے بعض چھوٹی سے چھوٹی مگر اہم اور بنیادی باتوں کی جانب آپ نے زیادہ سے زیادہ توجہ فرمائی ہے مثلاً حضور پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا کہ ہفتہ وار ناخن ضرور ترشوائے جائیں لیکن اس کے ساتھ یہ بھی تاکید فرمائی ہے کہ ناخن دانتوں سے نہ کاٹے جائیں کیونکہ یہ طریقہ حفظانِ صحت کے اصول کے خلاف ہے۔

حضرت ایوب انصاریؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ ایک شخص حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمتِ بابرکت میں حاضر ہوا اور آسمان کی خبریں دریافت کرنے لگا تو اس پر آپ نے فرمایا: تم میں ایک شخص آتا ہے اور آسمان کی خبریں دریافت کرتا ہے مگر اس کو اپنے سامنے کی چیزیں نظر نہیں آتیں یعنی اس کے ناخن پرندوں کے پنجوں کی طرح بڑھے ہوئے ہیں جن میں ہر طرح کا میل کچیل بھرا ہوا ہوتا ہے۔

شریعتِ اسلامیہ نے اپنی عبادات اور اُن کے ارکان و شرائط تک میں حفظانِ صحت کے اصولوں کو بڑی خوبصورتی سے سمو رکھا ہے۔ نماز اور نماز کے لیے غسل و طہارت اور پاکیزگیِ لباس و مکان کا جو نظام اسلام نے قائم کیا ہے اگر اس پر صحیح معنی

میں عمل کیا جائے تو صحت و صفائی اور پاکیزگی کا وہ ماحول پیدا ہو جاتا ہے کہ لوگ بڑی حد تک بیماریوں سے نجات پا سکتے ہیں۔

اگر اسلامی طہارت کے طریقوں پر غور کیا جائے تو اس کا معیار سائنس کے طریقوں سے بھی اعلیٰ و ارفع نظر آئے گا نماز سے پہلے وضو کا حکم دیا گیا ہے یہ روحانی اور جسمانی دونوں فوائد پر حاوی ہے اسی وجہ سے خود وضو کو روحانی عبادت کا درجہ دیا گیا ہے ایک موقعہ پر ایک غیر مسلم سائنسدان نے ایک مسلمان کو وضو کرتے دیکھا وہ وضو کی ترتیب کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اس نے ناک میں پانی لینے پر غور کیا۔ اس نے دیکھا کہ کلائی سے کہنی تک کا حصہ دھوتے وقت مستعمل پانی کو ڈھلے ہوئے پنجوں کی طرف سے نہیں بلکہ کہنی کی طرف سے بہایا جاتا ہے اس طریقے سے بہت متاثر ہوا۔ پھر اس نے سر اور گردن پر مسح کی سائنٹیفک ترکیب کو دیکھا۔ اس نے غور کیا کہ سر اور گردن کو دھویا نہیں جاتا جس سے گرم گرم حالت میں نقصان پہنچ جانے کا امکان ہے بلکہ صرف ہاتھ پھیرا جاتا ہے جس سے تسکین کے علاوہ اعصاب میں انتعاشی کیفیت پیدا ہوتی ہے جو دھونے سے نہیں ہو سکتی چونکہ پشت اور گردن کا تعلق مبدأ النخاع سے ہے اور دماغی و عصبی اعمال میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ اس طریقہ کو دیکھ کر وہ اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اسلام کے سامنے اپنی گردن جھکا دی اس نے سوچا کہ تیرہ سو برس پہلے جس انسان نے نماز سے پہلے طہارت اور تفریحِ اعضائے بدن کا یہ طریقہ سکھایا ہے وہ نبی کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح اسلام میں دانتوں کی صفائی اور خلال کو انتہائی اہمیت دی گئی ہے اور دانتوں کی صفائی کے لیے مسواک کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ مسواک سے بہتر دانتوں کی صفائی کا کوئی اور طریقہ ممکن نہیں یہ طریقہ مضرات سے پاک اور فوائد سے مملو ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ مسواک انسان کو بہت سی بیماریوں سے محفوظ رکھتی ہے اور یہ قول جتنا سائنٹیفک ہے موجودہ طبی سائنس کی روشنی میں اس کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے دن میں اکثر کم از کم پانچ مرتبہ نمازوں سے پہلے وضو کرنا ہوتا ہے اور وضو کے ساتھ مسواک کرنے کی بھی شدید تاکید کی جاتی ہے۔ ذیل میں اسی قسم کی چند احادیث پاک بیان کی جا رہی ہیں:

۱۔ عَنْ حُذَيْفَةَ رضی قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ اِذَا قَامَ مِنَ النَّوْمِ يَشُوْصُ فَاهُ بِالسِّوَاكِ۔ (بخاری و مسلم)

یعنی حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ جب حضور خواب سے بیدار ہوتے تو اپنے دہن مبارک کو مسواک سے صاف کرتے تھے۔

۲۔ عَنْ عَائِشَةَ رضی اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ قَالَ اَلسِّوَاكُ مُطَهِّرَةٌ لِّلْفَمِ وَمَرْضَاةٌ لِّلرَّبِّ۔ (نسائی)

یعنی حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ حضور نے ارشاد فرمایا: "مسواک منہ کو پاکیزہ کرنے والی اور رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ ہے۔"

۳۔ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رضی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ لَوْلَا اَنْ اَشُقَّ عَلٰى اُمَّتِيْ اَوْ عَلَى النَّاسِ لَاَمَرْتُهُمْ بِالسِّوَاكِ مَعَ كُلِّ صَلٰوةٍ۔ (بخاری و مسلم)

یعنی حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور نے ارشاد فرمایا: "اگر مجھ کو یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ میری اُمت مشقت میں پڑ جائے گی تو میں ان کو ہر نماز کے لیے ضرور مسواک کرنے کا حکم دیتا۔"

۴۔ مُسند احمد میں ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کچھ لوگ آئے جن کے دانت صاف نہ ہونے کی وجہ سے پیلے ہو رہے تھے، آپ کی نظر پڑی تو فرمایا: تمہارے دانت پیلے پیلے کیوں نظر آتے ہیں مسواک کیا کرو۔

بہ ظاہر اس عمل کا فائدہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ دانت صاف رہیں اور ان کے تعفن سے دُوسری بیماریاں پیدا نہ ہوں چونکہ دانتوں کا ہضمِ غذا سے بڑا تعلق ہے اور غذا اگر اچھی طرح ہضم نہ ہُوئی تو پرورشِ انسانی کرنے والی اخلاط کا توازن بگڑ جائے گا اور ان کے فساد سے صحتِ انسانی پر اثر پڑے گا۔

اسی طرح انسانی صحت کو برقرار رکھنے کے لیے پانی کا استعمال اشد ضروری ہے کیونکہ پانی انہضامِ غذا میں مد و معاون اور اخلاط کو رقیق کر کے بدن کے ہر عضو میں نفوذ کرانے کا ذریعہ بنتا ہے لیکن پانی پینے کے بھی کچھ آداب ہیں جس کی رہنمائی ہمیں احادیثِ نبویہ سے ملتی ہے۔ مثلاً آپ نے فرمایا کہ پانی پیتے وقت تین بار سانس لیا کرو اور سانس برتن کے اندر نہیں بلکہ باہر لیا جائے نیز مشروب میں پھونک مارنے سے بھی منع فرمایا جس کا فائدہ یہ ہے کہ انسان کے اندر سے سانس کے ذریعہ سے جو ہوا خارج ہوتی ہے وہ مضرِ صحت ہے لہٰذا زہریلے اور گندے جراثیم سے بچاؤ کے خیال ہی سے یہ حکم دیا گیا ہے کہ پانی تین سانسوں میں پیا جائے اور تینوں مرتبہ پانی کے برتن کو منہ سے الگ کر کے سانس لیا جائے۔ اس لیے یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ گرم کھانے کو مُنہ سے پھونک مار کر ٹھنڈا نہ کیا جائے۔ ارشادِ گرامی ہے:

۱۔ عَنْ عَبَّاسٍؓ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نَھٰی اَنْ یُّتَنَفَّسَ فِی الْاِنَاءِ اَوْ یُنْفَخَ فِیْہِ۔ (ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ)

یعنی حضرت عباسؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے برتن کے اندر سانس لینے اور اس میں پھونک مارنے سے منع فرمایا ہے۔

۲۔ عَنْ اَنَسٍؓ اَنَّ الرَّسُوْلَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کَانَ یَتَنَفَّسُ فِی الشَّرَابِ ثَلَاثًا خَارِجَ الْاِنَاءِ۔

یعنی حضرت انسؓ سے روایت ہے فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی مشروب کے پینے کے دوران برتن سے باہر تین بار سانس لیا کرتے تھے۔

جس طرح کلامِ پاک میں وَثِیَابَکَ فَطَہِّرْ وَالرُّجْزَ فَاھْجُرْ کے ذریعہ کپڑوں اور جسم کو پاک صاف رکھنے اور میل کچیل سے صاف سُتھرا رکھنے کا حکم دیا گیا ہے اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی لباس کو صاف سُتھرا رکھنے اور گندگی سے علیحدہ رہنے کی تاکید فرمائی ہے۔ ایک بار آپ نے کسی شخص کو میلے کپڑے پہنے ہُوئے دیکھا تو فرمایا اس کے پاس اتنا بھی نہیں کہ اپنے کپڑے دھو لیتا۔

صفائی سے متعلق بخاری شریف میں روایت ہے آپ نے ارشاد فرمایا کہ ہر مسلمان پر خدا کا یہ حق ہے کہ وہ ہفتہ میں

ایک دن غسل کیا کرے اور اپنے سر اور بدن کو دھویا کرے۔ آپ نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ روزانہ ہر شخص صبح کو اُٹھ کر کسی کھانے پینے کی چیز کو ہاتھ لگانے سے پہلے کم از کم تین مرتبہ اپنے ہاتھ دھوئے۔ اسی طرح کھانا کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے کی تاکید فرمائی چونکہ جب بغیر دُھلے ہُوئے ہاتھ کھانے کے ساتھ مُنہ میں جائیں گے تو میل یا جراثیم کے جسم کے اندر جانے کا احتمال رہے گا اور اس میں بھی یہ باریکی رکھی گئی ہے کہ کھانے سے پہلے ہاتھ دھو کر کسی کپڑے سے نہ پُونچھے جائیں چونکہ اس طرح اس کپڑے کے جراثیم ہاتھوں میں لگ جائیں گے اور کھانے کے ساتھ مُنہ میں چلے جائیں گے اور اسی مصلحت کی بنا پر آپ نے یہ بھی حکم دیا کہ دُوسرے کے تولیے میں شرکت نہ کی جائے۔

انسانی صحت کی حفاظت کا حضور پاک علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کو اس درجہ خیال تھا کہ آپ نے یہ عام ہدایت فرمائی کہ بیمار آدمی تندرست آدمی کے پاس نہ آئے اور متعدی اور اڑ کر لگنے والی بیماریوں سے بچنے کے لیے تو آپ نے یہاں تک حکم دے دیا کہ جذامی سے ایسا بھاگ جیسے شیر سے بھاگتے ہیں۔ ان تمام ہدایتوں اور احتیاطوں کا مقصد یہی ہے کہ انسانی صحت بیماریوں سے محفوظ رہے۔ اسی طرح بخاری اور مسلم کی یہ حدیث پاک ہے:

فَاِذَا سَمِعْتُمْ بِالطَّاعُوْنِ بِاَرْضٍ فَلَا تَقْدَمُوْا اِلَیْهِ وَاِذَا وَقَعَ بِاَرْضٍ وَاَنْتُمْ بِهَا فَلَا تَخْرُجُوْا مِنْهَا فِرَارًا مِّنْهُ۔

یعنی جب کسی بستی میں تم سُنو کہ وہاں طاعون کی وبا پھُوٹ پڑی ہے تو وہاں نہ جاؤ اور جہاں تم رہتے ہو اگر وہاں پھُوٹ پڑے تو اپنی بستی سے نکل کر نہ بھاگو۔

کس قدر حکیمانہ ارشاد ہے کہ جہاں یہ متعدی وبا پھیلی ہُوئی ہے وہاں خود جا کر اپنے ہاتھوں بیماری کو دعوت نہ دو، اور اگر خود تمہاری بستی اس وبا سے متاثر ہو جائے تو وہاں سے بھاگ کر اس متعدی مرض کو دُوسرے شہر میں نہ لے جاؤ۔

جسمانی صفائی کے بعد غذا کا مسئلہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ غذا کے متعلق بھی اسلام نے تفصیلی ہدایات دی ہیں اور اس ضمن میں پیغمبر عربی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی فہم و فراست اور عقل و دانش کے قربان جائیے جب احادیث نبویہ کو جدید علم طب کی روشنی میں دیکھا جاتا ہے تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ آپ کا ہر فرمان ٹھوس سائنسی حقیقت پر مبنی ہے اور آپ کی تعلیمات حکیمانہ اور سائنٹیفک ہیں اور سائنس کے اس ارتقائی دور کے علم سے بھی سبقت لے گئی ہیں۔

انسان کی صحیح غذا کیا ہے؟ سبزی یا گوشت؟ یہ مسئلہ مدت سے ما بہ النزاع بنا ہوا ہے۔ اسلام نے اس مسئلہ کو چودہ سو سال پہلے طے کر دیا ہے۔ گوشت کھانے کو اسلام جائز رکھتا ہے۔ پروٹین غذا کا سب سے اہم جزو ہے۔ اہل سائنس اس بات پر متفق ہیں کہ لحم اور حیوانی غذائیں پروٹین کا بہترین ماخذ ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے کہ گوشت سب سالنوں کا سردار ہے۔ گوشت بلغم کی تولید کو کم کرتا اور چہرے کے رنگ کو نکھارتا ہے اور خُون بُہتات کے ساتھ پیدا کرتا ہے اور پیٹ کو بڑھنے نہیں دیتا یعنی لطیف قسم کی غذا ہے اور اسے کھا کر راحت ہوتی ہے۔ جن جانوروں کا گوشت کھانے کے قابل ہے اور جن کا قابلِ استعمال نہیں ہے اس کی اسلام نے ایسی سائنٹیفک تقسیم کی ہے کہ سائنس سے اس کی حرف بہ حرف

تصدیق ہوتی ہے۔ جن جانوروں کے گوشت کھانے سے منع کیا گیا ہے وہ مضر صحت ہیں اور جن کے نقصانات سے طب جدید خوب واقف ہے۔ خنزیر کا گوشت سراسر مضر صحت اور بے حد مخرب اخلاق ہونے کے علاوہ مولد امراض بھی ہے اور کیا عجب ہے کہ یورپ اور امریکہ میں امراضِ قلب اور ہائی بلڈ پریشر کا مرض زیادہ پائے جانے کی وجہ منجملہ اور اسباب کے سور کا گوشت بھی ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ گوشت میں کدو یعنی لوکی ڈال کر استعمال کیا کرو کیونکہ کدو مقوی دماغ ہونے کے علاوہ گوشت کی بھی اصلاح کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سبزی آمیز گوشت بہتر غذا ہے۔ اور حضور پاک صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا یہ ارشاد سائنس کی تحقیقات کے بالکل مطابق ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دست اور پشت کا گوشت کھانے کی تلقین فرمائی ہے اور وجہ بھی بتلا دی ہے کہ اس سے کمر اور بازو مضبوط ہوتے ہیں۔ اس قول سے علاج بالاعضاء کے اصول کی تصدیق ہوتی ہے۔

آج اناجوں اور پھلوں کے چھلکوں میں بہترین اور نہایت ضروری اجزاء کی موجودگی کی سائنس تصدیق کرتی ہے۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بغیر چھنے ہوئے آٹے کی روٹی تناول فرمایا کرتے تھے اور زیادہ تر جَو کی روٹی استعمال فرماتے تھے۔ جالینوس کا قول ہے کہ جَو ایسا اناج ہے جو بیماروں اور تندرستوں کے لیے یکساں مفید ہے۔ آج بھی جَو کو نہایت مفید اور اعلیٰ درجہ کا مقوی و مغذی اناج قرار دیا جاتا ہے اور ہر قسم کی مضرت سے پاک اور لطیف غذا سمجھا جاتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ سیال غذاؤں میں سب سے اچھا دودھ ہے۔ دُودھ سے دہی، مسکہ، پنیر، چھاچھ اور بالائی وغیرہ بھی حاصل ہوتی ہے جو اپنی اپنی جگہ غذا بھی ہیں اور دوا بھی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کوئی تم کو پینے کے لیے دُودھ پیش کرے تو اس کو رد مت کرو کیونکہ یہ اللہ کی بڑی نعمت ہے نیز فرمایا کہ پنیر تنہا مضر ہے اس کو جوز کے ساتھ استعمال کرنا چاہیے۔ قرآن پاک میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ انسانوں کے لیے شہد میں شفا ہے۔ حضور پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھی شہد بہت محبوب تھا۔ شیر اور شہد ہزاروں قسم کی بوٹیوں کے مرکب ہوتے ہیں کوئی حکیم ان سے بہتر مرکب دوا اور غذا تیار کرنے پر قادر نہیں ہے۔

رُوح اور جسم کے طبیب اعظم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بعض اشیاء کو بدرقات کے ساتھ استعمال فرماتے تھے چنانچہ دُودھ میں اکثر پانی ملا لیا کرتے تھے اس طرح دُودھ اور زیادہ لطیف اور سریع الاثر ہو جاتا ہے۔ شہد کو پانی میں حل کر کے نوش فرمایا کرتے تھے۔ اس طرح شہد کی حدت کم ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی کھجور کو پانی میں ایک رات اور کبھی دو رات تر کر کے اس کا زلال استعمال فرماتے تھے اور کبھی دُودھ میں شہد آمیز کر کے استعمال فرماتے تھے۔

اسی طرح کبھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بغیر اصلاح کھیرا، ککڑی اور خربوزہ کے ساتھ کھجور ملا کر تناول فرماتے تھے اور ارشاد فرماتے تھے کہ اس طرح کھانے سے ایک دُوسرے کی حدت اور برودت کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اس فرمان سے دواؤں اور غذاؤں میں حدت اور برودت کے وجود کی تصدیق ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں زنجبیل یعنی

سونٹھ اور کافور کے مزاج کی تعریف کی گئی ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ جنت کی اغذیہ کا مزاج ادرک اور کافور جیسا ہے۔ یہ دونوں خوشبودار ہیں، ان میں سے ایک بارد اور ایک حار ہے۔ زنجبیل اور کافور کی تاثیر کے لیے خاصہ یا فعل یا اس کے ہم معنیٰ کوئی لفظ استعمال نہیں کیا گیا بلکہ مزاج کہا گیا ہے۔ اس طرح ادویہ و اغذیہ کا مخصوص مزاج بھی قرآن سے ثابت ہوتا ہے جس کا طبِ جدید انکار کرتی ہے۔

حضور پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام مکھن کو کھجور کے ساتھ ملا کر استعمال کرنا بہت پسند فرماتے تھے۔ اسی طرح کھیرے کو نمک لگا کر بھی استعمال فرماتے تھے۔ آپؐ کو پھل بہت مرغوب تھے چنانچہ انجیر اور زیت سے بڑی رغبت تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا کہ زیت کھایا کرو اور اس کا تیل لگایا کرو بلا شبہ زیتون کا تیل تمام تیلوں سے بہتر ہے۔ پھلوں میں سے آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے انگور اور انار کی بھی تعریف فرمائی ہے اور انجیر کو بواسیر اور نقرس میں مفید بتلایا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی پسندیدہ غذائیں

آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو کھانوں میں ثرید بہت پسند تھا۔ ثرید شوربے میں روٹی بھگو لینے کو کہتے ہیں اور دودھ میں کھجور کو بھگو کر اس میں تھوڑا سا مکھن کا اضافہ کر لیا جائے تو اس کو بھی ثرید کہا جاتا ہے۔ تلبینہ: بیماری میں جب کوئی شخص کھانا نہیں کھاتا تھا تو آپ اس کو تلبینہ پلانے کی ہدایت فرمایا کرتے تھے۔ فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ تلبینہ دھو ڈالتی ہے شکموں کو جس طرح کوئی دھو ڈالتا ہے اپنے چہرہ کو میل سے۔ تلبینہ کی تیاری کی ترکیب یہ ہے کہ بغیر چھنے ہوئے جَو کے آٹے کو دودھ میں پکایا جائے، اور جب وہ پک جانے کے قریب ہو تو اس میں تھوڑا سا شہد ملا دیا جائے اور پھر اسے ٹھنڈا کر کے پیا جائے، بعض اوقات اس کو ثرید میں ملا کر بھی پیا جاتا تھا۔

حیس بھی حضور پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بہت پسندیدہ غذا تھی۔ یہ بھی تین اجزا سے مرکب ہے یعنی کھجور، مکھن اور دہی سے یہ مقوی غذا ہے اور جسم کو فربہ کرتی ہے۔ اس طرح ہریسہ کو بھی آپ نے مقوی غذا فرمایا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سبزی کو دسترخوان پر بہت پسند فرماتے تھے۔ سبز رنگ کو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہت پسند فرماتے تھے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ جاری پانی اور سبز چیز کو دیکھنے سے نگاہ تیز ہوتی ہے۔ فرمایا: زینت دیا کرو اپنے دسترخوان کو سبز چیزوں سے۔ اس لیے کہ سبز چیز بھگاتی ہے شیطان کو اللہ کے نام سے۔ علماء کہتے ہیں کہ سبز چیز سے مراد پودینہ، ہرا دھنیا اور سبز ترکاریاں ہیں، نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ سرکہ بہترین سالن ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ خدا نے معدہ سے بڑا کوئی ظرف پیدا نہیں کیا یہ کبھی نہیں بھرتا۔ اس لیے مناسب ہے کہ معدہ کے تین حصے کیے جائیں، ایک حصہ غذا کے لیے، ایک حصہ پانی کے لیے اور ایک حصہ سانس کی آمد و رفت کے لیے۔ ڈکار سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت نفرت تھی۔ ڈکار کی آواز سُن کر فرماتے تھے کہ اتنا کیوں کھاتے ہو۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے رات کو فاقہ کرنے سے منع فرمایا ہے چونکہ وہ جلد بڑھاپا لاتا ہے۔ بدبودار چیز کھا کر مسجد میں آنے سے بھی آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

نے منع فرمایا ہے۔

طب جدید نے قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ زیادہ کھانا نہ صرف بہت سی بیماریوں کی جڑ ہے بلکہ یہ عادت قبل از وقت بوڑھا کر دیتی ہے اور زندگی کے بہت سے مصائب مثلاً ذیابیطس، فالج اور مخبوط الحواسی اسی چیز کا نتیجہ ہے۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے متبعین کو یہی تعلیم دی ہے اور زیادہ کھانے کو سختی سے منع فرمایا ہے۔ مندرجہ ذیل حدیث پاک میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے پینے اور حفظانِ صحت کا ایسا جامع اصول ارشاد فرمایا ہے جس کی مثال کسی طب، کسی سائنس اور کسی ازم میں نہیں ملتی۔ فرمایا: نَحْنُ قَوْمٌ لَا نَأْكُلُ حَتّٰى نَجُوْعَ وَ اِذَا اَكَلْنَا فَلَا نَشْبَعُ۔ یعنی ہم ایسی قوم ہیں کہ جب تک بھوک نہ لگے نہیں کھاتے اور جب کھاتے ہیں تو پیٹ بھر کر نہیں کھاتے۔

پرہیز پرہیز بھی دوائی علاج کی طرح سنّت ہے۔ مرض میں غسل یا وضو کی بجائے تیمم کی نہ صرف اجازت بلکہ ہدایت ہے۔ حضور پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آنکھ دُکھنے کی حالت میں حضرت صہیب رومیؓ کو کھجور کھانے سے منع فرمایا تھا۔ اسی طرح ایک مرتبہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو آشوب چشم میں کھجور استعمال کرنے سے باز رکھا۔ اس وقت جَو کے ساتھ چقندر پکا ہوا موجود تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس میں سے کھاؤ یہ تمہارے لیے مناسب ہے۔ جس برتن کا پانی دُھوپ سے گرم ہو اس پانی کو استعمال کرنے سے منع فرمایا اور بتلایا کہ ایسے پانی سے برص ہو جایا کرتا ہے۔ تیز گرم مسہلات سے بھی منع فرمایا ہے۔ عورتوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ مٹی کھایا کرتی ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مٹی کھانے سے منع فرمایا ہے اور ارشاد فرمایا کہ مٹی کھانے سے انسان ہمیشہ بیمار رہتا ہے، پیٹ بڑا ہو جاتا ہے اور رنگ زرد ہو جاتا ہے۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مچھلی کو دُودھ کے ساتھ کھانے یا دُودھ کے ساتھ ترشی کھانے سے منع فرمایا ہے۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو گرم غذاؤں، دو سرد غذاؤں، دو قابض غذاؤں یا دو مسہل اشیاء کو جمع کرنے سے منع فرمایا ہے۔

اب استردادِ صحتِ زائلہ کی طرف آیئے یعنی اگر کوئی شخص بیمار ہو جائے تو اس کے معالجے کے بارے میں بھی ہم کو حضور پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاداتِ عالیہ میں بے شمار ہدایات ملتی ہیں اور صرف علاج معالجہ ہی نہیں بلکہ احادیثِ پاک کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ اور آپ کے صحابہ کرامؓ علمِ طب اور معالجہ میں نہ صرف یہ کہ علمی بصیرت رکھتے تھے بلکہ علمی معلومات اور علم الجراحت سے پوری پوری واقفیت رکھتے تھے جیسا کہ زاد المعاد کی مندرجہ ذیل احادیث اس بات کی شاہد ہیں:

۱۔ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ اَمَرَ طَبِيْبًا اَنْ يَّبْسُطَ بَطْنَ رَجُلٍ اَجْوَى الْبَطْنِ فَقِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ هَلْ يَنْفَعُ الطِّبُّ قَالَ الَّذِیْ اَنْزَلَ الدَّاءَ اَنْزَلَ الشِّفَاءَ فِيْمَا شَاءَ۔

یعنی حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک استسقا کے مریض کے بارے میں اس کے معالج کو حکم دیا کہ وہ مریض کے پیٹ میں شگاف دے، اس پر حضور سے پوچھا گیا کہ اے اللہ کے رسول! کیا طب میں بھی کوئی مفید چیز ہے آپ نے جواب دیا جس ذات نے بیماری اتاری ہے اس نے جس جس چیز میں چاہا شفا بھی رکھی ہے۔

۲۔ عَنْ عَلِیٍّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ دَخَلْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ عَلٰى رَجُلٍ يَعُوْدُهٗ بِظَهْرِهٖ وَرَمٌ

فَقَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللهِ! بِهٰذِهٖ مِدَّةٌ فَقَالَ بُطُّوْا عَنْهُ قَالَ عَلِيٌّ فَمَا بَرِحْتُ حَتّٰى بَطَتُّ وَالنَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ شَاهِدٌ۔

یعنی حضرت علیؓ سے روایت ہے فرمایا: میں ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ ایک بیمار کی عیادت کے لیے گیا اس شخص کی پشت پر کسی جگہ ورم تھا لوگوں نے عرض کیا کہ حضور! ورم میں پیپ پڑ گیا ہے آپ نے فرمایا اسے شگاف دے دو۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اسی وقت آپ کی موجودگی میں اس شخص کے شگاف دے دیا اور وہ ٹھیک ہو گیا۔

اسی طرح زخموں کا علاج اور مرہم پٹی کرنا بھی صحابہ کرامؓ اور اہلبیت منتظہرین کی سنّت ہے۔ چنانچہ جب اُحد میں حضور پاک صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا چہرہ مبارک زخمی اور سامنے کا دانت شہید ہو گیا تو حضرت علیؓ اپنی ڈھال میں پانی لے کر آئے اور حضرت بی بی فاطمہؓ نے اپنے والد کے زخم دھونے شروع کیے مگر خون نہ تھما تو حضرت فاطمہؓ نے چٹائی کا ٹکڑا جلایا اور اس کی خاکستر زخم پر چھڑک دی تو خون فوراً بند ہو گیا۔

ایک بار جب حضرت سعدؓ بن معاذ کے تیر لگا تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا علاج داغنے سے کیا اور یہ عمل خود اپنے دستِ مبارک سے سرانجام دیا اور جب زخم پر ورم ہو گیا تو دوبارہ پھر داغ دیا۔

اسی قسم کا ایک اور واقعہ ترمذی شریف میں ہے جو حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت اسعدؓ بن زُرارہ کو کانٹا لگ جانے پر داغ دیا۔ نیز مشکوٰۃ شریف میں ابن ماجہ کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اپنے علاج کے لیے سینگھی لگانے والے کو بلایا اور اس کے ساتھ ہی فرمایا کہ میرے خون میں جوش پیدا ہو رہا ہے اس لیے تم کسی حجام کو بلالاؤ اور دیکھو پچھنا لگانے والا جوان ہو، نہ ضعیف ہو، نہ نو عمر۔ نیز آپ نے یہ بھی فرمایا کہ میں نے حضور پاک صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے سُنا ہے کہ نہار منہ پچھنا لگوانا زیادہ بہتر ہے اس سے عقل و فہم میں اضافہ ہوتا ہے اور قوتِ حافظہ زیادہ ہوتی ہے۔

اگرچہ دیسی جڑی بُوٹیاں طبِ یونانی کے علاج کی اساس اور بنیاد ہیں اور جڑی بُوٹیوں پر برّصغیر پاک و ہند میں بڑے وسیع تجربات کیے گئے ہیں مگر ابھی حال میں چینی وفود کے تبادلہ سے اہلِ پاکستان میں اس سلسلہ میں زیادہ دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ اس لیے اب ہم آخر میں مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر دیسی جڑی بوٹیوں سے علاج اور ان کے خواص کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ارشادات گرامی بیان کرتے ہیں۔ چونکہ احادیث پاک کے مطالعہ سے یہ روشن حقیقت بھی ہمارے سامنے آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو جو علوم عطا فرمائے تھے ان میں خواص الاشیاء کا علم بھی شامل تھا اور بکثرت ایسی حدیثیں ہیں جن میں آپ نے متعدد دواؤں کی طبی خاصیتیں بیان فرمائی ہیں۔ امراض کے لیے ان کا مفید ہونا سمجھایا، اور ان سے فائدہ اٹھانے کی تلقین فرمائی۔

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ کُھمبی کا پانی آنکھوں کے لیے شفا بخش ہے۔ چنانچہ ترمذی شریف میں ہے حضرت ابُوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے تین یا پانچ یا سات کُھمبیاں لے کر ان کا پانی نچوڑا اور ایک شیشی

میں رکھ لیا۔ میری ایک کنیز کی آنکھیں کمزور اور خراب تھیں میں نے وہ پانی اس کی آنکھوں میں ڈالا اور وہ اچھی ہوگئی۔

سناء کے متعلق ابن ماجہ اور ترمذی میں ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے سناء کے متعلق فرمایا اگر کسی چیز میں موت سے شفا ہو سکتی تو وہ سناء میں ہوتی۔

اسی طرح مہندی کے متعلق ترمذی شریف میں ہے، عَنْ سَلْمٰیؓ خَادِمَةِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ اٰلِہٖ وَسَلَّمَ قَالَتْ مَا یَکُوْنُ برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قَرْحَۃٌ وَلَا نَکْبَۃٌ اِلَّا اَمَرَنِیْ اَنْ اَضَعَ عَلَیْھَا الْحِنَاءَ۔

یعنی حضور کی خادمہ حضرت سلمیٰؓ سے مروی ہے انھوں نے فرمایا جب کبھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو زخم، چوٹ یا پھنسی کی تکلیف ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ کو حکم دیتے کہ میں اس پر مہندی لگاؤں۔

طبِ رسولؐ

مولوی حکیم محمد عبد الرزاق

"بخاری و مسلم نے بالاتفاق حضرت ابی ہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"کلونجی میں موت کے سوا ہر مرض کی دوا ہے۔"

کلونجی تیسرے درجہ میں گرم اور دوسرے درجہ میں خشک ہے۔ اس میں ایک قسم کی تیزی اور جلا کی قوت ہے۔ جس کے سبب سے وہ بلغم غلیظ کی غلظت و لزوجت کو قطع کرتی ہے۔ بلغمی مواد کو اور ریاح غلیظہ کو تحلیل کرتی ہے۔ شہد میں ملا کر چاٹنے سے معدہ کا تنقیہ اور ہضم کی تقویت ہوتی ہے۔ حدیث شریف میں جو ہر مرض کے لیے مفید ہونا وارد ہُوا ہے، اس سے یہ مراد ہے کہ امراض باردہ بلغمیہ میں سے ہر ایک مرض کو نافع ہے۔ بعض علمأ نے لکھا ہے کہ اہلِ عرب کے اکثر امراض اس زمانہ میں برودت و رطوبت سے ہوتے تھے۔ کیونکہ ان کی اکثر غذاؤں میں دہی اور سرد و تر کاریاں ہوتی تھیں، لہٰذا اگر ٹھیک موقع پر استعمال کی جائے تو تمام امراض باردہ کے لیے بہت مفید ہے۔

۲۔ "مسلم نے حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نوزائیدہ بچوں کو لایا جاتا تو آپ ان کے لیے برکت کی دُعا کرتے اور چھوہارا چبا کر بچے کے تالُو میں چپکا دیتے تھے۔"

جب تک بچہ ماں کے پیٹ میں رہتا ہے، اس کی آنتوں میں کسی قدر فضلات برازیہ موجود ہوتے ہیں اور ایک تو ان کی قلت مقدار کے باعث وہ آنتوں میں جمع رہتے ہیں۔ دُوسرے یہ کہ ان کے نکلنے کا موقع نہیں ملتا ہے۔ اس لیے بچہ کو پیدائش کے بعد سب سے پہلے گھُٹی دی جاتی ہے تاکہ اس کی آنتیں فضلہ مجتمعہ سے پاک ہو جائیں اور چونکہ چھوہارے میں قوتِ جلا موجود رہے، اس لیے بچے کو چھوہارا دینے سے بھی اس کی آنتوں کے موجودہ فضلات صاف ہونے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔ دوسری منفعت یہ بھی ہے کہ اطبأ کے تجارب کثیرہ سے یہ ثابت ہُوا ہے کہ بچے کو سب سے پہلے جو چیز دی جاتی ہے، اپنی مدت العمر میں کسی موقع پر اس چیز سے اُسے مضرت نہیں ہوتی۔ کیوں کہ بچے کی طبیعت کو اس چیز کے ساتھ ایک خاص مناسبت پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ یہ مقولہ عام طور پر مشہور ہے کہ فلاں چیز تو اس کی گھٹی میں پڑی ہے۔ لہٰذا ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ملک عرب میں چونکہ چھوہارے اکثر کھائے جاتے ہیں، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نوزائیدہ بچوں کے تالُو پر چھوہارا لگا دیتے تھے، تاکہ اس کا عرق رفتہ رفتہ بچے کے حلق میں جاتا رہے اور بچہ بار بار اُسے چُوستا رہے۔ اس عمل سے ایک تو آنتوں کی صفائی مقصود تھی اور دُوسرے یہ بھی نفع منصور تھا کہ چھوہارے سے اس کو مدت العمر میں مضرت نہ پہنچے۔

۳۔ "ترمذی و ابن ماجہ نے عقبہ ابن عامر سے روایت کی۔ فرمایا رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بیماروں کو کھانے کے لیے مجبور نہ کیا کرو۔ کیونکہ خدا تعالیٰ ان کو کھلا پلا دیتا ہے۔"

جس مریض کے ہوش و حواس درست ہوں اور وہ غذا کی ضرورت و منفعت سے کافی واقفیت رکھتا ہو اور اس کے معدے

ہیں بھی کوئی ایسی خرابی موجود نہ ہو، جس کے سبب سے بھوک کا ادراک نہ ہو سکے اور باوجود ان امور کے اس کی طبیعت غذا کی طرف مائل نہ ہوتی ہو تو سمجھ لو کر اس کے بدن کو غذا کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے اسے مرض کی حالت میں غذا کھانے پر مجبور نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ مریض کی طبیعت ہر وقت دفعِ مرض اور تحلیل و اصلاح مادہ میں مصروف رہتی ہے۔ رطوباتِ بدنیہ میں بعض رطوبات کی اصلاح کر کے انہیں پرورشِ بدن میں صرف کرتی اور غذا کا کام لیتی ہے اور غذا نہ کھلانے کی حالت میں طبیعت ہضمِ غذا اور دفع فضلاتِ غذا وغیرہ امور سے پُورے طور پر سبک دوش رہ کر دفعِ مرض کی طرف متوجہ رہتی ہے اور اگر ایسے موقع پر جبراً غذا کھلائی جائے، تو بہت سی خرابیوں کا اندیشہ رہتا ہے۔

۴۔ "ترمذی نے زید ابن ارقم سے روایت کی ہے۔ وُہ کہتے ہیں کہ ہم کو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ذات الجنب میں قسط بحری اور زیت سے علاج کرنے کا حکم دیا۔"

قسط بحری کا مزاج تیسرے درجے میں گرم خشک ہے۔ اس میں ایک قسم کی حدت اور تیزی پائی جاتی ہے جس کے باعث یہ رطوباتِ فضلیہ کو تحلیل اور خشک کرتا ہے۔ اگر اس کا ضماد کیا جاتے، تو مادہ فاسدہ کو عمقِ بدن سے باہر کی طرف جذب کرتا اور ریاح غلیظہ کو تحلیل کرتا ہے۔ درد کو تسکین دینا اور اعصاب کی تقویت اس کا خاص کام ہے۔ اس لیے دردِ سینہ اور پہلو کے لیے مفید اور ذات الجنب بارد کے لیے نافع ہے۔

زیت بھی مقوی اعصاب اور مسکن اوجاع ہے۔ مصفی اخلاط، مفتح سُدد، قاطع عفونت اور مقوی بدن ہے۔ بعض اطبّا نے لکھا ہے کہ زیت کی مالش سے اعصاب کو قوت حاصل ہوتی ہے اور سردی کے تمام نقصانات رفع ہوتے ہیں۔ درد کو بہت جلد رفع کرتا اور مادہ کو تحلیل کرتا ہے۔ اس لیے کہ اگر قسط کو باریک پیس کر اس میں ملایا جائے اور گرم کر کے ذات الجنب بارد خصوصاً ریحی میں اس کی مالش کی جائے تو بہت نافع ہوگا اور اگر قسط کو اس میں جلا کر صاف کریں اور عام دردوں کے موقع پر اس کی مالش کریں، تو اس سے نفع ہوگا۔

۵۔ "ترمذی و ابن ماجہ نے اسماء بنت عمیس سے روایت کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر موت کی دوا ہوتی تو سناء ہوتی۔"

سناء کی دوسرے درجہ میں گرم و خشک ہے۔ بلغم، صفراء، سوداء کو براہ اسہال خارج کرتی ہے اور ہر قسم کے اخلاط سوختہ اور خام کو نکالتی ہے، یہ دوا نہ صرف معدے اور آنتوں کا تنقیہ کرتی ہے، بلکہ اس کی قوت اعماق بدن میں نفوذ کر کے اعضأ بعیدہ سے مواد موذیہ کو کھینچ نکالتی ہے۔ اس لیے عرق النساء، وجع مفاصل، نقرس، دردِ کمر وغیرہ کو جو اخلاط ثلثہ میں سے کسی غلط سے پیدا ہوئے ہوں، نفع کرتی ہے۔ مقوی و منقی دماغ ہے۔ صرع، شقیقہ اور پرانے دردِ سر کو نافع ہے۔ ضیق النفس کے لیے موافق اور جرم قلب کی مقوی ہے۔ چونکہ اس سے مواد خبیثہ کا تنقیہ ہو جاتا ہے، اس لیے امراض متعلق فسادِ خون کو بھی نفع کرتی ہے۔ خارش خشک و تر اور پھوڑے پھنسیوں اور اکثر قروح خبیثہ میں اس کا مسہل بہت فائدہ کرتا ہے۔

غرضکہ جب ہر قسم کے موادِ فاسدہ کو بدن سے نکالنا اور بدن کو اُن سے پُورے طور پر پاک و صاف کرنا اس کا کام ہے، تو

اس کی نسبت یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سوائے موت کے ہر مرض کی بہترین دوا ہے۔

۶۔ "بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت ابی ہریرہؓ سے روایت کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: معدہ بدن کا حوض ہے۔ سب رگیں اس میں ملتی ہیں۔ اگر معدہ درست ہے تو سب رگیں درست ہیں، معدہ خراب ہے تو کل رگیں خراب۔"

یونانی اطبا، وید اور ڈاکٹر سب کے سب اس بات میں متفق ہیں کہ غذا جب معدے میں پہنچتی ہے، تو اس میں ایک خاص قسم کا تغیر کیمیاوی (ہضم) ہوتا ہے جس کے باعث غذا کا رس (خلاصہ) اس کے فضلی اجزا سے متمیز ہو کر باریک رگوں کے ذریعہ سے جگر وغیرہ کی طرف جاتا ہوا تمام اعضاء میں خاص خاص تغیرات حاصل کر کے پرورشِ بدنی میں صرف ہوتا ہے۔ گویا پرورش بدنی کا مادہ سب سے پہلے معدے میں ہو کر پھر وہاں سے تمام اعضاء میں علیٰ قدرِ مراتب تقسیم ہوتا ہے، اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ معدہ مثل اس حوض کے ہے، جس میں پہلے پانی جمع ہو کر پھر حوض کے چاروں طرف والے قطعاتِ زمین کو سیراب کرتا ہو۔

وریدیں، شریانیں غذا کے رس کو جذب کرنے والی خاص قسم کی رگیں (بلکہ کسی قدر پٹھے بھی) اس کی ساخت میں سب کے سب مل جل کر منتشر ہو گئے ہیں، تاکہ غذا کے رس کو جذب کرنے والی رگیں اپنا کام بخوبی انجام دے سکیں اور شریانیں معدے کو زندگی کی قوت اور پرورش پانے کی قابلیت بخشیں اور وریدیں اسے اپنی منفعت سے متمتع کریں۔

یہ بات سب جانتے ہیں کہ اگر معدے کا خاص کام (ہضم غذا) پورے طور پر درست رہتا ہے، تو سب رگیں ٹھیک اور ان کے تمام افعال درست رہتے ہیں اور اگر کسی سبب سے معدے کا فعل خراب ہو جاتا ہے تو سب رگیں ماؤف اور ان کے افعال خراب ہو جاتے ہیں اور یہ خرابی صرف رگوں تک ہی محدود نہیں رہتی، بلکہ اس خرابی کا اثر تمام اعضاء تک متعدی ہوتا ہے۔ جس سے پرورش بدنی میں قصور اور عام صحت میں اس قدر فتور پیدا ہو جاتا ہے کہ اگر یہ حالت کچھ دنوں قایم رہے، تو عیش زندگی تلخ ہو جاتا ہے: ؏

مایۂ عیشِ آدمی شکم است

۷۔ "بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت علیؓ سے روایت کی، فرماتے تھے کہ ایک دفعہ آنحضرتؐ کے نماز پڑھتے میں بچھو نے کاٹ کھایا۔ آپ نے بچھو کو جوتی سے مار ڈالا اور فرمایا: خدا غارت کرے بچھو کو، نبی کے کاٹنے سے بھی باز نہیں آتا۔ پھر پانی اور نمک منگوایا اور نمک کو پانی میں ملا کر بچھو کے کاٹے پر چھیڑکا۔"

نمکِ طعام (کھانے کا نمک) دوسرے درجہ میں گرم و خشک ہے۔ رطوبات متعفنہ کو تحلیل اور خشک کرتا ہے۔ چیپ دار رطوبات کو سطحِ اعضا سے چھڑاتا اور جس عضو پر اس کا لیپ کیا جائے یا مالش کی جائے، اس عضو کے اجزا کو سکیڑ کر اس کے مسامات کو وسیع کرتا ہے۔ مسامات کے اندر کی رطوبات کو تحلیل کر کے تفتیح مسامات کرتا ہے۔ اعضاء کی سردی کو دور کرتا اور سرد زہروں کو تحلیل کرتا ہے۔ گرم پانی میں نمک گھول کر بچھو کے کاٹے ہوئے عضو کو اس پانی میں رکھیں، تو اس سے زہر تحلیل ہوتا اور درد فوراً موقوف ہو جاتا ہے۔ نمک و تخم باریک پیس کر بچھو کے کاٹے ہوئے مقام پر لیپ کرنے سے بہت نفع ہوتا ہے۔ نمک باریک پسا ہوا سرکہ میں ملا کر کپڑے کی گدی اس میں تر کریں اور زہردار جانور کے کاٹے ہوئے مقام پر باندھیں، تو اس سے بہت نفع ہوتا ہے۔ نمک کی پوٹلیوں سے تکمید کرنا تمام دردوں کو مفید ہے، جو اعضاء کی سردی یا ریح سے پیدا ہوئے ہوں۔

۸۔ "ابو نعیم نے کتاب الطب میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ حضرتؐ نے فرمایا کہ سب سالنوں کا سردار سالن گوشت ہے"
اسی کتاب میں حضرت علیؓ کا بیان درج ہے کہ حضرتؐ نے فرمایا: گوشت کھانا اچھا کرتا ہے حلق کو اور صاف کرتا ہے رنگ کو اور چھوٹا کر دیتا ہے پیٹ کو یعنی توند نہیں نکلنے دیتا۔"

گوشت! اگرچہ ہر حیوان کے گوشت کا مزاج یکساں نہیں ہوتا ہے، بلکہ جس طرح سے ہر ایک حیوان کے مزاج میں بہ نسبت دوسرے کے تھوڑا یا بہت فرق ہوتا ہے، اسی طرح سے ان کے گوشت کا مزاج بھی ایک دوسرے سے کسی قدر ضرور مختلف ہوتا ہے، لیکن پھر بھی گوشت کا مزاج عموماً گرم اور تر سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ مختلف حیوانات کے گوشت کی باہمی اختلافِ مزاجی اس قدر نہیں ہوتی ہے کہ جس کے سبب سے کسی حیوان کے گوشت کو گرم و تر نہ کہا جا سکے۔

جن جن حیوانات کے گوشت کھائے جاتے ہیں، ان میں سب سے بہتر بکری کے یکسالہ پٹھڑے کا گوشت ہے۔ اگر نباتاتی غذاؤں کے ساتھ بقدر مناسبت کھایا جائے، تو بآسانی ہضم ہو جاتا اور عمدہ اخلاط پیدا کرتا ہے۔ نباتاتی غذاؤں کی بہ نسبت گوشت میں غذائی اجزاء فضلی اجزاء سے بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ گوشت کھانے سے ریاح اور بلغمی فضلات بہت ہی کم پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے نباتاتی غذا کھانے والوں کی بہ نسبت گوشت خوروں کا پیٹ چھوٹا ہوتا ہے۔ ان کو نفخِ شکم اور کثرتِ ریاح کی شکایت بھی کم ہوتی ہے اور پیٹ بڑھ کر توند نہیں نکلتی ہے۔ اگر کھانے کی مقدار مناسب ہو تو ہضم کی عمدگی اور اخلاطِ بدنیہ کے عمدہ پیدا ہونے سے بدن کی پرورش اچھی طرح سے ہوتی اور رنگ میں رونق و صفائی آتی ہے۔ ان وجوہات سے گوشت کو سب سالنوں کا سردار کہنا بجا ہے۔

ڈاکٹر بھی اس سے متفق ہیں کہ تندرستی کی حالت میں پرورشِ بدنی کے لیے غذا سے جن کیمیاوی اجزا کے حاصل کرنے کی ہمیں ضرورت ہے اور جو نسبت باہمی ان اجزا کے محصولہ میں ہونی چاہیے، وہ تمام اجزائے مطلوبہ نسبت مقصود کے موافق اسی حالت میں بآسانی اور عمدگی سے حاصل ہو سکتے ہیں، جب کہ ہماری غذا اشیائے نباتاتی اور گوشت سے مرکب ہو۔ کیونکہ صرف نباتاتی غذاؤں میں بعض اجزائے ضروریہ نسبت مطلوبہ سے بہت کم ہوتے ہیں اور اسی کے قریب قریب ان غذاؤں کا حال ہے، جو صرف حیوانی ہوں۔

۹۔ "ابو نعیم نے انس بن مالک سے روایت کی کہ حضرتؐ نے فرمایا: رات کا کھانا مت چھوڑو، اس سے بڑھاپا جلدی آتا ہے۔"

خالی پیٹ ہونے اور بھوک کی حالت میں بلا کھائے سوئے رہنے سے بدن کی موجودہ رطوبتیں تحلیل ہوتی رہتی ہیں اور بحالتِ صحت جب کہ بدن میں فضلی رطوبات زیادہ نہ ہوں، تو خالی پیٹ سو رہنے سے وُہ غذائی رطوبتیں تحلیل ہونے لگتی ہیں، جن کا ذخیرہ بدن میں ہر وقت بقدر مناسب جمع رہنا حفظِ صحت اور بقائے قوت کے لیے ضروری ہے، اگر کچھ دنوں ایسا کیا جاتے تو رفتہ رفتہ بدن دُبلا، بے رونق اور خشک ہونے لگتا ہے، تمام قوتوں میں ضعف آنے لگتا ہے۔ اس لیے رات کو بے کھائے سو رہنا طبی قواعد کے رُو سے بھی ممنوع ہے۔

۱۰۔ "جامع کبیر نے حضرت علیؓ سے روایت کی ہے کہ حضرتؐ نے فرمایا: "کھُنبی آنکھوں کے لیے شفا ہے۔"

کھنبی کی چند قسمیں ہوتی ہیں۔ اُن میں سے اکثر زہریلی ہونے کے باعث استعمال نہیں کی جاتی ہیں۔ لیکن ایک قسم کی کھنبی جو سفید گول چھوٹی ہوتی ہے اور اس میں ایک قسم کی تیز بُو اور چیپ دار رطوبت نہیں ہوتی اور صاف و پاک زمین میں اُگتی ہے، اس میں سمیت نہیں ہوتی اور وُہی استعمال میں آتی ہے۔ اس کا مزاج سرد اور تر تیسرے درجہ میں ہے۔ اس کا تازہ پانی آنکھ میں لگانے سے جرب پلک اور جالا کو نفع ہوتا ہے، بصارت قوی اور تیز ہوتی ہے۔ اگر سُرمہ کو اس کے پانی سے پیسا گیا ہو، تو اس کے لگانے سے نزول الماء کو بہت فائدہ ہوتا ہے۔

۱۱۔ "دو اصحابیوں کو، جن کے شدت سے خارش تھی، ریشمی کُرتے پہننے کی نصیحت کی۔"

ریشمی لباس بدن کو فربہ اور باعتدال گرم کرتا ہے۔ گردہ اور پشت کو قوت دیتا ہے، جرب کے لیے مفید ہے۔ بدن اور لباس میں جُوں کی پیدائش کا مانع ہے۔ لیکن اس سے بدن کی جلد رقیق اور نازک ہو جاتی ہے۔ اس کی اصلاح یہ ہے کہ ریشم اور سوت سے ملا کر بُنا ہُوا کپڑا پہنا جائے، تو اس سے یہ مضرت نہ ہوگی۔

یہی وجہ ہے جو شریعتِ اسلام نے مردوں کو ریشم اور سُوت سے بُنے ہُوئے کپڑے پہننے کی اجازت عطا فرمائی ہے۔ فعل الحکیم لا یخلو عن الحکمۃ۔

اسلامی عہد میں تعلیمِ نسواں

ڈاکٹر احمد شلبی

قرونِ وسطیٰ میں تعلیمِ نسواں سے متعلق جس قدر معلومات حاصل ہوتی ہیں، ان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس زمانے میں عورتوں کو مشرق و مغرب دونوں جگہ مرد کے مقابلے میں تعلیم کے مواقع بہت ہی کم میسر آئے۔ اسلامی دنیا میں تعلیمِ نسواں پر بحث کرنے سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ چند ایسے اقتباسات پیش کریں، جن سے اس عہد کی عیسائی دنیا میں عورت کے ذہنی معیار کا اندازہ ہو جائے۔

قرونِ وسطیٰ کے یورپ میں عورت کی مطلق کوئی وقعت نہ تھی۔ اس کی یہ وجہ ہے کہ رومن کیتھولک مذہب عورت کو دوم درجہ کی مخلوق گردانتا تھا جیسا کہ وتھ نڈسن (WIETH KNUDSEN) لکھتا ہے کہ:

"قرونِ وسطیٰ کے لوگوں نے نہایت ہوشیاری سے کام لیا کہ عورت کو مطلق کوئی اختیار نہیں دیا۔ کسی طاقت ورکا تو سوال ہی نہ تھا۔ اگر کچھ اختیار تھا تو یہ کہ وُہ گھرداری کے تنگ دائرہ میں پھنسی رہے۔"

اسی نقطۂ نظر کو انسائیکلو پیڈیا آف ایجوکیشن میں ذرا تفصیل سے یُوں بیان کیا گیا ہے:

"فرانسسکو ڈا باربرینو (FRANCESCO DA BARBERINO) کے نزدیک امیرزادی کو نوشت و خواند سیکھنے کی محض اس وجہ سے اجازت دی گئی تھی کہ وہ بالغ ہو کر اپنی جائداد کی دیکھ بھال کر سکے۔ جہاں تک دیگر معززین، اطباء، ججوں اور دیگر شرفاء کی لڑکیوں کا سوال ہے وہ کافی بحث و مباحثہ کے بعد یہ طے کرتا ہے کہ بہتر ہے، وُہ لکھنا پڑھنا نہ سیکھیں۔ علاوہ بریں تاجروں اور اہلِ حرفہ کی لڑکیوں کو تعلیم حاصل کرنے کی قطعی ممانعت تھی۔"[1]

جون لینگڈن ڈیوس (JONN LANG DON DAVIS) بھی اپنی کتاب "مختصر تاریخ خواتین" (SHORT HISTORY OF WOMEN) میں طبقۂ امراء کی خواتین کی کچھ ایسی ہی تصویر کھینچتا ہے۔ پہلے وہ یہ سوال کرتا ہے کہ "عہدِ شجاعت کی خاتون اپنی محل سرا سے میں کس قسم کی زندگی گزارتی تھی؟" پہلی چیز تو یہ ہے کہ تعلیم میں اسے کچھ شُد بُد آجاتی تھی۔ غالباً بچپن میں اس کا زیادہ وقت کسی اتالیق کے ساتھ یا کسی ادنیٰ قسم کے مدرسہ میں گزرتا تھا، جہاں اسے صرف لکھنا پڑھنا سکھایا جاتا تھا۔ وہ داستانیں اور عشقیہ افسانے پڑھ سکتی تھی، جو وہ خانہ بدوش میراثیوں سے خرید لیا کرتی تھی۔ اسی واقعہ سے ہم بلا جھجک یہ کہہ سکتے ہیں کہ ادنیٰ طبقہ کی عورت کو ایسی تعلیم بھی میسر نہ تھی۔

انگلستان میں اواخرِ قرونِ وسطیٰ کے متعلق اے ابرام (A. ABRAM) نے یوں لکھا ہے:

"مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کی تعلیم کو کچھ بھی اہمیت حاصل نہ تھی اور معمولی شُد بُد کے علاوہ ان سے کچھ توقع

---

[1] انسائیکلو پیڈیا آف ایجوکیشن جلد ۴ ص ۱۷۹۰

بھی نہ کی جاتی تھی۔"

لاٹور لینڈری کا نائٹ (KNIGHT OF LATOUR LANDRY) جو اس مضمون پر مستند استاد مانا جاتا تھا، صرف یہ چاہتا تھا کہ اس کی لڑکیاں کچھ پڑھنا سیکھ لیں۔ اس کا خیال تھا کہ لڑکیوں کو مدرسہ میں اس لیے داخل کیا جائے کہ وہاں دین کی اچھی اچھی باتیں سیکھ لیں اور اس طرح اپنے فرائض اچھی طرح جان لیں اور بُری باتوں سے بچی رہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بس اس سے زیادہ وہ اس کی ذہنی تربیت کا خواہشمند نہیں۔ لوگ اپنے وصیت ناموں میں لڑکیوں کی تعلیم کے لیے کچھ رقم نہیں چھوڑتے تھے بلکہ بجائے اس کے شادی کے اخراجات کے لیے وصیت کیا کرتے تھے۔ غالباً اکثر والدین اس سے مطمئن تھے، کہ ان کی بیٹی تھوڑی سی ابتدائی تعلیم حاصل کر کے امورِ خانہ داری میں کافی مہارت رکھتی ہو اور اس میں ایک اچھی بیوی بننے کی صلاحیت ہو۔[1]

یہ تھی قرونِ وسطیٰ کی یورپی لڑکی، جس کا خاکہ وہاں کے علماء نے کھینچا ہے۔ اب ہم مسلم خاتون کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ہمیں ان مصنفین سے اتفاق نہیں ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ تعلیم نسواں بھی عام تھی۔ یہ ماننا پڑے گا کہ اکثر خواتین نے تعلیمی سہولتوں سے فائدہ اٹھایا۔ لیکن جہاں تک ہمارا اندازہ ہے، اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ خواتین میں تعلیم عام تھی۔ اس میں شک نہیں کہ مردوں کے مقابلہ میں عورتوں میں بھی پڑھی لکھی عورتیں ان پڑھ عورتوں سے بہت کم تھیں۔ یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اس کا کیا سبب تھا جب کہ اسلام کے مذہبی نقطۂ نگاہ سے تحصیلِ علم میں جنس حائل نہ تھی۔ ہمارے خیال میں اس کا سبب وہ مشکلات تھیں، جن سے عموماً طلباء کو دوچار ہونا پڑتا تھا۔ تحصیلِ علم کے لیے سفر قریب قریب لازمی تھا اور اکثر طویل سفر کرنے پڑتے تھے اور طلباء کو مختلف قسم کے مصائب کا سامنا ہوتا تھا۔ عرب خاتون کو ایسی مشکلات سے واسطہ نہ تھا۔ کیونکہ معاشرہ میں اس کا ایک مقدس مقام تھا۔ ایسا مقام جس کے متعلق ایک عرب شاعر لکھتا ہے؛

"یہ فرض تو ہمارا ہے کہ ہم لڑیں اور مرتے دم تک اپنی قوم کی حفاظت کریں اور صنفِ نازک کو یہ حق نہیں کہ ان کے پرے کے پرے شان و شوکت اور تکلف کے ساتھ خراماں خراماں اِدھر اُدھر گشت کرتے پھریں۔"

یہی وجہ تھی کہ مسلمان مردوں کے مقابلہ میں خواتین تعلیم میں پسماندہ تھیں۔ لیکن ان میں سے ایک کثیر تعداد کو مواقع حاصل ہوئے اور انہوں نے اس عہد کی ثقافت کے ہر شعبہ میں نمایاں حصہ لیا۔

اسلام کے قرونِ اوّل سے شروع کریں، تو ہمیں البلاذری کا یہ بیان ملتا ہے کہ ابتدائی دورِ اسلام میں پانچ عرب خواتین ایسی تھیں، جو لکھنا پڑھنا جانتی تھیں۔ ان کے نام یہ ہیں؛

حفصہ بنت عمرؓ، ام کلثوم بنت عقبہ، عائشہ بنت سعد، کریمہ بنت مقداد اور سب سے بڑھ کر الشفاء بنت عبداللہ عدویہ جنہوں نے حضرت حفصہؓ کو بھی پڑھایا تھا اور آنحضرت صلعم نے ان سے کہا تھا کہ وہ آنحضرتؐ سے شادی کے بعد بھی حفصہؓ کو پڑھاتی رہیں۔ ازواج مطہرات میں سے حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلمیٰؓ پڑھ سکتی تھیں لیکن انھیں لکھنا نہیں آتا تھا۔[2]

الشفاء کا حضرت حفصہؓ کو پڑھانا لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ایک مثال قائم ہو گیا۔ ہمیں کوئی مثال ایسی نہیں ملی کہ جس سے یہ ظاہر ہو

---

[1] ENGLISH LIFE AND MANNERS IN THE MIDDLE AGES [2] فتوح البلدان (بلاذری) ص ۴۵۸

کہ لڑکیاں مکاتب میں پڑھتی تھیں یا لڑکے لڑکیاں ساتھ ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ خواتین کی ایک جماعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور درخواست کی کہ ہفتہ میں کم سے کم ایک دن آنحضرت صلعم ان کی تعلیم وتربیت کے لیے بھی مقرر فرمائیں۔ چنانچہ آنحضرت صلعم باقاعدہ خواتین کو جمع کرکے ان کو تعلیم دیتے اور پند ونصائح فرمایا کرتے تھے۔ بعض مصنفین نے اس معاملہ میں غلطی کی ہے۔ خلیل طوطح نے اپنی تصنیف "التربیت والتعلیم عند العرب" کے صفحہ ۶۹ پر بحوالہ الاغانی تین اقتباسات دیے ہیں، جن سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ مکتب میں پڑھتی تھیں۔ لیکن یہ اقتباسات اصل ماخذ میں اس طرح نہیں پائے جاتے۔ الاہوانی اس نکتہ پر متضاد بیانات دیتا ہے۔ پہلے تو وہ یہ لکھتا ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم مکاتب میں ہوتی تھی[1] اور پھر لکھتا ہے کہ گھر پر تعلیم دینے کا دستور تھا[2]۔

ہم اس بات پر متفق ہیں کہ قرونِ وسطیٰ میں مسلم لڑکی کو گھر پر ہی تعلیم دی جاتی تھی۔ یہی خیال ابن سحنون کی تصنیف آداب المعلمین کے دیباچہ میں ظاہر کیا گیا ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:

> "اکثر وبیشتر باپ اپنی بیٹی کو پڑھایا کرتا تھا۔ جیسا کہ عیسٰی بن مسکین (متوفی ۲۹۵ھ) نے کیا، جو ظہر کے وقت تک اپنے شاگردوں کو درس دیا کرتے تھے اور اس کے بعد اپنی بیٹیوں اور بھتیجیوں اور پوتیوں اور نواسیوں کو قرآن مجید اور دیگر علوم کی تعلیم دیا کرتے تھے"[3]

شہرہ آفاق شاعر الاعشا اپنی بیٹی کو پڑھایا کرتا تھا۔ وہ ایسی تربیت یافتہ اور مہذب خاتون ہوئی اور اس نے ایسا ذوقِ سلیم پایا تھا کہ باپ اپنی تازہ نظموں پر اس کی تنقید وتبصرہ پر اعتماد کیا کرتا تھا[4]۔

بعض حالات میں امراء اور خاندانِ شاہی کی لڑکیوں کے لیے اتالیق مقرر کیے جاتے تھے[5]۔ گھر کی چار دیواری میں تعلیم حاصل کر کے بہت سی عورتوں نے اعلیٰ قابلیت حاصل کی، خصوصاً فلسفہ، تعازن میں بہت نام پیدا کیا۔

ام المومنین حضرت عائشہؓ انصار خواتین کی تعریف کیا کرتی تھیں کہ وہ اس مضمون پر عبور حاصل کرنے میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتیں[6]۔ مسلم خواتین نے نہ صرف اسلامی علوم حاصل کیے، بلکہ اسلامی کردار اور شرافت میں بھی نام پیدا کیا۔ اس ضمن میں ہم ایک قصہ بیان کیے بغیر نہیں رہ سکتے، جس سے ایک مسلم خاتون کا اعلیٰ کردار ظاہر ہوتا ہے۔

۷۳ھ میں الحجاج کی افواج نے حضرت عبداللہ بن زبیر کو شکست دی اور ان کے اکثر ساتھیوں نے جن میں بہت سے قبائلی سردار تھے، ہتھیار ڈال دیے۔ مایوسی کی حالت میں حضرت عبداللہ بن زبیر اپنی والدہ حضرت اسماء بنت ابوبکرؓ کے پاس گئے اور اس وقت ان دونوں کے درمیان جو گفتگو ہوئی، وہ یہ ہے:

ابن زبیر: اماں! میرے ساتھیوں نے میرے ساتھ دغا کی۔ اب صرف چند آدمی میرے ساتھ ہیں۔ وہ بھی کسی نہ کسی وقت اپنی امداد سے دست کش ہو جائیں گے۔ اگر میں شکست مان لوں، تو دشمن میری شرائط ماننے کے لیے تیار ہے۔ براہِ کرم مجھے مشورہ دیجئے۔

---

[1] التعلیم عند القابسی ص ۸۰ [2] ایضاً ص ۳ [3] ایضاً ص ۱۹ [4] ایضاً ص ۲۲ [5] الاغانی ص ۱۰۶ [6] آداب المعلمین ص ۲۲ [7] البخاری ص ۲۶

اسماء : بیٹے ! مجھ سے زیادہ تمھیں اپنے حالات کی خبر ہے۔ اگر تمھیں یقین ہے کہ تم حق پر ہو اور تم نے بدعت کے خلاف جہاد کیا ہے، تو پھر جب تک جان میں جان ہے، اسے جاری رکھو اور بنی امیہ کی اطاعت قبول نہ کرو۔ اگر تمھیں دنیا کی خواہش ہے، تو پھر تم سے بد تر کوئی غلام نہیں، کہ تم خود کو اور اپنے ساتھیوں کو ایک معمولی چیز کے لیے تباہ کر رہے ہو۔ ساتھیوں کی کمزوری کے باعث ہتھیار نہ ڈالو۔ کیونکہ یہ نیکوں کا شیوہ نہیں ہے۔ یاد رکھو کہ جس مقصد کے لیے تمہارے دوستوں نے جان دی ہے، تم اسی مقصد کے لیے جہاد جاری رکھو جب تک کہ فتح یا شہادت نصیب نہ ہو۔

عبداللہ : اماں ! مجھے ڈر ہے کہ شامی مجھے پھانسی پر لٹکا دیں گے۔ میری لاش گھسیٹیں گے اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے۔

اسماء : بیٹے ! بھیڑ جب ذبح ہو جاتی ہے، تو کھال کھینچنے سے نہیں ڈرتی [1]

رفتہ رفتہ جوں جوں تہذیب و ثقافت پھیلتی گئی، مسلم خواتین ہر قسم کی ثقافتی سرگرمیوں میں حصہ لیتی رہیں۔ اب ہم ان سطور میں مختصر طور پر یہ دکھائیں گے کہ مختلف خواتین نے مختلف مضامین میں کیسے کیسے کارنامے انجام دیے۔

دینیات

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواتین کے دل پسند مضامین حدیث و فقہ تھے۔ ہمیں کثیر تعداد در مختلف زمانوں میں ایسی خواتین ملتی ہیں، جنھوں نے محدثین اور فقہاء میں ناموری حاصل کی۔

ابن حجر نے اپنی تصنیف "الاصابہ فی تمییز الصحابہ" میں اسلام کے قرون اولیٰ کی پندرہ سو تینتالیس محدث خواتین کے سوانح حیات جمع کیے ہیں۔ النووی نے اپنی کتاب "تہذیب الاسماء" میں الخطیب البغدادی نے تاریخ بغداد میں اور السخاوی نے الضوء اللامع میں بہت سا حصہ ان خواتین کے حالات کے لیے وقف کیا ہے۔ جنھوں نے علم و فضل میں کمال حاصل کیا۔

ہم یہاں صرف چند ایسی خواتین کا حال درج کرتے ہیں جنھوں نے دینیات میں کمال حاصل کیا۔

سب سے زیادہ افضلیت ام المومنین حضرت عائشہؓ کو حاصل ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا تھا کہ اپنی نصف دینی تعلیم کے لیے انھیں عائشہؓ پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ ان سے ایک ہزار احادیث مروی ہیں، جن کو انھوں نے براہِ راست آنحضرتؐ سے سنا ہے [2]

حضرت علیؓ کی اولاد میں نفیسہ ایسی مستند محدثہ تھیں کہ فسطاط میں امام شافعی ان کے حلقۂ درس میں شریک ہوا کرتے تھے حالانکہ اس وقت انھیں بھی شہرت اور عروج حاصل تھا [3]

فاطمہ بنت الاقرع ایک مشہور زمانہ عالم و فاضل تھیں اور نہایت اعلیٰ درجہ کی خوشنویس۔ انھوں نے کثرت سے قابل اساتذہ کے حلقۂ درس میں شرکت کی تھی اور اپنے بے شمار شاگردوں کے علم سے بھی استفادہ کیا تھا [4]

شیخا شہداء ملقب بہ فخر النساء، جامع مسجد بغداد میں ایک مجمع کے سامنے ادب، خطابت اور شاعری پر لکچر دیا کرتی تھیں۔

---

[1] تہذیب تاریخ دمشق ص ۴۱۵، ۴۱۶، ابن کثیر ص ۱۴۷

[2] تہذیب الاسماء ص ۸۴۸

[3] ابن خلکان ص ۲۵۱

[4] الکامل ص ۱۰۸

وقائع اسلام میں ممتاز علماء کے ساتھ اس خاتون کا بھی نام لیا جاتا ہے۔

ایک ممتاز خاتون زینب بنت الشعری نے اپنے زمانے کے نامور علماء دین سے تعلیم حاصل کر کے سندات حاصل کی تھیں۔ ابن خلکان کا بیان ہے کہ جب وہ دو سال کا تھا، تو ان خاتون نے اسے بھی ایک سند دی تھی۔ اس زمانے میں یہ دستور تھا کہ بچوں کی ہمت افزائی اور ان کی سعادت مندی کے لیے اس قسم کی سندیں عطا کی جاتی تھیں، "تاکہ بچہ اپنی ذاتی محنت و قابلیت سے ایسی سندات حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

سب سے آخر میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ تقریباً پانسو طلبا، ابو الخیر الاقطع کی وادی عینده کے حلقۂ درس میں شریک ہُوا کرتے تھے[1]

ان عالم و فاضل خواتین کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے، جن کی تعلیم و تربیت کے ممنونِ احسان بے شمار مرد علماء ہیں۔

مشہورِ زمانہ الخطیب البغدادی کریمہ بنت احمد المروزی کے شاگرد تھے، موصوف نے انھیں صحیح بخاری کا درس دیا تھا[2]

علی بن عساکر کے اساتذہ میں اسی سے زیادہ خواتین تھیں[3]

غرناطہ کے ابوحیان اپنے اساتذہ میں تین خواتین کا نام بھی لیتے ہیں، یعنی مینسہ بنت الملک الکامل، شامیہ بنت الحافظ اور زینب بنت عبد اللطیف البغدادی[4]

دو ممتاز خواتین عائشہؓ بنت محمد اور زینب بنت کمال الدین نے مشہور زمانہ سیاح ابن بطوطہ کو سندات عطا کی تھیں۔

ادب

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اکثر خواتین نے شاعری اور خطابت میں نام پیدا کیا۔ اکثر حالات میں وُہ اپنے ہم عصر مردوں کے برابر اور بعض حالات میں ان سے بڑھ کر ثابت ہُوئیں۔ یہاں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں؛

النضر ابن الحارث ہجرت سے قبل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر حملے کیا کرتا تھا اور حضورؐ کو تنگ کیا کرتا تھا۔ جب غزوۂ بدر میں وُہ گرفتار ہُوا، تو اسے قتل کر دیا گیا۔ اس کی بہن قتیلہ نے ایک دردناک مرثیہ لکھا، جسے سُن کر آنحضرتؐ نے فرمایا کہ مرثیہ ایسا ہے کہ اگر اس کی زندگی میں سُنا جاتا تو ممکن تھا کہ مجرم کی معافی کا باعث ہوتا[5]

الفرزدق کی بیوی کو ادب میں اس قدر درک حاصل تھا کہ خود اس کا شوہر اور شاعری میں اس کا حریف جریر دونوں فیصلہ کے لیے اس کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ اس کا فیصلہ یہ تھا کہ اعلیٰ درجہ کی نظموں میں دونوں کا پلّہ برابر ہے۔ لیکن ادنیٰ درجہ کی نظموں میں جریر کا کلام فرزدق سے بہتر ہے[6]

صفیہ جو اشبیلیہ (SEVILLE) کی رہنے والی تھی، خطابت اور شاعری کی صلاحیتوں میں ممتاز تھی، لیکن علاوہ ازیں وُہ خوشنویسی میں سب سے سبقت لے گئی تھی۔ اس کی تحریر کی ہر شخص مدح و ثنا کرتا تھا اور وہ ماہر محررین کے لیے ایک نمونہ تھی[7]

---

[1] کتاب الشکوا ص ۵۰ ایشیاٹک ۱۹۳۰ء [2] معجم الادبا ص ۲۴۷ [3] ایضاً ص ۲۴۰ [4] النعیمی ص ۱۰۱
[5] تحفۃ النظار ص ۲۲۲ [6] البیان والتبیین ص ۹۳ [7] A SHORKHIF OF SORACCU P.569

زینب اور حمیدہ بنات زیاد نہایت اعلیٰ درجہ کی شاعرہ تھیں۔ علم و فن کے ہر شعبہ میں انھیں کمال حاصل تھا اور دونوں حسین و جمیل بھی تھیں، دولت مند تھیں، دلنواز تھیں اور منکسر المزاج۔ علم کی محبت انھیں علماء و فضلاء کی جماعت میں لے آئی تھی، جن سے وُہ نہایت شان و شوکت اور اطمینان سے مساویہ ملتی جلتی تھیں۔ لیکن خواتین کے سے طور طریقوں کا لحاظ رکھتی تھیں۔[۱]

مریم بنت ابی یعقوب انصاری نہایت ممتاز شاعرہ اور ادب کی استاد تھیں۔ ان کا حلقۂ درس عورتوں کے لیے تھا، جو ان کے علم سے استفادہ کرنے آیا کرتی تھیں۔[۲]

ہدانیہ نے اپنے استاد ابوالمطرب عبدالنان سے پڑھا تھا، لیکن وُہ استاد سے بڑھ گئی۔ اس نے المبرد کی تصنیف 'الکامل' پر اور القالی کی 'النوادر' پر عبور حاصل کر لیا تھا اور علم عروض میں مسلّمہ استاد تھی۔[۳]

حفصہ الرکونیہ ساکن غرناطہ اپنی شرافت، اپنے حسن اور دولت و قابلیت کے باعث مشہور رہتی تھی۔ اس کی شاعری میں محبت کے جذبات بھرے ہُوئے تھے، جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے، جو یاقوت اور ابن الخطیب نے نقل کیے ہیں۔ وہ خلیفہ کے محل میں خواتین کی استاد و اتالیق تھی۔[۴]

ایک بیش قیمت مخطوطہ موسومہ نزہت الجلساء فی الاخبار النساء مصنفہ السیوطی دمشق کے کتب خانہ الظاہریہ میں ہے۔ اس میں ستائیس خواتین شعراء کے سوانح حیات درج ہیں، جن میں سے ہم صرف ایک مثال پیش کرتے ہیں۔

تقیہ ام علی بنت ابی الفرج (متوفی ۵۷۰ھ) نہایت قابل خاتون تھیں۔ ایک مرتبہ انھوں نے صلاح الدین کے بھتیجے تقی الدین عمر کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا، جو ساقی نامہ کے طرز پر لکھا گیا تھا۔ اس میں شاعرہ نے نہایت خوبی سے ایک محفل مے نوشی کا بے کم و کاست نقشہ کھینچا تھا ساغر و مینا اور دیگر کوائف اس طرح بیان کیے گئے تھے کہ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ شاعر خود ایک عادی مے خوار ہے۔ قصیدہ پڑھ کر تقی الدین نے بالاعلان کہا کہ شاعر کو ضرور محفل مے نوشی کا ذاتی تجربہ ہے۔ اس خاتون نے ایک رزمیہ قصیدہ لکھ ڈالا، جس میں اس نے جنگ کی کل جزئیات نہایت تفصیل سے بیان کی تھیں اور میدانِ جنگ و جنگجو بہادروں کا نقشہ کھینچا تھا۔ جب اس نے یہ رزمیہ نظم تقی الدین کو بھیجی، تو ایک خط میں لکھا کہ مجھے جتنا تجربہ بزم کا ہے، اتنا ہی رزم کا ہے۔ اس نظم کو پڑھ کر تقی الدین نے اس کے اعلیٰ تخیل کا لوہا مان لیا اور اس کی بے حد تعریف کی۔

موسیقی و نغمہ ایچ۔ جی فارمر کا قول ہے کہ:

"مہد سے لحد تک اور لوری سے لے کر مرثیہ تک عرب اور موسیقی لازم و ملزوم ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی زندگی کے ہر لمحہ کے لیے ایک خاص موسیقی ہے۔ خوشی و غم میں، کام کاج میں، کھیل کود میں، میدانِ جنگ اور مراسم مذہبی میں قرونِ وسطیٰ کے ہر عرب گھرانے میں ایک مغنیہ کا ہونا ایسا ہی لازمی تھا، جیسا آج کل ہر گھر میں پیانو۔"[۵]

---

[۱] نفح الطیب ص ۱۴۲ [۲] ایضاً ص ۱۴۳-۱۱ [۳] ایضاً ص ۱۷۸: ۱۰ [۴] ارشاد (یاقوت) ص ۱۱۹
[۵] LEGACY OF ISLAM (ARNOLD) P. 358.

اس بیان سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس دور میں اربابِ نشاط کی کتنی تعداد ہوگی ہم قارئین کی توجہ مشہور زمانہ کتاب الاغانی کی طرف مبذول کراتے ہیں جس میں ایسی متعدد لڑکیوں کا حال درج ہے۔ یہاں ہم اس کتاب سے اور نہایت الارب اور نفح الطیب سے صرف چند گانے والی لڑکیوں کے مختصر حالات درج کرتے ہیں۔

مسلمان مغنیوں کے اوّلین دور میں جمیلہ کا نام ملتا ہے۔ اس سے معبد ابن عائشہ، حبابہ، سلامہ، عقیلہ خالدہ اور ربیعہ نے گانا سیکھا۔ نامور مغنی معبد کو اس بات کا اقرار ہے کہ وہ خود اور اس کے ساتھی جمیلہ ہی کے علم و فن کے پھل ہیں اور بغیر اس کی تعلیم کے وہ ہرگز شہرت حاصل نہ کر سکتے تھے۔ اس دور میں جب ابن سریج، الغریض، معبد اور دیگر موسیقاروں میں مقابلہ ہوتا تو جمیلہ ہی جج مقرر ہوا کرتی تھی[1]

دنانیر جو خاندان برامکہ سے متعلق تھی، نہایت نامور مغنیہ تھی۔ علاوہ اس کے کہ اس نے گانے میں شہرت حاصل کر لی تھی، وُہ اپنے حسن وجمال، بذلہ سنجی اور ادبی وانشیت کے باعث بھی مشہور زمانہ تھی۔ اصفہانی کا بیان ہے کہ اس نے فنِ موسیقی پر ایک کتاب بھی لکھی تھی[2]

خلیفہ مہدی کی بیٹی علیہ ایک مشاق شاعرہ، ایک ممتاز مغنیہ اور ایک نامور موسیقار تھی۔ وہ اور اس کا بھائی ابراہیم دونوں اس فن میں لاثانی تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بھائی پر سبقت لے گئی تھی۔ نامور مغنیہ عریب اس دن کو اپنی زندگی کا بہترین دن بتاتی ہے، جس روز اس نے علیہ کا گانا سنا اور اس کے ساتھ اس کے بھائی نے نوازی کی[3]

متیم ہاشمیہ، جو اسحاق اور اس کے باپ کی شاگرد تھی، اپنے حسن وجمال، نغمہ سرائی اور ادبی قابلیت میں مشہور تھی۔ ایک مرتبہ وُہ خلیفہ المعتصم کے سامنے گا رہی تھی اور ابراہیم بن مہدی بھی موجود تھا۔ جب وہ گیت ختم کر چکی تو ابراہیم نے اس کو دوبارہ گانے کی فرمائش کی۔ لیکن اس نے اپنے آقا سے کہا کہ ابراہیم اس طرح سُر سیکھ لے گا۔ اس لیے اس نے اپنے آقا سے اجازت حاصل کی کہ وہ گیت دوبارہ نہ گایا جائے۔ کچھ دن بعد یہ ہُوا کہ ابراہیم اپنے گھر کو جا رہا تھا۔ متیم وہی گیت اپنے گھر میں گا رہی تھی۔ ابراہیم چپکے سے وہاں کھڑا ہو گیا اور اس نے تمام کا تمام نغمہ یاد کر لیا۔ بعد ازاں دروازہ پر دستک دی اور اکڑ کر کہا کہ میں نے اپنا مقصد حاصل کر لیا ہے[4]

خدیجہ بنت المامون نہایت اعلیٰ درجہ کی شاعرہ اور مغنیہ تھی، ایک روز بوقتِ شب شاریہ نے نہایت عمدہ گیت خلیفہ المتوکل کے سامنے گایا۔ خلیفہ نہایت خوش ہُوا اور اس نے دریافت کیا کہ یہ پیارا گیت تو نے کہاں سے سیکھا؟ اس نے جواب دیا کہ گیت اور لے دونوں خدیجہ بنت المامون کی تخلیق ہیں[5]

خلیفہ عبدالرحمٰن ثانی کے محل کا ایک حصہ دار المدنیات کہلاتا تھا۔ جہاں مدینہ کے تین گویے قلم، علم اور فضل رہا کرتے تھے۔ ان میں سے فضل اپنے فن میں سب سے ممتاز تھا[6]

عُلیدہ الطنبوریہ بکمال حُسنِ صورت وسیرت اور طباعی کی مالک خاتون تھی۔ وُہ نہایت نفاست سے طنبورہ بجایا کرتی تھی اور اسی وجہ سے

---

[1] الاغانی ص ۱۲۴، نہایت الارب، ص ۹۴
[2] الاغانی ص ۳۶
[3] الاغانی ص ۸۲-۹۵، نہایت الارب ص ۲۳۱
[4] الاغانی ص ۳۱-۳۸
[5] الاغانی ص ۱۱۴
[6] نفح الطیب ص ۸۰۸ (المقری)

بر اس کا لقب پڑ گیا تھا، علاوہ ازیں اس کے گلے میں بڑا لوچ تھا۔[۱]

طب

خدمتِ خلق کے وہ فرائض، جو اس تہذیب یافتہ دور میں صلیبِ احمر کے ادارے سرانجام دیتے ہیں، اکثر اسلامی لڑائیوں میں خواتین اسلام انجام دیا کرتی تھیں۔ جب فتح خیبر کے لیے اسلامی افواج تیاری کر رہی تھیں، اُمیہ بنت قیس الغفاریہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مع ایک جماعتِ خواتین حاضر ہوئیں اور افواج کے ساتھ چلنے کی اجازت چاہی تاکہ زخمیوں کی مرہم پٹی کریں اور دیگر ممکن خدمات انجام دیں۔ آنحضرتؐ نے اجازت دے دی اور انھوں نے یہ فرائض انجام دیے۔[۲]

الربیع بنت معوذہ کے متعلق روایت کی ہے کہ انھوں نے بیان کیا کہ اسلامی افواج کے ساتھ خواتین بھی رہا کرتی تھیں، تاکہ زخمیوں کی دیکھ بھال کریں اور پانی پلائیں اور زخمیوں کو واپس مدینہ پہنچائیں۔[۳]

علاوہ ازیں ایسی خواتین کے حالات بھی ملتے ہیں، جنھوں نے علماے طب کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔

قبیلہ بنی اَود میں زینب بہت مشہور طبیبہ اور ماہرِ امراضِ چشم تھی۔

ام الحسن بنت القاضی ابی جعفر الطنجالی مختلف مضامین میں بہت وسیع علم کی مالک تھی، لیکن وہ بحیثیت طبیب بہت مشہور تھی۔[۴]

الحفیظ بن زہر کی بہن اور اس کی بیٹی، جو المنصور بن ابی عامر کے زمانے میں مشہور تھیں۔ بہت اچھی طبیب تھیں اور امراض نسوانی میں ماہرِ خصوصی تھیں اور محل شاہی کی خواتین کے علاج معالجہ کے لیے ان ہی کو بلایا جاتا تھا۔[۵]

فوجی خدمت

اسلام نے بہت سی ایسی خواتین پیدا کی ہیں، جنھوں نے عسکریت میں نام پیدا کیا ہے۔ تاریخ میں ہمیں نصیبہ زوجہ زید ابن عاصم کا حال ملتا ہے، جس نے غزوۂ اُحد میں حصہ لیا تھا۔ جب غنیم نے ایک ساتھ ہلّہ بولا، تو اس نے اس حملے کو روکا اور اپنی تلوار سے گیارہ اشخاص کو زخمی کیا۔[۶]

تاریخ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلم خواتین نے بیشتر جنگوں میں بھی عملی حصہ لیا تھا۔ چنانچہ جنگ یرموک میں مسلم خواتین بڑی بے جگری سے لڑیں۔ ہند بنت عتبہ بار بار دیگر خواتین کو تلقین کرتی تھی کہ اپنی تلواروں سے مردوں کی مدد کریں۔[۷]

اسی جنگ میں جب گھمسان کا رن پڑا تو جویریہ بنت ابی سفیان اپنے شوہر کے ساتھ شانہ بہ شانہ لڑتی ہوئی نظر آئی۔[۸]

جنگ صفین میں ایک "سُرخ اُونٹ" بہت نمایاں تھا۔ اس پہ الزرقا بنت عدی سوار تھی۔ اس کی مستعدی اور جوشیلی تقریر پر دانِ علیؓ کی ہمت افزائی اور جنگ کے نتائج پر بہت اثر انداز ہوئی۔[۹] ایک دُوسری خاتون عسکری شاہ بنت الاطرش نے بھی اس جنگ میں حصہ لیا۔ میدان جنگ میں سامانِ حرب اٹھاتے ہُوئے اس کو نہایت جوش و خروش سے جاتے ہُوئے دیکھا گیا۔[۱۰]

۱؎ Short History of the Saracens ۲؎ المرأة العربیہ (عبداللہ عفیفی) ص ۴۴ ۳؎ الاصابہ (ابن حجر) ص ۵۷۵

۴؎ ایضاً ص ۵۷۵ ۵؎ طبقات الاطبا (ابن ابی اصیبعہ) ص ... ۶؎ The Arab Woman.

۷؎ فتوح البلدان (بلاذری) ص ۱۴۱ ۸؎ الطبری ص ۲۱۰۰ - ۲۱۰۱ ۹؎ العقد الفرید (ابن عبد ربہ) ص ۲۱۴

۱۰؎ العقد الفرید (ابن عبد ربہ) ص ۲۱۵

عہدِ منصور میں ہمیں دو شہزادیوں کے حالات ملتے ہیں، جن کے نام اُمِ عیسیٰ اور لبابہ تھے۔ یہ دونوں لباسِ حرب میں ملبوس اسلامی افواج کے ساتھ بازنطینی علاقہ کی طرف مارچ کر رہی تھیں[1]

دیگر سرگرمیاں ملکہ زبیدہ نہایت مہذب اور شائستہ خاتون تھی۔ لیکن یہاں ہم اس کا تذکرہ بطور ایک مصلح معاشرت کریں گے۔ جب اس نے ۱۸۶ھ میں حج کا فریضہ ادا کیا، تو اسے معلوم ہوا کہ مکہ والوں کو پانی کی قلت کے باعث سخت تکالیف ہیں۔ لہٰذا اس نے اپنے صرفِ خاص سے ایک نہر کھدوائی، جو آج بھی موجود ہے۔ جب اس نے دیکھا کہ اخراجات کثیر کے باعث خزانچی کو کچھ ہچکچاہٹ ہے تو حکم دیا کہ کام فوراً شروع کر دیا جائے خواہ کدال کی ایک ضرب پر ایک دینار صرف ہو۔ غرض اخراجات ساڑھے دس لاکھ دینار سے زاید ہوئے جو سب کے سب ملکہ نے اپنے صرفِ خاص سے ادا کیے[2]

ایک اور خاتون لبانہ نامی ساکن قرطبہ کے متعلق لکھا ہے کہ وُہ خلیفہ الحکم کی معتمد ذاتی تھی اور یہ عہدہ اس وقت تک کسی عورت کو نہ ملا تھا[3]

ہم اس مضمون کو ایک مشہور قصہ پر ختم کرتے ہیں کہ:

ایک کنیز ہارون الرشید کی خدمت میں پیش کی گئی، جس کی قیمت دس ہزار دینار تھی۔ خلیفہ نے شرط منظور کر لی مگر اس شرط پر کہ کنیز کا امتحان لیا جائے۔ چنانچہ نہایت مشہور علمائے دینیات، فقہ، تفسیر، طب، فلکیات، فلسفہ، خطابت اور شطرنج نے یکے بعد دیگرے اس کا امتحان لیا اور ہر مرتبہ اس نے نہ صرف یہ کہ ہر سوال کا جواب اطمینان بخش دیا، بلکہ ان میں سے ہر ایک عالم سے اس نے خود ایک سوال کیا، جس کا وُہ جواب نہ دے سکے۔

---

[1] الکامل (ابن الاثیر) ص ۳۰۲ [2] حضارت الاسلام فی دار السلام (جمیل نخلہ) ص ۹۰

[3] اسلامک سولزیشن (خدا بخش) ص ۲۹۵

عہدِ نبوی ؐ کا نظامِ تعلیم

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

عرب اور خاص کر مکہ معظمہ کی معاشرتی حالت کا جو قبل اسلام پائی جاتی تھی، اگر قریب سے مطالعہ کیا جائے، تو ناگزیر اس نتیجہ پر پہنچنا پڑتا ہے کہ اس زمانہ کے عربوں میں غیر معمولی صلاحیتیں پائی جاتی تھیں۔ جب اسلامی تعلیمات نے ان صلاحیتوں کو صیقل کیا، تو عربوں نے اپنی اپج اور کارکردگی کی قابلیت سے دنیا کو حیران کر دیا اور جب "وحدت اور حرکت کے مذہب" یعنی اسلام نے ان کی توانائیوں کو ایک مرکز پر جمع کیا اور ان میں مزید قوت پیدا کر دی تو یہی عرب اس قابل ہو گئے کہ پوری دنیا کو دعوت مبارزت دیں اور وقت واحد میں اس وقت کی دونوں عالمگیر شہنشاہیتوں یعنی ایران اور روم (بیزنطینہ) سے جنگ کریں۔

میں نے اپنے مقالوں میں کسی قدر تفصیل سے بتایا ہے کہ زمانہ جاہلیت کی عربی خانہ جنگیاں عربوں کے کردار کو بنانے اور ان میں حیرت انگیز قوت برداشت اور دیگر اعلیٰ مہمات پسند قابلیتیں پیدا کرنے میں ممد و معاون رہیں۔ جن پر خود نپولین[1] کو رشک تھا۔ عرب میں معینہ اوقات پر لگنے والے بازاروں اور کاروانوں کی حفاظت کے لیے بدرقوں یا خفاروں کا انتظام کچھ اتنا مکمل اور وسیع ہو گیا تھا کہ اس نے پورے جزیرہ نمائے عرب میں ایک معاشی "وفاق" قائم کر دیا تھا جس سے عربوں میں وحدت کے خیالات پیدا ہونے لگ گئے تھے اور اسلام کے تحت ان کی "سیاسی وحدت" کا راستہ صاف ہو گیا تھا۔ اسی طرح شہری مملکت مکہ کا دستور بھی خاصہ ترقی یافتہ تھا جس سے وہاں کے باشندوں کو اس بات کی تربیت مل چکی تھی کہ ایک عالمگیر شہنشاہیت کے نظم و نسق کو چلا سکیں۔[2]

آج میرے پیش نظر ایک اور مسئلہ ہے اور وہ یہ کہ زمانہ جاہلیت سے عربوں کی علمی صلاحیتیں بھی اتنی خاصی تھیں کہ ہجرت کی ابتدائی صدیوں میں عربوں نے علوم و فنون کی حیرت انگیز فصلیں کاٹیں۔ انہی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا، ان کی خفیہ قابلیتوں کو بیدار کرنا اور ان کو مفید اغراض میں کام میں لانا، یہ البتہ اسلام کا کارنامہ ہے۔

عہدِ نبوی کے نظامِ تعلیم کا اس سے بہتر پس منظر کیا ہو گا کہ اسلام سے پہلے عرب میں علمی حالت جیسی کچھ تھی، اس کا خاکہ پیش کیا جائے۔

عرب میں زمانۂ جاہلیت میں تعلیم

بدقسمتی سے ہمارے پاس زمانۂ جاہلیت کے تعلیمی معاملات کے متعلق بہت کم معلومات محفوظ ہیں۔ اس کی کچھ تو یہ وجہ ہے کہ اس زمانے میں وہاں لکھنے کا زیادہ رواج نہ تھا اور کچھ یہ کہ لاکھوں کروڑوں کتابیں ہلاکو خان وغیرہ نے بغداد، قرطبہ اور دیگر مقامات پر ایسے زمانے میں تباہ کر دیں، جب کہ ابھی فن طباعت سے کتابیں چھاپنے کا کام نہیں لیا جانے لگا تھا۔ اس دشواری کے باوجود جو کچھ تھوڑا بہت مواد ہم تک پہنچ چکا ہے۔

---

[1] سینٹ ہیلینا کی یادداشتیں (فرانسیسی) جلد ۳ صـ ۱۸۳

[2] "شہری" مملکت مکہ جو رسالہ اسلامک کلچر جلد ۱۲ شمارہ ۳ میں شائع ہوا۔ ملاحظہ ہو۔

اس کی مدد سے زمانہ جاہلیت کی تعلیمی حالت کا پتا چلتا ہے جس سے ہمیں حیرت ہوتی ہے اور اس قوم کے متعلق رشک ہونے لگتا ہے، جو اَن پڑھ ہونے پر اتراتی تھی[1]

اولاً ان کی زبان کو لیجیے۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کوئی زبان اپنے لغات، محاورات اور ادبی کمالات میں اس زمانے میں ترقی کرتی ہے جب اس کے بولنے والوں کا تمدن عروج پہ ہو اور اس سے پہلے اس زبان کی حالت اتنی پست ہوتی ہے کہ اس کو جانوروں کی آواز سے کچھ ہی بلند قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس وقت اس زبان میں نہ تو اونچے خیالات ادا کیے جا سکتے ہیں اور نہ معمولی روزمرہ کی ضرورتوں کے سوا اس میں کوئی علوم وفنون ملتے ہیں۔ اگر اس معیار پر اسلام سے عین پہلے کی عربی زبان کو جانچا جائے۔ تو ہم زبان کی نزاکت، لغات کی کثرت، قواعدِ صرف ونحو کے استحکام اور خاصے بلند معیار کے نظم کے ذخیرہ کے باعث حیرت زدہ ہو جاتے ہیں۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مستند عربی زبان زمانۂ جاہلیت کی سمجھی جاتی ہے، اسلامی تمدن کے عہد زرّیں کی زبان کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہے۔ اگر ہم زمانۂ حال کی کوئی زبان مثلاً جرمن، روسی، فرانسیسی یا انگریزی کو لیں، تو ان کے دو مولف جن میں مثلاً ڈیڑھ ہزار سال کا زمانہ حائل ہو، تو ایک ہی زبان کے یہ مولف ایک دوسرے کو بالکل نہیں سمجھ سکیں گے۔ اس کے برخلاف امراءالقیس کی زبان اور قواعد صرف ونحو بالکل وہی ہیں، جو مثلاً زمانہ حال کے مصری شعراء شوقی اور حافظ کے ہیں۔ قرآن اور حدیث اس "جاہلی زبان" میں ہیں، جس پر عربی شہنشاہیت کے تمدن نے کوئی اثر قائم کرنے کا موقع نہیں پایا تھا۔ قرآن اور حدیث زمانہ جاہلیت کے بدویوں کو بھی اسی سہولت سے سمجھ میں آتے تھے، جتنا آج کسی جدید عربی کے متعلم کو۔ اس زمانے میں عربی زبان، لغات کی حد تک، اتنی وسیع اور متمول ہو گئی تھی کہ اس کا مقابلہ زمانہ حال کی انتہائی ترقی یافتہ مغربی زبانوں سے بھی بآسانی کیا جا سکتا ہے۔ ان چیزوں کی مجھے تفصیل بیان کرنی غیر ضروری ہے کیونکہ ہر عربی دان اس سے واقف ہے۔ میرا منشا صرف اس بات کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ اسلام سے پہلے عربوں کی زبان جس پختگی اور وسعت سے بہرہ ور ہو چکی تھی، وہ یقیناً اس بات کے بغیر ممکن نہیں کہ اس سے پہلے اس زبان کے بولنے والوں میں ادبیات کی بڑی صلاحیتیں اور بڑے چرچے رہے ہوں۔

بے شمار نظمیں زمانہ جاہلیت کی طرف منسوب ہیں۔ خود نثر میں بہت سے خطبوں، تقریروں، ضرب المثلوں، کہانیوں، کاہنوں اور حکموں (پنچ) کے فیصلوں وغیرہ کی صورت میں ہم تک ان کی یادگاریں پہنچی ہیں۔ ان کے دیکھنے سے ہر ناظر یہ اندازہ کر لے گا کہ اس زمانہ کے عربوں میں بلاغت، ظرافت، حسنِ ذوق اور وقتِ نظر کا معیار کتنا بلند تھا۔ خود لفظ "عرب" کے معنی ہیں وہ شخص جو اپنا مطلب اچھے طور سے واضح کر سکتا ہو۔ تمام غیر عرب عجم کہلاتے ہیں، جس کے معنی گونگے کے ہیں۔

یہاں تک تو استنباطات اور قیاس آرائیاں ہوتی رہیں۔ خود تاریخی واقعات بھی مفقود نہیں ہیں۔ مدرسوں کے سلسلے میں کسے یقین آئے گا کہ اس زمانے میں وہاں نہ صرف تعلیم گاہیں تھیں بلکہ ایسی تعلیم گاہیں، جن میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں تعلیم پاتی ہوں؟ بہرحال ابن قتیبہ نے عیون الاخبار (جلد ۴ صفحہ ۱۰۳) میں بیان کیا ہے کہ مکہ کے قریب رہنے والے قبیلہ ہذیل کی ضرب المثل فاحشۂ عورت ظلمہ

---

[1] خود ایک حدیث میں ہے "ہم ایک اُمّی قوم ہیں، لکھنا اور حساب کرنا ہمیں نہیں آتا" (مختصر جامع بیان العلم صفحہ ۲۵)۔

معارف: اصل حدیث صحیح بخاری وغیرہ میں بھی ہے مگر اس میں فخر کا شائبہ نہیں بلکہ قمری مہینوں کے اختیار کی وجہ بتائی گئی ہے۔

جب بچی تھی، تو ایک مدرسہ جاتی تھی، جہاں اس کا سب سے دلچسپ مشغلہ یہ تھا کہ دواتوں میں قلم ڈال اور نکال کر کھیلا کرے۔ اس دلچسپ واقعہ سے اتنا تو معلوم ہو جاتا ہے کہ قبیلہ قریش کے رشتہ دار قبیلہ ہذیل میں ایسے مدرسے تھے، جو چاہے کتنے ہی ابتدائی نوعیت کے کیوں نہ ہوں، ان میں لڑکیاں اور لڑکے تعلیم پانے کے لیے جاتے تھے۔

بازار عکاظ میں ہر سال جو ادبی چرچا ہوا کرتا تھا، اس کے باعث اسے ایک "پان عرب لٹریری کانگریس" کہنا بے جا نہ ہوگا۔ عکاظ نے مورخین اور مولفین کو ہمیشہ سے ہی لبھا رکھا ہے حال میں جامعہ مصریہ کے پروفیسر احمد امین نے مجلہ کلیۃ الادب میں اس موضوع پر ایک بہت اچھا مضمون لکھا ہے۔ مجھے یہاں عکاظ کی علمی سرگرمیوں کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ یہاں اس قدر کافی ہے کہ اس ادارے کا صرف نام لے لیا جائے، جس نے عربی زبان کو معیاری بنانے کے لیے اتنا نمایاں حصہ لیا ہے۔

غیلان بن سلمہ ثقفی کے متعلق بیان کیا جاتا ہے[۱] کہ وہ ہفتہ میں ایک دن علمی جلسہ منعقد کرتا جس میں نظمیں پڑھی جاتیں اور ان پر تنقید ہوتی۔ ہفتے کے باقی دنوں میں وہ کسی دن عدل گستری کا کام انجام دیتا اور کسی دن دوسرے فرائض میں مشغول ہوتا۔ اس واقعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ جاہلیت میں طائف والوں کا علمی ذوق بھی کتنا بلند تھا۔

اس زمانے میں مکہ کی علم دوستی اس سے بھی کچھ زیادہ ہی بلند تھی۔ سبع معلقات مکہ ہی کے معبد کعبہ میں لٹکائے جاتے رہے اور اسی اعزاز و امتیاز نے ان سات نظموں کو عربی ادبیات میں ایک لافانی زندگی عطا کر دی ہے ورقہ بن نوفل مکہ کا ایک باشندہ تھا۔ اس نے زمانہ جاہلیت میں توریت اور انجیل کو عربی میں منتقل کیا تھا۔ غالباً یہ مکہ والے ہی تھے جنہوں نے عربی زبان کو سب سے پہلے ایک تحریری زبان کی حیثیت عطا کی تھی[۲]۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ یہاں کے اجڈ سپاہی بھی لکھے پڑھے ہوا کرتے تھے۔ اس کی مزید تفصیل آگے آئے گی۔

قصہ نویسی، ناول اور ڈرامہ زمانہ حال میں ادبیات میں بہت بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ مکہ والوں کو بھی اس کا بڑا ذوق تھا چنانچہ چاندنی راتوں میں خاندانی اجتماع گاہوں پہ یا شہر کے مرکزی دار الندوہ میں یہ لوگ جمع ہوتے اور پیشہ ور قصہ گو وغیرہ وہاں پر جنتر باسنے ہوئے قصے بیان کر کے دلچسپی کا سامان مہیا کرتے اس کے کچھ حوالے میرے مضمون "شہری مملکت مکہ" میں ملیں گے۔

ادبی ذوق جاہلیت میں صرف عربوں ہی میں نہ تھا بلکہ عرب میں رہنے والی دوسری قوموں میں بھی اس کا پتا چلتا ہے۔ چنانچہ یہودی سموآل بن عادیا اور دیگر یہودی اور نصرانی شعرا کے دیوان بھی پائے جاتے تھے۔ مدینہ منورہ کے یہودیوں نے ایک بیت المدارس قائم کر رکھا تھا، جو نیم عدالتی اور نیم تعلیمی ادارہ ہوا کرتا تھا اور اسلام کے آغاز تک اس کا پتا چلتا ہے۔ (دیکھیے سیرۃ ابن ہشام میں غزوہ بنی قینقاع وغیرہ) زمانہ جاہلیت میں عربی زبان میں لکھنے پڑھنے کی چیزوں کے لیے بڑی کثرت سے الفاظ ملتے ہیں چنانچہ صرف قرآن مجید ہی میں حسب ذیل الفاظ کا ذکر ہے: رق اور قرطاس (کاغذ) قلم، ن (دوات) نستنسخ، مرقوم، مسطور، مستطر، مکتوب، نخطہ، تملی، املیل (لکھنے کے معنی میں جو مختلف افعال پائے جاتے ہیں، یہ ان کے صیغے ہیں) کاتب، مداد (سیاہی) اسفار، زبر، کتب، صحف (کتابوں اور تحریری چیزوں کے معنوں میں) وغیرہ

[۱] - الازمنہ والامکنہ مولفہ مرزوقی جلد ۲ ص ۸۰-۷۹۔ نیز معارف ابن قتیبہ۔

[۲] - فہرست ابن ندیم ص ۷۔ نیز کتاب الخراج مولفہ قدامہ بن جعفر کا ٹکڑا جو آکسفورڈ میں ہے (مگر غلطی سے خلافہ کی طرف منسوب ہے)

غرض ان اور اسی طرح کی مماثل بنیادوں پر علوم و فنون کی وہ بلند عمارتیں بعد میں زمانہ اسلام کے عربوں نے کھڑی کیں، جن پر پورے کرہ ارض کی علمی دنیا فخر کر سکتی ہے۔

قبل ہجرت اسلام یہ چیز عام طور سے معلوم ہے کہ اسلام کا آغاز اس وقت سے ہوا جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر چالیس سال کی عمر میں پہلی وحی اتری۔ اس بات کا کوئی پتا نہیں چلتا کہ نوعمری میں آپ نے لکھنے اور پڑھنے کے فن میں حصہ لیا ہو یا آپ عمر بھر اُمّی ہی رہے اس کے باوجود یہ کس قدر اثر انگیز واقعہ ہے کہ خدا کے پاس سے آپ کو جو سب سے پہلی وحی آئی، اس میں آپ کو اور آپ کے متبعین کو "اقراء" یعنی پڑھنے کا حکم تھا اور قلم کی ان الفاظ میں تعریف کی گئی تھی کہ جملہ انسانی علم اسی سے ہے۔

"پڑھ اپنے رب کے نام سے جو خالق ہے۔ جس نے انسان کو ایک جمے ہوئے قطرۂ خون سے پیدا کیا۔ پڑھ یہ تیرا بزرگ پروردگار ہے جس نے قلم کے ذریعے سے تعلیم دی اور انسان کو وہ چیز بتائی جسے وہ نہیں جانتا تھا۔"
(قرآن مجید سورہ ۹۶۔ آیۃ ۱ تا ۴)

ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے کہ خدا نے سب سے پہلے قلم ہی کو پیدا کیا۔[1] سہولت کے لیے ہم بھی وہی مشہور تقسیم اختیار کر سکتے ہیں، جو قبل ہجرت و بعد ہجرت کے نام سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے متعلق استعمال کی گئی ہے اور اس تقسیم سے وہ زمانے بھی متعین ہو جاتے ہیں، جب آپ کے ہاتھ میں دنیاوی اقتدار تھا یا نہ تھا۔

یہ امر نمایاں کئے جانے کے قابل ہے کہ قریب قریب وہ تمام آیتیں جن میں لکھنے پڑھنے یا علم سیکھنے کا ذکر ہے، وہ مکی آیتیں ہیں۔ اس کے برخلاف مدنی آیتوں میں کام کرنے اور تعمیل کرنے پر زیادہ زور دیا گیا ہے چنانچہ:

۱۔ کیا وہ لوگ جو جانتے ہیں، اور جو نہیں جانتے برابر ہو سکتے ہیں؟ (قرآن مجید ۳۹/۹)
۲۔ تم کو علم سے تھوڑی مقدار دی گئی ہے۔ (قرآن مجید ۱۷/۸۵)
۳۔ اللہ سے اس کے بندوں میں صرف عالم ہی ڈرتے ہیں۔ (قرآن مجید ۳۵/۲۸)
۴۔ اور کہہ میرے آقا مجھے علم میں زیادتی عطا کر۔ (قرآن مجید ۲۰/۱۱۴)
۵۔ تمہیں وہ چیز سکھائی گئی جو نہ تم جانتے تھے اور نہ تمہارے آباؤ اجداد (قرآن مجید ۶/۹۲)
۶۔ اگر زمین کے تمام درخت قلم بن جائیں اور سمندر سات دیگر سمندروں کے ساتھ سیاہی بن جائے تو بھی خدا کے کلمات ختم نہ ہو سکیں۔ (قرآن مجید ۳۱/۲۷)
۷۔ قسم ہے پہاڑ کی اور قسم ہے ایک کتاب کی جو لکھی ہوئی ہے ایک جھلی پر جو پھیلائی گئی ہے (قرآن مجید ۵۲/۱ تا ۳)
۸۔ قسم ہے دوات کی اور قلم کی اور اس چیز کی جو تم لکھتے ہو (قرآن مجید ۶۸/۱)
۹۔ اگر ہم نے تجھ پر ایک واقعی تحریری چیز کاغذ پر لکھی ہوئی بھیجی ہوتی۔ (قرآن مجید ۶/۷)
۱۰۔ اگر تمہیں معلوم نہ ہو تو یاد رکھنے والوں سے پوچھ لو (قرآن مجید ۱۶/۴۳)

[1] ترمذی ۴۴/۶۸، ابوداؤد ۳۹/۱۶، ابن حنبل جلد ۵ ص ۳۱۵، طیالسی ص ۵۷۷

یہ تمام مکی آیتیں ہیں۔

کسی قوم میں پیغمبر کا مبعوث ہونا تعلیم کے سوا کسی اور غرض کے لیے نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہمیں حیرت نہ ہو کہ ایک حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میں ایک معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں[1] اس کی تائید قرآنی آیتوں سے بھی ہوتی ہے چنانچہ فرمایا

۱۔ (ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ نے دعا کی) اے ہمارے آقا ان کے پاس انہی میں کا ایک رسول بھیج جو انہیں تیری آیتیں سنائے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے، تو ہی طاقت ور اور عقل مند ہے۔ (قرآن مجید ۲/۱۲۹)

۲۔ وہی ہے جس نے امیوں میں انہی میں کا ایک رسول بھیجا تاکہ انہیں اس کی آیتیں سنائے ان کا تزکیہ کرے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے۔ اگرچہ اس سے پہلے وہ خاص گمراہی میں مبتلا تھے۔ (ایضاً ۶۲/۲)

۳۔ بے شک خدا نے ایمان والوں پر مہربانی کی جب اس نے ان کے پاس انہی میں کا ایک رسول بھیجا جو انہیں اس کی آیتیں سناتا ہے، ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اگرچہ وہ اس سے پہلے فاش گمراہی میں مبتلا تھے۔ ایضاً ۳/۱۶۴

حقیقت میں تبلیغ اور تعلیم ایک ہی چیز ہیں۔ خاص کر ایسے شخص کے لیے جو مذہب و سیاست کو بالکل الگ اور ایک دوسرے سے آزاد چیزیں نہ سمجھتا ہو، اور جس کا مطمح نظر یہ ہو کہ:۔

"اے ہمارے پروردگار ہمیں اس دنیا میں بھی بھلائی عطا کر اور آخرت میں بھی اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا" ایضاً ۲/۲۰۱

بیعتِ عقبۂ ثانیہ جیسے ابتدائی زمانہ میں جو ہجرت سے بھی دو سال پہلے منعقد ہوئی تھی، کوئی ایک درجن مدینہ والوں نے اسلام قبول کیا تھا، تو ان کی خواہش پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ مکہ سے ایک تربیت یافتہ معلم[2] روانہ کر دیا تھا، جو انہیں قرآن مجید کی تعلیم دے سکے اور دینیات اسلام سے واقف کرا سکے۔ بے شبہ اس ابتدائی زمانہ میں تعلیم سے مراد صرف مبادی دین اور عبادت کے طریقوں کی تعلیم ہی ہو سکتی تھی۔

زمانہ قبل ہجرت کی سب سے اہم چیز جو اس سلسلے میں بیان کی جا سکتی ہے، یہ بھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کاتبوں کو مقرر کر رکھا تھا، جن کا کام یہ تھا کہ جیسے جیسے وحی نازل ہوتی جائے، اس کو لکھ لیں اور اس کی نقلیں کر یں۔ چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ جب حضرت عمرؓ اسلام لانے لگے تو انہیں قرآن مجید کی چند سورتیں اپنی بہن کے گھر میں لکھی ہوئی ملی تھیں اور بظاہر ان کی بہن بھی پڑھنا جانتی تھی۔

اس سلسلے میں سب سے آخر میں حضرت موسیٰؑ کے قصے کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں جو قرآن شریف کی ایک مکی سورت (کہف) میں مذکور ہے کہ کس طرح وہ طلب علم کے لیے گھر سے نکلے، سفر کی صعوبتیں برداشت کیں اور دل دہلانے والے تجربے حاصل کیے اس قصے کا ماحصل یہ ہے کہ کوئی شخص کتنا ہی بڑا عالم ہو جائے، ہر چیز نہیں جان سکتا۔ اور یہ کہ علم میں زیادتی کی خواہش ہو تو بیرونی ممالک کا سفر ناگزیر ہے[3]۔

---

[1] ابن عبدالبر کی مختصر جامع بیان العلم ص ۲۵۔ معارف ۱: ابن ماجہ باب فضل العلماء

[2] سیرت ابن ہشام ص ۲۸۹۔ [3] طلب علم کے لیے سفر کے سلسلے میں دیکھئے مقدمہ دارمی ص ۴۶

بعد ہجرت

ہمارے پاس بعد ہجرت زمانے کے متعلق جو مواد ہے، اس کو سنہ وار ترتیب کی جگہ فن وار مرتب کرنا زیادہ سہولت بخش ہو گا، مثلاً مدرسوں کا انتظام، امتحانات، اقامت خانے، ابتدائی تعلیم اور لکھنا پڑھنا سکھلنے کا بندوبست، اجنبی زبانوں کی تعلیم، نصاب تعلیم، عورتوں کی تعلیم، صوبہ جات میں تعلیمی انتظام، صوبہ جات میں دورہ اور تنقیح کرنے والے افسر وغیرہ۔

ہم ابھی اوپر بیان کر چکے ہیں کہ رسول کریم صلعم نے ہجرت سے بھی پہلے ایک معلم کو مدینہ منورہ روانہ کیا تھا جس کے کارنامے تاریخ نے محفوظ رکھے ہیں۔ جب ہجرت کے بعد رسول کریم صلعم خود مدینہ منورہ پہنچے تو بے شمار اور بے حد اہم جنگی اور سیاسی مصروفیتوں کے باوجود آپ اس کے لیے وقت نکال لیا کرتے تھے کہ مدینہ منورہ سے ناخواندگی کو دور کرنے کے کام کی شخصی طور سے نگرانی کر سکیں چنانچہ اس سلسلے میں آپ نے سعید بن العاص رض کا تقرر کیا تھا کہ لوگوں کو لکھنے اور پڑھنے کی تعلیم دیں یہ بہت خوش نویس بھی تھے[1] رسول کریم صلعم کو ناخواندگی سے اتنی دلچسپی تھی کہ ہجرت کے ڈیڑھ ہی سال بعد جب ساٹھ ستر مکہ والے جنگ بدر میں گرفتار ہو کر مدینہ لائے گئے تو آپ نے ان لوگوں کا، جو مال دار نہ تھے، ان کی رہائی کے لیے یہ فدیہ مقرر کیا تھا کہ مدینہ کے دس دس بچوں کو لکھنا سکھائیں[2]

حضرت عبادہ ابن الصامت رض کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے صفہ میں اس غرض سے مامور کیا تھا کہ لوگوں کو لکھنے کی اور قرآن مجید کی تعلیم دوں[3]

صُفّہ سے مراد مکان کا ملحق حصہ ہوتا ہے۔ یہ مسجد نبوی میں ایک احاطہ تھا، جو اس غرض کے لیے مختص کر دیا گیا تھا کہ باہر سے تعلیم کے لیے آنے والوں بلکہ خود مقامی بے گھرے طالب علموں کے لیے دار الاقامے کا بھی کام دے اور مدرسہ کا بھی اس اقامتی درسگاہ میں لکھنے پڑھنے کے علاوہ فقہ کی تعلیم دی جاتی تھی، قرآن مجید کی سورتیں زبانی یاد کرائی جاتی تھیں، فن تجوید سکھایا جاتا تھا اور دیگر اسلامی علوم کی تعلیم کا بندوبست تھا جس کی نگرانی خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم شخصی طور سے فرمایا کرتے تھے اور وہاں رہنے کی غذا وغیرہ کا بھی بندوبست کیا کرتے تھے۔ یہ طلبہ اپنے فرصت کے گھنٹوں میں طلب روزگار میں بھی مصروف ہوا کرتے تھے[4]

درس گاہ صفہ میں نہ صرف مقیم طلبہ کی تعلیم کا انتظام تھا بلکہ ایسے بھی بہت سے لوگ آتے تھے، جن کے مدینہ میں گھر تھے اور وہ صرف درس کے لیے وہاں حاضر ہوا کرتے تھے۔ وقتاً فوقتاً عارضی طور سے درس گاہ میں شریک ہونے والوں کی بھی کمی نہ تھی۔ مقیم طلبہ کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی اور ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک وقت ان کی تعداد ستر بھی تھی[5]

---

[1] استیعاب ابن عبد البر ص ۲۹۳، نیز نظام الحکومت النبویہ مولفہ کتانی ۱/۴۸ بحوالہ ابو داؤد،

[2] ابن سعد ۲/۱ ص ۱۴، سہیلی ۲/۹۲، مسند ابن حنبل ۱/۲۴۷، کتانی کتاب مذکور ۱/۴۸۔

[3] کتانی ۱/۴۸ بحوالہ ابو داؤد وغیرہ (معارف: ابو داؤد کتاب البیوع باب کسب العلم)

[4] بخاری باب سریۃ بیر معونہ،

[5] مسند ابن حنبل جلد ۳ ص ۱۳۷۔



مسجدِ نبوی کا ایک منظر

مقامی طلبہ کے علاوہ دور دراز کے قبائل سے بھی طلبہ آتے اور اپنا ضروری نصاب تکمیل کرکے اپنے وطنوں کو واپس ہو جاتے[1]
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اکثر اپنے کسی تربیت یافتہ صحابی کو قبائلی وفود کے ساتھ ان کے مسکنوں کو روانہ کر دیتے تاکہ وہ اس علاقے میں دینیات کی تعلیم کا بندوبست کریں، جس کے بعد وہ مدینہ واپس آجاتے[2]

ہجرت کے ابتدائی سالوں میں معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ مستقل سیاست تھی کہ جب مدینہ کے باہر کے لوگ مسلمان ہوتے تو ان کو حکم دیا جاتا کہ ترکِ وطن کرکے مرکزِ اسلام کے قریب آبسیں[3]۔ جہاں بعض وقت ان کو اپنی آبادی بسانے کے لیے سرکاری زمینیں بھی دی جاتیں[4]

ترکِ وطن کے اس حکم میں فوجی، سیاسی اور تمدنی جو اغراض پوشیدہ تھے، وہ ظاہر ہیں۔ ابن سعد[5] نے بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قبیلے میں جو نیا نیا مسلمان ہوا تھا، ایک معلم روانہ کیا۔ معلموں کو ہجرت کے متعلق جو عام ہدائتیں تھیں اس کی انہوں نے لفظی تعمیل کی اور کہنا شروع کیا کہ جو ہجرت نہ کرے، وہ مسلمان ہی نہیں سمجھا جائے گا۔ قبیلے والے پریشان ہوئے مگر وہ سمجھ دار تھے۔ انہوں نے اپنا ایک وفد مدینہ روانہ کیا تاکہ براہ راست جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم معلوم کریں کہ ہجرت کے حکم کا کیا منشا ہے اور یہ عرض کریں کہ انہیں اپنا وطن چھوڑنے میں کس قدر عظیم معاشی نقصان ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی مشکلات کو سُن کر انہیں اجازت دی کہ وہ اپنے وطن ہی میں رہیں اور ان کے ساتھ وہی سلوک ملحوظ رکھا جائے گا، جو اسلامی سرزمین میں ہجرت کرنے والوں کے ساتھ رکھا جاتا تھا۔

مدنی زندگی میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ مستقل سیاست تھی کہ قبائل میں تعلیم و تربیت کے لیے معلم روانہ کریں۔ بیر معونہ کے مشہور واقعہ میں ستر قاریانِ قرآن بھیجے گئے تھے جن کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ انہیں نجد کے ایک آباد علاقے میں اور کثیر قبائل میں کام کرنا تھا۔

قبائلی نمائندوں کا تعلیم کی غرض سے مدینہ آنا بھی کوئی شاذ و نادر واقعہ نہ تھا[6] اور جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، ایسے لوگوں کے قیام و طعام اور تعلیم و تربیت کی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود شخصی طور سے نگرانی فرماتے تھے اور یہ لوگ عموماً صفہ میں ٹھہرائے جاتے تھے مدینہ منورہ میں صفہ واحد درس گاہ نہ تھی بلکہ یہاں کم از کم نو مسجدیں خود عہد نبوی میں تھیں[7] اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ہر مسجد اپنے آس پاس کے محلہ والوں کے لیے درس گاہ کا بھی کام دیتی تھی۔ خاص کر بچے وہاں پڑھنے آیا کرتے تھے۔ قبا مدینہ منورہ

---

[1] بخاری باب رحمۃ البہائم نیز تفسیر طبری جلد ۱۱ صہ۵ نیز تفسیر خازن میں سورہ (۹) آیۃ ۱۲۲ کی تفسیر جہاں قرآن مجید میں حکم ہے کہ پوری قوم جہاد پر نہ جائے بلکہ چند لوگ تعلیم حاصل کرکے رہنمائی کا فریضہ انجام دیں نیز ابن عبدالبر کی کتاب العلم صفہ ۲ تا ۲۱)

[2] کتانی کی نظام الحکومۃ النبویہ جلد ۱ صہ۴۳ و مابعد

[3] دیکھئے مفتاح کنوز السنہ لفظ ہجرہ

[4] ابو داؤد جلد ۲ صہ۳۲ وغیرہ۔ [5] طبقات ابن سعد باب الوفود

[6] اس کی تفصیل اوپر آچکی ہے [7] ابو داؤد "کتاب المراسیل" نیز عینی شرح بخاری جلد ۲ صہ۴۶۸،

کے جنوب میں مسجد نبویؐ سے کوئی دو ڈھائی میل پر واقع ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وقتاً فوقتاً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم وہاں تشریف لے جاتے اور وہاں کی مسجد کے مدرسے کی شخصی طور سے نگرانی فرماتے[1] بعض احادیث میں رسول کریم صلعم کے عام حکم ان لوگوں کے متعلق محفوظ ہیں جو اپنے محلے کی مسجد کے مدرسے میں تعلیم پاتے تھے[2]۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی احکام صادر کئے تھے کہ لوگ اپنے ہمسایوں سے تعلیم حاصل کریں[3]۔

ایک دلچسپ واقعہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ نے بیان کیا ہے[4] کہ ایک دن جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہاں دو قسم کے لوگ موجود ہیں۔ کچھ لوگ نوافل اور خدا کی عبادت میں مشغول تھے اور کچھ لوگ فقہ کی تعلیم و تعلم میں منہمک۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دونوں ہی لوگ اچھا کام کر رہے ہیں۔ البتہ ایک کا کام زیادہ اچھا ہے۔ جو لوگ خدا سے کچھ مانگ رہے ہیں، ان کے متعلق خدا کی مرضی ہے کہ چاہے تو دے، چاہے تو نہ دے۔ البتہ دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں، جو علم حاصل کر رہے ہیں اور جہالت کو دور کر رہے ہیں سچ تو یہ ہے کہ خود میں بھی معلم ہی بنا کر بھیجا گیا ہوں —— یہ کہتے ہوئے آپ نے اس حلقے میں اپنے لیے جگہ بنائی جہاں درس ہو رہا تھا۔

یہاں اس مشہور اور اکثر حوالہ دی جانے والی حدیث کا ذکر کیا جا سکتا ہے کہ ایک عالم شیطان پر ایک ہزار عابدوں سے زیادہ سخت گزرتا ہے[5]۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی شخصی طور سے اعلیٰ تعلیم دیا کرتے تھے حضرت عمرؓ وغیرہ بڑے صحابہ ان درسوں میں شریک رہا کرتے تھے، جہاں قرآن وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی کے حلقہائے درس کا اکثر معائنہ کیا کرتے تھے۔ اگر وہاں کوئی بے عنوانی نظر آتی تو فوراً تدارک فرما دیا کرتے۔ چنانچہ ترمذی میں ہے[6] کہ ایک مرتبہ مسجد نبوی میں رسول کریم صلعم نے قضا و قدر کے متعلق کچھ مباحثہ ہوتے سنا آپ اپنے حجرے سے باہر آئے۔ مارے غصے کے آپ کا چہرہ تمتما رہا تھا اور راوی کے الفاظ میں ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ انار کا رس آپ کے رخساروں اور پیشانی پر نچوڑ دیا گیا ہے۔ آپ نے اس موضوع پر بحث مباحثے سے منع کر دیا اور ارشاد فرمایا کہ بہت سی گزشتہ امتیں اسی مسئلہ میں الجھ کر گمراہ ہو گئی تھیں۔

یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک طے شدہ سیاست تھی کہ صرف وہی لوگ مسجدوں میں امام بنیں جو قرآن مجید اور سنت کے زیادہ سے زیادہ ماہر ہوں (جیسا کہ صحیح مسلم میں بیان کیا گیا ہے)۔ یہ کوششیں بیکار نہ گئیں۔ اور خواندگی میں اس قدر تیزی سے ترقی

---

[1] ابن عبد البر کی کتاب العلم ص ۹۷۔

[2] ابن عبد البر کی کتاب العلم ص ۱۴۱

[3] کتانی کی نظام الحکومتہ النبویہ جلد ۱ ص ۴۱ (معارف صحیح بخاری املاء نبوی بیان حضرت عمرؓ)

[4] ابن عبد البر کی کتاب العلم ص ۲۵ نیز دیگر کتب حدیث۔

[5] سیوطی کی جمع الجوامع تحت عنوان "عالم و فقیہ" بحوالہ بخاری و دیلمی، نیز ترمذی باب العلم۔

[6] شمائل ترمذی برموقع۔

ہوئی کہ ہجرت کو چند ہی دن گزرے تھے کہ قرآن مجید نے حکم دیا کہ ہر وہ تجارتی معاملہ جس میں رقم ادھار ہو، صرف تحریری طور سے انجام پائے اور ایسی دستاویز پر کم از کم دو اشخاص کی گواہی لی جایا کرے۔ اس کا منشا قرآن کے الفاظ میں یہ تھا کہ اس طرح کی تحریری گواہی "خدا کے نزدیک زیادہ منصفانہ ہے اور شہادت کے اغراض کے لیے زیادہ مستحکم وسیلہ ہے اور شبہات پیدا ہونے کی صورت میں رفع شک کا بہترین ذریعہ ہے۔"[1]

مدینہ میں خواندگی کی کثرت ہو جانے کے باعث اس حکم سے کوئی دشواری پیش نہیں آئی اور ظاہر ہے کہ ملک میں خواندگی کی وسعت کے بغیر ایسا حکم نہیں دیا جا سکتا تھا۔ گو اس میں شک نہیں کہ پیشہ ور کاتبوں کا بھی اس زمانے میں پتا چلتا ہے[2]

ہجرت کے بعد ہی سے سیاسی معاہدات، سرکاری خط و کتابت، ہر فوجی مہم میں جانے والے رضا کاروں کے ناموں کی فہرستیں[3] مختلف مقامات مثلاً مکہ، نجد، خیبر وغیرہ میں خفیہ نامہ نگار[4] جو عموماً تحریری طور سے آنحضرت صلعم کو اپنے مقام کے حالات سے اطلاع دیا کرتے تھے۔ نیز مردم شماری[5] اور اس طرح کی بہت سی چیزیں اس بات میں ممد و معاون ہوئیں کہ خواندگی روز بروز بڑھتی ہی جائے۔ تاریخ نے رسول کریم صلعم کے کوئی ڈھائی تین سو خطوط محفوظ رکھے ہیں[6]۔ صحیح تعداد اس سے بہت زیادہ ہونی چاہیے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت دس لاکھ مربع میل کے علاقے پر چلتی تھی اور دس سال تک حکمرانی کے فرائض آپ کو انجام دینا پڑے تھے۔

عرب میں خطوط پر مہر کرنے کا رواج سب سے پہلے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے شروع ہوا[7]۔ آپ کو خط کی صفائی اور وضاحت کا جس قدر لحاظ رہتا تھا، اس کا اندازہ ان چند احادیث سے ایک حد تک ہو سکتا ہے، جن میں آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ کاغذ کو موڑنے سے پہلے اس کی سیاہی کو ریگ ڈال کر خشک کر لو[8] یا یہ کہ حرف "س" کے تینوں شوشے برابر دیا کرو اور اس کو بغیر شوشوں کے نہ لکھا کرو[9]۔ غالباً یہ حکم اس لیے تھا کہ شوشے نہ دینا احتیاط پسندی کے فقدان اور سستی پر دلالت کرتا ہے، یا یہ کہ لکھتے ہوئے اگر کچھ رکنا پڑے تو کاتب کو چاہیے کہ قلم اپنے کان پر رکھ لے کیونکہ اس سے لکھوانے والے کی زیادہ آسانی سے یاددہانی ہو جاتی ہے[10]۔

---

۱ قرآن مجید $\frac{2}{282}$، ۲ کتانی کی نظام الحکومۃ النبویہ، $\frac{1}{275}$ تا ۷۷،

۳ کتانی کتاب مذکور جلد ا ص ۲۲۱ بحوالہ صحیح مسلم۔

۴ کتانی $\frac{1}{362 \text{ تا } 363}$ (معارف: خفیہ نامہ نگار کی اصطلاح صحیح نہیں ممکن ہے کسی نے اتفاقاً کوئی اطلاع بھیج دی ہو)

۵ صحیح بخاری $\frac{56}{181}$ کتانی کے بیان کے مطابق ایک مرتبہ مسلم شماری کی فہرستوں سے پندرہ سو اندراجات شہر مدینہ میں ہونے معلوم ہوئے تھے، جو ظاہر ہے کہ ابتدائے ہجرت کا زمانہ ہوگا۔ ۶ اس پر جدید ترین تالیف الوثائق السیاسیہ کے نام سے میں نے شائع کی ہے۔

۷ کتانی $\frac{1}{171}$ فتوح البلدان مولفہ بلاذری باب الخاتم، ۸ کتانی $\frac{1}{129}$

۹ ایضاً $\frac{1}{125}$ ومابعد،

۱۰ ایضاً $\frac{1}{125}$ ومابعد، (معارف: اوپر کی دونوں باتیں صحیح حدیثوں میں نہیں۔)

عہد نبوی ہی میں یک فنی ذوق یا تخصص ترقی کر گیا تھا اور خود جناب رسالتمآب صلعم اس کی حوصلہ افزائی فرمایا کرتے تھے کہ جس کو قرآن سیکھنا ہو، وہ فلاں صحابی کے پاس جائے، جس کو تجوید یا تقسیم ترکہ کا حساب سیکھنا ہو، وہ فلاں کے پاس جائے وغیرہ[۱]۔

متعدد حدیثوں میں معلموں کو معاوضہ قبول کرنے کی ممانعت کی گئی ہے[۲]۔ عبادہ بن صامتؓ کی روایت ہے کہ وہ درس گاہ صفہ میں قرآن اور فن تحریر کی تعلیم دیتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک شاگرد نے انہیں ایک کمان نذر کی مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس کے قبول کرنے سے روک دیا[۳]۔

ایک مملکت کے حاکم اعلیٰ کی حیثیت سے جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کو مترجمین کی بھی ضرورت ہوا کرتی تھی، جو غیر زبانیں جانتے ہوں چنانچہ حضرت زید بن ثابتؓ جو دربار رسالت کے میر منشی کہے جا سکتے ہیں، فارسی، حبشی، عبرانی اور رومی (یونانی) جانتے تھے[۴]۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ان کو حکم دیا تھا کہ وہ عبرانی خط لکھنا اور پڑھنا بھی سیکھ لیں اور چند ہفتوں میں وہ اس میں حاذق ہو گئے تھے[۵]۔ چنانچہ یہودیوں کو اگر کوئی خط بھیجا جاتا یا ان کے پاس سے کوئی خط آتا تو حضرت زید بن ثابتؓ اس کو لکھا یا پڑھا کرتے تھے۔

نصاب کا مسئلہ ایسا ہے کہ اس پر پوری صحت کے ساتھ بیان کرنا دشواری سے خالی نہیں۔ ہمارے پاس جو مختصر و محدود مواد ہے، اس سے پتا چلتا ہے کہ ہر جگہ ایک ہی نصاب جاری نہ تھا، معینہ کتب پڑھانے کی بجائے معینہ معلم کے پاس لوگ جاتے اور وہ جو پڑھا سکتا، اس سے پڑھتے۔ بہرحال اتنا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن و سنت کے ہمہ گیر نصاب کے علاوہ آنحضرت صلعم نے حکم دیا تھا کہ نشانہ بازی[۶]، تیراکی[۷]، تقسیم ترکہ کی ریاضی[۸]، مبادی طب[۹]، علم ہیئت[۱۰]، علم انساب[۱۱] اور علم تجوید قرآن[۱۲] کی تعلیم دی جایا کرے ایک حدیث میں یہ بھی حکم ہے کہ استاد

۱۔ طبقات ابن سعد بر موقع،

۲۔ سیوطی کی جمع الجوامع تحت عنوان "علما" بحوالہ طبرانی نیز بخاری ۲۲/۱۶، ابو داؤد ۲۲/۳۶

۳۔ ابوداؤد جلد ۲۔ صفحہ ۱۲۹۔ اس کا ذکر شبلی کی سیرۃ النبی طباعت دوم جلد ۲ صفحہ ۸۰ میں بھی ہے

۴۔ کتانی ۱/۲۰۲ بحوالہ العقد الفرید مؤلفہ ابن عبدربہ وغیرہ

۵۔ ایضاً ۱/۲۰۲ بحوالہ بخاری وغیرہ

۶۔ جمع الجوامع مؤلفہ سیوطی تحت عنوان "علّموا" بحوالہ ابن مندہ، ابونعیم و دیلمی،

۷۔ ایضاً تحت عنوان "ابونعیم و ابن مندہ۔

۸۔ ایضاً تحت عنوان "تعلموا" بحوالہ طبرانی و دارقطنی وغیرہ نیز ابن عبدالبر کی کتاب العلم صفحہ ۹۰، ابوداؤد ۱۸/۱، ابن ماجہ ۲۳/۱

۹۔ سیوطی کی جمع الجوامع تحت عنوان "تعلمن" بحوالہ مالک۔

۱۰۔ ایضاً تحت عنوان "تعلموا" بحوالہ ابن سنی۔

۱۱۔ ایضاً تحت عنوان "تعلموا من انسابکم" بحوالہ مالک و ترمذی و بیہقی و طبری۔

۱۲۔ ایضاً تحت عنوان "تعلموا من امر النجوم" بحوالہ دیلمی،

کی عزت کی جائے[1]

مکہ کے باشندوں کو زبان کی صفائی کا بے حد لحاظ رہتا تھا اور وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ ان کے بچے صحرا کی آزاد زندگی میں پرورش پائیں اور مکہ کی رنگا رنگ کی آبادی میں مل کر متاثر نہ ہوں۔ اسی لیے وہ اپنے نوزائیدہ بچوں کو مختلف قبائل میں بھیج دیتے تھے جہاں وہ کئی سال رہ کر والدین کے پاس واپس آتے۔ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس سے سابقہ رہا تھا اور آئندہ زندگی میں آپ اسے یاد کیا کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ معززین مکہ میں اس کا رواج آج بھی چلا آتا ہے۔

تربیت دلانے کا ایک دوسرا طریقہ مکہ والوں نے یہ اختیار کیا تھا کہ تجارت کے لیے جو کاروان جایا کرتے تھے اس میں کسی معمر کے ساتھ نوعمروں کو بھیج دیا کریں۔ چونکہ مکہ کی معاشی زندگی کا دارومدار بہت بڑی حد تک تجارت پر تھا، اس لیے اس طریقے کی اہمیت مکہ والوں کے لیے جیسی کچھ تھی، ظاہر ہے۔ سفر کے تجارب کا فائدہ ماسوا تھا۔

اس زمانے میں نوعمروں اور معمروں کی تعلیمی ضرورتوں کے فرق کو محسوس کر لیا گیا تھا۔ چنانچہ احادیث میں واضح الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ بچوں کو کن چیزوں کی تعلیم دینی چاہیئے۔ نشانہ اندازی اور پیراکی خاص طور سے بچپن ہی سے سکھائی جاتی تھی۔ اسی طرح نماز پڑھنے کا طریقہ بھی بچپن ہی سے بچوں کو سکھایا جاتا تھا اور سات برس کی عمر کے بعد بچے نماز نہ پڑھیں تو سزا دینے کا حکم تھا[2]

عورتوں کے ساتھ علیحدہ سلوک کیا جاتا تھا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہفتے میں ایک دن مقرر کیا تھا جب آپ عورتوں کے خصوصی مجمع میں تشریف لے جاتے، ان کو تعلیم دیتے اور ان کے سوالات کا جواب دیتے[3] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے لیے چرخہ کاتنا سب سے اچھا مشغلہ قرار دیا تھا[4]۔ ایک حدیث میں یہ واقعہ بیان ہوا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خاتون سے خواہش کی کہ وہ آپ کی ایک بیوی کو لکھنے پڑھنے کی تعلیم دیں[5]۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ بی بی عائشہؓ کو فقہ اور دیگر اسلامی علوم، نیز ادب، شاعری اور طب میں بڑا دخل تھا[6] یہاں تک کہ ایک مرتبہ رسول کریم صلعم نے فرمایا کہ آدھا علم عائشہؓ سے حاصل کرو[7]۔ قرآن نے بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں پر ایک خصوصی فریضہ عائد کیا کہ وہ دوسروں کو تعلیم دیا کریں[8]

---

[1] جمع الجوامع سیوطی تحت عنوان "تعلموا" بحوالہ طبرانی۔

[2] جمع الجوامع سیوطی تحت عنوان "علموا صبیّ" بحوالہ ابن حنبل و ترمذی و بغوی۔

[3] صحیح بخاری کتاب العلم۔

[4] جمع الجوامع سیوطی تحت عنوان "علموا (نعم لهو المؤمنة فی بيتها الغزل) بحوالہ ابونعیم و ابن مندہ۔

[5] کتانی $\frac{1}{49 \text{ تا } 55}$ بحوالہ قاضی عیاض و ابوداؤد۔

[6] سیرۃ النبیؐ مؤلفہ شبلی طبع دوم $\frac{2}{424}$

[7] احادیث فضل عائشہؓ کسی کتاب حدیث میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

[8] قرآن مجید $\frac{33}{34}$

ایک حدیث میں بیان ہوا ہے کہ جس کے پاس کوئی لونڈی ہو اور وہ اسے تعلیم دے اور اچھی تعلیم دے اور اس کی تربیت کرے اور اچھی تربیت کرے، پھر اس کو آزاد کر کے باضابطہ نکاح کرے، تو اسے دگنا ثواب ملے گا[1]۔

رفتہ رفتہ مملکتِ اسلامیہ جو ابتدائً ایک شہر مدینہ کے کچھ حصہ پر مشتمل تھی پھیلتی گئی اور نہ صرف خانہ بدوش بدوی بلکہ شہروں میں مستقل طور سے سکونت کرنے والے عربوں نے بھی بڑی تعداد میں اسلام قبول کرنا شروع کیا۔ ایک نئے دین کے قبول کرنے کا ناگزیر نتیجہ تھا کہ ایک وسیع تعلیماتی نظام قائم ہو، جو دس لاکھ مربع میل کے رقبے کی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ عہد نبوی کے اہتمام پر حکومت اسلامی باوجود اس قدر وسیع رقبے پر مشتمل ہونے کے دینیات کی تعلیم کی ضرورتوں سے اچھی طرح عہدہ برآ ہونے لگی تھی۔ کچھ تو مرکز مدینہ سے بڑے بڑے مقامات پر تربیت یافتہ معلم بھیج دیئے جاتے تھے اور کچھ صوبہ دار گورنروں کے فرائض منصبی میں یہ امر صراحت کے ساتھ شامل کر دیا جاتا تھا کہ وہ اپنے ماتحت علاقے کی تعلیمی ضرورتوں کا مناسب انتظام کریں[2]۔ یمن کے گورنر عمرو ابن حزم کے نام جو طویل تقرر نامہ با ہدایت نامہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھا تھا، اسے تاریخ نے محفوظ رکھا ہے[3]۔ اس میں بھی گورنر کو ہدایت ہے کہ لوگوں کے لیے قرآن، حدیث، فقہ اور علوم اسلامیہ کی تعلیم کا بندوبست کریں اسی دستاویز میں ایک دلچسپ جملہ ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی اور دنیاوی تعلیم میں کس طرح فرق کرنا چاہیئے اور وہ جملہ یہ ہے کہ "لوگوں کو اس بات کی نرمی سے ترغیب[4] دو کہ وہ دینیات کی تعلیم حاصل کریں۔" گورنروں کو جس تعلیم کے رائج کرنے کا حکم تھا، اس میں دینیاتی ضرورتوں میں سے وضو، جمعہ کا غسل، نماز باجماعت، روزہ اور حج کعبہ کے احکام شامل تھے۔

صوبہ وار درس گاہوں کا معیار بلند کرنے کے لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صوبہ یمن میں ایک صدر ناظم تعلیمات مقرر کیا تھا، جس کا کام یہ تھا کہ مختلف اضلاع و تعلقات میں ہمیشہ دورہ کرتا رہے اور وہاں کی تعلیم اور تعلیم گاہوں کی نگرانی کرے[5]۔ کوئی تعجب نہیں جو صوبہ جات میں بھی اس طرح کے افسر مامور کئے گئے ہوں۔

آخر میں تعلیم کی نظری حیثیت کے متعلق قرآن و حدیث کے بعض احکام کی جانب اشارہ کرنا بے محل نہ ہوگا۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہم دیکھتے ہیں کہ شروع سے آخر تک بار بار اور صاف و صریح الفاظ میں اندھی تقلید کو برا ٹھہرایا گیا ہے[6] اور اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ ہر شخص خود اپنے طور پر غور و فکر کرے اور کسی رسم و رواج کی پیروی محض آبائی و موروثی ہونے کی بنا پر نہ کرے[7]۔ کسی

---

[1] ابن عبدالبر کی کتاب العلم صـ۲۶۔

[2] کتانی $\frac{1}{۴۴}$ ومابعد،

[3] سیرت ابن ہشام صـ۹۶۱ تا صـ۹۶۲، تاریخ طبری صـ۱۷۲۷ تا صـ۱۷۲۹، کتانی $\frac{1}{۲۴۸ تا ۲۴۹}$ وغیرہ

[4] جمع الجوامع سیوطی تحت عنوان علموا "علموا ولا تعنفوا فان العلم خیر من العنف۔ علموا و یسروا ولا تعسروا" بحوالہ ابن سعد و بیہقی و ابن حنبل۔

[5] تاریخ طبری طـ۱۸۵۲ و ۱۹۸۳ (احوال سنہ ۱۱ھ)

[6] ابن عبدالبر کی کتاب العلم صـ۶ باب ذم التقلید بحوالہ آیت "اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابًا من دون اللہ"

[7] طلب علم کی فضیلت کے لیے دیکھو ابوداؤد $\frac{۲۴}{۲}$، مقدمہ ابن ماجہ صـ۱۷، مقدمہ دارمی صـ۲۱ وغیرہ، ترمذی $\frac{۳۹}{۲ و ۱۹}$

اور مذہبی کتاب میں فطرت کے مطالعہ پر اتنا زور نہیں دیا گیا ہو گا، جتنا قرآن مجید میں۔ ہے کہ سورج، چاند، سمندر کی موجیں، دن اور رات، چمکتے ہوئے ستارے، دمکتی فجر، پودے اور حیوانات ——— تمام ہی قوانین فطرت کے تابع بنائے گئے ہیں، جن سے ان کے خالق کی قدرت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ قرآن مجید کے مطابق علم لامتناہی ہے[1]۔ اور بڑے سے بڑے عالم کا علم بھی تھوڑا ہی ہوتا ہے، یہ کہ سارا عالم انسان کی خدمت کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور انسان جو زمین میں خدا کا نائب ہے، اپنے بر ملا ور کردار کے مطابق جانچا جائے گا۔ اسی طرح قرآن مجید میں اس کا بھی بار بار ذکر ہے، کہ حق و صداقت کی پیروی کی جانی چاہیئے اور موروثی عقائد و رواجات سے متاثر نہیں ہونا چاہیئے۔

احادیث میں بھی علماء کی بڑی تعریف کی گئی ہے اور ان کو سب سے بہتر انسان قرار دیا گیا ہے[2]، حتیٰ کہ ان کو انبیاء کا وارث قرار دیا گیا ہے[3]۔ آخر میں ایک حدیث کا ذکر کیا جا سکتا ہے، جس کا اکثر حوالہ آتا ہے اگرچہ ماہرین اس کو اس کے موجودہ الفاظ میں صحیح حدیث نہیں سمجھتے لیکن اس کا مفہوم قرآن و حدیث کی عام تعلیمی پالیسی سے بالکل متفق ہے یعنی "علم حاصل کرو، اگرچہ چین ہی میں کیوں نہ ہو، کیونکہ علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و عورت کا فریضہ ہے[4]"

ایک حدیث میں یہ دعا ماثور ہے کہ "اے خدا میں تجھ سے علم نافع اور رزق طیب اور عمل مقبول کی استدعا کرتا ہوں[5]" اور اسی پر یہ تبصرہ ختم کیا جاتا ہے۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ عِلْمًا نَافِعًا وَرِزْقًا طَیِّبًا وَعَمَلًا مُتَقَبَّلًا، آمین!

۱؎ قرآن مجید ۱۸/۶۵، قرآن مجید میں قصہ موسیٰ و خضر کا مقصد بھی طلب علم کی فضیلت اور علم انسانی کی قلت کو نمایاں کرنا ہے

۲؎ من یرد اللہ بہ خیراً یفقہہ فی الدین (بخاری ۳/۱۰، ۹۶/۱۴۰۱، ترمذی ۱/۳۹، مقدمہ ابن ماجہ صـ۱۷، مقدمہ دارمی صـ۲۳، ابن عبدالبر کی کتاب العلم صـ۱۶ تا صـ۱۷، حدیث خیر الناس العلماء والمتعلمون (مقدمہ دارمی صـ۲۵ و صـ۳۱ ابوداؤد ۲۴/۳۱)

۳؎ العلماء ورثۃ الانبیاء (بخاری ۳/۱۰، ترمذی ۳۹/۹، ابن عبدالبر کی کتاب العلم صـ۲۱)

۴؎ اطلبوا العلم ولو بالصین فان طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم ومسلمۃ (ابن عبد البر کی کتاب العلم، بیہقی کی شعب الایمان، ابن عدی کی الکامل اور سیوطی کی جمع الجوامع میں یہ حدیث ہے)

۵؎ حدیث نبوی بحوالہ کتاب العلم مولفہ ابن عبد البر کی صـ۹۴۔

عہدِ رسولؐ میں نظامِ تعلیم

سید رشید احمد ارشد

اسلام کے تعلیمی نظام کی اہمیت کا اندازہ لگانے سے پیشتر یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ دورِ جاہلیت میں ظہورِ اسلام سے پہلے عربوں کی حالت کیا تھی؟

ظہورِ اسلام سے پہلے عربوں کی تعلیمی زندگی کا سراغ لگانا بے سود ہے کیونکہ اس وقت اہلِ عرب ایک ناخواندہ قوم تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دوسری قوموں کے مقابلے میں اُمّی یعنی ناخواندہ کہلاتے تھے۔ اسلام سے پیشتر چند عربوں نے غیر قوموں کی مدد سے عربی رسم الخط ایجاد کیا تھا ورنہ اس سے پہلے عربی زبان کا کوئی رسم الخط نہیں تھا۔ یہودی اپنے عبرانی رسم الخط میں خط و کتابت کرتے تھے اور اسی طرح شام و عراق کے اپنے جداگانہ رسم الخط تھے۔ یمنی عربوں کا خطِ حمیری ان کے تمدن کے ساتھ ہی نیست و نابود ہو چکا تھا۔ اور وہاں کے رہنے والے بھی اس قدیم خط سے ناآشنا ہو گئے تھے۔ اسلام سے پیشتر عربوں کی کوئی مرکزی اور علمی زبان نہیں تھی بلکہ ہر قبیلے کی بولی ایک دوسرے سے مختلف تھی، ان کی بولیوں میں اس قدر اختلاف تھا کہ بعض اوقات ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کی بول چال کی زبان کو نہیں سمجھ سکتا تھا۔ بالخصوص یمن اور جنوبی عرب کی زبان، شمالی عرب اور قریش کی زبان سے بہت مختلف تھی۔

یمن کا تمدّن

حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے سینکڑوں برس پہلے سبا اور حمیری قبائل کے زمانے میں جنوبی عرب کا تمدن عالمِ شباب پر تھا۔ اس وقت یہاں کے بادشاہوں نے خطِ مسند کے نام سے ایک رسم الخط ایجاد کیا تھا جو خطِ حمیری کے نام سے بھی موسوم تھا۔ یہ خط صرف بادشاہوں اور امراء کی یادگاری جنگوں، رسموں اور مخصوص احکام کو کتبوں کی شکل میں لکھنے کے لیے مستعمل رہا۔ عوام میں غالباً اس کا رواج نہیں تھا، کیونکہ ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے جو کتبات یمن کے کھنڈروں سے برآمد کئے ہیں، انھیں صرف وہاں کے بادشاہوں اور امراء نے اپنے احکام جاری کرنے، یا اپنے جنگی معرکوں کا اعلان کرنے کے لیے خطِ حمیری میں استعمال کیا تھا، عوام کی لکھی ہوئی کوئی تحریر یا کتبہ دستیاب نہیں ہو سکا ہے اور نہ کوئی ادبی، علمی یا تعلیمی قسم کی تحریر برآمد ہوئی ہے۔ البتہ مستشرقین نے ان کتبات کی مدد سے قدیم حمیری زبان کے حروفِ ابجد اور اس کے الفاظ و قواعد معلوم کر لیے ہیں جو عربی لسانیات میں کارآمد ہو سکتے ہیں۔

مخصوص رسم الخط

ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ خطِ حمیری کے ذریعے یمن کے عوام کو تعلیم دینے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی تھی اور نہ قدیم زمانے میں عوام کو تعلیم دی جاتی تھی کیونکہ اس زمانے کے تمام مہذب ممالک میں بھی تعلیم محدود ہوا کرتی تھی اور امراء کا ایک مخصوص حلقہ ہی تعلیم یافتہ ہوتا تھا۔

اس کے علاوہ حمیری رسم الخط نہایت مشکل اور ناقابلِ فہم تھا۔ یہ صرف اینٹوں اور پتھروں میں کھود کر لکھنے کے لیے ہی کارآمد

ہو سکتا تھا۔ اس لئے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں بھی عربوں کا کوئی تعلیمی نظام نہیں تھا۔

دورِ جاہلیت

بہر حال اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ یمن کے قدیمی تہذیب و تمدن کے دور میں عربوں کا کوئی تعلیمی نظام تھا تو یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جب یہ مہذب سلطنتیں تباہ و برباد ہو گئیں اور یمن کے باشندے سیلاب آنے کے بعد عرب کے دور دراز علاقوں میں منتشر ہو گئے تو ان کے تمدن کے ساتھ ساتھ ان کا تعلیمی نظام بھی ختم ہو گیا ہو گا۔ کیونکہ اس کے بعد تمام جزیرہ عرب میں جہالت و وحشت کا تاریک دور شروع ہو گیا تھا اور اس سرزمین میں ناخواندگی اور جہالت کا وہ گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا کہ یہ دور "دورِ جاہلیت" کہلایا جانے لگا تا آنکہ اسلام نے آ کر ایمان اور علم کی روشنی سے جاہلیت کے اس اندھیرے کو دور کیا۔

مکہ معظمہ کی مرکزیت

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے تقریباً نصف صدی پیشتر مکہ معظمہ کو خانہ کعبہ کی وجہ سے ایک طرح کی مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ عرب کے تمام قبائل خانہ کعبہ کو مقدس اور متبرک خیال کرتے تھے اور اس تقدس کی وجہ سے اس کے قریب سالانہ میلے اور بازار لگنے شروع ہو گئے تھے۔ اس قسم کے مرکزی اجتماعوں میں مختلف قبائل کے شعرا بھی یہاں آنے لگے اور عکاظ کے مقام پر عرب شعراء کا اجتماع ہونے لگا اور وہ خاص و عام کو اپنے قصائد سنانے لگے۔

دورِ جاہلیت کے یہ شعراء مقبولیت حاصل کرنے کے لئے ایسی زبان میں اشعار سناتے تھے۔ جسے عرب کے سب لوگ سمجھ سکیں ایسی فصیح اور عام فہم زبان قریش کی زبان تھی کیونکہ قریش کا قبیلہ اپنے مذہبی تقدس کی وجہ سے عرب کے ہر مقام پر تجارت کر سکتا تھا اس طرح انہوں نے عرب قبائل کے تمام عمدہ الفاظ اپنی زبان میں رائج کر لئے تھے۔ یوں ان کی زبان تمام عربوں کی مرکزی زبان بن گئی تھی۔

تعلیم کا سنگ بنیاد

جب خداوند تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت عطا کی تو سب سے پہلی وحی اسی مرکزی زبان میں نازل ہوئی۔ سب سے پہلی آیات سورۂ اقرأ کی تھیں جن میں نوشت و خواند کی تلقین کی گئی تھی اور قلم کے ذریعے تعلیم حاصل کرنے کی فضیلت کا اعتراف کیا گیا تھا۔ چنانچہ اس پہلی وحی کو اسلامی نظام تعلیم کا سنگ بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے۔

تعلیم و تبلیغ

نبوت کے فوراً بعد آپ کو حکم دیا گیا کہ آپ پیغام خداوندی اپنے رشتہ داروں اور دیگر اہلِ مکہ تک پہنچا دیں اور انھیں قرآن کریم کی آیات و احکام سنائیں۔ چنانچہ آپ حکم الٰہی کی تعمیل میں سخت مخالفتوں کے باوجود مکہ معظمہ میں تبلیغ کرنے لگے۔ یہی تبلیغ، اسلامی تعلیم کا سنگ بنیاد بنی اور آپ کوچہ و بازار میں ہر جگہ تعلیم و تبلیغ کے فرائض انجام دینے لگے اور جو لوگ مسلمان ہو گئے تھے، وہ آپ کی تعلیمات سے زیادہ مستفید ہوئے۔

آپ انھیں نہ صرف اخلاقی اور مذہبی تعلیم دیتے تھے۔ بلکہ ان کی عملی تربیت بھی کرتے تھے اور انھیں علم کی فضیلت سے بھی آگاہ کرتے تھے۔ چنانچہ قرآن مجید اور احادیث نبوی میں علم کی فضیلت کے بارے میں جو کچھ ارشاد فرمایا گیا ہے — ان

کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

علم کی فضیلت قرآن کریم میں سورۂ بقرہ میں حضرت آدم کی تخلیق کا قصہ بیان کیا گیا ہے اور اس میں حضرت آدم کو خلافت الٰہی تفویض کرنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ پھر فرشتوں پر ان کی فضیلت کو محض علم و دانش کی وجہ سے ثابت کیا گیا ہے چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:۔

(ترجمہ) "اور خدا نے، حضرت آدم کو تمام چیزوں کے نام سکھائے۔ پھر ان چیزوں کو فرشتوں کے سامنے پیش فرما کر یہ کہا" اگر تم سچے ہو تو مجھے ان چیزوں کے نام بتاؤ" فرشتوں نے عرض کیا "تیری ذات پاک ہے ہم تو اس کے سوا کچھ نہیں جانتے ہیں جو تو نے ہمیں سکھایا ہے۔ بلاشبہ تو ہی علم و حکمت والا ہے"
خدا نے آدم سے فرمایا" (اب) تم ان کو ان چیزوں کے نام بتاؤ" چنانچہ حضرت آدم نے فرشتوں کو ان چیزوں کے نام بتا دیئے تو خدا نے فرشتوں سے کہا" کیا میں نے تم سے یہ کہا نہیں تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی تمام پوشیدہ چیزوں کو جانتا ہوں اور ان باتوں کو بھی جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو۔ اور انھیں بھی، جن کو تم پوشیدہ رکھتے ہو۔"

دوسرے مقامات پر اہل علم کی برتری کو یوں واضح کیا گیا ہے:۔

۱۔ قل هل يستوی الذين يعلمون والذين لا يعلمون (الزمر۔ ۹)
(اے پیغمبر) کہہ دیجیے کہ کیا اہل علم اور جاہل افراد برابر ہو سکتے ہیں۔

۲۔ يرفع الله الذين امنوا منكم والذين اوتوا العلم درجات (مجادلہ۔ ۱۱)
اللہ تعالیٰ تم میں سے ایمان والوں کے اور ان لوگوں کے جن کو علم عطا ہوا ہے، درجات بلند کرے گا۔

دینی عالموں کی اہمیت اور ضرورت کو ان آیات کریمہ میں واضح کیا گیا ہے:۔

۳۔ فلولا نفر من كل فرقة منهم طائفة ليتفقهوا فی الدين ولينذروا قومهم اذا رجعوا اليهم لعلهم يحذرون ○ (توبہ۔ ۱۲۲)
ان کی ہر بڑی جماعت میں سے ایک چھوٹی جماعت جایا کرے۔ تاکہ وہ دین کی تعلیم حاصل کرتے رہیں اور جب وہ (تعلیم حاصل کر کے) واپس آئیں تو اپنی قوم کو تعلیم دے کر خدا کے عذاب سے ڈرائیں تاکہ وہ آگاہ ہو جائیں اور بُری باتوں سے) پرہیز کریں۔

۴۔ فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون (سورۂ نحل۔ ۴۳)
اگر تم کو علم نہ ہو تو اہل علم سے پوچھ لیا کرو۔

۵۔ انما يخشى الله من عباده العلمؤا ($\frac{۳۵}{۲۸}$)
بلا شبہ اللہ سے اس کے بندوں میں سے علماء ہی ڈرتے ہیں
آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے علم کے اضافہ کے لئے اس دعا کی تلقین کی گئی ہے۔

۶۔ وَقُل رَّبِّ زِدنی علما ۵ اور (اے پیغمبر کہہ دیجئے" اے پروردگار! تو میرے علم میں اضافہ کر"

احادیثِ نبویؐ مذکورہ بالا چند آیات میں علم اور اہلِ علم کی فضیلت بیان کی گئی ہے ان کے علاوہ احادیث نبوی میں بھی علم کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ جن میں مسلمانوں کو تحصیل علم کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ ہم چند احادیث کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔

۱۔ علم حاصل کرنا ہر مسلمان کا فریضہ ہے (حوالہ) معجم طبرانی کبیر و اوسط د صغیر عن ابی سعید و ابن عباس والحسن بن علیؓ)

۲۔ زمین پر عالم کی مثال ایسی ہے جیسے آسمان پر ستاروں کی ہے جو بحر و بر کی تاریکیوں کو روشن کرتے ہیں۔ اگر ستارے ماند پڑ جائیں تو رہنما بھی بھٹکتے پھریں (مسند احمد)

۳۔ اللہ تعالیٰ جس کسی کے ساتھ بھلائی کرنا چاہتا ہے تو اسے دین کا علم حاصل کرنے کی توفیق عطا فرماتا ہے۔ (صحیح بخاری مسلم و ترمذی عن ابن عباس و معاویہ)

۴۔ جو شخص صبح سویرے علم حاصل کرنے یا علم کی تعلیم دینے کے لئے گھر سے نکلے تو اسے ایک مکمل حج کا ثواب ملتا ہے (طبرانی کبیر عن ابی امامہ)

۵۔ جو شخص طلب علم کے لئے اپنے گھر سے نکلے تو جب تک وہ واپس نہ آجائے تو اس وقت تک اس کا مرتبہ مجاہد اور نمازی کے برابر ہوتا ہے (ترمذی عن ابن عباس)

۶۔ علم و حکمت مومن کی گم شدہ (دولت) ہے۔ جہاں سے مل جائے اسے حاصل کرنا چاہیے کیونکہ مومن اس کا زیادہ حقدار ہے (ترمذی عن ابی ھریرہ)

۷۔ عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسے تم میں سے ایک ادنیٰ مسلمان پر میری فضیلت ہو۔ جو شخص لوگوں کو اچھی تعلیم دیتا ہے اس پر اللہ، اس کے فرشتے اور آسمانوں اور زمین کی ساری مخلوق، یہاں تک کہ چیونٹیاں اپنے بلوں میں اور مچھلیاں سمندر میں، دعائے خیر و برکت و رحمت کرتی ہیں۔

۸۔ العلماء ورثۃ الانبیاء علمأ پیغمبروں کے وارث ہوتے ہیں۔

۹۔ تم مہد سے لحد تک علم حاصل کرتے رہو خواہ اس کے لئے چین جانا پڑے۔

معلّمِ مدینہ مکہ معظمہ کی زندگی میں بھی آپ نے تعلیم و تبلیغ میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور اس سلسلے میں آپ نے گوناگوں تکالیف و مصائب کو بھی برداشت کیا مگر اصل اسلامی نظام تعلیم کا آغاز مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرنے کے بعد ہوتا ہے۔ تاہم ہجرت سے پہلے جب مدینہ منورہ کے چالیس[40] افراد مسلمان ہو گئے تو اہل مدینہ نے درخواست کی کہ انھیں قرآن کریم کی تعلیم دینے کے لئے کوئی معلم بھیجا جائے۔ لہٰذا آپ نے حضرت مصعب بن عُمیر کو مدینہ منورہ بھیجا۔ وہ پہلے مسلمان تھے جو مکہ معظمہ سے باہر ایک اسلامی معلم کی حیثیت سے بھیجے گئے۔ ان کی تعلیمی مساعی کی بدولت تھیدا دس

کے سردار حضرت سعد بن معاذ مسلمان ہو گئے اور اسلام مدینہ کے گھر گھر پھیل گیا۔

عام اور لازمی تعلیم جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے اور یہاں آکر آپ نے خود مختار اسلامی مملکت قائم کی تو اس کے ساتھ ساتھ آپ نے تعلیم کا اسلامی نظام بھی قائم کیا۔

اس نظام تعلیم میں سب سے مقدم اور اہم قرآن کریم کی تعلیم تھی جو مدینہ کے ہر مرد و زن کے لئے لازمی تعلیم تھی۔ بچے بوڑھے سب قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرتے تھے اس تعلیمی نظام کی نگرانی آپ بذات خود فرماتے تھے اور قرآن کریم کے احکام کی وضاحت کے سلسلے میں جس کسی کو کوئی دقت پیش آتی تھی تو وہ براہ راست آپ کے پاس آکر اپنی مشکلات کو دور کرتا تھا۔

اقامتی جامعہ آپ نے اس نظام تعلیم کا آغاز اس طرح کیا کہ مسجد نبوی کے ایک حصہ میں سائبان اور چبوترہ (صفہ) بنوایا یہ مسلمانوں کی پہلی اقامتی جامعہ تھی کیونکہ غریب اور لاوارث صحابہ یہاں قیام بھی کرتے تھے۔ یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی درس دیتے تھے اور دیگر اساتذہ بھی مقرر کئے گئے تھے۔ چنانچہ عبداللہ بن سعید بن العاص جو نہایت خوشخط تھے اور زمانہ جاہلیت میں بھی کاتب کی حیثیت سے مشہور تھے، انھیں وہاں لکھنا سکھاتے تھے اسی طرح سنن ابی داؤد میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی یہ روایت بھی موجود ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اس کام پر مامور کیا کہ وہ اصحاب صفہ کو لکھنا سکھائیں اور قرآن کریم کی تعلیم دیں۔

اصحاب صفہ اصحاب صفہ میں وہ صحابی شامل تھے جن کا کوئی گھر بار نہیں تھا اور اپنی تنگدستی کی وجہ سے وہ مہاجرین و انصار کی طرح تجارت و زراعت میں مشغول نہیں ہو سکتے تھے۔ لہٰذا وہ روز و شب اسی سائبان کے نیچے چبوترہ پر اپنی زندگی گذار دیتے تھے۔ یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہر وقت رہنے کی وجہ سے آپ کی تعلیمات سے زیادہ مستفید ہوئے اور دیگر اساتذہ سے بھی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اسی طرح آگے چل کر یہ مسلمانوں کے معلم بنے اور انہوں نے قرآن و حدیث کی تعلیمات کو تمام دنیا میں پھیلایا۔ انہی میں حضرت ابوہریرہ بھی تھے جو احادیث نبوی کے سب سے بڑے راوی اور عالم بنے اور انہوں نے تنگدستی اور فاقہ کشی کے باوجود سب سے زیادہ احادیث نبوی کا علم حاصل کیا اور آپ کی وفات کے بعد ہزاروں انسانوں کو احادیث نبوی کی تعلیم دی چنانچہ ان کا یہ فیض تاقیامت جاری رہے گا۔

طلبہ کی تعداد صفہ کی درسگاہ میں تعلیم حاصل کرنے والوں کی کثیر تعداد کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بعض کتب میں اہل صفہ کے طلبہ کی تعداد چار سو بیان کی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اصحاب صفہ کے علاوہ، جو وہاں مقیم اور شب باش ہوتے تھے۔ ایسے افراد بھی وہاں تعلیم حاصل کرنے کے لئے آتے تھے۔ جن کے گھر مدینہ میں تھے یا وہ گرد و نواح میں رہتے تھے۔ اہل مدینہ وہاں صرف درس کے موقع پر شریک ہوتے تھے اور گرد و نواح کے حضرات کی کافی تعداد بھی "وقتاً فوقتاً" درس میں شریک ہوتی تھی۔

اصحاب صفہ یعنی مقیم طلبہ کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ بعض اوقات مقیم و شب باش طلبہ ستر اسّی تک ہو جاتے تھے۔

نصابِ تعلیم

اس اقامتی درسگاہ میں لکھنے پڑھنے کے علاوہ اسلامی احکام (فقہ) کی تعلیم بھی دی جاتی تھی، قرآن مجید کی سورتیں زبانی یاد کرائی جاتی تھیں فنِ قرأت و تجوید بھی سکھایا جاتا تھا۔ ان کی تعلیمی نگرانی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاص طور پر فرماتے تھے اور یہاں کے مقیم طلبہ کی غذا مہیا کرنے اور قیام کرنے کا بندوبست بھی آپ فرماتے تھے۔

تعلیمِ بالغاں

اصحاب صفہ کے علاوہ کاروباری صحابۂ کرام کی بڑی تعداد بھی فرصت کے اوقات میں تعلیم حاصل کرتی تھی۔ مدینہ کے باشندے مہاجرین و انصار پر مشتمل تھے۔ وہ مسلمان جو مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئے اور مہاجرین کہلاتے تھے، اہل مدینہ کے تعاون اور اسلامی اخوت کی بدولت بہت جلد اپنے پاؤں پہ کھڑے ہو گئے اور چونکہ انھیں مکہ معظمہ میں رہنے کی وجہ سے تجارتی کاروبار کا تجربہ تھا۔ اس لئے مہاجرین تجارت کرنے لگے۔ تاہم وہ اسلام کے بنیادی مقاصد کو نہیں بھولے بلکہ اپنی فرصت کے اوقات میں مسجد نبوی میں باجماعت نماز ادا کرتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر اساتذہ کی تعلیمات سے مستفید ہوتے تھے۔

انصار مدینہ کے قدیمی باشندے تھے اور پہلے سے کاشت کاری کے فرائض انجام دیتے تھے اس لئے وہ زراعت کے کام میں لگے رہے۔ تاہم وہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں روزانہ حاضر ہوتے تھے اور آپ سے روزمرہ کے اسلامی احکام سیکھتے تھے اور قرآن کریم کی تعلیم، دیگر اکابر صحابہ سے حاصل کرتے تھے۔

چونکہ مہاجرین کی کثیر تعداد مدینہ منورہ میں آ کر آباد ہو گئی تھی اس لئے مدینہ شہر سے باہر مضافات میں مہاجرین و انصار آباد ہونے لگے تھے۔ اس طرح ان کے لئے روزانہ مدینہ منورہ آنا اور مسجد نبوی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے مستفید ہونا مشکل تھا۔ اس لئے وہ ایک دن چھوڑ کر دوسرے دن آتے تھے اور انہوں نے تعلیم حاصل کرنے کے لئے باری مقرر کر رکھی تھی۔ ایک دن ایک ساتھی آتا تھا اور وہ جو تعلیم حاصل کرتا تھا، اس سے اپنے دوسرے ساتھی کو باخبر کر دیتا تھا۔ یوں تعاون سے ہر ایک کو اپنے ساتھی کے ذریعے روزمرہ کی تعلیمات اور اسلامی احکام سے آگاہی حاصل ہو جاتی تھی۔

ایسے صحابہ میں حضرت عمر فاروق بھی تھے وہ بھی شہر سے باہر رہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے ایک انصار پڑوسی سے یہ معاملہ طے کر رکھا تھا کہ ایک دن وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا کرے اور دوسرے دن وہ خود آنحضرت کی خدمت میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے جایا کریں گے۔ یوں وہ ایک دوسرے کو روزمرہ کی تعلیمات سے آگاہ کرتے رہے۔

مدینہ پہنچ کر آپ اکثر اپنے کئی تربیت یافتہ صحابہ کو نومسلم قبائل و فود کے ساتھ روانہ کرتے تھے تاکہ وہ ان کے اپنے علاقوں میں جا کر انھیں اسلامی تعلیم دیں۔ کچھ عرصہ تعلیم دینے کے بعد وہ واپس آجاتے تھے۔

قرّا کی شہادت

اسی قسم کا ایک الم ناک واقعہ مدنی دور کے ابتدائی زمانے میں رونما ہوا جبکہ نجد کے بعض قبائل نے درخواست کی کہ انہیں قرآن کریم کی تعلیم دینے کے لئے عمدہ معلمین کو روانہ کیا جائے۔ لہٰذا آپ نے ان کی درخواست پر ستر قرّاء (قرآنی تعلیم کے معلمین) بھیجے مگر کفار نے بئر معونہ کے قریب انہیں دھوکے سے شہید کر دیا۔ یہ ایک ایسا المناک واقعہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عمر بھر اس کا قلق رہا کیونکہ اس قدر لائق اور قابل مسلمان کسی بڑی سے بڑی جنگ میں بھی شہید

نہیں ہوئے ۔ ان کی شہادت اسلام کے لیے ایک بہت بڑا صدمہ تھا ۔ جسے اسلامی تعلیم و تبلیغ کے سلسلے میں مسلمانوں کو برداشت کرنا پڑا ۔

جنگی قیدیوں کی تعلیمی خدمت

مدینہ منورہ پہنچ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم و تبلیغ کی سرگرمیوں میں اضافہ کر دیا تھا تاہم مسلمانوں میں عربی لکھنے والوں کی تعداد بہت کم تھی ۔ اس زمانہ میں عربی رسم الخط اپنی ابتدائی حالت میں تھا جس کا سیکھنا بہت مشکل تھا ۔ اس لیے جب جنگ بدر کی فتح کے بعد قریش کے ستر (۷۰) سرکردہ افراد گرفتار ہو کر آئے تو معلوم ہوا کہ ان میں سے چند قیدی ایسے بھی تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے لہٰذا آپ نے اس موقع کو غنیمت جانا اور ان کے لیے یہ شرط مقرر کی کہ اگر ان میں ہر ایک قیدی مدینہ منورہ کے دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے گا تو انھیں رہا کر دیا جائے گا اور مالی تاوان کے بجائے ان کی یہ تعلیمی خدمت ان کی رہائی کا سبب بن جائے گی ۔

چنانچہ حضرت زید بن ثابت بھی ان انصار کے لڑکوں میں شامل تھے ۔ جنھوں نے ان قیدیوں سے لکھنا پڑھنا سیکھا اور آگے چل کر یہی حضرت زید بن ثابت آپ کے بہت بڑے کاتب وحی اور جامع قرآن ثابت ہوئے ۔

غیر زبانوں کی تعلیم

عہد رسالت میں عام تعلیم قرآن کریم ، احادیث نبوی اور نوشت و خواند کی تعلیم تک محدود تھی تاہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مدینہ منورہ کی اسلامی ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے غیر زبانوں میں بھی خطوط آتے تھے جنھیں غیر مسلموں اور بالخصوص یہودیوں کی مدد سے پڑھوایا جاتا تھا ان خطوط میں بعض معاملات پوشیدہ ہوتے تھے ۔ اس لیے آپ نے یہ ضرورت محسوس کی کہ کوئی قابلِ اعتماد صحابی ان غیر زبانوں کی تعلیم حاصل کرے ۔ چنانچہ حضرت زید بن ثابت خود بیان فرماتے ہیں ۔

" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ۔" میرے پاس مختلف خطوط آتے رہتے ہیں اور میں یہ بات پسند نہیں کرتا ہوں کہ ان خطوط کو ہر کوئی پڑھے ۔ تو کیا تم عبرانی زبان کا لکھنا پڑھنا سیکھ سکتے ہو ۔ یا یوں فرمایا کہ کیا تم سریانی کا لکھنا پڑھنا سیکھ سکتے ہو؟" میں نے عرض کیا: " ہاں " (سیکھ سکتا ہوں) چنانچہ میں نے سترہ دن میں وہ زبان سیکھ لی ۔"

ماہرِ السنہ

مؤرخین نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے صرف عبرانی اور سریانی زبانیں ہی نہیں سیکھی تھیں بلکہ انھیں غیر زبانوں کو جلد سیکھنے میں بہت بڑا ملکہ حاصل تھا ۔ وہ فارسی ، رومی ، قبطی اور حبشی زبانیں بھی جانتے تھے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ان زبانوں کی ترجمانی کے فرائض بھی انجام دیتے تھے ۔ انہوں نے یہ زبانیں ان آزاد کردہ غلاموں سے سیکھی تھیں جو ایسی قوموں سے متعلق تھے اور مدینہ منورہ میں رہتے تھے ۔

حضرت زید بن ثابت مختلف زبانیں جاننے کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر زبان کی تمام خط و کتابت کے فرائض انجام دیتے تھے اور آپ کے کاتب وحی بھی تھے ان یہودیوں سے خط و کتابت بھی وہی کرتے تھے جو مدینہ اور اس کے گردونواح میں آباد تھے ۔

حضرت عبداللہ بن زبیر کے بارے میں بھی یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ بھی بہت سی زبانیں جانتے تھے اور اپنے غیر ملکی غلاموں

سے انہی کی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔

مخصوص اساتذہ احادیث کی بعض روایات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ تعلیم میں توسیع ہونے کے بعد تعلیم کے کسی خاص شعبہ میں مزید مہارت پیدا کرنے کے لئے مخصوص اساتذہ بھی مقرر کر دیئے گئے تھے۔ چنانچہ فن قراءت میں مہارت کے لئے آپ طلبہ کو حضرت ابی بن کعب کے پاس بھیجا کرتے تھے اور اس میراث کے اسلامی احکام کی تفصیل معلوم کرنے کے لئے آپ حضرت زید بن ثابت کے ہاں طلبہ بھیجا کرتے تھے۔

فنونِ سپہ گری چونکہ مدینہ منورہ میں اپنے دفاع کے لئے مسلمانوں کو مختلف جنگوں میں شریک ہونا پڑتا تھا۔ اس لئے آپ نے تعلیمی نظام میں فنون سپہ گری کو خاص اہمیت دے رکھی تھی آپ نے ہدایت دے رکھی تھی کہ بچوں کو ابتدا ہی سے نشانہ بازی، تیراندازی اور پیراکی کی تعلیم دی جائے۔ بڑوں کے لئے بھی آپ گھڑ دوڑ کے مقابلے کراتے تھے اور جنگی مشقیں بھی کراتے تھے۔

خواتین کی تعلیم قرآنِ کریم اور احادیثِ نبوی میں علم دین کی تعلیم کو خواتین کے لئے بھی اسی قدر ضروری قرار دیا گیا ہے۔ جس قدر وہ مردوں کے لئے ضروری ہے یہاں تک کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لونڈیوں کو تعلیم دینے کی ہدایت بھی فرمائی ہے اور اسے باعث ثواب قرار دیا ہے اور ارشاد فرمایا ہے کہ جو کوئی اپنی لونڈی کو عمدہ تعلیم و تربیت دے کر نکاح کرے گا تو اسے دوگنا ثواب ملے گا۔

چونکہ مسجدِ نبوی مسلمانوں کے لئے سب سے بڑی تعلیمی درسگاہ تھی جہاں آپ صحابہ کرام کو ہر وقت تعلیم دیتے تھے۔ اس لئے ابتداً میں خواتین وہاں نہیں جاتی تھیں اور ان کے مرد بھی انھیں مسجدِ نبوی جانے سے روکتے تھے اس لئے آپ نے انھیں حکم دیا:۔

"تم اللہ کی بندیوں (عورتوں) کو اللہ کی مساجد میں جانے سے نہ روکو۔"

اس حکم کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم خواتین بھی کثیر تعداد میں آپ کی مجالس وعظ و تعلیم میں حاضر ہونے لگیں اور آپ کی تعلیمات سے مستفید ہونے لگیں۔ تاہم بعض زنانہ مسائل ایسے تھے جنھیں وہ براہ راست آپ سے نہیں معلوم کر سکتی تھیں۔ اس لئے ان معاملات میں وہ امہات المومنین یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور دیگر ازواج مطہرات کے ذریعے مستفید ہوتی تھیں۔ یوں ان ازواجِ مطہرات کے ذریعے وہ خواتین کے مخصوص مذہبی مسائل سے مسلم خواتین آگاہی حاصل کرتی رہیں۔

ان تمام سہولتوں کے باوجود مسلم خواتین نے یہ محسوس کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہفتہ میں ایک دن صرف خواتین کے لئے مخصوص کرا لینا چاہیئے چنانچہ ان کی درخواست پر آپ نے ہفتہ میں ایک دن صرف خواتین کی تعلیم کے لئے مخصوص کر دیا تھا، اس دن آپ ان کے سوالات کے جوابات دیتے اور ملکی حالات کے مطابق انھیں وعظ و نصیحت فرماتے تھے۔ ان اجتماعات سے بہت مفید نتائج برآمد ہوئے اور جنگی ضروریات کے لئے خواتین نے دل کھول کر مالی امداد کی۔

آپ نے خواتین کو مشغول رکھنے کے لئے مشورہ دیا کہ وہ چرخہ کاتا کریں اور گھریلو صنعتوں میں دلچسپی لیں۔

خواتین کو تعلیم دینے میں آپ کی ازواج مطہرات بھی آپ کی شریک رہیں کیونکہ آپ نے انھیں حکم دیا تھا کہ وہ نہ صرف خود تعلیم حاصل کریں بلکہ دیگر مسلم خواتین کو بھی تعلیم دیں کیونکہ علم چھپانے کو آپ نے مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے جرم قرار دیا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خواتین کی تعلیم کا آغاز گھر سے کیا تھا۔ چنانچہ آپ کی تعلیم کی بدولت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حدیث، فقہ، تفسیر اور شعر و ادب میں بہت بڑی عالمہ ہو گئی تھیں اور انہوں نے آپ کی وفات کے بعد بھی اسی تعلیمی فیض کو جاری رکھا یہی حال دیگر ازواج مطہرات کا تھا کہ اگر ازواج مطہرات میں سے کوئی نوشت و خواند سے ناواقف ہوتی تھیں تو آپ دیگر خواتین کو ان کی تعلیم پر مامور کرتے تھے۔ چنانچہ احادیث میں یہ مذکور ہے کہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے، جو حضرت عمر فاروق کی صاحبزادی تھیں۔ آپ کے علم و اجازت سے اپنی ایک رشتہ دار خاتون شفا بنت عبداللہ سے جو خوب لکھی پڑھی تھیں، لکھنا سیکھا تھا۔

طریقہ تعلیم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے دیگر معلمین کا طریقہ تعلیم نفسیاتی نقطہ نگاہ سے نہایت عمدہ اور مؤثر تھا۔ آپ نہایت آسان اور دل نشین انداز میں لوگوں کو تعلیم دیتے تھے۔ جو باتیں ضروری اور اہم ہوتی تھیں انھیں آپ تین دفعہ دہراتے تھے تاکہ ایک کند ذہن انسان بھی انھیں اچھی طرح سمجھ سکے آپ ہر شخص کو اس کی صلاحیت اور عقل و مزاج کے مطابق تعلیم دیتے تھے۔ بلکہ آپ معلموں کو بار بار یہ ہدایت فرماتے تھے۔

"تم لوگوں سے ان کی عقل (ذہنیت) کے مطابق گفتگو کیا کرو۔"

اسی اصول کے مطابق آپ نہایت آسان زبان میں مختصر گفتگو فرماتے تھے اور غیر متعلقہ باتوں کو درمیان میں نہیں لاتے تھے۔ البتہ سمجھانے کے لئے اگر تمثیلات کی ضرورت ہوتی تھی تو ان سے بھی کام لیتے تھے اور جو باتیں اہم اور ضروری ہوتی تھیں ان کو بار بار دہراتے تھے۔

آپ کی محفل میں اکثر جاہل اور عرب بدو آیا کرتے تھے اور وہ اکثر آداب محفل کا لحاظ کئے بغیر، ناشائستہ طور پر گفتگو کرتے تھے اور بے ڈھنگے سوالات کرتے تھے۔ مگر آپ ان کے سوالات کو نہایت صبر و تحمل اور ٹھنڈے دل سے سنتے تھے۔ اور ان کے مزاج اور ذہنیت کے مطابق تسلی بخش جواب دیتے تھے جس سے وہ مطمئن ہو جاتے تھے

انقلابی نتائج آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نظامِ تعلیم کے انقلابی نتائج آپ کے عہد مبارک ہی میں برآمد ہونے شروع ہو گئے تھے۔ اس کے ذریعے نہ صرف مسلمانوں کی خواندگی کا معیار بڑھا بلکہ انہوں نے تہذیب و مدنیت کے وہ تمام اچھے اصول سیکھے جو بالعموم موجودہ درس گاہوں میں سکھائے جاتے ہیں۔ تاہم اس کے باوجود ایسے عمدہ نتائج حاصل نہیں ہوتے ہیں۔

مسلمان اس تعلیم کے ذریعے نہ صرف مذہبی اور اخلاقی حیثیت سے اعلیٰ کردار کے مالک بنے، بلکہ ان کی ادبیت اور قابلیت میں بھی اضافہ ہوا۔

عہدِ نبویؐ اور عہدِ صحابہؓ کی تعلیمی سرگرمیاں

مولانا خلیل حامدی

درس گاہ کی تاسیس

غزوہ بدر کبریٰ حق و باطل کے درمیان ایک فیصلہ کن واقعہ ثابت ہوا۔ اس غزوہ میں علمبرداران حق کو اللہ تعالیٰ نے عظیم الشان کامیابی عطا کی۔ لشکر اسلام اور اس کا جلیل القدر قائد صلی اللہ علیہ وسلم بندگان طاغوت اور صنادید قریش پر بہت بڑی نصرت سے سرفراز ہوئے۔ قریش کے کچھ لوگ تو میدان جنگ میں مارے گئے اور کچھ گرفتار ہوئے۔ گرفتار شدگان میں سے جن کے ورثاء ذی حیثیت تھے، وہ ایک معاہدے کے تحت مسلمانوں کو مقررہ مالی فدیہ ادا کرنے کے بعد رہا کروا کر مکہ لے گئے اور جو نادار تھے، وہ مایوس ہو کر اپنے مستقبل کے بارے میں طرح طرح کے خیالات قائم کرنے لگے۔

ان نازک حالات میں عام مسلمان تو بڑے بڑے مسائل میں اپنی فکری قوتیں صرف کر رہے تھے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، جو بلاشبہ مسلمانوں کے تمام اہل معاملات میں پورے انہماک و اعتناء سے کام لیتے تھے، حالات کے تقاضے کے علی الرغم ایک ایسے منصوبے کے بارے میں سوچ بچار کر رہے تھے، جس سے بڑے سے بڑا مفکر بھی اس نوعیت کے حالات میں غفلت کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ منصوبہ اہلِ مدینہ کے بچوں کے بہتر مستقبل کا تھا، جو ابتدائی تعلیم سے یکسر محروم تھے۔ چنانچہ آپ نے ایک طرف یہ دیکھا کہ اہلِ مدینہ کے بچے گلیوں میں کھیل کود کر اپنا وقت گزار رہے ہیں اور دوسری طرف اسیرانِ بدر آپ کی نگاہ کے سامنے تھے جو تہی دست ہونے کی وجہ سے رہائی کی کوئی سبیل نہ پا رہے تھے۔ چنانچہ آپ نے ہر پڑھے لکھے قیدی پر لازم کر دیا کہ وہ کم از کم انصار کے دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھائے اور اگر وہ اپنی مہم میں کامیاب ہو گیا، تو اسے رہائی مل جائے گی۔ آپ کے اس فیصلے نے اسلام کی تاریخ میں نوشت و خواند کی پہلی درسگاہ کی داغ بیل ڈال دی۔

سزا دینے کا نظریہ

شاگردوں کی لغزشوں پر یا اسباق سے عدم توجہی پر یا ادائے فرض اور حفظِ آموختہ میں تاخیر و تساہل دکھانے پر اُستاد کا شاگردوں کو زدوکوب کرنا قریب قریب قدیم طریقہ تعلیم میں امر لازم شمار کیا جاتا تھا۔ طلباء کے نظم و نسق کو درست رکھنے کے لیے اس کے بغیر کوئی چارہ نہ سمجھا جاتا تھا، بلکہ اکثر معلمین کے نزدیک تو سزا کا طریقہ اسباق کی تفہیم میں بھی مددگار ہوتا تھا۔ سزا دینے کے نظریہ کے بارے میں آج کل ماہرین تعلیم میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض اس کے حامی ہیں اور بعض سخت مخالف۔ یہ اختلاف ماضی قریب میں پیدا ہوا ہے اور اس کی بنیاد جدید تجرباتی اصول تعلیم، بچوں کی نفسیات کا مطالعہ اور ان کے طبعی رجحانات کی تحقیق پر قائم ہوئی۔

لیکن پہلی اسلامی درسگاہ کے بارے میں تاریخ کچھ معلومات ہمیں فراہم کرتی ہے۔ ان سے واضح ہوتا ہے کہ اس مدرسہ میں بچوں کو زدوکوب کرنے کا طریقہ ناپسندیدگی سے دیکھا گیا ہے اور اس طریقے کے استعمال پر بچوں کے سرپرستوں نے معلمین پر سخت تنقید کی ہے۔ مقریزی کا بیان ہے کہ مذکورہ اسلامی درسگاہ کا ایک کمسن طالب علم جوان قیدیوں کے پاس زیر تعلیم تھا، اپنے مدرسہ سے روتا ہوا گھر واپس چلا گیا۔ باپ نے پوچھا "کیوں کیا ہوا؟" لڑکے نے جواب دیا "میرے معلم نے مجھے مارا ہے۔" باپ نے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ یہ معلم (قیدی) نیچے سے بدر کا انتقام لے رہا ہے۔" اس

کے بعد باپ نے بطور احتجاج اپنے بچے کو قیدی معلم کے پاس جانے سے روک دیا۔ یہ اگرچہ نہایت معمولی سا واقعہ ہے، لیکن جو شخص اس کا گہرا مطالعہ کرے گا، اسے معلوم ہو گا کہ جدید طریقہ تعلیم کا یہ اصول کہ تدریس کے لیے ڈنڈے کا استعمال مستحسن نہیں ہے، اسلام کے ابتدائی دور میں پایا جاتا تھا۔ جدید نظریہ تعلیم اس اصول کو اپنے عہد کے قابل فخر اصولوں میں ایک مضروب طالب علم کے سرپرست نے زود کوب پر جو احتجاج کیا ہے۔ وہ اس نظریہ کی قدامت اور اسلامی مزاج سے اس کی ہم آہنگی کا واضح ثبوت فراہم کرتا ہے۔

درس گاہ کے ایک نامور طالب علم مقریزی نے اپنی کتاب امتاع الاسماع میں اسیران بدر کے حالات میں لکھا ہے کہ ان کے پاس انصار کے جو بچے پڑھتے تھے، ان میں سے ایک زید بن ثابت بھی تھے، جو کتابت سیکھا کرتے تھے۔ چنانچہ وہ اس قدر خوش خط ہو گئے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کاتبان وحی میں شامل کر لیا تھا۔

غیر ملکی زبان کی تعلیم نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن ثابت کے اندر جب علم کے حصول اور کتابت کے فن میں غیر معمولی مہارت و قابلیت کے جوہر دیکھے تو آپ نے ان کو ۴ھ میں فرمایا "میرے پاس ایسے لوگوں کے خطوط آتے ہیں کہ میں پسند نہیں کرتا کہ کوئی دوسرا انہیں پڑھے" دوسری روایت میں ہے "میں خطوط کے پڑھوانے کے معاملہ میں یہودیوں پر اطمینان نہیں رکھتا" تیسری روایت میں ہے" میں لوگوں کی طرف مکاتیب بھیجتا ہوں (جن میں معاہدات کے مکاتیب بھی ہوتے ہیں) اور مجھے اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں وہ میرے الفاظ میں کمی بیشی نہ کر لیں" اس بنا پر آپ نے حضرت زید کو عبرانی زبان یا سریانی زبان پڑھنے کا مشورہ دیا۔ زید نے سر اطاعت جھکا یا۔ سیکھنے کے لیے کمر باندھ لی اور سترہ دن کے اندر حضرت زید نے یہ زبان سیکھ لی (مورخین کے الفاظ میں فتعلمها فی سبعة عشر یوماً، ادنوں میں اس زبان کو حاصل کر لیا)

غیر ملکی زبان کی تعلیم کو ہمارے دینی حلقوں میں مستحسن خیال نہیں کیا جاتا اور اسے امکانی حد تک پرہیز کی دعوت دی جاتی ہے مگر مذکورہ بالا واقعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیر ملکی زبان کا حصول اس شخص کیلئے مستحسن اقدام ہے، جو دشمنان اسلام کے حملوں سے اسلام کی مدافعت کرنا چاہتا ہو بلکہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ دعوت اسلامی کی اشاعت کی توفیق دے اور وہ ایسے ماحول میں کام کر رہا ہو جس کی زبان سے ناآشنا ہو تو اس کے لیے وہاں کی زبان سیکھنا کار ثواب ہے۔ ایک شخص عالم دین اور قاضی شرع ہو تو بھی اجنبی زبان سیکھ سکتا ہے۔ از روئے شریعت اس کوئی قدغن نہیں ہے حضرت زید بن ثابت نے عبرانی یا سریانی زبان کی تحصیل کی تھی یہ اعدائے اسلام کی زبان تھی۔ لیکن اس کے باوجود آپ فقہائے صحابہ میں شمار ہوتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے بارے میں فرمایا تھا۔ افرضکم زید (مسائل وراثت کو سب سے بہتر جاننے والے زید ہیں) حضرت ابو بکر صدیق نے اپنے عہد میں ان کو جمع قرآن کی مہم پر لگایا تھا ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عباس حضرت زید کو پیادہ پا رخصت کرنے کے لیے نکلے تو حضرت زید نے ان سے کہا۔ اے رسول خدا کے عم زاد! آپ یہ تکلیف نہ فرمایئں" حضرت عبداللہ بن عباس نے جواب دیا۔ اہل علم اور اہل شرف کی ایسے ہی عزت کرنے کا حکم ہے۔ ابن سعد نے طبقات میں زہری سے روایت کی ہے کہ حضرت زید حضرت عمر اور حضرت عثمان اور حضرت علی رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عہد میں مدینہ میں قضاء، افتاء، قرأت اور فرائض کے مسائل میں معتمد علیہ رہے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے ۴۵ھ میں حضرت زید کی وفات پر فرمایا تھا "علم یوں اٹھتا ہے" ابن عمر نے اس موقع پر کہا تھا "خلافت عمر میں یہ ملک بھر میں واحد عالم تھے" حضرت حسان نے اپنے مرثیہ میں کہا تھا۔

فمن للقوافی بعد حسان وابنه؟

ومن للمعانی بعد زید بن ثابت؟

(حسان اور پسر حسان کے بعد قافیوں کا شہسوار کون ہوگا اور زید بن ثابت کے بعد معانی کا بادشاہ کون ہوگا)۔

مسجد ہی مدرسہ تھی

مدینہ منورہ میں مسجد نبوی صرف پنج وقتہ نماز ادا کرنے کے لیے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اللہ کے فرمان سننے کے لیے مسلمانوں کے اجتماع کا مرکز ہی نہیں بلکہ احکام شریعت کی تدریس اور قرآن کی تعلیم کا مدرسہ بھی تھا۔ اس مدرسہ کے اساتذہ میں خود جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اور آپ کے وہ صحابہؓ تھے جنہوں نے پہلے خود براہ راست شمع نبوت سے اکتساب نور کیا تھا اور مبدء فیاض کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیے تھا ادھر آپ کے ارشاد سے دوسرے لوگوں کو تعلیم و تربیت دینے پر مامور تھے۔

حصولِ تعلیم کی ترغیب

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم و تربیت کا عملاً انتظام فرمانے کے بعد مسلمانوں کو بکثرت مواقع پر مختلف طریقوں سے حصولِ تعلیم کی ترغیب دی۔ اس سلسلہ میں حضرت ابوالدرداء سے ایک مشہور حدیث مروی ہے۔ آپ نے فرمایا جس کو سننے کے لیے اہل علم طول طویل سفر کرکے حضرت ابوالدرداء کے پاس پہنچا کرتے تھے۔ وہ حدیث یہ کہ۔

”جو شخص علم کی جستجو میں راستہ طے کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کا راستہ قریب کرتا ہے۔ عالم کے حق میں آسمانوں اور زمین کی تمام چیزیں حتیٰ کہ مچھلیاں پانی کے اندر اللہ سے مغفرت کی دعا کرتی ہیں۔ عالم کو عابد پر وہی درجہ حاصل ہے جو ماہ بدر کو دوسرے تمام ستاروں پر حاصل ہے۔“

بخاری اور مسلم کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے اور لوگ آپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اتنے میں تین آدمی آئے۔ ان میں سے دو تو آگے بڑھ گئے اور ایک واپس چلا گیا۔ ان دونوں نے آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا۔ ان میں سے ایک تو حلقہ کے اندر ایک کشادہ جگہ دیکھ کر بیٹھ گیا اور دوسرا لوگوں کے پیچھے ہو کر بیٹھ گیا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گفتگو سے فارغ ہوئے تو فرمایا، ان تینوں آدمیوں کے متعلق تمہیں خبر دوں؟ ان میں سے ایک نے تو اللہ کے دامن میں پناہ لی اور اللہ نے اسے پناہ دی۔ دوسرا شرم میں رہا اور اللہ نے بھی اس سے شرم کی اور تیسرے نے روگردانی کی اور اللہ نے بھی اس سے منہ پھیر لیا۔“ عقبہ بن عامر جہنی روایت کرتے ہیں کہ لوگ صفہ میں بیٹھے تھے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم باہر نکلے اور فرمایا تم میں سے کون پسند کرتا ہے کہ وہ بطحان یا عقیق کی وادی میں جائے اور ہر روز دو عمدہ نسل کی کوہان دار اونٹنیاں لائے اور گناہ اور قطع رحمی کے بغیر ان کا مالک ہو جائے؟ صحابہ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! ہم سب یہ پسند کرتے ہیں۔“ آپ نے فرمایا ”تم میں سے کسی شخص کا مسجد کی طرف جانا اور وہاں کتاب اللہ کی دو آیتیں سیکھ لینا، دو اونٹنیوں سے بہتر ہے اور تین آیتیں سیکھنا تین اونٹنیوں سے بہتر ہے اور چار سیکھنا اونٹوں کے ایک گلہ سے بہتر ہے۔

حضرت ابو ہریرہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا۔ ”جو شخص ہماری اس مسجد میں اس نیت سے داخل ہو کہ وہ علم سیکھے گا یا سکھائے گا، تو وہ بمنزلہ مجاہد فی سبیل اللہ ہے اور جو اس مقصد کے بغیر داخل ہوا، وہ اس شخص کی مانند ہے جو ایک چیز پر نگاہ ٹکائے ہوئے ہے لیکن وہ اس کی ملکیت نہیں ہے۔“

الغرض ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا پہلا مدرسہ مسجد ہی میں قائم ہوا تھا۔ جہاں بندگی و عبادت کے ساتھ تعلیم و ارشاد کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔

معلم کی شخصیت

جدید نظریہ تعلیم اس امر کا داعی ہے کہ معلم کی شخصیت مثالی شخصیت ہونی چاہیئے۔ علم کے لحاظ سے اسے اپنے مضمون میں نہایت وسیع الاطلاع اور حاوی و حاذق ہونا اور اس کے ساتھ اسے معلومات عامہ سے بھی بہت بڑی حد تک بہرہ مند ہونا ضروری ہے اور اپنی

ظاہری شکل و لباس کے لحاظ سے بھی باوقار بن کر رہنا چاہیئے۔ اسے طلباء کے سامنے ایسی ہیئت و حالت میں کبھی نہیں آنا چاہیئے کہ طلبا کو تمسخر و استہزاء کا موقع ملے۔ کیونکہ جب معلم طلبا کا نشانہ تمسخر بن جاتا ہے، تو طلبا اس سے استفادہ تو کیا کریں گے الٹا یہ صورت استاد اور طلباء کے درمیان متعدد الجھنوں اور خرابیوں کو جنم دینے کا موجب ہوگی،

نبوی نظریہ تعلیم نے بھی اس پہلو کی طرف خاص طور پہ دھیان دیا ہے۔ حدیث جبریل میں جو حضرت عمرؓ سے مروی ہے معلم کی ظاہری شائستگی اور وقار کی تاکید کا اشارہ ملتا ہے۔ حضرت عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ہمارے پاس ایک آدمی آیا، جس کے کپڑے انتہائی سفید اور بال انتہائی سیاہ تھے۔ سفر کی کوئی علامت اس پہ دکھائی نہ دیتی تھی۔ ہم میں سے کوئی اسے نہ جانتا تھا۔ وہ آکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دوزانو بیٹھ گیا اور اپنے گھٹنے آنحضورؐ کے گھٹنوں سے ملا دیئے اور اپنی ہتھیلیاں آنحضورؐ کی رانوں پہ رکھ دیں اور کہنے لگا " اے محمدؐ! مجھے اسلام کی خبر دو "۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ آپ یہ شہادت دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور رمضان کے روزے رکھیں اور بیت اللہ کا حج کریں اگر استطاعت ہو۔" اس شخص نے کہا " آپ نے درست کہا"۔ (اس طرح اس نے اور بھی متعدد سوال کئے اور آپ نے ان کے جوابات دیئے) ہمیں تعجب تھا کہ یہ شخص خود ہی سوال کرتا ہے اور پھر خود ہی آنحضورؐ کی تصدیق کرتا ہے اس کے بعد وہ چلا گیا۔ حضورؐ کافی دیر تک خاموش رہے اور پھر فرمایا " عمر! جانتے ہو یہ سائل کون تھا؟" میں نے عرض کیا " اللہ اور اس کا رسولؐ بہتر جانتے ہیں"۔ فرمایا " یہ جبریلؑ تھے۔ تمہیں تمہارا دین سکھانے آئے تھے"۔

حضرت جبریل علیہ السلام کا نہایت شائستہ لباس اور سنورے ہوئے بالوں کے ساتھ نمودار ہونا گرد و غبار کے اثرات سے صاف ہونا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مؤدبانہ دوزانو ہو کر بیٹھنا اور پھر آنحضورؐ کا حضرت عمرؓ کو یہ فرمانا کہ یہ تمہارے دین کے معلم بن کر آئے تھے۔ یہ تمام گوشے ایسے ہیں، جس سے ہمیں متعدد امور کی رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً یہ کہ جس شخص کے کندھوں پر انسانوں کی تعلیم و تربیت بالخصوص نوجوانوں کی تربیت کے فرائض ہوں، اس کے لیے لازم ہے کہ وہ آداب گفتگو سے واقف ہو، ملکی ماحول اور روایات کے مطابق اپنے لباس کا اہتمام کرتا ہو اور کوئی ایسی نازیبا حرکت نہ کرے، جو اسے شاگردوں کے تمسخر و مزاح کا ہدف بنا دے جس سے وہ غضبناک ہو جائے اور پھر علم و عرفان کا گہوارہ سزا و عقوبت کی کچہری بن جائے۔ کچھ طلبا بطور سزا بنچوں پہ کھڑے ہوں اور کچھ کی سرزنش ہو رہی ہو اور کسی کو کلاس بدر ہونے کی سزا مل رہی ہو اور کسی کو صدر مدرسہ کے سامنے پیش ہونے کے لیے بھیجا جا رہا ہو۔ الغرض معلم کے لیے ہر حیثیت سے باوقار اور پُرہیبت رہنا ضروری ہے

مدت تعلیم پہلی اسلامی درسگاہ کے بارے میں جو معلومات ہمیں حاصل ہوئی ہیں ان میں سے ایک اس درس گاہ کی مدت تعلیم ہے۔ مسلم نے اعمش سے اور انہوں نے ابراہیم سے حارث کی ایک روایت نقل کی ہے جس میں حارث بتاتے ہیں کہ میں نے تین سال میں قرآن سیکھا اور دو سال میں وحی۔ یا آپ نے اس کے برعکس فرمایا یعنی دو سال میں قرآن، تین سال میں وحی۔ وحی سے مراد نوشت و خواند ہے۔

طرز تحریر بعض روایات سے اس درس گاہ کے طلباء کی تحریر اور کتابت کے نمونے بھی معلوم ہوتے ہیں۔ حافظ ذہبی نے بتایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد لکھنا سیکھا۔ میرا خط بچھوؤں کی شکل کا ہوتا تھا"۔ حضرت ابو موسیٰ نے ان الفاظ میں اپنے طرز تحریر کی تصویر کھینچی ہے جسے ہم دیکھے بغیر بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ آپ نے اپنے خط کی تمثیل بچھو سے دی ہے۔ بچھو کی شکل جانی پہچانی ہے یعنی ایک دوسرے کو منقطع کرتے ہوئے خطوط اور نصف دائرے۔

عہدِ نبوی میں علمی ترقیاں

محمد حفیظ اللہ پھلواروی

نبی اُمّی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنھوں نے کسی مُعلم کے سامنے کبھی زانوئے ادب تہہ نہیں کیا تھا اور نہ انھیں کسی عالم کی صحبت میں بیٹھنے کا موقع ملا تھا، طلب علم کو ہر مسلمان کا ایک مقدس فریضہ قرار دیا:

طَلَبُ العلم فریضةٌ علیٰ کُلّ مُسلم (ابن ماجہ)	علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر لازم ہے۔
مَنْ سلک سبیلا یطلبُ فیه علماً سَهَّلَ اللہ لَہٗ طریقاً الی الجنة (مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی)	جس نے طلب علم کی خاطر کوئی راستہ طے کیا اللہ اس کے لئے جنت کی راہ آسان کرے گا۔
ان الملائکة تضع اجنحتها رضیً لطالب العلم (مشکوٰۃ)	فرشتے علم کے طلب کرنے والوں کے لئے اپنے پَر بچھاتے ہیں تاکہ ان کو راضی رکھا جائے۔

اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے قلوب میں علم کی اہمیت جتائی اور صحابہ کرام کو حکم دیا کہ:

ان رجالاً یاتون من اقطار الارض یتفقھون فی الدین فاستوصوا بھم خیراً (مشکوٰۃ)	زمین کے اقطار سے لوگ تمہارے پاس دین سیکھنے کے لئے آئیں گے تو ان کے ساتھ بھلائی کا سلوک کیجو۔

مکہ معظمہ میں مسلمانوں کا سب سے پہلا تبلیغی مرکز "دار ارقم" تھا۔ یہ مکان ارقم بن ارقم کا تھا جو کوہ صفا کے دامن میں تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تین سال یعنی ۶ھ نبوی کے آخر تک یہاں اشاعت اسلام اور نومسلموں کی تربیت کا کام انجام دیتے رہے۔

"دار ارقم" کے قبل حضرت خدیجۃ الکبریٰ کا مکان جو "داب الحجر" میں واقع تھا، سب سے پہلی تربیت گاہ کہا جاسکتا ہے "دار ارقم" کے بعد "شعب ابی طالب" بھی تربیت گاہ کہی جاسکتی ہے۔ جہاں محرم ۷ھ نبوی سے ۱۰ھ نبوی تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیرو محصور رہے۔

یثرب (مدینہ منورہ) کے کچھ لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ ان کی درخواست پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مُصْعَب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو تعلیم قرآن کے لئے بھیجا۔ حضرت ابواُمامہ اَسعد بن زُرارہ نے اپنا مکان دیا۔ گویا یثرب میں سب سے پہلے مدرسہ کی بنیاد پڑی۔

ہجرت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آٹھ دس ماہ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مکان پر قیام فرمایا۔ یثرب میں یہ دوسری تربیت گاہ کہی جاسکتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں بے حد اہم جنگی اور سیاسی مصروفیتوں کے باوجود اس کے لئے

وقت نکال لیا کرتے تھے کہ مدینہ منورہ سے ناخواندگی دُور کرنے کے کام کی ذاتی طور سے نگرانی کر سکیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں آپ نے سعید بن العاص کا تقرر کیا تھا کہ لوگوں کو لکھنے پڑھنے کی تعلیم دیں۔ یہ بہت خوش نویس تھے۔ ایک راوی کے الفاظ میں ان کو "معلم حکمت" بنایا گیا تھا۔ جس سے لکھنے پڑھنے کی عظیم اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے [۱]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں مسجد کی بنا ڈالی، اور ساتھ ہی اس کے شمالی گوشے میں ایک چبوترہ بنایا۔ جس پر ایک سائبان تھا۔ یہی "صُفّہ" کہلایا۔ یہاں وہ مہاجرین قیام کرتے جو غیر متاہل اور بے مایہ تھے۔ یہ "اصحاب صُفّہ" کہلاتے تھے۔ یہ لوگ تمہ توڑنے نہیں آئے بلکہ دنیوی علائق سے بے نیاز اور بے تعلق ہو کر تعلیم دین حاصل کرنے میں مصروف رہتے ان لوگوں نے اپنی زندگیاں اسلام سیکھنے کے لیے وقف کر دی تھیں۔

مولانا مناظر حسن گیلانی تحریر فرماتے ہیں کہ "صُفّہ" اس لئے قائم کیا گیا تھا کہ باہر سے جو لوگ طلب علم کے لئے آئیں، انھیں اس میں ٹھہرایا جائے اور تعلیم دی جائے اس صُفّہ کے رہنے والوں کی خبر گیری مسلمانوں کے سپرد تھی کم و بیش اسلام کی اس پہلی تعلیم گاہ میں مختلف اوقات کے اندر طلبہ کی تعداد "ستر اسی" تک پہنچ جاتی تھی۔ کچھ تو لکڑیاں جنگل سے لاکر اور ان کو بیچ کر اپنا کام چلاتے تھے، جیسا کہ بخاری میں ہے کہ دن کو صُفّہ والے لکڑیاں چُنتے تھے اور رات کو پڑھتے تھے۔ لیکن اصحاب ثروت و وسعت کی طرف سے بااشارہٗ نبوت ان کی امداد بھی ہوتی تھی۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم براہ راست ان لوگوں کے کھانے پینے کے مسئلہ کی نگرانی فرمایا کرتے تھے۔ کوئی خراب چیز اگر ان لوگوں کے لیے بھیجتا تو حضورؐ اس پر ناخوشی کا اظہار فرماتے [۲]"

یہاں سے اکتساب علم کرنے والوں کی تعداد مجموعی بقول سیوطی ایک سو ایک بیان کی جاتی ہے "صُفّہ" دن کو مدرسہ کا کام دیتا اور رات کو "دار الاقامہ" کا۔

صرف "صُفّہ" ہی نہیں بلکہ پوری مسجد نبوی تعلیم گاہ تھی، جہاں دینی اور دنیوی تعلیم دی جاتی تھی مسجد نبوی میں "اصحاب صفہ" کی تعلیم حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے سپرد تھی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود، اُبی بن کعب اور حضرت زید بن ثابت یہیں درس دیا کرتے تھے۔ اس جامعہ میں اصحاب ذوق دور دراز ممالک سے اکتساب علم کے لئے آتے تھے [۳]

مقامی طلبہ کے علاوہ دور دراز کے طلبہ بھی آتے اور اپنا ضروری نصاب تکمیل کر کے اپنے وطنوں کو واپس جاتے تھے (بخاری)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی بہ نفس نفیس تعلیم دیا کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، وغیرہ بڑے صحابہ ان درسوں میں شریک رہا کرتے تھے۔ دوسرے صحابہ کرام بھی تعلیم دینے کے لئے مقرر تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی کے حلقہائے درس کا اکثر معائنہ کرتے تھے۔ اسلام کی تبلیغ کے لئے یہیں سے لوگ بھیجے جاتے تھے۔

اصحاب صُفّہ کے کھانے پینے کے نگراں معاذ بن جبل تھے۔ اہل صُفّہ مزدوری بھی کرتے تھے۔ غرض سب سے پہلی باضابطہ درس گاہ مسجد نبوی تھی اور سب سے پہلا "اقامتی مدرسہ صُفّہ" تھا۔ ایک بار مسجد نبوی میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو دیکھا کہ صحابہ کرام کے دو حلقے ہیں۔ ایک حلقہ میں لوگ تلاوت و دعا میں مشغول ہیں اور دوسرے حلقے میں قرآن پاک

---

[۱] عہد نبوی میں نظام حکمرانی ص ۱۰، ۲۰۹ [۲] ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم جلد اول۔ [۳] تمدن عرب از محمد جان الحق سلیمانی۔

کا درس ہو رہا ہے۔ آپ یہ فرما کر کہ "میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں" حلقۂ درس میں بیٹھ گئے۔

مدینہ میں مسجد نبوی واحد درس گاہ نہ تھی بلکہ یہاں کم سے کم نو مسجدیں خود عہد نبوی میں تھیں مقام "الحسا" میں بھی ایک مسجد بنائی گئی تھی جہاں تعلیم کا انتظام تھا۔

مدینہ میں ۲ھ میں ایک اقامتی درس گاہ "دار القراء" کے نام سے قائم ہوئی جس کا ذکر علامہ بلاذری نے کیا ہے۔

۲ھ میں جنگ بدر کے موقع پر بہت سے قیدی گرفتار ہو کر آئے۔ ان کی رہائی کی ایک صورت حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مقرر کی کہ ہر قیدی دس مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھائے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تعلیم سے کتنی دلچسپی تھی۔

اسلام کے دائرے میں جو قبائل داخل ہوتے جاتے تھے۔ دربار رسالت سے ان کی تعلیم و تلقین کے لئے ذمہ دار اصحاب کو بھیجا جاتا تھا کہ جو کچھ تم نے ہم سے سیکھا ہے۔ وہ انھیں بھی جا کر سکھاؤ[1]

مورخ طبری نے ۱۰ھ کے واقعات میں لکھا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ ابن جبل کو ناظم تعلیمات بنا کر یمن بھیجا جہاں وہ ایک ضلع سے دوسرے ضلع میں دورہ کیا کرتے اور مدارس کی نگرانی کرتے (حصہ اول)

معاذ بن جبل اور ابو موسیٰ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ملک یمن میں تعلیم اسلام کے لئے مامور فرمایا تھا۔ ان کی روانگی کے وقت ان سے ارشاد فرمایا کہ :۔

"لوگوں کے ساتھ آسانی پسند کرنا انھیں سختی میں نہ ڈالنا۔ خوشخبری اور بشارت انھیں سنانا دین سے نفرت نہ دلانا اور تم آپس میں مل جل کر رہنا (بخاری)

دور دراز اسلامی بستیوں میں تعلیم کے بندوبست کے لئے دورہ کرنے والے مقرر کئے جاتے تھے۔ ان مقامات کے نو عمر اور ذہین لوگوں کو مدینہ بلا کر کچھ عرصہ اسلامی صدر مرکز میں رکھا جاتا اور اسلامی تربیت سے آراستہ کر کے ان کو ملک واپس کر دیا جاتا تھا۔ ان علاقوں میں مسجدیں بنانے کی خاص تاکید ہوتی تھی۔ عمان جیسے دور دراز مقامات کے نو مسلموں کے نام آنحضرت کا ایک تہذیبی ہدایت نامہ بخاری وغیرہ نے محفوظ کیا ہے۔ "مسجدیں بناؤ، ورنہ فوج بھیج کر تمھیں سزا دی جائے گی[2]

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں تو علم کا مرجع آپؐ ہی کی ذات تھی، لیکن آپ کی زندگی ہی میں بلکہ اسلام کے ابتدائی دور میں آپؐ کے فیض یافتہ صحابہ کرام تعلیم کی خدمت انجام دینے لگے تھے۔ چنانچہ ہجرت سے قبل آپؐ نے حضرت مُصعب بن عُمیر کو اہل مدینہ کی تعلیم کے لئے بھیجا تھا اور مدینہ آنے کے بعد تو تعلیم کا پورا انتظام قائم ہو گیا۔

بیرونی اشخاص و قبائل کی درخواست پر ان کی تعلیم کے لئے مدینہ سے معلمین بھیجے جاتے تھے۔ چنانچہ ایک بیرونی وفد کی

---

[1] تدوین حدیث مولانا سید مناظر احسن گیلانی ص۲۳ (۱۹۵۶ء)

[2] عہد نبوی میں نظام حکمرانی ص ۲۹۳ -

درخواست پر آپ نے ستر قرأ یعنی معلمین قرآن روانہ فرمائے تھے۔

تعلیم کے ساتھ کتابت و تحریر کو بھی ترقی ہوئی۔ کتابتِ وحی، صلح و جنگ کے معاہدوں دعوتِ اسلام کے خطوط اور دوسرے معاملات و احکام کی کتابت کے لئے تحریر ناگزیر تھی۔ اس لئے آنحضرتؐ نے دینی تعلیم کے ساتھ اسکی جانب بھی توجہ فرمائی۔

یہودیوں سے اکثر معاملات رہتے تھے اس لیے آنحضرتؐ نے ان سے خط و کتابت کے لئے زید بن ثابت کو عبرانی سیکھنے کا حکم دیا۔

غرض مذہبی و ملکی ضروریات کے تحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے اور ذاتی شوق کی وجہ سے صحابہ کرام نے چند دنوں میں معمولی نوشت و خواند کے لئے بقدر ضرورت تعلیم حاصل کر لی۔

عہدِ نبوی میں دوسری طاقتوں سے سیاسی دستاویزوں کا تبادلہ شروع ہو گیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی وقت اپنے صحابہ میں سے چند افراد کو ایشیا اور افریقہ کی زبانیں سیکھنے کا حکم دیا اور ان کی زبانوں پر عبور حاصل کرنے کے بعد ان کو بحیثیت ترجمان مقرر کیا[۱]

حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمہات المومنین کی تعلیم کے لئے بھی انتظام فرمایا شفا بنت عبداللہ عدویہؓ سے آپ نے خاص طور پر اس خواہش کا اظہار فرمایا کہ وہ انھیں لکھنا پڑھنا سکھا دیں (ملاحظہ ہو نظام الحکومت النبویہ) چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہؓ حضرت حفصہ اور حضرت ام سلمہ علم حدیث میں یدطولیٰ رکھتی تھیں آپ نے انھیں طب کی تعلیم کی طرف توجہ دلائی (جمع الجوامع السیوطی)

اسلام کے ابتدائی عہد میں خواتین کا سب سے پہلا مرکز حضرت عائشہ کی درس گاہ تھی ہفتہ میں ایک دن حضورؐ خود بھی عورتوں کے خصوصی مجمع میں تشریف لے جاتے تھے۔ حج کے ایام میں پہاڑوں کے دامن میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کا خیمہ نصب ہوتا اور دور دراز سے آنے والی خواتین ان سے استفادہ کرتیں[۲]

آنحضرت نے شفا بنت عبداللہ سے کہا تھا کہ وہ شادی کے بعد بھی حفصہ کو پڑھاتی رہیں۔ ازواج مطہرات میں سے حضرت عائشہ اور اُمّ سلمہ پڑھ سکتی تھیں لیکن انھیں لکھنا نہیں آتا تھا[۳]

اُمّ المومنین حضرت حفصہ سب سے زیادہ پڑھی ہوئی تھیں۔ ان کو شفا نے کتابت کی بھی تعلیم دی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے آپ ہی کے پاس مکمل قرآن پاک کو رکھوایا تھا۔ اس مصحف کا نام "امام" رکھا گیا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شاعروں سے بھی رواداری کا سلوک برتا۔ بعض شاعروں کو انعام دیئے اور شاعری کے بارے میں ارشاد فرمایا:

"بے شک بعض شعروں میں دانش مندی اور حکمت ہوتی ہے۔"

---

[۱] اسلام کا نظام حکومت ص ۳۴۶۔

[۲] بحوالہ جائزہ مدارس عربیہ اسلامیہ۔

[۳] فتوح البلدان

اخلاقی اور حکیمانہ شاعری کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ چنانچہ زمانہ جاہلیت کے مشہور شاعر اُمیّہ بن ابی الصلت کے کلام کی آنحضرتؐ نے توصیف فرمائی۔ خود صحابہ میں متعدد بزرگ شاعر تھے اور حضرت حسّان بن ثابت کو دربارِ نبوی کا شاعر ہونے کا فخر حاصل تھا۔

حسّان بن ثابت (متوفی ۵۴ھ) جب آنحضرتؐ ہجرت کرکے مدینہ پہنچے تو انصار کے دوسرے لوگوں کے ساتھ مسلمان ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم ان (کفار) کی ہجو کرو اور روح القدس تمہارے ساتھ ہیں"۔ چنانچہ حسّان نے ان کی ہجو کہہ کر انھیں سخت تکلیف پہنچائی اور ان کی زبان کو بند کر دیا۔ کفار کی اس ہجو سے حسّان کو بڑی مقبولیت و شہرت حاصل ہوئی۔[1]

حسّان بن ثابت اسلام کی تائید میں اور مخالفین کے جواب میں اشعار نظم کرکے لاتے تو ان کے لئے مسجد نبوی میں منبر رکھ دیا جاتا جس پر چڑھ کر وہ اشعار پڑھا کرتے۔[2]

ایک بار آنحضرتؐ کو ابوبکرؓ نے اس حال میں دیکھا تو آپ نے کہا کہ قرآن کے ہوتے ہوئے شعر و شاعری کی کیا ضرورت ہے؟ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ:۔

"قرآن پاک کا اپنا خاص مقام ہے۔ مگر گاہے گاہے شعر سن لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔"

کعب بن زہیر کی ہجو گوئی پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا خون مباح کر دیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کو بیچ میں ڈال کر آپ کے پاس پہنچا اور اسلام لے آیا۔ آنحضرتؐ کی مدح میں اپنا مشہور "لامیہ" قصیدہ کہا جس پر آپ نے اسے معاف فرما دیا، اس کی جان بخش دی اور اپنی چادر مبارک اتار کر اسے دے دی۔[3]

اسلام لانے اور امان پانے کے بعد کعب نے اپنا شہرۂ آفاق قصیدہ پڑھا، اور جب وہ اس شعر پر پہنچے۔

اِنّ الرسول سَیفٌ یستضاءُ بہٖ	بے شک رسول اللہ ایک ایسی تلوار ہیں جن سے روشنی
مہنّدٌ من سیوفِ اللّٰہ مسلولُ۔	حاصل کی جاتی ہے آپ اللہ کی تلواروں میں ایک عمدہ ہندی شمشیر برہنہ ہیں۔

تو آنحضرتؐ نے اپنی وہ چادر جو آپ کے جسد مبارک پر تھی، اتار کر کعب کو عطا فرمائی۔ یہ چادر مبارک استنبول میں سرائے قدیم کے نوادرات میں تبرکات نبوی میں اب بھی شامل ہے۔[4]

نابغہ جعدی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر ایک قصیدہ پڑھا تو آپؐ بہت خوش ہوئے اور دعا دی کہ اللہ تعالیٰ تیرے منہ کو کبھی نہ توڑے۔ نابغہ نے ۱۲۰ سال کی عمر پائی لیکن اس کا ایک دانت بھی نہ ٹوٹا۔

خنساء (وفات ۲۴ھ) شعر گوئی میں کمال رکھتی تھی۔ اپنی قوم کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی

---

[1] تاریخ ادب عربی۔

[2] رحمۃ للعالمین۔ [3] تاریخ ادب عربی۔ [4] کعب بن زہیر۔ پروفیسر علی محسن صدیقی۔

اور اسلام قبول کر لیا۔ حضور کو اس نے اپنے اشعار سنائے تو آپ جھومنے لگے اور مزید سننے کا شوق یہ کہتے ہوئے ظاہر فرمایا:
—" اور سناؤ اے خنساؔ!"

بنی تمیم کے وکلا دربارِ رسالت میں آئے اور اپنے خطیب اور شاعر کو اپنے ساتھ لائے اور آنحضرت کو فخر و مباہات کے مقابلہ کے لئے کہا۔ انھیں اجازت ملی۔ وکلا کے خطیب عطارد نے تقریر کی۔ آنحضرت کے حکم سے ثابت بن قیس نے تقریر کا جواب دیا۔ اس کے بعد وکلا نے اپنے شاعر زبرقان کو کھڑا کیا۔ اس نے آٹھ شعر پڑھے۔ آنحضرت نے حسّان بن ثابت کو جواب دینے کے لئے کہا۔ حسّان نے فی البدیہہ تیرہ شعر کہے۔ حسّان کی نظم سن کر بنی تمیم کے وکلا نے کہا کہ :-

"یہ شخص (آنحضرت) تو مؤیّد من اللہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کے خطیب اور شاعر ہمارے خطیب اور شاعر سے زیادہ فصیح و بلیغ ہیں۔"

پھر ان لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی امّی ہونے کا روشن کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے اپنی زندگی ہی میں علم کا ذوق اس قدر عام فرمایا تھا کہ اونٹوں کے چرواہے میدانوں اور ریگستانوں میں اپنے اونٹ بھی چراتے تھے اور ساتھ ہی دینی علوم کی تحصیل بھی کرتے جاتے تھے۔ چنانچہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ، کا قول ہے :-

"ہم لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ساری حدیثیں نہیں سُنی ہیں بلکہ ہمارے دوست احباب انھیں ہم سے بیان کرتے تھے اور ہم لوگ اونٹوں کے چرانے میں مشغول رہتے تھے۔"

گویا مسلمانوں نے علم کی روشنی سے عہدِ رسالت ہی میں ریگستانوں اور چراگاہوں کو اسلام کی کھلی یونیورسٹی بنا دیا تھا۔ اور چرواہے اس میں تعلیم حاصل کرتے تھے اندازہ کرو کہ مسلمانوں نے علم دین کی کس قدر ضرورت سمجھی تھی اور دین کی بنیادی باتوں کو ہر مسلمان کے دل میں ڈالنے کے لئے کیا کیا جتن کئے تھے اور ان مسلم چرواہوں نے ہی دنیا میں علمی زندگی کا کتنا اونچا معیار قائم کیا تھا۔[1]

اسلام کا سب سے بڑا مرکز مدینہ منورہ تھا، لیکن نہ تو یہاں اسکول اور کالج کی عالی شان عمارتیں تھیں اور نہ یونیورسٹی، یہاں کا طرزِ تعلیم یہ تھا کہ :

حضرت جابر بن عبداللہ مسجد نبوی میں درس دے رہے ہیں۔ حضرت ابوہریرہ اپنی جگہ بیٹھے درس دے رہے ہیں (آپ کے آٹھ سو شاگرد تھے)

حضرت ابوسعید خدری مسندِ درس بچھائے ہوئے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر فاروق درس دینے میں مشغول ہیں۔ حضرت عائشہؓ اپنی جگہ درس دے رہی ہیں۔

---

[1] العلم از المستدرک بحوالہ البلاغ بمبئی۔

علی بن ابی زُرعہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کے وقت ایک لاکھ ایسے صحابہ چھوڑے جو عالم ہونے کے ساتھ باقاعدہ حضور کی حدیثیں لوگوں کو سنایا کرتے تھے۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔

صدیق اکبر جیسے راست باز انسان فاروق اعظم جیسے صاحب ایمان و اتقاء اور علی جیسے مرد حق شناس درسگاہ نبوت کے فیض یافتہ تھے۔

یہ تھا اس امی کا فیض جس نے کسی معلم کے آگے کبھی زانوئے ادب تہہ نہیں کیا تھا۔ ٹامس کارلائل لکھتا ہے:۔

> "ایک بات اس جگہ اور قابل لحاظ ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کبھی کسی استاد کے سامنے زانوئے ادب تہہ نہیں کیا تھا۔ وہ اُمی تھے نہ اگلے علوم سیکھے تھے اور نہ پچھلے کیونکہ وہ خود ان تمام چیزوں سے غنی تھے (لیکن) ان کے منہ سے جو کلمہ بھی نکلتا۔ وہ حکمت عملی میں ڈوبا ہوا ہوتا۔ جہاں بولنے کا موقع نہ ہوتا تو بالکل ساکت رہتے اور جب بولتے تو عقل و اخلاص اور حکمت کے موتی جھڑتے۔"

(لائف آف دی ہولی پروفٹ)

بعض لوگ عربیت کی ناواقفیت اور جہالت کی بنا پر قرآن پڑھ کر ہنستے ہیں۔ اگر وہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس فصیح و بلیغ اور دل ہلا دینے والی زبان و عبارت سے لوگوں کو تبلیغ و ہدایت کا درس دیتے ہوئے سنتے تو ان کی طرح یہ بھی سربسجود ہو کر بے اختیار چیخ اٹھتے کہ:۔

> "اے پروردگار کے سچے پیغمبر! ہم کو ذلت و ہلاکت کے گڑھے سے نکال کر عزت و نجات کی بلندیوں پر پہنچا دے!" (جان جیک روسو)

(بحوالہ یورپ اور اسلام)

جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ (پیرس) اپنے ایک مضمون "قرآن مجید کے ترجمے" میں تحریر فرماتے ہیں:

> "شمس الائمہ سرخسی (فوت ۴۸۳ھ) نے اپنی تالیف "المبسوط" میں لکھا ہے:۔ "مروی ہے کہ (چند نومسلم) ایرانیوں نے حضرت سلمان فارسی رضؓ سے درخواست کی کہ ان کے لئے قرآن کا فارسی میں ترجمہ کریں اور آپ نے سورہ فاتحہ کا فارسی میں ترجمہ کر کے انھیں بھیجا۔"

اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے ایک اور بڑے فقیہ امام تاج الشریعہ نے اپنی کتاب "النهاية حاشية الهداية" میں مزید تفصیل یہ دی ہے کہ حضرت سلمان فارسی نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے یہ کام انجام دیا اور ان کے ترجمے کا ایک جزء بھی نقل کیا ہے "بنام خداوند بخشایندہ مہربان"

(جو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا ترجمہ ہے)

جغرافیہ اسلامی عہد میں

دنیا مسلمانوں کا وطن اکبر ہے۔ مسلمان اس دنیا کے باشندے ہیں اور اس کی ہر اقلیم، ہر ملک اور ہر برِ اعظم کو اپنی جیسنہ سمجھتے ہیں۔ اللہ کی زمین اور اللہ کے بندے، خدا کی مخلوق اور ساری خدائی۔

"ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست"۔ "ہر ملک ہمارا ملک ہے، کیوں؟ اس لیے کہ ہر ملک ہمارے ہی خدا کا تو ملک ہے" جس قوم کے بچے یہ خیال لے کر پیدا ہوں اور جس قوم کے جوان اجنبی ملکوں کے ساحلوں پر کھڑے ہو کر اس قسم کے عقیدہ کا اظہار کریں، وہ پہاڑی سرحدوں میں قلعہ بند ہو کر نہیں رہ سکتے۔

حضرت عیسیٰؑ کے میلاد پر چھ سو سال گزر چکے تھے کہ مسلمان چشمے کی طرح اُبھرے، آبشار کی طرح زمین پر نازل ہوئے اور بہتے ہوئے دریاؤں اور نہروں کی طرح چاروں طرف بڑھتے چلے گئے۔ عرب سے چلے، فرانس کے پہاڑوں تک پہنچے، سائبیریا کے جنگلوں میں بسے، بحر شمالی کے قریبی شہروں پر سایہ فگن ہوئے، چین میں آباد ہوئے، مصر، شام، عراق، فارس، اٹلی، سسلی، اسپین، افغانستان، ہندوستان، بحر روم، بحر الکاہل، بحر عرب، بحر ہند کے حکمران بنے۔ انہوں نے بحر روم کو فتح کیا، ہوا کا رُخ بدلا، چاند سورج پر علم و تحقیق کی کمند ڈالی اور ستاروں کو اپنی رفتار کے ساتھ لے کر آگے بڑھے۔ انہوں نے عرب کے نخلستانوں میں قوت حاصل کی، شام کے سنگتروں کا رس پیا، ایران کے محلات میں گرد جھاڑی، آریانا (افغانستان) پہنچ کر پھل کھائے، ہندوستان آکر پھول سونگھے، اسپین میں داخل ہو کر یونیورسٹیاں بنائیں، سمرقند میں رصدگاہیں تعمیر کیں، ملکوں کے راستے ناپے، اقلیموں کے حالات پر دسترس حاصل کی، برِاعظموں کے نقشے بنائے، زمینوں کا بندوبست کیا اور پیداواروں کی تنظیم کی۔

وہ شش جہات عالم میں آزاد بن کر گھومے، مگر خدا کے ہو کر رہے۔ وہ جہاں گئے، خدا کے نام کے ساتھ، خدا کے گھر (بیت اللہ) کا نام بھی ساتھ لے گئے۔ ساری دنیا اُن کا گھر تھی، مگر ان کا دل؛ بیت اللہ کی محبت کا گھر تھا۔

بیت اللہ کا عشق، حج کی محبت، فتح کا شوق، علم کا ذوق، یہ چار چیزیں تھیں جنہوں نے فاتح مسلمانوں کو سیر و سیاحت پر آمادہ کیا اور یہ سیر و سیاحت کی قدر و قیمت تھی کہ مسلمانوں کے علمی دماغ اور تعلیمی مزاج جغرافیہ کی ایجاد و تجدید کی طرف متوجہ ہوئے۔

۱۹۶ء میں ارتستین پہلا یونانی عالم تھا جس نے فینیقی سوداگروں اور سکندر کے سپاہیوں سے دنیا کے ملکوں کے حالات سنے اور ان کو قلم بند کیا۔ یہ تھی جغرافیہ کی ابتداء۔ اس کے بعد اسٹرابون سیاح اور پلینوس اور بطلیموس نے کتابیں لکھیں، جن میں جغرافیہ بطلیموس کو خاص شہرت حاصل ہوئی۔ بطلیموس نے چار سو پہاڑوں، بہت سے شہروں اور پہاڑی پیداواروں کا ذکر کیا۔ اس

حد پر جغرافیہ ختم ہو گیا۔ پانچ سو برس بعد مسلمان علوم و فنون کا تاج سر پر رکھ کر نمودار ہوئے اور انھوں نے حقیقی معنوں میں علم جغرافیہ کو ایک مستقل علم کی حیثیت سے ایجاد کیا۔ اصمعی، ہمدانی، ابوالاشعث نے کتابیں تحریر کیں۔ جغرافیہ کی تخلیق کے لیے سیاحت بڑی ضروری چیز تھی، مسلمان اس کام میں نمبر اوّل نکلے۔ انھوں نے دنیا کو اپنے قدموں سے روند ڈالا، ہر طرف گئے، ہر سمت میں بڑھے، ہر ملک میں پہنچے اور سمندروں، دریاؤں، نہروں، ساحلوں، شہروں، جنگلوں، صحراؤں، پہاڑوں، وادیوں، انسانوں اور حیوانوں سے ان کا نام پوچھ کر چھوڑا۔ انھوں نے خود زحمت اٹھائی، معلومات جمع کیں اور ان کو ہمارے سامنے بطور ارمغان پیش کر دیا۔

شیخ ابوزید بلخی، جغرافیہ کا پہلا مسلمان موجد تھا جس نے "صور الاقالیم" لکھ کر اس فن کا بنیاد بویا۔ یہ پہلی کتاب ہے جس میں فنی ضرورت کے مطابق سمندروں، دریاؤں، ساحلوں، پہاڑوں، شہروں، شہری باشندوں اور ان کے تمام طبعی حالات کا ذکر کیا گیا ہے۔

ابواسحٰق الاصطخری دوسرا جغرافیہ دان تھا جس نے بلخی کا زمانہ پایا اور اپنی یادگار زمانہ کتاب "مسالک الممالک" لکھ کر ساری دنیا پر احسان کیا۔ اصطخری نے دُنیائے معلومہ کا دورہ کیا۔ اس کی مہم تیسری صدی ہجری کے بعد پوری ہوئی اور اس سے زبردست نتائج برآمد ہوئے۔

عہد حاضر کے سیاح بلخی اور اصطخری ہی کے نقشِ قدم پر قدم ہمت اٹھا کر چلتے ہیں اور دنیا کی سیاحت کرتے ہیں۔ ابن حوقل نے ۳۳۱ھ میں سیاحت کی اور "مسالک والممالک" کے نام سے اپنا جغرافیہ لکھا۔ اس نے ایک اور بات ایجاد کی اور وہ یہ کہ مختلف اقالیم کے نقشے بھی درج کیے جو بڑے رنگین اور مزیّن تھے۔ یورپ نے ابن حوقل کی اس اٹلس سے بہت فائدہ حاصل کیا اور اس تصنیف کو زبردست اہمیت دی۔ اس کے بعد ہمدانی، مسعودی اور مقدسی نے سیاحت کی اور فنِ جغرافیہ کو توسیع و ترقی دی۔

ابوعبداللہ محمد بن ادریس الاندلسی جغرافی نے سیاحت کے علم کو "مہم" بنا دیا۔ اس کی مہم نے افریقہ کے برِاعظم کو بھی نہ چھوڑا "نزہتہ المشتاق" ادریسی ہی کا معرکۃ الآرا جغرافیہ ہے۔ ادریسی نے صحرائے افریقہ کے متعلق نادر و نایاب معلومات قلمبند کیں جن کو آج تک یورپ کے جانباز سیاح بھی دریافت نہیں کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ براعظم یورپ میں ابن ادریس کی "نزہتہ المشتاق" کا فنی درجہ بہت بلند ہے، ۱۲۷۵ھ میں فرانسیسی زبان میں اس کا ترجمہ ہو کر علمائے یورپ کے سامنے آچکا ہے۔

مسلمان علما نے پانچویں چھٹی صدی ہجری میں فنِ جغرافیہ کے بارے میں تازہ اصول ایجاد کیا۔ انھوں نے جغرافیہ کو قاموس دانسائیکلو پیڈیا، کے طرز پر ترتیب دینا شروع کیا۔

ابوعبداللہ شہاب الدین رومی یاقوت الحموی نے اس ایجاد کی وجہ سے خاص شہرت حاصل کی۔ یاقوت نے قاموسی اصول پر حروف ہجا کے اعتبار سے شہروں کا جغرافیہ لکھا اور اس کا نام "معجم البلدان" تجویز کیا۔ اگرچہ مصنف ۶۲۸ھ میں وفات پاگیا، مگر اس کا کارنامہ کارناموں کی دنیا میں آج بھی زندہ ہے۔

تیسرا فن جو فنِ جغرافیہ کے لیے دوسرے درجہ پر لازمی ہے، سیاحت ہے۔ مسلمانوں نے سیاحت کو بھی ایک فن بنا کر اس سے خوب خوب کام لیا۔ ابن فضلان چلپی، ابن بطوطہ نے سفرنامے لکھے جن میں جغرافی معلومات کے صدہا سربھر ذخیرے ملتے ہیں۔

ایک عیسائی پادری نے کسی جگہ لکھا ہے کہ مسلمانوں میں جغرافیہ کی توسیع و ترقی حج کی برکت تھی۔ دنیا کے مسلمان حج بیت اللہ کے لیے آتے تھے اور صدہا وہاں سے دنیا کی پیمائش کرنے کے لیے نکلتے تھے۔ سیر و سیاحت کا داعیہ یہاں سے پیدا ہوا۔ اس شوق کو خدا نے پیدا کیا اور خدا کے گھر نے ابھارا۔ اب وُہ نہ شوق تھا، نہ ذوق بلکہ ایک فن تھا جس سے فاتح مسلمانوں نے ہر فتح کے محاذ پر کامیابی حاصل کی۔

کیا زمانہ تھا، کیسے لوگ تھے، کیا علم تھا، کیا فن تھا۔ مٹی پر ہاتھ ڈالتے تھے تو خدا کے حکم سے سونا ہو جاتا تھا۔ دراصل ان کا اعتقاد سچّا تھا، قبلہ صحیح تھا، زبان پکی تھی، علم حق تھا، وُہ موجد تھے، ہم کاریگر بھی نہیں رہے۔ یا وُہ زمانہ تھا، یا یہ دَور ہے۔ جھوٹے دل سے خدا کو اب بھی یاد کر لیتے ہیں مگر خدا کا گھر اب دل سے دُور اور دماغ سے اوجھل ہے۔

تاجدارِ دو عالمؐ کی فصاحت و بلاغت

عبد الرحمٰن عزام

بطلِ اعظم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بشر تھے۔ آپ پر وحی نازل ہوتی تھی۔ جو کچھ آپ کو بطور الہام عطا کیا گیا، اس کی تفصیل کتاب اللہ میں ہے۔ اس کے علاوہ آپ کے جو اقوال و آثار ہیں، وہ آپ کی عقلِ سلیم اور پاکیزہ زبان کے نتائج و ثمرات ہیں۔ آپ کے کردار و گفتار کی حقیقی تصویر تا ابد جھلکتی رہے گی اور آپ لوگوں کے پیشوا اور فصاحت و بلاغت کے امام تسلیم کیے جائیں گے۔ جس شخص میں یہ تین امور انجام دینے کی صلاحیت پیدا ہو جائے، وہ تاریخ عالم کی بے مثال ہستی تصور کیا جائے گا:

۱۔ مختلف قبائل اور متضاد خاندانوں کو متحد و منظم کر کے ایک جماعت بنا دینا،

۲۔ ایک ایسی سلطنت کی بنیاد قایم کرنا، جو چہار دانگ عالم میں تمام حکومتوں اور سلطنتوں کا مرکز بن جائے اور صدیوں تک برقرار رہے۔ چنانچہ مشرق و مغرب میں جہاں بھی آلِ ہاشم نے سلطنت قایم کی، اس کے اثرات کم از کم ہر سال سے بھی زیادہ مدت تک برقرار رہے،

۳۔ دنیا کے سامنے ایک ایسا دین پیش کرنا، جس کو عرب و عجم، سیاہ و سپید، غرضیکہ لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں ماننے والے موجود ہوں۔

چنانچہ یہ تین عظیم الشان مقاصد آپ میں جلوہ گر تھے، جن کی تکمیل وحی کے بعد آپ کی شستہ و شیریں زبان، فصیح و بلیغ انداز، عقل، فہم اور طبع سلیم کے ذریعے ہوئی۔

تمام اکابر کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا آسان اسلوب تفہیم اور معجز طرزِ بیان عطا کیا گیا تھا جو کسی معلم و مصلح کو نصیب نہ ہوا۔

آپ عربی زبان کے مالک تھے۔ آپ کا ہر لفظ معنی کا مخزن، ہر کلمہ حقائق سے لبریز، ہر قول حکمتوں کا سرچشمہ اور جملہ فصاحت و لطافت کا مظہر تھا، جو تصنع اور خود ساختگی کے شائبہ سے پاک تھا۔

ایک دن آپ کے صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہم نے آپ سے زیادہ فصیح و بلیغ کسی کو نہیں دیکھا۔

آپ نے فرمایا، اس میں کیا شک ہے، قرآن تو میری اپنی زبان میں نازل کیا گیا ہے۔

آنحضرتؐ نے اپنی فصاحت کی خود اس طرح تعبیر پیش کی کہ آپ قریش میں پیدا ہوئے اور بنو سعد میں پرورش پائی۔ اس سے مراد یہ تھی کہ آپ کے اندر دیہات کے جرأت آمیز انداز اور شہر کے لطافت بخش آثار موجود تھے۔ آپ کا قریش میں پیدا ہونا اور بنو سعد میں نشوونما پانا اس پہلو پر روشنی ڈالتا ہے کہ آپ میں عرب کے ہر قبیلہ و گروہ کو اپنے لہجہ سے مخاطب کرنے کی قدرت پائی جاتی ہے۔ آپؐ

ایسے دلکش انداز، بلیغ اسلوب اور شستہ زبان میں کلام فرماتے کہ سننے والا خواہ قحطان یا عدنان کا ہو یا جنوبی جزیرہ کا، خواہ شمالی حجاز کا ہو یا تہامہ و نجد کا باشندہ ہو، خود بخود آپؐ کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ اسے اعتراف کرنا پڑتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فصاحتُ بلاغت کے امام ہیں۔

آپؐ کی گفتگو بہت روشن، صاف اور واضح ہوتی۔ اس میں ابہام اور اشتباہ کو دخل نہ ہوتا۔ آپؐ کی مجلس میں سے ہر شخص اس کو یاد کر سکتا تھا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہاری طرح تیز گفتگو نہیں فرماتے تھے بلکہ آپ رُک رُک کر صاف اور واضح کلام فرماتے تھے۔ آپؐ کے قریب بیٹھا ہوا ہر شخص اس کو محفوظ کر لیتا۔

حضرت عائشہؓ سے ایک اور روایت ہے کہ:

آپؐ اس طرح گفتگو فرماتے تھے کہ اگر کوئی شخص اس کو شمار کرنا چاہے، تو شمار کر سکتا تھا۔

عرب قوموں کو اپنی فصاحت و بلاغت پر بہت ناز تھا۔ اس غرض کے لیے ان کے بڑے بڑے میلے ہوا کرتے تھے جہاں وہ باہم اپنے ادبی مظاہرے کیا کرتے تھے، جس کے اشعار لاجواب ہوتے، ان کو جلی حروف میں لکھ کر کعبہ کی دیواروں پر آویزاں کیا جاتا تھا۔ ایسے لوگوں کے درمیان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور فصاحت و بلاغت کے ایسے جوہر دکھائے جن کی آب و تاب سے عرب کے فصاحت کے دعویداروں کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ انھی عربوں میں خواہ وہ جاہلیت کے ہوں یا اسلامی دور کے ابوبکرؓ قریش میں باعتبارِ حسب و نسب بہت ممتاز تھے۔ یہ بھی آنحضرتؐ کی فصاحت و بلاغت پر حیرت کرتے تھے۔ ایک دن ابوبکرؓ نے عرض کیا کہ میں عرب کے گلی کوچے اور یہاں کے بازار گھوم چکا ہوں، فصحاؑ کے بلیغ سے بلیغ کلام بھی سُن چکا ہوں، لیکن آپؐ کی فصاحت و بلاغت کے مقابلہ میں سب کو ہیچ پایا۔ یہ ادبی شان آپؐ میں کس نے پیدا کی، کس نے آپؐ کو یہ معجز بیانی سکھائی ہے؟

آپؐ نے فرمایا:

میرے پروردگار نے مجھے ادب سکھایا اور اعجاز بیان سے آراستہ و پیراستہ کیا۔

آپؐ کی فصاحت کی یہی سچی تصویر ہے کیونکہ آنحضرتؐ فطری طور پر فہیم و ذکی تھی۔ آپؐ کو منجانب اللہ غیر معمولی فہم و بصیرت، عقلِ سلیم اور طبعِ مستقیم عطا ہوئی تھی، جو آپؐ کے ہر قول و فعل میں جلوہ گر نظر آتی تھی۔

جاحظ، جو عربی ادب میں بہت بلند درجہ رکھتا ہے، آنحضرتؐ کے فصیح و بلیغ کلام کا نقشہ اس طرح کھینچتا ہے:

"خدا نے آپؐ کے کلام میں لطافت و محبت کی چاشنی پیدا کی تھی اور اس کو مقبولیت کا شرف عطا کیا تھا۔ اس میں شیرینی، دل آویزی اور شستگی بھی رہتی تھی۔ باوجود کلام کی تکرار اور سننے والے کو اعادہ کی عدم حاجت کے نہ آپؐ کے کلام کا وقار اور توازن گھٹتا نہ کسی کلمہ میں لغزش ہوتی، آپ کی فصاحت کا نہ کوئی دشمن مقابلہ کر سکا اور نہ کسی خطیب کو آپ کی فصاحت کی ہمسری کی ہمت ہوئی۔ آپؐ طول طویل خطبوں کو موزوں و مجمل کلام میں بیان فرما دیتے۔ آپ نے صداقت و واقعیت کو کبھی اپنے ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ آنحضرتؐ کے کلام میں جس قدر

راست بازی، انصاف پسندی، نفع رسانی اور وزن و وقار کا پہلو غالب تھا، اتنا کسی اور کے کلام میں ناپید تھا"

اب ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان اقوال و کلمات سے، جو مختلف مواقع پر استعمال کیے گئے، جن میں بے شمار معانی وحقایق پوشیدہ ہیں "مشتے نمونہ از خروارے" پیش کرتے ہیں۔ جس سے اندازہ ہوگا کہ آپ کی فصاحت و بلاغت کا سمندر کس قدر لامحدود اور زخار تھا۔ صدیاں گزرنے پر بھی اس قسم کی جودت طبع، طلاقت لسانی اور معجز بیانی کا ثبوت کوئی شخص پیش نہیں کر سکا۔

آنحضرتؐ فرماتے ہیں کہ میرے پروردگار نے مجھے نو (۹) چیزوں کا حکم دیا ہے:

۱۔ خفیہ و علانیہ حالت میں اور خلوت و جلوت میں خدائے تعالیٰ سے ڈرنا،

۲۔ غصہ اور خوشی کے وقت عدل و انصاف کو ملحوظ رکھنا،

۳۔ فقر و غنا میں میانہ روی اختیار کرنا،

۴۔ جو مجھ سے قطع تعلق کرے، میں اس سے صلہ رحمی کروں،

۵۔ جو مجھے محروم رکھے، میں اس پر بخشش و احسان کروں،

۶۔ جو مجھ پر ظلم و ستم ڈھائے، میں اس سے درگزر کروں،

۷۔ میرے ارادہ میں غور و فکر ہو،

۸۔ میری زبان پر ذکرِ خدا ہو،

۹۔ میری نظر سراپا عبرت ہو،

لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار پر یہ کلمات لکھے ہوئے پائے:

"جو تجھ پر ظلم کرے تُو اس کو معاف کر دے، جو تجھ سے رشتہ توڑے، تُو اس کو جوڑ دے، جو تجھ سے بدی کرے، تو اس پر اچھائی کا سلوک کر۔ ہمیشہ حق بات کہہ، خواہ اپنی ذات پر ہو۔"

ابن عباسؓ فرماتے ہیں، میں آنحضرتؐ کا ردیف تھا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

"اے لڑکے! اللہ کی حفاظت کر، خدا تیری حفاظت کرے گا۔ حق کی حفاظت کر، خدا کو تو اپنے قریب پائے گا۔ خوشحالی میں اللہ کی حمد و ثنا کر، تنگ دستی اور مصیبت کے وقت وہ تیری تعریف کرے گا۔ اگر تجھے کسی چیز کی حاجت ہے، تو تُو اللہ ہی سے مانگ۔ اگر تجھے امداد و اعانت درکار ہے، تو خدا ہی سے طلب کر۔ خدا نے جو چیز تیرے مقدر میں نہیں لکھی، اگر تمام لوگ بھی مل کر تجھے کچھ فائدہ پہنچانا چاہیں، تو ان سے نہ ہو سکے گا۔ قلم خشک ہو گئے اور دفتر تہہ کر دیئے گئے۔ اگر تیرے اندر تسلیم و رضا کے ساتھ اللہ کے لیے عمل کرنے کی قوت موجود ہے تو اسے کر گزر۔ اگر تجھ میں اتنی طاقت نہیں، تو مصیبت پر صبر کرنے میں بہت بہتری ہے۔ کامرانی و فتح صبر و عزیمت سے اور راحت و آسایش مصیبت و تکلیف کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ ہر تنگی کے بعد کشادگی اور ہر مشکل

کے بعد آسانی ہے اور تنگ دستی و مشکل ہرگز خوشحالی پر غالب نہیں آسکتی۔"

ابوذرؓ سے مروی ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا:

"تو جہاں کہیں ہو، خدا تعالیٰ سے خوف کر۔ بدی میں نیکی اور احسان کر، کیونکہ بھلائی برائی کو مٹا دیتی ہے۔ لوگوں سے حسنِ خلق اور نیک سلوک سے پیش آ۔"

ابن عمرو بن العاص بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"یہ دو خصلتیں جس شخص میں پائی جائیں گی، اللہ تعالیٰ اُس کے نام کے ساتھ صابر و شاکر لکھے گا۔ جس میں یہ صفات نہ پائی جائیں، وہ نہ شاکر کہلائے گا اور نہ صابر:

۱۔ جس شخص نے اپنے دین میں بڑے آدمی کو دیکھا اور اس کی اقتدا کی،

۲۔ جس نے اپنی دنیا میں اپنے سے کم مرتبہ شخص کو دیکھا اور اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان کی حمد و تعریف کی۔"

حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تم میں سے کوئی شخص خود کو ڈانواں ڈول ثابت نہ کرے (یعنی وہ شخص جو اپنی کمزوری کی وجہ سے نہ دوسروں کی رائے پر چلتا ہے اور نہ اپنی رائے پر ثابت قدم رہتا ہے) جو یہ کہتا ہے میں لوگوں کے ساتھ ہوں۔ اگر کوئی بھلائی کرے تو میں بھی احسان کروں گا۔ اگر وہ بُرائی کریں، تو میں بھی بدی کروں گا۔ لیکن تم اپنی رائے میں مستقل رہو۔ اگر لوگ بھلائی کریں، تو تم بھی ان کا اتباع کرو۔ اگر وہ بُرائی کریں، تو تم ان کی بدی سے احتراز کرو۔"

حضرت معاویہؓ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے حضرت عائشہؓ کو ایک خط میں لکھا کہ تم مجھے ایک جامع اور مختصر خط لکھو، جس میں میرے لیے کچھ وصیت ہو۔ چنانچہ انھوں نے ان کو لکھا:

"تم پر سلام ہو۔ بعد حمدِ خدا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا کہ جو شخص لوگوں کو ناخوش رکھ کر خدا تعالیٰ کو رضامند رکھے گا، خدا تعالیٰ اس کو لوگوں سے محفوظ رکھنے کا ذمہ لے گا اور اگر اللہ تعالیٰ کو ناخوش رکھ کر لوگوں کی خوشنودی تلاش کرے گا، تو خدا تعالیٰ اپنا ذمہ اس سے اٹھا لے گا اور لوگوں کے رحم و کرم پر اسے چھوڑ دے گا۔ والسلام علیک۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"انسان کے اندر یہ چیزیں نہایت بُری ہیں: بخیلی جو ہلاک کر دے اور وہ بزدلی جو مصیبت میں ڈالے۔ تم ظلم کرنے سے بچتے رہو کیونکہ ظلم قیامت کے دن کی ظلمتوں میں سے ہے۔ بخل سے بھی پرہیز کرو کیونکہ بخیلی نے تمہاری گزشتہ قوموں کو ہلاکت کے گھاٹ اتار دیا۔ ان کی خونریزی اور ہتک حرمت پر آمادہ کر دیا۔"

آپؐ نے فرمایا:

"خدا تعالیٰ نے تمہارے لیے تین چیزیں مذموم قرار دی ہیں، "قیل و قال"، "اضاعت مال" اور "کثرت سوال"۔

نیز آپ نے فرمایا:
"تم اپنے کسی بھائی کو گالیاں نہ دو۔ ایسا نہ ہو کہ خدا تعالیٰ اس کو معاف کر دے اور تم کو مصیبت میں مبتلا کر دے۔"
نیز آپ نے ارشاد فرمایا:
"کیا میں تمہیں بتاؤں، تم میں سے بُرا شخص وُہ ہے، جو تنہا کھاتے، اپنے غلام پر تازیانے لگائے اور اس پر رحم نہ کرے۔"
ابوہریرہؓ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:
"عنقریب وُہ دَور آئے گا، جب تو ایسی قوم کو دیکھے گا کہ ان کے ہاتھوں میں گائے کی دُم ہوگی اور وہ خدا کے غضب میں صبح و شام کریں گے۔"
نیز آپ نے فرمایا کہ دو قسم کے لوگ جہنمی ہیں:
"ایک وہ، جن کے پاس گائے کی دموں کی طرح کوڑے ہوں گے، جن سے وہ لوگوں کو مارتے رہیں گے۔
دوسرا گروہ ان عورتوں کا ہوگا، جو اوڑھی ہوئی ہیں، مگر ننگی ہیں۔ لوگوں کے دلوں کو مائل کرنے والی اور خود ان کی طرف مائل ہونے والی ہیں۔ ان کے سر اونٹ کے کوہان کی طرح ہوں گے۔ وہ جنت میں داخل ہوں گی نہ اس کی بُو ہی سونگھ سکیں گی۔"

نیز آپ نے ارشاد فرمایا:
"دو نعمتیں ایسی ہیں جن میں اکثر لوگوں کو نقصان پیش ہوتا ہے: ایک تندرستی، دوسری فارغ البالی۔"
اس معنی خیز اور حقیقت پرور کلمات میں غور کیجئے اور دیکھیے کہ ان کے اندر کتنی حکمتیں پوشیدہ ہیں۔ اس شخص کی صحبت میں کوئی بھلائی نہیں، جو تمہیں ویسا نہ چاہے جیسا کہ تم اس کو چاہتے ہو۔ لوگ اپنے زمانے سے مشابہت رکھتے ہیں۔ میری امت جب تک امانت کو غنیمت اور صدقہ کو فرض سمجھے، بھلائی میں رہے گی۔ بخل کی اطاعت کیشی نفسانی خواہشوں کی پیروی اور خود پسندی سے بچتے رہو۔ کیونکہ یہ چیزیں ہلاکت میں ڈالنے والی ہیں۔
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک منصف مزاج اور حقیقت پسند خطیب تھے۔ اپنی بصیرت افروز حقیقتوں کو لوگوں کے دلوں میں اور کانوں تک اس انداز میں پہنچاتے کہ وہ ان میں سرایت کر جاتیں۔ آپ رنگین کلامی، فضول باتوں اور لفاظی سے لوگوں کے دلوں کو مسخر کرنے کا کبھی قصد نہ فرماتے تھے۔ آپ خواہ مخواہ کی فصاحت چھانٹنے اور منہ بنا بنا کر گفتگو کرنے کو نہایت ناپسند جانتے تھے۔ آپ کی گفتگو حد درجہ واضح اور ظاہر ہوتی، جو دل و دماغ میں فوراً اثر انداز ہو جاتی۔ آپ طول طویل خطبے، ایجاز و اختصار کے ساتھ دیا کرتے تھے، جو حشو و زوائد سے خالی ہوتے تھے۔ حاصل کلام یہ کہ آپ کے کلام میں ایجاز کامل کے ساتھ اعجاز اکمل بھی پایا جاتا تھا۔
ابُوسعیدؓ خدری فرماتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے ہمیں عید کی نماز پڑھائی، پھر خطبہ دیا۔ قیامِ قیامت کے متعلق جس قدر

شواہد و آثار تھے، وہ تمام ہمارے روبرو پیش کیے۔ بعضوں نے اس کو یاد کرلیا اور بعض کو بھول گئے۔ آپؐ نے اپنے خطبہ میں فرمایا:

"دنیا ایک دلکش سبز باغ ہے۔ خدا تعالیٰ نے تمھیں دنیا کا خلیفہ اور اپنا نائب بنایا ہے۔ وہ دیکھ رہا ہے کہ تم کیسا عمل کرتے ہو۔ سنو! دنیا سے بچتے رہو۔ عورتوں کے معاملہ میں اتقیا ظاہر تو۔ جب کسی شخص کو حق بات کا علم ہو جائے، تو اس کو بلا خوف و خطر کہہ دے۔ اور لوگوں کے خوف کا اندیشہ نہ کرے۔ آگاہ ہو جاؤ، ہر فریبی اور غدار کے لیے قیامت کے دن اس کے دھوکے اور فریب و غدر کے مطابق ایک جھنڈا نصب کیا جائے گا۔ نافرمان امام کے دھوکے سے بڑھ کر اور کوئی غدّار نہیں ہے۔ غصہ انسان کے دل میں گویا ایک چنگاری ہے جس سے اس کی دونوں آنکھیں سرخ انگارہ ہو جاتی ہیں اور رگیں پھول جاتی ہیں۔ اگر اس کا احساس ہونے لگے، تو اپنے مقام سے اُٹھ جانا چاہیے۔"

پھر ذرا اس خطبہ کو بھی ملاحظہ کیجئے، جس کو آپؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر عرفات کے میدان میں ایک لاکھ آدمیوں کے سامنے ارشاد فرمایا۔ جو زندگی کے اکثر و بیشتر بنیادی امور اور شریعت کے ٹھوس اصول پر حاوی و محیط ہے۔ اس کے اندر آپ نے جاہلیت کے رسم و رواج کو مٹا دیا۔ باہم مساوات کو قایم کیا۔ انتقام کے پست ترین جذبات کو فنا کر دیا اور عصبیت کی دبی ہوئی چنگاریوں کو، جو عربوں میں آناً فاناً صرف ایک جھونکے سے بھڑک جایا کرتی تھیں، ایک دم بجھا دیا۔ اسی طرح سود کو بھی حرام کر دیا۔ عورت کی شان و منزلت بڑھائی۔ فتنہ و فساد، لوٹ مار اور آپس کے جنگ و جدل کو جو عربوں کے عزت و وقار کا سرمایہ تصور کیا جاتا تھا، مطلقاً حرام قرار دیا۔ حرمت والے کو حلال قرار دیا اور حرام و حلال اوقات کو بیان فرمایا کیونکہ اہلِ روم خاص مہینوں میں عربوں سے جنگ کرنے کو حرام قرار دینے میں انتہائی غلو برتتے تھے اور ان کے حدود سے تجاوز کر جاتے تھے۔ الغرض آپ نے لوگوں کو مختلف احکام و اوامر کی نصیحت فرمائی اور جن گناہوں کو حقیر اور اعمال کو کمتر جانتے تھے، ان سے خوف دلایا۔

آپؐ نے خطبہ کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا:

"لوگو! تم اچھی طرح کان دھر کر سنو! کیونکہ نہیں معلوم میں اس سال کے بعد پھر اس جگہ تم سے خطاب کر سکوں۔

لوگو! زمانہ اس وقت سے اب تک اپنی گردش میں مصروف ہے، جب سے کہ اللہ نے آسمان و زمین کو پیدا کیا۔ بارہ مہینوں کا ایک سال ہے۔ ان میں سے چار مہینے حرمت و تعظیم والے ہیں۔ یہ تین تو مسلسل ہیں: ذی القعدہ، ذی الحجہ، محرم اور چوتھا رجب، جو شعبان اور جمادی کے مابین ہے۔ یہ مہینا کون سا ہے؟ کیا ذی الحجہ نہیں ہے؟

لوگوں نے عرض کیا: بے شک وہی ہے۔

آپؐ نے فرمایا: یہ شہر کون سا ہے؟ کیا یہ وہی شہر نہیں ہے؟

لوگوں نے کہا: بے شک۔
آپ نے فرمایا: یہ دن کون سا ہے؟ کیا قربانی کا دن نہیں ہے؟
لوگوں نے جواب دیا: بے شک۔
پھر فرمایا: تمھارے خون، تمھارے مال اور تمھاری آبروئیں تم پر حرام ہیں۔ جیسا کہ یہ دن، یہ مہینا اور یہ مقدس شہر حرمت والے ہیں، تم عنقریب اپنے پروردگار سے جا ملو گے اور اپنے اپنے اعمال کے متعلق پُوچھے جاؤ گے۔

سُنو! میرے بعد کہیں تم گمراہ نہ ہو جانا کہ ایک دُوسرے کی گردنیں مارتے پھرو۔ تم میں سے جو شخص یہاں حاضر ہے، اپنے دُوسرے غیر حاضر شخص کو میرا پیغام پہنچا دے۔ شاید وہ لوگ، جن کو یہ پیغام پہنچا ہے، بمقابلہ سننے والوں کے زیادہ یاد رکھنے والے ہوں۔ کیا میں نے اپنا پیام پہنچا دیا۔ کیا میں نے اپنی تبلیغ کا فرض انجام دے دیا؟ جس شخص کے پاس کوئی امانت ہو، اس کو اس کے حقدار تک پہنچا دے۔ ہر سُود ساقط کر دیا جاتا ہے۔ ہاں تمھارا راس المال تم رکھ سکتے ہو، تاکہ کسی پر ظلم نہ ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ راس المال سُود نہیں ہے۔ عباس بن عبدالمطلب کا جتنا سُود ہے، وہ سب ساقط کر دیا جاتا ہے۔ جاہلیت کی جس قدر خونریزی اور دیت تھی، وہ تمام معدوم کر دی جاتی ہے۔ سب سے پہلے میں عبدالمطلب کے بیٹے حارث بن ربیعہ کی خونریزی کو معاف کرتا ہُوں۔

لوگو! اب شیطان جزیرۂ عرب میں بتوں کی عبادت سے مایوس ہو چکا ہے۔ مگر اس کے علاوہ دیگر چیزوں میں اس کو اپنی اطاعت کی توقع ہے۔ تم اپنے جن اعمال کو حقیر سمجھتے ہو، وہ ان سے خوش ہو گیا ہے۔ تم اپنے دین میں شیطان سے ڈرتے رہو۔

لوگو! بے شک نسئی کفر میں زیادتی کا موجب ہے۔ کافر لوگ اس سے گمراہ ہو جاتے ہیں۔ ایک سال تو اس کو حلال کر دیتے ہیں اور دوسرے سال اس کو حرام، تاکہ اللہ تعالیٰ نے جو تعداد حرمت کی مقرر کی ہے، اس کی موافقت ہو جائے۔ اس لیے وہ اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال کر دیتے ہیں۔

لوگو! تم پر تمھاری عورتوں کا حق ہے اور ان پر بھی تمھارا حق ہے۔ تم پر ان کا یہ حق ہے کہ وہ تمھارے سوائے کسی ایسے شخص سے ربط و ضبط نہ رکھیں، جس کو تم ناپسند کرتے ہو اور کوئی فاش غلطی نہ کر بیٹھیں۔ اگر وہ اس طرح کریں تو اللہ تعالیٰ نے تمھیں اجازت دی ہے کہ تم ان کو اپنے بستروں سے الگ کر دو اور ان کو پہلے تو ہلکی سی سزا دو، اگر وہ اس سے باز رہ جائیں، تو ان کے لیے ان کا کھانا اور کپڑا ہے۔

اے لوگو! تم عورتوں کو بھلائی کا حکم دو (یعنی مرتے وقت مال اور ورثہ کی وصیت کرو) کیونکہ وہ تمھارے پاس قیدیوں کے مانند ہیں، ان کو اپنے آپ کسی چیز پر قابو نہیں ہے۔

اے لوگو! تم میری باتوں کو سمجھ لو۔ میں نے اپنی تبلیغ کا فرض ادا کر دیا۔ میں نے تم میں دُو چیزیں یعنی کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہؐ چھوڑی ہیں۔ جب تک ان کو مضبوطی سے تھامے رہو گے، ہر گز گمراہ نہ ہو گے۔

اے لوگو! میری باتیں سنو اور سمجھو اور جان رکھو کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اپنے ایک بھائی کا مال دُوسرے پر حرام ہے۔ لیکن ہاں اگر وُہ اپنی خوشی سے دے دے، تو جائز ہے تاکہ تم اپنے نفسوں پر ظلم نہ کر بیٹھو۔ اے خدا! کیا میں نے اپنا تبلیغی فرض پورا کر دیا ہے؛

لوگوں نے بیک آواز جواب دیا: بے شک۔

آپؐ نے فرمایا: اے اللہ! تو گواہ ہے۔ پھر آپؐ اپنی اونٹنی پر سے اُتر گئے۔

اس خطبہ میں زندگی کے اہم اصولوں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ جن لوگوں نے اس خطبہ کے وقت عرب کی اجتماعی حالت بلکہ تمام انسانی سوسائٹی کی کیفیت کا مطالعہ کیا ہے، وُہ بخوبی جانتے ہیں کہ یہ خطبہ آنحضرتؐ کے ظہور قدسی کے بعد ایک اہم اجتماعی انقلاب کا پیش خیمہ اور زبردست اصلاحی نظام کے لیے سنگِ بنیاد تھا۔ اس کے اندر تمام امراض وعلل کی تشخیص اور ان کا علاج، تہذیب وعمران کے وہ زرّیں اصول اور ارتقاء کے وہ اسرار و رموز پوشیدہ ہیں، جنھوں نے عرب کے جاہلوں اور گمراہوں کے اندر وُہ عظیم الشان روح پھونکی اور ایک ایسی قوم بنا دیا، جو مشرق و مغرب میں صدیوں تک حکمرانی کرتی رہی۔

زمانہ خواہ کتنا ہی پلٹا کھائے اور گزشتہ یادگاروں کو مٹانے کی کوشش کرے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی فصاحت و بلاغت کا سرچشمہ اپنی لطافت خیز رفتار اور ترنّم ریز آواز کے ساتھ جاری رہے گا اور علم و ادب کے شیدائیوں اور دلدادگان کو ایسا سرور و کیف بخشے گا، جس میں ہر ادیب اپنے دل میں وجدانی کیفیت اور رُوح میں تسکین محسوس کرے گا۔

دورِ نبوی میں عرب قوم

گلزار حسین

چھٹی صدی عیسوی میں دنیائے تہذیب و تمدن اور جہانِ عمرانیت و معاشرت مکمل طور پر مسخ ہو چکا تھا۔ کفر، الحاد، شرک، ظلم و استبداد اور بے حیائی کی تاریکی نے ہر طرف سے انسانیت کو گھیر رکھا تھا۔ عرب کی حالت بھی ان سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔ وہاں بھی اصنام شکن حضرت ابراہیمؑ کی اولاد نے پھر سے شیوۂ آذری اختیار کر رکھا تھا۔ ستاروں کی پرستش اور بتوں کی پوجا مکمل طور پر حاوی تھی۔ ارواحِ خبیثہ اور بھوت پریت پر بھی ان کا اعتقاد تھا، جنھیں یہ خدا کا مقرب سمجھ کر پوجتے تھے۔

جاہلیت کی بنا پر ان کی اخلاقی حالت بھی نہایت پست تھی اور روزمرہ کی زندگی میں وحشت و بربریت عیاں تھی۔ مثلاً کھانے پکانے میں حرام و حلال تو ایک طرف، نفیس و خبیث کی بھی تمیز نہ تھی۔ حشرات الارض ان کی عام غذا تھی۔ چھپکلیوں کو کھا جاتے تھے۔ مردہ جانوروں اور چمڑے تک کو بھون کر کھا لیتے تھے۔ درندگی کا یہ عالم کہ زندہ اونٹ کی کوہان اور دنبہ کی دُم کی چکی کاٹ کر کھا لیتے۔

عائلی زندگی میں باپ کے مرنے کے بعد اس کی تمام بیویاں، سوائے حقیقی ماں کے بیٹے کی وراثت میں آجاتیں اور اس کی جائز بیویاں سمجھی جاتیں۔ بیویوں کی تعداد کی کوئی حد نہ تھی۔ عارضی نکاح کا رواج تھا اور بدکاری عام اور مختلف شکلوں میں تھی۔ شجاعت اور بہادری میں کسی کی شہرت سنتے تو اپنی بیوی اس کے پاس بھیج دیتے تاکہ بہادر اولاد پیدا ہو۔

بے شرمی کی یہ کیفیت کہ حج میں ہزاروں لوگ جمع ہوتے لیکن قریش کے سوا سب عورتیں مرد برہنہ ہو کر طوافِ کعبہ کرتے۔ شراب پانی کی طرح پیتے۔ حد یہ کہ عورتیں اور بچے ساقی گری کرتے۔ اسی شراب کے عشق کی وجہ سے ان کی زبان میں اس کے تقریباً ۲۵۰ نام ہیں۔ شراب کے ساتھ قمار بازی لازمی ہوتی تھی اور اس کا شمار ان کے ہاں قومی مفاخر میں تھا۔

معاشی زندگی میں سُود خواری کا نظام رائج تھا۔ عورتوں اور بچوں تک کو گروی رکھوا لیا جاتا تھا۔ سرمایہ داروں کے ظلم و ستم کی وجہ سے لوٹ مار عام تھی اور بعض قبائل کا ذریعہ معاش ہی لوٹ مار اور ڈاکہ زنی تھا کہ عورتوں اور بچوں کو لوٹ کر دوسری جگہ فروخت کر دیتے۔ شرفاء لڑکیوں کو موجبِ شرم و عار سمجھتے تھے اور اس سے بچنے کے لیے زندہ دفن کر دیتے تھے۔

ان سب سے بڑھی ہوئی خرابی ان کے ہاں خانہ جنگی کی تھی۔ ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کے خون کا پیاسا رہتا تھا اور انتقام نسلاً بعد نسلٍ وراثتاً چلتا تھا۔ معمولی معمولی باتوں پر خون کی ندیاں بہہ جاتی تھیں۔ قانون اور مرکزیت نہ ہونے کی وجہ سے کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا۔ ان تمام نقائص و عیوب کے باوجود ان میں کچھ ایسی خصوصیات بھی تھیں جو صرف انہی میں تھیں اور آج بھی ہمیں تہذیب و تمدن کی ترقی یافتہ دنیا میں کہیں نظر نہیں آتیں۔

حجاز کا عرب نہ کسی کا محکوم تھا اور نہ ہی ہوسِ ملک گیری اس میں تھی۔ یہ خصوصیت ساری دنیا میں اس سرزمین کو حاصل تھی کہ

زندگی کی نمود سے لے کر اُس وقت تک کسی غیر نے ان پر حکومت نہیں کی تھی۔ غیر تو غیر خود اپنوں کی بھی کوئی منظم حکومت قایم نہیں تھی۔

یہ کیفیت ان کی مذہبی دنیا میں بھی تھی یعنی کسی خاص مذہب کا کوئی اثر نہ تھا۔ محض اپنی ذوق بندگی کے لیے کچھ معبود وضع کر رکھے تھے جس طرح جی میں آتا، ان کی پرستش کر لیتے۔ لیکن اس پرستش میں بھی وہ لوگ اپنے معبودوں کے تابع نہیں تھے۔ امرا القیس کا واقعہ ہے کہ وہ اپنے باپ کے قتل کا انتقام لینے کے لیے گھر سے نکلا تو پہلے اپنے بُت کے مندر میں گیا تاکہ اپنے معبود سے اس باب میں استصواب کرے۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ تیر پھینک کر فال لیتے تھے۔ چنانچہ پہلا تیر پھینکا تو جواب نفی میں ملا۔ دوسرا پھینکا تو بھی نفی اور تیسرا پھینکا تو بھی نفی ہی میں نکلا۔ اس نے ترکش اٹھا کر بُت کے مُنہ پہ مارا اور کہا: ملعون! تیرا باپ قتل کر دیا جاتا تو میں دیکھتا کہ تُو کس طرح کہتا ہے کہ انتقام نہیں لینا چاہیے۔

سادہ زندگی اور سیدھے سادے ماحول کے ساتھ ساتھ صحرا کی وسعت نے ان کی نگاہوں میں سیر چشمی، ارادوں میں بلندی، عزم میں پختگی اور خیالوں میں فرخندگی پیدا کر دی تھی۔ ان کی مہمان نوازی آج بھی ضرب المثل کے طور پر بیان کی جاتی ہے۔

ایفائے عہد کی یہ حالت کہ جان پر بن جائے، گھر تباہ ہو جائے، دنیا بھر سے لڑائی مول لینی پڑے مگر کیا مجال کہ ایک دفعہ عہد دینے کے بعد پھر جائے۔ ایک دفعہ امرا القیس نے اپنی تلواریں اور زرہیں سموال کے پاس بطور امانت رکھیں۔ حارث غسانی نے انھیں سموال سے طلب کیا تو اس نے امانت داری کے خلاف سمجھ کر دینے سے صاف انکار کر دیا۔ حارث نے ایک جرار لشکر لے کر چڑھائی کر دی، سموال میں تابِ مقابلہ نہ تھی، اس لیے اپنے قلعہ میں محصور ہو گیا۔ اتفاقاً سموال کا بیٹا قلعہ سے باہر رہ گیا تھا جو پکڑا گیا۔ حارث نے سموال کو پکارا۔ وُہ قلعہ کے بُرج پر آیا تو حارث نے کہا کہ امرا القیس کی زرہیں وغیرہ اب بھی میرے حوالے کر دو، ورنہ تمہارے بیٹے کو ابھی قتل کر دوں گا۔ اس نے اس پر بھی دینے سے صاف انکار کر دیا اور آنکھوں کے سامنے بیٹے کو ذبح ہوتے دیکھنا گوارا کر لیا۔

اسی طرح رفاقت میں بھی کبھی جان کی پروا نہیں کرتے تھے اور احسان کا اس قدر پاس کہ بدلہ ادا کیے بغیر چین نہیں آتا تھا۔ شجاعت کا یہ عالم کہ میدانِ جنگ ان کے لیے کھیل کا میدان بن چکا تھا۔ بستر پر مرنا ان کے لیے بڑی ذلّت کی موت تصور کی جاتی تھی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ موت ان کے نزدیک ایک کھیل تھا۔ مرد تو مرد، عورتوں کی بھی یہی کیفیت تھی کہ موت سے انھیں کسی قسم کا خوف ہی محسوس نہیں ہوتا تھا۔

لیکن ان تمام چیزوں سے بڑھ کر احساسِ برتری کا جذبہ ان کی پُوری زندگی پر چھایا ہُوا تھا۔ کوئی گوارا نہیں کرتا تھا کہ دوسرا اس کی ہمسری کا دعوٰی کرے۔ ایک فرد کی دُوسرے فرد سے آگے بڑھنے کی تمنّا، ایک قبیلے کی دُوسرے قبیلے پر مسابقت کی آرزو انھیں سب کچھ بھلا دیتی۔ بنواُمیہ اور بنوہاشم ایک ہی لڑی کی دو شاخیں تھیں مگر باہمی رقابت انتہا کو پہنچی ہُوئی تھی۔ ابوجہل سے جب ایک شخص نے پُوچھا کہ محمدؐ کی دعوتِ اسلام کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟ تو اس نے صاف کہا کہ میں کیا کہوں محمدؐ کے خاندان نے عزّت و شرف میں دعویٰ برتری کیا او ثبوت میں دعوتیں کھلائیں۔ اس کے جواب میں اسی شان کے ساتھ ہم نے بھی دعوتیں دیں۔ انھوں نے خُون بہا دیئے، ہم نے بھی دیئے۔ انھوں نے بڑی بڑی فیاضیاں کیں، ہم نے بھی کیں۔ ہم دونوں خاندان ہم پلّہ ہو چکے تھے کہ دفعتاً ان کی طرف سے یہ دعوٰی ہُوا کہ ہمارے خاندان میں نبوت اور آسمان سے وحی آ گئی ہے، اب ہم کہاں تک برداشت کریں۔

نسلی تفاخر انتہائی شدّت سے کار فرما تھا۔ وہ ہر غیر عرب کو عجم یعنی گونگا کہتے تھے۔

سچائی کا یہ عالم کہ جب ابوسفیان ہرقل کے دربار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف رومیوں سے مدد مانگنے کو گیا تو ہرقل نے نبی اکرم کے بارے میں پوچھا کہ وُہ کس سیرت کے مالک ہیں۔ اس وقت بھی ابوسفیان اس ذات اقدس و اعظم کے بارے میں جس کو وُہ لوگ اپنا سخت دشمن سمجھتے تھے، سچائی سے روگردانی نہ کر سکا اور کہا کہ اس کی ساری زندگی میں ہم کسی بات پر انگلی نہیں رکھ سکتے سوائے اس کے کہ وُہ ہمارے خداؤں کے خلاف ہے۔

برادران! یہ تھی وُہ قوم جس نے رُشد و ہدایت کے اس بارِ عظیم کو اٹھانا تھا، جو انسانیت کو اس کی منزل و منتہا پر رہتی دنیا تک لے جانے والا تھا۔

جبّار و قہّار

خدا جَبّار ہے، اسمائے حسنیٰ میں جبّار کے معنی وہ نہیں جو عوام نے سمجھے اور جبر کو ظلم و ستم کا مترادف خیال کیا بلکہ جبّار کے معنی ہیں "شکستہ دلوں کی شکستگی کو دُور کرنے والا۔ دکھیاؤں کے درد دُکھ کو توڑ دینے والا۔"

خدا قہّار ہے یہاں بھی قہر بمعنی غیظ و غضب نہیں، بلکہ قہر کے معنی حکومت ہیں۔ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ۔ وہ اپنے بندوں پر حکمران ہے۔

إِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيمٍ

بے شک آپ بہترین اخلاق پر ہیں

(القلم : ۴)



اَخلاقی اِصلاح

اوصافِ رسولؐ

حافظ مفتی محمد انوار الحق

سادہ زندگی

جناب سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کی زندگی بھی دنیوی اعتبار سے اوّل سے آخر تک نشیب و فراز کا ایک عجیب مرقع ہے آپ ولادت سے پہلے تو یتیم ہو گئے۔ ہوش سنبھالنے نہ پائے تھے کہ موت نے ماں کی آغوشِ محبت سے جُدا کر دیا اس کے چند ہی دن بعد دادا کا سایۂ شفقت بھی سر سے اُٹھ گیا۔ غرض بچپن یوں یتیمی اور بیکسی میں گزرا۔ جوان ہوتے تب بھی ایک مدت عُسرت و ناداری رفیق رہی۔ پھر یکایک قدرت نے دولتِ ظاہری کو بھی قدموں پر ڈال دیا اور آخر چالیس برس کے سن میں خالقِ کون و مکان اور صانعِ زمین و آسمان کی طرف سے آپ کو وہ خلعتِ نبوت عطا ہوا جس کے سامنے کائنات کی بڑی سے بڑی نعمت بھی کچھ وقعت نہیں رکھتی لیکن اس کے ساتھ ہی، ہر چہار طرف سے دشمنیوں اور پریشانیوں کا بھی سامنا ہوا یہاں تک کہ آخر دس برس کی بے شمار تکلیفوں اور مصیبتوں کے بعد عزیزوں کی مخالفت نے وطن کی مفارقت پر مجبور کیا۔ اب پھر آہستہ آہستہ زمانے نے رنگ بدلا اور ایک عمر ناکامی کے بعد خدا نے اس منشاءِ عالیہ کی تکمیل کا سامان مہیا کیا جس کے لیے آپ مبعوث ہوئے تھے یہاں تک کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کی صداؤں نے حدودِ عرب سے نکل کر قیصر اور کسریٰ کے ایوانوں میں غلغلہ ڈال دیا۔ مگر ان سارے تغیرات اور انقلابات میں ایک بات جو سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ یہ ہے کہ آنجناب نے ہمیشہ ایک ہی طور پر زندگی بسر فرمائی، جب کچھ نہیں تھا تب بھی دل غنی تھا، جب خدا کی عنایت سے سب کچھ ہو گیا تب بھی غرور یا نخوت یا تصنّع یا نمائش مطلق چھُو نہیں گئی اور ایسا ہو بھی کیونکر سکتا تھا اس شہنشاہِ ہر دوسرا کی نظروں میں ان حطامِ دنیوی کی وقعت ہی کیا تھی کہ اس سے طبیعت پر کچھ اثر پڑتا۔

اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِیْنَۃُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ الْبٰقِیٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَیْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَیْرٌ اَمَلًا (کہف، ع ۹)	مال اور اولاد حیاتِ دنیا کی زینت ہیں اور باقی رہنے والے نیک کام تیرے رب کے نزدیک بہ لحاظ ثواب بھی بہتر ہیں اور بہ لحاظ امید بھی۔

آپ جس طرح بچپن میں بکریاں چرایا کرتے تھے ایسے ہی نبوت اور سلطنت مل جانے کے بعد بھی بکریوں کا دُودھ دوہا کرتے تھے۔ اور دودھ دوہنے پر ہی کیا موقوف ہے آپ نے کبھی اپنے ذاتی کاموں کے لیے اپنے خدام تک کو تکلیف نہیں دی اور ہمیشہ اپنا سب کام آپ اپنے ہاتھوں سے کیا۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اپنے آپ کو دنیوی کام کاج میں اوروں سے ممتاز نہیں کیا بلکہ جیسے تم سب لوگ اپنے گھروں میں اپنا کام کرتے ہو،

ایسے ہی آپ بھی کیا کرتے تھے۔ آپ خود ہی اپنی بکریوں کا دودھ دوہتے تھے، خود ہی اپنے کپڑے سیتے تھے، خود ہی جوتیاں گانٹھ لیتے تھے۔ غرض اپنے سب کام خود کر لیتے تھے۔" (بخاری و ترمذی)

کئی بار ایسا اتفاق ہوا کہ کسی نے بے احتیاطی اور لاپروائی سے مسجد میں تھوک دیا یا ناک صاف کی تو گو آپ کو یہ بات بہت ناگوار گزری مگر آپ نے اسے اپنے ہاتھ سے خود صاف کر دیا اور فرمایا کہ "جب تم میں سے کوئی نماز پڑھنے کو کھڑا ہوتا ہے تو وہ گویا اپنے معبود سے سرگوشی کرتا ہے اور اس کا پروردگار اس کے اور قبلے کے بیچ میں ہوتا ہے' اس لیے تم کو کبھی مسجد میں اپنے سامنے نہ تھوکنا چاہیے۔" (بخاری ص ۵۸)

مدینہ منورہ میں جب مسجد نبوی کی تعمیر ہو رہی تھی تو آپ بہ نفس نفیس سب کاموں میں شریک تھے یہاں تک کہ معمولی مزدور کی طرح آپ بھی اینٹیں اٹھا اٹھا کر لاتے تھے۔ (بخاری ص ۵۵۵)

اسی طرح غزوۂ خندق کے موقع پر آپ نے بھی کھائی کھودنے میں سب لوگوں کا ساتھ دیا اور خود اپنے ہاتھوں سے مٹی اٹھانے اور پتھر توڑنے میں تامل نہیں فرمایا یہاں تک کہ صدر مبارک گرد آلود ہو گیا۔ (بخاری ص ۲۱۸)

غرض آپ کو کسی کام کے کرنے میں بھی عار نہیں ہوتا تھا بلکہ ہمیشہ صرف اپنا ہی کام نہیں بلکہ اوروں کا کام بھی خود کر دیا کرتے تھے اور اس میں آپ اور آپ کے ادنیٰ ترین خادم میں کچھ فرق نہ ہوتا تھا۔

کھانے میں آنجنابؐ کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ آپ کی غذا عموماً جَو کی روٹی ہوتی تھی۔ (بخاری و ترمذی ص ۵)

اور چونکہ اس سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کے یہاں چھلنی نہیں تھی اس لیے اس کی بھوسی پھونک مار کر ہٹا دی جاتی تھی۔ اس سے زیادہ نازک مزاجی اور ذائقہ طلبی کی اس مطبخ میں اجازت نہ تھی۔ (ترمذی ص ۷۷ھ)

مگر طرہ یہ ہے کہ ایسا اوقات یہ بھی نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں کبھی آپ کو اور آپ کے اہل و عیال کو پیٹ بھر کر جَو کی روٹی بھی متواتر دو دن تک نہیں ملی۔ (ترمذی ص ۷۷ھ)

ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا کہ "ہم اہلبیت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں بعض دفعہ ایک ایک مہینہ تک آگ نہیں جلی اور ہم صرف کھجوروں اور پانی پر گزارا کرتے رہے۔" (شفا ص ۶۳)

ابو طلحہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم نے بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر ہو کر بھوک کی شکایت کی اور دامن اٹھا کر دکھایا کہ پیٹ پر پتھر باندھ رکھے تھے۔ جناب رسالتمآبؐ نے ہماری تسکین کے لیے اپنا دامن اٹھایا تو ہم نے دیکھا کہ شکم مبارک سے دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔ (مشکوٰۃ ص ۳۸۱)

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے دودھ شریک بھائی مسروق اُن کے پاس آئے حضرت عایشہؓ نے کھانا منگوایا اور فرمانے لگیں کہ "جب میں سیر ہو کر کھانا کھاتی ہوں تو مجھے رونا آتا ہے۔" انھوں نے پوچھا کہ کیوں؟ آپ نے جواب دیا کہ "مجھے آپؐ کا زمانہ یاد آجاتا ہے کہ جب تک آپ بحیات رہے خدا گواہ ہے کہ کبھی ایک دن میں دو بار سیر

ہو کر روٹی نہیں کھائی۔" (ترمذی ص ۵۰۸)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ "جناب رسالت مآبؐ نے عمر بھر خوان پر کھانا نہیں کھایا اور نہ کبھی چھنے ہوئے باریک آٹے کی روٹی تناول فرمائی۔" (ترمذی ص ۵۰۸)

ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ آپؐ نے کبھی کسی کھانے کو بُرا نہیں کہا۔ جو کچھ موجود ہوتا تھا وہی تناول فرما لیتے۔ اور بھوک نہیں ہوتی تھی تو چھوڑ دیتے تھے۔" (بخاری ص ۸۱۴)

ملبوسات کو دیکھیے کہ آنجنابؐ کا لباس قمیص، چادر، تہبند یا ازار اور عمامہ تھا۔ یہ سب چیزیں بالعموم سُوتی اور معمولی قسم کے کپڑے کی ہوتی تھیں۔ ریشم کا استعمال تو آپ نے اپنی اُمت میں مردوں کے لیے ناجائز فرما دیا تھا اور خود آپ کے لباس میں تو قطعاً کسی قسم کی بھڑک اور نمایش ہوتی ہی نہ تھی۔ موزے آپ کو ایک مرتبہ نجاشی (شاہِ حبش) نے اور ایک بار ایک شخص وحیہ نے تحفۃً بھیجے تھے۔ پاپوش مبارک چمڑے کی تھیں جن میں دو تسمے کے بند لگے ہوئے تھے ان سے وہ انگلیوں میں باندھ لی جاتی تھیں۔

آپ کے آرام فرمانے کی یہ کیفیت تھی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پُوچھا گیا کہ "آنجناب کا بستر آپ کے گھر میں کس چیز کا تھا؟" اُنھوں نے فرمایا کہ "ادھوڑی کا جس میں کھجور کی چھال بھری ہوتی تھی۔" (بخاری و ترمذی ص ۵۹۴)

یہی سوال حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بھی کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ "ایک ٹاٹ کا ٹکڑا تھا جسے ہم دُہرا کر دیا کرتے تھے۔ آنجنابؐ اسی پر استراحت فرماتے تھے۔ ایک رات میں نے خیال کیا کہ اگر اس کی چار تہیں کر دیں تو غالباً آپ کو زیادہ آرام ملے۔ چنانچہ ہم نے ایسا ہی کیا، جب صبح ہُوئی تو آنجنابؐ نے پُوچھا کہ "رات تم نے میرے لیے کیا بچھایا تھا؟" میں نے کہا "وہی آپ کا ٹاٹ تھا، مگر ہاں ہم نے اُس کی چار تہیں کر دی تھیں تاکہ آپ کو زیادہ آرام ملے۔" آپ نے فرمایا کہ نہیں اسے تو جیسا پہلے تھا ویسا ہی کر دو۔ اس نے مجھے رات ہی کو نمازِ شب سے باز رکھا۔ (ترمذی ص ۵۹۴)

سواریوں میں آنجناب کو گدھے پر سوار ہونے سے عار نہ تھا۔ چنانچہ آپ فتح خیبر کے دن گدھے پر سوار تھے جس کی لگام کھجور کی چھال کی تھی۔ انسؓ سے روایت ہے کہ "آپ حج کے لیے تشریف لے گئے تو آپ کے اونٹ کا پالان پُرانا تھا جس کی قیمت ہمارے خیال میں چار درہم (ایک روپے) سے زیادہ نہ ہوگی۔" (شفا ص ۵۸)

یہ تو آپ کی طرزِ زندگی کا مختصر ساخاکہ تھا۔ یہ بھی دیکھ لیجئے کہ آپ اپنے عزیزوں کو کس طرح رہنے کا ارشاد فرماتے تھے، حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ ایک بار حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے سُنا کہ آنجنابؐ کے پاس کوئی غلام ہے، تو چونکہ حضرت فاطمہؓ کے ہاتھوں میں چکی پیستے پیستے چھالے پڑ گئے تھے اور ان میں تکلیف تھی اس لیے وہ آنجنابؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں تاکہ اس غلام کو اپنے لیے مانگ لیں۔ اتفاق سے آپ تشریف نہ رکھتے تھے۔ اُنھوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ذکر کیا اور خود واپس آ گئیں۔ جب آنجناب تشریف لائے تو حضرت عائشہؓ نے آپؐ سے کہا۔ آپؐ اسی وقت حضرت فاطمہؓ کے ہاں آئے اور اپنے آس پاس اُن کو اور حضرت علیؓ کو بٹھا کر فرمایا کہ "میں تم کو ایک ایسی بات نہ بتاؤں جو اس چیز سے (یعنی خادم سے) بہتر ہو جو تم مجھ سے مانگتی ہو۔ سُنو، تم سوتے وقت ۳۳ بار سبحان اللہ، ۳۳ بار الحمد للہ اور ۳۴ بار اللہ اکبر کہا کرو، یہ تمھارے لیے

خادم سے بہتر ہے۔" (بخاری ص ۵۲۵ د) ؎

یُوں کی ہے اہلبیت مطہر نے زندگی
یہ ماجرائے دُخترِ خیرُ الانامؐ ہے

غرض آنجناب نے زندگی تو اس طرح بسر کی اور وفات سے پہلے فرمایا کہ "میرے ورثاء کو میرے ترکے میں روپیہ پیسہ کچھ نہ ملے گا۔" (ترمذی)

حقیقت میں آپؐ کے پاس ان مزخرفات دنیوی میں سے کچھ تھا ہی نہیں جو کسی کو دیا جاتا۔ حالت تو یہ تھی کہ آپؐ کی زرہ مبارک ایک یہودی کے پاس تیس درہم کے عوض گرو رکھی ہوئی تھی اور آں جنابؐ کے پاس اتنا زر نقد نہ تھا کہ اُسے چھڑا لیتے۔" (بخاری ص ۴۱۴)

آپؐ نے ترکہ میں صرف اپنے ہتھیار، ایک خچر اور تھوڑی سی مملوکہ زمین کے سوا اور کوئی چیز نہیں چھوڑی اور ان اشیا کی بابت بھی ارشاد فرمایا کہ یہ خیرات کر دی جائیں۔ (بخاری ص ۴۱۵)

سبحان اللہ! کیسی پاکیزہ زندگی تھی کہ اس پر لاکھوں جانیں قربان کی جا سکتی ہیں۔

وَسَلَامٌ عَلَیْہِ یَوْمَ وُلِدَ وَیَوْمَ یَمُوْتُ وَیَوْمَ یُبْعَثُ حَیًّا ؕ

اور سلام ہو ان پر جس دن وہ پیدا ہوئے اور جس دن مرے اور جس دن کہ وہ پھر زندہ کیے جائیں گے۔

یہ تھی طرزِ معاشرت اُس شخص کی جس کی نسبت نعوذ باللہ من ذالک مخالفین یہ کہتے ہیں کہ اُس نے اپنے ذاتی مقاصد اور نفسانی اغراض کے حصول کے لیے اور ملک گیری اور جاہ طلبی کی ہوس میں اپنی قوم پر تلوار اٹھائی اور مذہب کی آڑ میں کُشت و خون کی اجازت دی۔ خدا کی پناہ کس قدر کور باطنی اور دریدہ دہنی سے اس بہترین خلائق صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ اتہام لگایا جاتا ہے۔ کیا ایسی ہی سادہ پُرمحن اور جفاکشی کی زندگی بسر کرنے کے لیے آپ نے یہ تمام کوششیں کی تھیں جن کی انتہائی کامیابی سے بھی آپ کے طرزِ بُود و باش میں ذرہ بھر فرق نہیں آیا۔ کیا دنیا کی گزشتہ اور موجودہ قوموں کی تاریخیں کسی ایک فرد کو بھی مثالاً پیش کر سکتی ہیں جس نے دنیوی اغراض سے خروج کر کے اپنے لیے ایک مستقل سلطنت قائم کر لی ہو۔ اور اس کے بعد اس کی وضع زندگی میں اس کے عشرِ عشیر بھی سادگی اور جفاکشی باقی رہی ہو۔ قطعاً و یقیناً اس کی کوئی نظیر صفحۂ عالم پر نہیں ہے۔ بیشک لوگوں نے بہت سادہ اور پُر مشقت زندگیاں بسر کی ہیں۔ مگر ان کے ہاتھ سلطنتیں نہیں لگیں۔ بلاشبہ آدمیوں نے سلطنتیں حاصل کر لی ہیں مگر ان میں یہ زہد و اتقا نہیں رہا۔ شاید کوئی شخص یہاں بدھ کی مثال پیش کرے کہ گو اس نے ایسا نہیں کیا مگر کم سے کم اپنی سلطنت سے تو دست بردار ہو ہی گیا تو میں کہوں گا کہ ایسی مثالیں تو بارگاہِ نبوت کے غلاموں میں بھی بہ کثرت مل سکتی ہیں۔ حضرت ابراہیم ادھم، شاہِ بلخ اور شاہ شجاع والیِ کرمان وغیرہ رحمۃ اللہ علیہم اسی آستانے کے گداؤں کی خاکِ پا ہیں، اور خدا جانے ان جیسے اور کتنے خدا کے بندے اس اُمتِ مرحومہ میں گزر چکے ہوں گے۔ حقیقت میں یہ خصوصیت تھی جو فیاضِ ازل نے اپنے رسول برحق جناب سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کی ذات بابرکات کے لیے

مخصوص اور منتخب فرمائی تھی۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ط

حُسنِ معاشرت اور خوش خُلقی

جناب سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کی سادہ اور بے تکلف زندگی کے حالات تو آپ نے سُن لیے مگر یہیں یہ بھی سمجھ لیجئے کہ آپ کی یہ فقیرانہ طرز بود و باش نہ تو بے نوائی اور تنگدستی کی وجہ سے تھی کیونکہ رقوم خمس کے علاوہ باغ فدک اور خیبر وغیرہ کی آمدنی بھی آپ کے تمام مصارف کے لیے اچھی طرح کافی ہوسکتی تھی۔ اور نہ رہبانیت گوشہ نشینی اور دنیا سے بے تعلقی کے باعث سے تھی۔ کیونکہ آنجنابؐ نے ایسے ترکِ دُنیا کو جائز ہی نہیں رکھا تھا جس کے سبب سے آدمی اپنے فرائض کو بجا لانے سے معذور ہو جائے اور اپنے کرنے کے کام دُوسروں کے سر ڈالے۔ اور اس بارہ میں خود آنجنابؐ کا طرزِ عمل نہایت کامل دنیاداروں کا سا تھا، نہیں، بلکہ اس کی اصلی وجہ حطام دنیوی کی بے وقعتی، راحتِ جسمانی سے بے نیازی، بے انتہا مروت اور ایثار و ہمدردی تھی۔ لیکن ان کے واقعات ہم آئندہ بیان کریں گے، سرِدست یہ دیکھنا چاہیے کہ اس قدر زُہد اور بے نفسی کے باوجود بھی آپ کے تعلقات اپنے متعلقین کے ساتھ کس قسم کے تھے۔

انگریزی میں ایک مثل ہے کہ کوئی شخص اپنے خدمت گار کی نظروں میں ہیرو نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ بیرونی دنیا میں غیروں کے روبرو خواہ کوئی شخص اپنے آپ کو کتنا ہی کیوں نہ لیے دیئے رہے تاہم گھر کی خلوت اور تنہائی میں یہ وضع قایم رکھنا نہایت مشکل ہوتا ہے اور نوکروں اور گھر والوں کے سامنے چھوٹی چھوٹی باتوں میں آدمی کی بدمزاجی، درشت خوئی، زود رنجی اور اس قسم کے بیسیوں عیب کُھل جاتے ہیں۔ بلاشبہ یہ بالکل درست ہے مگر ہم اسی معیار کو پیشِ نظر رکھ کر جناب رسالتمآبؐ کی طرزِ معاشرت کو لیتے ہیں۔

خادمِ بارگاہِ نبوی انس رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ "میں آٹھ برس کا تھا جب خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا، اور برابر دس برس تک شرف یابِ ملازمت رہا مگر اس تمام مدت میں حضورؐ نے کبھی اُف تک نہ کہا اور نہ کبھی یہ فرمایا کہ تُو نے یہ کام کیوں کیا، یا وہ کام کیوں نہیں کیا۔" (مشکوٰۃ ص ۵۴۴)

آں جناب بے انتہا خوش خلق تھے۔ ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ آپ نے مجھے کہیں جانے کا حکم دیا مگر میں نے جانے سے انکار کیا گو میرے دل میں بھی تھا کہ چونکہ حضور سرورِ کائنات نے ارشاد فرمایا ہے اس لیے جاؤں گا، پھر میں نکلا یہاں تک کہ میرا گزر چند بچوں پر ہُوا جو بازار میں کھیل رہے تھے وہاں آپ نے پیچھے سے آن کر میری گردن پکڑلی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو آپ مسکرا رہے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ "کیوں انس! جہاں میں نے تم کو بھیجا تھا کیا تم وہاں گئے تھے۔" میں نے عرض کیا کہ "یارسول اللہ! میں جارہا ہوں۔" (مشکوٰۃ ص ۵۴۴)

آپ کے اخلاق کی یہ کیفیت تھی کہ مدینہ میں لوگ اکثر صبح ہی پانی لے کر آپ کی خدمت میں آتے تاکہ آپ نمازِ صبح سے فارغ ہوکر اس میں برکت کے لیے ہاتھ ڈال دیں، تو خواہ کیسی ہی سردی کیوں نہ ہوتی مگر آپ ہرگز ان برتنوں میں ہاتھ

ڈالنے سے دریغ نہ فرماتے تھے۔ اگر کسی لونڈی کو بھی کچھ ضرورت ہوتی تو آپ کا ہاتھ پکڑ کر جہاں چاہتی لے جاتی اور آپ کبھی جانے میں تامل نہ فرماتے۔ (مشکوٰۃ ص ۲۴۲)

انسؓ ہی کا بیان ہے کہ حضور سرورِ کائنات کی زبانِ مبارک سے نہ کبھی کوئی فحش اور بیہودہ کلمہ نکلتا تھا، نہ آپ کسی پر لعنت کرتے تھے۔ نہ کسی کو برا بھلا کہتے تھے۔ اگر کسی پر بہت ہی خفا ہوتے تو فقط اتنا فرماتے: "مالہٗ ترِب جبینہٗ" اسے کیا ہوگیا اس کی پیشانی خاک آلودہ ہو۔ (بخاری ص ۸۹۲)

ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ لوگوں نے آپ سے کہا بھی کہ مشرکین کے لیے دعائے بد کیجئے تو آپؐ نے فرمایا کہ "میں لعنت کرنے کے لیے نہیں آیا بلکہ اللہ نے مجھے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔" (مشکوٰۃ ص ۲۴۴)

آنجنابؐ نے خانگی تعلقات کو آدمی کی نیکی اور خوش خوئی کا معیار قرار دیا ہے اور ارشاد فرمایا ہے کہ:

خَیْرُکُمْ خَیْرُکُمْ لِاَھْلِہٖ۔ تم میں سے اچھے وہی ہیں جو اپنے گھر والوں کے ساتھ اچھے ہیں۔ (مشکوٰۃ ص ۲۳۷)

اور آنحضورؐ طبعاً اور فطرۃً اس اصول کی بہترین مثال تھے۔ آپؐ اپنے اہلبیت پر نہایت مہربان اور بے انتہا شفیق تھے۔ عین عنفوانِ شباب میں آپؐ کی شادی حضرت خدیجہؓ سے ہوئی اس وقت حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سنِ کہولت کو پہنچ چکی تھیں اور عمر میں آنجنابؐ سے پندرہ سال بڑی تھیں۔ لیکن ان باتوں کے باوجود بھی آپ کا پچیس برس کا ساتھ حسنِ معاشرت کا ایک بے مثل نمونہ ہے۔ اس تمام مدت میں کوئی خفیف سے خفیف بات بھی ایسی پیش نہیں آئی جو ذرا دیر کے لیے بھی کسی قسم کی شکر رنجی کا باعث ہوتی۔ حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد جب جنابِ رسالتمآبؐ نے مختلف ضرورتوں اور مصلحتوں سے متعدد شادیاں کیں تب بھی یہ حال تھا کہ جب کبھی آپ کے ہاں قربانی کی جاتی تو آپ سب سے پہلے خصوصیت کے ساتھ حضرت خدیجہ مرحومہ کی ملنے جلنے والی عورتوں کے ہاں حصہ بھجواتے اور آنجنابؐ ان کا ذکر ایسی دلی محبت سے فرماتے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تک کو رشک ہوتا، حالانکہ وہ ازواجِ مطہرات میں سب سے زیادہ محبوب اور منظورِ نظر تھیں۔ لیکن آنجناب کی یہ محبت و شفقت کچھ حضرت خدیجہؓ ہی کے لیے مخصوص نہ تھی وہ طبیعت ہی ایسی تھی کہ اس میں ہر قسم کی خوبیاں فطرۃً علیٰ وجہ کمال موجود تھیں۔ حضرت خدیجہؓ کے بعد جب ازواجِ مطہرات کی تعداد نو تک پہنچ گئی تب بھی حضور کا طرزِ عمل ایسا منصفانہ اور مشفقانہ رہا کہ کبھی کسی کو شکایت پیدا نہیں ہوئی حالانکہ دنیوی عیش و آرام کی جو کچھ کیفیت تھی وہ تو ہم اوپر دیکھ ہی چکے اور ایسی تنگ دستی کی حالت میں باہمی رقابت کی وجہ سے ذرا ذرا سی بات پر روز لڑائی جھگڑے ہونے چاہئیں تھے، مگر وہاں تو اللہ کی طرف سے یہ اعلان ہو چکا تھا:

یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ	اے نبی! تو اپنی بیبیوں سے کہہ دے کہ اگر
تُرِدْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا وَزِیْنَتَهَا فَتَعَالَیْنَ	تم دنیوی زندگی اور اس کی بہار چاہتی ہو تو آؤ
اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِیْلًا	میں تم کو مالِ دنیا دے دوں اور تم کو خوبی کے

وَاِن کُنۡتُنَّ تُرِدۡنَ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ وَ الدَّارَ الۡاٰخِرَۃَ فَاِنَّ اللّٰہَ اَعَدَّ لِلۡمُحۡسِنٰتِ مِنۡکُنَّ اَجۡرًا عَظِیۡمًا ؕ (احزاب ع ۴)

ساتھ رخصت کر دوں اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور آخرت کے گھر کو ترجیح دیتی ہو تو بیشک اللہ نے تم میں سے نیک کرداروں کے لیے اجر عظیم مہیا کیا ہے۔

بھلا پھر کس کو یہ گوارا ہو سکتا تھا کہ دنیوی مال کے لالچ سے آنجناب کی صحبت روح پرور کو چھوڑنے کا خیال بھی کرتی۔ اس کے علاوہ یوں بھی آپ کے فیض صحبت نے ان کی طبیعتوں میں اتنی صلاحیت پیدا کر دی تھی کہ اگر باہمی رقابت تھی بھی تو آنجناب کی راحت رسانی اور رضا جوئی کے لیے ورنہ اور کسی قسم کے دنیوی آرام و آسائش کا تو خیال تک بھی نہیں گزرتا تھا مگر آنجنابؐ بھی ان کا پاس خاطر اس قدر رکھتے تھے کہ ہرگز کسی بات میں ان میں سے کسی کی حق تلفی یا کسی کے ساتھ بے انصافی نہ ہونے دیتے تھے اور ہمیشہ ان کے ساتھ نہایت عمدہ اور بہتر سے بہتر سلوک کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ "جناب رسالتمآبؐ کی طبیعت میں کسی قسم کی بیہودگی اور لغویت نہیں تھی نہ آپ کبھی چلّاتے تھے نہ کبھی بدی کے عوض بدی کرتے تھے بلکہ ہمیشہ درگزر کرتے تھے اور معاف فرما دیتے تھے"۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ "آپ نہایت فراخ حوصلہ، نہایت صادق البیان، نہایت نرم مزاج اور نہایت خوش خلق تھے۔ آپ کی عادت تھی کہ جب آپ کے گھر والوں یا اصحاب و احباب میں سے کوئی آپ کو پکارتا تھا تو آپ ہمیشہ بلالحاظ خردی و بزرگی جواب میں کہا کرتے تھے لبّیک۔ یعنی حاضر ہوں میں حاضر ہوں۔

آپؐ کو بچوں سے بھی بڑی محبت تھی۔ چنانچہ بسا اوقات آپ اپنی نواسی امامہ بنت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو گود میں لے کر یا کاندھے پر بٹھا کر نماز پڑھتے تھے۔ جب رکوع میں جاتے تو ایک طرف بٹھا دیتے اور جب قیام فرماتے تو پھر اسے اٹھا لیتے۔" (بخاری ص ۷۰۸)

نماز میں اتنی محبت کا اظہار آپؐ کی طبیعت کی بے انتہا شفقت اور رفاقت کی دلیل ہے کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس بچی کے رونے اور مچلنے کے خیال سے نماز تک میں اس کا بہلانا جائز رکھتے تھے۔ شاید اس میں یہ مصلحت مدنظر ہو کہ اُس زمانہ میں چونکہ لڑکیاں بڑی حقارت اور ذلّت کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں اور شرفائے عرب ان کو باعث عار سمجھتے تھے، تو آنجنابؐ کی اس الفت و شفقت کو دیکھ کر وہ باطل خیال مٹ جائے اور بلاوجہ لڑکیوں کی حق تلفی نہ ہو۔ حضرت حسنین رضی اللہ عنہا سے بھی آپ کو بیحد محبت تھی۔ اور ان پر ہی کیا موقوف ہے آپ سب ہی بچوں پر شفیق اور مہربان تھے۔ چنانچہ بچّے آپ کے پاس آتے تو آپ اپنی گود میں بٹھاتے تھے۔ وہ آپ کے کپڑوں پر پیشاب بھی کر دیتے تھے مگر آپ کچھ خیال نہیں کرتے تھے۔ آپ چھوہارے چبا چبا کر ان کو کھلایا کرتے تھے اور اُن کو بہلایا کرتے تھے اور اُن کے لیے دعائے خیر و برکت کیا کرتے تھے۔ (بخاری ص ۸۸۸، ۹۴۰، ۹۴۴ وغیرہ)

انسؓ کا بیان ہے کہ آپ ان کے چھوٹے بھائی ابو عمیر کے ساتھ اکثر کھیلا کرتے تھے۔ ابو عمیر نے ایک بلبل

پال رکھی تھی اور اس سے اسے بہت محبت تھی۔ چنانچہ آپؐ اس سے فرمایا کرتے تھے: یَا عُمَیْرُ مَا فَعَلَ النُّغَیْرُ۔ اے عُمیر! نغیر کیسی ہے؟ یا اس کا کیا حال ہے؟ (بخاری ص ۹۰۵)

ام خالد بنت خالد کہتی ہیں کہ "میں ایک دن اپنے والد کے ساتھ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی میں اس وقت ایک زرد قمیص پہنے ہوئے تھی۔ آپ نے دیکھ کر فرمایا کہ "یہ بہت اچھی ہے، بہت اچھی ہے"! پھر میں آپ کی پشت پر جا کر مہرِ نبوت سے (جو دونوں شانہائے مبارک کے بیچ میں ایک مضغہ گوشت کی طرح تھی) کھیلنے لگی۔ اس پر میرے والد نے مجھے گھُرکا۔ مگر آپ نے اُن کو منع کر دیا اور فرمایا کہ رہنے دو اسے کھیلنے دو۔" (بخاری ص ۸۸۶)

اسی بارے میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ "جب آنجناب مکہ معظمہ تشریف لائے تو عبدالمطلب کے بچے آپ کے استقبال کے لیے بھاگے ہوئے آئے آپ نے نہایت شفقت سے اُن میں سے ایک کو اپنے آگے اور ایک کو اپنے پیچھے سوار کر لیا۔" (ص ۲۴۲)

آپ کے بچوں پر مہربان اور شفیق ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہوں اور میرا خیال ہوتا ہے کہ لمبی نماز پڑھوں مگر اثنائے نماز میں کسی بچے کے رونے کی آواز آتی ہے تو میں نماز کو چھوٹا کر دیتا ہوں کیونکہ مجھے یہ بات ناگوار معلوم ہوتی ہے کہ اس کی ماں پر سختی کی جائے۔" (بخاری ص ۹۸)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کے نزدیک بچوں کی پرورش، ان کی خدمت اور ان پر شفقت خدا کی عبادت کی زیادتی سے بھی زیادہ ضروری اور قابل توجہ کام ہے۔

جریر ابن عبداللہ کا بیان ہے کہ "میں جب سے مسلمان ہوا آنجناب نے کبھی مجھے گھر میں آنے سے منع نہیں فرمایا۔ اور جب آپ مجھے دیکھتے تھے مسکرانے لگتے تھے۔ آپ اپنے اصحاب سے مزاح بھی فرماتے تھے اور ان کی سب باتوں میں شریک ہوتے اور ان سے بات چیت کیا کرتے تھے۔ آپ بچوں سے کھیلا کرتے اور ان کو اپنی گود میں بٹھایا کرتے تھے۔ آپ آزاد اور غلام اور لونڈی اور فقیر سب کی دعوت کو یکساں طیب خاطر سے قبول فرما لیتے تھے اور شہر کے دور دراز حصوں میں بھی مریضوں کی عیادت اور مزاج پرسی کے لیے تشریف لے جاتے تھے۔ اور جب کوئی شخص کوئی عذر پیش کرتا تو قبول فرما لیتے اور اسے معذور سمجھتے تھے۔" (شفا، ص ۵۳ و ۵۴)

آپ کے یہ الطاف کچھ مسلمانوں ہی کے ساتھ نہیں تھے بلکہ آپ سب ہی پر شفیق تھے۔ چنانچہ انسؓ کہتے ہیں کہ "ایک یہودی لڑکا آپ کی خدمت گزاری کرتا تھا، اتفاق سے وہ بیمار پڑ گیا۔ آپ اس کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے اور اس کے سرہانے بیٹھ گئے۔ پھر آپ نے اس سے اسلام قبول کرنے کے لیے فرمایا۔ اس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا جو وہیں اس کے پاس تھا۔ اس نے کہا کہ "تو ابوالقاسم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کہنا مان لے۔" پس وہ مسلمان ہو گیا۔ اس سے آپ بہت خوش ہوئے۔ اور وہاں سے نکلے تو فرمانے لگے کہ "خدا کا شکر ہے کہ وہ آگ سے بچ گیا۔" (بخاری ص ۱۸۱)

ظاہر ہے کہ اس لڑکے کے حالت نزاع میں اسلام لانے سے آپ کا کسی قسم کا ذاتی اور ظاہری فائدہ نہ تھا اور آپ کی

یہ تمام کوشش اور پھر اس پر مسرت محض آپ کی شفقت اور دلسوزی کی وجہ سے تھی۔

انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ "کبھی ایسا نہیں ہُوا کہ کسی شخص نے کوئی بات چپکے سے کہنے کے لیے اپنا منہ گوش مبارک سے لگایا ہو اور آپ نے اس آدمی کے سر اٹھانے سے پہلے اپنا سرِ اقدس ہٹا لیا ہو۔ اور نہ کبھی ایسا ہوا کہ کسی نے آپ سے مصافحہ کیا ہو، اور آپ نے اس کے ہاتھ کھینچنے سے پہلے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ہو۔ آپ کبھی اور آدمیوں کے سامنے پاؤں نہیں پھیلاتے تھے۔ جس کسی سے ملتے تھے پہلے خود سلام کرتے تھے اور خود مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے تھے۔ جب کوئی شخص آپ کے پاس آتا تھا تو آپ اس کی تعظیم کرتے تھے اور اکثر اس کے لیے اپنی چادر بچھا دیتے تھے اور اُسے اپنے گدّے پر بٹھا لیتے تھے۔ اور اگر وہ اس پر بیٹھنے سے انکار کرتا تو آپ اصرار فرماتے اور اُسے اسی پر بیٹھنے کے لیے مجبور کرتے تھے۔ آپ تعظیماً و احتراماً اپنے اصحاب کا نام نہ لیتے تھے۔ بلکہ ان کو کسی کنیت سے خطاب فرماتے اور اُن کو نہایت محبت آمیز اور پسندیدہ ناموں سے یاد کرتے تھے۔ آپ کبھی کسی کا قطع کلام نہیں کرتے تھے۔ البتہ اگر کوئی شخص نازیبا بات کہتا تو آپ یا تو اُسے منع فرماتے یا اُٹھ کر کھڑے ہو جاتے تاکہ وہ خود ہی رک جائے۔" (شفا، ص ۵۴)

آپ کی انتہائے خوش خلقی اور کمال ادب کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ جب آپ نماز پڑھتے ہوتے تھے اور کوئی شخص ملنے کے لیے آتا تھا تو آپ نماز کو مختصر کر دیتے تھے اور سلام پھیر کر اس کی حاجت روائی فرماتے تھے اور جب وہ چلا جاتا تو پھر نماز میں مشغول ہو جاتے۔ (شفا، ص ۵۴)

یہ صورت نوافل میں ہوتی تھی کیونکہ فرض نماز تو مسجد میں ادا کی جاتی تھی اور اس میں کسی قسم کی تخفیف اور اختصار جائز اور اختیاری نہیں ہے۔

عبداللہ بن حارث رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ "میں نے کسی شخص کو جناب رسالتمآب سے زیادہ خوش خلق اور خوش مزاج نہیں دیکھا۔" (شفا، ص ۵۴)

غرض آپ کی ہر ایک بات ہر ایک کام اور ہر ایک تعلق اس وعدہ صادقہ کی مجسم تصدیق اور ثبوت تھا کہ:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۔ اور ہم نے تجھے تمام دنیا والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

اور اس میں اعدا و مخالفین تک بھی مستثنیٰ نہیں ہیں لیکن ان کے ساتھ آپ کے لطف و مراعات کا تذکرہ آپ کے حلم، عفو اور شجاعت وغیرہ کے ضمن میں آئے گا۔

شجاعت

جناب سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کی ذات بابرکات میں تمام صفات ظاہری و باطنی اور کمالات صوری و معنوی ایسے تناسب اور موزونیت کے ساتھ جمع تھے کہ حقیقت میں یہ بہت ہی مشکل ہے کہ کسی ایک صفت کو اوروں پر مقدم

رکھا جائے۔ لیکن بہرحال چونکہ سب کا ذکر یکبارگی نہیں ہو سکتا اس لیے ہم ایک خارجی وجہ سے شجاعت کو پہلے لیتے ہیں۔ وہ وجہ یہ ہے کہ بالعموم اور مذہبوں نے اپنے مقتداؤں کے لیے شجاعت کا دعویٰ نہیں کیا اور پھر اسی نقص کی وجہ سے اس صفت کو مصلحانِ قوم اور ہادیانِ ملت کے لیے غیر ضروری سمجھنے لگے۔ لیکن یہ خیال خود ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ عرفِ عام میں شجاعت صرف تہور اور بیباکی کا نام ہے اور اس کی نمایش فقط میدانِ جنگ میں ہو سکتی ہے۔ مگر حقیقت میں سچی شجاعت وہ ہے جو مجاہدۂ نفس اور مجادلۂ ہوا و ہوس میں ظاہر کی جائے، جو عفو اور حلم کی شان میں نمایاں ہو، جو ثبات و استقلال کی صورت میں آشکار ہو۔ چنانچہ جناب رسالتمآبؐ کا ارشاد ہے:

لَیْسَ الشَّدِیْدُ بِالصُّرْعَۃِ اِنَّمَا الشَّدِیْدُ مَنْ یَّمْلِكُ نَفْسَہٗ عِنْدَ الْغَضَبِ۔

وہ پہلوان نہیں ہے جو لوگوں کو پچھاڑ دے بلکہ اصل پہلوان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس کا مالک ہو۔

(صحیحین از مشکوٰۃ ص ۳۶۹)

اس لحاظ سے یقیناً شجاعت کو تمام دیگر صفاتِ حسنہ پر فضیلت حاصل ہے لیکن اگر اس وسعتِ نظر سے کام نہ لیا جائے اور شجاعت کو اس کے عرفی معنوں ہی میں لیں تب بھی بلاشبہ وہ اتنی پاکیزہ اور پسندیدہ خوبی ہے کہ جو طبیعت اس صفت سے متصف نہ ہو وہ کسی طرح اخلاقِ انسانی کا بہترین اور کامل ترین نمونہ ہونے کے قابل نہیں کہی جا سکتی۔ اب اس مختصر سی تمہید کے بعد دیکھیے کہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم میں صفتِ شجاعت کتنی اعلیٰ درجہ کی تھی۔ انسؓ کا بیان ہے کہ "آپ اشجع الناس یعنی انتہا درجے کے بہادر اور شجاع تھے۔ چنانچہ ایک رات کا ذکر ہے کہ اہلِ مدینہ یکایک گھبرا اٹھے (جیسے کوئی دشمن چڑھ آئے یا ڈاکہ پڑے) تو لوگ اس آواز کی جانب چلے مگر ادھر سے ان کو آپ واپس آتے ہوئے ملے۔ کیونکہ آپ سب آدمیوں سے پہلے تنہا ادھر تشریف لے گئے تھے۔ آپ نے تسلی کے طور پر فرمایا کہ "ڈرو مت، گھبراؤ مت"۔ اور آپ اس وقت ابو طلحہ کے برہنہ پشت گھوڑے پر سوار تھے اور گردن مبارک میں تلوار لٹکی ہوئی تھی۔" (بخاری ص ۴۲۶)

براء ابن عازب رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک آدمی نے مجھ سے پوچھا کہ "کیا تم سب جنگِ حنین میں حضرت رسول اللہ کو چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے؟" میں نے کہا کہ "ہاں۔ لیکن آنجناب اپنی جگہ پر قایم رہے اور بیشک میں نے آپ کو دیکھا کہ آپ ایک سفید خچر پر سوار تھے اور ابوسفیان بن حارث آپ کے چچا زاد بھائی آپ کی رکاب تھامے ہوئے تھے اور حضرت عباسؓ آپ کی لگام پکڑے ہوئے اور آنجناب یہ شعر رجزیہ پڑھ رہے تھے:

اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِبْ اَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ۔

میں سچا پیغمبر ہوں، میں ابنِ عبدالمطلب ہوں۔

اور اس دن آپ سے زیادہ بہادر اور شجاع کوئی شخص نظر نہیں آیا اور خدا کی قسم جب لڑائی بہت تند اور تیز ہوتی تھی تو ہم آپ ہی کی پناہ ڈھونڈا کرتے تھے اور ہم میں سب سے زیادہ دلیر اور بہادر اور شجاع وہی شخص ہوتا تھا جو آپ کے ساتھ کھڑا رہ سکتا تھا۔ (بخاری ص ۶۱۷)

اسی واقعہ کی بابت حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ "میں اس دن آپ کی لگام پکڑے ہوئے تھا۔ جب مسلمان

بھاگ کھڑے ہوئے تو آپ نے اپنے خچر کو دشمنوں کی طرف بڑھانے کے لیے ایڑ دی اور میں اسے تیز چلنے سے روکنا چاہتا تھا، یہاں تک کہ آخر میں نے ارشاد عالی کے مطابق اصحابِ سمرہ کو آواز دی اور وہ میری آواز سنتے ہی پلٹے اور ذرا دیر میں لڑائی کا نقشہ بدل گیا۔" (شفا، ص ۵۰ و ۵۱)

اُبی بن خلف کا واقعہ ہے کہ جنگِ بدر میں جب وہ فدیہ دے کر رہا ہوا تو اس نے آپ سے کہا کہ "میرے پاس ایک گھوڑا ہے جسے میں ہر روز ایک پیمانہ (فرق) جوار کھلاتا ہوں میں اس پر بیٹھ کر تجھے قتل کروں گا۔" آپ نے جواب دیا کہ "نہیں، بلکہ انشاء اللہ تو میرے ہاتھ سے مارا جائے گا۔" اس کے بعد جنگِ اُحد میں اُس نے آنجناب کو دیکھا تو گھوڑا بڑھاتا ہوا آپ پر حملہ کرنے کے لیے آیا۔ مگر چند مسلمان اس کے راستہ میں حائل ہو گئے۔ اس پر آپ نے اُن کو حکم دیا کہ "ہٹ جاؤ اور اسے آنے دو۔" اور آپ نے حارث بن الصمہ کے ہاتھ میں سے نیزہ لے لیا اور آگے بڑھ کر اُسے ہوا میں جنبش دے کر اُبی کے مارا اور وُہ اپنے گھوڑے پر ڈگمگا گیا اور اس کی پسلی ٹوٹ گئی اور وہ چیختا چلاتا قریش کی طرف بھاگا۔ لوگوں نے اس سے کہا بھی کہ زخم کچھ زیادہ خوفناک نہیں ہے۔ مگر وہ یہی کہتا رہا "جو تکلیف مجھے ہے وہ اگر سب لوگوں کو بانٹ دی جائے تو وہ سب کے سب ہلاک ہو جائیں۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پہلے ہی کہا تھا کہ تُو میرے ہاتھ سے مارا جائے گا۔ واللہ اگر وہ مجھ پر تھوک دیتے تب بھی میں نہ بچتا۔" آخر وہ لوٹتے ہوئے مکہ سے چھ میل اُدھر مقام سرف پر مر گیا۔" (شفا، ص ۵۱ و ۵۲)

عمران بن حصین کہتے ہیں کہ ہمیشہ غنیم پر حملہ کرنے وقت آپ سب سے آگے ہوتے تھے۔ (شفا، ص ۵۱)

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کا بیان ہے کہ "جب لڑائی شدت کی ہوتی تھی اور جوش و محنت سے آنکھیں سُرخ ہو جاتی تھیں تو ہم آنحضرتؐ کی آڑ لیتے تھے اور ہم میں سے کوئی آدمی دشمن سے آپؐ سے زیادہ قریب نہ ہوتا تھا۔ اور میں نے جنگِ بدر میں اپنے آپ کو دیکھا کہ ہم آپؐ ہی کی پناہ ڈھونڈتے تھے۔ اور آپؐ اس دن سب سے زیادہ مستقل مزاج اور قوی القلب تھے۔" (شفا، ص ۵۱)

اس ضمن میں سب سے زیادہ قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی طبع اقدس میں جس طرح جبن و بزدلی کا مطلق نشان نہ تھا ویسے ہی قساوت اور جنگ جوئی کا بھی قطعاً وجود نہ تھا اور آپ کی شجاعت دیگر خصائل حسنہ کی طرح افراط و تفریط سے بالکل پاک اور نہایت ہی معقول اور صحیح قسم کی تھی۔ بلاشبہ آپ کو بہت سی لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ مگر وہ سب کی سب صرف محافظت اور مدافعت کے لیے تھیں۔ اور آپ نے خود کبھی پیش قدمی نہیں کی۔ ہاں جب کوئی موقع آ پڑا اور مقابلہ پڑ گیا تو پھر ہٹنے کا نام نہیں لیا۔ چنانچہ بدر میں آپ نے تین سو تیرہ آدمیوں سے ایک ہزار شجاعانِ مکہ کا مقابلہ کیا اور خدا نے آپ کو مظفر و منصور کیا۔ ایک اور روایت ہے کہ ایک روز آپ دشمن کے انتظار میں ایک جگہ پڑے رہے، یہاں تک کہ سورج ڈھل گیا۔ پھر آپ نے کھڑے ہو کر فرمایا کہ "اے لوگو! دشمن سے ملنے کی تمنا مت کرو اور اللہ سے امن و عافیت چاہو۔ مگر جب مقابلہ ہو جائے تو صبر کرو اور یقین جانو کہ جنت تلواروں کے سایہ میں ہے۔" (بخاری ص ۳۱۶) یعنی حمایتِ حق سے بڑھ کر اور کوئی خدمت جنت کا مستحق نہیں کرتی۔

آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میدانِ جنگ میں سالارِ لشکر کی حیثیت سے قلب میں ہوتے تھے۔ اور اگرچہ آپ کی ہی شجاعت وہمت تمام فوج کی پشت و پناہ ہوتی تھی۔ تاہم خود آپ کے ہاتھ بہت کم خون آلود ہوتے تھے۔ چنانچہ باوجودیکہ آپ پندرہ سولہ غزوات میں بہ نفسِ نفیس شریک ہوئے۔ لیکن اُبَیّ ابن خلف کے سوا صرف ایک اور آدمی آپ کے ہاتھ سے مارا گیا، اس زمانہ میں جبکہ جنرل صرف اپنی طاقت اور جلاوت کی وجہ سے منتخب اور ممتاز ہوتا تھا اور اس کا سب سے زیادہ دشمنوں کو قتل کرنا ہی اس کے لیے باعثِ اعزاز ہوتا تھا۔ یہ خموش شجاعت لوگوں کو بہت ہی عجیب معلوم ہوتی ہوگی مگر کیا یہ سچی شجاعت کی بہترین مثال نہیں ہے۔

ثبات و استقلال

ثبات اور شجاعت حقیقت میں ایک ہی صفت کی دو کسی قدر مختلف صورتیں ہیں اور دونوں میں فرق فقط یہ ہے کہ شجاعت میں قوتِ مدافعت کا پہلو زیادہ نکلتا ہے اور ثبات میں طاقتِ برداشت کا۔ ایک میں کیفیت فاعلی غالب ہے دُوسری میں کیفیت انفعالی لیکن بہرحال وہی شخص شجاع اور ثابت قدم ہو سکتا ہے جو مصائب و آلام میں پریشان نہ ہو۔ جو تکلیفوں اور سختیوں سے نہ گھبرائے، جو حادثوں کو سکون اور سکوت سے سہے اور جو شدتِ خوف و خطر میں بھی مطمئن اور مستقل رہے۔ اور جب تک کسی میں یہ باتیں نہ ہوں تب تک اس میں نہ شجاعت ہو سکتی ہے نہ ثبات۔ اس لیے در اصل یہ دونوں ایک ہی شے ہیں۔ جو موقع اور ضرورت کے مطابق کبھی ایک صورت سے نمایاں ہوتی ہے کبھی دوسری حیثیت سے۔ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی بے نظیر شجاعت کی ایک دو مثالیں آپ نے دیکھ لیں۔ اب آپؐ کے ثبات و استقلال کے چند واقعات سن لیجئے۔ اس کی سب سے بڑی اور نمایاں مثال تو آپ کی تبلیغ مذہب اور تعلیم اسلام ہی ہے۔ اور اگر ہجرت کے بعد کے زمانے کو چھوڑ بھی دیں (اگرچہ وہ بھی کچھ کم مشکل اور محنت طلب نہ تھا) تب بھی وہ گیارہ سال جو آنجناب نے آغازِ رسالت سے ہجرت تک مکہ معظمہ میں بسر کیے اور جو دل شکن مخالفتیں اور جانکاہ مصیبتیں دعوتِ حق میں وہاں آپ کو پیش آئیں وہ ثبات و استقلال کی ایسی مثالیں ہیں جس کی نظیر دنیا کی تاریخ نہیں دکھا سکتی۔ اور اگر غور کریں تو وہی آپ کی صداقت کی سب سے بڑی تصدیق ہیں کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں کہ جھوٹ اتنا پائدار ہو۔ کوئی بڑی سے بڑی دنیوی غرض اور سخت سے سخت قوتِ ارادی بھی اتنی مسلسل ناکامیوں اور متواتر مایوسیوں کے مقابلہ میں قائم نہیں رہ سکتی جب تک کہ تائیدِ غیبی اور امدادِ ربانی اس کے ساتھ نہ ہو۔

جب آپؐ نے توحید و تنزیہہ باری تعالیٰ کی تبلیغ اور بت پرستی کی مذمت شروع کی تو اہلِ قریش نے آپ کے چچا ابوطالب سے شکایت کی اور چاہا کہ وہ آپ کو کہہ سُن کر اس سے روک دیں۔ ایک دو بار تو ابوطالب نے ان لوگوں کو سمجھا بجھا کر ٹال دیا، مگر جب آپ کے وعظ کا سلسلہ برابر جاری رہا تو ایک دن ان کے بڑے بڑے لوگ سب اکٹھے ہو کر پھر ابوطالب کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ "ابوطالب! تم ہم میں بڑے بوڑھے ہو اس لیے ہم نے کہا تھا کہ تم اپنے بھتیجے کو منع کر دو مگر تم نے کچھ نہیں کیا اب ہم اس کی باتیں نہیں سُن سکتے کہ وہ ہمارے معبودوں کو بُرا کہے اور ہم کو اور ہمارے بزرگوں کو کم سمجھ اور نادان بتائے۔ اب بھی یا تو تم اسے ان حرکتوں سے روک لو ورنہ پھر ہماری تمھاری لڑائی

ہو جائے گی۔ اور اُس وقت تک صلح نہ ہو گی جب تک ایک فریق نہ مارا جائے۔" وہ تو یہ کہہ کر چلے گئے مگر ابو طالب کو بڑی فکر ہوئی۔ نہ تو وہ اپنی قوم سے خواہ مخواہ کی لڑائی مول لینا چاہتے تھے نہ آپ کو بے یار و مددگار چھوڑنے کو ان کا جی چاہتا تھا۔ آخر اُنھوں نے آپ کو بلایا اور آپ سے یہ سارا جھگڑا کہا۔ اور کہا کہ "یا ابن اخی! ان لوگوں نے مجھ سے یہ کہا، اب تم خود اپنے اور میرے حال پر رحم کرو، اور مجھے ایسی بات پر مجبور مت کرو جو مجھ سے نہ ہو سکے۔" یہ آپ کے لیے نہایت ہی نازک اور آزمائش کا وقت تھا کیونکہ ابو طالب کی یہ بات سُن کر آنجناب سمجھے کہ اب شاید انھوں نے بھی میرا ساتھ چھوڑنے کا ارادہ کر لیا ہے اور یہ بھی میری مدد سے دستبردار ہوتے ہیں۔ مگر آپ نے نہایت استقلال سے جواب دیا کہ "یا عم! اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند لاکر رکھ دیں کہ میں اس بات کو چھوڑ دوں تب بھی خدا گواہ ہے کہ میں اسے نہیں چھوڑوں گا جب تک کہ اللہ اسے پورا نہ کر دے یا میں ہلاک نہ ہو جاؤں۔" یہ کہہ کر آپ آبدیدہ ہو کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور وہاں سے جانے لگے۔ مگر آپ کو جاتے ہوئے دیکھ کر ابو طالب نے آپ کو پھر بلایا اور کہا: "یا ابن اخی! جاؤ اور جو تمھارا جی چاہے کہو، کیونکہ خدا کی قسم میں کبھی بھی تمھارا ساتھ نہ چھوڑوں گا۔" (سیرت ابن ہشام ص ۱۴۰)

جب اہلِ مکہ ابو طالب کی طرف سے ناامید ہو گئے تو اُنھوں نے براہِ راست آپ کو ملانے کی کوشش کی۔ چنانچہ ایک روز بعد مغرب اُنھوں نے ایک جلسہ کیا اور اس میں آپ کو بلایا۔ جب آپ تشریف لائے تو اُنھوں نے پہلے تو آپ سے بہت کچھ شکایت کی اور پھر یہ کہا کہ "اگر تُو نے یہ نئی نئی باتیں اس لیے پھیلانا شروع کی ہیں کہ تو دولتمند ہو جائے تو ہم نے آپس میں تیرے لیے اتنا روپیہ جمع کر لیا ہے کہ تو ہم سب سے زیادہ مالدار ہو جائے۔ اگر تُو ہم میں بزرگی چاہتا ہے تو ہم تجھے اپنا سردار بنانے کے لیے تیار ہیں۔ اگر تو ملک اور سلطنت کا خواہاں ہے تو ہم کو تجھے اپنا بادشاہ بنا لینے میں بھی تامل نہیں ہے، اور اگر تجھے آسیب ہو گیا ہے تو ہم اپنے خرچ سے تیرا علاج کرنے پر بھی آمادہ ہیں اور اگر تُو پھر بھی اچھا نہ ہُوا تو خیر ہم تجھے دیوانہ سمجھ کر معذور کہیں گے مگر یہ تو نہیں دیکھا جاتا کہ تُو ہمارے بُتوں کو بُرا کہے، اور ہم میں آپس میں تفرقہ ڈال دے اور ایک دُوسرے کو جُدا کر دے۔ اس سے تجھ کو باز آنا چاہیے۔"

آپؐ نے فرمایا: "مجھ میں ان میں سے کوئی بات نہیں ہے، نہ میں مال چاہتا ہوں نہ بزرگی نہ بادشاہت۔ نہ میں دیوانہ ہوں۔ لیکن اللہ نے مجھے تمھاری ہدایت کے لیے مامور کیا ہے، اور میں اللہ کا پیام تم تک پہنچاتا ہوں اور تم کو سمجھاتا ہوں، اگر تم مانو تو تمھارے لیے دین دنیا کی بہتری ہے، اور اگر نہ مانو تو میں اللہ کے حکم پر صبر کروں گا یہاں تک کہ اللہ مجھ میں اور تم میں فیصلہ کر دے جو اس کو منظور ہو۔"

اس پر ان لوگوں نے کہا کہ "اچھا تُو خدا کا رسول ہے تو ہمارے ملک میں سے پہاڑوں کو ہٹا دے، اور عراق و عجم کی نہریں بہا دے، اور ہمارے بزرگوں کو زندہ کر دے۔"

آپؐ نے فرمایا: "مجھے اللہ نے ان باتوں کے لیے نہیں بھیجا ہے، مجھے جو حکم دیا گیا ہے وہی کرتا ہوں اور جو پیام مجھے پہنچا ہے اسے تم تک پہنچاتا ہُوں، اس کا ماننا یا نہ ماننا تمھارا کام ہے۔"

انھوں نے کہا" اچھا تو ہمارے لیے کچھ نہیں کرتا تو خود اپنے ہی واسطے باغ اور محل اور سونے چاندی کے خزانے مانگ لے جس سے تیری ناداری اور تنگ دستی دُور ہو جائے اور ہم پر تیری فضیلت اور رسالت ثابت ہو جائے کیونکہ تُو بھی گلی کُوچوں میں ایسے ہی پھرتا ہے جیسے ہم پھرتے ہیں۔ اور تُو بھی تلاشِ معاش کا ایسا ہی محتاج ہے جیسے کہ ہم۔ تو پھر ہم میں اور تجھ میں فرق کیا ہے۔ یا اگر یہ بھی نہیں تو یہی کر کہ آسمان کو توڑ کر ہم پر لا گرا۔"

آپؐ نے اس کا پھر بھی وہی جواب دیا کہ" مجھے خدا نے اس لیے نہیں بھیجا ہے۔ مجھے تو اس نے فقط بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔"

اُنھوں نے کہا: "یُوں تو ہم نہیں مانیں گے۔ اور واللہ کہ ہم تجھے نہیں چھوڑیں گے جب تک کہ تجھے ہم قتل نہ کر ڈالیں یا تُو ہم کو نہ مار ڈالے۔"

اس پر آنجنابؐ اُٹھ کھڑے ہُوئے اور وہاں سے حزین و غمگین واپس تشریف لے آئے۔ مگر اس ناکامی سے آپؐ کے استقلال میں ذرا بھی تزلزل نہیں ہوا۔ آپ کے واپس آجانے کے بعد اس مجلس میں ان سب لوگوں نے آپ کے قتل کا مشورہ کیا اور ابوجہل نے عہد کیا کہ" خواہ کچھ بھی ہو کل جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی نماز میں سر بسجود ہوں گے تو میں ایک بھاری پتھر اُن کے سر پر پٹک دُوں گا۔ پھر تم کو اختیار ہے چاہو میری مدد کر دینا مجھے تنہا چھوڑ دو۔ اور قصاص میں بنی عبد مناف کا جو جی چاہے کرے۔"

اُن سب نے قسمیں کھائیں کہ" ہم ہرگز تیرا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔"

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے دن حسبِ معمول کعبے میں نماز کے لیے تشریف لائے اور نہایت اطمینان اور استقلال سے نماز میں مشغول ہو گئے۔ ابوجہل اپنی قرارداد کے مطابق ایک بڑا بھاری پتھر لیے بیٹھا تھا اور اہلِ قریش بڑے شوق سے نتیجے کا انتظار کر رہے تھے۔ جب آپ سجدے میں گئے تو ابُوجہل پتھر لے کر جھپٹا، مگر جب آپ کے پاس گیا تو یکایک مرعوب اور خوفزدہ ہو کر اُلٹا پھرا اور پتھر اس کے ہاتھ سے چھُٹ گیا۔ اور یُوں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو محض اپنی قدرتِ کاملہ سے بچا لیا۔ (سیرت ابن ہشام ص ۱۵۱)

لیکن اس واقعہ کی کیا خصوصیت ہے۔ ایسے ایسے حملے بارہ برس تک برابر روز ہی ہوتے رہے اور خدا یُوں ہی آپ کو بچاتا رہا۔ مگر آپ جس دھن میں تھے اس میں ان خطروں اور مخالفتوں سے نہ کچھ کمی ہوتی تھی نہ زیادتی۔ اور ہو بھی کیونکر سکتی تھی آپ کو اللہ نے جس کام کے لیے بھیجا تھا آپ کو اس کی تعمیل کے سوا اور کسی بات سے کچھ سروکار ہی نہ تھا۔ کیونکہ آپ کو یہ حکم مل چکا تھا کہ:

وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ۔

اور جس کا ہم ان سے وعدہ کر رہے ہیں ان میں سے بعض خواہ تم کو دکھا دیں یا تم کو وفات دیں (تم کو اس سے کچھ تعلق نہیں) بیشک تمھارا کام تو صرف ان کا پہنچا دینا ہے اور حساب لینا ہمارا کام ہے۔

اور آپ کی زندگی کا ہر ایک واقعہ اس کا ثبوت ہے کہ آپ نے کیسی کامل اطاعت اور احتیاط سے اس ارشاد کی تعمیل کی۔

آخر جب اس طویل مدت کے پیہم امتحانِ صبر و ثبات کے بعد وہ وقت آگیا کہ آپ مکہ سے ہجرت فرمائیں۔ تو یہ واقعہ آپ کے استقلال کا سب سے بڑا ثبوت تھا۔ صورتِ حال یہ تھی کہ اہلِ مکہ نے آپ کے قتل کا مصمم ارادہ کر لیا تھا اور جس کام میں ابو جہل مرعوب ہو کر ناکام رہ گیا تھا اس کی تکمیل کے لیے تمام قبائل کا ایک ایک منتخب جوان مقرر ہوا تاکہ یوں آپ کے قتل کا الزام تمام قبیلوں میں بٹ جائے اور بنی ہاشم کو آپ کا قصاص لینے کی جرأت نہ ہو۔ بلاشبہ یہ رائے نہایت ہوشیاری اور دُور اندیشی پر مبنی تھی اور بظاہر عرب میں کوئی طاقت اس متفقہ کوشش کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ اور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا اس مہلکے سے بچ جانا جس طرح تائیدِ غیبی اور امدادِ ربانی کا نہایت نمایاں ثبوت ہے ویسے ہی آپ کے ثبات و استقامت کا بھی نہایت واضح واقعہ ہے۔ جب ان لوگوں نے رات کو آپ کا مکان چاروں طرف سے گھیر لیا تو آپ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو اپنی جگہ سُلا دیا اور اپنی چادر اُڑھا دی اور خود بکہ و تنہا بالکل اطمینان اور استقلال سے ان کے بیچ میں سے ہوتے ہوئے نکل گئے۔ خدا نے ان کی آنکھوں پر ایسے پردے ڈال دیے کہ کسی نے آپ کو جاتے ہوئے نہیں دیکھا اور یُوں ان کی ساری کوشش رائگاں گئی۔ (سیرت ابن ہشام ص ۲۶۵)

پھر جب آپ اور حضرت ابو بکرؓ نے مکے سے نکل کر تین شبانہ روز تک غارِ ثور میں قیام فرمایا تو ایک دن حضرت ابو بکرؓ نے وہیں سے قریش کو ادھر آتے ہوئے دیکھا، اس سے وہ بہت پریشان ہوئے اور اُنھوں نے کہا: "یا رسولؐ اللہ! اگر ان میں سے کسی نے نیچے نظر کی تو وہ ہم کو دیکھ لے گا۔" آپ نے جواب دیا: "اے ابو بکر! تم ان دو شخصوں کی بابت کیا خیال کرتے ہو جن کا تیسرا اللہ ہے۔" یعنی جب اللہ ساتھ ہے تو پھر کوئی کیا کر سکتا ہے۔ چنانچہ وہ لوگ غار کے پاس سے لوٹ گئے اور آپ ان کے شر سے محفوظ رہے۔ (بخاری ص ۵۱۶)

اس کے بعد جب آپ وہاں سے تشریف لا رہے تھے اور اہلِ مکہ آپ کی تلاش میں چاروں طرف سرگرداں تھے تو اتفاق سے ان میں سے ایک شخص سُراقہ ابن مالک نے آپ کو پا لیا۔ حضرت ابو بکر نے اسے آتے ہوئے دیکھا تو گھبرا گئے اور انھوں نے کہا: "یا رسولؐ اللہ! انھوں نے ہم کو آ لیا۔" آپ نے پھر بھی نہایت اطمینان سے فرمایا کہ: "اے ابو بکر! کچھ فکر مت کرو بیشک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔" (بخاری ص ۵۱۱)

چنانچہ خدا کی قدرت سے وہی سُراقہ جو آپ کے پکڑنے کے لیے آیا تھا آپ کی حفاظت کا ذریعہ بن گیا۔ یعنی وہ آپ سے صلح کر کے واپس چلا گیا اور جو اہلِ مکہ اس کو آپ کے تعاقب میں آتے ہوئے ملے ان کو بھی الٹا پھیر لے گیا۔ سچ ہے: ؏

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

مگر یقیناً اس تمام سفر میں خدا کے حکم سے آپ کا استقلال و استقامت ہی آپ کے محفوظ و مصئون رہنے کا ظاہری سبب بن گیا۔

ہجرت کے بعد مظالم قریش کے کم ہو جانے اور حالات کے بدل جانے سے آپ کی ثابت قدمی اور مستقل مزاجی میں کچھ فرق

نہیں ہوا اور بار ہا اس کی آزمائش ہوئی۔ جنگِ اُحد کے موقع پر آپ نے لڑائی کا ارادہ کرنے سے پہلے اصحاب کرام سے اس بارے میں مشورہ کیا تو یہ بات قرار پائی کہ میدان میں نکل کر لڑنا چاہیے۔ اس پر آپؐ نے خود زیب سر فرما لیا اور روانگی کا ارادہ کر لیا۔ اُس وقت پھر بعض لوگوں کی رائے بدلی اور اُنھوں نے آپؐ کو ٹھہرنے کی رائے دی۔ مگر آپؐ نے ان کی طرف کچھ التفات نہ فرمائی اور کہا کہ یہ بات نبی کی شان کے شایاں نہیں ہے کہ وہ خود پہن کر اُسے اتار دے تاوقتیکہ اللہ اسے حکم نہ دے۔" (سیرت ابن ہشام ص ۴۴۸)

جنگِ حنین میں مسلمان پسپا ہو ہی چکے تھے۔ مگر محض آپ کے استقلال و استقامت نے میدان جیت لیا۔ اس وقت اگر آپ کے قدم ذرا بھی ڈگمگا جاتے، اگر آپؐ کی تیوری پر ذرا بھی بل پڑ جاتا تو مسلمانوں کو ایسی شکست ہوتی کہ شاید دنیا کی تاریخ بدل جاتی۔ لیکن جہاں نفسانیت کا گذر ہی نہ ہوا اور جس کا ہر ایک کام خالصۃً لوجہ اللہ ہو اس کے پائے ثبات میں ناکامی سے کیا لغزش ہوسکتی ہے اس کے لیے شکست و فتح دونوں یکساں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دشمن کے نرغے اور مسلمانوں کی گریز پائی سے آپ کا قدم پیچھے ہٹنے کی بجائے آگے بڑھا۔ البتہ خدا نے ان مسلمانوں کو جو فتح مکّہ کی وجہ سے اپنی شجاعت اور کامیابی پر مغرور ہو گئے تھے یہ سبق دے دیا کہ غرور ہمیشہ ذلت کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ اور خدا کی مدد کسی قوم یا کسی نام کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ نکوکاری کا صلہ اور حُسنِ اعمال کا انعام ہے۔

چنانچہ اس کی بابت کلامِ پاک میں یہ ارشاد ہوا ہے:

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيرَةٍ وَّ يَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنكُمْ شَيْئًا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُم مُّدْبِرِينَ ط ثُمَّ أَنزَلَ اللّٰهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَنزَلَ جُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِينَ كَفَرُوا ط وَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ۝

بے شک اللہ نے بہت سے موقعوں پر تمھاری مدد کی اور خاص کر حنین کے دن جب کہ تمھاری کثرت نے تم کو مغرور کر دیا تھا پھر وہ کثرتِ تعداد تمھارے کچھ بھی کام نہ آئی اور زمین باوجود ایں وسعت تم پر تنگ ہونے لگی، پھر تم پیٹھ پھیر کر بھاگے۔ پھر اللہ نے اپنی طرف سے اپنے پیغمبر اور مسلمانوں پر اطمینان اور سکون نازل فرمایا اور ایسی فوجوں کو بھیجا جن کو تم نہیں دیکھتے اور جن لوگوں نے کفر کیا تھا اُن کو سزا دی اور بیشک کفر کرنے والوں کا یہی بدلہ ہے۔

حلم اور تحمل

گزشتہ باب میں ہم نے جناب سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کے وہی چند واقعات بیان کیے ہیں جو عرف شجاعت اور ظاہری بہادری سے تعلق رکھتے ہیں لیکن آپ کی طبیعت کا اصلی میلان اور آپ کے خلق کریم کا صحیح نمونہ شجاعت کے دوسرے مفہوم یعنی ضبطِ نفس، بردباری اور حلم کے موقعوں پر نظر آتا ہے۔

جنگِ اُحد میں جب جناب رسالت مآب روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک دانت مبارک عتبہ بن ابی وقاص کے پتّھر کے

صدمے سے شہید ہوگیا اور چہرہ اقدس عبداللہ ابن شہاب الزہری کے حملہ سے مجروح اور خون آلود ہوگیا، تو آپ کے اصحاب کرام آنجناب کی اس تکلیف سے نہایت ملول اور رنجیدہ ہوئے اور ان پر یہ حادثہ بہت ہی شاق گزرا اور انھوں نے آپ سے عرض کیا کہ "کاش آپؐ ان لوگوں کے حق میں دعائے بد فرماتے تاکہ یہ اپنے کیفرِ کردار کو پہنچتے۔" آنجنابؐ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ "میں لعنت اور بد دعا کرنے کے لیے نہیں آیا ہوں بلکہ راہِ راست کی طرف بلانے کو آیا ہوں، اور خدا نے مجھے سراپا رحمت بنا کر بھیجا ہے۔" اور پھر آپؐ نے اللہ سے دعا کی کہ "بارِ الٰہا! میری قوم کو بخش دے، اور ان کو راہِ راست کی ہدایت کر، کیونکہ وہ جانتے نہیں۔" (شفا، ص ۷۴)

سُبحان اللہ! غور کرنے کی بات ہے کہ یہ خیر طلبی، یہ عذر خواہی کس حال میں کن لوگوں کی طرف سے کی گئی تھی، اس وقت کہ جب دہانِ اقدس سے خون جاری تھا خود کے دو حلقے رخسارۂ گلگوں میں ایسے گھر سے اُتر گئے تھے کہ ابو عبیدہ ابن الجراح نے دانتوں سے پکڑ کر بمشکل ان کو نکالا تو اس سے ان کا دانت گر گیا۔ اور ان لوگوں کے لیے جو شروع سے آپ کے درپئے آزار رہے تھے جن کے مظالم گوناگوں نے آپ کو ترکِ وطن اور مفارقتِ احباب پر مجبور کیا، جن کے تشدد و تعذیب سے آپ کے بیسیوں رفیق اور دوست تڑپ تڑپ کر جاں بحق ہوگئے اور جن کی روز افزوں زیادتیوں سے آخر آپؐ کو آپ کی طبعی مروّت اور رحم دلی کے برخلاف تلوار اٹھانی پڑی اور جس کا خونریز اور جانکاہ صدمہ اُسی وقت دوسروں پر نہیں پڑا بلکہ خود آپ کی ذات بابرکات پر اتنی شدّت سے پہنچا تھا۔ ایسی حالت میں ایسے لوگوں کے لیے ایسی دعا اس سے بڑھ کر بُردباری، تحمل اور حلم کی کیا مثال ہوسکتی ہے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ "طفیل بن عَمرو نے حاضرِ خدمت ہوکر عرض کیا کہ "یا رسولؐ اللہ! قبیلہ دوس نافرمانی اور سرکشی کرتا ہے اور اسلام لانے سے انکار کرتا ہے، آپ ان کے لیے بد دعا کیجئے۔" آپ نے ہاتھ اٹھائے لوگ سمجھے کہ آپ ان کے لیے بدُعا کرتے ہیں، مگر آپؐ نے کہا تو یہ کہا کہ "بارِ الٰہا! دوس کو ہدایت کر اور راہِ راست دکھلا، اور ان کو دائرہ اسلام میں لے آ۔"

غزوہ ذات الرقاع ۵ھ کا واقعہ ہے کہ آنجناب اتفاق سے احباب و اصحاب سے جُدا ہوکر ایک درخت کے نیچے دوپہر کے وقت آرام فرما رہے تھے کہ دشمنوں میں سے ایک شخص غورث بن حارث وہاں پہنچا اور اس نے آپ کو تنہا سوتا ہوا پاکر آپ کے قتل کے ارادہ سے تلوار کھینچی کہ اتنے میں آپ کی آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو دشمن ننگی تلوار لیے سر پر کھڑا تھا۔ اس نے آپ کو بیدار دیکھ کر کہا کہ "اب بتا تجھے میرے ہاتھ سے کون بچا سکتا ہے؟" آپؐ نے فرمایا: "اللہ۔" اب اسے خدا کی قدرت کہیے یا رعبِ نبوت سمجھئے بہرحال خواہ وجہ کچھ ہی ہو واقعہ یہ ہے کہ ہیبت سے اس کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ کر آپؐ کے قدموں پر گر پڑی، آپؐ نے وہی تلوار اٹھا کر فرمایا کہ "اب تُو بتا کہ تجھے میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟" اس نے کہا "کوئی نہیں، مگر ہاں تو ہی عمدہ بدلہ دینے والا ہو، اور حلم و عفو سے کام لے۔" آپؐ نے اسے معاف کر دیا اور چھوڑ دیا۔ (بخاری) بعض راویوں کا بیان ہے کہ جب وہ اپنے لوگوں میں آیا تو اس نے اُن سے کہا کہ "میں بہترین خلق کے پاس سے آیا ہوں۔" اور یہ قصہ کہا، اور یہی وجہ اس کے اسلام لانے کی ہوئی۔ (شفا، ص ۴۷)

انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں جناب رسالت مآبؐ کے ہم رکاب تھا۔ آپؐ اس وقت چادر اوڑھے

ہوئے تھے جس کی کور بہت موٹی تھی۔ ایک بدوی نے چادر کا کنارہ پکڑ کر اس زور سے جھٹکا دیا کہ اس کی موٹی کور کی رگڑ سے آپ کے شانے اور گردن پر نشان پڑ گیا (بخاری) آپ اس کی طرف متوجہ ہوئے تو اس نے کہا "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے اس مال میں سے جو تیرے پاس ہے میرے دونوں اونٹوں پر بھی کچھ لاد دے۔ کیونکہ اس میں سے جو کچھ تو مجھے دے گا وہ کچھ تیرا یا تیرے باپ کا مال نہیں ہے۔" یہ تلخ اور درشت بات سُن کر پہلے تو آنجناب فرطِ حلم و کرم سے خاموش رہے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ "بے شک مال تو اللہ کا ہے اور میں اس کا بندہ ہوں، مگر اے اعرابی! یہ تو کہہ کہ اب تیرے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جائے جو تو نے میرے ساتھ کیا ہے؟" اس نے کہا "نہیں"۔ آپؐ نے پوچھا "کیوں نہیں؟" اس نے کہا "کیونکہ تو برائی کے عوض میں برائی نہیں کرتا۔" یہ سُن کر آنجناب ہنسنے لگے۔ پھر آپؐ نے حکم دیا کہ "اس کے ایک اونٹ پر جَو اور ایک پر کھجوریں بار کر کے اسے دے دیں۔" (شفا، ص ۴۸)

ایک مرتبہ یہودی زید بن سعنہ اسلام لانے سے پہلے آپ کے پاس اپنے کچھ قرض کا تقاضا کرنے آیا اور شانہ مبارک سے چادر کھینچ لی اور بہت کچھ بک جھک کر کہنے لگا کہ "تم بنی عبدالمطلب بڑے ہی نادہند اور وعدہ خلاف ہو۔" اس کی بدزبانی پر بھی جناب رسالت مآبؐ برابر مسکراتے رہے، مگر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے جھڑک کر ایسی بیہودہ گوئی سے روکنا چاہا تو آپؐ نے ان سے فرمایا کہ "اے عُمر! تم نے ہم دونوں سے وہ طرزِ عمل اختیار نہیں کیا جو ہونا چاہیے تھا اور جس کی ہم کو ضرورت تھی۔ یعنی مناسب یہ تھا کہ تم اسے جھڑکنے کی بجائے مجھ سے ایفائے وعدہ اور ادائے قرض کے لیے کہتے اور اس کو حسنِ طلب اور نرمی تقاضا کی ہدایت کرتے۔" یہ کہہ کر آپؐ نے حضرت عمرؓ کو ارشاد فرمایا کہ "اس کا قرض ادا کریں اور اس کو جھڑکنے کے معاوضہ میں لے بیس صاع (تقریباً ڈیڑھ من) جَو اور دے دیں۔" حالانکہ اُس وقت میعادِ قرض میں بھی تین دن باقی تھے۔ اس حلم، نیک طینتی اور خوش خوئی نے اس شخص کے دل پر اتنا اثر کیا کہ وہ مُسلمان ہوگیا۔ اس کا بیان ہے کہ "مجھے آپ میں نبوت کی تمام نشانیاں معلوم ہوتی تھیں۔ مگر صرف دو باتیں میں نے نہیں آزمائی تھیں۔ ایک تو یہ کہ ان کا حلم ان کے غصہ سے زیادہ ہے اور دوسرے یہ کہ ان پر جتنی سختی کی جائے اُسی قدر اُن کی نرمی اور مہربانی بڑھتی جاتی ہے۔ اب میں نے ان دونوں صفتوں کو آپ میں برای العین دیکھ لیا اور مجھے آپؐ کی رسالت میں کچھ شبہہ نہیں رہا۔" (شفا، ص ۴۸)

حقیقت میں ضبطِ نفس اور حُسنِ اخلاق سے بڑھ کر انسان میں اور کیا خُوبی ہوسکتی ہے اور اس خوبی کے کمال کا مذکورہ بالا واقعہ سے بڑھ کر اور کیا معجزہ ہوسکتا ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جناب سرورِ کائنات نے حمایت حق میں محارم الٰہی کی حفاظت کی نیت کے سوا اپنے اوپر کسی قسم کی ظلم و زیادتی سے کبھی دادخواہی نہیں کی اور کسی ذاتی حق تلفی اور ستم رسیدگی کا ہرگز انتقام نہیں چاہا۔ نہ آپ نے حالتِ جہاد کے سوا کبھی کسی کو اپنے ہاتھ سے مارا نہ تنبیہہ کے لیے نہ سزا کے طور پر۔ (بخاری از مشکوٰۃ ص ۴۴۲)

سب جانتے ہیں کہ آپ مسجد سے زیادہ کسی مقام کی عزّت نہیں کرتے تھے، یہاں تک کہ اگر اس میں کوئی ذرا سی ناپاک اور غلیظ چیز بھی پڑی ہوتی تھی تو آپؐ کو بہت ملال ہوتا تھا۔ مگر ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ کوئی بدو وہاں آیا۔ ان وحشی صحرائیوں

کو اتنی تمیز کہاں۔ اس نے وہیں مسجد میں بیٹھ کر پیشاب کر دیا۔ اس کی یہ بدتہذیبی اور بے ادبی سب کو شاق گزری اور لوگ اسے مارنے اُٹھے۔ مگر جناب سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات نے ان کو روک لیا اور فرمایا کہ "اسے جانے دو اور اس کے پیشاب پر ایک ڈول پانی بہا دو، کیونکہ بیشک تم آسانی اور نرمی کے لیے بھیجے گئے ہو اور تشدد کرنے کے لیے نہیں بھیجے گئے ہو"۔ (بخاری ص ۸۹ و ۹۰۵)

آپ نے ایک موقع پر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا تھا کہ:

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الرِّفْقَ فِی الْاَمْرِ کُلِّہٖ ۔ اللہ کل کاموں میں نرمی اور رفق کو پسند کرتا ہے۔

اور بلاشبہ آپ کا طرزِ عمل ہمیشہ ہر حال میں اس قول کے مطابق رہا۔

عفو و رحم

غور سے دیکھا جائے تو حلم اور عفو ایک دُوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ وہی شخص دُوسروں کی لغزشوں اور غلطیوں سے چشم پوشی کر سکتا ہے جسے اپنے نفس پر اختیار اور اپنی طبیعت پر اقتدار ہو ورنہ جس میں حلم نہیں ہے اس میں رحم ممکن نہیں ہے مغلوب الغیظ آدمی کو تو اوروں سے درگزر کرنے کی جگہ اکثر خود اپنی تیز مزاجی اور زود رنجی پر ان سے معافی مانگنے اور معذرت کرنے کی ضرورت پڑتی ہے حقیقت میں جس طرح حلم شجاعت کے ایک خاص اور زیادہ اعلیٰ درجہ کا نام ہے ویسے ہی رحم حلم کی ایک مخصوص اور زیادہ پاکیزہ صورت سمجھنی چاہیے کیونکہ حلم تو یہ ہے کہ آدمی ناپسندیدہ حالات اور خلافِ طبیعت واقعات کو سنجیدگی اور متانت سے برداشت کرے اور ان کے ناگوار ہونے کی وجہ سے از خود رفتہ نہ ہو جائے۔ اور رحم یہ ہے کہ وہ ان حالات کے باعث اور ان واقعات کے موجب شخص پر دسترس رکھنے کے باوجود بھی اسے معاف کر دے اور اس کی قابلِ سرزنش حرکتوں پر اُسے کچھ نہ کہے۔ اس لیے قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے کہ:

وَالْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ۔ (آل عمران ع ۱۴)

اور غصہ کو پی جانے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے، اور اللہ بھلائی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

اور اسی تعلق کی بنا پر سچی شجاعت کے لیے حلم اور رحم جزوِ لازم سمجھے گئے ہیں اور اس وجہ سے یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ جس طبیعت میں اتنا اعلیٰ درجے کا حلم موجود ہو جیسا کہ گزشتہ باب میں چند روایتوں سے معلوم ہوتا ہے اس میں عفو اور رحم کی صفاتِ حسنہ علیٰ وجہ کمال نہ پائی جائیں۔ چنانچہ واقعات شاہد ہیں کہ جناب سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات نہایت ہی رحیم المزاج واقع ہوئے تھے اور حتی المقدور اپنے بڑے سے بڑے دشمنوں کو بھی معاف فرما دیتے تھے۔ قریشِ مکہ سے زیادہ سخت دشمن آپ کے اور کون تھے اور ان سے زیادہ کس کے ہاتھوں آپ کو تکلیفیں پہنچی تھیں۔ اس لیے فتح مکہ کے وقت ان سب کو یقین تھا کہ ان کی ایک ایک بات کا ان سے بدلہ لیا جائے گا اور ان کی سابقہ جفائیں ہی ان کی تباہی اور بربادی کا

سبب بن جائیں گی۔ لیکن جب آپؐ تشریف لائے تو آپ نے کسی کو بھی کچھ نہیں کہا اور سب کو معاف کردیا۔ پھر آپؐ نے ان سے پوچھا کہ تم لوگ کیا کہتے تھے کہ میں تم سے کیا برتاؤ کروں گا۔" اُنھوں نے کہا کہ" اچھا، کیونکہ آپ مہربان بھائی اور مہربان بھائی کے بیٹے ہیں۔" آپ نے فرمایا کہ" آج میں بھی تم سے وہی کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا۔" (شفا، ص ۴۸)

لَا تَثۡرِيبَ عَلَيۡكُمُ ٱلۡيَوۡمَ يَغۡفِرُ ٱللَّهُ لَكُمۡ ۔ آج تم پر کچھ الزام نہیں ہے اللہ تم کو معاف کرے

وَهُوَ أَرۡحَمُ ٱلرَّٰحِمِينَ ط (۱۲: ۹۲) اور بے شک وہ تمام رحم کرنے والوں میں سب سے بڑا رحم کرنے والا ہے۔

خیبر کی ایک یہودی عورت زینب بنت حارث نے آپ کی خدمت میں ایک بھنی ہوئی بکری پیش کی جس میں اس نے زہر ملا دیا تھا اور آپ اور اصحاب کرام اس میں سے کھانے لگے کہ اتنے میں آپ نے سب کو ہاتھ روکنے کے لیے ارشاد فرمایا اور کہا کہ یہ گوشت مسموم ہے۔ پھر آپ نے اس عورت کو بلا کر اُس سے پُوچھا تو اُس نے یہ عذر کیا کہ میں آپ کے دعوٰیِ نبوت کی تصدیق کرنا چاہتی تھی کیونکہ پیغمبر کو زہر سے کچھ نقصان نہیں ہوسکتا۔ آپؐ نے اس عورت کو معاف کر دیا حالانکہ آپؐ کے بعض اصحاب زہر کے اثر سے انتقال کر گئے اور خود آنجناب کا مزاج مقدس بھی ناساز رہا۔ لیکن اس کے انتقام میں آپؐ نے اس عورت سے بازپرس نہیں فرمائی۔ (بخاری ص ۴۴۹)

رحم کی ترغیب وتحریص کے لیے آنجنابؐ نے ارشاد فرمایا:

اَلرَّاحِمُوْنَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ اِرْحَمُوْا مَنْ رحم کرنے والوں پر رحمٰن رحم کرتا ہے تم زمین والوں

فِي الْاَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَآءِ۔ (ابوداؤد) پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔

اور اس میں قطعاً شائبہ شُبہ تک نہیں ہوسکتا کہ آپ خود اس قول کے سب سے اعلیٰ اور اکمل نمونہ تھے۔

سلمہؓ کہتے ہیں کہ ایک روز میں مدینہ سے نکلا اور غابہ کی طرف چلا۔ جب میں جنگل کے پاس پہنچا تو مجھے عبدالرحمن بن عوف کا غلام آتا ہُوا ملا اور اس نے مجھ سے کہا کہ" آنجناب کی اونٹنیاں چور لے گئے۔" میں نے پُوچھا کہ" وہ کون لوگ تھے؟" اس نے کہا کہ" غطفان اور فزارہ۔" میں نے وہیں تین نعرے لگائے:" یاصباحاہ یاصباحاہ۔" ایسے کہ جنگل گونج اٹھا پھر میں ان کے تعاقب میں بھاگا تو میں تھوڑی دُور پر اُن کو جالیا۔ وُہ پانی پینے کو ٹھہرے تھے میں نے ان پر تیر برسانے شروع کیے اور رجز یہ شعر پڑھتا جاتا تھا، یہاں تک کہ وُہ اونٹنیاں چھوڑ کر بھاگ گئے اور میں اُن کو گھیر لایا۔ راستے میں مجھے آپ آتے ہوئے ملے۔ میں نے آپ سے قصّہ کہا اور یہ بھی عرض کیا کہ" وہ لوگ ابھی پیاسے ہیں اگر ان کے پیچھے کچھ آدمی بھیج دیے جائیں تو غالباً وہ گرفتار ہوسکتے ہیں۔" آپؐ نے فرمایا:" اے ابن الاکوع! اب تم نے اپنا مال پا لیا اب ان کو جانے دو، وہ اپنے ساتھیوں سے جا ملے ہوں گے۔" (بخاری ص ۴۲۷) یہ درگزر محض آپؐ کے رحم کی وجہ سے تھی ورنہ چوروں کا پکڑا جانا کیا مشکل تھا۔

ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے نجد کی طرف کچھ سوار بھیجے۔ وُہ قبیلہ

بنی حنیفہ کے ایک شخص ثمامہ بن اثال کو پکڑ لائے اور اسے مسجد کے ایک ستون سے باندھ دیا۔ جب آپ وہاں تشریف لائے تو آپ نے اس سے کہا: "اے ثمامہ! اب تمھارا کیا ارادہ ہے؟" اس نے جواب دیا: "یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! میرا ارادہ بھلائی کا ہے۔ اگر تو مجھے قتل کر دے گا تو مجھ پر بہت سے خون ہیں (یعنی میرا قتل حق بجانب ہوگا) اور اگر تو احسان کرے گا تو وہ ایسے شخص کے ساتھ ہوگا جو شکر گزار رہے گا۔ اور اگر تو مجھ سے کچھ مال وصول کرنا چاہتا ہے تو جو تیرا جی چاہے مانگ لے (یعنی میں دولت مند آدمی ہوں رقم فدیہ ادا کر سکتا ہوں)۔ آپ نے ایک دو دن کے بعد اسے چھوڑ دیا۔ رہا ہو کر وہ مسجد کے باہر چلا گیا، وہاں سے ذرا دیر میں نہا دھو کر پھر آیا اور کلمۂ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔ اور کہنے لگا: "یا رسولؐ اللہ! دنیا میں مجھے آپؐ سے زیادہ عداوت اور آپ کے مذہب سے زیادہ نفرت کسی چیز سے نہ تھی۔ مگر اب مجھے آپؐ سب سے زیادہ محبوب اور آپ کا مذہب سب سے زیادہ مرغوب ہے۔" (بخاری ص ۶۲۷)

اس سے بھی زیادہ رحم و عفو کا واقعہ حاطب ابن ابی بلتعہ کا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ "جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اور زبیر اور مقداد کو روضہ خاخ کی طرف روانہ کیا اور فرمایا کہ "وہاں ایک شتر سوار عورت ہے اور اس کے پاس ایک خط ہے وہ لے آؤ۔" ہم چلے، جب ہم اس باغ میں پہنچے تو وہاں وہی عورت ملی۔ ہم نے اس سے خط مانگا تو اس نے انکار کیا۔ مگر ہمیں یقین تھا کہ آنجناب کا فرمانا غلط نہیں ہو سکتا اس لیے ہم نے اس سے کہا کہ "یا تو تو خود وہ خط دے دے ورنہ ہم تیری تلاشی لیں گے۔" ہمارا یہ اصرار اور یقین دیکھ کر اس نے اپنے جوڑے میں سے خط نکالا۔ ہم وہ لے کر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے دیکھا تو وہ خط حاطب ابن ابی بلتعہ نے بعض مشرکین مکہ کو لکھا تھا اور اس میں، اُن کو آنجناب کے ارادوں اور تجویزوں وغیرہ کی اطلاع دی تھی۔ آپؐ نے اُس سے پوچھا: "اے حاطب! یہ کیا؟" اُس نے کہا: "یا رسولؐ اللہ! ذرا ٹھہریے میں اہلِ قریش میں سے تو ہوں نہیں کہ اُن کو میری قرابت کا پاس ہو، اور مہاجرین کے تو اُن سے رشتہ داری کے تعلقات ہیں اور ان کے اعزّہ مکّے میں ہیں جو ان کے اہل و عیال اور ان کے مال و منال کی حفاظت کرتے ہیں۔ مگر میرا کوئی بھی نہیں ہے اس لیے میں نے یہ جاسوسی اور خبر رسانی اس خیال سے کی تا کہ میرا بھی قریش پر کوئی احسان ہو جائے اور وہ میرے اہل و عیال کو کچھ نہ کہیں، ورنہ میں نے یہ فعل کفر و ارتداد کی وجہ سے نہیں کیا۔" آپ نے یہ سن کر اصحاب سے فرمایا کہ اس نے سچ سچ کہہ دیا۔" حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: "یا رسولؐ اللہ! اجازت دیجیے کہ میں اس منافق کی گردن اڑا دوں۔" مگر آپؐ نے فرمایا: "یہ شخص جنگِ بدر میں شریک تھا۔" (گویا اس لیے قابلِ معافی ہے)۔ یہ سُن کر حضرت عمرؓ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اُنھوں نے کہا: "اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتا ہے۔" (بخاری، ص ۵۶۷)

اللہ اللہ کس قدر رحم و حلم ہے کہ ایک شخص آپ کا رفیق اور دوست بن کر آپ کے ساتھ رہتا ہے اور پھر آپ کی تمام تجاویز سے دشمن کو اطلاع دیتا ہے آپ اسے پکڑ لیتے ہیں اور اس کا جرم اتنا یقینی ہے کہ وہ خود انکار کی گنجائش نہیں پاتا اور اس کا عذر بدتر از گناہ معلوم ہوتا ہے مگر آپؐ کا رحم خود اس کا عذر خواہ بن کر اس کی جان بخشی کرا دیتا ہے، حالانکہ

آج کل کی بڑی سے بڑی مدعی تہذیب سلطنت میں اس جُرم کا شُبہ بھی سزائے قتل کے لیے کافی ہے اور اس میں کسی قسم کی بھی رعایت کا امکان نہیں۔

ذاتی تعلق کے لحاظ سے آپ کے رحم و عفو کی ایک مثال اس سے بھی زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔ جنگِ بدر میں ایک شخص طعیمہ بن عدی جناب سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ سے مارا گیا۔ عرب جاہلیت میں تو ایسے واقعات کا رونا برسوں بلکہ پشتوں تک رہتا تھا۔ چنانچہ اس کے بھتیجے جبیرہ بن مطعم نے اپنے غلام وحشی سے یہ وعدہ کیا کہ "اگر وہ حضرت حمزہ کو مار ڈالے تو آزاد ہو جائے"۔ وحشی آپ کی تاک میں رہا، جنگِ اُحد میں جب وہ ایک شخص سباع سے مصروفِ جنگ تھے تو وحشی نے موقع پا کر پیچھے سے آپؓ کو نیزہ مارا جس سے آپ شہید ہو گئے۔ اس کے بعد وحشی حسبِ قرارداد آزاد ہو کر مکے میں رہنے لگا۔ اور جب مکہ فتح ہو گیا تو وہاں سے بھاگ کر طائف پہنچا۔ اتفاق سے اسے معلوم ہُوا کہ اہلِ طائف کے قاصد جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جا رہے ہیں تو وہ بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔ کیونکہ سب جانتے تھے کہ آپ قاصد کو کچھ نہیں کہتے۔ چنانچہ جب آپ کی نظر اس پر پڑی تو آپ نے پوچھا کہ "کیا تُو وحشی ہے؟" اس نے کہا "ہاں"۔ آپ نے پوچھا کہ "کیا تُو نے ہی حمزہ کو قتل کیا تھا؟" اُس نے کہا "آپ نے جو کچھ سنا ہے وہ درست ہے"۔ آپ نے فرمایا "کیا تو یہ کر سکتا ہے کہ میرے پاس سے چلا جائے اور مجھے اپنی صورت نہ دکھائے"۔ چنانچہ وہ وفات حسرت آیات تک سامنے نہیں آیا اور آخر مسیلمہ کذاب کو قتل کر کے اس نے قتلِ حمزہؓ کی تلافی کی۔ یہ قصہ خود وحشی نے جعفر بن عمرو ضمیری اور عبداللہ بن عدی سے بیان کیا تھا۔ (بخاری ص ۵۸۳)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہتی ہیں کہ "میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اگر میں شبِ قدر کو پا جاؤں تو کیا دُعا مانگوں؟" آپ نے فرمایا: یہ:

اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّیْ۔ (مشکوٰۃ ص ۱۵۲) — اے اللہ! تو بڑا درگزر کرنے والا ہے اور تو درگزر کرنے کو پسند کرتا ہے تو مجھ سے بھی درگزر کر۔

اس ایک بات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ آپ کے نزدیک عفو کس قدر پسندیدہ صفت ہے۔ اور مذکورہ بالا واقعات سے ظاہر ہے کہ آپ اس صفت کے کیسے کامل اور جامع نمونہ تھے۔

صبر و شکر

صبر دنیا میں انسان کے لیے نہایت ہی ضروری اور مفید صفت ہے۔ اس کا تعلق ایک طرف تو حلم سے ہے اور دوسری طرف تسلیم و رضا سے، حلم اس حال میں ممدوح ہے جبکہ آدمی قدرت ہوتے ہوئے بھی بجا غصے کو دبا لے۔ لیکن صبر کے قابل تعریف ہونے میں قدرت اور استطاعت کی شرط نہیں ہے۔ بلکہ جب کبھی آدمی انسانی یا آسمانی خلافِ طبع بات کو ٹھنڈے دل سے برداشت کر لیتا ہے اور اس پر جزع فزع اور داد فریاد کرنے سے باز رہتا ہے تو وہی صبر ہے۔ اور یقیناً مستحسن، اسی طرح جیسے حلم کا ظاہری نتیجہ عفو ہے ویسے ہی صبر کا عملی نتیجہ شکر ہے۔ مگر نہیں اس بات کو بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام

نے ایسے صبر کی ہرگز تعلیم نہیں دی جو کسی طرح بھی ہماری حالت کی اصلاح میں مانع ہو یا جسے ہم ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنے کا حیلہ بنا سکیں۔ اسلام نے تو اصول ہی یہ ٹھہرایا ہے کہ:

اَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى وَ اَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى۔ (النجم ع ۳)

بے شک انسان کے لیے وہی ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے اور اس کی کوشش ضرور ملحوظ رکھی جائے گی۔

کوشش نہ کرنا صبر ہے ہی نہیں، بلکہ یہ تو پرلے درجہ کی کاہلی، بزدلی اور پست ہمتی ہے اور اس کا نتیجہ شکر کی بجائے انتہا کی ناشکری ہے۔ کیونکہ خدا کی دی ہوئی طاقتوں سے کام نہ لینے اور ان کو رائیگاں چھوڑ دینے سے بڑھ کر اس کی نعمتوں کی اور کیا ناقدردانی اور ناشکرگزاری ہو سکتی ہے۔ قرآن مجید میں تو جا بجا اس کو کفر کہا گیا ہے۔ اور حقیقت میں ناشکری ہی کفر ہے۔ اسلام کی تعلیم کے مطابق صبرِ محمود وہی ہے کہ آدمی ناگزیر واقعات پر بیقراری اور ناشکیبائی کا اظہار نہ کرے جو اس کے دائرۂ اختیار سے باہر ہیں۔ لیکن جن باتوں پر اس کی دسترس ہے ان میں حتی المقدور پوری کوشش نہ کرنا صرف صبر کا غلط استعمال ہی نہیں بلکہ سخت گناہ اور بڑا کفران ہے۔ اور جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام واقعاتِ زندگی اس سچی تعلیم کی عملی مثال ہیں۔ آپ شدائد پر صبر کرتے تھے۔ مگر آپ کی تسلیم و رضا ناخوش آیند باتوں کی امکانی مدافعت میں مانع نہ تھی۔ آپ کو اللہ پر کامل توقع تھا۔ لیکن یہ توکل آپ کی سعی و کوشش میں مخل نہ تھا ؎

گفت پیغمبر بہ آوازِ بلند
بر توکل زانوے اُشتر بہ بند

آپ بے انتہا صابر تھے۔ کفارِ مکہ کے ہاتھ سے آپ کو جو ایذائیں پہنچیں اُن کا برداشت کرنا آسان کام نہ تھا۔ آپ ہی کا جگر تھا کہ آپ نے اُن پر صبر کیا اور کبھی اپنے فرض کے بجا لانے میں اضطرار اور اضطراب کو دخل نہ دیا۔ حالانکہ حالت یہ تھی کہ آپ کے وعظ و نصیحت پر تمسخر اور استہزا تو شروع ہی سے کیا جاتا تھا۔ پھر نوبت سبّ و شتم تک پہنچی۔ وہ لوگ کبھی آپ کو دیوانہ اور مجنون کہتے تھے کبھی ساحر اور عیّار قرار دیتے تھے، کبھی آپ کی ناداری اور بے کسی پر آوازے کستے تھے۔ جب ان باتوں سے کچھ نتیجہ نہ نکلا تو انھوں نے آپ کے ساتھ اور زیادہ گستاخی اور بے حرمتی کا برتاؤ کیا۔ آپ کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے اور چونکہ غالباً آپ اس زمانہ میں برہنہ پا پھرتے ہوں گے اس لیے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس سے آپ کو کیسی تکلیف ہوتی ہو گی جب آپ کعبے میں نماز ادا فرماتے تھے تو کفار آپ کو ہر طرح چھیڑتے اور پریشان کرتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک شخص نے آپ پر خاک ڈال دی اور آپ اسی حال میں گھر تشریف لائے تو آپ کی ایک صاحبزادی نے مٹی جھاڑ دی اور سر دُھلایا اور وہ روتی جاتی تھیں آپ نے فرمایا: "بیٹی رومت، بے شک اللہ تیرے باپ کا محافظ ہے۔ (سیرت ابن ہشام ص ۳۲۷)

ایک روز اور ایسا ہی ہوا کہ آپ سایۂ کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے۔ اس دن کعبے میں اونٹ ذبح کیے ہوئے تھے۔ ابوجہل وغیرہ نے ان کی آلائش آپ کے اوپر ڈال دی اس وقت اتفاق سے حضرت فاطمہؓ پہنچ گئیں اور انھوں نے اسے

آپ پر سے ہٹایا۔" (بخاری ص ۷۴)

روایت ہے کہ ایک بار عروہ بن زبیر نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے پوچھا کہ "یہ تو بتاؤ کہ مشرکوں نے جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سب سے زیادہ سخت بدسلوکی کیا کی تھی؟" اُنھوں نے جواب دیا کہ "ایک روز آپ کعبے میں نماز ادا فرماتے تھے کہ اتنے میں وہاں عقبہ ابن ابی مُعیط آ گیا اس نے گردن مبارک میں ایک کپڑا لپیٹ کر بڑی سختی سے آپ کا گلا گھونٹنا شروع کیا، حُسنِ اتفاق کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آ پہنچے اور آپ نے عقبہ کے کندھے پکڑ کر اُسے پیچھے ہٹایا اور کہا "کیا تم لوگ اس شخص کو مارے ڈالتے ہو جو کہتا ہے کہ میرا پروردگار اللہ ہے۔" (بخاری ص ۵۹۵)

لیکن غالباً آنجناب کو ان تمام ذاتی تکلیفوں سے زیادہ تکلیف اپنے اصحاب و رفقا کی تکلیف اور پریشانی سے ہوتی ہو گی معلوم ہوتا ہے کہ یہی وجہ تھی کہ اہلِ مکہ بیکس و مسکین مسلمانوں کو اتنی سخت اذیتیں پہنچاتے تھے جسے سُن کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ ورنہ ان بیچاروں نے ان کا کیا بگاڑا تھا۔ وہ تو ان کے بتوں کو بھی بُرا نہ کہتے تھے فقط اتنا البتہ تھا کہ خود ان کے دل میں نورِ ایمان گھر کر گیا تھا اور اس سعادتِ عظمٰے اور نعمتِ کبریٰ کے مقابلہ میں کوئی تکلیف اور کوئی مصیبت ان کی حقیقت شناس نظر میں کچھ وقعت نہیں رکھتی تھی مگر بات یہی تھی کہ چونکہ آنجنابؐ پر دست درازی کی جرأت وہ تو کر نہیں سکتے تھے اس لیے اور ہر طرح سے ایذا رسانی کی کوشش کرتے تھے اور چونکہ آپ کی رحیم المزاجی اور رقیق القلبی کو بھی جانتے تھے۔ اس لیے آپ کے ضعیف اور کمزور پیروؤں کو تکلیف دے کر آپ کو تکلیف پہنچانا چاہتے تھے یہاں تک کہ ان میں سے متعدد آدمی تو ان کے ظلم و تشدد ہی سے جاں بحق تسلیم ہو گئے۔ جناب رسالت مآبؐ ان سب جسمانی اور روحانی سختیوں کو اٹھاتے تھے مگر رشتۂ صبر ہاتھ سے نہ چھُوٹتا تھا اور ادائے فرض سے منہ نہ موڑتے تھے۔

یہ تو اپنے ابنائے قوم کی ایذا رسانیوں پر صبر کی مثالیں تھیں اور حقیقت میں انہی کا برداشت کرنا طبیعت پر زیادہ گراں بھی ہوتا ہے مگر ان کے علاوہ اور ناخوشگوار واقعات سے بھی آپؐ کی زندگی خالی نہ تھی۔ اور آپ رسولِ خدا ہونے کی وجہ سے ان حادثات سے مصئون نہ تھے جو عام طور پر انسان کو وقتاً فوقتاً پیش آتے ہیں اگرچہ ہم کو ان میں سے اکثر حالات تو معلوم ہی نہیں۔ کیونکہ آپ کا تسلیم و توکل خود آپ کو بھی کسی تکلیف کا احساس نہیں ہونے دیتا تھا تو اوروں کو ان کا علم کیونکر ہو سکتا تھا۔ تاہم آپ کی اولاد امجاد کے انتقال کا حال تو تاریخی واقعہ ہے۔ آپؐ کے چار صاحبزادے قاسم، طاہر، طیب (از حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا) اور ابراہیم (از ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا) پیدا ہوئے۔ مگر چاروں کا بچپن میں ہی انتقال ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ اولاد کی موت سے زیادہ آدمی پر اور کیا صدمہ ہو سکتا ہے۔ یُوں تو ہر جگہ ہی مگر خاص کر عرب میں تو اولاد ذکور کی بڑی قدر تھی۔ کیونکہ انہی پر قبیلوں کی طاقت کا مدار تھا۔ اور انہی سے آیندہ نسل چلتی تھی۔ وہاں جس قدر لڑکیوں سے نفرت کی جاتی تھی اسی قدر لڑکوں سے محبت کی جاتی تھی چنانچہ سنگدل اہلِ مکہ آنجنابؐ کے ان حوادث پر بھی آپؐ سے استہزا کرتے تھے اور آپؐ کو ابتر (مقطوع النسل) ہونے کا طعنہ دیتے تھے۔ اس پر اللہ جل شانہٗ نے آپؐ کی تسکین کے لیے فرمایا:

اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ۔ — بیشک تیرا دشمن ہی مقطوع النسل اور بے نام و نشان ہے۔

چنانچہ دیکھیے کہ یہ وعدہ صادقہ کتنی عمدگی سے پُورا ہوا کہ اسی زمانہ میں اُن لوگوں کا کوئی نام لیوا نہ رہا۔ اور ایک ہی پشت کے بعد خود ان کی اولاد دائرۂ اسلام میں داخل ہو کر ان پر لعنت کرنے لگی۔ لیکن بہر حال ان سب باتوں سے بھی آپ کے پائے صبر و ثبات میں لغزش نہیں ہوتی تھی۔

انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ "ہم جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ابو سیف لوہار کے یہاں گئے جس کی بیوی آپ کے صاحبزادے ابراہیم کو دُودھ پلاتی تھیں۔ اس وقت ابراہیم بالکل جاں بلب تھے ان کی حالت دیکھ کر آپ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے (ذرا ان لوگوں کی سخت دلی کو دیکھیے) کہ اس حالت میں آپ کو آبدیدہ دیکھ کر عبدالرحمٰن بن عوف نے کہا "یارسول اللہ آپ بھی!" (یعنی آپ بھی بے صبری کا اظہار فرماتے ہیں) آپؐ نے فرمایا: اے ابنِ عوف! یہ آنسو رحم اور شفقت کی وجہ سے ہیں۔ (یعنی بے صبری اور ناشکری کی وجہ سے نہیں ہیں) اور بے شک آنکھ سے آنسو بہتے ہیں اور دل رنج کرتا ہے۔ مگر ہم کوئی ایسی بات نہیں کہتے جو رضائے الٰہی کے خلاف ہو۔" (بخاری ص ۱۷۴)

اسی طرح اسامہ بن زید سے مروی ہے کہ "آپ کی ایک صاحبزادی کے لڑکے کا انتقال ہو رہا تھا۔ اُنھوں نے آپ کو بلایا۔ آپ نے ان کو سلام کہلا بھیجا، اور یہ کہا کہ "بے شک جو اللہ نے لے لیا ہے وہ اس کا تھا اور جو کچھ اس نے دیا ہے وہ بھی اسی کا ہے۔ اور اس کے نزدیک سب کا ایک وقت مقرر ہے، اس لیے تم کو صبر اور شکر سے کام لینا چاہیے۔" انھوں نے پھر آپ کو قسم دلا کر بہ تاکید بلوایا، تو آپؐ اصحاب سمیت تشریف لے گئے۔ آپ نے بچّے کو اٹھایا تو اس کی سانس اُکھڑ چکی تھی۔ آپؐ کے آنسو بھر آئے۔ یہ دیکھ کر سعد نے آپؐ کو ٹوکا اور کہا "یارسولؐ اللہ! یہ کیا؟" آپؐ نے فرمایا "یہ رحمت اور رقت ہے جو اللہ نے اپنے بندوں کے دلوں میں ڈالی ہے۔ اور بے شک اللہ اپنے رحیم المزاج بندوں پر رحم کرتا ہے۔" یعنی اشک باری کو اضطراب پر محمول نہ کرنا چاہیے بلکہ یہ تو عین صبر ہے۔ البتہ کسی عزیز کی مفارقت کو محسوس نہ کرنا قساوت اور سخت دلی کی دلیل ہے۔" (بخاری ص ۱۷۱)

سبحان اللہ! خدا نے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو کتنا نیک اور پاک دل عطا فرمایا تھا، اور آپ کو ہر ایک بات میں افراط و تفریط سے کس خوب صورتی سے بچایا تھا۔ یہی صبر اگر بڑھ جائے کہ آدمی کو اپنے عزیزوں سے ہمدردی نہ رہی اور اس کا دل ان کے صدموں کو محسوس نہ کرے تو یہ قساوت بن جائے۔ اور قطعاً قابلِ تعریف نہ ہو اس کے برخلاف اگر وہی آنسو جو ایک شیر خوار بچّے کی جاں کنی یا ایک ضعیف بیوہ کی بیکسی پر ٹپکتے ہیں خود اپنی جسمانی تکلیف یا اپنے ادائے فرض کی دقتوں پر نکلیں تو وہ جبن ہو جائے اور یقیناً مستحق ملامت ٹھہرے۔ یہ اعتدال مزاج اللہ تعالیٰ کا ایک نہایت بیش بہا عطیہ ہے جس کو وہ چاہے عطا کر دے۔ وَاللّٰہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ط

ان دونوں صورتوں کے سوا صبر کی ایک قسم اور بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنے لیے کسی قسم کی آسائش کے اسباب مہیا کرنا آدمی کے اختیار میں ہو۔ مگر وہ (سستی یا پست ہمتی یا بے سروسامانی کے سبب سے نہیں بلکہ) اپنی فیاضی یا رحمدلی یا ہمدردی کی وجہ سے صبر کرتا ہے اور وہ اسباب دُوسروں کو دیتا ہے۔ یہ صبر سب سے زیادہ مشکل اور سب سے زیادہ محمود ہے

کیونکہ پہلی دونوں صورتوں میں تو چار و ناچار صبر کرنا ہی پڑتا ہے اور تھوڑا بہت رو دھو کر سب ہی صبر کر لیتے ہیں۔ مگر یہ آخرالذکر صورت خود اختیاری ہے اور اس کے لیے بڑے ضبطِ نفس کی ضرورت ہے۔

بلاشبہ ظاہر بیں اشخاص کے لیے یہ نہایت ہی عجیب ہے کہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی صفاتِ حسنہ میں تغیرِ حالات نے ذرا بھی فرق پیدا نہیں کیا۔ مکہ معظمہ میں آپؐ جس طرح کفار کی ایذا پر صابر و شاکر رہے۔ مدینہ منورہ میں ویسے ہی آپ خود اپنے نفس پر ضابط اور قادر رہے صرف صبر کی نوعیت کسی قدر بدل گئی۔ یہاں باوجودیکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہر طرح کامیاب اور مقتدر بنا دیا۔ مگر پھر بھی آپ کی جو طرزِ معاشرت تھی وہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اور اس سے آپ کے صبر اور ضبط کا اندازہ ہو سکتا ہے، کتنی بڑی بات ہے کہ ایک با اختیار نبی اور ایک ہر دلعزیز رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) جس کے جاں نثار اتباع اور سرفروش اصحاب میں کچھ تی لوگ بھی شامل ہوں جو اس کے اشارۂ ابرو پر اپنی دولت، اپنا گھر بار اور اپنی جان تک قربان کرنے کو سعادتِ دارین جانتے ہوں۔ اس پر دو دو دن کے فاقے گزریں محض اس وجہ سے کہ اس نے جو کچھ آیا محض مسکینوں کی دستگیری اور محتاجوں کی کاربراری میں صرف کر دیا۔ کیا یہ صبرِ محمود کی بہترین مثال نہیں ہے، اور کیا آپ کی زندگی ایسی مثالوں کا ایک مسلسل تذکرہ نہیں ہے؟ یقیناً اس سے متعصب سے متعصب شخص کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔

سوید بن نعمان کہتے ہیں کہ "میں جنگِ خیبر میں آپ کے ہم رکاب تھا جب آپ خیبر کے قریب مقام صہبا میں پہنچے تو آپ نے عصر کی نماز پڑھ کر کھانا مانگا وہاں ستو کے سوا اور کچھ بھی موجود نہ تھا۔ چنانچہ وہی لایا گیا۔ ہم سب نے اسی کو گوندھ گاندھ کر کھا لیا اور اس کا پانی پی لیا۔ جناب سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات اُٹھ کھڑے ہوئے اور آپؐ نے کلی کی۔ پھر ہم نے نماز پڑھی۔" (بخاری ص ۸۱۲)

جابرؓ کہتے ہیں کہ غزوۂ خندق کے موقع پر ہم لوگ کھائی کھود رہے تھے۔ کھودتے کھودتے ایک بڑا پتھر آ گیا۔ سب آپ کی خدمت میں آئے اور حال عرض کیا۔ آپؐ خود اس میں اترنے کے لیے تیار ہو گئے حالانکہ اس وقت شدتِ گرسنگی سے شکم مبارک پر پتھر بندھا ہوا تھا کیونکہ وہاں ہم کو تین دن سے کچھ کھانے کو نہیں ملا تھا۔ چنانچہ آپؐ نے کدال لے کر اس پتھر کو توڑنا شروع کیا یہاں تک کہ وہ ریت کی طرح ریزہ ریزہ ہو گیا۔ پھر میں اجازت لے کر گھر آیا اور میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ "میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وہ حالت دیکھی ہے کہ صبر کی تاب نہیں ہے۔ کیا تمہارے پاس کچھ کھانے کو ہے؟" اس نے کہا "ہمارے یہاں کچھ جو اور ایک بکری کا بچہ ہے۔" میں نے اسے ذبح کر کے پکانے کے لیے دیگچی میں رکھا۔ اُس نے جو پیسے اور آٹا گوندھ کر روٹی پکانے لگی۔ پھر میں نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ "یارسول اللہؐ! میرے پاس کچھ تھوڑا سا کھانا ہے قدم رنجہ فرمائیے، اور ایک دو آدمیوں کو اور لیے چلیے۔" آپ نے پوچھا کہ "کتنا کھانا ہے؟" میں نے کیفیت عرض کی۔ آپؐ نے فرمایا کہ "بہت ہے اور بہت اچھا ہے، تم اپنی بیوی سے کہہ دو کہ جب تک میں نہ آؤں تب تک دیگچی چولھے پر سے اور روٹی کو تنور میں سے نہ نکالے۔" پھر آپ سب مہاجرین کو لے کر چلے۔ یہ دیکھ کر مجھے بہت فکر ہوئی اور میں نے اپنی بیوی سے آ کر کہا: "اری کمبخت! جناب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سب مہاجرین و انصار کو لے کر آ گئے۔" اس نے کہا کہ "کیا آپؐ نے تم سے

حال پوچھ لیا تھا؟" میں نے کہا "ہاں"۔ اتنے میں آپ بھی تشریف لے آئے اور آپ نے لوگوں سے کہا کہ "آؤ۔ مگر ہجوم مت کرو۔" پھر آپؐ نے روٹیاں نکال کر اس پر گوشت رکھا اور اصحاب میں تقسیم کرنا شروع کیا یہاں تک کہ سب سیر ہوگئے اور پھر بھی کھانا باقی رہ گیا۔ تو آپ نے فرمایا کہ "کھاؤ اور لوگوں کو دو، کیونکہ وہ بھوکے ہیں۔" (بخاری ص ۵۸۸)

اس ایک واقعہ سے آپ کے کتنے خصائل حمیدہ پر روشنی پڑتی ہے۔ آپ کی سادگی اور بے تکلفی آپ کی محنت اور جفاکشی اور صبر و ثبات، آپ کا استقلال و استقامت، آپ کا انصاف اور مساوات، یہ ایک واقعہ آپ کی ان صفاتِ حسنہ کا آئینہ ہے۔ اور وہ اپنی نوعیت میں کچھ انوکھا واقعہ نہیں ہے۔ ایسے موقعے اکثر پیش آتے رہتے تھے۔ چنانچہ انسؓ بیان کرتے ہیں کہ "ایک دن ابو طلحہ نے اُم سلیم سے کہا کہ "جناب رسول اللہؐ کی آواز سے ضعف پایا جاتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے کچھ کھایا نہیں۔ کیا تمھارے پاس کچھ ہے۔" اُنھوں نے جَو کی کچھ ٹکیاں نکالیں اور ان کو اپنی اوڑھنی میں لپیٹ کر مجھے دیں، اور مجھے خدمتِ اقدس میں روانہ کیا۔ میں پہنچا تو آپ مسجد میں تشریف فرما تھے اور بہت سے آدمی حاضر تھے۔ میں چپ چاپ کھڑا رہا آپؐ نے مجھے کھڑا دیکھ کر پوچھا کہ "کیا تم کو ابو طلحہ نے بھیجا ہے؟"

میں: "جی ہاں۔"

آپ: "کھانے کے لیے۔"

میں: "جی ہاں۔"

یہ سن کر آپ نے سب لوگوں کو ساتھ لیا اور چلے۔ میں آگے آگے بھاگتا ہوا گھر آیا اور حال کہا۔ ابو طلحہ اور ام سلیم کو اس سے تردد ہوا۔ کیونکہ کھانا زیادہ نہ تھا۔ مگر اُن کو آپ کی ہر بات پر پورا اعتبار تھا۔ ابو طلحہ نے باہر نکل کر آپ کا استقبال کیا۔ آپ اندر تشریف لائے اور ام سلیم سے کہا "یا ام سلیم! تمھارے پاس کیا ہے، لاؤ"۔ وہ وہی روٹیاں لے آئیں۔ اور ایک کُپّا تھا، اس میں سے کچھ نچوڑا۔ آپ نے اس سے روٹی لگائی اور دس دس آدمیوں کو بلا کر کھانا کھلا دیا، یہاں تک کہ سب کا پیٹ بھر گیا۔" (بخاری ص ۵۱۹)

یہ واقعات اُس زمانے کے ہیں جب کہ خدا نے اپنی قدرت اور مہربانی سے دولتِ دنیا کو آپ کے قدموں پر ڈال دیا تھا، مگر اس سے آپ کی طبیعت میں ذرا بھی فرق نہیں آیا۔ آپ جیسے مصائبِ آسمانی پر صابر تھے ویسے ہی کفارِ قریش کی جور و جفا پر بھی صابر و شاکر رہے اور ویسے ہی مدینہ میں رئیسِ قوم ہونے کے بعد بھی صابر و ضابط رہے۔ یوں تو کوئی وقت، کوئی لمحہ، کوئی ثانیہ ایسا گزرتا ہی نہ تھا جب آپ کا دل یادِ الٰہی سے غافل ہوتا ہو، لیکن آپ اپنے اس تقرب و معرفت کے باوجود بھی محض ذکرِ قلبی پر قانع نہ تھے اور ان شدائد ظاہری پر بھی آپ کی عبادت گزاری کا یہ عالم تھا کہ کثرتِ قیام و شب بیداری سے آپ کے پاؤں ورم کر آتے تھے۔ مگر جب آپ سے کہا گیا کہ "آپ تو محبوبِ خدا اور رسول اللہ ہیں۔ آپ کو اس قدر عبادت کی کیا ضرورت ہے؟" تو آپ نے فرمایا کہ "تو کیا میں بندۂ شکر گزار نہ ہوں۔" (بخاری ص ۱۵۲) یعنی یہ درست ہے کہ مجھ پر منعمِ حقیقی کے بے شمار احسان و انعام ہیں لیکن یہ خود ہی اس بات کے مستلزم ہیں کہ اس کا اور زیادہ شکر ادا کیا جائے۔

نہ یہ کہ اس کے لطف وکرم کے بھروسا پر اسے بھلا دیں اور اس سے غافل ہو جائیں۔ سُبحان اللہ! کتنا معقول اور پاکیزہ جواب ہے۔ اور اگر خدا ہدایت دے تو آنجناب کی یہ ایک بات ہی ساری دنیا کی اصلاح کرنے کے لیے کافی ہے۔ مگر وائے برحالِ ما کہ آپ کو اپنا ہادی اور مقتدا جانتے ہیں۔ مگر جو حالت ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔

سخاوت

فضائلِ انسانی میں دُوسروں کی نفع رسانی کے لحاظ سے سخاوت کا درجہ سب سے مقدم ہے۔ کیونکہ علی العموم عوام کو جتنا عملی فائدہ بظاہر اس سے پہنچتا ہے۔ اتنا اور کسی سے نہیں پہنچتا۔ سخاوت کے لیے یہی ضرور نہیں ہے کہ آدمی دولت مند ہی ہو۔ اور ہزاروں لاکھوں روپیہ خیرات کر سکے۔ نہیں، بلکہ سچی سخاوت اور فیاضی یہ ہے کہ آدمی مقدور بھر دوسروں کو فائدہ پہنچانے میں دریغ نہ کرے۔ اور خدا نے اپنے فضل وکرم سے جو نعمتیں اس کو عطا فرمائی ہیں۔ اُن میں مستحقین کو شریک کرنے میں بخل اور خست سے کام نہ لے اس کے لیے دولت کی اتنی ضرورت نہیں جس قدر نیک دلی کی حاجت ہے۔ کیونکہ یقیناً وہ غریب آدمی جو اپنا پیٹ کاٹ کر کسی بھوکے کو اپنی رُوکھی سُوکھی روٹی میں سے ایک ٹکڑا دے دیتا ہے اس کروڑپتی سے بدرجہا زیادہ قابلِ ستائش اور مستحقِ آفریں ہے جو اپنے بیحد حساب دولت میں سے چند لاکھ روپیہ خیراتی کاموں یا قومی چندوں میں خرچ کر دیتا ہے۔ نہیں اگر یہ شخص اپنی ساری کی ساری دولت بھی خیرات کر دے پھر بھی بمشکل اس غریب کے برابر ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اگر اس کی یہ سخاوت نمود و نمائش کے شائبہ سے پاک ہو تب بھی دُنیا میں اس کی اس فیّاضی اور فراخ حوصلگی کا غلغلہ اور اس کے ابنائے قوم کا اس کی داد و دہش پر تشکر و امتنان ہی اس کی جود و عطا کا کافی معاوضہ ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں وہ غریب آدمی غالباً خود بھی اپنی فیاضی کو بھول جاتا ہے اور اس بھوکے کو بھی اس کا احسان یاد نہیں رہتا اور دنیا کو تو اس عالی ہمتی اور فراغ حوصلگی کی خبر تک بھی نہیں ہوتی۔

دولتِ دنیا کے لحاظ سے جناب سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کا مقابلہ امریکہ اور یورپ کے قارون شوکت فیّاضوں اور شدادِ حشمت مخیّروں سے نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جس حقیقی جُود و سخا کے واقعات آپ کی روزمرہ زندگی میں ایسی کثرت سے پیش آتے تھے کہ کسی کو ان کا خیال تک نہ رہتا تھا اس کی مثال ملنا آسان نہیں ہے۔ آپ کی طبیعت کی فیاضی کا اندازہ صرف اس بات سے ہو سکتا ہے کہ بروایت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کبھی زبانِ فیض ترجمان سے کسی سائل کے لیے بھی "نہیں" نہیں نکلا۔ (صحیحین از مشکوٰۃ ص ۴۴۲) اور بقول انسؓ آپ نے کبھی کسی چیز کو آئندہ کے لیے نہیں رکھا۔ (مشکوٰۃ ص ۴۴۳) یہی وجہ ہے کہ جب ایک شخص نے آپ سے بکریاں مانگیں اور وہ اتنی تھیں کہ دو پہاڑیوں کا درمیانی میدان ان سے بھرا ہُوا تھا، تو آپ نے وہ سب اسے دے دیں۔ یہ شخص اپنی قوم میں جا کر کہنے لگا کہ "اے قوم! اسلام لے آؤ۔ کیونکہ خدا کی قسم! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس قدر دیتا ہے کہ فقر کا خوف نہیں رہتا۔" (مشکوٰۃ ص ۴۴۳)

جبیر بن مطعم کا بیان ہے کہ جب ہم جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب جنگِ حنین سے واپس آ رہے تھے

تو ایک جگہ چند بدوی آپؐ سے مانگتے مانگتے لپٹ پڑے، یہاں تک کہ آپ کو ایک ببول کے درخت تک دھکیلتے ہوئے لے گئے۔ اور اس کش مکش میں آپ کی چادر اُس کے کانٹوں میں اُلجھ گئی۔ آپ نے وہاں رُک کر ان سے فرمایا کہ میری چادر تو مجھے دے دو۔ اگر میرے پاس جنگل کے ان درختوں کے برابر بھی اُونٹ ہوتے تو میں سب تم میں بانٹ دیتا۔ اور تم مجھے نہ تو بخیل پاتے اور نہ جھوٹا۔ اور نہ ڈرپوک (کہ خواہ نخواہ کسی چیز کے دینے میں دریغ کروں یا ایفائے وعدہ نہ کروں یا فقر و فاقہ سے ڈر کر کچھ اپنے لیے بچا رکھوں) (بخاری ص ۳۹۶)

ابو سعید الخدریؓ کہتے ہیں کہ "ایک دفعہ انصار میں کچھ لوگوں نے آپ سے کچھ مانگا۔ آپ نے اُن کو دے دیا۔ اُنھوں نے اور مانگا، آپ نے اُن کو اور دیا، یہاں تک کہ آپ کے پاس جو کچھ تھا سب دے ڈالا۔ پھر آپ نے فرمایا کہ" میرے پاس جو کچھ مال آتا ہے میں اُسے تم لوگوں سے بچا کر جمع نہیں کر رکھتا اور بلا شبہ جو شخص اللہ سے یہ مانگتا ہے کہ وہ اسے سوال کی ذلت سے بچائے۔ اللہ اسے اس سے بچا لیتا ہے۔ اور جو استغنا چاہتا ہے، اللہ اسے غنی کر دیتا ہے۔ اور جو شخص صبر اختیار کرتا ہے اللہ اسے صابر بنا دیتا ہے۔ اور کسی شخص کو عطایائے الٰہی میں سے کوئی عطیہ صبر سے زیادہ اچھا نہیں دیا گیا۔ (بخاری ص ۱۹۸) یعنی صبر خدا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔

ایسے ہی حکیم بن حزام کہتے ہیں کہ" میں نے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ سوال کیا۔ آپ نے مجھے دیا۔ پھر میں نے اور مانگا، آپ نے اور دیا۔ پھر آپ نے فرمایا: "یا حکیم! بے شک یہ مال پاکیزہ اور پسندیدہ ہے۔ جو کوئی اسے بلا حرص ضرورت کے لیے لیتا ہے تو اس میں برکت ہوتی ہے اور جو کوئی اسے لالچ سے لیتا ہے۔ تو اس میں برکت نہیں ہوتی۔ اور اس کی حالت اس شخص کی سی ہوتی ہے جو کھاتا ہے مگر سیر نہیں ہوتا۔ اور بے شک دست بلند (دینے والا) دست پست (لینے والے) سے بہتر ہے۔" میں نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! بخدا! میں آپ کے سوا مرتے دم تک کسی سے کچھ نہ مانگوں گا۔" چنانچہ روایت ہے کہ آپؐ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے اپنے اپنے عہدِ خلافت میں حکیم کو کچھ دینا چاہا۔ مگر اُنھوں نے قبول نہ کیا اور برابر اپنے قول پر ثابت قدم رہے۔ (بخاری ص ۳۸۴)

آپ کے جُود و عطا کے ایسے واقعات جتنے چاہیں جمع کیے جا سکتے ہیں کیونکہ آپ کے ابرِ کرم کی گہرباری کسی موسم اور موقع کی منتظر نہیں رہتی تھی بلکہ وہ فیاضِ ازل کی بخشش کی ایک مثال تھی کہ ہمیشہ ہر حال میں جاری رہتی تھی۔ چنانچہ ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہا فرمایا کہ" اگر میرے پاس کوہِ اُحد کے برابر سونا ہو تب بھی مجھے خوشی اسی وقت ہو کہ میں تین دن گزرنے سے پہلے ہی وہ سب بانٹ دُوں اور میرے پاس سوائے اس کے جو میں ادائے قرض کے لیے اٹھا رکھوں اور کچھ باقی نہ رہے۔" (بخاری ص ۳۲۱)

یہ محض آپ کی تمنا ہی نہ تھی بلکہ خدا نے اسے کئی بار کر دکھایا اور جو کچھ آپ کی زبانِ صدق بیان سے نکلا تھا وہ بارہا عملاً پُورا ہو گیا۔ آپ کے پاس بڑی بڑی رقمیں آئیں مگر جب آپ وہاں سے اُٹھے تو خالی ہاتھ اُٹھے۔ چنانچہ عامل بحرین نے

آپ کی خدمت میں ایک لاکھ دس ہزار درہم بھیجے۔ آپ نے شام ہوتے ہوتے وہ سب دے دیے۔ ایک مرتبہ آپ کے پاس نوّے ہزار درہم آئے، آپ نے ان کو چٹائی پر رکھ دیا اور جو سائل آیا اسے دیتے گئے یہاں تک کہ وہ سب تقسیم ہو گئے۔ (شفا، ص ۵۰)

آپ کی بے انتہا سیر چشمی اور فیاضی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ بعض وقت جب آپ کے پاس کچھ نہیں ہوتا تھا اور کوئی حاجت مند آجاتا تھا تو آپ قرض تک لے کر اس کی حاجت روائی میں تامل نہ ہوتا تھا اور بالعموم آپ پر اسی قسم کے قرض تھے ورنہ آپ اپنی ذاتی ضرورتوں کو قرض لے کر پورا کرنے سے بالکل بے نیاز تھے۔ چنانچہ روایت ہے کہ ایک شخص بارگاہِ نبوی میں کچھ مانگنے کے لیے حاضر ہوا۔ اس وقت آپ کے پاس کچھ نہ تھا۔ آپ نے فرمایا کہ "اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ مگر جاؤ تم میری ذمہ داری پر چیزیں خرید و۔ جب ہمارے پاس کچھ آئے گا تو ہم اس کی قیمت ادا کر دیں گے۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ "یا رسول اللہ! اللہ نے آپ کو ان باتوں کی تکلیف نہیں دی جو آپ کی استطاعت سے باہر ہیں۔" آپ کا مطلب یہ تھا کہ اس طرح دوسروں کے لیے خود قرض کا بار اٹھانا اور پھر قرض خواہوں کی باتیں سننا کیا ضرور ہے۔ جو کچھ آپ کے پاس ہوتا ہے وہ تو آپ دے ہی دیتے ہیں پھر ایسا کیوں کیا جائے۔ آپ کو اُن کی یہ بات کچھ ناپسند ہوئی۔ کیونکہ آپ کی بندہ نوازی کسی کی دل شکنی کو گوارا نہیں کرتی تھی۔ مگر آپ ساکت رہے کہ وہیں سے انصار میں سے کسی نے کہا "یا رسول اللہ! آپ تو دیجئے اور اللہ سے افلاس کا خوف نہ کیجئے۔" آپ یہ توکل اور کشادہ دلی کی بات سن کر مسکرانے لگے اور آپ کی بشاشت بشرے سے ظاہر ہو گئی۔ (شفا، ص ۵۰)

یہاں یہ بات ملحوظِ خاطر رکھنی چاہیے کہ آپ کا یہ جود بیجا کبھی نہیں ہوتا تھا۔ اوّل تو علی العموم تمام مسلمان تھے ہی غریب اور نادار کیونکہ مہاجرین کا تو تمام سامانِ معیشت مکہ ہی میں رہ گیا تھا اور وہ بمشکل جان بچا کر وہاں سے نکلے تھے۔ رہے انصار، تو وہ بھی کچھ زیادہ متمول نہ تھے، کیونکہ جہاں یہودیوں کی سی سود خوار تجارت پیشہ قوم ہو گی وہاں کوئی اور قوم کیا دولت مند ہو سکتی ہے۔ اس کے سوا اول تو عرب کی حمیت اور شرافت۔ اُس پر آپ کی صحبت روح پرور کی برکت اور سعادت وہاں ایسا کوئی بھی نہ تھا جو بلا وجہ اور بے ضرورت زمرۂ سائلین میں شامل ہونے کا عار گوارا کرتا۔ یہ بھی تھا کہ وہاں آپس میں ایک دوسرے کی حالت تو مخفی تھی ہی نہیں اس لیے آپ کے پاس ضرورت مند ہی آتے تھے اور آپ ان کی بے دریغ اعانت و دستگیری فرماتے تھے۔ چنانچہ آپ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ،

اِنَّمَآ اَنَا قَاسِمٌ وَّخَازِنٌ وَّ اللّٰہُ یُعْطِیْ۔ — بیشک میں تو خزانچی اور بانٹنے والا ہوں اور اللہ ہی دیتا ہے۔ (بخاری)

آپ تو کبھی اپنے جُود و عطا پر تشکر و امتنان کے متوقع ہوتے ہی نہ تھے۔ لیکن چونکہ بہرحال سوال تو مکروہ ہے ہی، اور سائل کو خواہ نخواہ گردن جھکانی ہی پڑتی ہے اور بالخصوص غیور شخص کو تو اس سے بہت ہی شرم آتی ہے۔ اس لیے بسا اوقات آپ کی طبع کریم اپنے جُود کی کوئی ایسی صورت نکال لیتی تھی جس میں احسان کا بار بظاہر کچھ ہلکا ہو جاتا تھا۔ چنانچہ آپ اکثر ایسا کیا کرتے تھے کہ کسی سے کوئی چیز خرید فرمالی اور پھر وہی چیز اسے ہدیۃً دے دی۔ یہ محض آپ کا حسنِ عطا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اس سے فی الواقع احسان میں کچھ کمی نہیں ہوتی۔

جابر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ" میں ایک غزوے میں آپ کے ساتھ تھا میرا اونٹ تھک کر پیچھے رہ گیا، اتنے میں آپ آ گئے۔ آپ نے پُوچھا کہ" کیوں جابر! کیا حال ہے؟" میں نے عرض کیا کہ" میرا اونٹ تھک گیا ہے۔" آپؐ نے میرے اونٹ کے ایک تسمہ مارا تو وہ خوب تیز چلنے لگا۔ پھر ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے چلے۔ پھر آپ نے مجھ سے پُوچھا کہ" کیا تم یہ اونٹ بیچتے ہو؟" میں نے کہا" ہاں"۔ آپ نے مجھ سے وہ خرید لیا۔ پھر آپ آگے تشریف لے آئے اور میں ذرا دن چڑھے پہنچا۔ میں نے اُونٹ مسجد کے دروازہ پر باندھ دیا۔ آپ نے مجھے دیکھ کر فرمایا کہ" تم اب آئے ہو۔" میں نے عرض کیا کہ" ہاں یا رسولؐ اللہ!" آپ نے فرمایا کہ" اُونٹ کو چھوڑ دو اور مسجد میں آ کر دو رکعت نماز پڑھو۔" جب میں نماز سے فارغ ہوا تو آپ نے بلالؓ کو حکم دیا کہ" اونٹ کی قیمت ادا کر دیں۔" میں قیمت لے کر چلا تو آپ نے مجھے پھر بلایا، میں ڈرا کہ میرا اونٹ واپس کر دیا جائے گا۔ اور وہ مجھے نہایت ناپسند تھا۔ مگر میں آیا تو آپ نے فرمایا کہ اونٹ بھی لے جاؤ اور اس کی قیمت تمہاری ہو چکی اسے بھی رہنے دو۔" (بخاری ص ۲۸۳)

ایسا ہی واقعہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ کے ساتھ پیش آیا۔ ابنِ عمرؓ کہتے ہیں کہ" ہم ایک سفر میں ہمرکاب تھے اور میں حضرت عمرؓ کے ایک نوجوان اونٹ پر سوار تھا۔ وہ مجھ سے رُکتا نہیں تھا۔ اور سب کے آگے ہو ہو جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ مجھے ڈانٹتے تھے اور بار بار پیچھے ہٹا دیتے تھے مگر اُونٹ کسی طرح مانتا ہی نہ تھا۔ آپ نے دیکھا تو حضرت عمرؓ سے فرمایا:" یا عمرؓ! تم اسے بیچتے ہو؟" اُنھوں نے کہا:" یا رسولؐ اللہ! یہ آپ ہی کا ہے۔" آپ نے فرمایا:" نہیں تم میرے ہاتھ بیچ دو۔" حضرت عمر نے اسے بیچ دیا۔ آپ نے وہ وہیں مجھے دے دیا اور فرمایا کہ" یا عبداللہ! یہ اونٹ تمہارا ہے۔ اب جو تمہارا جی چاہے کرو۔" (بخاری)

سبحان اللہ! بخشش کا کتنا پاکیزہ اسلوب ہے۔ اس حسن عطا سے عطیہ کی قیمت کم ہونے کے بجائے صد چند بڑھ جاتی ہے۔ یہ ہے سچی سخاوت، ورنہ ؏

در تلاشِ نام سیم و زر فشاندن جود نیست

آپ کی انتہائے سخاوت کی مثال یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ" جب جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم مرض موت میں مبتلا تھے تو آپ کے پاس کچھ دینار آئے، آپ نے سب اسی وقت تقسیم فرما دیے صرف چھ باقی رہ گئے آپ نے بعض امہات المومنین کو دے دیے۔ مگر آپ کو نیند نہ آئی۔ یہاں تک کہ آپ نے پُوچھا کہ میں نے وہ چھ دینار کیا کیے۔ آپ سے کہا گیا کہ آپ نے فلاں فلاں ازواج مطہرات کو دے دیے۔ آپ نے فوراً وہ دینار ان کے پاس سے منگوا کر تقسیم کر دیے۔ اس کے بعد آپؐ نے بہ اطمینان استراحت فرمائی۔ (طبقات ابنِ سعد جزء ثانی قسم ثانی)

مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ عام مسلمانوں کے لیے بھی یہی حکم ہے۔ ظاہر ہے کہ عام طور پر کوئی شخص ایسے توکل کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ یہ آپ کی خصوصیت تھی اسی لیے کلام پاک میں صریح طور پر یہ حکم فرما دیا گیا ہے کہ:

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ — نہ اپنے ہاتھ کو بالکل اپنی گردن سے باندھ لے

وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا ﴿بنی اسرائیل ع ۲﴾
نہ بالکل پھیلا دے کہ پھر حسرت زدہ ہو کر بیٹھے اور لوگ تجھے برا کہیں اور ملامت کریں۔

ایثار اور حُسنِ سلوک

ایثار بھی سخاوت کی ایک صورت ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ سخاوت کے مفہوم میں عموماً کسی کو کچھ دینا پایا جاتا ہے، اور ایثار کے لیے اس کی ضرورت نہیں بلکہ جہاں کہیں آدمی کسی دوسرے کو اپنے اوپر ترجیح دے اور اس کے حق کو اپنے نفس پر مقدم سمجھے، وہیں ایثار ہوگا۔ اگرچہ عملاً اس نے کسی کو کچھ بھی نہ دیا ہو۔ مثلاً ایک خواستگارِ ملازمت یہ دیکھ کر اپنی درخواست واپس لے لیتا ہے کہ ایک اور امیدوار اس سے زیادہ اس خدمت کا اہل اور حاجت مند ہے تو بلاشبہ یہ اس کا ایثار ہوگا۔ گو یہ فعل سخاوت کی ضمن میں نہیں آتا۔ ایثار کو سخاوت پر اس وجہ سے ایک گونہ فضیلت حاصل ہے کہ سخاوت میں اس بات کا امکان ہے کہ معطی کی ذات پر اس کا کچھ اثر نہ پڑے لیکن ایثار تب ہی ہو سکتا ہے، جبکہ اپنے جائز حقوق اور بجا خواہشات کو دبا کر ان سے غیروں کو مستفید کیا جائے۔

جنابِ سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کی زندگی کا اصل اصول ہی ایثار تھا۔ کیونکہ آپ کا سب سے بڑا کام یعنی دعوئ نبوت تھا ہی اس بات کا مستلزم کہ آپ اپنے تمام اسبابِ آسائش اور سامانِ راحت سے دست بردار ہو کر ہر قسم کی دنیوی مصلحتوں اور ظاہری منفعتوں کو اپنی قوم اور ملک اور نوع کی دائمی اصلاح اور ابدی بہبودی پر نثار کر دیں یہاں تک کہ جب آپ کو وعظ و نصیحت سے باز رکھنے کے لیے اہلِ قریش نے دولت و حشمت کی لالچ دینی چاہی تو آپ نے اس سے قطعاً انکار کر دیا اور اپنی نوع کی بہتری کے لیے اپنی ذات پر دُنیا بھر کی تکلیفیں گوارا کرنے میں ذرا بھی تامل نہ کیا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ایثار ہو سکتا ہے!

لیکن اس ایک عام مثال کے علاوہ بھی آپؐ کے ایثار کے واقعات بکثرت ملتے ہیں۔ چنانچہ سہیل سے روایت ہے کہ ایک عورت جنابِ سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کے پاس ایک بُنی ہوئی چادر لائی۔ جس کی خوب صورت کور تھی۔ اس نے کہا کہ "میں نے اسے اپنے ہاتھ سے بُنا ہے، اور میں اسے خود لے کر آئی ہوں تاکہ آپؐ کو پہناؤں۔" آپ کو اس وقت چادر کی ضرورت بھی تھی اور یوں بھی آپ کبھی حقیر سے حقیر ہدیہ بھی رد نہ کرتے تھے۔ چنانچہ آپؐ نے وہ چادر لے لی اور آپ اسی کو تہبند کے طور پر باندھ کر باہر تشریف لائے۔ ایک شخص نے اس کی بہت تعریف کی اور آپ سے وہ چادر مانگی۔ آپ نے فوراً اُس کے حوالے کر دی۔ اور لوگوں نے اس پر اسے بہت طعن کیا اور کہا کہ "تُو نے بہت بُرا کیا، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی سخت ضرورت تھی۔ اس لیے آپ نے اسے زیبِ تن فرمایا تھا تُو نے اسے مانگ لیا حالانکہ تُو جانتا تھا کہ آپ کبھی انکار نہیں فرماتے۔" اس نے کہا کہ "خدا گواہ ہے کہ میں نے پہننے کے لیے نہیں مانگی بلکہ اس لیے لی ہے کہ یہ میرا کفن ہو۔" چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ (بخاری ص ۱۷۰)

ابُوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں بُھوکا ہوں"۔ آپ نے اپنے اہلبیت کے ہاں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ کسی کے پاس کچھ نہیں ہے۔ اس پر آپ نے کہا کہ "کیا کوئی ہے جو اس شخص کو آج کی رات مہمان رکھے اور اللہ کی رحمت کا مستحق ہو"۔ یہ سُن کر انصار میں سے ایک شخص اٹھا اور اُس نے کہا "یا رسول اللہ! میں حاضر ہوں"۔ چنانچہ وہ اس کو ساتھ لے کر اپنے گھر گیا اور اپنی بیوی سے کہا کہ "جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مہمان بھیجا ہے تو تُو کچھ اٹھا نہ رکھ اور جو کچھ ہو اس کے لیے لے آ"۔ اس نے کہا "خدا جانتا ہے کہ میرے پاس تو بچّوں کے شام کے کھانے کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے"۔ اس نے کہا "کچھ مضائقہ نہیں، بچّے کھانا مانگیں تو انھیں تھپک تھپک کر سُلا دینا۔ آ چل چراغ گُل کر دیں اور آج رات خالی پیٹ ہی سو رہیں"۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ دوسرے دن جب وہ شخص خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا تو آپ نے خوشنودیِ خداوندی کی خوش خبری سنائی اور اس پر آیت شریف نازل ہوئی: (بخاری ص ۷۲۵)

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (حشر، ع ۱)

اور وہ لوگ مہاجرین کو اپنے نفس سے مقدم رکھتے ہیں خواہ خود ان پر تنگی ہی کیوں نہ ہو۔

اللہ اکبر! تعجب ہوتا ہے کہ چند روزہ صحبت بابرکت نبوی نے بادیہ نشینانِ عرب کی طبائع کو کس قدر ایثار و احسان کا ذوق شناس بنا دیا تھا کہ ان کو اپنا اور اپنے لختِ جگر نورِ نظر بچّوں کا بُھوکا رکھنا ایک مہمان کی خاطر شکنی سے بہت زیادہ خوش گوار تھا کیا دنیا کی تاریخ اس کی کوئی نظیر دکھا سکتی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ہم نے بچپن میں سر فلپ سڈنی کا قصہ پڑھا تھا جس میں بڑی شد و مد سے اس کی اس مروّت اور انسانیت کی تعریف کی گئی ہے کہ اس نے زٹفن کے میدان میں زخمی ہو کر پانی مانگا جب پانی آیا تو اُسی وقت ایک تشنہ لب سپاہی نے پانی دیکھ کر اُس کی آرزو کی، سر فلپ سڈنی نے خود پانی نہیں پیا اور وہ پیالہ اس زخمی کو دے دیا۔ کچھ شک نہیں کہ یہ ایثار نہایت قابلِ تعریف اور مستحق ستائش ہے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں جنگِ یرموک کا یہ واقعہ بھی دادِ طلب ہے۔

حذیفہ کہتے ہیں کہ جنگِ یرموک میں میرے چچازاد بھائی زخمی ہو کر گرے تو تھوڑا سا پانی لے کر ان کو تلاش کرنے چلا تاکہ ان کو پلا دُوں۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے ان کو پایا اُن کی آخری حالت دیکھی، میں نے اشارے سے دریافت کیا کہ "پانی پلاؤں؟" انھوں نے کہا "ہاں"۔ میں پلانے ہی کو تھا کہ قریب سے آہ کی آواز آئی۔ میرے بھائی نے اشارہ سے کہا کہ "پہلے انھیں پلاؤ"۔ میں ادھر گیا تو دیکھا کہ ہشام بن العاص مجروح پڑے ہیں۔ میں نے چاہا کہ ان کو پانی پلاؤں۔ اتنے میں ایک اور طرف سے آہ کی آواز آئی۔ ہشام نے اشارے سے کہا کہ "پہلے انھیں پلاؤ"۔ میں وہاں گیا تو وہ اب تک جاں بحق ہو چکے تھے۔ لوٹ کر ہشام کے پاس آیا تو وہ بھی انتقال فرما چکے تھے۔ پھر اپنے بھائی کے پاس آیا تو ان کی رُوح بھی پرواز کر چکی تھی۔ (منقول از کلید القرآن ص ۶۴ ماخذ حمایت الاسلام)

دونوں واقعے بالکل ایک ہی قسم کے ایثار کی مثال ہیں۔ مگر ان میں قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ ایک واقعہ ایک قوم کے

ایک بہترین فرد کا واقعہ ہے جس پر اس کی قوم کو آج تک ناز اور بجا ناز ہے۔ دوسرا واقعہ ایک ہی وقت میں ایک مختصر سی جماعت کے تین شخصوں میں اسی قسم کے کامل ایثار کا ثبوت دیتا ہے۔ اور پھر بھی وہ واقعہ کچھ غیر معمولی طور پر مشہور اور زبان زد نہیں ہوتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جماعت میں ایسے واقعات نادر الوقوع اور شاذ نہ تھے بلکہ یہ خصائل اس پوری قوم میں نسبتاً عام تھے۔ ورنہ یہ تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اس موقع پر صرف وہی لوگ تشنہ کام ہوکر پانی کے لیے کراہتے جن میں اتنا اعلیٰ درجے کا ایثار موجود تھا، نہیں، حقیقت میں بات یہ تھی کہ اس وقت میں جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی روشن مثال نے تمام اہلِ اسلام کے دلوں میں وہ صفاتِ حمیدہ پیدا کر دی تھیں کہ ایثار اُن کا شعار بن گیا تھا اور اُن میں سے ہر ایک اپنے اپنے طور پر سر فلپ سڈنی سے کم نہ تھا۔ اور یہی سبب تھا کہ اس وقت ان کے ایسے کارنامے خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر نہیں سمجھے جاتے تھے۔

حضرت ابن عمر کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک صحابی کے پاس کہیں سے بھُنی ہوئی سری آئی۔ اُنھوں نے کہا کہ فلاں دوست بہت محتاج ہے اور وہی اس کا زیادہ مستحق ہے۔ چنانچہ وہ سری اس کے پاس بھیج دی۔ انھوں نے بھی یہی خیال کیا کہ فلاں دوست زیادہ محتاج ہے اور سری ان کے پاس بھیج دی۔ تیسرے شخص نے بھی یہی خیال کیا۔ غرض یہ سری کئی جگہ پھر پھرا کر پھر اسی پہلے شخص کے پاس آگئی۔ (الحقوق والفرائض)

یہ حالات سُن کر تعجب ہوتا ہے۔ مگر جب ہم اس عملی تعلیم کو دیکھیں جس پر یہ مبنی تھے، تو یہ تعجب دور ہو جاتا ہے۔ اور ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ اُسوۂ حسنۂ نبویؐ کے اتباع کا نتیجہ ہونا ہی یہی چاہیے تھا۔ اور جہاں کہیں یہ نتیجہ پیدا نہ ہو وہاں یقین کر لینا چاہیے کہ اتباعِ سنّت کا فقط نام ہی نام ہے ورنہ فی الواقع جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی تقلید نہیں کی جاتی۔ آپ کے تو ایثار و احسان کی یہ حالت تھی کہ نہایت ہی خفیف اور جزئی باتوں میں بھی اس کا خیال رکھتے تھے اور اوروں کو اس کا خیال رکھنے کی تاکید فرماتے تھے۔

اس حسنِ مراعات کو ملاحظہ فرمایئے کہ ایک بار آپ کہیں جنگل میں تشریف لیے جاتے تھے ایک صاحب اور بھی آپ کے ساتھ تھے۔ آپ نے ایک جگہ کھود کر دو مسواکیں نکالیں، ایک سیدھی تھی اور ایک ٹیڑھی۔ آپؐ نے ٹیڑھی خود لی اور سیدھی اس شخص کو دے دی۔ اس نے عرض بھی کیا کہ سیدھی آپ رہنے دیں۔ مگر آپ نے نہیں لی اور فرمایا کہ "جو شخص کسی کی صحبت میں رہتا ہے، تو خواہ گھڑی بھر ہی کیوں نہ ہو، قیامت کے دن اس سے پُوچھا جائے گا کہ حقِ صحبت بجالایا یا نہیں۔" (الحقوق والفرائض)

ظاہر ہے کہ جہاں اتنی اتنی باتوں کا لحاظ رکھا جائے وہاں جتنا اعلیٰ درجہ کا ایثار پایا جائے کم ہے۔ لیکن قابلِ دید یہ بات ہے کہ اس لحاظ سے ان لوگوں کی کیا حالت ہے جو اتباعِ سنّت کے دعویدار ہیں۔

محبت و شفقت

دنیا میں حُسنِ معاشرت کے قیام اور نظامِ تمدّن کی بقا کا مدار سب سے زیادہ محبت پر ہے، بعینہٖ جس طرح تمام اجرام آسمانی کششِ ثقل کے پھندے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ویسے ہی افرادِ انسانی بھی محبت کے رشتے میں بندھے ہوئے ہیں۔ اور خواہ

مسئلہ ارتقاء ان کو معرکۂ ہستی میں باہم کتنا ہی مخالف اور برسرِ پیکار کیوں نہ بنائے۔ اور اصولِ افادہ ان کو آپس کے تعلقات میں کیسا ہی خودغرض اور نفس پرست کیوں نہ بتائے۔ اس سے کوئی تنگ خیال سے تنگ خیال فلسفی بھی انکار نہیں کرسکتا کہ دنیا کا لطف اور زندگی کا مزہ محبت ہی سے ہے۔ اور یہ محبت بھی خواہ خودغرضی ہی کی ایک خوشنما صورت کیوں نہ ہو تاہم یہ نہ ہو تو جینا وبال ہوجائے اور اس عالمِ رنج و محن میں حیاتِ مستعار کے چند دن کاٹنے بھی دوبھر ہوجائیں کیونکہ محبت ہی کی چاشنی ہے جو یہاں کی تکلیفوں اور مصیبتوں کی تلخی کو خوشگوار بنا دیتی ہے۔ اور اس پر مزہ یہ ہے کہ اصول افادہ خواہ کچھ بھی کہے۔ لیکن یہ بہرحال مسلم ہے کہ محبت جس قدر شائبہ غرض سے پاک ہو اتنی ہی زیادہ قابلِ تعریف ہے کیونکہ وہ جتنی بے غرضانہ ہوگی اُسی قدر اُس کا دائرہ اثر بھی زیادہ وسیع ہوگا اور اُسی قدر اس کے احباب و اصحاب بھی کثیر التعداد ہوں گے۔ مگر یہ کشادہ دلی اور فراخ حوصلگی کچھ آسان نہیں ہے۔ انسان فی الواقع اپنے ذاتی فائدوں اور نفسانی خواہشوں کے جال میں ایسا پابند ہوتا ہے کہ اس کی محبت کو خودغرضی پر محمول کرنا کچھ بیجا اور خلافِ قیاس نہیں ہے۔ یہ امر واقعی ہے کہ اول تو اہل و عیال ہی کی محبت جو بالکل فطری اور طبعی سمجھی جاتی ہے وہ بھی غرضوں سے ملوث ہوتی ہے اور گھر کی چار دیواری سے نکل کر تو دنیا میں بہت ہی کم ایسے تعلقات پائے جاتے ہیں جو محبت کے پاک نام کے مستحق ہوں اور ان سے بھی زیادہ کمیاب وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر ان تعلقات کا اثر ہو۔ یُوں کہنے کو اپنی قوم کے دوست اور اپنے ملک کے بہی خواہ اور اپنی نوع کے ہمدرد بہت سے ہوں گے مگر ان کے ان مخلصانہ دعووں کی بقا جب ہی تک ہے جب تک ان کی محبوب قوم اور ان کا پیارا وطن ان عاشقانِ معشوق خو کی نازبرداری کیے جاتا ہے۔ لیکن اگر کہیں اتفاق سے اُن کے اعزاز و احترام میں کچھ فرق آئے یا کوئی بات ان کے خلافِ مزاج ہو تو پھر ان کے تمام قومی ایثار و محبت کے جذبات ہوا ہوجاتے ہیں۔ اور وہ اپنی اس بے غرضانہ محبت پاشی کے لیے کوئی اور تشنہ لب ڈھونڈھ لیتے ہیں۔

بہرکیف ہم کو کسی سے کیا سروکار، ہم کو تو صرف یہ دکھانا تھا کہ محبت جس قدر زیادہ عام اور بے غرضانہ ہو، اتنی ہی زیادہ محمود۔ لیکن ساتھ ہی اسی قدر زیادہ مشکل اور نادر الوجود بھی ہوتی ہے اور ایسی محبت صرف ان ہی نفوسِ زکیہ میں پائی جاتی ہے جن کو محبوبِ حقیقی نے اصلاح و ارشادِ خلق کے لیے مامور فرمایا ہے اور ان میں بھی اس کے مختلف درجے ہوتے ہیں۔ ہمارے عقیدے کے مطابق جنابِ سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات رحمۃ للعالمین ہیں۔ یعنی آپ کی سچی محبت اور خالص شفقت کا دائرہ قبیلے اور شہر اور قوم اور ملک ہی تک محدود نہیں رہا بلکہ تمام دُنیا پر حاوی اور محیط ہوگیا۔ لیکن یہ محض عقیدہ ہی نہیں ہے۔ بلکہ آپ کی حیاتِ بابرکات کا ہر ایک واقعہ اس کا شاہد ہے۔ جو تکلیفیں آپ کو ابنائے وطن کے ہاتھوں پہنچیں، ان کے چند مختصر واقعات ہم آپ کے صبر و ثبات کے ضمن میں بیان کرچکے ہیں اور یہاں اُن کو دُہرانے کی حاجت نہیں۔ البتہ یہاں اِن باتوں کو پیشِ نظر رکھ کر ہم یہ پُوچھتے ہیں (اور مخاطب وہ لوگ ہیں جو ہمارے ہم عقیدہ نہیں) کہ آخر آپ کو اس قدر حوصلہ فرسا قوتِ برداشت کے اظہار کی ضرورت ہی کیا تھی! اہلِ مکہ آپ سے چاہتے ہی کیا تھے، یہی نا کہ آپ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں اور شرک و بُت پرستی سے نہ روکیں۔ تو پھر آپ نے ایسا ہی کیوں نہ کیا! مانا کہ آپ جو کچھ فرماتے تھے سچ فرماتے تھے اور انھیں کے فائدے کے لیے فرماتے تھے۔ لیکن جب وہ لوگ خود ہی اُسے سننا نہ چاہتے تھے تو آپ کو کیا پڑی تھی کہ خواہ مخواہ ان کے لیے اپنے آپ کو اس

بلا میں ڈالتے اور پریشان ہوتے۔ مخالف کہتے ہیں کہ آپ کی یہ تمام جدوجہد صرف دولت وثروت اور شوکت وحکومت حاصل کرنے کے لیے تھی۔ مگر یہ ان کی نادانی یا کور باطنی ہے۔ یہ سب چیزیں تو شیوخِ مکہ خود ہی آپ کی خدمت میں پیش کرتے تھے، اور عالم بیکسی میں آپ کو یہ کیونکر یقین ہو سکتا تھا کہ خدا آپ کو بعد میں اس سے زیادہ دولت وحکومت عطا کرے گا۔ اگر ان کی تمام تگ و دو کی غایت و غرض یہی ہوتی تو اس وقت کی تنگ دستی و ناداری میں تو اہلِ مکہ کی پیش کردہ دولت وحکومت ہی آپ کے لیے نعمتِ غیر مترقبہ تھی اور آپ کو وہی غنیمت سمجھنی چاہیے تھی اس سے قطع نظر کیجئے اور یہ دیکھیے کہ آپ نے ان باتوں کو حاصل کرنے کے بعد بھی ان سے ذاتی کیا فائدہ اٹھایا۔ آپ کی سادہ زندگی کے واقعات ہم سن ہی چکے۔ آپ کے ایثار اور سخاوت کے حالات ہم نے دیکھ ہی لیے تو کیا آپ کو دولتِ دنیا کی ہوس اس لیے تھی کہ آپ بے چھنے جَو کی روٹی کھائیں۔ اپنی جوتیاں اپنے ہاتھوں سے سیئیں۔ آپ کے اہل بیت نے خود چکیاں پیسیں۔ اور فقط یہی نہیں بلکہ آپ نے ہمیشہ کے لیے اپنی اولاد پر زکوٰۃ اور صدقات کو بھی حرام فرما دیا حالانکہ قیاس یہ چاہتا ہے کہ جس دولت کے حاصل کرنے میں آپ نے اتنی تکلیفیں اٹھائی تھیں اوّل تو خود ہی اس سے فائدہ اٹھاتے اور خیر اگر خود کسی وجہ سے اسے استعمال نہ کیا تھا تو کم از کم اپنی اولاد کو تو اس سے مستفید ہونے دیتے۔ مگر صورتِ حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ اور ہم جس پہلو سے چاہیں غور کریں آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام افعال آلائش، ریا اور آمیزشِ غرض سے بالکل پاک اور مبرا ثابت ہوتے ہیں بشرطیکہ انصاف کو ہاتھ سے نہ دیا جائے۔ حقیقت میں جناب سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کے نسبت ایسی بدگمانی ہی غلط اور مہمل ہے کیونکہ آپ کی سعی و کوشش کی وجہ ہی تھی تعظیم لامر اللہ اور شفقت علیٰ خلق اللہ یہ آپ کی بالکل سچی اور بے غرضانہ محبت ہی تھی جو آپ کو اتنی مخالفتوں اور ایسی مصیبتوں کے باوجود بھی اصلاح بین الناس سے دست کش نہیں ہونے دیتی تھی اور آپ ان لوگوں کی اس قدر ایذا اور آزار رسانی پر بھی ان کو صداقت کی طرف بلانے اور حقیقت کا رستہ دکھانے سے باز نہیں رہ سکتے تھے بعینہٖ جس طرح ماں باپ اپنے بچوں کی نافرمان برداری اور رنج دہی پر صبر کرتے ہیں مگر پھر بھی ان کی بھلائی اور بہتری میں کوشاں رہتے ہیں لیکن ماں باپ کی محبت کی ایک انتہا ہوتی ہے اور جب عقوق حدِ برداشت سے گزر جاتا ہے تو وہ بھی اس سے کنارہ کر جاتے ہیں، مگر آپ کی محبت وشفقت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ وہ لوگ جس قدر آپ سے سرکشی کرتے تھے آپ اتنی ہی ان کے ساتھ اور رعایت فرماتے تھے۔ وہ جس قدر آپ کو تکلیف دیتے تھے آپ اتنی ہی ان سے اور مہربانی کرتے تھے۔ غرض جس طرح ان کی عداوت اور دشمنی بے پایاں تھی ویسے ہی آپ کی شفقت اور محبت غیر محدود تھی۔ اور بلاشبہ آپ اس وعدۂ صادق کی مجسم تصدیق تھے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ط — اور ہم نے تجھے تمام عالموں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

لیکن اس کے لیے سچے طاہر اور طیب دل کی ضرورت ہے اس کا کچھ اندازہ وہی شخص کر سکتا ہے جس نے خود کبھی اپنی محبت کو بے غرض اور مخلص بنانے کی کوشش کی ہے ورنہ عام طور پر انسانی طبیعت اس کی مشکلات کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔

ظاہر ہے کہ جو شخص دشمنوں تک کا دوست ہو گا وہ دوستوں سے کیسی کچھ محبت نہ کرتا ہو گا۔ آپ بھی اپنے اصحاب و

احباب پر بے انتہا شفیق اور مہربان تھے۔ چنانچہ اس کی مثالیں ہم آپ کے حسنِ سلوک، ایثار، رحم، صبر وغیرہ مختلف اخلاقِ حسنہ کے ضمن میں دیکھ چکے ہیں۔ اور آئندہ اور ابواب میں بھی دیکھیں گے۔ بات یہ ہے کہ محبت کا اثر کسی خاص فعل میں محدود نہیں ہوتا بلکہ جہاں محبت ہو وہاں اس کا رنگ ہر ایک بات میں نمایاں ہوتا ہے کیونکہ اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تعلقاتِ انسانی میں تمام صفاتِ حسنہ محبت ہی کی پیدا کردہ ہیں البتہ یہ ضروری بات ہے کہ ہر ایک کی محبت کے اظہار کی جداگانہ صورت ہوتی ہے۔ مثلاً دولت مند کی محبت سخاوت بن کر ظاہر ہوتی ہے۔ حاکم کی محبت انصاف اور حلم کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ طبیب اپنے محبوب مریض کو مفید سے مفید اور خوش ذائقہ سے خوش ذائقہ دوا پلاتا ہے۔ پیر اپنے پیارے مرید کو سب سے جلدی منازلِ سلوک طے کرانا چاہتا ہے۔ غرض ہر ایک کا الگ الگ رنگ ہوتا ہے۔ لیکن کامل ترین محبت وہی ہے جو ہر تعلق میں ہویدا اور ہر شان میں نمایاں ہو۔

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی بے انتہا شفقت اور غیر محدود محبت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ آپ اپنی اُمتِ مرحومہ پر عبادات کا بار بھی حتی الامکان بہت ہی کم ڈالنا چاہتے تھے۔ چنانچہ آپ خود اسی خیال سے نوافل پر مداومت نہیں فرماتے تھے کہ کہیں لوگ ان عبادتوں کو اپنے اوپر لازم نہ کر لیں۔ اور یُوں تکلیف مالایطاق میں نہ پڑ جائیں۔

عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ "ایک روز آپ میرے ہاں تشریف لائے اور فرمایا کہ "میں نے سُنا ہے کہ تم رات بھر نماز پڑھتے ہو اور دن کو روزہ رکھتے ہو۔" میں نے کہا "جی ہاں"۔ آپ نے فرمایا "جاگو بھی اور سوؤ بھی، روزہ بھی رکھو اور ناغہ بھی کرو۔ کیونکہ تمہارے اوپر تمہارے جسم کا بھی حق ہے، اور تمہاری آنکھوں کا بھی، تمہارے دوستوں اور بھائیوں کا بھی حق ہے اور گھر والوں کا بھی۔" (بخاری ص ۱۵۴)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ "ایک روز میرے پاس بنی اسد کی ایک عورت بیٹھی تھی کہ آپ تشریف لے آئے۔ آپ نے پُوچھا کہ "یہ کون ہے؟" میں نے کہا کہ "فلاں ہے، اور یہ رات بھر نماز پڑھتی ہے، سوتی نہیں۔" آپ نے فرمایا: "یہ چھوڑ دو تم کو وہی کام کرنے چاہئیں جن کی تم طاقت رکھتی ہو۔ کیونکہ بیشک اللہ نہیں تھکتا جب تک تم نہ ملول ہو جاؤ۔" (بخاری ص ۱۵۴)

ابو مسعود سے روایت ہے کہ "ایک شخص خدمت بابرکت میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا کہ "میں صبح کی نماز با جماعت فلاں شخص کی وجہ سے نہیں پڑھ سکتا کیونکہ وہ بڑی لمبی نماز پڑھتا ہے۔" یہ سُن کر آپ اتنے ناراض ہوئے کہ میں نے کبھی آپ کو اتنا خفا نہیں دیکھا اور آپ نے نصیحتاً کہا کہ اے لوگو! تم لوگوں کو دین سے نفرت دلاتے ہو۔ جب تم نماز پڑھاؤ تو اُسے مختصر کرو۔ کیونکہ ان میں بیمار اور بُوڑھے اور حاجتمند بھی ہوتے ہیں۔" (بخاری ص ۹۰۲) یعنی ان کو تمہاری لمبی نماز سے تکلیف ہو گی اور یُوں وہ عبادت سے ملول ہو جائیں گے، جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ نیکی برباد، گناہ لازم۔

سعد ابن وقاصؓ کہتے ہیں کہ "میں مکہ میں بیمار ہو گیا اور میری حالت نازک ہو گئی مگر میرا اس شہر میں مرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ جہاں سے میں ہجرت کر چکا تھا۔ آپ میری عیادت کے لیے تشریف لائے، تو میں نے کہا "یا رسول اللہ! میں اپنا تمام مال خیرات کرنا چاہتا ہُوں۔" آپ نے فرمایا "نہیں"۔ میں نے کہا "اچھا آدھا"۔ آپ نے فرمایا "نہیں"۔ میں نے کہا "اچھا تہائی"!

آپؐ نے فرمایا: "تہائی بھی بہت ہے۔ مگر خیر۔ بیشک یہ بہتر ہے کہ تم اپنے وارثوں کو دولت مند چھوڑو بہ نسبت اس کے کہ تم اُن کو نادار چھوڑو۔" (بخاری ص ۳۸۳)

لیکن آپ کی شفقت مسلمانوں ہی کے لیے مخصوص نہ تھی بلکہ اُس سے آپ کے منکر بھی مستفید ہوتے تھے۔ روایت ہے کہ قبیلہ اراش کے ایک شخص نے ابُو جہل کے ہاتھ ایک اُونٹ بیچا۔ وہ اُس کی قیمت دینے میں ٹال مٹول کرتا رہا۔ وہ بیچارہ پریشان ہو کر قریش کی مجلس میں آیا اور پکار پکار کر کہنے لگا: "یا معشرِ قریش! میں ایک اجنبی مسافر ہوں اور ابوالحکم ابن ہشام (ابوجہل) نے میرا حق مار لیا ہے، کیا تم میں سے کوئی ایسا انصاف والا ہے کہ میری داد رسی کرے اور اُس سے میرا حق دلائے۔" جنابِ رسالت مآبؐ بھی وہیں ایک طرف تشریف فرما تھے۔ اِن بے دردوں نے اس بیچارے کی فریاد کا تو کچھ خیال نہ کیا۔ البتہ آپ کو چھیڑنے اور آپ سے استہزا کرنے کے لیے اُس سے کہہ دیا کہ "جاؤ اس شخص کے پاس جا کر اس سے کہو وہ تمھارا حق دلا دے گا۔" اس غریب کو آپؐ کی اور ابوجہل کی باہمی مخالفت کا کچھ حال معلوم نہ تھا اُس نے ان کے کہنے کے مطابق آپ سے آکر کہا۔ اس کی غربت اور بیکسی پر آپ کا بحرِ شفقت موجزن ہوا۔ آپ نے اپنے ضعف اور ابوجہل کی جہالت اور عداوت کا کچھ بھی خیال نہ کیا اور فوراً اس کے ساتھ چلنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے، وہ لوگ تو یہی تماشہ دیکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے ایک آدمی کو آپ کے پیچھے روانہ کیا کہ وہ سب ماجرا ان سے آکر کہے۔ خیر، آپ نے جا کر ابُوجہل کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اُس نے پوچھا "کون؟" آپؐ نے جواب دیا: "محمد" (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم)۔ وُہ نکلا اور آپ کو دیکھ کر اس کا رنگ اُڑ گیا۔ آپؐ نے اس سے کہا "اس آدمی کا حق ادا کرو۔" اس نے کہا "اچھا جو کچھ اس کا آتا ہے وُہ میں ادا کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر اُس نے اندر جا کر چُپ چاپ اُس کا روپیہ لا دیا۔ اور وہ شخص خوش خوش آپ کا شکریہ ادا کرتا ہُوا اور آپ کو دُعائیں دیتا ہُوا چلا گیا۔ جب اور لوگوں نے یہ واقعہ سُنا تو ان کو اس خلافِ امید کارروائی پر بہت تعجب ہوا۔ مگر ابُوجہل اتنا مرعوب ہو گیا تھا کہ اُس سے اور کُچھ بن ہی نہ پڑا۔ (سیرت ابنِ ہشام ص ۲۱۱)

مسلم اور غیر مسلم پر ہی کیا منحصر ہے۔ آپ کی شفقت تو جانوروں تک کو حاوی تھی۔ ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دن آپؐ نے فرمایا کہ ایک شخص جنگل میں چلا جا رہا تھا، اسے بےحد پیاس لگی۔ اتفاق سے اُسے ایک کُنواں ملا تو اس نے اس میں اُتر کر پانی پیا، باہر آیا تو وہیں ایک کُتا بھی پیاسا ہانپتا کانپتا آگیا تھا اور شدتِ تشنگی سے کیچڑ چاٹ رہا تھا۔ اس آدمی کے دل میں خیال آیا کہ جیسی تکلیف پیاس سے مجھے تھی ویسی ہی اِسے بھی ہو گی۔ یہ خیال کر کے وُہ پھر اُترا اور اُس نے اپنے چمڑے کے موزے میں پانی بھرا اور اسے دانتوں سے پکڑ کر اُوپر لایا، اور کُتے کو پانی پلایا۔ اللہ نے اس کی رحم دلی اور ہمدردی کے انعام میں اسے بخش دیا۔" آپؐ کی زبان سے یہ قصہ سُن کر لوگوں نے پُوچھا: "یا رسول اللہ! کیا ہم کو جانوروں پر رحم کرنے کا بھی اجر ملتا ہے؟" آپ نے فرمایا: "ہاں"۔ (بخاری ص ۸۸۸) ہر ایک ذی حیات پر شفقت و رحم کا صلہ ہے۔

یہ حالت تھی آپؐ کی شفقت خلق اللہ کی، حالانکہ جس قوم اور ملک میں آپ مبعوث ہوئے تھے۔ وہ لوگ ایسے سخت دل تھے کہ وہ اپنی اولاد کو جیتے جی زمین میں گاڑ دیتے تھے اور اُن کو ذرا بھی رحم نہیں آتا تھا۔ ع

بہ بیں تفاوتِ راہ از کجاست تا بہ کجا

عدل و انصاف

اگر ذرا غور و تعمق سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انصاف سچی محبت کی عمومیت اور اعراض نفسانی سے بریت کا نام ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ جس معاملہ میں قاضی کی کوئی ذاتی غرض پوشیدہ نہیں ہے۔ اور اس کو فریقین سے یکساں تعلق اور یکساں محبت ہے تو اس میں اسے کسی طرح کی زیادتی یا بے انصافی کرنے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے۔ اور جب کوئی شخص اپنے سب ابنائے نوع پر یکساں مہربان ہوگا اور اس میں کسی قسم کی نفسانیت اور خود غرضی نہ ہوگی تو اس کے پورے طور پر عادل اور منصف نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ بلاشبہ ظلم صرف اس حالت میں کیا جاسکتا ہے جبکہ اس سے یا تو ہمارا کوئی ذاتی فائدہ ہو یا جب ہمارا دو آدمیوں میں سے ایک کی طرف زیادہ میلان ہو۔ اور ہم دوسرے کے مقابلہ میں اسے فائدہ پہنچانا چاہتے ہوں۔ مگر جس طبیعت میں یہ باتیں نہیں اُس میں بے انصافی کا خیال تک آنا محال ہے۔

ہم جناب سرورِ کائنات رہبرِ مخلوقات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کی بے غرضانہ محبت اور مخلصانہ شفقت کا حال دیکھ چکے۔ اگر وہ واقعات سچے ہیں اور ہمارا استدلال درست ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہی ہے کہ آپ نہایت اعلیٰ درجہ کے منصف مزاج اور عدل پرور ہوں۔ اور کبھی کسی پر آپ کے ہاتھ سے کوئی زیادتی نہ ہوئی ہو۔ اگر واقعات سے اس بات کی تصدیق ہو جائے تو اول اس سے ہمارے مذکورۂ بالا استدلال کی صحت پائی جائے گی اور دُوسرے آپ کی یہ انصاف پسندی آپ کے رحمۃ للعالمین ہونے کی نہایت قوی اور معقول دلیل بن جائے گی۔ آیئے دیکھیں کہ آپ کے حالاتِ حیات اس بارہ میں کیا کہتے ہیں۔

اگرچہ ہم کو آپ کے قبل بعثت کے حالات اس تفصیل و تشریح سے نہیں معلوم جیسا کہ ہمارا جاننے کو جی چاہتا ہے تاہم اتنا ضرور معلوم ہے کہ شروع ہی سے آپ کو اپنے عدل و انصاف کی وجہ سے امتیاز خاص حاصل تھا، یہاں تک کہ آپ ظاہری دولت و ثروت نہ ہونے کے باوجود بھی اکثر اختلافاتِ قریش میں حکم بنائے جاتے تھے۔ اور اسی لیے آپ کا لقب "امین" ہوگیا تھا۔

بعثت کے بعد آپ کی صفاتِ حمیدہ کے اظہار کے مواقع صدچند ہوگئے۔ اور آپ کی منصف مزاجی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ یہود مدینہ بھی اپنی ذاتی خصومتوں میں آپ ہی سے تصفیہ چاہتے تھے حالانکہ اُن کو آپ کی نبوت سے انکار تھا تب بھی بالاتفاق آپ ہی کا فیصلہ چاہا جاتا تھا اور کبھی کسی کو آپؐ کے انصاف پر شائبہ شبہ بھی نہیں ہوا۔ پھر یہ بھی نہ تھا کہ فقط غیروں ہی میں آپ کا انصاف مسلّم ہو، نہیں آپ کا انصاف اتنا یقینی تھا کہ اگر کبھی مسلمان اور غیر مسلم کا باہم جھگڑا ہو جاتا تھا تب بھی موافق اور مخالف سب ہی آپ کے پاس آتے تھے۔ چنانچہ ابنِ عباسؓ سے مروی ہے کہ ایک یہودی اور ایک نام کے مسلمان بشر میں جھگڑا تھا۔ یہودی نے کہا "چلو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس چلیں"۔ بشر نے کہا "نہیں، کعب بن الاشرف سردار یہود کے پاس چلیں"۔ کیونکہ وہ لوگ رشوت وغیرہ لیتے تھے۔ مگر اس سے یہودی نے انکار کیا اور آخر دونوں آپ ہی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہودی حق بجانب تھا۔ آپؐ نے اُسی کے حق میں فیصلہ کیا۔ جب دونوں باہر نکلے تو بشر نے کہا "یہ فیصلہ ٹھیک نہیں ہوا، چلو (حضرت عمرؓ) کے پاس چلیں"۔ اسے یہ خیال تھا کہ شاید ان کا تعصب مذہبی انصاف پر غالب آجائے۔ یہودی آپؐ کے

فیصلہ سے قوی دل ہوگیا تھا اس نے مان لیا اور دونوں حضرت عمرؓ کے پاس آئے۔ مگر یہودی نے آتے ہی ان کو یہ سُنا دیا کہ معاملہ حضور سرورِ کائناتؐ کے سامنے پیش ہو چکا ہے اور آپؐ نے یہ فیصلہ فرمایا ہے۔ مگر یہ شخص اس پر راضی نہیں ہوا اور اب یہاں آیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے بشر سے اس کی تصدیق کی۔ اس نے بھی کہا کہ ہاں صورتِ واقعہ یہی ہے۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے کہا "تم دونوں ذرا ٹھہرو مَیں ابھی فیصلہ کیے دیتا ہوں" یہ کہہ کر وہ اندر گئے اور تلوار لاکر منافق بشر کی گردن اُڑا دی اور کہا کہ "جو شخص (مسلمان ہوکر) اللہ اور اُس کے رسول کے فیصلہ کو نہیں مانتا مَیں اس کا فیصلہ یُوں کرتا ہوں" اس پر اس کے ساتھ کے اور منافقوں نے بہت غل مچایا۔ مگر اللہ نے وحی سے حضرت عمرؓ کے فعل کی تائید فرمائی اور اُسی دن سے اُن کا لقب فاروق ہوگیا۔ (تفسیر خازن۔ النساء، ع ۹)

فتح مکہ کے بعد کا واقعہ ہے کہ بنی مخزوم میں سے ایک عورت فاطمہ بنت الاسود چوری کے جرم میں پکڑی گئی۔ ثبوتِ جرم کے بعد آپؐ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ شرفائے قریش کو یہ عار ناگوار گزرا اور انھوں نے چاہا کہ آپؐ سے سفارش کرا کے اس عورت کو اس سزا سے بچالیں۔ مگر بارگاہِ رسالت میں عرض کرنے کی جرأت کسے تھی۔ آخر اسامہ بن زید کو کہہ سُن کر اس بات پر آمادہ کیا کہ آپ سے اس کے لیے سفارش کریں۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ "یا اسامہ! تم اللہ کی مقرر کردہ سزا میں سفارش کو دخل دیتے ہو" پھر آپ اُٹھے اور آپ نے خطبہ میں فرمایا کہ "اے لوگو! تم سے پہلے کی قومیں اسی لیے تباہ ہوگئیں کہ جب ان میں کوئی بڑا خاندانی شخص چوری کرتا تھا تو لوگ اسے چھوڑ دیتے تھے۔ اور جب کوئی کمزور چوری کرتا تھا تو اسے سزا دیتے تھے۔ (یعنی ایسی ناانصافیاں ہی اُن کی بربادی کا سبب ہوئیں) خدا گواہ ہے کہ اگر فاطمہ بنت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے چوری کی ہوتی تو یقیناً میں اُس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔" (بخاری ص ۹۱۶)

انصاف کی انتہا تو یہ ہے کہ لوگ ذرا ذرا سی بات میں خود آپ پر تشدد اور تقاضا کرتے تھے۔ مگر آپ اپنے حلم اور انصاف کی وجہ سے ہمیشہ ان کے مطابق فیصلہ فرماتے تھے۔ ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ "جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلّم پر کسی کا ایک اونٹ قرض تھا ایک دن وہ تقاضا کرتا ہوا آیا اور سخت سست کہنے لگا۔ اس کی ہرزہ گوئی اصحاب کرام کو بہت ناگوار ہوئی اور انھوں نے اسے روکنا چاہا مگر آپ نے فرمایا کہ "اسے کچھ مت کہو کیونکہ قرض خواہ کو تقاضا کرنے کا حق ہے۔" پھر آپؐ نے حکم دیا کہ ایک اسی کا سا اُونٹ لاکر اُسے دے دیں اتفاق سے ویسا اونٹ موجود نہ تھا، لوگوں نے آکر عرض کیا کہ اس سے بہتر اونٹ موجود ہیں مگر ویسا اونٹ موجود نہیں۔ آپ نے حکم دیا کہ اس کے اونٹ سے بہتر اونٹ دے دیا جائے۔ اور آپ نے فرمایا کہ "تم میں سے بہتر وہی ہے جو بہتر ادائیگی کرے۔" (بخاری ص ۳۰۹)

ایسے واقعات بارہا پیش آئے۔ اور گو آپ نے اس کی بابت کوئی حکم صادر نہیں فرمایا تاہم خود آپ کا دستور العمل ہمیشہ یہی رہا کہ جس کسی سے کچھ قرض لیتے تھے اس کو عموماً میعاد مقررہ سے پہلے ادا کردیتے تھے اور اس کی واجب الادا جنس سے کچھ زیادہ عطا فرماتے تھے۔ یہ آپ کا احسان ہوتا تھا کیونکہ قرض خواہ کو اس بیشی کے مانگنے کا کچھ حق نہیں ہوتا تھا (ورنہ وہ تو سُود ہوجاتا) لیکن آپ اسی کو اس لحاظ سے انصاف سمجھتے تھے کہ قرض خواہ کو اپنی چیز کے فائدے سے اتنے دن تک محروم رہنے کی تلافی ہوجائے۔ مسلمان جو اس وقت بدقسمتی سے دنیا بھر میں سب سے زیادہ نادہند اور بدمعاملہ سمجھے جاتے ہیں۔ اگر آپ کی صرف اسی ایک سنت کی پیروی کریں تو ان کے مباحث قومی میں سے مسئلہ سود از خود غائب ہوجائے اور وہ یقیناً ناداری اور حاجت مندی کے قعرِ ذلت سے نکل کر دولت و حشمت کے اوجِ عزت پر پہنچ جائیں کیونکہ دولت کی کنجی تجارت ہے اور تجارت کا مدار ساکھ اور اعتبار پر ہے جو ہم

میں نہیں ہے اور اس کا فقدان نتیجہ ہے اسی سنّتِ نبوی کے ترک کا۔ اگر ہم صرف ایک اس سنّت پر چلتے ہوتے تو یقیناً ہم دولت اور تجارت کے مالک ہوتے اور غالباً ہم کو آج اپنی ان مٹی ہوئی سلطنتوں کا ماتم بھی نہ کرنا پڑتا، جن کو گردشِ فلک اور انقلابِ لیل ونہار نے نہیں بلکہ خود ہماری بد اطواریوں اور بداعمالیوں نے ہمارے دستِ مرتعش سے لے کر اُن ہاتھوں میں دے دیا جن میں ہمارے ہادیٔ صادق اور رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اُسوۂ حسنہ کے تتبع نے عنانِ حکومت کے تھامنے کی طاقت پیدا کر دی ہے افسوس کہ ہم کو کیا تعلیم دی گئی اور ہم نے اس پر کیا عمل کیا۔ افسوس کہ ہم کو کیا ہونا چاہیے تھا اور ہم کیا ہو گئے ؎

کبھی خاقان تھے کبھی قیصر و کسریٰ ہم تھے

اب تو کچھ یاد نہیں یہ بھی کہ کیا کیا تم تھے

یہاں ایک اور حدیث بھی قابلِ ذکر ہے۔ اور اگرچہ اس کو بظاہر اس باب سے کچھ تعلق نہیں ہے مگر اس سے اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ جناب رسالت مآبؐ نے ہماری اس موجودہ حالت کا اب سے تیرہ سو برس پہلے کتنا صحیح اندازہ فرمایا تھا اور اُسی وقت ہم کو اس راستے کے خطرات سے کتنی اچھی طرح متنبہ اور آگاہ کر دیا تھا جس کو ہم نے اُن کی ہدایت کے باوجود بھی اپنے عقوق وعصیان کی وجہ سے نہ چھوڑا۔ اور آخر اس حالِ زار کو پہنچے۔

روایت ہے کہ جب ابو عبیدۃ بن الجراح بحرین سے جزیہ وصول کر کے لائے تو ان کے واپس آنے کی خبر سارے شہر میں مشہور ہو گئی۔ تمام انصار صبح کی نماز میں آپ کے ساتھ شریک ہوئے۔ آپ نماز کے بعد واپس چلے تو وہ پھر راستے میں آپ کے سامنے آئے آپ ان کو دیکھ کر مُسکرانے لگے اور آپ نے فرمایا "شاید تم نے سنا ہے کہ ابو عبیدہ کچھ لے کر آئے ہیں۔" اُنھوں نے کہا "یارسول اللہ! ہاں۔" آپ نے فرمایا "خوش ہو جاؤ اور اُس چیز کی امید رکھو جو تم کو مسرور کرے گی۔ خدا گواہ ہے کہ مجھے تمھاری تہی دستی اور عسرت سے کچھ اندیشہ نہیں ہے لیکن مجھے ڈر یہ ہے کہ تمھارے سامنے بھی دنیا پیش کی جائے، جیسے کہ تم سے پہلوں کے سامنے کی گئی تھی۔ پھر وہ اس میں محو ومنہمک ہو گئے جیسا کہ معروف ہے۔ اور پھر یہ حرص وہوس اور عیش وعشرت تم کو بھی ہلاک کر دے۔ جیسے کہ اس نے اُن کو برباد کر دیا۔" (بخاری ص ۴۴۴)

مسلمانوں کی تاریخ اُٹھا کر دیکھیے کہ اُس کا ایک ایک ورق آپ کے اس ارشاد کی کیسی تصدیق کرتا ہے، جس کا آپ کو احتمال تھا وہی ہوا اور بحالات موجودہ وہی ہونا چاہیے تھا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ۔ جناب سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کی منصف مزاجی کے ضمن میں صلح حدیبیہ کے بعض واقعات بھی قابلِ ذکر ہیں۔ فتح مکہ سے پہلے آپ ۶ھ میں حج کے مقصد سے مکہ کی جانب نہضت فرما ہوئے۔ اہلِ مکہ کو یہ خوف ہوا کہ مبادا ایسے میں آپ کی تشریف آوری سے مسلمانوں کی جماعت اور طاقت اور زیادہ بڑھ جائے اور خود مکہ کے بہت سے آدمی اسلام قبول کر لیں۔ اس لیے عمائد قریش نے آپ کو راستے ہی میں روکنے کی تیاری کی۔ حدیبیہ پر دونوں فریقوں کا مقابلہ ہوا۔ چونکہ آپ کا قصد لڑائی کا بالکل نہ تھا، نہ آپ اس ارادے سے نکلے تھے، اس لیے اگرچہ آپ کے ہمرکاب ایک ہزار مسلمان تھے مگر آپ نے جنگ پر پیش قدمی نہیں کی اور اہلِ مکہ کو یہی پیام کہلا بھیجا، اگرچہ ساتھ ہی یہ بھی کہلا بھیجا کہ "اگر تم نے بہ صلح وآشتی نہ مانا تو پھر مجبوراً ہم بزور شمشیر مکہ معظمہ میں داخل ہوں گے۔ کیونکہ جو ارادہ

ہم کر کے نکلے ہیں وہ فسخ نہیں ہو سکتا۔" اس پر قریش نے سہیل بن عمرو کو معاہدہ کرنے کے لیے بھیجا آپ نے قریش کی تمام شرائط کو منظور فرما لیا اور عہد نامہ لکھنے کے لیے کاتب کو بلایا اور حکم دیا کہ لکھو "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔" سہیل نے کہا "رحمان کو تو ہم جانتے ہی نہیں کہ کیا ہے، تم تو جیسے پہلے سے لکھا کرتے تھے ویسے ہی لکھو باسمک اللّٰھم۔" اس پر مسلمانوں نے بگڑ کر کہا "واللہ ہم تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے سوا اور کچھ ہرگز نہیں لکھیں گے۔" مگر آپ نے فرمایا کہ "خیر باسمک اللّٰھم لکھ دو۔" پھر فرمایا "آگے لکھو، یہ ہے جو طے ہوا۔ محمد رسول اللہ ہیں اور۔" سہیل نے پھر ٹوکا اور کہا "واللہ اگر ہم آپ کو رسول اللہ ہی مانتے تو حرمِ کعبہ سے روکتے ہی کیوں، اور لڑائی ہی کیوں ہوتی اس لیے محمد رسول اللہ کے بجائے محمد بن عبداللہ لکھو۔" آپ نے فرمایا "خدا گواہ ہے کہ میں بلاشبہ اللہ کا رسول ہوں۔ لیکن خیر، اگر تم مجھے جھٹلاتے ہو تو محمد بن عبداللہ ہی لکھ دو۔" (بخاری ص ۲۰۹)

غرض یوں وہ معاہدہ لکھا گیا اس کا باقی حصہ میں کسی دوسرے مقام پر عرض کروں گا یہاں مجھے صرف اتنا ہی دکھانا ملحوظ تھا میں نے اس واقعے کو انصاف کے باب میں لیا ہے۔ گو بظاہر اس میں عدل کی نسبت رفق کا پہلو زیادہ نکلتا ہے۔ میرے خیال میں یہ واقعہ آپ کی منصف مزاجی کا نہایت ہی نمایاں ثبوت ہے۔ کیونکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو سب سے زیادہ مشکل بات یہ ہی ہے کہ آدمی اپنے مخالف کے نقطۂ خیال کو قبول کرلے اور وہ بھی بالخصوص مذہبی معاملات میں، اگر آپ کے دل میں ذرا بھی چور ہوتا تو یہ ممکن تھا کہ آپ اپنے صحابہ اور متبعین کے سامنے اپنے لقب رسول اللہ کو حذف کرنے کی اجازت دیتے۔ کیونکہ اسی پر تو سارا دار و مدار تھا۔ لیکن آپ کو اس کا اشتباہ بھی نہیں ہوا اور آپ کی طبعی انصاف پسندی اور معدلت گستری نے سہیل کے اعتراض کی معقولیت کو قبول کر لیا اور معقول بات کو تسلیم کر لینے میں کبھی آپ کو کچھ تامل ہوا ہی نہیں۔ یہ ہے سچی تعمیل اس ارشادِ الٰہی کی:

وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ط اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ط (مائدہ ع ۶)

اور اگر تو ان غیر مسلم لوگوں میں فیصلہ کرے تو انصاف سے فیصلہ کر۔ بیشک اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

تواضع اور انکسار

سعدی علیہ الرحمۃ کا یہ قول نہایت ہی سچا ہے: ؎

تواضع زگردن فرازاں نکوست
گدا اگر تواضع کند خوے اوست

تواضع عالی مرتبہ اور بلند پایہ شخص کے لیے اتنی ہی مشکل ہے جس قدر ادنیٰ مرتبہ اور پست حالت کے آدمی کے واسطے خودداری اور پابندیٔ وضع۔ لیکن جس شخص کے دل میں اپنے ابنائے نوع کی محبت ہو یہ ممکن ہی نہیں کہ اس میں تواضع اور انکسار نہ ہو کیونکہ محبت مساوات کی مستلزم ہے۔ اور مساوات میں کبر و نخوت کی گنجائش نہیں۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی اور سب لوگوں سے محبت بھی کرے۔ ان پر شفیق بھی ہو ان کا ہمدرد بھی رہے اور پھر اپنے آپ کو اُن سے افضل بھی سمجھے اور ان سے غرور بھی کرے۔

اس سے میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ کسی کو کسی پر فضیلت ہے ہی نہیں۔ اصول فَضَّلْنَا بَعْضَكُمْ عَلٰی بَعْضٍ تو یقیناً بالکل درست ہے مگر کسی کا افضل ہونا اور بات ہے اور اس کا اپنے آپ کو افضل سمجھنا دوسری بات ہے۔ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ کیونکہ فی الواقع جو لوگ اوروں سے بہتر ہوتے ہیں وہ اپنے آپ کو ایسا نہیں سمجھتے۔ اور جو اپنے آپ کو اوروں سے بہتر سمجھتے ہیں وہ اصل میں ایسے ہوتے نہیں۔ اس سے یہ بھی نہ خیال ہونا چاہیے کہ چونکہ سب برابر ہیں اس لیے حفظ مراتب کی ضرورت نہیں۔ نہیں، بڑے خواہ کیسے ہی متواضع اور منکسر المزاج کیوں نہ ہوں چھوٹوں کو کبھی اپنی حد سے گزرنا اور سررشتہ ادب کو ہاتھ سے دینا نہ چاہیے۔ حقیقت میں تعلقات کی خوبی یہی ہے کہ ایک طرف سے محبت و شفقت ہو اور دوسری طرف سے عقیدت و اطاعت، ایک طرف سے تواضع و انکسار ہو اور دوسری طرف سے ادب اور عزت۔ اسی حسن مراعات کا بہترین مرقع ہم کو جناب خیر الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ کے احباب کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے باہمی تعلقات میں نظر آتا ہے۔

یہ تو ہم گزشتہ بابوں میں دیکھ ہی چکے ہیں کہ آپ کیونکر ہر ایک کام میں اپنے صحابہ کے ساتھ شریک ہوتے تھے اور کسی طرح اپنے آپ کو اُن میں ممتاز نہ ہونے دیتے تھے۔ لیکن اس کے علاوہ یوں بھی آپ بے انتہا متواضع اور منکسر المزاج تھے یہاں تک کہ آپ اپنے متبعین کو اس بات کی بھی اجازت نہ دیتے تھے کہ وہ آپ کو کسی گزشتہ پیغمبر سے افضل سمجھیں۔ چنانچہ آپ نے فرمایا کہ "کسی کو یہ بھی نہ کہنا چاہیے کہ میں یونسؑ بن متی سے بہتر ہوں اور جس کسی نے یہ کہا کہ میں یونس بن متی سے بہتر ہوں، اس نے غلط کہا (بخاری ص ۰۹) حالانکہ یونس بن متی اولو العزم اور صاحبِ کتاب پیغمبروں میں سے نہیں تھے۔ اور آپ خاتم النبیین تھے مگر پھر بھی آپ کا انکسار ایسا مقابلہ جائز نہ رکھتا تھا۔

ابو سعید الخدری بیان کرتے ہیں کہ "ایک دن آپ تشریف فرما تھے کہ اتنے میں ایک یہودی آیا اور اس نے کہا کہ "ابوالقاسم (صلی اللہ علیہ وسلم)! تیرے رفیقوں میں سے ایک نے میرے منہ پر طمانچہ مارا۔" آپ نے پوچھا "کس نے؟" اس نے کہا "انصار میں سے ایک نے۔" اور کچھ پتہ بتایا۔ آپ نے اُسے بلایا اور اُس سے پوچھا "کیا تُو نے اسے مارا ہے؟" اس نے کہا "ہاں، میں نے اسے بازار میں یہ قسم کھاتے سُنا: "قسم اس ذات کی جس نے موسیٰؑ کو تمام نوع بشر میں سب پر فضیلت دی۔" اس پر مجھے غصہ آیا اور میں نے کہا: "اے ناپاک! کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی؟" اور میں نے اس کے ایک طمانچہ مارا۔" آپ نے فرمایا: "تم لوگ مجھے پیغمبروں پر برتری مت دو۔" (بخاری ص ۳۲۵)

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا: "تم میری تعریف میں زیادہ مبالغہ مت کرو۔ جیسے مسیحیوں نے عیسیٰ ابن مریم کو حد سے زیادہ بڑھایا! میں تو اللہ کے بندوں میں سے ایک بندہ ہوں، اس لیے مجھے عبداللہ و رسولہٗ کہا کرو۔" (شفا، ص ۵۸)

ایک دفعہ ایک شخص نے آپ کو "یا خیر البریۃ" (یعنی اے بہترین خلائق) کہہ کر خطاب کیا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ "یہ لقب ابراہیمؑ کے لیے زیادہ موزوں ہے۔" (شفا، ص ۵۸)

اگر انسانی طبیعت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ علی العموم خواہ کوئی شخص کتنا ہی متواضع اور منکسر المزاج کیوں نہ ہو۔ پھر بھی کم سے کم وہ یہ ضرور چاہتا ہے کہ دوسرے لوگ اس کی عزت اور اُس کی صفاتِ حسنہ کی تعریف کریں اور خاص کر جس بات میں وہ اوروں سے خاص طور پر ممتاز ہے، اُس میں اُس کی فضیلت مسلّم رہے۔ مگر جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھیے کہ آپ کی

وجہ امتیاز نبوت ہی تھی ۔ اور یہ احتمال ہو سکتا تھا کہ اور انبیا کو آپ پر فضیلت دینے سے آپ کے متبعین کی نظروں میں شاید آپ کی وقعت کچھ کم ہو جائے ۔ لیکن آپ کی حقیقی عظمت اور فضیلت کا سب سے بڑا ثبوت یہی ہے کہ آپ کو اس کا خیال بھی نہیں آیا ۔ اور آپ نے اپنے آپ کو نبوت میں بھی اوروں پر مرجح اور افضل نہیں رکھا یہاں تک کہ آپ کو خود اپنے صحابہ کا اقتدا کرنے میں بھی تامل نہ ہوتا تھا ۔ چنانچہ غزوہ تبوک کے سفر کا واقعہ ہے کہ آپ صبح اُٹھ کر کہیں باہر تشریف لے گئے اور دیر ہو گئی ۔ جب آپ واپس آئے تو جماعت کھڑی ہو گئی تھی اور عبدالرحمٰن بن عوف پہلی رکعت پڑھا چکے تھے ۔ آپ کے ساتھ اس واقعہ کے راوی مغیرہ بن شعبہ تھے ۔ اُنھوں نے ان کو اطلاع دینی چاہی تو آپ نے منع فرما دیا ، اور انہی کے پیچھے نماز میں شریک ہو گئے ۔ (خصائص کبریٰ للسیوطی ص ۲۰۶) اور یوں تو جا بجا کلام مجید ہی میں ارشاد ہے کہ :

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ط (کہف ع ۱۲)	اے پیغمبر ! تو کہہ دے کہ بیشک میں تمھاری طرح کا آدمی ہوں مگر مجھ پر وحی کی گئی ہے کہ بیشک تمھارا پروردگار خدائے واحد ہے ۔
قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ط ۔ (بنی اسرائیل ع ۱۰)	اے پیغمبر ! تو کہہ دے کہ سبحان اللہ میں تو ایک انسان پیامبر کے سوا اور کچھ بھی نہیں ۔

حالی مرحوم نے ارشادِ نبوی کا نہایت عمدہ ترجمہ کیا ہے : ؎

نہ کرنا مری قبر پر سر کو خم تم　　بنانا نہ تربت کو میری صنم تم
نہیں بندہ ہونے میں کچھ مجھ سے کم تم　　کہ بیچارگی میں برابر ہیں ہم تم
مجھے دی ہے حق نے بس اتنی بزرگی
کہ بندہ بھی ہوں اُس کا اور ایلچی بھی

ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ " کسی شخص کو اس کے اعمال جنت میں داخل نہیں کر سکتے " یعنی آدمی سے کچھ نہ کچھ گناہ ہو ہی جاتے ہیں محض اپنے حسنِ عمل پر کسی کو نازاں نہ ہونا چاہیے بلکہ اللہ کے عفو و کرم پر بھروسا رکھنا چاہیے ۔ لوگوں نے پوچھا " یا رسول اللہ ! کیا آپ بھی " آپ نے فرمایا " ہاں میں بھی جب تک اللہ کی رحمت و مغفرت مجھے ڈھانپ نہ لے ۔ " (بخاری ص ۹۵۰)

لیکن آپ کی تواضع فقط اسی پر موقوف نہ تھی بلکہ آپ کا ہر ایک فعل آپ کے انکسار کا عملی ثبوت ہے آپ کو یہ بھی گوارا نہ تھا کہ آپ کے صحابہ آپ کی تعظیم کے لیے قیام بھی کریں ۔ چنانچہ روایت ہے کہ ایک روز آپ باہر تشریف لائے اور آپ اُس وقت ایک عصا پر سہارا لیے ہوئے تھے تو سب صحابہ تعظیماً کھڑے ہو گئے ۔ اس پر آپ نے فرمایا : جیسے عجمی آپس میں ایک دوسرے کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوتے ہیں اس طرح تم کو کھڑا نہ ہونا چاہیے ۔ " (شفا ، ص ۸۰)

آپ نے فرمایا " بے شک میں بھی ایک بندہ ہوں جیسے اور لوگ کھاتے ہیں ویسے ہی میں بھی کھاتا ہوں ، جیسے اور لوگ بیٹھتے ہیں ویسے ہی میں بھی بیٹھتا ہوں ۔ " (شفا ، ص ۸۰)

جب مکّہ سے ہجرت فرماکر آپ مدینہ میں تشریف لائے تو آپ نے ابو ایوبؓ کے گھر میں قیام فرمایا۔ ابو ایوبؓ کہتے ہیں کہ "ہم کو یہ بات بہت شاق گزرتی تھی کہ آپ تو نیچے رہیں اور ہم اوپر۔ چنانچہ میں نے خدمتِ اقدس میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ آپ اوپر قیام فرمائیں اور ہم نیچے رہیں گے۔ کیونکہ یہ ہم کو بڑی بے ادبی معلوم ہوتی ہے۔" مگر آپؐ نے اسے قبول نہ کیا اور فرمایا کہ "مجھے اور میرے پاس آنے والوں کو نیچے ہی رہنے میں زیادہ آرام ہے۔" چنانچہ آپ وہیں رہے۔ ایک دن اتفاق سے ہماری پانی کی ٹھلیا ٹوٹ گئی تو میں اور ام ایوب دونوں اپنی چادر سے اس پانی کو پونچھتے رہے۔ اگرچہ ہمارے پاس اس کے سوا اوڑھنے کے لیے اور کچھ نہ تھا کیونکہ ہم کو یہ ڈر تھا کہ مبادا پانی آپ پر ٹپکے اور آپ کو تکلیف ہو۔" یہ مثال ہے ایک طرف سے شفقت و انکسار کی اور دوسری طرف سے محبت و احترام کی۔" (سیرت ابن ہشام ص ۲۷۶)

"آپ فرطِ انکسار سے گدھے پر بھی سوار ہو جاتے تھے اور اونٹ وغیرہ پر اپنے پیچھے اور لوگوں کو بھی بٹھا لیتے تھے۔ مسکینوں اور بیکسوں کی عیادت کو تشریف لے جاتے تھے۔ فقیروں اور غریبوں کے ساتھ بیٹھتے تھے۔ اپنے اصحاب میں بالکل ملے جلے رہتے تھے، اور مجلس میں جہاں جگہ مل جاتی تھی وہیں بیٹھ جاتے تھے۔ آپ نوکروں کے کام میں شریک ہو جاتے تھے اور ان کو اپنے ساتھ بٹھا لیتے تھے۔"

(شفا، ص ۸ د)

عمرو بن سائب سے مروی ہے کہ "ایک دن آپ تشریف فرما تھے کہ آپ کی دایہ حلیمہ کا شوہر حارث بن عبد العزیٰ آیا۔ آپ نے اس کے لیے چادر کا ایک کونہ پھیلا دیا۔ ذرا دیر میں حلیمہ آئی تو آپ نے دوسرا کونہ پھیلا دیا۔ پھر آپ کا دودھ شریک بھائی عبد اللہ بن حارث آیا تو آپ کھڑے ہو گئے اور اسے اپنے سامنے بٹھایا" (شفا، ص، د)

انسؓ کہتے ہیں کہ "ایک مرتبہ ایک دیوانی سی عورت آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس نے کہا کہ مجھے تجھ سے کچھ کام ہے۔ آپ نے فرمایا: "اے ام فلاں! تیرا جی چاہے مدینے کی گلیوں میں جہاں جی چاہے بیٹھ جا، میں بھی تیرے ساتھ بیٹھا رہوں گا یہاں تک کہ تیرا کام پورا ہو جائے۔" چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا اور اس کے ساتھ بیٹھے رہے حتیٰ کہ اس کا جو کچھ کام تھا وہ پورا ہو گیا۔" (مشکوٰۃ ص ۲۴۲)

ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ "ایک دن میں بہت بھوکا تھا اور میں نے شدتِ گرسنگی سے اپنے پیٹ پر پتھر باندھ رکھے تھے اور میں راستے پر بیٹھا تھا جدھر سے لوگ آتے جاتے تھے اتنے میں ابو بکرؓ وہاں سے گزرے میں نے ان سے قرآن مجید کی ایک آیت پوچھی، اور میرا مطلب یہ تھا کہ شاید وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لیتے جائیں۔ مگر وہ چلے گئے۔ پھر عمرؓ گزرے ان سے بھی میں نے ایک آیت اسی نیت سے پوچھی مگر وہ بھی چلے گئے۔ پھر ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور مجھے دیکھ کر مسکرانے لگے اور آپ نے میرے بشرے سے میری حالت سمجھ لی اور کہا: "ابو ہریرہ!" میں نے کہا "لبیک یا رسول اللہ۔" آپ نے فرمایا "چلو۔" میں بھی آپ کے ہمراہ چلا۔ پھر جب آپ مکان پر پہنچے تو آپ نے میرے لیے اندر آنے کی اجازت چاہی۔ اجازت لے کر میں اندر گیا وہاں ایک برتن میں دودھ رکھا تھا آپ نے پوچھا کہ "دودھ کیسا ہے اور کہاں سے آیا ہے؟" معلوم ہوا کہ فلاں شخص نے آپؐ کے لیے بھیجا ہے۔ آپ نے مجھ سے کہا "ابو ہریرہؓ! اہلِ صُفّہ کو بلا لاؤ۔" اور اہلِ صفہ وہ لوگ تھے جن کا گھر بار نہ تھا۔ جب کوئی چیز خیرات یا صدقہ کے طور پر آپ کے پاس آتی تھی تو آپ وہ سب کی سب انہی لوگوں کو بھیج دیتے تھے۔ اور اگر تحفتہً

آتی تھی تو آپ ان لوگوں کو بلا کر اُس کو ان میں بانٹ دیتے تھے اور خود بھی ان کے ساتھ شریک ہو جاتے تھے۔ مگر اس وقت مجھے ان لوگوں کا بلانا ناگوار گزرا۔ اور میں نے اپنے دل میں کہا کہ اس کا اہل صفہ کی نسبت تو میں زیادہ مستحق ہوں کہ اگر اس میں سے تھوڑا سا پی لوں تو ذرا جان میں جان آجائے مگر خیر، قہر درویش بر جانِ درویش، میں ان کو بلا لایا، جب وہ آگئے تو آپ نے مجھے اُن کو دودھ پلانے کا حکم دیا، مجھے اُمید نہ رہی کہ اس میں سے مجھے بھی کچھ ملے گا۔ مگر فرماں برداری اور اطاعت کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ پس میں نے پیالہ لے کر ان میں سے ایک ایک کو دُودھ پلانا شروع کیا۔ جب ایک آدمی سیر ہو کر پی لیتا تھا تو وہ پیالہ مجھے واپس کر دیتا تھا، میں دوسرے کو دے دیتا تھا، یہاں تک کہ اسی طرح میں نے سب کو دُودھ پلایا اور میں آپ تک پہنچ گیا۔ آپؐ نے پیالہ مجھ سے لے کر اسے اپنے ہاتھ پر رکھ لیا اور میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا: "ابوہریرہؓ! اب میں اور تم باقی رہ گئے۔" میں نے عرض کیا "جی ہاں یا رسول اللہؐ"۔ آپ نے فرمایا: "بیٹھ جاؤ اور پیو۔" میں بیٹھ گیا اور پیالہ لے کر دودھ پینا شروع کیا۔ پی چکا تو آپؐ نے پھر فرمایا "اور پیو۔" میں نے اور پیا۔ آپؐ نے پھر فرمایا "اور پیو۔" یہاں تک کہ میں نے عرض کیا "بہ خدائے لایزال اب تو بالکل گنجائش نہیں رہی۔" آپؐ نے کہا "اچھا اب مجھے دو۔" میں نے پیالہ پیش کیا آپؐ نے اسے لے کر بسم اللہ کی اور خدا کا شکر ادا کیا اور پھر سب کا پس ماندہ دودھ نوش فرمایا۔" (بخاری ص ۹۵۶)

سبحان اللہ! کس قدر محبت وایثار، تواضع اور انکسار کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے اور حالت یہ تھی کہ ایسے واقعات ہر روز ہی پیش آتے رہتے تھے۔ یہ ہجرت کے بعد کا ذکر ہے۔ یعنی اس زمانہ کا جب بخیال دشمنان آپ کی دنیوی سلطنت قائم ہو چکی تھی اور اگرچہ آپ ظاہری حیثیت سے بھی بادشاہ ہو گئے تھے لیکن آپ کے حُسنِ ادب کا یہ حال تھا کہ آپ کبھی تکیہ لگا کر کھانا نہیں کھاتے تھے۔ (بخاری ص ۸۱۲)

آپ کو لوگوں کی حاجت روائی کے لیے اپنے منکرین ومخالفین تک کے پاس جا کر ان کی سفارش کرنے میں عار نہ ہوتا تھا بارہا ایسا اتفاق ہوا کہ کسی پہ کچھ قرض ہوا اور یہودی قرض خواہ نے (کیونکہ لین دین کا کام یہودی ہی کرتے تھے) تنگ طلبی کی۔ اور وہ شخص آپ کے پاس آیا، اگر آپ کے پاس کچھ ہوا تو خود ادا کر دیا، ورنہ اس یہودی کے پاس خود تشریف لے گئے اور اس سے کچھ اور مہلت دینے کے لیے کہا، مگر وہ لوگ عموماً اس کا بھی کچھ خیال نہ کرتے تھے تو آپ اِدھر اُدھر سے کوشش کر کے جس طرح ممکن ہوتا تھا ادائے قرض کا بندوبست کر دیتے تھے۔ آپ نے فرمایا ہے کہ "بھوکوں اور مسکینوں کے لیے کوشش کرنے والا مجاہد فی سبیل اللہ اور قائم اللیل اور صائم النہار کے برابر درجہ رکھتا ہے۔" (مشکوٰۃ ص ۳۵۹)

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے روایت ہے کہ ایک یہودی کے کچھ دینار آپ پر قرض تھے وہ تقاضا کرتے آیا۔ آپ نے فرمایا: "اس وقت تو میرے پاس کچھ نہیں ہے کہ میں تجھے دُوں۔" یہودی نے کہا "یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! جب تک تُو مجھے دے گا نہیں، میں یہاں سے جاؤں گا نہیں۔" آپ نے فرمایا: "اچھا تو میں تیرے پاس بیٹھا رہوں گا۔" چنانچہ آپؐ اس کے پاس بیٹھ گئے اور وہیں ظہر، مغرب، عشا کی نماز ادا فرمائی۔ یہاں تک کہ دوسری صبح ہو گئی۔ آپؐ کے اصحاب کرام کبھی اس یہودی کو دھمکاتے تھے کبھی اس سے وعدہ کرتے تھے کبھی آپ سے عرض کرتے تھے کہ "یا رسولؐ اللہ! آپ کو ایک یہودی نے

قید کر رکھا ہے "۔ آپ نے فرمایا" میرے پروردگار نے مجھے اس بات سے منع کیا ہے کہ میں کسی معاہد یا غیر معاہد پر زیادتی کر دوں"۔ جب اور دیر ہوئی اور زیادہ دن چڑھا تو وہ یہودی مسلمان ہوگیا اور اس نے کہا کہ " میں تو آپ کے حلم، انصاف اور تواضع وغیرہ صفات حسنہ کا امتحان کرنا چاہتا تھا"۔ (خصائص کبریٰ للسیوطی و مشکوٰۃ ص ۴۴۳)

انتہائے عروج میں آپ کی تواضع اور فروتنی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ جب فتح مکہ کے وقت آپ مظفر و منصور اس شہر میں داخل ہوئے، جس نے شروع سے آپ کو تکلیف دینے اور آپ کی مخالفت کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا۔ تو فرطِ انکسار سے آپ کا سر مبارک اتنا جھکا ہوا تھا کہ کاٹھی کے سامنے کے حصہ سے لگا جاتا تھا۔ آپؐ اس وقت اونٹ پر سوار تھے اور تنہا نہ تھے بلکہ اسامہؓ آپ کے ردیف تھے (نسیم الریاض شرح شفا و سیرت ابن ہشام ص ۴۲۶) حالانکہ اس وقت فاتحانہ شان اس بات کی مقتضی تھی کہ آپ گھوڑے پر اپنے صحابہ کے جھرمٹ میں کالبدر فی النجوم شاہانہ تزک و احتشام سے تشریف لاتے۔ مگر یہ شان ہی اور ہے جو شہنشاہوں کو کہاں نصیب!

صدق

اگر میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت لکھتا ہوتا تو آپ کے صدق پر قطعاً استشہاد نہ کرتا، کیونکہ یہ تو آپ کی وہ صفت ہے جس میں آپ کو بعثت سے برسوں پہلے ہی سے شہرت عام حاصل ہو چکی تھی اور جس سے آپ کے اسی زمانہ کے شدید ترین اعدا نے بھی انکار نہیں کیا اس کے سوا یوں بھی صدق باقی تمام محاسن اخلاق کا سنگِ بنیاد ہے اور جب تک کسی طبیعت میں پوری سچائی نہ ہو تب تک اس میں کوئی اور اعلیٰ خوبی ہونی ممکن ہی نہیں ہے۔ اس لیے اس جامع صفات حسنہ روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق پر واقعات سے استدلال کرنا، سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ اور یہ آنجناب کی شان میں گستاخی ہی نہیں بلکہ خود اپنی جہالت اور نادانی کا بھی اظہار ہے لیکن میں تو چونکہ اپنے ابنائے وطن کی تقلید اور اتباع کے لیے آپ کے اسوۂ حسنہ کو پیش کرنا چاہتا ہوں اس لیے میرے لیے آپ کے صدق کا بیان بھی ضروری ہے۔

ہم میں سچائی کی اس قدر کمی ہے کہ اگر ترتیبِ ابواب میں اپنی ضرورت کو مدِ نظر رکھا جاتا تو یقیناً اس باب کو فاتحۃ الکتاب ہونا چاہیے تھا۔ لیکن خیر چونکہ ہم لوگ عموماً ایسے مضامین کی کتابوں کو ختم کرنے سے پہلے ان کے ابتدائی حصہ کو بھول جاتے ہیں اس لیے شاید اس کا آخر میں ہونا بھی کچھ زیادہ ناموزوں نہ ہو۔ ممکن ہے کہ اس کے بعد کتاب کے جلد ختم ہو جانے کی وجہ سے اس کا کچھ حصہ حافظے کے کسی کونے میں باقی رہ جائے۔

سچائی کے متعلق جناب سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کی تعلیم کا اندازہ اس ایک حدیث سے ہوسکتا ہے۔ اور اگر گوش شنوا ہو تو یہی ایک نصیحت عمر بھر کی اصلاح کے لیے کفایت کرتی ہے۔ عبد اللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ "ایک شخص نے حاضر خدمت ہو کر عرض کیا کہ" یا رسول اللہ! جنت پانے کا عمل کیا ہے؟" آپ نے فرمایا: "صدق۔ کیونکہ جب آدمی سچا ہوتا ہے تو نیکی کرتا ہے۔ اور جب نیکی کرتا ہے تو نورِ ایمانی پیدا ہوتا ہے۔ اور جب ایماندار ہوتا ہے تو جنت میں داخل

ہوتا ہے۔" (ترغیب وترہیب ص ۵۰۱)

ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا کہ خبردار ہمیشہ سچے رہو، خواہ تم کو سچائی میں ہلاکت ہی کیوں نظر نہ آئے۔ کیونکہ بلاشبہ نجات اسی میں ہے۔" (ترغیب وترہیب ص ۵۰۱)

ایک اور روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "دیکھو ہمیشہ صدق پر جمے رہو، کیونکہ صدق نکوکاری کی طرف لے جاتا ہے اور نکوکاری جنت کی طرف رہبری کرتی ہے۔ اور جو شخص ہمیشہ سچ پر قایم رہتا ہے وہ بارگاہِ الٰہی میں صدیق لکھا جاتا ہے۔ اور خبردار، جھوٹ سے بچو کیوں کہ جھوٹ بدکاری کی طرف لے جاتا ہے اور بدکاری آگ کی طرف رہبری کرتی ہے۔ اور جو شخص جھوٹا ہوتا ہے وہ بارگاہِ کبریائی میں کذاب لکھا جاتا ہے۔" (بخاری ومسلم، ابوداؤد وترمذی از ترغیب وترہیب ص ۵۰۱)

آپ کی سچائی اور راست بازی اتنی اعلیٰ درجہ کی تھی کہ زبان صدق بیان پر تو کیا کبھی آپؐ کے خیال میں بھی کوئی غلط بات نہیں گزرتی تھی اور گزشتہ کے متعلق آپ جو کچھ فرماتے تھے وہ تو درست ہوتا ہی تھا لیکن خیالات کی راست بازی کا اتنا اثر تھا کہ آیندہ کی بابت بھی جو بات آپ کی زبانِ مبارک سے نکلتی تھی خدا اس کو سچ کر دیتا تھا۔ چنانچہ اس کے بیسیوں مستند واقعات ہیں کہ آپ نے کسی شخص یا کسی واقعہ کی بابت کچھ فرمایا اور بعد میں بعینہٖ وہی ہو گیا۔ لیکن اس پر آپؐ نے کبھی پیش گوئی یا غیب دانی کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ اس سے قطعی انکار فرمایا۔ آپ کی یہ صفت اتنی مشہور ومعروف تھی کہ آپؐ کے اعدا ومخالفین تک کو اس سے انکار نہ تھا۔

چنانچہ روایت ہے کہ جنگِ بدر میں اخنس ابن شریق ابُوجہل سے ملا تو اس نے اس سے کہا" اے ابوالحکم! میں تجھ سے ایک بات پُوچھتا ہُوں یہاں ہم دونوں کے سوا اور کوئی تو ہماری بات سُننے والا نہیں ہے۔ تو مجھے سچ سچ بتا دے کہ آیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سچا ہے یا جھُوٹا۔" ابُوجہل نے جواب دیا کہ "واللہ! بے شک محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سچ بولتا ہے اور اس نے کبھی غلط بیانی نہیں کی۔" (شفا، ص ۵۹)

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ابُوجہل نے خود جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ" ہم کو تیری راست گفتاری اور صادق البیانی پر تو شبہ نہیں ہے اور ہم تجھے تو نہیں جھٹلاتے۔ البتہ جو کچھ تو لایا ہے اور جو کچھ تو کہتا ہے اس کو ہم جھٹلاتے ہیں اور اسے ہم نہیں مانتے۔ چنانچہ اسی پر یہ آیت شریفہ نازل ہوئی: (شفا، ص ۵۹)

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِیْ يَقُوْلُوْنَ	بے شک ہم جانتے ہیں کہ وہ لوگ جو باتیں کہتے ہیں
فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ	تجھ کو رنجیدہ کریں گی۔ لیکن یہ ظالم تجھ کو نہیں جھٹلاتے
بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ط (انعام ع ۴)	بلکہ اللہ کی نشانیوں کا انکار کرتے ہیں۔

ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ" جب یہ آیت شریفہ نازل ہوئی:

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ط — اور تو اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرا۔

تو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کوہِ صفا پر چڑھے اور آپؐ نے سب قبائل قریش کو پکارا۔ آپ کی آواز سُن کر سب اہلِ قریش جمع ہو گئے یہاں تک کہ جو شخص خود نہیں آ سکتا تھا اس نے اپنا آدمی خبر لینے کو بھیجا۔ انھوں نے آپ سے پُوچھا کہ" کیا

ہوا؟" آپؐ نے فرمایا: "یہ بتاؤ کہ اگر میں تم کو یہ خبر دوں کہ پہاڑ کے پیچھے اس وادی میں ایک لشکر پڑا ہوا ہے اور صبح یا شام تم پر حملہ کرنے والا ہے تو تم میرے کہنے کو سچ سمجھو گے یا نہیں؟" سب نے کہا: "ہاں۔ بے شک کیونکہ ہم نے کبھی تجھے جھوٹ بولتے ہوئے نہیں سنا۔" آپ نے فرمایا: "تو میں تم کو عنقریب آنے والے عذاب سے ڈراتا ہوں۔" یہ سن کر ابولہب نے کہا "تجھ پر ہلاکت ہو کیا تو نے ہم کو اس واسطے بلایا تھا؟" اس پر سورۂ لہب نازل ہوئی۔ (بخاری ص ۷۰۲)

حالیؔ مرحوم نے اس واقعہ کو اپنے مسدس میں نہایت خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے: ؎

وہ فخرِ عرب زیبِ محراب و منبر — تمام اہلِ مکہ کو ہمراہ لے کر
گیا ایک دن حسبِ فرمانِ داور — سوئے دشت اور چڑھ کے کوہِ صفا پر
یہ فرمایا سب سے کہ "اے آلِ غالب
سمجھتے ہو تم مجکو صادق کہ کاذب؟"

کہا سب نے "قول آج تک کوئی تیرا — کبھی ہم نے جھوٹا سنا اور نہ دیکھا"
کہا گر سمجھتے ہو تم مجھ کو ایسا — تو باور کرو گے اگر میں کہوں گا؟
کہ فوج گراں پشت کوہِ صفا پر
پڑی ہے کہ لوٹے تمھیں گھات پا کر"

کہا "تیری ہر بات کا یاں یقیں ہے — کہ بچپن سے صادق ہے تو اور امیں ہے"
کہا "گر مری بات یہ دل نشیں ہے — تو سن لو خلاف اس میں اصلا نہیں ہے
کہ سب قافلہ یاں سے ہے جانے والا
ڈرو اس سے جو وقت ہے آنے والا"

بیہقی نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ "نضیر بن حارث ایک دن آپ کے متعلق اکابرِ قریش سے کہنے لگا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جب تم میں نوعمر لڑکا تھا تب وہ تم میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ کردار، راست گفتار اور امانت دار سمجھا جاتا تھا۔ مگر جب اس کی داڑھی کے بال سپید ہو گئے اور اس نے تم سے وہ باتیں کہنی شروع کیں جو وہ کہتا ہے تو اب تم کہتے ہو کہ وہ جادوگر ہے۔ نہیں، خدا کی قسم وہ جادوگر نہیں ہے، ہم نے جادوگروں کے شعبدے دیکھے ہیں۔ اور تم کہتے ہو کہ وہ کاہن ہے، تو واللہ وہ کاہن بھی نہیں ہے، ہم نے کہانت کے تماشے بھی دیکھے ہیں۔ اور تم کہتے ہو کہ وہ دیوانہ ہے، تو واللہ وہ دیوانہ بھی نہیں ہے، ہم دیوانوں کی دیوانگی اور خبط کو بھی جانتے ہیں۔ اور تم کہتے ہو کہ وہ شاعر ہے، واللہ وہ شاعر بھی نہیں ہے۔ ہم شعر کے تمام اصناف سے بھی واقف ہیں۔ پس اے معشرِ قریش! تم اس معاملے پر غور کرو، واللہ تم پر یہ ایک امرِ عظیم واقع ہوا ہے۔" (سیرت ابن ہشام ص ۱۵۹)

یہ شخص نضیر بن حارث آپ کا نہایت دشمن تھا اور ہمیشہ آپ کے درپے آزار رہتا تھا۔ چنانچہ اس کو شیطان

قریش کہتے ہیں ۔ یہ جنگِ بدر میں گرفتار ہو کر مارا گیا۔" (سیرت ابن ہشام، ص ۲۱۴)

اِن واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ کفارِ قریش زیادہ تر اپنی ضد اور اپنے غرور و نخوت کی وجہ سے اسلام نہیں لاتے تھے، اور باوجودیکہ وہ آپ کو صادق القول جانتے تھے پھر بھی آپ کو جھٹلاتے تھے اور آپ سے لڑتے تھے۔ بہر حال اس سے ہم کو بحث نہیں۔ لیکن یہ یقینی امر ہے کہ آپ کی کامل راستبازی پر آپ کے سخت سے سخت دشمن کو بھی کبھی حرف گیری کا موقع نہیں ملا۔

صدق ہی کا ایک شعبہ ایفائے وعدہ بھی ہے۔ اگرچہ یہ معمولی سچائی سے کسی قدر زیادہ مشکل ہے۔ کیونکہ ایفائے وعدہ میں بعض وقت مشکلات کا بھی سامنا ہوتا ہے۔ لیکن انھیں مشکلات کے سبب سے یہ قابلِ تعریف بھی زیادہ ہے۔ اس لیے احادیث نبوی میں اس کی تاکید بھی زیادہ کی گئی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ "منافق کی تین نشانیاں ہیں اگرچہ وہ روزہ رکھتا ہو، نماز پڑھتا ہو اور اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہو:

اوّل بات کرے تو جھوٹ بولے۔

دوسرے جب وعدہ کرے تو پورا نہ کرے۔

تیسرے جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔" (صحیحین از مشکوٰۃ ص ۸)

ذرا غور سے دیکھا جائے تو یہ تینوں باتیں جھوٹ ہی کی مختلف صورتیں ہیں۔ سچا آدمی نہ جھوٹ بولتا ہے نہ وعدہ خلافی کرتا ہے نہ امانت میں خیانت کرتا ہے۔

آپ کے مبعوث ہونے سے پہلے کا واقعہ ہے کہ عبداللہ ابن ابی الحمٗا نے آپ سے کچھ چیز لی۔ مگر قیمت میں کچھ کمی رہ گئی۔ اس نے آپ سے کہا کہ "تم یہیں ٹھہرو، میں ابھی لے کر آتا ہوں۔" اس کے بعد وہ بھول گیا۔ تین دن بعد اسے یاد آیا آن کر دیکھا تو آپ وہیں تھے۔ آپؐ نے اسے دیکھ کر فرمایا کہ "تم نے مجھے بہت سخت تکلیف دی۔ میں تین دن سے یہیں تمھارا انتظار کر رہا ہوں۔" (شفا، ص ۵۶)

صُلح حدیبیہ کا کچھ قصہ انصاف کے ضمن میں بیان کیا جا چکا ہے۔ اس صلح کی شرطوں میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ اگر اہلِ مکہ میں سے کوئی شخص آپ کے پاس آجائے تو خواہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو پھر بھی آپ اسے واپس کر دیں۔ ظاہر ہے کہ یہ شرط مسلمانوں کے لیے بڑی سخت تھی۔ چنانچہ انھوں نے کہا کہ "سبحان اللہ! یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ جو شخص مسلمان ہو کر ہمارے پاس آئے ہم اسے مشرکوں کو دے دیں۔" یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی اور یہ شرط عہد نامہ میں لکھی بھی نہیں گئی تھی کہ ابو جندل بن سہیل زنجیریں کھڑکھڑاتا ہوا آیا۔ وہ مکے کے زیریں حصہ سے نکل بھاگا تھا اور مسلمانوں کے لشکر تک پہنچ گیا تھا۔ سہیل نے اپنے بیٹے کو دیکھ کر کہا "یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ پہلا شخص ہے جسے میں چاہتا ہوں کہ تم واپس کر دو۔" آپؐ نے فرمایا: ابھی تو معاہدہ لکھا بھی نہیں گیا۔ "مگر سہیل نے کہا "واللہ! اگر تم نے یہ نہ کیا تو پھر میں ہرگز تم سے کسی شرط پر بھی صلح نہ کروں گا۔" آپؐ نے ہر چند اسے نرم کرنا اور سمجھانا چاہا مگر اس نے مانا ہی نہیں۔ اس پر ابو جندل نے کہا "یا معشر المسلمین! میں مسلمان ہوں اور اب مشرکوں کے حوالے کیا جاتا ہوں۔ کیا تم میرا حال نہیں دیکھتے کہ میں کس بلا میں مبتلا ہوں۔" اور یہ ظاہر تھا کہ

اسے محض اللہ کے ماننے کے سبب سے بہت سخت سخت تکلیفیں پہنچائی گئی تھیں۔ اس پر بقول ابن اسحاق آپ نے فرمایا "اے ابوجندل! صبر کرو، گھبراؤ مت۔ پس بیشک ہم غدر اور عہد شکنی نہیں کرتے۔ اور بلاشبہ اللہ تمھارے لیے کشایش اور راستہ پیدا کر دے گا۔" اور یہ کہہ کر اسے سہیل کے حوالے کر دیا۔ حالانکہ یہ بات تمام مسلمانوں پر بے انتہا گراں گزری اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تو بڑے شد و مد سے اس سے اختلاف کیا مگر آپ نے ایفائے عہد میں شائبہ شبہ تک کو گوارا نہ فرمایا اور کسی کے اختلاف کی مطلق پروا نہ کی۔" (بخاری ص ۳۷۹)

اس کے بعد جب آپ مدینہ منورہ تشریف آئے تو قریش میں سے ایک شخص ابوبصیر جو اسلام لا چکا تھا مکے سے بھاگ کر وہاں آگیا۔ قریش نے حسب وعدہ اسے لینے کے لیے آدمی بھیجے۔ آپ نے بے تامل ابوبصیر کو اُن کے حوالے کر دیا۔ مگر جب وہ ذوالحلیفہ پہنچے تو وہاں ٹھہر کر انھوں نے کچھ کھانے پینے کا ارادہ کیا۔ ابوبصیر نے ان میں سے ایک کی تلوار کی تعریف کی اور دیکھنے کے لیے مانگی۔ اس نے خوشامد میں آکر تلوار دے دی۔ ابوبصیر نے تلوار لے کر پہلا وار اُسی پر کیا، وہ تو وہیں ٹھنڈا ہو گیا، دُوسرا آدمی بھاگا اور گرتا پڑتا سیدھا مسجد نبوی میں آیا۔ جب وہ آپ کے پاس پہنچا تو اُس نے کہا "واللہ میرا رفیق مارا گیا اور میں بھی اتفاقیہ ہی بچا ہُوں۔" اتنے میں ابوبصیر بھی آگیا اور اس نے آتے ہی کہا: "یانبی اللہ! واللہ خدا نے آپ کو اپنے عہد سے سبکدوش کر دیا کیونکہ آپ تو مجھے ان کے حوالے کر چکے تھے۔ پھر اللہ نے مجھے ان سے نجات دی۔" آپ نے فرمایا: "یہ شخص آتش جنگ کا بھڑکانے والا ہے۔" آپ کے لہجے سے سب کو یقین ہو گیا کہ آپ ابوبصیر کو ضرور واپس کر دیں گے۔ اس ڈر سے ابوبصیر وہاں سے فوراً چل دیا اور سمندر کے کنارے پر جا کر پناہ گزیں ہُوا۔ اس کے بعد قریش میں سے جو شخص مسلمان ہو کر مکے سے نکل بھاگتا تھا وہ سیدھا وہیں جاتا تھا، یہاں تک کہ ابوبصیر کے ساتھ ایک جماعت ہو گئی اُنھوں نے اپنی شکم پُری کے لیے یہ وتیرہ اختیار کر لیا کہ قریش کا جو قافلہ شام کی طرف جاتا تھا اسی کو لُوٹ لیتے تھے۔ یہاں تک کہ قریش نے تنگ آکر آپ کی خدمت میں بڑے عجز و الحاح سے کہلا بھیجا کہ آپ ان لوگوں کو اپنے ہاں بُلا لیں اور آئندہ بھی جو شخص مسلمان ہو کر مکے سے چلا جائے اُسے واپس کرنے کی ضرورت نہیں تب آپ نے ابوبصیر اور اس کے ساتھیوں کو اپنے ہاں آنے کی اجازت دی۔ اور یُوں وہ شرط ٹوٹی جو شروع میں مسلمانوں کو اتنی ناگوار گزری تھی لیکن آخر میں خود اہلِ مکہ کے لیے ایسی وبالِ جان ہو گئی کہ اُنھوں نے خود منتیں کر کے اس سے اپنی جان چھڑائی۔" (بخاری ص ۳۸۰)

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی حیرت انگیز صداقت و امانت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ہجرت سے پہلے باوجودیکہ اہل مکہ آپ کے جانی دشمن اور آپ کے قتل کے درپے تھے پھر بھی آپ کی صداقت و امانت پر ان کو اتنا کلی اعتبار تھا کہ جس کسی کے پاس کچھ بھی ایسا سامان ہوتا تھا جس کے ضائع ہو جانے کا ڈر رہتا تھا تو وہ اسے آپؐ کے پاس امانت رکھ جاتا تھا۔ چنانچہ ہجرت کے وقت آپ کا حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو اپنے بستر پر اور اپنے پیچھے چھوڑ جانے کا اصلی سبب ہی یہ تھا کہ آپ کے تشریف لے جانے کے بعد وہ تمام ودیعتیں ان کے مالکوں کو واپس کر دیں (سیرت ابن ہشام ص ۲۷۳) ورنہ ایسے وقت میں حضرت علیؓ کو اس بھڑوں کے چھتے میں تنہا چھوڑ جانا کچھ کم خطرناک نہ تھا، کیونکہ ابوطالب کا تو انتقال ہی ہو چکا تھا۔ اور یہ امر قرین قیاس تھا کہ قریش آپ کو نہ پا کر اپنی ساری ناکامی کا بدلہ حضرت علیؓ ہی سے لیں۔ مگر آپ نے حضرت علیؓ کو اطمینان دلا دیا تھا کہ ان کو کچھ خوف نہ کرنا چاہیے اور بہرحال چونکہ امانتوں کی واپسی لازمی تھی اس لیے حضرت علیؓ وہیں رہے۔ یہاں تک کہ وہ کل اشیا اپنے اپنے ٹھکانے پہنچا دی گئیں۔

سبحان اللہ! کتنی عمدہ تعمیل ہے اس ارشادِ الٰہی کی کہ:

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا ۙ وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ (نساء۔ ع ۵)

بے شک اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے مالکوں کو واپس کر دیا کرو اور جب تم لوگوں کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کرو تو انصاف سے فیصلہ کرو۔

حیاؔ

قدرت نے انسان کے جذباتِ حیوانی کی لگام اور اس کے قوائے شہوانی کا انتظام حیا کے ہاتھ میں رکھا ہے۔ اور فقط یہی نہیں بلکہ اسی کے ذریعہ سے اور بہت سی برائیوں کی بھی روک تھام کی ہے۔ آجکل کی تہذیب میں حیا کی کچھ زیادہ تاکید نہیں کی جاتی بلکہ اسے ایک حد تک صرف صنفِ ضعیف کے لیے مخصوص اور فرقہ اناث کے واسطے موزوں سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ اس تہذیب کی غلطی ہے اور اَلْحَیَاءُ مِنَ الْاِیْمَانِ کے اصول کی صحت میں کچھ تغیرؔ نہیں ہوا۔ چونکہ غالباً ناظرین خود اپنے ذاتی تجربے سے اس کی تصدیق کر سکیں گے اس لیے مجھے اس بحث کی مزید تصریح غیر ضروری معلوم ہوتی ہے۔ لیکن بہر حال خصائلِ انسانی میں سے حیا کو نکال لیجئے اور دیکھیے کہ انسانیت کا کتنا بڑا جزء غائب ہو جاتا ہے اور کتے اور آدمی میں کتنا فرق رہ جاتا ہے۔ بلاشبہ یہ درست ہے کہ اور مکارمِ اخلاق کی طرح حیا کا بھی غلط استعمال ہو سکتا ہے اور اس میں بھی افراط و تفریط ممکن ہے۔ لیکن اس سے اس صفت کی پاکیزگی پر کچھ اثر نہیں پڑتا اور اگر ہم ذرا غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ اتنی عمدہ خصلت ہے کہ اگر کسی شخص میں حیا کے سوا اور کوئی خُوبی نہ ہو تب بھی وہ صرف اسی کی وجہ سے ہر قسم کی برائیوں سے بچ سکتا ہے۔ کیونکہ بے حیائی کو ارتکابِ فواحش کا دروازہ سمجھنا چاہیے۔ جب تک یہ دروازہ نہیں کُھلتا، اور آنکھوں میں شرم اور دل میں غیرت باقی رہتی ہے۔ تب تک ناکردنی حرکات کی طرف قدم ہی نہیں بڑھتا اور یُوں اگر آدمی نیکی نہ بھی کرے تب بھی بدی سے محفوظ رہتا ہے۔

حیا کے کئی درجے ہیں، سب سے پہلا درجہ تو یہ ہے کہ آدمی کو غیروں کے سامنے کوئی ناشائستہ بات کرتے ہوئے شرم آئے۔ اور اگرچہ یہ درجہ بہت ابتدائی اور معمولی ہے مگر پھر بھی بہت سی ظاہری بُرائیاں اس سے چُھوٹ جاتی ہیں اس سے ترقی ہوتی ہے تو آدمی اپنے عزیزوں اور گھر والوں سے بھی شرم کرنے لگتا ہے اور اس سے بہت سی ایسی قباحتیں دور ہو جاتی ہیں جو بیرونی دنیا کی نظروں سے چھپ کر گھر کی چہار دیواری کے پردے میں ظاہر ہوتی ہیں۔ لیکن سب سے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ آدمی کو اپنے آپ سے بھی شرم آنے لگے یا بہ الفاظِ دیگر وہ خدا سے شرم کرنے لگے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں وہ اپنے آپ کو بدکرداریوں سے ہی نہیں بلکہ بدگمانیوں سے بچائے گا اور حتی المقدور اپنے دل میں کسی قسم کا ناپاک اور شرمناک خیال تک نہ گزرنے دے گا۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو کسی خلوت کدے میں بھی تنہا نہ پائے گا اور اسے دل کے مخفی پردوں اور دماغ کے تاریک گوشوں میں بھی گناہ کی تصویر کو پناہ دینے کی جسارت نہ ہوگی اسی لیے ارشادِ نبوی ہے کہ: (مشکوٰۃ ص ۴۶۸)

خُلُقُ الْاِسْلَامِ الْحَیَاءُ۔ — اسلام کی خاص خصلت حیا ہے۔

جناب سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کی ذات بابرکات یوں تو تمام صفاتِ جمیلہ کی بہترین مثال ہے۔ اس لیے آپ میں حیا کا بھی علیٰ وجہ الکمال پایا جانا کچھ عجیب بات نہیں ہے۔ لیکن تعجب تو یہ دیکھ کر ہوتا ہے کہ آپ نے کس زمانے میں کس قسم کے لوگوں کے سامنے حیا اور غیرت کا کیسا اعلیٰ درجے کا نمونہ پیش کیا۔ کہنے کو تو عرب اپنے آپ کو بڑا ناک والا کہتے تھے مگر حالت یہ تھی کہ برہنگی ان کے لیے کچھ باعثِ شرم نہ تھی بلکہ حج میں تو ننگے ہی ہو کر طواف کرتے تھے۔ پھر بھلا جہاں سترِ غلیظ تک چھپانے کی پروا نہ ہو وہاں شرم و غیرت کیا ہوگی! خدا کی شان ہے کہ انہی لوگوں میں آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے، اور آپ کی حیا کی یہ حالت تھی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ انھوں نے بھی آپ کو کبھی برہنہ نہیں دیکھا۔ (شمائل ترمذی ص ۲۸)

ابو سعید خدری کا بیان ہے کہ "آنجناب شریف پردہ نشیں کنواری لڑکی سے بھی زیادہ حیادار تھے۔ اور جب کوئی بات آپ کو ناپسند ہوتی تھی تو ہم لوگ فوراً آپ کے چہرے سے سمجھ جاتے تھے۔ اگر آپ کو کسی کی بات اچھی نہ معلوم ہوتی تو اُسے اشارے کنائے سے آگاہ فرما دیتے تھے تاکہ وہ خفیف نہ ہو۔" (بخاری ص ۹۰۱ و شفا ص ۵۲)

لیکن یہ رعایت فقط انہی باتوں میں تھی جو آپ کو ذاتی طور پر ناپسند ہوتی تھیں ورنہ احکامِ الٰہی میں پہلو تہی کرنے والے کو آپ کبھی یُوں طرح نہیں دیتے تھے اور اعلاءِ کلمۃ الحق میں آپ کی آواز کسی وجہ سے پست نہیں ہوتی تھی۔ اور حقیقت میں اگر ایسا ہوتا تو وہ حیا کا غلط استعمال ہوتا۔ مگر اس عین صداقت اور محض خیر صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی بات میں بھی حدِ اعتدال سے تجاوز کیونکر ہو سکتا تھا وہاں تو غلطی کا امکان ہی نہ تھا۔

چنانچہ ایک دن کا واقعہ ہے کہ ایک شخص خدمت بابرکت میں حاضر ہوا جس پر زعفران یا کسی ایسی ہی چیز کی زردی کا نشان تھا۔ اگرچہ آپ اپنی امت میں اس قسم کے زنانہ پن کے بناؤ سنگار پسند نہ فرماتے تھے۔ لیکن آپ نے اس شخص سے کچھ نہیں کہا۔ البتہ جب وہ چلا گیا تو اور حاضرینِ مجلس سے فرمایا کہ "اگر تم اس سے اس کے دھوڈالنے کے لیے کہتے تو اچھا ہوتا۔" (ابو داؤد ص ۵۰۶ و شمائل ترمذی ص ۲۷)

حقیقت یہ ہے کہ آپ کی حیا اتنی اعلیٰ درجے کی تھی کہ آپ کسی کو نادم و شرمسار ہوتے ہوئے دیکھنے سے بھی شرم کرتے تھے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ "جب آپ کو کسی کی کوئی ناپسندیدہ بات معلوم ہوتی تو آپ اس کا نام لے کر بالتخصیص کچھ نہیں فرماتے تھے بلکہ یُوں کہہ دیتے تھے کہ 'وہ کیسے آدمی ہیں جو ایسی باتیں کرتے ہیں'۔" (شفا ص ۵۲) یوں اس کو اشارۃً تنبیہ بھی ہو جاتی تھی اور وہ اور لوگوں کے سامنے خجل اور خفیف بھی نہیں ہوتا تھا اور بہت سے آدمیوں کو اس حرکت کی قباحت بھی معلوم ہو جاتی تھی۔

یہ آپ کی شدتِ غیرت اور فرطِ حیا ہی کی وجہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کو کلام مجید میں آپ کی طرف سے لوگوں کو یہ آدابِ ملاقات سکھانے کی ضرورت پڑی کہ جب کوئی کسی کے ہاں ملنے جائے تو یہ جائز نہیں کہ وہاں بیٹھ کر اور لوگوں سے اِدھر اُدھر کی گپ لگانے لگے۔ اور یوں صاحبِ خانہ کی تکلیف اور کوفت کا باعث ہو۔ آپ کے اصحاب حاضرِ خدمت ہوتے تو وہاں آپس میں دیر تک باتیں کرتے رہتے۔ اور جناب رسالت مآب اپنی تکلیف کو ان کی دل شکنی پر ترجیح دیتے مگر ان سے کچھ نہ فرماتے تھے۔ اس پر ارشادِ باری ہوا کہ:

اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيِي مِنْكُمْ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ ط (احزاب - ع ۷)	بیشک تمھاری اس بات سے پیغمبر کو تکلیف ہوتی ہے اور وہ تم سے شرم کرتے ہیں، اور اللہ کو سچ بات کہنے میں کسی کا کچھ لحاظ نہیں ہے۔

مگر یہ امر یہاں بھی قابلِ لحاظ ہے کہ آپ صرف اپنی ذاتی تکالیف و مکروہات کو ہی اس خموشی سے گوارا فرما لیتے تھے اور اس کے اظہار میں شرم کرتے تھے۔ لیکن کسی صداقت مذہبی کے اعلان اور فرمانِ خداوندی کی تعمیل میں ہرگز ذاتیات آپ کے لیے مانع نہیں ہوتی تھیں۔ اور یہی حیا کا سچا اور صحیح استعمال ہے۔ اللہ سب کو اس کی توفیق دے۔

وقار و متانت

مقتضائے قیاس یہ ہے کہ جو شخص اس قدر حلیم اور شفیق، اتنا رفیق القلب اور منکسر المزاج لوگوں کے دلوں سے اس کا عظمت و وقار کم ہو جائے اور اس کا رعب و داب قایم نہ رہے۔ مگر خدا نے اپنی قدرت سے جناب سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کو کچھ ایسا مزاج عطا فرمایا تھا کہ ان تمام باتوں کے باوجود بھی جو رُعب کا اثر ان پر تھا وہ شاہانِ عالی وقار کو بھی نصیب نہ ہو گا حالانکہ آپ کسی کو کچھ نہیں کہتے تھے۔ ہر ایک سے بے انتہا نرمی اور محبت سے پیش آتے تھے اور آپ کے صحابہ بھی آپ کے پسینہ کی جگہ اپنا خون بہانے کو سعادتِ دارین سمجھتے تھے۔ مگر خدا نے آپ کی سادہ اور بے تصنع وضع کو اپنے جمال و جلال کا مظہر بنایا تھا۔

خارجہ بن زید انصاری کہتے ہیں کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نہایت ہی باوقار تھے اور مجلس میں کبھی آپ سے کوئی بیجا حرکت سرزد نہیں ہوتی تھی۔ (شفا ص ۶۱)

آپ بیشتر اوقات خاموش رہتے تھے، بلا ضرورت بات نہیں کرتے تھے۔ اگر کوئی شخص کوئی نازیبا بات کرتا تھا تو اس سے اعراض فرماتے تھے۔ آپ کا کلام صاف اور واضح ہوتا تھا، نہ اتنا طویل کہ اس میں کوئی بات فضول اور زاید از ضرورت ہو نہ اتنا مختصر کہ کوئی کام کی بات رہ جائے یا سمجھ میں نہ آئے۔ آپ قہقہہ مار کر اس طرح نہیں ہنستے تھے کہ دندان مبارک کھل جائیں۔ بلکہ تبسم فرماتے تھے اور آپ کے اصحاب بھی آپ کی توقیر و تعظیم اور صفاتِ نبویہ کی تتبع کی وجہ سے زور سے نہیں ہنستے تھے۔ آپ کی مجلس میں حلم اور امانت اور حیا اور نیکی کی گفتگو ہوتی تھی۔ لوگ آپ کے سامنے بلند آواز سے باتیں نہیں کرتے تھے۔ اور وہاں کسی قسم کی نازیبا اور ناپسندیدہ گفتگو نہیں کی جاتی تھی۔ جب آپ کلام فرماتے تھے تو سب اہلِ مجلس ادب سے سر جھکا لیتے تھے اور بالکل سکوت ہو جاتا تھا۔ آپ نہایت صحت اور وضاحت سے گفتگو کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ "آپ اس قدر صاف تکلم فرماتے تھے کہ اگر کوئی گننے والا گننا چاہتا تو ایک ایک حرف الگ الگ گن لیتا۔" (مشکوٰۃ ص ۴۴۲)

اسی طرح آپ کی چال نہایت معتدل اور متوسط قسم کی تھی۔ نہ تو آپ بہت تیز چلتے تھے کہ ساتھ والوں پر گراں ہو نہ اس قدر آہستہ چلتے تھے کہ اس سے تکان اور سستی مترشح ہو۔ غرض اعتدال اور میانہ روی آپ کی ہر ایک بات سے ہویدا تھی۔ ابو مسعودؓ سے روایت ہے کہ فتح مکہ کے دن ایک شخص نے حاضرِ خدمت ہو کر کچھ عرض کرنا چاہا مگر رعبِ نبوی سے اس کے بدن میں لرزہ پڑ گیا۔

آپ نے فرمایا "گھبراؤ مت، اطمینان سے بات کہو، میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں، بلکہ میں بھی قریش کی ایک عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت کھایا کرتی تھی۔" (شفا، ص ۵۹)

صلح حدیبیہ کی شرائط کے طے ہونے سے پہلے قریش کا ایک سردار عروہ ابن مسعود اہلِ مکہ کا سفیر بن کر جناب سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اثنائے گفتگو میں اس نے آپ کی ریش مبارک کو ہاتھ لگانا چاہا (جیسے کہ بعض آدمیوں کی عادت ہوتی ہے)۔ مغیرہ ابن شعبہؓ آپ کے پیچھے کھڑے ہوئے تھے۔ تو جب عروہ کا ہاتھ ریش مبارک کی طرف بڑھتا تھا وہ تلوار کی کوتھی سے اسے ہٹا دیتے تھے۔ اور کہتے تھے "جناب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ریش مبارک سے اپنا ہاتھ ہٹا لے۔" بہرحال جب وہ وہاں سے اپنے لشکر میں واپس گیا تو اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا "اے قوم! واللہ میں نے بڑے بڑے بادشاہوں کے دربار دیکھے ہیں اور میں قیصر اور کسریٰ اور نجاشی کے پاس سفیر بن کر گیا ہوں۔ مگر خدا جانتا ہے کہ میں نے کسی بادشاہ کو نہیں دیکھا کہ اس کے اصحاب اس کی اتنی تعظیم کرتے ہوں جیسے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اصحاب ان کی عزت اور ادب کرتے ہیں۔ واللہ اگر وہ تھوکتے بھی ہیں تو زمین پر گرنے نہیں پاتا۔ اور لوگ اسے ہاتھوں ہاتھ لے کر منہ اور جسم پر مل لیتے ہیں۔ اور جب وہ وضو کرتے ہیں تو ان کے وضو کے گرے ہوئے پانی کے لیے جان دیتے ہیں۔ اور جب وہ کوئی حکم دیتے ہیں تو وہ تعمیلِ ارشاد کے لیے دوڑتے ہیں۔ اور جب وہ بات کرتے ہیں تو ان کے سب پاس بیٹھنے والوں کی آوازیں دھیمی ہو جاتی ہیں اور فرطِ تعظیم و تکریم سے ان کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے اور کبھی ان سے آنکھ نہیں ملاتے۔ انھوں نے تم کو امن کا پیام بھیجا ہے تو تم کو چاہیے کہ اسے قبول کر لو۔" (بخاری ص ۳۷۸ و ۳۷۹)

سُبحان اللہ! یہ شانِ نبوت تھی شانِ حکومت نہ تھی۔ یہ بات کسی کو کہاں نصیب ہو سکتی ہے۔ لیکن ہمارا فرض ہے کہ ہم بھی اپنے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی طرزِ عمل کی تقلید میں وہ طریقہ اختیار کریں جس سے ہمارے ملنے جلنے والوں میں ہماری عزت اور لحاظ باقی رہے کیونکہ اس سے بھی آدمی اکثر برائیوں سے بچ جاتا ہے۔

زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی

انسانی طبیعت میں طیبت و ظرافت کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کھانے میں نمک۔ اس کی بھی بڑی خوبی یہی ہے کہ انداز سے ہو ورنہ اگر نمک کی طرح زیادہ ہو گئی تو متانت، سنجیدگی اور بہت سی اخلاقی خوبیوں کو مٹا کر آدمی کو نکما اور بیکار کر دے گی۔ اور اگر کم ہوئی تو زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی نہ ہوگی۔ اور زندگی بالکل پھیکی اور بے لطف رہے گی۔ دُنیا میں ظریفوں کی تو کمی نہیں ہے مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ متانت اور سنجیدگی بھی ہو اور شگفتہ مزاجی بھی ہو۔ اور بالخصوص بزرگانِ ملّت و مقتدیانِ مذہب تو اپنی شان کو خوش طبعی اور مذاق سے بہت ارفع سمجھتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ایک حد تک ان کا ایسا سمجھنا بجا بھی ہے۔ کیونکہ جو دل و دماغ موت و زیست کے مسائل اور دنیا و عقبیٰ کے مباحث پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں ان کو ہنسی دل لگی کا بہت کم موقع ملتا ہے اور رفتہ رفتہ ان کی طبیعت خود ہی ان باتوں سے اُچاٹ ہو جاتی ہے۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے: ؎

خبر ز زندہ دلی نیست اہلِ مدرسہ را
کہ دل بسانِ مگس در کتاب می میرد

پس اگر مزاج میں کامل اعتدال ہو تو البتہ یہ ممکن ہے کہ طبیعت میں تفکر و تدبر بھی ہو اور شگفتگی بھی باقی رہے۔ لیکن ایسے مزاج النادر کالمعدوم ہیں۔

جناب سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کو اللہ نے ایسا ہی مزاج عطا فرمایا تھا۔ آپؐ میں اس قدر متانت اور سنجیدگی اور بزرگی کے ساتھ زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی بھی اعلیٰ درجہ کی تھی اور باوجودیکہ آپؐ کا عرفانِ الٰہی میں ڈوبا ہوا قلبِ مطہر کسی وقت دم بھر کے لیے بھی صانعِ ازل کے آثارِ قدرت پر غور و خوض سے غافل نہ ہوتا تھا۔ پھر بھی آپ محض زاہدِ خشک ہرگز نہ تھے۔ چہرہ مبارک ہر وقت بشاش رہتا تھا اور آپ ہر شخص سے نہایت خندہ روئی سے ملتے تھے۔ چنانچہ جریر بن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ "میں جب سے اسلام لایا آپ نے مجھے اپنے ہاں آنے سے منع نہیں فرمایا۔ اور آپ جب مجھے دیکھتے تھے مسکرانے لگتے تھے۔ (شمائل ترمذی ص ۱۷)

بسا اوقات چھوٹے چھوٹے بچے آپ کے پاس آجاتے تھے اور آپ ان سے کھیلا کرتے تھے اور ان کو کھلایا کرتے تھے، کبھی آپ ان سے خوش طبعی کی باتیں بھی کرتے تھے۔ چنانچہ بعض مرتبہ آپ محبت اور مزاح سے انسؓ کو "ذو الاُذنین" (دو کانوں والا) کہہ کر خطاب فرماتے تھے۔ (شمائل ترمذی ص ۱۸)

اسی طرح ایک مرتبہ حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما میں کسی بات پر کچھ شکر رنجی ہوگئی، حضرت علیؓ مسجد میں جاکر سو رہے۔ اتفاق سے آپؐ ان کے ہاں تشریف لائے اور یہ قصہ سن کر مسجد میں گئے اور وہاں آپؐ نے حضرت علیؓ کو اٹھایا چونکہ وہ اس وقت فرشِ زمین پر لیٹے ہوئے تھے اور کچھ مٹی بھی جسم سے لگ گئی تھی اس لیے آپؐ نے ان کو "ابو تراب" کا نام دے دیا۔ اس دن سے یہ کنیت ایسی مقبول ہوئی کہ گویا اس کے سوا حضرت علیؓ کی اور کوئی کنیت ہی نہیں رہی۔ (بخاری ص ۹۲۹)

ایک مرتبہ آپؐ نے کسی کو ایک اونٹ دینے کا وعدہ کیا، جب وہ آیا تو آپؐ نے فرمایا کہ "میں تجھے اونٹنی کا بچہ دیتا ہوں" اس پر وہ بگڑا اور اس نے کہا "میں اونٹنی کا بچہ کیا کروں گا!" آپؐ نے فرمایا "اونٹ اونٹنی کے بچے نہیں ہوتے تو کیا ہوتے ہیں!" وہ شخص آپؐ کا مطلب غلط سمجھا تھا آپؐ نے یونہی ہنسی سے اونٹ کہنے کے بجائے اونٹنی کا بچہ کہہ دیا تھا۔ اس نے یہ خیال کیا کہ شاید آپؐ نے چھوٹے کم عمر بچے کے لیے حکم دیا ہے۔ (شمائل ترمذی ص ۱۸)

اسی طرح ایک دفعہ ایک بوڑھی عورت اُمِّ زبیر خدمتِ بابرکت میں آئیں اور آپ سے کہا کہ "یا رسول اللہ! میرے لیے دعا کیجئے کہ اللہ مجھے جنت میں جگہ دے۔" آپؐ نے فرمایا "اے اُمِّ زبیر! بوڑھی عورتیں جنت میں نہیں جائیں گی۔" یہ دل شکن جواب سن کر وہ بے چاری بہت مایوس ہوئیں اور انھوں نے پوچھا کہ "کیوں بوڑھی عورتوں نے کیا کیا ہے کہ وہ جنت میں نہیں جائیں گی؟" آپؐ نے فرمایا "تم نے قرآن میں پڑھا نہیں کہ اللہ تعالیٰ جنت والیوں کو نوجوان اور دوشیزہ پیدا کرے گا تو پھر بوڑھیاں وہاں کیسے جاسکتی ہیں۔" آپؐ کا مطلب یہ تھا کہ ان کا بڑھاپا باقی نہ رہے گا، اس لیے ان کو اس حالت کے لحاظ سے بوڑھی کہنا درست نہیں ہے۔ آپؐ نے بطورِ خوش طبعی اُمِّ زبیر سے اس طرح فرمایا کہ ان کو آپؐ کا مطلب سمجھنے میں مغالطہ ہوا حالانکہ آپ نے

جو کچھ فرمایا تھا وہ بالکل درست تھا۔ (شمائل ترمذی ص ۱۸)

مگر ان واقعات سے آپ کی شگفتہ مزاجی کے علاوہ آپ کی راست گفتاری کا اندازہ ہوسکتا ہے کہ آپ ہنسی سے بھی غلط بیانی نہیں فرماتے تھے۔ چنانچہ ایک بار لوگوں نے آپؐ سے کہا "یا رسولؐ اللہ! آپ ہم سے مزاح فرماتے ہیں۔" یہ بات ان لوگوں کو آپؐ سے عجیب معلوم ہوتی تھی۔ آپؐ نے اس کے جواب میں فرمایا: "ہاں مگر میں کبھی حق اور صدق کے سوا کچھ نہیں کہتا۔ (شمائل ترمذی ص ۱۸) آپؐ نے متبعین کو سچ کی اتنی تاکید فرمائی ہے کہ مزاح میں بھی جھوٹ بولنے کو منع کیا۔

آپؐ لوگوں کو کھیلنے کودنے اور خوشی منانے سے بھی منع نہیں فرماتے تھے کیونکہ آپ کو اللہ نے بالکل ٹھیک طور پر بتا دیا تھا کہ فی الحقیقت انسان کے لیے کون سی بات مضر ہے اور کون سی نہیں۔ اور آپ کو معلوم تھا کہ نیکی اور پارسائی، زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی کے بھی منافی نہیں ہے۔ اور انبساطِ روح کے لیے کسی قدر تفریح بھی ضروری ہے۔ بلکہ اسی وجہ سے کبھی کبھی آپ خود بھی اس میں شریک ہوجاتے تھے۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہتی ہیں کہ ایک مرتبہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں تشریف رکھتے تھے کہ اتنے میں حضرت ابوبکرؓ آگئے۔ وہ عید کا دن تھا اور دو لڑکیاں وہی گیت گا رہی تھیں جو انصار نے جنگِ بعاث کے دن جوڑا تھا (یہ لڑائی ہجرت سے تین سال قبل اوس اور خزرج میں ہوئی تھی) ابوبکرؓ نے ان کو دیکھ کر کہا کہ "یہ شیطان کے باجے ہیں۔" مگر آپؐ نے کچھ خیال نہ فرمایا، تو انھوں نے دوبارہ یہی کہا۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: "اے ابوبکر! ان کو گانے دو، کچھ مت کہو، ہر قوم کا کوئی خوشی کا دن ہوتا ہے، اور آج کا دن ہمارے لیے عید ہے۔" (بخاری ص ۵۵۹)

ایسے ہی بریدہ سے روایت ہے کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کسی لڑائی پر تشریف لے گئے تھے۔ جب آپ واپس آگئے تو ایک حبشی لونڈی آئی، اس نے کہا "یا رسولؐ اللہ! میں نے نذر مانی تھی کہ جب آپ بخیریت واپس آئیں گے تو میں آپ کے سامنے گاؤں گی اور دف (ڈھول) بجاؤں گی۔" آپؐ نے فرمایا: "اگر تو نے یہ نذر مانی تھی تو اچھا گا اور بجا ورنہ نہیں۔" اس نے گانا بجانا شروع کیا۔ اس اثنا میں حضرت ابوبکر، حضرت علی اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم آئے، مگر وہ گاتی بجاتی رہی۔ مگر جب حضرت عمرؓ آئے تو وہ ڈر کے مارے جھٹ چپ ہوگئی اور دف پر بیٹھ گئی۔ (مشکوٰۃ ص ۴۷۶)

حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں کہ "ایک دن جناب رسالت مآبؐ تشریف فرما تھے کہ ہم نے باہر سے بچوں کی آواز سنی، آپؐ نے اٹھ کر دیکھا کہ ایک حبشن ناچ گا رہی تھی اور بچے آس پاس کھڑے تھے۔ آپؐ نے مجھ سے بھی کہا "عائشہ! آ تماشہ دیکھ۔" چنانچہ میں آئی اور آپؐ کے دوش مبارک پر ٹھڈی رکھ کر کھڑی ہوگئی اور آپؐ کی آڑ میں سے دیکھتی رہی، آپؐ نے مجھ سے کئی بار پوچھا کہ "اچھی طرح دل بھر کر دیکھ لیا یا نہیں؟" میں نے کہا "نہیں۔ بات یہ تھی کہ میں تماشے سے زیادہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ آپؐ کے دل میں میرا خیال اور محبت کس قدر ہے۔" اتنے میں حضرت عمرؓ آگئے تو سب لوگ منتشر ہوگئے۔ (ترمذی ص ۵۲۹)

آپ اعدا کی آزار رسانی اور تکلیف دہی کو بھی اسی شگفتہ مزاجی سے برداشت کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپؐ نے فرمایا کہ "دیکھو اللہ نے مجھے قریش کی گالیوں اور کوسنے سے کیسا بچایا ہے، وہ لوگ مجھے مُذَمَّم (یعنی برا، قابلِ مذمت) کہہ کر بد دعائیں دیتے ہیں، حالانکہ میں مُحَمَّد (اچھا اور قابلِ تعریف) ہوں۔" (مشکوٰۃ) یعنی جب وہ مذمم کو کوستے ہیں

تو جو مذمّم ہوگا اسی کو وہ کوسنا لگتا ہوگا اور وہی اُن کی گالیوں کا بُرا مانتا ہوگا۔ ہم مذمّم ہیں ہی نہیں ہم تو محمد ہیں۔ یوں اللہ ہم کو ان کی بدزبانیوں سے محفوظ رکھتا ہے اور اگر وہ ہم کو محمدؐ سمجھ لیں تو پھر بُرا ہی کیوں کہیں۔

ان مثالوں سے جہاں آپؐ کی شگفتہ مزاجی معلوم ہوتی ہے وہیں اس میں آپ کے اعتدال اور میانہ روی کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور ہم کو یہ سبق بھی ملتا ہے کہ ہم کو آپس میں کیسے تعلقات رکھنے چاہئیں۔ اور اگر ایک دوسرے سے مذاق کریں تو کس حد تک۔ اگر ہر وقت مُنہ پھُلائے رکھنا اچھا نہیں تو یقیناً ہر وقت کی دل لگی بھی مناسب نہیں۔ آدمی کو نہ ایسا ہونا چاہیے کہ "افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را" کا مصداق ہو اور نہ ایسا کہ لوگ اس کی ہروقت کی چھیڑخانی اور ہنسی مذاق سے تنگ آجائیں۔ چنانچہ آپؐ نے فرمایا ہے کہ خبردار! بہت ہنسنے سے پرہیز کرو، کیونکہ اس سے دل مرجاتا ہے اور چہرے کا نور جاتا رہتا ہے۔" (مشکوٰۃ ص ۲۵۳)

ایک اور حدیث ہے کہ "افسوس اس شخص پر جو لوگوں کو ہنسانے کے لیے جھُوٹی باتیں بناتا ہے۔" (مشکوٰۃ ص ۳۵۲)

اتباعِ سنّت اور ہم

مسلمانوں کو شروع سے اس بات پر ناز رہا ہے کہ جس سچّی محبت اور دلی عقیدت سے اُنھوں نے اپنے مخبرِ صادق جناب سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کے حالات و روایات کو محفوظ رکھا ہے اور جس احتیاط و التزام سے وہ آپؐ کی احادیث و سُنن پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی نظیر دُنیا کی کسی قوم اور کسی مذہب میں نہیں مل سکتی۔ بلاشبہ ان کا یہ ناز بجا اور یہ فخر زیبا ہے۔ اب اس گئے گزرے زمانے میں بھی باوجودیکہ الحاد وارتداد کا اس قدر زور ہے تاہم غالباً دنیا کے پردے پر کوئی ایسا مسلمان نہ ہوگا جس کے دل و دماغ کے کسی نہ کسی کونے میں آں جنابؐ کی محبت اور عظمت کا کچھ مٹا مٹایا نشان باقی نہ رہا ہو اور اگر خدانخواستہ کوئی ایسا شخص ہو تو اس کے تمام ادعائے اسلام کے باوجود بھی اسے قطعاً مسلمان نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ عقیدۂ توحید کے بعد جو فی الجملہ اور اقوامِ عالم میں بھی کسی نہ کسی صورت میں پایا ہی جاتا ہے۔ مسلمانوں کا مایۂ ناز و نشانِ امتیاز صرف محبتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی ہے۔ اور اگر یہ نہیں تو یقیناً کچھ بھی نہیں۔ اور اس کے سامنے مذہب کا نام لینا ہی فضول ہے۔ بہرکیف یہی محبت اتباعِ سنّت کی سب سے بڑی محرک ہے، اور اتباعِ سنّت ہی اس محبت کی سب سے بہتر علامت ہے کیونکہ اگر محبوب کی ہر ایک ادا محبوب نہیں ہے تو محبت کا دعویٰ جھوٹا اور غلط ہے۔ مجنوں اپنی لیلیٰ کی مشابہت کی وجہ سے آہوانِ صحرا پر قربان ہوتا ہے اور اُس کی ادنیٰ ملابست کے سبب سے سگِ لیلیٰ کو چومتا ہے اور یہی اُس کے مجنونِ محبت اور مفتونِ اُلفت ہونے کا ثبوت ہے۔ اس لیے اگر اتباعِ سنّت کی غایت و غرض صرف اثباتِ محبت ہی ہوتب بھی حضور سرورِ کائنات خلاصۂ موجودات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کی ہر ایک بات واجبِ تقلید ہے۔ لیکن ہم کو تو اس کی بدولت اس سے بھی زیادہ حوصلہ افزا امیدیں ہیں ہم کو تو یقین واثق ہے کہ اگر ہم کو اللہ اس کی توفیق دے تو ہم محبِ رسول ہو کر محبوبِ خدا بن جائیں، کیونکہ وعدۂ صادقہ ہے کہ:

اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ۔

اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تمھیں محبت کرے گا اور تمھارے گناہ بخش دے گا۔

اب یہاں یہ دیکھنا چاہیے کہ اتباعِ سنّت کے کیا معنیٰ ہیں۔ مگر معاف کیجئے قطع کلام ہوتا ہے مجھے یہیں یہ جملہ معترضہ بھی کہہ دینا چاہیے کہ میرا روئے سخن صرف انہی اصحاب کی طرف ہے جن کے دل میں کچھ مذہبی حمیت اور اسلام کی محبت باقی ہے۔ اور یہاں میرا خطاب ان لوگوں سے نہیں ہے جو سرے سے مذہب کو ضعیف الاعتقادی اور وہم پرستی کا مرادف اور اخلاق اور نیکی کو حفظ نفس اور نفع ذات کا ہم معنی سمجھتے ہیں۔ کیونکہ جہاں فرائض کی فرضیت سے ہی انکار ہو وہاں اتباعِ سنن کب مستحب ہو سکتا ہے، اس لیے میں ان سے قطع نظر کرتا ہوں۔

ہاں تو اب یہاں یہ دیکھنا ہے کہ اتباعِ سنّت کے کیا معنی ہیں، میرے خیال میں اس کے معنی تو صاف ہیں اور ان کے سمجھنے میں تو کچھ دقت نہیں ہوئی۔ البتہ چونکہ اس پر عمل کرنا ذرا آسان نہ تھا۔ اس لیے اس میں تساہل و تغافل سے کام لیا گیا۔ بلاشبہ بالعموم مسلمان بہت سی باتوں میں سنّتِ نبوی پر چلتے ہیں یا کم سے کم چلتے تھے، جب تک کہ انھوں نے ایمان کو نفاق کے عوض اور اخلاص کو ریا کے بدلے نہیں دیا تھا لیکن کیا سنّت نبوی کی پیروی فقط یہی ہے کہ تحیۃ نماز کے ساتھ دو چار رکعتیں اور پڑھ لی جائیں۔ کیونکہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معمول رہا ہے یا یہ کہ لبیں ترشوا لی جائیں یا پائنچوں کو ٹخنوں سے اونچا رکھا جائے یا دوپہر کو قیلولہ کیا جائے، کیونکہ یہ حضور سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کی وضع تھی بلاشبہ یہ باتیں بھی اچھی ہیں کیونکہ آنجناب کی تقلید جس قدر چھوٹی سے چھوٹی اور جزوی سے جزوی بات میں بھی، ہو سکے عین سعادت ہے۔ مگر دنیا میں ہمیشہ پھول پتوں سے پہلے جڑ اور تنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور عمارت سے پہلے اس کے نقش و نگار کا وجود ممکن نہیں ہوتا۔ فرع اور اصل کا جو تعلق ان باتوں میں ہے وہی مذہب میں بھی ہے۔ اور اتباعِ سنن بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ محض ظاہری وضع و صورت میں آنجنابؐ کی تقلید کرنا اور اخلاقِ حسنہ اور خصائلِ جمیلہ میں آپ کا اتباع نہ کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے جڑ کے بغیر پھول یا مکان کے بغیر نقش و نگار کا خیال کیا جائے۔

انسان کے نقطۂ خیال سے اشیائے عالم کے مفید ہونے کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو یہ کہ اشیا خود ہی مقصود بالذات ہوں جیسے غلہ کہ آدمی کو ہر حال میں اس کی ضرورت رہتی ہے۔ یا یہ کہ وہ اگرچہ بذاتِ خود تو کچھ مفید اور کارآمد نہ ہوں۔ لیکن اشیاءِ مرغوبہ کے حصول کا واسطہ اور ذریعہ بن سکتی ہوں، جیسے روپیہ کہ وہ بذاتِ خود محض بیکار چیز ہے۔ مگر چونکہ اس سے ضروری چیزیں حاصل کی جا سکتی ہیں اس لیے وہ بھی ضروری سمجھا جانے لگا۔ انسان کی ساری کوششیں بہرحال انہیں دونوں قسموں کے حصول پر مصروف رہتی ہیں۔ اور اس کی تمام تگ و دو انہی کے دائرے میں محدود ہوتی ہے۔ بعینہٖ یہی حال نیکی کا بھی ہے۔ بعض نیکیاں تو مقصود بالذات ہیں جیسے سچائی، انصاف، شفقت، اطاعت وغیرہ اور بعض ان کے حصول کا ذریعہ اور وسیلہ جیسے قیام و قعود یا روزہ میں ترکِ آب و دانہ وغیرہ غرض ہم تعمیم کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اخلاقی خوبیاں مقصود بالذات ہیں اور مذہبی عبادتیں ان کے حاصل کرنے کا طریقہ اور واسطہ۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ان عبادات ظاہری کی ضرورت اور فرضیت میں کچھ کمی ہو جاتی ہے۔ ہرگز نہیں۔ غالباً اس سے کسی کو انکار نہ ہو کہ فی نفسہٖ روپیہ بالکل نکمی چیز ہے کیونکہ آدمی خود اسے نہ کھا سکتا ہے نہ پہن سکتا ہے نہ وہ کسی درد کی دوا ہے نہ کسی مرض کا علاج۔ لیکن کیا اس سے اس کی قیمت یا حاجت کچھ کم بھی ہو جاتی ہے۔ حقیقت میں عبادتوں کی معقولیت کا مطلب یہ ہے کہ ان کا کوئی نمایاں اور عملی فائدہ ہو۔ اور خواہ اور مذاہب نے ان کی اس حقیقت کو سمجھا ہو یا نہیں۔ اسلام نے تو بالکل صاف طور پر اس کا اعلان

کر دیا ہے۔ چنانچہ نماز کا جہاں حکم دیا ہے وہیں اس کی غایت اور غرض بھی بتا دی ہے کہ :

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ۔ (عنکبوت ع ۵)	بے شک نماز ناپسندیدہ اور مکروہ باتوں سے روکتی ہے اور البتہ اللہ کا یاد کرنا زیادہ بڑی بات ہے۔

احادیثِ نبوی سے اس فرمان کی اور بھی زیادہ وضاحت اور صراحت ہوگئی ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں یہ ارشاد خاص طور پر قابلِ غور ہیں :

مَنْ لَّمْ تَنْھَہٗ صَلٰوتُہٗ عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ لَمْ یَزْدَدْ مِنَ اللّٰہِ اِلَّا بُعْدًا۔ (احیاء العلوم ص ۱۴۲ جزو اول)	جس شخص کو اس کی نماز نے ناپسندیدہ اور مکروہ باتوں سے نہ روکا اس نے اُسے اللہ سے اور بھی زیادہ دُور کر دیا۔
کَمْ مِّنْ قَآئِمٍ حَظُّہٗ مِنْ صَلٰوتِہِ التَّعَبُ وَالنَّصَبُ۔ (احیاء العلوم ص ۱۴۳، جزو اول)	بہت سے ایسے قیام کرنے والے ہیں کہ ان کی نماز سے ان کو بجز کوفت اور تکلیف کے اور کچھ حاصل نہیں۔
لَیْسَ لِلْعَبْدِ مِنْ صَلٰوتِہٖ اِلَّا مَا عَقَلَ مِنْھَا۔ (احیاء العلوم ص ۱۴۳ جزو اول)	بندے کے لیے اس کی نماز میں سے وہی ہے جو اس نے سمجھ کر کیا (یعنی اگر بے سوچے سمجھے ادا کی تو اس سے کچھ نتیجہ نہیں)
اِنَّمَا الصَّلٰوۃُ تَمَسْکُنٌ وَّتَوَاضُعٌ وَّتَضَرُّعٌ وَّتَاَوُّہٌ وَّتَنَادُمٌ۔ (احیاء العلوم ص ۱۴۳ جزو اول)	بے شک نماز خاکساری اور تواضع اور گریہ وزاری اور شرمساری ہے۔

اسی طرح جہاں روزہ کی فرضیت کا ارشاد ہوا ہے وہیں یہ بھی کہہ دیا ہے کہ :

وَلِتُکْمِلُوا الْعِدَّۃَ وَلِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰکُمْ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ۔ (البقرہ ع ۲۳)	تاکہ تم گنتی کو پورا کرو اور اللہ نے جو سیدھا راستہ تم کو دکھایا ہے اس پر اس کی بزرگی بیان کرو اور شاید کہ تم اُس کے احسان پر شکر ادا کرو۔

اور جناب رسالتمآبؐ نے یہ فرما کر اُس حکم کو اور زیادہ صاف کر دیا ہے کہ :

مَنْ لَّمْ یَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِہٖ فَلَیْسَ لِلّٰہِ حَاجَۃٌ فِیْ اَنْ یَّدَعَ طَعَامَہٗ وَشَرَابَہٗ۔ (بخاری ص ۱۵۵)	جو شخص قولاً وفعلاً جھوٹ نہیں چھوڑتا اللہ کو اُس کے کھانا پینا چھوڑنے کی ضرورت نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جو نماز، روزہ مقصود بالذات ہیں وہ محض ارکانِ ظاہری میں محدود رہ ہی نہیں، بلکہ وہ ان تمام محاسنِ باطنی پر بھی حاوی ہیں جن پر تمام صفاتِ حمیدہ و اخلاقِ پسندیدہ کا انحصار رہا ہے۔

یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ان چیزوں کے مقصود بالذات ہونے کی نسبت ہم نے جو کچھ کہا ہے وہ نسبتی ہے۔ یعنی گو غلہ اگرچہ روپیہ کے مقابلہ میں مقصود بالذات ہے مگر حقیقت میں وہ بھی صرف غلہ ہونے کی وجہ سے مطلوب نہیں۔ بلکہ اس لیے مطلوب ہے کہ وہ مدارِ صحت ہے اور صحت بنائے حیات ہے۔ اور قیامِ حیات ہماری ساری جسمانی اور مادی کوشش اور کشمکش کا غایت الامال ہے۔ اس طرح اگرچہ اعمال و عبادات ظاہری کے مقابلہ میں اخلاقی نیکیاں مقصود بالذات ہیں۔ مگر خود ان کی ضرورت تزکیۂ نفس و تصفیۂ باطن کے لیے ہے، اور دل کی پاکیزگی اور نفس کی صفائی معرفتِ الٰہی اور تقربِ ربانی کی طرف رہبر ہے اور یہی ہماری تمام روحانی ترقی اور باطنی اصلاح کا معراجِ کمال ہے اور یہی وہ بے بہا انعام ہے جس کا اتباعِ سنت کے صلہ میں ہم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ اس لیے یہ ارشاد ہوا ہے کہ:

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ؕ (کہف ع ۱۲)

پس جو کوئی اپنے پروردگار سے ملنے کا آرزومند ہے اُسے چاہیے کہ وہ نیک کام کرے اور اپنے اللہ کی عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے۔

مگر غور کیجئے کہ کیا یہ انعام ہم کو کسی رسمی عبادت سے مل سکتا ہے، کیا اس سے کہ ہم کسی جسمانی ریاضت کے مستحق ہو سکتے ہیں، کیا اس اعلیٰ علیین تک ہم محض ظاہری اتباعِ سنت سے پہنچ سکتے ہیں۔ کیا یہ روحانی کمال سرسری نمائش اعمال کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ حاشا و کلا یہ کسی طرح ممکن نہیں، اس کے لیے اطمینانِ قلب کی ضرورت ہے۔ جو کامل اخلاقی اعتدال کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور کامل اعتدال کی بہترین مثال وہ ہے جس کا کچھ سرسری سا خاکہ ہم نے گزشتہ اوراق میں پیش کیا ہے۔ پس ہمارا نصب العین یہی ہے۔ اگر ہم سچے دل سے مذہب کو مانتے ہیں، اگر ہم خلوصِ نیت سے سنتِ نبویؐ پر چلنا چاہتے ہیں، یعنی بہ الفاظِ دیگر اگر ہم سچ مچ اپنے خدا سے ملنے کے آرزومند ہیں تو ہم کو اپنے آپ میں اخلاقی خوبیاں پیدا کرنی چاہئیں جو آپ کی ہر ایک بات میں مضمر تھیں اور جنھوں نے آپ کو بہترین مخلوقات بنا دیا تھا۔ یہ سچ ہے کہ ہم اس درجے تک کسی طرح بھی نہیں پہنچ سکتے۔ ہاں ہم مانتے ہیں کہ ذرہ آفتاب نہیں بن سکتا۔ پھر بھی جو ذرہ آفتاب کی ضو میں آتا ہے وہ آفتاب نہیں تو تارے کی طرح چمکنے ہی لگتا ہے۔ لیکن جو ذرہ آفتاب کی طرف رُخ ہی نہیں کرتا اس کو ازلی سیاہ روئی اور دائمی تیرہ بختی کے سوا اور کیا نصیب ہو سکتا ہے۔ غالب مرحوم نے خوب کہا ہے: ؎

گفتمش ذرّہ بہ خورشید رسد، گفت محال
گفتمش کوششِ من در طلبش، گفت رواست

بہرحال اس ظلمت پسند ذرّے کی سیاہ روئی تو اسی کے افعال کا نتیجہ ہے۔ مگر ظلم تو یہ ہے کہ وہ اپنی تیرہ بختی سے نورِ آفتابِ عالمتاب کو بدنام کرتا ہے۔ جس کا اس کو کچھ حق نہیں کیونکہ وہ خود اس سے روگرداں ہے۔ خیال کیجئے کہ کیا ہم جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر اس سے بڑا کوئی الزام لگا سکتے ہیں کہ ہم چند آسان اور سرسری سی باتیں لے کر تمام سنتِ نبوی کو انہی میں محدود سمجھیں اور صرف انہی کے اتباع کا التزام کر کے عملاً دنیا کو یہ دکھائیں کہ گویا جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری خوبیوں کا خلاصہ یہی ہیں۔

میرے خیال میں آپ کی شان میں اس سے بڑھ کر کوئی گستاخی اور بے ادبی نہیں ہوسکتی۔ میں یہ کہتا ہوں کہ اس سے اعمال ظاہری کا استخفاف مدِنظر نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی یہ تو بدیہی بات ہے کہ مذہبی حیثیت سے یہ اعمال جسمانی اور افعال ظاہری مقصود بالذات نہیں ہیں اور اگر اُن کی اصلی غایت وغرض سے قطع نظر کر لی جائے تو یقیناً وہ بے معنی اور مہمل ہوجاتے ہیں۔ سچ ہے: ؎

دلِ آگاہ می باید وگرنہ
گدا یک لحظہ بے نامِ خدا نیست

مولوی معنوی علیہ الرحمۃ نے اسی اصول کو اس پُرزور پیرایہ میں بیان کیا ہے: ؎

دل بدست آور کہ حجِ اکبر است — از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است
کعبہ بنگاہِ خلیل آزر است — دل گزرگاہِ جلیلِ اکبر است
کعبۂ کوراں ز آب و گل بود — کعبۂ روشن ضمیراں دل بود

انصاف شرط ہے۔ کیا اتباعِ سنّت یہی ہے کہ ہم خوان پر کھانا کھانے سے تو پرہیز کریں، کیونکہ آپ نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ لیکن اس بات کا کبھی بھولے سے بھی خیال نہ کریں کہ آپ کی غذا بالعموم کیا تھی، اور جو کچھ تھی وہ کس وجہ سے تھی۔ چمچے کے استعمال سے تو اتنا احتراز مگر کھانا لذیذ سے لذیذ اور پُرتکلف سے پُرتکلف حلق تک ٹھونس لینا اور اپنے غریب بھائیوں اور فاقہ زدہ ہمسایوں سے ایسی لاپروائی اور بے اعتنائی برتنا، گویا وہ آدمی ہی نہیں ہیں۔ کیا یہ سنّتِ نبوی کا مُنہ چڑانا نہیں ہے؟ اسی طرح اگر پائنچے ٹخنے سے ذرا نیچے ہوجائیں تو ان پر اتنا اعتراض ہو لیکن اس کے سوا اگر لباس کبر و نخوت کا سبب یا ریا و نمائش کا ذریعہ بن جائے تو کچھ نہیں۔ میرے خیال میں یہ صحیح طور پر سنّت کی پیروی نہیں ہے۔ بلاشبہ آپ کا طرزِ عمل یہی تھا۔ لیکن یقیناً یہ باتیں مقصود بالذات نہیں تھیں اس لیے دیکھنا یہ چاہیے کہ آپ ایسا کرتے کیوں تھے۔ اگر آپ اب تک نہیں سمجھے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو جناب سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کے محاسنِ اخلاق کا علم نہیں ہے۔ اور آپ نے اس کتاب کے گزشتہ باب نہیں پڑھے ہیں۔ اس لیے پھر ورق گردانی کیجئے اور دیکھیے کہ ان باتوں سے آپ کا مدعا کیا تھا، یہ کہ آپ کی طرح آپ کے متبعین میں بھی صبر و شکر، سخاوت و مروّت، ایثار و ہمدردی، جفاکشی و وفا شعاری کی صفات محمود پیدا ہوجائیں اور غرور و تکبّر، حسد و ہوس، خود نمائی اور خود پسندی، شکم پروری اور تن آسانی وغیرہ خصائل مذمومہ کا انسداد ہوسکے۔ اب اگر ہم میں وُہ باتیں ہیں اور یہ نہیں ہیں تو ہمارا جس طرح جی چاہے کھانا کھائیں اور کپڑا پہنیں۔ اصلی مقصود حاصل ہوگیا۔ اور اگر یہ نہیں ہے تو خوان اور چمچے کے ساتھ اگر ہاتھوں کا استعمال بھی ترک کردیں یا پائنچوں کو ٹخنوں سے کیا گھٹنوں سے بھی اوپر چڑھا لیں تب بھی نتیجہ ہیچ۔ اور اتباعِ سنّت معلوم ہاں البتہ اگر یہ اخلاقی خوبیاں حاصل کرنے کے بعد پھر بہ مزید ادب و احتیاط و بہ فرطِ محبت و عقیدت آپ کی اس وضع ظاہری کی بھی تقلید کی جائے، تو کیا کہنا، نورٌ علیٰ نور۔ تب یہ سچ مچ کا اتباع سنت ہو۔ خدا اس کی توفیق سب کو دے۔

یہی کیفیت نماز روزے کی بھی ہے۔ شاید مجھے یہ نہ کہنا چاہیے کہ نماز روزہ باوجود ایں شدّت تاکید مقصود بالذات نہیں ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمارا رسمی روزہ نماز اصل میں روزہ نماز ہے ہی نہیں۔ صوم و صلوٰۃ کی جو تعریف خدا اور رسولؐ نے فرمائی ہے

وہ اس پر منطبق ہی نہیں ہوتی۔ وہ تزکیۂ نفس وتصفیۂ باطن کا بہترین راستہ ہیں۔ اور اس میں قیام وقعود اور ترک آب ونان کے سوا اور کچھ بھی خوبی نہیں اس لیے وہ بلاشبہ مقصود بالذات ہیں۔ لیکن ان کے برخلاف ان کی یہ حالت ہے کہ بقول غالب مرحوم : ؎

تن پروری خلق فزوں شد زریاضت
جز گرمیِ افطار نہ دارد رمضاں ہیچ

کیا یہ مناسب ہے کہ ہم نماز پڑھیں مگر برائیوں سے باز نہ آئیں۔ روزے رکھیں مگر اس سے صبر و حلم کے بجائے حرص وہوس اور غصہ اور بدمزاجی پیدا ہو جائے حالانکہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہم کو یہ بتاتی ہے کہ ایک غیبت سے روزہ اور نماز اور وضو سب کچھ فاسد ہو جاتا ہے۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ اسلام کی مقرر کردہ عبادتیں انسان کو اس کے مقصدِ حیات تک پہنچانے کے لیے بہترین اور قریب ترین راستہ بتاتی ہیں۔ اس لیے ان سے اعراض کرنا نہایت ہی سخت غلطی اور بہت ہی بڑا گناہ ہے۔ لیکن بظاہر اس صراطِ مستقیم پر چلنا، مگر فی الواقع بدمستوں کی طرح وہیں پاؤں ٹپک ٹپک کر رہ جانا اور اپنے مقصودِ اصلی کی طرف ایک قدم بھی نہ بڑھانا اس سے بھی بڑا قصور اور اس سے بھی بدتر جرم ہے۔ لسان العصر اکبر نے خوب کہا ہے : ؎

وہ بھی گمراہ ہے جو خضر کا طالب نہ ہوا
وہ بھی ناداں ہے جو خضر کو منزل سمجھا

ہمارے ہاں خدا کے فضل سے ایسے بزرگ تو اب بھی بہت مل جائیں گے جو ہمیشہ روزے رکھتے ہیں اور جن کی نماز کبھی قضا نہیں ہوتی اور جو اور طرح طرح کی ریاضتیں کرتے ہیں۔ لیکن ان میں ایسے اصحاب بہت کم ہوں گے جن کو اپنے گھر میں کوئی خلافِ طبع واقعہ پیش آ جانے پر غصہ نہ آتا ہو، جو اپنے خادم پر خفا نہ ہوتے ہوں، جو کسی محبوب امر میں اپنے بھائی کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہوں۔ اور جو اپنی نکوکاری پر مغرور ہو کر کسی دوسرے کو حقیر نہ سمجھتے ہوں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ایسے لوگ ہیں ہی نہیں۔ خدا کے بندے ایک سے ایک بہتر و برتر ہیں۔ مگر ہاں ان کی کمی بہت ہے۔ اور چونکہ ہم خود ایسے نہیں ہیں اس لیے غالباً ہم کو وہ کہیں نظر بھی نہیں آتے۔ لیکن اتباعِ سنت یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک ایسا اور اس سے بھی اچھا ہو جائے۔

مگر زیادہ قابلِ افسوس حالت تو طبقہ جدید کی ہے۔ مصلحانِ قوم نے محاسنِ باطنی پیدا کرنے کے لیے رسمی عبادتوں اور ظاہری قیدوں کی اہمیت کو گھٹایا تھا۔ ہماری بدقسمتی سے یہ تو مٹ گئیں مگر وہ پیدا نہ ہوئیں۔ ازیں سو راندہ و ازاں سو درماندہ۔ ان بزرگوں پر تو یہ اعتراض ہے کہ ان میں ظاہرداری زیادہ اور حقیقی نیکیاں کم تھیں مگر اب ہم سے تو وہ حقیقی نیکیاں بھی کوسوں دور ہیں اور اسلام کی ظاہری شان کا بھی پتا نہیں۔ آج کل تو حالت یہ ہے کہ : ؎

وضع میں طرز میں اخلاق میں سیرت میں کہیں
نظر آتے نہیں کچھ حرمتِ دیں کے آثار

البتہ اس سارے غل شور کا نتیجہ یہ ہوا کہ نوجوانانِ وطن نے مذہب کو کھو کر قوم اور ملک کا نام سیکھا ہے۔ مگر وہ اتنا نہیں سوچتے کہ قوم کا تو وجود ہی مذہب سے ہوا ہے اور ملک مسلمانوں کا اب کوئی باقی نہیں رہا۔ جن خوش نصیبوں کو خدا نے یہ بے بہا

نعمتیں دی ہیں وہ چاہیں تو اپنے مذہب کو ان پر قربان کر دیں یا اپنی حسنِ تدبیر سے اسے بھی سنبھال لیں اور ان کو بھی۔ مگر مسلمانوں کے پاس تولے دے کر اسلام کا نام ہی رہ گیا ہے۔ اور اگر یہ بھی گیا تو پھر ایسے سیلِ حوادث میں کاروانِ رفتہ کے اس مٹے مٹائے نقشِ قدم کا باقی رہنا معلوم۔

اے نفس! خوابِ غفلت سے بیدار ہو۔ نشۂ نخوت سے ہوش میں آ۔ آخر یہ بے خودی کب تک۔ یہ حق ناشناسی تا کے۔ وہ وقت بہت قریب ہے جب تجھے بارگاہِ احکم الحاکمین میں حاضر ہونا ہوگا، جہاں اپنی زندگی بھر کے ایک ایک کام، ایک ایک خیال، ایک ایک نیت کا ذرا ذرا حساب دینا پڑے گا، جہاں تیرے اعضا و جوارح تیرے خلاف شہادت دیں گے۔ جہاں تیرے مخفی ارادے اور پوشیدہ مدعا ظاہر ہو جائیں گے۔ اور ریا اور تصنع کا پردہ اُٹھ جائے گا۔ جہاں اعمال و افعال اپنی اصلی حالت میں نظر آئیں گے اور اُن کی ٹھیک قیمت لگائی جائے گی۔

وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ۗ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ (انبیاء ع ۴)	اور اگر رائی کے دانے کے برابر بھی کچھ ہوگا تو ہم آسے لے آئیں گے اور ہم نہایت عمدہ حساب کرنے والے ہیں۔

تو خود ہی سچے دل سے انصاف کر اور دیکھ۔ کیا تو اس دن کی جواب دہی کے لیے تیار ہے؟ کیا تو اس عدالت کی باز پرس سے بے خوف ہے؟ تو اس کا جواب آج یہیں دے۔ کیونکہ وہاں بھی تیرا نامۂ اعمال تیرے ہاتھ میں ہی دیا جائے گا اور تجھ سے ہی انصاف چاہا جائے گا۔

اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۭ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۭ (بنی اسرائیل ع ۴)	تو اپنا نامۂ اعمال پڑھ لے۔ آج تو ہی خود اپنے لیے اچھا حساب کرنے والا ہے۔

تو اپنے مال و جمال پر مغرور ہے۔ اپنی دولت و ثروت پر فریفتہ ہے۔ اپنی طاقت اور حکومت پر دلدادہ ہے۔ اپنے علم و عمل پر نازاں ہے۔ یہ سب حیاتِ دُنیوی کی دل آویزیاں اور نظر فریبیاں ہیں۔ تجھے اپنے تقویٰ اور پارسائی پر غرہ ہے اپنی نکوکاری اور پرہیزگاری کا گھمنڈ ہے اپنے حسنِ اعمال اور کثرتِ عبادت پر بھروسا ہے اپنی شب بیداری اور اطاعت گزاری پر اعتماد ہے۔ یہ اچھے کام ہیں خدا قبول کرے۔ مگر کیا تجھ کو یقین ہے کہ یہ سب عمل اغراضِ نفسانی کی آمیزش سے پاک اور نمود و نمائش کی آلائش سے مبرّا ہیں اور ان میں شہرت طلبی اور جاہ پرستی کا مطلق شائبہ نہیں ہے۔ کیا تجھ کو اطمینان ہے کہ پابندیٔ صوم و صلوٰۃ نے تجھ میں خود پسندی اور خود ستائی پیدا نہیں کی۔ اور تُو نے اپنے زُہد و اطاعت کے زعم میں کسی دُوسرے کو حقیر نہیں سمجھا اپنے آپ کو اچھی طرح دیکھ اور یقین کر لے کہ اگر ان میں سے کوئی برائی بھی تجھ میں موجود ہے تو تیرے عمل ناقص اور تیری عبادتیں ناقابلِ قبول ہیں۔ بارگاہِ رب العزت میں ان چیزوں کی کچھ قدر نہیں وہاں فقط ایک بات دیکھی جاتی ہے اور وہ خلوص ہے اگر تُو نے جو کچھ کیا ہے خلوص اور نیک نیتی سے کیا ہے تو تیرا اُٹھنا، بیٹھنا، کھانا، پینا، سونا، جاگنا غرض ہر ایک کام عبادت میں داخل ہے۔ اور اگر خدانخواستہ تجھ میں خلوص نہیں ہے تو تیرے تمام اعمال بیکار ہیں نہ تُو نے کوئی فرض ادا کیا نہ کسی سنت کی پیروی کی۔ اللہ تجھ پر رحم کرے۔ اسی لیے تو ارشاد ہوا ہے کہ:

وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ ۚ وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ	اور بیشک تیرا پروردگار اپنے بندوں کی زیادتیوں کے باوجود بھی ان کو بہت بخشنے والا ہے اور بیشک

الْعِقَابِ ط (رعد ع ۲) تیرے پروردگار کا عذاب بھی بڑا سخت ہے۔

وہاں غلطیوں پر پکڑ نہیں ہوگی۔ آدمیوں سے غلطیاں تو ہوتی ہی ہیں وہاں لغزشوں پر گرفت نہ کی جائے گی۔ لغزش سے تو انسان کا خمیر ہی ہوا ہے اگر ان پر سزا دی گئی تو کہیں ٹھکانا ہی نہیں۔ مگر وہ بڑا غفور الرحیم ہے، ہاں اس کی سند نہیں کہ جان بوجھ کر پھسلیں اور سنبھلنے کی کوشش نہ کریں دیدہ و دانستہ غلطیاں کریں اور ان سے باز نہ آئیں۔ اتباعِ سنّت کے دعوے تو بڑے لمبے چوڑے ہوں۔ مگر اخلاقِ نبوی کے اختیار کرنے کا کبھی ارادہ تک نہ کیا جائے ارکان مذہبی کی ظاہری پابندی تو بڑے شدّ و مد سے کی جائے لیکن دل میں صداقت اور خلوص کا نشان تک نہ ہو۔ لیکن معاف کیجئے میں کیا ہوں اور کیا کہہ رہا ہوں مجھے شرم آنی چاہیے کہ میں صداقت اور خلوص کا نام لیتا ہوں جب کہ خود مجھ میں ان کا نام و نشان بھی نہیں۔ جو نگاہ میں نے دوسروں کی نکتہ چینی کے لیے اٹھائی تھی اتفاق سے وہ خود میرے ہی افعال پر جا پڑی اور میں نے حسرت و افسوس سے دیکھا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اور جو کچھ لکھ رہا ہوں اگرچہ وہ صداقت اور خلوص پر مبنی ہے۔ لیکن حیف کہ صداقت اور خلوص سے معرا ہے۔ اور خدا ہی جانتا ہے کہ اس میں بھی میری کیا کیا ذاتی غرضیں کون کون سی نفسانی خواہشیں مضمر اور مستتر ہیں۔ سچ یہ ہے کہ کہنا بہت آسان ہے مگر کرنا بہت مشکل ہے۔ مگر اس سے زیادہ دو روئی کو میری طبیعت بھی گوارا نہیں کرتی۔ اس لیے اس دُعا پر ختم کر کے آپ سے رخصت ہوتا ہوں کہ اللہ آپ کو اپنے فضل و کرم سے جناب سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کی سچی سنّت پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور مجھے بھی اس کی برکت سے محروم نہ رکھے۔ آمین

رَبَّنَا اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ط رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ۝ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ط اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝

(آل عمران ع ۲۰)

اے ہمارے پروردگار! ہم نے ایک منادی کرنے والے کو سنا کہ وہ ایمان کی منادی کر رہا تھا کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ تو ہم ایمان لے آئے ہیں۔ پس اے پروردگار! ہمارے قصور معاف فرما اور ہم سے ہمارے گناہ دُور کر اور نیک بندوں کے ساتھ ہمارا بھی خاتمہ بخیر کیجیو۔ اور اے پروردگار! جو کچھ تُو نے اپنے پیغمبروں سے وعدے کیے ہیں ہم کو نصیب کر اور قیامت کے دن ہم کو ذلیل اور رسوا نہ کیجیو۔ بے شک تُو کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

جوہرِ خُلقِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)

شیخ الازہر عبدالحلیم محمود

ترجمہ : ڈاکٹر سید مطلوب حسین

اس مقالہ کو پیش کرنے کا اصل مقصد پیغمبر علیہ السلام کے محاسنِ اخلاق کا بیان یا اظہار ہے جن سے آپ کو مزین کیا گیا تھا اور جو تمام اخلاقِ حسنہ اور اعلیٰ کردار کی بنیاد اور ذریعہ ہیں۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے جب رسول اللہ کے اخلاق کے بارے میں استفسار کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ آپ کا اخلاق قرآن تھا۔ اُمّ المؤمنین کی اس تعریف سے بات بالکل واضح ہو جاتی ہے اور کسی قسم کا شک و شبہ باقی نہیں رہتا۔

باوجود اس بات کے کہ جو وصف اُمّ المؤمنین نے صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے ہم اسے جامع اور مانع طریقے سے بیان کریں گے جو حتمی ہوگی اور شک و شُبہ سے بالا ہوگی۔

قرآن کریم نے اخلاق کی کم سے کم حدود متعین کی ہیں لیکن فضیلت کی زیادہ سے زیادہ تصویر کشی کی ہے۔ صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مکارمِ اخلاق کی بلند ترین چوٹی کی نشاندہی بھی کی ہے۔ قرآن کریم مقربین الٰہی کے درجات کے منابع نور کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ وہ میانہ روش کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ سابقین بالخیرات کی بات بھی کرتا ہے۔ وہ اصحاب الیمین کے بارے میں بھی بتاتا ہے اور مقربین کے بارے میں بھی گفت گو کرتا ہے۔ اور اس بات کی صراحت کرتا ہے کہ مقربین کی تعداد اصحاب الیمین کی نسبت بہت کم ہے چنانچہ مقربین کی تعداد اوّلین میں زیادہ ہے اور آخرین میں کم۔ اصحاب الیمین اوّلین اور متاخرین دونوں میں بہت سے ہیں۔ اصحاب الیمین اور مقربین کے بارے میں سورہ واقعہ کو مدِّ نظر رکھنا چاہیئے۔

ہم ایک مثال کے ذریعہ اس کی وضاحت کریں گے۔ برائی کا بدلہ برائی سے دینا عدل ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وجزآؤُ سیئۃٍ سیئۃٌ مثلھا (۴۲ : ۴۰) "لیکن قرآن کریم اس کو عدل کہنے کے باوجود اخلاقِ کریمانہ کا ایک اور درجہ بیان کرتا ہے اور وہ درجہ "کظم الغیظ" ہے۔ اور وہ شخص جو برائی کا بدلہ برائی سے دینے کی قدرت رکھنے کے باوجود غصہ کو پی جاتا ہے وہ اخلاقِ کریمانہ کی میزان میں اُس شخص سے بلند درجہ کا حامل ہے جو برائی کا بدلہ بُرائی سے دیتا ہے۔

قرآن کریم اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اخلاقِ عالیہ کا تیسرا درجہ بھی بیان کرتا ہے۔ اور یہ درجہ برائی کا بدلہ برائی سے دینے اور غصہ کو پی جانے سے تجاوز کر کے عفو تک پہنچ جاتا ہے اور عفو کی قدرت رکھنے کی وجہ سے برائی کا بدلہ برائی سے دینے اور غصہ کو پی جانے سے کہیں بلند ہے۔ قرآن کریم اس سے آگے بلند ترین درجہ کا ذکر کرتا ہے۔ جو احسان کا درجہ ہے جس کے حامل مقربین الٰہی ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

"وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ" (۳: ۱۳۴)

"جو لوگ غصہ کو پی جانے والے ہیں۔ اور لوگوں پر احسان کرنے والے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ محسنین سے پیار کرتا ہے۔"

یہ سب اخلاقِ کریمانہ کے درجات ہیں اور یہ بھی کریم ہیں البتہ ان کے درمیان تفاوت ہے جیسا کہ کریم اور اکرم کا تفاوت ہے اور شریف اور اشرف کے مابین فرق ہے۔ اس کے بعد ہمیں یہ حق پہنچتا ہے کہ ہم سوال کریں۔

جب حضرت عائشہ صدیقہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توصیف یوں فرماتی ہیں کہ آپ کا اخلاق قرآن ہے تو کیا اُن کی مراد قرآن کے بیان کردہ اخلاق کے ادنیٰ درجہ سے تھی یا اُن کی مراد اخلاقِ قرآنی کے اوسط درجہ سے تھی یا اخلاقِ قرآنی کے بلند ترین درجہ کو بیان کرنے سے تھی۔ اس مسئلہ کو بھی قرآنِ کریم نے خود ہی حل کر دیا ہے۔ چنانچہ وہ ہمارے سامنے خلقِ قرآنی کے اس درجہ کو ایک عام اور مجمل صورت میں بیان کرتا ہے جس تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جا پہنچے تھے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے بارے میں بیان فرماتا ہے "وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ" "بے شک آپ خلقِ عظیم کے درجہ پر فائز ہیں۔"

قاضی عیاض صاحب الشفاء لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ کی تعریف اُن عطیات کی وجہ سے کی ہے جو خود اُن کو عطا کئے تھے اور جن کی طرف آپ کی ہدایت فرمائی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کے مجد و شرف کے بیان کے لئے تاکید کے دو حروف (اِنَّ۔ لَ) بیان کئے۔ کہا گیا ہے کہ خلقِ عظیم سے مراد قرآن مجید ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد آپ کی طبع کریم ہے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کی استطاعت تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔

علامہ واحدی نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور کی صفت بیان کی اور آپ کے اخلاقِ کریمانہ کو قبولیت کی سند عطا فرمائی۔ اور آپ کے خلق کو آپ کے ماسوا پر فضیلت دی کیونکہ یہ اخلاقِ کریم آپ کو جبلی طور پر عطا ہوئے تھے۔ صحابہ کرام اور تابعین سے بھی اس آیتِ کریمہ کے بارے میں گفتگو کا پتہ چلتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اسلام سے بڑھ کر کوئی دین محبوب نہیں اور اسلام سے بڑھ کر وہ کسی دین سے راضی نہیں ہے۔

حضرت قتادہ کے قول کے مطابق اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے احکام کا امتثال امر فرماتے تھے اور جس سے اللہ تعالیٰ آپ کو روکتا تھا ترک جاتے تھے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ یا رسول اللہ آپ اس خلقِ عظیم پر پورے اترتے ہیں جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے آپ کو قرآن کریم میں دیا ہے۔ ان سب کے ساتھ اس آیتِ کریمہ کے بارے میں جو کچھ بھی کہا گیا ہے اس سے آپ کی تمجید و ثنا کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ اور ہمارے اس ایمان کے باوجود کہ یہ آیتِ کریمہ ان تمام عظمتوں پر مشتمل ہے جو اب تک بیان کئے جاتے رہے ہیں۔ اور وہ تمام مطالب شریفہ جو بیان کئے جاتے رہے ہیں اور بیان کئے جاتے رہیں گے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس آیت کی تفسیر و تشریح بیان کے آخری درجہ کی محتاج رہے گی۔

اس خلقِ عظیم کے بارے میں کچھ لوگ سوال کر سکتے ہیں کہ اس میں کوئی اور مکرم و محترم نبی یا کوئی برگزیدہ رسول یا کوئی

نہایت مقرب فرشتہ حضور علیہ السلام کے ساتھ شریک ہے؟

کیا سیدنا ابراہیم علیہ السلام خلقِ عظیم کے اس بلند مرتبہ پر فائز نہیں تھے جبکہ وہ حلیم اور سلیم الطبع تھے؟

کیا سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام اس خلقِ عظیم کے حامل نہیں تھے جبکہ اللہ تعالیٰ اُن سے راضی تھے؟

کیا سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اس خلقِ عظیم پر فائز نہیں تھے جبکہ اللہ تعالیٰ کی تمام برکتیں اُن پہ تھیں جہاں کہیں وہ گئے؟

اور ملائکہ جو اللہ تعالیٰ کے احکام کی عدم تعمیل نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جس پر کہ انہیں مامور کیا گیا ہے۔ حالانکہ اُن کے درمیان حضرت جبرائیل اور میکائیل علیہم السلام اور حاملینِ عرش شامل ہیں کیا وہ بھی خلقِ عظیم کے حامل نہیں ہیں؟

کیا اُن میں سے کوئی مکارم اخلاق کے اس بلند درجہ پہ پہنچا جن پہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فائز تھے؟

وہ کونسا مقام تھا جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بلند ترین اخلاق کے ساتھ استادہ تھے؟

اس سوال کو قرآن شریف اس درجہ تک حل کر دیتا ہے کہ شرحِ صدر اور صاف دلی کے ساتھ ہم رسول اللہ کی جذباتی محبت کے متحمل ہوتے ہیں۔ بے شک قرآن حکیم اس مسئلہ کو اس صراحت کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ کوئی چیز پردۂ راز میں نہیں رہتی اور وہ آیات جن میں آپ کا تذکرہ کیا گیا ہے اس ضمن میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں چھوڑتیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

"قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ○ (۶ - ۱۶۲ : ۱۶۳)

"کہہ دے کہ میری عبادت اور میری قربانی اور میری حیات و موت رب العلمین کے لئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں اور اسی کے لئے مجھے مامور کیا گیا ہے اور میں اوّل المسلمین ہوں"۔

قرآنِ کریم کی یہ آیت حضور علیہ السلام کے اعلیٰ ترین درجۂ اخلاق کے بارے میں بیان کرتی ہے بے شک یہ علوِ اخلاق کا بلند ترین مقام ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی لازوال کوششوں، اپنی روزمرہ زندگی، اپنے افعال اور اپنے پیغمبرانہ اعجاز سے اخلاقِ عالیہ کی تکمیل کے لئے مامور کیا گیا تھا۔ آپ کو اخلاقِ مروجہ کی تشہیر کے لیے نہیں بھیجا گیا تھا۔ بلکہ آپ کو اُن اخلاقِ عالیہ اور اخلاقِ حسنہ کی تکمیل کے لیے فائز کیا گیا تھا جو آپ کی بعثت سے قبل مفقود تھے۔

مختصر یہ کہ آپ اوّل المسلمین تھے اور آپ کی مثل کوئی دوسرا نہیں تھا۔ یہ مکارم اخلاق اسی طرح ناقص رہتے اگر اللہ تعالیٰ کی مرضی کے ساتھ آپ انھیں مکمل نہ کرتے۔

کائنات میں کسی پیغمبر، کسی نبی، کسی برگزیدہ رسول اور نہ ہی کسی مقرب فرشتے نے اللہ تعالیٰ کی مکمل رضا کی بلند ترین چوٹی اور مکارمِ اخلاق کے بلند ترین مقام تک رسائی حاصل کی۔ اور اوّل المسلمین ہونا ہی اللہ تعالیٰ کی مکمل رضا ہے۔

یقیناً تمام کائنات۔ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات خواہ اُن کا تعلق اوّل المسلمین سے ہو۔ خواہ اُن کی نسبت ملائکہ سے ہو خواہ بنی نوع انسان سے، خواہ یہ اوّلیت قدیم ہو یا جدید، خواہ اس اوّلیت کی نسبت ابدیت تک کی جائے، بلاشک و شبہ اوّل المسلمین کا ظہور، وجودِ کائنات میں ابھی تک نہیں ہوا تھا۔ کائنات ابھی تک نامکمل تھی۔ ناقص تھی۔

کائنات مادی اور معنوی ہر لحاظ سے ناقص تھی۔ وہ اس لئے ناقص تھی کہ ابھی سرزمین کو اس ہستی کی وجہ سے معطر ہونا تھا جو اجساد میں سب سے زیادہ پاکیزہ ہے اور اس کی فضاؤں کو اسے منزہ کرنا تھا جو ارواح میں سب سے زیادہ نفیس اور پاکیزہ ہے چنانچہ لازم تھا کہ ایک ایسا وجود کائنات میں آئے جو اللہ تعالیٰ کے دین کو مکمل کرے اور وہ (اللہ تعالیٰ) اپنی نعمتوں کا اس کے ذریعے اتمام کرے اور اس کی رسالت اور پیغام سے اللہ تعالیٰ اس طرح راضی ہو کہ اس کو ساری انسانیت کے لئے ابدی دین بنا دے اور یہی وہ وجہ ہے جسے ہم اللہ تعالیٰ کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے مراد لیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کو بایں طور نازل کیا کہ اسلام وجہہ للہ کا مقصد پورا ہو اسلام وجہہ للہ کے مقاصد کی تحدید کی۔ اسلام وجہہ للہ کے طریقوں اور اسالیب کی تحدید کی اور اسلام وجہہ للہ کے اغراض و مقاصد کی تحدید کی۔ بایں سبب اسلام ہی وجہہ للہ ہے۔ وہ تسلیم ہے اور وہی استسلام جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اسے محبوب رکھتا ہے اور اس سے راضی ہے۔ چنانچہ ہر وہ شخص جو اسلام کے علاوہ کسی اور دین کی رغبت رکھے گا مقبول نہیں ہو گا۔ اور یہ قابل قبول ہو بھی کیسے سکتا ہے۔ کہ وہ اسلام وجہہ للہ کے منافی ہے یقیناً اسلام وجہہ للہ ہی جوہر دین ہے۔ یہی دینِ قیم ہے اور وہی دینِ وحید ہے۔

اور یہی نقشِ وحید ہے — الٰہی نص جو ساری کائنات میں منفرد ہے جو اسلام وجہہ للہ کی کیفیت کو واضح کرتی ہے۔ وہ قرآن حکیم ہے۔ اور جب انسان اسلام وجہہ للہ کے مقام تک جا پہنچتا ہے تو گویا معراج انسانیت تک جا پہنچتا ہے۔ اور مکارم اخلاق کی چوٹی تک جا پہنچتا ہے

لوگ اللہ تعالیٰ کے سامنے وجہہ للہ کی صفت میں امتیاز رکھتے ہیں۔ یہ ایک لابدی امر ہے کہ اُن میں سے ایک انسان اول حیثیت کا حامل ہو۔ قرآن کریم کی مذکورہ آیت کے مطابق رسول اللہ بالا طلاق اول ہیں۔

قرآن کریم نے اول المسلمین کی صفت سے حضور علیہ السلام کے سوا کسی اور کو متصف نہیں کیا۔ اگر ایسا اول المسلمین مکارم اخلاق کو حد اتمام تک پہنچانے والا۔ وہ جس کی صلوٰۃ اور نسک اور جس کی زندگی اور موت اللہ رب العالمین کے لئے ہوتی ہے وجود میں نہ آتا تو یہ کائنات تا ابد اس کی منتظر رہتی تاکہ وہ اس کے وجود سے کمال حاصل کر سکے اور کائنات مادی اور روحانی اغنیاء سے ناقص نہ رہ جاتی۔

جب نبی علیہ السلام تشریف فرما ہوتے تو اللہ کی حکمت آپ کے وجود اور آپ کی رسالت سے انتہا تک جا پہنچی اور یہی وہ حقیقت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول میں بیان فرمایا ہے۔

"الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا"

"آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین کمل کر دیا اور تمہارے لیے اتمام نعمت کر دیا اور تمہارے لئے اسلام کو دین پسند کیا"

صلوٰۃ اللہ وسلامہٗ علیک یا سیدی یارسول اللہ۔

رسولِ اکرم ﷺ کی سیرۃِ طیبہ دائمی نمونۂ عمل ہے

اعجاز الحق قدوسی

ربیع الاول کا مہینہ رحمتوں اور سعادتوں کا مہینہ ہے۔ اسی مہینے میں خدا کی سب سے بڑی رحمت کا ظہور ہوا۔ اسی مہینے میں نسلِ انسانی کو نعمتِ غیر مترقبہ سے سرفراز فرمایا گیا۔ اسی مہینے میں ضلالت اور گمراہی کی تاریکیاں حق کے نور سے جگمگا اٹھیں۔ اسی مہینے میں رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی جس کی ہدایت کی روشنی تمام عالموں کو منور کرنے والی تھی۔ اسی مہینے میں خدا کے اس برگزیدہ رسول کی پیدائش ہوئی جو سارے انبیاء علیہم السلام کے سرتاج ہیں۔

میں اس مختصر سے مضمون میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارک کی ایک خصوصیت آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں جس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ آپ تمام عالم کے لیے قیامت تک رسول ہیں۔

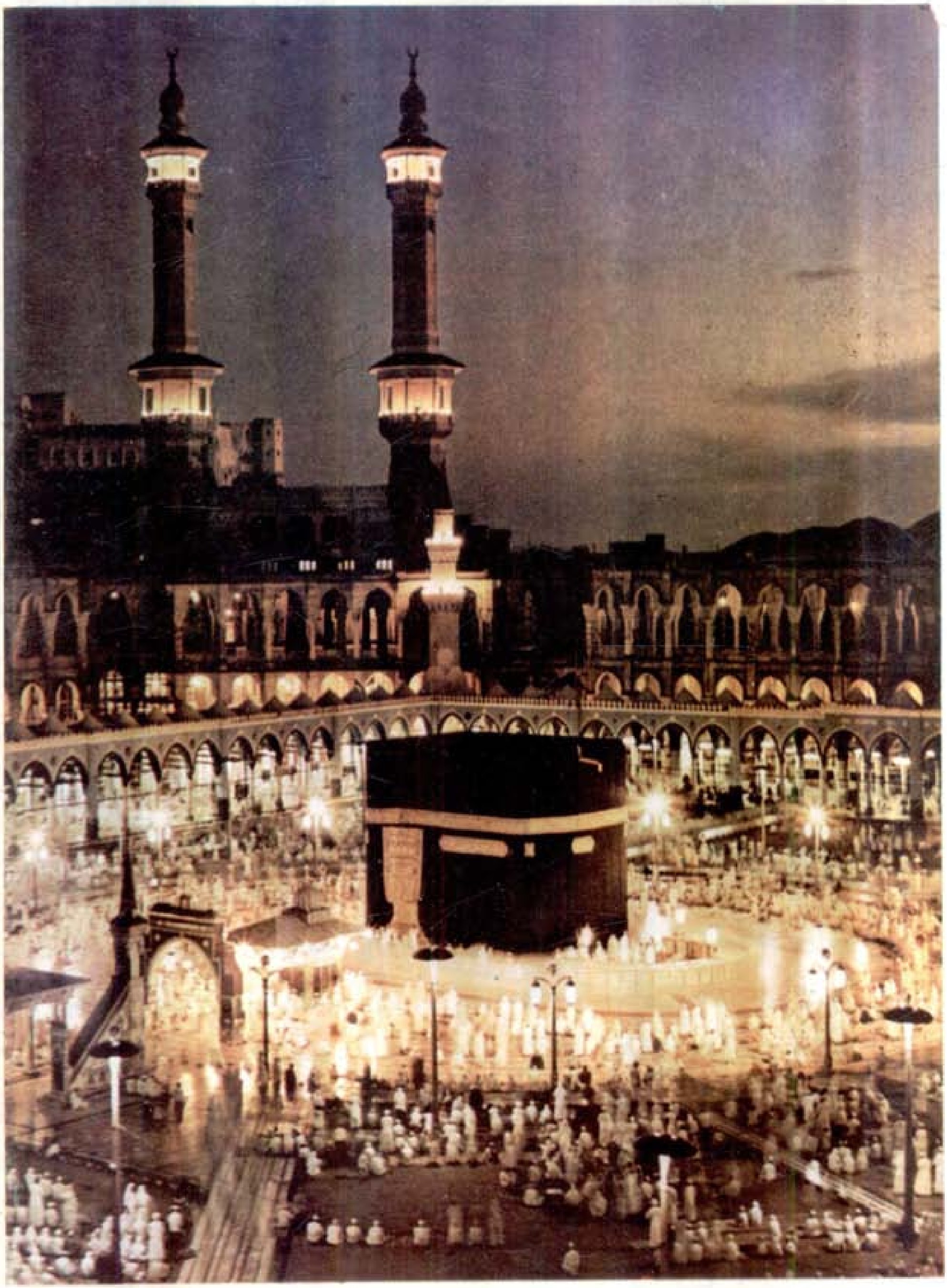
دنیا کے سب سے بڑے پیغمبر حضرت محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا کمال یہ ہے کہ وہ بیک وقت زندگی کے تمام شعبوں میں انسان کی رہنمائی کرتی ہے۔ جس کی حیاتِ طیبہ تمام انسانوں کی رہبری کرے وہی سارے عالم کے لیے رسول ہے۔ ہمارے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سارے عالم کے لیے رحمت بن کر آئے اور تمام عالموں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجے گئے۔ ساری کائنات کے لیے رؤف و رحیم ٹھہرائے گئے۔ آپ کا طرۂ امتیاز خُلقِ عظیم ہے۔ چونکہ آپ سارے عالم کے لیے رسول بنا کر بھیجے گئے اس لیے آپ کی حیاتِ طیبہ کسی خاص جماعت، کسی خاص قوم، کسی خاص ملک، کسی خاص زمانے کے لیے خاص نہ تھی بلکہ آپ سارے عالموں کے لیے رسول بنا کر بھیجے گئے تھے اس لیے آپ کی زندگی کو بھی تمام عالم کے لیے اُسوۂ حسنہ ٹھہرایا گیا۔

انسان جب کسی شعبۂ حیات میں قدم رکھتا ہے تو اس کی فطری خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس نے زندگی کے جس شعبے کو اختیار کیا ہے، اس کے سامنے اس میں کوئی اچھا نمونہ ہو تاکہ وہ اسے دیکھ کر اپنی زندگی کو بہتر سے بہتر بنا سکے۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارک کا کمال یہ ہے کہ دنیا کا ہر فرد اپنی حیثیت کے مطابق آپ کی زندگی کی روشنی میں اپنی زندگی کو بہتر بنا سکتا ہے، اس لیے کہ ادب و اخلاق کا کوئی سبق ایسا نہیں جو ہمیں آپ کی حیاتِ طیبہ میں نہ ملتا ہو۔

اب میں آپ کے سامنے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارک کے بے شمار پہلوؤں میں سے چند پہلو اجمالی طور پر پیش کرتا ہوں جن سے آپ کو معلوم ہوگا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرتِ طیبہ میں جامعیت اور عمل کے جو درس ہم کو ملتے ہیں دنیا کی تاریخ ان کو پیش کرنے سے قاصر ہے۔

مثلاً تجارت ہی کو لیجیے ایک تاجر اور کاروباری انسان کی زندگی کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ حُسنِ معاملہ کا خوگر اور ایفائے عہد کا پابند ہو۔ اگر کسی تاجر کی زندگی میں یہ دو وصف مفقود ہوں تو وہ کبھی اچھا تاجر نہیں بن سکتا۔



خانہ کعبہ کا ایک منظر

مرحلہ ہے جہاں بڑوں بڑوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں مگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے انصاف کے اس نازک ترین مرحلے سے گزر کر بھی تمام دنیا کے حاکموں کے لیے قابلِ تقلید نمونہ چھوڑا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ایک مرتبہ مالِ غنیمت تقسیم فرمارہے تھے، لوگوں کی بہت بھیڑ تھی ایک آدمی آکر منہ کے بل آپ پر لد گیا، آپ کے ہاتھ میں ایک لکڑی تھی، آپؐ نے اس سے اسے ٹھوکا دیا، جس کی وجہ سے اتفاقاً اس کے خراش آگئی، آپؐ نے اس سے فرمایا کہ میاں! تم مجھ سے بدلہ لے لو۔ اس نے کہا یا رسول اللہ! میں نے معاف کر دیا۔

دوستی و تعلقات کی دنیا پر اگر گہری نظر ڈالی جائے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دوستی اور محبت کی بنیادیں خلوص، باہمی ارتباط اور ایک دوسرے کی ہمدردی سے مستحکم ہوتی ہیں۔ دیکھیے کہ آپ بحیثیت ایک دوست اور ساتھی ہونے کے اپنے دوستوں اور ساتھیوں کے ساتھ کس طرح پیش آتے تھے۔

ایک سفر میں صحابۂ کرامؓ نے کھانا پکانے کا انتظام کیا اور ہر ایک نے ایک ایک کام اپنے ذمے لے لیا۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ میں جنگل سے لکڑیاں لاؤں گا۔ صحابہؓ نے کہا کہ ہمارے ماں باپ قربان آپ کو زحمت فرمانے کی ضرورت نہیں۔ ہم سب کام خود انجام دے لیں گے۔ ارشاد فرمایا: یہ صحیح ہے، لیکن خدا اس بندے کو پسند نہیں کرتا جو دوسروں سے اپنے آپ کو نمایاں کرتا ہو۔

دشمنوں کے مقابلے میں آپؐ نے اخلاق و کردار کا وہ اعلیٰ نمونہ پیش کیا کہ اگر آج بھی اس کو پیشِ نظر رکھا جائے تو آپ کا بڑے سے بڑا دشمن دوست ہو سکتا ہے، بشرطیکہ اس کا ضمیر بالکل تاریک نہ ہو گیا ہو۔

آپؐ نے مکے کے ان ہزاروں دشمنوں کو معاف کر دیا جنھوں نے آپ کو سخت سے سخت تکلیفیں پہنچائی تھیں۔ آپ نے اپنے چچا کے قاتل کو معاف کر دیا، آپ نے ہندہ کو معاف کر دیا جس نے آپؐ کے چچا حضرت حمزہؓ کی لاش کے ساتھ گستاخیاں کی تھیں، آپؐ نے عُمیر بن وہب کو معاف کر دیا جو اپنی تلوار زہر میں بجھا کر آپؐ کے قتل کے ارادے سے آیا تھا۔ آپؐ نے اس یہودیہ کو معاف کر دیا جس نے خیبر میں آپؐ کو زہر دیا تھا۔

مالدار ہونے کی حیثیت سے اگر دنیا کسی صالح نظام تمدن کو بر سرِ عمل لانا چاہتی ہے تو اسے چاہیے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کو اپنے لیے نمونہ بنائے۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آپؐ سب سے زیادہ سخی تھے اور رمضان المبارک میں آپ کی سخاوت بہت بڑھ جاتی تھی، تمام عمر آپؐ نے کسی کا سوال رد نہیں کیا۔

ایک روز حضرت ابوذرؓ سے ارشاد فرمایا ابوذرؓ! اگر یہ اُحد کا پہاڑ میرے لیے سونا ہو جائے تو میں کبھی اس کو گوارا نہیں کروں گا کہ تین روز گزر جائیں اور ایک دینار بھی میرے پاس رکھا رہ جائے۔ مگر وہ کہ جس کو میں قرض کی ادائی کے لیے رکھ چھوڑوں۔

آج دنیا کے ہر حصے میں مزدور اور سرمایہ دار کی جنگ جاری ہے۔ یہ عالمگیر جنگ صرف اس لیے برپا ہے کہ سرمایہ داروں نے دنیا کے معاشی وسائل پر اس طرح قبضہ کر رکھا ہے کہ ساری انسانیت اُن کے مقابلے میں مجبور و لاچار ہو کر رہ گئی ہے، لیکن

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس سلسلے میں جو جو اصول پیش کیے ہیں اگر اُن پر عمل کیا جاتا تو دُنیا آج جس محرومی و بدنصیبی سے دوچار ہے آپ دنیا کے ہر فرد کو اپنی حیثیت کے مطابق خوش حال وخوش نصیب پاتے۔

سرمایہ داری کی بنیاد روپے کے جمع کرنے اور اس نظریے پر قایم ہے کہ انسان وسائل ثروت پر جب کبھی قبضہ پائے تو وہ ان کو روکے رکھے، یہاں تک کہ اُن سے اپنی ذات کے لیے فائدہ نہ اٹھائے۔ اس خود غرضانہ نظریے نے نظامِ معیشت کو اس طرح تباہ کیا کہ ہر ملک میں دولت صرف چند سرمایہ داروں کے قبضے میں جمع ہو کر رہ گئی۔ اس غیر منصفانہ نظامِ معیشت نے تباہی مچا کر رکھ دی، اسی نظامِ معیشت کی کوکھ سے ہزاروں فاقہ کش، مزدور، قرضدار پیدا ہوئے جو ایک ایک دانے کو ترس رہے ہیں۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے سب سے پہلے انسانی ضمیر پر اس حقیقت کو واضح کیا کہ دولت جمع کرنے سے نہیں بلکہ اچھے کاموں میں خرچ کرنے سے بڑھتی ہے۔ آپؐ ہی نے دنیا کو یہ بتایا کہ جو لوگ دولت جمع کرتے ہیں وہ اُن کے لیے جائز نہیں ہو سکتی جب تک وہ اس کی زکوٰۃ ادا نہ کریں۔ آپؐ نے سُود کو حرام قرار دیا اور سُود کے روکنے کی انتہائی کوشش کی۔ آپ ہی نے حصولِ معیشت کے ذرائع میں سے بعض کو جائز اور بعض کو ناجائز قرار دیا۔ آپؐ ہی نے مزدوروں کی مشکلات حل کرتے ہوئے فرمایا کہ مزدور کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے اس کی مزدوری ادا کی جائے۔ آپؐ ہی نے سرمایہ دارانہ ذہنیت، سرمایہ دارانہ اخلاق اور سرمایہ دارانہ نظام کا قلع قمع کر کے دنیا پر خوش حالی، امن اور بلند اخلاقی کے دروازے وا کیے۔

خود غرض اور نفس پرست سرمایہ داروں نے جن مصیبتوں کو انسانوں پر مسلط کیا ہے وہ بلیک مارکٹنگ اور چور بازاری ہے، جو غریبوں کے لیے عذابِ الیم سے کم نہیں۔

آپؐ نے ان لوگوں پر جو غذائی اجناس اور دُوسری اشیاء کو محض نفع اندوزی کی خاطر روک کر رکھتے ہیں، بہت بڑی ذمہ داری عائد کی ہے۔ آپ نے فرمایا: جو لوگ غذائی اجناس اور دوسری اشیاء کو ذخیرہ کر لیتے ہیں تاکہ بازار میں مصنوعی طور پر ان کی مقدار گھٹ جائے اور قیمت بڑھ جائے، تو وہ بڑے گنہگار ہیں۔ آپؐ نے تجارت میں بھی خوش اخلاقی کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: اللہ اس آدمی پر رحم کرتا ہے جو خریدنے، بیچنے اور تقاضا کرنے میں نرمی اختیار کرتے ہیں۔

خرید و فروخت کے آداب بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ خرید و فروخت کرتے وقت جھوٹی قسمیں نہ کھاؤ۔ اپنے مال کا عیب اور خُوبی دونوں باتیں خریدار کے سامنے بیان کرو، اور مال بیچنے کے لیے چکنی چُپڑی، پُھسلا دینے والی باتیں نہ کرو، مال کو تخمینے سے نہیں بلکہ پوری طرح ناپ تول کر بیچو۔ آپؐ نے فرمایا کہ جو اپنے مال کے عیب کو چھپاتا ہے اور خریدار پر ظاہر نہیں کرتا وُہ ہمیشہ اللہ کے غضب میں رہتا ہے۔

تفوق و برتری کا وُہ خیال جو ہزار ہا سال سے انسان کی فطرت میں جاگزیں تھا، آپؐ نے اس کو مٹا کر دنیا کو احترامِ انسانیت کے درس اور مساوات کی نعمت سے سرفراز فرمایا۔ آپ ہی نے دنیا پر اس حقیقت کو واضح کیا کہ غلام و آقا، شاہ و گدا، شودر و برہمن خدا کی نظر میں سب برابر ہیں۔ اسلام میں معیارِ شرافت تو تقوٰی اور صرف تقوٰی ہے۔

ایک صحابی بیان کرتے ہیں کہ میرے شمار میں نہیں آسکتا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے منبر پر سے کئی مرتبہ یہ الفاظ فرمائے تھے کہ اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن جاؤ۔

خطبۂ حجۃ الوداع میں بنی نوع انسان کو مساوات کا پیغام دیتے ہُوئے فرمایا کہ عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں ، نہ عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت ہے۔ تم سب کے سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔

انسان کی سب سے بڑی خوبی کو واضح کرتے ہُوئے ارشاد فرمایا کہ تم میں بہترین آدمی وُہ ہے ، جس سے لوگوں کو زیادہ فائدہ پہنچے۔

رحمۃ للعالمینؐ کی شانِ رحمت کی عمومیت کا اندازہ اِس سے کیجئے کہ آپؐ نے فرمایا : تم زمین والوں پر رحم کرو ، آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔

اس مختصر سی تحریر میں آپ کی سیرت طیبہ کے یہ چند پہلو میں نے آپ کے سامنے پیش کیے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تمام عمر لکھنے والے لکھتے رہیں اور بیان کرنے والے بیان کرتے رہیں تب بھی حضورؐ کا اول وصف بیان نہیں ہو سکتا۔ ؎

دفتر تمام گشت و بہ پایاں رسید عمر
ما ہمچناں در اولِ وصفِ تو ماندہ ایم

تاجدارِ مدینہ کی گھریلو زندگی

ڈاکٹر حافظ محمد سالم توحیدی

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اسوۂ حسنہ کی حیثیت رکھتی ہے، آپ ساری دنیا والوں کے لیے مشعل ہدایت اور خضر راہ بن کر تشریف لائے تھے۔ دینی و دنیوی نقطۂ نگاہ سے حضورؐ کے تمام پہلو مکمل تھے۔ آپؐ نہ صرف پیغمبر تھے کہ صرف تبلیغ پر اکتفا کرتے، نہ صرف عابد شب زندہ دار تھے کہ جنگل یا پہاڑ کے کسی کھوہ میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرتے رہتے، نہ دنیا دار تھے کہ زندگی کے طمطراق اور جاہ و جلال کا مظاہرہ فرماتے۔ آپ کو ہر مکتبۂ خیال کے لوگوں کو علمی تعلیم دینا تھی تاکہ شاہ و گدا، امیر و غریب، ادنیٰ و اعلیٰ ہر حیثیت کے لوگ آپ سے فیض اندوز ہو سکیں۔

انسان کی زندگی اپنے گھر ہی کی چار دیواری کے اندر اپنے اصلی اور حقیقی رنگ میں نظر آتی ہے۔ کوئی خواہ کتنا ہی عظیم المرتبت انسان کیوں نہ ہو، اپنے گھر کے اندر قدم رکھتا، تو پھر وہ بے تکلف ہو جاتا ہے اور عام و خاص کا فرق جاتا رہتا ہے۔ تصنع کا رنگ اڑ جاتا ہے۔ آیئے! دنیا کے سب سے بڑے بلند مرتبہ انسان کی خانگی زندگی کیا تھی اور گھریلو زندگی کا عنوان کیا تھا۔ تاریخ اسلام کی روشنی میں تلاش کریں۔

حضورؐ کے کاشانۂ اقدس میں بیک وقت مختلف المزاج، حیثیت اور عمر کی چند بیویاں تھیں۔ ان میں رؤسائے عرب کی چشم و چراغ بھی تھیں، غریب و نادار لڑکیاں بھی، صاحبِ جمال بھی تھیں اور صاحبِ کمال بھی۔ سن رسیدہ بھی تھیں اور چودہ پندرہ برس کی عمر والی بھی تیز مزاج بھی تھیں اور حلم و صبر والی بھی۔ گویا کاشانۂ نبوت میں مختلف الخیال عناصر کا اجتماع تھا۔

پہلی بیوی حضرت خدیجہؓ تھیں۔ جب ان کی عمر چالیس سال اور حضورؐ کی عمر شریف ۲۵ برس کی تھی، تو شادی ہوئی۔ نہایت شریف النفس، صاحبِ جمال اور مالدار بیوی تھیں۔ حضورؐ کے سرد و گرم زمانہ میں جان و مال سے ساتھ رہیں۔ ہر طرح کی اذیتیں برداشت کیں۔ دونوں میں انتہائی محبت تھی۔ غارِ حرا میں حضورؐ کو آپ ہی کھانا پہنچاتی تھیں۔ حلم و صبر کا پیکر تھیں۔ عورتوں میں سب سے پہلے آپ ہی نے اسلام قبول کیا ان کے رہتے ہوئے حضورؐ نے دوسری شادی نہیں کی۔ کل اولاد آپ ہی کے بطن سے ہوئی۔ چار لڑکیاں اور دو لڑکے پیدا ہوئے۔ حضرت فاطمہؓ، زینبؓ، رقیہؓ اور اُمّ کلثومؓ جوان ہو کر بیاہی گئیں۔ حضورؐ کے وصال کے وقت صرف حضرت فاطمہؓ حیات تھیں، چھ مہینے کے بعد وہ بھی اپنے باپ سے جا ملیں۔

حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے بعد حضرت سودہؓ سے شادی کی، جن کی عمر تقریباً ۵۰ برس تھی۔ بہت فیاض و غیور خاتون تھیں۔ ابتدائے اسلام میں مسلمان ہوئیں اور عہد فاروقی میں وصال ہوا۔

تیسری حضرت عائشہؓ حضرت صدیق اکبرؓ کی صاحبزادی نو سال کی عمر میں بیاہی گئیں، علم و فضل میں یکتائے زمانہ تھیں۔ حدیث و فقہ، شعر و شاعری میں ثانی نہ رکھتی تھیں۔ ۱۹ سال کی عمر میں بیوہ ہو گئیں۔ ۲۲۱۰ حدیثیں مروی ہیں (مسند ابن حنبل، ترمذی شریف

ہیں ہے کہ پیچیدہ مسائل صحابہ کرامؓ آپ ہی سے حل کراتے تھے۔ ۶۶ سال کی عمر میں وصال ہوا۔

چوتھی بیوی حضرت عمر فاروق اعظمؓ کی صاحبزادی حضرت حفصہؓ تھیں۔ بڑی طمطراق کی خاتون تھیں۔ عہد امیر معاویہ میں وصال ہوا۔

پانچویں بیوی حضرت ام سلمہؓ بہت غیور سیر چشم تھیں۔ غرباء پروری ان کا خاص شیوہ تھا۔ اس لیے ام المساکین سے پکاری جاتی تھیں۔ بہت اطاعت گزار خاتون تھیں۔ ازواج مطہرات میں سب کے پیچھے ۵۹ھ میں بعمر ۸۴ سال انتقال ہوا۔

چھٹی بیوی حضرت جویریہؓ اپنے قبیلہ کے سردار کی چشم و چراغ تھیں۔ حسین و خوبصورت خاتون تھیں۔ بہترین کھانا پکاتی تھیں۔ ۶۵ سال کی عمر میں وصال ہوا۔

ساتویں بیوی حضرت ام حبیبہؓ حضرت ابوسفیان رئیس اعظم قریش کی لختِ جگر تھیں، ان کا نکاح حبشہ کے شاہ نے پڑھایا تھا اور حق مہر بھی انہوں نے ہی ادا کر دیا تھا۔ ایک مرتبہ ان کے باپ ابوسفیان، جو ہنوز مسلمان نہیں ہوئے تھے، بیٹی سے ملنے آئے اور رسول اللہؐ کے بستر مبارک پر بیٹھنا چاہا تو انہوں نے حضورؐ کے بستر کو الٹ دیا اور کہا کہ آپ میں کفر کی ناپاکی ہے تو ان کے باپ ناراض ہو کر چلے گئے۔ ۴۴ھ میں انتقال ہوا۔

آٹھویں بیوی حضرت صفیہؓ قبیلہ بنو نضیر کے سردار کی بیٹی تھیں، جنگِ خیبر میں گرفتار ہو کر آئی تھیں۔ حسن میں، تدبیر میں بہت ممتاز تھیں۔

نویں بیوی حضرت میمونہؓ تھیں۔ مقام سرف میں شادی ہوئی۔ نیک شعار کریم النفس خاتون تھیں۔

دسویں بیوی حضرت زینبؓ تھیں۔ جود و سخا، حسن و جمال میں یکتائے روزگار تھیں۔ اپنے دست و بازو سے کماتی تھیں اور فقراء و مساکین میں تقسیم کرتی تھیں۔ نہایت سیر چشم خاتون تھیں۔ ۳۵ سال کی عمر میں شادی ہوئی۔ ۵۳ برس کی عمر میں وفات پائی۔

گیارھویں بیوی حضرت ماریہ قبطیہؓ تھیں، جو حسن و جمال میں بے نظیر تھیں۔

یہ بیویاں مختلف المزاج کی ضرور تھیں، مگر کُل پاک سیرت شریف النفس تھیں۔ دیکھو کاشانہ نبوت میں فکر و فاقہ کا دور دورہ تھا دو دو ماہ چولھے نہیں سلگتے تھے۔ لیکن پھر بھی یہ نیک بیویاں صبر و تحمل سے کام لیتی تھیں۔ لب شکایت کبھی نہ کھولتی تھیں۔ اور محبت میں سرِ مُو فرق نہیں آتا تھا۔

یکساں سلوک حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام بیویوں کے ساتھ یکساں سلوک اور برتاؤ کرتے تھے۔ مگر میلانِ طبع حضرت عائشہؓ کی طرف زیادہ تھا۔ کیونکہ وہ بہت بڑی صاحب فضل و کمال خاتون تھیں۔ حدیث و فقہ میں آپ کو وہ یدِ طولیٰ حاصل تھا کہ بڑے بڑے صحابہ کرامؓ ان سے فتویٰ پوچھتے تھے اور مسائل کی پیچیدگیاں ان کی خدمت میں جا کر سلجھاتے تھے اور یہ اس لیے نہیں تھا کہ آپ بہت کم عمر تھیں یا خوب صورت تھیں بلکہ حسن و جمال میں حضرت صفیہؓ، حضرت زینبؓ آپ اپنی مثال تھیں، صرف علم و فضل کی وجہ سے حضرت عائشہؓ کی طرف میلانِ خاطر کچھ زیادہ تھا۔ بتقاضائے بشریت بعض بیویوں کو اس خصوصیت پر رشک آیا اور حضورؐ کی خدمت میں تمام بیویوں کی طرف سے حضرت زینبؓ نمائندہ بن کر گئیں اور کہا کہ جو مرتبہ عائشہؓ کو عطا کیا گیا ہے، وہ اس کی مستحق نہیں ہیں۔ حضرت عائشہؓ چپ بیٹھی سنتی رہیں اور وہ اشارہ پا کر جواب دینے کو کھڑی ہوئیں تو وہ مدلل تقریر کی کہ حضرت زینبؓ لاجواب ہو گئیں۔

اور حضورؐ نے فرمایا کہ کیوں نہ ہو عائشہؓ حضرت ابوبکرؓ کی تو بیٹی ہیں۔

ایک بار اتفاق سے حضرت عائشہؓ کسی بات پر حضورؐ کے سامنے تُرش رُو ہو کر کچھ زور سے بول رہی تھیں کہ ان کے ابّا جان حضرت ابوبکرؓ تشریف لے آئے اور غصہ میں آ کر حضرت عائشہؓ پر ہاتھ اُٹھایا۔ وُہ جھٹ حضورؐ کی آڑ میں آ کر کھڑی ہو گئیں۔ کہنے لگے: اری بیوقوف! رسول اللہؐ کا ادب نہیں کرتی۔ اور باہر چلے گئے۔ حضورؐ نے مسکراتے ہُوئے فرمایا: "عائشہؓ! میں نے تم کو بچا لیا" حضرت عائشہؓ نے شرم سے گردن نیچی کر لی۔

حضورؐ روزانہ تھوڑی دیر کے لیے تمام ازواجِ مطہرات کے گھروں میں جاتے اور کچھ دیر بیٹھ کر چلے آتے اور جن کے ہاں شب باش ہونے کی باری ہوتی، وہیں ٹھہر جاتے۔ عصر کی نماز پڑھ کر حضرت ام سلمہؓ کے حجرے سے شروع کرتے، جس کے ہاں حضورؐ شب باش ہونے کے لیے ٹھہرتے، کل بیویاں وہیں جمع ہو جاتیں۔ سب ہنستی بولتی باتیں کرتیں اور بڑی پُر تکلف صحبت ہوتی۔ اور پھر اس کے بعد سونے کے وقت واپس چلی آتیں۔

حضرت صفیہؓ بہت اچھا کھانا پکانا جانتی تھیں۔ ایک روز انھوں نے کوئی اچھی چیز پکائی اور حضورؐ کے لیے بھیج دی۔ آپؐ اس وقت حضرت عائشہؓ کے یہاں تھے۔ حضرت عائشہؓ کو ناگوار معلوم ہوا اور پیالہ زمین پر پٹک ڈالا۔ حضورؐ خود دستِ مبارک سے پیالہ کے ٹکڑوں کو چنتے تھے اور مسکراتے ہوتے فرماتے تھے: "عائشہؓ! تاوان دینا ہوگا۔"

اس طرح کے واقعات اکثر ہوتے رہتے تھے مگر آپ اپنے خلقِ عظیم کے باعث ہنس کر ٹال دیتے۔ آپؐ کو ازواجِ مطہرات سے خاص محبت تھی۔ تعلقات بھی نہایت خوشگوار تھے۔ لیکن دنیوی طریق پر آپ نے کبھی بھی اس کا اظہار نہیں فرمایا۔ حضرت عائشہؓ کتنی محبوب بیوی تھیں۔ لیکن حضورؐ کے رہتے ہُوئے آپؓ کو نہ اچھا کپڑا نصیب ہُوا، نہ اچھی غذا، بلکہ زیور بھی نصیب نہ ہُوا۔ عائشہؓ کو ایک مرتبہ طلائی کنگن حضورؐ نے پہنے ہُوئے دیکھا، تو فرمایا، اگر تمھیں جنت کی آرزو ہے، تو پُر تکلف لباس اور زیورات سے پرہیز کرو۔ مگر مہندی لگانے کی تاکید فرماتے تھے۔ چوڑیوں کے بارے میں فرماتے کہ اس کی آواز سے گھر میں برکت ہوتی ہے اور عورتوں کا سہاگ ہے۔

ابتداء میں جو کچھ مل جاتا، ازواجِ مطہرات کھا پکا لیتی تھیں مگر فتح خیبر کے بعد ہر بیوی کے لیے اسّی وسق کھجور اور بیس وسق جَو کا سالانہ انتظام تھا جو حضورؐ کے کثرت اشتغال کے باعث حضرت بلالؓ کے ذمّہ اس کا انتظام تھا۔ سادگی کا یہ عالم تھا کہ چھوٹا موٹا جو کچھ مل جاتا، خدا کا شکر بجا لیتے اور کھا لیتے۔ جہاں جگہ مل جاتی بیٹھ جاتے۔ روٹی کا آٹا چھانا نہیں جاتا۔ کرتہ میں گردن کے پاس کا بٹن کُھلا رہتا۔ بستر کبھی کمبل کا ہوتا، کبھی چمڑے کا، جس میں کھجور کی چھالیں بھری رہتیں۔

کاشانۂ اقدس

۹ھ میں جب کہ ارض عرب سے یمن تک تمام ملک زیرنگین اسلام تھا اور حضورؐ اس کے واحد فرمانروا تھے، اس وقت بھی کاشانۂ اقدس میں صرف ایک چارپائی اور پانی کے لیے ایک سوکھا مشکیزہ تھا۔ یہ تھا شہنشاہؐ دو جہاں کے کاشانہ عالیہ کا نقشہ، جس کو زمین و آسمان پر تصرّف حاصل تھا۔ مسجد نبویؐ کے متصل ازواج مطہرات کے خام حجرے تھے جو طول میں دس ہاتھ اور عرض میں چھ سات ہاتھ سے زیادہ نہ تھے۔ پردہ کے خیال سے دروازہ میں کمبل لٹکے ہوئے تھے۔

ایک بار (بزمانۂ ایلاء) حضرت عمرؓ حضورؐ سے ملنے گئے، تو دیکھا کہ سردارِ دو جہاںؐ نے ایک تہبند باندھا ہُوا ہے، ایک،

کھردری چٹائی ہے ، جس پر لیٹنے سے جسم مبارک پر اسی کے نشانات پڑے ہیں ۔ ایک طرف گوشہ میں محض تھوڑا سا جَو رکھا ہُوا ہے ۔ مشکیزہ کی کھالیں کھونٹی میں لٹک رہی ہیں ۔ یہ منظر دیکھ کر حضرت عمرؓ بے اختیار رو پڑے ۔ آپ نے فرمایا : گھبراؤ نہیں میرے لیے عقبیٰ ہے ۔

مگر یاد رکھیے کہ یہ رہبانیت نہیں تھی ، فقر پسندی کا جوش تھا ۔ رہبانیت ہوتی تو معاملاتِ دنیا سے حضورؐ کنارہ کش ہوتے مگر آپ کے گھر میں ایک نہیں تو نو بیویاں تھیں ، اولادیں تھیں ، خویش و اقارب تھے ، ملنے جلنے والے تھے ۔ صاف بات یہ تھی کہ حضورؐ تصنع کو بالکل پسند نہ فرماتے تھے ۔ حضورؐ کی توجہ قوم کی اصلاح و ترقی کی طرف تھی ۔

صاف شفاف کپڑے پہنتے تھے اور اپنے جان نثاروں کو بھی اس کی تاکید فرماتے ۔ ہدایت تھی کہ کپڑوں میں بہتر پیوند کیوں نہ ہوں مگر صاف ستھرے ہوں ۔ خوشبُو کا استعمال زیادہ کرتے تھے ۔ ویسے آپ نے قیمتی سے قیمتی کپڑا بھی استعمال کیا ہے اور اچھے سے اچھے کھانے بھی تناول فرمائے ہیں ۔ مگر اس طرح کی عادت شریف نہ تھی ۔

عظمت و محنت سادگی کا یہ عالم تھا کہ آپ بے تکلف معمولی سے معمولی کام کر لیا کرتے تھے ۔ بازار سے سودا سلف خود لے آتے ، کپڑوں میں پیوند خود لگا لیتے ، پھٹے جوتے گانٹھ لیتے ، گھروں میں جھاڑو دے لیتے ، غلاموں مسکینوں کے ساتھ بیٹھ کر بلا تکلف کھانا کھا لیتے اور حد تو یہ ہے کہ دُوسروں کا بھی معمولی کام کر دینے میں کچھ تامل نہیں کرتے تھے ۔

بعض صحابہ کرامؓ جو گھر پر نہ ہوتے ، تو ان کی بکریاں گھر جا کر دوہ دیا کرتے ۔ مسجد قبا ، مسجد نبویؐ اور غزوۂ خندق میں حضورؐ نے مزدور کی حیثیت سے کام کیے ہیں ۔ ادنیٰ ہو یا اعلیٰ سب سے حضورؐ خندہ پیشانی سے بات کرتے ۔ ضعیف و کمزور کو حقیر نہ جانتے تھے اور یہ سب کچھ تعلیماً تھا کہ کوئی کسی کو پیشہ یا کام کی وجہ سے ذلیل نہ سمجھے اور جائز طور پر جو بھی پیشہ اختیار کیا جائے ، وہ اچھا ہے کیونکہ پہلے بھی اور آج کے دور میں بھی بعض معمولی پیشہ کے باعث اس کے کرنے والوں کو نیچی نظر سے دیکھا جاتا ہے ۔ اس لیے حضورؐ نے کر کے دکھا دیا کہ کوئی پیشہ ہو ، اگر جائز ہے تو وہ ذلیل نہیں ۔

نبی کریمؐ بحیثیت معلّمِ اخلاق

پیر محمد کرم شاہ

یہ جہانِ رنگ و بو جلوہ گاہ حیات ہے۔ زندگی کی بوقلموں رنگینیوں کے باعث یہ جہاں آباد ہے۔ گو نباتاتی اور حیوانی زندگی میں بھی رنگینیوں کے بڑے دلکش اور دلربا مینا بازار سجے ہوئے ہیں لیکن انسانی زندگی میں جو رعنائیاں اور ندرت آفرینیاں ہیں، یہاں تخلیقی قوتوں کے جو سمندر موجزن ہیں وہ کسی دوسری جگہ نظر نہیں آتے۔ یہ انسان ہی ہے جس کو خلعتِ وجود بخشنے کے بعد اس کے خالق نے فرمایا **لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم**۔ اس قدرت و طاقت والے نے عرش و فرش، کائنات کی لامتناہی پہنائیوں کو لفظ کُن سے پیدا کیا لیکن آدم خاکی کی آفرینش کا ذکر کیا تو فرمایا **خلقتہ بیدی**۔ میں نے اسے اپنی قدرت کے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا ہے۔ علم اور عمل، فکر اور تخلیق، تدبیر اور تعمیر کی جو بے پناہ صلاحیتیں اس پیکرِ خاکی میں ودیعت فرمائیں۔ ان کا تذکرہ" **نفخت فیہ من روحی**" کے معنی خیز الفاظ سے کیا۔ اللہ تعالیٰ کی صفات حکمت، علم اور قدرت کا یہ شاہکار سب سے الگ تھلگ انفرادی زندگی بسر کرے، خلاق عالم کو یہ گوارا نہ ہوا۔ اگر وہ عزلت اختیار کرتا تو وہ بے پایاں صلاحیتیں بے مصرف ہو جاتیں۔ اس چشمہ حیواں سے کوئی تشنہ لب اگر سیراب نہ ہوتا تو اس کی حیات بخش تاثیر کا کسے علم ہوتا، ان صفات کے ودیعت فرمانے والے کے حضور فرطِ عقیدت سے جبین نیاز کون جھکاتا۔ حکمتِ الٰہی کا تقاضا ہے کہ انسان، اجتماعی اور معاشرتی زندگی بسر کرے، اپنے بنی نوع انسان سے استفادہ بھی کرے اور انہیں فائدہ بھی پہنچائے۔ دوسروں کے علوم و فنون سے رہنمائی بھی حاصل کرے اور اپنے فکر و نظر کے چراغ روشن کرکے شبستان وجود کو منور بھی کرے۔ وہ ماں باپ کا بیٹا بھی ہو اور اپنے بیٹے بیٹیوں کا باپ بھی۔ اس کے خاندان کے افراد اس کے لئے تقویت کا باعث ہوں ضرورت کے وقت وہ ان کا سہارا بنے حتیٰ کہ اس کے تعلقات کا حلقہ سارے ملک اور ساری قوم کو اپنے احاطہ میں لے لے۔

ان معاشرتی تعلقات کے باعث حقوق و فرائض کا معرضِ وجود میں آنا ناگزیر ہے معاشرے کا ہر فرد جب تک اپنے فرائض پوری ذمہ داری سے ادا نہیں کرے گا نیز جب تک اسے اپنے حقوق کی بازیابی کا یقین نہ ہوگا اس وقت تک صحت مند معاشرہ وجود میں نہیں آسکتا۔ اس لیے حقوق و فرائض میں اعتدال اور توازن برقرار رکھنا اہم اور بنیادی ضرورت ہے۔ اس کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو قانون کی طاقت سے اس توازن کو برقرار رکھا جائے اور جو شخص بھی اس توازن کو بگاڑنے کا مرتکب ہو اس کی سرکوبی کر دی جائے اور یا اس کی اخلاقی قوتیں کو بیدار کیا جائے اور ایسے خطوط پر ان کی نشوونما کر دی جائے کہ پھر ہر قسم کے حالات میں وہ راہِ اعتدال پر ثابت قدمی سے چلتا رہے۔ قانون کی عمل داری انسانی زندگی کے صرف چند گوشوں تک ہے۔ انسانی زندگی کے بہت سے ایسے گوشے ہیں جہاں قانون کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔ نیز ہر کام اگر قانون کے زور سے کرایا جائے تو خلوص و ایثار اور محبت و پیار کے غنچے کھل کر پھول نہیں بن سکیں گے۔ اسلام نے حقوق و فرائض میں توازن پیدا کرنے، پھر اسے برقرار رکھنے کے لئے اور معاشرہ کو ہر قسم کی بے راہروی سے بچانے کے لئے اخلاقی تربیت پر اسی لئے بہت

زیادہ توجہ دی ہے۔

اس سے قبل کہ میں "حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بحیثیت معلم" کے عنوان پر اظہارِ خیال کروں، مناسب سمجھتا ہوں کہ لفظ خلق کی تشریح کر دوں تاکہ کسی قسم کا ابہام نہ رہے۔

علامہ ابن منظور لغت کی مشہور کتاب لسان العرب میں لکھتے ہیں:

الخُلُق والخُلْقُ: السجیّته وھوالدین والطبع والسجیّته وحقیقته انه لصورة الانسان الباطنة وھی نفسه واوصافها ومعانیها المختصّة بمنزلة الخَلق الصورته الظاهرة واوصافها ومعانیها۔	خُلق اور خُلُق کا معنی فطرت اور طبیعت ہے۔ انسان کی باطنی صورت کو مع اس کے اوصاف اور مخصوص معانی کے خُلق کہتے ہیں۔ جس طرح اس کی ظاہری شکل وصورت کو خلق کہا جاتا ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ جو دانش ایمانی اور دانش برھانی دونوں سے مالا مال ہیں، جو حکمت وفلسفہ کے علاوہ نفسیاتِ انسانی کے بھی ماہر ہیں خلق کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فالخلق عبارة عن هیئة فی النفس راسخة عنها تصدر الافعال بسهولة و یسر من غیر حاجة الی فکر و رویة (احیاء العلوم)

ترجمہ: یعنی خلق، نفس کی اسی راسخ کیفیت کا نام ہے جس کے باعث اعمال بڑی سہولت اور آسانی سے صادر ہوتے ہیں ان کے کرنے کے لئے سوچ بچار کے تکلف کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

اس تشریح سے معلوم ہوا کہ وہ اعمال جو کسی سے اتفاقاً صادر ہوتے ہیں یا کسی وقتی جذبہ اور عارضی جوش سے ان کا ظہور ہوتا ہے وہ خواہ کتنے اعلیٰ اور عمدہ ہوں انھیں خلق نہیں کہا جائے گا۔

خلق کا اطلاق انہی خصائل وعادات پر ہوگا جو پختہ ہوں، جن کی جڑیں قلب و روح میں بہت گہری ہوں۔ انہی غیر متزلزل اور پختہ صفات پر کامیاب زندگی کا محل تعمیر کیا جا سکتا ہے انہی پر اعتماد کرتے ہوئے قومی ترقی اور اصلاح کے منصوبے بنائے جاتے ہیں اور ان پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ کسی ترنگ میں آکر اگر کوئی شخص غریبوں اور محتاجوں کی امداد کے لئے اپنے خزانوں کے منہ کھول دے تو ہم اسے سخی نہیں کہیں گے۔ جو شخص کسی وقتی جوش کے ماتحت اپنے دشمن پر حملہ کر کے اسے مار گرائے اسے ہم شجاع نہیں کہیں گے۔ اس سے یہ توقع عبث ہے کہ جب بھی اسے میدانِ جہاد میں سر کیف آنے کی دعوت دی جائے گی تو وہ اسے قبول کرے گا۔

اس لئے نیک اور عمدہ خصائل کو پیدا کرنا پھر ان کو اس طرح پختہ اور استوار کرنا کہ وہ ان سے مطلوبہ اعمال کا ظہور اس طرح بے تکلفی سے ہو جس طرح چشمہ سے پانی ابلتا ہے، یا آنکھ اپنے گرد و پیش کو دیکھتی ہے، یا کان آواز سنتے ہیں۔ یہ کیفیت افراد و اقوام کی صحت مند ترقی کے لئے جس قدر اہم اور ضروری ہے اسی قدر مشکل اور کٹھن بھی ہے۔ اسی کٹھن اور خطرناک مہم کو سر کرنے کے لئے حکماء و فلاسفہ نے بڑی کوششیں کیں لیکن ان کے باہمی اختلافات اور ان کی نظریاتی کشمکش نے ان کی محنت کو بے ثمر کر دیا۔ وہ یہ طے

نہ کر سکے کہ خیر و شر کا معیار کیا ہے؟ ایپی قورا اور اس کے ساتھی لذت و الم کو خیر و شر کا معیار ثابت کرنے میں اپنی ذہنی قابلیتیں کھپاتے رہے۔ ان کے معتقدات کے معبد میں مدتوں لذت کے صنم کی پرستش بڑی دھوم دھام سے ہوتی رہی۔ زینو جو ایک مستقل مکتبۂ فکر (مدرسہ رواقیہ) کا مؤسس تھا۔ اس نے اس کے برعکس نفس کشی اور لذات سے کلی اجتناب کو خیر کا سرچشمہ قرار دیا۔ افلاطون استاد ہے اور ارسطو شاگرد، اقلیم دانش و حکمت کے دونوں تاجور ہیں، دونوں کی عبقریت شک و شبہ سے بالاتر ہے، دونوں کا زمانہ بھی ایک ہے لیکن یہ دو بھی متفقہ طور پر فیصلہ نہ کر سکے کہ خیر و شر کا معیار کیا ہے؟ استاد (مثل علیا) اور غیر محسوس جہاں کے طواف میں سرگرداں ہے اور اس کا شاگرد ارسطو، عالم محسوسات سے باہر قدم رکھنا پسند نہیں کرتا۔

یہ ذہنی خلفشار صرف اسی زمانہ کی خصوصیت نہیں جبکہ حکمت و فلسفہ اپنے ابتدائی مراحل میں تھے بلکہ آج بھی جبکہ فکر انسانی کی یلغار سے خلاؤں میں کہرام بپا ہے بے یقینی کی وہی کیفیت ہے۔ ہربرٹ سپنسر، جان لوک اور ہیگل وغیرہ جن فلسفیوں نے علم اخلاق کے موضوع پر اظہار خیال کیا ہے۔ ان کی ثقیل تحریریں پڑھ کر آپ کا سر چکرانے لگے گا۔ انہوں نے روحوں کو اضطراب، دلوں کو بے چینی اور عقلوں کو بے یقینی کے سوا کچھ نہیں دیا۔ انہوں نے کسی ایسی راہ کی نشاندہی نہیں کی جو مسافر کو منزل تک پہنچا دے۔ البتہ انہوں نے آبلہ پا راہیوں کے راستہ میں تشکیک کے کانٹے بڑی کثرت سے بکھیرے ہیں۔ یقین کی ٹمٹماتی ہوئی شمع جس کی مدھم لو میں افتاں و خیزاں وہ سوئے منزل رواں تھے وہ بھی بجھ گئی۔ ترجمانِ حقیقت حضرت اقبالؒ نے کیا خوب فرمایا ہے:

ہیگل کا صدف گہر سے خالی — ہے اس کا طلسم سب خیالی
انجام خرد ہے بے حضوری — ہے فلسفۂ زندگی سے دوری
افکار کے نغمہ ہائے بے صوت — ہیں ذوقِ عمل کے واسطے موت

ان کو اپنا راہبر بنانے والوں پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔ جب پردہ اٹھتا ہے اور وہ اپنے ممدوح کو اس کے صحیح روپ میں دیکھتے ہیں۔ وہ فضائل، وہ خصائل حمیدہ، وہ اخلاق عالیہ، جن کی تعریف میں اس نے صدہا ورق سیاہ کئے تھے اس کی عملی زندگی میں تو ان کا نام و نشان تک نہیں، بلکہ وہ تو رذائل کی دلدل میں کمر تک دھنسا ہوا ہے۔

ان کے علاوہ دوسرا گروہ جس نے اپنی قوم کے اخلاق کو درست کرنے کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں وہ انبیاء کرام کا گروہ تھا۔ ان کی باتیں سادہ اور واضح تھیں۔ ان کی تعلیمات میں الجھاؤ اور التباس نہیں تھا۔ ان کے ہاں پیچیدہ علمی اصطلاحات کی بھرمار نہیں تھی۔ بلکہ ان کے ارشادات عام فہم اور دلوں میں گھر کر جانے والے تھے۔ انہوں نے خیر و شر کا معیار لذت و الم، نفس پرستی یا نفس کشی کو قرار نہیں دیا۔ انہوں نے اخلاق حسنہ کی غرض و غایت بیان کرنے کے لیے سعادت، مسرت، قوت، غلبہ کے مبہم الفاظ استعمال نہیں کئے تاکہ ان کا شارح حسبِ منشا اُن کو معانی کا لباس پہناتا رہے بلکہ اس کد و کاوش اور جد و جہد کی غرض و غایت رضائے الٰہی کو قرار دے کر ان تمام فکری الجھنوں کو ختم کر دیا۔

اس سے بھی زیادہ جس چیز نے گروہ انبیاءؑ کی تعلیمات کو قبولِ عام بخشا اور اُن کے لیے دلوں کے دریچے کھول دیئے، وہ ان نفوسِ قدسیہ کے قول و عمل کی ہم آہنگی اور یکسانیت تھی۔ وہ دوسروں کو جس کام کے کرنے کا حکم دیتے پہلے خود اس پر کاربند ہوتے۔ مزید یہ کہ ان کے یہ

اعمال کسی ذاتی غرض اور منفعت سے وابستہ نہ تھے۔ ان کے اقوال کی دل نشینی، ان کے اعمال کا بانکپن اور ان کے خلوص کی مہک نے ان لوگوں کی کایا پلٹ دی جن کو ان کی صحبت کا فیضان نصیب ہوا۔

لیکن انبیاء سابقین کا دائرۂ کار محدود تھا۔ ان کی نصیحت کا مقصد کسی ایک قوم کی یا کسی ایک ملک کے باشندوں کی اصلاح تھا اور وہ بھی محدود وقت تک کے لئے۔ بارگاہِ الٰہی سے یہ شرف اور یہ اعزاز فقط عبد مکرم، رسول معظم محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ارزانی ہوا کہ آپؐ کی رسالت ہر اسود و احمر، عربی و عجمی، شرقی و غربی کے لئے تھی۔ ارشاد الٰہی ہے وما ارسلناك الا كافة للناس بشيرا و نذيرا۔ ہم نے آپ کو تمام اولادِ آدم کی طرف بشیر و نذیر بنا کر مبعوث فرمایا ہے۔ آپؐ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں آپ کا آفتابِ نبوت تا قیامت نور افشانی کے لئے طلوع ہوا ہے۔

اصلاحِ اخلاق کا فریضہ جو ہر نبی نے اپنے مقام اور حیثیت کے مطابق انجام دیا اس مقصد کی تکمیل کے لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے آپ کو وقف فرمایا۔ ارشاد ہے:

بعثت لاتمم مكارم الاخلاق

مجھے اس لئے مبعوث کیا گیا ہے کہ میں مکارم اخلاق کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دوں۔ تکمیلِ اخلاق کا یہ فریضہ حضور سرور عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جس حسن و خوبی سے انجام دیا اس کو سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل امور پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

۱۔ اخلاقی تعلیم کی جامعیت

۲۔ اندازِ تعلیم

۳۔ معلّم کی شخصیت

سابق انبیاء کرام کی تعلیمات جو ہم تک پہنچی ہیں ان سے صرف زندگی کے چند گوشوں میں راہنمائی ملتی ہے۔ حضرت ایوبؑ ہمیں مصائب و امراض میں صبر و استقامت کی ایک چٹان نظر آتے ہیں۔ حضرت یعقوبؑ اپنے بیٹے کے فراق میں آنسوؤں کی لڑیاں پروتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کی شریعت میں شدت اور سختی کا عنصر غالب ہے اور حضرت عیسیٰؑ کوہِ زیتون پر کھڑے اپنے سامعین کو عفو و درگزر، رحمت و شفقت کی تلقین کرتے سنائی دیتے ہیں۔ زندگی کے ایسے گوشے بھی ہیں جہاں ان نفوسِ قدسیہ نے قدم نہیں رکھا اور ایسے نقوش نہیں چھوڑے جن سے آنے والی نسلیں اپنی منزل کا سراغ لگا سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے زندگی کے تمام مہجور و متروک گوشوں کو نورِ ہدایت سے منور کرنے کے لئے اپنے حبیب مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمت للعالمین کی خلعتِ زیبا عطا فرما کر اپنی مخلوق کی چارہ گری کے لیے مبعوث فرمایا۔ حضورؐ کی سیرت طیبہ پر اگر سرسری نظر ڈالی جائے، ہمیں وہاں زندگی کی بوقلمونیوں کا ایک حسین و جمیل مرقع نظر آتا ہے۔ وہاں جنگ کی شعلہ سامانیاں بھی ہیں اور صلح کی رأفت و رحمت بھی، دشمنی و نفرت کے انگارے بھی برساتے ہیں اور عقیدت مند اپنی محبت و مؤدت کے رنگین پھول بھی نچھاور کر رہے ہوتے ہیں۔ ہم نے محبوبِ خدا کو حلقۂ یاراں میں بھی دیکھا ہے اور حملہ آوروں کے نرغہ میں بھی۔ ہم نے ان کی کاروباری مصروفیتوں کا بھی مطالعہ کیا ہے اور غارِ حرا کی خلوتوں میں ان کے سوز و گداز کا جائزہ بھی لیا ہے۔ ہم نے انھیں اپنے وطن سے بظاہر انتہائی بے بسی اور بے کسی میں ہجرت کرتے بھی دیکھا ہے اور پھر چند سال بعد اسی شہر میں فاتحانہ انداز میں داخل ہونے کا منظر بھی ملاحظہ کیا ہے۔ اپنے اہل و عیال کے ساتھ ان کے برتاؤ

کا ریکارڈ بھی ہمارے سامنے ہے اور اپنے جاں نثار اور وفا شعار ساتھیوں سے حسنِ سلوک کی تفصیلات بھی ہمارے پیش نظر ہیں۔ الغرض زندگی کے وسیع وعریض میدان کا کوئی کونا ایسا نہیں جہاں حبیب کبریاؐ نے اپنے اسوۂ حسنہ کے حسین وجمیل نقوش نہ چھوڑے ہوں۔ یہ جامعیت، یہ ہمہ گیری اسوۂ محمدیؐ کے علاوہ کہیں بھی نظر نہیں آتی۔ زندگی کے ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والا ہر آدمی اسی آبِ زلال سے اپنی پیاس بجھا سکتا ہے۔ اس دار شفا میں انسانیت کے ظاہری و باطنی، سیاسی و معاشی، سماجی اور اخلاقی ہر قسم کے ناقابلِ علاج روگوں کے لیے اکسیر موجود ہے۔

خاتم الانبیاؐ کو بارگاہِ الٰہی سے جو کتاب منیر مرحمت ہوئی اس کے مندرجہ ذیل مقامات کا ہی اگر آپ مطالعہ کریں تو آپ کو حضورؐ کا لایا ہوا نظامِ اخلاق اپنی تمامتر رعنائیوں اور جملہ زیبائیوں کے ساتھ جلوہ فگن ملے گا۔ سورۂ بقرہ کی آیات ۱۷۶ اور ۱۷۷، سورۃ المومنون کی ابتدائی آیات، سورۃ الفرقان کی آیات ۶۳ تا ۷۴۔

اندازِ تعلیم

مذکورہ بالا آیات میں اخلاق حسنہ کی اہمیت اور افادیت کو جس انداز سے بیان کیا گیا ہے اس سے کوئی سلیم الطبع متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ ارشادات جن میں اخلاقِ حسنہ کو اپنانے کی تلقین کی گئی ہے۔ وہ بھی بڑے دلنشین اور روح پرور ہیں۔ چند نمونے ملاحظہ فرمایئے۔ سرورِ کائنات علیہ التحیات والتسلیمات نماز میں اکثر یہ دعا مانگا کرتے:

اللھم اھدنی لاحسن الاخلاق لا یھدی لاحسنھا الا انت واصرف عنی سیئاتھا لا یصرف عنی سیئاتھا الا انت (مسلم شریف)

ترجمہ: اے اللہ بہترین اخلاق کی طرف میری راہنمائی فرما تیرے سوا بہترین اخلاق کی طرف کوئی راہنمائی نہیں کر سکتا اور بُرے اخلاق کو مجھ سے دُور کر دے کیونکہ تو ہی بُرے اخلاق کو مجھ سے دُور کر سکتا ہے۔

یہ اس پاک ہستی کی دُعا ہے جس کے اخلاقِ حسنہ کی گواہی عالم الغیب والشہادہ نے یوں دی ہے۔ وانک لعلی خلق عظیم۔ یہ اس پیکرِ خصائل حمیدہ کی دعا ہے جس کا دامن ہر قسم کی نازیبا حرکات کے داغ سے پاک ہے۔ ایسی ہستی جب عجز و نیاز سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ التجا کرتی ہوگی تو خود سوچیئے صحابہ کرامؓ کے دلوں پر اخلاقِ حسنہ کی اہمیت کے نقوش کس طرح ثبت ہوتے ہوں گے۔ اہلِ ایمان کے نزدیک ایمان سے بڑھ کر کوئی قیمتی دولت نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ماننے والوں کو جب یہ ارشاد فرمایا ہوگا تو اخلاق کریمہ کی اہمیت ان کی نگاہوں میں کتنی بڑھ گئی ہوگی۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

اکمل المومنین ایمانا احسنھم خلقاً

ترجمہ: جس شخص کا خلق بہترین ہوگا تمام مومنین میں سے اس کا ایمان اعلیٰ اور اکمل ہوگا۔

ہر نیک دل انسان عبادتِ الٰہی میں لذت و سرور محسوس کرتا ہے اور اس کا جی چاہتا ہے کہ یادِ الٰہی کی شمع فروزاں رہے اور وہ بصد جان اس پر قربان ہوتا رہے۔ ہو سکتا تھا کہ کوئی شخص کثرت عبادت پر ناز کرنے لگے اور اخلاقِ حسنہ کی اہمیت اس کی نگاہوں میں کم ہو جائے۔ اس اندیشے سے بچانے کے لئے اللہ تعالیٰ کے محبوب نے تنبیہہ فرما دی:

ان الرجل ليدرك بحسن خلقه درجة قائم الليل وصائم النهار (ابوداؤد)

انسان اپنے اخلاق کے باعث اس درجہ پر فائز ہو جاتا ہے جو رات بھر ذکرِ الٰہی میں کھڑے رہنے والے اور عمر بھر روزہ رکھنے والے کو نصیب ہوتا ہے۔ کون بندہ ہے جس کے دل میں اپنے پروردگار کی رضا اور محبت کی تمنا چٹکیاں نہ لے رہی ہو۔ اس کا طریقہ بتا دیا۔ احب عباد اللہ الی اللہ احسنهم اخلاقاً (طبرانی)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کے بندوں میں اس کے نزدیک سب سے زیادہ وہ محبوب ہوتا ہے جس کے اخلاق پسندیدہ ہوں۔ اس طرح ہر مومن کی یہ خواہش ہوگی کہ اس کے ہادی و مرشد صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پر نگاہِ لطف و کرم ہو اور قیامت کے روز اسے اپنے آقا کے قرب میں جگہ ملے چنانچہ اپنے مشتاقانِ جمال کو یہ فرما کر بشارت دی۔ ان احبکم الیّ واقربکم منی فی الآخرة محاسنکم اخلاقاً وان ابغضکم الی وابعدکم منی فی الآخرة مساویکم اخلاقاً۔

ترجمہ: تم میں سے مجھے سب سے پیارا اور آخرت میں سب سے زیادہ میرے قریب وہ شخص ہوگا جو خوش خلق ہے اور تم میں سے سب سے زیادہ ناپسندیدہ اور روزِ قیامت مجھ سے دُور وہ شخص ہوگا جو بدخلق ہے۔

بے شمار ارشاداتِ نبویؐ میں سے یہ چند اقوال پیشِ خدمت ہیں۔ اخلاقِ حسنہ کو اپنانے کی تڑپ پیدا کرنے کے لئے اس سے زیادہ مؤثر اور دلنشین اسلوب کوئی کہاں سے لائے گا۔

جن چیزوں کو اخلاقِ حسنہ کہا گیا ہے وہ کیا ہیں

انسانی معاشرہ کا فرد ہوتے ہوئے معاشرہ کے دوسرے افراد کے جو حقوق انسان پر واجب ہیں ان کو حسن و خوبی سے انجام دینا ہی حسن خلق کہلاتا ہے۔ ماں باپ، بیوی، بچے، پڑوسی، یتیم بیوہ، سائل، بیمار، مسافر، مجاہد، سب کے ساتھ مروت و احسان کرنے کی تاکید ارشاداتِ نبوت میں موجود ہے۔ یہ تعلیم اتنی جامع اور ہمہ گیر ہے کہ انسان تو انسان حیوانات و نباتات بھی اس میں داخل ہیں۔ شیر دار جانوروں کو تلف کرنے، پھل دار درختوں کو کاٹنے، لہلہاتے ہوئے کھیتوں کو ویران کرنے، بستے ہوئے گھروں کو اجاڑنے، ان سب چیزوں سے منع کر دیا گیا ہے۔ اسلوب تخاطب اتنا شیریں ہے کہ اس کی مٹھاس اور عذوبت روح کی گہرائیوں میں سرایت کر جاتی ہے۔ بخاری شریف میں ایک فاحشہ عورت کا تذکرہ ہے۔ جس کے عمر بھر گناہوں کو اللہ تعالیٰ نے اس لئے معاف فرمایا کہ اس نے پیاس سے تڑپتے ہوئے ایک کتے کو پانی پلا دیا تھا۔ بیوہ عورتوں، مسکین لوگوں کی خدمت کو جہاد فی سبیل اللہ کا درجہ دیا گیا ہے۔ بخاری شریف میں ہے:

الساعی علی الارملة والمساكين كالمجاهد فی سبيل الله وكالذی يصوم النهار ويقوم الليل

ترجمہ: بیوہ اور غریب کے لئے دوڑ دھوپ کرنے والا خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے کی طرح ہے اور اس عابد کی مانند ہے جو دن بھر روزہ رکھتا ہے اور رات بھر نماز پڑھتا ہے۔

یتیم کی حفاظت اور کفالت کے شوق کو یوں مہمیز لگائی ہے:

"انا وکافل الیتیم فی الجنة ھکذا"

"کہ میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں یوں ساتھ ساتھ ہوں گے جس طرح ہاتھ کی یہ دو انگلیاں"۔

بے شک معلمِ اخلاق کی تعلیمات ہمہ گیر اور عالمگیر ہیں اور اس کا اسلوبِ بیان بھی دلنشین اور لذیذ ہے۔ لیکن معلمِ کریمؐ کی شخصیت میں جو دلربائیاں اور رعنائیاں ہیں وہ قلب و نظر کو مسحور کر رہی ہیں۔ اس کی ایک جھلک دیکھ کر دل دیوانہ اور روح سرشار ہو جاتی ہے۔ ان کی ذات والاصفات میں جو بانکپن اور نکھار ہے اس نے ان کی دعوت کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔

کوئی ایسی بات نہیں فرمائی جس پر خود عمل کر کے نہ دکھایا ہو۔ لوگوں کو سچ بولنے اور امانت میں دیانت کو ملحوظ رکھنے کی تاکید کی تو خود راست گفتاری اور امانت داری کا وہ بلند معیار پیش کیا کہ خون کے پیاسے بھی صادق اور امین کہنے پر مجبور ہو گئے۔ لوگوں کو وعدہ پورا کرنے کی تلقین کی تو خود ایسے اصولوں کا پابند ہوئے کہ دشمن بھی عش عش کر اُٹھے۔ آپ کو معلوم ہے جب قیصرِ روم نے ابوسفیان کو اپنے دربار میں طلب کیا تاکہ حضورؐ کے اخلاق و کردار کے بارے میں دریافت کرے، ابوسفیان اس وقت اسلام اور رسولِ اسلام کا بدترین دشمن تھا، لیکن اس کو بھی مجبوراً یہ کہنا پڑا کہ آپؐ کے اخلاق بڑے بلند ہیں، وہ قول کے پکے اور بات کے سچے ہیں۔ عرب کے بدو اور اجڈ لوگ حضورؐ کے اخلاق کریمانہ کو دیکھ کر حضورؐ کے گرویدہ ہوئے تھے۔ مسجدِ نبوی کی تعمیر کا وقت آتا ہے۔ صحابہ کرامؓ اس کی بنیادیں کھود رہے ہیں۔ پتھر اور گارا اٹھا اٹھا کر لا رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کا حبیب بھی ان کے ساتھ کام میں برابر کا شریک ہے۔ غزوہ احزاب کے موقع پر جب عرب کے سارے مشرک قبائل نے مدینہ طیبہ پر دھاوا بول دیا، اسلام کے اس مرکز کے دفاع کے لئے خندق کھودنے کا منصوبہ طے ہوا، صحابہ کرامؓ کی طرح حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہاتھ میں کدال لئے خود بھی خندق کھودنے میں مصروف ہیں۔ گیسوئے عنبریں پر مٹی گر رہی ہے، روئے زیبا پر گرد پڑ رہی ہے، اس روح پرور منظر کو دیکھ کر مجاہدینِ اسلام پر کیف و مستی کا عالم طاری ہو جاتا ہے اور وہ بے خودی کی حالت میں یہ شعر پڑھتے ہیں:

نحن الذین بایعوا محمدا   علی الجھاد ما بقینا ابدا

ترجمہ: ہم وہ جاں فروش ہیں جنہوں نے محمد مصطفیٰؐ کے دستِ مبارک پر تادمِ واپسیں جہاد کرنے کی بیعت کی ہے۔

سرورِ عالم ہادی برحقؐ ان کے جوشِ ایمانی کو دیکھ کر جواباً فرماتے ہیں:

اللھم لا عیش الا عیش الآخرہ   فاغفر الانصار والمھاجرہ

اے اللہ! زندگی تو بس آخرت کی زندگی ہے۔ الٰہی میرے انصار اور مہاجرین کو بخش دے۔

لشکرِ اسلام میدانِ بدر کی طرف کوچ کر رہا ہے۔ تین تین سپاہیوں کے لیے ایک سواری کا انتظام ہو سکا ہے۔ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلّم نے بھی اپنی سواری میں سیدنا علیؓ اور مرثدؓ بن ابی مرثد کو شریک کر لیا ہے۔ مدینہ طیبہ سے جب قدسیوں کا یہ لشکر نکلتا ہے تو حضورؐ اونٹنی پر سوار ہیں، مقررہ مسافت طے کرنے کے بعد حضورؐ اُتر جاتے ہیں اور اپنے ساتھیوں کو حکم دیتے ہیں کہ ان میں سے ایک سوار ہو جائے۔ وہ عرض کرتے ہیں کہ ان کی باری میں بھی حضورؐ ہی سوار رہیں اس سے انھیں روحانی مسرت ہوگی۔ حضورؐ جانتے ہیں کہ یہ پیشکش صدقِ دل سے کی جا رہی ہے لیکن حضورؐ کو اچھی طرح علم ہے کہ حضورؐ کا مقام اقدارِ عالیہ کے معلم اور استاد کا ہے، حضورؐ ان کی

اس مخلصانہ پیش کش کو قبول نہیں فرماتے بلکہ انہیں یوں جواب دیتے ہیں -

ما انتما باقوی منی ولا انا اغنیٰ عنکما من الاجر -

کہ نہ تم مجھ سے طاقتور ہو اور نہ یہ بات ہے کہ تمہیں مجھ سے زیادہ اجر و ثواب کی ضرورت ہے - چرخِ پیر نے بھی یہ منظر کا ہے کو دیکھا ہوگا کہ لشکر کا سپہ سالار، اُمت کا سردار اور مجاہدین کا محبوب قائد ناقہ کی نکیل ہاتھ میں لیے پیدل چل رہا ہے اور ایک سپاہی اونٹنی پر سوار ہے۔

یہی وہ اسوۂ حسنہ ہے جس نے سب کے دلوں کو موہ لیا، یہی وہ اخلاق کریمانہ تھے جنہوں نے سب کو حضورؐ کی محبت کا اسیر بنا لیا - یہی وہ سیرت کا بلند معیار تھا جس نے عرب جیسی وحشی درندہ صفت اور درشت قوم کو کاروانِ انسانیت کا امام بنا دیا - اس معلمِ اخلاق کی تربیت سے وہ اُمت تیار ہوئی جس کے بارے میں خالقِ دو جہاں نے فرمایا :

کنتم خیر امة اخرجت للناس

شیم الحبیب

مصنف: مفتی الٰہی بخش کاندھلوی | مترجم: مولانا اشرف علی تھانوی

میں اللہ تعالیٰ کی تعریف کرتا ہوں جس نے ہماری طرف ایک رسول کو بھیجا جو عربی، ہاشمی، مکی مدنی سردار، امین، سچی خبریں دینے والے سچی خبریں دے گئے قریشی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ پر اور آپ کی آل و اصحاب پر جو کہ آپ کے محب خاص اور رازدار با اختصاص تھے۔ رحمت نازل فرما دے اور بعد حمد و صلوٰۃ کے مدعا یہ ہے کہ علماء (ہمیشہ سے) نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شمائل کو جمع کرتے رہے۔

اور اس باب میں نوبنو مسلک اور اعتدال طریق پر چلتے رہے۔ لیکن بعض نے اس قدر تطویل کی جس سے دل اُکتا جاوے اور بعض نے اس قدر اختصار کیا کہ فہم مطلب ہی میں خلل پڑ جاوے اور لوگ مختلف ہوتے ہیں بعضے (تطویل یا ایجاز سے) بھاگتے ہیں اور بعضے اس کے شائق اور طالب ہوتے ہیں۔ (سو تطویل و اختصار سے نفع عام نہیں ہوتا بخلاف مقدار اوسط مناسب کے کہ وہ ہر شخص کے مذاق کے موافق ہوتا ہے) اس لیے میں نے ارادہ کیا کہ آپ کے محاسن اوصاف و مکارم اخلاق اور شمائل اور خصائل میں سے ایک مختصر حصہ مگر کافی شافی قلمبند کروں کیونکہ عاشق سرگشتہ و مہجور حبیب محروم وصال ہوتا ہے تو منزل محبوب یا خط و خال ہی کو یاد کر کے اپنے دل کو سمجھاتا ہے اور محبوب کے جمال اور اوصاف کا بیان و تذکرہ کر کے اپنا جی بہلاتا ہے اور اسی کے ساتھ اس میں حصولِ ثواب اور نجات من العذاب اور شفاعت محبوب رب الارباب اور دعائے طالبین و احباب کی بھی امید رکھتا ہوں اور یہ امید کیسے نہ رکھوں جبکہ حسن عمل کا کوئی وسیلہ میرے پاس نہیں اور عمر تمام معاصی اور لغزشوں میں صرف ہوئی اس لیے میں نے آپ کے شمائل و مدائح و فضائل کے تذکرہ کا دامن پکڑا۔ اللہ تعالیٰ مجھ سے اور سب مسلمانوں سے اس کو قبول فرمائے اور مستحق جمیع محامد کا وہی رب العالمین ہے اور چونکہ کتاب الشمائل امام ترمذی رحمۃ اللہ کی اور کتاب الشفاء قاضی عیاض رحمۃ اللہ کی اس باب میں جامع تر اور ضابطہ ترتھیں اس لیے میں نے انہی دو کتابوں سے ایسے مضامین منتخب کیے جو طالب راغب کو (دوسری کتابوں سے) بے نیاز کر دیں اور جن سے مہجور مشتاق دل کو تسلی ہو سکے۔ سو ہم امام حسنؓ بن علی کی روایت سے جو کہ ہندؓ سے مروی ہے شروع کرتے ہیں کیونکہ وُہ فصاحت و بلاغت کے منتہی پیمانہ پر ہے اور معدن نبوت و رسالت یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم صلوٰۃ و سلاماً تا مین کاملین کے بیان خصوصیات کے اعلیٰ درجہ میں ہے۔ پس میں کہتا ہوں (وصل اوّل آپ کے حلیہ شریف میں) قاضی ممدوح نے اپنے اسناد معنعن سے جو کہ امام زین العابدینؒ تک پہنچتی ہے روایت کیا ہے کہ انھوں نے کہا کہ حضرت حسنؓ بن علیؓ نے فرمایا کہ میں نے اپنے ماموں ہند بن ابی ہالہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ دریافت کیا اور وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بکثرت ذکر اوصاف کیا کرتے تھے اور میں امیدوار رہا کہ ان اوصاف میں سے کچھ میرے سامنے بھی بیان کریں جس کو میں اپنے ذہن میں جماؤں۔ پس اُنھوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (اپنی ذات میں) عظیم تھے (نظروں میں) معظم تھے آپ کا چہرۂ مبارک ماہِ بدر کی طرح چمکتا تھا بالکل میانہ قد آدمی سے تو

قامت میں قدرے نکلے ہُوئے تھے اور دراز قدسے قامت میں کم تھے۔ سرِ مبارک (اعتدال کے ساتھ) کلاں تھا۔ مُوئے سر سیدھے قدرے بَل دار تھے۔ اگر سر کے بالوں کو جمع کرتے وقت اُن میں (اتفاقاً از خود) مانگ نکل آتی تو مانگ نکلی رہنے دیتے تھے ورنہ نہیں (یعنی ابتداءِ اسلام میں ایسا معمول تھا اور بعد میں تو قصداً مانگ نکالتے تھے) آپ کے موئے سر نرمہ گوش سے تجاوز کر جاتے تھے جبکہ آپ بالوں کو بڑھائے ہوئے تھے آپ کا رنگ مبارک چمکدار تھا، پیشانی فراخ تھی، ابرو خمدار بالوں سے پُر تھی اور باہم پیوستہ نہ تھیں اُن دونوں کے درمیان میں ایک رگ تھی کہ وُہ غصہ میں اُبھر جاتی تھی۔ بلند بینی تھے بینی مبارک پر ایک نور نمایاں تھا کہ جو شخص تامل نہ کرے آپ کو دراز بینی سمجھے۔ ریش مبارک بھری ہوئی تھی پتلی خُوب سیاہ تھی رُخسار مبارک سُبک تھے۔ دہن مبارک (اعتدال کے ساتھ) فراخ تھا (یعنی تنگ نہ تھا نہ یہ کہ زیادہ فراخ تھا) دندان مبارک باریک آبدار تھے اور ان میں (ذرا ذرا) ریخیں تھیں۔ سینہ سے ناف تک بالوں کا ایک باریک خط تھا۔ گردن مبارک ایسی (خوبصورت) تھی جیسی تصویر کی گردن (خوب صورت تراشی جاتی ہے) صفائی میں چاندی جیسی تھی۔ بدن جسامت میں معتدل اور پُرگوشت اور کسا ہوا تھا۔ شکم اور سینہ مبارک ہموار تھا اور سینہ قدرے اُبھرا ہوا تھا آپ کے شانوں کے درمیان قدرے (اوروں سے زائد) فاصلہ تھا جوڑ پر کی ہڈیاں کلاں تھیں۔ کپڑا اتارنے کی حالت میں آپ کا بدن روشن تھا۔ سینہ اور ناف کے درمیان لکیر کی طرح بالوں کی ایک متصل دھاری چلی آتی تھی اور ان بالوں کے سوا ثدیین (وغیرہ) پر بال نہ تھے (البتہ) دونوں بازو اور شانوں سینہ کے بالائی حصہ پر (مناسب مقدار سے) بال تھے۔ کلائیاں دراز تھیں ہتھیلی فراخ تھی۔ کفین اور قدمین پُرگوشت تھے۔ (یا تھ پاؤں کی انگلیاں لمبی تھیں یا راوی نے بلند کہا ہے (کہ اس کا بھی وہی حاصل ہے)

اعصاب آپ کے برابر تھے۔ آپ کے تلوے (قدرے) گہرے تھے (کہ چلنے میں زمین کو نہ لگتے) قدم مبارک ہموار اور ایسے صاف تھے کہ پانی اُن پر سے (بالکل ڈھل جاتا یعنی میل کچیل خشونت وغیرہ سے پاک تھے چکنے ہونے سے پانی ان کو ذرا نہ لگا رہتا) جب چلنے کے لیے پاؤں اُٹھاتے تو قوت سے پاؤں اکھڑتا تھا اور قدم اس طرح رکھتے کہ آگے کو جُھک پڑتا تھا اور تواضع کے ساتھ قدم بڑھا کر چلتے۔ چلنے میں ایسا معلوم ہوتا گویا (کسی بلندی سے) پستی میں اُتر رہے ہیں جب کسی (کروٹ) کی طرف (کی چیز) کو دیکھنا چاہتے تو پورے پھر کر دیکھتے (یعنی کن انکھیوں سے دیکھنے کی عادت نہ تھی) نگاہ نیچی رکھتے آسمان کی طرف نگاہ کرنے کی نسبت زمین کی طرف آپ کی نگاہ زیادہ رہتی۔ عموماً عادت آپ کی گوشۂ چشم سے دیکھنے کی تھی (مطلب یہ کہ غایت حیا سے پورا سر اٹھا کر نگاہ بھر کر نہ دیکھتے) اپنے اصحاب کو چلنے میں آگے کر دیتے۔ جس سے ملتے خود ابتداءِ السلام فرماتے۔ پھر میں نے (یعنی امام حسنؓ نے ہند بن ابی ہالہ سے) کہا آپ کی گفتگو کے متعلق مجھ سے بیان کیجیے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت (آخرت کے) غم میں اور ہمیشہ (امورِ آخرت کی) سوچ میں رہتے کسی وقت آپ کو چین نہیں ہوتا تھا اور بلا ضرورت کلام نہ فرماتے تھے۔ آپ کا سکوت طویل ہوتا تھا کلام کو شروع اور ختم مُنہ بھر کر فرماتے (یعنی گفتگو اوّل سے آخر تک نہایت صاف ہوتی) کلام جامع فرماتے (جس کے الفاظ مختصر ہوں مگر پُر مغز ہوں) آپ کا کلام (حق و باطل میں) فیصلہ کن ہوتا جو حشو و زوائد ہوتا اور نہ تنگ ہوتا۔ آپ نرم مزاج تھے نہ مزاج میں سختی تھی اور نہ مخاطب کی اہانت فرماتے نعمت اگر قلیل بھی ہوتی تب بھی اس کی تعظیم فرماتے اور کسی نعمت کی مذمت نہ فرماتے مگر کھانے کی چیز کی مذمت اور مدح دونوں نہ فرماتے (مذمت تو اس لیے نہ فرماتے کہ وہ نعمت تھی اور مدح زیادہ اس لیے نہ فرماتے کہ اکثر اس کا سبب

حرص اور طلب لذت ہوتی ہے) جب امر حق کی کوئی شخص ذرا مخالفت کرتا تو اس وقت آپ کے غصہ کی کوئی تاب نہ لا سکتا تھا جب تک کہ اس حق کو غالب کر لیتے اور اپنے نفس کے لیے غضبناک نہ ہوتے تھے اور نہ نفس کے لیے انتقام لیتے اور (گفتگو کے وقت) جب آپ اشارہ کرتے تو پورے ہاتھ سے اشارہ کرتے اور جب کسی امر پر تعجب فرماتے تو ہاتھ کو لوٹتے، جب آپ بات کرتے تو اس کو یعنی داہنے انگوٹھے کو بائیں ہتھیلی سے متصل کرتے یعنی اس پر مارتے اور جب آپ کو غصہ آتا تو آپ اُدھر سے مُنہ پھیر لیتے اور کروٹ بدل لیتے اور جب خوش ہوتے تو نظر نیچی کر لیتے (یہ دونوں امر ناشی حیا سے ہیں) اکثر ہنسنا آپ کا تبسم ہوتا اور اس میں دندان مبارک جو ظاہر ہوتے تو ایسے معلوم ہوتے جیسے بارش کے اولے۔

وصل دوم آپ کے تقسیم اوقات و طرز معاشرت میں :

حضرت حسنؓ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک زمانہ تک حسینؓ بن علیؓ سے اس کو چھپائے رکھا پھر جو میں نے اُن سے بیان کیا تو معلوم ہُوا کہ وُہ مجھ سے پہلے اپنے والد سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گھر میں جانا باہر آنا نشست و برخاست طرز طریق سب پوچھ چکے ہیں اور کوئی بات بھی (بے تحقیق کیے ہُوئے) نہیں چھوڑی غرض امام حسینؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے والد ماجد سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں تشریف رکھنے کے متعلق پُوچھا انہوں نے فرمایا کہ آپ کا گھر میں اپنے ذاتی حوائج (طعام و منام وغیرہ) کے لیے تشریف لے جانا آپ اس باب میں (منجانب اللہ) ماذون تھے سو آپ اپنے گھر میں تشریف لاتے تو آپ اپنے اندر رہنے کے وقت کو تین حصوں پر تقسیم فرماتے ایک حصہ اللہ تعالیٰ (کی عبادت) کے لیے اور ایک حصہ اپنے گھر والوں (کے حقوق ادا کرنے) کے لیے (جیسے اُن سے ہنسنا بولنا) اور ایک حصہ اپنے نفس (کی راحت) کے لیے پھر اپنے حصہ کو اپنے اور لوگوں کے درمیان تقسیم فرما دیتے (یعنی اُس میں سے بھی بہت سا وقت اُمت کے کام میں صرف فرماتے) اور اُس حصۂ وقت کو خاص اصحاب کے واسطے سے عام لوگوں کے کام لگا دیتے (یعنی اس حصہ میں عام لوگ تو نہیں آ سکتے تھے مگر خواص حاضر ہوتے اور دین کی باتیں سن کر عوام کو پہنچاتے اس طرح سے لوگ بھی ان منافع میں شریک ہو جاتے) اور لوگوں سے کسی چیز کا اخفاء نہ فرماتے (یعنی احکام دینیہ کا اور نہ متاع دنیوی کا بلکہ ہر طرح کا نفع بلا دریغ پہنچاتے) اور اس حصہ امت میں آپ کا طرز یہ تھا کہ اہل فضل (یعنی اہل علم و عمل) کو آپ اس امر میں اوروں پر ترجیح دیتے کہ ان کو حاضر ہونے کی اجازت دیتے اور اُس وقت کو ان لوگوں پر بقدر ان کے فضیلت دینیہ کے تقسیم فرماتے سو ان میں سے کسی ایک کو ایک ضرورت ہوتی کسی کو دو ضرورتیں کسی کو زیادہ ضرورتیں ہوتیں تو ان کی حاجت میں مشغول ہوتے اور ان کو ایسے شغل میں لگاتے جس میں ان کی اور بقیہ امت کی اصلاح ہو وہ شغل یہ کہ وہ لوگ آپ سے پُوچھتے اور ان کے مناسب حال امور کی اُن کو اطلاع دیتے اور آپ یہ فرمایا کرتے کہ جو تم میں حاضر ہے وُہ غیر حاضر کو خبر کر دیا کرے اور (یہ بھی فرماتے کہ) جو شخص اپنی حاجت مجھ تک (کسی وجہ مثلاً پردہ یا ضعف یا بعد وغیرہ ذلک) نہ پہنچا سکے تو تم لوگ اُس کی حاجت مجھ تک پہنچا دیا کرو کیونکہ جو شخص ایسے شخص کی حاجت کسی ذی اختیار تک پہنچا دے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اُس کو پُلصراط پر ثابت قدم رکھے گا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں انہی باتوں کا تذکرہ ہوتا تھا اور اس کے خلاف دوسری بات قبول نہ فرماتے (مطلب یہ کہ لوگوں کے حوائج و منافع کے سوا دوسری لایعنی یا مضر باتوں کی سماعت بھی نہ فرماتے) اور سفیان بن وکیع کی حدیث میں حضرت علیؓ کا یہ قول بھی ہے کہ لوگ آپ کے پاس طالب ہو کر آتے اور کچھ نہ کچھ کھا کر واپس ہوتے (یعنی آپ علاوہ

نفع علمی کے کچھ نہ کچھ کھلاتے بھی تھے) اور ہادی یعنی فقیہہ ہوکر آپ کے پاس سے باہر نکلتے۔ امام حسینؓ فرماتے ہیں کہ میں نے (اپنے والد سے عرض کیا کہ آپ کے باہر تشریف رکھنے کے حالات بھی مجھ سے بیان کیجیے کہ اُس وقت میں کیا کرتے تھے۔ انھوں نے فرمایا کہ آپ اپنی زبان کو لایعنی باتوں سے محفوظ رکھتے تھے اور لوگوں کی تالیفِ قلب فرماتے تھے اور اُن میں تفریق نہ ہونے دیتے تھے اور ہر قوم کے آبرو دار آدمی کی آبرو کرتے تھے اور ایسے آدمی کو اُس قوم پر سردار مقرر فرما دیتے تھے اور لوگوں کو (امورِ مضرّہ سے) حذر رکھنے کی تاکید فرماتے تھے اور ان (کے شر) سے اپنا بھی بچاؤ رکھتے تھے مگر کسی شخص سے کشادہ روئی اور خوش خوئی میں کمی نہ کرتے تھے اپنے ملنے والوں کی حالت کا استفسار رکھتے تھے اور لوگوں میں جو واقعات ہوتے تھے آپ ان کو پُوچھتے رہتے تاکہ مظلوم کی نصرت اور مفسدوں کا انسداد ہو سکے اور اچھی بات کی تحسین اور تصویب اور بُری بات کی تقبیح اور تحقیر فرماتے۔ آپ کا ہر معمول نہایت اعتدال کے ساتھ ہوتا تھا اس میں بے انتظامی نہیں ہوتی تھی (کہ کبھی کسی طرح کر لیا کبھی کسی طرح کر لیا۔ لوگوں کی تعلیم مصلحت سے) غفلت نہ فرماتے بوجہ اس احتمال کے کہ اگر اُن کو اُن کے حال پر چھوڑ دیا جانے تو بعضے خود دین سے غافل ہو جاویں گے یا (بعضے امورِ دین میں اعتدال سے زیادہ مشغول ہو کر دین سے) اُکتا جاویں گے ہر حالت کا آپ کے یہاں ایک خاص انتظام تھا۔ حق سے کبھی کوتاہی نہ کرتے اور ناحق کی طرف کبھی تجاوز کر کے نہ جاتے لوگوں میں سے آپ کے مقرب بہترین لوگ ہوتے سب میں افضل آپ کے نزدیک وہ شخص ہوتا جو عام طور سے سب کا خیرخواہ ہوتا اور سب سے بڑا رتبہ اُس شخص کا ہوتا جو لوگوں کی غم خواری و اعانت بخوبی کرتا۔ پھر میں نے اُن سے آپ کی مجلس کے بارہ میں پوچھا کہ اس میں آپ کا کیا معمول تھا انھوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بیٹھنا اور اٹھنا سب ذکر اللہ کے ساتھ ہوتا اور اپنے لیے کوئی جگہ بیٹھنے کی (ایسی) معین نہ فرماتے (کہ خواہ مخواہ اسی جگہ بیٹھیں اور اگر کوئی بیٹھ جاوے تو اس کو اُٹھا دیں) اور دوسروں کو بھی (اس طرح) جگہ معین کرنے سے منع فرماتے اور جب کسی مجمع میں تشریف لے جاتے اور جس جگہ مجلس ختم ہوتی وہاں ہی بیٹھ جاتے اور دوسروں کو بھی یہی حکم فرماتے اور اپنے جلیسوں میں سے ہر شخص کو اس کا حصّہ (اپنے خطاب و توجہ سے) دیتے (یعنی سب پر جدا جدا متوجہ ہو کر خطاب فرماتے) یہاں تک کہ آپ کا ہر جلیس یُوں سمجھتا کہ مجھ سے زیادہ آپ کو کسی کی خاطر عزیز نہیں، جو شخص کسی ضرورت کے لیے آپ کو لے کر بیٹھ جاتا یا کھڑا رکھتا تو جب تک وہی شخص نہ ہٹ جاتا آپ اس کے ساتھ مقید رہتے۔ جو شخص آپ سے کچھ حاجت چاہتا تو بدون اس کے کہ اُس کی حاجت پُوری فرماتے یا نرمی سے جواب دیتے اس کو واپس نہ کرتے آپ کی کشادہ روئی اور خوشخوئی تمام لوگوں کے لیے عام تھی گویا بجائے اُن کے باپ کے ہو گئے تھے اور تمام لوگ آپ کے نزدیک حق میں (فی نفسہٖ) مساوی تھے (البتہ) تقویٰ کی وجہ سے متفاوت تھے (یعنی تقویٰ کی زیادتی سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دیتے تھے اور امور میں سب باہم متساوی تھے) اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ حق میں سب آپ کے نزدیک برابر تھے آپ کی مجلس حلم اور علم و حیا اور صبر و امانت کی مجلس ہوتی تھی اس میں آوازیں بلند نہ کی جاتی تھیں اور کسی کی حرمت پر کوئی داغ نہ لگایا جاتا اور کسی کی غلطیوں کی اشاعت نہ کی جاتی تھی۔ آپ کے اہلِ مجلس ایک دُوسرے کی طرف تقویٰ کے سبب متواضع مائل ہوتے تھے اس میں بڑوں کی توقیر کرتے تھے اور چھوٹوں پر مہربانی کرتے تھے اور صاحبِ حاجت کی اعانت کرتے تھے اور بے وطن پر رحم کرتے تھے۔ پھر میں نے ان سے آپ کی سیرت اپنے اہلِ مجلس کے ساتھ دریافت کی انھوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمہ وقت کشادہ رُو رہتے نرم اخلاق تھے آسانی سے موافق ہو جاتے تھے نہ سخت خُو تھے نہ درشت گو تھے نہ چلّا کر

بولتے اور نہ نامناسب بات فرماتے تھے نہ کسی کا عیب بیان کرتے اور نہ (مبالغہ کے ساتھ) کسی کی مدح فرماتے جو بات (یعنی خواہش کسی کی) آپ کی طبیعت کے خلاف ہوتی اُس سے تغافل فرما جاتے (یعنی اس پر گرفت نہ فرماتے) اور (تصریحاً) اُسے مایوس (بھی) نہ فرماتے (بلکہ خاموش ہو جاتے) آپ نے تین چیزوں سے تو اپنے کو بچا رکھا تھا، ریاء سے اور کثرتِ کلام سے اور بے سُود بات سے، اور تین چیزوں سے دوسرے آدمیوں کو بچا رکھا تھا کسی کی مذمت نہ فرماتے کسی کو عار نہ دلاتے اور نہ کسی کا عیب تلاش کرتے اور وہی کلام فرماتے جس میں اُمید ثواب کی ہوتی اور جب آپ کلام فرماتے تھے آپ کے تمام جلیس اسی طرح سر جُھکا کر بیٹھ جاتے جیسے ان کے سروں پر پرندے آکر بیٹھ گئے ہوں، اور جب آپ ساکت ہوتے تب وہ لوگ بولتے۔ آپ کے سامنے کسی بات میں نزع نہ کرتے۔ آپ کے پاس جو شخص بولتا اُس سے فارغ ہونے تک سب خاموش رہتے (یعنی بات کے بیچ میں کوئی نہ بولتا) اہل مجلس (میں سے ہر شخص) کی بات (رغبت کے ساتھ سُنے جانے میں) ایسی ہی ہوتی جیسے سب میں پہلے شخص کی بات تھی (یعنی کسی کے کلام کی بے قدری نہ کی جاتی) جس بات سے سب ہنستے آپ بھی ہنستے جس سے سب تعجب کرتے آپ بھی تعجب فرماتے اور پردیسی آدمی کی بے تمیزی کی گفتگو پر تحمل فرماتے اور فرمایا کرتے کہ جب کسی صاحبِ حاجت کو طلبِ حاجت میں دیکھو تو اس کی اعانت کرو، اور کوئی آپ کی ثناء کرتا تو آپ اس کو جائز نہ رکھتے البتہ اگر کوئی (احسان کی) مکافات کے طور پر کرتا تو خیر (بوجہ مشروع ہونے اس ثناء کے بشرط عدم تجاوز حد کے اس کو گوارا فرما لیتے) اور کسی بات کو نہ کاٹتے، یہاں تک کہ وہ حد سے بڑھنے لگتا اُس وقت اُس کو ختم کرا دینے سے یا اُٹھ کر کھڑے ہو جانے سے قطع فرما دیتے اور ایک روایت میں ہے کہ میں نے کہا آپ کا سکوت کس کیفیت کا تھا انہوں نے کہا کہ آپ کا سکوت چار امر پر مشتمل ہوتا تھا حلم اور بیدار مغزی اور اندازہ کی رعایت اور فکر (آگے ہر ایک کا بیان ہے) سو اندازہ کی رعایت تو یہ کہ حاضرین کی طرف نظر کرنے میں اور اُن کی عرض معروض سُننے میں برابری فرماتے تھے اور فکر باقی اور خالی میں فرماتے تھے (یعنی دنیا کے فنا اور عُقبیٰ کی بقاء کو سوچا کرتے) اور حلم آپ کا صبر یعنی ضبط کے ساتھ جمع کر دیا گیا تھا (آگے اس ضبط کا بیان ہے) سو آپ کو کوئی چیز ایسا غضبناک نہ کرتی تھی کہ آپ کو از جا رفتہ کر دے اور بیدار مغزی آپ کی چار امر کی جامع ہوتی تھی ایک نیک بات کو اختیار کرنا تاکہ اور لوگ آپ کا اقتداء کریں۔ دُوسرے بُری بات کو ترک کرنا تاکہ اور لوگ بھی باز رہیں تیسرے رائے کو اُن امور میں صرف کرنا جو آپ کی اُمت کے لیے مصلحت ہو چوتھے اُمت کے لیے اُن امور کا اہتمام کرنا جن میں اُن کی دنیا اور آخرت دونوں کے کاموں کی درستی ہو۔

وصل سوم تتمہ وصل اوّل میں :

جاننا چاہیے کہ اسی طرح کے شمائل متفرق حدیثوں میں ان حضرات سے وارد ہُوئے ہیں حضرت انسؓ حضرت ابو ہریرہؓ حضرت براء بن عازبؓ حضرت عائشہؓ حضرت ابو جحیفہؓ حضرت جابر بن سمرۃؓ حضرت امّ معبدؓ حضرت ابن عباسؓ حضرت معرض بن معیقیبؓ حضرت ابو الطفیلؓ حضرت عداء بن خالدؓ حضرت خریم بن فاتکؓ حضرت حکیم بن حزامؓ ہم بھی ثواب حاصل کرنے کی غرض سے

مختصر سا اس میں سے ذکر کرتے ہیں پس ان سب حضرات نے روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رنگ مبارک چمکتا ہوا تھا آپ کی پتلی نہایت سیاہ تھی بڑی بڑی آنکھیں تھیں۔ آنکھوں میں سرخ ڈورے تھے۔ مژگانیں آپ کی دراز تھیں۔ دونوں ابروؤں کے درمیان قدرے کشادگی تھی ابرو خمدار تھی بینی مبارک بلند تھی وندان مبارک میں کچھ ریخیں تھیں (یعنی بالکل اوپر تلے چڑھے ہوئے نہ تھے) چہرہ مبارک گول تھا جیسا چاند کا ٹکڑا۔ ریش مبارک گنجان تھی کہ سینہ مبارک بھر دیتی تھی شکم اور سینہ ہموار تھا سینہ چوڑا تھا۔ دونوں شانیں کلاں تھے استخواں بھاری تھیں دونوں کلائیاں اور بازو اور اسفل بدن (ساق وغیرہ) بھرے ہوئے تھے دونوں کف دست اور قدم کشادہ تھے سینہ سے ناف تک بالوں کا ایک باریک خط تھا قد مبارک میانہ تھا نہ تو بہت زیادہ دراز نہ بہت کوتاہ کہ اعضاء ایک دوسرے میں دھنسے ہوئے ہوں اور رفتار میں کوئی آپ کے ساتھ نہ رہ سکتا تھا (یعنی رفتار میں ایک گونہ سرعت تھی مگر بے تکلف) آپ کا قامت قدرے درازی کی طرف نسبت کیا جاتا تھا (یعنی طویل تو نہ تھا مگر دیکھنے میں قد اونچا معلوم ہوتا تھا) بال قدرے بل دار تھے جب ہنسے میں دندان مبارک ظاہر ہوتے تو جیسے برق کی روشنی نمودار ہوتی ہے جیسے اولے بارش کے ہوتے ہیں جب آپ کلام فرماتے تو سامنے کے دانتوں کے بیچ میں سے ایک نور سا نکلتا معلوم ہوتا تھا گردن نہایت خوب صورت تھی چہرہ مبارک پھولا ہوا نہ تھا اور نہ بالکل گول تھا (بلکہ مائل بتدویر تھا) بدن گٹھا ہوا تھا گوشت ہلکا تھا اور دوسری روایتوں میں ہے کہ آنکھوں میں سفیدی کے ساتھ سرخی تھی جوڑ بند کلاں تھے۔ جب زمین پر پاؤں رکھتے تو پورا پاؤں رکھتے تھے تلوے میں زیادہ گڑھا نہ تھا یہ تمام کتاب شفا کے مضمون کا خلاصہ ہے اور ترمذی نے اپنے شمائل میں حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے کہ ہمارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں کف دست اور دونوں قدم پُرگوشت تھے سر مبارک کلاں تھا۔ جوڑ کی ہڈیاں بڑی تھیں۔ نہ بہت طویل القامت تھے اور نہ کوتاہ قامت تھے کہ بدن کا گوشت ایک دوسرے میں دھنسا ہوا ہو آپ کے چہرہ مبارک میں ایک گونہ گولائی تھی۔ رنگ گورا تھا اس میں سرخی دمکتی تھی۔ سیاہ آنکھیں تھیں۔ مژگانیں دراز تھیں۔ شانے کی ہڈیاں اور شانے بڑے بڑے تھے۔ بدن مبارک بے مُو تھا (یعنی بدن پر بال نہ تھے البتہ سینہ سے ناف تک بالوں کی باریک دھاری تھی جب کسی (کروٹ) کی طرف (کی چیز) کو دیکھنا چاہتے تو پورے پھر کر دیکھتے۔ آپ کے دونوں شانوں کے درمیان مُہرِ نبوت تھی اور آپ خاتم النبیین تھے۔ اور حضرت جابرؓ بن سمرہ کی روایت میں ہے کہ آپ کا دہن مبارک (اعتدال کے ساتھ) فراخ تھا۔ ایڑیوں کا گوشت ہلکا تھا۔ آنکھوں میں سُرخ ڈورے تھے۔ جب آپ کی طرف نظر کرو تو یوں سمجھو کہ آپ کی آنکھوں میں سُرمہ پڑا ہے حالانکہ سُرمہ پڑا نہ ہوتا تھا اور حضرت ابوالطفیل لیثی نے کہا ہے کہ آپ گورے ملیح میانہ قد تھے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آپ میانہ قامت خوش اندام گندمی رنگ تھے۔ موئے سر دراز تھے بن گوش تک۔ آپ پر ایک سُرخ (دھاری دار) جوڑا تھا۔ اور شمائل ترمذی میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ بہت دراز تھے اور نہ کوتاہ قامت تھے اور نہ بالکل گورے بھبوکا تھے اور نہ سانولے تھے اور موئے مبارک آپ کے نہ بالکل خمدار تھے اور نہ بالکل سیدھے (بلکہ کچھ بل دار تھے)۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو چالیس برس کے ختم پر نبی بنایا پھر مکہ میں دس برس مقیم رہے اور حضرت ابن عباسؓ کے قول پر تیرہ برس رہے کہ آپ پر وحی ہوتی تھی (دس برس کی روایت میں کسر کو حساب میں نہیں لیا پس دونوں روایتیں متطابق ہیں)

اور مدینہ میں دس سال رہے پھر ساٹھ سال کی عمر میں اور ابن عباسؓ کے قول پر تریسٹھ سال کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو وفات دی اور امام بخاریؒ نے فرمایا کہ تریسٹھ سال کی روایتیں زیادہ ہیں اور (باوجود اتنی عمر کے) آپ کے سر اور ریش مبارک میں سفید بال بیس بھی نہ تھے اور محققین نے کہا ہے کہ آپ کے سر اور داڑھی میں سفید بال کل سترہ تھے۔ اور حضرت جابر بن سمرہؓ نے فرمایا کہ میں نے مہرِ نبوت کو آپ کے دونوں شانوں کے درمیان میں ایک سُرخ اور اُبھرا ہوا گوشت مثل بیضۂ کبوتر کے دیکھا۔ حضرت سائب بن یزیدؓ سے روایت ہے کہ وہ مثل چھپر کھٹ (مسہری) کی گھنڈی کے تھی اور عمرو بن اخطب انصاری سے روایت ہے کہ کچھ بال جمع تھے اور حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ آپ کی کمر پر ایک اُبھرا ہوا گوشت کا ٹکڑا تھا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ مثل مٹھی کے تھی اُس کے گرداگرد تل تھے جیسے مسّے ہوتے ہیں (اور ان روایات میں کچھ منافی نہیں سب اوصاف کا جمع ہونا ممکن ہے) حضرت براءؓ کہتے ہیں کہ میں نے کوئی بالوں والا سُرخ جوڑا (یعنی مخطط لنگی چادر) پہنے ہُوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ حسین نہیں دیکھا اور حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ میں نے کسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ حسین نہیں دیکھا گویا آپ کے چہرہ میں آفتاب چل رہا ہے اور جب آپ ہنستے تھے تو دیواروں پر چمک پڑتی تھی۔ اور حضرت جابرؓ سے پوچھا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ مبارک مثل تلوار کے (شفاف) تھا انہوں نے کہا کہ نہیں بلکہ مثل آفتاب اور ماہتاب کے مدور تھا (تلوار کی تشبیہ میں یہ کمی تھی کہ وہ مدور نہیں ہوتی) اور حضرت امِ معبدؓ نے کہا آپ دور سے سب سے زیادہ جمیل اور نزدیک سے سب سے زیادہ شیریں اور حسین معلوم ہوتے تھے اور حضرت علیؓ نے فرمایا ہے کہ جو شخص آپ کو اوّل وہلہ میں دیکھتا تھا مرعوب ہو جاتا تھا اور جو شخص شناسائی کے ساتھ ملتا جلتا آپ سے محبت کرتا تھا۔ میں نے آپ جیسا (صاحبِ جمال و صاحبِ کمال) نہ آپ سے پہلے کسی کو دیکھا اور نہ آپ کے بعد کسی کو دیکھا۔

وصل چہارم آپ کے طیب و مطیب ہونے میں:

اور حضرت انسؓ نے فرمایا کہ میں نے کوئی عنبر اور مشک اور کوئی (خوشبودار) چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مہک سے زیادہ خوشبودار چیز نہیں دیکھی اور آپ کسی سے مصافحہ فرماتے تو تمام تمام دن اُس شخص کو مصافحہ کی خوشبو آتی رہتی اور کبھی کسی بچے کے سر پر ہاتھ رکھ دیتے تو وہ خوشبو کے سبب دُوسرے لڑکوں میں پہچانا جاتا اور آپ ایک بار حضرت انسؓ کے گھر سوئے ہوئے تھے اور آپ کو پسینہ آیا تھا تو حضرت انسؓ کی والدہ ایک شیشی لاکر آپ کے پسینہ کو جمع کرنے لگیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے اس بارہ میں پُوچھا انہوں نے عرض کیا کہ ہم اس کو اپنی خوشبو میں ملا دیں گے اور یہ پسینہ اعلیٰ درجہ کی خوشبو ہے۔ اور امام بخاری نے تاریخ کبیر میں حضرت جابرؓ سے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس رستہ سے گزرتے اور کوئی شخص آپ کی تلاش میں جاتا تو وہ خوشبو سے پہچان لیتا کہ اس رستہ سے تشریف لے گئے ہیں۔ اسحٰق بن راہویہ نے کہا ہے کہ یہ خوشبو بدون خوشبو لگائے ہُوئے (خود آپ کے بدن مبارک میں) تھی اور ابراہیم بن اسمٰعیل مُزنی نے حضرت جابرؓ سے روایت کی ہے کہ مجھکو (ایک بار) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیچھے سواری پر بٹھلا لیا۔ میں نے مہرِ نبوت کو اپنے منہ میں لے لیا سو اس میں سے مُشک کی لپٹ آ رہی تھی۔ اور مروی ہے کہ جب آپ بیت الخلاء میں جاتے تھے تو زمین پھٹ جاتی تھی اور آپ کے بول و براز کو نگل جاتی اور اس جگہ

نہایت پاکیزہ خوشبو آتی۔ حضرت عائشہؓ نے اسی طرح روایت کیا ہے اور اسی لیے علماء آپ کے بول و براز کے طاہر ہونے کے قائل ہُوئے ہیں۔

ابوبکر بن سابق مالکی اور ابونصر نے اس کو نقل کیا ہے اور مالک بن سنان یوم احد میں آپ کا خون (زخم کا) چوس کر پی گئے۔ آپ نے فرمایا اس کو کبھی دوزخ کی آگ نہ لگے گی اور عبداللہ بن زبیر نے آپ کا خون جو پچھنے لگانے سے نکلا تھا، پی لیا تھا اور برکتؓ اور آپ کی خادمہ اُمِ ایمنؓ نے آپ کا بول پی لیا تھا سو اُن کو ایسا معلوم ہُوا جیسا شیریں نفیس پانی ہوتا ہے اور آپ (قدرتی) مختون آور نال کٹے ہُوئے سُرمہ لگے ہُوئے پیدا ہُوئے تھے حضرت آمنہؓ آپ کی والدہ کہتی ہیں کہ میں نے آپ کو پاک صاف جنا، کوئی آلودگی آپ کو لگی ہُوئی نہ تھی اور آپ باوجودیکہ ایسا سوتے تھے کہ خراٹے بھی لینے لگتے تھے (یعنی سونے سے آپ کا وضو نہیں ٹوٹتا تھا) روایت کیا اس کو عکرمہ نے اور وجہ (اُس کی یہ تھی کہ) آپ سونے میں حدث سے محفوظ تھے۔

وصلِ پنجم آپ کی قوتِ بصیرت میں :

وہب بن مُنبّہ کہتے ہیں کہ میں نے اکہتر کتابوں میں پڑھا ہے اور سب میں یہ مضمون پایا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم عقل میں سب پر ترجیح رکھتے تھے رائے میں سب سے افضل تھے۔ اور آپ ظلمت میں بھی اس طرح دیکھتے تھے جس طرح روشنی میں دیکھتے تھے جیسا کہ حضرت عائشہؓ نے روایت کیا ہے اور آپ دور سے ایسا ہی دیکھتے تھے جیسا نزدیک سے۔ اور پیچھے سے بھی ایسا ہی دیکھتے تھے جس طرح سامنے سے دیکھتے تھے اور آپ نے نجاشی کا جنازہ (حبشہ میں) دیکھ لیا تھا اور اس پر نماز پڑھی اور آپ نے بیت المقدس کو مکہ معظمہ سے دیکھ لیا تھا جبکہ قریش کے سامنے اُس کا نقشہ بیان فرمایا (یہ سب معراج کی صبح کو قصہ ہوا تھا) اور جب آپ نے مدینہ منورہ میں اپنی مسجد کی تعمیر شروع کی اُس وقت خانہ کعبہ کو دیکھ لیا تھا اور آپ کو ثریا میں گیارہ ستارے نظر آیا کرتے تھے۔

وصلِ ششم آپ کی قوتِ بدنیہ وغیرہ میں :

اور آپ (کی قوت کی یہ کیفیت تھی کہ آپ نے ابورکانہ کو جو اپنے اہل زمانہ میں بہت قوی (مشہور) تھے کُشتی میں گرا دیا جبکہ اُن کو اسلام کی دعوت دی (اور اُنھوں نے) اپنے اسلام کو اس پر معلق کیا کہ مجکو کشتی میں گرا دیجیے) اور قبل زمانہ اسلام کے آپ نے ابورکانہ کو کشتی میں گرا دیا تھا۔ وہ دوسری تیسری بار پھر آپ سے مقابل ہوا۔ آپ ہر بار میں اس کو پچھاڑ دیتے تھے اور آپ تیز چلتے تھے کہ جیسے زمین لپٹی چلی آرہی ہو۔ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ہم بڑی کوشش کرتے تھے (کہ آپ کے ساتھ چل سکیں) اور آپ کچھ اہتمام بھی نہ فرماتے تھے (پھر بھی ہم تھک جاتے تھے) اور آپ کا ہنسنا تبسم ہوتا تھا اور جب (گوشہ کی) کسی چیز کو دیکھتے تھے تو پُورے اُس طرف مُڑ کر دیکھتے (یعنی دُزدیدہ نظر سے نہ دیکھتے)۔

وصلِ ہفتم آپ کے بعض خصائص میں :

اور آپ کو کلمات جامعہ عطا کیے گئے اور تمام زمین آپ کے لیے مسجد اور آلۂ طہارت بنائی گئی (یعنی یہ نہیں کہ خاص

مسجد ہی میں نماز درست اور جگہ نماز درست نہ ہو اور اسی طرح ہر جگہ کی مٹی سے بشرط پاک ہونے کے تیمم درست ہے) اور آپ کے لیے غنیمت کو حلال کیا گیا (اور پہلی شریعتوں میں مال غنیمت) کا کھانا حلال نہ تھا اور آپ کے لیے شفاعتِ کبریٰ اور مقامِ محمود مخصوص کیا گیا اور آپ جن و انس اور تمام خلائق کی طرف مبعوث ہُوئے۔

وصل ہشتم آپ کے کلام و طعام و منام و قعود و قیام میں :

اور عرب کی سب زبانیں جانتے تھے میں کہتا ہوں کہ بلکہ تمام زبانیں (یہ بعض کا قول ہے) ام معبدؓ کہتی ہیں کہ آپ شیریں کلام اور واضح بیان تھے نہ بہت کم گو تھے (کہ ضروری بات میں بھی سکوت فرما دیں اور نہ زیادہ گو تھے (کہ غیر ضروری اُمور میں مشغول ہوں) آپ کی گفتگو ایسی تھی جیسے موتی کے دانے پرو دیے گئے ہوں اور آپ کھانے اور سونے بہت کم تھے کھانے ہوئے سہارا لگا کر نہیں بیٹھتے تھے معنی اس کے اہل تحقیق کے نزدیک یہ ہیں کہ نہ ایسی چیز کا سہارا لیتے جو آپ کے نیچے ہوتی (جیسے گدا وغیرہ) اور نہ کسی کروٹ پر (ہاتھ یا تکیہ کے سہارے) بوجہ اس کے کہ بیٹھنے آپ کی نشست کھانے کے لیے ایسی ہوتی جیسے کھڑے ہونے کے لیے کوئی تیار ہو کر بیٹھتا ہے یعنی اکڑو بیٹھتے تھے اور آپ فرمایا کرتے کہ میں غلام کی طرح کھاتا ہوں اور غلام کی طرح بیٹھتا ہوں اور آپ کا سونا داہنی کروٹ پر ہوتا تھا کہ قلت منام میں معین ہو۔

وصل نہم آپ کی بعض صفات و مکارم اخلاق شجاعت و سخاوت ہیبت و جاہ و بے نفسی و ایثار وغیرہ میں :

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ آپ کو تیس مردوں کی قوت دی گئی تھی۔ روایت کیا اسکو نسائی نے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ آپ کو ہمبستری میں چالیس مردوں کی قوت دی گئی تھی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ مجکو اور لوگوں پر چار چیزوں میں فضیلت دی گئی، سخاوت اور شجاعت اور قوت مردمی اور مقابل پر غلبہ اور آپ نبوت کے قبل بھی اور بعد میں بھی صاحبِ وجاہت تھے حضرت قیلہ سے روایت ہے کہ انہوں نے جب آپ کو دیکھا تو ہیبت کے مارے کانپنے لگیں۔ آپ نے فرمایا اے غریب دل کو تھام رکھ (یعنی ڈھارس رکھ) اور حضرت ابن مسعودؓ نے روایت کیا ہے کہ آپ کے روبرو عقبہ بن عمرو کھڑے ہوئے خوف سے کانپنے لگے۔ آپ نے فرمایا کہ طبیعت پر آسانی کرو کوئی جابر بادشاہ نہیں ہوں اور آپ کو تمام خزائن رُوئے زمین کے اور تمام شہروں کی کُنجیاں (عالم کشف میں) عطا کی گئی تھیں اور آپ کی حیات میں بلاد حجاز اور یمن اور تمام جزیرۂ عرب اور نواحیِ شام و عراق فتح ہو گئے تھے۔ اور آپ کے حضور میں خمس اور صدقات اور عُشر حاضر کیے جاتے تھے اور سلاطین کی طرف سے ہدایا بھی پیش ہوتے تھے۔ ان سب کو آپ نے لوجہ اللہ صرف فرمایا اور مسلمانوں کو غنی کر دیا اور فرمایا کہ مجکو یہ بات خوش نہیں آتی کہ میرے لیے کوہِ اُحد سونا بن جاوے اور پھر رات کو اُس میں سے ایک دینار بھی میرے پاس رہے بجز ایسے دینار کے جس کو کسی واجب مطالبہ کے لیے تھام لوں اور یہ آپ کی کمال سخاوت وجُود و عطا ہے۔ چنانچہ (اسی کمال سخاوت کے سبب آپ مقروض رہتے تھے حتیٰ کہ) آپ نے جس وقت وفات فرمائی ہے تو آپ کی زرہ اہل و عیال کے اخراجات میں رہن رکھی ہوئی تھی اور آپ اپنے ذاتی خرچ اور پوشاک

اور مسکن میں صرف قدرِ ضرورت پر اکتفا فرماتے تھے اور غالب اوقات آپ کمبل اور موٹا کھیس اور گاڑھی چادر پہنتے تھے اور (بعض اوقات) اپنے اصحاب کو دیبا کی قبائیں جس میں سونے کے تار بنے ہُوئے تھے تقسیم فرماتے تھے اور جو ان میں موجود نہ ہوتے اُن کے لیے اُٹھا کر رکھتے اور حضرت عائشہؓ نے فرمایا ہے کہ آپ کا خلق قرآن تھا۔ اس کی خوشی کی بات سے آپ خوش ہوتے تھے اور اس کی ناخوشی کی بات سے آپ ناخوش ہوتے تھے (یعنی قرآن سے جو بات حق تعالیٰ کے خوش یا ناخوش ہونے کی ثابت ہوتی آپ کی خوشی و ناخوشی اسی کے تابع تھی) حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ آپ خلق عظیم پر قایم ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اصل فطرت میں مکارم اخلاق متانت طبع اور اعتدال مزاج پر پیدا کیا تھا۔

اور حضرت آمنہ بنت وہب کہتی ہیں کہ آپ جس وقت پیدا ہُوئے تو آپ کے دونوں ہاتھ زمین کی طرف کھلے ہُوئے تھے اور سر آسمان کی طرف اٹھائے ہُوئے تھے۔

وصل دہم آپ کی عصمت میں :

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب مجکو ہوش آیا بتوں سے اور شعرگوئی سے مجکو نفرت تھی۔ اور کبھی کسی امر جاہلیت (یعنی امر غیر مشروع) کا مجکو خیال تک بھی نہیں آیا بجز دو بار کے اور اس سے بھی اللہ تعالیٰ نے مجکو محفوظ رکھا پھر اس (خیال کی بھی نوبت نہیں آئی)۔

وصل یازدہم تتمہ وصل نہم میں :

اور آپ لوگوں کے ایذا دینے پر سب سے زیادہ صابر تھے اور سب سے بڑھ کر حلیم تھے، بُرائی کرنے والے سے درگزر فرماتے اور جو شخص آپ سے بدسلوکی کرتا تھا آپ اس سے سلوک کرتے تھے اور جو شخص آپ کو نہ دیتا آپ اسی کو دیتے اور جو شخص آپ پر ظلم کرتا آپ اس سے درگزر فرماتے اور کسی کام کے دو پہلوؤں میں جو آسان ہوتا اس کو اختیار فرماتے بشرطیکہ وہ گناہ نہ ہوتا (اس میں اپنے متبعین کے لیے آسانی کی رعایت فرمائی، نیز تجربہ ہے کہ آسانی پسند طبیعت دوسروں کے لیے بھی آسانی تجویز کرتی ہے) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات کے لیے کبھی انتقام نہیں لیا۔ حتیٰ کہ سیرت ابن ہشام میں مروی ہے کہ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کے بھائی عتبہ بن ابی وقاص نے اُحد کے روز آپ پر پتھر چلایا اس سے آپ کا دندانِ رباعیہ زیریں جانب راست کا شکستہ ہو گیا (یعنی جھڑ گیا اور رباعیہ کہتے ہیں سامنے کے چار دانتوں کے دونوں کروٹوں کی طرف کے چار دانتوں کو دو اوپر اور دو نیچے) اور آپ کا چہرہ مبارک زخمی ہو گیا لوگوں نے عرض کیا کہ آپ اُن پر بددعا کیجیے۔ آپ نے فرمایا: اے میرے اللہ! میری قوم کو ہدایت کیجیے کیونکہ اُن کو خبر نہیں اور آپ نے کسی چیز کو (یعنی آدمی یا جانور کو) اپنے ہاتھ سے نہیں مارا، البتہ اللہ کی راہ میں جو جہاد کیا وُہ اور بات ہے اور نہ کسی عورت کو مارا نہ کسی خادم کو مارا۔ اور حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ آپ سے کبھی کوئی چیز نہیں مانگی گئی جس پر آپ نے انکار فرما دیا ہو۔ کسی نے خوب کہا ہے (یہ فرزدق کا عربی شعر تھا جس کا ترجمہ فارسی میں یہ ہے): ؎

نرفت لا بزبانِ مبارکش ہرگز
مگر در اشہد ان لا الٰہ الا اللہ

اور آپ درماندوں کا بار اٹھا لیتے تھے اور نادار آدمی کو مال دے دیتے یا دلوا دیتے اور مہمان کی مہمانی کرتے اور حق معاملات میں آپ اعانت فرماتے جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے۔ اور امام ترمذی نے روایت کیا کہ آپ کے پاس ایک بار نوّے ہزار درہم آئے (تقریباً پچیس ہزار روپیہ ہوتا ہے) اور ایک بوریے پر رکھے گئے۔ سو آپ نے کسی سائل سے عذر نہیں کیا۔ یہاں تک کہ سب ختم کرکے فارغ ہو گئے۔ پھر آپ کے پاس ایک شخص آیا اور کچھ مانگا۔ آپ نے فرمایا میرے پاس کچھ باقی نہیں رہا (جو تجھ کو دے سکوں) لیکن تو میرے نام سے (ضرورت کی چیز) خرید لے جب ہمارے پاس کچھ آوے گا ہم ادا کر دیں گے۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ جو چیز آپ کی قدرت میں نہ ہو حق تعالیٰ نے آپ کو اس کا مکلف نہیں فرمایا (پھر آپ اتنی تکلیف کیوں اٹھاتے ہیں)۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات خوش نہیں معلوم ہوئی پھر انصار میں سے ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! خوب خرچ کیجئے اور مالک عرش (یعنی حق سبحانہٗ وتعالیٰ) سے کمی کا اندیشہ نہ کیجئے آپ نے تبسم فرمایا اور آپ کے چہرۂ مبارک پر بشاشت نمایاں ہوئی اور اگلے دن کے لیے کوئی چیز اٹھا کر نہ رکھتے تھے جیسا کہ حضرت انسؓ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیر میں ہوائے بارش خیر سے بھی زیادہ فیاض تھے۔

وصل دوازدہم دوسرے بعض اخلاق جمیلہ و طرزِ معاشرت میں:

حضرت ابن عمرؓ نے کہا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر نہ کوئی شجاع دیکھا اور نہ مضبوط دیکھا اور نہ فیاض دیکھا اور نہ (دوسرے اخلاق کے اعتبار سے) پسندیدہ دیکھا اور ہم جنگِ بدر کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آڑ میں پناہ لیتے تھے اور بڑا شجاع وہ شخص سمجھا جاتا تھا جو (میدان جنگ میں) آپ سے نزدیک رہتا جب آپ غنیم کے قریب ہوتے تھے کیونکہ اس شخص کو بھی (اس صورت میں) غنیم کے قریب رہنا پڑتا تھا۔ اور حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ آپ شرم و حیا میں اس سے بڑھ کر تھے، جیسے کنواری لڑکی پردہ میں ہوتی ہے۔ اور آپ نہایت لطیف الجلد نرم اندام تھے اور کسی شخص کو برُو ناگوار بات نہ فرماتے اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نہ آپ بروئے عادت سخت گو تھے اور نہ بتکلف سخت گو بنتے تھے۔ اور نہ بازاروں میں خلافِ وقار باتیں کرنے والے تھے اور برائی کا عوض برائی سے نہ دیتے تھے بلکہ معاف فرما دیتے تھے اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ غایتِ حیا سے آپ کی نگاہ کسی شخص کے چہرہ پر نہیں ٹھہرتی تھی (یعنی آنکھوں میں آنکھیں نہیں ڈالتے تھے) اور کسی نامناسب چیز کا اگر کسی ضرورت سے ذکر کرنا ہی پڑتا تو کنایۃً فرماتے۔ اور حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ آپ سب سے بڑھ کر دل کے کشادہ تھے، بات کے سچے تھے، طبیعت کے نرم تھے، معاشرت میں نہایت کریم تھے اور جو شخص آپ کی دعوت کرتا اُس کی دعوت منظور فرماتے اور ہدیہ قبول فرماتے اگرچہ وہ (ہدیہ یا طعام دعوت) گائے یا بکری کا پایہ ہی ہوتا اور ہدیہ کا بدل بھی دیتے تھے اور دعوت غلام کی اور آزاد کی اور لونڈی کی اور غریب کی سب کی قبول فرما لیتے اور مدینہ کی انتہا آبادی پر بھی (اگر مریض ہوتا اُس کی) عیادت فرماتے اور معذرت کرنیوالا کا عذر قبول فرماتے اور اپنے اصحاب سے ابتداءً مصافحہ فرماتے اور کبھی اپنے اصحابؓ میں پاؤں پھیلائے ہوئے نہیں دیکھے گئے جس سے اوروں پر

جگہ تنگ ہو جاوے اور جو آپ کے پاس آتا اس کی خاطر کرتے اور بعض اوقات اپنا کپڑا (اس کے بیٹھنے کے لیے) بچھا دیتے اور گدہ تکیہ خود چھوڑ کر اس کو دے دیتے اور کسی شخص کی بات بیچ میں نہ کاٹتے اور تبسم فرماتے اور خوش مزاجی میں سب سے بڑھ کر تھے بجز حالت نزول وحی یا وعظ یا خطبہ کی نہ ہوتی (کیونکہ ان حالتوں میں آپ کو جوش ہوتا تھا جس میں تبسم و خوش مزاجی ظاہر نہ ہوتی تھی) اور بعض اوقات فرستادوں کی خود خدمت فرماتے جیسے نجاشی بادشاہ کے فرستادے آئے تھے اور آپ قیامت میں تمام اولادِ آدم کے سردار ہوں گے اور سب سے اول آپ ہی کی قبر شریف کی زمین شق ہوگی (اور آپ باہر تشریف لاویں گے) اور سب سے اوّل ہی شفاعت کریں گے اور سب سے اوّل آپ کی شفاعت قبول ہوگی اور آپ (غایت تواضع) سے دراز گوش پر بھی سوار ہوتے تھے اور (کبھی) اپنے پیچھے بھی کسی کو بٹھلا لیتے اور غریبوں کی عیادت فرماتے تھے اور محتاجوں کے پاس بیٹھا کرتے تھے اور اپنے کپڑے میں (خود) جُوں دیکھ لیتے (کسی خادم پر موقوف نہ رکھتے اور یہ دیکھنا اس خیال سے تھا کہ کسی اور کی نہ چڑھ گئی ہو) اور اپنی بکری کا دودھ نکال لیتے اور اپنے کپڑوں میں خود پیوند لگا لیتے اور اپنی پاپوش کو خود (وقت حاجت کے) سی لیا کرتے اور اپنا گھر کا کام اور گھر والوں کا کام کر لیا کرتے (اور گھر میں جھاڑو دے لیا کرتے) اور خدمت گار کے ساتھ کھانا کھا لیا کرتے اور اس کے ساتھ آٹا گوندھوا لیتے اپنا سودا بازار سے خود لے آتے اور سب سے بڑھ کر احسان کرنے والے اور عدل کرنے والے اور عفیف اور سچ بولنے والے تھے حتیٰ کہ ابوجہل بن ہشام باوجود اس کے کہ آپ کا کامل دشمن تھا مگر اخنس بن شریق نے بدر کے روز جب اس سے پوچھا کہ اے ابوالحکم! یہاں تو میرے اور تیرے سوا اور کوئی موجود نہیں جو ہماری بات کو سن لے گا تو مجھ کو یہ بتلا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سچے ہیں یا جھوٹے ہیں؟ ابوجہل نے کہا: واللہ محمد سچے ہیں اور محمد نے کبھی جھوٹ بولا ہی نہیں۔

وصل سیزدہم تتمہ وصل ہشتم میں؛

حضرت خارجہ بن زید سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مجلس میں سب سے زیادہ باوقار ہوتے۔ اور حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ جب مجلس میں بیٹھتے تو دونوں پاؤں کھڑے کر کے ملا کر ان کے گرد ہاتھوں کا حلقہ بنا کر بیٹھتے اور ویسے بھی اکثر نشست آپ کی اسی ہیئت سے ہوتی (اس کو احتباء کہتے ہیں اور یہ تواضع اور سادگی کی وضع ہے) حضرت جابر بن سمرہؓ سے روایت ہے کہ آپ چار زانو بھی بیٹھتے تھے اور بعض اوقات اکڑوں (بغل میں ہاتھ دے کر) بیٹھ جاتے اور جب آپ چلتے تو جمعیت خاطر (یعنی طمانیت) کے ساتھ چلتے آپ کی چال سے یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ نہ آپ کے دل میں تنگی ہے (کہ گھبرائے ہوئے چلیں) اور نہ طبیعت میں سستی ہے (کہ پاؤں نہ اٹھتا ہو غرض نہ بہت تیز چلتے تھے نہ سست رفتار تھے) حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ آپ کے کلمات میں نہایت وضاحت ہوتی تھی اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ اس طرح کلام فرماتے کہ اگر کوئی شمار کرنے والا (الفاظ کو) شمار کرنا چاہتا تو شمار کر سکتا تھا۔ اور آپ خوشبو کی چیز اور خوشبو کو بہت پسند فرماتے اور کثرت سے اس کا استعمال فرماتے اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیتے اور کھانے پینے کی چیزوں میں پھونک نہیں مارتے تھے اور انگلیوں اور پوروں اور جوڑوں کے صاف رکھنے کو پسند فرماتے (کیونکہ یہ مواقع میل جمع ہونے کے ہیں) اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی متواتر

تین روز بھی روٹی سے پیٹ نہیں بھرا۔ یہاں تک کہ آخرت کو روانہ ہو گئے۔ اور حضرت حفصہؓ سے روایت ہے کہ آپ کا بستر ایک ٹاٹ تھا اور کبھی آپ چارپائی پر آرام فرماتے جو کھجوروں کے بان سے بُنی ہوتی حتی کہ آپ کے پہلو مبارک میں اس کا نشان پڑ جاتا۔

وصل چہاردہم آپ کے تنگی معیشت کو اختیار کرنے میں :

اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا شکم کبھی پیٹ بھرائی سے پُر نہیں ہُوا اور کسی سے شکوہ کا اظہار نہیں کیا اور فاقہ آپ کو بہ نسبت تونگری کے زیادہ محبوب تھا اور دن دن بھر بھُوکے گزار دیتے اور رات رات بھر بھوک سے کروٹیں بدلتے رہتے اور اگر آپ چاہتے تو اپنے رب سے تمام روئے زمین کے خزائن اور اس کی پیداوار اور اس کی فراخ عیشی کا سامان مانگ لیتے لیکن آپ یہی فرمایا کرتے تھے کہ مجکو دنیا سے کیا علاقہ میرے اولوالعزم بھائیوں نے اس سے زیادہ سخت حالت پر صبر کیا اور اپنی اسی حالت میں گزر گئے۔

وصل پانزدہم آپ کی خشیت مجاہدہ میں :

اور آپ اللہ تعالیٰ سے بہت ڈرتے تھے، یہاں تک کہ آپ نے فرمایا کہ کاش میں ایک درخت ہو جاتا جو کاٹ دیا جاتا اور آپ اس قدر (نفل) نماز پڑھتے تھے کہ قدم مبارک ورم کر جاتے۔ اس پر حق تعالیٰ و تقدس نے براہِ ترحم فرمایا طٰہٰ الخ یعنی ہم نے آپ پر قرآن مجید اس لیے نازل نہیں فرمایا کہ آپ مشقت میں پڑیں اور آپ نماز پڑھتے اور آپ کے سینہ میں ہنڈیا کا سا جوش (مسموع) ہوتا تھا اسی طرح عبداللہ بن شخیر نے روایت کیا ہے اور آپ برابر مغموم رہتے تھے کسی وقت آپ کو چین نہ تھا۔ یہ کیفیت فکر (آخرت سے) اور دن بھر میں ستر بار یا سو بار استغفار فرماتے تھے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ تو تعلیم امت کے لیے تھا یا خود اُمت کے لیے مغفرت طلب کرنا مقصود تھا یا یہ وجہ تھی کہ آپ دریائے قرب و عرفان میں مستغرق تھے اور آناً فاناً ترقی فرماتے رہتے تھے، کیونکہ تجلیات متجدد ہوتی رہتی ہیں۔ اور تجلی حسب استعداد محل تجلی کے ہوتی ہے اور آپ کی استعداد برابر متزائد ہوتی جاتی تھی (اس لیے تجلیات بھی لاتقف عندحد فائض ہوتی تھیں)، پس جب مرتبہ مابعد کو عالی دیکھتے تھے تو اپنے کو مرتبۂ ماقبل کے اعتبار سے تقصیر کی طرف منسوب فرماتے تھے کیا تم نے سنا نہیں کہ نیکوں کے حسنات مقربین کی سیئات ہوتی ہیں۔

وصل شانزدہم آپ کے حسن و جمال میں :

اور ترمذیؒ نے قتادہ سے انھوں نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو مبعوث نہیں فرمایا جو خوش آواز اور خوش رُو نہ ہو اور تمہارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم صورت شکل میں بھی اور آواز میں ان سب سے احسن تھے۔ میں کہتا ہوں کہ (باوجود ایسے حسن و جمال) عام لوگوں کا آپ پر اس طور عاشق نہ ہونا جیسا حضرت یوسف علیہ السلام پر عاشق ہوا کرتے تھے۔ بسبب غیرت الٰہی کے ہے کہ آپ کا جمال جیسا تھا غیروں پر ظاہر نہیں کیا جیسا کہ خود حضرت یوسف علیہ السلام کا جمال بھی

جس درجہ کا تھا وُہ بجز حضرت یعقوب علیہ السلام یا زلیخا کے اوروں پر ظاہر نہیں کیا۔

وصل ہفدہم آپ کے رفق و تواضع و پاکیزگیِ طبیعت میں :

اور آپ نہایت حلیم تھے نہ کسی کو دشنام دیتے تھے نہ سخت بات فرماتے نہ لعنت کی بد دُعا دیتے تھے اور نزدیک جگہ جانے میں دراز گوش پر سوار ہوتے تھے اور دُور جانے میں ناقہ پر اور معرکہ حرب میں نچر اور کسی مدد چاہنے والے کی پکار پر گھوڑے پر سوار ہوتے (تا کہ جلدی پہنچ جاویں اور معرکہ میں کمال ہے ثابت قدم رہنا اس لیے گھوڑے کی ضرورت نہیں سمجھی بلکہ ایسا جانور اختیار کیا کہ وُہ بھاگنے میں کم ہو یعنی نچر اور باقی معمولی حالات میں تواضع کی صورت اختیار فرمائی یعنی دراز گوش کی سواری اور سفر دراز میں جفاکش جانور کی ضرورت تھی اور وہ شتر ہے) اور آپ کافر اور دشمن سے بھی اس کی تالیف قلب کی توقع پر کشادہ رُوئی کے ساتھ پیش آتے تھے اور جاہل (کی بے تمیزی کی بات) پر صبر فرماتے اور اپنے گھر میں آ کر گھر والوں کے کاموں کا انتظام فرماتے اور چادر اوڑھنے میں بہت اہتمام فرماتے کہ اس میں سے ہاتھ پاؤں کچھ ظاہر نہ ہو (غالباً بیٹھنے کی حالت میں ایسا ہوتا ہو گا) اور آپ کی کشادہ روئی اور انصاف سب کے لیے عام تھا اور غصہ آپ کو بے تاب نہیں کرتا تھا اور اپنے جلیسوں سے کوئی بات (خلاف ظاہر) دل میں نہ رکھتے تھے اور آنکھوں کی خیانت (دزدیدہ نظر) آپ میں نہ تھی تو قلب کی خیانت کا تو کیا احتمال ہے اور آپ تمام احوال و اقوال اور افعال میں کبائر سے اور محققین کے نزدیک صغائر سے بھی معصوم تھے اور آپ سے کسی قسم کی وعدہ خلافی یا حق سے جنبش کا صدور ممکن ہی نہ تھا نہ قصداً نہ سہواً نہ صحت میں نہ مرض میں نہ واقعی مراد لینے میں نہ خوش طبعی میں نہ خوشی میں نہ غضب میں۔

وصل ہشدہم آپ کے اعتدالِ تزئین میں :

اور آپ جس روز مکہ معظمہ میں تشریف لائے ہیں (یعنی یوم فتح مکہ میں) اس روز آپ کے سر کے بال چار حصے ہو رہے تھے۔ روایت کیا اس کو امِ ہانی نے، اور آپ شروع میں اپنے بالوں کو بے مانگ نکالے جمع کر لیا کرتے تھے پھر آپ مانگ نکالنے لگے تھے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ایک روز ناغہ کر کے کنگھا کیا کرتے تھے۔ اور حضرت انسؓ سے آپ کے خضاب کے متعلق پوچھا گیا انھوں نے کہا آپ حدِ خضاب تک ہی نہ پہنچے تھے (یعنی آپ کے اتنے بال سفید ہی نہ ہُوئے تھے) بس تھوڑی سی سفیدی دونوں کنپٹیوں میں ہُوئی تھی۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ نے مہندی اور تیل کا خضاب کیا ہے (یعنی ایسی ترکیب سے کہ بال سیاہ نہ ہوں) اور ایک روایت میں ہے کہ آپ کے بالوں کا پکنا سرخ رنگ کا تھا (یعنی سیاہ سے سرخ ہو گئے تھے سفید نہ ہوئے تھے) اور عبداللہ بن عقیل کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا موئے مبارک حضرت انسؓ کے پاس خضاب کیا ہوا دیکھا (محققین کے نزدیک ان روایات میں تطبیق یہ ہے کہ آپ کے بال پکنے تو لگے تھے مگر بہت کم پکے تھے سو بعضے سرخ ہوں گے اور بعضے سفید لیکن آپ نے قصداً ان کو خضاب نہیں لگایا لیکن آپ کی عادت اکثر اوجاع وغیرہ میں مہندی رکھ دینے

کی تنی ایسا اتفاق ہوا ہوگا اس سے وُہ سفید بال رنگین ہوگئے اب سب روایات جمع ہوگئیں واللہ اعلم)۔ اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آپ سونے کے قبل ہر آنکھ میں تین تین سلائی سرمہ کی ڈالتے تھے۔ اور آپ سفید کپڑے کو اور کُرتہ کو پسند کرتے تھے۔ اور آپ کی آستین گٹے تک ہوتی تھی اور چادر یمانی کو پسند فرماتے اور (کبھی) بالوں کی سیاہ چادر (بھی) پہنتے تھے اور (ایک بار) رومی جبہ تنگ آستین کا (بھی) پہنا ہے (اس سے تشبہ ممنوع لازم نہیں آتا کیونکہ یہ ثابت نہیں کہ وہ لباس اہلِ روم کا خاص تھا۔ رومی ہونا باعتبار ساخت کے ہے۔ اور آپ نے سیاہ سادہ چرمی موزے (بھی) پہنے ہیں اور اُن پر (وضو میں) مسح فرمایا ہے، اور آپ کے نعلین شریف میں انگلیوں میں پہننے کے دو دو تسمے تھے (ایک انگوٹھے اور سبابہ کے درمیان ایک وسطی اور اس کے پاس والی کے درمیان میں)، اور پشت پر کا تسمہ بھی دوہرا تھا اور آپ بالوں سے صاف کیے ہُوئے چمڑے کے نعلین پہنتے تھے اور وضو کرکے ان میں پانوں بھی رکھ لیتے، روایت کیا ہے اس کو حضرت ابن عمرؓ نے اور آپ (گاہ گاہ) گٹھے ہوئے نعلین میں نماز (بھی) پڑھ لیتے (کیونکہ وہ پاک ہوتے تھے اور اس وقت عرف میں یہ خلاف ادب نہ ہوگا) اور آپ نے چاندی کی انگشتری بنوائی تھی اور اُس سے مُہر لگاتے تھے اور (التزام اور دوام کے ساتھ) پہنتے نہ تھے جیسا کہ حضرت ابن عمرؓ نے روایت کیا ہے اور حضرت انسؓ نے کہا ہے کہ اُس کا نگین حبشہ کا تھا۔ شروح بخاری میں مذکور ہے کہ ملک حبشہ کا ایک پتھر تھا یا اس کا رنگ حبشیوں کا سا (یعنی سیاہ) تھا اور وُہ مہرہ یمانی یا عقیق تھا اور ان سے یہ بھی روایت ہے کہ آپ کی انگشتری چاندی کی تھی اور اُس کا نگین اُسی کا تھا (میرے نزدیک نگین سے مراد خانہ نگین ہے یعنی نگین رکھنے کا حلقہ اور کسی چیز سونے وغیرہ کا نہ تھا جیسا بعضے بنوا لیتے ہیں) اور اُن ہی سے ایک روایت میں ہے گویا اس کی سفیدی (اور چمک) آپ کے ہاتھ میں اس وقت میری نظر میں ہے میں کہتا ہوں کہ ان روایات کا اختلاف باعتبار اختلاف حالات کے ہے خوب بصیرت حاصل کر لو اور خلاف کو چھوڑ دو اور اس انگشتری پر یہ منقوش تھا "محمد رسول اللہ" اس طرح سے کہ محمد ایک سطر اور رسول ایک سطر اور اللہ ایک سطر، روایت کیا اس کو حضرت انسؓ نے اور جب آپ بیت الخلاء میں جاتے تو انگشتری نکال دیتے اور اس کو (جب پہنتے تو) داہنے ہاتھ میں پہنتے، امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں اس کو حضرت عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب سے نقل کیا ہے اور حضرت انسؓ اور حضرت جابرؓ اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ آپ داہنے ہاتھ میں انگشتری پہنتے اور آپ کی تلوار قبیلہ بنی حنیفہ کی ساخت کی تھی اور اس کی مُوٹھ کی گھنڈی (یعنی تلوار پکڑنے میں جس جگہ پر ہاتھ ہوتا ہے اس کے سرے پر جو روک ہوتی ہے وہ) چاندی کی تھی (چونکہ وہ ہاتھ سے جدا رہتی ہے اس لیے چاندی کی درست ہے) اور جنگِ اُحد میں آپ دو زرہیں اور فتح مکہ کے روز آپ خود (یعنی آہنی کلاہ) پہنے ہُوئے تھے اور آپ جب عمامہ باندھتے تھے تو اُس کو دونوں شانوں کے درمیان چھوڑ لیتے تھے اور کتبِ سِیَر میں بروایت صحیحہ ثابت ہے کہ آپ کبھی دونوں شانوں کے درمیان چھوڑتے تھے اور کبھی بے شملہ عمامہ باندھتے تھے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آپ کبھی کلاہ بدون عمامہ کے اور کبھی عمامہ بدون کلاہ کے پہن لیتے اور آپ کے پاس ایک سیاہ عمامہ تھا اور آپ نصف ساق تک لنگی باندھتے تھے اور اجازت اس سے نیچے بھی دی ہے مگر یہ فرما دیا ہے کہ ازار کا ٹخنوں میں کچھ حق نہیں (یعنی ٹخنے سے نہ لگنا چاہیے)، اور آپ جب بیٹھتے تھے تو زانوں کے گرد ہاتھوں کا حلقہ بنا لیتے اور آپ مسجد میں ایک پانوں دوسرے،

پانوں پر رکھ کر چت لیٹتے تھے حضرت جابر بن سمرہؓ سے روایت ہے کہ میں نے آپ کو بائیں کروٹ پر ایک تکیہ کا سہارا لگائے ہوئے بیٹھے دیکھا ہے اور حضرت انسؓ نے آپ کو اس حالت میں دیکھا کہ آپ ایک کپڑا قطری تھا کہ اس کو بغل کے نیچے سے نکال کر کندھے پہ ڈال رکھا تھا اور لوگوں کو (اسی طرح) نماز پڑھائی (قطر ایک قریہ ہے بحرین کے علاقہ میں، وہاں سے چادریں آتی ہیں کپڑا ان کا موٹا ہوتا ہے)

وصل نوزدہم تتمہ وصل ہشتم وسیزدہم میں:

اور انھیں سے روایت ہے کہ جب آپ کھانا کھا۔ نے تھے تو اپنی تینوں انگلیوں کو چاٹ لیتے تھے۔ ابو جحیفہؓ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں تو تکیہ لگا کر نہیں کھاتا اور آپ تین انگلیوں سے کھاتے تھے اور ان کو (کھانے کے بعد) چاٹ لیتے تھے اور اکثر آپ کی غذا جو کی روٹی ہوتی تھی اور آپ نے چوکی (میز) پر کبھی کھانا نہیں کھایا اور نہ کبھی تشتری میں کھایا بلکہ دسترخوان پر کھاتے تھے اور کبھی آپ کے لیے چپاتی نہیں پکائی گئی۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آپ سرکہ کو اور روغن زیتون کو اور شیریں چیز کو اور شہد کو اور کدو کو پسند کرتے تھے اور آپ نے مرغ کا اور سرخاب کا اور بکری کا اور اونٹ کا اور گائے کا گوشت کھایا ہے اور ثرید کو (یعنی شوربے میں توڑی ہوئی روٹی کو) پسند کرتے تھے اور آپ فلفل اور مصالح بھی کھاتے تھے اور آپ نے خرمائے نیم پختہ تازہ اور خرمائے خشک اور چقندر اور خبیص (یعنی کھجور اور گھی اور پنیر کا مالیدہ) بھی کھایا ہے اور آپ کو کھرچن خوش معلوم ہوتی تھی اور آپ نے فرمایا ہے کہ برکت طعام کی اس میں ہے کہ کھانے سے پہلے بھی ہاتھ دھوئے اور کھانے کے بعد (بھی) دھوئے اور آپ ککڑی خرما کے ساتھ کھاتے تھے جیسا کہ عبداللہ بن جعفر نے روایت کیا ہے۔ اور حضرت عائشہؓ نے روایت کیا کہ آپ تربوز خرما کے ساتھ کھاتے اور فرماتے کہ اس کی گرمی کا اس کی سردی سے تدارک ہوجاتا ہے اور پانی آپ کو وہ پسند تھا جو شیریں ہو سرد ہو اور آپ خرما تر کر کے اس کا زلال اور دودھ اور پانی سب ایک ہی پیالہ میں پیا کرتے تھے جو لکڑی کا موٹا سا بنا ہوا تھا اور اس میں لوہے کے پترے لگے ہوئے تھے۔

اور آپ نے یہ بھی فرمایا کہ دودھ کے سوا کوئی ایسی چیز نہیں جو کھانے اور پینے دونوں کا کام دے سکے اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ آپ نے زمزم کا پانی کھڑے ہو کر نوش فرمایا اور عمرو بن شعیب نے اپنے والد سے اور انہوں نے اپنے جد سے روایت کیا ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کھڑے اور بیٹھے دونوں طرح پانی پیتے دیکھا ہے اور جب آپ پانی پیتے تھے تو درمیان میں دو بار سانس لیتے تھے اور امام بخاریؒ نے اسی روایت میں اتنا اور زیادہ کیا ہے کہ تین بار سانس لیتے تھے اور آپ جب اپنی خواب گاہ پر جاتے اپنا داہنا ہاتھ اپنے رخسارہ کے نیچے رکھتے روایت کیا ہے اس کو براء بن عازب نے اور جب سوتے تو آواز سے سوتے روایت کیا ابن عباسؓ نے، اور حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر جس پر آپ سوتے تھے چمڑے کا تھا اس کے اندر پوست خرما بھرا ہوا تھا اور حضرت حفصہؓ نے کہا ہے کہ آپ کا بستر ایک کمبل تھا ہم اس کو دوہرا کر دیا کرتے اور آپ اس پر سویا کرتے اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آپ مریضوں کی عیادت فرماتے تھے اور جنازہ میں

شریک ہوتے تھے اور درازگوش پر سوار ہوتے تھے اور غلام تک کی دعوت قبول کر لیتے تھے اور غزوہ بنی قریظہ میں آپ ایک درازگوش پر سوار تھے جس کا لگام پوست خرما کی رسی کا تھا اور پوست خرما کا ہی بنا ہوا اُس کا پالان تھا اور اُن سے ایک روایت ہے کہ آپ زمین پر بیٹھ جایا کرتے تھے اور اپنی بکری کا دودھ نکال لیا کرتے اور فرمایا کرتے تھے کہ اگر بکری کا دست کھلانے کے لیے میری دعوت کی جاوے تو منظور کر لوں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پُرانے پالان پر حج کیا ہے اور اس پالان پر ایک کملی تھی جو چار درم (ایک روپیہ) کی بھی نہ تھی۔ اس پر یہ دعا کرتے تھے کہ اے اللہ اس کو ایسا حج (مبرور) بنائے جس میں نمایش اور قصد شہرت نہ ہو اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آپ ہدیہ قبول فرماتے اور اس پر عوض بھی دیتے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مجھ پر (ایک بار) تیس رات دن اس حالت میں گزرے ہیں کہ میرے پاس کوئی کھانے کی چیز نہ تھی جس کو کوئی جاندار کھا سکے بجز اتنی مقدار قلیل کے جو بلال کی بغل میں آجاتا تھا روایت کیا اس کو حضرت انسؓ اور حضرت انسؓ نے یہ بھی کہا کہ آپ کے پاس کبھی گوشت روٹی کی قسم سے صبح کا یا شام کا کھانا جمع نہیں ہوا بجز اس کے کہ کھانے سے کھانے والے ہی زیادہ ہُوئے۔

وصل بستم آپ کی وفات شریف میں :

اور حضرت انسؓ ہی سے روایت ہے کہ آخری زیارت جو مجکو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہُوئی وہ اس طرح کہ آپ نے (مرض وفات میں) دوشنبہ کے دن پردہ اٹھا کر دیکھا اُس وقت مَیں نے آپ کا چہرہ مبارک دیکھا جیسے قرآن مجید کا ورق (پاک صاف) ہوتا ہے اور حضرت ابوبکرؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کا بوسہ لیا اپنا مُنھ تو آپ کی دونوں آنکھوں کے درمیان رکھا اور ہاتھوں کو آپ کی کلائیوں پر رکھا اور یہ الفاظ کہے ہائے نبی ہائے صفی ہائے خلیل اور سفیان بن عیینہ جعفر بن محمد سے اور وُہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوشنبہ کے روز وفات پائی۔ سو اُس دن اور سہ شنبہ کی شب اور سہ شنبہ کے دن آپ کے دفن میں (بوجہ غلبہ غم وحیرت اور بعضے امور وانتظام اجتماع مسلمین) توقف ہوا اور پھر شب کو آپ دفن کیے گئے کہ آخر شب میں پہاڑوں کی آواز زمین کھودنے کی حالت میں سُنی جاتی تھی اور عبدالرحمٰن بن عوف نے کہا کہ دوشنبہ کو وفات ہوئی اور شب سہ شنبہ میں دفن کیے گیے۔ ابو عیسٰی ترمذی اس روایت کو غریب (یعنی منفرد) کہتا ہے میں کہتا ہوں کہ صحیح یہی ہے کہ آپ شب چہار شنبہ میں دفن ہُوئے۔

وصل بست ویکم تمہ وصل ہفتم میں :

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میری آنکھیں سو جاتی ہیں اور میرا دل نہیں سوتا اور یہ بھی فرمایا ہے کہ میں شب اس حالت میں بسر کرتا ہوں کہ میرا رب مجکو کھلا پلا دیتا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ مجھ کو نسیان نہیں ہوتا لیکن نسیان کرایا جاتا ہے (تاکہ اس کے متعلق احکام سنت قرار پا دیں) اور (یہ بھی فرمایا ہے کہ) میں اپنے پیچھے ایسا ہی دیکھتا ہوں جیسا اپنے آگے سے دیکھتا ہوں اور آپ ہمیشہ دل سے بیدار رہتے تھے اور (باوجود اس بیدار دلی کے) آپ کی نماز فجر کا قضا ہو جانا

ایک حکمتِ الٰہی کے سبب سے تھا جو اس امر کو مقتضی ہُوئی کہ قضا کا حکم امت پر ظاہر ہو جاوے۔

وصل بست و دوم آپ کے مزاح میں :

اور آپ نے یہ بھی فرمایا کہ میں خوش طبعی تو کرتا ہُوں مگر (اس میں بھی) بات سچ ہی کہتا ہُوں۔ سو آپ مومنین سے اُن کا دل خوش کرنے کے لیے کبھی کبھی خوش طبعی بھی فرمایا کرتے تھے جیسے آپ نے ایک اعرابی سے (جس نے سواری کے لیے جانور مانگا تھا) فرمایا کہ میں تجھ کو اُونٹنی کے بچہ پر سوار کروں گا (وہ یہ سمجھا کہ تکلم کے وقت جو بچہ ہے اس پر سوار کرنا مراد ہے اس لیے کہا میں بچہ کو کیا کروں گا۔ آپ کے جواب سے معلوم ہو گیا کہ باعتبار ماضی کے جو تھا وہ مراد ہے) اور جیسے آپ نے ایک (بڑھیا) عورت سے فرمایا تھا کہ جنت میں کوئی بڑھیا نہ جائے گی۔ اور وُہ جب گھبرائی تب آپ کے جواب سے ظاہر ہو گیا کہ مطلب یہ ہے کہ جانے کے وقت کوئی بڑھیا نہ رہے گی سب جوان ہوں گی۔

وصل بست و سوم تتمہ وصل ہفتم و بست و دوم میں :

اور آپ افضل الانبیاء خاتم المرسلین اور منتہی النبیین تھے اور حضرت عیسٰی علیہ السلام احکامِ شرعیہ میں آپ کا اقتداء کریں گے۔

وصل بست و چہارم آپ کے بعض عوارض بشریت کے ظہور اور اس کی حکمت میں :

اور آپ کو بھی مثل دُوسرے انسانوں کے شدائد جھیلنے کا اتفاق ہُوا تا کہ آپ کا ثواب مضاعف ہو اور درجات بلند ہوں پس آپ کو مرض بھی ہوا اور درد وغیرہ کی شکایت بھی ہُوئی۔ اور آپ کو گرمی اور سردی کا اثر بھی ہُوا اور بھُوک پیاس بھی لگی اور آپ کو (موقع پر) غصہ اور انقباض بھی ہوا اور آپ کو ماندگی اور خستگی بھی ہوتی تھی اور کمزوری اور پیری بھی ہُوئی اور سواری پر سے گِر کر آپ کے خراش بھی ہو گیا اور جنگِ اُحد کے دن کفّار کے ہاتھ سے آپ کے چہرہ اور سر میں زخم بھی ہُوا اور کفار طائف نے آپ کے قدم مبارک کو خُون آلُود بھی کیا اور آپ کو زہر بھی کھلایا گیا اور آپ پر جادو بھی کیا گیا اور آپ نے دوا بھی کی اور پچھنے بھی لگوائے۔ جھاڑ پھونک کا بھی استعمال کیا اور اپنا وقت پورا کر کے عالمِ بالا میں ملحق ہو گئے اور اس دارالامتحان والبلاء سے آزاد ہو گئے اور آپ کو اللہ تعالیٰ نے بہت سے مواقع میں دشمنوں (کے قتل و ہلاک کی تدبیر کرنے) سے محفوظ رکھا حتیٰ کہ یومِ اُحد میں جب بدر بن قمہ نے آپ پر پتھر چلایا اور اُس سے آپ کا رخسارۂ مبارک زخمی ہو گیا اور خود آہنی کے دو حلقے رُخسارہ میں گھُس گئے اُس وقت اللہ تعالیٰ نے بچایا اور جب آپ جبل ثور کی طرف (پوشیدہ) تشریف لے گئے اس وقت قریش کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا اور غورث (بن حارث) کی تلوار کو اور ابوجہل کے پتھر کو اور سُراقہ بن مالک کے گھوڑے کو لبید بن اعصم کے سحر (کے اثر مقصود) کو اور (اسی طرح) یہودی عورت کے زہر کے (اثر مقصود) کو آپ سے دُور رکھا اور (ہلاکت سے) آپ کے محفوظ رہنے میں اور (معمولی) تکلیف ہو جانے میں آپ کے شرف کا اظہار ہے (یہ حکمت تو محفوظ رہنے کی ہے)

اور آپ کو ثواب دینا ہے (یہ حکمت تکلیف ہونے میں ہے) اور نیز اس لیے بھی تکلیف ہوئی تاکہ آپ کے بارہ میں معجزات و عجائب کے ظاہر فرمانے کے سبب لوگ ضلالت میں نہ پڑ جاویں (یعنی اگر جسمانی تکلیف نہ ہوتی تو شاید کسی کو آپ پر الوہیت کا شبہ ہو جاتا) جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت عزیر علیہ السلام کے بارہ میں (خاص عجائب کے سبب) ضلالت میں پڑ گئے اور تاکہ مصائب میں آپ کی اُمت کے لیے تسلی کا سبب ہو (کہ جب سیّد الانبیا کو بھی تکالیف پہنچی ہیں تو ہم کیا چیز ہیں)۔

وصل بست و پنجم آپ کی روح پر اُن عوارض کے اثر نہ ہونے میں:

اور یہ عوارض مذکورہ صرف آپ کے عنصری جسد شریف پر بوجہ مشارکت نوعی کے طاری ہوتے تھے رہا آپ کا قلب مبارک سو وہ تعلق باخلق سے منزہ مقدس اور مشاہدۂ حق میں مشغول تھا کیونکہ ہر آن ہر لحظہ اللہ ہی کے ساتھ اللہ ہی کے واسطے اللہ ہی میں مستغرق اور اللہ ہی کی معیت میں تھے حتیٰ کہ آپ کا کھانا پینا پہننا حرکت و سکون بولنا خاموش رہنا سب اللہ ہی کے واسطے اور اللہ ہی کے حکم سے تھا۔ (چنانچہ ارشاد خداوندی ہے) "اور آپ نفسانی خواہش سے کچھ نہیں بولتے یہ سب وحی ہی ہے جو آپ پر نازل کی جاتی ہے" اللہ تعالیٰ آپ پر اور آپ کی آل و اصحاب پر قیامت تک رحمتِ کاملہ نازل فرماتا رہے۔ یہ (جو کچھ لکھا گیا) مطولات کا اجمالی مضمون ہے اس کو یاد رکھو کیونکہ اس پر بجز علماء محققین کے اور وہ بھی کتب اور دفاتر کثیرہ کے تتبع کے بعد ہر شخص مطلع نہیں ہو سکتا اور ہم نے ایسا نافع خوری اور دلپسند سیری بخش مجموعہ تم کو دے دیا جس کو بہت قلیل مدت میں ضبط کر سکتے ہو اے اللہ اس کے پڑھنے والے کو اور لکھنے والے کو اور سُننے والے کو اور یاد کرنے والے کو اور کسی کے سامنے نقل کرنے والے کو اور تالیف کرنے والے کو (اور ترجمہ کرنے والے کو) بخش دیجیے۔ آمین

اور ہم چند ابیات پر اس کو ختم کرتے ہیں جو آپ کے دربار شریف میں بطور تحفہ کے (مبلغین صلوٰۃ و سلام کے واسطے سے) بھیجے جاتے ہیں۔ یہ اشعار مولف کے ہیں: ؎

دستگیری کیجیے میرے نبی	کشمکش میں تم ہی ہو میرے ولی
جز تمہارے ہے کہاں میری پناہ	فوج کلفت مجھ پر آ غالب ہوئی
ابن عبداللہ زمانہ ہے خلاف	اے میرے مولا خبر لیجے مری
کچھ عمل ہے اور نہ طاعت میرے پاس	ہے مگر دل میں محبت آپ کی
میں ہوں بس اور آپ کا دربا رسول	ابرِ غم گھیرے نہ پھر مجکو کبھی
خواب میں چہرہ دکھا دیجیے مجھے	اور مرے عیبوں کو کر دیجیے خفی
درگزر کرنا خطا و عیب سے	سب سے بڑھ کر ہے یہ خصلت آپ کی
سب خلائق کے لیے رحمت ہیں آپ	خاص کر جو ہیں گنہ گار و غوی

کاش ہو جاتا مدینہ کی میں خاک لعل بوسی ہوتی کافی آپ کی
آپ پر ہوں رحمتیں بے انتہا حضرت حق کی طرف سے دائمی
جس قدر دنیا میں ہیں ریت اور سانس اور بھی ہے جس قدر روئیدگی
اور تمھاری آل پر اصحاب پر
تا بقائے عمر دارا خسروی

جنابِ رسالتمآبؐ کی شگفتہ مزاجی

ارشد میر ایڈووکیٹ

عربی زبان کا ایک مشہور مقولہ ہے "مزاح المومنین عبادۃ" یعنی ایمان کی حدود کے اندر مؤمنین کا باہمی مزاح بھی عبادت ہے اسی طرح یہ بھی معروف قول ہے "الملح فی الکلام کالملح فی الطعام" جس کا مطلب ہے کہ کلام میں مزاح کو وہی مقام حاصل ہے جو طعام میں نمک کو ہے۔

انسانی فطرت حزن و مسرت سے مرکب ہے اور متانت کے ساتھ مسکراہٹ سے ہی حیاتِ انسانی کا قافلہ رواں دواں ہے۔ سرورِ کائناتؐ، فخرِ موجوداتؐ کی پوری زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح ہمارے سامنے ہے کہ حضورؐ نے کس طرح ربانی مقصدِ جلیلہ کی تکمیل کے لیے اپنی حیاتِ گرامی کا ایک ایک لمحہ وقف کر رکھا تھا اور رانہنمائی، دلسوزی، دردمندی اور سنجیدگی سے فلاحِ انسانی کے لیے کوشاں رہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ حضورؐ نے کسی مرحلہ پر بھی ترشروئی یا عبوست کو پسند نہیں فرمایا۔

حضورِ اقدسؐ کی ذاتِ گرامی فطری تقاضوں کو اخلاقی معیار کے ساتھ ہم آہنگ رکھنے کے لیے وقف رہتی تھی۔ آپؐ نے مزاح میں بھی متانت کا پہلو ہمیشہ ملحوظ رکھا اور کبھی کھلکھلا کر یا قہقہہ لگا کر نہیں ہنستے تھے بلکہ آپؐ کی ہنسی ہمیشہ تبسم تک محدود رہتی تھی۔ ایک مرتبہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا کہ آیا رسولِ اکرمؐ کبھی مزاح بھی فرماتے تھے تو آپ نے فرمایا۔ ہاں! لیکن ہر کہہ و مہ کے ساتھ نہیں بلکہ مخاطب کے محل و مقام اور استعداد کے مطابق ایسا فرماتے تھے۔

حضرت حسن بصریؒ سے روایت ہے کہ ایک روز کوئی ضعیفہ نبی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا یا رسولؐ اللہ! دُعا کیجیے میں جنت میں جاؤں، جس پر آنحضورؐ نے فرمایا۔ بوڑھی عورتیں جنت میں نہیں جائیں گی۔ وہ بڑی پریشان ہوئی اور رونے لگی جس پر آپؐ نے فرمایا کہ جنت میں بوڑھی عورتیں نہیں جائیں گی بلکہ اللہ تعالیٰ جوان کر کے داخل کریں گے۔ اس پر وہ بڑھیا خوش ہو گئی۔

اسی طرح حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ ایک شخص نے رسولِ اکرمؐ کی خدمتِ عالیہ میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ اسے کوئی سواری کا جانور عطا فرمائیں۔ آپؐ نے فرمایا۔ ہم تجھے اونٹنی کا بچہ دیں گے۔ اس نے کہا یا رسولؐ اللہ میں اونٹنی کے بچہ کو کیا کروں گا؟ (کیونکہ سواری کے لیے بچہ تو کام نہیں دے سکتا) آپؐ نے فرمایا۔ اونٹ کو ناقہ یعنی اونٹنی ہی تو جنتی ہے۔ مزاح کا یہ لطیف پیرایہ نہ صرف زیرِ لب تبسم کا عکاس ہے بلکہ اس میں صداقت کا پہلو بھی پوری آب و تاب سے نمایاں ہے چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ "لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ! آپؐ مزاح فرماتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا" یقیناً مگر اس میں صرف سچی بات کہتا ہوں"۔ لطیف ترین اور صداقت پر مبنی مزاح کی ایک اور درخشاں مثال یوں ہے کہ ایک عورت حضورؐ کی خدمت میں پہنچی۔ آپ نے اس کے شوہر کی بابت پوچھا تو اس نے نام بتایا۔ جس پر آپؐ نے فرمایا: وہی جس کی آنکھوں میں سفیدی ہے۔ جونہی وہ

عورت گھر پہنچی، اپنے شوہر کی آنکھوں کو غور سے دیکھنے لگی۔ اس کے خاوند نے کہا۔ تجھے کیا ہو گیا ہے؟ عورت نے جواب دیا۔ رسول اکرم نے مجھے آپ کے بارے میں پوچھا، میں نے بتایا تو فرمایا وہی جس کی آنکھوں میں سفیدی ہے۔ یہ سن کر اس نے کہا کہ کیا میری آنکھوں میں سفیدی سیاہی سے زیادہ نہیں ہے؟ حضور اکرم کی شگفتہ مزاجی کی ایک اور مثال حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ زاہر نامی ایک دیہاتی اکثر آپؐ کے لیے گاؤں کی چیزیں تحفے کے طور پر لایا کرتا تھا۔ آپ کو بھی اس سے بے حد انس تھا اور آپؐ بھی اُسے شہر کی کوئی نہ کوئی سوغات ضرور عنایت کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ آپؐ نے فرمایا کہ "زاہر ہمارا جنگل ہے اور ہم اس کے شہر ہیں۔" زاہر کی شکل وصورت بھی اچھی نہ تھی۔ ایک دن وہ اپنا سودا بیچ رہا تھا کہ حضورؐ پیچھے سے آئے اور بے خبری سے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ اس نے کہا کون ہے مجھے چھوڑ دے مگر جب مڑ کر دیکھا تو رسولِ خدا تھے جس پر وہ اپنی کمر حضورؐ کے سینہ مبارک سے ملنے لگا۔ آپؐ نے فرمایا۔ یہ غلام کون خریدتا ہے؟ زاہر کہنے لگا۔ یا رسولؐ اللہ! آپ مجھے کھوٹا سکہ پائیں گے۔ آپؐ نے فرمایا بلکہ اللہ کے نزدیک تو تو بہت قیمتی ہے۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نبی علیہ السلام کے لیے شائستہ مزاح پیدا کرنا تبلیغی اور دینی ضرورت بھی تھی کہ حضورؐ کی ذات اگر ایسا نہ کرتی تو ان کے قدرتی رعب وجلال کی بنا پر حاضرین کا ان کے قرب میں رہنا بھی مشکل ہو جاتا۔ مزید برآں سنت نبوی کی پیروی کرتے ہوئے آنے والے اکابر عمداً مزاح سے اجتناب کرتے۔ یہی سبب ہے کہ حضورؐ بعض اوقات صحابہ کرامؓ کو مزاحاً ان کے حسب حال القابات سے بھی نوازتے رہتے تھے۔ چنانچہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرمؐ نے ایک روز تفنّن کے طور پر فرمایا "یا ذالاذنین" یعنی اے دو کانوں والے۔ بادی النظر میں کان تو ہر شخص کے دو ہی ہوتے ہیں۔ اُنھیں جو خصوصیت سے یہ لقب عطا کیا تو ان کے کان بڑے ہوں گے۔ بصورتِ دیگر ان کی قوتِ سامعہ کافی تیز ہوگی۔ اسی طرح حضرت ابوہریرہؓ کو یہ لقب (یعنی بلّی کا باپ) اس لیے دیا کہ عربی میں ہریرہ بلّی کو کہتے ہیں اور آپؓ نے ایک بلّی پالی ہوئی تھی۔ اسی طرح حضرت علیؓ کو ابو تراب (مٹی کا باپ) کا لقب اس بنا پر مرحمت ہوا کہ ایک دن خاک پر سوتے میں ان کے رخساروں پر مٹی لگی ہوئی تھی۔ نیز انھوں نے حضرت انسؓ کے چھوٹے بھائی کی کنیت بھی رکھی اور اُسے ابو عمیر کہہ کر پکارا۔ ابو عمیر کے پاس نغیر نامی پرندہ تھا جس سے وہ کھیلا کرتا تھا۔ اتفاق سے وہ پرندہ مر گیا جس سے بچہ بہت رنجیدہ تھا۔ چنانچہ یہ دیکھتے ہوئے آپؐ نے اسے مزاحاً کہا: اے عمیر نغیر کو کیا ہوا؟

سرورِ کائنات جہاں خود شستہ مذاق کرتے تھے وہاں اگر صحابہ کرامؓ بھی اس نوع کا مذاق کرتے تو اس سے محظوظ ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عوف بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالمؐ غزوۂ تبوک کے دوران ایک بالکل چھوٹے سے خیمہ میں بیٹھے تھے کہ میں نے باہر سے سلام عرض کیا۔ آپؐ نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا کہ اندر آجاؤ۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا پورا آجاؤں۔ فرمایا ہاں پورے آجاؤ۔

اسی طرح حضرت ام سلمیٰؓ راوی ہیں کہ نبی کریمؐ کی وفات سے تقریباً ایک سال قبل حضرت ابوبکرؓ تجارت کے لیے بصرہ گئے۔ ان کے ہمراہ حضرت نعمانؓ اور حضرت سویبطؓ بھی تھے۔ ان میں سے حضرت سویبطؓ ظریف الطبع تھے۔ دورانِ سفر ایک روز حضرت سویبطؓ نے حضرت نعمانؓ سے کھانا مانگا۔ حضرت ابوبکرؓ وہاں موجود نہ تھے۔ نعمانؓ نے کہا حضرت ابوبکرؓ کے آنے پر دوں گا۔ حضرت

سویبطؓ نے کہا کہ اچھا میں تم سے دیکھ لوں گا۔ کچھ دیر چلتے رہنے کے بعد ایک قبیلہ کے پاس سے گزرے تو سویبطؓ نے وہاں کچھ لوگوں سے کہا کہ میرے پاس ایک غلام ہے اگر تم خریدنا چاہو تو لے لو مگر اس میں ایک بات ہے کہ وہ خود کو آزاد کہتا رہے گا لیکن تم اُسے چھوڑنا نہیں چنانچہ دس اونٹوں پر معاملہ طے ہو گیا اور ان لوگوں نے نعمانؓ کے گلے میں چادر ڈال لی یہ بیچارے چیختے ہی رہے کہ میں آزاد ہوں مگر انھوں نے کہا کہ ہمیں تمھاری اس بات کا علم ہے۔ حتیٰ کہ حضرت ابوبکرؓ آگئے تو انھوں نے ان کی جان چھڑائی اور مال واپس کر دیا۔ جب یہ حضرات مدینہ منورہ آئے تو یہ قصہ حضورؐ کو سنایا۔ آپؐ سُن کر خوب مسکرائے گویا خود بھی شگفتہ مزاج تھے اور شگفتگی کلام کو پسند بھی فرماتے تھے۔

ایک دن ایک شخص سے آپؐ نے دریافت فرمایا کہ بتاؤ تمھارے ماموں کی بہن تمھاری کیا لگی۔ اس سادہ دل نے سر جھکا لیا اور سوچنے لگا۔ آپؐ مسکرا دیئے اور فرمایا کہ ہوش کر، تجھے تیری ماں یاد نہیں رہی۔

رسُول مقبولؐ ایک روز صحابہ کرامؓ کے جلو میں کھجوریں کھا رہے تھے۔ شیرِ خدا حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی تشریف رکھتے تھے۔ آنحضرتؐ اور دیگر حاضرین کھجوریں کھا کھا کر گٹھلیوں کو حضرت علیؓ کے آگے رکھتے جا رہے تھے۔ حضورؐ نے مزاحاً فرمایا۔ کہ گٹھلیاں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ کھجوریں حضرت علیؓ نے کھائی ہیں۔ حضرت علیؓ بھی رسُول اکرمؐ ہی کی آغوش تربیت کے پروردہ تھے۔ انھوں نے برجستہ کہا کہ دیکھنے والا یہ بھی سمجھ سکتا ہے کہ میں نے گٹھلیاں چھوڑ دی ہیں۔ جن کے سامنے گٹھلیاں نہیں ہیں وہ شاید مع گٹھلیوں کے کھا گئے ہیں۔

آپؐ اور دیگر صحابہ کرامؓ اس حاضر جوابی سے بہت لطف اندوز ہوئے۔ اسی طرح حضرت صہیبؓ کہ مشہور صحابیٔ رسُول تھے۔ نبی اکرمؐ کی خدمت میں پہنچے۔ آپؐ اس وقت کھجوریں کھا رہے تھے۔ حضرت صہیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی کھجوریں کھانے لگے تو آپؐ نے فرمایا کہ "آنکھ آئی ہوئی ہے اور کھجوریں کھا رہے ہو"۔ جس پر حضرت صہیبؓ نے کہا "یا رسُولؐ اللہ! میں اچھی آنکھ سے کھا رہا ہوں۔ ایک آنکھ تو دُرست ہے"۔ اس بدیہہ گوئی پر آپؐ مسکرا دیئے۔

ایک مرتبہ ایک اعرابی مدینہ منورہ میں آیا۔ اونٹنی کا زانو باندھا اور مسجد نبویؐ میں جا کر سرکارِ دو عالمؐ کے پیچھے نماز ادا کی۔ نماز سے فارغ ہو کر باہر آیا اور اونٹنی پر سوار ہو کر بلند آواز سے کہا۔

"اے ربِّ ذوالجلال! مجھ پر رحم فرما اور سرورِ کائنات پر اور ہم دو کے سوا اور کسی کو اس میں شریک نہ کرنا"۔

یہ کلمات سُن کر آنحضورؐ نے مسکراتے ہوئے صحابہ کرامؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ "تم اس (دہقانی) اور اونٹ میں سے کسے زیادہ ناسمجھ کہو گے۔ تم نے سُنا اُس نے کیا کہا ہے"؟

صحابہ کرامؓ بھی مسکرائے اور عرض کیا۔ "جی ہاں سُنا"۔

ایک دفعہ بارگاہِ رسالتؐ میں ایک صحابی نے عرض کیا۔ "یا رسُولؐ اللہ! مجھے میرے بُت نے بہت نفع دیا"۔

صحابہؓ کرامؓ نے حیرانی کے عالم میں صحابی کے مُنہ کی جانب دیکھا کہ بُت بھلا کیسے کسی کو نفع پہنچا سکتا ہے۔ یہ صورتحال بھانپتے ہوئے صحابی نے کہا "یا حبیبِ کبریا! میں سفر پر روانہ ہوا۔ دورانِ سفر میں نے ستوؤں کا بُت بنایا۔ دورانِ سفر کھانا

ختم ہوا تو میں نے بُت کو توڑ کر کھایا۔ مجھے تو بُت نے بے حد نفع دیا۔" یہ جملہ سُن کر جملہ صحابۂ کرامؓ ہنسنے لگے اور آنحضورؐ بھی مُسکرا دیئے۔

امام عالی مقام حضرت امام حسینؓ نے سواریِ شُتر کی خواہش کی تو حضورؐ نے فرمایا۔ میں ہی تمہارا اُونٹ بننے کو تیار ہوں جس پر حضورِ اکرمؐ نے انھیں کاندھوں پر اُٹھا لیا اور حجرے کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک لے گئے۔ اسی دوران امام عالی مقامؓ نے فرمایا کہ اُونٹ کی تو مہار ہوتی ہے۔ جب کہ میرے اونٹ کی مہار کوئی نہیں۔ اس پر حضورؐ نے اپنے گیسو ان کے ہاتھ میں دے دیئے کہ یہ مہار ہے۔ اس حالت میں حضرت عمرؓ تشریف لے آئے اور حضرت امام حسینؓ سے کہا کہ بھئی تمہیں سواری خُوب ملی ہے۔ حضورؐ نبی کریم نے فرمایا کہ سوار بھی تو خُوب ہے۔

ایک دفعہ حضرت ابوذرؓ نے رسُول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا، سُنا ہے کہ جب دجال ظاہر ہوگا تو دُنیا قحط کا شکار ہوگی۔ اس عام قحط میں دجال لوگوں کی ضیافت کرے گا جس میں انواع و اقسام کے کھانے ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ اگر میں اس دور میں ہوا تو پہلے اس کے کھانوں سے خوب پیٹ بھروں گا اور پھر اس سے منحرف ہو جاؤں گا۔ یہ سُن کر حضورؐ نے تبسم فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اگر تم اس دَور میں ہوئے تو اللہ تعالیٰ تمہیں اس کی نعمتوں سے بے نیاز کر دے گا۔

بطور نمونہ مشتے از خروارے یہ چند مثالیں محض اس لیے درج کی گئی ہیں تاکہ یہ ثابت ہو سکے کہ نبی علیہ السلام اپنے ساتھیوں کے لطیف اور پاکیزہ مذاق سے کس قدر محظوظ ہوتے تھے۔ شگفتگی، برجستگی اور متانت کا ایک حسین امتزاج ہوتی تھی آپؐ خوش ہوتے تو زیرِ لب تبسم فرماتے۔ قہقہہ لگانا نبوت کی سنجیدگی کے خلاف تھا۔ قہقہہ تو وہ لوگ لگائیں جو بے فکر ہوں۔ آپؐ اپنے بارے میں فرماتے تھے کہ میں کیونکر بے فکر ہوں۔ جب کہ صاحبِ صور تیار کھڑا ہے اور قرآن پاک کی بعض سُورتوں کے بارے میں آپؐ نے فرمایا کہ انہوں نے مجھے قبل از وقت بوڑھا کر دیا ہے۔ گویا آپؐ کی حالت یوں تھی ؎

مرا در منزلِ جاناں چہ امن و عیش چُوں ہر دم
جرس فریاد می دارد کہ بر بندید محملہا

آپؐ کا تبسم بھی اس لیے تھا کہ آپؐ کے ساتھ مصالح خلق وابستہ تھا۔ البتہ کبھی کبھی بوقتِ تبسم آپؐ کے دندانِ مُبارک نظر آجاتے تھے۔ اس وقت دندانِ مبارک یُوں چمکتے تھے جیسے بادلوں کی اوٹ میں سے بجلی چمکی ہو۔ اس سلسلہ میں عامر بن سعد بن ابی وقاص راوی ہیں کہ انھوں نے دیکھا کہ آپؐ نے غزوۂ خندق کے موقع پر تبسم فرمایا اور آپؐ کے دندانِ مبارک نظر آنے لگے۔ عامر نے اپنے والد صاحب سے پُوچھا کہ حضورؐ کا تبسم کس نوع کا تھا۔ اس پر سعد کہنے لگے کہ غزوۂ خندق میں ایک آدمی نے تیروں سے بچنے کیلئے لوہے کی ڈھال کا سہارا لیا ہوا تھا۔ میں تیر پھینکتا جا رہا تھا اور وہ شخص اپنا چہرہ ڈھال سے بچا رہا تھا۔ اسی دوران میں نے ایک تیر چلانے کے لیے نکالا۔ اس نے اچانک سر اُونچا کیا، میں نے فوراً تیر چلا دیا جو اس کی پیشانی میں دھنس گیا اور وہ بل کھا کر گر پڑا۔ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر رسُولِ خُدا بے ساختہ مسکرا پڑے۔ اس وقت ہم نے آپؐ کے دندانِ مُبارک دیکھے۔

تاریخ نے حضورؐ کی دلآویز حسِ مزاح کا ایک اور واقعہ محفوظ رکھا ہے۔ غزوۂ بنی مصطلق میں مشہور منافق عبداللہ بن ابی نے حضورؐ

کے خلاف سازش کی اور ایک مجلس میں کہا کہ مدینہ جا کر ہم میں سے جو عزت والا ہے وہ ذلیل کو نکال دے گا۔ اس مجلس میں حضرت زیدؓ بن ارقم موجود تھے۔ وہ اس وقت بالکل بچے تھے۔ انہوں نے یہ واقعہ حضورؐ تک پہنچا دیا۔ جب عبداللہ بن ابی سے دریافت کیا گیا تو اس نے انکار کیا۔ زیدؓ پر لوگوں نے شک کیا کہ انہوں نے غلط اطلاع پہنچائی ہے مگر سورۃ منافقون کی آیت نمبر ۸ میں اللہ تعالیٰ نے تصدیق فرمائی تو حضورؐ نے زیدؓ بن ارقم کو بلایا اور مسکرا کر ان کا کان پکڑا اور فرمایا "لڑکے کا کان سچا تھا"۔ حضورؐ کا یہ فرمان اپنے اندر جہاں شگفتگی اور واقعیت کی ایک دنیا لیے ہوئے ہے وہاں علم بیان کی بلاغتوں کو بھی سمیٹے ہوئے ہے مجاز مرسل میں بعض اوقات آلہ کہہ کر وہ چیزیں مراد لے لی جاتی ہیں جن کے لیے وہ آلہ مخصوص ہو۔ اس فرمان میں "کان" سے سنی ہوئی بات مراد ہے۔

حضورؐ چونکہ "افصح العرب" تھے۔ اس لیے آپؐ کا ہر ارشاد فصاحت و بلاغت کی بے پایاں کیفیتوں کا امین ہوتا تھا۔ آپؐ کا مزاح شگفتگی، شائستگی اور پاکیزگی کا حامل تھا۔ یہ دلوں میں گدگدی پیدا کر کے بے پایاں طمانیت عطا کرتا تھا۔ مزاح کا یہی وہ نادر مثالی اور انمول نمونہ ہے کہ جس سے کسی کی دلآزاری نہیں ہوتی۔ حضورؐ کا فرمان ہے: اپنے بھائی کے ساتھ خصومت نہ کرو اور ایسا مذاق نہ کرو جس سے اسے ایذا پہنچے اور ایسا وعدہ نہ کرو جو وفا نہ کر سکو"۔ ایک اور مقام پر حضورؐ نے فرمایا: خالص ایمان تک آدمی نہیں پہنچا جب تک مزاح اور جھوٹ کو نہ چھوڑ دے"۔ ظاہر ہے کہ جب مزاح کے ساتھ جھوٹ کی آمیزش ہو جائے گی تو ایک طرف مزاح لطیف نہیں رہے گا بلکہ پھکڑپن میں بدل جائے گا اور دوسری طرف اس مزاح کا نشانہ بننے والا بات کی کسک دل میں محسوس کرے گا اور یوں دل پر ایسے زخم لگ جائیں گے جو کبھی مندمل نہ ہو سکیں گے۔ مزاح کے اپنے حدود ہیں جب مزاح ان سے گزر جائے تو وہ پھکڑپن بن جاتا ہے۔ ایک ادیب کے الفاظ میں "ادب کے جس نقطۂ عروج پر بیان کی خوبیاں، ذہن کے تنقیدی زاویے اور قلم کی تعمیری شوخیاں پختہ تر ہو کر ایک معیاری لطافت بن جاتی ہیں، مزاح کہلاتا ہے"۔ گویا مزاح کا مقصد تعمیر ہے، تخریب نہیں۔ طمانیت ہے دل آزاری نہیں۔ تبسم ہے قہقہہ نہیں۔ حضورؐ کی شگفتہ طبعی کے جو پاکیزہ نمونے تاریخ نے محفوظ رکھے ہیں۔ انہیں پڑھ کر لبوں سے زیادہ دل مسکراتا ہے۔ قرآن حکیم میں واضح حکم ہے:۔

"اپنے مومن بھائی کو عیب نہ لگاؤ اور نہ ایک دوسرے کا برا نام رکھو"۔ (الحجرات ۱۱) اسی فرمانِ اقدس سے اس پھبتی، طنز اور تضحیک کی نفی ہو جاتی ہے جس سے دلآزاری کا پہلو نکلتا ہو۔ حضورؐ کے مزاح میں شگفتگی بدرجۂ اتم موجود تھی مگر دلآزاری کا شائبہ بھی نہیں تھا اور اسی انداز کی تقلید ہم سب پر لازم ہے کہ یہی طریقہ ہم خرما و ہم ثواب کے مصداق ہے۔

معلمِ انسانیت کی پسندیدہ غذائیں

نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل کرنا مسلمانوں کے لئے ذریعہ عظمت و نجات ہے آپ کی تعلیم اس قدر کامل و مکمل ہے کہ اس سے صحت مند اور لذیذ غذاؤں تک کا علم حاصل کیا جا سکتا ہے اور ان کو استعمال کر کے ظاہری و مادی فائدے کے علاوہ سنّتِ رسولؐ کی ادائیگی کا ثواب بھی نصیب ہو سکتا ہے۔ وہ مسلمان بڑا ہی خوش نصیب ہے جو کسی چیز کو اس لئے پسند کرے کہ وہ چیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند تھی اس طرح اس چیز کا استعمال عبادت اور ذریعہ ثواب بن جاتا ہے

شہد

عربی میں شہد کی مکھی کو نحل کہتے ہیں قرآن کریم کی ایک سورۃ کا نام نحل ہی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی بے شمار نعمتوں میں سے کچھ کا ذکر کرتے ہوئے شہد کی مکھی اور شہد کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

"اور تمہارے رب نے شہد کی مکھی کو حکم دیا کہ پہاڑوں میں گھر بنا اور درختوں اور چھتوں میں، پھر ہر قسم کے پھلوں میں سے کھا اور اپنے رب کی راہیں چل جو تیرے لئے نرم اور آسان ہیں اس کے پیٹ سے ایک چیز پینے کی رنگ برنگ نکلتی ہے جس میں لوگوں کے لئے تندرستی ہے بے شک اس میں نشانی ہے اُن لوگوں کے لئے جو غور کریں۔" (آیت نمبر ۶۸ - ۶۹)

قابلِ غور ہے یہ آیت کہ کس طرح ایک مکھی پھلوں اور پھولوں کا رس چوستی ہے اور جب وہ اس کے پیٹ میں رہ کر باہر آتا ہے تو میٹھا لذیذ بھی ہوتا ہے اور صحت بخش بھی۔ خدا کی پیدا کردہ اس لذیذ و مفید نعمت کی اہمیت، افادیت اور لذت کا اندازہ نبی کریمؐ کے ارشادات سے مزید کیا جا سکتا ہے۔

علیکم بالشفائین العسل والقرآن — (دو چیزوں سے صحت حاصل کرو شہد اور قرآن کریم سے)

اس حدیث میں شہد کو صحت بخش ہونے کے ساتھ قرآن کریم کو بھی ذریعہ صحت فرمایا گیا کیوں کہ شہد تو جسمانی امراض کو ختم کرنے اور جسم کو صحت یاب کرنے والی ایک غذا ہے اور قرآنِ کریم روحانی امراض کو ختم کرنے اور روح کو جلا بخشنے والی کتاب ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ القرآن ما ھو شفاءٌ — ہم اتارتے ہیں قرآن میں وہ چیز جو ایمان والوں کے

ورحمۃ للمومنین o ۸۲:۱۷

لئے شفا اور صحت و رحمۃ المومنین ہے۔

۲۔ حضرت ابو سعید خدریؓ نے بیان کیا کہ ایک شخص نے نبی کریمؐ سے عرض کیا کہ میرے بھائی کے پیٹ میں درد ہے یا اس نے کہا کہ میرے بھائی کو اسہال (دستوں) کی شکایت ہے تو حضورؐ نے فرمایا:

اسقه عسلاً ۔ اسے شہد پلادو۔

وہ شخص چلا گیا اور پھر واپس آکر عرض کرنے لگا کہ میں نے شہد پلایا لیکن کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ نبی کریمؐ نے پھر شہد ہی پلانے کا حکم دیا۔ دو تین بار ایسا ہی ہوا۔ جب وہ چوتھی مرتبہ خدمت میں حاضر ہوا تو آپؐ نے فرمایا:۔

صدق الله وكذب بطن اخيك ۔ اللہ نے سچ فرمایا اور تیرے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے۔

اس ارشاد کو سنکر وہ شخص گیا اور پھر شہد پلایا اور وہ صحت یاب ہو گیا۔

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ نبی کریمؐ کو ارشاد باری تعالیٰ کے مطابق شہد کی افادیت پر کس قدر یقین تھا مریض گھبرایا مگر آپ شہد ہی پلواتے رہے اور آخر کار اللہ کا ارشاد سچ ہوا اور مرض ختم ہو گیا۔

شہد کی یہ تاثیر آج بھی باقی ہے شرط یہ ہے کہ شہد بھی اصلی ہو اور مسلمان بھی اصلی۔

(۳) حضرت ابو ہریرہؓ نے بیان کیا کہ نبی کریمؐ نے فرمایا:۔

من يلعق العسل ثلث غدوات في كل شهر لم يصبه عظيم من البلاء ۔ (جو شخص ہر مہینے تین دن شہد چاٹ لے تو اسے کوئی بڑی تکلیف نہیں ہو گی۔

یعنی شہد کا استعمال صحت کا ایک مستقل ذریعہ ہے اس حقیقت کو طبی تحقیق نے بھی ثابت کیا اور اطبا نے تسلیم کیا کہ شہد بہت سی بیماریوں کی دوا ہے مثلاً جسم اور خاص طور پر پھیپھڑوں کے لئے قوت بخش ہے۔ قلب کے لیے فرحت بخش ہے کھانسی دمہ اور ٹھنڈ سے ہونے والی بیماریوں کے لیے مفید ہے۔ لقوہ اور فالج کے لئے بھی بہت مفید ہے۔ خون کو صاف کرتا ہے اگر سرمہ کی طرح آنکھوں میں لگایا جائے تو آنکھوں کو بیماری سے بچاتا اور نظر کی حفاظت کرتا۔ غرض کہ بے شمار امراض کا علاج ہے۔

کھجور

کھجور ایک بہترین میوہ بھی ہے اور غذا بھی۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اس کا ذکر موجود ہے۔ سورہ رحمٰن کی دسویں آیت میں اس طرح ذکر فرمایا گیا۔

فيها فاكهة والنخل ذات الاكمام ۔ اس میں میوے ہیں اور غلاف والی کھجوریں۔

میووں کے تذکرے کے بعد خاص طور پر نخل (کھجور) کا ذکر اس کی افادیت (اہمیت) کو ظاہر کرتا ہے جس کی وضاحت نبی کریمؐ کے ان ارشادات سے ہوتی ہے۔

۱۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریمؐ نے فرمایا:۔

من تصبح کل یوم سبع تمرات عجوۃٍ لم یضرہٗ فی ذالک الیوم سم ولا سحر

جو شخص روزانہ صبح کے وقت سات عجوہ کھجوریں کھالیا کرے اُسے اس دن زہر اور جادو سے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔

کھجور کی بہت سی قسمیں ہوتی ہیں ان میں سے ایک قسم عجوہ ہے جو درمیانہ سائز کی ہوتی ہے اور اس کا رنگ سیاہی مائل ہوتا ہے یوں تو نبی کریمؐ نے ہر کھجور کو پسند فرمایا ہے لیکن عجوہ کی خاص طور پر احادیث بیان فرمائی اور اس کو بہت سے امراض کا علاج بتایا۔ جیسا کہ اسی حدیث میں فرمایا گیا کہ جو روزانہ صبح سات عجوہ استعمال کرے وہ دن بھر زہر اور جادو کے اثر سے بچا رہے گا۔ غور فرمایئے زہر اور جادو کس قدر تکلیف دہ چیزیں ہیں اور اس کا علاج کتنا معمولی سا ہے۔ اس عجوہ کے بارے میں آپؐ نے فرمایا۔

۲۔ والعجوۃ من الجنۃ وھی شفاءٌ من السم

اور عجوہ جنت کا پھل ہے اس میں زہر سے شفاء دینے کی تاثیر ہے۔

۳۔ حضرت سعدؓ نے بیان فرمایا کہ ایک دفعہ میں بیمار ہو گیا تو نبی کریمؐ میری عیادت کو تشریف لائے۔ آپؐ نے میرے سینے پر اپنا نورانی ہاتھ رکھا، مجھے اس کی ٹھنڈک دل تک محسوس ہوئی۔ آپ نے فرمایا۔

"تمہیں دل کی تکلیف ہے، تم حارث بن کلدہ ثقفی کے پاس جاؤ کیونکہ وہ طبیب ہے۔"

فلیاخذ سبع تمراتٍ من عجوۃ المدینۃ فلیجاھن بنواتھن ثم لیلدک

اسے چاہیے کہ مدینہ کی عجوہ کھجور کے سات دانے لے کر انھیں گٹھلیوں سمیت کوٹ لے اور تمہارے منہ میں ڈال دے۔

۴۔ حضرت عبداللہ بن جعفرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضورؐ کو دیکھا کہ آپ یا کل الرطب بالقثاء "تازہ کھجوریں اور ککڑی ایک ساتھ تناول فرماتے تھے"۔ کھجور اور ککڑی کا استعمال صرف ایک اتفاق نہ تھا بلکہ نبی کریمؐ نے اپنے اس عمل سے کھجور کی گرم تاثیر اور ککڑی کی سرد تاثیر کو ختم کرنے کا طریقہ سکھایا۔ یا اس مقصد کے لئے آپ کا ایک دوسرا عمل یہ تھا کہ

کان یاکل البطیخ با لرطب یقول

آپ تربوز تازہ کھجور کے ساتھ کھاتے تھے اور فرماتے:

یدفع حر ھذا برد ھذا

یہ تربوز گرمی کو ختم کرتا ہے اور کھجور سردی کو دور کرتی ہے۔

نبی کریمؐ کا یہ عمل اسی بات کو سمجھنے کے لئے کافی ہے کہ آپؐ صحت کا کس قدر خیال فرماتے تھے۔ اور مفید غذاؤں کے استعمال کا کس طرح طریقہ تعلیم فرماتے تھے۔

۵۔ بنو سلمی کی بیٹی عطیہ اور بیٹے عبداللہ نے بیان کیا کہ ہم نے نبی کریمؐ کی خدمت میں مکھن اور تازہ کھجوریں پیش کیں اور آپ مکھن و کھجور کو پسند فرماتے تھے۔

تمر خشک کھجور کو کہا جاتا ہے ۔ جو مکھن کے ساتھ واقعی بہت لذیذ بھی ہو جاتی ہے اور مکھن اس کی گرم و خشک تاثیر کو ختم کر دیتا ہے غرض کہ کھجور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پسندیدہ غذا تھی ۔ اب امت کے لئے اس کا استعمال فائدے کے علاوہ ذریعۂ ثواب بھی ہے ۔

گوشت

گوشت صحت و قوت کے لئے ایک نہایت ہی مفید غذا ہے مسلمانوں کے لئے جن جانوروں کا گوشت حلال کیا گیا وہ اس کو نہ صرف بطور غذا استعمال کرتے ہیں بلکہ بڑے شوق اور میلانِ طبع سے استعمال کرتے ہیں اور اگر یہ بھی خیال کر لیا جائے کہ اس مرغوب غذا کے متعلق نبی کریمؐ کا ارشاد اور عمل کیا ہے ۔ تو پھر اس کا استعمال سنتِ نبوی پر عمل بھی ہو گا ۔ لہٰذا اس سلسلے میں حضورؐ کے چند ارشادات ملاحظہ ہوں ۔

۱۔ حضرت ابو درداءؓ نے بیان کیا کہ نبی کریمؐ نے فرمایا :۔

سید طعام اھل الدنیا و اھل الجنة ۔ دنیا والوں اور جنت والوں دونوں کے کھانوں کا سردار گوشت ہے ۔

۲۔ حضرت بریدہؓ نے بیان کیا کہ نبی کریمؐ نے فرمایا :۔

خیر الادام فی الدنیا والآخرة اللحم دنیا اور آخرت میں بہترین سالن گوشت ہے

سب حصوں کا گوشت مزے میں برابر نہیں ہوتا بلکہ سر، پائے، سینہ، ران، وغیرہ ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ مزا ہوتا ہے ۔ جو جس کو پسند ہوتا ہے ۔ وہ اسی حصہ کو استعمال کرتا ہے ۔ نبی کریمؐ کو بھی بعض حصوں کا گوشت خاص طور پر پسند تھا جو ان چند احادیث سے ظاہر ہے

۱۔ حضرت ابوہریرہؓ نے بیان کیا کہ حضورؐ کی خدمت میں گوشت لایا گیا اس میں سے دست آپ کو دیا گیا کیونکہ آپ دست کو پسند فرماتے تھے ۔ لہٰذا آپ نے اُسے دانتوں سے کاٹ کر تناول فرمایا ۔

۲۔ حضرت ضباعہ بنت زبیرؓ نے بیان کیا کہ ایک دفعہ ہم نے اپنے گھر میں بکری ذبح کی تو حضورؐ نے پیغام بھیجا کہ اس میں سے ہمارا حصہ بھیج دیں ۔ میں نے عرض کیا صرف گردن کا گوشت بچا ہے جو آپ کے لیے بھیجتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے ۔ حضورؐ نے کہلا بھیجا ۔ یہی بھیج دو کیوں کہ گردن کا گوشت بکری کا عمدہ حصہ ہے ۔ گردن کا گوشت خیر سے قریب تر اور نقصان سے بعید تر ہے

۳۔ اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بیان کیا :

کانت الذراع احب اللحم الی رسول اللہ کاندھے کا گوشت حضورؐ کو سب سے زیادہ پسند تھا ۔

۴۔ حضرت ابن مسعودؓ نے بیان کیا :

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یحبہا الذراع حضورؐ کاندھے کا گوشت پسند فرماتے تھے ۔

۵۔ حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے ۔

ان اطیب اللحم لحم الظھر۔ پاکیزہ ترین گوشت پیٹھ کا ہے۔

۶۔ حضرت ام سلمہؓ نے بیان کیا کہ وہ حضورؐ کے پاس بھُنی ہوئی ران لے گئیں آپ نے اس میں سے تناول فرمایا۔

۷۔ حضرت عبداللہ ابن حارثؓ نے بیان کیا کہ ہم نے حضورؐ کے ساتھ بھُنا ہوا گوشت کھایا۔

۸۔ حضرت مغیرہ بن شیبہؓ نے بیان کیا کہ ایک رات نبی کریمؐ کے ساتھ ایک شخص کے یہاں مہمان ہوا۔ گھر والے نے بکری ذبح کی۔ نام بجنب نشوی ثم اخذا لشفرۃ فجعلہ بحرب بھامنہ۔

توآپ نے دست بھوننے کی فرمائش کی جو آپ کے سامنے لایا گیا پھر آپ نے چھری لی اور اس سے میرے لئے دست میں سے کاٹنے لگے۔

ان احادیث سے واضح ہے کہ نبی کریمؐ کو گوشت بہت پسند تھا اور خاص طور سے ران، دست، گردن، پیٹھ، کاندھے کا گوشت وہ بھی بھنا ہوا پسندیدہ تھا۔

نبی کریمؐ کے اس بہترین شوق سے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ اگر اللہ وسعت عطا فرمائے تو بہترین غذا اور لذیذ کھانے بھی کھائے جاسکتے ہیں۔ لیکن لذیذ کھانوں کے حاصل کرنے کے لئے حرام و ناجائز طریقے اختیار کرنے کی ہرگز اجازت نہیں یعنی مسلمان کی شان یہ ہے کہ اس کو اگر روکھی سوکھی روٹی ملے تو بھی خدا کا شکر ادا کرکے کھائے اور خوش رہے اور اگر بہترین غذائیں میسر ہوں تو ان کو بھی استعمال کرکے خدا کا شکر ادا کرے جیسا کہ نبی کریمؐ کا عمل تھا کہ آپ کئی کئی دن بھوکے رہتے تھے معمولی کھانا ملتا تو بھی خوش ہو کر کھا لیتے اور جب عمدہ کھانے میسر ہوتے تو ان کو بھی خوش ہو کر استعمال کرتے۔

آپؐ سے پرندوں کا گوشت استعمال کرنا بھی ثابت ہے۔

۱۔ حضرت زید الجرمیؒ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوموسیٰؓ نے فرمایا۔

رایت رسول اللہ یا کل لحم دجاج میں نے اللہ کے رسولؐ کو مرغ کا گوشت کھاتے دیکھا۔)

۲۔ حضرت ابراہیم ابن عمرؓ نے بیان کیا کہ ان کے دادا حضرت سفینہؓ نے فرمایا۔

اکلت مع رسول اللہ لحم حباری ٥ میں نے نبی کریمؐ کے ساتھ سُرخاب کا گوشت کھایا۔

۳۔ حضرت انسؓ نے بیان کیا کہ ہم نے بمقام مرالظہران ایک خرگوش کو اس کے بل سے نکالا۔ لوگ اس کے پیچھے دوڑتے دوڑتے تھک گئے مگر میں نے اسے پکڑ لیا اور اسے ابوطلحہؓ کے پاس لائے۔ انہوں نے اسے ذبح کرکے اس کے دست نبی کریمؐ کے پاس بھیج دیئے آپ نے اُسے قبول کر لیا اور بھنوانے کے بعد اس میں سے کچھ تناول بھی فرمایا۔

کدّو

نبی کریمؐ کو سبزیوں میں سب سے زیادہ کدّو (لوکی) پسند تھا۔ حضرت انسؓ نے بیان فرمایا کہ ایک درزی نے حضورؐ کی دعوت

کی۔ کھانے میں جَو کی روٹی اور شوربہ پیش کیا۔ شوربہ میں کدو اور گوشت تھا۔ میں نے دیکھا کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پیالے کے کناروں سے کدو کے ٹکڑے تلاش کر کے نکال لیتے اور تناول فرماتے تھے۔ اس دن سے ہی میں کدو کے بغیر کھانا نہیں کھاتا۔

ثرید و حلوہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ثرید و حلوہ بھی پسند تھا۔ ثرید ایک تو اس کھانے کو کہا جاتا ہے جو شوربے یا پتلی دال میں روٹی بھگو کر تیار کیا جاتا ہے۔ یہ ایک نرم جلد ہضم ہونے والا کھانا ہے۔ اس کو اللہ کے پیارے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پسند فرماتے تھے۔ ثرید کی ایک دوسری قسم بھی ہے۔ جو میٹھی ہوتی ہے اس کو حلوہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ستو میں کھجور خشک، دودھ اور گھی ملا کر مالیدے کی طرح بنایا جاتا ہے۔

حضورؐ کو دونوں ہی قسم کا ثرید پسند تھا جیسا کہ ابن عباسؓ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا۔

کان احب الطعام الی رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم الثرید من الخبز والثرید من

الحیس

روٹی سے تیار کیا ہوا اور ستو سے تیار کیا ہوا۔ خاص طور پر حلوہ کی پسندیدگی کا ذکر بھی موجود ہے۔ جیسا کہ اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا۔

کان رسول اللہ یحب الحلواء والعسل — حضور علیہ السلام حلوے اور شہد کو پسند فرماتے تھے

سالن روٹی

حضرت جابرؓ نے بیان کیا کہ نبی کریمؐ نے ایک مرتبہ اپنے اہل خاندان سے دریافت فرمایا کہ کوئی سالن ہے تو عرض کیا گیا گھر میں سرکہ کے سوا کچھ نہیں تو آپؐ نے وہی منگایا اور اسی سے کھانا تناول فرمانا شروع کر دیا۔ آپ کھاتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے:

نعم الادم الخل نعم الادم الخل — سرکہ کتنا اچھا سالن ہے، سرکہ کتنا اچھا سالن ہے۔

حضرت یوسف ابن عبد اللہؓ نے فرمایا میں نے نبی کریمؐ کو دیکھا کہ اخذ کسرۃ من الشعیر فوضع علیھا تمرۃ فقال ھٰذہٖ ادام ھٰذہٖ۔ آپؐ نے جَو کی روٹی کا ایک ٹکڑا لیا اور اس پر کھجور رکھ کر فرمایا۔ یہ ہے سالن یہ ہے سالن۔

حضرت انسؓ نے بیان فرمایا:

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعجبہ الثفل — حضورؐ ہانڈی کی کھرچن کو پسند فرماتے تھے۔

ان احادیث سے واضح ہے کہ جس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھنے ہوئے گوشت، دکی، شہد اور حلوہ جیسی نفیس غذائیں پسند فرمائیں اس کی شان یہ بھی تھی کہ سب سے اَنفس سالن کی جگہ سرکہ، حلوے کی جگہ کھجور اور جَو کی روٹی کا ٹکڑا اور ہانڈی کی کھرچن میسر ہوتی تو وہ اس کو بھی پسند

فرماکر رازقِ حقیقی کا شکر ادا کرتے اور اس پر بھی خوشی کا اظہار کیا کرتے تھے درحقیقت رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح انسانیت کے دونوں طبقوں، دولتمندوں اور غریبوں کو سہارا عطا فرمایا کہ اگر گوشت والے سنّتِ رسولؐ ادا کرنے کا ثواب پائیں تو سرکہ چٹنی اور روٹی پر زندگی بسر کرتے والے بھی یہ سوچ کر اپنے دل کو تسلی دیں کہ یہ معمولی کھانے صرف انہیں کی تقدیر میں نہیں بلکہ اللہ کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی پسند فرمائے اور خوش ہو کر استعمال فرمائے۔ بلکہ ان کا تو اگر مزید حال معلوم کرنا ہے تو حضرت مالک بن دینارؒ کے اس بیان سے اندازہ کیجیے۔

ما شبع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من خبز ولا لحم الا علی ضفف	نبی کریمؐ نے سوائے اجتماع کے کبھی نہ روٹی سیر ہو کر کھائی اور نہ کبھی گوشت پیٹ بھر کر کھایا۔

یعنی جب کوئی اجتماع ہوتا دعوت وغیرہ ہوتی تب تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سیر ہو کر کھانا تناول فرما لیا کرتے تھے۔ ورنہ حال یہ تھا کہ حضرت مسروقؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد ایک مرتبہ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہؓ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے میرے لئے کھانا منگوایا اور کہنے لگیں میں جب کبھی کھانا سیر ہو کر کھاتی ہوں تو مجھے رونا آجاتا ہے۔ حضرت مسروقؓ نے عرض کیا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے تو فرمایا مجھے وہ زمانہ یاد آجاتا ہے جب خدا کی قسم حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی دن دو مرتبہ روٹی اور گوشت پیٹ بھر کر نہیں کھایا۔

دودھ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دودھ بھی بہت پسند تھا آپؐ نے اکثر بکری کا دودھ استعمال کیا اور گائے کا بھی استعمال کیا۔ گائے کے دودھ کے متعلق آپؐ کا ایک ارشاد بھی موجود ہے۔ جس کو حضرت صہیبؓ نے بیان فرمایا۔ آپؐ فرماتے ہیں:

علیکم اللبن البقر فیھا شفاء وسمنھا دواءٌ ولحمھا داءٌ	تم گائے کا دودھ استعمال کرو کیونکہ اس میں شفا ہے اور اس کے گھی میں دوا کی تاثیر ہے اور اس کے گوشت میں بیماری ہے۔

یعنی گائے کا دودھ اور مکھن نہایت ہی مفید اور مقوی ہیں لیکن حضور علیہ السلام نے اس کا گوشت پسند نہیں فرمایا۔ اس لیے کہ اس میں بیماری کے جراثیم ہوتے ہیں۔ گویا جس طرح بکری کا گوشت کھانا سنت ہے اسی طرح گائے کے گوشت سے بچنے کی کوشش کرنا بھی جائز ہے۔ بہر حال حدیث میں گائے کے گوشت کی حرمت نہیں بلکہ ناپسندیدگی کا اظہار ہے، ایک اور حدیث شریف میں ہے کہ آپؐ نے صحابہ کرام کے لئے گائے ذبح فرمائی اور دوسری حدیث میں ہے کہ ازواج مطہرات کی طرف سے حج میں گائے ذبح فرمائی۔

مذکورہ احادیث سے جہاں نبی کریم رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی پسندیدہ غذاؤں کا پتہ چلا وہاں کھانے

کے سلسلے میں آپؐ کی تعلیمات کا اندازہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ اسلام ہر قسم کی حلال طیب غذاؤں کے استعمال کی اجازت دیتا ہے چاہے وہ بکری اور مرغی کا گوشت جیسی اعلیٰ اور گرانقدر غذا ہو یا کھجور اور جَو کی روٹی جیسی معمولی غذا ہو لیکن یہ خیال ضرور کرنا چاہیے کہ عمدہ کھانے ملنے پر غرور و تکبر نہ کیا جائے بلکہ خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے اور معمولی کھانا نصیب ہونے پر ناشکری نہ کی جائے بلکہ اس پر بھی خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کیونکہ اعلیٰ نعمتوں پر شکر ادا کرنے سے وہ نعمتیں جاری رہتی ہیں اور معمولی نعمتوں پر شکر ادا کرنا ان نعمتوں کے اعلیٰ ہونے کا سبب بن جاتا ہے۔

سیرتِ طیبہ کا مطالعہ

عبد القدوس ہاشمی

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ اور آپ کے احوال زندگی کا بار بار اور غور و فکر کے ساتھ عمیق طالعہ نہ صرف مسلمانوں کے لیے نہایت ضروری ہے بلکہ غیر مسلموں کے لیے بھی ایک فریضہ انسانی کا درجہ رکھتا ہے۔ مسلمانوں کے لیے تو یہ مطالعہ اس لیے نہایت ضروری ہے کہ ہمیں خالق کائنات خدائے بزرگ و برتر نے اپنی کتاب قرآن مجید میں یہی حکم دیا ہے ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ان کے نقش قدم پر چلیں، ان کی اتباع کریں اور ان کے اسوہ حسنہ کو اپنی زندگی کے لیے نمونہ عمل قرار دے کر اپنے آپ کو اس رنگ میں رنگنے کی سعی کریں اور اس میں ساری زندگی بسر کر دیں۔ ظاہر ہے کہ اس حکم کی تعمیل ہم اسی صورت میں کر سکتے ہیں، جب کہ ہم آپ کی سیرت طیبہ سے واقفیت حاصل کریں، بار بار پڑھیں سُنیں، دوسروں کو سنائیں، خود یاد رکھیں اور دوسروں کو یاد دلاتے رہیں۔ ایسا کبھی نہ ہونے پائے کہ ہم پر غفلت طاری ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت، اللہ سے محبت ہے اور رسول اللہ سے غفلت، اللہ سے غفلت ہے اور جو اللہ کی یاد سے غافل ہو گیا، اسے نہ یہاں چین اور نہ وہاں چین۔

اور ایک غیر مسلم کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کا مطالعہ اس لیے ایک فریضہ انسانی کا درجہ رکھتا ہے کہ نوع انسانی میں سے مردِ کامل کا صرف یہی ایک نمونہ ہے۔ کوئی مانے یا مانے، اتباع کرے یا انکار، لیکن یہ جان لینا تو ہر آدمی پر فرض ہے کہ ہر پہلو سے کامیاب و کامران اور ہر اعتبار سے مکمل انسان کیسا ہوتا ہے؟ کون بدنصیب ہوگا، جو یہ نہ چاہے کہ اسے ایک بامقصد اور کامیاب زندگی میسر ہو۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کامیاب زندگی کیسی ہوتی ہے اور کیا اس کا کوئی مکمل نمونہ ہمیں نظر آتا ہے کہ ہم اس سے کچھ سیکھیں اور کچھ حاصل کریں۔

زمین پر زمانہ نایاد گار سے نوع انسانی آباد ہے اور آج بھی لاکھوں اور کروڑوں نہیں بلکہ اربوں آدمی اس دنیا میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ سب کا قصہ ایک ہی سا قصہ ہے کہ پیدا ہوا، بڑوں نے دیکھ بھال کی، پرورش و پرداخت ہوئی، ایک محدود مدت تک زمین پر زندہ رہا اور بالآخر مر کے پیوند زمین ہو گیا۔ نہ پیدا ہونے میں اختیار وارادہ کو دخل تھا اور نہ موت میں۔

حیاتِ جاوداں میری نہ مرگ ناگہاں میری

سب کہاں؟ جن چند لوگوں کا حال آپ کو معلوم ہے، ان ہی کی زندگیوں پر غور کیجیے۔ پیدائش اور موت پر تو یقیناً کسی کو بھی اختیار حاصل نہ تھا۔ لیکن سن بلوغ سے موت تک جو کچھ وہ اپنے ارادہ و اختیار سے کرتے رہے، ان اعمال و افکار میں انہوں نے اپنے ارادہ و اختیار کو کس کس طرح استعمال کیا اور وہ اپنے مقاصد زندگی میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہاں! اور یہ بھی دیکھیے کہ انہوں نے اپنے ایک رخ کی تکمیل کے لیے زندگی کے دوسرے رخوں کو نظر انداز تو نہیں کر دیا۔ مثلاً

ایک شخص روحانی سکون حاصل کرنے کے لیے بیوی بچوں کو چھوڑ کر پہاڑ پر جا بیٹھا، تو اس کی زندگی اور پہاڑ کی چٹان میں کیا فرق باقی رہا۔ وہ نہ ہوا، پہاڑ کی ایک چٹان ہوئی۔ دوسرا بیوی بچوں اور عیش و عشرت دنیا میں اس طرح الجھا کہ ساری کائنات سے غافل ہو گیا، تو اس کی زندگی اور کتے بلیوں کی زندگی کے مابین امتیاز کیا رہا۔ وہ نہ رہا کتے رہے بلیاں رہیں۔ آدمی کا بچہ کو ہوا محض ایک جانور ہو کے رہ گیا۔

انسانی زندگی تو مختلف اور متنوع فرائض و واجبات کا مجموعہ ہے اور ان ہی کی اچھی طرح تکمیل سے زندگی کا کمال وابستہ ہے۔ ایک آدمی پر کچھ فرائض اپنی ذات کی طرف سے عاید ہوتے ہیں کچھ کنبے اور گھرانے کی طرف سے کچھ ہمسایوں اور اہلِ وطن کی طرف سے، کچھ قوم و ملت کی طرف سے اور کچھ بنی نوع انسان کی طرف سے۔ ان ہی متنوع فرائض و واجبات کی اس طرح متناسب و متوازن ادائیگی کہ ایک کی وجہ سے دوسرا رُخ متاثر نہ ہو اور ایک میں انہماک سے دوسرے کی طرف سے تغافل نہ پیدا ہو جائے، کامیاب و کامران زندگی کہلاتی ہے۔ اپنی ذات سے وابستگی اور اپنی راحت و عافیت کا اہتمام یقیناً ہر انسان کی اولین تمنا ہے۔ اس حد تک کہ پہاڑوں میں تارک الدنیا کی زندگی بسر کرنے والے سادھو بھی بھوک پیاس کے لیے کچھ نہ کچھ جتن کیا ہی کرتے ہیں اور گرمی سردی سے بچنے کے لیے کوئی نہ کوئی غار تلاش کر ہی لیتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص اپنی ہی ذات کو مقصود و معبود بنا لے اور زندگی کے دوسرے واجبات سے غافل ہو جائے تو اس کی زندگی کو نمونہ کی کامیاب زندگی نہیں کہا جا سکتا اور نہ ایسی کسی زندگی سے ہمارے لیے کوئی ہدایت حاصل ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ۔

ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

اب اس تصویر کا دوسرا رُخ لیجیے۔ ایک شخص وطن دوستی بلکہ ناپاک وطن پرستی کے نشہ میں سرشار ہو کر اپنے اوپر خود فراموشی کی کیفیت طاری کر لیتا ہے، نہ اپنی ذات کی فکر کرتا ہے، نہ پلٹ کر بیوی بچوں کی طرف دیکھتا ہے حتیٰ کہ ان عمومی فرائض و واجبات کی طرف سے بھی غافل ہو جاتا ہے، جو محض ایک انسان ہونے کی وجہ سے اس پر عائد ہوتے ہیں۔ ایسے شخص کو کوئی ذی ہوش آدمی کامیاب و کامران بھلا آدمی نہیں کہہ سکتا۔ یہ تو ممکن ہے کہ کسی تنگ نظر وطنی حکومت کا اسے سربراہ بنا دیا جائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی شہر کے باغ عام میں آنے والی نسلوں کے دماغوں کو زہرناک بنانے کے لیے اس کا مجسمہ نصب کر دیا جائے۔ مگر ایک بلند نظر آدمی اسے اچھا نمونہ نہیں قرار دے سکتا۔

پھر یہ بھی دیکھیے، ایک آدمی کو اپنی اس مختصر سی زندگی میں کیسے کیسے متنوع حالات سے گزرنا پڑتا ہے۔ کبھی دولت کی فراوانی، کبھی غربت کی پریشانی کہیں دوست سے واسطہ پڑتا ہے، کہیں دشمن سے مقابلہ۔ کبھی صحت و قوت کبھی بیماری و ناتوانی۔ آدمی کو کیا کیا نہیں کرنا پڑتا ہے۔ کبھی قوم کا سردار کبھی سردار کا فرماں بردار۔ کہیں حکومت و جماعت کا منتظم کہیں نادانوں کا معلم۔ یہ انسان ہی تو ہے، جو کبھی فوج کا کمانڈر اور کبھی جج بن کر داد عدل گستری دیتا ہوا نظر آتا ہے۔

کیا یہ حقیقت و واقعہ نہیں ہے کہ ہم اپنے بڑوں سے بہت کچھ سیکھتے ہیں تو کیا یہ ضروری نہیں کہ ہمارے سامنے ایک ایسا عملی نمونہ ہو، جس کی سیرت میں انسانی زندگی کے ان متنوع و مختلف حالات کا کامیاب نمونہ ہمیں مل جائے تلاش

یہ جتنے دنیا کی تاریخ میں کوئی ایک شخص بھی ایسا دکھائی دیتا ہے، جو ہمارے لیے ان تمام حالات میں نمونہ کا کام دے سکے۔ بہت سے فاتحین اور کشور کشاؤں کا حال ملتا ہے۔ بہت سے فلسفیوں کے افکار ملتے ہیں۔ بہت سے تارک الدنیا لوگوں کے تذکرے ہم سنتے ہیں۔ بہت سے بادشاہوں، وزیروں اور عالموں فاضلوں کے قصے موجود ہیں۔ ان کی بڑائی تسلیم، ان کی سربلندیاں سرآنکھوں پر مگر غور سے دیکھئے تو یہ سب کچھ سیرت انسانی کے کسی ایک رُخ کی کہانی سے زیادہ کچھ ہے؟ اس سے انکار نہیں اور ہمارا تو ایمان ہے کہ انسانوں کے پیدا کرنے والے خالق نے ہر زمانہ میں اور ہر قوم میں عملی زندگی کی رہنمائی کے فرائض انجام دینے کے لیے سچے اور بہترین رہنما بھیجے تھے۔ لیکن ان کے حالات ہم تک کہاں اور کتنے پہنچ سکے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ان میں اکثر کی تاریخی شخصیت بھی قابل اعتماد تاریخوں سے ثابت نہیں ہوتی۔ اور جو کچھ مستند یا غیر مستند حالات ہمیں ملتے ہیں، وہ محض چیدہ چیدہ واقعات ہیں، جن سے ان بزرگوں کی سیرت و کردار کا مکمل تو کیا کوئی نامکمل خاکہ بھی تیار نہیں ہو سکتا۔ ہزاروں سوالات پیدا ہوتے ہیں اور محض سوالات ہی رہ جاتے ہیں۔ ان کے حل کرنے کے لیے ہمیں ان قصہ کہانیوں میں کوئی کرن نہیں دکھائی دیتی۔

اس کے برخلاف حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا مطالعہ کرنے والا کسی جگہ تاریکی کا نشان نہیں پاتا۔ ہر چیز واضح اور چمکتے ہوئے آفتاب کی طرح واضح ہے۔ آپ کا شخصی کردار، رحمت، رأفت، شفقت، خشیت، عبادت، شجاعت، عدالت، صداقت، سخاوت، فراست، متانت، ایثار، احساس ذمہ داری، عاجزی اور تواضع، صبر، توکل، ثبات، دانش مندی وغیرہ وغیرہ سب کی کیفیت اور ان کے عملی نمونے مل جاتے ہیں اور بہت سے مل جاتے ہیں۔ اسی طرح آپ کی گھریلو زندگی میں اچھے شوہر، اچھے باپ اور اچھے نانا دادا وغیرہ کے بہترین نمونے ہمیں ملتے ہیں۔ جماعتی زندگی میں اچھے دوست، اچھے ساتھی، شفیق سردار اور مساکین کے سرپرست و مددگار کا بہترین نمونہ ہمیں آپ کی ذات میں ملتا ہے۔ اسی طرح ملی و قومی زندگی میں عدل، انصاف، فوجوں کی کمانداری، انتظامات حکومت، رعایا پروری، سیاسی سمجھ بوجھ، دوستوں کی دلداری، دشمنوں کے ساتھ نیک سلوک وغیرہ ایسا مکمل اور اتنا بہترین نقشہ ہمیں سیرت طیبہ میں دکھائی دیتا ہے کہ ویسا اور کہیں نہیں دکھائی دیتا اور کمال یہ ہے کہ انفرادی و اجتماعی زندگی کے یہ سارے نمونے صرف ایک ہی مقدس و مکمل انسان میں مل جاتے ہیں اور مطالعہ کرنے والا بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ۔

کاسۂ غیر کو، اور منہ سے لگاؤں، توبہ
شان پہچانتا ہوں یار کے پیمانے کی

اس کی ضرورت ہی نہیں پڑتی کہ زندگی کے کسی مرحلہ پر اور کسی حالت میں کہیں اور سے کوئی سبق حاصل کیا جائے خوشی، غم، تونگری، افلاس، سرداری، حکومت، اقتدار، ناتوانائی، صلح، جنگ، امن، بدامنی، اخلاص، دشمنی وغیرہ آخر آپ کو اپنی زندگی میں ان ہی باتوں سے تو واسطہ پڑے گا۔ آپ کو ان حالتوں میں کیا یقین رکھنا چاہیئے اور کیا عمل کرنا چاہیئے کہ آپ کامیاب رہیں اور آپ کا خالق بھی آپ سے خوش رہے۔ اس کا جواب آپ کو صرف سیرتِ طیبہ ہی میں مل سکتا ہے۔ خدائے بزرگ و برتر نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دین اسلام ہی کی تکمیل نہیں فرمائی بلکہ نبوت اور رہنمائی کے سلسلہ کو

آپ پر ختم کر کے سیرت انسانی کی بھی تکمیل فرما دی، اور اس طرح تکمیل فرما دی کہ اس سے زیادہ مکمل اور اتنے اچھے نمونہ کردار کا تصور بھی ممکن نہیں۔

مسلمانوں کے لیے تو اس بات کے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں اس لیے کہ یہ ان کا ایمان ہے اور وہ یقین رکھتے ہیں کہ خالق کائنات کی رضامندی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخلصانہ اتباع کے بغیر حاصل ہی نہیں ہو سکتی۔ اور بغیر حصول رضائے الٰہی نہ دنیا بھلی اور نہ آخرت۔ البتہ ایک غیر مسلم کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔ اس لیے کہ اس میں ایمان و یقین کا فقدان ہے۔ لیکن سیرت طیبہ کا عمیق مطالعہ اس کے لیے بھی ایک فریضہ انسانی کا درجہ رکھتا ہے۔ اگر اس نے سیرت طیبہ کا مطالعہ نہیں کیا تو اسے کہیں دنیا میں ایسا مکمل، واضح اور تفصیلی نمونہ، کامیاب انفرادی، اجتماعی اور قومی زندگی کا نہیں مل سکتا۔ وہ اپنی زندگی کے بہت سے مرحلوں میں یا تو کشمکش و پیچ میں گرفتار ہو جائے گا یا بری طرح ٹھوکریں کھائے گا۔ زندگی بہر حال زندگی ہے چاہے مسلمان کی زندگی ہو یا غیر مسلم کی۔ یہ وقت سب پر آتا ہے جب ایک آدمی کا دماغ یہ سوال کرتا ہے کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے اور ہمارے عمل کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ لازم ہے کہ آدمی کے سامنے اس سوال کے وقت کوئی نمونہ عمل موجود ہے۔ ایک نبی اور ایک فلسفی کے مابین یہ واضح فرق ہر جگہ نمایاں ہے کہ نبی جو کچھ کہتا ہے، اس کے مطابق عمل کر کے دکھاتا ہے اور فلسفی جو کچھ سوچتا ہے، وہ کہتا ہے نہ خود اس کے مطابق عمل کرتا ہے اور نہ کسی دوسرے عمل کرنے والے کو نتائج عمل کی ضمانت دیتا ہے۔ مسلم اور غیر مسلم دونوں کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ دنیا کلجگ نہیں کرجگ ہے اور

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

حقوق

عورتوں کے حقوق

اسلام ہی عورتوں کو تمدن میں برابر کی جگہ دیتا ہے اور اُن کے مساویانہ حقوق کو بحال کرتا ہے

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ ۔ عورتوں کے بھی حقوق ہیں جیسا کہ مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں ۔

بچّوں کے حقوق

وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ ۔ تنگدستی کے ڈر سے تم اپنی اولاد کو نہ مارا کرو

والدین کے حقوق

وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ۔ ماں باپ کے ساتھ عمدہ ترین برتاؤ کرو

الدفاع فی الاسلام

ابو سلمان شاہجہانپوری

الافرض جہاد
اسلام کے شرعی واجبات وفرائض میں ایک نہایت اہم اور اکثر حالتوں میں ایمان وکفر تک کا فیصلہ کر دینے والا فرض جہاد
ہے لیکن جہاد کی حقیقت کی نسبت سخت غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جہاد کے معنی صرف لڑنے کے ہیں مخالفین
اسلام اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے۔ حالانکہ ایسا سمجھنا اس عظیم الشان مقدس حکم کی عملی وسعت کو بالکل محدود کر دینا ہے۔
"جہاد" کے معنی کمال درجہ کوشش کرنے کے ہیں۔ قرآن وسنت کی اصطلاح میں اس کمال درجہ سعی کو جو ذاتی اغراض کی جگہ
حق پرستی اور سچائی کی راہ میں کی جائے، جہاد کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ یہ سعی زبان سے بھی ہے، مال سے بھی ہے، انفاق وقت وعمر سے
بھی ہے، محنت وتکالیف برداشت کرنے سے بھی اور دشمنوں کے مقابلے میں لڑنے اور اپنا خون بہانے سے بھی ہے جس سعی کی
ضرورت ہو اور جو سعی جس کے امکان میں ہو، اس پر فرض ہے اور جہاد فی سبیل اللہ میں لغت وشرع دونوں اعتبار سے داخل ہے۔ یہ
بات نہیں ہے کہ جہاد سے مقصود مجرد لڑائی ہی ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو جہاد کا اطلاق اعمال قلبی ولسانی پر نہ ہوتا حالانکہ کتاب وسنت ایسے

اطلاقات سے لبریز ہیں۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا قول صاحب اقناع نے نقل کیا ہے، جو حقیقت جہاد کے بارے میں قول فیصل وجامع ہے۔

الامر بالجهاد منه مايكون بالقلب كالعزم عليه ومنه ما يكون باللسان كالدعوة الى
الاسلام والحجة والبيان والرائى والتدبير فى ما فيه نفع المسلمين و بالبدن اى القتال
بنفسه فيجب الجهاد بغاية ما يمكنه من هذه الامور (جلد ١ - ٦٥٣)

دشمنوں کی فوج سے خاص وقت ہی میں مقابلہ ہو سکتا ہے لیکن ایک مومن انسان اپنی ساری زندگی اور زندگی کی ہر ہر دن

تمام جہاد حق میں بسر کر سکتا ہے۔

مشہور حدیث ہے:۔ المجاهد من جاهد نفسه فى ذات الله والمهاجر من هجر ما نهى

الله عنه ۔

سورہ الفرقان میں ہے کفار کے مقابلہ میں لڑنے سے بڑا جہاد کرو۔

فلا تطع الكافرين وجاهدهم به جهاداً كبيراً پس کافروں کی اطاعت نہ کرو اور ان سے بڑے سے بڑا جہاد کرو۔

سورۃ الفرقان بالاتفاق مکی ہے اور معلوم ہے کہ جہاد بالسیف یعنی لڑائی کا حکم ہجرت مدینہ کے بعد ہوا۔ پس غور

کرنا چاہیئے کہ اس کی زندگی میں کون سا جہاد تھا جس کا اس آیت میں حکم دیا جا رہا ہے؟ جہاد بالسیف تو ہو نہیں سکتا۔ یقیناً

وہ حق کی استقامت اور اس کی راہ میں تمام مصیبتیں اور شدتیں جھیل لینے کا جہاد تھا۔ مکی زندگی میں جس طرح یہ جہاد جاری رہا سب کو معلوم ہے۔ حق کی راہ میں دنیا کی کسی جماعت نے ایسی تکلیفیں اور مصیبتیں نہ اٹھائی ہوں گی جیسی اللہ کے رسولؐ اور آپؐ کے ساتھیوں نے مکی زندگی میں برداشت کیں۔ اس پر جہاد کبیر کا اطلاق ہوا۔

اسی طرح منافقوں کے ساتھ بھی جہاد کرنے کا حکم دیا گیا۔

جاھدالکفار والمنافقین واغلظ علیھم (۹ : ۶۶)

حالانکہ منافق تو خود اسلام کے تحت مقہورانہ و نکومانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان سے جنگ و قتال کی ضرورت ہی نہ تھی اور نہ ان سے کبھی جنگ کی گئی۔ سو یہ جہاد بھی تبلیغ حق و اتمام حجت و مقاومت فساد کا جہاد تھا، جو قلب و زبان سے تعلق رکھتا ہے۔

بخاری و ابن ماجہ میں ہے حضرت عائشہؓ نے پوچھا۔ ھل علی النساء جہاد؟ کیا عورتوں کے لیے بھی جہاد ہے؟ فرمایا "نعم جہاد، لاقتال فیہ الحج والعمرۃ" ہاں! جہاد ہے۔ مگر اس میں لڑنا نہیں ہے۔ حج اور عمرہ۔ اس حدیث میں اس سعی اور ترک وطن کی محنت کو جو حج و عمرہ میں پیش آتی ہے، عورتوں کے لیے جہاد فرمایا اور کہا ایسا جہاد جس میں لڑائی نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ لڑائی کے الگ کر دینے کے بعد بھی حقیقت "جہاد" باقی رہتی ہے۔

اگر امت کے لیے دفاع و جنگ کا وقت آگیا، یا کسی جماعت مفسدین پر امام نے حملہ کیا، تو ایسے وقتوں میں بھی صرف نفس جنگ ہی نہیں بلکہ سعی و کوشش کی ساری باتیں شریعت کے نزدیک جہاد ہیں۔ جس کی طاقت میں جنگ کرنا نہیں ہے اور اس نے مال دیا تو وہ بھی مجاہد ہے جس نے زبان سے دعوت و تبلیغ کی، وہ بھی مجاہد ہے۔ جس نے اس راہ میں اور کسی طرح کی محنت و تکلیف اٹھائی، وہ بھی مجاہد ہے۔ البتہ ایسے وقتوں میں اگر کوئی مسلمان لڑائی کی طاقت رکھتا ہے اور اس سے پہلو تہی کرلے، تو اس کا کوئی عذر نہیں سنا جائے گا اس کا شمار مومنوں کے بجائے منافقوں میں ہوگا۔ جو مال دے سکتا ہے اور نہ دیا، وہ بھی ایمان و اخلاص کی زندگی سے نکل گیا۔ زمین پر گو مسلمان کہلائے، پر اللہ کے حضور منافق کہلائے گا۔ جس شخص کی زبان اعلان حق اور دعوت الی الجہاد میں کھل سکتی ہے مگر نہ کھلی اس نے بھی ایمان چھوڑ کر نفاق کی راہ اختیار کر لی۔ گو شیطان حیل اور نفس خادع اس کو ہزاروں فریب دیتا رہے۔ ترمذی اور ابوداؤد میں ہے

"افضل الجھاد کلمۃ حق عند سلطان جائر۔"

سب سے زیادہ فضیلت رکھنے والا جہاد وہ کلمہ حق ہے، جو شاہان جور و ظلم کے سامنے بے باکانہ کہا جائے۔

اور پھر ان سب سے بالاتر مرتبہ ان مجاہدین کاملین اور اصحاب عزیمت کا ہے، جن کی زندگی سرتاسر جہاد فی سبیل اللہ اور جن کا وجود یکسر خدمت حق و شیفتگی صدق و عشق دعوت ہے، جو اس عمل مقدس کے لیے کسی خاص صدائے نفیر اور اعلان وقت کے منتظر نہیں رہتے، بلکہ ہر صبح جو ان پر آتی ہے، جہاد فی سبیل اللہ کی صبح ہوتی ہے اور شام کی تاریکی جو ان پر پھیلتی ہے، وہ اسی راہ کی شام ہوتی ہے۔ اس کی زندگی پر کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا، جو جہاد کے مرتبہ علیا و فضیلت عظمیٰ کے اجر و ثواب سے خالی ہو۔

کائنات ہستی کے ہر عمل کی طرح یہ عمل بھی تین عنصروں سے مرکب ہے۔ دل، زبان، اعضا و جوارح۔ سو ان کا دل ہمیشہ عشق حق اور عزم مقصد کی آتش شوق میں پھنکتا رہتا ہے۔ ان کی زبان ہمیشہ اعلان حق و دعوت الی اللہ میں سرگرم رہتی ہے

ان کے ہاتھ اور ان کے تمام جوارح کبھی اس راہ کی سعی و محنت سے نہیں تھکتے۔ اس کے بعد جہاد کا کونسا کام رہ گیا، جو انہوں نے نہیں کیا؟ اور اس راہ کا کون سا مرتبہ رہ گیا، جو انہوں نے نہیں پایا؟

افضل الجھاد کلمۃ حق عند سلطان جائر۔

جہاد کی اس حقیقت کو سامنے رکھ کر غور کرو۔ انسانی اعمال کی کون سی بڑائی اور عظمت ہے۔ جو اس کے دائرہ سے باہر رہ گئی؟ اور نوع انسانی کی ہدایت و سعادت کا کون سا عمل حق ہے، جو اس کے بغیر انجام پا سکتا ہے؟ پس یہی وجہ ہے کہ شریعت نے اس کی اہمیت و فضیلت پر اس قدر زور دیا کہ ساری نیکیاں، ساری عبادتیں اس سے پیچھے رہ گئیں۔ سب کا حکم شاخوں کا ہوا، یہ جڑ یہی عمل قرار پایا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل فضیلت ہو سکتی ہے کہ خود اللہ کے رسول نے فرمایا۔

والذی نفسی بیدہ لوددت انی اقتل فی سبیل اللہ ثم احیا، ثم اقتل ثم احیا ثم اقتل (رواہ البخاری)

خدا کی قسم! اگر ممکن ہوتا، تو میں چاہتا کہ اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں، پھر زندہ ہوں، پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ ہوں پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ ہوں، پھر قتل کیا جاؤں۔ تاکہ اسکی راہ میں جان دینے کی لذت و سعادت ایک مرتبہ میں ختم نہ ہو جائے۔

جہاد کی قسمیں اس سے معلوم ہوا کہ جہاد صرف جنگ و قتال کا نام نہیں بلکہ جہاد کی بہت سی قسموں میں سے ایک قسم "قتال" ہے اور اس کی بھی دو صورتیں ہیں (۱) "ہجوم" اور "دفاع" یعنی (offensive اور Defensive)

دراصل ہجوم کی بنیاد بھی دفاع ہی ہے۔ یعنی جب تک دنیا میں عالمگیر صلح و امن اور عام اخوت قائم نہ ہو جائے۔ ضروری ہوا کہ حریف اور مفسد قوتوں سے ہمیشہ مقابلہ جاری رکھا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے گا تو دشمن مسلمانوں کو چین سے نہ بیٹھنے دیں گے۔ اور اسلام کی اشاعت اور اس کے مشن کی تبلیغ و تکمیل میں ہمیشہ مانع ہوں گے۔

شرعاً قتال کی پہلی صورت (یعنی ہجوم و مقابلہ کا دائمی سلسلہ) فرض کفایہ ہے۔ بحکم وما کان المومنون لینفروا کافۃ، ضروری نہیں کہ بیک وقت ہر مسلمان اس میں حصہ لے۔ ہر عہد اور ہر ملک میں مسلمانوں کی ایک جماعت ضرور ایسی ہونی چاہیئے، جو یہ فرض انجام دیتی رہے۔ اگر ایک جماعت یہ فرض انجام دیتی رہی ہے، تو کافی ہے۔ جو مسلمان شریک ہوگا، اس کے لیے بڑا اجر ہے۔ جو شریک نہ ہوگا، اس کے لیے کوئی گناہ نہیں۔

حقیقت حکم دفاع یہ صورت تو اس قتال کی ہوئی، جس کی صورت حملہ و ہجوم کی ہوگی۔ دوسری قسم "دفاع" ہے۔ تشریح اس کی یہ ہے کہ جب کبھی کسی مسلمان حکومت یا کسی مسلمان آبادی پر کوئی غیر مسلم گروہ حملہ کرے، تو یکے بعد دیگرے تمام دنیا کے مسلمانوں پر شرعاً فرض ہو جاتا ہے کہ دفاع (ڈیفنس) کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ اس حکومت اور آبادی کو غیر مسلم قبضہ سے لڑ کر بچائیں۔ اگر فوری قبضہ ہو گیا ہے، تو اس سے نجات دلائیں اور اس کام کے لیے اپنی ساری قوتیں اور ہر طرح کی ممکن کوششیں وقف کر دیں۔ اس بارے میں قرآن و حدیث کے احکام اس کثرت سے موجود ہیں اور اسلامی فرائض میں یہ فرض اس درجہ مشہور فرض ہے کہ شاید ہی دنیا میں کوئی مسلمان اس سے ناواقف نکلے۔ یہی باہمی مددگاری و یاوری اور دفاع اعداء کا قانون ہے جس پر اسلام نے

شریعت و امت کی حفاظت کی ساری بنیادیں استوار کی ہیں۔

یہ فرض کفایہ نہیں ہے، بلکہ بالاتفاق مثال نماز روزہ کے ہر مسلمان پر فرض عین ہے ایک گروہ کے دفاع کرنے سے باقی مسلمان بری الذمہ نہیں ہو سکتے جس طرح ایک گروہ کے نماز پڑھ لینے سے باقی مسلمانوں کے ذمہ نماز ساقط نہیں ہو جاتی۔

ہدایہ میں ہے۔

الا ان یکون النفیر عاماً فحینئذ یصیر من فروض الاعیان

"نفیر" نفر سے ہے۔ نفر کے معنی ہیں، تیزی کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ دوڑ جانا۔ پس قوم کے ایسے بلاوے اور اجتماع پر جو لڑائی کے لیے ہو "نفیر" کا اطلاق ہوا قرآن میں ہے "انفروا خفافا وثقالا" اور "الا تنفروا" مطلب یہ ہے کہ اگر حفظ و دفاع کی ضرورت سے عام اجتماع و قیام کا وقت آ گیا، تو پھر جنگ کرنا ہر مسلمان پر فرض عین ہو جاتا ہے۔ ابن ہمام اس کی شرح میں لکھتے ہیں۔

ھذا اذا لم یکن النفیر عاماً فاذا کان النفیر عاماً بأن ھجموا علی بلدۃ من بلاد المسلمین، فیصیر من فروض الاعیان سواء کان المستنفر عادلاً او فاسقاً (فتح القدیر ۴: ۲۸۲)

فرض کفایہ کی صورت اس وقت تک ہے کہ نفیر کی حالت نہ ہو۔ لیکن اگر مسلمانوں کے شہروں میں سے کسی شہر پر غیر مسلموں نے حملہ کر دیا، تو اس وقت جنگ کرنا ہر مسلمان پر فرض عین ہو جائے گا۔ خواہ جنگ کے لیے دعوت دینے والا عادل ہو یا فاسق اور عنایہ میں ہے۔

ثم الجھاد یصیر فرض عین عند النفیر العام علی من یقرب من العدو وھو یقدر علیہ (مجموعہ فتح القدیر ۴: ۲۸۱)

اور اگر نفیر عام کی حالت ہو، تو جہاد کرنا ان مسلمانوں پر فرض عین ہو جائے گا، جو دشمن سے قریب ہوں اور اس پر قابو رکھتے ہوں۔ اسی طرح سراجیہ، رد المختار، شامی وغیرہ تمام کتب فقہ میں ہے۔

"اذا جاء النفیر انما یصیر فرض عین علی من یقرب من العدو"

اور "الجھاد فرض کفایۃ اذا لم یکن النفیر عاماً، فاذا قام بہ البعض، یسقط عن الباقین۔ فاذا صار النفیر عاماً، فحینئذ یصیر من فروض الاعیان" الخ۔

حملہ و ہجوم کے دائمی جہاد میں جب قتال فرض کفایہ ہوتا ہے، بعض جماعتیں مستثنیٰ ہوتی ہیں، مثلاً عورتیں اور لڑکے، عورتوں کے لیے شوہر کی خدمت اور نوکر کے لیے آقا کی خدمت مقدم ہے۔ لیکن اگر دفاع کی صورت پیش آ گئی ہو، تو اس کی فرضیت ایسی ہمہ گیر اور بالاتر ہے کہ بچوں اور معذوروں کے سوا کوئی گروہ، کوئی فرد مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔ بیوی بلا شوہر کی اجازت کے نکل کھڑی ہو، غلام بلا آقا کی اذن کے مشغول جہاد ہو جائے۔

امام بخاری نے باب باندھا ہے "وجوب النفیر"، یعنی جب حفظ ملت کی ضرورت پیش آ جائے، تو قتال کے لیے سب

کا اٹھ کھڑا ہونا واجب ہے۔ پھر آیہ "انفروا خفافاً وثقالاً" اور "مالکم اذا قیل لکم انفروا" الخ سے وجوب پر استدلال کیا ہے۔

اس کے بعد حضرت ابن عباس رضؓ کی روایت درج ہے۔

"لا ھجرۃ بعد الفتح ولکن جھاد ونیۃ واذا استنفرتم فانفروا"

یعنی وہ جو اوائل اسلام میں ایک خاص طرح کی ہجرت فرض ہوئی تھی تو فتح مکہ کے بعد اس کی ضرورت نہیں رہی۔ البتہ جہاد اور عزم جہاد قیامت تک باقی ہے۔ تو جب جمع ہونے کے لیے پکارے جاؤ، جمع ہو جاؤ اور جہاد کرو۔

فتح الباری میں ہے۔

الاٰن تدعوا الحاجۃ الیہ أن کان یدھم العدو ویتعین علیٰ من عینہ الامام۔ (جلد ۶ :- ۲۸)

اور موطا امام مالک میں ہے۔

اذا کان الکفار مستقرین بلادھم فالجھاد فرض کفایۃ، ان اقام بہ بعضھم سقط الحرج علی الباقین واذا قصدوا بلادنا واستنفر امام المسلمین، وجب علی الاعیان"

یعنی اگر کفار اپنے ملک میں ہیں، مسلمانوں پر حملہ آور نہیں ہوئے ہیں، تو اس حالت میں جہاد فرض کفایہ ہے لیکن جب وہ ہمارے ملکوں کا قصد کریں اور امیر اسلام نفیر کا اعلان کرے، تو پھر فرض عین ہو جائے گا۔

نفیر کا مطلب چونکہ جا بجا نفیر کا لفظ آیا ہے، اس سے یہ بات بھی صاف ہو جانی چاہیے کہ نفیر عام سے کیا مراد ہے؟ مقصود یہ ہے کہ دفاع کی ضرورت پیش آ جائے اور ہر شخص کو اس کا علم ہو جائے یا یہ مقصود ہے کہ جب تک کوئی بلانے والا مسلمانوں کو نہ بلائے گا، نفیر عام کی حالت نہ پیدا ہوگی؟ اس کا جواب شاہ ولی اللہ نے موطا کی شرح میں دے دیا ہے۔

"نزدیک استنفار جہاد فرض علی الاعیان می شود۔ استنفار را چوں متتبع کنیم حاصل شود حالتے کہ مقتضائے استنفار شدہ است از قصد کفار بلاد مارا، و قیام حرب درمیان جیوش مسلمین۔ و کافرین، و عدم کفایہ از اں مسلماناں، و آنچہ بداں ماند" (مسوّیٰ جلد ۲ - ۱۲۹)

شاہ صاحب کے بیان سے یہ بات واضح ہو گئی کہ نفیر کی صورت کیا ہے؟ تو یہ ضروری نہیں کہ کوئی خاص شخص مسلمانوں کو یہ کہہ کر پکارے کہ آؤ جہاد کرو مقصود یہ ہے کہ ایسی حالت پیدا ہو جائے، جو مقتضائے نفیر ہے۔ پس جب غیر مسلموں نے اسلامی ملکوں کا قصد کیا اور مسلمانوں اور کافروں میں لڑائی شروع ہو گئی، تو جہاد فرض ہو گیا اور جب دشمنوں کی طاقت ان ممالک کے مسلمانوں سے زیادہ قوی ہوئی اور ان کی شکست کا خوف ہوا، تو یکے بعد دیگرے تمام مسلمانانِ عالم پر فرض ہو گیا، خواہ کوئی پکارے یا نہ پکارے۔ پکارنے والا نہیں ہے تو یہ مسلمانوں کی بدنظمی و بدحالی ہے۔ ان کا فرض ہوگا کہ داعی و امیر کا انتظام کریں۔ یہی حال تمام فرائض کا ہے۔ نماز کا

جب وقت آجائے، تو خواہ موذن کی صدائے "حی علی الصلوٰۃ" سنائی دے یا نہ دے، وقت کا آجانا وجوب کے لیے کافی ہوتا ہے۔

احکام قطعیہ دفاع غرض کہ "دفاع" اسلام کے ان بنیادی حکموں میں سے ہے، جن کو ایک مسلمان مسلمان رہ کر کبھی ترک نہیں کرسکتا اگر ایک مسلمان کے دل میں رائی برابر بھی ایمان کی محبت باقی رہ گئی ہے، تو اس کی طاقت سے باہر ہے کہ اللہ کی یہ صدائے حق سنے اور از سر تا پا کانپ نہ اٹھے۔

یا ایھا الذین آمنوا مالکم اذا قیل لکم انفروا فی سبیل اللہ اثاقلتم الی الارض ارضیتم بالحیوۃ الدنیا من الآخرۃ فما متاع الحیوۃ الدنیا فی الآخرۃ الا قلیل (۹-۳۸)

مسلمانو! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کہ جب تم سے کہا جاتا ہے اللہ کی راہ میں نکل کھڑے ہو، تو تمہارے قدموں میں حرکت نہیں ہوتی اور زمین پر ڈھیر ہوئے جاتے ہو؟ کیا تم نے آخرت کو چھوڑ کر صرف دنیا ہی کی زندگی پر قناعت کر لی؟ اگر یہی بات ہے تو یاد رکھو جس زندگی پر ریجھے بیٹھے ہو، وہ آخرت کے مقابلہ میں بالکل ہی ہیچ ہے۔

اس کے بعد فرمایا:

الا تنفروا یعذبکم عذابا الیما ویستبدل قوما غیرکم ولا تضروہ شیأ واللہ علی کل شئی قدیر - (۹-۳۹)

یاد رکھو! اگر تم نے حکم الٰہی سے سرتابی کی اور وقت کے آنے پر بھی راہ حق میں کمربستہ نہ ہوئے تو اللہ نہایت ہی سخت عذاب میں ڈال کر اس کی سزا دے گا اور تمہارے سوا کسی دوسری قوم کو خدمت اسلام کے لیے کھڑا کر دے گا، تم چھانٹ دیئے جاؤ گے۔ کلمہ حق تمہارا محتاج نہیں ہے۔ تم ہی اپنی زندگی و نجات کے لیے اس کے محتاج ہو۔

اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت، ان کی حکومتوں کے مٹانے اور ان کی آبادیوں اور شہروں کو آپس میں بانٹ لینے کے لیے کفار ایک دوسرے کے ساتھی اور حامی ہیں۔

والذین کفروا بعضھم اولیاء بعض

جن لوگوں نے راہ کفر اختیار کی، تو وہ ایک دوسرے کے ساتھی اور مددگار ہیں، مسلمانوں کی مخالفت میں خزانوں کے خزانے خرچ کر ڈالتے ہیں۔

والذین کفروا ینفقون اموالھم لیصدوا عن سبیل اللہ -

جن لوگوں نے راہ کفر اختیار کی، تو وہ حق کی مخالفت میں اپنا مال خرچ کر رہے ہیں۔

پس مسلمانوں کی بھی سب سے بڑی اسلامی و ایمانی خصلت یہ قرار پائی کہ۔

والمومنون والمومنات بعضھم اولیاء بعض (۹:۷۲)

مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں باہم ایک دوسرے کی رفیق و مددگار ہیں۔

اور اسی بنا پر مسلمانوں کا فرض ٹھہرا کہ اگر دنیا کے کسی ایک اسلامی حصہ پر غیر مسلم حملہ کریں اور وہاں کے مسلمان ان کے مقابلہ

کی کافی قوت نہ رکھتے ہوں یا بالکل مغلوب ومقہور ہوگئے ہوں، تو تمام دوسرے حصص عالم کے مسلمانوں پر فرض ہے کہ ان کی یاوری واعانت کے لیے اس طرح اٹھ کھڑے ہوں، جس طرح خود اپنی آبادیوں کی حفاظت کے لیے اٹھتے اور اپنی جان ومال سے اسی طرح مدد دیں، جس طرح خود اپنے گھر بار کی حفاظت کے لیے مدد دیتے۔

یہ نہ کوئی نیا مذہبی اجتہاد ہے، نہ کوئی پولیٹیکل فتویٰ۔ تمام دنیا کے مسلمان فقہ وقوانین شریعت کی جو کتابیں صدیوں سے پڑھتے پڑھاتے آئے ہیں اور جو چھپی ہوئی بازاروں میں ہر جگہ ملتی ہیں اور جن پر عدالتوں میں عمل کیا جارہا ہے، ان سب میں یہ احکام موجود ہیں اسلامی دینیات کا کوئی طالب علم ایسا نہیں ملے گا جو ان حکموں سے بے خبر ہو اور پھر ان سب کے اوپر مسلمانوں کی کتاب اللہ ہے، جو اپنے ہر پارہ اور ہر سورۃ کے اندر اس حکم کا اعلان اور اس قانون کی پکار تیرہ صدیوں سے بلند کر رہی ہے۔ نوع انسانی کی کامل بیس نسلیں گزر چکی ہیں اور یہ احکام اپنی یکساں غیر مبدل، اٹل اور لا انتہا طاقت کے ساتھ مسلمانوں کے دلوں پر حکمرانی کر رہے ہیں۔

ترتیب وجوب دفاع

(ترتیب وجوب دفاع کے متعلق اشارہ کیا جا چکا ہے لیکن ضروری ہے کہ مسئلہ کے اس پہلو کی مزید تشریح کردی جائے)

جب دفاع کا فرض عین ہونا واضح ہوگیا، تو اب معلوم ہونا چاہیے کہ اس فرض کی انجام دہی کے لیے شریعت نے ایک خاص ترتیب اختیار کی ہے جو عقل وحکمت کی بنا پر وہی اس معاملہ کی قدرتی اور صحیح ترتیب ہوسکتی تھی۔ صورت اس کی یہ ہے کہ جب غیر مسلموں نے کسی اسلامی حکومت اور آبادی کا قصد کیا، تو اس ملک کے تمام مسلمانوں پر بہ مجرد قصد اعداء دفاع فرض عین ہوگیا۔ باقی رہے دیگر ممالک کے مسلمان تو اگر زیر جنگ مقامات کے مسلمان دشمن کے مقابلے کے لیے کافی قوت نہیں رکھتے، دشمن بہت زیادہ قوی ہے یا رکھتے ہیں اور غفلت وتساہل کرنے لگتے ہیں، تو اس حالت میں یکے بعد دیگرے تمام دنیا کے مسلمانوں پر بھی دفاع فرض عین ہوجائیگا بالکل اسی طرح جیسے نماز اور روزہ مگر صورت اس کی یوں ہوں گی کہ پہلے ان مقامات سے قریب تر مقام کے مسلمانوں پر واجب ہوگا۔ پھر ان سے قریب پر، پھر ان سے قریب تر پر۔ حتیٰ کہ مشرق ومغرب جنوب وشمال تمام اکناف عالم کے مسلمانوں پر یکے بعد دیگرے فرضیت عائد ہوجائے گی۔

اس وقت سارے فرائض، سارے وظائف، سارے کام ملتوی کر دینے چاہئیں۔ بمجرد اطلاع ہر مسلمان کو اپنی تمام قوتوں اور تمام سامانوں کے ساتھ وقف دفاع ملت جہاد فی سبیل اللہ ہوجانا چاہیئے اور قیام دفاع کے لیے شرعاً جن جن وسائل وانتظامات کی ضرورت ہے، سب کو مل جل کر ان کا انصرام کرنا چاہیئے اگر کسی آبادی میں مسلمانوں کا کوئی امام وپیشوا نہیں ہے، جو نظم وقیام اپنے ہاتھ میں لے، تو سب کا فرض ہوگا کہ پہلے امام وامیر کا انتظام کریں۔ پھر جن جن وسائل کی ضرورت ہو، ان کے حصول کے لیے ہر ممکن تدبیر وسعی کام میں لائیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا، تو سب اللہ کے حضور جوابدہ ہوں گے، سب مبتلائے معصیت وفسق ہوں گے۔ ایسی معصیت ایسا فسق، ایسا عدوان ایسا نفاق جس کے بعد صرف کفر ہی کا درجہ ہے۔

فتح القدیر میں ہے۔

فیجب علی جمیع اهل تلك البلدة النفر وكذا من يقرب منهم ان لم يكن

باهلها كفاية، وكذا من يقترب ممن يقترب ان لم يكن بمن يقترب كفاية، او تكاسلوا او عصوا، وهكذا الى ان يجب على جميع اهل الاسلام شرقاً وغرباً (جلد ۳ ص۲۳)

اگر غیر مسلموں نے حملہ کیا، تو پھر اس شہر کے تمام باشندوں پر دفاع کے لیے اٹھ کھڑا ہونا فرض عین ہو جائے گا اور اگر دشمن زیادہ طاقتور ہیں اور مقابلہ کے لیے وہاں کے مسلمان کافی نہیں، تو جو مسلمان ان سے قریب ہوں گے، ان پر بھی فرض عین ہو جائے گا اور اگر وہ بھی کافی نہیں، یا انہوں نے سستی کی، یا دانستہ انکار کیا تو پھر ان تمام لوگوں پر جو ان سے قریب ہوں، یہ فرض عائد ہو گا، اسی طرح یکے بعد دیگرے اس کا وجوب منتقل ہوتا جائے گا حتیٰ کہ تمام مسلمانوں پر مشرق میں ہوں یا مغرب میں دفاع کے لیے اٹھ کھڑا ہونا فرض ہو جائے گا،

ایسا ہی تمام کتب معتمدہ فقہ وحدیث میں ہے، عبارتوں کے نقل وترجمہ میں طول ہوگا، ردالمختار وغیرہ شروح میں ذخیرہ سے نقل کیا ہے۔

"فاما من وراءهم ببعد من العدو، فهو فرض كفاية عليهم حتى يسعهم تركه اذا لم يحتج اليهم بان عجز من كان يقترب من العدو عن المقاومة، او لم يعجزوا عنها لكنهم تكاسلوا، فانه يفترض على من يليه فرض كالصلوٰة والصوم لا يسعهم تركه، وثم الى ان يفترض على جميع اهل الاسلام شرقاً وغرباً"

جو لوگ عقبی علاقوں میں دشمنوں سے دور ہوں ان پر (قتال) فرض کفایہ ہوگا، یہاں تک کہ اس کے ترک پر مواخذہ نہ ہوگا جب کہ اس کی ضرورت نہ پڑی لیکن جو دشمن سے قریب ہوں، وہ مقابلہ واستقامت کی طاقت رکھتے ہوئے سستی کریں یا طاقت نہ رکھتے ہوں۔ ضرورت پیش آنے پر ان پر بہرحال یہ نماز، روزے کی طرح فرض ہوگا اور اسے ترک نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ اس طرح مشرق ومغرب کے تمام اہل اسلام پر یہ فرض ہو جاتا ہے اور عنایہ شرح ہدایہ میں ہے۔

"ثم الجهاد يصير فرض عين عند النفير العام على من يقترب من العدو وهو يقدر عليه واما لا اذا احتيج اليهم اما بعجز المقترب، واما للتكاسل فحينئذ يفرض على من يليهم" الخ)

چنانچہ عام اعلان کے بعد دشمن کے قریب تر علاقوں والے صاحب قدرت لوگوں پر جہاد (قتال) فرض عین ہو جاتا ہے لیکن جو لوگ ان کے عقب میں ہیں، ان پر فرض نہیں ہوتا، جب تک کہ ضرورت پیش نہ آئے، خواہ قریب کے لوگ قتال سے عاجز ہوں یا سستی کریں۔ اس وقت یہ ان سب پر فرض ہو جاتا ہے۔

اور شرح موطا میں ہے۔

"فان لم تقع الكفاية بمن نزل بهم، يجب على من بعد منهم من المسلمين عونهم"

اگر وہ لوگ جن پر حملہ ہوا، دشمن کے مقابلے میں کافی نہ ہوں، تو ان کے عقبی علاقوں کے مسلمانوں پر ان کی مدد واجب ہوگی۔

البتہ یاد رہے کہ یہ دفاع کی عام صورت ہے۔ لیکن دو حالتیں شرعاً ایسی بھی ہیں، جن میں وجوب دفاع کے لیے یکے بعد دیگرے اس ترتیب اور الاقرب فالاقرب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ بیک وقت اور بیک دفعہ ہی تمام مسلمانانِ عالم پر دفاع فرض ہو جاتا ہے۔

پہلی حالت یہ ہے کہ خلیفہ وقت تمام مسلمانانِ عالم سے طالب اعانت ہو، یا اس کی بے بسی اور بے چارگی کی حالت ایسی ہو جائے کہ بلا تمام مسلمانانِ عالم کی مجموعی اعانت کے مخلصی اور فتح ممکن نہ ہو۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اسلام کے عین مرکزی مقام یعنی جزیرہ عرب پر غیر مسلم حملہ آور ہوں جن کو ہمیشہ غیر مسلم اثر سے محفوظ رکھنا ہر مسلمان پر فرض ہے، خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ میں بستا ہو۔

فضائل دفاع

اسلامی احکام میں بحکم" دفاع" جو اہمیت رکھتا ہے، وہ عقائد ضروریہ کے بعد کسی حکم، کسی فرض، کسی رکن، کسی عبادت کو حاصل نہیں۔ قرآن وحدیث میں بار بار یہ بات بتائی گئی ہے کہ قومی زندگی اس عمل کے بقا پر موقوف ہے، جب تک مسلمانوں میں یہ جذبہ باقی رہے گا اور اس کام کی راہ میں ہر فرد اپنی جان اور اپنا مال قربان کر دینے کے لیے تیار رہے گا اس وقت تک دنیا کی کوئی قوم ان پر غالب نہ آسکے گی۔ جس دن یہ جذبہ مردہ ہو جائے گا۔ اسی دن سے مسلمانوں کی قومی موت بھی شروع ہو جائے گی۔ چنانچہ قرآن نے مثال میں یہودیوں کی تاریخ پیش کی ہے جب تک یہودیوں میں اعتقاداً وعملاً یہ جذبہ باقی رہا، حکومت وعزت انہی کے لیے تھی جب چند گھڑیوں کے عیش وراحت کا عشق قومی زندگی وعزت کے دائمی عیش کی طلب پر غالب آگیا اور اس چیز کو چھوڑ بیٹھے، تو ذلت ومحکومی کا داغ ہر یہودی کی پیشانی پر لگ گیا اور ہمیشہ کے لیے خوار و ذلیل ہو کر رہ گئے۔

ضربت علیہم الذلۃ والمسکنۃ وباؤ بغضب من اللہ!

سنن ابو داؤد میں ہے۔

اذا ضن الناس بالدینار والدرھم وتبایعوا بالعین واتبعوا اذناب البقر وترکوا الجھاد فی سبیل اللہ انزل اللہ بھم بلاءً فلم یرفعہ حتی یرجعوا۔

یعنی جب کوئی جماعت جہاد فی سبیل اللہ ترک کر دیتی ہے، تو اس پر بلائیں نازل ہوتی ہیں جو کبھی دور نہیں ہو سکیں الا یہ کہ وہ اس معصیت سے باز آئیں چونکہ شریعت وملت کے قیام کی اصل بنیاد یہی تھی، اس لیے ہر حیثیت اور ہر اعتبار سے اس پر زور دیا گیا اور سارے عملوں اور نیکیوں سے، جو ایک مسلمان دنیا میں کر سکتا ہے، اس عمل کا مرتبہ و اجر افضل و اعلیٰ ٹھہرایا۔ جس عمل میں جس قدر زیادہ ایثار و قربانی ہو گی، اتنا ہی زیادہ اس کا اجر و ثواب بھی ہو گا۔ ظاہر ہے کہ اس عمل سے بڑھ کر اور کس عمل میں مال و جان کا ایثار ہو سکتا ہے۔

بخاری ومسلم میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا" ای العمل افضل"؟ کون سا عمل سب سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے؟ فرمایا" ایمان باللہ ورسولہ" اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا۔ پوچھا" ماذا ثم" اس کے بعد؟ فرمایا۔ الجھاد فی سبیل اللہ" اللہ کی راہ میں جہاد!

بخاری میں ابوسعید خدری سے مروی ہے۔

قیل ای الناس افضل قال مومن یجاھد فی سبیل اللہ بنفسہ ومالہ۔

آپ سے پوچھا گیا سب سے زیادہ افضل آدمی کون ہے؟ فرمایا وہ مومن جو اللہ کی راہ میں اپنی جان و مال سے جہاد کرتا ہے اور فرمایا جہاد فی سبیل اللہ کی ایک صبح یا شام تمام دنیا اور اس کی نعمتوں سے بہتر ہے اور ان ساری چیزوں سے افضل ہے، جن پر سورج نکلتا اور ڈوبتا ہے۔

بخاری میں دو حدیثیں ہیں۔

"ماکان عبد یموت لہ عنداللہ خیر یسوہ ان یرجع الی الدنیا وان لہ الدنیا وما فیھا الا الشھید لما یری من فضل الشھادۃ فانہ یسرہ ان یرجع الی الدنیا فیقتل مرۃ اُخری اور روایت انس ما احد یدخل الجنۃ یحب ان یرجع الی الدنیا ولہ ما علی الارض من شیئ الا الشھید یتمنی ان یرجع الی الدنیا فیقتل عشر مرات لما یری من الکرامۃ"

حاصل دونوں کا یہ ہے کہ دوبارہ دنیا میں آنے کی کسی کو آرزو نہیں ہو سکتی مگر اس کو جو اللہ کی راہ میں شہید ہوا۔ جب وہ شہادت کا اجر و ثواب دیکھتا ہے تو تمنا کرتا ہے، کاش پھر دنیا میں جا سکوں اور دس مرتبہ اس طرح اللہ کی راہ میں مارا جاؤں اور دس مرتبہ شہادت کی عزت و کرامت حاصل کروں۔

جن لوگوں نے جنگ بدر میں جان نثاریاں کی تھیں، اگر کبھی ان سے کوئی لغزش ہوئی اور معصیت میں مبتلا ہو گئے، تو آپ نے سزا دینے سے انکار کر دیا اور فرمایا۔

"لعل اللہ اطلع علی اھل بدر فقال اعملوا ماشئتم"

یہ وہ جاں نثار حق ہیں، جنھوں نے جنگ بدر میں شرکت کی تھی عجب نہیں کہ اس ایک عمل کے صلہ میں اللہ نے ان کی ساری پچھلی اور آئندہ خطائیں بخش دی ہوں اور کہہ دیا ہو کہ جو جی میں آئے کرو۔

طبرانی نے عمران بن حصین سے روایت کی ہے کہ جب شام کے رومیوں کی تیاری کی خبر پہنچی، تو مدینہ میں مسلمانوں کی حالت نہایت نازک اور کمزور تھی۔ کسی طرح کا ساز و سامان میسر نہ تھا۔ حضرت عثمان نے یہ حال دیکھا تو اپنا پورا تجارتی قافلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا جو شام جانے کے لیے تیار ہوا تھا۔ اس میں دو سو اونٹ مال و اسباب سے لدے ہوئے تھے۔ اور دو سو اوقیہ سونا تھا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا۔

"لایضر عثمان ما عمل بعدھا"

اخرجہ الترمذی والحاکم ایضاً من حدیث عبدالرحمٰن بن حباب نحوہ۔

آج کے دن کے بعد سے عثمانؓ خواہ کچھ ہی کرے، لیکن کوئی عمل اس کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عمل دفاع کے لیے اپنا مال و متاع قربان کرنا خدا اور رسولؐ کی نظروں میں ایسا محبوب

و محترم کام ہے جس کے بعد کوئی برائی بھی صاحب عمل کو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ کسی عمل کی طاقت کسی عبادت کو بھی یہ فضیلت نصیب نہ ہوئی۔ قرآن بھی ہر جگہ اور بار بار یہی کہتا ہے۔

الذین آمنوا وھاجروا وجاھدوا فی سبیل اللہ باموالھم وانفسھم اعظم درجة عند اللہ واولئك ھم الفائزون۔ یبشرھم ربھم برحمة منه ورضوان وجنات لھم فیھا نعیم مقیم۔ خالدین فیھا ابدا ان اللہ عندہ اجر عظیم

جو لوگ ایمان لائے، حق کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا، اپنی جان و مال سے جہاد کیا، سو اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ اور اونچا درجہ انہی کا ہے۔ یہی لوگ ہیں کہ دنیا اور آخرت میں کامیاب ہوں گے۔ اللہ کی طرف سے ان کے لیے بشارت ہے، اس کی رحمت، اس کی محبت، بہشتی زندگی کی نعمتیں اور ان کی دائمی اور ہمیشگی، سب کچھ انہی کے لیے ہے۔

جو لوگ خود اپنی ذات سے جہاد و دفاع میں حصہ نہ لے سکیں، مگر مجاہدین کو اپنے مال و متاع سے مدد پہنچائیں یا اور کسی قسم کی خدمت انجام دیں، تو اگرچہ وہ مجاہدین کا اجر و ثواب نہیں پا سکتے، لیکن ان کے لیے بھی اجر ہے اور ساری عبادتوں اور طاعتوں سے بڑھ کر اجر ہے۔ ابن ماجہ میں ہے۔

من ارسل بنفقة فی سبیل اللہ واقام فی بیته فله بكل درھم سبع مائة درھم ومن غزا بنفسه فی سبیل اللہ وانفق فی وجهه ذلك فله بكل درھم سبع مائة الف درھم، ثم تلا ھذہ الآیة، واللہ یضاعف لمن یشاء

یعنی جو مسلمان ایسے وقتوں میں گھر سے نہ نکلا، صرف اپنے مال سے جہاد میں مدد دی تو اس کو ہر ایک درہم کے بدلے سات سو درہم کا اجر ملے گا۔ یعنی اس انفاق میں سات سو درہم زیادہ اجر ہے۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی "اللہ جس کسی کا اجر و ثواب چاہتا ہے، دوگنا کر دیتا ہے۔"

اگرچہ عمل کے اعتبار سے اس فرض کی تکمیل اس وقت لازم و ملزوم ہو جاتی ہے، جب حملۂ اعدا کی وجہ سے خاص طور پر ضرورت پیش آجائے۔ لیکن عزم و استقلال کے لحاظ سے یہ حکم کسی خاص وقت میں محدود نہیں۔ ہمیشہ اور ہر حال میں مسلمانوں کا فرض ہے کہ دفاع اعداء کے لیے تیار رہیں اور تیاری کرتے رہیں۔ جو دل اس عزم و طلب سے خالی ہوا، اس پر ایمان کی جگہ نفاق کا قبضہ ہو گیا۔

اسلام اور جہاد

محمد جعفر شاہ پھلواروی

بہت سے الفاظ ایسے ہیں، جو وضع تو ہوئے تھے کسی وسیع مفہوم کو ادا کرنے کے لیے، لیکن رفتہ رفتہ ان کی وسعت میں تنگی پیدا ہوتے ہوتے بہت ہی محدود قسم کا مفہوم باقی رہ گیا۔ ان ہی میں لفظ جہاد بھی شامل ہے۔ اس کے اصل لغوی معنی ہیں، پوری طاقت سے کوشش کرنا۔ قرآنی اصطلاح میں اسلامی نصب العین کے حصول میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دینے کو جہاد کہتے ہیں۔ عربی زبان میں اور خود ہماری زبان میں بھی جدوجہد (یا جد و جُہد) کوشش بلیغ ہی کو کہتے ہیں۔ اور لفظ جہاد میں زیادۂ حرف کی وجہ سے معنی اور زیادہ مبالغہ ہو جاتا ہے۔ اب دیکھئے کسی بلند مقصد کا حصول آسانی سے نہیں ہوتا۔ جتنا بلند مقصد ہوگا۔ اتنا ہی اس کا حصول بھی دُشوار ہوگا اور جس قدر حصول دشوار ہوگا۔ اتنی ہی سعی بلیغ اور ویسی ہی سر توڑ کوشش بھی درکار ہوگی۔ پھر اس کوشش میں جو چیز رکاوٹ ڈالے گی، اسے قربان بھی کرنا پڑے گا۔ اسی کوشش و قربانی کا نام ہے جہاد۔ انسان کے پاس جتنی عزیز و محبوب متاع ہے، وہ ایک ایک کر کے اس کوشش کی راہ میں آڑے آئے گی۔ کبھی وقت اور اس کی مصروفیتیں رکاوٹ ڈالیں گی۔ کبھی مالی نقصان کا خیال روک بنے گا، کبھی بال بچوں کی صُحبت آڑے آئے گی۔ کبھی اپنے تن بدن کی ناتوانیاں اور اپنی جان کا خوف دیوار بن کر حائل ہوگا۔ غرض ہزار جھگڑے بیچ میں سدِ سکندری بن کر کھڑے ہو جائیں گے۔ ان سب کو عبور کرنا یا ان سب کو درمیان سے ہٹا دینا گوہرِ مقصود کے حصول کا تقاضا ہوگا۔ یہی جہاد ہے۔ ایک آیت میں ان تمام چیزوں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

قُلْ ان کان اٰباؤکم و ابناؤکم و اخوانکم و ازواجکم و عشیرتکم و اموالُ اقترفتموھا و تجارۃ تخشون کسادھا و مٰسکن ترضونھا احب الیکم من اللہ و رسولہ و جہاد فی سبیلہ فتربصوا حتّٰی یاْتِی اللہ بامرہٖ و اللہ لا یھدی القوم الفٰسقین ۝

(۹ : ۲۴)

کہہ دو کہ اگر تمہارے آبا و اجداد اور تمہارے فرزند اور تمہارے بھائی اور تمہاری ازواج اور تمہارے افراد خاندان اور تمہارے وہ مال جو تم نے جمع کر رکھے ہیں اور وہ تجارت جس کے ماند پڑ جانے کا تمہیں خطرہ لگا رہتا ہے اور وہ گھر جو تمہیں پسند ہیں (اگر یہ سب چیزیں یا کوئی ایک چیز) تمہیں اللہ اور اس کے رسولؐ اور جہاد فی سبیل اللہ سے زیادہ محبوب ہے، تو انتظار کرو اس وقت کا جب اللہ اپنا فیصلہ کُن حکم لے آئے اور اللہ فاسق لوگوں کو راہ نہیں دکھاتا۔

اس آیت کو دیکھیے اس سے کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

مقصد کی محبت: پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ یا اس کی رضا ایک مسلمان کا اصلی مقصد ہے۔ رسولؐ اس کا واسطہ ہے اور جہاد و کوشش حصولِ مقصد کا طریقہ ہے۔ اگر مقصد سے محبت ہے، تو اس کی رہبری کرنے والا بھی ضرور محبوب ہوگا نیز اس راہ میں ہر ممکن کوشش بھی محبوب ہوگی۔ ہو نہیں سکتا کہ کوئی مقصد تو مطلوب ہو اور اس کے حصول کے لیے سعی محبوب نہ ہو یا جو اس کی راہبری کرے، اس سے محبت نہ ہو۔ گویا جہاد فی سبیل اللہ ویسا ہی محبوب ہونا چاہیے جیسا خود اللہ اور اس کا رسولؐ محبوب ہے۔ اگر جہاد محبوب نہیں

تو اللہ کی محبت ایسی ہی ہوگی جیسے اللہ سے تو محبت کا دعوے ہو اور اس کے رسولؐ سے کوئی محبت نہ ہو۔ پس جس چیز کے لیے سعی وکوشش یعنی جہاد نہ ہو، اس کے متعلق سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ اس مقصود کی محض خواہش ہے۔ کوئی محبت یا طلب یا تڑپ نہیں۔ دوسری چیز اس آیت سے یہ واضح ہوتی ہے کہ اللہ، رسول یا جہاد کے راستے میں رک

سب سے زیادہ محبوب مقصد: بن کر کھڑی ہو جانے والی چیزیں یہی ہیں، جن کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔ باپ دادا، آل اولاد، بھائی بند، بیوی یا شوہر، کنبے کے افراد، جمع کردہ مال واسباب، تجارت کی گرم بازاری اور گھر بار یا وطن۔ ان تمام چیزوں سے زیادہ خود نفس جہاد مرغوب ومحبوب ہونا چاہیئے۔ اگر اللہ یا اس کا پیغامبر محبوب ہے۔

تیسری حقیقت، جو اس آیت سے واضح ہوتی ہے، جہاد کا مطلب ہے، یعنی ان میں سے کوئی شے یا ان کے علاوہ کوئی

قربانی: چیز بیچ میں حائل ہو جائے، تو محبت جہاد کا تقاضا یہ ہے کہ اسے عبور کر لیا جائے یا یوں کہیے کہ اسے قربان کر دیا جائے۔

اب یہ واضح ہو گیا ہوگا کہ جہاد وکوشش کی بہت سی قسمیں ہیں۔ جس چیز کو بھی اس کوشش میں لگایا جائے گا،

اقسام جہاد: اسی چیز کا جہاد ہوگا۔ اگر صرف قلب ودماغ کا موقع ہے اور قلب ودماغ کو اس کوشش میں لگایا جائے تو یہ جہاد بالقلب ہوگا۔ اگر قلم یا علم کو لگائے، تو جہاد بالقلم اور جہاد بالعلم ہوگا۔ اگر جسم کو لگائے تو جہاد بالجسم ہوگا۔ اگر مال کو لگائے، تو جہاد بالمال ہوگا اور اگر جان کی بازی لگا دی، تو جہاد بالنفس ہوگا۔ ان تمام چیزوں کو دو ہی بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ تجارت، مساکن، وطن، مال، اسباب وغیرہ کا جہاد اور باپ دادا، آل اولاد، بھائی بند، ازواج اور افراد کنبہ وغیرہ کا اور اپنی ذات کا جہاد۔ ان دو میں اول کو مختصراً جہاد بالمال اور دوسرے کو بالاختصار جہاد بالنفس کہتے ہیں۔ قرآن پاک جہاد کے ساتھ قریباً ہر جگہ ان ہی دو چیزوں کو بیان کرتا ہے۔

مثلاً: وَتجاھدون فی سبیل اللہ باموالکم وانفسکم۔

غرض انسان کے مطلوبات ومرغوبات قدرۃً دو ہی قسموں کے ہیں مال اور جان (خواہ اپنی جان ہو، یا اپنے کسی محبوب کی) ان دو کے ذکر میں تمام قسم کے جہاد خود بخود سمٹ کر آجاتے ہیں اور الگ الگ ذکر کی ضرورت نہیں رہتی۔ اسلئے قرآن مجید بار بار جاھدوا فی سبیل اللہ باموالکم وانفسکم کہتا ہے۔ قرآن پاک میں ہر جگہ جہاد کے ذکر میں اموال کو انفس کے ذکر پر مقدم کیا گیا ہے۔ یہ تقدم اس لئے نہیں کہ جہاد بالمال جہاد بالنفس سے زیادہ مشکل ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاد کا آغاز جہاد بالمال ہی سے ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ جو مال نہ دے سکے، وہ جان کیا دے گا؟ جان بہرحال مال سے زیادہ قیمت رکھتی ہے اور جہاد کی آخری منزل ہے اور زبانی، قلبی، دماغی، وقتی، جسمانی اور مالی تمام جہادوں سے زیادہ مشکل جانی ہی جہاد ہے۔

یہ معلوم کرنے کے بعد کہ جہاد کی بہت سی شاخیں ہیں اور ان میں سب سے اعلیٰ وارفع جان کا جہاد ہے

جہاد بالنفس کا مطلب: یہ بھی جاننا چاہیئے کہ جہاد جانی کی بھی بہت سی صورتیں ہیں۔ جہاد جانی کے معنی فقط جان دے دینا نہیں بلکہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ "اسلامی کاز" (cause) کے لیے ہمیشہ سر بکف رہنا، سر توڑ کوشش کرتے رہنا، جان کو جوکھوں میں ڈالے رہنا اور زندگی سے بے پروا ہو کر اس راہ پر لگے رہنا۔ ایک آیت میں اس جہاد کی کئی قسمیں ایک جگہ اس طرح جمع کر دی گئی ہیں:

ذٰلک بانھم لا یصیبھم ظمأ ولا نصب ولا یہ اس لیے کہ یہ لوگ اللہ کی راہ میں جو پیاس، تھکن اور بھوک کو

مخمصة فی سبیل اللہ ولا یطئون موطئا یغیظ الکفار ولا ینالون من عدو نیلا الا کتب لھم بہ عمل صالح ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین ○ ولا ینفقون نفقة صغیرة ولا کبیرة ولا یقطعون وادیا الا کتب لھم لیجزیھم اللہ احسن ما کانوا یعملون ○ (۹: ۱۲۰، ۱۲۱)

مصیبت جھیلیں اور جس مقام کو روند کر اہلِ کُفر کو غُصّے میں ڈال دیں اور دشمن سے جو مقصد حاصل کر لیں، تو ان میں سے ہر ایک چیز کے بدلے ان کے لیے عمل صالح لکھا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ یقیناً مُحسنین کے اجر کو ضائع نہیں فرماتا اور وُہ جو چھوٹا بڑا انفاق کریں اور جو میدان قطع کریں، اس کے عوض بھی عمل صالح لکھا جائے گا۔ تاکہ اللہ ان کے عمل کا بہترین بدلہ دے۔

دیکھیے یہ جانی جہاد کی مختلف صورتیں ہیں۔ اللہ کی راہ میں بُھوکا پیاسا مرنا، تھکن برداشت کرنا، کسی سرزمین کو روندنا، دشمن سے مقصود (فتح یا صُلح وغیرہ) حاصل کرنا، کسی میدان کی مسافت کو قطع کرنا وغیرہ سب کچھ جانی جہاد میں داخل ہے۔ اسی بیان کے دوران میں مالی جہاد کا بھی ذکر آیا ہے کہ بڑا انفاق اور چھوٹا خرچ سب مالی جہاد میں داخل ہے۔

جانی جہاد: یہ تمام صورتیں جہاد جانی کی ہیں، لیکن یہ وہ صورتیں ہیں، جن کو زندہ ہی ادا کر سکتا ہے اور یہ عین ممکن ہے کہ اسی راہ میں مجاہد کی جان چلی جائے اور (عام اصطلاح میں) وُہ رتبہ شہادت حاصل کرلے لیکن جہاد کا مقصد جان دے دینا نہیں بلکہ اعلائے کلمۃ اللہ ہے، خواہ دشمن کی جان لے کر ہو یا اپنی جان دے کر ہو یا دونوں کو باقی رکھ کر ہو، یا دونوں کو ختم کر کے ہو۔ یہ ساری شکلیں جانی جہاد ہی کی ہیں کیونکہ یہ سب سر توڑ کوششیں ہیں اور جہاد کے معنی ہی ہیں سر توڑ کوشش، جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔

جانی قربانی: ان ہی کوششوں میں ایک بڑی کوشش قتال و جنگ بھی ہے اور اسی کے وہ تمام اجزا ہیں جو اوپر کی آیت میں بیان ہوئے ہیں۔ گویا قتال و جنگ جہاد ہی کا ایک اہم پہلو ہے۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہے کہ یہ جہاد کا فردِ اکمل ہے اب بات پوری طرح واضح ہو گئی ہو گی کہ لفظ جہاد خاص طور پر جنگ و قتال کے معنی میں کیوں بولا جانے لگا۔

یہ تمہید ہمیں اس لیے کرنی پڑی کہ آئندہ مضامین میں یہ لفظ بار بار اس معنی میں استعمال کیا گیا ہے اس سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ جہاد صرف لڑائی ہی کو کہتے ہیں۔ بلکہ حقیقت صرف اس قدر ہے کہ جس طرح شہید کا لفظ مقتول فی سبیل اللہ کے معنی میں اس لیے بولتے ہیں کہ فی سبیل اللہ قتل ہونا سب سے بڑی شہادت یعنی عملی گواہی ہے۔ اسی طرح جہاد کو بمعنی جنگ و قتال اس لیے استعمال کرتے ہیں کہ جدوجہد اور سعی و کوشش کا سب سے بڑا ثبوت جنگ و قتال ہی ہے۔ اگر اسی کی ضرورت ہو اور اس کے بغیر کام نہ چلتا ہو۔

دفاعی جنگ: اسلام کا یہ مُوقف نہیں کہ جو شخص اسلام قبول کرے، وہ بس کسی نہ کسی کافر سے لڑائی شروع کر دے، بلکہ حقیقت صرف اس قدر ہے کہ انسانیت کے سب سے اعلیٰ نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے جہاں اور بہت سی کوششیں کرنی پڑتی ہیں، وہاں کبھی اس کوشش کی بھی نوبت آ ہی جاتی ہے۔ اگر دنیا صرف باتوں ہی سے معقولیت کی زندگی اختیار کرے، تو جنگ کی ضرورت پیش نہ آئے۔ لیکن انسان میں دو قسم کی فطرتیں ودیعت کی گئی ہیں:

ایک فطرتِ سلیمہ اور دوسری فطرتِ سقیمہ۔ فطرتِ سلیمہ رکھنے والے جب معقولیت کی راہ اختیار کرتے ہیں تو فطرتِ سقیمہ رکھنے والوں کی روش پر فطرةً زد آتی ہے۔ اس خطرے کو محسوس کرتے ہی وُہ خود ہی معقولیت پر جھپٹ پڑتے ہیں۔ معقولیت پسند یہ نامعقول

حرکت نہیں کرتا کہ باتوں سے پہلے لاتوں پر اُتر آئے۔ اس کا کام جب تک معقول باتوں سے چلتا ہے، وہ اسی کو اپنی سب سے بڑی کامیابی سمجھتا ہے۔ وُہ نامعقول حملوں کا جواب بھی معقول باتوں ہی سے دے گا۔ اِدھر اس کی نامعقولیت بڑھتی جائے گی اور اُدھر معقولیت۔ یہاں تک کہ بات کے بعد لات کا مقام آجائے۔ معقولیت جتنی زیادہ موٹی جائے گی، نامعقولیت پر چوٹ اتنی ہی زیادہ گہری ہوتی جائے گی اور اس شکست کو محسوس کرنے کے بعد نامعقول خود باتوں کو چھوڑ کر لاتوں پر اتر آتا ہے۔ اس وقت بجز اس کے اور کوئی چارہ کار نہیں ہوتا کہ لاتوں کا جواب لاتوں سے دیا جائے۔ اس مقابلے میں معقولیت اور نامعقولیت کا وہی تناسب باقی رہتا ہے۔ جو باتوں کے مقابلے میں تھا۔ یہاں قدم قدم پر وہی معقولیت وہی اخلاقی قدروں کی نگہداشت اور وہی انسانیت ہوتی ہے اور ادھر وہی نامعقولیت ہوتی ہے، جس کا ابتدائی قدم "معقول باتوں" میں ظاہر ہو رہا تھا۔

جھوٹے پروپیگنڈے: گویا جہاد (بمعنی قتال) کا پہلا قدم ہے حملہ آور کے حملوں کا معقولیت سے جواب دینا اور یہ ایک ایسا حق ہے، جس کی معقولیت سے صرف وہی انکار کر سکتا ہے۔ جو معقولیت کو خیر باد کہنے کا اعلان کر چکا ہو۔ تاہم بعض معقول حق کو نامعقول ثابت کرنے کی کوشش کرنے والوں کی کمی نہیں رہی ہے۔ مسلمانوں کے عالمگیر زوال کے بعد جب یورپ نے سر اُٹھایا، اور یہ تمدنی روشنی اس کے اندر اسلام ہی کے صدقے میں آئی تھی، تو اس نے پہلا "جہاد" یہی کیا کہ جہادِ اسلامی کو نامعقول ثابت کرنے کی کوشش فرمائی۔ سیرت کی کتابیں لکھیں، تاریخیں شائع کیں۔ مقالات سپردِ قلم کیے اور ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا، یہ ثابت کرنے میں کہ جہاد وحشت ہے، بربریت ہے، خلافِ امن حرکت ہے، انسانیت کے خلاف ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اسلامی جہاد زبردستی مسلمان بنانے کے لیے ہوتا ہے۔ ان پروپیگنڈوں سے پڑھا لکھا مگر احساسِ کمتری رکھنے والا اور مرعوبیت کا مارا طبقہ متاثر ہوا مگر ایک ناقابلِ قطع شدہ رگ مذہب کی باقی تھی۔ قرآنی تعلیماتِ جہاد کو وُہ کہاں لے جاتے اور مذہب کا مقابلہ محض استدلالِ عقلی سے کس طرح کرتے؟ اس کے لیے انہوں نے مذہبی رنگ میں بعض مجددین بھی پیدا فرمائے، جنہوں نے جہاد کے خلاف الماریوں کی الماریاں لکھ ڈالیں اور اپنی جدید شریعت میں اسے "حرام" قرار دے دیا۔

آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا یورپ فی الواقع جہاد کو خلافِ انسانیت و تمدن سمجھتا تھا؟ کیا وُہ فی الحقیقت یہ یقین رکھتا تھا کہ اسلام نے جبراً مسلمان بنانے کے لیے تلوار اٹھائی تھی؟ ان دونوں سوالوں کا جواب نفی میں ہے۔ یہ قومیں حقیقت کو سمجھنے میں آپ سے بہت آگے ہیں۔ بڑی ذی عقل و ذی فہم ہیں، نہایت نکتہ رس اور حقیقت شناس ہیں۔ یہ اصلیت کو خوب سمجھتی ہیں۔ ان کی فکر ان کا ادراک بہت بلند ہے۔ پھر سوچیے انہوں نے اسلامی جہاد کو ایک بھیانک شکل کیوں دی اور اسے جبراً مسلمان بنانے کا ذریعہ کیوں فرض کیا؟ اس کے کچھ خاص وجوہ ہیں۔

پروپیگنڈے کی غرض: ان کا مقصد صرف مسلمانوں کے جذبۂ جہاد کو سرد کرنا تھا۔ اگر فی الواقع جہاد بُری چیز ہوتا تو سب سے پہلے یہ خود قتال کو ترک کرتے، لیکن یہ تو مقصد ہی نہیں تھا۔ مقصد تو فقط اتنا تھا کہ مسلمان جہاد کا خیال ترک کر دیں اور یہ اطمینان سے ان پر حکمرانی کرتے رہیں۔ ان کو دنیا کی کسی قوم سے خاص خطرہ نہ تھا۔ رہ رہ کر ان کی نیند کو خراب کرنے والا صرف یہ خیال تھا کہ اگر کہیں یہ قوم بیدار ہو گئی اور وہی سابق جذبۂ جہاد عود کر آیا، تو یہ پھر کہیں کے نہ رہیں گے۔ لہٰذا خیریت

صرف اسی میں ہے کہ عقلی راہ سے، مذہبی راہ سے، تعلیمی راہ سے، غرض ہر طرح مسلمان کے دل سے اس کا خیال ہی نکال دیا جائے۔
ان کے سر پر خطرۂ جہاد کا ہوا ہر وقت سوار تھا۔ اسی خطرے کو علامہ اقبال نے یوں ادا کیا ہے:

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سُنا ہے میں نے یہ قدسیوں سے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

احساس کہتری نے یہاں تک شکست خوردگی قبول کر لی کہ بہت سے مسلمان بھی یہ اعتراف کرتے ہوئے کہ اسلام جہاد کو سب سے بڑی عبادت قرار دیتا ہے۔ شرم وندامت محسوس کرنے لگے۔ اگر کہیں دبی زبان سے اقرار بھی کیا، تو صرف اس حد تک کہ "ہاں مدافعانہ جنگ تو اسلام میں جائز ہے"، یعنی ضروری ہونے پر بھی شبہ ہے۔

مدافعانہ اور جارحانہ: اسلام میں "مدافعانہ" اور "جارحانہ" نام کے دو جہاد نہیں۔ یہاں صرف ایک مثبت چیز ہے، جسے "جہاد" کہتے ہیں۔ مدافعت اگر کوئی چیز ہے، تو وہ شروع سے آخر تک مدافعت ہے اور جارحانہ اقدام ہے، تو وہ از اوّل تا آخر جارحانہ اقدام ہے۔ جہاد ایک ضروری اور ناگزیر عمل ہے، جو مومن کو بہر حال کرنا ہے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے، جس کے لیے وہ وجود میں آیا ہے، اگر آپ نظرِ غور وفکر سے کام لیں، تو مدافعانہ جنگ کی کوئی صحیح تعریف نہیں مل سکے گی۔ مدافعت کے یہ معنی نہیں ہو سکتے، کہ جب دشمن تمہارے گھروں میں گھس کر تم پر تلوار اُٹھائے اور اس کی دھار تمہاری گردن سے چوتھائی انچ کے فاصلے پر پہنچ جائے، تب تم سمجھو کہ دشمن نے واقعی جارحانہ حملہ کر دیا ہے اور اب مدافعت کا وقت آگیا ہے۔ یہ تصور تو کسی پرستار اہمسا کا بھی نہیں ہو سکتا۔ برخلاف اس کے اگر صرف یہ خطرہ ہو کہ دشمن حملہ کرنے والا ہے، ذرا سی غفلت میں ہمارا صفایا ہو جائے گا اور اگر پہلے ہی اس کا زور توڑ دیا جائے۔ جب ہی ہم اس کی غارت گری سے محفوظ رہ سکتے ہیں، تو اس صورت میں آگے بڑھ کر حملہ کر دینا ہی عین مدافعت ہے اور تحفظ قوم کا عین فطری تقاضا ہے۔ اس کی صورت خواہ کیسی ہی جارحانہ نظر آئے، لیکن دراصل یہ بھی مدافعت ہی کی ایک ضروری شکل ہے۔ اس انتظار میں رہنا کہ جب دشمن ہماری سرحدوں میں گھس کر قتل وغارت شروع کر دے گا تب ہم پر مدافعت ضروری ہوگی ایک شاعر کے لیے تو صحیح ہو سکتا ہے، جس کی دنیا صرف خیالی ہوتی ہے، لیکن ایک بیدار، زندہ اور مقدام قوم کے فرد کے لیے یہ شاعری کوئی وقعت نہیں رکھتی بلکہ ایک دوسرے نقطۂ نظر سے دیکھیے تو جس طرح جارحانہ اقدام مدافعت ہی کی ایک دوسری شکل ہے، اسی طرح مدافعت اس اقدام کا پہلا زینہ ہے، جو آپ اپنی حفاظت ومدافعت نہ کر سکے، وہ آگے کیا بڑھ سکے گا۔ بحیثیت ایک مسلمان امت کے اگر ہم فقط اپنے بچاؤ پر قانع ہو جائیں، تو اس امت کے وجود میں آنے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے اس لیے دراصل اسلامی نقطۂ نظر سے مدافعت اور جارحانہ اقدام میں کوئی فرق نہیں۔ جہاد صرف ایک ہی مثبت حقیقت ہے اور یہ دونوں اس کی ایسی دو صورتیں ہیں، جو باہم پیوستہ ہیں اور ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتیں۔

اجزائے جہاد: احادیث اور فقہ کو الگ کر کے بھی دیکھیے، تو قریباً سو آیات صرف جہاد سے متعلق ہیں، جن کے مضامین مختصراً یہ ہیں:

جہاد کی فرضیت : جہاد کن سے کیا جائے ؟ ان کا کیا جرم ہے ؟ جہاد کی غرض وغایت کیا ہے ؟ کس زمان ومکاں میں اس سے باز رہنا چاہیے ؟ اپنا بچاؤ کیوں ضروری ہے ؟ ثابت قدمی کیوں لازمی ہے ؟ ثابت قدموں پر کیا انعام اور بھاگنے والوں پر کیا عذاب ہوتا ہے ؟ جہاد کن کن چیزوں سے ہوتا ہے ؟ سامان جہاد کی فراہمی کیوں فرض ہے ؟ مجاہدین کا کیا درجہ ہے ؟ جہاد کن معذوروں پر فرض نہیں ؟ یہ فرض کفایہ اور فرض عین کب ہوتا ہے ؟ جنگ کے بعد صلح کن بنیادوں پر اور کیوں ہونا چاہیئے ؟ اسیران جنگ کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا چاہیئے ؟ مال غنیمت وفے کا کیا مصرف ہے ؟ جہاد کے بغیر کیوں قوم زندہ نہیں رہ سکتی ؟ ۔ غرض اس قسم کے بے شمار مضامین ہیں ، جو صرف قرآن پاک میں ذکر ہوئے ہیں ۔ ان سب کو نقل کرنے اور ان کی تشریح کرنے کے لیے ایک پوری کتاب درکار ہے یہاں اس وقت ایک مختصر مقالہ لکھنا ہے ۔ البتہ ان مضامین کے بعض گوشے ایسے ہیں ، جن کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے ، کیونکہ ان کے بغیر مقصدِ مقالہ سامنے نہ آسکے گا ۔

اُمتِ مسلمہ کا وجود کیوں عمل میں آیا : اس سوال کا جواب قرآن پاک میں یُوں ہے :

كُنتم خيرامة اخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنكر و تومنون بالله (۳ : ۱۱۰)

تم بہترین امت ہو ، جو کبھی برپا کی گئی ہے ۔ تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض ادا کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو ۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی بنیاد صرف عقل اور مشورہ بھی ہو سکتا ہے ۔ لیکن یہاں مراد وہ نہیں بلکہ وہ امر ونہی مقصود ہے ، جس کی بنیاد ایمان باللہ پر ہے اور وحی خداوندی ہی کے محک پر معروف ومنکر کو پرکھا جائے ۔ اس وقت یہ بحث کرنا مقصود نہیں کہ ایسا کیوں ہو ؟ بہر حال ہے ایسا ہی اور یہ مقصد اتنا عظیم الشان ، جہانی اور عالمگیر ہے کہ کسی محدود حلقے میں سمٹ کر رہنا اس کے فطری مزاج کے منافی ہے جس طرح پانی کی فطرت ہے نشیب کی طرف جانا اور جس طرح گرمی سے ہوا کا پھیلنا ہوا کا مزاج فطری ہے ، اسی طرح امر بالمعروف نہی عن المنکر کی فطرت میں پھیلاؤ ہے ۔ یعنی اگر اس کے پھیلاؤ کو روک دیا جائے تو اس کا کسی محدود حلقے میں سمٹ کر باقی رہنا بھی ناممکن ہے ۔ اگر پوری بستی میں وبا پھیلی ہوئی ہو یا پھیلنے کا خطرہ ہو ، تو صرف ایک گھر کے اندر کچھ صفائی کر لینا نہ اس گھر کو بیرونی مسموم فضا کے اثر سے بچا سکتی ہے ، نہ بستی کے دوسرے گھرانوں کو ۔ لامحالہ یہ کرنا پڑے گا کہ اپنے گھر کے باہر کی فضا بھی قابو حاصل کیا جائے ۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ پوری انسانی سوسائٹی بد ’’منکر‘‘ سے مسموم ہو اور ایک مختصر محدود حلقہ اپنی بعض اصلاح کر کے یہ سمجھ بیٹھے کہ ہم محفوظ ہو گئے ۔ اور فرض کیجیے کہ اگر ایسا ممکن بھی ہو تو یہ کس انسانیت کا تقاضا ہے کہ خود تو وبا سے بچ رہو ، مگر دوسروں کو وبا کا شکار بننے دو ؟

آگے چلنے سے پہلے یہاں دو ایک ضروری باتیں ذہن نشین کر لینا چاہیئے :

اولاً یہ کہ یہاں **تامرون** کہا گیا ہے ۔ **تعظون** نہیں فرمایا گیا ہے ۔ امر کے معنی ہیں آرڈر کرنا ۔ یہ اسلامی سوسائٹی

وعظ اور امر : کا دوسرا اسٹیج ہے ۔ پہلا زینہ ہے ، دعوت ، جیسا کہ اس آیت میں ذرا پہلے کہا گیا ہے کہ :

و لتكن منكم امة يدعون الى الخير و يأمرون بالمعروف وينهون عن المنكر (۳ : ۱۰۴)

یعنی تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہیئے ، جو خیر کی دعوت دے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے ۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ صرف دعوت و وعظ ہی میں ساری عمر نہیں ختم کر دینا ہے بلکہ رفتہ رفتہ ایسا مقام بھی حاصل کرنا ہے کہ جن لوگوں پر وعظ و دعوت اثر نہ کر سکے، ان پر امر و نہی (ORDER) نافذ کیا جا سکے۔

جہاد کا مطلب: ثانیاً یہ کہ اس مقصدِ عظیم کے حصول کے لیے جس قسم کی بھی جد و جہد، سعی بلیغ اور سر توڑ کوشش کی جائے گی، وہی جہاد ہے۔

معروف اور اسلام: ثالثاً اسلام سراسر خیر و معروف ہے اور اس کے مقابلے میں کفر یکسر شر و منکر ہے۔ لیکن آیت میں امر بالاسلام اور نہی عن الکفر نہیں کہا گیا ہے بلکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کہا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مذہب یا دین کو الگ رکھ کر بھی اگر دیکھا جائے تو معروف منکر شبت اور مستقل چیز ہے۔ معروف ہر وہ اچھائی ہے، جس کو فطرت سلیمہ اچھائی مانتی ہے، اور منکر ہر وہ برائی ہے جس کا فطرت سلیمہ انکار کرے گویا معروف (جسکا مادہ عرف ہے) جانی پہچانی چیز ہے اور منکر (جسکا مصدر انکار ہے) اسی کی ضد ہے۔

امر و نہی کے لیے طاقت: رابعاً اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام کی صرف دعوت تو دی جائے گی لیکن امر، آرڈر یا دباؤ نہیں ڈالا جائے گا۔ بخلاف اس کے معروف اختیار کرنے اور منکر کو ترک کرنے پر امر بھی کیا جائے گا۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ کسی غیر مسلم کو اسلام لانے پر ہرگز مجبور نہیں کیا جائے گا لیکن اگر وہ امن و انتظام میں خلل ڈالے، تو امر کی قوت کو ضرور حرکت میں لایا جائے گا۔ اسلام تو سودا ہی ہے خوشی کا۔ اس کے معنی ہی میں رضا کارانہ خوشدلی کے ساتھ نظامِ زندگی کو قبول کر لینا۔ دباؤ سے جو اسلام ہو، وہ تو اسلام ہی نہیں رہتا۔ لیکن فتنہ و فساد ایک ایسی چیز ہے کہ خواہ وہ خوشدلی سے ہو یا کسی کے دباؤ سے نتیجہ دونوں کا ایک ہی ہوتا ہے۔ اس لیے اسے روکنے کے لیے اگر دعوت و وعظ ناکافی ہو تو طاقت کا استعمال ایسا ہی ضروری ہے، جیسا زندگی کی بقا کیلئے آب و ہوا کا وجود۔ پوری انسانیت جس وقت معقولیت کی سطح پر پہنچ جائے گی، اس وقت طاقت کے استعمال کی واقعی ضرورت نہ رہے گی لیکن ابھی وہ منزل دور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ سے آج تک کوئی زمان و مکان خالی نہیں رہ سکا۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا خلاصہ: غرض انسانی زندگی میں بعض گوشے ایسے موجود ہیں، جہاں طاقت ہی کام آسکتی ہے اس استعمال طاقت سے مقصود صرف یہ ہے کہ دنیا سے فتنہ و فساد دُور ہو۔

قرآن پاک نے اسی مقصد کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے کہ:

اِلَّا تفعلوہ تکن فتنة فی الارض و فساد کبیر (۸ : ۷۳)	یعنی اگر تم نے یہ نہ کیا، زمین میں فتنہ و فساد پھیل جائے گا۔

اس کے دائرے کا پھیلاؤ اس طرح ہو گا کہ:

واتقوا فتنة لا تصیبن الذین ظلموا منکم خاصة (۸ : ۲۵)	اس فتنے سے بچو، جس کا اثر صرف ظالموں ہی تک محدود نہیں رہے گا۔

دوسرے لفظوں میں اگر فتنہ و فساد کا ابتدا ہی میں سدباب نہ کیا گیا، تو یہ پھیل کر نیک و بد سب کو تباہ و برباد کر دے گا، جب سیلاب اٹھتا ہے، تو اچھے برے سب کو لے ڈوبتا ہے۔

فتنہ و فساد کا مطلب: قرآن پاک کے تفحص و تدبر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے جان، مال، آبرو، ایمان، کردار وغیرہ کو جو چیز

بھی آزمائش اور خطرے میں ڈالے، وُہ فتنہ ہے اور زندگی میں جو شے ناہمواری پیدا کرے، وہ فساد ہے۔ ان دونوں چیزوں کا سدِ باب، ایک ایسا انسانی فریضہ ہے، جس کے ضروری ہونے سے کوئی دہریہ و لامذہب بھی انکار نہیں کر سکتا۔ یہی حاصل ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اور اس کے لیے طاقت کا استعمال عین تقاضائے عقل ہے۔

لگے ہاتھوں یہاں یہ بھی سُن لیجیے کہ جنگ اور طاقت کا استعمال ایک ایسی فطرت ہے، جو حاصلِ زندگی ہے۔

جنگ اور فطرت: انسان بیمار پڑتا ہے اور دوا استعمال کرتا ہے۔ اس استعمالِ دوا کی کیا اصلیت و حقیقت ہے؟ یہ صرف ایک جنگ ہے۔ مرض کے خلاف۔ تعلیم و تربیت کیا ہے؟ جہالت و ناشائستگی کے خلاف جنگ ہے۔ لباس، خوراک، مکان اور دوسری آسائشیں کیا ہیں؟ فقط ایک جنگ ہے ان خطرات کے خلاف، جو ان چیزوں کے نہ ہونے سے پیش آ سکتے ہیں۔ غرض پوری زندگی کے تمام مثبت کام اس کے منفی پہلوؤں کے خلاف جنگ ہیں۔ اس سے اور آگے بڑھیے، تو یہ پوری کائنات نفی و اثبات اور ایجاب و سلب کی جنگ ہی کا نتیجہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں بچاؤ، تحفظ (Protection) ہر مرحلے پر ایک فطری حق ہے اور اسی کا دوسرا نام ہے جنگ اور کسی مقصد کو مدارِ زندگی قرار دینے کا مطلب ہی یہ ہے کہ اس کے خلاف جو کچھ بھی ہے، اس سے تحفظ اور ضروری ہے اور یہی ضرورتِ تحفظ کبھی خاموش جنگ ہوتی ہے اور کبھی سرِ میدان۔ جنگ اگر فطرتِ سلیمہ کے مطابق ہے، تو بہرحال ایک فطری چیز ہے اور اگر اس کے خلاف ہے، تو جنگ سے بچنا بھی ایک جنگ ہے، فطرتِ سقیمہ کے خلاف۔

البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا کی ہر چیز اپنے مقصد اور نتیجے کے لحاظ

جنگ کے دو رُخ اور جہاد فی سبیل اللہ: ہی سے اپنی قدریں بناتی ہے۔ یہی جنگ اگر محض قوم، ملک، نسل کے ترفع و تعلّی کے لیے ہے اور اس کا مقصد محض ملک گیری یا جذبۂ انتقام کی تسکین یا ہوسِ زر و زن کی تکمیل وغیرہ ہے تو یقیناً اس سے زیادہ بدتر کوئی چیز نہیں۔ لیکن اگر اس کا مقصد صرف انسانیت کی سر بلندی، آدمیت کا قیام، اخلاقی قدروں کی حمایت ہو، تو اس سے بڑھ کر کوئی خیر اور کوئی نیکی نہیں ہو سکتی۔ ہمیں بتانا صرف یہی ہے کہ اسلام نے نری جنگ کی حمایت نہیں کی ہے، جس کا کوئی بلند مقصد و نتیجہ نہ ہو اس کے پیشِ نظر جو مقصد تھا اور اس کا جو نتیجہ ظاہر ہوا (جس کا کچھ تفصیلی ذکر آگے آئے گا) اسے دیکھتے ہوئے اسے محض جنگ نہیں کہا جا سکتا، بلکہ یہی ہے وہ شے جسے جہاد فی سبیل اللہ کہتے ہیں۔ جہاد فی سبیل اللہ کا مقصد وہی ہے، جس کا خلاصہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یا یوں کہیے کہ فتنہ و فساد کا سدِ باب۔

اتنے بڑے، بلند اور عالمگیر مقصد کا حصول یوں ہی بیٹھے بیٹھے نہیں ہوتا۔ اس کے لیے وہ سرتوڑ کوشش

حصولِ مقصد کی تیاری: ضروری ہوتی ہے، جس کے لیے شرعی اصطلاح ہے جہاد۔ اس کے لیے ہزاروں قسم کی تیاری کرنی پڑتی ہے۔ ایمان، علم، اخلاق، عملِ صالح، ذہنی ارتقاء، بیدار مغزی، تزکیۂ نفس وغیرہ وغیرہ۔ انہی تیاری کے اجزاء میں ایک ضروری جز ہے اعدادِ قوۃ یعنی مادی طاقت، فوجی تربیت، سامانِ حرب وغیرہ۔ قرآن کریم نے اس تیاری کی طرف اس آیت میں ارشاد فرمایا ہے کہ:

واعدوا لهم ما استطعتم من قوة و من رباط الخیل — اپنے امکان بھر قوت اور پلے ہوئے گھوڑے مہیا کرو، جس

ترھبون به عدو الله و عدوکم۔ کے ذریعے اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن کو خوفزدہ رکھو۔

یہاں آیت میں جس قوت کو جمع رکھنے کا حکم دیا گیا ہے، اس میں تمام طرح کی فوجی قوتیں شامل ہیں۔ ملٹری ٹریننگ، سیاسیاتِ جنگ کا فہم، موقع شناسی، حوصلوں کو بلند رکھنے کے طریقے، فوجی تنظیم، دائم آمادگی اور ان کے علاوہ تمام سامانِ حرب بندوق سے لے کر ایٹم بم تک اور طیارے سے لے کر ٹینک اور آبدوز کشتی تک اور راشن کے تمام سامان وغیرہ، جتنی چیزیں ہیں، سب اس میں داخل ہیں۔ اس طرح پلے ہوئے گھوڑوں میں حمل ونقل (ٹرانسپورٹ) کے وہ تمام ذرائع داخل ہیں، جو فوج کو یا اس کے سامان کو جلد سے جلد منزل مقصود پر پہنچا سکیں۔ اور پھر دیکھیے کہ تمام چیزوں کا یہ مقصد نہیں کہ دنیا میں جو بھی غیر مسلم ہے، اسے فنا کر دو اور مار دھاڑ شروع کر دو۔ قرآن ایسے مقاصد کی کیوں کر حمایت کر سکتا ہے؟ اس نے اس تیاری کا ایک ہی مقصد بتایا ہے: ترھبون به عدو الله و عدوکم اللہ کے اور اپنے دشمن کو مرعوب رکھنا۔

دو طرح کے دشمن: یہاں دو دشمنوں کا ذکر ہے: عدو اللہ اور عدوکم۔ اللہ کا دشمن اور تمہارا دشمن اس سے مراد ہے، دینی دشمن اور قومی دشمن۔ یعنی بعض دشمن ایسے ہوتے ہیں، جن کی عداوت بربنائے دین ہوتی ہے اور وہ محض اس لیے مسلمانوں سے جنگ کرتے ہیں کہ اسلام کو مٹا دیں۔ یہ ہیں دینی دشمن یعنی عدو اللہ۔ اور بعض دشمن ایسے ہوتے ہیں، جو مسلمانوں سے صرف ایک قوم کی حیثیت سے جنگ کرتے ہیں۔ اور اس قوم کو مٹانا چاہتے ہیں، ان کی ہوسِ ملک گیری اور شوقِ سیادت و اقتدار مجبور کرتا ہے کہ اپنی قوم کا حاکمانہ اقتدار دوسری قوم پر قائم کریں، خواہ وہ ہم مذہب ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ ہیں قومی دشمن، جن کو عدوکم کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

آج ان دونوں قسم کی مثال میں ہم انگریز اور ہندو کو پیش کر سکتے ہیں (متحدہ ہندوستان میں) اور ہندو ہم وطن اور ہم نسل بھی تھے اور اس کے پیشِ نظر وہ متحدہ قومیت کا پرچار بھی کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود مسلمان کو ایک اقلیت قرار دینا اور اس پر اپنا حاکمانہ اقتدار کرنے کے جذبے کو فروغ دینا صرف اس لیے تھا کہ انہیں اپنا مذہب ویسا ہی عزیز تھا۔ جیسا کسی اور کو یا مسلمان کو عزیز تھا۔ یہ ساری عداوتیں قومی سے زیادہ دینی و مذہبی بنیاد پر تھیں۔ اگر سارے مسلمانانِ ہند، ہندو دھرم قبول کر لیتے اور انہیں یقین آجاتا کہ یہ تبدیلی مذہب فی الواقع سچی ہے، تو ان کو مسلمانوں سے عداوت رکھنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ یہ تمام شواہد اس بات کا یقین دلانے کے لیے کافی ہیں کہ ان کی دشمنی خالص مذہبی ہی ہے۔

اب دوسری طرف انگریز کو دیکھیے۔ مسلمان کا دشمن وہ بھی ہے، لیکن اس کی دشمنی مذہبی سے زیادہ قومی ہے۔ وہ جس طرح یہاں کے اور باہر کے مسلمانوں پر اپنا اقتدار قائم و دائم رکھنے کا متمنی ہے۔ اسی طرح اپنے ہم مذہب فرانس اور جرمنی پر بھی اپنا تسلط جمائے رکھنے کا خواہش مند رہا ہے اور ان سے جو جنگیں بھی ہوئی ہیں، وہ مذہب کی بنیاد پر نہیں بلکہ قومیت کی بنا پر ہوئی ہیں۔

قرآن مجید ان دونوں قسم کے، مذہبی اور قومی، دشمنوں کو مرعوب رکھنے کے لیے قوت و سامان کی تیاری کو فرض قرار دیتا ہے۔

آزادی کی قدر و قیمت: مرعوب رکھنے کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ ان کو تم پر حملہ آور ہونے کی جرأت نہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ قومی و مذہبی دونوں حیثیتوں سے اپنے تحفظ کو قرآن ضروری قرار دیتا ہے۔ یہ تحفظ صرف اس لیے ہے کہ مسلمان پر کسی دوسری قوم کا کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ اقتدار بھی نہ قائم رہے اور یہ بالکل آزاد ہو۔ دشمن خواہ مذہبی نقطۂ نگاہ رکھتا ہو یا قومی، دونوں یکساں مصیبت ہیں اور ان کے اقتدار کے بعد وہ مقصد ہی فوت ہو جائے گا، جس کے لیے امتِ مسلمہ وجود

میں آئی ہے۔ محکومیت خواہ کیسی ہی خوشگوار، کتنی ہی آسائش بخش اور عدل گستر فضا میں ہو، لیکن ہے وہ ایسی لعنت جس کے آنے کے بعد محکوم قوم میں نہ ایمان و ضمیر باقی رہ سکتا ہے نہ کردار۔ غلط نہ ہوگا، اگر یہ کہا جائے کہ غلامی اور ایمان و کردار میں کچھ ایسا تباین و تناقض ہے کہ یہ دونوں چیزیں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ غلامی، فطرت اور کردار کو مسخ کر دیتی اور آزادی اقوام و افراد میں بلند کرداری پیدا کرتی ہے۔ آزاد قوموں کا ہی کردار ان کے ایمان کی پختگی اور ضمیر کی بیداری کا ضامن ہوتا ہے۔

اعداد قوت کی غرض: غرض مسلمان اگر بدقسمتی سے کہیں محکوم ہے، تو ہر عبادت اور ہر نیکی سے مقدم یہ فرض ہے کہ وُہ آزاد ہونے کی جدوجہد، سر توڑ کوشش یعنی جہاد، مسلسل کرتا رہے۔ اگر ایک منٹ کے لیے اس غلامی پر رضامندی کا جذبہ پیدا ہو، تو سمجھ لینا چاہیئے کہ ایمان کے رخصت ہونے کے لیے دریچہ کھل گیا اور اگر مسلمان آزاد ہے، خواہ وُہ ہجرت کر کے بنی اسرائیل کی طرح آزاد ہوا ہو، یا الگ اپنی حکومت بنائی ہو۔ تو ہر فرض سے زیادہ مقدم فرض یہ ہے کہ اس پر کوئی دوسرا تسلط ہونے کا تصور بھی نہ پیدا ہونے دے۔ یہی ہے، تحفظِ خود اختیاری اور اسی مقصد کے لیے ہے اعداد قوت۔ تا آنکہ دشمن خواہ دینی ہو، یا قومی، آنکھ اٹھا کر بھی اس طرف نہ دیکھ سکے۔

بقائے وجود مقدم ہے: دین، اسلام، تبلیغ اور چنان و چنیں تمام باتیں اس پر موقوف ہیں کہ ہمارا وجود باقی رہے۔ اگر وجود ہی باقی نہ رہے، تو یہ تبلیغی اسکیمیں اور یہ اسلام اور خدا و رسولؐ کی باتیں کہاں ہوں گی اور کون کرے گا؟ وجود، در بقا اتنی ہی ضروری چیز ہے کہ بعض اوقات اس کی خاطر ابدی حرام بھی عارضی طور پر حلال ہو جاتے ہیں۔ خنزیر ایک ابدی حرام شے ہے اور یہ ایک مستقل قانون ہے لیکن حالتِ اضطرار میں یہ بھی حلال ہو جاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اگر دین پر اپنی جان قربان کرنے کا فیصلہ کرے تو دین اس کی جان بچانے کے لیے اپنے ابدی قانون کی ابدیت کو قربان کر دیتا ہے۔ اس کی خاص وجہ ہے یعنی دین کا پورا نظام ہی انسانی زندگی کی بقا اور خوشگواری کے لیے، نہ کہ اسے فنا کرنے کے لیے جہاد کا اصل مقصد بھی یہی ہے۔ کہ کچھ عارضی قربانیاں دے کر مستقل بقاء و خوشگواری پیدا کی جائے۔ اگر کوئی انسان زندگی بچا کر دین کی سو خدمتیں کرنے کا یقین رکھتا ہے اور اس کی جان خنزیر ہی کھا کر بچ سکتی ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ خنزیر نہ کھا کر ایک تقوے کا ثبوت دے اور سو تقوے سے محروم رہ جائے۔ اسی طرح یہ سمجھنا چاہیئے کہ دین کی ساری خدمتیں اس پر موقوف ہیں کہ ہمارا وجود باقی رہے اور اس پر کسی غیر کا تسلط نہ قائم ہو۔ اس بقاء کے لیے ہر چیز قربان کی جا سکتی ہے اور اسی مقصد کے لیے اعدادِ قوۃ کا حکم ہے۔ یہ خود اتنی بڑی عبادت ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کا درجہ واشگاف لفظوں میں یوں بیان فرمادیا ہے کہ:

عینان لا تمسھما النار عین بکت من خشیتہ اللہ وعین باتت تحرس فی سبیل اللہ۔

دو آنکھیں ہیں، جن کو آگ نہیں چھوئے گی: ایک وُہ آنکھ جو خوفِ خدا سے روئے اور دوسری وُہ جو راہِ خدا میں پہرہ دے۔ (ترمذی)

ذرا غور کیجیے، سرحدوں پر شب کو دشمن کی نقل و حرکت کی نگرانی کرنے والا اور تہجد میں گریہ وزاری کرنے والا دونوں کا درجہ ایک ہی ہے۔ بلکہ دشمن کے نرغے مسلسل ہوں، تو تہجد ہی نہیں فرض نمازوں کی موجودہ شکل بھی معاف ہو جاتی ہے: فرجالاً او رکباناً

پیدل ہو، یا سواری پر جس حال میں ہو، اسی طرح نماز ادا کرلو۔ بلکہ اس سے بھی آگے چلیے۔ یہ بھی اس وقت معاف ہو جاتے گی۔ غزوۂ خندق میں چار نمازیں مسلسل قضا ہو گئیں، جن کو بعد میں ایک اذان اور چار اقامتوں سے اکٹھا ہی ادا کیا گیا۔ اس جواز قضا کی وجہ صرف ایک ہی ہو سکتی ہے، یعنی دشمن کے غلبے کا خطرہ۔ اگر آزاد وجود باقی رہ گیا تو نمازیں ہزاروں ادا ہو جائیں گی۔ لیکن اگر دشمن کا تسلط ہو گیا، تو ایک نماز بھی نہ ہو سکے گی۔ جو قتل کیا جائے گا۔ اس کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔ جو زندہ رہے گا، اس کی نماز بھی بے جان، بے وزن اور بے اثر رسم ہو کر رہ جائے گی اور آخر کار بقول اقبال:

ملّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

اس وقت دین اور عبادت کا تصور ہی بدل جائے گا اور اس کے بعد یہ نوبت آئے گی کہ نہ فقط یہ کہ جذبۂ جہاد ختم ہو غلامی کو گہوارۂ راحت سمجھ لیا جائے گا بلکہ وہ مجددین و مفتین بھی پیدا ہو جائیں گے۔ جو حکومت کافرہ کی اطاعت کو عین عبادت اور جہاد کو قطعاً حرام بتانے لگیں گے اور امتِ مسلمہ کے وجود میں آنے کا مقصد یکسر فوت ہو جائے گا۔

اعدادِ قوت کا مقصد: یہی وجہ ہے اعداد قوت کا حکم دینے کی، جس کی غرض یہ بتائی گئی ہے کہ تمہارا دینی و قومی دشمن تمہاری طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی بھی جرأت نہ کر سکے۔ غلام قوم کا کوئی ضمیر اور کوئی کردار نہیں ہوتا، اس لیے اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے ہر چیز کی بازی لگا دینا فرض ہے، جو قوم خود اپنی حریت کو قائم نہ رکھ سکے، وہ دوسری مظلوم و غلام قوموں کو ظالموں کی غلامی سے باہر لانے کا فرض کیا انجام دے سکتی ہے؟ امتِ مسلمہ کا تو وجود ہی اس مقصد کے لیے ہوا ہے کہ تمام انسانوں کو باہمی انسانی غلامی سے نکال کر ایک اللہ کی غلامی میں لے آئے پس گروہ خود ہی اپنے آپ کو دوسروں کی غلامی سے محفوظ نہ رکھ سکے تو وہ دوسرے غلام انسانوں کو قیدِ غلامی سے کیا باہر لا سکے گی۔

یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اعدادِ قوت غلط استعمال کے لیے نہیں، بلکہ اس لیے ہے کہ پہلے تو اپنی حفاظت کی جا سکے کیوں کہ اس کے بغیر کوئی قوم بھی آزاد ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ پھر اپنے مقاصد میں نمو اور توسیع پیدا کر سکے۔ یہ کوئی انسانیت نہیں کہ ایک قوم خود تو آزاد ہو اور دوسری قوموں کو غلامی میں دیکھتی رہے۔ اس مقصدِ عظیم کے لیے اپنے اندر حفاظتِ خود اختیاری کی قوت سے کہیں زیادہ مزید قوت پیدا کرنی پڑے گی اور اعداد قوت کا بڑا مقصد اسی طرح پورا ہو سکے گا۔

دنیا میں ہمیشہ یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ معقولیت کو صرف معقولیت کی وجہ سے تسلیم کرنے والے آٹے میں نمک کے برابر ہوتے ہیں۔ اعلیٰ سے اعلیٰ بات، بہتر سے بہتر انسان کہے، اس کی طرف توجہ بھی نہیں دی جاتی۔ لیکن اگر وہی شخص کوئی اقتدار یا قوت حاصل کرے، تو اس کی بات توجہ سے سنی جاتی ہے اس نقطہ نظر سے بھی اعدادِ قوت ایک ضروری فریضہ ہے۔

اعدادِ قوت کے شعبے: اوپر یہ لکھا جا چکا ہے کہ اعداد قوت میں بہت سی چیزیں داخل ہیں۔ ہم چند ایک کو ذرا تفصیل سے لکھتے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اپنے تحفظ کے لیے ایک حکومت کو آج کے دور میں کیا کیا کرنا پڑتا ہے:

۱۔ پروپیگنڈا اس میں اخبار، رسالے، خفیہ مراسلات، ریڈیو، تار برقی، ڈاک وغیرہ سب داخل ہیں اور وہ لوگ بھی جو مختلف طریقوں سے یہ فرض انجام دیتے ہیں۔

۲۔ جاسوسی اس میں وہ لوگ داخل ہیں، جو اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھ کر دوسرے ملکوں میں جاتے ہیں وہاں کی خبریں اپنے ملک میں پہنچاتے ہیں اور موقع موقع سے وہاں اپنا پروپیگنڈا بھی کرتے ہیں اور تالیف قلوب کے لیے رقمیں بھی صرف کرتے ہیں۔ اسی زمرے میں وُہ لوگ بھی شامل ہیں، جو اپنے ملک میں باغیوں اور دوسرے ممالک کے جاسوسوں کی نگرانی کرتے رہتے ہیں

۳۔ ذرائع حمل ونقل اس میں ہوائی، بحری اور بری تمام قسم کے جاندار اور مشینی سواریاں داخل ہیں جو عین وقت پر ہر وہ سامان پہنچا سکیں جس کی ضرورت پیش آئے۔

۴۔ آلات حرب و ضرب اس میں وہ تمام کارخانے داخل ہیں، جن میں بندوق، توپ، ٹینک، آبدوز کشتی، بحری تباہ کن جہاز، بارودی سرنگیں، بمبار طیارے اور بم کی تمام اقسام اور ان کے اجزا تیار ہوں۔

۵۔ طبی امداد اس میں دواؤں اور مرہم پٹی کے تمام سامان داخل ہیں۔

۶۔ سامان خورد و نوش اس میں امن و جنگ کے مختلف دور کے سامان داخل ہیں۔ مثلاً عام غذائیں اور حالات جنگ کے مطابق غذائیں اور آب رسانی کا سامان۔

۷۔ لباس اس میں فوجی لباس کے علاوہ وُہ زرہیں اور دیگر لباس وغیرہ بھی داخل ہیں، جن کے ذریعے گولیوں اور گیسوں سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔

۸۔ حوصلے (Morale) حوصلے کو بلند رکھنے اور غیرت کو ٹھیس لگانے کے ذرائع مثلاً خطباء، شعراء، اعلان انعامات، اہل وعیال کی میدان جنگ میں موجودگی وغیرہ۔ ان میں دو چیزیں اور بھی ملا لیجیے:

وُہ انسان، جو یہ کام کریں گے اور وہ مقام جہاں انہیں ان کاموں کی تربیت دی جائے گی۔ یوں سمجھیے کہ: پروپیگنڈے کے لیے اخبار اور رسالے کی ضرورت ہے، تو یہ خود بخود نہیں شائع ہوں گے بلکہ ان کے لیے خاص ڈھب کے آدمی (ایڈیٹرز) تیار کرنے ہوں گے، جو اپنے دل و دماغ اور فکر و نظر کو قلم کی نوک پر لائیں۔ اس کے لیے انہیں خاص مدارس میں تعلیم حاصل کرنی ہوگی۔ لہٰذا ایسی تعلیم گاہیں بھی اسی اعداد قوت کے زمرے میں شامل ہوں گی۔ پھر اس کی طباعت و اشاعت کے لیے کاغذ اور پریس وغیرہ لازمی ہیں۔ پس کاغذ کے کارخانے اور پریس کے پُرزے اور نیز ان کو برتنے والے اور اس کی تعلیم دینے والے آدمی بھی اعداد قوت میں داخل ہوں گے۔ اسی طرح خفیہ مراسلات، ریڈیو، تاربرقی، ڈاک وغیرہ کو بھی سمجھیے۔ ان سب کے لیے آدمی درکار ہیں۔ جو اپنی اپنی فنی تعلیم حاصل کر کے یہ خدمت انجام دے سکیں۔

یوں ہی باقی چیزوں کو بھی سمجھنا چاہیئے۔ جاسوسی کرنے والے بھی آدمی ہی ہوں گے۔ جن کو اس فن کی پختہ تعلیم دینی ہوگی۔ ذرائع حمل و نقل کو استعمال کرنے والے بھی انسان ہی ہوں گے۔ جو بغیر فنی تربیت کے صحیح کام ہی نہیں کر سکتے۔ آلات حرب و ضرب میں نہ فقط ان کے تیار کرنے والے بلکہ ان کو استعمال کرنیوالے انسانوں کی ضرورت ہوگی، ورنہ اگر ہتھیار کو چلانے والے ہی موجود نہ ہوں تو سارے ہتھیار بیکار ہوں گے، اسی طرح طبی امداد، سامانِ خوراک و پوشاک وغیرہ مہیا کرنے والوں کو بھی سمجھ لیجیے۔ ان سب کے

لیے مناسب انسانوں کی ضرورت ہو گی اور پھر ایسے معلموں اور تعلیم گاہوں کی بھی، جو مناسب انسان پیدا کریں اور ان سب سے بڑھ کر وہ مجاہدین (ملٹری مین) اور ان کی ٹریننگ جن کے ایک ایک قدم پر فتح و شکست کا دارو مدار ہے۔

اخذِ حذر: دوسری چیز یہ ہے کہ دشمن کے پاس بھی یہی تمام چیزیں ہوں گی اور وہ ان سب سے حملہ کرے گا۔ اس کے بچاؤ کے لیے بھی ہمیں اندرون ملک بہت کچھ سامان کرنا پڑے گا، مثلاً زمین دوز قلعے، مقناطیسی غبارے، آگ بجھانے کے سامان، ہراس کو دور کرنے کے مختلف ذرائع، حوصلوں کو بلند رکھنے کے طریقے، ضروریاتِ زندگی کی تباہی کے بعد فی الفور ان کا انتظام، فرسٹ ایڈ وغیرہ۔ غرض بیسیوں چیزیں ہیں، جن کا مقصد رهاب عدو (دشمن کو مرعوب رکھنا) نہیں بلکہ خود اپنا بچاؤ ہے۔ جسے قرآنی اصطلاح میں "اخذِ حذر" کہتے ہیں۔

ہم نے اعداد قوت کے تمام جزئیات کا احاطہ بالکل نہیں کیا ہے۔ چند چیزیں وضاحت کے لیے پیش کی ہیں، ورنہ فروع در فروع اتنی جزئیات ہیں، جن کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہے۔

مالی جہاد: اب سوچیے کیا یہ تمام کام جو اخذِ حذر اور اعدادِ قوۃ سے تعلق رکھتے ہیں، یوں ہی مفت میں ہو جائیں گے۔ کیا ان کے لیے لاانتہا مال کی ضرورت نہ ہو گی؟ یقیناً ہو گی اور ہمارے اندازوں سے بھی زیادہ ہو گی۔ آپ اس کا کچھ اندازہ اس سے کر سکتے ہیں کہ ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۴ء کی جنگِ عظیم میں ساڑھے انیس کروڑ روپے صرف ہوتے رہے۔ سالانہ؟ نہیں۔ ماہانہ؟ جی نہیں۔ ہفتہ وار؟ جی نہیں۔ پھر؟ روزانہ۔ کیا یہ ساری محارب حکومتوں کا مجموعی خرچ ہے؟ توبہ کیجیے۔ تو کیا صرف اتحادیوں کا؟ نہیں حضرت پھر؟ صرف برطانیہ کا۔ آپ نے غور فرمایا، ہر روز ساڑھے انیس کروڑ روپے جنگِ عالمگیر میں صرف کرتا رہا۔ اس سے اندازہ فرما لیجیے کہ موجودہ دور میں جنگی اخراجات کیا ہوا کرتے ہیں۔ اور اعداد قوۃ اور اخذ حذر کے لیے روپے کی کتنی شدید ضرورت ہے بس یہی ہے جہاد بالمال اور انفاق فی سبیل اللہ کا سب سے بڑا اہم شعبہ۔

جانی جہاد کا مطلب: بلکہ اعداد قوۃ اور اخذِ حذر کے جتنے شعبے مختصراً اوپر بیان ہوئے ہیں، یہ فقط جہاد بالمال ہی میں داخل نہیں جہاد بالنفس میں بھی ان کا شمار ہے۔ کیوں کہ جہاد بالنفس کے معنی صرف جان دے دینا قطعاً نہیں جان دے دینا تو ایک آخری مرحلہ ہے۔ اس سے پہلے کا مرحلہ ہے:

"جان کو جوکھوں میں ڈالنا"، اوپر کی بیان کردہ تمام تصریحات، جن کا تعلق اعداد قوۃ اور اخذ حذر سے ہے، جہاد بالنفس ہی ہیں۔ آلاتِ حرب بنانے اور ایجاد کرنے کے لیے سائنٹسٹ کا مغز کھپانا، اسے تیار کرنے کے لیے مزدوروں کا مشقت برداشت کرنا۔ پروپیگنڈے کے لیے مصنف کا دماغ ریزی کرنا، رات بھر پہرہ دینا، حتیٰ کہ فوجیوں کے لیے کھانا کپڑا تیار کرنا اور پہنچانا وغیرہ، یہ ساری خدمتیں جان کو جوکھوں میں ڈالنا ہے۔ یہ جان دینا تو نہیں مگر اس سے پہلے کا مرحلہ ہے اور یہ بھی عین جہاد بالنفس ہے۔

بہرحال یہ جان جوکھوں میں ڈالنے والے تمام مراحل بھی ایسے ہیں، جو انفاق مال کے بغیر طے نہیں کیے جا سکتے اور اس کے بغیر جہاد بالنفس کی ابتدائی اور آخری منزلوں کا حصول بھی ناممکن ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جگہ جہاد بالمال کو جہاد بالنفس پر مقدم رکھا گیا ہے۔ ترتیب ایثار بھی اسی کی متقاضی ہے۔

جہاد سے پہلوتہی : اگر جہاد بالمال اور جہاد بالنفس سے ذرا بھی پہلوتہی کی جائے۔ کوئی روحانی ریاضت اس خلا کو پُر نہ کر سکے گی۔ بلکہ تاریخ اسلام یہ بتاتی ہے کہ روحانی قوت بھی مادی قوت کی کمی سے کم ہو جاتی ہے۔ بغیر قوت کے سارا دین صرف یاتریوں اور سادھوؤں کا ایک بے جان دھرم رہ جاتا ہے۔ خوب کہا ہے علامہ اقبال نے،

در کمر تیغ دو رُو قرآں بہ دست   تن بدن، ہوش و حواس اللہ مست

این دو قوت حافظ یک دیگر اند   کائناتِ زندگی را محور اند

بولنے کو جس کا جی چاہے بولے، کسی کی زبان نہیں پکڑی جا سکتی۔ لیکن جہاد میں کوتاہی محض اس لیے کہ کچھ لوگ (مثلاً: یورپین مصنفین) اسلام کو بربریت قرار دیں گے۔ اتنی بڑی غفلت ہو گی جس سے بڑی اور کوئی غفلت نہیں ہو سکتی۔ پوری انسانی تاریخ میں اب تک کوئی دور ایسا نہیں آیا ہے، جہاں کوئی نظام، قوت کے بغیر قائم رہ سکا ہو۔ ابھی تک انسان اس بلند مقام پر نہیں پہنچا ہے، جہاں اس کی ضرورت باقی نہ رہے۔ اس مقام تک پہنچنے سے قبل اعداد قوت ایسی ہی ضروری ہے، جیسا بچے کی ابتدائی زندگی میں دودھ۔ یقیناً انسان ساری عمر دودھ نہیں پیتا۔ اس کی زندگی عام غذاؤں کے سہارے چلتی ہے۔ لیکن تاآنکہ اس کا معدہ ثقیل غذائیں ہضم کرنے کی صلاحیت پیدا کرے۔ اس کی بقا کے لیے دودھ ضروری ہے۔ اسی طرح انسانیت کی اونچی منزل، جہاں ہر معقول بات رضاکارانہ خوشدلی سے ہو، تک پہنچنے سے پہلے معقولیت کو قائم رکھنے کے لیے اعدادِ قوت سے مفر نہیں۔

اگلوں کے نمونے : آپ پچھلی تاریخ انسانیت پر نظر ڈالیے۔ کیا کوئی دور ایسا رہا ہے، جب جہاد کی ضرورت محسوس نہ کی گئی ہو؟ صرف محسوس ہی نہیں کی گئی بلکہ اس میں حصّہ لینا پڑا ہے۔ انبیاء اور صالحین نے بھی اس میں حصّہ لیا اور جو کسی دین پر یقین نہیں رکھتے، ان کو بھی اس کے سوا چارہ نہ رہا۔ آیئے چند نمونے اس کے دیکھ لیجیے:

بائبل : سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوتا ہے کہ:

جب تو کسی شہر سے جنگ کرنے کو اس کے نزدیک پہنچے، تو پہلے اسے صلح کا پیغام دینا ● اور اگر وہ تجھ کو صلح کا جواب دے دے اور اپنے پھاٹک اپنے لیے کھول دے، تو وہاں کے سب باشندے تیرے باجگذار بن کر تیری خدمت کریں ● اور اگر وہ تجھ سے صلح نہ کرے بلکہ تجھ سے لڑنا چاہے تو اس کا محاصرہ کرنا ● اور جب خداوند تیرا خدا اُسے تیرے قبضے میں کر دے، تو وہاں کے ہر مرد کو تلوار سے قتل کر ڈالنا ● لیکن عورتوں اور بال بچوں اور چوپایوں اور اس شہر کے سب مال اور لوٹ کو اپنے لیے رکھ لینا اور تو اپنے دشمنوں کی اس لوٹ کو جو خداوند تیرے خدا نے تجھ کو دی، کھانا ● ان سب شہروں کا یہی حال کرنا، جو تجھ سے بہت دور ہیں اور ان قوموں کے شہر نہیں ہیں ● پر ان قوموں کے شہروں میں، جن کو خداوند تیرا خدا میراث کے طور پر تجھ کو دیتا ہے، کسی ذی نفس کو جیتا نہ بچا رکھنا بلکہ تو ان کو یعنی حتی اور اموری اور کنعانی اور فرزی اور حوی اور یبوسی قوموں کو جیسا خداوند تیرے خدا نے تجھ کو حکم دیا ہے، بالکل نیست کر دینا[۱]

۱؎ استثنا ۲۰ : ۱۰ تا ۱۷)

کچھ اور بھی ملاحظہ ہو:

• اور جیسا کہ خداوند نے موسٰے کو حکم دیا تھا، اس کے مطابق انہوں نے مدیانیوں سے جنگ کی اور سب مردوں کو قتل کیا • اور بنی اسرائیل نے مدیان کی عورتوں اور ان کے بچوں کو اسیر کیا اور ان کے چوپائے اور بھیڑ بکریاں اور مال و اسباب سب کچھ لوٹ لیا • اور ان کی سکونت گاہوں کے سب شہروں کو جن میں وہ رہتے تھے اور ان سب چھاؤنیوں کو آگ سے پھونک دیا • اور انہوں نے سارا مال غنیمت اور سب اسیر کیا انسان اور کیا حیوان ساتھ لیے • (موسٰے سرداروں پر جھلا کر) ان سے کہنے لگا۔ کیا تم نے سب عورتیں جیتی بچا رکھی ہیں؟ • اس لیے ان بچوں میں جتنے لڑکے ہیں، سب کو مار ڈالو اور جتنی عورتیں مرد کا منہ دیکھ چکی ہیں، ان کو قتل کر ڈالو • لیکن ان لڑکیوں کو، جو مرد سے واقف نہیں اور اچھوتی ہیں، اپنے لیے زندہ رکھو • اور جو کچھ مال غنیمت جنگی مردوں کے ہاتھ آیا ہے، اسے چھوڑ کر لوٹ کے مال میں چھ لاکھ پچھتر ہزار بھیڑ بکریاں تھیں • اور بہتر ہزار گائے بیل • اور اکسٹھ ہزار گدھے • اور نفوس انسانی میں سے بتیس ہزار ایسی عورتیں جو مرد سے ناواقف اور اچھوتی تھیں۔

(گنتی ۳۱ تا ۳۵ ملتقطاً)

وید: اب ذرا ویدوں کو بھی دیکھیے:

وہ اندرا جس . . . نے ورترا کو قتل کیا اور جس نے قصبے کے قصبے اور گاؤں کے گاؤں تہ و بالا کر دیئے، وہ جو کالے داسوں (غلاموں) کی نوجوں کو قتل کرتا ہو۔ "(قدیم ہندوستان کی تہذیب" مصنفہ مسٹر آر سی دت۔ ترجمہ اردو ص ۳۷ بحوالہ رگ وید، منڈل ۱، منتر ۱۰۹، رچا ۸)

اور ملاحظہ ہو:

ہم نے داسوں کو دو ٹکڑوں میں کاٹ ڈالا۔ قضا و قدر نے ان کو اسی واسطے پیدا کیا تھا۔

(ایضاً ص ۳۸، ۲، منتر ۲۰، رچا ۶، ۷)

تخمینہ بھی ملاحظہ ہو:

اس نے پچاس ہزار سیاہ فام دشمنوں کو لڑائی میں تباہ و غارت کیا۔

(ایضاً ص ۴۲ بحوالہ ایضاً ۴، منتر ۱۶، رچا ۱۰)

ہم نے صرف نظیر و مثال کے طور پر یہ مختصر حوالے دیئے ہیں۔ ورنہ بائبل میں اور ویدوں میں جتنے حوالے ہیں، ان کو نقل کرنے کیلئے ایک الگ تصنیف کی ضرورت ہے۔ سوچنے کی بات صرف یہ ہے کہ کسی مذہب کو ماننے والوں کے لیے اسلام کے متعلق یہ کہنے کا موقع ہے کہ:

بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے

لامذہبوں کے اعداد و شمار: ایک نظیر ان کی بھی سن لیجیے، جو مذہب وغیرہ کے قائل نہیں، یا برائے نام قائل ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں، جو گذشتہ دو لوں جنگوں میں باہم جنگ کرکے انسانی خون بہاتے رہے۔ پہلی

جنگ عظیم کے مقتولین کے اعداد و شمار ملاحظہ فرمائیے یہ جنگ چار سال جاری رہی اور نتیجے میں یہ اعداد و شمار مقتولین کے شائع ہوئے:

روس	: ۱۷ لاکھ	ٹرکی	: ۲ لاکھ پچاس ہزار
جرمنی	: ۱۶ لاکھ	بلجیم	: ۱ لاکھ دو ہزار
فرانس	: ۱۳ لاکھ ستر ہزار	بلغاریہ	: ۱ لاکھ
اٹلی	: ۴ لاکھ ساٹھ ہزار	رومانیہ	: ۱ لاکھ
آسٹریا	: ۸ لاکھ	سرویا و مانٹینگرو	: ۱ لاکھ
برطانیہ	: ۷ لاکھ	امریکہ	: پچاس ہزار

میزان : ۷۳ لاکھ ۳۸ ہزار

دوسری جنگ عظیم کے مقتولین کے اعداد و شمار بھی ملاحظہ ہوں:

روس	: دو کروڑ دس لاکھ	امریکہ	: دس لاکھ ستّر ہزار
جرمنی	: ساٹھ لاکھ سے سوا کروڑ تک	برٹش امپائر	: چودہ لاکھ تیس ہزار
پولینڈ	: نو لاکھ	فرانس	: دس لاکھ
چین	: تیس لاکھ	اٹلی	: گیارہ لاکھ
جاپان	: ستائیس لاکھ سے پچاس لاکھ تک	یوگوسلاویہ	: سولہ لاکھ پچاسی ہزار
آسٹریا	: سات لاکھ	ہنگری	: چھ لاکھ
رومانیہ	: سات لاکھ	ہالینڈ	: دو لاکھ چھیتّر ہزار
فن لینڈ	: ایک لاکھ نواسی ہزار ایک سو چھیاسٹھ	بلجیم	: ساٹھ ہزار
چیکوسلاویکیہ	: ساٹھ ہزار	فلپائن	: تیس ہزار
سلاویکیہ	: تیس لاکھ پچاس ہزار		

نوٹ:- ان اعداد و شمار میں قیدی و زخمی سپاہیوں کا شمار داخل نہیں۔ کل تعداد قریباً چار کروڑ ہوتی ہے اور ان اعداد و شمار کی اشاعت کے بعد بھی بعض جگہ جنگ جاری تھی (کوثر ۵ ہم ۹)

غور طلب بات صرف یہ ہے کہ خود سب کچھ کرتے ہوئے اسلامی جہاد کو نہایت بھیانک اور غلط شکل دے کر پیش کرنے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ کہ ہم اگر یہی کام کریں، تو عین تہذیب ہے اور تم کرو تو بربریت ہے؟ دونوں میں فرق کیا ہے، جو اسلامی جہاد کو بربریت اور معترضین کی ہنر آزمائیوں کو تہذیب قرار دیا جائے؟ ہاں فرق ہے اور بہت بڑا فرق ہے۔ کچھ تفصیلات اس کی بھی سن لیجیے:

اسلامی وغیر اسلامی جنگوں کا فرق:

۱۔ جہاد اسلامی ایک بلند ترین نصب العین کے لیے ہے اور دوسری جنگوں کا کوئی بلند مقصد نہیں صرف ملک گیری ہے۔ اپنی قومی برتری کا قیام ہے اور مفتوحہ علاقوں کو اپنا غلام بنانا ہے۔

۲۔ اسلامی جہاد کا نتیجہ عدل و انصاف، فراخ دلی و رواداری، متوازن تہذیب و تمدن کی شکل میں ظاہر ہوا ہے اور غیر اسلامی جنگوں کا کوئی خوشگوار نتیجہ بجز تباہی و بربادی کے نہیں ظاہر ہو سکا۔

۳۔ اسلامی جہاد کے تمام قوانین احترام آدمیت، استیصال شر و فساد، ترک تعدی و انتقام اور احتیاط تقویٰ پر مبنی ہیں اور دوسری جنگوں میں بوڑھے، بچے، عورتیں، بیمار، گوشہ گیر وغیرہ کسی کا لحاظ [illegible] اور غلبہ و استیلا کے بعد انتقام کی آگ اور مشتعل ہو جاتی ہے۔

اسلامی آداب جنگ:

یہ آخری شق ایسی، کہ تفصیل پیش کیے بغیر اس کا یقین مشکل ہے۔ اسلامی قوانین جہاد کے چند نمونے ملاحظہ کیجیے:

۱۔ وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم به۔ — تم دشمنوں کے ساتھ اتنا ہی کر سکتے ہو، جتنا تمہارے ساتھ کیا گیا ہے۔

۲۔ ولئن صبرتم لهو خير للصّٰبرين۔ — اور اگر صبر و درگزر سے کام لو اور تمہارے لیے اور بھی بہتر ہے۔

۳۔ لا يجرمنكم شنان قوم على الا تعدلوا۔ اعدلوا۔ هو اقرب للتقوى۔ — کسی قوم کی دشمنی تمہیں عدل سے باہر نہ لے جائے۔ عدل کرنا ہوگا۔ کیونکہ یہی تقوے سے قریب تر ہے۔

۴۔ ان الله لا يحب المعتدين — حد سے متجاوز ہونے والوں کو اللہ پسند نہیں فرماتا۔

کچھ فرامین نبوی بھی سن لیجیے:

۵۔ اللہ کا نام لے کر اللہ ہی کی راہ میں اللہ کے نافرمانوں سے جہاد کرو

۶۔ بدعہدی اور خیانت نہ کرو۔

۷۔ لاشوں کو مثلہ نہ کرو۔

۸۔ راہبوں اور گوشہ نشینوں کو نہ چھیڑو۔

۹۔ کھجوریا اور کوئی پھلدار درخت نہ کاٹو۔

۱۰۔ عمارت کو نہ گراؤ۔

۱۱۔ عورتوں، بچوں، بوڑھوں، مریضوں اور غیر محارب آدمیوں کو نہ چھیڑا جائے۔

فتح مکہ کے وقت کی ہدایات بھی سن لیجیے:

۱۔ حرم میں خونریزی نہ ہو،

۲۔ صرف اسی کا مقابلہ کیا جائے، جو سامنے آکر مقابلہ کرے،

۳۔ جو شخص کعبہ میں داخل ہوا سے پناہ۔

۴۔ جو شخص ابوسفیان کے گھر داخل ہو، اسے پناہ،
۵۔ جو شخص اپنے گھر کا دروازہ بند کرے، اسے پناہ،
۶۔ بھاگنے والے کا تعاقب نہ کیا جائے۔
۷۔ ہتھیار پھینک دینے والے کا تعاقب نہ ہو،
۸۔ زخمی اور اسیر نہ قتل کیے جائیں۔

یہ ہیں مختصر نمونے ان قوانین کے، جن کا ہر مجاہد کو جہاد کے موقع پر پیش نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ بین الاقوامی اور عالمگیر جنگوں میں جتنا بھی ان باتوں کا لحاظ اور خیال رکھا گیا ہے، وہ آپ ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔

دونوں کا فرق: نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسلامی جہاد تو انسانیت کے لیے رحمت ہے اور بربریت و درندگی در اصل اُن کی جنگیں ہیں۔ جو اسلامی جہاد کو بربریت قرار دیتے ہیں۔ اس حقیقت سے ہمارے معترضین بے خبر نہیں لیکن ان کی بربریت چھپ ہی سکتی ہے۔ اس صورت میں کہ وہ اسلامی جہاد کو بربریت و وحشت ثابت کرنے کی کوشش اور پروپیگنڈا کرتے رہیں۔ غرض ان تمام پروپیگنڈوں کا مقصد صرف یہ ہے کہ اولاً تو مسلمان اس اہم فریضۂ زندگی سے کنارہ کش ہو جائیں اور ثانیاً خود معترضین کی جنگی درندگیوں پر پردہ پڑا رہے۔

لیکن کیا اب پاکستان بننے کے بعد اور آزادی کی نعمت حاصل ہونے کے بعد بھی ہمیں اسی غلط فہمی اور فریبِ فرنگ میں مبتلا رہنا چاہیے؟

وہ فریب خوردہ شاہیں، جو پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی

غزواتِ نبویؐ

محمّد طاہر فاروقی

عہدِ رسالت میں جو لڑائیاں پیش آئیں ان کے بیان میں ہمارے مورخین نے بڑی بے احتیاطی کی ہے، جس کی وجہ سے مخالفوں کو بات کا بتنگڑ بنانے کا موقع مل جاتا ہے اور ناواقف لوگ ان کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جتنے معرکے پیش آئے وہ دو قسم کے ہیں۔ جس معرکے میں آپؐ نے بہ نفسِ نفیس شرکت فرمائی وہ غزوہ ہے، اور جس میں آپؐ خود شریک نہ تھے وہ سریّہ کہلاتا ہے۔ مگر ان الفاظ کے استعمال میں بھی ہمارے قدما نے احتیاط نہیں کی۔ اکثر جماعتیں جو لڑنے کے علاوہ کسی دوسرے کام کے لیے بھیجی گئیں، ان کو بھی مورخین نے سریات کے ذیل میں شمار کر لیا۔ جس سے اس عہد مبارک کی لڑائیوں کی تعداد زیادہ نظر آنے لگی حالانکہ دراصل لڑائیوں کی تعداد بہت کم ہے۔

سریّہ میں ایسی جماعتیں بھی شامل کر لی گئیں جو صرف دو تین افراد پر مشتمل تھیں۔ یا ان کے بھیجنے کے مقاصد ہی کچھ اور تھے۔ مثلاً:

۱۔ دشمن کے ارادوں کا حال معلوم کرنا اور جاسوسی کرنا۔

۲۔ صلح کرنے اور امن قایم کرنے کے لیے جانا۔

۳۔ تبلیغِ اسلام کے واسطے جانا

۴۔ حملہ آوروں سے مدینہ منورہ کو بچانے کی غرض سے آگے بڑھ جانا۔ ان میں سے اکثر سریّے بغیر چھیڑ چھاڑ اور چپقلش کے واپس آ گئے۔

۵۔ سفارت لے کر دوسرے قبائل کی طرف جانا۔

۶۔ قریش کے قافلوں کی شام کی آمد و رفت میں روک ٹوک کرنا۔

اسلام کو آئے چودہ سال سے زیادہ ہو گئے تھے۔ مکہ میں مسلمانوں پر جو غیر انسانی اور ہیبت ناک مظالم کیے گئے، اور خود آنحضرت صلعم کے ساتھ جیسی گستاخیاں روا رکھی گئیں، ان کا حال سب کو معلوم ہے۔ اسی لیے اول ملک حبش کو اور پھر مدینہ کو ہجرت کی اجازت دی گئی مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اب تک مسلمانوں کو لڑنے کی اجازت نہ تھی۔ جب قریش نے مدینہ میں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا اور برسرِ فساد اور آمادۂ جنگ ہوئے تو جہاد کی اجازت ملی۔ اس اجازت کی مصلحت خود خدا نے بتا دی تھی۔

جہاد کے لیے جو حکم سب سے پہلے نازل ہوا، وہ سورۂ حج میں موجود ہے، اس میں بہ صراحت فرما دیا گیا ہے کہ مسلمان لڑائی کے لیے تیار ہوئے تو وہ لڑائی جارحانہ نہ تھی بلکہ مدافعانہ اور حفاظت خود اختیاری کے لیے تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: "تم کو لڑائی کی اجازت اس لیے دی گئی ہے کہ تم مظلوم ہو۔ اور تم کو صرف خدا کی پرستش کے جرم میں وطن سے نکلنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ اگر ایسا

ہوتا (یعنی جہاد کی اجازت نہ دی جاتی) تو یہودیوں اور عیسائیوں کی عبادت گاہیں اور مسلمانوں کی مسجدیں جن میں خدا کا نام لیا جاتا ہے گرا دی جاتیں۔"

یہ آخری بات صاف بتاتی ہے کہ جہاد کے حکم میں یہ مصلحت بھی پوشیدہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود اور دیگر اقوام سے جو معاہدے مذہبی آزادی اور امن عام کے لیے کیے تھے، اور قریش جن کو پامال کرنے کے درپے تھے، ان کی حفاظت کی جائے۔ اس لیے کہ اگر کوئی قوم معاہدہ کا پاس اور لحاظ کرنے والی نہ رہے گی تو مذہب اور عبادت گاہوں کی حفاظت کون کرے گا؟ اسی لیے جہاد کی دوسری آیت میں بھی خدا نے یہی حکم دیا کہ "صرف ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑنے کے لیے آئیں۔" اس مختصر بیان سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ مسلمان جنگجو نہ تھے بلکہ ان کو لڑنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔

ہجرت کر کے مدینہ آجانے کے بعد آنحضرت صلعم تو امن پھیلانے اور صلح فرمانے میں مصروف تھے، اور قریش اپنا جال پھیلا رہے تھے۔ مدینہ میں ایک جماعت تھی جس کو خود قرآن حکیم نے منافقین کا لقب دیا ہے۔ یہ لوگ ظاہر میں مسلمان بنتے رہتے مگر درپردہ درپے آزار رہتے۔ ان کا سردار عبداللہ ابن اُبیّ ابن سلول تھا۔ اس کا مدینہ میں بہت اثر تھا۔ قریش نے اسے لکھا کہ "تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے لڑو اور انھیں مدینہ سے نکال دو، ورنہ ہم سب تم پر حملہ کر کے تمھیں نیست و نابود کر دیں گے۔" اس نے اپنی جماعت کے لوگوں کو مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے تیار کیا۔ لیکن آنحضرت صلعم کو پہلے سے خبر ہو گئی۔ آپؐ خود تشریف لائے اور ان منافقوں کو سمجھایا کہ "قریش نے تم کو دھوکا دیا ہے۔ اگر تم ان کے فریب میں آ گئے تو یاد رکھو کہ جن سے تم لڑو گے اور جنھیں تم نقصان پہنچاؤ گے وہ سب تمھارے عزیز و اقارب ہیں۔ قریش تو پھر بھی غیر ہیں۔" عبداللہ ابن اُبی کے ساتھی اس بات کو سمجھ گئے اور یہ فتنہ دب گیا۔

قریش نے اسی طرح یہود کو مسلمانوں کے خلاف اکسایا۔ یہود خود بھی مسلمانوں سے خفا تھے۔ ایک تو اس لیے کہ اسلام حضرت عیسٰی علیہ السلام کو سچا نبی مانتا تھا اور ان کی نبوت پر ایمان لانا اسلام کا جزو تھا۔ نیز یہ کہ اسلام کی رُو سے یہودی حضرت عیسٰیؑ کی مخالفت کرنے میں غلطی پر تھے۔ دُوسرے یہ کہ مسلمانوں نے اپنا قبلہ بدل دیا تھا یعنی بیت المقدس کو چھوڑ کر خانہ کعبہ کو قبلہ قرار دیا تھا۔ تیسرے یہ کہ یہودیوں کو خطرہ تھا کہ مسلمان قوت پکڑتے جاتے ہیں تو اس سے ان کے اثر اور عظمت میں خلل آتا ہے۔ اب یہود نے دیکھا کہ سارے مکہ کی طاقت ہمارے ساتھ ہوئی جاتی ہے۔ تو انھوں نے قریش سے اسلام کی مخالفت میں تعاون کرنا قرینِ مصلحت سمجھا۔

قریش کو اس طرف سے اطمینان ہو گیا تو انھوں نے مسلمانوں کو دھمکی دی کہ: "تم یہ نہ سمجھنا کہ مکہ سے چلے آئے تو آرام سے بیٹھ رہو گے۔ ہم وہیں آکر تمھارا قلع قمع کر ڈالیں گے۔" دھمکی سے تجاوز کر کے انھوں نے چھیڑ چھاڑ بھی شروع کر دی۔ ربیع الاول سنہ ۲ھ میں کرز ابن جابر آیا اور مدینہ کے باہر جو مویشی چر رہے تھے انھیں لوٹ کر لے گیا۔

اسی طرح قریش نے ان قبائل کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا جو مکہ اور مدینہ کے درمیان آباد تھے۔ چنانچہ ان قبائل نے بھی مدینہ آنے جانے والوں پر سختیاں شروع کر دیں۔ اس زمانے میں اہل مدینہ کو ہر وقت مشرکین مکہ کے حملہ کا خوف لگا رہتا تھا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بذاتِ خود راتوں کو پہرہ دیا کرتے تھے۔ اسی طرح صحابہؓ سب کے سب اپنے ہتھیار ساتھ لے کر سوتے تھے۔

آخر رجب سنہ ۲ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ ابن جحشؓ کو بارہ آدمیوں کے ساتھ بھیجا تاکہ وُہ قریش کی

نقل و حرکت اور ان کے ارادوں کا پتا لگائیں۔ وہ ٹوہ لینے مکّہ کے قریب تک جا پہنچے تھے کہ قریش کا ایک قافلہ نظر آیا جو شام سے واپس آرہا تھا۔ حضرت عبداللہؓ اور ان کے ساتھیوں نے ان پر حملہ کیا۔ لڑائی میں عمرو بن الحضرمی مارا گیا۔ دو کافر قید ہوئے اور مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔ واپس آکر حضرت عبداللہؓ نے مالِ غنیمت پیش کیا اور سارا قصہ سنایا۔ آنحضرت صلعم نے جنگ کی اجازت نہیں دی تھی، اس لئے آپ کو حضرت عبداللہؓ کا یہ فعل ناگوار ہوا اور آپؐ نے مالِ غنیمت بھی قبول نہیں فرمایا۔ عمرو بن الحضرمی معززین قریش میں سے تھا اور دو کافر جو قید ہوئے وہ مغیرہ رئیس قریش کے بیٹے تھے۔ اس لیے اس واقعہ نے قریش کے جوشِ انتقام کو بھڑکا دیا اور نتیجہ میں غزوۂ بدر پیش آیا۔

غزوۂ بدر میں قریش مکہ پورے ساز و سامان حرب سے اچھی طرح لیس تھے اور مسلمان ان کے مقابلے میں ہر لحاظ سے بے حد کمزور تھے۔ مگر حق و باطل کے اس معرکہ کا نتیجہ سب کے سامنے ہے۔ جاء الحق و زھق الباطل کا پہلا روشن نشان دنیا کو نظر آیا اور مسلمانوں کو بے مثال فتح حاصل ہوئی۔ یہ فتح اسلام کی آیندہ ترقیوں کا پیش خیمہ تھی۔ قریش کے گیارہ بڑے بڑے سردار مارے گئے اور قریش کا اصل زور ٹوٹ گیا مگر ان کے دل جوشِ انتقام سے بھر گئے۔ جس کا نتیجہ جلد ہی ظاہر ہوا۔ قبائل عرب پر بھی مسلمانوں کی اس فتح کا بہت اچھا اثر پڑا کہ وہ مسلمانوں کی طاقت سے مرعوب ہو گئے۔ مگر یہود کی آتشِ حسد اور زیادہ بھڑک اُٹھی اور وہ مسلمانوں کے پہلے سے بھی زیادہ سخت جانی دشمن بن گئے۔

فتح بدر سے یہودیوں کے دلوں میں حسد کی جو آگ بھڑکی تھی، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ ہر وقت مسلمانوں کے آزار کے درپے رہنے لگے۔ مشرکین مکہ نے ان کو پہلے ہی اچھی طرح سے بھڑکا رکھا تھا۔ منافقینِ مدینہ نے اور روغن تازہ ملا۔ حالانکہ مسلمانوں اور یہودیوں میں باہم صلح و آشتی کے معاہدے ہو چکے تھے۔ مگر انھوں نے ان کا بھی احترام نہ کیا۔ سب سے پہلے بنو قینقاع نے اس معاہدے کو توڑا اور شوال کے مہینہ میں جنگ کا اعلان کر دیا۔ اتمامِ حجت کے طور پر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لے گئے اور ان کو سمجھایا۔ مگر انھوں نے کہا "قریش تو فنونِ جنگ سے ناواقف ہونے کی وجہ سے تم سے ہار گئے۔ ہم تم کو بتا دیں گے کہ لڑائی کیا ہوتی ہے۔" مجبوراً مسلمانوں کو لڑائی پر تیار ہونا پڑا۔ یہود قلعہ بند ہو کر لڑے۔ پندرہ دن محاصرہ رہا۔ تنگ آ گئے تو انھوں نے صلح کی درخواست کی اور کہا کہ "آنحضرت صلعم جو بھی فیصلہ کریں گے ہمیں منظور ہوگا۔" عبداللہ ابن ابی منافقینِ مدینہ کا سردار اور بنو قینقاع کا حلیف تھا۔ اس نے سفارش کی کہ ان کو صرف جلاوطن کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ شام کو جلاوطن کر دیے گئے۔ ان کی تعداد سات سو تھی۔

یہاں تمام غزوات کی تفصیل مقصود نہیں ہے۔ یہ بتانا مطلوب تھا کہ مسلمانوں سے قریش اور یہود کی لڑائیاں کس طرح شروع ہوئیں اور ان جنگوں میں مسلمانوں کا رویّہ کیا تھا۔

غزوۂ اُحد غزوۂ بدر کے جوشِ انتقام میں پیش آیا۔ دوسری طرف یہود کے دوسرے قبائل برابر مخالفت اور دشمنی کا مظاہرہ کرتے رہتے تھے۔ بنو نضیر کی چھیڑ چھاڑ جب حد سے بڑھ گئی تو آنحضرت صلعم نے معاہدہ کی تجدید چاہی۔ بنو قریظہ نے تو معاہدے کی تجدید کر دی۔ لیکن بنو نضیر برسرِ مخالفت رہے۔ آخر پریشان ہو کر صلح پر آمادہ ہوئے اور بخوشی و رغبت انھوں نے جلاوطنی پسند کی۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مسلمانوں نے ان کے مال و اسباب سے مطلق تعرض نہیں کیا اور وہ بڑی شان و شوکت کے ساتھ تمام مال و متاع اور ساز و سامان کے ساتھ شام اور خیبر کو کوچ کر گئے۔

اس کے بعد بڑی لڑائی غزوۂ خندق ہے۔ چونکہ اس جنگ میں مکہ کے قریش اور یہود اور دُوسرے قبائل نے بڑے پیمانے اور بڑی تیاریوں کے ساتھ شرکت کی تھی، اس لیے اس کو غزوۂ احزاب بھی کہا جاتا ہے۔ اس وقت بنو قریظہ (یہود) نے کُھلم کُھلا معاہدے کی دھجیاں اڑا دی تھیں۔ اس لیے جنگِ خندق کی فتح کے بعد ان کو سبق سکھانا لازم تھا، اور خود یہود نے شہادت دی تھی کہ حضرت سعد ابن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حکم کی حیثیت سے جو فیصلہ فرمایا تھا وہ تورات کے احکام کے عین مطابق تھا۔

مختصر یہ کہ قریش اور یہود اور منافقین تین بڑے دشمن اور مفسد گروہ تھے جو در پردہ اور علی الاعلان اسلام کی ہر طرح کی مخالفت اور مخاصمت پر کمربستہ رہتے تھے اور مجبور ہو کر مسلمانوں کو ان سے جنگ (جہاد) کی اجازت دی گئی تھی۔ پھر بھی جو جنگیں پیش آئیں ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ قریش کے حملوں کے نتیجہ میں جو لڑائیاں ہُوئیں وہ غزوۂ بدر، غزوۂ احد، غزوۂ احزاب اور غزوۂ حنین میں محدود ہیں۔ یہود کی لڑائیاں غزوۂ بنو قینقاع، غزوۂ بنو نضیر، غزوۂ بنو قریظہ اور غزوۂ خیبر ہیں۔ ان میں سے پہلی دو میں مطلق خونریزی نہیں ہُوئی اور مفتوحین نے بخوشی و رغبت جلاوطنی کی سزا منظور کی۔ رومیوں سے سریۂ موتہ (جس میں آں حضرت صلعم شریک نہ تھے) اور غزوۂ تبوک صرف دو معرکے ہُوئے۔

اب ان اسلامی نبوی جنگوں کا ایک اور زاویۂ نظر سے مطالعہ کیجئے تو حیرت ناک نتائج سامنے آتے ہیں۔ یہ خیال رہے کہ جو اسلامی دستے دُوسرے مقاصد سے بھیجے گئے تھے، جن میں لڑائی بھڑائی کا نام و نشان بھی نہیں ملتا، ان کو بھی مورخین نے غزوات کے ذیل میں بیان کیا ہے۔ جس سے غزوات کی تعداد بے سبب زیادہ نظر آنے لگی ہے ورنہ حقیقت میں لڑائیاں صرف اتنی ہیں جن کا اوپر ذکر ہُوا۔ یا پھر فتح مکہ ہے۔ واضح ہو کہ غزوۂ تبوک میں بھی کوئی لڑائی نہیں پیش آئی تھی۔ ایسے ہی بعض اور غزوات ہیں جن میں آنحضرت صلعم نے بہ نفس نفیس شرکت فرمائی۔ مگر بغیر کسی لڑائی کے واپس تشریف لائے۔ جیسے غزوات سویق، حمراء الاسد، انمار، بدر دوم، دومۃ الجندل، بنو لحیان، غابہ اور ذات الرقاع۔ سریّات میں بھی چند کے علاوہ جو لڑائی ہی کے لیے بھیجے گئے تھے باقی موقعوں پر کوئی جنگ نہیں ہُوئی۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ ان کو لڑائیوں میں شامل کیا جائے۔ جو شخص بھی دیانت داری سے تاریخ کا مطالعہ کرے گا، وہ اس بات کو دل سے قبول کرے گا کہ جو دستے تبلیغ اسلام، تکمیل صلح، بت شکنی، رہزنوں کے تعاقب، جاسوسی، مخبری یا اسی طرح کے دوسرے مقاصد کے لیے بھیجے گئے، ان کا شمار جنگوں میں کرنا سخت ناانصافی ہے اور فتح مکہ جیسی اہم جنگ جس طرح اختتام کو پہنچی اور یہاں جیسی رحم دلی، فراخ حوصلگی، عام معافی، رواداری اور سیر چشمی کا مظاہرہ فرمایا گیا، اس پر ہزاروں امن، صلح، آشتی اور خوش اخلاقی کی مثالیں قربان کی جا سکتی ہیں۔ درحقیقت خلقِ عظیم کا یہ وُہ اسوۂ حسنہ تھا جس کی مثال رہتی دنیا تک نہیں مل سکتی۔ اور اس کا کوئی پرتو اگر نظر آسکتا ہے تو صرف مسلمان سلاطین کی فتوحات میں۔ جیسے سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کی فتح بیت المقدس۔

دشمنانِ اسلام کہتے چلے آئے ہیں کہ "اسلام تلوار کے زور سے پھیلا" اور ان کو اعتماد ہے اپنے زبردست پروپاگنڈے

اورتحریری قوت پر۔ جانتے ہیں کہ جھوٹ بات بھی بار بار دُہرائی جائے، اور مسلسل کہی جاتی رہے، تو سننے والوں کے دل میں شک تو پیدا کر ہی دیتی ہے۔ اسی لیے کتنے مسلمان نوجوان ہیں جو تفصیلات سے بے خبر اور ناواقف ہونے کے باعث ان کے پروپاگنڈے سے کم و بیش متاثر ہو جاتے ہیں۔ مگر حق یہ ہے کہ دشمنوں میں سے کوئی بھی آج تک اس دعوے کا کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکا۔ غزوات نبوی سے اس پر دلیل لانے کی حقیقت مذکورہ بالا تحریر سے روشن ہو گئی۔

اتمامِ حجت کے لیے یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان لڑائیوں میں مقتولین اور قیدیوں کی تعداد غیر معمولی طور پر کم نظر آتی ہے۔ اگر جبر و تشدد کے لیے لڑائیاں ہوتیں تو قیدی اور مقتول اس سے بہت زیادہ ہوتے۔ ان تمام غزوات میں مخالفین کے کل قیدی ۶۵۶۴ اور کل مقتول ۷۵۹، تھے۔ اور مسلمانوں میں سے کل ۲۵۹ شہید اور صرف ایک بزرگ قید ہوئے۔ یقینی طور پر تحقیق ہے کہ دشمنوں کے ان قیدیوں میں سے ۶۳۴۸ قیدیوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بغیر کسی شرط کے (غزوۂ حنین کے بعد) آزاد فرما دیا تھا۔ صرف ایک شخص کو قصاص میں قتل کیا گیا تھا۔ باقی ۲۱۵ قیدیوں کے متعلق بات رہ جاتی ہے۔ ان میں سے ستر قیدی غزوۂ بدر کے تھے، جن کو فدیہ ادا کرنے پر رہا کر دیا گیا تھا۔ اب بچے ۱۴۵ قیدی۔ تو یہی بات ہے کہ جس سرورِ کائنات رحمۃ للعالمینؐ نے صرف ایک غزوۂ حنین کے چھ ہزار سے زیادہ قیدیوں کو آنِ واحد میں آزادی بخش دی تھی، اس ذاتِ مقدس نے ان تھوڑے سے افراد کو بھی اپنی رحمت و عفو سے محروم نہ رکھا ہوگا۔

اب ان اعداد کے مقابلے میں دنیا کی دوسری مذہبی و سیاسی لڑائیوں کے قیدیوں اور مقتولوں کی تعداد دیکھی جائے تو صاف ظاہر ہو جائے گا کہ مسلمانوں نے صرف مدافعت کے لیے مجبور ہو کر تلوار ہاتھ میں لی تھی یا کسی اور مقصد سے لڑے تھے۔ جان پورٹ کی روایت کے مطابق ڈیڑھ کروڑ کے قریب عیسائی مذہب کی بھینٹ چڑھائے گئے تھے۔ مہابھارت کے مقتولین کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ فرانس، امریکہ اور روس نے جمہوری سلطنتیں قائم کرنے میں لاکھوں سے زیادہ تہِ تیغ کر دیے۔ پہلی جنگِ عظیم کے مقتولین کی تعداد بہتّر لاکھ ہے۔ اور دُوسری جنگِ عظیم کے سلسلے میں کئی کروڑ آدمی ہلاک بتائے گئے ہیں۔ چین کی جنگِ آزادی نے کیا بھینٹ لی تھی، ان مقتولین کی تعداد کا شاید کبھی بھی تخمینہ نہ لگایا جا سکے گا۔ غرض اس مختصر تشریح سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ "اسلام کے پھیلنے کا سبب اس کی صداقت و حقانیت تھی یا تلوار کا زور۔"

اب ذرا نتائجِ جنگ پر ایک اور طرح نظر ڈالیے۔ زمانۂ جاہلیت میں عرب ہی میں نہیں، دنیا بھر میں لڑائیوں میں عجیب عجیب ظلم و ستم روا رکھے جاتے تھے۔ اسلام نے ان سب کی اصلاح کی۔ عورتوں، بوڑھوں اور بچّوں کے قتل سے بتاکید منع کیا۔ ایفائے عہد کی تعلیم کی۔ صلح حدیبیہ میں اس کی ایسی عجیب مثال موجود ہے جس کی نظیر تلاش کرنی بے سُود ہے۔ قاصدوں کے قتل سے منع فرمایا۔ قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ مسلمانوں نے بدر اور حنین کے قیدیوں کے ساتھ جو برتاؤ کیا اس کی مثال تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ فوجیں کوچ کرتی ہیں تو عام طور پر راستے کی بستیوں کو سخت مصائب اور تکالیف سے سابقہ ہوتا ہے۔ اہل فوج ان سے رسد وغیرہ کا ٹیکس وصول کرتے ہیں، اور فوجوں کے پھیلاؤ کی وجہ سے آمد و رفت کی راہ قطعاً مسدود ہو جاتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے بتاکید ان سب باتوں سے منع فرمایا۔ سب

سے بڑی اصلاح یہ تھی کہ مالِ غنیمت کی محبت دلوں سے نکال دی۔ ورنہ اسلام سے قبل صرف لُوٹ مار کے لیے لڑائیاں ہوا کرتی تھیں۔ جس کی چند مثالیں اسلام کے ابتدائی زمانے میں بھی ملتی ہیں۔ مگر رفتہ رفتہ یہ شغف جاتا رہا۔ مالِ غنیمت کی محبت دل سے بالکل نکل گئی۔ اسی طرح انتقام اور دیت کے جو غلط اور وحشیانہ طریقے رائج تھے، آنحضرت صلعم نے ان کو بھی دُور کر دیا۔ مساوات کا قانون قایم کرنا اور اسے نافذ وجاری کرکے دکھانا، اسلام کا سیاسی دنیا پر سب سے بڑا احسان ہے۔ چنانچہ غزواتِ نبوی میں اس کی روشن و تابناک مثالیں نظر آتی ہیں۔

۲

غزواتِ خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم

بریگیڈیر گلزار احمد

غزواتِ خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالعہ اور ان سے متعلق امور اور معاملات کی تحقیق کئی پہلوؤں سے ضروری ہے۔ اوّلاً غزواتِ نبویؐ ہی سیرت پاکؐ کی اولیں کتابوں کا باعث بنے۔ اس کے علاوہ مدنی دور کے اولیں سالوں میں دشمن کی جانب سے حملوں کا خدشہ اس قدر زیادہ رہتا تھا کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم خود راتوں کو پہرہ دیا کرتے تھے۔ ایک رات آرام کی ضرورت یا خواہش محسوس ہوئی تو صحابہ کرامؓ سے فرمایا کہ کوئی قابل آدمی آپؐ کی جگہ پہرہ دے تاکہ آپؐ آرام فرما سکیں۔ سعدؓ بن وقاص نے زرہ پہنی اور آپؐ نے اس رات آرام فرمایا۔ تاریخ ان ایام کے متعلق یہ بھی بتاتی ہے کہ صحابہؓ سورج نکلنے پر جب کھیتوں کو جاتے تھے تو اپنے ہتھیار ساتھ لے کر جاتے تھے۔

جب حالات یہ تھے کہ شب و روز دشمن کی جانب سے حملہ کا خدشہ موجود رہتا تھا اور مدنی دور کے اولیں نو سالوں میں ۲۹ بار شاہِ مدینہؐ کو بہ نفسِ نفیس بیرونِ مدینہ سفر کرنا پڑا۔ ان سفروں کو غزوات کا نام دیا گیا ہے۔ ضروری نہیں کہ ان کے دوران لڑائی واقع ہوئی ہو۔ ان غزوات کے علاوہ بھی حضور اقدسؐ اپنے جلیل القدر صحابہؓ کی زیر قیادت چھوٹے بڑے لشکر روانہ فرماتے رہتے تھے تاکہ ملک کے اندر امن و امان قایم رہے اور امت کے اندر زیادہ سے زیادہ لشکر سالار اور کماندار تربیت حاصل کر سکیں اور یوں ملت کی آیندہ ضروریات پوری ہوتی رہیں۔ ان لشکروں کو "سرایا" کا نام دیا گیا ہے اور ان کی تعداد پچاس سے زاید ہے۔ جس شہر سے ۹ سال کے عرصہ میں اسّی سے زاید مہمیں اندرون حدودِ ریاست یا بیرونِ حدودِ مملکت روانہ کی گئی ہوں اس کی زندگی پر اس طویل جنگ کا ضرور اثر پڑا ہوگا۔ اس لیے اس دور کی تاریخ اور سیرتِ حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم کے مطالعہ کے وقت یہ امر مسلسل ذہن کے سامنے رکھنا چاہیے کہ اس تمام عرصہ میں مدینہ کی فضا پر جنگ کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اس لیے اس عرصہ کے امور مملکت یعنی معاشی، معاشرتی، سیاسی اور بین الملکی سیاسیات سے متعلق امور کے فیصلوں کے وقت عسکری ضروریات بھی پیشِ نظر رہی ہوں گی۔

غزواتِ خاتم الرسلؐ پر تحقیق کی ان دو وجوہ کے علاوہ ایک اور پہلو بھی ہے جسے ملتِ اسلامیہ کو آزاد زندگی کے دوران ہمہ وقت پیش نظر رکھنا ہوگا۔ یہ پہلو فلسفۂ جنگ سے متعلق ہے۔ یعنی وہ کون سے مواقع ہیں جب ملتِ اسلامیہ سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں اور اس کے مطابق جہاد بالسیف کی طرف رجوع کرے اور جب جنگ بپا ہو جائے تو اسلامی لشکر دل کا طرزِ عمل کس طرح کا ہو۔

ملتِ اسلامیہ کی یہ پہلی جنگ تھی اور اس جنگ کو جو بات دوسری اسلامی جنگوں سے ممیّز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کی

قیادت، سپہ گری، اس کی تیاری، اس کے دوران کی تزویرات (STRATEGY) اور اس کی لڑائیوں کے دوران کی تدبیرات (TACTICS) یہاں تک کہ اس کے لیے وسائل کی فراہمی کے علاوہ اس کے بین الاقوامی پہلو یعنی اس کے دوران امورِ خارجہ پر فیصلے غرضیکہ اس کا ہر پہلو سرورِ کون و مکان شہنشاہِ دوجہان سربراہِ مملکت مدینہؐ کے اپنے ہاتھوں انجام پذیر ہوا۔

جنگ ہی کے ذریعہ ملت اور اس کے مفاد کا تحفظ کیا جا سکتا ہے۔ اس سے اہم تر زندگی کا کون سا پہلو ہو سکتا ہے۔ اس لیے سنتِ ختم المرسلینؐ کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ہی ملت اپنی نگہبانی کے فرائض انجام دے سکتی ہے۔ دورِ خیر البشرؐ ایسا دور ہے جس میں ملت کے مادی وسائل نہایت محدود تھے اور افرادی طاقت ابھی پوری طرح تیار نہیں ہوئی تھی با ایں ہمہ جب اس دور کے جزیرۃ العرب کی طاقتور ترین مملکت نے جنگ کا اعلان کیا تو اسے قبول کر لیا گیا اور مدینہ کی نوزائیدہ مملکت نے دفاع کی تیاریاں شروع کر دیں اور تاریخ شاہد ہے کہ یہ تیاریاں ہر پہلو مکمل تھیں۔ آج چودہ سو سال بعد ملتِ اسلامیہ نہایت ہی تاریک دور سے گزر کر کچھ اس طرح عالمِ انسانی پر اُبھری ہے جیسے کوئی نوزائیدہ مملکت وجود میں آئی ہو۔ اگر حقیقت کو نگاہ میں رکھا جائے تو عالمِ اسلام کا بیشتر حصہ نوزائیدہ مملکتوں پر مشتمل ہے اور دورِ اوّل کی طرح وسائل کی کمی کے ساتھ ساتھ ہر چہار سو سے اس کا دشمنوں کے درمیان گھر جانا بھی مسلّم ہے۔ ان حالات میں آج ملتِ اسلامیہ کے لیے سنتِ خاتم الرسلؐ صلی اللہ علیہ وسلم کو صحیح طور پر سمجھنا اور ان ہی خطوط پر دفاع کے لیے تیار ہونا ازحد ضروری ہے۔

جنگ ایک معاشرتی حقیقت ہے اور اس کے دوران خون کا بہنا اور تباہی و بربادی کے واقعات کا رونما ہونا فطرت جنگ کا خاصہ ہے جس سے فرار ممکن نہیں۔ اس کے باوجود یہ تاریخی امر ہے کہ جہاں کہیں ملتِ اسلامیہ کے افراد کو جنگ میں شرکت کرنی پڑی انھوں نے جنگ کی تمام فطری تباہیوں کے باوصف ظلم، تشدّد اور بے جا خون آشامی سے احتراز برتا۔ جب دورِ فاروقِ اعظمؓ میں بیت المقدس مسلمانوں نے فتح کیا تو ایک شہری کا بال بیکا نہ ہوا اور نہ ہی کسی کے مال یا عزت کو آنچ آئی۔ وہی بیت المقدس جب چار سو ساٹھ سال بعد یورپ کے متمدن صلیبی شہزادوں نے فتح کیا تو ان کے اپنے بیانات کے مطابق شہر کی گلیوں میں مسلمانوں کے خون سے گھٹنوں تک دلدل بن چکی تھی اور وہ فاتحانہ انداز میں "خون کے ان دریاؤں کو عبور کر کے خدا کے حضور دو زانو ہوئے جس نے انھیں فتح عطا کی تھی۔ چھیانوے سال بعد وہی بیت المقدس ایک بار پھر مسلمانوں نے فتح کیا۔ غازی صلاح الدین کی فوج چونکہ مسلمانوں پر مشتمل تھی اس لیے اس بار بھی کسی شہری کا بال بیکا نہ ہوا۔ مگر جب وہی شہر بیسویں صدی کے یورپ کی مہذب اور متمدن صیہونی قوم نے فتح کیا تو مسلمانوں کے قبلۂ اول کو بھی عمداً نذرِ آتش کر دیا۔ مقامِ فکر ہے کہ کیوں ایسے ہوتا ہے۔ کیا ان اور ان جیسے سیکڑوں دوسرے واقعات کو نگاہ میں رکھتے ہوئے یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ مسلمان جب میدانِ جنگ کا رُخ کیا کرتا تھا تو اس کے سامنے شہنشاہِ مدینہؐ کا عملی نمونہ موجود رہا کرتا تھا۔ جب دوسرے ادیان کی افواج فتح سے دوچار ہوتی ہیں تو ان کے سامنے ان کے دین کے بانیوں کی کوئی ایسی مثال موجود نہیں ہوتی جو ان کے عمل، ان کے کردار اور ان کے جذبات کی حدود کو متعین کر سکے۔ یہ فخر نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کو ہی حاصل ہے کہ انھوں نے حضورِ اقدس سے سبق حاصل کر کے اپنے صدیوں کے دشمنوں کے ساتھ بارہا عطا و بخشش کا سلوک کیا۔ آج اُمتِ فخرِ رسلؐ ایک بار پھر جادہ پیما ہونے کو ہے۔ لازم ہے کہ جنگ

لڑنے کے وہ طور طریقے جو سرورِ جہاںؐ نے استعمال کیے ان کا ایک بار پھر مطالعہ کر لیا جائے تاکہ میدانِ جنگ کو رُخ کرنے کے دوران سنّت کے مطابق عمل ممکن ہو۔

قریشِ مکہ نے انتہائی کوشش کی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ یا کسی دوسرے مقام کو ہجرت نہ فرما سکیں۔ مگر جب ان کی کوششوں کے باوجود آپؐ مدینہ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تو اہلِ مکہ نے ایک خط عبداللہ بن اُبی کو لکھا کہ اگر اہلِ مدینہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں کو قتل نہ کیا یا مدینہ سے نکال نہ دیا تو وہ مدینہ پر حملہ آور ہوں گے۔ عبداللہ بن ابی ان دونوں مدینہ کے دونوں بڑے قبیلوں اوس اور خزرج میں ہر دلعزیز تھا اور حضورؐ کی ہجرت سے قبل اس کی تاج پوشی کی رسم کی تیاریاں شروع تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ پہنچنے پر اس کو بادشاہ مقرر کرنے کا خیال ترک کر دیا گیا تھا۔ اسے اس بات کا بھی رنج تھا۔ اس نے اہلِ مکہ کا یہ خط ملنے پر مسلمانوں کے خلاف لڑائی پر غور کرنا شروع کر دیا۔ حضورِ اقدسؐ کو جب اس بات کا علم ہوا تو آپؐ اس کے پاس تشریف لے گئے اور اس اقدام کے نتائج سے اسے آگاہ کیا۔ آپؐ نے اسے یاد دلایا کہ اس کے اپنے قبیلہ کے لوگ مسلمان ہو چکے تھے۔ اسلام لانے کے بعد انہوں نے مسلمانوں کی صف میں کھڑا ہونا تھا اور آپؐ نے فرمایا:

"مجھے یقین ہے کہ تم اپنے قبیلہ کے افراد کے مابین جنگ ہرگز پسند نہ کرو گے۔"

عبداللہ بن ابی کو شاید اب تک یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ اسلام کے دائرہ میں انسان مکمل طور پر داخل ہوتا ہے۔ اس قدر واضح نظریۂ حیات کو قبول کر لینے کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ اگر زندہ رہے تو اسی مکمل ضابطۂ حیات پر قائم رہ کر زندہ رہیں گے ورنہ اللہ العالمین اور اس کے آخری پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی شہادت دیتے ہوئے اس جہان سے رخصت ہوں گے۔ اس نظریہ پر میدانِ جنگ میں عمل ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ البتہ حضورؐ نے اسے ضرور سمجھا دیا ہو گا اسی وجہ سے عبداللہ بن ابی نے بادلِ ناخواستہ مسلمانوں کو مدینہ سے بہ جبر نکالنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ تاریخ اس بات پر خاموش ہے مگر بعد کے واقعات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اہلِ مکہ کے حملہ کے پیشِ نظر مدینہ کا دفاع کرنے کا فیصلہ اسی محفل میں یا اس کے جلد بعد کر لیا گیا اور دفاعی امور کے علاوہ مدینہ کی سیاسی زندگی کی قیادت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ کر دی گئی۔ حضورؐ نے مدینہ کے دفاع کے لیے جو اقدامات ہاتھ میں لیے ان میں سے تین پہلو نمایاں ہیں:

اولاً مدینہ کو تحریری آئین عطا کیا۔ اس آئین کی رُو سے اختلافی مسائل کا فیصلہ آپؐ کے ہاتھ میں دیا گیا۔ جنگ سے متعلق مختلف قبائل کی ذمہ داریاں اور ان کی حدود کا واضح تعین کیا گیا۔

دوم امورِ خارجہ بھی آپؐ ہی کے دستِ مبارک میں دیے گئے اور آپؐ نے سفارتی سفر کے ذریعہ تزویراتی اہمیت کے علاقوں میں مدینہ کا اثر و رسوخ قائم کرنا شروع کر دیا۔

تیسرا پہلو سپاہ کی عسکری تربیت اور مختلف عہدوں کے لیے افسروں کو تیار کرنا تھا۔ اس پہلو کو بھی حضورِ اقدسؐ نے اپنے دستِ مبارک میں لیا۔ سپاہ کی عسکری تربیت اس لیے بھی ضروری تھی کہ مہاجر صحابۂ کرامؓ کے لیے مدینہ اور اس کے گرد و نواح کا علاقہ اور اس علاقہ کے رہنے والے قبائل، وہاں کا جغرافیہ اور وہاں کی آب و ہوا، یہ سب باتیں نئی تھیں۔ ان کے لیے ان باتوں سے واقفیت اور ان باتوں کا عادی ہونا اور بدلے ہوئے حالات میں جنگی ماحول کی صعوبتوں کے لیے تیار رہنا بھی ضروری تھا۔

حضور سرورِ دو عالمؐ نے جو آئین مملکتِ مدینہ کے لیے منظور فرمایا اور جس پر تمام قبائل نے اتفاق کیا اسے "یثاق مدینہ" کا نام دیا گیا ہے۔ ہماری نظر میں یہ عہد نامہ عالمِ انسانی کا پہلا تحریری آئین ہے۔ اس میں اجتماعی زندگی کے وہ تمام پہلو موجود ہیں جو مملکت کو بطریق احسن چلانے کے لیے ضروری ہیں۔ غزواتِ ختم الرسلؐ کے مطالعہ کے لیے البتہ صرف ان اشتقاق کا ذکر ضروری ہوگا جو دفاعِ مدینہ سے متعلق ہیں:

ا۔ وہ یہودی جو مسلمانوں کی پیروی کریں گے ان کی مدد کی جائے گی اور ان کے ساتھ مساوات کا برتاؤ کیا جائے گا۔

ب۔ جب مسلمان اللہ کی راہ میں جنگ کر رہے ہوں گے تو (کسی فریق کی طرف سے) علیحدہ صلح نہیں کی جائے گی۔

ج۔ اختلاف کی صورت میں معاملہ اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

د۔ جب یہودی مسلمانوں کے شانہ بشانہ لڑ رہے ہوں گے تو وہ اپنے اخراجات خود برداشت کریں گے۔

ھ۔ محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی اجازت کے بغیر کوئی (فریق) بھی جنگ کا اعلان نہیں کرے گا۔

و۔ اس دستاویز میں شامل فریق ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔

ز۔ جب تک جنگ جاری رہے گی یہودی مسلمانوں کو جنگ کے اخراجات کا حصہ ادا کریں گے۔ (یعنی جب جنگ میں شریک نہیں ہوں گے تو بھی جنگ کے اخراجات کا حصہ ادا کریں گے)

ح۔ یثرب کو اس دستاویز میں شریک فریقوں کے لیے حرم (امان گاہ) کا مقام حاصل ہوگا۔

ط۔ قریش اور ان کے حلیفوں کی مدد نہیں کی جائے گی۔

ی۔ دستاویز میں شامل فریق یثرب پر حملہ ہونے کی صورت میں ایک دوسرے کی مدد کو آئیں گے۔

"یثاق مدینہ" کی ان اشتقاق سے چند باتیں ذہن کے سامنے آتی ہیں:

۱۔ مدینہ کو باقاعدہ آزاد مملکت کا مقام دیا جا چکا تھا۔ اس دستاویز کے ذریعہ بیرونی دنیا کو یہ بتایا جا رہا تھا کہ مدینہ اب چند غیر منظم اور غیر متمدن قبائل کی بستی نہیں بلکہ ایک باقاعدہ ریاست ہے جس کا اپنا آئین، اپنا قانون، اپنی تنظیم ہے اور اپنی بین الاقوامی حیثیت ہے۔ اکثر مورخین بعد کے واقعات پر رائے زنی کرتے ہوئے اس بنیادی حقیقت کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔

۲۔ قریشِ مکہ کو مدد نہ دینے کا بالاتفاق رائے فیصلہ، مدینہ پر حملہ ہونے کے احتمال کا اندیشہ اہل قریش کے حلیفوں کا ذکر۔ یہ سب ایسی حقیقتوں کی طرف اشارہ ہے جن کو ہر وقت نگاہ کے سامنے رکھنا پڑے گا۔ قریشِ مکہ کی جانب سے حملہ کرنے کے فیصلہ کی خبر کی توثیق کے علاوہ یہ امر بھی اہلِ مدینہ کے علم میں تھا کہ اہلِ مکہ جب مدینہ پر حملہ آور ہوں گے تو ان کے حلیف قبیلے بھی ساتھ ہوں گے۔ بعد کی مہموں سے اس تشویش کی صداقت کا ثبوت ملتا ہے۔

۳۔ یہودیوں کے قبائل اور دوسرے قبائل جو مدینہ میں آباد تھے ان سب کو اس بات کا احساس تھا کہ متحدہ دفاع کے بغیر ریاست مدینہ کی بقا ناممکن ہے۔ یہی وجہ تھی ورنہ آج تک اہل مدینہ کو متحدہ دفاع کا خیال تک پیدا نہیں ہوا تھا۔

۴۔ شق "الف" سے ثابت ہوتا ہے کہ تعداد کی کمی کے باوجود مسلمانوں کا وقار نہایت بلند تھا۔

۵۔ اختلاف کی صورت میں معاملہ اللہ اور اللہ کے رسول کے سامنے پیش ہونے کے یہ معنے تھے کہ فیصلہ قرآن کی رُو سے ہوگا اور حضور اقدسؐ اس فیصلہ کو سنائیں گے۔

۶۔ جنگ کے اعلان کی حضورؐ کے علاوہ کسی اور کو اجازت نہ ہونے کے یہ معنے ہیں کہ حضور اقدسؐ کو سربراہِ مملکت کے طور پر تسلیم کر لیا گیا تھا۔

۷۔ شق "ب" سے یہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ کے علاوہ مسلمانوں کا کسی جنگ میں شامل ہونے کا امکان نہ تھا۔ جہاد فی سبیل اللہ کے دوران کسی فریق کو علیحدہ صلح کی اجازت نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ کوئی فریق اگر خفیہ طور پر دشمن کے ساتھ مل گیا ہو اور مسلمانوں سے پوشیدہ دشمن کے ساتھ صلح کرے اور پھر اس معاہدہ کو سامنے رکھ کر یہ کہے کہ مسلمان ہمارے حلیف ہوتے ہوئے ہمارے دوست کے ساتھ کیوں لڑتے ہیں۔ ایسے موقع کی پیش بینی کے طور پر یہ شق داخل کی گئی تھی۔ بعد کے واقعات نے اس شک کو درست ثابت کر دیا۔

۸۔ شق "ذ" سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ "یہودی" اگر جنگ میں شامل نہ بھی ہوں تو جب تک جنگ جاری رہے گی انھیں جنگ کے اخراجات کا ایک حصہ ادا کرنا ہوگا۔

غزواتِ ختم الرسلؐ کے دوران اکثر واقعات کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ "میثاقِ مدینہ" کی طرف وقتاً فوقتاً رجوع کیا جائے ورنہ غلط رائے قایم ہو جانے کے امکانات ہو سکتے ہیں۔ غزواتِ نبویؐ کو سمجھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ انھیں ایک مستقل اور مربوط جنگ کا مقام دیا جائے اور ہر مہم کو علیحدہ وحدت یا اکائی سمجھ کر اسے جنگ کا نام نہ دیا جائے۔ حضور اقدسؐ کی اس جنگ کا آغاز اہلِ مکہ کے اُس خطے سے ہوتا ہے جس کا ذکر آ چکا ہے اور جسے اعلانِ جنگ کا مقام حاصل ہے۔ اس جنگ کا اختتام آج تک نہیں ہوا۔ البتہ غزواتِ نبویؐ تبوک کے غزوہ پر ختم ہو گئے تھے اور اس کے بعد نئے دور میں اسلام اور اسلام کے زیرنگیں سرزمین کا دفاع کرنے کے لیے حضور اقدس کے جانشینوں نے اپنی ذمہ داریاں ادا کیں۔ بیعت عقبہ ثانی کا واقعہ ہے کہ عباس بن عبادہ نے کہا:

"اے اہلِ خزرج! تمھیں کچھ احساس ہے کہ تم کس بات کا وعدہ کر رہے ہو۔ تم ہر ایک سے جنگ کرنے کا وعدہ کر رہے ہو ...."

اور جب کبھی کسی نظامِ حیات کو "اللہ کے بندوں" کی جانب سے یہ خوف پیدا ہوتا ہے کہ وہ اللہ کا عطا کردہ نظام نافذ کریں گے تو انھیں اپنے آپ کو اور اپنے عقاید کو بچانے کے لیے تلوار اٹھانی پڑتی ہے۔ یہ جنگ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک اللہ کا نام لینے والوں کا وجود قایم رہے گا اور اس فلسفۂ حیات کے منکر بھی موجود ہوں گے۔

بیعت عقبہ ثانی کے واقعہ کو یوں بھی بیان کیا گیا ہے کہ سعد بن ضرارہ کے الفاظ تھے،

"تم جانتے ہو کہ کس بات کا وعدہ کر رہے ہو۔ یہ عرب و عجم کے ساتھ جنگ کا وعدہ ہے۔ یہ پورے عالم انسانی کے ساتھ جنگ کرنے کا وعدہ ہے۔"

عجیب اتفاق ہے کہ یہ وعدہ شعوری اور غیر شعوری طور پر آج چودہ صدیوں کے بعد بھی پُورا کیا جا رہا ہے۔

اس موقع پر جب عباس بن عبادہ نے فوراً غیر مسلموں پر ٹوٹ پڑنے کا خیال ظاہر کیا تو حضورؐ نے فرمایا:

" ابھی اللہ کی جانب سے لڑائی کی اجازت نہیں ملی "

بجا ارشاد تھا۔ اللہ کی راہ میں اللہ کے احکام کے مطابق ہی جنگ لڑی جا سکتی ہے۔ ہماری رائے میں کسی مکتب خیال یا دین و مذہب کے نزدیک لڑائی کے دوران اپنے قوانین، اپنی اخلاقی اقدار اور اپنے عقاید کا اتنا خیال نہیں رکھا گیا جتنا کہ غزوات نبیؐ کے دوران رکھا گیا۔ میں لڑائی کے دوران اگر کوئی فرار ہوتے ہوئے بھی کلمہ طیبہ پڑھ لیتا تھا تو حکم تھا کہ اٹھا ہوا تلوار گیر ہاتھ رک جانا چاہیے۔ جب دشمن شکست تسلیم کر لیتا تھا تو اسے فوراً معاف کر دیا جاتا تھا اور اس کی املاک پر اسے قابض رہنے دیا جاتا تھا۔ خصوصیت صرف غزواتِ نبوی میں پائی جاتی ہے کہ یہ جنگ امن و امان قایم کرنے کے لیے لڑی گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بعد کے ادوار میں مسلمان سپاہ کا برتاؤ مفتوح آبادیوں کے ساتھ مشفقانہ اور مربیانہ رہا ہے۔ اگر یوں نہ ہوتا تو جس نظام حیات پر قایم رہنے کا مسلمان امت دعویٰ کرتی رہتی ہے اس نظام حیات کے قوانین کی خلاف ورزی ہوتی۔

اور یہی وہ نظامِ حیات ہے جس کو وجود میں آنے سے روکنے کے لیے قریشِ مکہ نے اس جنگ کا آغاز کیا تھا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا قریش مکہ اس قدر تنگ نظر تھے کہ اپنے درمیان کسی دُوسرے دین و مذہب کے وجود کو قبول نہیں کرتے تھے یا اس دین کی کچھ ایسی خصوصیات تھیں کہ وہ اس کے قیام سے خائف تھے کہ ان کے مفاد کو نقصان پہنچے گا یا ان کا دین ختم ہو جائے گا۔ اس سوال کا جواب اس لیے بھی اہمیت رکھتا ہے کہ اکثر و بیشتر جب کوئی نیا مکتب خیال وجود میں آتا ہے اور پرانے مکتب خیال کے سربرآوردہ لوگ اسے پسند نہیں کرتے، تو اس نئے مکتب خیال پر عقیدہ رکھنے والے افراد کے ملک بدر ہونے کے بعد یہ مخاصمت از خود ختم ہو جاتی ہے قریشِ مکہ کی یہ مخالفت و مخاصمت مسلمانوں کے ملک چھوڑنے پر اور بھڑک اٹھی۔ اس لیے دیکھنا پڑے گا کہ اس بڑھتی ہوئی مخالفت کی کیا وجہ تھی۔

"تاریخ بتاتی ہے کہ بعثتِ نبویؐ کے وقت مکہ میں یہودی، عیسائی، صابی اور مختلف عقاید کے رکھنے والے قریش بستے تھے۔ کعبہ کے گرد تین سو ساٹھ بُت تھے۔ کعبہ کے اندر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بت یا تصویر کا وجود بھی بتایا جاتا ہے۔ کوئی کسی سے تعرض نہ کرتا تھا کہ وہ کس مذہب سے تعلق رکھتا ہے اور اس کا طریقِ عبادت کیا ہے۔ ان حقایق کی روشنی میں کوئی نہایت ہی خطرناک انجام اہل مکہ کے پیش نظر ہو گا کہ انھوں نے حبشہ ہجرت کرنے والوں کو واپس لانے کی کوشش اور تحائف اور انعام و اکرام تک کے لالچ دے کر ان مہاجروں کو واپس لانا چاہا اور جب مدینہ کی ہجرت شروع ہوئی تو پوری کوشش کی کہ حضور اقدسؐ مدینہ نہ پہنچ سکیں۔ ندوہ کے اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ جو کوئی حضورؐ کو زندہ یا قتل کر کے واپس لائے گا تو سو اونٹوں کے انعام سے نوازا جائے گا۔

غصہ کی یہ شدت اور دشمنی کی یہ حدود ہمیں اُس دَور کے چھوٹے چھوٹے واقعات پر غور کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ اہل عرب ایک خاص نظام زندگی کے مطابق اپنے امور طے کیا کرتے تھے۔ اس نظام زندگی میں فرد کو مکمل مذہبی آزادی تھی۔ یعنی عہد حاضر کے نظریات کے مطابق مذہب ہر فرد کا ذاتی معاملہ تھا۔ اسلام اس آزادہ روی کو ایک خاص نظم اور ضبط کے تحت لا رہا تھا اور فرد اور معاشرہ دونوں کو ایک واضح اور غیر مبہم نظامِ زندگی عطا کر رہا تھا۔ اہلِ قریش کے ایک موقع پر الفاظ تھے:

"اس نے ہمارے نظامِ زندگی کو جاہلانہ کہا ہے۔"

اور اس نظامِ زندگی کے خطوط اس قدر واضح تھے کہ جو اس کو قبول کرتا تھا وہ ایک نئی ملت کا فرد بن جاتا تھا۔ انھیں یہ بھی شکایت تھی کہ:

"ان کے درمیان تفریق پیدا ہوگئی ہے۔"

اور یہ نیا نظامِ زندگی لانے والا وہی قریشی تھا جسے اس کی بے داغ اور باضابطہ جوانی پر وہ برسوں سے "امین" کا لقب دے چکے تھے اور انھیں خدشہ تھا کہ اگر اس نظامِ زندگی کی تفاصیل اہلِ عرب کے سوادِ اعظم تک پہنچ گئیں تو "امینِ مکّہ" اور اس کے اصحابؓ طاقت حاصل کرلیں گے اور پھر ہم پر غالب آجائیں گے۔"

مکی دور میں ایسے واقعات بھی گزر چکے تھے جب دوسرے قبائل کے افراد نے حضورؐ کو ساتھ چلنے کی دعوت دی تھی مگر ان کی شرائط آپؐ کو منظور نہ تھیں۔ بحیرہ بن فراس جو قبیلہ بنو عامر کا فرد تھا اس نے کہا تھا:

"اگر قریش کے اس آدمی کو میں اپنے ساتھ لے جاسکوں تو میں اس کی مدد سے پُورے عرب کو زیر کرلوں۔"

اور پھر حضورؐ کو مخاطب کر کے کہا:

"اگر ہم لوگ آپؐ کے تابع ہوجائیں اور خدا آپؐ کو اپنے دشمنوں کے خلاف فتح دے دے تو پھر کیا آپؐ کے بعد ہم ملوکیت حاصل کرسکیں گے؟"

آپؐ نے فرمایا تھا:

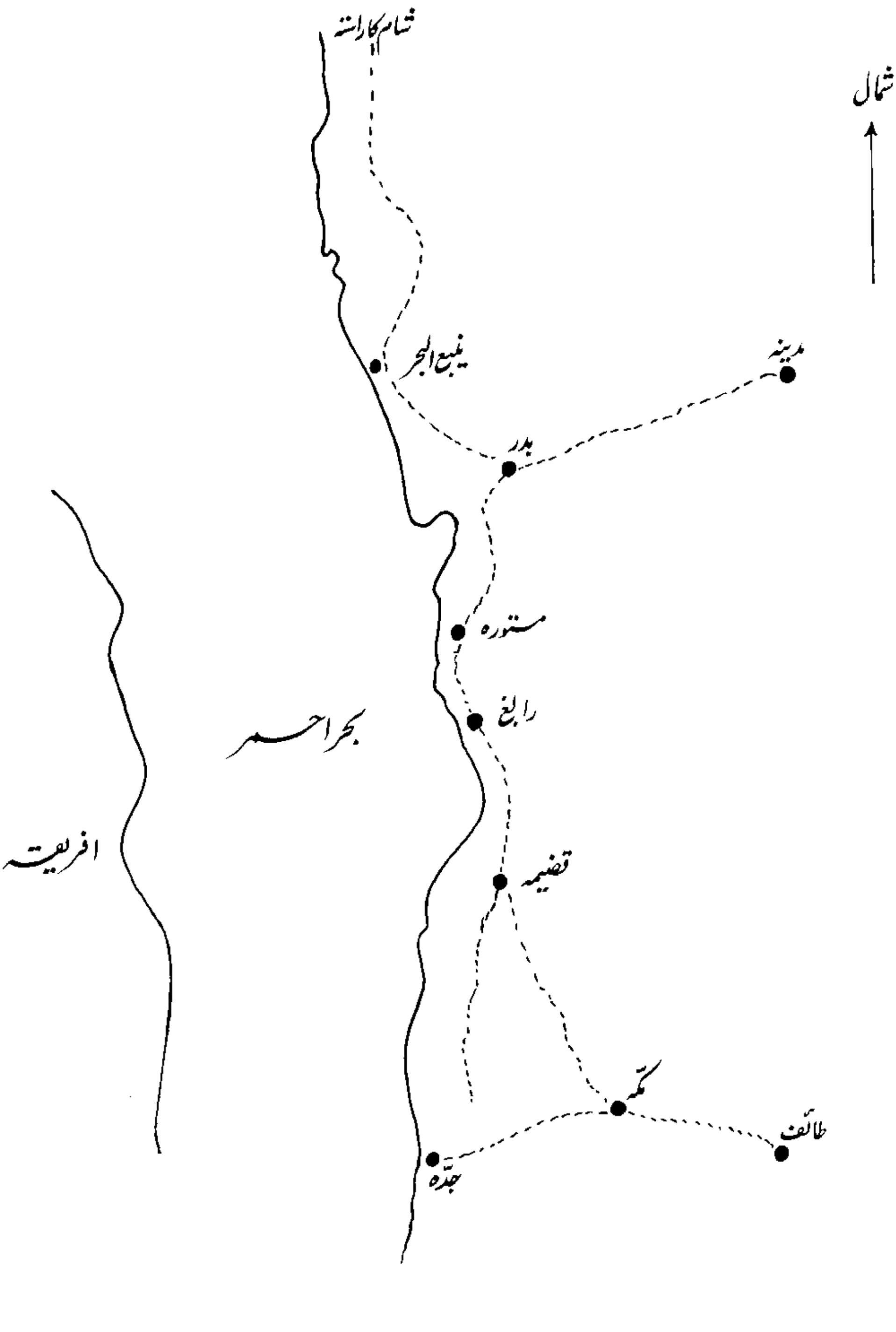
"ملوکیت ایسی چیز ہے کہ اللہ جسے چاہتا ہے اسے عطا کرتا ہے۔"

تو وہ شخص کہنے لگا:

"تو پھر آپؐ یہ چاہتے ہیں کہ ہم آپؐ کو عربوں کے خلاف اپنے سینوں کے زور سے حفاظت دیں اور پھر خدا آپؐ کو فتح دے تو اس کا پھل کوئی اور کھائے۔ شکریہ، ہمیں یہ قبول نہیں۔"

یہ تھا وہ پس منظر جس نے قریشِ مکّہ کو دشمنی کی انتہا تک پہنچا کر ان سے مدینہ کے خلاف اعلانِ جنگ کا مراسلہ بھجوایا۔ ظاہر ہے کہ دفاعِ مدینہ کے لیے ہر ممکن اقدام ضروری ہوگیا تھا۔ حضورِ اقدسؐ نے مدینہ کے مختلف قبائل کو ایک ہی وحدت میں منسلک کرنے کے بعد مدینہ سے مغرب کی جانب بحرالاحمر کے ساحل کے قرب وجوار میں رہنے والے قبائل کے ساتھ دوستانہ اور حلیفانہ مراسم قایم کرنے کے لیے سفارتی سفر اختیار کیا۔ اس سفر میں آپ ودّان کے مقام تک تشریف لے گئے۔ چونکہ اس سفر میں ابواء کے مقام پر بھی قیام کیا گیا اس لیے اس سفر کو غزوۂ ودان اور غزوۂ ابواء کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ غزوہ ہر اس سفر کو کہا گیا ہے جو سرورِ کونینؐ نے مدینہ سے باہر اختیار کیا۔ ضروری نہیں کہ یہ سفر جنگی مقاصد کے لیے کیا گیا ہو یا اس کے دوران کوئی جنگی کارروائی عمل میں لائی گئی ہو۔ ودّان اور ابواء کے مقامات مکہ سے مدینہ آنے والے راستہ کے قریب واقع ہونے کے علاوہ اس تجارتی شاہراہ پر واقع ہیں جو مکہ سے شام جاتی ہے اور جسے اہلِ مکہ اپنے قافلوں کے لیے استعمال کیا کرتے تھے۔ اس لحاظ سے

نقشہ ”الف“


شام کا راستہ
شمال
ینبع البحر
مدینہ
بدر
مستورہ
رابغ
بحر احمر
افریقہ
قضیمہ
مکہ
طائف
جدّہ

اس سفر کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ تربیتی اور سفارتی مقاصد کی تکمیل کے علاوہ یہ سفر تزویراتی (Strategic) مقصد بھی حاصل کر رہا تھا۔
(ملاحظہ ہو نقشہ "الف")

اس سفر کے دوران حضور اکرمؐ صرف مہاجر اصحابؓ کو اپنے ساتھ لے کر گئے۔ ان کی تعداد ساٹھ کے قریب تھی۔ علمبردار حمزہ بن عبدالمطلب تھے۔ شاید اس لیے کہ مہاجر اصحاب اس علاقہ اور وہاں کے جغرافیہ سے ناواقف تھے اور ان کی تربیت مقصود تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حضورؐ ابھی انصار صحابہ پر بوجھ ڈالنا چاہتے ہوں۔ اس سفر کے تمام مقاصد حاصل ہو گئے۔ ابوضمرہ جو اس علاقے کا بارسوخ قبیلہ تھا اس کے سردار مخشی بن عمرو الضمری کے ذریعہ سمجھوتہ ہوا جس کی رُو سے ضمرہ قبیلہ اور مدینہ کے درمیان ان ہی شرائط پر معاہدہ ہوا جو میثاق مدینہ کے مطابق دوسرے قبائل کے ساتھ طے پائی تھیں۔ اس کے علاوہ جہینہ قبیلہ کے ساتھ معاہدہ طے پایا کہ اگر مکہ اور مدینہ کے درمیان لڑائی ہوئی تو یہ قبیلہ غیر جانب دار رہے گا۔ یہ سفر (غزوہ) صفر ۲ ہجری میں اختیار کیا گیا اور اس میں حضورؐ اور آپؐ کے ساتھی تقریباً پندرہ بیس دن مدینہ سے غیر حاضر رہے۔ اس کے دوران کسی طرح کا کوئی مقابلہ پیش نہیں آیا جو ذرائع اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ یہ غزوہ بنوضمرہ کے خلاف حملہ کرنے کے لیے یا قریش مکہ کے کسی قافلہ کا راستہ روکنے یا لوٹنے کی غرض سے اختیار کیا گیا تھا وہ غلطی پر ہیں۔ ابھی قریش کا کوئی قافلہ شام نہیں گیا تھا اور بنوضمرہ کی جانب سے کوئی ایسی غلطی سرزد نہیں ہوئی تھی کہ ان پر حملہ کیا جاتا اور حضور اقدسؐ کے سامنے لڑائی کی جو اجازت تھی (۲۲ : ۲۹) اور جنگ کرنے کا جو حکم تھا (۲ : ۲۱۶ اور ۹ : ۳۶) ان کے الفاظ سے واضح ہے کہ جنگ انہی کے ساتھ کی جا سکتی تھی جو پہل کرنے کے مجرم تھے اور "ولا تعتدوا" کہہ کر پہل اور زیادتی کرنے سے روک دیا گیا۔ سراپا "خلق قرآن" سے کون توقع کر سکتا ہے کہ خالق العالمین کے حکم کے خلاف کوئی اقدام عمل میں آتا۔

اس سفر کی خبر جب مکہ پہنچی تو انھیں اپنی تجارتی شاہراہ کے مسدود ہونے کا خدشہ پیدا ہوا۔ انھوں نے عکرمہ بن ابی جہل کی کمان میں تین سو کا لشکر روانہ کیا تاکہ ساحلی علاقہ کے قبائل پر مکہ کا رعب قائم رہے اور وہ تجارت کا راستہ نہ روکیں۔ اغلباً اس لشکر کے بھیجنے کا یہ مقصد بھی تھا کہ مدینہ پر بھی حملہ کیا جائے۔ مورخین اس موقع پر بھی غلطی کا شکار ہوئے ہیں۔ انہوں نے قریش کے اس تین سو کے لشکر کو تجارتی قافلہ قرار دیا ہے حالانکہ کسی تجارتی قافلہ کے ساتھ تین سو محافظ نہیں ہو سکتے۔ محافظوں کی اتنی تعداد اگر ضرورت ہو تو تجارت غیر نفع بخش بن جاتی ہے۔

حضور اقدسؐ کی عسکری استخبارات کا محکمہ اس قدر مکمل تھا کہ مکہ کی ہر حرکت کی اطلاع آپ کو بروقت مدینہ پہنچ جاتی تھی۔ خیال ہے کہ اس مرتبہ بھی مکی لشکر کی روانگی کی اطلاع بروقت آپؐ کو مل گئی اس لیے کہ حضورؐ نے عبیدہ بن الحارث بن عبدالمطلب کو ساٹھ مہاجروں کی کمان سونپ کر اس مکی لشکر کے مقابلہ کے لیے روانہ فرمایا۔ دونوں لشکر ثنیۃ المرہ کے قریب آمنے سامنے ہوئے۔ مکی لشکر سے دو بارسوخ آدمی بھاگ کر مدنی لشکر میں شامل ہو گئے۔ ان کے نام المقداد بن عمرو البحرانی جو بنو زہرہ قبیلہ کا حلیف تھا اور عتبہ بن غزوان بن جابر المزنی جو بنو نوفل کا حلیف تھا، بتائے گئے ہیں۔ دو ایسے افراد کا لشکر سے دوڑ کر دشمن کی صفوں میں شامل ہو جانا جو بارسوخ تھے اور طاقتور قبائل کے حلیف تھے اور ساتھ ہی مدنی لشکر سے تیراندازی کا شروع ہو جانا، ان دونوں باتوں

نے مکی کمانڈر کو خوفزدہ کر دیا۔ تیر اندازی میں پہل سعد وقاص کی جانب سے بتائی جاتی ہے۔ ممکن ہے اور مجاہدوں نے بھی تیر پھینکے ہوں۔ مکی کمانڈر نوعمر اور ناتجربہ کار تھا۔ وہ اس بدلتی ہُوئی حالت کا مقابلہ نہ کر سکا اور کمپلٹ گیا۔ مدنی لشکر نے بھی مزید مزاحمت مناسب نہ سمجھی اور عسکری ترتیب کو قایم رکھتے ہُوئے مدینہ کا رُخ کیا۔ اگر مکی لشکر نہ ہوتا اور مکی تجارتی قافلہ ہوتا اور اس کے محافظ یوں بھاگ کھڑے ہوتے تو مدنی لشکر ضرور اس قافلہ کو لوٹ لیتا۔ مگر چونکہ وہاں کسی قافلہ کا وجود نہ تھا اس لیے مدنی لشکر نے اپنے سے پانچ گنا بڑے لشکر کو عقب نشینی کرنے دی۔ یہ سریہ صفر ۲ ہجری کے آخری ایام میں واقع ہُوا۔

اس ناکامی پر قریشِ مکہ خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔ ابوجہل قریش کا سرکردہ رہنما تھا۔ اس کے لڑکے کو میدانِ جنگ میں ناکامی ہُوئی تھی۔ اس لیے ایک اور مہم تیار کی گئی۔ اس بار ابوجہل تین۳۰۰ سو کا لشکر لے کر خود روانہ ہُوا۔ اس بار مدینہ سے حضور اقدسؐ نے حضرت حمزہ بن عبدالمطلب کو تیس۳۰ مہاجر دے کر روانہ کیا تاکہ مکی لشکر مدینہ کے قریب نہ آسکے۔ دونوں لشکر ساحلی علاقے میں آمنے سامنے ہُوئے مگر قبیلہ مجدی بن عمرو الجہنی نے دونوں لشکروں کو لڑنے سے باز رکھا۔ حضور اکرمؐ کے پہلے سفر غزوۂ ودان کے دوران اس قبیلہ کے ساتھ غیر جانبداری کا معاہدہ ہوا تھا اور اسی بنا پر اس قبیلہ کے سردار نے لڑائی نہ ہونے دی۔ عجیب اتفاق ہے کہ اس بار بھی مورخ اس سریہ کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ قریشِ مکہ کا ایک قافلہ شام سے آرہا تھا اور حضورؐ نے اس کو لوٹنے کے لیے یہ سریہ روانہ فرمایا تھا۔ اہلِ مکہ کے پاس اتنے محافظ ہرگز نہ تھے کہ وُہ ہر ماہ تین سو محافظوں کو قافلوں کی حفاظت کے لیے روانہ کر سکتے اور نہ ہی ان کی جانب سے ہر ماہ ایک قافلہ روانہ ہوسکتا تھا۔ جہاں تک واقعات کا تعلق ہے آج چودہ صدیاں گزر جانے کے بعد ہمیں یہ حق نہیں کہ ہم انتہائی خلوص اور محنت سے مرتب کی ہُوئی کتب تواریخ سے اختلاف کریں۔ البتہ عسکری پہلوؤں کو نگاہ میں رکھتے ہُوئے ہم ان مورخوں کی آراؑ سے اختلاف کا حق رکھتے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ یہ غزوات اور سرایا عمل میں آئے۔ یہ رائے ہے کہ ان کی تہہ میں حضور سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد کون سا تھا۔ ایک نوزائیدہ مملکت دو ماہ میں تین بار قافلوں کو لوٹنے کے ناکام سفر اختیار نہیں کر سکتی۔ ایک نئے نظامِ حیات کے گنتی کے چند داعی جو اپنی حفاظت اور پناہ کے لیے اہلِ مدینہ کا سہارا ڈھونڈنے پر مجبور ہُوئے تھے وہ نئی مملکت کو وجود میں لانے کے چند ماہ بعد اپنے میزبانوں سے مشورہ کیے بغیر اپنے دشمنوں کے خلاف پہل نہیں کر سکتے۔ خصوصاً جب پہل کرنا خود ان کے عقیدہ، طبیعت اور احکامِ الٰہی سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔ اس سریہ کو سریۂ سیف البحر کا نام دیا گیا ہے اور یہ ربیع الاول ۲ ہجری میں واقع ہوا۔

غزوۂ ودان کے بعد مکہ کی جانب سے دو بار پہل ہو چکی تھی۔ ضروری محسوس ہو رہا تھا کہ مملکتِ مدینہ کے سربراہ اور کمانڈر اعظمؐ بنفسِ نفیس اس تزویراتی علاقہ کا دورہ کرتے، وہاں کے قبائل سے راہ و رسم بڑھاتے، دوستوں کو تسلی دیتے، کمزور قبائل کی ہمت بڑھاتے تاکہ مملکتِ مکہ کے طاقت ور اور بارسوخ قبیلۂ قریش کو نامناسب اہمیت نہ مل سکے۔ یوں بھی ہر مملکت اپنے اثر ورسوخ کے علاقہ میں اور خاص طور پر اپنی مملکت کے سرحدی علاقوں میں علمبردار گشت (FLAG MARCH) کے ذریعہ اپنا وقار قایم رکھا کرتی تھی۔ مملکتِ مدینہ کو تو ابھی اپنی سپاہ کی تربیت کو بھی مکمل کرنا تھا۔ سریۂ سیف البحر کی واپسی کے بعد حضور اقدسؐ ساٹھ کے قریب مہاجر اصحاب کو ہمرکاب لے کر ایک اور سفر پر روانہ ہُوئے۔ یہ سفر بھی ربیع الاول ۲ ہجری میں کیا گیا ہے

اور اس کو غزوۂ بواط کا نام اس لیے دیا گیا ہے کہ اس سفر کے دوران بواط کے مقام تک گشت کی گئی۔ اس غزوہ کے دوران بھی کسی دشمن سے آمنا سامنا نہیں ہوا۔ مورخوں نے اس غزوہ کو بھی اہل قریش کے قافلہ کے خلاف کارروائی بتایا ہے۔ اور اس بار پھر غلطی کی ہے۔

جمادی الاولیٰ ۲ ہجری کے دوران حضورؐ پھر بیرونِ مدینہ تشریف لے گئے۔ اس بار پھر ساحلی علاقہ تک اپنے سفر کو محدود رکھا اور بنو مدلج کے ساتھ دوستانہ معاہدہ کیا۔ یہ قبیلہ بنو ضمرہ کا حلیف تھا جن کے ساتھ غزوۂ ودان کے دوران معاہدہ طے پا چکا تھا اس سفارتی اور تربیتی غزوہ کو بھی مورخوں نے قریش کے تجارتی قافلہ کے خلاف کارروائی بتایا ہے حالانکہ ان ایام میں اس علاقہ میں کسی تجارتی قافلہ کا وجود نہ تھا۔ اس سفر کو غزوہ ذوالعشیرہ کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے دوران حمزہؓ بن عبدالمطلب علمبردار تھے اور تقریباً ساٹھ ستر مہاجر صحابہ ہمرکاب تھے۔

جنگی کارروائیوں کا آغاز کیے مکہ کو کافی عرصہ گزر چکا تھا اور ابھی تک تیر نشانہ پر نہ بیٹھا تھا۔ بین القبائلی حالات مکہ کے مخالف جا رہے تھے۔ بین الاقوامی سطح پر رائے عامہ بڑا دخل رکھتی ہے۔ جب کسی مملکت کے دوستوں اور حلیفوں میں کمی واقع ہونا شروع ہو جائے تو اسے کوئی غیر معمولی قدم اٹھانا پڑتا ہے ورنہ بین الملکی سطح پر اس کا وقار گرنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس خیال سے مکہ کی جانب سے کرز بن جابر الفہری کی کمان میں ایک تیز رفتار گشت روانہ کی گئی جس نے رات کی تاریکی میں مدینہ کے باہر کھیتوں اور باغوں کو نقصان پہنچایا اور کچھ جانور ہانک کر لے گئی۔ دوسری صبح اطلاع ملنے پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ساٹھ مہاجر اصحاب کا لشکر مرتب کیا اور کرز بن جابر کا تعاقب کیا۔ مکی گشت غیر معروف راستوں سے ہوتی ہوئی نکل گئی اس لیے آپؐ بدر کے مقام سے واپس مدینہ چلے گئے۔ اس مہم کو غزوۂ صفوان اور غزوۂ بدر الاولیٰ کے نام دیے گئے ہیں۔ یہ جمادی الآخر ۲ھ ہجری کا واقعہ ہے۔ اس غزوہ کے دوران علیؓ بن ابی طالب علمبردار تھے اور زیدؓ بن الحارثہ کو مدینہ میں نیابت عطا کی گئی تھی۔

کرز بن جابر کے چھاپہ کے جلد بعد اطلاع ملی کہ ایک اور مکی گشت مدینہ کی طرف بڑھ رہی ہے۔ حضورؐ نے سعدؓ ابن ابی وقاص کو آٹھ مہاجر اصحاب کی نظارتی گشت پر روانہ فرمایا۔ وہ خرار اور جحفہ کے مقامات تک گئے مگر دشمن لوٹ گیا تھا۔ یہ سریہ رجب ۲ھ میں واقع ہوا اور اس کے دوران میں مقداد بن عمرو علمبردار مقرر کیے گئے تھے۔

اسی ماہ حضور اقدسؐ نے ایک اور نظارتی گشت روانہ کی تاکہ مکہ کے جنوب کے علاقہ میں مکی نقل و حرکت کی اطلاع لے آئے۔ اس گشت کے کماندار عبداللہ بن جحش مقرر ہوئے۔ انھیں ملفوف احکامات دیے گئے اور حکم دیا گیا کہ ملفوف احکامات تین دن کی مسافت کے بعد کھولے جائیں۔ انھوں نے تحریری احکام کے مطابق کوچ جاری رکھا اور مکہ کے جنوب میں نخلہ کے مقام پر جا کر رکے تاکہ مکی نقل و حرکت معلوم ہو سکے۔ انھیں حکم دیا گیا تھا کہ کسی قسم کی لڑائی یا چھاپہ وغیرہ کی کوشش نہ کریں۔ نخلہ کے مقام پر ایک مکی قافلہ بھی آکر رکا۔ عبداللہ بن جحش نے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے قافلہ لوٹ لیا اور اس کے دو محافظ قید کر لیے گئے۔ حملے کے دوران ایک محافظ عمرو بن حضرمی مارا گیا۔ مدینہ پہنچنے پر انھیں سرزنش ہوئی اور قافلہ کا سامان لوٹا دینے کے علاوہ مقتول کا خون بہا ادا کیا گیا۔

جنگ کے اس پہلے دور کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ عرصہ بیشتر ایک دوسرے کی طاقت معلوم کرنے، سفارتی تعلقات بڑھانے اور چھوٹی مہموں کی ترسیل میں گزارا گیا۔ قریش مکہ نے چار بار کوشش کی کہ مدنی مفادات کو نقصان پہنچائیں۔ مگر وہ صرف ایک بار کامیابی سے حملہ آور ہو سکے تھے۔ دوسری طرف مدینہ نے بھی سریہ نخلہ کے دوران مکہ کو نقصان پہنچایا تھا گو اس نقصان کی تلافی کر دی گئی تھی۔ اس کے برعکس مدینہ کو سفارتی کوششوں میں نمایاں کامیابی حاصل ہو چکی تھی۔ اس کی تین مہمیں مدافعانہ تھیں اور ایک مہم اس لیے نکالی گئی تھی کہ کبی چھاپہ مار گشت کا تعاقب کیا جائے۔ قریش مکہ بہر نوع طاقتور فریق تھے۔ ان کے تعلقات جزیرۃ العرب کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے حلیفوں کی تعداد ان گنت تھی اور یہ حلیف یمن سے لے کر شام کی سرحدوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ قریش مکہ جنگ کے ان اوّلیں ایام کے نتیجہ سے ہرگز مطمئن نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لیے اس دور کے غیر جانبدار مبصر ضرور محسوس کر سکے ہوں گے کہ اب مکہ کی جانب سے کوئی اہم قدم اٹھایا جائے گا۔ یہ ممکن اقدام کس صورت میں رونما ہوگا۔ اس کے متعلق یہی کہا جا سکتا تھا کہ مکہ اب براہِ راست مدینہ پر حملہ آور ہوگا۔ مگر رائے عامہ کو استوار کرنے کے لیے وہ کیا کرے گا اس کے متعلق کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

کی مدنی جنگ شروع کرنے والوں کو یہ احساس نہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم داخلی اور خارجی سطح پر خاطر خواہ انتظام کر سکیں گے۔ اس وجہ سے انہوں نے اب تک جو مہمیں روانہ کی تھیں ان میں قریش مکہ نے اپنی پوری طاقت استعمال نہیں کی تھی۔ اب انہیں محسوس ہونے لگا تھا کہ ان کی اس غلط معاملہ فہمی کی وجہ سے مدینہ دن بدن طاقت پکڑتا جا رہا تھا۔ وہ یہ بھی سمجھ سکتے تھے کہ اگر مدینہ کے استحکام اور بین القبائلی سطح پر تعلقات بڑھانے کی یہ رفتار جاری رہی تو عرب کا اچھا خاصا حصہ مدینہ کا حلیف بن جائے گا اور پھر نیا نظامِ زندگی قبول کر لیا جائے گا۔ اس نظامِ زندگی کو اسی وجہ سے وہ کہیں باہر نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ حتیٰ کہ اس کا حبشہ میں جڑیں پکڑ لینا بھی انہیں منظور نہ تھا۔ اب وہ مدینہ میں قایم ہو چکا تھا۔ اس کی اپنی ریاست تھی جس میں اس نظامِ زندگی کا قانون نافذ ہو چکا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس دین کے لانے والے کی حیثیت اب سربراہِ مملکت کی تھی اور یہ سربراہِ مملکت وہی تھا جسے وہ "امین" کا لقب دے چکے تھے اور جزیرۃ العرب اس کی نیک نامی، بلند اخلاق اور صداقت و سخاوت کو تسلیم کرتا تھا۔ ان کے لیے ایک ہی راستہ کھلا تھا اور وہ یہ کہ اپنی پوری طاقت کو مجتمع کر کے مدینہ پر حملہ کریں اور اسلام کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں۔ انہوں نے ایک بار حضورؐ کے چچا حضرت ابو طالب سے واضح اور غیر مبہم الفاظ میں کہا تھا:

"اپنے بھتیجے کو ہمارے حوالے کر دو۔ اس نے تمہارے دین کی مخالفت کی ہے اور تمہارے آبا و اجداد کے دین کی مخالفت کی ہے۔ اس نے تمہاری قوم میں افتراق پیدا کیا ہے اور ہمارے نظامِ زندگی کا مضحکہ اڑایا ہے۔ (ہمیں دے دو) تاکہ ہم اس کا خاتمہ کر دیں۔"

حضور کا خاتمہ کرنے کی کوشش ہجرت کی شب تک جاری رہی تھی۔ ان کی اسی ناکامی نے انہیں جنگ شروع کرنے پر مجبور کیا تھا۔

ایک مغربی مصنف لکھتا ہے:

"آج دنیا کتنی مختلف ہوتی اگر قریش کے سربراہ منتخب افراد کے ذریعہ قتل کروانے کی بجائے کسی دلیر آدمی کو کرایہ پر لے لیتے اور وہ خنجر ہاتھ میں لے کر سیدھا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے گھر چلا جاتا۔"

درست دنیا مختلف ضرور ہوتی مگر اس میں نہ علم ہوتا، نہ فن، نہ سائنس، نہ فلسفہ۔ اور اگر "طلب العلم" کا حکم آپؐ کی جانب سے انسانیت کو نہ ملا ہوتا تو آج انسان نہ چاند کے رازہائے سربستہ پر عبور حاصل کرتا اور نہ ہی رحم و کرم اور امن و صلح کی زندگی کا خواہاں ہوتا۔ قریشِ مکہ بھی شاید دنیا کو اس کے پرانے رنگ پر قایم رکھنا چاہتے تھے اور اسی لیے حضور اقدسؐ کے وجود کو ختم کرنا چاہتے تھے۔

اب جنگ نے ایسی صورت اختیار کر لی تھی کہ انھیں اپنی پوری طاقت کو بہم کر کے مدینہ پر حملہ آور ہونا تھا مگر اس میں چند قباحتیں بھی تھیں۔ مکہ کے قریب بنو بکر کا قبیلہ تھا جس کے ساتھ مکہ کے تعلقات اچھے نہ تھے۔ اگر قریش اپنی پوری طاقت لے کر مکہ سے باہر چلے جاتے تو خطرہ تھا کہ بنو بکر مکہ پر حملہ آور ہو کر مکہ کو نقصان پہنچائیں گے۔ علاوہ ازیں مکہ سے مدینہ جانے کے لیے مکی لشکر کو بنو ضمرہ اور بنو مدلج کے علاقوں سے ہو کر جانا پڑتا تھا اور یہ دونوں قبیلے مدینہ کے حلیف بن چکے تھے۔ ان کو مدینہ کی مدد کرنے سے روکنے کے لیے کوئی چال چلنی پڑتی تھی۔ بنو بکر، بنو ضمرہ اور بنو مدلج کو خاموش رکھنے کا ایک ہی طریقہ قریش مکہ کی سمجھ میں آیا۔ اہل عرب کے ہاں تجارتی قافلوں اور تجارتی شاہراہوں کو آزادی دی گئی تھی۔ اس لیے اگر قریش مکہ یہ ثابت کر سکتے کہ مدینہ ان کے قافلہ پر حملہ آور ہو رہا ہے تو بنو ضمرہ اور بنو مدلج کے دو قبیلے مکی لشکر کے راستہ میں حائل ہونے سے احتراز برتیں گے اور بنو بکر مکہ پر حملہ آور نہ ہوں گے اس فیصلہ کو انتہائی صیغۂ راز میں رکھا گیا اور نہایت چالاکی سے ڈراما کھیلا گیا۔

ایک بہت بڑا قافلہ شام روانہ کیا گیا جس میں کوشش کی گئی کہ مکہ کے زیادہ سے زیادہ گھروں کا مال تجارت شامل ہو۔ کہا گیا ہے کہ شاید ہی کوئی گھر یا خاندان ہو جس نے اس قافلہ کے ذریعہ شام سے سامان نہ منگوایا ہو۔ اس کے علاوہ سامانِ حرب بھی کافی مقدار میں منگوایا گیا تاکہ مدینہ کے خلاف استعمال کیا جا سکے۔ جب یہ قافلہ دمشق سے روانہ ہوا تو زرقہ کے مقام سے ضمضم نامی قاصد کو روانہ کیا گیا۔ اس نے مکہ پہنچ کر اونٹ کا پالان الٹا کیا اور اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ جہاں سے گزرتا چیخ چیخ کر پکارتا کہ "محمدؐ اور اس کے ساتھی قافلہ لوٹنے کے لیے گھات میں بیٹھے ہوئے ہیں، پہنچو اور اپنے قافلہ کو بچاؤ۔۔۔"

شہر میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ ہر ایک نے اس قافلہ کے ذریعے سامان منگوایا تھا اور اب اس کے لٹ جانے کا خطرہ تھا پہلا قدم درست پڑا تھا۔ اہلِ مکہ کی ہمدردی حاصل ہو چکی تھی۔ دوسرا مرحلہ بنو بکر کو خاموش کرنا تھا۔ اس پر چار دن صرف ہوئے۔ انہوں نے مدد کے طور پر اپنے آدمی تو نہ بھیجے البتہ اقرار کیا کہ مکی فوج کی غیر حاضری میں مکہ پر حملہ آور نہ ہوں گے۔

ضمضم کے مکہ پہنچنے کے پانچ چھ روز بعد مکی لشکر مدینہ پر حملہ کرنے کی غرض سے روانہ ہوا۔ اغلباً اس دوران شام کی شاہراہ پر رہنے والے قبائل جو مدینہ کے حلیف تھے انھیں بھی مطلع کر دیا گیا ہو گا کہ مکی لشکر کی نقل و حرکت محض اپنے قافلہ کو بچانے کی غرض سے کی جا رہی تھی۔ مکی لشکر کو بدر پہنچنے میں دس دن صرف ہوئے۔ نجد کے رہنے والے دو قبیلے بنو غطفان اور بنو سُلیم بھی مکی لشکر کے ہمراہ بدر پہنچے۔

اُدھر مدینہ میں مکی لشکر کی روانگی کی اطلاع مل چکی تھی۔ اس لیے آپؐ نے دو آدمیوں کو اس غرض سے روانہ کیا کہ مکی لشکر کی آمد وغیرہ کی نقل و حرکت کی خبر رکھیں۔ حضور اقدسؐ نے اس مرتبہ تمام مسلمانوں کو جمع کیا اور ان کے سامنے پورے حالات بیان فرمانے کے بعد ان کی آراء دریافت کیں۔ مہاجر اصحاب میں سے حضرت ابوبکرؓ اور پھر حضرت عمرؓ اٹھے اور انھوں نے

مکمل وفاداری کا یقین دلایا۔ پھر مقدادؓ اٹھے اور انھوں نے بھی مکمل وفاداری کا اعلان کیا۔ اب حضورؐ نے نگاہ انصار اصحاب کی جانب کی۔ انصار اصحاب کی طرف سے حضرت سعدؓ بن معاذ اٹھے اور انھوں نے بھی مکمل فرمانبرداری کا یقین دلایا۔ اب آپؐ نے فرمایا:

"..... مجھ سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے وعدہ کیا ہے کہ دونوں میں سے ایک ہمارے ہاتھ آئے گا۔"

یعنی حضورؐ کو علم تھا کہ مکی لشکر روانہ ہو چکا ہے اور مکی تجارتی قافلہ اپنے واپسی سفر پر شام سے روانہ ہو چکا ہے۔ مدنی لشکر تین دن میں بدر پہنچا تو مکی لشکر بدر کی وادی کے جنوبی کونے پر پہنچ چکا تھا اور قرآن مجید کے مطابق مکی قافلہ پاس ہی نیچے ساحل کے قریب پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا:

اذ انتم بالعدوة الدنيا وهم بالعدوة القصوى والركب اسفل منكم۔

جس وقت تم (درے کے) قریب والے کونے پر تھے اور وہ دُور والے کونے پر تھے اور قافلہ تم سے نیچے (کی طرف) تھا۔

چونکہ تینوں مشیتِ ایزدی سے ایک ہی وقت پر ایک ہی جگہ اکٹھے ہو گئے تھے الٰہ العالمین اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے فرماتا ہے:

ولو تواعدتم لاختلفتم في الميعاد۔ (الانفال ۸: ۴۲)

اور اگر تم (لوگ آپس میں) وعدہ کرتے تو وعدہ ہرگز ایفا نہ کر سکتے (اکٹھے اس مقام پر نہ پہنچ سکتے تھے)

کوئی تاریخ کی کتاب اور کوئی روایت کتنی ہی مستند کیوں نہ ہو قرآن کے مقابلہ میں اس کا صحیح ہونا قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مکی اور مدنی لشکر اور مکی قافلہ بدر کے مقام پر ایک ہی وقت میں موجود تھے اور قافلہ مدنی لشکر کی موجودگی سے آگاہ ہو کر اور راستہ بدل کر مکہ کی جانب بڑھ نہیں گیا تھا۔

جو روایات مختلف کتبِ تواریخ میں دی گئی ہیں اور اس واقعہ کے متعلق جو تفاصیل بیان کی گئی ہیں ان پر غور کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ابن اسحاق جملہ سیرت نگاروں میں اولیت کا مقام رکھتا ہے۔ اس کے الفاظ ہیں:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سُنا کہ ابوسفیان بن حرب شام سے ایک بہت بڑے قافلہ کے ساتھ آ رہا تھا..... اس کے محافظ صرف تیس یا چالیس آدمی تھے......"

اس کے بعد لکھتا ہے:

"محمد بن مسلم اور عاصم بن عمر بن قتادہ اور ...... اور .... نے مجھے واقعہ کا کچھ حصہ سنایا اور ان سب کے بیان سے میں نے بدر کے واقعہ کا بیان مرتب کیا ہے۔"

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سُنا کہ ابوسفیان شام سے واپس آ رہا تھا تو آپؐ نے مسلمانوں کو بلایا اور کہا:

"یہ قریش کا قافلہ ہے جس میں ان کا سامان ہے۔ جاؤ اور اس پر حملہ کرو شاید اللہ اس کو تمہارے ہاتھ میں

دے دے۔"

لوگوں نے آپؐ کی اس دعوت کو قبول کیا۔ کسی نے شوق سے اور بعض نے بے دلی سے۔ اس لیے کہ ان کے خیال میں حضورؐ لڑائی نہیں کریں گے۔

اس سے یہ تاثر دیا جا رہا ہے کہ جو لوگ بے دلی سے شامل ہوئے تھے یا جو لوگ حضورؐ کے اس سفر میں ہمرکاب نہیں ہوئے وہ قافلہ لوٹنا پسند نہیں کرتے تھے اور چونکہ لڑائی کا امکان نہ تھا اس لیے وہ بے دلی سے شامل ہوئے تھے اور بعض اسی وجہ سے شامل ہی نہیں ہوئے تھے۔ اس کے برعکس ان اوائل ایام کے دوران میں بعض افراد کے رویہ پر قرآن حکیم فرماتا ہے:

کتب علیکم القتال وھو کرہ لکم۔ (البقرہ ۲: ۲۱۶)

تم پر جنگ کو فرض کیا گیا ہے اور وہ تمہیں ناپسند ہے۔

یہی نہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگ جنگ سے جی چرانے لگے اور حضور اقدسؐ کو یہ امر ناگوار گزرا تو اللہ العالمین نے آپؐ کے فرض کو واضح طور پر بیان فرما دیا:

فقاتل فی سبیل اللہ لا تکلف الا نفسك وحرض المؤمنین۔ (النساء ۴: ۸۴)

پس تو لڑ اللہ کی راہ میں تو صرف اپنے لیے ذمہ دار ہے اور مسلمانوں کو (صرف) ترغیب دے (فی سبیل اللہ جنگ کی)

یعنی حضورؐ کے ذمہ جہاد کی ترغیب دینا تھا۔ اگر لوگ اس فریضہ کو شوق سے پورا نہ کرتے تو ان کی ذمہ داری آپؐ پر نہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ جو اصحابِ رسول اللہ حضورؐ کے ہمرکاب بدر گئے وہ انتہائی دلیری اور جرأت و شجاعت سے لڑے۔ تین سو تیرہ (۳۱۳) کے لشکر کے مقابلہ میں ایک ہزار (۱۰۰۰) کی جمعیت تھی۔ مکی لشکر کو تعداد کے علاوہ ہتھیاروں میں بھی برتری حاصل تھی۔ اگر لوگ بے دلی سے بدر کو روانہ ہوئے ہوتے تو لڑائی کا نتیجہ کچھ اور ہوتا۔ جب حضور اقدسؐ بدر پہنچے تو مکی لشکر وادی کے دوسرے کنارہ پر پہلے سے پہنچ چکا تھا۔ جو روایتیں یہ بتاتی ہیں کہ حضور اقدسؐ کی قافلہ کے بدر پہنچنے سے قبل ہی بدر پہنچ کر اس کا راستہ روکے ہوئے تھے وہ حقیقت سے بہت دور ہیں۔ ضمضم اگر بدر سے روانہ کیا گیا ہوتا تو اسے بدر سے مکہ تک کے دو سو (۲۰۰) میل کے فاصلہ کو طے کرنے کے لیے کم از کم چار دن درکار تھے۔ چار دن اہلِ مکہ کو بنو بکر کے ساتھ مذاکرات میں صرف کرنے پڑے۔ انھوں نے کم از کم دو دن تیاریوں میں صرف کیے ہوں گے۔ تمام روایات متفق ہیں کہ مکی لشکر کو مکہ سے بدر تک دس (۱۰) دن لگے تھے۔ ان تمام کا حاصل بیس (۲۰) دن ہے۔ اگر مدنی لشکر ضمضم کی روانگی سے قبل ہی بدر میں موجود تھا تو پھر اس کے وہاں پر بیس (۲۰) دن رکے رہنے کا کیا سبب تھا۔

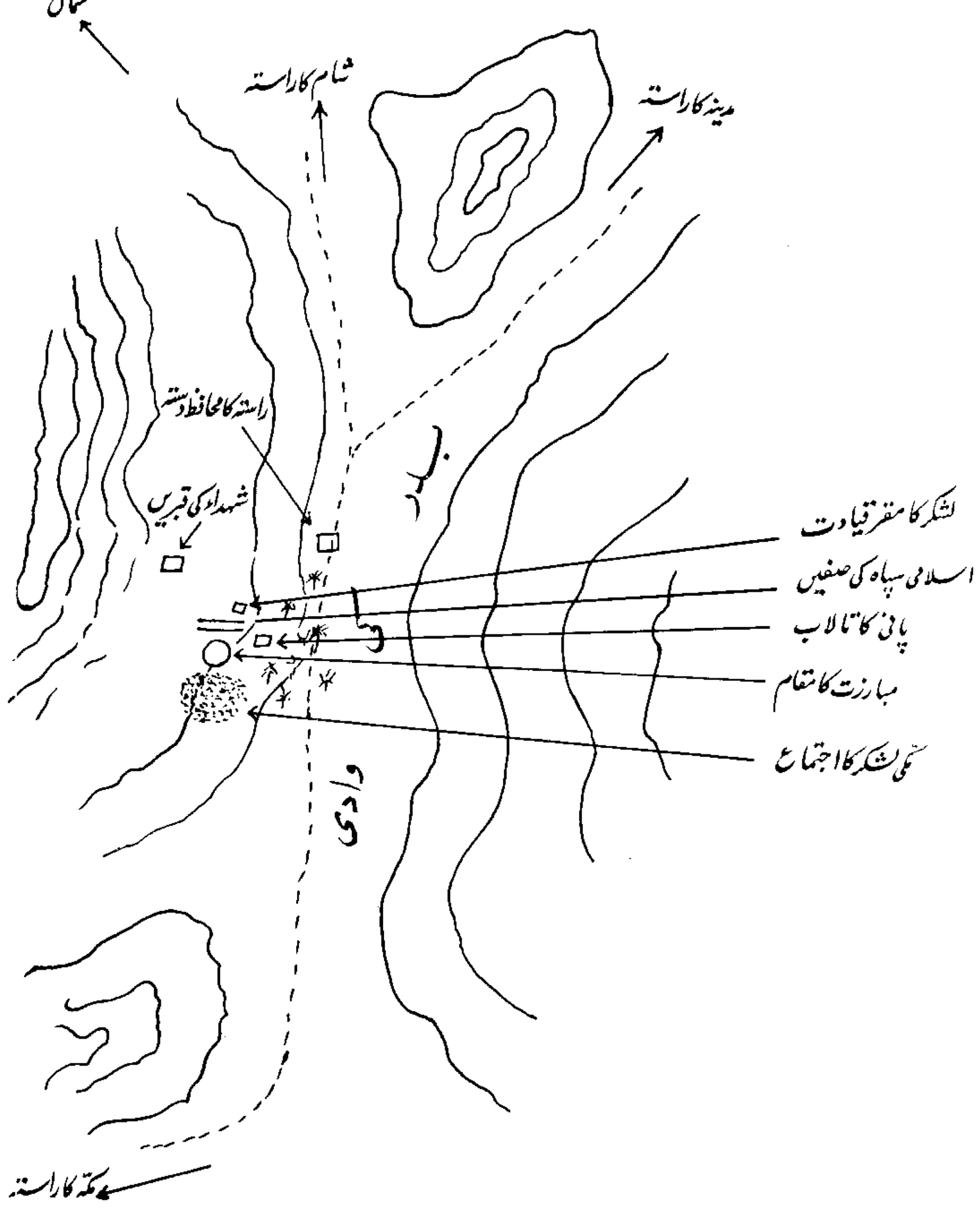
کہا گیا ہے کہ مکی قافلہ راستہ بدل کر اور سمندر کے قریب سے ہو کر مکہ کی طرف بڑھ گیا تھا اور پھر آگے جا کر مکی لشکر کو اطلاع دی تھی کہ ان کے بدر جانے کی ضرورت نہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم کے مطابق "قافلہ وہیں نیچے قریب ہی موجود تھا۔" بدر سے ساحل سمندر بمشکل پندرہ میل ہے۔ ساحل کے ساتھ کے دو تین میل اونٹوں کے گزرنے کے لیے موزوں نہیں۔ اگر قافلہ راستہ بدل بھی لیتا تو اصل راستہ سے بارہ (۱۲) میل سے زیادہ دور نہ جا سکتا تھا۔ قافلوں کی رفتار سست ہوتی ہے۔ بارہ (۱۲) میل کا فاصلہ

نقشہ "ب"

بدر کی لڑائی کا میدان

(بے پیمانہ)

۱۷، رمضان سنہ ۲ ہجری



زیادہ نہ تھا۔ مدنی لشکر اس پر آسانی سے حملہ آور ہوسکتا تھا اس لیے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ جب مکی قافلہ بدر کے قریب سے گزرا تو اس وقت تک مدنی لشکر وہاں نہیں پہنچا تھا۔ ابوسفیان نے جو اُونٹ کی لید اور اس میں مدینہ کا چارہ دیکھا تھا وُہ لید اس گشت کے اونٹوں کی ہوگی جو حضورؐ نے اطلاع حاصل کرنے کے لیے چند روز پیشتر روانہ کی تھی۔ ابوسفیان نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ وہاں پر لشکر کے ستر اسّی اُونٹوں کا کوئی ثبوت نہ تھا اور یہ کہ وہاں پر ایک دُو اونٹ ہی آئے تھے اس لیے وہ قریب ہی پڑاؤ ڈال کر رُک گیا تا کہ مکی لشکر کے آنے پر اس میں شامل ہوجائے۔ ایک روایت کے مطابق وہ لڑائی میں شامل تھا اور زخمی بھی ہُوا تھا۔ بدر پہنچ کر حضورؐ نے اچھا سا مقام چنا۔ اپنے اونٹ اس سے کچھ فاصلہ پیچھے ایک نشیب میں بٹھائے اور رات دعا و عبادت میں گزاری۔ دُوسری صبح ۱۷ رمضان ۲ ہجری کو نماز سے فارغ ہوکر اپنے اس چھوٹے سے تاریخی لشکر کی صف بندی کی اور اپنے صدر مقام میں دُشمن کا انتظار کرنے لگے۔ مگر دل کو اپنے پروردگار کی یاد سے ایک لمحہ بھی غافل نہ ہونے دیا۔ بدر کی وادی دُو اُونچے پہاڑوں کے درمیان واقع ہے۔ وادی کے وسط میں پانی کا چشمہ ہے جس کے قریب سے شام اور مدینہ کی شاہراہ گزرتی ہے۔ وادی کے شمالی حصہ میں پہنچ کر شام اور مدینہ کے راستے جدا سمتیں اختیار کر لیتے ہیں۔ شام کا راستہ شمال کا رُخ قایم رکھتا ہے اور مدینہ کا راستہ مشرقی رُخ اختیار کر لیتا ہے۔ راستہ کے مغرب کی جانب اونچی زمین ہے۔ حضورؐ نے اسے ہی میدانِ جنگ کے لیے چنا تھا۔ (دیکھیں نقشہ "ب")

دُوسری صبح مکی فوج باجے گاجے کے ساتھ اپنے عسکر سے آگے بڑھی اور مدنی لشکر گاہ کا رُخ کیا۔ جب حضورؐ نے انہیں آتے دیکھا تو بارگاہِ الٰہی میں دستِ دعا بلند کر کے کہا:

"اے اللہ! اگر یہ چھوٹی سی جماعت آج ختم ہوجاتی ہے تو پھر قیامت تک تیرے احکام ماننے والا کوئی نہیں ہوگا۔"

اس ایک جملہ میں بہت سے نکات مضمر ہیں:

اوّلاً تو یہ کہ عبادت کے معنے حکم ماننے کے ہیں۔ حکم کا ذکر جب بارگاہِ رب السموٰات سے متعلق ہوتا ہے تو حکم ماننے کے معنے ہوتے ہیں کہ اس کے عطا کردہ قوانین کے مطابق زندگی گزاری جائے۔

دوسرا نکتہ یہ تھا کہ جب مسلمان میدانِ جنگ کا رُخ کرتا ہے تو اس کے سامنے دو ہی راستے ہوتے ہیں غالب آنے کے یا پھر شہید ہوجانے کے۔ "یغلبون او یقتل" کا یہی مفہوم ہے۔

تیسرا نکتہ یہ ہے کہ اللہ کا آخری پیغام اور قانون آچکا ہے۔ اللہ کے آخری نبیؐ نے یہ قانون انسانیت تک پہنچا یا ہے۔ اب اگر یہ چھوٹی سی جماعت جو اس قانون پہ زندگی گزار رہی ہے وہی اس لڑائی میں ختم ہوجاتی تو ختم رسالت کے اصول کے مطابق پھر نہ کوئی پیغام بھیجا جاتا تھا اور نہ پیغامبر کا وجود ہونا تھا۔ ایسے میں اللہ کے قانون پر کون عمل کرتا اور کون ہوتا جو اس کے احکام کے مطابق اس کے عطا کردہ نظامِ زندگی کو فروغ دے کر خالص اسلامی معاشرہ وجود میں لاتا۔ یعنی قیامت تک پھر اللہ کا قانون رائج نہ ہوسکتا۔

حضور اکرمؐ نے اپنے لشکر کو دفاعی لڑائی کے مطابق ترتیب دیا تھا مگر ساتھ ہی خیال بھی رکھا گیا تھا کہ جوابی حملہ کی جونہی ضرورت محسوس ہو اسی وقت پورا لشکر حملہ کر سکے اور کسی طرح سے دیر یا الجھن پیدا نہ ہو۔ آپ نے لشکر کی دو صفیں بنائیں اور ہاتھ میں تیر لے کر صف سیدھی کی۔ عرب میں اب تک لڑائی کے دوران صف بندی کا دستور نہ تھا۔ وہ ہجوم کی شکل میں حملہ آور ہوا کرتے تھے آپؐ نے اپنی اُمت کی جماعتی زندگی کی تربیت نماز اور لڑائی دونوں مقامات پر صف بندی کے ذریعہ شروع کی۔ نماز میں جس طرح امام کے احکام کے بغیر کوئی حرکت نہیں کی جاسکتی اسی طرح لڑائی میں کماندار کے حکم کے بغیر کوئی حرکت نہیں ہوسکتی۔ جس طرح نماز میں سلام پھیرنے سے قبل اگر کوئی اپنی نماز ختم کر دے تو اس کی نماز ساقط ہو جاتی ہے اسی طرح لڑائی میں سپاہی کماندار کے حکم کے بغیر صف سے نکل نہیں سکتا۔ اسلامی لشکر نماز کے دوران انضباط قایم رکھنے کے سبق سیکھ چکا تھا۔ آج نماز عشق کا عملی سبق درپیش تھا۔ آج حکم ملا کہ جب تک حضورؐ حکم نہ دیں اس وقت تک کسی ہتھیار سے دشمن پر وار نہیں کیا جائے گا تاکہ کوئی تیر، کوئی بھالہ اور کوئی پتھر ضایع نہ جائے۔ جب تیر کمان سے نکلے تو وہ دشمن کے سینہ میں پیوست ہو ورنہ مدنی ریاست کے مادی ذرائع اجازت نہ دیتے تھے کہ یونہی تیر پھینکے جائیں اور وہ سینۂ زمین میں پیوست ہوتے رہیں۔

حضور سرور دو عالمؐ نے اگلی صف میں شمشیر زن اور نیزہ باز افراد کو رکھا۔ تیر انداز پچھلی صف میں تھے۔ دونوں پہلوؤں کو ترچھی ترتیب دی گئی تھی تاکہ دشمن اپنے رسالہ اور برتر عددی قوت سے فائدہ اٹھا کر اسلامی لشکر کو لپیٹ میں نہ لے سکے۔ ایک راستہ اسلامی لشکر کے عقب میں جاتا تھا۔ اس راستہ سے فوج کے اونٹوں پر حملہ ہوسکتا تھا۔ آپؐ نے ایک ٹولی (سیکشن) کو اس راستہ کی حفاظت پر متعین کر رکھا تھا۔ پینے کے پانی کی کمی نہ تھی۔ رات بارش ہوگئی تھی اور صفوں کے قریب ہی تالاب بنا لیا گیا تھا۔ دشمن کے افراد کو اجازت تھی کہ لڑائی شروع ہونے تک پانی پیتے رہیں۔ لڑائی شروع ہونے کے بعد اس تالاب سے پانی پینے کی اجازت نہ تھی۔

قریش جب اسلامی صفوں سے تقریباً تین سو گز پر پہنچے تو رُک گئے۔ زمین ڈھلوان ہونے کی وجہ سے وہ نچلی سطح پر تھے اور رات جو بارش ہوئی تھی اس کی وجہ سے کیچڑ سا ہو گیا تھا اور انھیں اوپر آنے میں دقت محسوس ہو رہی تھی۔ سورج بھی ان کی آنکھوں میں پڑ رہا تھا۔ حضورؐ نے جو مقام چنا تھا وہاں سے سورج اسلامی لشکر کے عقب میں تھا۔ صفیں درست کرنے تفصیلی احکامات صادر کرنے اور ادنیٰ کماندار (JUNIOR COMMANDER) مقرر کرنے کے بعد حضورؐ اپنے مقر قیادت یعنی فوج کے صدر مقام (FORCE HEAD QUARTER) میں آگئے۔ یہ ایک چھوٹا سا کھجور کی ٹہنیوں اور پتوں کا جھونپڑا تھا جو صفوں کے درمیان میں پیچھے کی طرف قدرے اونچی زمین پر بنایا گیا تھا تاکہ آپ سائے میں لڑائی کے میدان کو ہر لمحہ دیکھ سکیں اور بدلتے ہوئے حالات کے مطابق احکامات دیتے رہیں۔

قریب آکر مکی فوج کے علمبردار عتبہ بن ربیعہ نے مدنی فوج کو مبارزت کے لیے للکارا۔ مدنی فوج سے تین انصار جوان آگے بڑھے۔ مکی علمبردار نے انصار کے ساتھ مبارزت کرنے سے انکار کر دیا۔ نیا نظامِ زندگی مہاجر اصحاب نے پہلے پہل اپنایا تھا اور حسب و نسب کے لحاظ سے بھی قریشِ مکہ چاہتے تھے کہ اپنے ہم پلہ جوانوں سے مقابلہ کریں۔ حضورِ اقدسؐ نے

انصار نوجوانوں کو واپس بلایا اور اپنے ہی خاندان کے تین اولوا العزم افراد کو آگے بڑھنے کے لیے حکم دیا۔ یہ حمزہؓ بن المطلب، علیؓ بن ابی طالب ابن عبدالمطلب اور عبیدہؓ بن الحارث بن المطلب تھے۔ جب یہ تینوں آگے بڑھے تو مکی علمبردار نے ان کی نامزدگی قبول کی۔ حمزہؓ شیبہ بن ربیعہ کے مقابل ہوئے، علیؓ ولید بن عتبہ کے بالمقابل آئے اور عبیدہؓ بن الحارث عتبہ بن ربیعہ کے سامنے کھڑے ہوئے۔ مبارزت غیر معمولی طور پر جلد ختم ہوئی۔ حمزہؓ اور علیؓ نے فوراً اپنے حریفوں کو ختم کر دیا۔ ادھر عبیدہؓ بن الحارث اور عتبہ بن ربیعہ نے ایک دوسرے کو زخمی کر دیا۔ مبارزت کی ایک شرط ہوا کرتی تھی کہ جونہی خون بہہ نکلے تو مبارزت میں حصہ لینے والے ایک دوسرے کی مدد کو آ سکتے تھے۔ چونکہ حمزہؓ اور علیؓ اپنے اپنے حریفوں کو ٹھکانے لگا چکے تھے۔ وہ عبیدہؓ بن الحارث کی مدد کو پہنچ سکتے تھے۔ دونوں عقابوں کی طرح جھپٹے اور دوسرے ہی لمحہ عتبہ بن ربیعہ کا لاشہ ریت میں تڑپ رہا تھا اور مکی علم زمین بوس ہو چکا تھا۔ تینوں بار اسلامی لشکر سے اللہ اکبر کا نعرہ بلند ہوا تھا۔ مکی کماندار اب اپنی فوج کے حوصلوں کو مزید پست نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے عام حملہ کا حکم دے دیا۔

مکی کماندار اعلیٰ کی یہ سب سے بڑی غلطی تھی۔ اس کی فوج اپنی آنکھوں سے تین سورماؤں کے سر خاک میں تڑپتے دیکھ چکی تھی۔ انھیں حملہ کرنے کے لیے بلندی کی طرف آگے بڑھنا تھا۔ رات کی بارش پاؤں کو جمنے نہ دے رہی تھی اور سامنے سے سورج کی شعاعیں آنکھوں کو خیرہ کیے دے رہی تھیں۔ اس پہ مزید حیرانی اور تعجب کی یہ بات کہ اسلامی سپاہ خاموش اور ساکت ان کا انتظار کر رہی تھی۔ جیسے وہ میدانِ جنگ پر نہیں بلکہ مسجد نبویؐ کے کچے فرش پر اپنے خالق و مالک کے حضور صف بستہ ہیں اور جان کا ہدیہ پیش کرنے کی سعادت کے منتظر ہیں۔ وہ اور آگے بڑھے کہ نہ معلوم اسلامی سپاہ کس خیال سے خاموش کھڑی ہو۔ ان کے ذہنوں پہ مبارزت کے نقشے ثبت ہو چکے تھے وہ ضرور قلب کی حرکت کو تیز کر رہے ہوں گے کہ نہ معلوم اور کتنوں کا یہی حشر ہو۔ اور پھر معاً تیروں کی بوچھاڑ پڑی اور اس ہجوم کے بڑھنے کی رفتار ضرور کم ہوئی ہوگی۔ کچھ لاشے ریت پر تڑپے ہوں گے۔ کچھ معمولی زخموں کو سنبھالتے ہوئے آگے بڑھ آئے ہوں گے۔

اور پھر ان کی ٹکر اس سیسہ پلائی ہوئی دیوار سے ہوئی جو ان کی منتظر تھی اور جسے وہ نہ معلوم کتنی دیر سے دیکھ رہے تھے۔ ٹیلے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نہ معلوم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اتنی بڑی جمعیت کہاں سے لے آئے تھے۔ دور سے تو یہ کم نظر آتے تھے اور اب دائیں سے بائیں تک۔ دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مسلمان ہی مسلمان صف بستہ نہیں دیوار بنے کھڑے تھے۔ ان سے کون ٹکر لے۔ اور مکی سپاہ نے دوسری ٹکر اس دیوار سے لی اور خون کی ندیاں بہہ نکلیں۔ بائیں جانب سے مکی رسالہ بڑھ آنا چاہیے تھا۔ مگر یہ کیا ہوا۔ وہ تو بہت پیچھے رک گیا۔ نہ معلوم رسالہ کیوں رک گیا۔ کیا مسلمان اتنے زیادہ ہیں؟ وہ تو چند نفوس تھے۔ اور پھر مکی سپاہ کا حوصلہ بڑھانے کے لیے ان کے کمانداروں کی آواز بلند ہوئی ہوگی مگر یہ آواز آج اپنی گرج کھو چکی تھی۔ بہادرانِ مکہ کے حملوں کے ریلے بڑی دیر تک اس انسانی جسموں کی دیوار سے ٹکراتے رہے۔ جونہی اس دیوار کا ایک فرد لبیک کر شہادتِ عظمیٰ حاصل کرتا اور صف میں جگہ خالی ہوتی تو پچھلی صف سے ایک اور فرد خاموشی سے آگے بڑھتا اور اس خلا کو پُر کر لیتا۔ دائیں بائیں والوں کی یہ فکر نہ تھی کہ ان کا پہلو خالی ہو جائے گا اور دشمن کو اندر داخل ہونے کی جگہ مل جائے گی مسجد نبویؐ

یں صف کے خلا پُر کرنے کی تربیت مل چکی تھی۔ اور پھر یہ بھی تو نماز تھی بلکہ حقیقی نماز جس کے لیے سالہا سال سے مشق ہوتی رہی تھی۔ مدتوں سے ان کی آرزو تھی کہ اللہ کرے کوئی یہ نہ کہہ دے، ع

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

معاً ایسا محسوس ہوا کہ ان ریلوں کی شدت اور رفتار میں کمی ہو رہی ہے۔ سپہ سالارِ مدینہؐ لحہ لحہ کی حالت کا جائزہ لے رہے تھے۔ آپ جھکے، مٹھی بھر کنکر اٹھائے اور دشمن کی طرف پھینکتے ہُوئے فرمایا:

"اب حملہ کرو۔ ان کو شکست ہوگی۔"

اور یہ آواز شرق و غرب کی پہاڑیوں سے ٹکرا کر کچھ اس طرح گونجی کہ لڑائی کے میدان اور بدر کی پُوری وادی پر پھیل گئی۔ کی فوج اپنا تمام زور ختم کر چکی تھی۔ مدنی فوج کے حملہ کی تاب نہ لا سکی۔ وُہ دیوار جو ان کی بار بار کوششوں سے حرکت میں نہ آئی تھی اب آگے کو بڑھ رہی تھی اور یہ بڑھتا ہوا انسانی سیلاب مکی سپاہ کو نہایت مہیب نظر آیا ہوگا۔ وُہ رُکے، رُک کر پلٹے اور پھر بھاگ کھڑے ہُوئے۔

بدر کی لڑائی ختم ہو چکی تھی۔ اپنے اور پرائے مقتول دفن کیے جا رہے تھے۔ شہداء کو وردی کے کفن میں دفنایا گیا۔ خونِ شہید سے پاک کوئی پانی نہیں ہو سکتا۔ وہ غسل اور کفن سے بہت بلند و بالا ہوتا ہے۔ دشمن کے اکثر آدمی کھیت رہے اور اتنے ہی قید کر لیے گئے باقی ماندہ نے تیز سواریوں پر مکہ کا رُخ اختیار کیا اور تجارتی قافلہ سے بہت پہلے وہاں پہنچ گئے اور اپنی ناکامی کی داستان سنائی جس کو لوگوں نے باور کرنے سے انکار کر دیا۔ بالآخر جب شکست کی تصدیق ہوگئی تو پورے شہر میں کہرام مچ گیا۔

مسلمانوں کے شہداء کی تعداد چودہ تھی۔ چھ مہاجر اصحابؓ اور آٹھ انصارؓ۔ اس فتح کا اثر انتہائی دور رس ہونا تھا۔ جزیرۃ العرب کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ مکہ کو شکست ہوئی تھی۔ قریشِ مکہ کا مدینہ کی نوزائیدہ مملکت سے شکست کھا جانا معمولی بات نہ تھی۔ یُوں محسوس ہو رہا تھا کہ عرب کی سرزمین پر ایک نیا سورج چمکنے والا ہے اور اس سورج کی روشنی ہر کس و ناکس کے لیے یکساں طور پہ فیض پہنچائے گی۔ یُوں بھی یثرب اب مدینۃ النبیؐ بن چکا تھا اور عرب قبائل کا رُخ مکہ کے علاوہ اس جانب بھی ہونا شروع ہو گیا تھا۔ فتحِ بدر نے مدینۃ النبیؐ کی حیثیت ہی بدل دی تھی۔ اب یہ ایک فاتح کا صدر مقام تھا۔ وہ فاتحؐ جو اللہ کی جانب سے ایک نیا قانون اور نیا نظامِ زندگی لے کر آیا تھا اور یہ جنگ جس کی پہلی لڑائی کا فیصلہ ربّ العزت نے اس کے حق میں کیا تھا یہ اسی نظامِ زندگی کے تحفظ و بقا کے لیے لڑی جا رہی تھی۔

اور وہ فرسودہ نظامِ زندگی جو بیت اللہ کے قرب سے مستفیض نہ ہو سکا اور جس کے نام لیواؤں نے خالقِ کائنات کے سوا دنیا کی ہر شے کو سجدہ کیا اس کا دیا اب ٹمٹما رہا تھا۔ اس کے بتوں کے پجاریوں نے اس شکست کو دل پر نقش کر لیا اور فیصلہ کیا کہ جب تک اس رسوائی کا بدلہ نہ لیں گے امن و چین سے نہ سوئیں گے۔ شہر میں منادی کر دی گئی کہ کوئی اپنے مقتولوں پر نوحہ نہ کرے۔ وہ غم کو پالنا چاہتے تھے کہ جس قدر اسے دم پخت کیا گیا اسی قدر جوابی کارروائی کے وقت ان کے جوانوں میں غم و غصہ شدید ہوگا۔ ابو سفیان نے قسم کھائی کہ جب تک دوبارہ خون نہ بہے گا وہ اس وقت تک بیوی کی خوابگاہ کا رُخ نہ کرے گا۔ اس کی بیوی نے بھی سوگند اٹھائی کہ جب تک اس کا خاوند دشمن پر حملہ آور نہ ہوگا وہ سُرمہ، تیل اور مستی کو اپنے اُوپر حرام کرے گی۔ اہلِ مکہ جوانمردی میں معروف تھے۔

ان کا غم سمجھ میں آسکتا تھا۔ ان کی عزت کی رکھوالی عورتوں نے بھی اس شکست کو صبر سے قبول کیا اور پورا ایک مہینہ آہ و بکا اور نوحہ سے احتراز برتا اور پھر جب انھوں نے اپنے غم کو الفاظ کا جامہ پہنایا تو سننے والوں کے دل دہل گئے۔ ایک مہینہ ختم ہونے سے قبل ابوسفیان مدینہ پر ناکام حملہ کر چکا تھا۔

مدینہ کی یہودی آبادی پر اس فتح کا اثر اس قدر ہوا کہ انھوں نے اس کے بعد کھلم کھلا حضورؐ کی مخالفت شروع کر دی۔ وُہ میثاقِ مدینہ کی دستاویز کے دستخط کنندہ تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے بدر کی لڑائی میں نہ شرکت کی تھی اور نہ اخراجات میں حصہ دار بنے تھے۔ در اصل وُہ اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھ رہے تھے اور نہ ہی انھیں مساواتِ انسانی اور دولت کی تقسیم کے اصول زکوٰۃ، صدقات اور خیرات کی شکل میں پسند تھے۔ خیال ہے کہ بدر سے قبل ہی انھوں نے مدینہ سے باہر رہنے والے یہودیوں کے توسط سے قریشِ مکہ کے ساتھ رابطہ قایم کر رکھا تھا۔ اس لیے کہ بدر کے چند ہی روز بعد یہودی قبیلہ بنو قینقاع نے بغاوت کر دی۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اہلِ مکہ اور بنو سُلیم سے ساز باز کر رکھی تھی کہ تینوں متحد ہو کر ایک بار پھر مدینہ پر حملہ کریں۔ یہ وہی بنو سُلیم قبیلہ ہے جو بدر کی لڑائی میں نجد سے آکر قریشِ مکہ کے شانہ بشانہ لڑا تھا۔ اگر قافلہ کا راستہ روکنا یا سرنگلہ بدر کا باعث ہوتا اور مکی فوج اور مدنی لشکر اتفاقاً بدر کے مقام پر آمنے سامنے ہو گئے ہوتے تو ممکن تھا مگر نجد کے دو قبیلے بنو سلیم اور بنو غطفان اسی صورت اس جنگ میں شامل ہو سکتے تھے کہ قریشِ مکہ نے انہیں ماقبل سے دعوت دی ہوتی، وقت اور مقام معین کیا ہوتا اور انھوں نے اس دعوت کو پہلے سے قبول کر لیا ہوتا ورنہ نجد کے رہنے والے قبیلے اتفاقاً وہاں نہیں موجود ہو سکتے تھے۔

جب بنو قینقاع سے کہا گیا کہ مدینہ کا امن وامان ضروری تھا اور جنگ سے کسی کو فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا تو انھوں نے جواب دیا:

> "ہمیں قریش کی طرح مت سمجھو۔ تم لوگوں نے ایک ایسی قوم کے ساتھ مقابلہ کیا تھا جنھیں معلوم نہیں کہ جنگ کیسے کرتے ہیں اور تم نے انھیں شکست دے دی۔ اللہ کی قسم اگر ہم تمہارے ساتھ لڑے تو تم صحیح مردوں سے مقابلہ کرو گے۔ ہم جانتے ہیں کہ لڑائی کس طرح کی جاتی ہے۔"

اس پر حضورؐ نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے واپس چلے آئے۔ اب ایک ایسا واقعہ ہُوا جسے کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جس کی وجہ سے فوراً کارروائی عمل میں لانا پڑی۔ ایک مسلمان لڑکی ایک یہودی سنار سے کچھ خریدنے آئی۔ ساتھ کی دُکان والے یہودی نے اس کا پیراہن اونچا کر دیا۔ اس نے دُہائی دی کہ:

> "کیا مدینۃ النبیؐ میں عورتوں کی عزت اسی طرح ہوا کرتی ہے۔"

پاس سے ایک مسلمان نوجوان گزر رہا تھا اس نے تلوار کھینچ کر بدکردار یہودی کا سر قلم کر دیا۔ پاس کے یہودیوں نے یہ دیکھا تو انھوں نے اکٹھے ہو کر اس مسلمان کو شہید کر دیا۔ حضور اقدسؐ نے فوراً لشکر تیار کیا اور بنو قینقاع کے قلعہ کا محاصرہ شروع کر دیا۔ ممکن ہے کہ بنو قینقاع کو امید ہو کہ باہر کی بستیوں کے یہودی ان کی مدد کو آئیں گے۔ مگر انھوں نے بیرونی کمک کا انتظار تک نہ کیا اور پندرہ دن کے بعد اس شرط پر دروازے کھول دیے کہ انھیں اپنا سامان لے جانے کی اجازت دی جائے اور وہ مدینہ سے چلے جائیں۔ ان کی یہ شرط قبول کر لی گئی اور انھوں نے اپنی خود پسند صلح کے مطابق اپنا قلعہ خالی کر دیا۔ مگر مکانوں کے دروازے تک اکھاڑ کر

لے گئے۔ تاریخ اس بات پر خاموش ہے بلکہ اس دور کے واقعات کے تقدم و تاخر میں بھی کہیں کہیں غلطی نظر آتی ہے۔ خیال ہے کہ یہودیوں نے ماقبل کے سمجھوتے کے مطابق قریشِ مکہ کو اطلاع دی کہ وُہ مسلمانوں کے خلاف بغاوت کر چکے ہیں اور اب اپنے قلعہ میں محصور ہیں۔ مکہ سے ابوسفیان آیا مگر اس وقت تک بنو قینقاع شہر بدر ہو چکے تھے۔ اس نے شہر کے باہر ایک یہودی سردار سلام بن مشکم سے حالات دریافت کیے۔ بنو قینقاع جنھوں نے بغاوت کی تھی وہ جا چکے تھے۔ اس لیے اس نے شہر کے مضافات میں چند درخت کاٹے اور دو آدمیوں کو قتل کرنے کے بعد رات کی تاریکی میں فرار اختیار کیا۔

"تاریخ بتاتی ہے کہ مکہ میں ایک ماہ تک سوگ رہا اور پھر بدر کے مقتولوں کی یاد میں ہر طرح کا نوحہ اور آہ و بکا سننے میں آیا۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ابوسفیان نے جو چھاپہ مدینہ کے مضافات میں مارا تھا اس سے اس کی واپسی ایک ماہ کے اندر ہو چکی تھی۔ اگر اس وقت تک بنو قینقاع کا محاصرہ ختم نہ ہوا ہوتا تو وہ ضرور اس یہودی قبیلہ کو مدد دیتا۔ اس لیے ہم اس میں حق بجانب ہیں اگر یہ کہیں کہ بدر سے واپسی کے جلد بعد بنو قینقاع کی بغاوت اور انخلاء اور ان کے جانے کے بعد ابوسفیان کا آنا اور رات ہی میں اپنی قسم پوری کر کے لوٹ جانا واقع ہوا۔ دُوسری صبح حضورؐ نے جلدی سے لشکر تیار کیا اور ابوسفیان کا تعاقب کیا۔ اس تعاقب کی وجہ سے ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں نے ستوؤں کے تھیلے پھینک دیے تاکہ اونٹ زیادہ تیزی سے دوڑ سکیں اور تعاقب ناکام رہے۔ اس وافر مقدار میں ستّو لانے سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ ابوسفیان یہودیوں کی مدد کو آیا تھا ورنہ اگر صرف چھاپہ مارنا مقصود ہوتا تو زادِ راہ سے زائد ستّو لانے کی ضرورت نہ تھی۔ ستّو پھینکے جانے کی وجہ سے اس مہم کو غزوۂ سویق کا نام دیا گیا ہے اور ہماری رائے میں یہ شوال ۲ھ ہجری کے پہلے نصف کا واقعہ ہے۔ بنو قینقاع کا غزوہ آخر رمضان ۲ھ ہجری سے شروع ہو کر شوال کے پہلے ہفتہ میں ختم ہو گیا ہو گا۔

ابوسفیان کے لوٹ جانے کے جلد بعد اطلاع ملی کہ بنو سُلیم جنھوں نے بدر میں لشکر بھیج کر مکہ کی مدد کی تھی، وہ مدینہ پر حملہ کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ ممکن ہے جب ابوسفیان مکہ سے اس لیے روانہ ہوا تھا کہ بنو قینقاع کی مدد کو پہنچے تو بنو سُلیم کو بھی اطلاع دے دی ہو گی کہ وُہ بھی مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں اور اس طرح بنو قینقاع کو گھیرے سے نجات دلائیں۔ ابوسفیان چونکہ محض ایک چھاپہ مار کر لوٹ گیا تھا اس لیے بنو سُلیم اپنی تیاریوں میں مصروف رہے۔ حضورِ اقدسؐ نے پچاس مہاجر اور انصار اصحابؓ پر مشتمل لشکر تیار کیا اور بنو سُلیم کو ان کے اپنے علاقہ میں ہی سزا دینے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ آپؐ چار ہی دن میں بنو سُلیم کے علاقے میں پہنچ گئے مگر آپؐ کی آمد کی خبر پا کر بنو سُلیم نے ایک دن قبل پہاڑوں کا رُخ کیا اور اپنی خیمہ گاہوں کو خالی کر گئے۔ یہ واقعہ شوال ۲ھ کے اواخر کا ہے۔ یوں غزوۂ بدر کے تقریباً ایک ماہ کے اندر ہی مدینہ کے خلاف اس اہم اور طاقتور جوڑ کا قلع قمع کر دیا گیا۔ یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ فتح بدر کے ایک ماہ کے اندر مجاہدوں کی تعداد تین سو تیرہ (۳۱۳) سے بڑھ کر چار سو پچاس تک پہنچ چکی تھی۔ اس مہم کو غزوۂ بنو سُلیم اور غزوہ الکدر کے نام دیے گئے ہیں۔

اس قبیلہ نے جلد بعد دوبارہ حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس لیے انھیں سزا دینے کے لیے ایک اور مہم نکالی گئی۔ اس بار بھی قیادت حضورؐ نے اپنے ہاتھ میں رکھی۔ مگر بنو سُلیم نے اس مرتبہ بھی اپنی خیمہ گاہوں کو چھوڑ کر پہاڑوں میں پناہ لے لی۔ اس

مہم کو غزوۂ بنو سلیم ثانی کہا گیا ہے اور یہ ذوالقعدہ ۲ھ میں واقعہ ہُوا۔

بنو غطفان جو نجد کے رہنے والے تھے انہوں نے بھی بدر کے مقام پر قریش مکّہ کی مدد کی تھی۔ یہ نہایت ہی طاقتور قبیلہ تھا اور پانچ ہزار (۵۰۰۰) ہتھیار بند میدان جنگ میں مہیا کر سکتا تھا۔ اطلاع ملی کہ بنو غطفان مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ حضورؐ نے فوراً لشکر تیار کیا اور پیشتر اس کے کہ وُہ پوری تیاری کر کے مدینہ پر حملہ آور ہوتے۔ آپ نے ان کی خیمہ گاہوں کا رُخ کیا۔ اس مرتبہ بھی آپؐ کے ہمرکاب چار سو پچاس (۴۵۰) کے قریب مہاجر اور انصار اصحابؓ تھے۔ بنو غطفان چونکہ ابھی تیار نہ تھے اس لیے مدینہ کے لشکر کی آمد کی خبر سن کر پہاڑوں میں رُوپوش ہو گئے۔

بدر کے بعد سے شام کا ساحلی تجارتی راستہ مکمل طور پر مدینہ کے زیر اثر آچکا تھا۔ امکان تھا کہ قریش آیندہ اپنی تجارت جاری رکھنے کے لیے نجد کے راستہ عراق سے تجارتی روابط قایم کریں۔ اس لیے ضروری تھا کہ قریش کے حلیفوں کے علاقہ میں چند روز قیام کیا جائے اور سفارتی تعلقات بڑھا کر مکّہ کے لیے اس شاہراہ کو بھی مشکل بنا دیا جائے۔ بعض مفکروں نے مورخوں کی اس رائے سے اتفاق کیا ہے کہ حضور اقدسؐ بدر سے قبل بھی اہل مکّہ کے قافلوں کی تلاش میں لشکر روانہ کیا کرتے تھے۔ ہمیں اس سے انکار نہیں کہ مکّہ اور مدینہ کے درمیان چونکہ جنگ شروع ہو چکی تھی اس لیے مدینہ حق بجانب تھا اگر اقتصادی ہتھیار کے استعمال کے طور پر مکّہ کی اس تجارتی شاہراہ کو مسدود کرنے کی کوششیں جاری رکھتا۔ البتہ ہمیں اس رائے سے اس لیے اختلاف ہے کہ ابھی مدینہ اتنا طاقتور نہیں ہُوا تھا کہ وہ حملہ میں پہل کرتا اور نہ ہی نظریاتی طور پر مسلمان حملے میں پہل کر سکتے تھے۔ یہ وُہ دور ہے کہ جس کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ " تم ڈر رہے تھے کہ لوگ تمھیں اُچک نہ لیں"۔

اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حضور اقدسؐ کبھی کوئی کام سوچے بغیر ہاتھ میں نہیں لیتے تھے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ حضورؐ تین بار خود تشریف لے جائیں اور تین بار کبار صحابہؓ کو روانہ فرمائیں اور ہر بار قافلہ ہاتھ سے نکل جائے۔ بعد کے غزوات اور سرایا کے نتائج سے یہ امر واضح ہو جائے گا کہ آپ کا ہر اقدام سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت عمل میں آتا تھا حتیٰ کہ لشکروں کی تعداد، کمانداروں کی شخصیت اور علمبردار کی قابلیت۔ یہ تمام باتیں انتہائی غور و فکر کے بعد فیصلہ کی جاتی تھیں۔ آپؐ کے خلاف پورا جزیرۃ العرب مکّہ کا حلیف بن چکا تھا۔ آپؐ نے مدینہ اور اس کی حدود کی حفاظت کرنا تھی اور مدینہ کی بقاء کے ساتھ ساتھ اور مدینہ کے مسلمانوں کی چھوٹی سی جماعت کے ساتھ اسلام کا مستقبل وابستہ تھا۔ لشکر کے افراد کے حوصلہ کا خیال، رائے عامہ کی جانب نظر، دشمن کے ارادوں کے قوی ہونے کا خطرہ، ان تمام باتوں کے پیشِ نظر حضورؐ کا کوئی سریہ، کوئی غزوہ ناکامی سے دو چار نہیں ہو سکتا تھا جن غزوات اور سرایا میں دشمن قبائل بھاگ کر پہاڑوں میں روپوش ہو جاتے تھے وہ بھی کامیاب مہمیں تھیں۔ اس لیے کہ مقصد یہ نہ تھا کہ دشمنوں کو تباہ کیا جائے یا ان کے افراد کو ختم کیا جائے۔ حضورؐ کے پیشِ نظر جو مقصد تھا وہ اعلائے کلمۃ الحق تھا۔ آپ اللہ کا پیغام انسانیت تک پہنچانے کے لیے مبعوث ہُوئے تھے۔ اس لیے انسانیت کا زندہ رہنا ضروری تھا تاکہ اس تک حضورؐ اپنا پیغام پہنچا سکیں۔ یہ تو عصرِ حاضر کی جنگوں کا خاصہ ہے کہ کروڑوں آدمی مارے جاتے ہیں اور ان سے زاید جنگ کے نتیجہ میں جو بیماریاں پھیلتی ہیں ان کا شکار ہوتے ہیں اور پھر بھی جنگی مقاصد کی تکمیل نہیں ہو پاتی۔

غزوۂ بنوغطفان کے بعد حضورؐ چند ہفتے نجد میں ٹھہرے رہے مگر یہ قبائل جو ہزاروں کی تعداد میں ہتھیار بند مہیا کر سکتے تھے ؛ ہیبت سپاہِ شاہِ مدینہ سے اس قدر خوفزدہ تھے کہ اپنے علاقہ میں ہی مدنی لشکر پر حملہ کرنے کی جرأت کر سکتے۔ مدینہ پر حملہ کی تیاریوں کی وجہ یہ تھی کہ قریش مکہ کا ساتھ اور مدینہ کے اندر رہنے والے یہودیوں کی خفیہ مدد کی امید ہُوا کرتی تھی۔ غزوۂ غطفان ربیع الاوّل ۳ھ میں واقع ہُوا۔ اس کے جلد بعد ربیع الآخر ۳ھ میں غزوۃ القردہ پر آپ تشریف لے گئے۔ یہ غزوہ خالصتاً سفارتی تعلقات بڑھانے کی غرض سے عمل میں لایا گیا تھا۔ اس کے دوران شام کی تجارتی سرحد پر مزید غور و فکر ہُوا تاکہ اسے قریشِ مکہ استعمال نہ کر سکیں۔ اس سفر کی وجہ سے اہل مکہ یہ سمجھے کہ آپؐ نجد کی طرف سے غافل ہیں۔ اس لیے انہوں نے ایک تجارتی قافلہ تیار کیا اور اسے نجد کے راستہ عراق عرب روانہ کیا۔ نجد کے قبائل کی اکثریت مکہ کے حلیفوں پر مشتمل تھی مگر اس کے باوجود وہ اس تجارتی راستہ کو استعمال نہ کر سکے۔ حضورؐ کو معلوم ہو گیا تھا کہ مکی قافلہ کب مکہ سے روانہ ہوا ہے۔ آپؐ قافلوں کی رفتار کا تجربہ رکھتے تھے۔ آپؐ نے زید بن حارث کو چھوٹی سی جماعت دے کر روانہ فرمایا۔ انہوں نے آپ کی ہدایات کے مطابق القردہ کے مقام پر مکی قافلہ کو جا لیا اور ان کا تمام سامان اور بار برداری کے جانور پکڑ لیے۔ ابُوسفیان بن حرب جان بچانے میں کامیاب ہو گیا۔

بدر سے اب تک کے دَور کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ دَور بھی خاصا اہم اور شہنشاہِ مدینہ کے لیے مصروف رہا ہے۔ اس دور میں آٹھ مہمیں مدینہ سے باہر گئیں۔ ان میں سے سات کی قیادت حضور انورؐ نے بہ نفس نفیس فرمائی۔ صرف ایک سریہ صحابی کی قیادت میں روانہ کیا گیا۔ یہ صحابی حضورؐ کا آزاد کردہ غلام تھا مگر حضورؐ انہیں کسی اہم خدمت کے لیے تیار کر رہے تھے۔ سپہ سالاروں کی تربیت کی جانب جس قدر توجہ آپؐ نے فرمائی اتنی توجہ صدیوں کی تاریخِ جنگ میں کسی سپہ سالارِ اعظم نے نہیں دی۔ حضورؐ جانتے تھے کہ اس نئے نظامِ حیات کے خلاف دنیا کی تمام طاقتیں صف آرا ہوں گی اور اس نظامِ حیات کے دفاع کے لیے مدتوں تک ملت کو قربانیاں پیش کرتے رہنا پڑے گا اور شہادت کے طلبگاروں کی قیادت کیلیے سپہ سالاروں کی تربیت از بسکہ ضروری تھی۔ اس دور کی آخری مہم یہ سریہ تھا جس کے نتیجہ میں اہل مکہ نے دیکھا کہ ان کی تجارت کی تمام راہیں مسدود ہو چکی ہیں۔ اب اگر انھیں زندہ رہنا تھا تو مدینہ کو شکست دے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کا وجود ختم کرنا ضروری تھا ورنہ ان کے خیال میں وُہ خود آزاد اور باوقار زندگی نہ گزار سکتے تھے۔ اس دور کا اختتام غزوۂ اُحد پر ہوتا ہے اور اس کا مقصد بھی بدر کی طرح اسلام اور مسلمانوں کو ختم کرنا تھا۔ اُحد کی لڑائی شوال ۳ھ میں ہُوئی۔

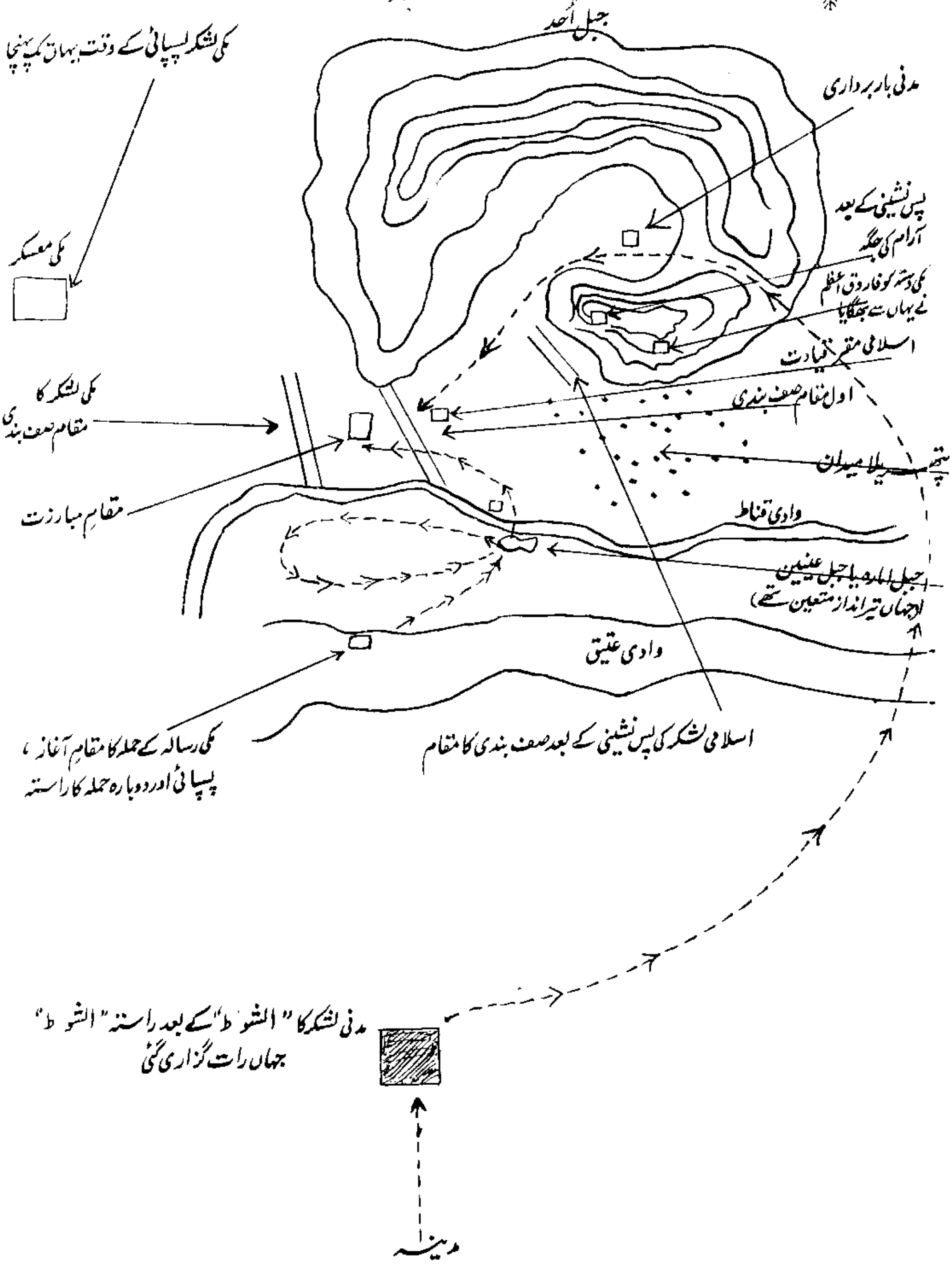
حضور انورؐ مسجد قبا میں تشریف فرما تھے کہ مکہ سے خط کے ذریعہ اطلاع ملی کہ قریشِ مکہ تین ہزار کی جمعیت کے ساتھ مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے نکل کھڑے ہُوئے ہیں۔ یہ اطلاع آپؐ نے اپنے تک رکھی تاکہ شہر میں خوف و ہراس نہ پھیل جائے۔ اور جو لوگ خفیہ طور پر مکہ کے ہم خیال تھے وُہ مکی لشکر کی مدد کی تیاریاں نہ شروع کر دیں۔ خط اُبَیّ بن کعب نے پڑھا تھا اور اُسے آپؐ نے منع فرما دیا کہ کسی سے خط کے مضمون کا ذکر نہ کرے۔ جب آپؐ کے خیال میں مکی لشکر مدینہ کے قریب پہنچنے والا تھا تو آپؐ نے حضرت خبابؓ کو روانہ فرمایا کہ مکی لشکر کی نقل و حرکت کو نگاہ میں رکھے۔ مکی لشکر مدینہ کے قریب پہنچ کر مدینہ کے شمال میں کوہِ اُحد سے مغرب کی جانب خیمہ زن ہو گیا۔

حضورؐ نے دوسرے دن مسلمانوں کو اکٹھا کیا اور مشورہ طلب فرمایا کہ دشمن کا مقابلہ کس طرح کیا جائے۔ حضورؐ خود شہر کے اندر

(نقشہ "ج")

اُحد کی لڑائی کا میدان (بے پیمانہ)

(۶ شوال ۳ھ ہجری)



رہ کر مقابلہ کرنے کے حق میں تھے مگر بہت سے ایسے نوجوان موجود تھے جو معرکۂ بدر میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ ان کے اصرار پر مجمع کی اکثریت کا رجحان شہر سے باہر نکل کر مقابلہ کرنے کے حق میں نظر آیا۔ البتہ عبداللہ بن اُبَی جو منافقین کا رہنما تھا حضورؐ کے ساتھ متفق تھا۔ سرور دو عالمؐ اُٹھے اور مکان کے اندر جا کر زرہ و خود پہن کر مجمع میں تشریف لائے۔ اب لوگوں کو خیال ہوا کہ شاید آپؐ ان کے اصرار کو بُرا مان گئے ہیں اور کہنے لگے کہ جس طرح آپؐ کی مرضی۔ حضورؐ نے فرمایا:

"پیغمبرِ خدا کے لیے مناسب نہیں کہ جب وہ ایک بار زِرہ پہن لے تو اسے اس سے قبل اتار دے کہ اللہ اس کے اور اس کے دشمنوں کے درمیان فیصلہ فرما دے۔"

اب آپؐ نے تین نیزے منگائے۔ ایک پر مہاجر سپاہ کا علم باندھا اور وہ حضرت مصعبؓ کو عطا فرمایا اور دوسرے دو انصار سپاہ کے دونوں قبیلوں اوس اور خزرج کو عطا فرمائے اور پھر گھوڑے پر سوار ہوتے ہوئے روانگی کا اشارہ فرمایا۔ آج مدینہ کی فوج کی تعداد ایک ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ وہ مسافر جو دو سال قبل اپنے صادق ترین صحابیؓ سفر و حضر کے ساتھی صدیق اکبرؓ کے ساتھ یثرب پناہ لینے کے لیے پہنچے تھے آج مملکتِ مدینہ کے صدر مقام مدینۃ النبی سے ایک ہزار کے لشکر کے ساتھ اس مملکت اور اس کے رہنے والوں کے دفاع کے لیے علم لہراتے ہوئے میدانِ جنگ کو تشریف لے جا رہے تھے مگر ابھی "عشق کے امتحان" اور بھی باقی تھے راتؐ "الشوط" کے مقام پر گزارنے کے بعد عبداللہ بن اُبَی اپنے تین سو منافق ساتھیوں کو لے کر یہ کہتے ہوئے واپس مدینہ چلا گیا کہ شہر کے اندر سے دفاع کرنے کا اس کا مشورہ چونکہ قبول نہیں کیا گیا تھا اس لیے وہ اپنے آدمی بے فائدہ مروانا نہیں چاہتا تھا۔ حضور اقدسؐ کے پاس اب صرف سات سو (۷۰۰) کی جمعیت رہ گئی تھی۔

حضور اکرمؐ نے اس لشکر کے ساتھ پہلے سیدھے مشرق کا رُخ اختیار کیا۔ پھر معمولی بائیں کو مُڑ کر کوہِ اُحد کے جنوب مشرقی کونے میں جو چھوٹی سی گھاٹی ہے اس سے داخل ہو کر اُحد کے درمیان کھُلے میدان میں بار برداری کے اونٹ چھوڑے اور پھر اُحد کے جنوب میں جو گھاٹی ہے اُس سے نکل کر اُحد کے جنوب مغربی کونے پر صف آراء ہوگئے۔ یہاں سے مکی معسکر نظر آ رہا تھا۔ آپؐ نے صبح کی نماز اسی مقام پر ادا کی اور پھر دشمن کا انتظار فرمانے لگے۔ اب آپؐ کی صفوں کا داہنا کنارا اُحد کے ساتھ ملحق تھا اور بایاں کنارہ وادیٔ قناط کے کنارے تک پہنچا ہُوا تھا۔ (ملاحظہ ہو نقشہ "ج")

اس طرح صف آرائی میں آپؐ کی صفوں کا رُخ تقریباً مغرب، جنوب مغرب کی جانب تھا اور مدینہ قدرے بائیں، مگر سامنے تھا۔ اُحد آپؐ کے داہنے تھا اور پتھریلا میدان جس میں آج کل عمارتیں بن چکی ہیں، عقب میں تھا۔ بائیں اور پیچھے جبل العینین تھا جسے اب جبل رماۃ کہا جاتا ہے۔ اس دو گنبدی پہاڑی پر آپؐ نے پچاس (۵۰) تیر انداز متعین فرمائے تاکہ اگر وادیٔ قناط کے راستہ سے ہوتا ہُوا دشمن کا رسالہ عقب سے حملہ آور ہونا چاہے تو اسے تیروں کی بوچھاڑ سے روک لیا جائے۔ آپؐ نے اپنے دونوں پہلوؤں کو اس خوبی سے تدبیراتی (TACTICAL) طور پر محفوظ کر لیا تھا کہ دشمن کا مضبوط اور طاقتور رسالہ بیکار ہو گیا تھا۔

مکی لشکر مدنی لشکر کو صف آراستہ دیکھ کر باجے گاجے اور دف کی جھنکار کے شور میں آگے بڑھا اور قریب آ کر رُک گیا۔ اس مرتبہ مکی لشکر نے بھی صفیں آراستہ کیں اور حسبِ معمول مبارزت کے لیے مدنی لشکر کو للکارا۔ طلحہ مکی فوج کا علمبردار تھا۔ پہلے وُہ

آگے بڑھا۔ حضورؐ نے زبیرؓ کو اس کے مقابلہ کے لیے منتخب فرمایا۔ زبیرؓ نے پہلے ہی وار میں طلحہ کا سر قلم کر دیا۔ طلحہ کے بعد طلحہ بن ابو طلحہ نے مکی علم سنبھالا اور وہ مبارزت کے لیے آگے بڑھا اور پلک جھپکنے میں ختم کر دیا گیا۔ اب مکی علم کے گرد مبارزت کے ایسے جوہر اور ہمت و استقلال کے نمونے دیکھنے میں آئے جن کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ طلحہ بن ابو طلحہ کے بعد اس کے بھائی شیبہ نے علم سنبھالا۔ اُسے حمزہؓ نے قتل کیا۔ اب ابو سعید بن ابو طلحہ نے علم ہاتھ میں لیا۔ اسے سعد وقاصؓ نے نیزہ کے وار سے ختم کیا۔ غرضیکہ مکی علم آٹھ ہاتھوں نے سنبھالا اور سبھی کا خاتمہ آناً فاناً ہوتا گیا۔ ہر بار کوہِ اُحد اللہ اکبر کی صدا سے گونج اُٹھا۔ مکی کماندار ابو سفیان اس منظر کی تاب نہ لا سکا اور عام حملہ کا حکم دے دیا۔

یہ حملہ بدر کے معرکہ کی طرح پھر اسی ناقابلِ تسخیر چٹان سے ٹکرایا اور مکی فوج اس طرح بکھر گئی جس طرح سمندر کی بے تاب مگر مجبور لہریں ساحلِ سمندر کی چٹانوں سے ٹکرا کر پارہ پارہ ہو جاتی ہیں۔ مکی کماندار نے بہت حوصلہ افزائی کی۔ اس کی فوج نے بار بار بڑھنے کی کوشش کی مگر ہر بار ناکامی ہوئی اور پھر معاً مکی فوج بھاگ کھڑی ہوئی۔ مدنی فوج نے اس کا تعاقب کیا۔ اُدھر بائیں جانب مکی رسالہ بھی روک لیا گیا تھا۔ اس کے کماندار خالد کے جوہر ابھی نمایاں نہیں ہوئے تھے۔ جونہی مکی فوج میں بھگدڑ مچی مکی رسالہ بھی پسپائی پر مجبور ہو گیا۔ مدنی فوج بڑھ کر مکی معسکر تک جا پہنچی۔ جونہی جبل رماۃ پر متعین تیر اندازوں نے دیکھا کہ مکی فوج بھاگ کھڑی ہوئی ہے اور اس کے رسالہ کا حملہ بھی انہوں نے پسپا کر دیا ہے وہ بھی مالِ غنیمت جمع کرنے کے خیال سے اپنے مقام سے ہٹ گئے۔ صرف کماندار اور نو یا دس افراد اپنے مقام پر قایم رہے۔ حضور اقدسؐ نے ان پچاس افراد کو اس پہاڑی پر متعین کرتے وقت فرمایا تھا کہ "چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو انہوں نے وہاں پر قایم رہنا ہے اور" اگر دیکھو کہ ہمارا گوشت گدھ نوچ رہے ہیں تو بھی تم اس مقام سے نہ ہلنا" حکم عدولی کی سزا سخت ہوتی ہے۔ فوجی انضباط حکم عدولی کو قبول نہیں کرتا۔ جنگ میں متعین مقام کو چھوڑنے کی سزا موت ہے اور بجا طور پر یہ سزا مقرر کی گئی ہے۔ غیر انضباطی اور حکم عدولی میدانِ جنگ میں شکست کا باعث بنا کرتی ہیں۔ رسول اللہؐ کے حکم کی خلاف ورزی اور لشکر خیر البشر ختم الرسلؐ جس کی فوج نے آدابِ رزم و بزم سکھائے تھے اس میں غیر انضباطی اور حکم عدولی کا واقعہ سرزد ہو جائے۔ اس کی سزا اللہ العٰلمین کی جانب سے ہونی تھی۔ وہی ہوا۔

جب مکی رسالہ بھاگا جا رہا تھا تو خالد بن ولید کے قریب کے ایک شخص نے مُڑ کر دیکھا اور جبل رماۃ کو خالی پایا۔ اس نے خالد سے پکار کر اس امر کی نشان دہی کی۔ خالد نے بھی بھاگتے ہُوئے مُڑ کر دیکھا اور وُہ پہاڑی جس نے اس کے حملہ کو دیر تک روکے رکھا تھا اسے خالی پایا۔ راوی کہتا ہے: "خالد نے اپنے گھوڑے کی باگ موڑی اور ہم نے بھی اس کے ساتھ اپنے گھوڑوں کی باگ موڑی اور جبل رماۃ پر جو لوگ رہ گئے تھے ان کو سُموں تلے کچلتے ہُوئے مدنی فوج پر عقب سے حملہ کر دیا"

مکی فوج جو بے حواس ہو کر بھاگ رہی تھی اور جس کے خیموں تک مدنی مجاہد پہنچ چکے تھے اسے جب معلوم ہُوا کہ فاتح فوج بکھری ہُوئی حالت میں مکی سوارہ (CAVALRY) کے گھیرے میں آ گئی ہے اس نے فرار ختم کیا اور دوبارہ مدنی فوج پر پلٹ پڑی۔ آناً فاناً نقشہ بدل گیا۔ جب کوئی فوج فرار اختیار کرتی ہے تو فاتح فوج کی ترتیب بھی قایم نہیں رہ سکتی۔ اس لیے کہ اس نے قیدی پکڑنے ہوتے ہیں، اسلحہ اکٹھا کرنا ہوتا ہے اور یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ مفتوح مکمل طور پر میدانِ جنگ چھوڑ جائے۔ مدنی

فوج بھی قیدی پکڑنے اور اسلحہ اکٹھا کرنے میں مصروف تھی۔ ظاہر ہے کہ قیدی پکڑنے کے لیے فرداً فرداً انھیں ان کا پیچھا کر کے پکڑنا پڑا ہوگا۔ اس لیے وہ ایک ایک اور دو دو ہو گئے ہوں گے۔ بعض مؤرخوں کا اس بات پر زور دینا کہ مکی سوارہ (CAVALRY) کے عقبی حملہ کی وجہ سے وہ ایک ایک اور دو دو ہو گئے تھے درست معلوم نہیں ہوتا۔ وہ مکی سوارہ پہنچنے سے قبل ہی ترتیب کھو بیٹھے تھے مدنی فوج کی اتلاف (CASUALTIES) سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انصار صحابہؓ جن کی تربیت اس قدر پختہ نہ تھی جتنی کہ مہاجر اصحابؓ کی تھی ان کے شہداء کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ لڑائی ختم ہونے تک ستر انصار اور چار مہاجر اصحاب شہادت کا مقام حاصل کر چکے تھے۔ دونوں کی کل تعداد کو نظر میں رکھا جائے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ انصار اصحابؓ کی تربیت ابھی بہتر ہو سکتی تھی۔ بعد کے غزوات نے ثابت کر دکھایا کہ بہت جلد یہ کمی پوری کر لی گئی۔

جب حضورِ اقدسؐ نے دیکھا کہ فوج پر دو طرفہ حملہ ہو گیا ہے تو آپ نے اپنی سپاہ کی دوبارہ تنظیم شروع کر دی۔ عین لڑائی کے میدان میں جب گھمسان کی دست بدست لڑائی ہو رہی ہو اس وقت گھری ہوئی فوج کو دوبارہ منظم کر کے نرغے سے نکالنا معمولی کام نہیں۔ چونکہ دشمن کا تعاقب کرتے ہوئے بعض افراد بہت آگے نکل گئے تھے اور انھیں شاید یہ احساس بھی نہ تھا کہ حضورؐ نے فوج کو دوبارہ منظم کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس لیے آپؐ نے بلند آواز سے پکار کر فوج کو اپنے گرد جمع ہونے کا حکم دیا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

"یہاں ہوں میں اللہ کا رسولؐ، یہاں آؤ، میرے پاس لوٹ آؤ، اور میری طرف آؤ، فلاں اور فلاں اور فلاں میری طرف اور فلاں یہاں، ہوں میں اللہ کا رسولؐ۔"

حضور اقدسؐ کے ساتھ حضورؐ کا محافظ دستہ ہمہ وقت موجود رہا تھا۔ یہ چودہ اصحاب تھے، سات مہاجر اور سات انصار۔ انہوں نے سوارہ کا حملہ نہایت دلیری سے روکا۔ آپؐ کی آواز سن کر سپاہ آپ کے گرد جمع ہونا شروع ہو گئی اور آپؐ ان کو منظم کرتے ہوئے آہستہ آہستہ پس نشینی بھی کرتے جاتے تھے اور دشمن کے پے بہ پے حملوں کو روکتے جاتے تھے۔ آپؐ زخمی بھی ہو چکے تھے، دو دندان مبارک شہید ہو چکے تھے۔ خود کی کڑیاں چہرے کے گوشت میں پیوست ہو چکی تھیں۔ دشمن کا زور بھی آپؐ ہی کے گرد تھا تاکہ حلقہ توڑ کر آپؐ تک پہنچا جائے۔ مگر شمعِ نبوت کے پروانے یہ کب ہونے دیتے تھے۔ بالآخر آپؐ نے بقیہ اصحابؓ کے ساتھ اُحد کے جنوبی حصہ کی بلندی حاصل کر ہی لی۔ اب دشمن کو ناکام لوٹنا پڑا۔ بائیں جانب سے مکی سوارہ نے بھی برابر کی بلندی سے حملہ کرنے کی کوشش کی مگر حضورؐ نے حضرت عمرؓ کو چند مہاجر صحابہ دے کر دشمن کو بھگا دیا۔ یہاں پر حضورؐ کے زخم دھوئے گئے۔ اس پس نشینی میں وقت صرف ہوا ہوگا اس لیے کہ مدینہ خبر چلی گئی کہ حضورؐ شہید ہو گئے ہیں۔ وہاں سے اور لوگوں کے علاوہ حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت فاطمۃ الزہراؓ تشریف لے آئیں۔ حضرت فاطمہؓ نے ہی حضورؐ کے زخم دھوئے اور حضرت عائشہؓ نے زخمیوں کو پانی پلایا۔ مکی فوج کا سپہ سالار قریب آیا اور آ کر کہا کہ بدر کا بدلہ اُتر گیا ہے اور پھر اگلے سال انہی دنوں میں بدر کے مقام پر فیصلہ کن لڑائی لڑنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ جب سرکارِ دو عالمؐ نے مکی فوج کو واپس جاتے دیکھا، تو آپؐ نے بھی فوج کو مدینہ واپسی کا حکم دے دیا۔

بعض مؤرخوں نے اُحد کو اسلامی فوج کی شکست بتایا ہے۔ ہمیں اس رائے سے اختلاف ہے۔ فتح و شکست سے ساتھ کچھ عوامل وابستہ ہوتے ہیں۔ مثلاً :

۱۔ حملہ آور فوج کا مقصد۔ اگر یہ مقصد حاصل نہ ہو تو اسے فاتح نہیں کہا جا سکتا۔

۲۔ لڑائی کے بعد لڑائی کے میدان سے ایک فریق کا نکل جانا۔ اس موقع پر حالانکہ مدنی فوج کو پسپائی کرنی پڑی تھی مگر وہ لڑائی کے میدان میں آخر تک مجبور رہی تھی۔

۳۔ فتح کا ثبوت مالِ غنیمت اور جنگی اسیر ہوا کرتا ہے۔ مکی فوج نہ تو مالِ غنیمت حاصل کر سکی تھی اور نہ ہی مدنی فوج کا ایک فرد بھی اسیر کیا جا سکا تھا۔

۴۔ حملہ آور جس مملکت پر حملہ کر رہا ہے اس کی سرزمین کا کچھ حصہ اپنے زیرِ نگیں کرے۔ اس پہلو سے بھی مکی حملہ آور کسی طرح کی کامیابی حاصل نہ کر سکے تھے۔

۵۔ بین الاقوامی سطح پر حملہ آور کو کوئی خاص فائدہ حاصل ہو۔ اُحد کے موقعہ پر حملہ کرنے سے قبل مکی قافلوں کے لیے دونوں راستے بند تھے۔ اس لڑائی کے بعد یہ دونوں راستے مثل سابق مسدود رہے۔ یعنی جن علاقوں پر مدینہ بدر کے بعد سے اثر حاصل کر سکا تھا وہ اثر اُحد کی وجہ سے ضایع نہیں ہوا۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ قبل دوپہر جو کامیابی اور فتح مدنی فوج کو حاصل ہوئی تھی وہ کھو دی گئی۔ اور یہ لڑائی ہار جیت کے بغیر ختم ہوئی۔

دُوسری صبح حضورِ انورؐ نے اُحد میں شریک مجاہدوں کو حاضری کے لیے بلایا اور مکی فوج کے تعاقب کے لیے روانہ ہوئے۔ بہت سے مسلمان شامل ہونا چاہتے تھے جو کسی وجہ سے اُحد میں شریک نہیں ہو سکے تھے آپ نے انہیں اس لشکر میں شامل ہونے کی اجازت نہ دی۔ یہ غزوۂ اُحد کی لڑائی کا حصہ تھا اس لیے اس میں وہی مجاہد شرکت کا حق رکھتے تھے جو اُحد میں شامل تھے۔ آج اسلامی سپاہ کی تعداد گھٹ کر پانچسو چالیس (۵۴۰) رہ گئی تھی۔ صرف حضرت جابر بن عبداللہؓ واحد خوش قسمت شخص تھے جنہیں اُحد میں شریک نہ ہونے کے باوجود ساتھ لے لیا گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُحد کے روز حضرت جابرؓ کے والد حضرت عبداللہؓ چاہتے تھے کہ خود تشریف لے جائیں اور حضرت جابرؓ کو بہنوں کی حفاظت کے لیے مدینہ چھوڑ گئے تھے۔ حضرت عبداللہؓ اُحد میں شہید ہو گئے تھے اس لیے حضرت جابرؓ کا شرکت پر اصرار حق بجانب تھا اور رحمۃ للعالمینؐ نے انہیں اس غزوہ میں شرکت کی اجازت دے دی۔ آپؐ اس غزوہ میں حمراء الاسد تک تشریف لے گئے۔ جب ابوسفیان جس کا معسکر چند میل آگے تھا اس نے سُنا کہ آپؐ اس کے تعاقب میں نکل پڑے ہیں تو وہ تیزی سے مکہ روانہ ہو گیا۔ چونکہ غزوۂ حمراء الاسد غزوۂ اُحد کا شاخسانہ تھا اور مکی سپاہ اس تعاقب کی وجہ سے میدان چھوڑ گئی تھی اس لیے اگر کسی فریق کو ناکام کہا جا سکتا ہے تو وُہ قریشِ مکہ تھے نہ کہ مملکتِ مدینہ۔ بہرکیف مکہ کا پلڑا بھاری کہہ سکتے ہیں۔ مدینہ جیتی ہوئی بازی سے فائدہ نہ اٹھا سکا تھا اور ابھی دشمن میں اتنی سکت تھی کہ وُہ اس جنگ کو اور طول دے سکتا تھا۔ واقعات بتاتے ہیں کہ اس نے اس جنگ کو خاصا طول دیا۔

غزوۂ اُحد کے جلد بعد بنو عدل اور بنو قرع کے نمائندے مدینہ آئے اور اسلام لانے کی غرض سے کچھ اساتذہ کے لیے

درخواست کی۔ آپؐ نے سات آدمی ساتھ کیے۔ راستہ میں ان کے ساتھ دھوکا ہُوا اور ان میں سے پانچ کو شہید کر دیا گیا اور باقی دو کو اہلِ مکہ کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا جنھوں نے ان کو ازحد اذیتیں دے کر شہید کیا۔ یہ واقعہ الرجیع کے نام سے مشہور ہے۔ کچھ دنوں کے بعد عامر بن طفیل بنو عامر کا سردار اور ابو براء جو بنو سلیم سے متعلق تھے وہ مدینہ آئے اور انہوں نے بھی اساتذہ کے لیے درخواست کی۔ چونکہ ایک بار دھوکا ہو چکا تھا اس لیے آپؐ اساتذہ بھیجنے کے حق میں نہ تھے مگر ابو براء نے اپنی ذمہ داری پر انہیں لے جانے کا وعدہ کیا۔ اس جماعت کے ساتھ بھی دھوکا کیا گیا اور صرف دو اصحاب بچ کر واپس آئے۔ یہ واقعہ بئر معونہ کے نام سے معروف ہے۔ بنو عامر نے اس دوران میں دو آدمی مدینہ روانہ کیے کہ اس معاملہ میں وُہ بے قصور تھے۔ یہ دونوں واپس جا رہے تھے کہ اتفاق سے ان کی مڈبھیڑ ان دو اصحاب سے ہو گئی جو بچ کر واپس آنے تھے۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ حضورؐ ان دو آدمیوں کو معافی دے چکے ہیں۔ ان دونوں اصحاب نے بنو عامر کے ان دونوں آدمیوں کو قتل کر دیا حالانکہ یہ قتل غلطی سے ہُوا تھا آپؐ نے ان دونوں کا خون بہا ادا کر دیا۔

انہی دنوں ایک سریہ بھی روانہ کرنا پڑا۔ کچھ آدمیوں نے مدینہ کے اونٹ چرا لیے تھے ان کے تعاقب میں ایک سریہ روانہ کیا گیا جو اونٹوں کا کچھ حصہ ان ڈاکوؤں سے چھین کر واپس لے آئے۔ اسے سریہ قصم کا نام دیا گیا ہے اور یہ محرم ۴ھ کا واقعہ ہے۔

اُحد کی جیتی ہُوئی بازی کا ہاتھ سے جانا، ڈاکوؤں کا مدینہ کی چراگاہ سے اُونٹ ہانک کر لے جانا اور اساتذہ کی دو جماعتوں پر کامیاب حملے۔ ان تمام غیر مربوط باتوں میں ربط پیدا کرنے والے فتنہ انگیز افراد تو ہمیشہ موجود ہوتے ہیں۔ انہوں نے یہودی قبیلہ بنو نضیر کو شہ دی اور ممکن ہے کہ اس میں مکہ کا ہاتھ بھی شامل ہو۔ البتہ مدینہ کے منافقین کا ہاتھ ضرور تھا۔ انہوں نے بنو نضیر کو یقین دلایا تھا کہ :

"اگر تم پر حملہ ہوا تو ہم تمہاری مدد کو ضرور آئیں گے۔"

انہوں نے اور باتوں کے علاوہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کی سازش کی۔ آپؐ نے لام بندی کا حکم دیا اور فوراً ان کے قلعہ کا محاصرہ کر دیا۔ بنو نضیر نے تین ہفتوں تک انتظار کیا مگر نہ تو قریشِ مکہ ان کی مدد کو پہنچے اور نہ ہی عبداللہ بن اُبیّ نے ان کو کسی طرح کی مدد دی۔ بالآخر انہوں نے غیر مشروط طور پر شکست تسلیم کر لی۔ اس کے بعد عبداللہ بن اُبیّ نے ان کی سفارش کی اور حضورؐ نے اس کی منافقت کا علم رکھتے ہُوئے بنو نضیر کو بخش دیا اور انہیں ہتھیاروں کے علاوہ اپنا تمام اثاثہ مدینہ سے لے جانے کی اجازت دے دی وہ جا کر شام اور خیبر میں آباد ہو گئے اور وہاں بھی مدینہ کے خلاف شرارت کرنے سے باز نہ آئے۔ اس غزوہ کے دوران حضرت علی رضی اللہ عنہ علمبردار تھے۔ یہ ربیع الاوّل ۴ھ کا واقعہ ہے۔

بنو غطفان جو بدر میں قریش کا ساتھ دے چکے تھے اور اس کے بعد بھی انہوں نے مدینہ پر حملہ کی تیاری کی تھی وہ خیبر کے یہودیوں کے بھی حلیف تھے۔ ممکن ہے بنو نضیر نے خیبر پہنچ کر انہیں اکسایا ہو۔ جمادی الاول ۴ھ میں اطلاع ملی کہ وہ پھر مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ آپؐ نے جلدی سے چار سو مہاجر اور انصار اصحابؓ کا لشکر تیار کیا اور ان کی خیمہ گاہوں کا رُخ کیا۔ اس مرتبہ پھر بنو غطفان کو حضورؐ کی آمد کا علم ہو گیا اور وُہ پہاڑوں میں رُوپوش ہو گئے۔ اس سفر کا نام غزوۂ ذات الرقاع ہے۔ اب ابو سفیان نے پیغام روانہ کیا کہ گزشتہ سال والا بدر کے مقام پر طاقت کی آزمائش کا اقرار بدستور قائم ہے۔ ساتھ ہی حملہ کی

تیاریاں بھی شروع کر دیں اور ان تیاریوں کا چرچا عام ہونے لگا۔

حضور اقدسؐ شعبان ۴ھ (مارچ ۶۲۵ء ب م) مدینہ سے ایک ہزار پانچسو کی جمعیت کے ساتھ روانہ ہُوئے۔ فوج کے علاوہ آپؐ اپنے ساتھ بہت سے مدینہ کے تاجر بھی لیتے گئے تاکہ وہاں پر میلے کے دوران وہ تجارت کے ذریعہ نفع کما لیں۔ مدینہ کی فوج اور تاجر ایک ہفتہ بدر کے مقام پر ٹھہرے مگر ابوسفیان نہ آیا۔ وُہ مکہ سے تو روانہ ہُوا تھا مگر ایک ہی منزل چل کر لوٹ گیا اور کہا کہ اس سال اونٹوں کے لیے چارہ کی قلت ہے اس لیے لڑائی پر روانگی موزوں نہ ہو گی۔

جیسا کہ ذکر آ چکا ہے بنو نضیر کے کچھ یہودی شام کی سرحد پر چلے گئے تھے۔ خیال ہے کہ انہوں نے وہاں کے عیسائی قبائل کو مدینہ کے خلاف بھڑکایا۔ انہوں نے مدینہ کے تجارتی کاروانوں پر حملے شروع کر دیے۔ یہ بھی اطلاع ملی کہ یہ قبائل مدینہ پر حملہ کی تیاریاں بھی کر رہے ہیں۔ آپؐ ایک ہزار (۱۰۰۰) کا لشکر لے کر شمالی علاقوں میں گئے اور وہاں کچھ عرصہ ٹھہر کر آپؐ نے تجارتی راستوں کی حفاظت کے انتظامات کیے۔ کسی قبیلہ کو حملہ کی جرأت نہ ہُوئی۔ اس لیے آپؐ شمالی علاقہ میں امن و امان قائم کرنے کے بعد مدینہ لوٹ آئے۔ یہ سفر غزوۂ دومۃ الجندل کہلاتا ہے۔

اس دور کا اگر جائزہ لیا جائے تو نظر آئے گا کہ یہ دَور انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ اُحد کے واقعہ کی وجہ سے انضباط اور ثابت قدمی کی جانب پہلے سے زیادہ توجہ کی ضرورت محسوس ہو رہی ہو گی۔ اس دور کی سات مہموں میں سے چھ کی کمان سرورِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ میں رکھی۔ اس دور میں مدینہ سے غیر حاضری بھی زیادہ عرصہ کے لیے رہی مگر دشمنوں کو ہمت نہ پڑی کہ حضورؐ کی غیر حاضری میں مدینہ پر حملہ آور ہوں۔ حضورؐ اس سرعت سے سفر کرتے تھے اور اس درجہ رازداری رکھی جاتی تھی کہ کسی کو معلوم نہ ہوتا تھا کہ آپؐ کب کس مقام پر ہوں گے۔ اس لیے دشمن حضورؐ کی غیر حاضری میں بھی مدینہ پر حملہ کرنے سے قبل انتہائی غور و فکر کرتے ہوں گے۔ طویل عرصہ کی غیر حاضری سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ حضورؐ اپنی غیر حاضری میں نیابت کے جو انتظامات فرما جاتے تھے ان پر حضورؐ کو مکمل اعتماد تھا۔ ان نیابتوں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپؐ چاہتے تھے کہ اُمت میں زیادہ سے زیادہ امورِ مملکت سنبھالنے والے افراد تربیت پا لیں تاکہ حضورؐ کے بعد ریاست و مملکت کو خلا محسوس نہ ہو۔

ان دور دراز کے سفروں سے آپؐ کی فوج کی جسمانی اور ذہنی توانائی کا پتا بھی ملتا ہے۔ درست کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی عمر پچاس سال سے زیادہ ہو چکی تھی مگر حضورؐ جیسی ذہنی اور جسمانی صلاحیتیں کہاں کسی میں ہو سکتی تھیں۔ البتہ آپؐ فوج کے باقی افراد کو بھی توانائی کی بہترین حالت میں رکھنا چاہتے تھے۔ ان مہموں کے ذریعہ مملکتِ مدینہ کی سرحدوں کا تعین بھی کیا جا سکتا ہے کہ کس طرح بتدریج ہر سال مدینہ کی حدود ہر چہار سُو بڑھتی رہیں۔

اس دور میں بھی مکہ کے تجارتی کاروان مکہ سے شمال اور مشرق کی جانب سفر نہ کر سکے اور ان کا تجارتی سامان ضایع ہوتا رہا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مکہ اپنا پُرانا مقام تقریباً کھو چکا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ قریشِ مکہ کو اپنی ضایع ہوتی ہُوئی عزت اور ماسبق کے وقار کے کم ہونے کا علم نہ ہُوا ہو۔ وہ روزِ اوّل سے اسلام اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو ختم کرنے کے حق میں تھے۔ اب یکایک وُہ کس طرح مدینہ کی بالادستی کو قبول کر لیتے۔ اب انہیں بنو نضیر کی وجہ سے خیبر کے یہودیوں کی جانب سے پہلے سے زیادہ کمک کا اقرار ہوا۔

انہوں نے اپنے پرانے حلیفوں سے بھی راہ و رسم پیدا کیا اور اسلام کو کلیتاً ختم کرنے کی ایک اور کوشش کی۔ یہ کوشش غزوۂ احزاب یا غزوۂ خندق پر منتج ہوئی۔ بدرؔ اور اُحد کی لڑائیوں کی شدت کے باوجود خطرہ اور ابتلاء کا موقعہ اس سے قبل شاید ہی ہوا ہو۔ یہی وُہ معرکہ ہے جس کے متعلق ارشادِ ربانی ہے کہ مسلمانوں کے دل دہل گئے تھے۔ (احزاب ۳۳ : ۱۱)

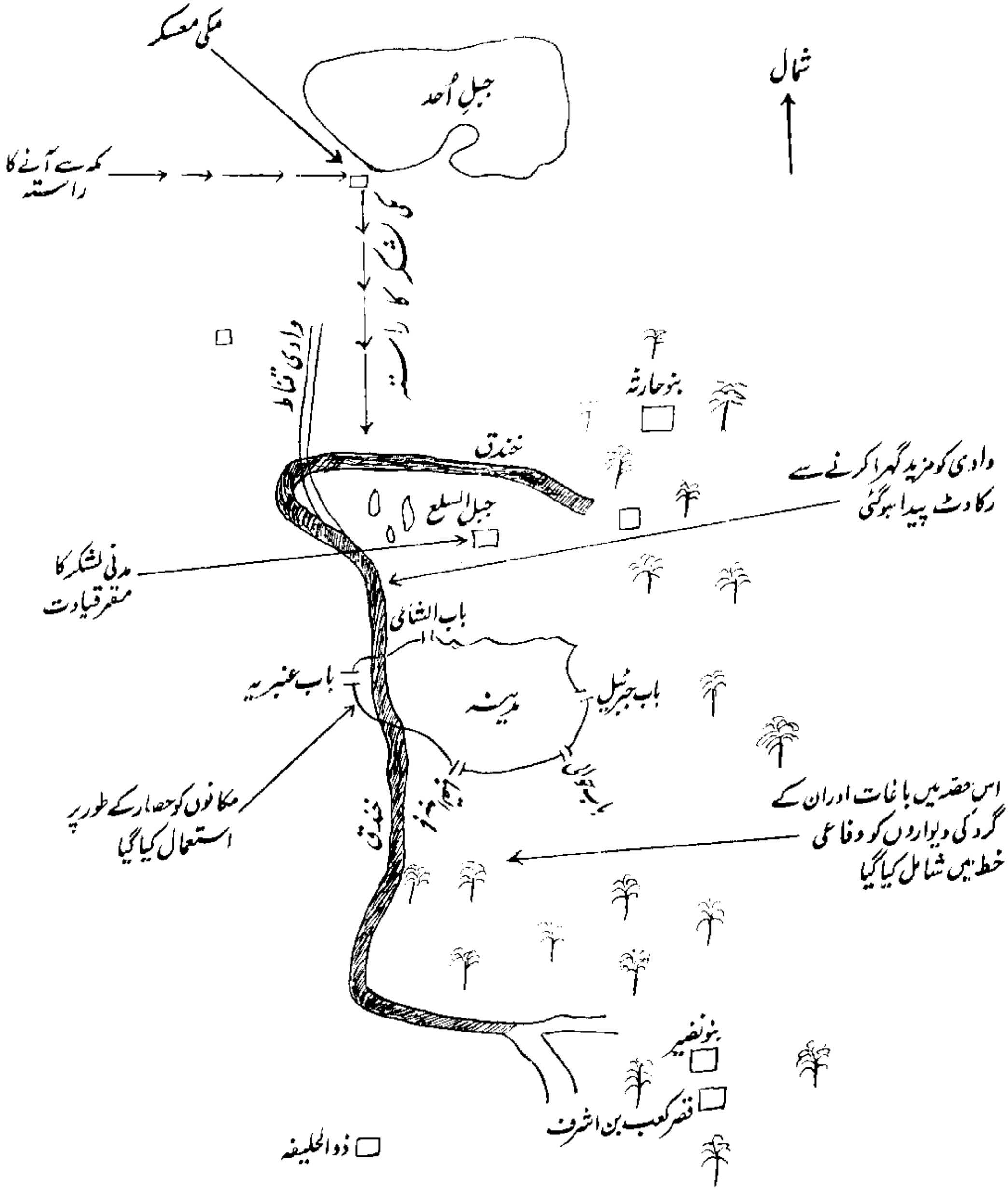
حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو خفیہ پیغام کے ذریعہ ذوالقعدہ ۵ھ میں اطلاع ملی کہ قریش مکہ بہت بڑی جمعیت لے کر مدینہ پر حملہ کے لیے چل پڑے ہیں۔ آپؐ لشکروں کی رفتار سے واقف تھے۔ اُحد کے وقت بھی آپؐ کو مکی فوج کی روانگی کی جب اطلاع ملی تھی تو آپؐ نے ان کے پہنچنے کا وقت درست متعین کر لیا تھا۔ اس مرتبہ آپؐ کا پختہ ارادہ تھا کہ مدینہ کا دفاع مدینہ کے اندر رہ کر کیا جائے اور دشمن کی زاید طاقت کو استعمال ہی نہ ہونے دیا جائے۔ آپؐ کو صرف چھ دنوں کی مہلت ملی تھی۔ روایات میں آیا ہے کہ حضرت سلمان فارسی کے مشورہ سے خندق کھودنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ہمیں یہ بات قابلِ توجہ نظر نہیں آتی۔ خندقی لڑائی بجائے خود ایک فن ہے۔ جنہوں نے پہلی عالمی جنگ کی خندقی جنگ کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں محض خندق کھودنا ہی مقصود نہیں ہوتا، خندق کے ایک ایک قدم کو اگر دفاعی افواج کے کارگزار سے نیچے نہ رکھا جائے تو حملہ آور فوج چند شہتیر یا چند درختوں کے تنے رکھ کر خندق کے اُوپر سے گزر سکتی ہے۔ اگر یہ بھی میسر نہ ہوں تو خندق کو پتھروں اور مٹی سے پُر کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کماندار اعلیٰ کے لیے ذاتی طور پہ خندقی جنگ کے تمام پہلوؤں سے پوری واقفیت ضروری ہے ورنہ خندق نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔ خندق کی لمبائی، چوڑائی، اس کو کھودنے پر کتنے آدمیوں کے کتنے دن صرف ہوں گے اور انہیں ہر روز کتنے گھنٹے کام کرنا ہوگا۔ اس کی سمت، اس کے ہر موڑ کا دوسرے موڑ کے ساتھ رابطہ، پلٹن، کمپنی، پلاٹون اور سیکشن میں خندق کے مختلف حصوں کو بانٹنا اور کمانداروں کے مقامات کا تعین کرنا۔ یہ تمام ایسے امور ہیں جو اگر درست حل نہ کیے گئے ہوں تو خندق دردِ سر بن کر شکست کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ ہم اس لیے اس امر کی نشاندہی کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ رسول اللہؐ چونکہ اُحد کے موقعہ پر بھی شہر کے اندر رہ کر دفاع کرنا چاہتے تھے اس لیے آپؐ کے ذہن میں شہر کا اس طرح کا دفاع پہلے سے موجود تھا۔ آپؐ چونکہ دفاعی امور کو ہمیشہ صیغۂ راز میں رکھتے تھے اس لیے آپؐ نے کسی سے ذکر نہ کیا ہوگا۔ ممکن ہے کہ حضرت سلمان فارسی نے بھی کہیں خندق کا لفظ استعمال کر لیا ہو۔ البتہ تاریخی طور پہ یہ درست نہیں کہ دفاعی منصوبوں میں ایرانؔ کے اندر خندق کا عمل دخل رہا تھا۔ قلعوں کے گرد خندق دہلی سے لے کر ہسپانیہ تک پائی جاتی تھی۔ البتہ پُورے شہر کا دفاع خندق، مکانات اور باغات کو باہم منسلک کر کے اگر تاریخ جنگ میں پہلی بار منظرِ عام پہ آیا ہے تو وُہ مدینہ کے دفاع کے لیے غزوۂ احزاب میں آیا ہے۔ اس سے قبل یہ طریق دفاع راقم الحروف کی نظروں سے نہیں گزرا۔ (ملاحظہ ہو نقشہ "د")

آپؐ نے نو ہزار گز کی لانبی خندق جو کم از کم بارہ فٹ گہری اور پندرہ فٹ چوڑی تھی، اسے چھ دن میں مکمل کیا۔ اس قدر کھدائی اتنے کم عرصہ میں اس وقت تک شاید ہی کسی مقام پر کی گئی ہو۔ اب مدینہ حملہ روکنے کے لیے تیار تھا۔ مکی فوج پہلے کی طرح سیدھی اُحد کے دامن میں گئی اور وہاں تین دن تک پڑاؤ ڈالے رکھا۔ جب انہیں یقین ہو گیا کہ اس بار کھلے میدان میں ان کی اعدادی برتری کو اور ان کے مضبوط رسالہ کو استعمال کرنے کا موقع نہیں دیا جائے گا تو انہوں نے مدینہ کا رُخ کیا۔ جُونہی خندق کے سامنے پہنچے تو خندق کے اُس پار سے ان پہ پتھروں کی بوچھاڑ پڑی۔ وُہ اب سمجھے کہ یہ مٹی کی دیوار سی جو سامنے کھڑی ہے یہ دمدمہ ہے جو حال ہی میں

(نقشہ "د")

خندق کی لڑائی کا میدان

(شوال تا ذیقعد ۵ھ)



ان کی پذیرائی کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ سامنے والے رُکے تو پیچھے والوں کو معلوم نہ تھا کہ آگے کیا ہو رہا ہے۔ ایک ہنگامہ سا بپا ہو گیا جس کو رفع کرنے میں خاصی دیر اور وقت ہُوئی۔ اس کے بعد سے مکی سپاہ خندق کے قریب سوچ سمجھ کر اور عسکری تیاری کے بعد ہی آیا کرتی۔

غزوۂ احزاب، یعنی جب قومیں اور قبیلے مسلمانوں پر اجتماع کی صورت میں حملہ آور ہوئے تھے۔ واقعتاً جزیرۃ العرب میں مکہ کے پھیلے ہُوئے حلیفوں کا اجتماع تھا۔ اس کی تعداد بارہ ہزار (۱۲۰۰۰) سے چوبیس ہزار (۲۴۰۰۰) تک بتائی گئی ہے۔ چند قبائل کی تعداد کی تفصیل بتائی گئی ہے، وُہ یہ ہیں:

نام قبیلہ	پیادہ	سوار	بار برداری کے جانور	کماندار
۱۔ قریش مکہ	۴۰۰۰	۳۰۰	۱۵۰۰	ابوُسفیان
۲۔ بنو ادجہ	۴۰۰	نامعلوم	نامعلوم	مِسار ابن رُخیلہ
۳۔ بنو مُرّہ	۴۰۰	〃	〃	الحارث بن عوف
۴۔ بنو فزارہ	۱۰۰۰	〃	۱۰۰۰	اُعینہ بن حصن
۵۔ بنو سُلیم	۷۰۰	〃	〃	حضیفہ
	۶۵۰۰	۳۰۰	۲۵۰۰	

۶۔ بنو فزارہ اور بنو سُلیم کے پاس سوارہ موجود تھا۔ اس لیے اگر ان دونوں قبائل کا سوارہ ۳۰۰ تصور کیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

۳۰۰

۷۔ بنو غطفان کے پاس غزوۂ خیبر میں ۵۰۰۰ پیادہ فوج کی موجودگی ثابت ہے۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ اس موقع پر وُہ اپنی پوری پیادہ سپاہ اور پورا سوارہ ساتھ نہ لائے ہوں۔ اس لیے ان کے اعداد کا بھی شمار ہونا ضروری ہے۔

۵۰۰۰ ۳۰۰ ۱۵۰۰

۸۔ خیبر کے یہودی قبائل کے پاس ۱۰۰۰۰ ہتھیار بند ہر وقت موجود رہتے تھے۔ ان کا ہاتھ اس مہم میں ثابت ہے۔ ان کے سرداروں نے مدینہ کے یہودیوں کو شامل کرنے کا اعتراف کیا تھا کہ وہی تمام عرب قبائل کو لے کر مدینہ آیا ہے۔ اس لیے ان کے لشکر کی تعداد کم از کم ۵۰۰۰ پیادہ اور ۲۰۰ سوار شمار کر لی جائے۔

۵۰۰۰ ۲۰۰ ۵۰۰

۹۔ بنو سعد، بنو کنانہ اور بنو تہامہ کی موجودگی مسلّم ہے۔ تعداد نہیں دی گئی۔ ان تینوں کے ایک ہزار پیادہ اور دو سو سوارہ شامل کر لیا جائے تو مناسب ہوگا۔

	پیادہ	سوار	بار برداری کے جانور
	۱۰۰۰	۲۰۰	۲۰۰
میزان	۱۷۵۰۰	۱۳۰۰	۴۷۰۰

یعنی	۱۸۵۰۰	ہتھیار بند
اور	۲۰۰۰	کے قریب ساربان موجود ہوں گے۔
اس نفری کے لیے	۱۰۰۰	کے قریب ملازم پیشہ قسم کے لوگوں کا ہونا بدیہی ہے۔
یعنی	۲۱۵۰۰	سے کم تعداد کا یہ اجتماع نہ ہوگا۔

جن تاریخ دانوں نے "احزاب" کی تعداد چوبیس ہزار (۲۴۰۰۰) بتائی ہے وہ چنداں غلط معلوم نہیں ہوتی۔ اس کے مقابلہ میں دفاعی قواء کی کل تعداد تین ہزار (۳۰۰۰) تھی، ان میں وہ منافق بھی شامل تھے جن کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ بہانے بنا کر اپنے گھروں کو چلے جاتے تھے۔ (احزاب ۳۳ : ۱۳)

اس عظیم اجتماع کا علمبردار عثمان بن طلحہ تھا جو اُس خاندان کا فرد تھا جنہوں نے اپنے نظامِ حیات کی بقاء کے لیے بدر اور اُحد میں اپنے جگر گوشوں کی بڑی تعداد لات اور منات کی بھینٹ چڑھائی تھی۔ مگر جو لوگ ان کے مقابلہ میں اپنے نظامِ حیات کا دفاع کر رہے تھے ان کا جذبۂ ایمان ان سے بھی بلند تھا اور اس بات کی تصدیق جزیرۃ العرب کے بکھرے ہُوئے میدانوں میں کئی بار ہو چکی تھی۔

سپاہِ جزیرۃ العرب نے دفاعی افواج کے پہلے حملے کے بعد خندق سے دُور اپنا معسکر قایم کیا۔ کئی روز تک کوششیں جاری رہیں کہ کسی مقام سے خندق کو عبور کیا جائے مگر دفاعی افواج ہر مقام پر ان کو روکنے میں کامیاب رہیں۔ ایک روز عکرمہ بن ابی جہل اور اس کے چند ساتھیوں نے خندق کا ایک ایسا مقام ڈھونڈ لیا جہاں سے ان کے گھوڑے کُود کر پار ہو گئے۔ انہوں نے سیدھا مدینہ کے مقرِ قیادت (COMMAND H.Q) کا رُخ کیا۔ حضور اقدسؐ اپنے مقرِ قیادت سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ آپؐ نے حضرت علیؓ کو چند آدمی دے کر ان کو روکنے کے لیے روانہ کیا۔ دونوں دستوں کا آمنا سامنا ہونے پر عکرمہ کے دستہ کے ایک مشہور دلیر عَمرو نے حضرت علیؓ کو مبارزت کے لیے للکارا۔ آپ پیادہ تھے مگر آپ آگے بڑھ آئے۔ وہ دونوں لشکروں کی نگاہوں کے سامنے سوار ہو کر پیادہ سے لڑنا نہ چاہتا تھا، گھوڑے سے اُتر آیا اور گھوڑے کی کونچیاں کاٹ ڈالیں۔ اس سے یہ دکھانا مقصود تھا کہ اب میں فاتح بن کر ہی اپنے معسکر کو لوٹوں گا۔ دیر تک تلوار سے لڑائی ہوتی رہی حتیٰ کہ گرد کی وجہ سے دونوں دیکھنے والوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ معاً گرد کے غبار کے اندر سے اللہ اکبر کی صدا بلند ہُوئی۔ اس پر قریب کی اسلامی افواج نے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ یہ دیکھ کر عکرمہ اور اس کے ساتھی بھاگ کھڑے ہُوئے اور گھوڑوں کو دوڑاتے ہُوئے خندق کے پار ہو گئے۔ البتہ ان کا ایک ساتھی نوفل خندق میں گر گیا۔ عَمرو کی لاش کے لیے کی سپہ سالار نے دس ہزار درہم پیش کیے مگر حضورؐ پُرنور نے لاش بغیر معاوضہ کے لے جانے کی اجازت دے دی۔

یہ ناکامی جزیرۃ العرب کی متحدہ کمان کے لیے باعثِ ننگ تھی۔ دُوسری صبح پوری جمعیت خندق کے باہر صف آرا تھی۔ ابُو سفیان نے پُورے محاذ پر حملے کا حکم دے دیا۔ یہ حملہ اپنی شدت کے باوجود ناکام رہا۔ مدینہ کی دفاعی افواج چاک و چوبند محاذ کے اپنے اپنے خط کو پوری مستعدی سے سنبھالے ہُوئے تھیں۔ مدنی سپاہ اب ہر طرح سے تجربہ کار کہلا سکتی تھی۔ دفاعی خط بھی اس خوبی سے تجویز کیا گیا تھا کہ خندق اور اس کے اندرونی جانب خندق سے کھدے ہُوئے ملبہ کا دمدمہ دفاعی افواج کو ایک طرح سے

آڑ کا کام بھی دے رہے تھے۔ حملہ آور فوج کی تعداد سات آٹھ گنا زیادہ ہونے کے باوجود بے دست و پاسی ہو رہی تھی۔ دشمن کے سپہ سالار نے بالآخر اس مقام پر انتہائی شدت سے حملہ کیا جو اسلامی مفر قیادت کے بالکل سامنے تھا۔ عکرمہ بن ابی جہل، خالد بن ولید اور دوسرے دلیر نوجوان سبھی اس حملہ میں شامل تھے۔ اُس روز شام تک دشمن کی یہ کوششیں جاری رہیں مگر اس مقام پر متعین اسلامی فوج ان کی ہر کوشش ناکام بناتی رہی۔ اس کے باوجود اس روز اسلامی فوج کے صرف پانچ افراد شہادت کا رتبہ حاصل کر سکے۔

اس روز ظہر کی نماز بھی ادا نہ کی جا سکی جسے بعد میں باجماعت قضا کر کے پڑھا گیا۔

اگر کوئی دقت ہو رہی تھی تو منافقین کی جانب سے جو رازداری کے لیے ضرر رساں ہونے کے علاوہ اپنی پوری کوششیں بروئے کار نہ لا رہے تھے اور جہاں تک یہودی قبیلہ بنو قریظہ کا تعلق ہے وہ کسی وقت بھی خطرہ کا باعث بن سکتے تھے اور اندرونِ شہر سے حملہ کر کے پورے دفاعی منصوبہ کو بیکار بنا سکتے تھے۔ جس روز پورے محاذ پر دشمن نے حملہ کیا تھا اس روز بھی "مجتمع احزاب" (COALITION ARMIES) کے سپہ سالاروں کی خواہش تھی کہ بنو قریظہ ان کے حملہ کے ساتھ ساتھ اپنے قلعہ کی جانب سے حملہ آور ہوں مگر آخری وقت ان کی ہمت ان کا ساتھ چھوڑ گئی۔ ایک روز اس مکان کے قریب جہاں مسلمان عورتوں اور بچوں کو جمع کیا گیا تھا وہاں پر ایک یہودی مخدوش حالت میں دیکھا گیا۔ کوئی مرد موجود نہ تھا۔ حضورؐ کی پھوپھی حضرت صفیہؓ نے اکیلے ہی اس کا کام تمام کر دیا۔ ممکن ہے اس واقعہ کی وجہ سے وہ یہ سمجھتے ہوں کہ اس جانب بھی دفاعی انتظام مکمل تھے اور اس لیے عام حملہ میں شامل نہ ہوئے ہوں۔ اب ایک اور کوشش کی گئی، جب "مجتمع احزاب" مدینہ پہنچی تھیں تو یہودی سردار کعب بنو قریظہ کے سردار حُیَیّ بن اخطب، کے پاس گیا تھا اور اسے انتہائی فخر سے بتایا تھا کہ وہ پورے عرب کو مجتمع کر کے اسلام کے خلاف لے آیا ہے۔ اور اسے بھی شامل ہونے کے لیے کہا۔ حیی بن اخطب نے پہلے تو کہا کہ اس کا رسول اللہؐ کے ساتھ معاہدہ ہے مگر وہ بالآخر کعب کے کہنے میں آ گیا۔ جب اس سے کسی نے حضورؐ کے ساتھ معاہدہ کا ذکر کیا تو کہنے لگا:

"کون ہیں رسول اللہؐ۔ ہمارا محمدؐ کے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں"

اب ابوسفیان نے کوشش کی کہ ایک اور حملہ ہو، اور اس کے ساتھ ہی بنو قریظہ بھی حملہ آور ہوں۔ بنو قریظہ نے شرط رکھی کہ ہمارے سپاہی لڑائی میں تجربہ نہیں رکھتے اس لیے قریش اپنے ستر (۷۰) بلند خاندانوں کے جوان رہنمائی کے لیے ان کے پاس روانہ کریں تاکہ وہ خاطر خواہ طور پر حملہ میں شامل ہو سکیں۔ ابوسفیان اس بات پر راضی ہو گیا۔ اس منصوبہ کی اطلاع حضورؐ تک بھی پہنچ گئی۔ یہ انتہائی خطرناک منصوبہ تھا۔ افرادی قوت اس بات کی متحمل نہ ہو سکتی تھی کہ خندق پر بھی ہمہ وقتی پہرہ موجود ہو اور باغات کی جانب اور بنو قریظہ کے قلعہ کی جانب بھی پہرہ مکمل رہے۔ حضورؐ کو معلوم تھا کہ اسلامی فوج میں جو منافقین شامل تھے ان میں نعیم نامی سپاہی دشمن کے لیے جاسوسی کر رہا تھا۔ اس طرح انتظام کیا گیا کہ نعیم کے سامنے کسی نے یونہی ذکر کر دیا کہ یہودی قبیلہ بنو قریظہ اس لیے قریش سے ستر سپاہی مانگ رہا ہے کہ انہیں یرغمال بنا لے۔ اس شام نعیم کو موقع دے دیا گیا کہ وہ خندق آسانی سے پار کر لے جیسا کہ اُمید تھی وہ چپکے سے دشمن کے معسکر میں چلا گیا اور وہاں یہ قصہ ابوسفیان کے سامنے بیان کر دیا۔ ابوسفیان پہلے ہی یہودیوں کے تذبذب اور نیم دلی سے تنگ آ چکا تھا۔ اب اسے مکمل شک پیدا ہو گیا کہ یہودی انہیں دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ اس نے یہودیوں کو

کہلا بھیجا کہ ہم ستر چیدہ اور اعلیٰ خاندان جری قریش تو شہر کے اندر داخل نہیں کر سکتے۔ البتہ تم لوگ آج بہر صورت عقب سے مسلمانوں پر حملہ کر دو۔ بنو قریظہ یوں بھی متحدہ محاذ سے ناامید ہو چلے تھے۔ وہ یہ سمجھے کہ ابوسفیان اپنے جوان اس لیے مہیا نہیں کر رہا کہ وہ انہیں مروانا چاہتا ہے۔ انہوں نے "یوم سبت" کا بہانہ کیا اور حملہ سے انکار کر دیا۔ ابوسفیان کو اب یقین ہو گیا کہ یہودی اپنی فطرت سے مجبور اسے دھوکا دینا چاہتے ہیں۔

مدینہ کا محاصرہ جاری رہا۔ اب "متحدہ محاذ" کی جانب سے کوئی خاص حملہ نہیں ہوا۔ اس کے برعکس مدینہ نے لڑاکا کشتیں خندق پار بھیج کر حملہ آوروں پر وار کرنے سے گریز نہ کیا اور ان کے بیس اونٹوں کی باربرداری بھی ایک موقعہ پر اپنے قابو میں لے لی۔ اب دشمنوں کی صفوں میں بے دلی اور ناامیدی پھیل رہی تھی۔ بیس یا بائیس[۲۲] ہزار سے زاید جمعیت کا ایک ہی مقام پر رہنا، مختلف قبائل کی سپاہ کا صبح و شام ایک دوسرے کے ساتھ الجھنا اور موسم کی نامساعدت۔ یہ تمام باتیں ایسی تھیں کہ منضبط افواج کو بھی ناامید کر دیتیں جزیرۃ العرب کی متحدہ افواج نے تو ابھی انضباط کے مبادیات پر بھی عبور حاصل نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے نظامِ حیات کے دفاع کے علاوہ جرأت و دلیری کے مظاہر اور نمونے پیش کرنے اور دیکھنے کے لیے بھی تو آئے تھے اور اس "خندق" نے ان کو لہو گرم کرنے کے مواقع تک سے محروم کر دیا تھا۔ ناامیدی کے ایام پر مزید ایک رات باد و باراں کا یہ عالم کہ خیمے تک اکھڑ گئے اور جانوروں نے اپنی رسیاں تڑوا کر چاروں طرف تباہی مچا دی۔ اب حالات برداشت سے باہر تھے۔ ابوسفیان جس نے مسلمانوں کو مکمل طور پہ تباہ کرنے کی قسم کھائی تھی۔ اٹھا اور کہا:

"اے قریش! ہم مستقل معسکر میں نہیں ہیں۔ گھوڑے اور اونٹ مر رہے ہیں۔ بنو قریظہ نے بدعہدی کی ہے اور ان کے متعلق مخدوش خبریں آرہی ہیں۔ طوفان کی شدت کو بھی تم لوگ دیکھ رہے ہو جو نہ کھانا پکانے دیتی ہے اور برتنوں، آگ اور خیموں کو ختم کر رہی ہے۔ چلو یہاں سے، میں بھی جا رہا ہوں۔"

اور ہر ایک نے اپنی راہ لی۔ حضورؐ نے دوسری صبح فرمایا:

"اب قریش تم پر حملہ آور نہ ہوں گے، اب تم ان پر حملہ کرو گے۔"

غزوہ احزاب قریشِ مکہ کی کوششوں کی انتہا تھی۔ مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ سے ان کے درمیان منافقین کی موجودگی اور یہودی قبائل کی فتنہ انگیزی کے باوجود یہ مشکل دور بھی ختم ہو گیا تھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصر سا جائزہ لے لیا جائے۔ اس سے مکہ اور مدینہ کی لڑائی کے آیندہ کے واقعات کو ان کے صحیح پس منظر میں سمجھنے میں آسانی ہو گی۔

مملکتِ مدینہ کا دفاع بجائے خود ایک معجزہ ہے جس کے دوران کے واقعات کے تواتر اور باہمی ربط سے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ کوئی غیر مرئی طاقت ان واقعات کو ظہور میں لا رہی ہے۔ درست کہ انسان اس جنگ، اور اس جنگ سے متعلق ہر واقعہ کو دلائل اور براہین سے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنی استعداد کے مطابق منطقی استدلال کے ذریعہ ان واقعات کی عالمِ انسانی کے بہت سے دوسرے واقعات کے ساتھ مطابقت ثابت کرنے کی کوشش میں کامیاب نظر آتا ہے، مگر اس پوری جنگ کا کامیابی کے ساتھ موجودہ مرحلہ تک پہنچنا دو باتوں پر منحصر تھا: اوّلاً ذاتِ خیر البشر سید الرسل محمد رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی اور دوم اس نظریۂ حیات اور اس پر مبنی نظامِ زندگی پر جو اللہ العالمین نے آپؐ کے ذریعہ عالم انسانی کی جانب بھیجا تھا۔ اس نظامِ زندگی اور اسے بحسن وخوبی جاری کرنے کا نتیجہ تھا کہ ایک چھوٹی سی غیر معروف سی بستی نے پورے جزیرۃ العرب کا مقابلہ کیا۔ اس مقابلہ کے دوران اخلاق اور آدمیت کے تمام اصول پیشِ نظر رکھے اور باوجود وسائل کی کمی کے کسی گوشے، کسی انسانی گروہ اور کسی مادی طاقت کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کیا اور اس پوری کشمکش کو اپنے افراد اور ان کے وسائل کے ذریعہ جاری رکھا۔ شاید یہ بھی آئندہ نسلوں کے لیے ایک اہم سبق تھا کہ جب باطل کے ساتھ رزم آراء ہونا پڑے تو جو وسائل استعمال کیے جائیں وہ تمام تر صداقت پرستوں سے حاصل کیے جائیں ورنہ باطل کی شمولیت سے صداقت داغدار ہو کر کمزور ہو جائے گی۔

اس نظامِ زندگی کا ایک خاص پہلو جو اس جنگ کو اب تک کامیاب طور پر جاری رکھنے کا باعث بنتا رہا تھا وُہ اس کا زندگی کو ایک مکمل اکائی، ایک وحدت اور ایک مربوط سلسلہ تصوّر کرنے کا پہلو تھا۔ اس کے نتیجہ میں فرد اپنی زندگی کے تمام پہلوؤں کو ایک ہی فلسفہ کا تابع پا کر اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکتا تھا۔

غزوۂ ودّان سے شروع ہو کر غزوۂ خندق تک اسلام ایک مسلسل آزمائش میں رہا تھا۔ یہ بات ہر فرد کو معلوم تھی۔ اس کے باوجود جس کسی نے اس نظامِ حیات کو ایک بار قبول کر لیا تھا اس نے پھر اس سے مُنہ نہیں موڑا تھا اور اس نظامِ حیات کی صداقت پر جان دے کر شہادت دینا اپنا بلند ترین مقصدِ حیات تصور کیا تھا۔ غزوۂ بدر کے موقعہ پر دشمن کو خیال تھا کہ ایک بھرپور وار سے اس نئی مملکت اور اس کے فلسفۂ زندگی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نابُود کر دے گا۔ انھیں اس میں ناکامی رہی۔ وُہ دوبارہ آئے اور پہلے سے زیادہ مادی وسائل ساتھ لائے۔ مگر اس بار بھی وُہ اپنے مقصد میں ناکام رہے۔ جزیرۃ العرب کے قبائل اور دُور ونزدیک کی بستیاں دیکھ رہی تھیں کہ مکّہ کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی مقام کا حریف پیدا ہو چکا ہے مگر چونکہ اس حریف کے پیشِ نظر ان کے موجودہ نظامِ زندگی کو بدلنا تھا اسی طرح قریشِ مکّہ کی تیسری بڑی کوشش میں تقریباً جزیرۃ العرب کا وُہ حصّہ شامل تھا جو سیاسی اور معاشرتی شعور رکھتا تھا۔ درست کہ یہ پچیس دن مسلمانوں کے لیے آزمایش کے دن تھے مگر ہم دیکھ چکے ہیں کہ متحدہ عرب کی یہ کوشش بھی بار آور نہ ہو سکی۔ اب تک مدینہ دفاعی جنگیں لڑتا رہا تھا گو اس کے دوران مہاجماتی عمل (Offensive Action) کی طرف بھی رجوع کیا گیا اور عسکری اصطلاحات کے مطابق مدینہ اب تک مہاجماتی دفاع (Offensive Defence) کے نظریہ کا پیرو رہا تھا۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جہاں تک عظیم تزویرات (GRAND STRATEGY) کا تعلق ہے حضورِ اقدسؐ مہاجماتی تزویرات (OFFENSIVE STRATEGY) پر عمل کرتے رہے تھے۔ البتہ تدبیراتی (TACTICAL) سطح پر آپؐ نے سوائے غزوۂ مصطلق کے آپ نے ہر لڑائی میں دفاعی تدبیرات سے آگاہ کیا اور جب دیکھا کہ دشمن کے حملہ کا زور کم پڑ گیا ہے تو آپؐ نے مہاجماتی تدبیرات اختیار کر کے جوابی حملہ سے دشمن کو شکست دی۔ غزوۂ احزاب میں دشمن کا محاصرہ اس قدر وسیع پیمانہ پر تھا اور اس میں اتنے مختلف مقامات سے قبائل آ کر شامل ہوئے تھے کہ جوابی حملہ یا ان کے تعاقب کا موقع نہ تھا۔ تعاقب صرف ایک یا دو قبائل کا ممکن تھا اور اگر یہ کوشش کی جاتی تو مدینہ سے لشکرِ اسلام کی غیر حاضری میں دوسرے قبائل کا پلٹ کر مقرِ قیادت پر حملہ آور ہونے کا امکان تھا۔ اس لیے

حضور اقدسؐ نے حملہ آوروں کا تعاقب نہ کیا۔ البتہ جو دشمن گھر کے اندر موجود تھا اس سے نبٹنے کا فیصلہ کیا۔ خندق کے مورچوں سے واپس آتے ہوئے حضورؐ نے دوبارہ لام بندی کا حکم دیا اور بنو قریظہ کے قلعہ کا محاصرہ شروع کر دیا۔

بنو قریظہ معاہدہ توڑ چکے تھے اور ایسے موقع پر بغاوت کی تھی جب مملکتِ مدینہ کے صدر مقام کا دشمن محاصرہ کیے ہوئے تھا۔ وہ عملی طور پر باہر صرف اس لیے نہیں نکلے تھے کہ وہ سپاہِ مدینہ کی عسکری قابلیت سے واقف تھے اور انہیں متحدہ محاذ کی کامیابی کا یقین نہ تھا۔ ایسے مارِ آستین کا ختم کرنا ہی قرینِ مصلحت تھا۔ بنو قریظہ کا محاصرہ پچیس دن رہا۔ وہ اس سے زیادہ کی تاب نہ لا سکے اور غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیے۔ ان کے متعلق فیصلہ کے لیے انہی سے دریافت کیا گیا کہ وہ کسے منصف بنانا چاہتے ہیں؟ انہوں نے حضرت سعدؓ بن معاذ کا نام تجویز کیا۔ حضرت سعدؓ خندق کی لڑائی میں زخمی ہو گئے تھے اور اب مسجد نبوی میں ان کے علاج کے لیے خیمہ نصب کر دیا گیا تھا۔ صحابیہ حضرت رفیدہؓ نرسنگ کے فرائض انجام دے رہی تھیں۔ ان کے لیے سواری روانہ کی گئی کہ آ کر بنو قریظہ کی قسمت کا فیصلہ کر دیں۔

حضرت سعدؓ جب آئے تو ان کے قبیلہ نے ان کے سامنے بنو قریظہ کی سفارش کی کہ ان پر سختی نہ کی جائے۔ حضرت سعدؓ نے کہا:

"وقت آگیا ہے کہ سعد اللہ کی راہ میں کسی شخص کی ناراضگی کی پروا نہ کرے۔"

پھر انہوں نے مجمع کی طرف نگاہ کرتے ہوئے پوچھا:

"کیا آپ لوگ اللہ کے سامنے اقرار کرتے ہیں کہ میرا فیصلہ قبول کریں گے؟"

سب نے یک زبان ہو کر کہا:

"ہاں۔"

پھر انہوں نے حضورؐ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا:

"اور کیا یہ (میرا فیصلہ) وہ بھی قبول کریں گے جو یہاں موجود ہیں؟"

حضور اقدسؐ نے اثبات میں جواب دیا۔

حضرت سعدؓ نے اپنا فیصلہ سنایا:

"تو پھر میں فیصلہ کرتا ہوں کہ جنگ کے قابل افراد قتل کیے جائیں، اُن کی جائداد بانٹ دی جائے اور ان کی عورتیں اور بچے غلام بنا لیے جائیں۔"

اس فیصلہ پر عمل کیا گیا۔ یہ واقعہ ذوالحج ۵ھ کا ہے۔

عیینہ بن حصن جس نے بنو غطفان کے منصوبہ دستہ کی غزوۂ خندق میں قیادت کی تھی وہ اپنی برتری دکھانے کے لیے مدینہ کی چراگاہوں پر چھاپہ مار کر مدینہ کے کچھ اونٹ ہانک کر لے گئے۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ عرب قبائل پے بہ پے ناکامیوں کے باوجود مدینہ کی برتری ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ جونہی مقر قیادت میں اس حملہ کی اطلاع ملی ایک تیز رفتار دستہ ان کے تعاقب میں روانہ کیا گیا اور چھاپہ ماروں سے بیشتر اونٹ چھین لیے گئے۔

اہلِ خیبر مختلف طریقوں سے دوسرے قبائل کو مدینہ کے خلاف بھکانے کے علاوہ غزوۂ خندق میں اہم کردار ادا کر چکے تھے۔ ان کے علاقہ سے فوج اور تمام ادنیٰ درجہ کے کمانداروں کی واقفیت اور وہاں کے جغرافیائی حالات سے شناسائی ضروری تھی۔ حضور اقدسؐ نے ربیع الآخر ۶ھ ہجری میں ایک مہم کی قیادت فرمائی اور خیبر کے اردگرد کے علاقہ کی دیکھ بھال کے بعد بغیر کسی معرکہ کے مدینہ لوٹ آئے۔

اسی مہینہ بنو آسد کے متعلق اطلاع ملی کہ وہ حملہ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ ان کے خلاف حضرت عکاشہؓ بن الاسدی کو چالیس مجاہدوں کا دستہ دے کر روانہ کیا گیا۔ بنو آسد اس سریہ کے پہنچنے سے قبل ہی منتشر ہو چکے تھے۔

اسی مہینہ ایک اور سریہ بنو ثعلبہ کے علاقہ میں بھیجا گیا انہوں نے اپنے علاقہ میں بدامنی پھیلانی شروع کر دی تھی۔ یہ سریہ ناکام رہا۔ اس لیے کہ بنو ثعلبہ نے ان کے لیے چھاپا ڈال رکھا تھا اور دستہ کے شرکاء دس مجاہدوں کو شہید کر دیا۔

جونہی اس سانحہ کی اطلاع ملی حضورؐ نے دوسرے ہی دن حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح کو چالیس مجاہدوں کی کمان دے کر روانہ فرمایا کہ بنو ثعلبہ کو مناسب سزا دیں۔ سریہ کے قریب پہنچنے پر بنو ثعلبہ اپنا سامان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اس لیے کوئی معرکہ نہ ہُوا۔

اسی مہینہ یعنی ربیع الآخر ۶ھ ہجری میں بنو سُلیم کے خلاف حضرت زیدؓ بن الحارث کو روانہ کیا گیا۔ اطلاع ملی تھی کہ وہ ایک بار پھر مدینہ پر حملہ کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ بنو سُلیم بدر اور احزاب میں مدینہ کے خلاف صف آراء ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود جب حضرت زیدؓ ان کے چند قیدی پکڑ کر لے آئے اور انہوں نے حضورِ اقدس کو یقین دلایا کہ وہ حملہ کی تیاریاں نہیں کر رہے تھے تو انہیں بخش دیا گیا اور ان کے تمام قیدی رہا کر دیے گئے۔

جمادی الآخر میں ہی حضرت زیدؓ کو بنو ثعلبہ کے خلاف بھی روانہ کیا گیا۔ انہوں نے مدینہ کی گشت کو چھاپا ڈال کر شہید کر دیا تھا مگر اس مرتبہ بھی بنو ثعلبہ بھاگ جانے میں کامیاب ہو گئے۔

اس مہم سے واپس آتے ہی حضرت زیدؓ کو وادی القراء روانہ کیا گیا۔ وہاں پر اس سے قبل حضرت زیدؓ کی زیر کمان ایک گشت پر وہاں کے قبائل نے حملہ کر کے انہیں نقصان پہنچایا تھا۔

رجب کے مہینہ میں ہی اطلاع ملی کہ قریشِ مکہ ایک بار پھر قسمت آزمائی کر کے ایک تجارتی قافلہ شام روانہ کر رہے ہیں۔ وہ ساحلی علاقہ یعنی مدینہ کے علاقہ سے گزر رہے تھے اس لیے اس قافلہ کو اَلَیس کے مقام پر روک لیا گیا اور اس کا تمام سامان بحق سرکارِ مدینہ ضبط کر لیا گیا۔

شعبان ۶ھ میں ساحلِ سمندر پر اور مکہ کی سرحدوں کے قریب بنو مصطلق کے خلاف ایک مہم عمل میں لائی گئی۔ حضورؐ نے کمان اپنے ہاتھ میں رکھی تھی اور علمبردار حضرت ابوبکرؓ اور حضرت سعدؓ بن عبیدہ تھے۔ بنو مصطلق کے علاقہ میں پہنچ کر انہیں گھیرے میں لے لیا گیا اور ان کے بہت سے قیدی لے لیے گئے مگر بعد میں پُورے قبیلہ کو معافی دے دی گئی اور ان کے اسیر رہا کر دیے گئے۔

۶ھ کے باقی ماندہ ایام میں پانچ مزید سرایا روانہ کیے گئے۔ ان کا مقصد دور دراز علاقوں میں امن و امان قایم رکھنا تھا تاکہ ملک کی تجارت کو فروغ ہو اور لوگ اپنے کاروبار میں کسی خوف و خطر کے بغیر مصروفِ عمل رہیں۔

۶ھ کے آخری ایام میں آپؐ نے ایک بار پھر صلح کی طرف رجوع کیا کہ شاید اہلِ مکہ اپنی ناکامیوں کا احساس کرتے ہُوئے

جنگ کے راستہ کو ترک کرنے پر تیار ہو جائیں۔ یہ بات ہمہ وقت ذہن میں رہنی چاہیے کہ حضور رحمۃ للعلمین کا مقصد حکومت قایم کرنا، مملکت کو وسعت دینا یا دشمنوں کی افواج کو شکست دینا نہیں تھا۔ حضورؐ کا مقصدِ حیات تبلیغ اسلام یعنی اللہ کا پیغام انسانیت تک پہنچانا تھا۔ اور چونکہ یہ اللہ کا آخری پیغام تھا اس لیے مشیت ایزدی کے مطابق اسلام یعنی نئے نظامِ حیات کو عملی طور پر انسانی معاشرے میں قایم کرنا تھا۔ اس مقصد کی تکمیل یوں ہو سکتی تھی کہ ایک بار ایک مثالی معاشرہ قایم ہو جائے۔ اس معاشرہ کی اپنی مملکت و حکومت ہو، اس کی اپنی فوج ہو، اس کا ایک معاشی نظام ہو اور اس پر بھی ابتلاء و مصیبت کے ایام آئیں تاکہ قیامت تک کی ہزاروں لاکھوں صدیوں میں جب بھی کوئی انسانی گروہ مختلف سمتوں سے مخالفت کے باوجود اسی طرح کا معاشرہ قایم کر کے اس نظامِ حیات کو ایک بار پھر عملی طور پر نافذ کرنا چاہے تو اس کے سامنے ایسی ازلی و ابدی مثال موجود ہو جو ہر حال، ہر موقعہ، ہر دور اور ہر جگہ پر قابلِ عمل ہو۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے دین کو ختم کرنے کی انتہائی کوششیں بے سود ثابت ہو چکی تھیں۔ آپؐ اس پس منظر میں اور طاقت ہوتے ہوئے بے اسلحہ و بے ہتھیار اور بغیر بہت بڑی جمعیت کے صلح کا ہاتھ بڑھانا چاہتے تھے۔ تاریخ عالم میں شاید ہی کوئی ایسی مثال ہو جہاں فاتح نہتے ہو کر اپنے دشمنوں کے گھر اس لیے گیا ہو کہ آیندہ صلح اور امن کے ماحول میں زندگی گزاری جائے۔

آپؐ نے فیصلہ کیا کہ آپؐ عمرہ کے لیے مکہ تشریف لے جائیں گے اور آپؐ کے ہمرکاب جو لوگ ہوں گے ان کے پاس عرب کے دستور کے مطابق سوائے تلوار کے اور کوئی اسلحہ یا جنگی سامان نہ ہوگا۔ آپؐ نے اس ارادہ کو اردگرد کے قبائل تک پہنچایا تاکہ مختلف مقامات کے لوگ شامل ہو جائیں اور مکہ کو بھی یقین آ جائے کہ یہ سفر خالصتاً دوستانہ اور صلح کن اغراض کے پیشِ نظر شروع کیا گیا ہے۔ آپؐ کی ان دوستانہ خواہشات کی اطلاع تو مکہ والوں تک پہنچ گئی مگر اہلِ مکہ اس طرح آپؐ کے ساتھ صلح کر کے اپنے ہاتھوں اپنے نظامِ حیات اور اس کے اندر اپنے بلند و با اقتدار مقام کو ختم نہ کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے جونہی سُنا کہ حضور اقدسؐ عمرہ ادا کرنے کی غرض سے مکہ آنے کے لیے روانہ ہو گئے ہیں انہوں نے قرب و جوار کے حلیف قبائل کو پیغام بھیج کر مدافعت کے لیے بلایا۔ اس اجتماع کو قبائلِ عرب کا دوسرا بڑا اجتماع کہا جا سکتا ہے۔ مکہ کے شمال میں مدینہ کے راستہ پر ذوالتواء کا مقام ہے۔ یہ متحدہ سپاہ اس مقام پر حضورؐ کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔ اپنا عزم دکھانے کے لیے انہوں نے چیتے کی کھالیں پہن رکھی تھیں۔

جب آپؐ نے یہ سُنا تو آپؐ راستہ چھوڑ کر مکہ کے مشرق سے ہوتے ہوئے جدہ سے آنے والے مکہ کے راستے پر حدیبیہ کے مقام پر فروکش ہو گئے۔ آپؐ نے اس طرح ان کو مجبور کیا کہ اگر وُہ لڑائی کرنا چاہیں تو حضورؐ کے چنے ہوئے مقام پر لڑنے پر مجبور ہوں گے مکہ کی دہلیز پر اس طرح حضورؐ کا پہنچ جانا قریشِ مکہ کے لیے ازحد خطرناک تھا۔ یہاں پہنچ کر بھی آپؐ نے صلح مندانہ طور پر عمرہ ادا کرنے کے ارادہ کا برملا اظہار کیا۔ اہلِ مکہ رسماً کسی کو عمرہ ادا کرنے سے منع بھی نہ کر سکتے تھے اور آپؐ کی موجودگی مکہ کے گرد و نواح میں انھیں پسند بھی نہ تھی۔ اب آپؐ کی جانب انہوں نے پیغامات بھیجنا شروع کیے کہ آپؐ واپس چلے جائیں۔

سفارتیں روانہ ہونا شروع ہوئیں۔ حضرت عثمانؓ کی معسکر میں بھیجے گئے مگر ان کی واپسی میں دیر ہونے لگی۔ بلکہ یہ افواہ بھی پھیل گئی کہ حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا گیا ہے۔ آپؐ نے اپنے اصحاب کو جمع کیا اور نہتے ہونے کے باوجود اپنا ارادہ ظاہر فرمایا کہ چونکہ آپؐ کے سفیر کو واپس آنے نہیں دیا گیا یا شاید قتل کر دیا گیا ہے اس لیے آپؐ نے مکہ پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ آزاد اور خود مختار

مملکتِ مدینہ کے سربراہ سے یہی توقع ہوسکتی تھی کہ اس کے سفیر کے قتل کے یہ معنے تھے کہ اس کی مملکت اور ملوکیت (SOVEREIGNTY) پر براہِ راست حملہ کردیا گیا ہے۔ آپؐ نے دعوت دی جو رضاکارانہ طور پر فی سبیل اللہ جہاد کے لیے بے ہتھیار و اسلحہ لڑائی میں شریک ہونے کے لیے تیار ہیں وُہ حضورؐ کے ہاتھ میں تا شہادت لڑنے کی بیعت کریں۔ عرب کی آزاد سرزمین میں آزاد قبائل کے نہ معلوم کتنے افراد اس منظر کو دیکھ رہے ہوں گے کہ ببول کے درخت کے نیچے معسکر کے ہر فرد نے اپنے رہنما، اپنے رسول، اپنے سپہ سالار شہنشاہِ مدینہؐ کے ہاتھ پر صدقِ دل سے بیعت کی کہ وہ بے اسلحہ و بے ہتھیار، بے خود و بے زرہ مکہ اور ان کی لاتعداد جمعیت کے ساتھ لڑائی میں شرکت کرے گا۔ وہ کونسی آنکھ ہوگی جو اس منظر کا نقشہ بھلا سکی ہوگی اور وہ کون سا انسان ہوگا کہ جس کا دل ان جوانمردوں کی مردانگی کو دیکھ کر دہل نہ گیا ہوگا۔ یہ خبر آناً فاناً مکی معسکر میں پہنچا دی گئی ہوگی۔ حضرت عثمانؓ لوٹ آئے اور ساتھ ہی مکہ کی جانب سے نئی سفارت بھی آگئی جس کا سردار سہیل تھا۔ وہی سہیل جو بدر کے مقام پر اسیر بنا کر مدینہ لے جایا گیا تھا اور وہاں سے فدیہ ادا کرنے پر رہا ہُوا تھا۔ کافی بحث و تمحیص کے بعد شرائط طے پائیں کہ اس سال رسول اللہؐ واپس چلے جائیں اور آیندہ سال انہی دنوں عمرہ کے لیے تشریف لائیں۔ مسلمانوں کی موجودگی میں اہلِ مکہ تین دن کے لیے مکہ خالی کر جائیں گے۔ مسلمان نہتے آئیں گے یعنی ہر فرد کے پاس صرف ایک تلوار ہوگی جو نیام میں ہوگی۔ یہ صلح دس سال تک کے عرصہ کے لیے عمل میں آئے گی۔ جو قبائل رسول اللہؐ یا اہلِ مکہ کا ساتھ دینا چاہیں وُہ دے سکیں گے اور ان کے فرائض و حقوق بھی وہی ہوں گے جو ان دو فریقوں کے ہوں گے۔ اس معاہدہ کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ اگر مکہ کا کوئی ایسا فرد جو خود کفیل نہ ہو وُہ اپنے ولی کی اجازت کے بغیر مدینہ چلا جائے تو اسے واپس کر دیا جائے گا۔ البتہ کوئی مسلمان مدینہ چھوڑ کر مکہ چلا آئے تو اسے واپس نہیں کیا جائے گا۔ حضورؐ چونکہ صلح چاہتے تھے آپؐ نے ان شرائط کو قبول کر لیا۔ عہدنامہ تحریر ہونے کے دوران کے واقعات بھی اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ آپؐ صلح کے خواہشمند تھے اور جنگ جاری رکھنا آپؐ کے مقصد کے خلاف تھا۔ مخالفت و مخاصمت اور جنگ و جدال کا ماحول تبلیغِ دین کے لیے موزوں نہیں ہُوا کرتا۔ آپؐ سے یہ بنیادی اصول مخفی نہ تھا۔ اسی لیے آپؐ نے ہر موقع پر امن و سلامتی، بخشش و عطا اور رحمت و محبت سے کام لیا۔ مورخ یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ گو یہ شرائط بادی النظر میں مدینہ کی فاتح مملکت کے مفاد کے خلاف نظر آتی تھیں اس کے باوجود صلح کے دو سالوں کے درمیان اتنے لوگوں نے اسلام قبول کیا جتنے ماقبل کے سالوں میں دائرۂ اسلام میں داخل نہیں ہُوئے تھے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضورِ اقدسؐ نے تو اس صلح کو اس لیے قبول کیا کہ یہ اقدام عین آپؐ کے مقصد اور آپؐ کے لائے ہُوئے پیغام کے مطابق تھا۔ مکہ نے صلح کیوں قبول کی، اس کی بھی وجوہات تھیں:

اوّلاً: مدینہ نے ان کی تمام تجارتی راہیں بند کر رکھی تھیں اور ان کا تجارتی مال ان کے گوداموں میں گل سڑ رہا تھا۔ تجارتی مال کی تباہی کے علاوہ ان کی آمدنی بند ہوچکی تھی۔ تجارت شروع ہونے سے وہ ازسرِ نو طاقت پکڑ سکتے تھے۔

ثانیاً: جنگ کی وجہ سے زائرین کی تعداد میں کمی بھی ان کے لیے اقتصادی طور پر خسارے کا باعث بنی ہوئی تھی۔

ثالثاً: جو قبائل اس مرتبہ ان کے ساتھ تھے انہوں نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رویّہ اور حسنِ اخلاق دیکھا تو انہوں نے کمی ہٹ دھرمی کی وجہ سے ان کا ساتھ چھوڑ دینے کے خیالات کا اظہار کیا۔

رابعاً: سرکارِ مدینہؐ اور ان کے اصحابؓ مکہ کی دہلیز تک آچکے تھے۔ اس سال ان کے لوٹ جانے سے مکہ کا بھرم رہ جاتا تھا۔ اگر

وہ نہ لوٹتے اور مکہ کے حلیف ان کے ساتھ لڑنے پر رضامند نہ ہوتے تو انہیں خطرہ تھا کہ حضورؐ مکہ پر کہیں قبضہ نہ کرلیں۔

اس صلح کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے فتح سے منسوب کیا ہے۔ حدیبیہ سے لوٹتے ہوئے اس کے ثمرات کو آیندہ فتح کی نوید دی گئی اسی لیے حضور اقدسؐ نے مدینہ پہنچ کر چند روز توقف فرمایا اور جب دیکھا کہ خیبر کے یہودیوں نے اس صلح نامہ کے مطابق اپنے پرانے حلیف یعنی مکہ کا ساتھ دینے کا اعلان نہیں کیا اور نہ ہی علیحدہ صلح کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے تو آپؐ نے بشارت ربانی کے مطابق ان اصحاب کو مہم پر ساتھ لے جانے کا ارادہ ظاہر فرمایا جنھوں نے آپؐ کے دستِ مبارک پر حدیبیہ کے مقام پر بیعتِ رضوان میں حصہ لیا تھا۔ تاریخ ان اصحاب کے مقام کو بہت بلند سمجھتی ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ ان اصحاب کے فیصلہ نے ان کی عقیدت، ان کی ذات بابرکات کا احترام اور ان کا اللہ پر ایمان کا پورا پورا ثبوت پیش کیا۔ ایک دو یا گنتی کے آدمیوں کا اپنے دور کی سب سے بڑی طاقت کے ساتھ نہتے لڑ جانا ممکن ہے۔ پوری فوج کا ایسے حالات میں شہادت پر بیعت کرنا اور بات ہے۔ "تاریخ عالم کہیں ایسا واقعہ پیش نہیں کرتی۔ چونکہ ان ہی لوگوں کے لیے اللہ نے فتح کا وعدہ فرمایا تھا اس لیے حضورؐ نے ان اصحابِ بیعتِ رضوان کے علاوہ کسی اور مسلمان کو ساتھ نہ لیا اور اس مہم پر روانہ ہو گئے۔ گو روانگی کے وقت آپؐ نے یہ نہیں بتایا تھا کہ یہ مہم کس کے خلاف ہے۔ البتہ قرائن سے پتا چلتا ہے کہ یہ خیبر کے خلاف ہے۔ اس وقت خیبر کے متعدد قلعوں میں دس ہزار ہتھیار بند موجود تھے۔ ان کے علاوہ ان کے حلیف قبیلہ بنو غطفان نے بھی ایک ہزار ہتھیار بند ان کی مدد کے لیے روانہ کر دیے تھے۔ بنو غطفان کے پاس ابھی چار ہزار ہتھیار بند افراد مزید موجود تھے اور خیبر اور بنو غطفان میں طے پا چکا تھا کہ جونہی اسلامی لشکر خیبر کے قریب پہنچے تو بنو غطفان اس پر عقب سے حملہ کر دیں۔ قیاس ہے کہ خیبر نے ان یہودی قبائل کے ذریعہ رومی گورنرِ شام سے بھی مدد طلب کی ہوئی تھی جو قبائل مدینہ سے نکل کر شام کی سرحد پر آباد ہوئے تھے۔ عراق کے ایرانی گورنر کے ساتھ بھی خیبر کے تعلقات موجود تھے اور ممکن ہے کہ انہیں ان اطراف سے کمک کا بھی یقین ہو۔ اتنی بڑی جمعیت کے خلاف حضور اقدسؐ نے وہی چودہ ہزار مجاہد اپنے ساتھ لیے جنہیں بیعتِ رضوان میں شرکت کا شرف حاصل ہو چکا تھا۔ ان کے علاوہ زخمیوں کی تیمارداری کے لیے بیس صحابیات کو بھی خصوصی اجازت دی گئی کہ وہ بھی لشکر کے ہمراہ جہاد میں شمولیت کریں۔ پوری ملت کی ملی جنگ اور کلی جنگ کی مثال پیش کی جا رہی تھی کہ بعد کے ادوار میں ملت حسب ضرورت اپنے معاملات کو مناسب شکل دیتی رہے۔

مدینہ سے چند منزل جانے کے بعد آپؐ نے ایسے دوراہے پر قیام فرمایا جہاں سے بنو غطفان اور خیبر پر یکساں طور پر حملہ ہو سکتا تھا۔ اس قیام کی اطلاع جب بنو غطفان کو پہنچی تو وہ یہ سمجھے کہ ان کی خیمہ گاہوں پر آپؐ حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس خوف سے وہ واپس اپنے قبائلی علاقہ میں چلے گئے اور دوبارہ خیبر کا رُخ نہ کیا۔

جہاں تک اہلِ خیبر کا تعلق ہے ان کی وادی کی دونوں جانب مضبوط قلعے تھے۔ یہ تعداد میں بارہ تھے اور ان کے محلِ وقوع اس خیال سے چنے گئے تھے کہ تزویراتی (STRATEGIC) اور تدبیراتی (TACTICAL) لحاظ سے پوری وادی کا دفاع ہو سکے اور قلعے ایک دوسرے کو مدد دے سکیں۔ چونکہ مدینہ خیبر سے جنوب کی طرف ہے اس لیے اہلِ خیبر نے وادی کے جنوبی کنارے والے قلعوں کو زیادہ مضبوط کر رکھا تھا اور اپنے بہترین سپاہی اور سردار اسی جانب متعین کیے تھے۔

خیبر والوں کو اس وقت آپؐ کی موجودگی کا علم ہوا جب آپ ایک صبح طلوعِ آفتاب کے وقت شمالی قلعوں کے باہر نظر آئے

اس ناگہانی حملہ (SURPRISE ATTACK) کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے ہی دن تین قلعے ہتھیار رکھنے پر مجبور ہو گئے۔ خیبر کی مہم دو ماہ تک جاری رہی۔ بعض قلعوں نے کافی سخت مقابلہ کیا مگر بالآخر تمام کے تمام قلعے سر ہو گئے۔ یہودیوں کی گزارش پر آپؐ نے انہیں اپنی زمینوں پر آدھی پیداوار کی بٹائی کے اقرار پر قابض رہنے دیا۔ البتہ یہ شرط تھی کہ جب بھی حکومتِ مدینہ ان کے اخراج کا فیصلہ کرے انہیں خیبر خالی کرنا پڑیگا۔ خیبر کی مہم حضور اقدسؐ کی سپہ سالارانہ صلاحیتوں اور عسکری معاملات میں آپؐ کی تزویراتی و تدبیراتی سمجھ بوجھ کا پتا دیتی ہے۔ رسولِ اُمّی جو اپنا نام تک نہ لکھ جانتے تھے اور نہ پڑھ جانتے تھے، جنھوں نے کسی فوج میں کارگزاری کے ذریعہ لشکر سالاری کا تجربہ حاصل نہ کیا تھا اپنے لشکر سے گیارہ گُنا زیادہ فوجی طاقت کے خلاف لشکر کشی کرتے وقت صرف وہی اشخاص ہمرکاب رکھتے ہیں جنھوں نے بیعتِ رضوان میں حصہ لے کر اللہ کی جانب سے فتح کی خوشخبری حاصل کی تھی۔ دُوسرے آدمی موجود ہیں، وہ ہمسفر ہونے کے تمنائی بھی ہیں۔ مگر اللہ کا آخری پیغام رسانؐ اللہ کے وعدہ پر بھروسہ کرتے ہُوئے ان ہی خوش بختوں کو ساتھ رکھتا ہے جنھوں نے ایسے نازک موقعہ پر جان کی بازی لگا دی تھی۔ خیبر کی مہم محرم ۷ھ میں شروع ہوکر ربیع الاوّل کے شروع میں ختم ہُوئی۔

خیبر کے بعد وادی القریٰ، تیمہ اور فدک کے یہودیوں نے بھی اُن ہی شرائط پر اطاعت قبول کر لی جو شرائط اہلِ خیبر کو عطا کی گئی تھیں۔ اسی طرح خیبر سے واپسی کے دوران ذات الرقاع کے مقام پر دشمن کے اجتماع کی خبر ملی۔ جب آپؐ ان کی طرف متوجہ ہُوئے تو وہ پہاڑوں میں چھُپ گئے۔

۷ ہجری کے دوران جمادی الآخر اور رمضان کے مہینوں کے درمیان پانچ سرایا بیرونِ مدینہ روانہ کیے گئے۔ یہ تمام سرایا کامیاب رہے۔ اکثر میں اسیر مدینہ لائے گئے۔ معافی مانگنے پر سب رہا کر دیے گئے۔ اب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مہموں کی کمان کے بجائے تبلیغ اور انتظامی امور کی طرف نسبتاً زیادہ توجہ دے سکتے تھے۔ دشمن کا زور ختم ہو چکا تھا۔ بعض کوتاہ اندیش، قبائل حکومت کی طاقت سے بے خبر بغاوت اور لوٹ مار کی طرف مائل ہو جاتے تھے۔ ان کے خلاف اصحابؓ کی کمان میں چھوٹے چھوٹے دستے مقصد پُورا کر سکتے تھے۔ مثال کے طور پر ان پانچ سرایا میں تیس سے زائد کی گشت کسی میں بھی نہ بھیجی گئی۔ ربیع الاول ۸ ہجری میں ذات العرق میں قبیلہ ہوازن نے مدینہ کے خلاف جمع ہونا شروع کیا مگر جونہی شجاع بن الاسدی کی زیر کمان پچیس مجاہدوں کی گشت کا سنا تو وہ منتشر ہو گئے۔

مدینہ اور خیبر سے گئے ہُوئے یہودیوں کی سازشوں کا نتیجہ ہُوا کہ شام اور جزیرۃ العرب کی سرحدوں پر جو عیسائی قبائل آباد تھے انہوں نے ہرقل روم کو آمادہ کر لیا کہ مدینہ پر حملہ کیا جائے۔ آج تک جزیرۃ العرب کبھی متحد نہیں ہُوا تھا اس لیے عراق، شام اور مصر پر قابض بادشاہوں کو اس طرف کبھی کسی خطرہ کا احتمال نہیں ہُوا تھا۔ اب عرب مدینہ کی قیادت میں متحد ہو رہے تھے۔ عربوں کی عسکری روایات سے دنیا واقف تھی۔ اب تک ان کی یہ صلاحیتیں ایک دوسرے کے خلاف استعمال ہوتی رہی تھیں۔ ان کے متحد ہونے کے بعد عربوں کا ناقابل تسخیر قوت بننے کا خطرہ تھا۔ اسلام نے انہیں جو جذبہ دیا تھا اس سے بھی ہرقل اور اس کے مشیر ناواقف نہ ہوں گے۔ اسلام قبول کرنے کی دعوت بھی دربارِ ہرقل میں پہنچ چکی تھی۔ اطلاع ملی کہ ہرقل مدینہ پر حملہ آور ہونے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ حضورِ اقدسؐ کو بہت ممکن ہے کہ صحیح تعداد کا علم ہو۔ مگر یہ راز کسی پر افشا نہ کیا گیا۔ تین ہزار کا جری لشکر تیار کیا گیا اور اس کا کماندار اعلیٰ زیدؓ بن

حارث کو مقرر کیا گیا۔ گزشتہ بارہ مہینوں میں زید کو کئی مہموں پر روانہ کیا گیا تھا۔ کون جان سکتا ہے کہ یہ آزمایش و امتحان کے سرایا تھے یا کسی بہت بڑے معرکہ کے پیشِ نظر تربیت و تیاری تھی۔ آج تک اتنا بڑا لشکر مدینہ نے صدر مقام سے باہر روانہ نہیں کیا تھا۔ بعض مورخ رومی فوج کی دو لاکھ کی تعداد اور ان کے مددگار عیسائی قبائل کی پچاس ہزار تعداد کو اس لیے قبول نہیں کرنا چاہتے کہ اسلامی فوج کی آتلاف صرف دو سو پچاس تھیں۔ یہ استدلال درست نہیں۔ طرفین کی آتلاف فریقِ مخالف کی تعداد پر منحصر نہیں ہوا کرتیں۔ ان کا انحصار ہتھیاروں، اسلحہ، طرزِ جنگ اور دل گردہ پر ہوا کرتا ہے۔ حضورؐ واحد سپہ سالار ہیں جو ہمیشہ کم سے کم تعداد کے لشکر روانہ فرمایا کرتے تھے۔ کم سے کم طاقت (ECONOMY OF FORCE) کے اصول کا استعمال آپؐ سے بہتر کوئی سپہ سالار نہیں کر سکا۔ آپؐ بنو غطفان کے پانچ ہزار ہتھیار بندوں کے خلاف ساٹھ سے زاید کا لشکر روانہ نہیں فرماتے تھے اور وُہ جو پانچ ہزار کا لشکر تیار کر سکتے تھے ہمیشہ ناگہانیت (SURPRISE) کا شکار ہو جانے کی وجہ سے پہاڑوں میں روپوش ہونے پر مجبور ہوا کرتے تھے۔ آپؐ خیبر کے موقعہ پر سولہ ہزار کے خلاف صرف چودہ سو کے لشکر کو لے کر روانہ ہُوئے تھے۔ اس لیے سر درِ کونینؐ اگر تین ہزار کا لشکر شمالی علاقوں میں روانہ فرماتے ہیں اور مغربی مورخوں کی تحقیق کے مطابق یونانی ماخذ بھی ہرقل کے بھائی کے زیرِ کمان دو لاکھ کا لشکر بتاتے ہیں تو پھر آتلاف کی کمی کی دیگر وجوہات ڈھونڈنی پڑیں گی اور بہت ممکن ہے کہ ان وجوہات کی روشنی میں موتہ کی لڑائی کا نقشہ بہتر سمجھا جا سکے۔

حضورِ اقدسؐ کی دُور رس نگاہ کا ثبوت اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے کہ مملکتِ مدینہ کا سب سے بڑا لشکر اُس دَور کی فاتح طاقت کے خلاف روانہ فرماتے وقت لشکر کی کمان کے مستقبل پر مکمل احکامات نافذ فرمائے۔ زیدؓ کماندار تھے مگر زیدؓ کی شہادت پر کمان کے لیے جعفرؓ بن ابی طالب کو نامزد کیا۔ اور فرمایا کہ جب جعفرؓ بھی رتبۂ شہادت حاصل کر لے تو عبداللہؓ بن رواحہ اسلامی لشکروں کی کمان سنبھالے۔ اور چونکہ روانگی کے وقت عبداللہ بن رواحہ کو خیر و برکت عطا فرما چکے تھے اس لیے حکم ہُوا کہ جب عبداللہؓ بھی شہید ہو جائے تو لشکر اپنا کماندار خود عین میدانِ جنگ میں منتخب کرے۔ خیر و برکت کے الفاظ کے متعلق یہ رائے ہے کہ شہادت کے طلبگار لڑائی شروع ہونے سے قبل دعائے خیر و برکت کی گزارش کرتے تھے۔ جن کے حق میں دُعا کے الفاظ لبِ مبارک سے ادا ہو جاتے تھے وہ جانتا تھا کہ اسے اس لڑائی میں شہادت نصیب ہو جائے گی۔ جن کے سوال پر آپؐ خاموش رہتے وُہ سمجھ جاتے تھے کہ ابھی قسمت نے یاوری نہیں کی۔ اس روز لشکر کی مدینہ سے روانگی سے قبل نمازِ جمعہ کے بعد حضرت عبداللہؓ نے دعائے برکت کی درخواست کی تھی اور آپؐ نے دعا فرمائی۔ جب کمان کی مزید تفاصیل بیان فرمائیں تو حضرت عبداللہؓ کو تیسرا کماندار نامزد فرمایا۔ آج تک کسی مہم میں آپؐ نے کمان کے متعلق یہ نہیں فرمایا تھا کہ فلاں کے بعد فلاں کماندار ہوگا۔ یہ پہلا موقعہ ہے کہ اس طرح کے احکام جاری فرمائے۔ یہ تمام باتیں بے وجہ نہیں ہو سکتیں۔

جب اسلامی لشکر شام کی سرحد کے قریب پہنچا تو اطلاع ملی کہ ہرقل شہنشاہِ مملکت بازنطین (دراصل کماندار اس کا بھائی تھا) دو لاکھ کی جمعیت کے ساتھ آیا ہوا ہے۔ اتنے بڑے رومی لشکر کی جنوبی شام میں موجودگی کی صرف ایک وجہ ہو سکتی تھی اور وہ مملکتِ مدینہ پر فوج کشی تھی۔ حضورؐ کی عسکری استخبارات کی بروقت کارکردگی داد طلب ہے۔ دشمن کی تعداد کی اطلاع، ان کے ارادوں کا ذکر اور ان کی روانگی کی تاریخوں کا تعین۔ یہ سب باتیں اگر کاملاً درست نہ ہوتیں تو زیدؓ کا لشکر شام کی سرحد پر بروقت نہ پہنچ سکتا۔ لشکر نے

معمولی بحث کے بعد فیصلہ کیا دشمن کی تعداد بے معنی ہے۔ انہیں فرض کی ادائیگی سے غرض ہے۔

دونوں لشکر بحیرۂ مُردار کے ساحل پر مشارف گاؤں کے مقام پر ایک دُوسرے کے بالمقابل ہُوئے۔ جیساکہ معمول ہے دونوں نے اپنے اپنے رسالوں کو دشمن کے بازوؤں کے صحیح مقامات کے تعین کے لیے استعمال کیا۔ واقعات سے یُوں محسوس ہوتا ہے کہ زیدؓ نے اپنے رسالے کے استعمال میں دشمن کو اپنی صحیح تعداد کا اندازہ نہ ہونے دیا۔ ناظر اور لڑاکا گشتوں (RECCE AND FIGHTING PATROLS) کا استعمال چھ روز تک رہا۔ ساتویں دن زیدؓ نے رابطہ (CONTACT) توڑ کر کچھ اس انداز میں پس نشینی کی کہ رومی یہ سمجھے کہ اسلامی لشکر بھاگ کھڑا ہوا ہے۔ رومی لشکر فیلانکس (PHALLANX) کی ترتیب میں صف آراء تھا۔ فیلانکس تیز رفتاری تو کجا چند قدموں سے زیادہ کی حرکت کی اجازت نہیں دیتا۔ زیدؓ نے تیزی سے پس نشینی کی اور چند میل عقب میں موتہ کے مقام پر اپنے لشکر کو اس طرح ترتیب دی کہ رومی لشکر جونہی سامنے آئے اس کے غیر مرتب فیلانکس کے بکھرے ہُوئے سپاہیوں پر ہلّہ بول دیا جائے۔ فیلانکس یوں بھی اس قدر گنجان ہوتا ہے کہ اس کے اکثر افراد کو بازو اٹھانے کے لیے جگہ نہیں ہوتی اور وہ اپنے ہتھیاروں کا استعمال اچھی طرح نہیں کر سکتے۔ رومی لشکر پر جونہی یہ ناگہانی حملہ ہوا اس کی اگلی مگر بے ترتیب صفیں پیچھے کو بھاگ نکلیں حالانکہ حملہ محاذ کے صرف ایک حصّہ پر ہُوا تھا مگر لڑائی میں فوج کی بھگدڑ چھُوت کی بیماری کی مانند ہُوا کرتی ہے۔ ہر طرف شور و غل اور عقب کو بھاگنے کی کوشش۔ فیلانکس کی گہرائی اس کی چوڑائی کے برابر ہوتی ہے بھاگ کر کہاں جاتے۔ اب پیچھے سے اسلامی سپاہ کی شمشیریں چمکنا شروع ہُوئیں۔ تاریخ دان لکھتے ہیں کہ مسلمان سپاہی ایک ایک اور دو دو ہو گئے تھے۔ مورخوں نے وہی اُحد والی غلطی کی ہے۔ جب دشمن بھاگ کھڑا ہو تو دو سے زیادہ آدمی کس طرح اکٹھے رہ سکتے ہیں۔ دشمن کا تعاقب کرنے والی فوج خود بکھر جاتی ہے۔

زیدؓ بالآخر شہید ہُوئے۔ جعفرؓ ابن ابی طالب نے بڑھ کر کمان سنبھال لی۔ جعفرؓ نے پیدل لڑنا پسند کیا اور آپ پہلے مسلمان ہیں جنھوں نے گھوڑے کی کونچیاں کاٹ ڈالیں۔ جعفرؓ دلیر، شجاع، نڈر اور طالبِ شہادت، علیؓ ابن ابی طالب کے چھوٹے بھائی۔ ایسے جوانمرد کے سامنے کون ٹھہر سکتا تھا۔ آپ رومی صفوں کو چیر کر بڑھتے گئے۔ حتی کہ بہتر زخموں نے بدن کا خون نچوڑ دیا۔ جب وہ گرے تو عبداللہؓ قریب ہی تھے۔ علمِ نبویؐ انہوں نے سنبھالا اور اشعار پڑھتے ہُوئے رومی صفوں کو چیرنے کا عمل جاری رکھا بالآخر انہوں نے بھی درِ جنت پر دستک دی۔ درِ بہشت بریں وا ہُوا اور اسلامی لشکر کا تیسرا کماندار بارگاہِ رب العزت میں حاضر ہوا۔

حکمِ رسالت تھا کہ تیسرے کماندار کے شہید ہونے پر لشکر دشمن کی تلواروں کے سائے میں اپنا چوتھا کماندار منتخب کرے گا۔ یہی ہوا۔ خالدؓ بن ولید کو چوتھا کماندار چُنا گیا۔ جو مورخ یہ کہتے ہیں کہ موتہ کے مقام پر اسلامی لشکر کو شکست ہُوئی تھی۔ وہ یہ بھُول جاتے ہیں کہ شکست خوردہ لشکر میدانِ جنگ میں اپنا کماندار چننے کے قابل نہیں ہُوا کرتا۔ فاتح دشمن ایسی تقاریب کی اجازت نہیں دیا کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ دشمن موتہ کے مقام سے بھاگنے میں مصروف تھا۔ اگر جعفرؓ کے زخم اس کی فوج گن سکتی ہے اور نیا کماندار چُن کر اس کے احکام کے مطابق واپسی کے دوران مالک بن زفیلہ عیسائی سردار جو دشمن کے بائیں بازو کی حفاظت پر مامور تھا اسے قتل کر سکتی ہے تو ایسی فوج شکست خوردہ نہیں ہو سکتی۔ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اُحد کی طرح یہ مقابلہ بھی فتح و شکست کے بغیر انجام پذیر ہُوا۔ چونکہ وہ رومی مملکت کو ختم کیے بغیر لوٹے تھے اس لیے چند لوگوں نے ان پر کنکر پھینکے اور کہا کہ یہ دشمن کو پیٹھ دکھا کر

آ سکے ہیں۔ ابھی تو تفاصیل سے مدینہ کے لوگ مکمل لاعلم تھے۔ کیسے معلوم ہُوا کہ یہ بھاگ آئے ہیں۔ یہ فقرہ یونہی کسی نے کہہ دیا ہوگا۔
حضورؐ نے اس پر فرمایا تھا:

"یہ بھاگے ہوئے نہیں ہیں۔ اگر اللہ کو منظور رہا تو یہ پھر لڑیں گے۔"

تاریخ شاہد ہے کہ ایسے ہی ہوا۔

اُس دَور کی دنیا کی سب سے بڑی طاقت نے موتہ کے مقام پر جو زخم کھائے وہ مغربی دنیا کے دلوں پر ابھی ہرے ہیں اور شاید قیامت تک مندمل نہ ہوں۔ گو رومؔ کا تنزّل اس معرکہ کے نتیجہ میں شروع ہو چکا تھا مگر جن شمالی قبائل نے اس غیر ملکی طاقت کو مدد دی تھی ان کا معاملہ ابھی باقی تھا۔ غزوۂ موتہ جمادی الاُولیٰ ۸ھ ہجری میں ہُوا۔ دوسرے ہی مہینہ حضورؐ نے عمرو بن العاص کو تین سو کا لشکر دے کر شمالی علاقہ میں روانہ فرمایا کہ وہاں کے قبائل نے جو لاتا نونیت کے واقعات شروع کر دیئے تھے وُہ ختم ہوں۔ عمروؓ ابن العاص نے اس علاقہ میں پہنچ کر مدینہ اطلاع دی کہ قبائل کے اجتماع کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ان کی طرف کمک روانہ کی جائے۔ حضورؐ نے حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح کو دو سو مجاہد دے کر کمک کے طور پر روانہ فرمایا۔ اس لشکر میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ صف کے سپاہی کی حیثیت سے شامل تھے۔ وہاں پر کمان کا سوال پیدا ہُوا۔ حضرت ابوعبیدہؓ پرانے کماندار تھے مگر عمروؓ ابن العاص نے کہا کہ مہم کے کماندار وُہ ہیں اس لیے نماز کی امامت اور افواج کی امامت یعنی کمان کرنے کے وہی حقدار ہیں۔ کمک کا کماندار اسی صورت ہو سکتا ہے کہ اعلیٰ کمان (HIGH COMMAND) نے اس طرح کے واضح احکام صادر کیے ہوں۔ ان کا موقف مان لیا گیا۔ قبائل کے اجتماع کو شکست ہُوئی اور شمالی علاقوں میں امن و امان قایم کر دیا گیا۔ اس مہم کا نام سریّہ ذات السلاسل ہے۔

رجب ۸ھ ہجری میں حضرت ابوعبیدہ کو بھی کمان کا موقعہ مل گیا۔ انہیں تین سو کا لشکر دے کر سیف البحر روانہ کیا گیا۔ باغی قبیلہ لشکر کی آمد سُن کر پہاڑوں کی جانب نکل گیا۔ اسی طرح شعبان ۸ھ ہجری میں سریّہ محارب میں بھی ہُوا، کوئی لڑائی نہیں ہُوئی۔

اس دور کا جائزہ اگر لیا جائے تو ایسے محسوس ہوتا ہے کہ مدینہ پورے جزیرۃ العرب پر چھا گیا ہے اور مکہ پس منظر میں چلا گیا ہے شمالی علاقہ جو کبھی کسی بھی مملکت کے تابع مکمل طور پر نہ رہا تھا وہ بھی مطیع ہو کر امن و امان قایم رکھ رہا تھا۔ گو اہلِ مکہ کی تجارت پرانے پیمانہ پر از سرِ نو جاری ہوگئی تھی مگر سیاسی طور پر مکہ اپنا مقام کھو بیٹھا تھا۔ مکہ کے حلیف ختم ہو چکے تھے۔ بنو فزارہ کا سردار اعیینہ بن حصن جس نے بارہا مکہ کی مدد کی تھی وُہ مدینہ آیا اور اپنے تمام کارناموں کی معافی مانگی۔ وہ جس نے چالیس دینی مدرسوں کو قتل کروایا تھا اسے مدینہ کے دربار میں رحمۃ للعٰلمینؐ نے بخش دیا۔ اُس دور کے مبصروں کو محسوس ہوتا ہوگا کہ جزیرۃ العرب اب وہ پُرانا عرب نہیں رہا۔ اب اس میں نئی روح کارفرما ہو چکی ہے۔ اس احساس کے نمایاں ہوتے ہی قریش مکہ کو ایک بار پھر اپنے جاتے ہوئے اقتدار کی فکر دامنگیر ہُوئی۔

اہلِ مکہ نے صلح حدیبیہ اس لیے قبول کی تھی کہ وُہ اپنی تجارت کو بحال کرنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ تجارت کے بحال ہونے سے، وُہ اپنا سیاسی اور معاشرتی مقام قایم رکھ سکیں گے مگر حالات نے تمام پرانے نظام کو بدل ڈالا تھا۔ مدینہ اب رومی سلطنت کے ساتھ مبارزت میں بلند مقام حاصل کر چکا تھا۔ نجد پُوری طرح مدینہ کے زیرِ نگیں تھا۔ شمالی علاقے مدینہ کی اطاعت قبول کر چکے تھے ساحلی علاقہ پورے کا پورا مدینہ کے زیرِ تصرف تھا۔ مکہ اگر تجارت کر رہا تھا تو وہ مدینہ کے رحم و کرم پر۔ اگر حالات کو اسی طرح رہنے دیا گیا

تو پھر مکہ بھی مدینہ کی سیادت و قیادت کو قبول کرنے پر مجبور ہو جائیگا اور پھر ان کی دینی و سیاسی رہبری افسانہ بن کے رہ جائے گی۔ کی نوجوانوں نے زور دیا کہ صلح حدیبیہ کو توڑ دیا جائے ——— اب ایک واقعہ ہوا جس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اہلِ مکہ کے نوجوانوں کی تجویز تھی یا وہ جوش میں آکر اور صلح حدیبیہ کو توڑنے کی غرض سے شامل ہو گئے تھے۔ صلح حدیبیہ کے موقعہ پر بنو خزاعہ نے اعلان کیا تھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی مدینہ کے حلیف ہیں۔ اس وقت بنو بکر نے اعلان کیا تھا کہ وہ قریشِ مکہ کے حلیف ہیں۔ بنو بکر کو آخری مرتبہ بنو خزاعہ کی جانب سے نقصان پہنچا تھا۔ صلح حدیبیہ کے مطابق یہ بدلہ نہ لے سکے تھے۔ مگر قریش مکہ کے کچھ جوانوں کے ساتھ مل کر بنو بکر نے اچانک بنو خزاعہ پر حملہ کر دیا اور یہاں تک کہ انہیں حرم میں بھی تعاقب کر کے مارا۔ بنو خزاعہ حضورؐ کی خدمت میں مدینہ حاضر ہوئے۔ آپؐ نے انھیں یقین دلایا کہ کچھ کیا جائے گا اور وہ لوٹ آئے۔ آپؐ نے قریش کو لکھا کہ وہ مقتولوں کا خون بہا ادا کریں۔ قریشِ مکہ نے انکار کیا۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ پھر صلح حدیبیہ ختم کر دو۔ انہوں نے جواب دیا کہ جہاں تک ان کا تعلق ہے صلح حدیبیہ ختم ہو چکی ہے — یہ حقیقتاً اعلانِ جنگ تھا۔

دوبارہ سوچنے پر قریشِ مکہ نے چاہا کہ صلح حدیبیہ قایم رہے مگر خوں بہا کا ذکر پھر بھی نہ کیا۔ ابو سفیان مدینہ آیا مگر دربارِ رسالتؐ میں باریابی کی اجازت نہ ملی اور ناکام واپس چلا گیا۔

حضورؐ جب تیاری مکمل کر چکے تو دس ہزار کا لشکر لے کر مکہ کے خلاف روانہ ہو گئے۔ منزل آخر تک صیغۂ راز میں رہی۔ ساتویں دن مرالظہران کے مقام پر معسکر لگایا اور حکم دیا کہ ٹولی ٹولی یعنی دس آدمیوں کے لنگر کی آگ کی بجائے ہر شخص اپنا الاؤ جلائے۔ دیکھنے والوں کو معلوم ہوا کہ دس ہزار نہیں بلکہ ایک لاکھ کا لشکر ہے۔ ابو سفیان خدمت میں حاضر ہوا کہ کی جانب سے معذرت خواہی کی اور مسلمان ہوا۔ مگر آپؐ نے صرف یہ کہا، جاؤ اور جا کر اعلان کر دو کہ:

"جو حرم میں پناہ لے گا یا جو ابوسفیان کے گھر پناہ لے گا اور جو اپنے دروازے بند کر دے گا اسے امان ملے گی۔"

دوسری صبح لشکر چار بریگیڈوں میں تقسیم ہوا اور چاروں جانب سے حضورؐ اس مکہ میں داخل ہوئے جہاں سے جاتے وقت آپؐ کو پکڑنے کے لیے سو اونٹوں کے انعام کا اقرار ہوا تھا۔ ایک محلہ نے مدافعت کی ورنہ کوئی لڑائی نہیں ہوئی۔ کچھ دیر آرام فرمانے کے بعد حضورؐ حرم کعبہ تشریف لے گئے۔ آپؐ حرم کعبہ کے دروازہ پر کھڑے تھے اور سردارانِ قریش سر جھکائے سامنے بیٹھے تھے۔ خالق العلمین کی تعریف و توصیف کے بعد حضورؐ نے پوچھا:

"اے قریش! مجھ سے کس طرح کے سلوک کی توقع رکھتے ہو؟"

جواب ملا:

"باعزت باپ کے باعزت بیٹے سے اچھے سلوک کی توقع ہے۔"

ارشادِ رحمتِ عالمؐ ہوا:

"آج تمہیں کوئی پرسش نہیں، جاؤ تمہاری گردنیں آزاد ہیں۔"

عمر بھر کے دشمن آزادہو کر دوست بن چکے تھے۔

مکہ کے جنوب میں بنو ہوازن کا علاقہ تھا۔ یہ بہت بڑا قبیلہ تھا جس کی شاخیں صحرا اور پہاڑوں میں پھیلی ہوئی تھیں اور صحرائی لڑائی اور پہاڑی لڑائی سے یکساں طور پر واقف تھے۔ طائف ان کا مرکزی مقام تھا۔ مکہ اور مدینہ کی جنگ میں اب تک انھوں نے حصہ نہیں لیا تھا۔ اس لئے بھی ان کی تمام طاقت محفوظ تھی۔ انھیں کعبہ کے بتوں کا ٹکڑے ٹکڑے ہونا ناگوار گزرا۔ ان کا سردار مالک ابھی نوجوان اور خود سر تھا۔ قریش مکہ کی شکست نے شاید اسے یہ خیال بھی دے دیا تھا کہ مدینہ ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ قریش اس سے شکست کھا گئے ہیں۔ مگر میں بہت بڑے قبیلے کا سردار ہوں۔ اگر میں فاتح عربؐ کو شکست دے دوں تو میں پورے عرب کا بادشاہ بن سکتا ہوں۔ اس خیال نے اسے پورے قبیلے کی طاقت کو یکجا کرنے کی طرف متوجہ کر دیا۔ اس نے قبیلہ کی تمام شاخوں کو بلوا بھیجا اور حکم دیا کہ ریوڑ، عورتیں اور بچے سبھی ساتھ لے آؤ۔ اسے ایک بزرگ نے مشورہ بھی دیا کہ یہ کیا کر رہے ہو، کہنے لگا: "بیوی بچوں کی حفاظت کے خیال سے یہ بے جگری سے لڑیں گے۔"

حضورِ اقدسؐ کو جب اطلاع ملی تو آپؐ نے فوراً ہوازن کی پہاڑیوں کا رُخ کیا۔ دس ہزار کا لشکر آپؐ مدینہ سے ساتھ لائے تھے قریش مکہ نے دو ہزار کا دستہ مہیا کیا۔ روانگی سے تیسرے دن ایک وادی سے گزر رہے تھے کہ اچانک دونوں طرف کے ناموں سے حملہ ہوا خالد بن ولید طلایہ کی کمان کر رہے تھے مگر طلایہ میں بنو سُلیم کے نوجوان تھے جن کی تربیت ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی وہ جلد ہی بھاگ کھڑے ہوئے۔ تنگ وادی میں جب طلایہ بھاگ کھڑا ہوا تو پوری فوج کے قدم اُکھڑ گئے۔ آپؐ قریب ہی تھے۔ آپؐ وادی کے ایک اونچے حصہ پر کھڑے ہو گئے اور پکار کر فرمایا:

"کہاں جا رہے ہو، ادھر میرے پاس آؤ، یہاں ہوں میں اللہ کا رسول، محمد! عبد اللہ کا بیٹا۔"

حلقۂ اصحابؓ میں "ابریشم کی طرح نرم" آواز میں بولنے والے آخری نبیؐ کی آواز دونوں طرف کے پہاڑوں کے ساتھ ٹکرائی اور دوست دشمن کو معلوم ہوا کہ کس طرح جب خُون کے دریا بہہ رہے ہوں تو کمان دار ٹھنڈے دل سے اپنی کمان قایم رکھتا ہے اور افواج کو درست طریقہ پر سرگرم عمل ہونے کی ہدایات دیتا ہے۔ جب آپؐ نے فرمایا:

"اے انصار!

اے ببول کے درخت کے ساتھیو!

میرے پاس آؤ۔

اے انصار!

اے خزرج!"

صحابۂ کرامؓ "لبیک لبیک" کہتے ہوئے اور اپنی زرہیں پھینکتے ہوئے اونٹوں سے کود ے۔ آج مدینہ کے غازی زرہ کے بغیر لڑنے میں آسانی ورخوشی محسوس کر رہے تھے۔ معاً لڑائی کا نقشہ بدل چکا تھا۔ بنو ہوازن جب بنو سُلیم کا تعاقب کرتے ہوئے مدنی لشکر کے مقرِ قیادت تک پہنچے تو سیسہ پلائی ہوئی دیوار سے ٹکرا کر رک گئے۔ حضورؐ یہ نقشہ ملاحظہ فرما رہے تھے۔ جب گھمسان کا رن پڑا تو فرمایا:

"اب تنور گرم ہوا ہے۔"

ایک دلیر خاتون اپنی سواری بڑھاتی ہُوئی حضور اقدسؐ کے قریب پہنچ گئی اور کہا:

"حضورؐ جو بھاگنے والے ہیں انھیں بھی دشمنوں کی طرح قتل کرنا چاہیے۔"

اس روز تو بھاگنے والے قتل نہ کیے گئے مگر عہد حاضر کی افواج کی قیادت نے میدانِ جنگ سے بھاگنے والوں کی سزا موت تجویز کی ہے۔ ہوازن کو غزوۂ حنین میں شوال ۸ھ میں شکست فاش ہُوئی۔ وہ مختلف سمتوں میں بھاگ کھڑے ہُوئے۔ زیادہ تر نے طائف جا کر پناہ لی۔ ان کے معسکر سے چوبیس ہزار اُونٹ اور چالیس ہزار بھیڑ بکریاں ہاتھ آئیں۔ ان کے بیوی بچوں کو البتہ آزاد کر دیا گیا۔ قریش کے جن سرداروں نے ہجرت کے دوسرے دن ندوہ میں بیٹھ کر آپ کو پکڑ کر لانے والے کو سَو اونٹ انعام دینے کا اعلان کیا تھا انھیں نام بنام بُلایا گیا اور حنین میں حاصل شدہ اونٹوں میں سے انہیں ایک ایک سو اونٹ انعام دیے گئے۔ یہ تھا رحمتِ عالمؐ کا بدلہ۔

حنین کی فتح کے بعد کچھ روز تک طائف کا محاصرہ کیا گیا مگر بے جا خون خرابہ کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ آپ نے محاصرہ اٹھا لیا اور فرمایا کہ اہلِ طائف خود مدینہ حاضر ہوں گے۔ ایسے ہی ہوا۔ اہلِ طائف کے سرداروں نے مدینہ حاضر ہو کر گزشتہ کی معافی مانگی۔ انعام و اکرام اور خلعت و سفر خرچ سے نوازے گئے اور ان کے تمام قصور بخش دیے گئے۔ یہ دریا دلی، یہ بخشش، یہ جود و سخا اور یہ انعام و کرام۔ مگر جب سپہ سالارِ مدینہؐ، شاہِ زمان، فاتح خیبر و حنین ان سفارتوں پر دولت کی بارش کر کے مسجد نبویؐ سے اُٹھتے اور اپنے چند ہاتھ کے طول و عرض کے حجرہ میں داخل ہوتے اور پُوچھتے کہ اس روز گھر میں کیا پکا ہے؟ تو اکثر جواب ملتا:

"گھر میں کچھ تھا ہی نہیں کہ چُولھا گرم ہوتا۔"

اور شہنشاہِ دو عالم، سربراہِ مملکتِ عرب و عجمؐ، فاتح ہر میدان خالی پیٹ سو رہتے۔ یہ تھے محمدؐ، اللہ کے رسولؐ، آخری نبیؐ، عالم بشریت کے لیے زمان و مکاں سے بلند تر نظامِ زندگی لانے والے اُمّی پیغمبرؐ، اور اس پر مکمل طور پر نمونہ قایم کرنے والے جنہوں نے عسرت و نصرت، بزم و رزم، ناداری و شہنشاہی کی زندگی غرضیکہ ہر انسان کے لیے زندگی بسر کرنے کے طور طریقے مثال کے طور پر قایم کیے۔ اللہ اور اللہ کے فرشتے کیوں نہ ایسے سرورِ دوجہاںؐ پر درود پڑھیں۔ آپ بھی پڑھیے،

اللھم صلّ علیٰ محمدٍ و علیٰ آلِ و اصحاب محمد و بارك وسلم وصل علیه۔

یوں تو فتح مکہ اور حنین و طائف کے غزوات پر غزواتِ نبویؐ کا ذکر ختم ہو جانا تھا مگر شمال سے اطلاع آئی کہ رومی شہنشاہ ایک بار پھر زور آزمائی کے لیے بڑھ رہا ہے۔ اس بار آپ نے لام بندی پورے اعلان کے بعد کی اور بتا دیا کہ کہاں کا قصد ہے۔ تیس ہزار کا لشکر تیار ہُوا، ایک تہائی سوارہ پر مشتمل تھا۔ امت نے دل کھول کر بیت المال کی مدد کی۔ حضرت عمرؓ آدھا اثاثہ اٹھا لائے، حضرت ابوبکرؓ نے اپنی پوری پُونجی پیش کر دی۔ دس ہزار سپاہ کا اسلحہ وغیرہ حضرت عثمانؓ نے فراہم کیا۔ اس کے باوجود بہت سے تھے جو اس لیے نہ جا سکے کہ سواری مہیا نہ ہو سکی۔ مدینہ میں تنہا ساتھی کے ساتھ شامل ہونے والا اللہ کا اُمّی رسولؐ آج تیس ہزار کی جمعیت کے ساتھ مملکتِ مدینہ جو پورے جزیرۃ العرب پر مشتمل تھی اس کے تحفظ اور دفاع کے لیے اس دور کی فاتح مملکت کے خلاف لشکر کشی کر رہا تھا۔ جنہوں نے تین ہزار سے کاری زخم کھائے تھے وہ تیس ہزار کے مقابلہ میں کس طرح آتے۔ لڑائی نہیں ہُوئی البتہ چھوٹی چھوٹی

جھڑپوں کے ذریعہ شمالی علاقہ کے قبائل کو امن اور سکون سے رہنے کی تلقین کے بعد حضور اقدسؐ واپس مدینہ تشریف لے آئے۔ اور صحابہؓ کو مملکت کے نظم ونسق اور انتظام و انصرام کے سبق سکھانے میں مصروف ہوگئے۔ اب کوئی غزوہ عمل میں نہیں آیا۔ غزوات کی مہم میں جو مقصد تھا وہ دوست و دشمن کو امن عطا کرنا تھا وہ حاصل ہو چکا تھا۔ اس لیے اب صرف "الیوم اکملت" کے اشارہ کا انتظار تھا۔

مہمّاتِ رسولؐ

غلام جیلانی برق
ایم۔اے، پی۔ایچ۔ڈی

الفہرس

مہماتِ رسولؐ

ڈاکٹر غلام جیلانی برق

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدنی زندگی کے دس برس میں اٹھاسی (۸۸) مہمات ترتیب دی تھیں۔ ان میں سے کچھ تبلیغی تھیں۔ جیسے بئرِ معونہ (عنوان نمبر۱۹) رجیع (۲۰) اور یمن (۲۷) کی مہمات۔ کچھ خالص دفاعی تھیں جیسے بدر، اُحد اور اَحزاب۔ کہ دشمن مدینے پر چڑھ آیا تھا اور حضورؐ کو تلوار اٹھانا پڑی تھی۔ کچھ اقتصادی تھیں جن کا مقصد قریشِ مکہ کو اقتصادی طور پر کمزور کرنا تھا اور اس کی واحد صورت یہ تھی کہ قریش کے تجارتی قافلوں کو جو شام تک جاتے تھے نواحِ مدینہ سے گزرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ اس سلسلے میں حضورؐ نے کئی مہمات بھیجی تھیں۔ دیکھیے عنوان ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۷، ۸ وغیرہ اور کچھ انسدادی تھیں۔ حضورؐ کا نظامِ اخبار و اطلاعات اس قدر محکم و مکمل تھا کہ جہاں بھی کوئی سازش ہوتی مدینہ پر حملہ کرنے کا کوئی منصوبہ بنتا یا قبائل آمادۂ پیکار ہوتے تو حضورؐ کو اطلاع مل جاتی اور آپؐ فوراً کوئی مہم اس طرف بھیج دیتے۔ اس نوع کی مہمات چالیس سے کم نہ تھیں۔ دیکھیے عنوان ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۷، ۱۸، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۸، ۲۹، ۳۰ وغیرہ۔

اسلام بزورِ شمشیر کا الزام غیر مسلم تاریخ نگار عموماً یہ طعنہ دیتے ہیں کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیلا۔ یہ الزام بوجوہ بے بنیاد ہے اول اس لیے کہ اللہ نے دین میں جبر سے روک دیا تھا لا اکراہ فی الدّین (دین میں جبر نہیں ہے) حضورؐ کی اٹھاسی مہمات کی تفصیل آپ کے سامنے ہے ان میں ایک بھی ایسی مہم نہیں جو کسی قوم یا قبیلے کا دین بدلنے کے لیے بھیجی گئی ہو۔ دوم، مذہب ایک شدید ترین تعصب کا نام ہے جس کی جڑیں رُوح کی گہرائیوں میں ہوتی ہیں۔ رُوح کا نکلنا تو آسان ہے لیکن مذہب کا چھٹنا مشکل۔ اگر مذہب تلوار سے بدل سکتا ہے تو پھر آیئے تلوار میں دیتا ہُوں ذرا پشاور سے آگے کوہستانی قبائل میں جایئے اور ان کا مذہب بدل کر دکھایئے۔ اگر ہم لحہ بھر کے لیے اس الزام کو صحیح بھی تسلیم کریں تو سوال یہ ہے کہ انڈونیشیا میں گیارہ کروڑ، ملایا میں ایک کروڑ، جزائر بحرالکاہل میں اسی لاکھ، چین میں آٹھ کروڑ اور سیاہ افریقہ میں بائیس کروڑ مسلمان کہاں سے آگئے ہیں۔ ان ممالک میں تو ہماری تلوار کبھی نہیں گئی تھی۔ ہاں ہمارے روشن جبیں علماء و صوفیاء، دیانت دار تاجر اور راست باز مسافر ضرور گئے تھے۔ یہ انہی لوگوں کا حُسنِ کردار تھا، جس سے کروڑوں انسان متاثر ہُوئے اور وہ خدائے قدوس کے سامنے جُھک گئے۔

حضورؐ اور پیروانِ حضورؐ نے بارہا میدانِ جنگ میں اسلام پیش کیا تھا لیکن صرف اُن لوگوں کے سامنے جنھوں نے حملے میں پہل کی تھی اور پھر شکست کھائی تھی۔ انھیں دو میں سے ایک کا اختیار دیا گیا تھا، اسلام یا جزیہ۔ جزیہ ایک ہلکا سا ٹیکس ہے جو زکوٰۃ، صدقہ اور عُشر سے بہت کم تھا۔ خلفائے راشدین کے زمانے میں جزیہ کی شرح یہ تھی:

د۔ سرمایہ دار: چار درہم ماہوار۔ ایک درہم ہماری چونی کے برابر ہوتا ہے۔

ب۔ اوسط الحال: دو درہم ماہانہ

ج۔ ذرا کمتر: ایک درہم ماہانہ

تمام نادار، بے کار اور معذور اس سے مستثنیٰ تھے۔

مکہ میں حضورؐ کی مشکلات مکہ میں حضورؐ کو جہاد کی اجازت نہیں تھی اس لیے آپؐ اور آپؐ کے جاں نثار چپ چاپ قریش کے مظالم سہتے رہے اور جواباً کوئی کارروائی نہ کر سکے۔ ابوجہل[1] (د ۲ھ) نے آپؐ کے خلاف کیا کچھ نہیں کیا۔ وہ کون سا ایذا تھا جو ابولہب[2] اور اس کی بیوی نے نہیں دیا۔ ایک دن جب حضورؐ سجدے میں گئے تو عقبہ[3] نے اونٹ کی اوجھ آپؐ پر پھینک دی۔ اسی عقبہ نے ایک دن آپؐ کی گردن میں چادر ڈال کر اسے مروڑنا شروع کیا۔ اوپر سے حضرت ابوبکرؓ آگئے اور انھوں نے عقبہ کو دھکیل کر آپؐ کی گردن کو آزاد کرایا۔ جب آپؐ طائف[4] میں تبلیغ کے لیے گئے تو وہاں کے لوگوں نے آپؐ کو اتنے پتھر مارے کہ آپؐ کے جوتے لہو سے بھر گئے۔ ہجرت سے پانچ برس پہلے قریش نے ابوطالب کے گھرانے کو اس حد تک زچ کیا کہ یہ لوگ شعب ابی طالب میں منتقل ہوگئے اور وہاں تین برس تک ناداری و عسرت کی زندگی بسر کرتے رہے۔ حضرت بلالؓ[5]، امیہ[6] بن خلف کے غلام تھے۔ جب یہ ایمان لائے تو امیہ نے دوپہر کے وقت انھیں گرم ریت پر لٹا کر ان کی چھاتی پر ایک

---

۱ ابوجہل کا پورا نام ابوالحکم عمرو بن ہشام بن مغیرہ مخزومی تھا۔ مخزوم قریش ہی کا ایک قبیلہ تھا۔ یہ اپنے قبیلے کا سردار تھا۔ ۵۷۰ء میں پیدا ہوا اور میدانِ بدر میں دو بھائیوں معاذ بن عفراء اور معوذ بن عفراء کے ہاتھوں ہلاک ہوا۔ (دائرہ معارف اسلامیہ۔ پنجاب ج ۱ "ابوجہل")

۲ ابولہب کا اصلی نام عبدالعزیٰ بن عبدالمطلب تھا۔ یہ حضورؐ کا حقیقی چچا تھا اور اپنی بیوی کے ساتھ مل کر حضورؐ کی راہوں میں کانٹے بچھایا کرتا تھا۔ اعدائے اسلام میں یہ واحد آدمی ہے جس کے متعلق ایک سورہ نازل ہوا تھا تبت یدا ابی لہب ... جب بدر میں قریش کو شکست ہوئی تو وفورِ غیظ و غضب سے اسے پہلے بخار ہوا پھر چیچک نے حملہ کر دیا۔ جب یہ ہلاک ہوا تو دو تین دن پڑا رہا اور پھر کرایہ کے حبشیوں نے اسے دفن کیا۔ (ڈکشنری آف اسلام "ابولہب")

۳ عقبہ بن ابی معیط اموی حضورؐ کے بدترین اعداء میں سے تھا۔ (اردو انسائیکلوپیڈیا ص ۱۰۸)

۴ طائف مکہ سے کوئی دس میل جنوب میں ایک سرسبز مقام ہے۔

۵ بلالؓ بن رباح حبشی، اسلام کے ایک دشمن امیہ بن خلف کا غلام تھا۔ یہ آپ کو بے اندازہ اذیتیں دیتا تھا۔ بالآخر حضرت ابوبکرؓ نے بلالؓ کو خرید کر آزاد کر دیا۔ یہ امیہ غزوۂ بدر میں بلالؓ ہی کی ضرب سے ہلاک ہوا تھا۔ حیاتِ رسولؐ میں آپ مؤذن رہے اور تمام غزوات میں شامل ہوئے۔ پھر شام کی طرف چلے گئے ۶۳ برس کی عمر پائی۔ ۲۰ھ میں فوت ہوئے اور دمشق میں دفن ہوئے۔ (اکمال۔ ص ۱۱۱۴)

۶ امیہ بن خلف بدر میں حضرت بلالؓ کی ضرب سے ہلاک ہوا تھا اور اس کا بھائی ابی بن خلف میدانِ احد میں حضورؐ کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ (اردو انسائیکلو پیڈیا۔ ص ۶۲)

بھاری سِل رکھ دی۔ عمارؓ[8] یمنی، صہیبؓ[9] رومی اور دیگر متعدد نومسلموں سے بھی یہی سلوک کیا گیا۔ اُن کا یہ سلوک صرف غریبوں سے نہ تھا بلکہ حضرت عثمانؓ[10] جیسے صاحبِ جاہ و دولت، حضرت ابوذرؓ[11]، حضرت زبیرؓ[12] بن عوام اور حضرت سعیدؓ[13] بن زید جیسے معزز لوگ بھی ان کے مظالم کا شکار رہے۔ آخر تنگ آ کر حضورؐ نے صحابہ کو ہدایت کی کہ وُہ حبشہ چلے جائیں چنانچہ صحابہؓ کے دو قافلے روانہ ہُوئے۔ پہلے میں گیارہ مرد اور چار عورتیں تھیں ان میں حضرت عثمانؓ، حضرت زبیرؓ بن عوام اور حضرت عبدالرحمانؓ[14] بن عوف بھی شامل تھے۔ دوسرے قافلے میں ۸۰ صحابہ تھے اور یہ ہجرت ثانیہ کے نام سے مشہور ہے۔

قریش نے عمروؓ[15] بن عاص (بعد میں فاتح مصر) کی قیادت میں ایک سفارت حبشہ میں بھیجی۔ اس نے پہلے وہاں کے اسقفِ اعظم کو

---

[8] عمارؓ کے والد کا نام یاسِر اور والدہ کا سُمیّہ تھا۔ یہ پہلے حُذیفہ بن مُغیرہ قرشی کے غلام تھے۔ اسلام لانے کے بعد انہیں بے اندازہ اذیتیں دی گئیں لیکن ثابت قدم رہے۔ یہ تمام غزوات میں شامل ہُوئے اور جنگِ صفّین (۳۷ھ) میں حضرت علیؓ کی طرف سے لڑتے ہوئے شہادت پائی۔ (اکمال ص ۱۱۶۱)

[9] صُہیبؓ کا والد سنان بن خالد (مالک) بن عبد عمرو بن طفیل موصل میں کسریٰ کا عامل تھا۔ رُومیوں کے ایک حملے میں صہیبؓ اسیر ہوگیا اور رُوم میں پلتا رہا۔ اتفاقاً وہاں مکہ کا ایک تاجر کلب جا پہنچا اور صہیب کو خرید لایا۔ اس سے عبداللہ بن جدعان التیمی نے خرید کر اسے آزاد کر دیا لیکن یہ عبداللہ کے پاس ہی قیام پذیر رہا۔ یہ اور عمار ایک ہی دن اسلام لائے تھے۔ وفات ۳۸ھ میں۔ (استیعاب ج ۱ ص ۳۱۴ و اکمال ص ۱۱۴۵)

[10] عثمانؓ بن عفان بن ابی العاص بن اُمیّہ بن عبد شمس القرشی الاموی حضورؐ کے بعد تیسرے خلیفہ تھے جو ۲۳ھ سے ۳۵ھ تک برسرِ اقتدار رہے۔ آپ کے گھر میں آگے پیچھے حضورؐ کی دو بیٹیاں تھیں۔ پہلے رُقیہ اور پھر اُمِ کلثوم۔ آپ نے دو دفعہ ہجرت کی۔ پہلے حبشہ اور پھر مدینہ کی طرف (استیعاب ج ۲ ص ۴۷۲)

[11] ابُوذرؓ غفاری کا پورا نام جندب بن جنادہ بن سفیان بن عبید بن غفار تھا۔ والدہ رَملہ بنت ربیعہ تھی۔ کہتے ہیں کہ ابوذر اسلام لانے والوں میں چوتھے تھے۔ بدر، اُحد اور خندق میں شامل ہوئے۔ عہدِ ابوبکرؓ میں شام کی طرف چلے گئے اور حضرت عثمانؓ کے زمانے میں ربذہ (مدینہ سے چار منزل شمال مشرق کی طرف) کو مسکن بنا لیا اور ۳۲ھ میں وہیں وفات پائی۔ (استیعاب ج ۱ ص ۸۲)

[12] زُبیرؓ بن عوام بن خویلد بن اسد بن عبد العزّیٰ بن قُصیّ القرشی الاسدی ابوعبداللہ (۳۶ھ) کی والدہ صفیہ بنت عبدالمطلب حضورؐ کی پھوپھی تھیں۔ پندرہ برس کی عمر میں اسلام لائے۔ اللہ کی راہوں میں سب سے پہلے تلوار کا استعمال آپ ہی نے کیا تھا۔ آپ عشرۂ مبشرہ میں شامل تھے۔ جنگِ جمل میں حضرت عائشہؓ کی طرف سے لڑتے ہوئے شہید ہوگئے۔ (استیعاب ج ۱ ص ۲۰۱)

[13] سعیدؓ بن زید بن عمرو بن نفیل القرشی العدوی (۵۰ھ) بدر کے سوا تمام غزوات میں شامل ہُوئے۔ آپ عشرہ مبشرہ میں سے تھے اور عمرؓ سے پہلے اسلام لائے تھے۔ آپ حضرت عمرؓ کے بہنوئی تھے۔ بیوی کا نام فاطمہ۔ انہی کو سزا دینے گئے تھے کہ عمرؓ خود مسلمان ہو گئے۔ (استیعاب ج ۲ ۔ ص ۵۳۸)

[14] عبدالرحمانؓ بن عوف بن عبدِ عوف بن عبد بن حارث بن زہرہ بن کلاب بن مُرّہ بن کعب قرشی۔ زہری حضورؐ سے دس سال چھوٹے تھے۔ یہ عشرہ مبشرہ میں سے تھے اور فقیہ صحابہ میں شمار ہوتے تھے۔ وفات ۳۲ھ میں ہُوئی۔ (استیعاب ج ۲ ص ۳۹۰ اور اکمال ۱۱۰۵)

[15] عمروؓ بن عاص بن وائل بن ہاشم بن سعید بن سہم قرشی۔ سہمی سالِ فتح (مکہ) سے پہلے اسلام لائے تھے۔ حضورؐ نے آپ کو عُمان کا حاکم مقرر کیا تھا۔ عہدِ عمرؓ میں مصر کو فتح کیا اور ۴۳ھ میں وفات پائی۔

(استیعاب ج ۲ ص ۴۳۴ و اکمال ص ۱۱۶۲)

تحائف دے کر قابو کیا اور پھر کچھ تحائف نجاشی[10] کی خدمت میں پیش کرنے کے بعد استدعا کی کہ یہ مہاجر مسلمان اُن کے حوالے کیے جائیں لیکن نجاشی نے اُن کی بات نہ سُنی۔

جو لوگ حضورؐ کو ایذا دینے کے لیے ہر روز نئے طریقے سوچتے تھے۔ ان میں ابوجہل، ابولہب، ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل اور اسود بن عبدیغوث سرِفہرست تھے۔ (سیرت النبیؐ ج ۱، ص ۲۵۶)

عربوں کی شجاعت، جاں بازی اور اپنے وقار کی حفاظت کے لیے سرفروشی کی بے شمار داستانیں تاریخ عرب اور دواوینِ عرب میں محفوظ ہیں۔ اگر حضورؐ مظالمِ قریش کا انتقام لینے پہ تُل جاتے تو بنو ہاشم، بنو تیم، بنو زہرہ، بنو عدی اور دیگر قبائل کے سینکڑوں سرفروش آپؐ کا اشارہ پاتے ہی جان پہ کھیل جاتے لیکن انتقام لینے کی اجازت نہ تھی اس لیے حضورؐ اور آپؐ کے جاں نثار چُپ چاپ ظلم سہتے رہے۔ اور جب یہ مظالم اُن کی قوتِ برداشت سے باہر ہوگئے تو مدینہ کی طرف ہجرت کر گئے۔ آپؐ (بموجب سیرت النبیؐ ج ۱ صفحہ ۲۷۷) ۸۔ ربیع الاول ۱۳ نبوی/۲۰ ستمبر ۶۲۲ء کو مدینہ کی بیرونی بستی قُبا میں داخل ہوئے تھے۔ واٹ (ص ۱۷) کی تحقیق یہ ہے کہ آپؐ ۲۴ ستمبر ۶۲۲ء مطابق ۱۲۔ ربیع الاول ۱ھ کو قُبا میں تشریف فرما ہوئے تھے۔ ابن خلدون (ج ۱ ص ۹۹) کی رائے بھی یہی ہے لیکن وُہ ساتھ ہی لکھتے ہیں کہ حضورؐ سوموار کو قُبا میں پہنچے تھے۔ ریاضی کے ایک فارمولے کے مطابق سوموار ۸۔ ربیع الاول ۱ھ کو تھا۔ اور اُس روز ستمبر کی ۲۴ تاریخ تھی نہ کہ ۲۰۔ چار روز بعد مدینہ میں تشریف فرما ہوئے اور اس روز سے آپؐ کی زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

بعد از ہجرت

ہجرت کے بعد بھی قریش فتنہ سامانیوں سے باز نہ آئے چنانچہ انہوں نے مدینہ کے ایک رئیس عبداللہ[11] بن اُبَی کو لکھا:

"تُم نے ہمارے آدمی کو اپنے ہاں پناہ دی ہے۔ ہم قسم کھا کر اعلان کرتے ہیں کہ اگر تم نے اُن سب کو مار نہ ڈالا یا نکال نہ دیا تو ہم تم پر حملہ کر کے تمہیں تباہ کر دیں گے اور تمہاری مستورات کو اسیر بنا لیں گے۔"

انہی دنوں قبیلۂ اوس کا ایک سردار سعد[12] بن معاذ عمرہ کے لیے مکہ میں گیا تو کعبہ میں ابوجہل سے ملاقات ہوگئی۔ کہنے لگا کہ تم نے ایک "مُرتد" (خاکم بدہن) کو اپنے ہاں پناہ دے رکھی ہے۔ اگر تم اُمیہ بن خلف کے مہمان نہ ہوتے تو واپس نہ جاتے۔ سعد نے جواباً کہا کہ ابوجہل! شرارتوں سے باز آ جاؤ ورنہ ہم تمہارے تجارتی قافلوں کو حدودِ مدینہ سے گزرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔

مدینہ میں متواتر یہ خبریں آ رہی تھیں کہ قریش مدینہ پہ حملے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ چنانچہ مدّت تک یہ حال رہا کہ حضورؐ رات کو جاگتے رہتے

---

[11] عبداللہ بن اُبَی مدینے کا رئیس المنافقین، جو اسلام کے خلاف تادمِ آخریں سازشوں میں مصروف رہا۔ اس کی وفات غزوۂ تبوک (۹ھ) سے چند ہفتے بعد ہوئی تھی۔ حضورؐ نے اس کا جنازہ پڑھایا لیکن معاً تنبیہ نازل ہوئی کہ آیندہ اس کی قبر پہ نہ جانا۔

[12] ابوعمروؓ سعد بن معاذ بن نعمان بن امرؤالقیس بن زید الانصاری الاشہلی ہجرت سے کچھ پہلے اسلام لا چکا تھا۔ بدر و اُحد میں شامل ہُوا۔ خندق میں تیر سے زخمی ہُوا اور ایک ماہ بیمار رہ کر فوت ہوگیا۔ (۵ھ)

(استیعاب ج ۲، ص ۵۴۵)

اور بہ روایت بخاری[۳]:

کانوا لا یبیتون الا بالسلاح ۔

(کہ صحابہ رات بھر مسلح رہتے)

ربیع الاوّل ۲ھ میں مکہ کا ایک قریشی سردار کرز[۴] بن جابر الفہری مدینہ میں آیا۔ اور گرد جس قدر مویشی چر رہے تھے سب کو ہانک کر لے گیا۔ حضورؐ چند صحابہ کو لے کر اس کی تلاش میں میدانِ بدر تک گئے لیکن وُہ نکل گیا تھا۔

تو یہ تھے وہ حالات جن سے حضورؐ گزر رہے تھے۔ آپ کی یہ دلی آرزو تھی کہ اللہ انہیں جہاد کی اجازت عطا فرمائے

اِذنِ جہاد

چنانچہ ہجرت سے ایک سال بعد ۱۲ صفر ۲ھ کو یہ آیت نازل ہُوئی[۵]:

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یقاتلون بانھم ظلموا و ان اللہ علیٰ نصرھم لقدیر ۔ الذین اُخرِجوا من دیارھم بغیر حقٍ اِلّا ان یقولوا ربنا اللہ ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع و بِیَعٌ وصلوٰۃ و مساجد یذکرفیھا اسم اللہ کثیراً ولینصرن اللہ من ینصرہ ان اللہ لقوی عزیز ۔ (الحج: ۳۹ - ۴۰)

جن لوگوں پر جنگ ٹھونسی جا رہی ہے ہم اُن مظلوموں کو لڑنے کی اجازت دیتے ہیں اور اللہ اُن کی مدد کرنے پر قادر ہے۔ یہ وُہ لوگ ہیں جنہیں اُن کے گھروں سے اس بناء پر نکال دیا گیا ہے کہ یہ اللہ کو اپنا رب کہتے تھے۔ اگر اللہ ایک گروہ کے حملوں کو دوسرے گروہ سے نہ روکتا تو راہبوں کے مسکن، گرجے، یہود کی عبادت گاہیں اور مساجد، جن میں اللہ کو بہت یاد کیا جاتا ہے سب گر جاتیں۔ جو شخص اللہ کی مدد کرے گا اللہ اس کی امداد سے کبھی غافل نہیں ہوتا کیونکہ اللہ بہت طاقت ور اور غالب ہے۔

آیۂ بالا سے واضح ہے کہ جہاد کا مقصد مظلوموں کا دفاع اور عبادت گاہوں کی حفاظت ہے۔ قرآن بار بار کہتا ہے کہ اپنی حفاظت کے لیے لڑو لیکن کسی صورت میں زیادتی نہ کرو۔

وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین ۔ (بقرہ: ۱۹۰)

(اللہ کی راہ میں تم صرف اُن لوگوں سے لڑو جو تم پر حملہ کریں۔ اور زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا)

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

فمنِ اعتدیٰ علیکم فاعتدوا علیہ بمثل ما اعتدیٰ علیکم و اتقوا اللہ و اعلموا ان اللہ مع المتقین ۔ (بقرہ: ۱۹۴)

---

[۳] بخاری: باب الجہاد

[۴] کرز بن جابر بن حسیل بن لاحب بن حبیب القرشی الفہری اس واقعہ کے بعد جلد مسلمان ہو گیا۔ اور حضورؐ نے اسے شوال ۶ھ میں بنو عرینہ کے چند ڈاکوؤں کے تعاقب میں بھیجا جو حضورؐ کی اونٹنیاں ہانک لے گئے تھے۔ فتح مکہ کے دن یہ راستے سے بھٹک گئے اور کسی کافر نے انہیں مار ڈالا۔ (استیعاب ۔ ج ۱ ۔ ص ۲۲۳)

[۵] نسائی بحوالہ سیرت النبی ج ۱ ۔ ص ۳۰۹

(پس جو شخص تم پر زیادتی کرے تو جواباً تم اس سے اتنی ہی زیادتی کرو جتنی اس نے تم سے کی۔ اللہ سے ڈرو اور سمجھ لو کہ اللہ اہلِ تقویٰ کے ساتھ ہے)

اگر کسی وقت کوئی قوم اپنی بے بس رعایا کو نسل و مذہب کی بناء پر قتل کرنے لگے جیسا کہ بھارت، اسرائیل، جنوبی افریقہ اور روڈیشیا میں عموماً ہوتا رہتا ہے تو مسلمانوں پر ایسے لوگوں کی مدد فرض ہو جاتی ہے۔

مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا۔ (النساء - ۷۵)

(تم اللہ کی راہ میں اُن بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر کیوں نہیں لڑتے جو ہر وقت دعا مانگتے رہتے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں اس بستی سے نجات دلا جس کے باشندے ظالم ہیں)

لیکن مسلمان اس فرض کو اسی صورت میں ادا کر سکتا ہے جب اُس کی برّی، بحری اور فضائی قوت سے ساری کائنات لرزہ براندام ہو۔ ایک ایسا وقت تھا جب ہم دنیا میں سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ ہماری افواج جس طرف کا رُخ کرتی تھیں کامیابیاں ان کے قدم چومتی تھیں۔ یہ وُہ وقت تھا جب ہم پوری طرح مسلمان تھے۔ اسلام کو چھوڑنے کے بعد آج ہماری پچاس ریاستوں کی حالت یہ ہے کہ یورپ کی کسی قوم سے ایک دن کے لیے بھی نہیں لڑ سکتیں۔ جو قوم ذخائرِ کائنات سے فائدہ نہیں اٹھاتی اور اخلاقی اقدار کا سفینہ سیلِ شراب میں بہا دیتی ہے اُس کا یہی حال ہوتا ہے ؎

عصا نہ ہو، تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد (اقبالؒ)

دفاعی تدابیر حضورؐ نے قریش کے حملوں سے بچنے اور انہیں کمزور کرنے کے لیے دو قدم اٹھائے۔ اوّل ان کے تجارتی قافلوں کو جو نواحِ مدینہ سے گزر کر شام کی طرف جاتے اور آتے تھے، روکنے کے لیے مہمات بھیجنے کا انتظام کیا تاکہ وُہ لوگ اقتصادی بدحالی کا شکار ہو کر شرارتیں ترک کر دیں۔ دوم، مسلمانوں میں اس حد تک جذبۂ جہاد پیدا کر دیا کہ یہ لوگ شہادت کو سب سے بڑا اعزاز سمجھنے لگے۔

مہمّات کی قسمیں

حضورؐ نے مدینہ کی دہ سالہ زندگی میں کم و بیش اٹھاسی (۸۸) مہمات بھیجی تھیں۔ ان میں سے کچھ ایسی تھیں جن کی قیادت کسی صحابی کے سپرد تھی۔ یہ سرایا[۲] کہلاتی ہیں اور بعض کی قیادت خود سرورِ دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے کی تھی اور یہ غزوات (جنگیں) کے نام سے مشہور ہیں۔

---

[۱] اس وقت ایران، روم اور مصر پر حریص، عیاش اور شکم پرست بادشاہوں کی حکومت تھی جو جونکوں کی طرح غریب رعایا کا خون چوس رہے تھے اور انہیں افلاس و جہالت کے جہنّم میں دھکیل رکھا تھا۔ عربوں نے روم و ایران پر دو مقاصد کے لیے چڑھائی کی تھی اوّل مظلوم انسانیت کو بادشاہوں کے ظلم سے چھڑانے کے لیے۔ دوم بار بار کی سرحدی جھڑپوں اور سازشوں کو ختم کرنے کے لیے۔

[۲] سریّہ جیش (یعنی لشکر) کو کہتے ہیں خواہ یہ دس افراد پر مشتمل ہو یا زیادہ پر۔ بعض مہمات پر صرف ایک آدمی بھیجا گیا تھا اور اسے بھی سریّہ کا نام دیا گیا تھا۔ اس کی جمع ہے سرایا۔

ان کی تعداد ۲۷ ہے۔ ان میں سے نو غزوات[۲۳] ایسے ہیں جن میں حضورؐ نے دشمنوں سے جنگ کی تھی۔ یعنی بدر، اُحد، مریسیع، خندق، قریظہ، خیبر، فتح مکہ، حنین اور طائف۔ اور باقی اٹھارہ میں شمشیر کا استعمال نہیں ہُوا تھا۔ سرایا کی تعداد ساٹھ سے کچھ اُوپر تھی۔ اِن تمام کی تفصیل اور تاریخی ترتیب یہ ہے:

۱۔ سریۂ حمزہ بن عبد المطّلب حضورؐ کو اطلاع ملی کہ قریش کا ایک تجارتی قافلہ شام سے آ رہا ہے۔ چونکہ آپؐ یہ طے کر چکے تھے کہ قریش کی اقتصادی قوت کو توڑنا مسلمانوں کے مفاد میں ہے اس لیے آپؐ نے اپنے عمِ محترم حضرت حمزہؓ بن عبد المطلب (۳۲ ھ) کو تیں مہاجرین کا ایک دستہ دے کر ساحل کی طرف بھیجا۔ اس مہم کا عَلم سفید تھا جو حضرت حمزہؓ کے ایک حلیف ابو مرثد[۲۴] کنانہؓ بن الحصین الغنوی کے ہاتھ میں تھا۔ وہاں پہنچے تو ایک آدھ دن کے بعد قافلہ بھی آ گیا۔ ابو جہل اور تین سو دیگر نوجوان اس کی حفاظت کر رہے تھے۔ جنگ کے لیے صفیں آراستہ ہو گئیں۔ لیکن فریقین کے ایک حلیف مَجْدِیؓ[۲۵] بن عَمرو کی کوششوں سے یہ تصادم ٹل گیا اور حضرت حمزہؓ واپس آ گئے۔ یہ واقعہ ہجرت سے سات ماہ بعد کا ہے۔

(ابن الجوزی : تلقیح صفحہ ۲۲)

۲۔ عُبیدہ[۲۶] بن حارِث کی مہم اس مہم کا مقصد بھی قریش کے تجارتی قافلوں کو روکنا تھا۔ یہ ہجرت سے آٹھ ماہ بعد شوّال میں بھیجی گئی تھی۔ اس میں ساٹھ مہاجر صحابہ شامل تھے اور اس کی سیادت حضرت ابو الحارث عبیدہؓ بن حارث بن المطلب کے سپرد تھی۔ جب یہ لوگ اَحیا[۲۷] پر پہنچے تو سامنے سے کارواں نمودار ہُوا جس کا قائد ابو سفیانؓ[۲۸] بن حرب تھا

---

[۲۳] طبقات ابن سعد۔ اردو ترجمہ از مولانا عمادی ص ۳۴۲ طبع کراچی ۱۹۷۰ء

[۲۴] پُورا نام کنّانہؓ بن حصین بن یربوع بن عمرو الغنوی (۱۲ھ) ایک محترم صحابی۔ آپ کے فرزند مرثد بھی صحابی تھے۔ کنانہ غزوۂ بدر میں شامل تھے۔ عمر ۶۶ سال۔ (الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب۔ ابن البر۔ القُرطبی۔ طبع ثانی حیدر آباد ص ۲۲۶-۲۳۶ ۱ھ)

[۲۵] مجدی بن عمرو بنو جُہینہ سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ قبیلہ مدینہ کے شمال میں خیبر کے قریب آباد تھا اور اس کے تعلقات اہل مکّہ و اہلِ مدینہ سے اچھے تھے۔

(واٹ: محمّد ایٹ مدینہ۔ ص ۲)

[۲۶] عبیدہ بن حارث بن المطّلب بن عبد مناف بن قصّی القرشی حضورؐ سے دس سال بڑے تھے اور آغازِ بعثت ہی میں اسلام لے آئے تھے۔ آپ بدر میں شامل ہُوئے تھے اور اسی میں شہادت پائی تھی۔ (استیعاب ج ۲، ص ۴۰۹)

[۲۷] مدینہ کے جنوب مغرب میں کوئی پچاس میل دور جُحفہ کا مشہور مقام ہے جو اہل شام و مصر کی میقات بھی ہے۔ اس سے دس میل کے فاصلے پر ایک وادی بطنِ رابغ کے نام سے مشہور ہے جس کے ایک چشمے (یا کنویں یا جھیل) کا نام اَحیاء تھا۔

(یاقوت۔ معجم البُلدان۔ ج ۱۔ ص ۱۴۵)

[۲۸] ابُو سفیانؓ صخر بن حرب بن اُمیّہ بن عبد شمس الاموی القرشی، امیر معاویہ کا والد، حضورؐ سے دس سال بڑا، فتح مکّہ کے روز اسلام لایا۔ حنین و طائف کے غزوات میں شامل ہُوا۔ حضورؐ نے اسے حنین کی غنیمت سے سو اُونٹ اور چالیس اوقیہ چاندی دی تھی۔ طائف میں اس کی ایک آنکھ چلی گئی تھی اور جنگِ یرموک میں دُوسری۔ اس کی وفات ۳۳ھ یا ۳۶ھ میں ہوئی تھی۔ (استیعاب ص ۶۸۹)

اور اس کے ہمراہ دو سو محافظ بھی تھے۔ طرفین نے ایک دوسرے پر تیر تو چلائے لیکن تلوار کا استعمال نہ کیا۔ اس مہم کا علم حضرت مسطح[۲۹] بن اُثاثہ بن المطلب بن عبدِ مناف کے پاس تھا۔ (تلقیح۔ ص ۲۲)

۳۔ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کی مہم یہ مہم ہجرت سے نو ماہ بعد ذی القعدہ میں بھیجی گئی تھی۔ اس میں صرف بیس مہاجر صحابہ تھے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص (بعد میں فاتح ایران)[۳۰]، اس کے قائد تھے۔ علم حضرت مقدادؓ[۳۱] بن عمرو البہرانی کے پاس تھا۔ یہ لوگ حجاز کی ایک وادی خرار[۳۲] تک گئے لیکن کاروان نظر نہ آیا اور واپس آ گئے۔ (تلقیح ص ۲۲)

۴۔ غزوۂ اَبواء صفر ۲ھ میں حضور صلعم، ساٹھ مہاجرین[۳۳] کے ہمراہ مدینہ سے نکلے۔ مقصد قریش کی شامی تجارت کو بند کرنا تھا۔ آپ مدینے سے نکل کر کوئی اسّی میل جنوب مغرب میں اَبواء تک گئے۔ یہ ایک پہاڑ کا نام ہے جو جُحفہ سے ۱۳ میل دُور تھا۔ یہیں حضورؐ کی والدہ حضرت آمنہؓ[۳۴] مدفون ہیں۔ روایات میں ہے کہ حضورؐ کے والد حضرت عبداللہ[۳۵] ایک تجارتی سفر میں فوت ہوئے تھے اور مدینہ میں دفن تھے۔ حضرت آمنہؓ ہر سال اُن کی قبر پہ جایا کرتی تھیں۔ وہ ایک ایسے ہی سفر سے واپس آ رہی تھیں کہ وفات پا گئیں اور ابواء میں دفن ہُوئیں۔

اس مہم میں حضورؐ کی نیابت (مدینہ میں)، کے فرائض حضرت سعدؓ بن عبادہ نے سرانجام دیئے تھے۔ علم حضرت حمزہؓ کے پاس تھا

---

[۲۹] پورا نام مسطحؓ بن اُثاثہ بن عباد بن عبدالمطلب بن عبدِ مناف قرشی تھا۔ یہ کئی غزوات میں شامل ہوئے۔ ۵۶ برس کی عمر پائی اور ۳۴ھ میں انتقال ہوا۔ (الاکمال فی اسماء الرجال ص ۱۱۸۰، طبع لاہور ۱۹۶۳ء)

[۳۰] پورا نام سعدؓ بن ابی وقاص۔ مالکؓ بن وُہَیب بن عبدِ مناف۔ والدہ کا نام حَمنہ بنت سُفیان تھا۔ آپ اسلام قبول کرنے والوں میں تیسرے تھے اور غزوات میں پہلا تیر انھوں نے ہی چلایا تھا۔ حضورؐ نے میدانِ اُحد میں آپ سے فرمایا تھا، ارم سعد فداك ابی واُمّی (سعد، تم پر میرے ماں باپ قربان ہوں، تیر چلاؤ) آپ نے عہدِ فاروقیؓ میں بے شمار فتوحات حاصل کیں۔ ایران کے فاتح بھی آپ ہی تھے۔ (اکمال ص ۱۲۵)

[۳۱] مقدادؓ بن عمرو بن ثعلبہ بن مالک بن ربیعہ بن ثُمامہ غزوۂ بدر میں شامل ہُوئے تھے۔ ستر برس کی عمر تھی کہ ۳۳ھ میں وفات پا گئے اور بقیع میں دفن ہوئے۔ (تلقیح ص ۶۰)

[۳۲] خرار۔ یہ وادی مدینہ سے کوئی پچاس میل جنوب مغرب میں جُحفہ کے قریب تھی۔ (تلقیح ص ۲۲)

[۳۳] یہ تعداد شبلی (سیرت النبیؐ، ج ۱، ص ۳۱۱) نے بتائی ہے۔ ابن خلدون (ج ۱، ص ۵۰) کے ہاں یہ تعداد ۲۰۰ تھی۔

[۳۴] آمنہؓ بنت وہب بن عبدِ مناف بن زہرہ بن کلاب بن مُرّۃ قرشیہ۔ شادی کے وقت حضرت عبداللہ کی عمر پچیس سال اور بروائتے تیس تھی۔ جب حضورؐ کی عمر آٹھ برس ہُوئی تو آپؐ کی وفات ہوگئی۔ (استیعاب، ج ۱، ص ۱۵)

[۳۵] عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدِ مناف بن قُصَی بن کلاب بن مُرّہ کی وفات حضورؐ کی ولادت سے پہلے ہُوئی تھی۔ ایک روایت کے مطابق اس وقت حضورؐ کی عمر دو ماہ اور ایک اور روایت کے مطابق اٹھارہ ماہ تھی۔ (ایضاً ص ۱۵)

(باقی بر صفحہ آئندہ)

آپ کارواں کو نہ پا سکے اور پندرہ دن کے بعد لوٹ آئے۔ (تلقیح ص ۲۲)

۵۔ غزوۂ بُواط بُواط مدینہ سے کوئی پچاس میل دُور مغرب کی طرف پہاڑوں کا ایک سلسلہ ہے۔ ینبع سے ایک منزل مشرق میں یہ کبھی جُہینہ[37] (قبیلہ) کی ملکیت تھا۔ حضورؐ کو اطلاع ملی کہ قریش کا ایک کارواں جس میں اڑھائی ہزار اونٹ ہیں، اور جس کی حفاظت اُمیہ بن خلف اور سو دیگر آدمی کر رہے ہیں، شام سے آ رہا ہے۔ چنانچہ آپ دو سو صحابہ کو لے کر نکل پڑے۔ حضرت سعدؓ بن معاذ کو نائب مقرر کیا اور عَلم حضرت سعد بن ابی وقاص کے ہاتھ میں دیا۔ آپ بواط تک گئے لیکن کارواں کو نہ پا سکے اور واپس آ گئے۔ (تلقیح ص ۲۲)

۶۔ غزوۂ تلاشِ کُرز صفحاتِ گزشتہ میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ مکہ کا ایک مہم جُو کُرزؓ[38] بن جابر مدینہ کی چراگاہوں سے بہت سے مویشی ہانک کر بھاگ گیا تھا۔ حضورؐ اس کی تلاش میں سوادِ بدر کی ایک وادی سُفوان تک گئے تھے لیکن اُسے نہ پا سکے۔ یہ واقعہ ربیع الاول ۲ھ میں پیش آیا تھا۔ حضورؐ نے زیدؓ[39] بن حارثہ کو مدینہ میں اپنا نائب مقرر کیا تھا اور عَلم حضرت علیؓ[40] کے سپرد تھا یہ غزوۂ بدر اُولیٰ کہلاتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد کُرز اسلام لے آیا۔ فتح مکہ کے دن بھٹک کر غلط راستے پر نکل گیا اور ایک مُشرک نے اُسے مار ڈالا۔
(استیعاب۔ ج ۱۔ ص ۲۲۳)

۷۔ غزوۂ ذِی العُشَیرہ ذوالعشیرہ مدینہ کے مغرب میں ساحل کی طرف ینبع[41] کے قریب ایک موضع جہاں حضورؐ جمادی الآخرہ ۲ھ میں ایک تجارتی قافلے کو روکنے کے لیے گئے تھے۔ آپ کے ہمراہ ڈیڑھ سو اور بروایتے دو سو مہاجر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) [36] ابو ثابت سعدؓ بن عبادہ بن دلیم بن حارثہ خزرج کا سردار تھا اور فتح مکہ کے دن عَلم بردار۔ اس نے حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ چنانچہ یہ مدینہ کو چھوڑ کر حوران (شام) چلے گئے اور وہیں ۱۵ھ یا ۱۶ھ میں وفات پائی۔ (اکمال ص ۱۳۵ ۱ و استیعاب ج ۲ ص ۵۴۹)

[37] یہ قبیلہ مدینہ سے کوئی ڈیڑھ سو میل شمال مغرب میں آباد تھا۔

[38] کُرز۔ دیکھیے حاشیہ نمبر ۱۹

[39] ابو اُسامہ زید بن حارثہ بن شراحیل الکلبی کو بنو قین نے حملہ کر کے بچپن ہی میں غلام بنا لیا تھا۔ جاہلیت میں نواحِ مکہ کی ایک منڈی حُباشہ میں فروخت ہُوا۔ اور حضرت خدیجہؓ کے ایک بھتیجے حکیمؓ بن حزام بن خویلد القرشی الاسدی (۵۴ھ) نے اسے خرید کر حضرت خدیجہؓ کے حوالے کر دیا اور بعد میں موصوفہ نے حضورؐ کو دے دیا۔ (استیعاب ج ۱۔ ص ۱۰۵)

[40] علیؓ بن ابی طالب بن عبد المطلب لڑکوں میں پہلے مسلمان تھے۔ خواتین میں پہلی مسلمہ حضرت خدیجہؓ تھیں۔ مردوں میں سب سے پہلے مسلم ابوبکرؓ اور غلاموں میں زید بن حارثہ۔ جب حضرت علیؓ اسلام لائے تو اس وقت آپ کی عمر کوئی راوی ۸ سال، کوئی ۱۲، کوئی ۱۳، کوئی ۱۵ اور کوئی ۱۶ بتاتا ہے۔ آپ تمام غزوات میں شامل ہُوئے۔ ۳۵ھ سے ۴۰ھ تک خلیفہ رہے۔ ۴۰ھ میں شہادت پائی۔ اس وقت آپ کی عمر تریسٹھ برس تھی۔

(استیعاب، ج ۲ ص ۴۶۲)

[41] ینبوع مدینہ سے اندازاً ایک سو بیس میل مغرب کی طرف ساحل پر ایک مقام، جو آج بھی موجود ہے۔

صحابہ تھے۔ فرائض نیابت حضرت ابو سلمہؓ[24] بن عبدالاسد المخزومی کے سپرد تھے۔ علم حضرت حمزہؓ کے حوالے تھا۔ سواری اور باربرداری کیلئے تیس اونٹ بھی تھے۔ آپ قافلے کو نہ پا سکے اور واپس آ گئے۔ (تلقیح ص ۳۴)

۸۔ عبداللہ بن جحشؓ کی مہم

رجب ۲ھ میں حضورؐ نے حضرت عبداللہؓ[25] بن جحش کو آٹھ مہاجر صحابہ کے ہمراہ نخلہ[26] کی طرف بھیجا۔ ساتھ ہی ایک خط لکھ کر دیا اور ہدایت فرمائی کہ اس خط کو دو دن کے بعد کھولنا اور کسی ہمراہی کو ساتھ جانے پر مجبور نہ کرنا۔ جب دو دن کے بعد حضرت عبداللہؓ نے وہ خط کھولا تو اس میں تحریر تھا:

"تم برابر چلتے جاؤ اور مکہ و طائف کے مابین نخلہ میں جا کر قیام کرو۔ وہاں قافلے کا انتظار کرو اور حالات سے ہمیں اطلاع دیتے رہو۔"

خط پڑھ کر حضرت عبداللہؓ نے ساتھیوں کو کہا کہ تم میں سے جو چاہے واپس چلا جائے۔ سب نے آگے جانے پر اصرار کیا۔ جب وہاں پہنچ کر مقیم ہو گئے تو انھیں قریش کا ایک چھوٹا سا کارواں نظر آیا۔ چونکہ رجب میں جنگ ممنوع تھی۔ اس لیے سب سوچنے لگے کہ کیا کیا جائے۔ بالآخر انھوں نے حملے کا فیصلہ کیا اور لڑائی چھڑ گئی۔ چنانچہ واقدؓ[27] بن عبداللہ کے تیر سے قافلے کا ایک اہم رکن عمروؓ[28] بن الحضرمی مارا گیا دو دیگر ارکان یعنی عثمان بن عبداللہ بن المغیرہ اور حکمؓ[29] بن کیسان کو گرفتار کر لیا اور ان کے مال و اسباب پر قبضہ کر لیا۔ جب یہ مہم مدینہ میں

---

[24] ابوسلمہ عبداللہؓ بن عبدالاسد بن ہلال بن عبداللہ بن عمر بن مخزوم القرشی المخزومی حبشہ کی ہجرت میں شامل ہوئے تھے۔ بدر میں بھی حصہ لیا تھا۔ پھر اُحد میں شامل ہوئے۔ دشمن کے ایک تیر سے زخمی ہو گئے۔ زخم مندمل ہونے کے بعد دوبارہ ہرا ہو گیا اور اسی سے ۴ھ میں آپ کی وفات ہو گئی۔ اس کی وفات کے بعد حضورؐ نے اس کی زوجہ اُمّ سلمہ کو اپنی زوجیت میں لے لیا۔ (استیعاب۔ ج ۲۔ ص ۶۸۵)

[25] عبداللہؓ بن جحش بن رئاب بن یعمر بن صبرہ بن مرۃ الاسدی اوّلین مسلمانوں میں سے تھے۔ ہجرتِ حبشہ میں شامل ہوئے۔ ان کی بہن زینب بنت جحش حضورؐ کے نکاح میں تھی۔ بدر میں حصہ لیا اور اُحد میں شہادت پائی۔ (استیعاب ج ۱، ص ۳۴۱)

[26] نخلہ، مکہ و طائف کے درمیان ایک چراگاہ، جو بُستانِ ابنِ عامر کے نام سے مشہور تھی۔ (یاقوت۔ معجم۔ ج ۸)

[27] واقدؓ بن عبداللہ بن عبدمناف بن عرین بن یربوع التمیمی ابتدائی مسلمانوں میں سے تھا۔ حضورؐ کے ہمراہ تمام غزوات میں شامل ہوا۔ اور حضرت عمرؓ کی خلافت (۱۳ھ۔ ۲۳ھ) میں وفات پائی۔ (استیعاب۔ ج ۲۔ ص ۶۰۶)

[28] عمرو بن عبداللہ بن عمار بن اکبر بن ربیعہ بن مالک الحضرمی اصلاً حضرموت سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا والد امیر معاویہ کے دادا حرب کا حلیف تھا اور بہت احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کا بھائی العلاء اسلام لے آیا تھا اور حضورؐ نے اسے بحرین کا گورنر لگا دیا تھا۔ (استیعاب۔ ج ۲۔ ص ۵۰۵)

[29] حکم بن کیسان، حضرت خالد بن ولید کے بھائی ہشام بن ولید بن مغیرہ کا مولیٰ (حلیف، آزاد کردہ غلام، پناہ میں لیا ہوا) تھا۔ جب حضورؐ نے اسے آزاد کر دیا تو یہ اسلام لے آیا اور مدینہ ہی میں رہ گیا۔ اس کی شہادت بئر معونہ کے واقعہ (۴ھ) میں ہوئی تھی۔ (استیعاب۔ ج ۱۔ ص ۱۱۷)

واپس آئی اور حضورؐ کو معلوم ہُوا کہ ان لوگوں نے شہرِ حرام میں جنگ کی ہے تو آزردہ خاطر ہو گئے اور وحی کے آنے تک مالِ غنیمت کی تقسیم روک دی۔ بالآخر یہ آیت نازل ہُوئی:

یسئلونك عن الشهر الحرام قتالٍ فيه ۔ قل قتالٌ فيه كبيرٌ و صدٌّ عن سبيل الله و كفرٌ به والمسجد الحرام و اخراج اهلِه منه اكبرُ عند الله والفتنة اكبرُ من القتل ۔ (بقرہ: ۲۱۷)

(اے رسول! یہ لوگ آپ سے شہرِ حرام میں جنگ کرنے کے بارے میں پوچھتے ہیں کہئے کہ اس میں لڑنا ایک بڑا گناہ ہے لیکن اللہ کی راہوں سے روکنا، اس کا انکار کرنا، مسجدِ حرام میں داخل ہونے سے روکنا اور اس سے وہاں کے رہنے والوں کو نکال دینا اس سے بھی بڑا گناہ ہے۔ یاد رکھیے کہ فتنہ (شرارت، ایذا، سازش) قتل سے بھی بدتر جُرم ہے)

چند روز بعد اہلِ مکہ نے عثمان و حکم کا فدیہ بھیجا لیکن حضورؐ نے فرمایا کہ مہم کے دو آدمی یعنی حضرت سعدؓ بن ابی وقاص اور حضرت عتبہؓ[۵۵] بن غزوان ابھی تک واپس نہیں آئے۔ مجھے خطرہ ہے کہ یہ کہیں تمہارے ہاتھ نہ لگ گئے ہوں۔ میں اُن کے آنے پر قیدیوں کا فیصلہ کروں گا۔ چنانچہ ایک آدھ دن کے بعد یہ دونوں پہنچ گئے تو حضورؐ نے قیدیوں کو زرِ فدیہ لے کر چھوڑ دیا۔

جو قتل و گرفتار ہُوئے وُہ بڑے خاندانوں کے لوگ تھے۔ مقتول عَمرو عبداللہ الحضرمی کا بیٹا تھا۔ جو امیر معاویہ کے دادا حرب بن اُمیہ کا حلیف تھا۔ (اصابہ: ترجمہ علاء الحضرمی) عثمان بن مغیرہ (حضرت خالد کا دادا اور ولید کا والد) کا پوتا تھا جو حرب بن امیہ کے بعد دوسرے درجے کا رئیس شمار ہوتا تھا۔ حکم بن کیسان، خالد بن ولید کے بھائی ہشام بن ولید بن مُغیرہ کا مولیٰ (آزاد کردہ غلام یا پناہ جُو) تھا۔ (استیعاب ص ۱۱۷)

اس واقعہ نے قریش کو سخت مشتعل کر دیا اور وُہ انتقام لینے پر تُل گئے۔ بدر، اُحد اور احزاب کے حملے اسی واقعہ کا نتیجہ تھے۔

کہتے ہیں کہ عمرو بن الحضرمی پہلا مقتول ہے جو مسلمانوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اور یہ پہلا مالِ غنیمت تھا جو مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ (ابن خلدون، ج ۱، ص ۸۰۔ سیرت النبیؐ، ج ۱، ص ۳۱۲)

۹۔ غزوۂ بدر بدر دراصل ایک کنویں کا نام تھا جو اُس نواح کے ایک سردار بدر بن حارث یا بدر بن کلدہ نے کھُدوایا تھا۔ لیکن بعد میں یہ ساری وادی بدر کے نام سے مشہور ہو گئی۔ یہ وادی مدینہ سے کوئی اسّی میل جنوب مغرب کی طرف واقع ہے۔ آجکل وہاں ایک اچھا خاصہ گاؤں آباد ہے جس میں کئی سو مکان اور دو مسجدیں ہیں، جن میں سے ایک جامع کہلاتی ہے اور عین اس جگہ تعمیر ہوئی ہے جہاں غزوۂ بدر کے موقعہ پر حضورؐ کے لیے ایک جھونپڑی بنائی گئی تھی اور گرد و دُور تک نخلستان ہیں۔ یہ وادی بیضوی شکل کی ہے، اندازاً پانچ میل لمبی اور چار میل چوڑی۔ اس کے ارد گرد کئی پہاڑیاں ہیں۔ ان میں سے ایک کا موجودہ نام العُدوۃ الدنیا

---

[۵۵] عتبہؓ بن غزوان بن حارث بن جابر بن وہب المازنی اسلام لانے والوں میں سے ساتویں تھے۔ ہجرتِ حبشہ میں شامل ہُوئے۔ بعد ازاں ہجرت کر کے مدینے میں آ گئے اور تمام غزوات میں شامل ہوئے۔ ۱۷ھ میں سفرِ حج سے واپس بصرہ جا رہے تھے کہ ایک مقام معدن سلیم میں سواری سے گِر کر فوت ہو گئے۔ (استیعاب۔ ج ۲۔ ص ۴۹۲)

[illegible]

[illegible]

[illegible]

حضورؐ ۲۲/۲۳ رمضان کو مدینہ واپس آئے تھے۔ (تنقیح ص ۲۳، میدان جنگ ص ۲۹-۴۵، ابن خلدون ج ۱، ص ۸۲-۸۸)

۱۰۔ غزوہ بنی قینقاع مدینہ میں یہود کے تین قبیلے آباد تھے۔ بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ، یہ سب کے سب مدینہ کے حوالی میں رہتے تھے اور ان کا گزارہ تجارت، صناعی (زرگری و آہنگری) اور زراعت پر تھا۔ قینقاع زرگری کا کام کرتے تھے (اور اپنی حفاظت کے لیے اسلحہ کے ذخائر بھی پاس رکھتے تھے) گو حضورؐ نے مدینہ آتے ہی اوس، خزرج اور یہود سے ایک معاہدہ کر لیا تھا جس کی رو سے انہیں یہ ضمانت دی گئی تھی کہ:

"جو یہود مسلمانوں سے تعاون کریں گے اُن کی مدد کی جائے گی۔ اگر وُہ ظلم کریں گے تو انہیں تنبیہ کی جائے گی۔ اور ہم اُن کے خلاف کسی اور کی مدد نہیں کریں گے..... جنگ کی صورت میں یہود مسلمانوں کو مالی مدد دیں گے..... اور یہود کو پُوری مذہبی آزادی حاصل ہوگی........" (ابن خلدون، ج ۱، ص ۶۷-۷۰)

لیکن یہود نے جلد ہی اس معاہدہ کی خلاف ورزی شروع کر دی اور اس سلسلے میں کئی ناگوار قدم اٹھائے مثلاً:

ا۔ حضورؐ کی آمد سے پہلے یہود سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ مسلمان طاقت ور ہو رہے ہیں تو پراپیگنڈہ شروع کر دیا اور مسلمانوں کو بُرا بھلا کہنے لگے۔

ب۔ یہ لوگ جب حضورؐ کی مجلس میں جاتے تو السلامُ علیکم کی بجائے "السّامُ علیکم" (تم پر موت) کہتے۔ یہ واقعہ صحیح بخاری کے مختلف ابواب میں منقول ہے۔

ج۔ مسلمانوں میں مایوسی و بددلی پھیلانے کے لیے صبح کو ایمان لاتے اور شام کو لوٹ جاتے۔

وَقالت طائفۃ من اھل الکتاب اٰمِنُوا بالذی اُنزل علی الذین اٰمنوا وجہَ النہار و اکفروا اٰخرہٗ لعلّھم یرجعون۔ (عمران: ۸۰)

(اہل کتاب (مراد یہود) کا ایک طبقہ کہے گا کہ قرآن پر صبح کو ایمان لاؤ اور شام کو پھر جاؤ تاکہ مسلمان (بد دل ہو کر) بھی اسلام سے بھاگ جائیں)

د۔ انہوں نے مسلمانوں کی طاقت توڑنے کے لیے اَوس و خزرج کو باہم لڑانا چاہا۔ (سیرت النبیؐ شبلی۔ ج ۱۔ ص ۴۰۲)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

عباس فتح خیبر سے پہلے اسلام لا چکے تھے لیکن قوم کے ڈر سے چھپاتے پھرتے تھے۔ فتح مکہ کے دن اعلان کر دیا۔ حنین، طائف اور تبوک میں شامل ہُوئے۔ حضورؐ آپ کی بہت عزت کرتے تھے اور صحابہؓ آپ سے بڑے بڑے امور میں مشورہ لیتے تھے۔ آپ کی وفات جمعہ کے دن رمضان ۳۲ھ میں ہُوئی۔ (استیعاب۔ ج ۲۔ ص ۴۸۵)

۵۵ ولیدؓ بن ولید بن مغیرہ القرشی، خالد بن ولید کے بھائی تھے۔ بدر میں حضورؐ کے خلاف لڑے، قید ہو گئے۔ لیکن جُونہی اس کے بھائیوں نے انہیں فدیہ دے کر رہا کرایا، یہ مسلمان ہو گئے۔ حضرت خالد انہی کی ترغیب سے مسلمان ہُوئے تھے۔ ان کی وفات فتح مکہ کے بعد ہوئی تھی۔ (ایضاً ص ۶۰۲)

ھ - یہ قریشِ مکہ سے مل کر سازشیں کرنے لگے اور ان کی شرارتوں میں اس قدر اضافہ ہوگیا کہ حضورؐ کو اپنی جان کا خطرہ پڑ گیا۔ (ایضاً ص ۴۰۳)

و - یہود کے اشتعال کا باعث اولاً غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی معجزانہ فتح تھی۔ اس سے قریش کا زور ٹوٹ گیا تھا اور مسلمانوں کی قوت بڑھ گئی تھی۔ ثانیاً وحیِ الٰہی یہود کی اخلاقی کمزوریوں کو کھول کھول کر بیان کر رہی تھی کہ یہ جھوٹ بولتے، حرام کھاتے۔ اپنی الہامی کتابوں کو بگاڑتے۔ خیانت سے کام لیتے۔ انبیاء کو قتل کرتے اور حضرت مریمؑ پر افترا باندھتے ہیں۔

وقس علیٰ ھذا۔ ابنِ سعد نے طبقات میں غزوۂ بنی قینقاع کے ذیل میں لکھا ہے:

"واقعۂ بدر کے بعد یہود کے بغض و حسد میں اضافہ ہوگیا اور اِن لوگوں نے عہد کو توڑ ڈالا۔"

(بحوالہ سیرت النبیؐ، ج ۱، ص ۴۰۴)

ز - کعبؔ بن اشرف مدینہ کا مشہور شاعر تھا۔ اصلاً یہ قبیلہ طے سے تعلق رکھتا ہے لیکن اس کا باپ مدینہ میں آکر بنو نضیر کا حلیف بن گیا تھا۔ اس نے ایک یہودی لڑکی سے شادی کر لی تھی اور کعب اسی کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ اسے اسلام سے اس حد تک عداوت تھی کہ جب بدر میں بڑے بڑے سردارانِ قریش ہلاک ہو گئے تو یہ تعزیت کے لیے مکہ میں گیا اور مقتولِ کشتگانِ بدر کے مرثیے لکھ کر قریش کو انتقام کے لیے اُکساتا رہا۔ اُس نے خود بھی حضورؐ کو ہلاک کرنے کی سازش کی تھی۔ اُس کے اشعار نے بنو قینقاع کے دلوں میں مزید نفرت بھر دی اور وہ اسلام کو نقصان پہنچانے کے لیے شب و روز سازشیں کرنے لگے۔

ح - اُن کے اقتصادی مظالم حد سے بڑھ چکے تھے۔ یہ بھاری شرحِ سود پر قرض دے کر سب کچھ لوٹ لیتے تھے۔ یہاں تک کہ بچوں اور عورتوں تک کو رہن رکھ لیتے تھے۔ (سیرت ص ۳۹۶)

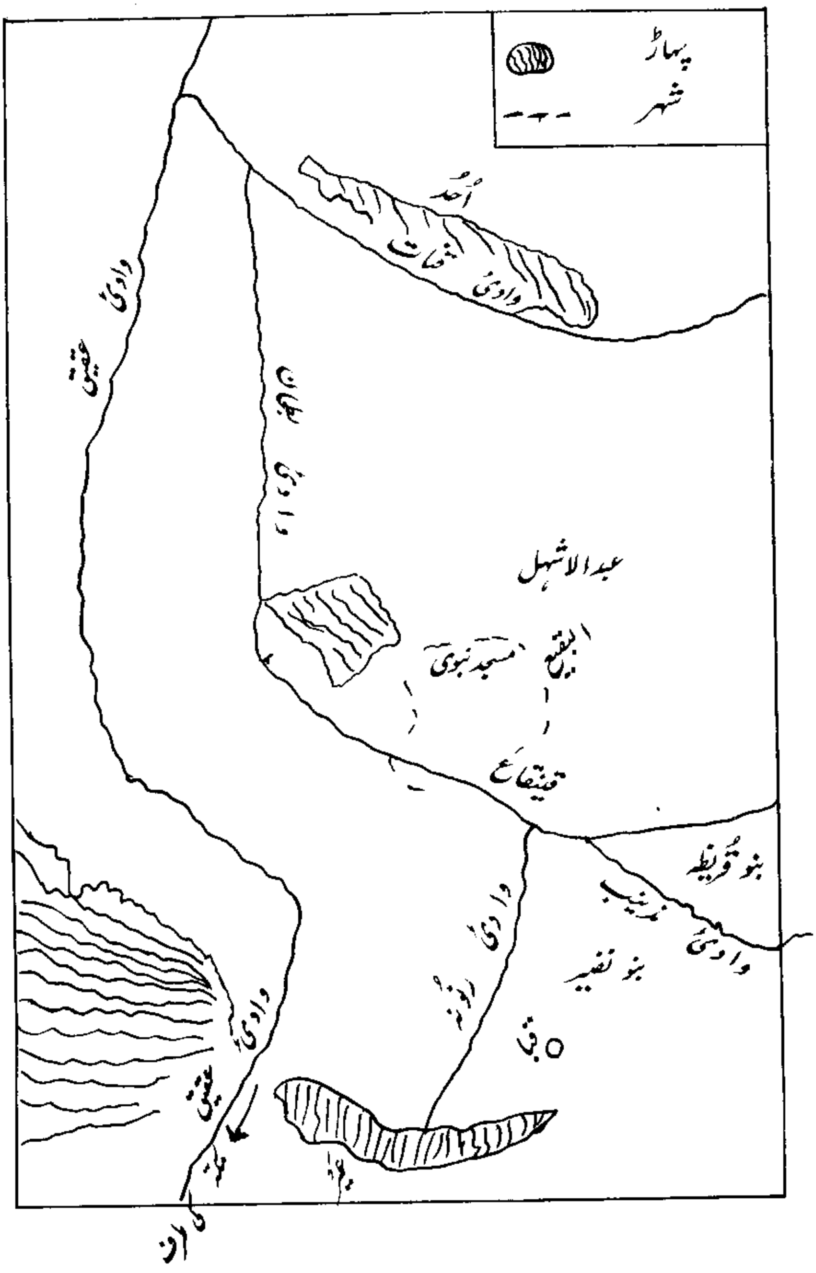
ط - یہ آگ دھک ہی رہی تھی کہ ایک واقعہ نے اسے بھڑکا کر شعلۂ جوّالہ بنا دیا۔ ہُوا یوں کہ ایک مُسلم خاتون ایک یہودی کی دُکان پر سودا لینے گئیں۔ چند نوجوان یہودیوں نے مل کر اُس کی بے حُرمتی کی۔ اس پر ایک مسلمان نے اُس دکان دار پہ حملہ کر کے اسے مار ڈالا اور یہودیوں نے اُس مسلمان کو قتل کر دیا۔ حضورؐ اس پر بھی مشتعل نہ ہوئے بلکہ خود چل کر یہودیوں کے ہاں گئے اور انہیں پُرامن رہنے کی تلقین کی۔ انہوں نے جواباً حضورؐ کی توہین کی اور بدزبانی سے کام لیا۔

جنگ اب حضورؐ کے پاس جنگ کے سوا کوئی اور صورت باقی نہیں رہی تھی۔ چنانچہ آپ سینچر کے دن نصف شوال ۲ھ کو صحابہ کا ایک دستہ لے کر محلۂ قینقاع کی طرف بڑھے۔ حضرت ابو لبابہؓ کو اپنا نائب مقرر کیا۔ علم حضرت حمزہؓ کے ہاتھ

کعب بن اشرف اتنا دولت مند تھا کہ اس نے یہودی علماء کی تنخواہیں باندھ رکھی تھیں۔ جب اس کی دل آزاریاں حد سے بڑھ گئیں تو ایک صحابی محمد بن مسلمہ انصاری (م ۴۳ھ) نے اسے شوال ۳ھ میں قتل کر دیا۔ (سیرت النبیؐ - ج ۱ - ص ۴۰۷)

ابو لبابہؓ نام کے تین صحابی تھے۔ اوّل حضورؐ کا ایک مولیٰ۔ دوم ابو لبابۃ الاسلمی۔ سوم ابو لبابہ بن عبدالمنذر الانصاری۔ اور یہاں آخر الذکر مراد ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

شہر مدینہ اور حوالی



میں دیا اور ان کا محاصرہ کر لیا۔ پندرہ روز کے بعد یہود نے پیش کش کی کہ مسلمان اُن کے مال میں سے جو چاہیں لے لیں۔ لیکن انہیں بال بچوں سمیت مدینہ سے جانے کی اجازت دے دیں۔ حضورؐ نے یہ پیش کش منظور فرمالی اور ان کے مال و متاع سے اشیائے ذیل لے لیں:

۱۔ تین کمانیں یعنی کتوم ۔ رَوحا اور بیضاء

۲۔ دو زرہیں، صُغدیہ اور فضّہ

۳۔ تین تلواریں: قَلَعِی، بتّار۔ اور تیسری کا نام معلوم نہیں۔

۴۔ تین نیزے

اس کے بعد وہ لوگ مدینہ کو چھوڑ کر خیبر[۵۵]، فدک[۵۶] اور تیماء[۵۷] وغیرہ کی طرف نکل گئے۔ (تلقیح ص ۴۲ ، سیرت النبیؐ ج ۱۔ ص ۳۹۵-۴۰۸)

۱۱۔ **غزوۂ سَوِیق** سَوِیق کے معنی ہیں ستّو۔ بات یُوں ہُوئی کہ شکستِ بدر کے بعد ابُوسفیان نے قسم کھالی تھی کہ وہ اس شکست کا انتقام لینے سے پہلے نہ تو بیوی کے قریب جائے گا، نہ بالوں کو تیل لگائے گا۔ چنانچہ وہ دو سو شُتر سواروں کے ساتھ مدینے پر بڑھا۔ اُسے معلوم تھا کہ یہود اس کی ہر طرح سے مدد کریں گے۔ چنانچہ وہ پہلے حُیَیّ بن اخطب کے ہاں گیا۔ لیکن اس نے دروازہ نہ کھولا۔ پھر بنو نَضِیر کے سردار سلام بن مِشکَم کے پاس آیا۔ اُس نے پُرجوش استقبال کیا۔ شراب پلائی، پُرتکلّف ضیافت کی اور مسلمانوں کے متعلق ہر بات بتائی۔ چنانچہ اسے مسلمانوں کو للکارنے کی جُرأت نہ پڑی اور واپسی کا ارادہ کر لیا۔ مدینہ سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

ان کے نام کے متعلق اختلاف ہے۔ امام احمد بن حنبل (۲۴۱ھ) کے ہاں ان کا نام رفاعہ تھا۔ اور موسیٰ بن عقبہ بن بشیر بتاتے ہیں کہ ان کا نسب نامہ یہ ہے: رفاعہ بن منذر بن زُبیر بن زید بن اُمیّہ الاوسی الانصاری ہجرتِ حضورؐ سے کچھ پہلے اسلام لائے تھے۔ تقریباً تمام غزوات میں شامل رہے۔ حضورؐ نے غزوۂ سُویق میں بھی آپ کو اپنا نائب مقرر کیا تھا۔ آپ غزوۂ تبوک میں عمداً شامل نہیں ہُوئے تھے۔ اس پر بعد میں اتنے پچھتائے کہ کھانا پینا چھوڑ دیا۔ اور اعلان کیا کہ جب تک اللہ میری توبہ منظور نہیں کرے گا میں کچھ نہیں کھاؤں گا۔ جب یہ خبر حضورؐ تک پہنچی تو آپ ان کے ہاں گئے اور قبولِ توبہ کی اطلاع دی۔ وفات ۳۵-۴۰ھ کے درمیان ہُوئی۔ (استیعاب ج ۲- ص ۶۵۶)

[۵۵] مدینہ سے اندازاً سو میل شمال میں یہود کا ایک شہر۔

[۵۶] خیبر سے کوئی ۶۰ میل شمال کی طرف ایک بستی۔

[۵۷] مدینہ سے دو سو میل شمال میں خیبر اور فدک سے آگے ایک گاؤں۔

[۵۸] حُیَیّ بن اخطب بنو نضیر کا ایک سردار، جو ۴ھ میں خیبر میں جا آباد ہوا تھا۔ اس نے حضورؐ سے یہ معاہدہ کیا تھا کہ وُہ حضورؐ کے خلاف کسی حملہ آور کی مدد نہیں کرے گا۔ بایں ہمہ وہ احزاب میں شامل ہو کر ۵ھ میں مدینہ پر حملہ آور ہُوا اور جب احزاب ناکام ہو کر واپس چلے گئے تو یہ بنو قریظہ (مدینہ) کے ہاں رہنے لگا۔ چونکہ بنو قُرَیظہ بھی معاہدہ توڑ کر احزاب میں شامل ہُوئے تھے اس لیے حضورؐ نے احزاب کے واپس جانے کے بعد بنو قریظہ کا محاصرہ کر لیا۔ حُیَیّ گرفتار ہوا اور حضورؐ نے اس کی موت کا حکم دے دیا۔ (البلاذری: فتوح البلدان انگریزی۔ ص ۴۱)

تین میل کے فاصلے پر ایک مقام عُرَیض کہلاتا تھا وہاں ایک نخلستان میں دو آدمی مصروفِ کار تھے۔ اِن میں سے ایک کا نام شبلی (سیرت، ج ۱، ص ۳۰۵) نے سعد بن عَمرو لکھا ہے اور دُوسرے کے متعلق ابن خلدون کے حاشیہ نگار حکیم احمد حسین الہ آبادی نے صرف اتنا ہی کہا ہے کہ وہ سعید بن عَمرو کا ایک حلیف تھا (ج ۱، ص ۹۲) یہ سعد کون تھا؛ اس کا ذکر حافظ ابن عبد البر قرطبی[61] (۴۶۳ھ) نے الاستیعاب میں نہیں کیا۔ اس سے شبہ ہوتا ہے کہ یہ شاید صحابی نہ تھے۔ ابُوسفیان نے ان دونوں کو قتل کر دیا اور پھر ڈر سے بھاگ نکلا۔ اور اونٹوں کو سُبک سیر بنانے کے لیے ستو کے تھیلے راہ میں پھینکتا گیا۔ اسی مناسبت سے یہ مہم غزوۂ سویق کے نام سے مشہور ہو گئی۔

جب حضورؐ تک یہ اطلاع پہنچی تو آپ ۵۔ ذی الحجہ ۲ھ کو اسّی صحابہ کے ہمراہ ابُوسفیان کی تلاش میں نکلے۔ دُور تک اُس کا تعاقب کیا۔ لیکن وُہ نہ مِلا اور آپ پانچ دن کے بعد واپس آ گئے۔ آپ کی غیر حاضری میں نیابت کے فرائض حضرت ابو لبابہؓ[62] بن عبد المنذر نے سرانجام دیئے تھے۔ (تلقیح ص ۲۴، ابن خلدون، ج ۱، ص ۹۲ اور سیرت النبیؐ شبلی ج ۱۔ ص ۳۶۵)

۱۲۔ غزوۂ قرقرۃ الکدر

حضورؐ کو اطلاع ملی کہ عرب کے دو اہم قبیلے سُلَیم[63] اور غطفان[64] اَرحَضِیَّہ[65] کے قریب ایک موضع قرقرۃ الکدر میں، جو مدینہ سے کوئی اسّی میل دُور تھا، جمع ہو رہے ہیں۔ آپ نے ان کو سزا دینے کا فیصلہ فرمایا اور دو سو صحابہ کے ہمراہ ۱۴/۱۵ المحرم ۳ھ کو مدینے سے روانہ ہُوئے۔ عَلَم حضرت علیؓ کے پاس تھا۔ حضرت عبد اللہؓ[66] بن اُمّ مکتُوم کو بطور نائب پیچھے چھوڑا۔ آپ تین چار روز کے بعد منزل پر جا پہنچے۔ لیکن وہاں دشمن کا نشان تک نہ تھا۔ وہاں صرف اُن کے اُونٹ تھے جو صحرا میں چَر رہے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ یہی اُونٹ اُن کی سواریاں ہیں جن پر چڑھ کر وہ مدینے پر حملہ کر سکتے ہیں، اس لیے انہیں ہانک کر لے چلو۔ چنانچہ وُہ انہیں ہانک لائے اور حضورؐ نے بیت المال کے لیے ایک سو اُونٹ رکھ کر باقی چار سو ہمراہیوں میں بانٹ دیئے اور ہر ایک کو دو دو اونٹ مل گئے۔ (تلقیح ص ۲۴)

---

61. حافظ ابُوعمر یوسف بن عبد اللہ بن محمد بن عبد البر القرطبی النمری (۳۶۸ - ۴۶۳ھ) بہت بڑے مورخ، محدث اور عالم انساب تھے۔ ان کا تعلق نمرہ قبیلے سے تھا۔ الاستیعاب کے علاوہ اِن کی دیگر کتابوں کے نام یہ ہیں: (۱) کتاب الانتہاء (فقہا پر)۔ (۲) کتاب الدرر فی اختصار المغازی والسیر (۳) کتاب فی قبائل العرب و انسابہم (۴) بہجۃ المجالس۔ (فرید وجدی: دائرۃ المعارف ج ۱۰، ص ۱۰۲۴)

62. دیکھئے حاشیہ شمار نمبر ۵۶

63. بنُو سُلَیم مدینہ سے کوئی پچاس میل جنوب مشرق کی طرف آباد تھے۔

64. غَطَفان مدینہ کے جنوب اور قدرے مشرق میں ۶۰/۷۰ میل دُور رہتے تھے۔

65. مدینہ کے جنوب مشرق میں بئر معونہ کے قریب ایک مقام (یاقوت۔ معجم۔ ج ۱۔ ص ۱۸۲)

66. اکثر اصحابِ رجال کا خیال ہے کہ عبد اللہؓ بن اُمّ مکتوم اور عَمرو بن امّ مکتوم جس کا ذکر حاشیہ شمار نمبر ۴۹ میں ہو چکا ہے ایک ہی شخصیت تھے دونوں کا نسب نامہ ایک ہے۔ بعض رجال نگاروں نے عبد اللہ کا ذکر ہی نہیں کیا۔ (استیعاب، ج ۱، ص ۳۷۹)

۱۳۔ غزوۂ غطفان غزوۂ کُدر (۱۴/۱۵ محرم ۳ھ) سے کوئی دو ماہ بعد حضورؐ کو اطلاع ملی کہ نجد کے دو قبیلے ثعلبہ اور محارِب، جو غطفان کی شاخیں تھیں، ذو امر[67] میں جمع ہو رہی ہیں بنو محارب کے رئیس دُعثور بن حارث اس اجتماع کے قائد و محرک ہیں چنانچہ آپؐ ۱۲ ربیع الاوّل ۳ھ کو ۴۵۰ صحابہ کے ہمراہ مدینہ سے نکلے اور حضرت عثمانؓ بن عفان کو بطور نائب پیچھے چھوڑ گئے۔ جب ان قبائل کو آپؐ کی آمد کا علم ہُوا تو پہاڑوں میں بھاگ گئے۔ آپؐ وہاں دن کے وقت ایک درخت کے نیچے آرام فرما رہے تھے کہ دبے پاؤں دُعثور وہاں جا پہنچا، تلوار سونت کر حضورؐ کے سر پر کھڑا ہو گیا اور بلند آواز سے کہنے لگا، بتا اے محمد! تجھے اب مجھ سے کون بچائے گا؟ حضورؐ نے بے ساختہ جواب دیا: اللہ۔ معاً جبریلؑ نے دُعثور کے سینے میں اس زور سے دو ہتّڑ رسید کیا کہ اس کی تلوار گر گئی جسے حضورؐ نے فوراً تھام کر پُوچھا: بتا اب تجھے کون بچائے گا؟ کہنے لگا: کوئی نہیں اور ساتھ ہی کلمہ پڑھ کر اسلام لے آیا۔ حضورؐ وہاں کچھ دیر ٹھہرے اور پھر کسی تصادم کے بغیر واپس چلے گئے۔ (تلقیح ص ۲۵)

۱۴۔ غزوۂ بنو سُلَیم مدینہ سے کوئی ۵۰/۶۰ میل جنوب مشرق میں ایک مقام فُرع کہلاتا تھا اور اُس کے قریب ہی ایک اور موضع بُحران کے نام سے مشہور تھا، حضورؐ کو اطلاع ملی کہ بنو سُلَیم بُحران میں جمع ہو رہے ہیں آپ ابنِ اُمِّ مکتوم[68] کو نائب بنا کر ۶ جمادی الاُولیٰ ۳ھ کو تین سو صحابہ کے ہمراہ روانہ ہُوئے۔ منزل پر پہنچے تو وہاں کسی لشکر کا نشان نہ تھا۔

۱۵۔ حضرت زیدؓ[69] بن حارثہ کی مہم جب قریش کی قدیم تجارتی شاہراہ، جو ساحلِ قلزم کے ساتھ ساتھ شام تک جاتی تھی مسلمانوں کے پیہم حملوں سے غیر محفوظ ہو گئی تو قریش کی اکثریت نے اس کا استعمال ترک کر دیا۔ البتّہ ایک گروہ، جس کا سردار صفوانؓ[70] بن اُمیّہ تھا (یہ اپنے آپ کو ابوسفیان کا رقیب سمجھتا تھا) شام سے تجارت کرنے پر مُصر تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایک قافلہ بایں ہدایت شام کو بھیجا کہ وہ آتے جاتے مدینہ کے مشرق سے گزرے اور رہبری کے لیے بنو عجل کے ایک آدمی فراتؓ[71] بن حیان کو اُجرت پر ساتھ بھیج دیا۔ قافلے کی سیادت صفوان بن اُمیّہ کے سپرد تھی۔ جب یہ قافلہ مالِ تجارت لے کر لوٹا تو حضورؐ کو

---

[67] ذو امر نجد میں بنو غطفان کا ایک موضع۔ (یاقوت: معجم۔ ج ۱۔ ص ۲۲۴)

[68] عمروؓ بن اُمِّ مکتوم۔ دیکھیے حاشیہ نمبر ۴۹۔

[69] زیدؓ بن حارثہ۔ دیکھیے حاشیہ نمبر ۳۹۔

[70] صفوان بن اُمیّہ بن خلف بن وہب بن حذافہ بن جُمحؓ القرشی الجُمحیؓ کا والد اُمیّہ بن خلف بدر میں اپنے سابق غلام حضرت بلالؓ کے ہاتھوں مارا گیا تھا صفوان فتح مکّہ کے بعد اسلام لایا تھا۔ بات یُوں ہُوئی کہ جب حضورؐ مکّہ سے لوٹے تو یہ بھی ساتھ شامل ہو گیا اور حنین و طائف میں حضورؐ کی طرف سے لڑا، حالاں کہ اس وقت تک یہ کافر ہی تھا۔ آپؐ نے اسے حنین کی غنیمت سے کافی حصّہ دیا۔ یہ فتح مکّہ سے ایک ماہ بعد اسلام لے آیا اور مدینہ میں آگیا۔ لیکن حضورؐ نے اُسے یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ فتح مکّہ کے بعد ہجرت کی ضرورت نہیں رہی۔ یہ افصح القریش تھا۔ اس کی وفات ۴۲ھ کو مکّہ میں ہُوئی۔ (استیعاب۔ ج ۱۔ ص ۳۱۸)

[71] فرات بن حیّان بن ثعلبۃ العجلی یمامہ کے ایک قبیلے بنو عجل سے تعلق رکھتے تھے۔ زیدؓ بن حارثہ کی مہم کے بعد جلد مُسلمان ہو گئے اور جب مسیلمہ نے دعویٰ نبوّت کیا تو حضورؐ نے انہیں مُسیلمہ سے لڑنے کے لیے بھیجا تھا۔ (استیعاب۔ ج ۲۔ ص ۵۲۰)

اطلاع مل گئی۔ آپؐ نے حضرت زیدؓ بن حارثہ کو سو سواروں کے ساتھ جمادی الآخرہ ۳ھ میں اس قافلے سے مقابلے کے لیے روانہ کیا۔ جونہی یہ لوگ قافلے کے قریب پہنچے تو تمام محافظ قافلے کو چھوڑ کر بھاگ گئے اور حضرت زیدؓ سارے قافلے کو مدینے میں ہانک لائے۔ اس تمام مال و متاع کی قیمت ایک لاکھ درہم تھی۔ (تلقیح ص ۲۵، ابن خلدون ج ۱ ص ۹، واٹ ص ۲۰)

۱۶۔ غزوۂ اُحد بدر کے ستر مقتولوں کا انتقام لینے کے لیے قریش سخت بے تاب تھے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے انہوں نے اڑھائی لاکھ درہم جمع کیے۔ نواحی قبائل میں اشتعال پیدا کرنے کے لیے شعراء بھیجے اور اس طرح تین ہزار جانبازوں کا ایک لشکر تیار کیا جس میں سات سو زرہ پوش تھے اور جن کے پاس دو سو گھوڑے اور تین ہزار اونٹ تھے۔ یہ لشکر بدھ کے دن (۵ شوال ۳ھ) اُحد کے قریب فروکش ہوا۔ حضورؐ کو لمحہ لمحہ کی خبر مل رہی تھی۔ آپؐ دو دن بعد نمازِ جمعہ سے فارغ ہو کر ایک ہزار افراد کے ہمراہ مدینہ سے نکلے۔ جب شہر کے باہر پہنچے تو رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی تین سو آدمیوں کو لے کر واپس چلا گیا۔ بایں ہمہ حضورؐ کے عزم میں فرق نہ آیا۔ آپؐ نے میدانِ اُحد میں پہنچ کر صف آرائی کی حضرت زبیرؓ[۲۷] بن عوام کو رسالے کا افسر مقرر کیا۔ پچاس تیراندازوں کو حضرت عبداللہؓ[۲۸] بن جبیر کی قیادت میں اُس چوٹی پر متعین فرمایا جو مسلمانوں کے پیچھے تھے۔ ۷ شوال کو سب سے پہلے خواتینِ قریش دف پر اشعار پڑھتی ہوئی آگے بڑھیں جن میں کشتگانِ بدر کا ماتم اور انتقام کے رجز تھے۔ ابوسفیان کی بیوی ہند سب سے آگے تھی پیچھے چودہ دیگر عورتیں تھیں، جن میں اُمِّ حکیم (ابوجہل کے فرزند عکرمہ کی بیوی)، فاطمہ (خالد بن ولید کی ہمشیر)، برزہ (طائف کے رئیس مسعود ثقفی کی بیٹی) اور رَیطہ (عمرو بن عاص کی زوجہ) خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ رجزیہ اشعار میں سے دو یہ ہیں ؎

نَحْنُ بناتُ طارقٍ نمشی علی النّمارقِ

(ہم مسافرانِ شہر یعنی تاروں کی بیٹیاں ہیں جو قالینوں پر چلنے کی عادی ہیں)

اِن تقبلوا نُعانقِ او تدبروا نفارقِ

(اگر تم آگے بڑھو گے تو ہم تم سے گلے ملیں گی۔ پیچھے ہٹو گے تو ہم تمہیں چھوڑ جائیں گی)

جب صفیں آراستہ ہو گئیں تو حضورؐ نے مہاجرین کا علم حضرت علیؓ کو۔ اوس کا حضرت اُسیدؓ[۲۹] بن حُضیر کو اور خزرج کا حبابؓ[۳۰] بن مُنذِر کو

---

[۲۷] دیکھیے حاشیہ نمبر ۱۱

[۲۸] عبداللہ بن جُبیر بن نُعمان بن اُمیّہ بن امرءُ القیس انصاری ہجرتِ رسولؐ سے ذرا پہلے اسلام لائے تھے۔ بدر میں حصّہ لیا اور اُحد میں شہادت پائی۔ (استیعاب ج ۱ ص ۳۴۲)

[۲۹] اُسیدؓ بن حُضیر بن سماک بن عتیک بن رافع بن امرءُ القیس بن زید بن عبد الاشہل بن حارث بن خزرج بن عمرو بن مالک بن اوس انصاری اشہلی عقبۂ ثانیہ سے بھی ذرا پہلے ایمان لائے تھے (عقبۂ اولیٰ و ثانیہ میں ایک سال کا زمانہ حائل تھا)، بدر میں شاید شامل نہیں ہوئے لیکن اُحد میں بڑی پامردی سے لڑے۔ جب دیگر صحابہ حضورؐ کو تنہا چھوڑ گئے تھے تو یہ حضورؐ کے پاس ہی ڈٹے رہے۔ علم و حُسنِ تلاوت میں مشہور تھے۔ شعبان ۲۰ھ میں وفات پائی اور فاروقِ اعظمؓ نے انہیں بقیع میں دفن کیا۔ (استیعاب ج ۱ ص ۲۸)

[۳۰] حُبابؓ بن مُنذِر کے لیے دیکھیے حاشیہ نمبر ۱۵۔

عطا کیا۔ جب جنگ شروع ہو گئی تو مسلمانوں کے تند و تیز حملوں سے قریش کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ رجز خواں عورتیں پیچھے کو بھاگیں اور مسلمانوں نے قریش کا سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ یہ صورت دیکھ کر قُلّہ کوہ کے تیرانداز بھی نیچے کو بھاگے۔ عبداللہؓ بن جبیر نے بہت روکا۔ لیکن انہوں نے پروا نہ کی۔ اس پر خالدؓ[6] بن ولید نے پیچھے سے حملہ کیا۔ حملہ اتنا تیز تھا کہ مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ ایک خاصی تعداد شہید ہو گئے۔ حضورؐ کے چہرے پر چوٹ آئی۔ دائیں طرف کا ایک نچلا دانت ٹوٹ گیا اور آپؐ ایک گڑھے میں گر پڑے۔ اس پر یہ افواہ پھیل گئی کہ حضورؐ شہید ہو گئے ہیں۔ اس عام بدحواسی چھا گئی اور حضرت عمرؓ نے تلوار پھینک دی۔ پاس ہی حضرت انسؓ[7] بن مالک کے چچا حضرت ابن نضرؓ[8] کھڑے تھے۔ انہوں نے حضرت عمرؓ سے پوچھا کہ یہ کیا؟ کہا: حضورؐ کے بعد لڑ کر کیا کریں گے۔ ابن نضرؓ نے کہا کہ اُن کے بعد ہم زندہ رہ کر کیا کریں گے۔ یہ کہہ کر دشمن کی صفوں میں گھس گئے اور اسّی سے زیادہ زخم کھا کر شہادت پائی۔

حضورؐ کو سب سے پہلے حضرت کعبؓ[9] بن مالک نے دیکھا اور بلند آواز سے کہا "مسلمانو! رسول اللہ صلعم یہ ہیں"۔ یہ سن کر جاں نثار ٹوٹ پڑے اور کفار نے ان پر حملہ کر دیا۔ حضرت ابو دجانہؓ[10] اور حضرت طلحہؓ حضورؐ کے لیے سپر بن گئے اور تمام وار اپنے جسموں پر سہنے لگے تاہم تلوار کا ایک وار حضورؐ کے خود پر پڑ گیا اور اس کی دو کڑیاں چہرۂ مبارک میں چُبھ گئیں۔ اس حالت میں بھی آپؐ کی زبان پر یہ الفاظ تھے:

---

[6] خالدؓ بن ولید بن مُغیرہ بن عبداللہ بن عمر بن مخزوم القرشی المخزومی کی والدہ لبابۃ الصغریٰ اُم المومنین میمونہ کی بہن تھی۔ جاہلیت میں خالد اشرافِ قریش میں شمار ہوتے تھے۔ یہ کب مسلمان ہوئے؟ اس کے متعلق اختلاف ہے۔ کوئی حدیبیہ و خیبر کے درمیان بتاتا ہے کوئی اسے سالِ خندق (۵ھ) کا واقعہ قرار دیتا ہے اور کوئی ۸ھ کا۔ بہرحال یہ غزوۂ مکہ میں حضورؐ کے ساتھ تھے۔ پھر حنین میں بھی شامل ہوئے۔ ۹ھ میں حضورؐ نے انہیں دُومۃ الجندل کی طرف بھیجا اور یہ وہاں کے فرمانروا اکیدر بن عبدالملک کو گرفتار کر لائے۔ ایک سال بعد یہ والیٔ نجران (الحارث بن کعب) کو پکڑ لائے۔ حضرت ابوبکرؓ نے انہیں منکرینِ زکوٰۃ اور جھوٹے نبیوں کے خلاف لڑنے کے لیے بھیجا۔ مُسیلمہ کو آپ ہی نے قتل کیا تھا۔ آپ کو حضورؐ نے سیف اللہ کا خطاب دیا تھا۔ وفات کے وقت آپ کے جسم پر کوئی جگہ ایسی نہ تھی جس پر تلوار، تیر یا نیزے کا زخم نہ ہو۔ آپ کی وفات ۲۱/۲۲ھ کو حمص اور بروایتے مدینہ میں ہوئی تھی۔ آپ تاریخِ اسلام کے سب سے بڑے فاتح تھے۔ (استیعاب ج ۱ ص ۱۵۳)

[7] انسؓ بن مالک خزرجی انصاری حضورؐ کے خادم تھے۔ جب یہ حضورؐ کی خدمت میں آئے تو آٹھ دس سال کے تھے۔ ۹۱ھ میں بصرہ کے قریب وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ (ایضاً ص ۳۵)

[8] شبلی (سیرت ج ۱، ص ۳۰۸) نے ابن نضر لکھا ہے اور ابن خلدون (ج ۱ ص ۱۰۲) نے نضر بن انس۔ صحیح اَنس بن نَضر ہے۔ یہ اُحد میں شہید ہوئے تھے۔ (استیعاب ج ۱۔ ص ۴۴)

[9] کعبؓ بن مالک بن ابی کعب عمرو بن القین بن کعب الانصاری عقبۂ ثانیہ میں اسلام لائے تھے۔ بدر و تبوک کے سوا باقی تمام غزوات میں شامل ہوئے۔ یہ شاعر بھی تھے۔ یہ غزوۂ تبوک میں عمداً شامل نہیں ہوئے تھے۔ پھر سخت نادم و تائب ہوئے تو یہ آیت نازل ہوئی:

وعلى الثلٰثة الذين خُلِّفوا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کی وفات ۵۰ - ۵۳ھ میں ہوئی۔ (استیعاب ج ۱ ص ۲۱۶)

[10] ابو دجانہ۔ سماک بن اوس بن خرشہ انصاری۔ ۱۱ھ میں مسیلمہ کے خلاف لڑتے ہوئے شہادت پائی۔ (استیعاب ج ۲ ص ۶۴۳)

(باقی بر صفحہ آئندہ)

ربّ اغفر لقومی فانّھم لا یعلمون ۔ (بخاری ۔غزوۂ احد)

(اے رب! میری قوم کو معاف کر دے کہ وہ لاعلم ہے)

ابوسفیان کی بیوی ہند جس کے والد عتبہ کو حضرت حمزہ نے بدر میں قتل کیا تھا، کو حضرت حمزہؓ کی لاش نظر آگئی ۔اس نے آپ کے کان اور ناک کاٹ کر اُن کا ہار بنا لیا اور کلیجہ نکال کر چبا گئی ۔

جب دونوں فوجیں میدان سے الگ ہوئیں تو حضورؐ نے ایک دستہ تعاقب میں بایں غرض بھیجا کہ کہیں ابوسفیان مدینے پر حملہ نہ کر دے اور دوسرے دن زخمی ہونے کے باوجود آپؐ خود بھی مدینہ کے جنوب میں آٹھ میل تک گئے لیکن قریش جا چکے تھے اس لیے واپس تشریف لے آئے ۔

اس جنگ میں شہداء و مقتولین کی تعداد یہ تھی:

۱۔ شہداء ۷۰ ۔ان میں حضرت حمزہؓ ، حضرت عبداللہؓ بن جحش ، حضرت مصعبؓ بن عمیر و دیگر مہاجر صحابہ اور ۶۵ انصار شامل تھے ۔

۲۔ مقتولینِ قریش کی تعداد بقولِ ابن خلدون (ج ۱ ۔ص ۱۰۴) بائیس تھی اور بقول ابن الجوزی (تلقیح ص ۲۵) تئیس ۔ ان میں قابلِ ذکر یہ تھے :

ولید بن عاص بن ہشام ۔ ابو اُمیہ بن ابی حذیفہ بن مُغیرہ اور ہشام بن ابی حذیفہ بن مغیرہ ۔

اس جنگ کے بعد مدینہ ماتم کدہ بن گیا ۔حضورؐ جس طرف سے گزرتے عورتیں کسی نہ کسی کو رو رہی ہوتیں لیکن حضرت حمزہؓ کا نوحہ خواں کوئی نہیں تھا اس پر حضورؐ کو دُکھ سا ہوا اور فرمایا :

اماحمزۃُ فلا بواکی لہٗ ۔ (افسوس کہ حمزہ پہ رونے والا کوئی نہیں)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

۴۹؎ طلحہؓ بن عبیداللہ بن عثمان بن عمرو بن سعد القرشی التیمی جب ہجرت کر کے مدینے میں پہنچے تو حضورؐ نے انہیں کعبؓ بن مالک بن ابوکعب کا بھائی بنا دیا ۔غزوۂ بدر کے وقت طلحہ شام میں تھے ۔اُحد میں آپ نے کعب بن مالک کے ہمراہ حضورؐ کو بچانے کے لیے تیر و تیغ کے کئی زخم کھائے تھے ۔ جب حضورؐ زخمی ہو کر گرے تو یہ آپؐ کو پیٹھ پر اُٹھا کر بلندی پر ایک غار میں لے گئے ۔ بدر کے بعد حضرت طلحہ تمام غزوات میں شامل ہوئے ۔آپ عشرۂ مبشرہ میں سے تھے ۔جنگِ جمل (۳۶ھ) میں مروان بن الحکم کے تیر سے شہادت پائی ۔آپ حضرت علیؓ کی طرف سے لڑ رہے تھے کہ جنگ کو چھوڑ کر الگ ہو گئے ۔(استیعاب ج ۱ ۔ص ۲۰۶)

۵۰؎ حضورؐ حمراء الاسد (موضع) تک گئے اور یہ تعاقب غزوہ اُحد کے سلسلے میں تھا ۔بعض تاریخ نگاروں نے اسے ایک الگ غزوہ قرار دیا ہے ۔

۵۱؎ عبداللہؓ بن جحش کے لیے دیکھئے حاشیہ نمبر ۴۳

۵۲؎ مصعبؓ بن عُمیر کے لیے دیکھئے حاشیہ نمبر ۵۰

انصار کو اس ارشاد کا علم ہوا تو اپنی خواتین کو حضورؐ کے گھر ماتمِ حمزہؓ کے لیے بھیج دیا۔ جب یہ عورتیں حضورؐ کے در پر جمع ہوئیں تو آپؐ گھر سے باہر آئے۔ ان سب کے لیے دعا فرمائی، شکریہ ادا کیا اور یہ کہہ کر انہیں واپس بھیج دیا کہ آج سے مُردوں پر نوحہ کی رسم بند کی جاتی ہے۔ (تلقیح ص ۲۵، واٹ ص ۲۱۔ ابن خلدون ج ۱ ص ۱۰۰-۱۰۵۔ سیرت النبی ج ۱ ص ۳۶۹ - ۳۴۸)

۱۷۔ مہمّ قطن کُرفہ و مکہ کی راہ پر دونوں کے وسط میں ایک قصبہ فَیدؔ کے نام سے مشہور تھا۔ اس کے قریب ایک پہاڑ قطن کہلاتا تھا۔ حضورؐ کے زمانے میں وہاں بنو خزیمہ کی ایک شاخ اسد بھی آباد تھی۔ حضورؐ کو اطلاع ملی کہ قبیلۂ اسد کے ایک سردار خویلد کے دو بیٹے سلمہ و طلیحہ[۵۵] مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے ایک لشکر ترتیب دے رہے ہیں۔ حضورؐ نے حضرت ابوسلمہ[۵۶] کو ۱۵۰ صحابہ کے ہمراہ اس طرف بھیجا۔ یہ جیش یکم محرم ۴ھ کو روانہ ہُوا اور وہ لوگ ان کی روانگی کی خبر سن کر منتشر ہو گئے۔ (تلقیح ص ۲۶ - شبلی سیرت ص ۳۸۹)

۱۸۔ وادیٔ عُرَنہ کی مہم وادیٔ عُرنہ مکہ کے مشرق میں عرفات کے قریب واقع تھی۔ یہ بنو لحیان کی ملکیت تھی۔ اس قبیلے کے سردار کا نام سُفیان بن خالد الہذلی تھا۔ حضورؐ کو خبر ملی کہ سفیان مدینے پر حملہ کرنے کے لیے ایک جیش ترتیب دے رہا ہے۔ آپؐ نے حضرت عبداللہؓ بن اُنیس[۵۷] کو اس کے مقابلے کے لیے روانہ کیا۔ یہ ۵۔ محرم ۴ھ کو تنہا چل پڑے۔ وہاں پہنچ کر اُسے تلاش کیا، موقعہ پا کر مار ڈالا اور سر کاٹ کر ساتھ لے گئے۔ جب حضورؐ کی خدمت میں پہنچے اور سارا واقعہ بتایا تو حضورؐ نے خوش ہو کر اپنا عصا عطا کیا اور فرمایا:

تخصر بھذہ فی الجنۃ۔ (کہ جنت میں اس کے سہارے سے چلنا)

جب یہ فوت ہوئے تو عصا اُن کے کفن میں رکھ دیا گیا۔ (تلقیح ص ۲۶ - سیرت النبیؐ ج ۱ ص ۳۸۹)

---

[۵۵] طُلیحہؓ و سلمہ دونوں بھائی تھے۔ سلمہ کے مشرف بہ اسلام ہونے کی کوئی شہادت موجود نہیں۔ البتہ طلیحہ اسلام لے آئے تھے لیکن حضورؐ کی رحلت کے بعد یہ بھی سیلابِ ارتداد میں بہہ گئے اور اپنے سارے قبیلے کو مسلمانوں کے خلاف منظم کر لیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان کی گوشمالی کے لیے حضرت خالدؓ بن ولید کو بھیجا لیکن یہ شام کی طرف بھاگ گئے اور عہدِ عمرؓ میں تائب ہو کر مدینہ میں آئے اور پھر کئی جنگوں میں شامل ہُوئے۔ (استیعاب ج ۱ ص ۲۱۱)

[۵۶] ابوسلمہ: تذکروں میں اس کنیت کے دو ہی صحابی ملتے ہیں۔ اوّل ابوسلمہ جس کا نام کہیں مذکور نہیں۔ حافظ ابن عبدالبرؒ نے اتنا ہی لکھا ہے کہ یہ حضورؐ کی صحبت میں رہے تھے۔ (استیعاب ج ۲ ص ۶۸۶) دوم۔ ابوسلمہ: عبداللہ بن عبدالاسد بن ہلال بن عبداللہ بن عمر بن مخزوم القرشی المخزومی اوّلین مسلمانوں میں سے تھے۔ ہجرتِ حبشہ میں بھی حصہ لیا تھا۔ یہ اُحد میں زخمی ہُوئے۔ زخم اچھا ہونے کے بعد پھر ہرا ہو گیا اور آپ ۳۔ جمادی الآخرہ ۴ھ (استیعاب میں ۳ھ درج ہے جو صریحاً غلط ہے کیونکہ اُحد کا واقعہ جمادی الآخرہ ۳ھ سے چار ماہ بعد پیش آیا تھا) کو وفات پا گئے۔ مہمِ قطن کی سیادت انہی کے سپرد ہوئی تھی۔ (استیعاب ج ۲۔ ص ۶۸۵)

[۵۷] عبداللہ بن اُنیس بن اسعد بن حرام بن حبیب بن مالک جُہنی، ہجرتِ رسُولؐ سے کچھ عرصہ پہلے اسلام لائے تھے۔ اُحد اور بعد کے غزوات میں حصہ لیا اور ۵۴ھ میں وفات پائی۔ (استیعاب ج ۱۔ ص ۳۴۶)

۱۹- بئرِ معونہ کی مہم صفر ۴ھ میں حضورؐ نے نجد کے ایک قبیلے عامرؓ [۸۸] بن صعصعہ کے ایک رئیس ابو البراء عامر بن مالک کو اسلام کی دعوت دی۔ اس نے کہا کہ قبیلے کی حمایت حاصل کرنے نیز اُسے اسلام سے متعارف کرانے کے لیے چند صحابہ میرے ساتھ بھیجئے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ مجھے اہل نجد پر اعتبار نہیں۔ کہنے لگا کہ میں ضامن ہوں۔ چنانچہ آپ نے چند صحابہ اس کے ساتھ کر دیئے۔ ان کی تعداد بعض روایات کے مطابق ستر اور بعض دیگر کے مطابق چالیس تھی۔ جب یہ لوگ ارضِ بنو سُلیم [۸۹] کے ایک کنوئیں بئرِ معونہ پر پہنچے تو وہاں سے اپنی جماعت کے ایک ہی آدمی حرامؓ [۹۰] بن ملحان کو حضورؐ کا خط دے کر قبیلے کے سردار عامر بن طفیل کی طرف بھیجا۔ اس نے قاصد کو قتل کر دیا اور بنو سلیم کے چند آدمیوں کے ہمراہ بئرِ معونہ کی طرف چل پڑا۔ راہ میں سامنے سے صحابہ آ گئے جو قاصد کو ڈھونڈنے کے لیے نکل پڑے تھے۔ عامر نے ان کو گھیر کر قتل کر دیا اور عمروؓ [۹۱] بن اُمیہ کو یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ میری ماں نے ایک غلام کو آزاد کرنے کی منت مانی تھی اس لیے تو آزاد ہے اور ساتھ ہی اس کی چوٹی کاٹ لی۔ اس جماعت کا سردار حضرت مُنذر [۹۲] تھا اور اس میں حضرت عامرؓ [۹۳] بن فہیرہ اور حضرت نافعؓ [۹۴] بن بدیل جیسے مقدس لوگ شامل تھے۔ (تلقیح ص ۲۶۔ ابن خلدون ج ۱ ص ۱۱۵۔ واٹ ط۲، شبلی ص ۳۸۹)

---

۸۸ عامر بن صعصعہ کا قبیلہ ہوازن کا ایک حصہ تھا۔ مدت تک اس کی سیادت ابو البراء عامر بن مالک کے پاس رہی۔ بعد میں دو نوجوان سردار، عامر بن طفیل اور علقمہ بن عُلاثہ خود سر ہو کر اپنی مرضی کرنے لگے۔ اس کی شہادت حرام بن ملحان کے قتل سے ملتی ہے کہ ابو البراء نے اُسے اور اس کی جماعت کو پناہ دی لیکن عامر بن طفیل نے اسے قتل کر دیا۔ (واٹ ص ۹۰)

۸۹ سُلیم کے قبیلے نے اسلام کے خلاف کوئی خاص حصہ نہیں لیا۔ اوائل ہجرت میں ایک دو مرتبہ انھوں نے شرارت کا ارادہ کیا تھا لیکن اسلامی جیش کے آنے پر منتشر ہو گئے البتہ بئرِ معونہ کے المیہ کے ذمہ دار یہی لوگ تھے۔ انھوں نے عامر بن طفیل کے ساتھ مل کر تمام صحابہ کو مار ڈالا۔ بعد میں ان کا رویہ ٹھیک ہو گیا۔ فتحِ مکہ اور حنین کی مہم میں سُلیم کے ایک ہزار جوان شامل تھے حنین میں حضورؐ نے تین علم تین سُلیمیوں کو دیئے تھے۔ یعنی عباس بن مرداس، خُناف بن ندبہ اور حُجاج بن علاط۔ یہ قبیلہ حضورؐ کی زندگی میں ہی مسلمان ہو گیا تھا۔ (واٹ ص ۹۵)

۹۰ حرامؓ بن ملحان۔ مالک بن خالد بن زید بن حرام الانصاری نے بدر و اُحد میں حصہ لیا۔ آپ حضرت انس بن مالک کے ماموں تھے۔ جب عامر بن طفیل نے آپ کے سر میں نیزہ مارا اور آپ کے ہاتھوں پر خون گرنے لگا تو فرمایا فُزْتُ و ربّ الکعبۃ (رب کعبہ کی قسم میں جیت گیا) شہادت ۴ھ میں پائی۔ (استیعاب ج ۱، ص ۱۳۲)

۹۱ عمروؓ بن اُمیہ بن خویلد بن عبداللہ بن ایاس بن عبید الضمری۔ بدر اور احد میں قریش کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف لڑتے رہے لیکن اُحد کے بعد فوراً اسلام لے آئے اور ۶ھ میں حضورؐ نے انہیں ایک تبلیغی خط دے کر نجاشی کی طرف بھیجا تھا۔ عہدِ معاویہ میں مدینہ میں وفات پائی۔

(استیعاب ج ۲ ص ۴۲۰)

۹۲ مُنذر بن عمرو بن خُنَیس بن حارثہ بن لوذان الانصاری الساعدی ہجرتِ رسولؐ سے پہلے اسلام لائے تھے۔ بدر و اُحد میں حصہ لیا اور بئرِ معونہ کے المیہ میں شہید ہو گئے۔ (۴ھ) (استیعاب۔ ج ۱ ص ۲۷۵)

۹۳ عامرؓ بن فُہیرہ حضرت ابوبکرؓ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ جبلِ ثور میں مویشی چرایا کرتے تھے۔ جب حضورؐ ابوبکر صدیق رضؓ کے ہمراہ غارِ ثور میں پناہ گزین ہوئے تو یہ ہر شام وہاں کھانا وغیرہ لاتے تھے اور سفرِ ہجرت میں ان دونوں کے ساتھ تھے۔ بدر و اُحد میں حصہ لیا اور بئرِ معونہ کے حادثے میں شہادت پائی۔ (استیعاب ج ۲۔ ص ۲۴۹)

(باقی بر صفحہ آئندہ)

۲۰۔ رَجیع[۹۵] کی مہم صفر ۴ھ میں قبائل عَضَل[۹۶] و قارہ کے چند آدمی حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ ہماری قوم اسلام لا چکی ہے لیکن احکامِ شریعہ سے نا آشنا ہے۔ اس لیے ہمارے ساتھ چند عالم و مبلغ بھیجئے۔ حضورؐ نے سات صحابہ کا انتخاب فرمایا اور حضرت مرثد[۹۷]ؓ بن ابی مرثد کو ان کا امیر مقرر کر کے بھیج دیا۔ جب یہ لوگ مقامِ رَجیع پر پہنچے تو انہوں نے غداری کی اور بنو لحیان[۹۸] کے چند آدمیوں کو بُلا کر پانچ کو تو مروا ڈالا اور باقی دو یعنی حضرت خبیب[۹۹]ؓ بن عدی اور حضرت زید[۱۰۰]ؓ بن دَثِنہ کو مکہ میں قریش کے ہاں فروخت کر دیا اور قریش نے انہیں شہید کر ڈالا۔ خُبَیبؓ کو ابو سَروَعہ[۱۰۱] نے، جس کے والد حارث بن عامر کو خُبَیبؓ نے اُحد میں قتل کیا تھا اور زید کو صفوان[۱۰۲] بن اُمیہ بن خلف نے کیونکہ اس کا باپ امیہ بن خلف بدر میں مسلمانوں کے ہاتھ سے ہلاک ہوا تھا۔ اور صفوان کے بدلے میں کسی مسلمان کا سر لینا چاہتا تھا۔ (تلقیح ص ۲۶۔ ابن خلدون ج ۱ ص ۱۱۰۔ شبلی ج ۱ ص ۳۹۱)

---

۹۴ نافعؓ بن بُدَیل بن ورقاء الخزاعی ایک صاحبِ علم صحابی تھے۔ (استیعاب ج ۱ ص ۲۹۴)

۹۵ مدینہ و مکہ کے وسط میں ایک مقام عُسفان کہلاتا تھا۔ رجیع مکہ و عُسفان کے درمیان واقع تھا۔ (شبلی ج ۱۔ ص ۳۹۱)

۹۶ عَضَل اور قارہ، قبیلۂ اسد بن خُزَیمہ کی شاخیں تھیں اور یہ مکہ و مدینہ کے مشرق میں رہتی تھیں۔ (واٹ۔ ص ۸۱)

۹۷ حضرت مرثدؓ بن ابی مرثد الغنوی بدر و اُحد میں شامل ہوئے تھے اور حادثۂ رجیع میں شہید ہوئے۔ (۴ھ) آپ نے حضورؐ سے کئی احادیث روایت کی ہیں۔ آپ کو حضورؐ نے مہم رجیع کا امیر مقرر کیا تھا لیکن ایک اور روایت کے مطابق اس مہم کا امیر عاصمؓ بن ثابت بن ابی الاقلح انصاری تھا یہ بھی ان سات صحابہ میں شامل تھا جنھیں حضورؐ نے اس مہم پر بھیجا تھا۔ جب بنو لحیان نے صحابہ کو قتل کر دیا تو انہوں نے عاصم کا سر کاٹ کر سلافہ بنت سعد بن شہید کے پاس فروخت کرنا چاہا لیکن شہد کی مکھیوں کے اچانک حملے سے ایسا نہ کر سکے۔ سلافہ کے دو بیٹوں کو اُحد میں عاصم نے ہلاک کیا تھا اور اس نے قسم کھائی تھی کہ وہ عاصم کے کاسہ سر میں شراب پیئے گی۔ (استیعاب ج ۱ ص ۲۶۵ و ابن خلدون ج ۱ ص ۱۱۵)

۹۸ بنو لحیان۔ قبیلۂ ہُذَیل کی ایک شاخ تھی جو مدینہ کے جنوب مشرق میں آباد تھی۔ اس کے ایک سردار سُفیان بن خالد بن نُبَیحہ الہُذَلی کو عبداللہؓ بن اُنَیس نے قتل کر دیا تھا (دیکھیے عنوان نمبر ۱۶)۔ اسی قتل کا انتقام لینے کے لیے بنو لحیان نے ان صحابہ کو قتل کیا۔
(واٹ۔ صفحہ ۹۰)

۹۹ خُبَیب بن عَدِی بن عوف بن کُلفَہ انصاری بدر میں موجود تھے۔ انہیں ابُو سَروَعہ (ح۔ ۱۰۱) نے شہید کیا تھا۔
(استیعاب ج ۱ ص ۱۶۲)

۱۰۰ زیدؓ بن دَثِنہ بن معاویہ بن عُبَید بن عامر بن بیاضۃ الانصاری نے بدر و اُحد میں حصہ لیا تھا۔ مہم رجیع میں پہلے قید ہوئے اور بعد ازاں صفوان بن اُمیہ کے ہاتھوں شہید۔ (ایضاً ص ۱۸۹)

۱۰۱ ابُو سَروَعہؓ عُقبہ بن حارث بن عامر بن نوفل بن عبدِ مناف القرشی النوفلی الحجازی فتح مکہ کے دن اسلام لائے تھے۔
(استیعاب۔ ج ۲۔ ص ۶۹۳)

۱۰۲ صفوان بن اُمیہ کے لیے دیکھیے حاشیہ نمبر ۷۰۔

۲۱۔ غزوۂ بنو نضیر بنو نضیر یہود مدینہ کا ایک قبیلہ تھا جو مسجد نبوی ؐ سے جنوب مشرق کی طرف شہر سے باہر آباد تھا۔ یہ ہر وقت اسلام کے خلاف سازشوں میں مصروف رہتا تھا۔ ایک دفعہ انہوں نے حضورؐ کو پیغام بھیجا کہ آپ ہمارے تین علماء سے اسلام پر گفتگو کرنے کے لیے تشریف لائیں اور ساتھ تین صحابی بھی لے آئیں۔ حضورؐ نے یہ دعوت منظور فرمائی اور حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کو ساتھ لے کر اُن کے ہاں چلے گئے۔ یہود نے آپ کے آنے سے پہلے چھت پر ایک یہودی کو چڑھا دیا تھا اور ہدایت کی تھی کہ جب مسلمان باتوں میں لگ جائیں تو وُہ رسول (صلعم) پر ایک وزنی سِل گرا دے۔ جب حضورؐ وہاں پہنچے تو انہیں اُسی دیوار کے سائے میں بٹھایا گیا لیکن وحی نے آپؐ کو سازش کی اطلاع دے دی چنانچہ آپ اُٹھ کر واپس چلے گئے اور بنو نضیر کو سزا دینے کی سکیم بنانے لگے۔ آپ ربیع الاول ۴ھ میں صحابہ کا ایک جیش لے کر بنو نضیر کے محلے میں گئے۔ ان کا محاصرہ کر لیا اور پندرہ دن کے بعد اس شرط پر صلح ہُوئی کہ یہود ہتھیار چھوڑ جائیں اور حتی الوسع سامان اٹھا سکتے ہیں لے کر مدینہ سے نکل جائیں۔ چنانچہ یہ لوگ خیبر وغیرہ کی طرف چلے گئے اور مدینہ سے بایں شان روانہ ہُوئے کہ عورتیں دَف بجا بجا کر گا اور ناچ رہی تھیں۔ (تلقیح ص ۲۶۔ شبلی ج ا ص ۴۰۸۔ عہد نبویؐ کے میدان جنگ ص ۹۷، ابن خلدون ج ا ص ۱۱۷)

۲۲۔ غزوۂ بدر الموعد [۵۲] جنگِ اُحد کے خاتمے پر ابُو سفیان نے بلند آواز سے کہا تھا کہ اگلے سال ہمارا تمہارا مقابلہ میدانِ بدر میں ہوگا۔ چونکہ حضورؐ نے اس چیلنج کو منظور کر لیا تھا اس لیے آپ یکم [۵۳] ذی القعدہ ۴ھ کو حضرت عبد اللہ [۵۴] بن رواحہ کو بطورِ نائب [۵۵] چھوڑ کر) پندرہ سو صحابہ اور دس گھوڑوں کے ساتھ بدر کی طرف روانہ ہو گئے۔ ابو سفیان بھی دو ہزار ہمراہیوں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا لیکن اُسے حملے کی ہمت نہ پڑی اور واپس چلا گیا (تلقیح ص ۲۷) یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ جُوں جُوں دن گزر رہے تھے حضورؐ کی فوجی طاقت بڑھ رہی تھی۔ بدر میں آپ کے پاس صرف دو گھوڑے تھے۔ لیکن بعد کی جنگوں میں ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ جدول یہ ہے:

---

[۵۲] موعد کے معنی ہیں: وعدہ۔ جائے وعدہ اور زمانِ وعدہ۔ چونکہ اُحد میں ابو سفیان نے اگلے سال بدر میں لڑنے کا چیلنج دیا جسے حضورؐ نے منظور فرما لیا تھا۔ اس لیے بدر کے ساتھ الموعد (وعدہ۔ جائے وعدہ۔ زمانِ وعدہ) کا لفظ بڑھا دیا گیا ہے یعنی وُہ بدر جہاں مقابلے کا فیصلہ (وعدہ) ہوا تھا۔ (منجد "وعد")

[۵۳] ابن خلدون (ج ا ص ۱۱۸) کے ہاں یہ سفر شعبان میں ہُوا تھا اور ابن الجوزی (تلقیح ص ۲۷) کے ہاں یکم ذی قعدہ ۴ھ کو۔

[۵۴] عبد اللہ بن رواحہ بن ثعلبہ بن امراء القیس الانصاری ہجرتِ رسُول سے پہلے اسلام لائے اور فتح مکہ کے بعد دیگر تمام مہمات میں شامل ہُوئے۔ غزوۂ موتہ (۸ھ) میں شہادت پائی۔ (استیعاب ج ا ص ۳۴۸)

[۵۵] ابن خلدون (ج ا ص ۱۱۸) لکھتا ہے کہ:

نائب کا نام عبد اللہ بن اُبَیّ بن سلول تھا لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ یہ عبد اللہ رئیس المنافقین تھا اور حضورؐ اسے اس منصب کا اہل نہیں سمجھتے تھے۔

سال	غزوہ	گھوڑوں کی تعداد	بندوں کی تعداد	سال	غزوہ	گھوڑوں کی تعداد	بندوں کی تعداد
۲ھ	بدر	۲	۳۱۳	۸ھ	حنین	۸۰۰	۱۲,۰۰۰
۴ھ	بدرالموعد	۱۰	۱۵۰۰	۹ھ	تبوک	۱۰,۰۰۰	۳۰,۰۰۰
۷ھ	خیبر	۲۰۰	ایضاً	۰	۰	۰	(واٹ ص ۲۵۰)

۲۳۔ غزوۂ ذات الرّقاع[۱۰۷] حضورؐ کو اطلاع ملی کہ نجد میں غطفان کے دو قبیلے ثعلبہ اور انمار مدینے پر حملے کے لیے جمع ہو رہے ہیں آپؐ نے حضرت عثمان بن عفان کو اپنا نائب مقرر کر کے چار سو (یا سات سو) صحابہ کے ساتھ محرم ۵ھ میں کُوچ کیا اور ایک ایسے میدان میں ڈیرے ڈالے جس کے چاروں طرف سُرخ، سفید اور سیاہ رنگ کی پہاڑیاں تھیں اور یُوں نظر آتا تھا گویا رنگ برنگ کپڑے دھوپ میں لٹکے ہُوئے ہیں۔ قبائل منتشر ہو گئے اور حضورؐ لڑے بغیر واپس آ گئے۔
(تلقیح ص ۲۷)

۲۴۔ غزوۂ دُومۃُ الجَندل دُومۃ الجندل کا قصبہ مدینہ سے پانچ سو میل شمال میں اس تجارتی شاہراہ کے قریب واقع تھا جو یمن سے شام تک جاتی تھی۔ چونکہ وہاں کے قبائل مدینہ کے تجارتی قافلوں کے لیے خطرہ بن گئے تھے، اس لیے حضورؐ اُن کی گوشمالی کے لیے ۲۲/۲۴ ربیع الاول ۵ھ کو ایک ہزار صحابہ کے ساتھ مدینہ سے نکلے۔ حضرت سِباع بن عُرفُطہ[۱۰۸] کو اپنا نائب مقرر کیا اور پندرہ دن کے بعد دُومہ میں پہنچے۔ لیکن قبائل منتشر ہو چکے تھے اس لیے واپس آ گئے۔
(تلقیح، ص ۲۷)

۲۵۔ غزوۂ مُرَیسِیع (یا بنی مُصطلِق) مُرَیسیع ایک چشمے کا نام ہے جو مدینہ سے اندازاً سو میل جنوب مغرب میں ساحل کی طرف واقع تھا اس کے نواح میں بنُو خزاعہ کی ایک شاخ بنُو مُصطلق آباد تھی۔ حضورؐ کو اطلاع ملی کہ یہ قبیلہ مدینہ پر حملے کا ارادہ رکھتا ہے۔ آپؐ نے صحابہ کو تیاری کا حکم دے دیا اور حضرت زیدؓ بن حارثہ[۱۰۹] کو نائب مقرر کرنے کے بعد ۲۔ شعبان ۵ھ کو مدینہ سے روانہ ہُوئے۔ وہاں پہنچے تو وُہ لوگ جنگ کے لیے تیار تھے اُن میں سے

---

[۱۰۷] ذات الرقاع کے لفظی معنی ہیں: دھجیوں اور ٹکڑوں والی۔ اس سے مراد غطفان کا وُہ میدان ہے جس کے گرد رنگ برنگ پہاڑیاں تھیں۔ اور جن کی وجہ سے یہ مہم "ذاتُ الرّقاع" کے نام سے مشہور ہو گئی۔

[۱۰۸] حضرت سِباع بن عُرفُطہ کے متعلق حافظ ابن عبدالبر نے صرف اتنا کہا ہے کہ حضورؐ نے دُومۃ الجندل اور خیبر کے سفر کے دوران انہیں مدینہ میں اپنا نائب مقرر کیا تھا اور یہ بڑے صحابہ میں شمار ہوتے تھے۔ (استیعاب ج ۲ ص ۵۶۴)

[۱۰۹] زیدؓ بن حارثہ کے لیے دیکھیے حاشیہ نمبر ۲۹۔

دس مارے گئے، چھ سو اسیر ہوئے۔ اور غنیمت میں دو ہزار اونٹ اور پانچ ہزار بکریاں ہاتھ آئیں۔ اسیروں میں رئیسِ قبیلہ حارث (حرث) بن ابی ضرار کی بیٹی جویریہؓ بھی تھی۔ یہ تقسیم کے وقت حضرت ثابتؓ بن قیس کے حصّے میں آئی۔ جب حضورؐ کو معلوم ہوا کہ یہ سردارِ قبیلہ کی بیٹی ہے تو آپ نے حضرت ثابتؓ کو کچھ رقم دے کر اُسے آزاد کرا لیا اور اسے اپنی زوجیت میں لے لیا۔

اس تصادم میں صرف ایک صحابی شہید ہوا تھا۔ (شبلی، ج ۱ ص ۴۱۲-۴۱۳۔ تلقیح، ص ۲۷۔ ابنِ خلدون، ج ۱، ص ۱۲۸۔ واٹ، ص ۱۳۵)

واقعۂ افک یہ واقعہ اسی غزوہ سے واپسی پر پیش آیا تھا۔ بات یوں ہوئی کہ واپسی پر حضورؐ نے رات کو ایک جگہ قیام فرمایا۔ آدھی رات کے وقت حضرت عائشہؓ رفعِ حاجت کے لیے لشکر گاہ سے باہر گئیں، واپسی پر انہیں محسوس ہوا کہ اُن کا ہار، جو وہ اپنی بہن سے عاریۃً لائی تھیں کہیں گر گیا ہے۔ وہ دوبارہ واپس گئیں تو قافلہ چل دیا اور آپ رہ گئیں۔ آپ لشکر گاہ میں بیٹھ کر انتظار کر رہی تھیں کہ صفوانؓ بن معطل، جس کا کام قافلہ کی گری پڑی اشیا کو سنبھالنا تھا، آ گیا۔ حضرت عائشہؓ کو تنہا دیکھ کر پہلے بلند آواز سے "انا للّٰہ و انا الیہ راجعون" کہا۔ پھر اونٹ کو بٹھایا، حضرت عائشہؓ کو سوار کیا اور مہار پکڑ کر چل دیا۔ جب یہ اپنے قافلے میں پہنچے تو منافقِ اعظم عبداللہ بن اُبَیّ نے حضرت عائشہؓ کو بدنام کرنا شروع کر دیا۔ جب داستانِ افترا سارے مدینے میں پھیل گئی تو حضورؐ نے حضرت عائشہؓ سے کنارہ کر لیا۔ اس پر وہ سخت بے چین بلکہ بیمار رہنے لگیں۔ اور اندازاً ایک ماہ کے بعد وحی نے آپ کی برأت کا اعلان کیا۔ "اِفک" کے معنی ہیں جھوٹ بولنا اور الزام تراشنا۔ (ابنِ خلدون ج ۱۔ ص ۱۳۰)

۲۶۔ غزوۂ احزاب (یا خندق) بنو نضیر مدینہ سے نکل کر خیبر میں پہنچے تو انہوں نے انتقام کی ٹھان لی۔ ان کے رؤسا میں سے حُیَیّ بن اَخطب اور کنانہ بن ربیع قریش کو ساتھ ملانے کے لیے

---

۱۱۰ جویریہؓ بنت حارث بن ابی ضرار غزوۂ مریسیع میں اسیر ہونے سے پہلے مسافع بن صفوان (بروایتے: صفوان بن ملک) کی زوجہ تھیں اور آپ کا نام بَرّہ تھا۔ حضورؐ نے انہیں زوجیت میں لینے کے بعد ان کا نام جویریہ رکھ دیا۔ ۶۵ سال کی عمر میں ۵۶ھ میں وفات پائی۔ (تلقیح۔ ص ۱۱)

۱۱۱ حضرت ثابتؓ بن قیس بن شماس بن ظہیر انصاری پہلے انصار کے خطیب تھے۔ اسلام لانے کے بعد خطیبِ رسولؐ بن گئے۔ اُحُد اور بعد کے غزوات میں شامل ہوئے اور حضرت ابوبکرؓ کے عہدِ خلافت (۱۱-۱۳ھ) میں مسیلمہ کے خلاف لڑتے ہوئے یمامہ میں شہادت پائی۔ (استیعاب ج ۱۔ ص ۷۴)

۱۱۲ حضرت عائشہؓ بنت ابی بکرؓ الصدیق حضورؐ کے نکاح میں ہجرت سے دو برس (اور بروایتے: تین برس) پہلے آئیں۔ اس وقت آپ کی عمر چھ سال تھی نو برس کی عمر میں رخصتی ہوئی۔ حضورؐ کے ساتھ نو سال گزارے۔ ۶۶ سال کی عمر پائی۔ ۱۷ رمضان ۵۸ھ یا ۵۷ھ میں وفات پائی۔ اور جنت البقیع میں مدفون ہوئیں۔

۱۱۳ صفوانؓ بن معطل بن ربیعہ بن خزاعی السُّلَمی الذکوانی غزوۂ مریسیع سے ذرا پہلے اسلام لائے تھے اور بعد ازاں یہ ہر غزوہ میں شامل ہوئے۔ آپ کی وفات میں اختلاف ہے۔ کوئی ۱۹ھ بتاتا ہے، کوئی ۵۸ھ یا ۶۰ھ۔ (استیعاب ج ۱ ص ۲۱۸)

مکہ میں گئے۔ وہ پہلے ہی تیار بیٹھے تھے اس لیے جھٹ مان گئے۔ پھر غطفان، بنو اسد[۱۱۴]، بنوسُلیم، بنو سعد اور چند دیگر قبائل کو ساتھ ملایا۔ اور اس طرح دس ہزار کا لشکر لے کر مدینے کی طرف بڑھے۔

حضورؐ تک یہ خبریں پہنچیں تو آپؐ نے صحابہ سے مشورہ کیا۔ حضرت سلمان[۱۱۵] فارسی نے رائے دی کہ فوج کے لیے ایک موزوں جگہ تجویز کر کے اس کے سامنے خندق کھود دی جائے۔ حضورؐ کو یہ تجویز پسند آئی اور آپ چند صحابہ کے ہمراہ گھوڑے پر سوار ہو کر نکلے۔ مختلف مقامات کا معائنہ فرمانے کے بعد فوج کے لیے ایک موزوں جگہ پسند کی نیز طے ہوا کہ بچوں اور عورتوں کو قلعہ نما مکانات (آطام، آجام) میں منتقل کر دیا جائے۔

شہر کے جنوب مشرق اور مغرب میں پہاڑیاں بھی تھیں اور گھنے باغات بھی۔ ان سے گزرنا مشکل تھا۔ صرف شمال کا رُخ ایسا تھا جہاں سے دشمن بآسانی مدینے پر حملہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس علاقے کی پیمائش کی گئی اور بیس بیس گز کے ٹکڑے دس دس آدمیوں کے حوالے کر دیئے گئے۔ خود حضورؐ بھی کھدائی کیا کرتے تھے۔ تیار ہونے کے بعد یہ خندق ساڑھے تین میل لمبی، کافی چوڑی اور اتنی گہری تھی کہ ایک دفعہ ایک حملہ آور نے کودنے کی کوشش کی تو گر کر مر گیا (طبری ص ۱۴۷۶۔ بحوالہ محمد حمید اللہ ص ۹۷)۔ یہ کھدائی تین ہفتے جاری رہی حضورؐ اُن دنوں اپنا گھر چھوڑ کر خندق کے پاس ایک ٹیلے پر خیمہ لگا کر قیام پذیر ہو گئے تھے۔ شہر کے باقی لوگ از خود اپنے اپنے محلوں کے سامنے خندقیں کھودنے لگے اور اس طرح سارا شہر ایک قلعہ بن گیا۔ جب یہ خندق مکمل ہو گئی تو دشمن بھی آن پہنچا اور اس نے محاصرہ کر لیا۔ محاصرے نے شدت پکڑی تو مدینہ کے بنو قریظہ بھی دشمن کے ساتھ شامل ہو گئے۔ قریش نے ہر چند زور مارا کہ وہ خندق کو عبور کر کے آگے نکلیں لیکن تیر اندازوں نے انہیں کامیاب نہ ہونے دیا۔ البتہ ایک تنگ جگہ سے ایک دفعہ چار قریش سردار پار کود گئے لیکن جھٹ مارے گئے۔ جب محاصرہ طول پکڑ گیا اور قریش کے ذخائر رسد ختم ہونے لگے، ساتھ ہی ایک ایسی آندھی چل پڑی جس سے درخت اُکھڑ گئے اور قریش کا مال و اسباب اُڑ گیا تو وہ گھبرا گئے اور اکیس دن کے بعد واپس چلے گئے۔

قرآن حکیم نے اس واقعہ کا ذکر یوں کیا ہے:

یٰایھا الذین اٰمنوا اذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ جاءتکم جنودٌ فارسلنا علیھم ریحًا و جنودًا لم تروھا وکان اللہ بما تعملون بصیراً۔ (احزاب: ۹)

---

[۱۱۴] اسد، خزیمہ سے تعلق رکھتا تھا۔ سُلیم، غطفان سے اور سعد، عامر بن صعصعہ سے۔ (واٹ۔ ص ۸۱)

[۱۱۵] سلمانؓ۔ ابوعبداللہ۔ فارسی۔ اصلاً خوزستان کے ایک شہر رامہُرمز کے رہنے والے تھے۔ ان کا والد زرتشتی تھا۔ لیکن سلمان عیسائی ہو گئے۔ جب تبدیلِ مذہب کے بعد بھی وہ غیر مطمئن رہے تو صداقت کی تلاش میں ادھر ادھر گھومنے لگے۔ ایک دن بردہ فروشوں نے انہیں پکڑ کر مدینہ کی منڈی میں بیچ ڈالا۔ بعد میں انہیں حضورؐ نے خرید کر آزاد کر دیا۔ حضورؐ ان سے بہت خوش تھے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں مدائن کے گورنر تھے انہیں پانچ ہزار درہم تنخواہ ملتی تھی۔ یہ ساری تنخواہ صدقہ کر دیتے تھے اور اپنی روزی مزدوری سے کماتے تھے۔ (استیعاب ص ۵۵۶۔ کنسائز انسائیکلو پیڈیا آف اسلام ص ۳۶۲)

(اے ایمان والو! اللہ کے اس احسان کو یاد کرو جب تم پر حملہ آور چڑھ آئے تھے اور ہم نے آندھی اور خفیہ لشکر بھیج کر انہیں بھگا دیا تھا۔ بے شک اللہ تمھارے اعمال کو دیکھ رہا ہے)

ابن الجوزی (تلقیح ص ۲۷) لکھتے ہیں کہ خندق کا واقعہ ذی قعدہ ۵ھ میں پیش آیا تھا۔ حضورؐ نے حضرت عبداللہؓ[۱۱۶] بن ام مکتوم کو اپنا نائب مقرر فرمایا تھا۔ مہاجرین کا علم بردار حضرت زیدؓ[۱۱۷] بن حارثہ تھے اور انصار کا حضرت سعدؓ[۱۱۸] بن عبادہ۔ آپ خندق میں پندرہ یوم رہے آپ کے ساتھ تین ہزار صحابہ تھے اور حملہ آوروں کی تعداد دس ہزار تھی۔ (شبلی ج ۱ ص ۴۱۹۔ ابن خلدون ج ۱ ص ۱۲۰۔ عہد نبویؐ کے میدان جنگ ص ۶۰)

۲۷۔ غزوۂ بنو قریظہ بنو قریظہ یہود کا ایک قبیلہ تھا جو مدینہ میں مسجد نبویؐ سے جنوب مشرق کی طرف آباد تھا۔ جنگ احزاب میں یہ لوگ معاہدے کو توڑ کر قریش مکہ کے ساتھ مل گئے تھے اور مسلمانوں کو مٹانے کے لیے میدانِ جنگ میں اُتر آئے تھے۔ جب احزاب واپس چلے گئے تو حضورؐ نے صحابہ سے کہا کہ وہ ہتھیار نہ کھولیں اور سب سے پہلے بنو قریظہ کے فتنے کو ختم کریں۔ چنانچہ ۲۲۔ ذیقعدہ ۵ھ کو آپؐ تین ہزار صحابہ اور ۳۶ گھوڑوں کے ساتھ اُن کے محلے میں گئے اور اُن کا محاصرہ کر لیا۔ پندرہ دن کے بعد وہ چیخ اُٹھے اور حضرت سعدؓ[۱۱۹] بن معاذ کی ثالثی پر آمادہ ہو گئے۔ حضرت سعد قبیلۂ اوس سے تعلق رکھتے تھے۔ اور اوس بنو قریظہ کے حلیف تھے۔ آپ نے یہود کی مقدس کتاب تورات ہی کے مطابق فیصلہ کیا۔ تورات میں درج ذیل ہے:

"... تو اُن کا محاصرہ کر۔ اور جب تیرا خدا تجھ کو اُن پر قبضہ دلا دے تو مردوں کو قتل کرا دے۔ عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا لے۔"

سعد نے اُن کے تمام لڑنے والے مردوں کو قتل اور اطفال و خواتین کو قیدی بنانے کا حکم دے دیا۔ یہ تھی اُن کی غداری، عہد شکنی اور تخریب کاری کی سزا۔ (تلقیح ص ۲۸۔ شبلی ۴۲۳)

۲۸۔ مہم قرطاء قرطا، نجد کے ایک قبیلے عامر بن صعصعہ کی ایک شاخ تھی جو حرمین کے مشرق میں آباد تھی۔ حضورؐ کو اطلاع ملی کہ یہ لوگ مدینہ پر حملہ کرنا چاہتے ہیں تو آپ نے محرم ۶ھ میں حضرت محمدؓ[۱۲۰] بن مسلمہ کو تیس صحابہ کے ہمراہ ان کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ وہ لوگ پہاڑوں کی طرف بھاگ گئے اور صحابہ کچھ مالِ غنیمت لے کر واپس آ گئے۔ (تلقیح ص ۲۸)

۲۹۔ غزوۂ بنو لحیان ہم لکھ چکے ہیں کہ بنو لحیان قبیلہ ہُذیل کی ایک شاخ تھی، جو مدینہ کے جنوب مشرق میں آباد تھی۔ حضورؐ کو اطلاع ملی کہ بنو لحیان کسی شرارت کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔ چنانچہ آپ حضرت عبداللہؓ

---

۱۱۶ دیکھیے حاشیہ نمبر ۶۶ ۔ ۱۱۷ دیکھیے حاشیہ نمبر ۲۹

۱۱۸ دیکھیے حاشیہ نمبر ۳۶ ۔ ۱۱۹ دیکھیے حاشیہ نمبر ۱۷

۱۲۰ ابو عبدالرحمان محمدؓ بن مسلمہ بن سلمہ بن خالد بن عدی بن مجدعہ بن حارثہ بن حارث الانصاری تمام غزوات میں شامل ہوئے۔ آپ فضلائے صحابہ میں شمار ہوتے تھے۔ حضورؐ نے کئی بار آپ کو اپنا نائب مقرر کیا تھا۔ جب مسلمان آپس میں لڑنے لگے تو آپ گوشہ نشین ہو گئے۔ آپ کی وفات ۴۳ھ (یا ۴۶ھ یا ۴۷ھ) میں ہوئی تھی۔ مروان بن حکم نے جو اس وقت امیر مدینہ تھے، جنازہ پڑھایا تھا اور آپ مدینہ میں دفن ہوئے تھے۔ (استیعاب ج ۱ ص ۲۳۱)

بن امِ مکتوم کو اپنا نائب مقرر کر کے دو سو صحابہ اور بیس گھوڑوں کے ساتھ ربیع الاول ۶ھ کو مدینہ سے نکلے۔ وہاں پہنچے تو وُہ سب پہاڑوں کی طرف بھاگ چکے تھے۔ اس لیے آپ ۱۴ دن کے بعد واپس تشریف لے آئے۔ (تلقیح ص ۲۸)

۳۰۔ غزوۂ غابہ غابہ ایک چراگاہ کا نام ہے جو مدینہ سے اندازاً بارہ میل کے فاصلے پر واقع تھی اور جس میں حضورؐ کی اُونٹنیاں چرتی تھیں ایک رات بنو غطفان کی ایک شاخ فزارہ کے سردار عُیینہؓ[۱۲۱] بن حصن نے چالیس سواروں کے ساتھ غابہ پر حملہ کیا اور بیس اونٹنیاں ہانک کر لے گیا۔ ساتھ ہی حضرت ابوذرؓ[۱۲۲] غفاری کے فرزند کو، جو اُسی چراگاہ میں رہتا تھا قتل کر ڈالا۔ حضورؐ کو اطلاع ملی تو پانچ سو (یا سات سو) کی جمعیت لے کر اُن کا پیچھا کیا۔ آپ کے ساتھ آٹھ گھوڑ سوار بھی تھے۔ انہوں نے چوروں کو جا لیا۔ لڑائی ہوئی۔ چار چور مارے گئے اور مسلمانوں میں سے صرف ایک شہید ہُوا۔ انہوں نے دس اونٹنیاں تو پکڑ لیں لیکن باقی دس کو وُہ بھگا لے گئے۔ (دواث ص ۲۴۲۔ تلقیح ص ۲۸)

۳۱۔ عکاشہؓ کی مہم حضورؐ کو اطلاع ملی کہ نجد کا ایک قبیلہ اسد، شرارت پر آمادہ ہے۔ آپ نے حضرت عُکاشہؓ[۱۲۳] بن محصن الاسدی کو ربیع الاول ۶ھ میں چالیس صحابہ کا ایک دستہ دے کر اس کی گوشمالی کے لیے بھیجا۔ جب یہ دستہ ارضِ اسد کے ایک چشمے غمر پر پہنچا تو وہ لوگ منتشر ہو گئے۔ (تلقیح ص ۲۸)

۳۲۔ مہم ذوالقصہ مدینہ سے چوبیس میل دور نجد میں بنو ثعلبہ کا ایک موضع ذوالقصہ کہلاتا تھا۔ حضورؐ کو اطلاع ملی کہ وہاں ثعلبہ کے آدمی حملے کے لیے جمع ہو رہے ہیں چنانچہ آپ نے ربیع الاول ۶ھ میں محمدؓ[۱۲۴] بن مسلمہ کو صرف دس صحابہ کے ہمراہ مقابلے کے لیے بھیجا وہاں ایک سو آدمی اکٹھے ہو گئے اور انہوں نے سب کو مار ڈالا۔ صرف محمدؓ بن مسلمہ بچ کر نکل سکے۔ حضورؐ نے فوراً چالیس صحابہ کا ایک اور دستہ حضرت ابوعبیدہؓ[۱۲۵] بن جراح کی قیادت میں روانہ کیا لیکن وہ لوگ منتشر ہو گئے۔

---

۱۲۱ ابو مالک عُیینہؓ بن حصن بن حُذیفہ بن بدر الفزاری فتح مکہ سے ذرا پہلے اسلام لائے اور غزوۂ مکہ میں شامل ہُوئے۔ اسلام لانے سے پہلے لاف زن، ڈانگ مار اور اکھڑ سمجھے جاتے تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد بھی کسی حد تک اکھڑ رہے۔ ایک مرتبہ اجازت لیے بغیر حضورؐ کے گھر میں داخل ہو گئے اور حضرت عائشہؓ کے متعلق پُوچھنے لگے کہ یہ کون ہے؟ فرمایا: یہ میری زوجہ عائشہ ہے۔ کہنے لگے: کیا آپؐ کو اس سے حسین تر بیوی نہیں مل سکتی تھی؟ حضرت عائشہؓ سخت ناراض ہُوئیں اور پُوچھا یہ کون ہے؟ حضورؐ نے فرمایا: احمقِ مطاعٌ۔ یہ ایک احمق ہے۔ جو اپنی قوم کا لیڈر ہے۔ آپؐ نے حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ سے بھی ایک ایک دفعہ گستاخانہ گفتگو کی تھی۔ (استیعاب ج ۲ ص ۵۱۳)

۱۲۲ ابُوذرؓ جُندب بن جنادہ بن قیس بن عمرو غفاری اسلام لانے والوں میں چوتھے تھے۔ باقی تفاصیل کے لیے دیکھیے حاشیہ نمبر ۱۔

۱۲۳ عکاشہؓ بن محصن بن حرثان بن قیس الاسدی فضلائے صحابہ میں شمار ہوتے تھے۔ بدر سے تبوک تک تمام غزوات میں شامل ہُوئے اور حضورؐ سے ایک سال بعد ۱۲ھ میں مُرتدین کے خلاف لڑتے ہُوئے شہید ہو گئے۔ (استیعاب۔ ج ۲۔ ص ۲۰۸)

۱۲۴ دیکھیے حاشیہ نمبر ۱۲

۱۲۵ ابُوعبیدہؓ عامر بن عبداللہ بن جراح بن ہلال بن اہیب بن ضبہ بن حارث بن فہر القرشی الفہری تمام غزوات میں شامل تھے۔ حبشہ کی طرف ہجرت بھی کی تھی۔ اُحد میں جب ایک کافر عبداللہ بن قمیئہ کی ضربِ شمشیر سے خود کی دو کڑیاں حضورؐ کے چہرۂ مبارک میں چُبھ گئیں۔ (باقی بر صفحہ آئندہ)

دو تین ہفتے بعد ثعلبہ کے چند آدمی اپنے اُونٹوں کو چرانے کے لیے مدینہ کے قریب ایک چراگاہ میں آگئے۔ حضور نے حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو دوبارہ چالیس صحابہ کے ساتھ بھیجا۔ وُہ خود تو بھاگ گئے لیکن ان کے بیشتر مویشی پیچھے رہ گئے جنھیں یہ ہانک لائے۔ (تلقیح ص ۲۸)

۲۳۔ مہم جمُوح (یا جموم) حضور کو اطلاع ملی کہ بنُو سُلیم کسی شرارت کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔ آپ نے ربیع الآخر ۶ھ میں حضرت زید بن حارثہ کو اُن کی گوشمالی کے لیے روانہ کیا۔ یہ لوگ ارضِ بنُو سُلیم کے ایک چشمے جموح (یا جموم) پر پہنچے تو وہاں ایک عورت نے بنوسلیم کے محلے تک اُن کی رہ نمائی کی۔ چنانچہ یہ کچھ قیدی اور مالِ غنیمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ (تلقیح ص ۲۹)

۲۴۔ مہمِ عیص مدینہ میں یہ خبر پہنچی کہ قریش کا ایک تجارتی قافلہ مدینہ سے کوئی پچاس میل مشرق میں ارضِ بنُو سُلیم سے گزرنے والا ہے۔ آپ نے جمادی الاولیٰ ۶ھ میں زید بن حارثہ کو ۱۰۰ سواروں کے ہمراہ اُس کی طرف بھیجا۔ ارضِ سُلیم کے ایک مقام عیص پر قافلہ والوں سے مقابلہ ہُوا اور حضرت زید کامیاب ہُوئے۔ مالِ تجارت میں چاندی کی بہی خاصی مقدار تھی جو بیت المال میں داخل کر دی گئی۔ (تلقیح ص ۲۹)

۲۵۔ مہمِ طَرَف طرَف ایک چشمہ ہے۔ مدینہ سے ۳۶ میل بصرہ (مشرق) کی طرف۔ خبر ملی کہ اس مقام پر کچھ اعراب (دیہاتی جنگلی) حملے کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔ حضور نے جمادی الآخرہ ۶ھ میں حضرت زید بن حارثہ کو ۱۵ صحابہ کے ساتھ بھیجا۔ یہ طَرَف تک گئے۔ لیکن مقابلے میں کوئی نہ آیا۔ (تلقیح ص ۲۹)

۲۶۔ مہمِ حسمیٰ مدینہ میں خبر آئی کہ بنُو جُزام، جو مدینہ سے کوئی تین سو میل شمال میں تیماء کے قریب آباد تھے۔ مدینہ کے قافلوں اور مسافروں کو لُوٹ لیتے ہیں۔ حضور نے جمادی الآخرہ ۶ھ میں حضرت زید بن حارثہ کو پانچ سو کا ایک لشکر دے کر اُس طرف بھیجا۔ وادی القُریٰ[۱۲۶] سے ذرا شمال میں بمقام حِسمیٰ جُزامیوں سے مقابلہ ہُوا۔ انھیں سخت شکست ہُوئی۔ زید کو غنیمت میں ایک سو اسیر، ایک ہزار اُونٹ اور پانچ ہزار بکریاں ملیں۔ (ایضاً ص ۲۹)

۲۷۔ سَریّہ دُومۃ الجندل دُومۃ الجندل شمالی عرب کا ایک سرحدی شہر ہے جس میں بنو کلب آباد تھے۔ جب انھوں نے مدینہ کے قافلوں اور مسافروں کو تنگ کرنا شروع کیا تو حضور نے حضرت عبدالرحمٰن[۱۲۷] بن عوف کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

تو حضرت ابو عبیدہ نے انھیں دانتوں سے کھینچ کر نکالا اور اس کوشش میں آپ کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ حضور نے آپ کو اُمین الملّت کا خطاب دیا تھا۔ حضور کی رحلت کے بعد جب انصار نے اپنا الگ خلیفہ چُن لیا تو صورتِ حال کو سنبھالنے کے لیے حضرت عمر اور ابو عبیدہ نے حضرت کے ہاتھ پر سب سے پہلے بیعت کی تھی۔ آپ شام کے فاتح تھے۔ آپ کی وفات اُردن کے ایک شہر عمواس میں (۱۸ھ) میں ہوئی تھی۔

(استیعاب۔ ج ۲۔ ص ۶۷۰)

[۱۲۶] وادی القریٰ: مدینہ سے ۱۲۵ میل شمال میں فدک اور تیماء کے درمیان ایک آباد وادی۔ (معجم البلدان۔ ج ۸۔ "واد")

[۱۲۷] دیکھیے حاشیہ نمبر ۱۳۔

شعبان ۶ھ میں سات سو صحابہ کے ہمراہ اُن کی طرف بھیجا۔ وہاں پہنچے تو اُن کا امیر اَصْبَغ بن عَمرو الکلبی بہت سے دیگر آدمیوں کے ساتھ مسلمان ہوگیا اور اپنی بیٹی حضرت عبدالرحمٰنؓ کے نکاح میں دے دی۔ (ایضاً ص ۲۹)

۳۸۔ مُہِم فَدَک مدینہ سے اندازاً ایک سو بیس میل شمال میں خیبر اور وادی القُریٰ کے درمیان یہود کی ایک بستی فَدَک کہلاتی تھی۔ اس میں بنُوسعد بن بکر کا قبیلہ بھی آباد تھا۔ اطلاع ملی کہ اِس قبیلہ کے لوگ یہود یانِ خیبر کی امداد کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔ آپؐ نے شعبان ۶ھ میں حضرت علیؓ کو ایک سو صحابہ کے ہمراہ اُس طرف بھیجا۔ یہ لوگ خیبر و فدک کے درمیان ہَمَج نامی ایک چشمے پر جا رُکے۔ وہاں اُس قبیلے سے جنگ ہُوئی۔ وہ خود تو فوراً بھاگ گئے لیکن اُن کے مویشی پیچھے رہ گئے جن میں سے حضرت علیؓ پانچ سو اُونٹ اور دو ہزار بکریاں ہانک لائے۔ (تلقیح ص ۲۹)

۳۹۔ مُہِم ابنِ عَتِیک حضورؐ کو اطلاع ملی کہ خیبر میں یہود کا ایک سردار ابُو رافِع سَلّام بن اَبی الحُقَیق النَّضری مدینہ پر حملے کے ارادے سے ایک لشکر جمع کر رہا ہے۔ حضورؐ نے حضرت عبداللہؓ[۱۲۸] بن عتیک کو چار دیگر صحابہ کے ہمراہ اُس کی طرف بھیجا۔ ان لوگوں نے رات کے وقت ابُورافع کو اُس کے گھر میں داخل ہو کر قتل کر دیا۔ اور بخیریت لوٹ آئے۔ یہ مہم رمضان ۶ھ میں بھیجی گئی تھی۔ (تلقیح ص ۳۰)

۴۰۔ مُہِم عبداللہؓ بن رواحہ جیسا کہ ہم عنوان ۳۸ کے تحت بتا چکے ہیں۔ جب ابو رافع قتل ہوگیا تو یہودِ خیبر نے اُسَیر بن زارِم کو اپنا امیر بنا لیا۔ یہ قبائل غَطَفان کے ہاں امداد کے لیے گیا۔ جب حضورؐ کو یہ اطلاع ملی تو آپؐ نے شوّال ۶ھ میں حضرت عبداللہؓ[۱۲۹] بن رواحہ کو ۳۰ صحابہ کے ساتھ اس کی گوشمالی کے لیے بھیجا۔ عبداللہ نے وہاں پہنچ کر اُسَیر اور اس کے تیس آدمیوں کو قتل کر ڈالا۔ (ایضاً ص ۳۰)

۴۱۔ مُہِم کُرز بن جابر شوّال ۶ھ میں قبیلۂ عُرَینہ[۱۳۰] کے آٹھ آدمی حضورؐ کے پاس مدینہ میں آئے اور اسلام لانے کے بعد مدینہ ہی میں رہنے لگے۔ انہیں مدینہ کی آب و ہوا راس نہ آئی تو حضورؐ نے انہیں مدینہ سے چھ میل دُور قُبا کی جانب ذُوالجَدْر نامی ایک چراگاہ میں بھیج دیا جہاں حضورؐ کی اُونٹنیاں بھی چرتی تھیں۔ چرواہے کا نام یسار تھا۔ یہ حضورؐ کا آزاد کردہ غلام تھا۔ جب وُہ لوگ تندرست ہو گئے تو یسار کی آنکھیں پھوڑنے اور ہاتھ پاؤں کاٹنے کے بعد اُسے قتل کر دیا اور پندرہ اونٹنیاں ہانک کر لے گئے۔ حضورؐ تک یہ المناک اطلاع پہنچی تو آپؐ نے حضرت کُرزؓ[۱۳۱] بن جابر الفہری کو ۲۰ صحابہ کے ہمراہ

۱۲۸؎ عبداللہؓ بن عتیک بن قیس بن اَسْوَد (خزرجی) بدر اور بعض دیگر غزوات میں شامل ہُوئے۔ جنگِ جمل (۳۶ھ) میں حضرت علیؓ کی طرف سے لڑتے ہُوئے شہادت حاصل کی۔ (استیعاب۔ ج ۱۔ ص ۳۷۷)

۱۲۹؎ دیکھیے حاشیہ نمبر ۱۰۵

۱۳۰؎ عُرَینہ نجد کے ایک قبیلے عامر بن صعصعہ کی ایک شاخ تھی۔

۱۳۱؎ یہ وہی کُرز ہیں جو اسلام لانے سے پہلے ایک دفعہ اہل مدینہ کے اونٹ لے گئے تھے۔ دیکھیے عنوان ۶ اور حاشیہ ۱۹۔

اُن کے تعاقب میں بھیجا۔ انہوں نے چوروں کو جا لیا اور حضورؐ نے ان کو سخت سزا دی۔ (طبقات ابن سعد۔ ج ۱۔ ص ۴۳۶۔ تلقیح۔ ص ۳۰)

۴۲۔ **عمروؓ بن اُمیّہ کی مہم** مکہ میں حضورؐ اور اسلام کا بڑا دشمن ابوسفیان تھا۔ یہ مسلمانوں کی تخریب و تباہی کے لیے مسلسل سازشوں میں مصروف رہتا تھا۔ تنگ آکر حضورؐ نے حضرت عمروؓ بن[۱۳۱] اُمیہ اور سلمہؓ[۱۳۲] بن اسلم کو حکم دیا کہ وُہ ابوسفیان کو ختم کرائیں۔ یہ دونوں مکہ میں پہنچے۔ عمرو کعبہ کا طواف کر رہے تھے کہ ابوسفیان نے انہیں دیکھ لیا اور قریش کو خبر کر دی۔ قریش انہیں پکڑنے کے لیے جمع ہُوئے تو یہ دونوں بھاگ نکلے اور نواحِ مکہ میں قریش کے تین آدمیوں کو قتل اور ایک کو گرفتار کرنے کے بعد واپس آ گئے۔ (طبقات۔ ج ۱۔ ص ۴۳۷ اور تلقیح ص ۳۰)

۴۳۔ **غزوہ حُدَیبیہ** حُدَیبیہ ایک کنویں کا نام ہے جو مکہ سے بارہ میل شمال میں واقع تھا۔ جب حضورؐ ذی قعدہ ۶ھ میں تقریباً پندرہ سو صحابہ کے ہمراہ عُمرہ کے لیے روانہ ہُوئے اور قریش تک یہ خبر پہنچی تو انہوں نے خالدؓ[۱۳۳] بن ولید کو دو سو سوار دے کر آگے بھیجا کہ وہ مسلمانوں کو روکے۔ بلدح[۱۳۴] میں فوجیں آمنے سامنے آ گئیں۔ لیکن حضورؐ کترا کر حُدیبیہ کی طرف نکل گئے اور وہاں ڈیرے ڈال دیئے۔ وہاں سے آپؐ نے حضرت خراشؓ[۱۳۵] بن امیہ کو قریش کی طرف یہ پیغام دے کر بھیجا کہ ہم لڑنے کے لیے نہیں بلکہ صرف عُمرہ کے لیے آئے ہیں۔ قریش نے انہیں گرفتار کر لیا۔ پھر آپؐ نے حضرت عثمانؓ کو بھیجا۔ وہ بھی دیر تک نہ لَوٹے تو آپؐ نے تمام صحابہ سے ایک ببول کے درخت کے نیچے سرفروشی کی بیعت لی۔ یہ خبر قریش تک پہنچی تو انہوں نے سہیلؓ[۱۳۶] بن عمرو کو بات چیت کے لیے بھیجا۔ کافی بحث و تمحیص کے بعد طے پایا کہ:

۱۔ مسلمان اس سال واپس چلے جائیں۔

---

[۱۳۱] دیکھئے حاشیہ نمبر ۹۱

[۱۳۲] سلمہؓ بن اسلم بن حریش بن عدی بن مجدعہ بن حارثہ انصاری تمام غزوات میں شامل ہُوئے اور ۱۴ھ میں شہادت پائی۔ (استیعاب ج ۲ ص ۵۶۰)

[۱۳۳] دیکھئے حاشیہ نمبر ۶۰

[۱۳۴] بلدح: مکہ کے مغرب میں ایک وادی۔ (معجم۔ ج ۲۔ ص ۲۶۴)

[۱۳۵] خراشؓ بن اُمیہ بن الفضل الکعبی الخُزاعی حضورؐ کے ہمراہ حدیبیہ اور بعد کے غزوات میں شامل ہُوئے اور خلافت معاویہ (۴۰ - ۶۰ھ) کے دوران وفات پائی۔ (استیعاب۔ ج ۱۔ ص ۱۶۲)

[۱۳۶] سُہیلؓ بن عمرو بن عبدشمس بن عبد ود بن نصر بن مالک القرشی العامری قریش کے ایک معزز سردار تھے نیز فصیح البیان خطیب بھی۔ جب بدر میں اسیر ہُوئے تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ اُس کے سامنے کے دو دانت نکال دیئے جائیں تاکہ اس کی فصاحت ختم ہو جائے۔ حضورؐ نے فرمایا: جانے دو، شاید اس کی فصاحت سے کبھی ہم بھی فائدہ اٹھا سکیں۔ چنانچہ فتنۂ ارتداد میں آپؓ نے لوگوں کو راہِ راست پر لانے کے لیے فصیح و بلیغ خطبے دیئے اور جنگِ یرموک (۱۵ھ) میں وفات پائی۔ (استیعاب۔ ج ۲۔ ص ۵۷۶)

۲ - اگلے سال آئیں اور صرف تین دن قیام کریں۔
۳ - صرف تلواریں لانے کی اجازت ہوگی اور وہ بھی نیام میں ہوں گی۔
۴ - جو مسلمان مکّہ میں مقیم ہیں ان میں سے کسی کو ساتھ نہ لے جائیں اور اگر حضورؐ کا کوئی ساتھی مکّہ میں رہنا چاہے تو اُسے نہ روکیں۔
۵ - اگر اہل مکّہ میں سے کوئی مدینے چلا جائے تو اُسے واپس کر دیا جائے اور اگر کوئی مسلمان مکّہ میں آجائے تو اُسے واپسی کی اجازت نہیں ہوگی۔
۶ - قبائل عرب کو اختیار ہوگا کہ جس کے ساتھ چاہیں معاہدہ کریں فریقین اس کا احترام کریں گے۔

تو یہ تھا معاہدۂ حُدیبیہ۔ جب یہ لکھا جا رہا تھا تو قریش کے نمایندے سُہیل کے فرزند، حضرت ابوجندل[۱۳۸]رضؓ جو اسلام لا چکے تھے اور قریش کے ہاتھوں اذیتیں برداشت کر رہے تھے، کسی طرح رسیوں اور بیڑیوں سمیت بھاگ کر حضورؐ کی خدمت میں جا پہنچے لیکن آپؐ نے انہیں شرائطِ معاہدے کے مطابق لوٹا دیا۔

اس معاہدہ کے بعد مکّہ و مدینہ کے لوگ آپس میں آزادانہ ملنے لگے اور اہلِ مکّہ اہلِ مدینہ کے حُسنِ کردار، حُسنِ معاملہ اور حسنِ صحبت سے متاثر ہونے لگے۔ اس سے اسلام کے خلاف نہ صرف عناد کم ہوگیا بلکہ بے شمار دلوں میں اس سیدھے سادے دین کے لیے محبت بھی پیدا ہوگئی۔ یہ اس محبت کا نتیجہ تھا کہ جب دو سال بعد حضور مکّہ میں داخل ہوئے تو چند گھنٹوں کے اندر اندر سارا مکّہ مسلمان ہوگیا اور غالباً انہی نتائج کی بناء پر اللہ نے اس معاہدے کو فتحِ مبین کہا تھا۔ (طبقات۔ ج ۱۔ ص ۴۳۸۔ تلقیح ص ۲۰۔ شبلی ج ۱۔ ص ۴۴۷)

۴۴ - **غزوۂ خیبر** خیبر یہود کا ایک قلعہ بند شہر تھا مدینہ سے اندازاً سو میل شمال میں۔ بنو نضیر، قُریظہ اور قینقاع کے بیشتر جلاوطن یہود وہیں جا ٹھہرے تھے اور ارد گرد کے قبائل کو مسلمانوں کے خلاف مسلسل بھڑکاتے رہتے تھے۔ جب ان کی شرارتیں ناقابلِ برداشت ہوگئیں تو حضورؐ جُمادی الاولیٰ ۷ھ[۱۳۹] میں سولہ سو صحابہ کے ہمراہ مدینہ سے نکلے۔ ان میں دو سو سوار بھی تھے۔ حضرت سِباعؓ[۱۴۰] بن عُرفُطہ کو اپنا نائب مقرر کیا اور تین عَلَم تیار کرائے۔ عَلَمِ خاص حضرت علیؓ کو دیا۔ دُوسرا حضرت حبابؓ[۱۴۱]

---

[۱۳۸] ابوجندلؓ کا نام تھا عبداللہ بن سہیل بن عمرو۔ جسے اسلام لانے کے بعد باپ نے زنجیروں میں باندھ دیا تھا۔ یہ کسی طرح زنجیریں نکال کر ساحلِ بحر پر چلے گئے اور چند دیگر مسلمانوں کے ساتھ مل کر قریش کے تجارتی قافلوں کو لوٹنے لگے۔ فتح مکّہ کے بعد یہ کام چھوڑ دیا۔ ان کی وفات خلافتِ عمرؓ کے دوران (۱۳-۲۳ھ) ہوئی تھی۔ (استیعاب۔ ج ۲۔ ص ۶۲۲)

[۱۳۹] شبلی کہتے ہیں کہ حضورؐ محرم ۷ھ میں روانہ ہوئے تھے۔ (سیرت۔ ج ۱۔ ص ۴۸۱)۔ ابن خلدون (ج ۱۔ ص ۱۴۹) نے بھی یہی لکھا ہے لیکن قدیم ترین ماخذ طبقات ابن سعد (ج ۱۔ ص ۴۴۴) نیز ابن الجوزی (تلقیح۔ ص ۲۱) نے جمادی الاُولیٰ کو ترجیح دی ہے۔

[۱۴۰] دیکھیے حاشیہ نمبر ۱۰۸

[۱۴۱] 〃 〃 〃 ۵۱

بن مُنذِر کو اور تیسرا سعدؓ[۱۴۱] بن عبادہ کو۔

زخمیوں کی دیکھ بھال کرنے، تیر اٹھانے اور دیگر چھوٹے بڑے کاموں کے لیے کچھ مستورات بھی ساتھ ہولیں۔

خیبر میں کئی قلعے تھے۔ مثلاً سلالم، قموُص، ناعم، نطاۃ، زُبیر، قصُارہ، الوطیح، شق اور مرَبطہ۔ جن کی حفاظت پر بیس ہزار سپاہی متعین تھے۔ ان میں قموص مضبوط ترین تھا۔ اس کا رئیس مرَحَب بن عنُترہؓ تھا۔ سب سے پہلے ناعم فتح ہوا۔ پھر کئی دیگر قلعے۔ لیکن قموص فتح نہ ہوسکا۔ حضورؐ نے یکے بعد دیگرے کئی صحابہ کو اس مہم پر بھیجا لیکن کامیابی نہ ہُوئی۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا: میں کل ایک ایسے شخص کو علَم دوں گا جو ناکام نہیں آئے گا۔ دُوسرے روز حضورؐ نے حضرت علیؓ کو علَم عطا کیا۔ جب حضرت علیؓ قلعہ کے سامنے پہنچے تو مرحب اینٹھتا اور جھُومتا ہُوا سامنے سے نمودار ہُوا اور حضرت علیؓ کی طرف نہایت حقارت سے دیکھ کر کہنے لگا۔ کیا عربوں کی فوج میں تم سے بہتر کوئی آدمی نہیں تھا؟ حضرت علیؓ نے کہا: ذرا سامنے تو آؤ۔ مرحب نے آگے بڑھ کر تلوار کا وار کیا لیکن حضرت علیؓ اُچھل کر ایک طرف کو ہوگئے اور معاً مرحب کے سر پر وُہ ضرب رسید کی کہ تلوار اس کے خود اور کھوپری کو کاٹ کر نچلے جبڑے تک اُتر آئی۔ مرَحب گر گیا۔ اس کی فوج بھاگ نکلی اور پُورے بیس دن کے بعد قموص فتح ہوگیا۔ ساتھ ہی اہل خیبر نے ہتھیار پھینک دیئے حضورؐ نے سالانہ نصف زرعی پیداوار کا لگان عائد کر کے انہیں کامل امن وامان دے دیا۔

خاتمۂ جنگ کے بعد ایک جلاوطن مدینی یہودی سلاّم بن مشکم کی بیوی زینب نے آپؐ کو ایک زہر آلُود بِریاں بکری بھیجی۔ آپؐ نے ذرا سا لقمہ چکھ کر اسے ترک کر دیا، لیکن حضرت بشرؓ[۱۴۲] بن براء چند لُقمے کھا گئے اور ہلاک ہو گئے۔ حضورؐ نے جُرمِ قتل میں زینب کو قتل کر دیا۔

اس جنگ میں شہداء ومقتولین کی تعداد یہ تھی:

شہداء۔ ۱۷ مقتولین (یہود): ۹۳

فتح مکمل ہو چکی تو مہاجرینِ حبشہ میں سے بعض حبشہ سے واپس آگئے اور حضورؐ سے ملنے کے لیے خیبر جا نکلے۔ ان میں حضرت جعفرؓ[۱۴۳] بن ابی طالب بھی شامل تھے۔ آپ ان سے مل کر بہت خوش ہُوئے اور فرمایا کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے کس چیز سے زیادہ خوشی ہُوئی ہے فتح خیبر سے یا جعفر کے آنے سے۔" (تلقیح ص ۳۱، ابنِ خلدون ج۔۱۔ ص ۱۴۹۔ طبقات ج ۱ ص ۴۴۴۔ شبلی ج ۱ ص ۴۷۵)

۴۱۔ مہمِ فدَک

فدک وادی القُرٰی کی ایک بستی تھی۔ یہ وادی خیبر اور تیماء کے درمیان واقع تھی اور بہت سرسبز و شاداب تھی اس بستی میں یہود آباد تھے۔ جب حضورؐ فتح خیبر کے معاً بعد فدَک کی طرف بڑھے تو اُن لوگوں نے لڑے بغیر نصف زرعی پیداوار سالانہ پر صلح کر لی۔ (شبلی ج ۱۔ ص ۵۰۲)

---

[۱۴۱] دیکھیے حاشیہ نمبر ۳۶

[۱۴۲] بِشرؓ بن براء بن معرور انصاری، خزرجی قبیلہ بنُوسلمہ کے سردار تھے۔ آپؓ نے بدر، اُحد، خندق اور خیبر میں حصہ لیا تھا۔ (استیعاب ج ۱ ص ۶۱)

[۱۴۳] ابو عبداللہ جعفرؓ بن ابی طالب (عبد مناف) بن عبدالمُطّلب حضرت علی اور عقیل بھائی تھے، حضرت علی سے دس سال بڑے۔ جعفر سے بڑے عقیل تھے اور عقیل سے بڑے طالب۔ سب کی اَعمار میں دس دس سال کا فرق تھا۔ آپ کی شہادت مُوتہ کی جنگ (۸ھ) میں ہوئی تھی۔ (ایضاً ص ۸)

۴۶ - مہمِ تُربہ
حضورؐ کو اطلاع ملی کہ مکّہ سے چار رات کے فاصلے پر نجران کی طرف ایک مقام تُربہ میں ہوازن (قبیلہ) کے کچھ شوریدہ سر آمادۂ شر ہیں۔ آپؐ نے شعبان ۷ھ میں حضرت عمرؓ کو تیس صحابہ کے ہمراہ اس سمت بھیجا لیکن وہ لوگ بھاگ گئے۔ (طبقات ج ۱ ص ۴۵۸)

۴۷ - مہمِ بنی کلاب
شعبان ۷ھ میں حضرت ابوبکرؓ کو نجد کے ایک قبیلے بنو کلاب کی سرکوبی کے لیے بھیجا گیا۔ آپ نے ان کے شریروں کو سزا دی اور چند قیدی پکڑ لائے۔ (تلقیح ص ۳۱)

۴۸ - مہمِ بشیرؓ بن سعد
شعبان ۷ھ میں حضورؐ نے حضرت بشیرؓ[۱۴۵] بن سعد کو تیس صحابہ کے ہمراہ فدک کے ایک قبیلہ بنو مُرّہ کی گوشمالی کے لیے بھیجا۔ چونکہ وہ تعداد میں بہت زیادہ تھے اس لیے انہوں نے اس دستے کو بہت نقصان پہنچایا۔ حضرت بشیرؓ بن سعد کو سخت زخمی کر دیا اور انہیں ان کے ساتھی اٹھا کر واپس لائے۔
(طبقات۔ ج ۱ - ص ۴۶۰)

۴۹ - مہمِ میفعہ
مَیفَعَہ مدینے سے ۹۶ میل دُور نجد میں ایک مقام تھا جہاں رمضان ۷ھ میں دو قبائل، بنو عُوال اور بنو عبد بن ثعلبہ کے چند شوریدہ سر شرارت کے لیے جمع ہو گئے۔ حضورؐ نے حضرت غالبؓ[۱۴۶] بن عبداللہ کو ایک سو تیس آدمی دے کر اُس طرف بھیجا۔ وہاں جنگ ہوئی اور قبائل کو سخت شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ جنگ کے دوران جب حضرت اُسامہؓ[۱۴۷] بن زید ایک کافر اُسامہ بن نہیک بن مرداس کی طرف تلوار لے کر بڑھے تو اس نے بلند آواز سے کہا: لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ۔ لیکن حضرت اُسامہؓ نے اُسے مار ڈالا۔ جب یہ خبر حضورؐ تک پہنچی تو آپؐ ناراض ہوئے اور فرمایا:

ھَلْ شَقَقْتَ قَلْبَہٗ۔ (کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھا تھا؟)

اس پر اسامہؓ نے توبہ کی اور آیندہ محتاط رہنے کا عہد کیا۔ (تلقیح ص ۳۱ - طبقات ج ۱ ص ۴۶۰)

۵۰ - مہمِ الجناب
الجناب ایک مقام ہے خیبر و وادی القُریٰ کے درمیان (معجم - ج ۳ - ص ۱۴۱)۔ شوال ۷ھ میں حضورؐ کو اطلاع ملی کہ عُیَینہ[۱۴۸] بن حصن، قبیلۂ غطفان کی ایک جمعیت کے ساتھ الجناب میں مقیم ہے۔

---

۱۴۵ بشیرؓ بن سعد بن ثعلبہ بن خلاس بن زید الانصاری ہجرت سے پہلے ایمان لا چکے تھے۔ بدر، اُحد اور بعد کے غزوات میں شامل ہوئے۔ آپ کی وفات خلافتِ ابوبکرؓ کے عہد (۱۱-۱۲ھ) میں ہوئی تھی۔ (استیعاب - ج ۱ - ص ۶۲)

۱۴۶ غالبؓ بن عبداللہ بن مسعر اللیثی حضورؐ کے قابلِ اعتماد صحابی تھے۔ انہیں حضورؐ نے کئی مہمات کا سربراہ مقرر کیا تھا۔ (استیعاب ج ۲ ص ۵۱۶)

۱۴۷ اُسامہ بن زید بن حارثہ بن شراحیل بن کعب الکلبی حضورؐ کے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ کے بیٹے تھے حضورؐ کی وفات کے وقت یہ تقریباً بیس سال کے تھے۔ حضورؐ کی وفات کے بعد وادی القُریٰ میں رہنے لگے۔ کافی عرصے کے بعد مدینے میں آئے اور ۵۸ھ یا ۵۹ھ میں وفات پائی۔ (استیعاب - ج ۱ - ص ۲۹)

۱۴۸ دیکھیے حاشیہ نمبر ۱۲۱۔ یہ وُہی عُیینہ ہے جو ایک مرتبہ حضورؐ کی اُونٹنیاں چرا کر لے گیا تھا۔

اور مدینہ پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ آپؐ نے حضرت بشیرؓ[۱۴۹] بن سعد انصاری کو تین سو آدمی دے کر اُس طرف بھیجا۔ وہ لوگ انہیں دیکھتے ہی بھاگ گئے۔ انہیں صرف دو آدمی اور چند اونٹ ملے جنہیں یہ پکڑ لائے۔ (طبقات ج ۱، ص ۴۶۱)

۵۱ - مہم ابن ابی العوجاء ذوالحجہ ۷ھ میں بنو سلیم کی ایک جمعیت کو منتشر کرنے کے لیے حضورؐ نے حضرت ابن ابی العوجاءؓ[۱۵۰] کو پچاس آدمیوں کے ہمراہ بھیجا۔ وہاں پہنچے تو قبائلیوں نے انہیں گھیر لیا۔ ان میں سے اکثر قتل ہو گئے اور ابن ابی العوجاء سخت زخمی ہوئے (طبقات - ج ۱ - ص ۴۶۵)

۵۲ - مہم کدید کدید[۱۵۱] حجاز میں ایک مقام ہے جہاں صفر ۸ھ میں بنو ملوّح کے چند آدمی برائے شرارت جمع ہوگئے تھے حضورؐ نے حضرت غالبؓ[۱۵۲] بن عبداللہ لیثی کو دس صحابہ کے ساتھ بھیجا۔ ان لوگوں نے رات کے وقت ان پر حملہ کیا اور اُن کے مویشی ہانک لائے۔ (طبقات ج ۱ ص ۴۶۷)

۵۳ - مہم بنو مرّہ ہم عنوان نمبر ۴۸ میں بیان کر چکے ہیں کہ شعبان ۷ھ میں فدک کے بنو مرّہ نے حضرت بشیرؓ[۱۵۳] بن سعد انصاری اور اُن کے ساتھیوں کو سخت نقصان پہنچایا تھا انہیں سزا دینے کے لیے حضورؐ نے صفر ۸ھ میں حضرت غالبؓ بن عبداللہ لیثی کو دو سو صحابہ کے ہمراہ اُس طرف بھیجا۔ تصادم میں اُن کے چند آدمی مارے گئے اور یہ کچھ مال غنیمت لے کر واپس آگئے۔ (ایضاً - ص ۴۶۸)

۵۴ - مہم سیّ سیّ[۱۵۴] ایک کنویں یا چشمے کا نام ہے جو مدینہ سے پانچ منزل دور، مکہ و بصرہ کی راہ پر نجد میں واقع تھا۔ وہاں قبیلۂ ہوازن کے چند آدمی فتنہ کاری کے لیے جمع ہوگئے۔ حضورؐ نے حضرت شجاعؓ[۱۵۵] بن ابی وہب الاسدی کو چوبیس آدمی دے کر بھیجا۔ وہ لوگ مقابلے میں نہ آئے اور یہ غنیمت لے کر لوٹ آئے۔ (ایضاً ص ۴۶۸)

---

۱۴۹ دیکھئے حاشیہ نمبر ۱۴۵

۱۵۰ ابن ابی العوجاءؓ کا ذکر صاحبِ استیعاب نے نہیں کیا۔ ابن الجوزی نے صرف اتنا کہا ہے (تلقیح، ص ۲۲) اسمہٗ اخرم کہ اُن کا نام اخرم تھا اور اخرم کے متعلق استیعاب (ج ۱ ص ۴۸) نے اتنا ہی لکھا ہے کہ یہ حضورؐ کا شاہ سوار تھا۔

۱۵۱ یاقوت، معجم البلدان - ج ۷ - ص ۲۲۴

۱۵۲ دیکھیے حاشیہ نمبر ۱۴۶

۱۵۳ " " ۱۴۵

۱۵۴ یاقوت، معجم البلدان - ج ۵ - ص ۲۰۲

۱۵۵ شجاعؓ بن ابی وہب بن ربیعہ بن اسد بن صہیب الاسدی ہجرت سے پہلے اسلام لائے تھے۔ تمام غزوات میں شامل ہوئے حبشہ کی طرف بھی ہجرت کی تھی۔ جنگِ یمامہ میں شہادت پائی۔

(استیعاب - ج ۲ - ص ۵۹۳)

۵۵۔ مہمِ کعبؓ بن عُمیر حضورؐ نے ربیع الاول ۸ھ میں حضرت کعبؓ[156] بن عُمیرؓ غفاری کو پندرہ صحابہ کے ہمراہ ذات اطلاح[157] میں تبلیغ کے لیے بھیجا۔ اُن لوگوں نے ان پر حملہ کر دیا اور سب کو مار ڈالا۔ صرف ایک زخمی کسی طرح مدینے میں واپس پہنچا۔ (طبقات۔ ج ۱۔ ص ۴۶۹)

۵۶۔ مہمِ مُوتہ مُوتہ جنوبی اردن کا ایک سرحدی شہر ہے۔ بات یوں ہُوئی کہ حضورؐ نے جمادی الاولیٰ ۸ھ میں حضرت حارثؓ[158] بن عُمیر ازدی کو ایک تبلیغی خط دے کر بُصریٰ (شام) کے والی کی طرف بھیجا۔ جب قاصد موتہ میں پہنچا تو اسے قبیلۂ غسّان کے سردار شُرحبیل بن عَمرو الغسانی نے قتل کر دیا۔ اِس پر حضورؐ نے ایک مہم ترتیب دی۔ جو تین ہزار غازیوں پر مشتمل تھی۔ حضرت زیدؓ[159] بن حارثہ کو امیر مقرر کیا اور ہدایت فرمائی کہ اگر زید شہید ہو جائے تو حضرت جعفرؓ[160] بن ابی طالب اور اُن کے بعد حضرت عبد اللہؓ[161] بن رواحہ امیر ہوں۔ اگر یہ بھی شہید ہو جائیں تو مسلمان خود ہی اپنا امیر منتخب کریں۔ جب یہ مہم وہاں پہنچی تو بہت سے صحابہ اور تینوں امیر شہید ہو گئے اور جب باقیماندہ لوگ مدینہ میں واپس آئے تو لوگوں نے اُن پر مٹی اچھالی۔ (تلقیح۔ ص ۳۲)

۵۷۔ مہمِ ذات السّلاسِل مدینہ میں یہ خبر آئی کہ وادی القُریٰ میں، جو مدینہ سے دس یوم کی مسافت پر واقع تھی۔ بنو قضاعہ کے کچھ لوگ فتنہ پردازی کے لیے اکٹھے ہو گئے ہیں۔ حضورؐ نے جمادی الآخرہ ۸ھ میں حضرت عَمروؓ[162] بن عاص کو تین سو صحابہ کے ہمراہ اس سمت بھیجا وہاں پہنچ کر انہوں نے اطلاع دی کہ قبائلیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس لیے کمک بھیجی جائے۔ آنحضرتؐ نے حضرت ابو عبیدہؓ[163] بن جرّاح کو دو سو آدمی دے کر ان کی مدد کے لیے بھیجا۔ کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے اپنے آپ کو زنجیروں سے باندھ لیا تھا تاکہ جم کر لڑ سکیں اور بھاگنے کی راہیں بند ہو جائیں۔ اسی بنا پر اس مہم کو ذات السلاسِل (زنجیروں والی) کہتے ہیں۔ ان تمام انتظامات کے باوجود قبائل کو شکست ہُوئی۔ (طبقات۔ ج ۱۔ ص ۴۷۲۔ تلقیح۔ ص ۳۲)

۱۵۶؎ کعبؓ بن عُمیر غفاری اعاظم صحابہ میں سے تھے آپ کو حضورؐ نے کئی مہمات پر بھیجا تھا۔ آپ ذات اطلاح کی مہم (۸ھ) میں شہید ہو گئے تھے۔ (استیعاب۔ ج ۱۔ ص ۲۱۷)

۱۵۷؎ ذات اطلاح ایک موضع کا نام ہے وادی القریٰ کے قریب۔ (یاقوت۔ معجم ج ۱۔ ص ۲۸۷)

۱۵۸؎ حضرت حارثؓ بن عُمیر ازدی کو حضورؐ نے اپنا قاصد بنا کر والیٔ بُصریٰ کی طرف بھیجا تھا۔ جب یہ موتہ میں پہنچے تو قبیلۂ غسّان کے سردار شُرحبیل نے انہیں ایک سرائے میں ٹھہرایا اور بعد ازاں انہیں قتل کر دیا۔ (استیعاب ج ۱۔ ص ۱۱۴)

۱۵۹؎ دیکھیے حاشیہ نمبر ۴۹

۱۶۰؎ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ۱۴۴

۱۶۱؎ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ۱۰۵

۱۶۲؎ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ۱۴

۱۶۳؎ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ۱۲۵

۵۸ - مہم خَبَط خَبَط کے دو مفہوم ہیں۔ اوّل: درختوں کے سُوکھے پتّے۔ دوم: مدینہ سے پانچ دن کی مسافت پر شمال مغرب کی طرف ساحل کے قریب قبیلۂ جُہَینَہ کا ایک موضع۔

رجب ۸ھ میں حضورؐ نے حضرت عبیدہؓ بن جراح کو مدینہ سے پانچ دن کی مسافت پر ساحل کی طرف بھیجا۔ جہاں سے جُہَینہ کی شرارتوں کی اطلاعات آ رہی تھیں۔ اتفاقاً سفر میں ان کا راشن ختم ہو گیا اور انہیں سُوکھے پتّوں پر گزارہ کرنا پڑا۔ جب یہ ساحل پر پہنچے تو سمندر کی لہریں لپٹی ہُوئی ایک بڑی مچھلی خشکی پر رہ گئی اور انہوں نے اسے گھیر کو پکڑ لیا۔ پھر جہینہ کا رُخ کیا۔ وہ لوگ بھاگ گئے اور صحابہ واپس آ گئے۔ (طبقات ج ۱۔ ص ۴۷۳)

۵۹ - مہم خُضرہ نجد میں قبیلۂ بنُو محارب کے ایک موضع کا نام خُضرہ ہے۔ شعبان ۸ھ میں حضورؐ نے بنُو محارب کی گوشمالی کے لیے حضرت ابوقتادہؓ[۴۱۲] بن ربعی انصاری کو خُضرہ کی طرف بھیجا۔ انہوں نے مقابلہ کیا اور شکست کھائی۔ صحابہ اتنا مالِ غنیمت ساتھ لائے کہ خُمس نکالنے کے بعد بھی ہر ایک کو بارہ بارہ اُونٹ ملے۔ (ایضاً ص ۴۷۲)

۶۰ - فتح مکّہ بنو خزاعہ مکّہ و مدینہ کے درمیان بدر کے قریب آباد تھے اور مسلمانوں کے حلیف تھے۔ معاہدہ حدیبیہ کے مطابق قبائل عرب کو پوری پوری آزادی تھی کہ جس کے ساتھ چاہیں، معاہدہ کریں۔ فریقین اس کا احترام کریں گے۔ لیکن قریش نے اس شرط کو توڑ دیا اور نجد کے ایک قبیلے بنو بکر کے ساتھ مل کر حضورؐ کے حلیف بنو خزاعہ پر حملہ کر دیا۔ ان لوگوں نے بھاگ کر حرم میں پناہ لی۔ لیکن حملہ آوروں نے انہیں وہاں بھی معاف نہ کیا۔ اس پر خُزاعہ کے چند آدمی حضورؐ کے ہاں مدینہ میں گئے۔ حضورؐ نے بات سُن کر قریش کو پیغام بھیجا کہ مقتولوں کا خوں بہا ادا کرو لیکن قریش نے انکار کر دیا۔ اس پر حضورؐ ۱۰ رمضان ۸ھ کو دس ہزار صحابہ کے ہمراہ مدینہ سے نکلے۔ جب مکّہ کے قریب مَرّ الظہران میں پڑاؤ ڈالا تو ابُو سفیان رات کے وقت چند دیگر آدمیوں کے ساتھ جائزہ لینے کے لیے مَرّ الظہران میں گیا۔ کسی فوجی نے اسے دیکھ لیا اور پکڑ کر حضورؐ کے ہاں لے گیا۔ وہاں پہنچ کر ابُوسفیان فوراً اسلام لے آیا۔ ۲۰ رمضان کو صبح کے وقت لشکرِ اسلام مکّہ کی طرف روانہ ہوا۔ ہر قبیلے کا عَلم جدا تھا۔ عَلمِ نبویؐ حضرت زُبیرؓ بن عوام کے پاس تھا۔ حسب الحکم مختلف دروازوں سے شہر میں داخل ہُوئے۔ آں حضرتؐ نے اعلان فرمایا کہ جو شخص اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے گا یا ابوسفیانؓ کے گھر میں داخل ہو جائے گا اُسے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا تاہم خالد بن ولید ایک دستہ لے کر مقابلے میں آ گیا۔ ۱۳ لاشیں چھوڑ کر جلد بھاگ نکلا۔ صحابہ میں سے تین شہید ہوئے تھوڑی دیر میں سارے شہر نے اطاعت قبول کر لی۔ حضورؐ نے عام معافی کا اعلان کر دیا۔ پھر اپنی سواری پر بیت اللہ کا طواف کیا۔ اُس وقت حرم میں ۳۶۰ بُت رکھے ہُوئے تھے۔ آپ جب کسی بُت کے پاس سے گزرتے تو عصا سے اُسے ٹھوکا دے کر پڑھتے: قُل جاء الحق وزھق الباطل۔ ساتھ ہی ایک غیبی ہاتھ کی ضرب سے وہ اُوندھا پڑ جاتا۔ جب ظُہر کا وقت آیا تو حضرت بلالؓ نے اذان دی۔ بقول ابنِ سعد (ج ۱۔ ص ۴۷۸) یہ کعبہ میں پہلی اذان تھی۔ پھر شہر میں منادی کرائی کہ ہر شخص اپنے گھر کے بتوں کو توڑ ڈالے۔ ساتھ ہی گرد و نواح کے اصنام مثلاً عزّیٰ، منات، لات، سواع وغیرہ کو توڑنے کے لیے مہمات بھیجیں۔

---

[۴۱۲] ابُوقتادہؓ بن ربعی بن بلدمہ انصاری تمام غزوات میں موجود تھے۔ ۵۴ھ میں وفات پائی۔ (استیعاب۔ ج ۲۔ ص ۶۸۴)

مکہ ۲۰ رمضان ۸ھ کو فتح ہوا تھا۔ بعد از فتح حضورؐ پندرہ دن اور وہاں رہے۔ پھر حضرت عتابؓ[۱۶۵] بن اُسید کو عامل مکہ بنا کر واپس تشریف لے گئے۔ (طبقات ج ۱۔ ص ۴۴،۴۲۔ تلقیح ص ۲۲۔ شبلی ج ۱۔ ص ۵۰۹)

۶۱۔ عُزّٰی کی تباہی عزّٰی دراصل نخلہ[۱۶۶] میں ایک درخت کا نام تھا جس کے نیچے ایک بُت رکھا ہوا تھا جو لات و منات کے بعد تراشا گیا تھا۔ اس درخت کی مناسبت سے یہ بھی عُزّٰی کہلانے لگا تھا۔ فتح مکہ سے پانچ دن بعد حضورؐ نے حضرت خالدؓ بن ولید کو تیس سوار دے کر ہدایت فرمائی کہ وہ اس بُت کو توڑ آئے اور آپ نے تعمیل کی۔ (تلقیح۔ ص ۲۲، طبقات ص ۴۸،۴ ، اصفہانی ، کتاب الاغانی ج ۲ ص ۱۲)

۶۲۔ سُواع کی تباہی سُواع۔ قبیلہ ہُذیل کا بُت تھا جو مکہ سے تین میل دور ایک مقام رُہاط میں نصب تھا۔ حضورؐ نے فتح مکہ کے بعد حضرت عمروؓ بن عاص کو حکم دیا کہ وہ اس بُت کو گرا دیں اور انہوں نے تعمیل کی۔ (تلقیح۔ ص ۲۴)

۶۳۔ مناۃ کی تباہی مناۃ۔ اوس، خزرج اور غسان کا صنم تھا جو مکہ کے شمال میں ایک مقام مُشلّل میں نصب تھا۔ حضورؐ نے فتح مکہ کے بعد حضرت سعدؓ[۱۶۷] بن زید اشہلی کو حکم دیا کہ وہ اُسے جا کر توڑ آئے۔ سعد نے تعمیل کی۔ سعدؓ کے ہمراہ بیس سوار تھے۔ (تلقیح ص ۲۴)

۶۴۔ غزوۂ حُنین حنین ایک وادی کا نام ہے جو مکہ سے تین دن کی مسافت پر شمال میں واقع ہے۔ اس کے نواح میں ثقیف و ہوازن آباد تھے۔ جب حضورؐ ۶ شوال ۸ھ کو بارہ ہزار مجاہدین (ان میں دس ہزار اہل مدینہ تھے اور دو ہزار اہل مکہ) کے ہمراہ مکہ سے روانہ ہوئے تو ۱۰ شوال کو وادی حنین میں پہنچے وہاں ثقیف و ہوازن[۱۶۸] ہزاروں کی تعداد میں پہلے ہی سے مقیم تھے۔ اُن کی قیادت مالکؓ[۱۶۹] بن عوف کے ہاتھ میں تھی۔ ان لوگوں نے وہاں پہنچ کر تمام موزوں مقامات پر قبضہ کر لیا تھا اور تیر اندازوں کے دستے گھاٹیوں میں جا بجا جما دیئے تھے۔ جب ۱۱ شوال کی صبح طلوع ہوئی اور صحابہ کی صفیں دشمن کی طرف بڑھیں تو سامنے سے ہزاروں جوان ٹوٹ پڑے۔ تیروں کا مینہ برسنے لگا اور یہ حملہ اتنا اچانک اور شدید تھا کہ صحابہ ادھر ادھر

۱۶۵؎ عتابؓ بن اُسید بن ابی العیص بن اُمیہ بن عبد شمس القرشی فتح مکہ کے دن اسلام لائے تھے۔ آپ کو حضورؐ نے مکہ سے جاتے وقت عامل مکہ بنا دیا تھا۔ عتابؓ اس منصب پر حضورؐ کی رحلت تک فائز رہے اور ۱۳ھ میں وفات پائی۔ (استیعاب۔ ج ۲۔ ص ۵۰۸)

۱۶۶؎ مکہ سے دس میل کے فاصلے پر ایک باغ جو بُستانِ عامر کے نام سے مشہور تھا۔ (معجم۔ ج ۸۔ "نخلہ")

۱۶۷؎ سعدؓ بن زید بن مالک بن عبید بن کعب بن عبدالاشہل انصاری اشہلی بدر اور بعد کے غزوات میں شامل تھے۔ (استیعاب ج ۲ ص ۵۰۳)

۱۶۸؎ واٹ (ص ۷۰) لکھتا ہے کہ قبائلیوں کی تعداد بیس ہزار تھی۔

۱۶۹؎ مالکؓ بن عوف بن سعد بن ربیعہ بن یربوع النصری حنین کی جنگ کے فوراً بعد مسلمان ہو گئے تھے اور حضورؐ نے انہیں بھی مالِ غنیمت سے ایک سو اُونٹ دیئے تھے۔ یہ شاعر بھی تھے اور حضورؐ نے انہیں اپنی قوم کا سردار بنا دیا تھا۔ (استیعاب ج ۱۔ ص ۲۴۷)

بھاگ نکلے اور حضورؐ کے پاس صرف سات صحابہ رہ گئے یعنی حضرت عباسؓ[170]، حضرت علیؓ، حضرت فضلؓ[171] بن عباس، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت اسامہؓ[172] بن زید اور حضرت ربیعہؓ[173] بن حارث بن عبد المطلب۔ حضورؐ نے دائیں اور بائیں طرف دیکھ کر زور سے آواز دی یامعشر الانصار انا ابن عبد المطلب۔ انا النبی لاکذب۔ (اے انصار میں عبد المطلب کا فرزند اور بلاریب نبی ہوں) حضرت عباسؓ نے بھی لوگوں کو آواز دی۔ چنانچہ وہ سب لوٹ کر دشمن پر ٹوٹ پڑے اور اس شجاعت و بے جگری سے لڑے کہ دشمن گھبرا کر بھاگ نکلا اور ستر لاشیں میدان میں چھوڑ گیا۔ صحابہ میں سے صرف چار نے شہادت پائی۔ اسیروں کی تعداد ۶ ہزار تک جا پہنچی۔ مالِ غنیمت میں ۲۴ ہزار اونٹ، ۴۰ ہزار بکریاں اور چار ہزار اوقیہ چاندی آئی۔ حضورؐ نے تالیفِ قلوب کے لیے سردارانِ قریش پر خاص نوازش کی۔ ابوسفیان کو ۳۰۰، حکیم بن حزام کو ۲۰۰، صفوان بن امیہ اور چند دیگر کو ایک ایک سو اونٹ دیئے۔ دوسری طرف انصار میں سے ہر ایک کو چار چار اونٹ ملے۔ اس پر انصار کو رنج ہوا۔ جب یہ اطلاع حضورؐ تک پہنچی تو آپؐ نے سب انصار کو طلب فرمایا۔ ایک نہایت موثر اور دل ہلا دینے والا خطبہ دینے کے بعد پوچھا:

"اے انصار! کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے کر گھر جائیں اور تم محمدؐ کو لے کر واپس پہنچو۔"

انصار بے اختیار بول اٹھے کہ ہم اس تقسیم پر بہت خوش ہیں اور اکثر کا یہ حال تھا کہ روتے روتے اُن کی ڈاڑھیاں بھیگ گئیں۔

اس کے بعد قبائل کا ایک وفد قیدیوں کی رہائی کے لیے آیا اور رحمۃ للعالمینؐ نے سب کو چھوڑ دیا۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

(تلقیح۔ ص ، ۔ طبقات ج ۱۔ ص ۸۰۴۔ شبلی۔ ج ۱۔ ص ۵۳۰۔ واٹ ص ۷۰)

۶۵۔ غزوۂ طائف طائف۔ مکہ کے مشرق میں چالیس میل دور ایک سبز و شاداب مقام ہے جہاں وادیٔ حنین کے بھگوڑے جمع ہو گئے تھے۔ حضورؐ نے حنین سے فارغ ہو کر شوال ہی میں طائف کا محاصرہ کر لیا۔ لوگ قلعہ بند ہو کر چھتوں پر سے تیر برسانے لگے۔ جن سے بارہ صحابہ شہید ہو گئے۔ محاصرہ اٹھارہ دن جاری رہا چونکہ طویل سفر اور دو مہمات (مکہ و حنین) کی وجہ سے صحابہ اُکتا گئے تھے۔ اس لیے حضورؐ نے محاصرہ اٹھا لیا اور واپس چل دیئے۔ دو ماہ اور سولہ دن کے بعد آں حضرتؐ مدینہ میں تشریف لائے۔ (تلقیح ص ۳۵)

۶۶۔ مہم بنو تمیم تمیم عرب کا ایک اہم قبیلہ تھا جو خلیج ایران کے مغربی ساحل پر کویت کے قریب آباد تھا۔ حضورؐ کو اطلاع ملی کہ یہ قبیلہ حملے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ آپؐ نے حضرت عیینہؓ[174] بن حصن الفزاری کو پچاس سواروں کے ہمراہ

---

[170] دیکھیے حاشیہ نمبر ۵۳

[171] فضلؓ بن عباس بن عبد المطلب حنین اور آخری حج میں حضورؐ کے ساتھ تھے۔ وفات ۱۳ھ یا ۱۸ھ میں ہوئی۔ (استیعاب ج ۲ ص ۵۲۱)

[172] دیکھیے حاشیہ نمبر ۱۴۷

[173] ربیعہؓ بن حارث بن عبد المطلب، حضرت عباسؓ کے بھتیجے تھے۔ فاروق اعظمؓ کی خلافت کے آخری سال یعنی ۲۳ھ میں وفات پائی۔ فتح مکہ کے دن جب حضورؐ نے یہ اعلان فرمایا کہ جاہلیت کے خون آج سے معاف ہیں تو آپؐ نے ربیعہ بن حارث کی طرف سے یہ اعلان کیا تھا کہ ربیعہؓ کے بیٹے تمام (یا ایاس) کا بدلہ نہیں لیا جائے گا۔ (استیعاب۔ ج ۱۔ ص ۱۷۸)۔ [174] دیکھیے حاشیہ نمبر ۱۲۱۔

جو خالص اعراب تھے اور اُن میں کوئی مہاجر یا انصاری شامل نہ تھا اس سمت روانہ کیا۔ وہاں سے یہ گیارہ مرد، گیارہ عورتیں اور تیس بچے گرفتار کر لائے۔ پیچھے پیچھے رؤسائے تمیم کا ایک وفد بھی آن پہنچا۔ حضورؐ نے اُن کی درخواست منظور فرما کر تمام قیدی چھوڑ دیئے۔ یہ واقعہ محرم ۹ھ میں پیش آیا تھا۔ (طبقات۔ ج ۱ ص ۴۹۹)

۶۷۔ مہمّ قُطبہ بن عامر مدینہ میں اطلاع آئی کہ بنو خثعم جو مکہ کے شمال میں دو یوم کی مسافت پر وادی بیشہ کے قریب رہتے تھے آمادۂ فساد ہیں۔ حضورؐ نے صفر ۹ھ میں حضرت قُطبہؓ[۱۷۵] بن عامر کو بیس آدمی دے کر اس طرف روانہ کیا۔ وہاں شدید مقابلہ ہوا اور حضرت قُطبہؓ کافی مالِ غنیمت کے ساتھ واپس آئے۔ (تلقیح ص ۳۵)

۶۸۔ مہمّ بنی کلاب بنو کلاب نجد میں رہتے تھے۔ ان کے متعلق خبر ملی کہ یہ حملے کی تیاری کر رہے ہیں۔ حضورؐ نے ربیع الاوّل ۹ھ میں حضرت ضحاکؓ[۱۷۶] بن سفیان کو اُن کی طرف بھیجا اور انہیں سخت شکست ہوئی۔ (طبقات ج ۱ ص ۵۰۱)

۶۹۔ مہمّ علقمہ ربیع الآخر ۹ھ میں حبشہ کے کچھ آدمی جدہ میں آ کر قانون شکنی کرنے لگے۔ حضورؐ نے علقمہؓ بن مُجزِّز المُدلِجی کو تین سو آدمیوں کا ایک دستہ دے کر اس سمت بھیجا لیکن وہ لوگ انہیں دیکھتے ہی بھاگ گئے۔ (طبقات۔ ج ۱۔ ص ۵۰۱)

۷۰۔ مہمّ الفُلس اُلفُلس قبیلۂ طے کا بُت تھا اور یہ قبیلہ مدینہ سے اندازاً سو میل شمال مشرق میں آباد تھا۔ حضورؐ نے ربیع الآخر ۹ھ میں حضرت علیؓ کو ڈیڑھ سو سواروں کے ہمراہ اس طرف بھیجا۔ یہ بُت مشہور حاتم (کریم و فیاض) کے محلّے میں نصب تھا۔ ان لوگوں نے مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی۔ غنیمت میں کچھ مویشی اور قیدی آئے۔ ان میں حاتم کی بیٹی بھی شامل تھی۔ روایات میں ہے کہ جب حاتم کی بیٹی حضورؐ کے سامنے لائی گئی تو آپؐ نے اس کی طرف اپنی ردا پھینکی تاکہ وہ معزز خواتین کی طرح سارے جسم کو ڈھانپ سکے۔ غنیمت میں تین تلواریں بھی تھیں جو حضورؐ نے لے لیں۔ یعنی رُسُوب، مِخذَم اور یمانی۔ اور آلِ حاتم کو رہا کر دیا۔ (تلقیح۔ ص ۳۵، طبقات۔ ج ۱۔ ص ۵۰۲)

۷۱۔ غزوۂ تبوک تبوک۔ شمالی عرب کا ایک شہر ہے۔ مدینہ سے ساڑھے تین سو میل دُور اور خلیج عقبہ سے ایک سو میل مشرق میں۔ جب شامی تاجروں نے مدینے میں آ کر یہ بتایا کہ رُومی فوجیں عرب کی شمالی سرحد پر جمع ہو رہی ہیں تو حضورؐ نے جہاد کی تیاری کا حکم دے دیا۔ چونکہ سفر بہت طویل اور موسم گرم تھا اس لیے آپؐ نے ہر شخص سے کہا کہ وہ سواری کا انتظام کرے۔ ابن خلدون (ج ۱۔ ص ۱۷۷) لکھتا ہے کہ اس غزوہ میں حضرت عثمانؓ نے سب سے زیادہ مال و اسباب دیا تھا۔

۱۷۵؎ قُطبہؓ بن عامر بن حدیدۃ بن عمرو بن سواد انصاری عقبۂ اولیٰ و ثانیہ نیز تمام غزوات میں شامل ہوئے۔ اُحد میں نو زخم کھائے تھے۔ ۲۳ھ اور ۳۵ھ کے درمیان وفات پائی۔ (استیعاب۔ ج ۲۔ ص ۵۳۲)

۱۷۶؎ ضحاکؓ بن سُفیان بن عوف بن کعب بن ابی بکر بن کلاب الکلبی شجاعانِ عرب میں شمار ہوتے تھے اور محفل میں حضورؐ کے سر پر تلوار سونت کر کھڑے ہوتے تھے۔ (استیعاب ج ۱۔ ص ۳۲۳)

آپ نے ایک ہزار دینار، ایک سو گھوڑے اور نوسو اونٹ پیش کیے تھے۔ حضورؐ ماہ رجب ۹ھ میں تیس ہزار مجاہدین اور دس ہزار گھوڑوں کے ہمراہ مدینہ سے روانہ ہُوئے۔ تیرہ چودہ دن کے بعد تبوک میں پہنچے وہاں بیس دن رہے لیکن رومی فوج سامنے نہ آئی اس لیے آپ واپس چل پڑے اور دو ماہ کے بعد رمضان ۹ھ میں مدینے پہنچ گئے۔ (تلقیح ص ۳۶ - ابن سعد ج ا۔ ص ۵۰۲)

۷۲۔ مہم یمن حضورؐ نے حضرت علیؓ کو تین سو سواروں کے ہمراہ یمن میں تبلیغ اسلام کے لیے بھیجا اور ہدایت کی کہ جب تک وہ لوگ تم پر حملہ آور نہ ہوں تم اُن سے جنگ نہ کرو۔ وہاں پہنچ کر جب حضرت علیؓ نے اسلام پیش کیا تو انہوں نے تیر اور پتھر برسانے شروع کر دیئے۔ اس پر جنگ چھڑ گئی اور بیس یمنی ہلاک ہو گئے لیکن اس واقعہ کے بعد ان لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔

(ابنِ سعد، ج ا، ص ۵۰۰)

۷۳۔ آخری حج حضورؐ ذی قعدہ ۱۰ھ میں حج کے لیے روانہ ہُوئے۔ آپؐ کے ہمراہ تمام ازواج مطہرات اور دیگر لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد تھی۔ کہتے ہیں کہ اس حج میں تقریباً ایک لاکھ چالیس ہزار آدمی شامل ہُوئے تھے۔

"پھر میں نے نگاہ کی تو کیا دیکھتا ہُوں کہ وہ صیہون کے پہاڑ پر کھڑا ہے اور اس کے ساتھ ایک لاکھ چوالیس ہزار شخص ہیں۔" (مکاشفہ یُوحنا۔ $\frac{۱۴}{۱-۵}$)

آپؐ نے عرفات میں وہ مشہور خطبہ دیا جو خطبۂ حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے۔ فرمایا:

"اے لوگو سُنو! شاید میں اس سال کے بعد اس مقام پر آپ سے پھر نہ مل سکوں۔ جس طرح آج کا دن، یہ شہر اور یہ مہینہ مقدس ہے اسی طرح تمہارے لیے ایک دُوسرے کی جان و مال مقدس ہے۔ تم میں سے جس کے پاس امانت ہے اسے ادا کرے۔ قرضوں پر سُود نہ لو۔ عہد جاہلیت کے مقتولوں کا سلسلۂ انتقام آج سے ختم کیا جاتا ہے۔ اے لوگو! سرزمینِ عرب میں شیطان اپنی عبادت سے مایوس ہو چکا ہے۔ تم پر تمہاری بیویوں کے اور بیویوں پر کچھ تمہارے حقوق ہیں جنہیں ادا کرنا ضروری ہے۔ یاد رکھو کہ کسی عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ اللہ کے ہاں بزرگ تر وُہ ہے جو زیادہ متقی ہو۔ اے لوگو! کیا تم شہادت دیتے ہو کہ میں نے اللہ کا پیغام تم تک پہنچا دیا، آواز آئی کہ ہاں۔ فرمایا کہ اس پیغام کو حاضر غائب تک پہنچائے۔" (خلاصہ ابن خلدون ج ا ص ۲۰۱)

حضورؐ ۱۰ ذی الحجہ کو مکّہ سے واپس چلے اور دس بارہ یوم کے بعد مدینہ میں تشریف لے آئے۔ (تلقیح۔ ص ۳۶ - ابنِ سعد ج ا، ص ۵۰۹)

۷۴۔ مہم اُسامہؓ حضورؐ کو اطلاع ملی کہ شمالی سرحد پر رومی مصروف شرارت ہیں۔ آپؐ نے حضرت اُسامہؓ بن زید کو بلایا اور تین ہزار مجاہدین کے ہمراہ ۱۰ ربیع الاوّل ۱۱ھ کو روم کی طرف روانہ کیا۔ آپ مدینہ کے باہر جُرُف میں آخری جائزے کے لیے ٹھہرے۔ ۱۲ ربیع الاوّل کو آگے بڑھنے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ حضورؐ کی وفات کی خبر ملی۔ لشکر واپس آ گیا۔ لیکن جونہی حضرت ابوبکرؓ بیعت وغیرہ سے فارغ ہو چکے تو آپؓ نے اُسامہؓ کو اپنی مہم پر دوبارہ جانے کا حکم دے دیا۔ آپ یکم ربیع الآخر کو

روانہ ہوئے۔ بیس دن کے بعد منزل (موتہ) پر پہنچے۔ خبریوں کی گوشمالی کی۔ پھر واپس چل پڑے اور پندرہ دن کے بعد مدینے پہنچ گئے۔
(ابن سعد ج ۱۲، ص ۵۲۴، تلقیح ص ۳۷)

غیر اہم مہمات

حضورؐ کی تمام مہمات کی تعداد کیا تھی؛ اس میں سیرت نگاروں کا اختلاف ہے مثلاً:

ا۔ البلاذری (فتوح البلدان) ۱۶ بتاتا ہے۔
ب۔ قاضی سلیمان منصورپوری (رحمۃ للعالمینؐ) کے ہاں یہ تعداد ۲۰ ہے۔
ج۔ شبلی (سیرت النبیؐ) 〃 〃 〃 〃 ۳۵ 〃 ۔
د۔ ابن خلدون (تاریخ) 〃 〃 〃 〃 ۳۶ 〃 ۔
ہ۔ طبری (〃) 〃 〃 〃 〃 ۳۹ 〃 ۔
و۔ ابن سعد (طبقات) 〃 〃 〃 〃 ۴۸ 〃 ۔
ز۔ ابن الجوزی (تلقیح) 〃 〃 〃 〃 ۴۸ 〃 ۔
ح۔ واٹ (محمد ایٹ مدینہ) 〃 〃 〃 〃 ۴۸ 〃 ۔

میں نے اس مقالے میں صرف ۳۴ کا ذکر کیا ہے اور ۱۴ اس بنا پر چھوڑ دی ہیں کہ بعض تشنۂ تفصیل تھیں اور بعض کے راوی ضعیف تھے۔

ان کا جدول یہ ہے:

شمار	سال	ماہ	منزل	امیرِ مہم	مجاہدین کی تعداد	کس کے خلاف
۱	۲ ھ	رمضان	۰	عُمیرؓ	۱	عصماء ۔ دشمنِ رسولؐ پر حملہ
۲	〃	شوال	۰	سالمؓ	۱	ابوعفک ۔ 〃 〃 〃 〃
۳	۳ ھ	ربیع الاوّل	۰	محمدؓ بن مسلمہ	۵	کعب بن اشرف ۔ دشمنِ رسولؐ پر حملہ
۴	〃	شوال	حمراء الاسد	حضورؐ	۷۰۰	قریش
۵	۴ ھ	ذی الحجہ	۰	عبداللہؓ بن اُنیس	۵	ابُو رافع ۔ دشمنِ اسلام پر حملہ
۶	۶ ھ	ربیع الآخر	ذوالقصہ (نجد)	ابُوعبیدہؓ بن جراح	۴۰	بنو ثعلبہ
۷	〃	رجب	وادی القُریٰ	زیدؓ بن حارثہ	۰	بنو فزارہ
	〃	رمضان	۰	〃	۰	اُمّ قِرفہ
۹	۷ ھ	محرّم	نجد	ابانؓ بن سعید	۰	۰
۱۰	۷ ھ	شعبان	فدک	غالبؓ بن عبداللہ	۲۰۰	بنو مُرّہ
۱۱	۸ ھ	ربیع الاوّل	ذات اطلاح (شام)	کعب غفاریؓ	۱۵	قضاعہ

۱۲	۸ھ	رمضان	بطن اِضم (مکہ و یمامہ کے درمیان ایک مقام)	ابو قتادہؓ الربعی	۸	۔
۱۳	〃	〃	یلملم (مکہ کے قریب)	ہشامؓ بن عاص	۲۰۰	۔
۱۴	۹ھ	شوال	دُومہ	خالدؓ بن ولید	۴۲۰	رکندہ
						میزان اعظم : ۸۸

حرفِ آخر

عرب کے تین طرف (مشرق، مغرب اور جنوب) سمندر تھا اور شمال میں خشکی۔ حضورؐ کی تمام تر توجہ شمالی علاقوں کی طرف تھی۔ کیونکہ :

ا۔ مدینہ کی تجارت شام سے ہوتی تھی اور اس کے تجارتی قافلے شمالی قبائل کے مساکن سے گزر کر آگے جاتے تھے۔ اس لیے ان قبائل کی تسخیر کے لیے حضورؐ نے بار بار شمال کی طرف مہمات بھیجیں۔ موتہ، تبوک، دومۃ الجندل، خیبر اور فدک کی مہمات کا ذکر ہو چکا ہے آپؐ نے شمالی قبائل کی طرف قاصد بھی بھیجے تھے۔ دِحیہ بن خلیفہ کلبی والیٔ بُصریٰ کی طرف گیا تھا۔ شُجاع بن وَہب اَسدی، غسان کے ایک سردار مُنذر بن حارث کی طرف اور ایک دیگر صحابی حضورؐ کا خط لے کر غُسّان کے والی جَبلہ بن اَیہم کے ہاں گئے تھے۔ آپ نے بعض شمالی قبائل سے مُعاہدے بھی کیے تھے۔ مثلاً جُہینہ، فزارہ، اَیلہ اور عُذرہ وغیرہ۔

حضورؐ کی اسی حکمتِ عملی کا نتیجہ تھا کہ فتح مکہ کی مہم میں سُلیم، غفار، مُزینہ، جُہینہ، ضمرہ، لَیث، سعد بن بکر اور اَشجع جیسے اہم اور معزز قبائل کے دستے بھی شامل ہوئے تھے۔

حضورؐ کو علم تھا کہ کون سا قبیلہ کس کا دشمن ہے۔ اس زمانے میں سُلیم کی مُرّہ سے، فزارہ کی عامر سے، عبس کی ذُبیان سے، عامر بن صعصعہ کی تمیم سے، مراد کی ہمدان سے اور ہوازن کی غطفان سے عداوت تھی۔

آپ اس کش مکش کو دُور کر کے دونوں کو ساتھ ملا لیتے اور اگر صلح نہ ہو سکتی تو کسی ایک کے حلیف بن جاتے۔

ب۔ حضورؐ اس حقیقت سے پُوری طرح آشنا تھے کہ کوئی انقلاب تمکن فی الارض یعنی سیاسی قوت کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ایک غلام قوم جو دُوسروں کی سلاسل میں جکڑی ہوئی ہو۔ فکر و عمل میں کوئی حرکت پیدا نہیں کر سکتی۔ آپ کے سامنے اصلاحِ انسانیت، فروغِ امن اور استیصالِ ظلم و استحصال جیسے بلند مقاصد تھے۔ ان کے حصُول کے لیے آپ جغرافیائی حدود کو پھلانگ کر ساری دنیا کو اشتراکِ عمل کی دعوت دینا چاہتے تھے اور اس کی بہترین صورت یہی تھی کہ شمالی سرحدات محفوظ ہو جائیں۔ چنانچہ رحلت سے ڈیڑھ سال پہلے حضورؐ تیس ہزار مجاہدین کو لے کر شمال کے ایک سرحدی شہر تبوکؔ تک گئے۔ جاسوس بھیج کر رُومی فوج کو تلاش کیا۔ لیکن وُہ سامنے نہ آئی اور حضورؐ لوٹ آئے۔ اسی طرح کی ایک مہم حضورؐ نے ہجرت کے آٹھویں سال موتہ کی طرف بھیجی تھی اور دو سال پہلے (سنہ ۶ھ) دُومۃ الجندل کی طرف۔ آخری علالت میں بھی آپ کو شمالی سرحدات کا خیال رہا۔ چنانچہ رحلت سے دو دن پہلے حضرت اُسامہؓ کو تین ہزار کی جمعیت دے کر شام کی طرف جانے کا حکم دیا۔ ابھی حضرت اُسامہؓ تیاری ہو رہے تھے کہ حضورؐ انتقال فرما گئے اور یہ مہم رُک گئی لیکن جونہی خلیفۂ اول

بیعت وغیرہ سے فارغ ہوئے تو حضرت اسامہؓ کو شام کی طرف روانہ کر دیا۔

حضورؐ کے بعد بھی اسی پلان پر عمل ہوتا رہا۔ چنانچہ اسی برس کی قلیل مدت میں سندھ کے صحراؤں سے ہسپانیہ کی شاداب وادیوں تک اللہ کا پیغام پھیل گیا اور دشت و دمن صدائے تکبیر سے گونج اُٹھے:

صلی اللہ علیہ وسلم

جلوہا خیزد ز نقشِ پائے او
صد کلیم آوارۂ سینائے او
رونق از ما محفلِ ایّام را
او رُسُل را ختم و ما اقوام را (اقبالؒ)

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

ضمیمۂ اوّل

قبائل

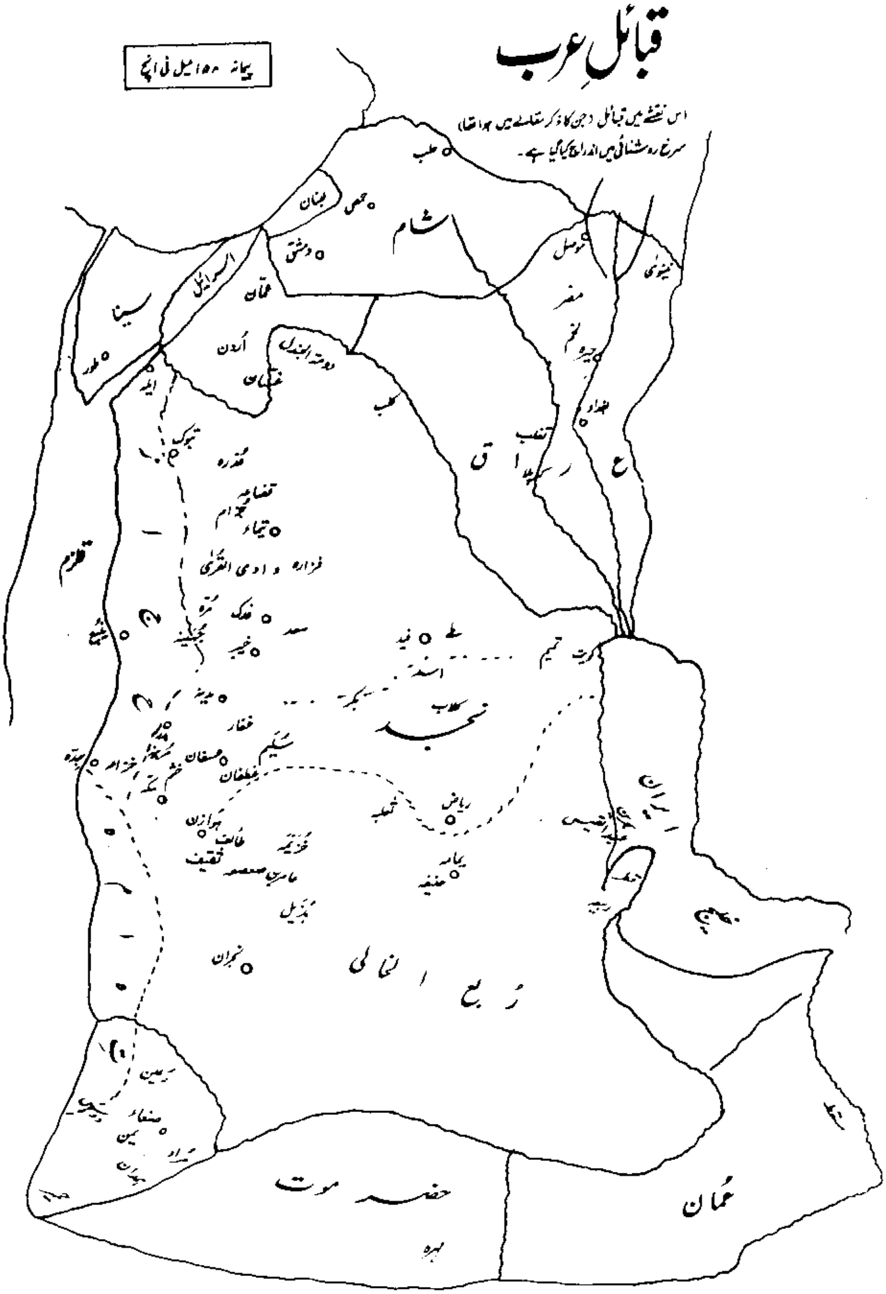
عرب میں سینکڑوں قبائل تھے جو جنوبی اُردن سے بحیرۂ عرب کے ساحل تک تقریباً گیارہ لاکھ مربع میل زمین میں آباد تھے۔ ان میں کئی ہمنام تھے۔ مثلاً خُزاعہ، ہوازن اور قریش کی ایک ایک شاخ کا نام بنو کعب تھا اور کتنے ہی قبائل عوف، مالک اور ازد کہلاتے تھے۔

قبائل کے بڑے بڑے گروہ دو تھے۔ بنُو عدنان اور بنو قحطان۔ عدنان حضورؐ کے اکیسویں جد تھے اور قحطان عدنان کا نانا تھا۔ جنوبی عرب یعنی یمن وغیرہ میں قحطان کی اولاد آباد تھی اور شمال میں عدنان کی۔ غطفان، خُزاعہ، مُزَینہ، ہُذَیل، کنانہ، تمیم، دارِم، مُرّہ، کِلاب، ہوازن، سُلَیم، مازن اور جُشم عدنانی تھے اور سبا، حمیر، کہلان، اَوس، خَزرج، کِندہ، ہمدان، مراد، مَہرہ وغیرہ قحطانی۔ اِن دونوں گروہوں میں کچھ نام مشترک تھے۔ مثلاً تعلبہ، جُشم، حارِث، حَرب، ربیعہ، مُرّہ، مُزَینہ، مازن اور غنم وغیرہ۔ عربستان کا جغرافیہ لکھنے والوں نے عرب کی بستیوں، وادیوں اور پہاڑوں کے نام توگِن ڈالے ہیں لیکن ان کا مقام متعین نہیں کیا۔ یاقوت حَمَوی نے معجم البلدان میں یہ تو بار بار لکھا ہے کہ فلاں موضع نجد یا حجاز میں فلاں قبیلے کی ملکیت تھا لیکن یہ نہیں بتایا کہ وُہ ریاض یا فَید یا مدینہ سے کس سمت میں کتنی دُور واقع تھا۔ حجاز کا رقبہ پچاس ہزار اور نجد کا سوا لاکھ مربع میل ہے۔ صرف یہ کہہ دینے سے کہ فلاں مقام نجد میں تھا، بات نہیں بنتی۔ مقام کا تعین نہ یاقوت کے ہاں ملتا ہے نہ کتاب فی جزیرۃ العرب کے مصنف ابوسعید السیرافی کے ہاں اور نہ معجم البقاع کے مصنف ابُوعبید البکری الاندلسی کے ہاں۔

ایک اور مشکل اِن قبائل کے اَنساب کے متعلق ہے۔ یہ معلوم کرنا کہ کون کس کی شاخ اور کس کا جد تھا، بڑے جان جوکھوں کا کام ہے جُذَیمہ کنانہ کی شاخ بھی تھی اور خُزاعہ کی بھی۔ غِفار ضَمرہ کی شاخ تھی۔ ضمرہ اور لَیث، بکر بن عبد مناۃ کی شاخیں تھیں۔ پھر بکر بن عبد مناۃ اور حارث بن عبد مناۃ، کنانہ کی شاخیں تھیں۔ یہ شاخ در شاخ کا سلسلہ بڑا ہی اُلجھا ہُوا ہے اسے سلجھا کر مختلف شاخوں کے اوطان تلاش کرنا کارے دارد۔

ایک اور دِقّت یہ کہ جغرافیہ نگاروں کے ہاں اوطانِ قبائل کے متعلق کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ یاقوت بار بار ہُذَیل کو تہامہ کا ایک قبیلہ بتاتا ہے لیکن واٹ منٹگمری (ص ۸۱) لکھتا ہے کہ یہ مکّہ کے مشرق میں تھا۔ یاقوت کے ہاں بنُو مُرّہ کا وطن یمامہ تھا۔ اور واٹ کے ہاں فدک۔ ان دونوں میں ۵۰۰ میل کا فاصلہ ہے۔ ان کتابوں میں اس قسم کے درجنوں تضادات ملتے ہیں۔ اِن حالات میں اوطانِ قبائل کا صحیح نقشہ تیار کرنا مشکل ہے۔ ساتھ والے نقشے کے متعلق ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ غالباً یہ صحیح ہے۔

منٹگمری واٹ نے بڑی محنت سے اوطانِ قبائل کی ایک فہرست تیار کی تھی جسے ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔ اس سے صرف اتنا ہی معلوم ہو سکے گا کہ کوئی قبیلہ حَرَمَین سے کس سمت میں آباد تھا۔ وہ حرمین سے کتنا دُور تھا؟ یہ سوال مدّت سے منتظرِ جواب ہے


قبائلِ عرب
پیمانہ ۱۵۰ میل فی انچ
اس نقشے میں قبائل (جن کا ذکر مقالے میں ہوا تھا)
سرخ روشنائی میں اندراج کیا گیا ہے۔
حلب
حمص
لبنان
شام
دمشق
عمان
اسرائیل
سینا
طور
اُردن
دومۃ الجندل
غسان
کلب
موصل
نینوی
مضر
لخم
تغلب
عراق
ایلہ
تبوک
عُذرہ
قضاعہ
جذام
تیماء
فزارہ
وادی القریٰ
قلزم
ینبع
فدک
سعد
خیبر
طے
اسد
بکر
تمیم
نجد
مدینہ
غفار
سلیم
عسفان
غطفان
جدہ
ہوازن
طائف
ثقیف
عامر بن صعصعہ
ہذیل
نجران
ریاض
یمامہ
حنیفہ
ربع الخالی
صنعاء
یمن
حضرموت
مہرہ
عُمان

اور رہے گا۔

۱۔ قبائلِ حرمین کے مغرب میں :

۱۔ خزاعہ ؛ (اسلم۔ کعب بن عمرو۔ المصطلق)
۲۔ کنانہ ؛ (بکر بن عبد مناۃ (ضمرہ وغفار)۔ لیث۔ دُئِل۔ مُدلج۔ الحارث بن عبد مناۃ)
۳۔ مُزَینہ
۴۔ جُہَینہ
۵۔ ازدِ شنوءہ

۲۔ قبائلِ حرمین کے مشرق میں :

۱۔ خُزَیمہ (مُدرکہ۔ کنانہ)
۲۔ اسد بن خزیمہ (عضل اور قارہ)
۳۔ طے (نبہان)
۴۔ ہُذَیل (لحیان)
۵۔ محارب (بنو خصافہ)
۶۔ غطفان (اشجع، فزارہ، مُرّہ، ثعلبہ۔ (انمار۔ عُوال)
۷۔ سُلیم ؛ (رِعل۔ شیبان)
۸۔ ہوازن ؛ (عامر بن صعصعہ (البکاء۔ ہلال۔ کلاب۔ (قُرطاء۔ عُرَینہ) ربیعہ۔ جُشَم۔ نصر۔ سعد بن بکر۔ ثمالہ ثقیف (بنو مالک۔ احلاف (باہلہ))

۳۔ شمالی قبائل :

۱۔ سعد بن ہُذَیم
۲۔ عُذرہ
۳۔ جُذام
۴۔ قضاعہ (جَرم۔ القین اور سلامان)
۵۔ بالی
۶۔ بَہراء
۷۔ لخم
۸۔ غسان
۹۔ کلب

۴۔ جنوبی قبائل :

۱۔ خثعم
۲۔ مذحج (عنس۔ جُعفی۔ خولان۔ النخع۔ رُہاء۔ سعد العشیرہ (زُبید)۔ صُداء)

---

[1] بریکٹ سے مراد شاخ اور شاخ در شاخ ہے۔

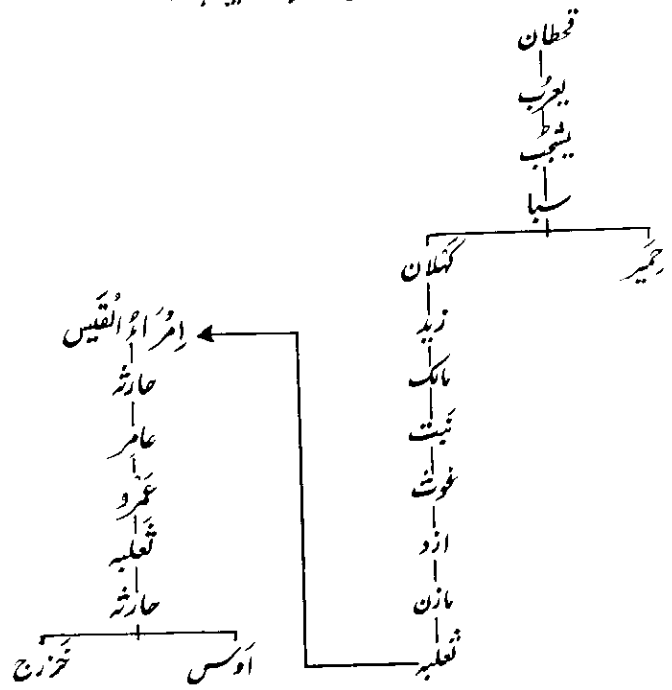
۳۔ بجیلہ
۴۔ ہمدان
۵۔ حارث بن کعب
۶۔ مراد
۷۔ کندہ (تجیب)
۸۔ حمیر
۹۔ عک اور اشعر

۵۔ عرب کے باقیماندہ قبائل:

۱۔ مہرہ
۲۔ ازد عمان
۳۔ عبدالقیس
۴۔ حنیفہ
۵۔ تمیم
۶۔ وائل
۷۔ بکر
۸۔ تغلب

یہ قبائل کی پوری فہرست نہیں ان کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔

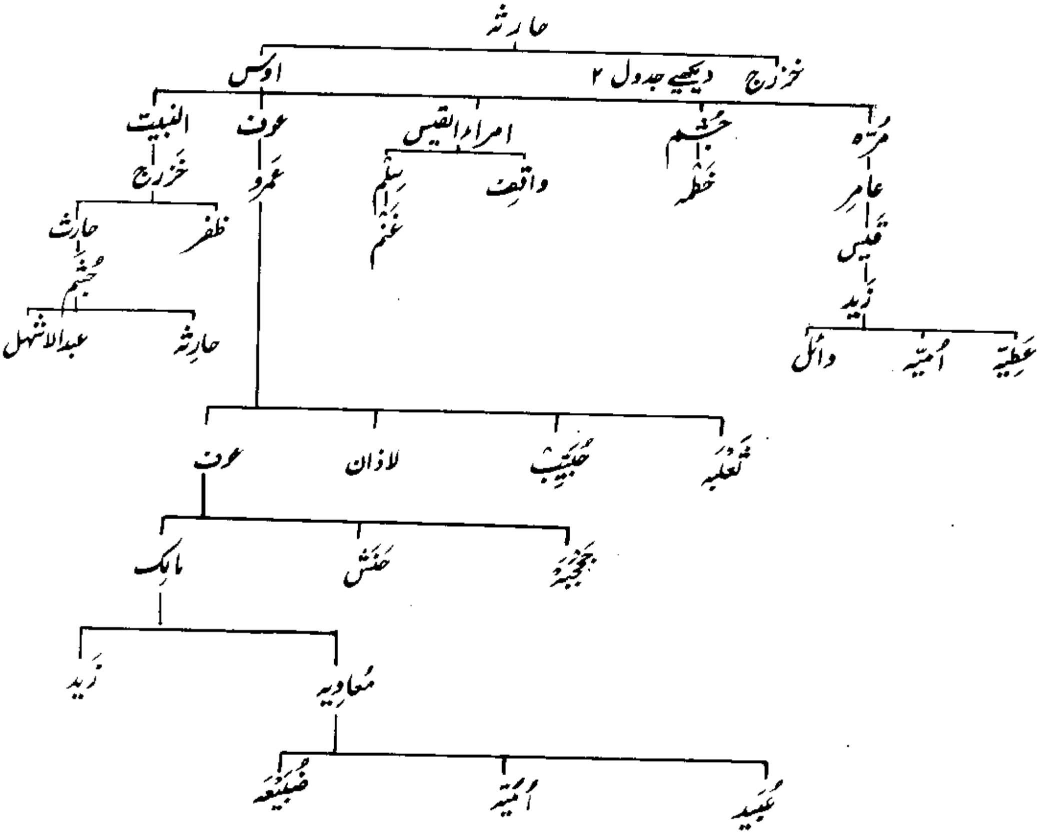
قبائلِ مدینہ مدینہ میں کچھ تو یہود آباد تھے جو کسی حملے کی وجہ سے فلسطین کو چھوڑ کر یہاں آ گئے تھے اور یا اوس وخزرج۔ ان کا جدِ اعلیٰ یمن سے آیا تھا۔ ان کا نسب نامہ یہ ہے:



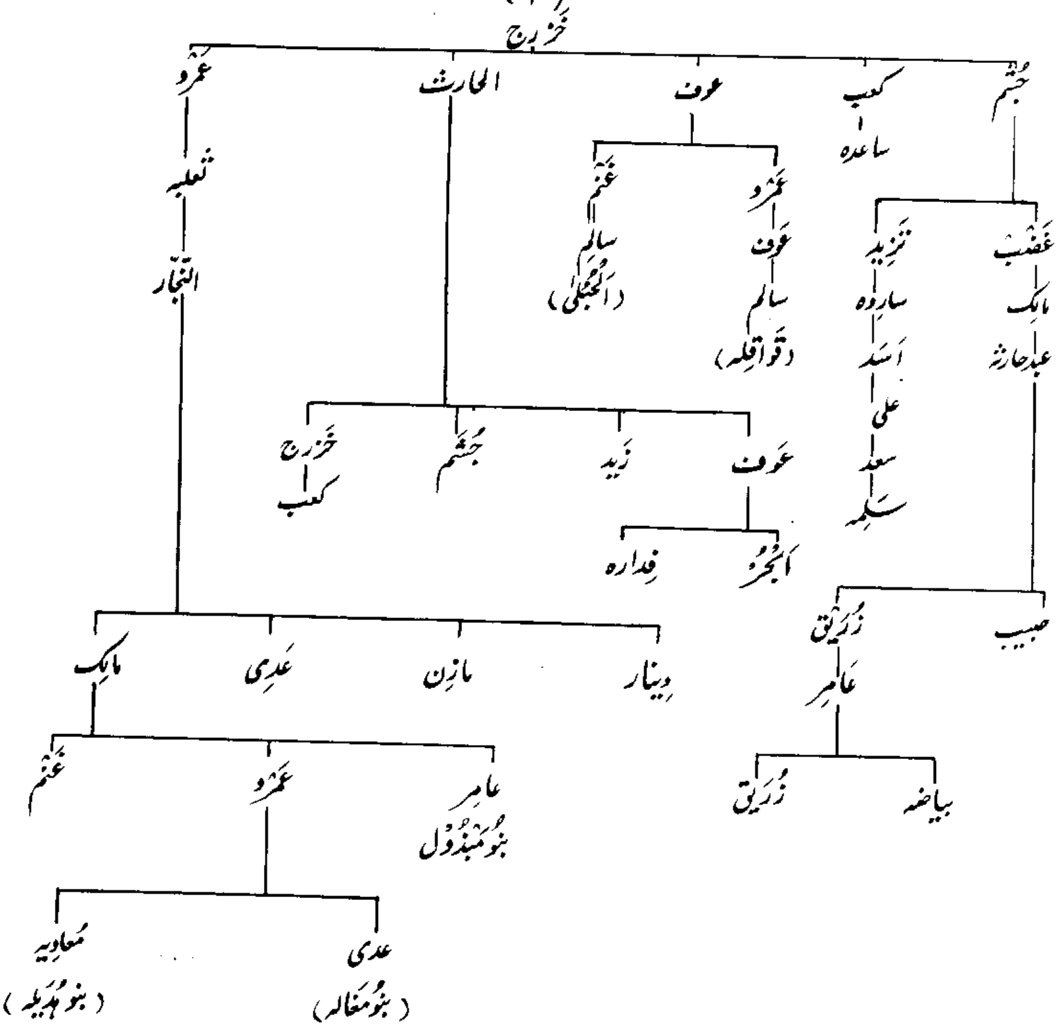
(دائرۂ معارفِ اسلامیہ ج ۳ "اوس")

ہُوا یُوں کہ کہلان کے دارالحکومت مآرب کے قریب وادیٔ عَرِم کا بند بوسیدہ ، موش خوردہ ہوگیا۔ جب سبا کے رئیس عمرو بن عامر کو یقین ہوگیا کہ بند ٹوٹنے والا ہے۔ تو وہ اپنی ساری جائداد اپنے برادر زادوں بنو حِمیر (جو بند کے بوسیدہ پن سے بے خبر تھے) کے پاس بیچ کر خود اقارب سمیت یمن سے نکل گیا۔ ثعلبہ بن عمرو حجاز میں مقیم ہوگیا اور حارثہ بن ثعلبہ مدینے چلا گیا۔ اوس و خزرج اسی کی اولاد ہیں اُن کے بعض افراد شمال کی طرف نکل گئے تھے۔ طے ، لخم ، غسان اور کلب انہی کی اولاد ہیں۔ کنسائیز انسائیکلو پیڈیا آف عرب سویلائیشن (ص ۲۹۳) میں لکھا ہے کہ یہ ہجرت چوتھی صدی عیسوی میں ہُوئی تھی۔ تین سو برس کے بعد جب حضورؐ مدینہ میں وارد ہُوئے تو اوس و خزرج پچھتر سے زاید قبائل میں تقسیم ہو چکے تھے۔ جداول یہ ہیں:

(۱)



(۲)

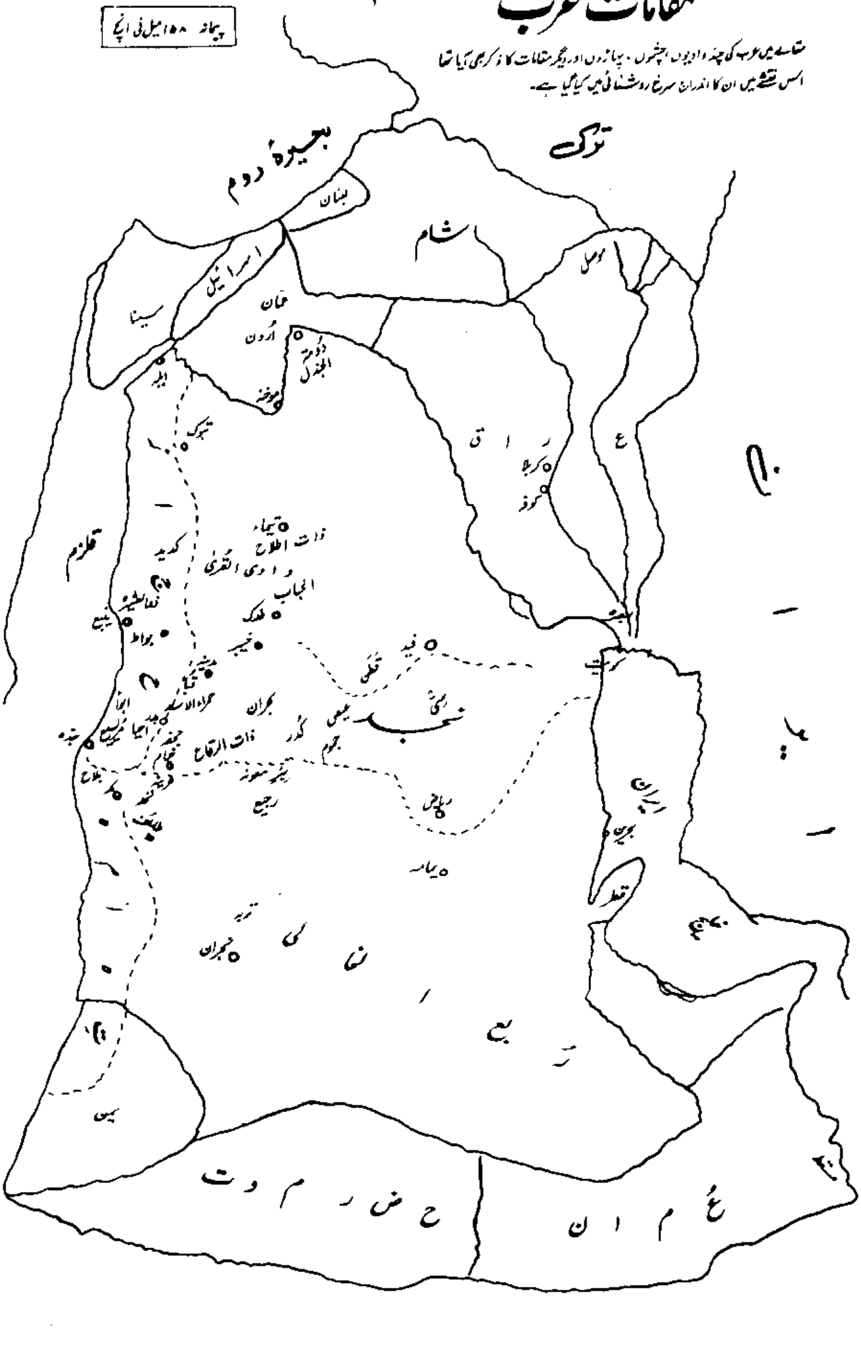

خزرج
جُشم
کعب
عوف
الحارث
عَمرو
ساعدہ
غَضب
تزید
مالک
عبد حارثہ
ساردہ
اَسد
علی
سعد
سلمہ
عَمرو
عوف
سالم
(قواقلہ)
غَنم
سالم
(الحُبلی)
ثعلبہ
النجار
عوف
زید
جشم
خزرج
کعب
ابجر
خدارہ
حبیب
زُریق
عامر
بیاضہ
زُریق
دینار
مازن
عدی
مالک
عامر
بنو مبذول
عمرو
غنم
عدی
(بنو مغالہ)
معاویہ
(بنو حدیلہ)

(واٹ ص ۱۵۴)

ضمیمۂ دوم

مقامات عرب

مقالے میں عرب کی چند وادیوں، چشموں، پہاڑوں اور دیگر مقامات کا ذکر بھی آیا تھا
اس نقشے میں ان کا اندراج سرخ روشنائی میں کیا گیا ہے۔



ضمیمۂ سوم

اُن عُمّال کی فہرست جو حضورؐ نے مقرر فرمائے تھے۔

شمار	نام	کہاں بھیجا	شمار	نام	کہاں بھیجا
۱	حضرت المہاجرؓ بن ابی اُمیہ مخزومی	صنعاء	۱۸	حضرت الاقرعؓ بن حابس تمیمی	بحرین
۲	〃 زیادؓ بن لبید انصاری	حضر موت	۱۹	〃 ولیدؓ بن عقبہ بن ابی مُعیط قرشی	المصطلق
۳	〃 علیؓ بن ابی طالب	نجران	۲۰	〃 عدیؓ بن حاتم طائی	قبائل طے و اسد
۴	〃 معاذؓ بن جبل انصاری	ایضاً	۲۱	〃 مالکؓ بن نویرہ تمیمی	تمیم
۵	〃 عبداللہؓ بن زید انصاری	حمیر	۲۲	〃 زبرقانؓ بن بدر تمیمی	بنو حنظلہ (تمیم)
۶	〃 مالکؓ بن عبادہ ہمدانی	〃	۲۳	〃 قیسؓ بن عاصم تمیمی	بنو سعد (تمیم)
۷	〃 عقبہؓ بن نمر ہمدانی	〃	۲۴	〃 بریدہؓ بن الحصیب اسلمی	اسلم و غفار
۸	〃 مالکؓ بن مُرّہ (مرارہ) رُہاوی	〃	۲۵	〃 کعبؓ بن مالک انصاری	〃 〃
۹	〃 عامرؓ بن شہر ہمدانی	ہمدان (یمن)	۲۶	〃 عبادؓ بن بشر انصاری	سُلیم و مُزینہ
۱۰	〃 ابو موسیٰؓ اشعری	مآرب (یمن)	۲۷	〃 رافعؓ بن مکیث جہنی	جُہینہ
۱۱	〃 خالدؓ بن سعید بن عاص قرشی	نجران و زبید کے درمیانی علاقے میں	۲۸	〃 عمروؓ بن عاص قرشی	فزارہ
			۲۹	〃 ضحاکؓ بن سفیان کلابی	بنو کلاب
۱۲	〃 طاہرؓ بن ابی ہالہ تمیمی	عک اور اشعر	۳۰	〃 بسرؓ بن سفیان کعبی	کعب
۱۳	〃 یعلیٰؓ بن اُمیہ تمیمی	جَنَد (یمن)	۳۱	〃 نُعیمؓ بن عبداللہ النحام قرشی	کعب
۱۴	〃 عمروؓ بن حزم انصاری	نجران	۳۲	〃 ابن لُتبیہؓ ازدی	ذُبیان
۱۵	〃 عُکاشہؓ بن ثور غوثی	سکاسک (؟)	۳۳	〃 عُیینہؓ بن حصن فزاری	تمیم
۱۶	〃 ابوسفیانؓ بن حرب قرشی	نجران	۳۴	〃 قُضاعیؓ بن عمرو عُذری	اسد
۱۷	〃 العلاءؓ بن حضرمی	بحرین		☆	☆

نوٹ: ان عمال کا کام زیادہ تر صدقات و زکوٰۃ جمع کرنا تھا۔

ضمیمۂ چہارم
اشاریہ حواشی

اس مقالے کے حواشی میں ۹۴ رجال (صحابہ اور دیگر) کا تعارف کرایا گیا ہے، ان کی فہرست یہ ہے:

شمار حاشیہ	نام	شمار حاشیہ	نام	شمار حاشیہ	نام
	الف	۶	اُمیّہ بن خلف		**خ**
۴۴	آمنہؓ (اُمِّ رسولؐ)	۷۷	انسؓ بن مالک	۷۶	خالدؓ بن ولید
۶۱	ابن عبدالبر	۷۸	انس بن نضر	۹۹	خُبیبؓ بن عدی انصاری
۱	ابوجہل		**ب**	۱۳۶	خراشؓ بن اُمیّہ خزاعی
۱۳۸	ابوجندلؓ بن سُہیل	۱۴۳	بشرؓ بن براء انصاری		**ر**
۸۰	ابودجانہؓ انصاری	۱۴۵	بشیرؓ بن سعد انصاری	۱۷۳	ربیعہؓ بن حارث بن عبدالمطلب ہاشمی
۱۰	ابوذرؓ غفاری		**ث**		**ز**
۱۰۱	ابوسَروَعَہؓ عقبہؓ بن حارث	۱۱۱	ثابتؓ بن قیس بن شماس	۱۱	زُبیرؓ بن عوام قرشی
۲۸	ابوسفیانؓ بن حرب		**ج**	۳۹	زیدؓ بن حارثہ کلبی
۴۲	ابوسلمہؓ عبداللہ بن عبدالاسد	۱۴۴	جعفرؓ بن ابی طالب	۱۰۰	زیدؓ بن دَثِنَہ انصاری
۱۲۵	ابوعبیدہؓ بن جراح	۱۱۰	جُویریہؓ (اُمّ المومنین)		**س**
۱۶۴	ابوقتادہؓ انصاری		**ح**	۱۰۸	سِباعؓ بن عُرفطہ انصاری
۵۶	ابولبابہؓ بن عبدالمنذر	۱۵۸	حارثؓ بن عُمیر ازدی	۳۰	سعدؓ بن ابی وقاص
۲	ابولہب	۵۱	حُبابؓ بن منذر انصاری	۱۶۷	سعدؓ بن زید اشہلی
۱۵۰	اخرمؓ (ابن ابی العوجاء)	۹۰	حرامؓ بن ملحان انصاری	۳۶	سعدؓ بن عبادہ انصاری
۱۴۷	اُسامہؓ بن زید	۴۷	حکمؓ بن کیسان مخزومی	۱۷	سعدؓ بن معاذ انصاری
۷۴	اُسیدؓ بن حُضیر			۱۲	سعیدؓ بن زید قرشی

کتابیات

۱۔ طبقات ابو عبداللہ محمد بن سعد بصری۔ اُردو ترجمہ از مولانا عبداللہ العمادی۔ دوسرا ایڈیشن نفیس اکاڈمی کراچی

۲۔ تاریخ ابنِ خلدون۔ اُردو ترجمہ از حکیم احمد حسین عثمانی۔ کراچی ۱۹۶۶ء

۳۔ تلقیح ابن الجوزی۔ دہلی ۱۲۸۶ھ

۴۔ الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب۔ حافظ ابن عبدالبرؒ۔ قرطبی۔ حیدر آباد۔ دکن

۵۔ تجرید البخاری میں "راویانِ حدیث" طابع دین محمد۔ لاہور

۶۔ عہد نبویؐ کے میدان جنگ ڈاکٹر محمد حمید اللہ۔ لاہور ۱۹۳۹ء

۷۔ اکمال فی اسماء الرجال۔ محمد بن عبداللہ خطیب۔ اردو ترجمہ سید تابش حسین امروہی۔ لاہور ۱۹۶۳ء

۸۔ سیرت النبیؐ۔ مولانا شبلی۔ طبع پنجم۔ لاہور

۹۔ دائرۃ المعارف الاسلامیہ۔ فرید بن مصطفیٰ وجدی۔ مصر ۱۹۲۳ء

۱۰۔ معجم البلدان۔ یاقوت حموی۔ مصر ۱۳۲۳ھ

۱۱۔ تاریخ۔ ابو جعفر محمد بن جریر طبری۔ اردو ترجمہ از محمد ابراہیم ایم۔ اے۔ کراچی ۱۹۷۰ء

۱۲۔ فتوح البلدان۔ البلاذری۔ انگریزی ترجمہ از فلپ ہتی۔ بیروت ۱۹۶۶ء

۱۳۔ کنسائیز انسائیکلو پیڈیا آف سویک سویلیزیشن۔ ہالینڈ ۱۹۵۹ء

۱۴۔ دائرۂ معارفِ اسلامیہ۔ اردو۔ پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور ۱۹۶۶ء

۱۵۔ رحمۃ للعٰلمین۔ قاضی محمد سلیمان منصور پوری۔ لاہور ۱۹۴۹ء

۱۶۔ محمدؐ ایٹ مدینہ۔ منٹگمری واٹ۔ آکسفورڈ ۱۹۵۶ء

ظہورِ قدرت

منشی رگھوناتھ راؤ درد

(۱)

ڈراؤنی اور خوفناک راتوں میں وحشی درندوں کی دل ہلانے والی آوازیں سُن کر کلیجہ کانپ جاتا تھا۔ آندھی اور اس کے ساتھ طوفان نوخیز قدرتی طور پر آتے جاتے تھے، اس پر کبھی کبھی خونخوار جنگ یا چھوٹی سی خونخوار جھڑپ دیکھنے سے آنکھوں میں اندھیرا چھا جاتا تھا۔ عورت، اس کا دل ہے کتنا لیکن اپنی جان پر کھیلنے والی ہستی کے لیے اس سے بھی زیادہ خوفناک اسباب پیدا ہو جائیں، تب بھی اس کو کچھ پروا نہیں ہوتی۔ مگر اس عورت کے پاس ایک امانت تھی، جس کے لیے اس نے جنگل کی خاک چھاننے پھرنے کا عہد کیا تھا کیونکہ اس امانت کے لیے چاروں طرف چور، اُچکے، ڈاکو، اٹھائی گیرے داؤ پیچ لڑا رہے تھے۔ چاہتے اور کوشش کرتے تھے کہ کسی طرح مظلوم عورت کا لال پاش پاش کر دیں تاکہ اس کی ہستی دنیا والوں کے لیے خواب ہو جائے۔

ایسے خطرناک دشمنوں میں گھر کر بھی دُکھیا ماں نے اپنے جگر کے ٹکڑے کو کس ناز سے پالا پوسا تھا، بتلانے کی ضرورت نہیں۔ چٹیل میدان، ہمدم نہ ساتھی، صرف ماں اور بچہ۔

قربان جائیے اس قدرت کے، ایک آسمانی طاقت شاملِ حال تھی، جو دوپہر کی چمکنے والی دھوپ میں، سورج کی شکل میں، چاندنی راتوں میں بدر بن کر اور اندھیری سنسان راتوں میں جھلملانے والے ستاروں میں نظر آتی تھی۔

بچہ بے فکر، رنج و غم سے آزاد، آنے والی بلاؤں سے بے خبر، ماں کی گود میں بیٹھا ہوا انگوٹھا چُوستا تھا۔ اس کو جھولنے کے لیے گہوارہ نہیں تھا۔ اوڑھنے کے لیے نرم اور گرم کپڑے نہیں تھے۔ اس کے رہنے کے لیے کوئی مکان نہیں تھا۔ لیکن اس کو ماں کی گود میں سب کچھ مل جاتا تھا۔ آغوشِ مادر سے بڑھ کر کوئی چیز اس کو عزیز نہیں تھی۔

ناشاد ماں جانتی، اچھی طرح جانتی تھی کہ ہم دونوں کی زندگی خطرے میں ہے۔ دُنیا میں میرے چاہنے والے بہت ہیں، مگر اس نورِ نظر کا کوئی روادار نہیں۔ عزیز، اقارب، خویش، یگانے، بیگانے سب خون کے پیاسے ہیں۔ اس کو اپنے مرنے کا غم نہیں تھا، صرف بچہ کی سلامتی چاہتی تھی۔

دن، دھوپ چھاؤں بن کر غائب ہوتا تھا۔ رات تارے گننے میں ختم ہوتی تھی۔ ماں یاس و حسرت، رنج و غم کے ساتھ بچہ کو کلیجہ سے بھینچ بھینچ کر اشکِ حسرت بہاتی تھی۔ امید صرف امید پر زندگی کے دن پورے کر رہی تھی۔

(۲)

جب یہ ہستی دنیا میں آئی تھی، اس کے ساتھ ایک صدائے غیب بھی۔ یہ وہ آواز تھی، جس کے لیے بزدل عورت جنگل کی

شیرنی بن کر لق ودق بیابان میں رہنے بسنے لگی تھی۔ صدائے غیب کیا تھی، وہ ایک معمہ تھا جس کا مطلب "ظہورِ قدرت" ۔

ماں کی ماری کبھی ڈراؤنے خواب دیکھ کر کانپ جاتی تھی، کبھی چپکے چپکے رو دیتی تھی۔ اس کی اس حرکت کو پرند و چرند، کیڑے مکوڑے غور سے دیکھتے تھے۔

صبح کے وقت پرند اپنی خوشنما آواز سے، خوب صورت پروں کو پھیلا کر نغمہ سنجی کرتے تھے۔ ظہورِ قدرت کے گیت جوشِ مستی میں گاتے تھے۔ میٹھے سروں سے بچے کو لوری دیتے تھے۔

دوپہر میں چرند اپنے بچوں کے ساتھ خوش فعلیاں کر کے ان دونوں کا دل بہلاتے تھے۔ راتوں کو کیڑے مکوڑے اپنی رسیلی، بند نہ ہونے والی آواز جنگل میں لبا دیتے تھے۔ یہ تھے تمام قدرت کے کھیل۔ ناشاد ماں ان قدرتی دوستوں کی طرف دھیان نہیں دیتی تھی۔ صرف اس کو اپنے بچے کی دُھن تھی۔

آہ! بوڑھی ماں نے دیکھا کہ اس کا ہونہار بچہ دم توڑ رہا ہے۔ اس نظارے نے اس غریب دکھیا کا دل اور بھی توڑ دیا۔ مرنے والے کی بے بسی اور بیکسی سے ضعیفہ دیوانی ہوگئی۔ اس نے کس آفت سے مقابلہ کر کے اس جگر کے ٹکڑے کو پالا تھا۔ کیا اسی دن کے لیے؟ اس کی آنکھیں مرنے والے کی صورت کو تک رہی تھیں۔ پُرحسرت آنکھیں جو کوئی دم میں بند ہونے والی تھیں، سفید ہونٹ، جن کی سُرخی معدوم ہو چکی تھی، زبانِ حال سے الوداع کہہ رہے تھے۔ مرنے والا بے ہوش، بے خبر تھا۔ ماں کی بے قراری اور اضطرابی سے اس کو کچھ واسطہ نہیں تھا۔ خوابِ مرگ کا اثر اس پر اچھی طرح ہو چکا تھا۔

شدتِ غم سے کپکپاتی آواز میں ضعیفہ چلا اُٹھی کہ "ہائے غضب" چھاتی دھڑا دھڑ پیٹ رہی تھی۔ منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔ پھر کہنے لگی، اے میرے کلیجے کی ٹھنڈک! آنکھوں کے نور! تُو آج مجھے کس کے سہارے چھوڑ چلا۔ یا اللہ! مجھ دکھیاری پر رحم کر۔ میری ہری بھری کوکھ جلا کر مجھے تاراج نہ کر۔ بچا۔ او میرے خدا! میرے اس نونہال کو بچا۔ تیری خدائی کے صدقے، اگر تو چاہتا ہے، تو مجھے اٹھا لے، لیکن میرا لال مجھے بخش دے۔ اتنا کہا اور وہ بے بس ہوگئی۔

یہ وہ دردناک آواز تھی، جو سچے دل سے نکل کر آسمان تک جا پہنچی۔ ہوائیں گونجنے لگی۔ درخت خاموش ہو گئے، آفتاب ڈر کر بادلوں کے پیچھے چھپ گیا۔ آندھی اور طوفان سرگوشیاں کرنے لگے۔ آسمان پر خوفناک شور ہُوا۔ بجلی چمکنے لگی، بادل گرجنے لگے۔ یکایک زمین تھرانے لگی۔

(۳)

مرنے والا مریض کسی قدر چونکا۔ بیہوش ماں کو پکارا اور مایوسی سے آہ بھر کر خاموش ہوگیا۔ بوڑھی ماں بیہوش تھی مگر اس کو محسوس ہونے لگا کہ وہ جاگ رہی ہے۔ مریض پر بھی غنودگی کی کیفیت طاری ہوگئی۔ دنیا میں سیاہی پھیل گئی۔ ضعیفہ نے دیکھا، اچانک مریض کے اطراف ایک روشنی نمودار ہوگئی۔ یہ کیا ہے؟ اس کا دھڑکنے والا دل اندر سے کہنے لگا "ظہورِ قدرت" کی علامت۔

روشنی بتدریج بڑھتی گئی۔ ایک حلقہ مریض کے اطراف ہوگیا۔ ضعیفہ کی دُھندلی آنکھیں اُس چمکنے والے نور کی تاب نہ لا کر بند ہونے لگیں۔ تاہم وُہ دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اب مریض بھلا چنگا تھا۔ اس کا وہی مردانہ حسن تھا۔ چہرے پر شباب کی تازگی اور سرخی تھی۔ سفید ہونٹوں میں سرخی آ گئی تھی۔ الوداع کہنے والی آنکھیں مسرت سے چمک رہی تھیں۔ صحت اور اس کے ساتھ طاقت، جسم میں خون کی گردش نے ثابت کر دکھایا کہ نقاہت اور کمزوری کافور ہو گئی۔

نوجوان مریض نے اس نور کو دیکھا اور اپنی حالت کو اچھی طرح محسوس کرنے لگا۔ اس کو لقین ہو گیا کہ اب وہ موت کے پنجے سے آزاد ہے۔ جاں بخش نور پر نگاہ دوڑا کر کہا کہ "ماں، ماں یہ خواب تو نہیں ہے"

ضعیفہ یہ سب دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی: "نہیں، یہ خواب نہیں "ظہورِ قدرت" ہے"

مریض: یہ کیا اس صدائے غیب کی تعبیر ہے، جو میرے دنیا میں آنے کے چند روز بعد تمھیں سنائی دی تھی۔

ضعیفہ: ہاں! ہاں!!

اٹھ کر آسمان کی طرف دیکھنے لگی اور کہا: یارب! تُو نے میری سُن لی اور میرا چاند جی اُٹھا۔ اس مرنے والے کو زندگی بخشنے والے داتا! تیری کریمی پر میں واری۔"

کسی قدر روشنی مدھم ہونے لگی۔ ضعیفہ ڈر گئی کہ پھر کہیں اس کا بچہ مرض میں مبتلا نہ ہو جائے۔ یہاں تک کہ وہ تمام روشنی معدوم ہو گئی۔ پھر وہی تاریکی اور وہی سنسان رات۔ مگر مریض اب مریض نہیں تھا، صحت یاب نوجوان تھا۔ اس کے ہاتھ، پاؤں، بازو مضبوط تھے۔ موت پر اس کو اچھی طرح فتح حاصل ہو گئی تھی۔

(۴)

نوجوان کو بسترِ مرگ کے واقعات یاد تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ ابھی دنیا میں "ظہورِ قدرت" کا اعلان کر دے۔ لیکن بوڑھی ماں منع کرتی تھی۔

ماں بیٹے کے ساتھ تشکریہ کے لیے سجدے میں گر گئی۔ حضورِ قلب سے تشکریے کے الفاظ کہہ چکنے کے بعد پھر اُس نے کہا: "مرنے والے کو جِلانے والے! میں چاہتی ہوں کہ تو میرے اس بچے کو لافانی زندگی عطا کر اور ہر بلا سے محفوظ رکھ۔ میری دُعا صرف یہی ہے۔"

سجدے سے سر اُٹھا کر دیکھا، ایک عجیب و غریب مخلوق سامنے کھڑی ہے۔ نوجوان بے اختیار چلایا، آہا! فرشتہ۔ فرشتے کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس نے بڑھیا اور نوجوان سے مخاطب ہو کر کہا کہ "سُنو! میں خدا تعالیٰ کے پاس سے اس لیے آیا ہوں کہ "ظہورِ قدرت" کے متعلق تم کو خوشخبری سناؤں کہ وقت بالکل قریب آ رہا ہے۔ ضعیفہ نے مسرت سے پُوچھا: اس کے سوا کچھ اور بھی کہو گے؟

فرشتہ: ہاں ضرور۔ تجھے اور تیرے نورِ نظر کو لافانی زندگی عطا کی گئی ہے۔

ضعیفہ نے فرشتے کا ہاتھ چوم لیا اور کہا کہ "کیا میرے بچے کے ساتھ مجھے بھی لافانی زندگی عطا کی گئی ہے۔"

فرشتہ: بیشک! لیکن اس لافانی زندگی کے لیے بیحد قربانیوں کی ضرورت ہے۔ تُو نہیں جانتی کہ دنیا میں آجکل فریب و

دغا کا بازار گرم ہے۔ بدی کی طرف لوگ رجوع ہو رہے ہیں۔ شرک اور کفر کو اپنے گھروں میں پال رہے ہیں۔ ایسی صورت میں تم دونوں لافانی زندگی کے مالک ہو جاؤ۔ بے کھٹکے نیکی کی تلقین کرو۔ لوگوں کو سچائی کے دسترخوان پر جمع ہونے کی دعوت دو۔ لوگ تمھاری کوششوں سے برہم ہو جائیں گے۔ تم کو مارنے کے لیے چاروں طرف سے دوڑیں گے۔ تم ہر حالت میں محفوظ رہو گے۔ لیکن خون میں لت پت ہو جاؤ گے۔ قریب میں ایک اور مقدس وجود سے دنیا کی تاریکی دُور ہو گی۔ آخر کار سچائی کی فتح ہو گی۔ جھوٹ اور مکر کا بازار سرد پڑ جائے گا۔ لوگ اپنے پیدا کرنے والے کی طرف رجوع ہو جائیں گے۔ جو لوگ سچائی اور حق کے لیے جان دیں گے، اُن کو شہادت کا درجہ مل جائے گا۔

یہ تقریر سُن کر پھر ایک بار دونوں نے فرشتے کے ہاتھ چُومے۔ بعدازاں فرشتے نے نہایت تعظیم کے ساتھ کہا کہ وہ وقت دُور نہیں "ظہورِ قدرت" کا تماشا دیکھو گے۔ یہ کہہ کر وہ آسمانی مخلوق اپنے پروں کو جنبش دینے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہاں کچھ نہ تھا۔ وہی جنگل، وہی وحشت۔ لیکن ماں بیٹے دونوں وفورِ مسرت سے جُھوم رہے تھے۔

(۵)

۲۹ اگست ۵۷۰ء م ۱۲ ربیع الاوّل کو مکّہ شریف میں ایک ہلچل مچی ہُوئی تھی۔ مکہ معظمہ میں ایک نئی مسرت نمایاں ہو رہی تھی اس روز قبیلہ قریش میں ایک "دُرِ یتیم" کا ظہور ہُوا تھا۔ فرشتے آسمان سے وحدانیت کے نغمے گاتے ہُوئے زمین پر اُتر رہے تھے۔ ہر ایک دل میں مسرت کا دریا لہریں لے رہا تھا۔ مجرموں کا دل دھڑک رہا تھا۔ خاندان قریش کا "دُرِ یتیم" ہر آنے جانے والے کو نظرِ غور سے دیکھ رہا تھا۔

فرشتے وہاں موجود تھے، لیکن لوگوں کی نظروں سے پنہاں۔ بار بار اس کی نگاہیں دروازے تک جا کر واپس آ رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس کی آنکھیں کسی کو ڈھونڈ رہی ہیں۔

ماں اپنے مرحوم شوہر کی یاد سے مغموم تھی لیکن اس موہنی مورت کو دیکھتے ہی اس کے دل کی کلی شگفتہ ہو جاتی تھی۔

دوپہر کا وقت تھا، سب لوگ سو گئے تھے، صرف فرشتے اس "دریتیم" کے محافظ تھے۔ ضعیفہ اور اس کے ساتھ ایک نوجوان، دونوں نے آکر فرشتوں سے کہا کہ ہم اس مقدس ہستی کی زیارت کرنا چاہتے ہیں۔

فرشتوں نے ضعیفہ اور اس کے نوجوان بیٹے کو "دُرِ یتیم" کے سامنے لا کر حاضر کر دیا۔ ضعیفہ نے جونہی اس مقدس ہستی کو دیکھا، ادب سے سر جھکا کر اس بچّے کے قدم چُومے اور ننھے ننھے ہاتھوں کو بار بار چُومنے لگی۔ نوجوان اس قابلِ عظمت صورت کو دیکھ کر کسی قدر مخوف ہونے لگا۔

ایک فرشتے نے اس کے کان میں کہا کہ "تو کیوں ڈرتا ہے۔ جا اور اس ظہورِ قدرت سے اپنی لافانی زندگی کو نثار کر"۔ وہ نوجوان گیا۔ اس دُرِ یتیم کے قدم چُومنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن بچّہ مچل کر ہنس دیا۔ جلدی سے اس نوجوان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر ضعیفہ کی طرف دیکھنے لگا۔

ضعیفہ نوجوان بن گئی اور وہ نوجوان بھی ایک خوب صورت بچّہ بن کر دُرِ یتیم کے قدموں تلے بیٹھ گیا۔ فرشتے حیران تھے۔

ایک دُوسرے کے مُنہ کو تک رہے تھے۔
ہاتفِ غیبی نے صدا دی: اے فرشتو! یہ عورت سرزمینِ عرب ہے اور یہ اس کا ہونہار بچہ اسلام ہے۔
اچانک ایک روشنی نمودار ہُوئی۔ اس کے بعد اور ایک فرشتہ دکھائی دیا اور پھر ان دونوں کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا،
"ظہورِ قدرت" جس کے تم متمنی تھے، تمھاری قسمت کا فیصلہ جس کے ہاتھ میں دیا گیا ہے، وہ **مُحمّدؐ** یہی ہیں۔
یہ مبارک الفاظ ختم ہوتے ہی فرشتے وحدانیت کے نغمے سنانے لگے۔ زمین پر آسمان سے پھُولوں کی بارش ہونے لگی۔ اس وقت عرب اور اسلام **مُحمّدؐ** کے ہاتھوں کو چوم رہے تھے۔

کُتبِ سابقہ کی بشارتیں

مولانا حسن میاں پھلواروی

قرآن مجید میں ارشاد ہوا: وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَآيَة۔ (سورہ آل عمران پ ۴) اس آیت میں اس عہد و میثاق کا ذکر ہے، جو روزِ اوّل میں تمام نبیوں سے حضرت سیّد المرسلین خاتم النبیین محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم وعلیہم اجمعین پر ایمان لانے، ان کی تصدیق اور مدد و نصرت کرنے پر لیا گیا تھا۔ حضرت مولائے کائنات امیر المومنین علی مرتضیٰ علیہ السلام اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ:

"آدمؑ سے لے کر مسیحؑ تک جتنے پیغمبر گزرے، خدا نے ہر ایک سے سید عالم رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت کی تصدیق اور تائید کا پختہ قول و قرار لیا۔" (تفسیر امام طبری وغیرہ)

اسی لیے سب پیغمبروں نے اپنے اپنے زمانہ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے پیش گوئیاں فرمائیں اور اپنی اُمتوں کو حضور پُرنور کی اِس عالم میں تشریف آوری کی بشارتیں دیں۔ اگلی سب آسمانی کتابوں میں خصوصًا توریت وانجیل میں ہمارے آقائے نامدار سرور و سردار احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی اوصاف گرامی سب کچھ مذکور تھا۔ پڑھو:

اَلرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا	وہ رسول نبی امی جس کو اہل کتاب توریت و انجیل میں
عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰاةِ وَالْاِنْجِيْلِ۔	لکھا ہوا پاتے ہیں۔

اب تک موجودہ توریت و اناجیل میں بھی باوجود اس قدر تغیر و تبدل، ترمیم و تحریف کے بہتیری بشارتیں صاف صاف موجود ہیں، جن میں سے بعض کو ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

۱۔ خداوند نے سیّدنا موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا:

"میں ان کے لیے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے مُنہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا، وہ سب ان سے کہے گا اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی میری باتوں کو جنھیں وُہ میرا نام لے کر کہے گا، نہ سُنے گا، تو میں اُس کا حساب اُس سے لُوں گا۔ لیکن وُہ نبی جو ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات کہے میرے نام سے، جس کے کہنے کا میں نے اسے حکم نہیں دیا یا اور معبودوں کے نام سے کہے، تو وہ نبی قتل کیا جائے۔"

(توریت مطبوعہ مرزاپور ۱۸۷۰ء، باب ۱۸۔ آیت ۱۸ تا ۲۰)

سبحان اللہ کیسی واضح بشارت ہے۔ بنی اسرائیل کے بھائی بنی اسمٰعیل کے سوا اور کون ہو سکتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ وہ نبی بنی اسمٰعیل میں ہوگا اور "تجھ سا ایک نبی" سوائے پیغمبر عربیؐ اور کسی پر صادق ہی نہیں آسکتا۔ کیونکہ بنی اسرائیل میں کوئی نبی مُوسیٰ کے

مانند ہوا ہی نہیں۔ جیسا کہ خود توراۃ کا بیان ہے کہ:

"پھر قایم نہ ہوا کوئی نبی بنی اسرائیل میں موسیٰؑ کے مانند، جس نے پہچانو ہو اللہ کو رو برو۔"

(توراۃ کتاب استثنا ۲ باب ۳۴۔ درس ۱۰)

لیکن حضور نبی امیؐ جناب کلیم اللہؑ کے بالکل "مثل" تھے اور اکثر امور میں ایک کی دوسرے سے مشابہت ثابت ہے۔ مثلاً:

۱۔ جس طرح حضرت موسیٰؑ مستقل صاحب شریعت تھے، ہمارے حضورؐ بھی مستقل صاحب شرع تھے۔ لیکن بنی اسرائیل میں کوئی نبی حضرت موسیٰؑ کے بعد حتیٰ کہ سیدنا مسیحؑ بھی مستقل صاحب الشرع نہ تھے۔ (دیکھو انجیل متی باب ۵)

۲۔ موسیٰ علیہ السلام حکومت و فرمانروائی کی شان بھی رکھتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی تاجداروں کے تاجدار تھے۔

۳۔ جہاد کا حکم موسیٰ علیہ السلام کو بھی ہوا اور ہمارے حضورؐ کو بھی مخالفین کے حملوں کا جواب دینے اور سرکشوں کی سرکوبی کا حکم دیا گیا۔

۴۔ سیدنا موسیٰؑ کو کوہ طور پر معراج ہوئی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اتم واکمل درجہ کی معراج ہوئی، وغیرہ وغیرہ (لیکن سیدنا مسیحؑ جن کو عیسائی اس بشارت کا مصداق ثابت کرنا چاہتے ہیں، ان وجوہ مماثلت سے بالکل خالی ہیں)

غرض آنحضرت سیدنا موسیٰؑ کے مانند بے شک ہیں، قرآن میں بھی حضورؐ کو "مثل موسیٰ" فرمایا گیا۔ پڑھو: اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَیْکُمْ رَسُوْلًا شَاھِدًا عَلَیْکُمْ کَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ٥ نیز آیہ وَشَھِدَ شَاھِدٌ مِّنْ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ عَلٰی مِثْلِہٖ میں بعض مفسروں نے شاھد سے سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام اور مثلہ سے حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو مراد لیا۔

اس بشارت کی یہ آیت کہ "اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا" قرآن پاک کی طرف اشارہ ہے۔ جو خدا کا کلام ہے اور حرف حرف آنحضرتؐ پر نازل ہوا: ؎

گرچہ قرآں از لب پیغمبر است
ہر کہ گوید حق نہ گفتہ ست کافر است

بشارت کا آخری حصہ یہ ہے کہ "جھوٹا نبی قتل کیا جائے" یہ حضور پُر نور کی نبوت کی صداقت کا قطعی فیصلہ ہے۔ کیونکہ اگر معاذ اللہ آپ وہ نبی مبشر و موعود نہ ہوتے تو ضرور اس آخری آیت کے مصداق ثابت ہوتے۔ مگر یہاں تو خدائی وعدۂ حفاظت شامل حال تھا کہ وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ۔ مخالفین نے قتل و ہلاک کی کیا کچھ انتہائی تدبیریں نہ کیں، مگر ایک بھی پیش رفت نہ ہو سکی۔ مخالفین ہی ہلاک و برباد ہوتے اور خدا نے اپنے سچے رسولؐ کی ہر طرح مدد و حفاظت کی۔ پڑھو: وَاِذْ یَمْکُرُ بِکَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِیُثْبِتُوْکَ اَوْ یَقْتُلُوْکَ اَوْ یُخْرِجُوْکَ وَیَمْکُرُوْنَ وَیَمْکُرُ اللّٰہُ وَاللّٰہُ خَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ۔

ہاں یہ بشارت نبی امیؐ کی نسبت اس طرح بھی صادق ہوئی کہ حضورؐ کے آخر زمانہ میں مسیلمہ کذاب نے جھوٹا دعوائے نبوت کیا اور وہ خبیث حضرت خلیفۂ اول صدیق اکبرؓ کے ابتدائے زمانہ خلافت میں قتل کیا گیا۔

۲ - حضرت سیّدنا داؤد علیہ السلام ایک آنے والے نبی کا مشتاقانہ ذکر اور اس کی ثنا و توصیف فرماتے ہیں :

(۲) "تو حسن میں بنی آدم سے کہیں زیادہ ہے۔ تیرے ہونٹوں میں لطف بٹا یا گیا ہے اسی لیے خدا نے تجھے ابد تک مبارک کیا۔"

(۳) "اے پہلوان اپنی تلوار کو، جو تیری حشمت اور بزرگاری ہے، حمائل کر کے اپنی ران پر لٹکا۔"

(۴) اور اپنی بزرگواری سے سوار ہو اور سچائی اور ملائمت اور صداقت کے واسطے اقبال مندی سے آگے بڑھ۔ تیرا دہنا ہاتھ تجھ کو مہیب کام سکھلا دے گا۔"

(۵) "تیرے تیر تیز ہیں۔ لوگ تیرے نیچے گرے پڑتے ہیں۔ وے بادشاہ کے دشمنوں کے دل میں لگ جاتے ہیں۔"

(۶) "تو صداقت کا دوست اور شرارت کا دشمن ہے۔"

(۷) "تیرے سارے لباس سے مُرّ اور عود کی خوشبو آتی ہے۔"

(۸) "بادشاہوں کی بیٹیاں تیری عزّت والیوں میں ہیں۔"

(۱۶) "تیرے بیٹے تیرے باپ دادوں کے قایم مقام ہوں گے تو انھیں تمام زمین کے سردار مقرر کرے گا۔"

(۱۷) "میں ساری پشتوں کو تیرا نام یاد دلاؤں گا۔ پس سارے لوگ ابدالآباد تیری ستایش کریں گے۔"

(زبور شریف باب ۴۵ ملتقطاً)

یہ بشارت کس قدر صاف اور حرفاً حرفاً سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق ہے۔ حضرت داؤد کے[1] بعد ایسا کون نبی دنیا میں آیا جو باطنی فضل و کمال کے ساتھ ظاہری حسن و جمال میں بھی یکتائے زمانہ و یگانہ عالم ہو اور حشمت و شوکت، حکومت و سلطنت اور تیر و تلوار کا بھی مالک ہُوا ہو۔ بجز محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کوئی نہیں۔

سبحان اللہ کس خلوص اور جوشِ محبت کے ساتھ حضرت داؤدؑ نے حضور انورؐ کے حسن و جمال، جاہ و جلال، غزوات و فتوحات اور عظمت و جلالت وغیرہ کو بیان فرمایا ہے۔ جس مُنہ سے حضرت داؤدؑ نے اُس محبوب کی یہ تعریف کی، اس مُنہ کے قربان اور جس مبارک لب و دہن سے یہ مدح و ثنا فرمائی اُس لب و دہن کے صدقے۔ آہ : ؎

نہ من بر آں گل عارض غزل سرایم و بس
کہ عندلیب تو از ہر طرف ہزار انند

اے حضرت داؤد! خدائے ذوالجلال والاکرام کی طرف سے آپ پر ہزاروں صلوٰۃ وسلام۔ آپ نے ہمارے آقا و مولیٰ، منظرِ حسنِ ازلی، پرتوِ جمالِ لم یزلی، نبی اُمّی، رسول عربی (صلوات اللہ وسلامہ علیہ وآلہ) کے حسن و جمال کی کیسی سچّی تعریف فرمائی کہ "تو حسن میں بنی آدم سے کہیں زیادہ ہے"! ؎

[1] حضرت یوسف علیہ السلام حضرت داؤد علیہ السلام سے بہت پہلے گزرے ہیں - ۱۲

شخصیتوں کا اختلاط

مندرجہ بالا سرسری جائزہ کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے کچھ تو ایسے مسلمان ہیں، جو اپنے شعائر و رسوم کے اعتبار سے غیر مسلم ہیں۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ ان کی شخصیت دراصل دو شخصیتوں کا مجموعہ ہے۔ انہوں نے ایک ایسے معاشرہ میں پرورش پائی جو دینداری کا عادی تھا۔ لہٰذا وہ شعائر و رسوم کے اعتبار سے تو مسلمان ہیں لیکن ساتھ ہی انہوں نے ایک ایسے معاشرہ میں بھی نشو و نما پائی ہے، جن کی فکری سطح اسلامی نظریات سے ہم آہنگ نہیں تھی۔ لہٰذا جب وہ زندگی کے کوائف و ظروف پر غور کرتے ہیں، چاہے وہ عام فکری حیات سے تعلق رکھتے ہوں یا اجتماعی، اخلاقی، سیاسی یا دوسرے شعبوں سے، تو وہ ان پر اسلامی فکر کے مطابق غور و فکر نہیں کرتے۔ البتہ اپنی مخصوص زندگی میں وہ مسلمان ہی سمجھے جاتے ہیں۔ فکری یا نفسیاتی اعتبار سے یہ بالکل ہی ایک نئی مخلوق ہے۔ عالمِ انسانی میں دو قسم کے مخلوط نظامِ تعلیم رائج رہے ہیں۔ ایک تو اسلامی تعلیم کا۔ لیکن یہ نظامِ تعلیم اپنے طریقے، وسائل اور سطح کے اعتبار سے قدیم ہے، جس کا سراغ ہمیں ان صدیوں میں ملتا ہے، جو عباسی عہدِ حکومت کے بعد گزر چکی ہیں۔ دوسرا نظامِ تعلیم وُہ ہے، جس کا سرچشمہ مغرب، مغربی افکار اور مغرب کی جدید تہذیب ہے اور ان نفسیاتی اور فکری اثرات نے جو بعض لوگوں میں شدت سے ظہور پذیر ہو چکے ہیں، بعض عجیب و غریب اور مخصوص نوعیت کے مظاہر پیدا کر دیئے ہیں۔ مثلاً اس نوع کا ایک مظاہرہ یہ بھی ہے کہ بہت سے اسلامی احکام میں اس انداز کی تاویلیں کی جانے لگی ہیں، جو زیادہ تر تکلف و تعسف سے خالی نہیں ہوتیں۔ ان تاویلات کا مقصد یہ ہے کہ اسلام اور دوسرے مذاہب میں تطبیق کی کوئی صورت نکالی جائے۔ لیکن یہ سب کچھ اسلام کی قربانی دے کر کیا جاتا ہے۔ گویا وہ چاہتے یہ ہیں کہ اسلام کا حلیہ بگاڑ کر اور اس کی قطع و برید کر کے اسے ایک ایسی بوتل میں بند کیا جا سکے۔ جس کا دہانہ تنگ ہو۔ چاہے ایسا کرنے کے لیے انھیں اس کے ہاتھ پاؤں یا اس کے جسم کے کسی بنیادی عضو ہی کو کاٹنا چھانٹنا کیوں نہ پڑ جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس سلسلہ میں میں کچھ مثالیں پیش کروں تو کوئی حرج نہیں ہوگا۔ لیکن مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دیجیے کہ یہ مثالیں میری ذاتی رائے پر مبنی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ دوسری مثالیں اس مقام پر زیادہ بہتر ہو سکتی ہوں اور ان سے بہتر طور پر استشہاد کرنا ممکن ہو۔

اس سلسلہ میں پہلی مثال نامور شخصیتوں کی یاد تازہ رکھنے کے لیے ان کے مجسموں کا قایم کرنا ہے۔ بعض مغربی تہذیب سے متاثر ہونے والوں کا خیال ہے کہ اسلام میں مجسمہ سازی چند وجوہ سے حرام کی گئی تھی، جو اب باقی نہیں رہیں۔ لہٰذا اگر آج ہم اپنے سربرآوردہ لوگوں کے مجسمے نصب کرنے لگیں تو اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔ مگر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اسلام میں مجسمہ سازی اور ان کی تنصیب کی حرمت کی وجہ صرف بت پرستی کے رجحان کو روکنا ہی نہیں ہے، بلکہ اس سے کہیں گہری ہے۔ نامور شخصیتوں کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے اسلام نے اس انداز کو کبھی بھی اختیار نہیں کیا۔ بلکہ اس نے معنوی اور ذہنی تقدیس و عظمت اور احترام پر زور دیا ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ذہنی تقدیس اور حرمت و عظمت کے اثرات مجسموں کی تنصیب سے کہیں زیادہ دیرپا اور گہرا اثر چھوڑ جانے والے ثابت ہوتے ہیں۔ آج تقریباً چودہ سو سال گزر جانے کے باوجود بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے راشدین اور دیگر ائمہ اور بزرگوں کی یاد مسلمانوں کے دلوں میں اس سے کہیں زیادہ تازہ ہے، جو یورپ کے لوگوں کے دلوں میں ان کے جگہ جگہ اپنی نامور شخصیتوں کے مجسمے نصب کر دینے سے ہو سکتی ہے۔ میں نے پیرس، لندن، ماسکو وغیرہ

یں خود اس امر کا مشاہدہ کیا ہے کہ نامور شخصیتوں کے مجسموں کے سامنے وہاں کے پڑھے لکھے تعلیم یافتہ باشندوں پر بھی وہ اثرات مرتب نہیں ہوتے، جو کسی جاہل سے جاہل مسلمان کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاے راشدین اور دیگر بزرگانِ دین کا محض نام لے دینے سے مرتب ہو جاتے ہیں حالانکہ ان تمام حضرات کے مجسمے کبھی بھی نصب نہیں کیے گئے۔

مجھے عرض کرنے دیجیے کہ مجسمے وہی قومیں نصب کرتی ہیں جو قدیم الایام سے بُت پرستی کرتی رہی ہیں اور جن کے ہاں ہمیشہ سے یہ ذہنیت کارفرما رہی ہے کہ جب کوئی ہیرو ان کی قوم میں پیدا ہُوا تو انھوں نے ہمیشہ اسے انسانوں کی صف سے الگ کر کے دیوتاؤں کی صف میں شامل کر دیا۔ کیونکہ ان کی عقل میں کبھی یہ بات آ ہی نہیں سکتی کہ ہیرو بھی انسان ہو سکتا ہے۔ اسی ذہنیت کے ماتحت انھوں نے اپنے ہیروؤں کو دیوتا بنا کر ان کے مجسمے نصب کیے۔ آج بھی وہی ذہنیت ایک دوسرے رُوپ میں اپنی نمایندگی کر رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ اسلام اس نقطۂ نظر کا حامی نہیں ہے۔

لاٹری اور سٹہ بازی بھی اس کی ایک مثال ہے۔ جس کے متعلق میرا خیال ہے کہ اس کا بظاہر گہرا ماحصل یہی ہے کہ اخلاق کے سرچشمے، جو ایمان کی گہرائیوں سے پھُوٹتے ہیں، ان کے سوتے دلوں میں خشک ہو گئے ہیں اور لوگ اس قدر مادہ پرست بن چکے ہیں کہ وہ مادی منفعت اور منفعت اندوزی کے علاوہ کسی چیز کو اہمیت ہی نہیں دیتے۔ جب تک اشیاے صرف کی قیمتیں نہ بڑھ جائیں، کسی نیک کام کے لیے ان سے ایک پیسہ وصول نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا سٹہ اور لاٹری کا ادارہ دلوں کے اخلاقی چشموں کے خشک ہو جانے پر مبنی ہے۔ دلی جذبات اور نفس کی گہرائیوں سے جب اخلاق کے سوتے پھُوٹتے ہیں، تو ان کا مظاہرہ ہمیشہ قربانی اور ایثار کی شکل میں ہوتا ہے۔ مگر یہاں تو اس کا ظہور قیمتیں بڑھانے کے خسیس اور ناجائز کسب کی صورت ہی میں ہو رہا ہے۔

اس قسم کے اور بھی بہت سے مسائل ہیں۔ میں یہاں چند مثالیں پیش کرنے پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں اس نوع کی خرافات یا اس قسم کے رجحانات کے درمیان جن کا نام میں "تکلف و تاویل" رکھتا ہوں اور نئے حوادث اور نئے واقعات کی کیفیات کا اندازہ لگانے کے درمیان، جن کے لیے واقعی شریعت اسلامیہ سے احکام مستنبط کرنے کی ضرورت ہے فرق کرنے کا قائل ہُوں۔ اس قسم کے مسائل کو میں آیندہ بیان کروں گا۔

اسلامی مفہومات میں رنگ آمیزی

اسلامی تصورات میں رنگ آمیزی کا رجحان جو آج دوسری تہذیبوں سے [illegible] کی بناء پر پیدا ہو رہا ہے، ہماری تاریخ میں کوئی انوکھا رجحان نہیں ہے ہماری پرانی تاریخ بھی اس قسم کے رجحانات سے بھرپور ہے۔ اس سے پہلے ہمارا ٹکراؤ اور تصادم یونانی فکر کے ساتھ ہو چکا ہے اور اس تصادم سے بے شمار نئے رجحانات پیدا ہُوئے تھے۔ مثلاً علم کلام کے مسائل۔ کیونکہ یہ بات تو ظاہر ہے کہ اسلامی عقیدہ نے یا زیادہ صحیح طور پر یہ کہہ لیجیے کہ اسلامی ایمان نے، کیونکہ عقیدہ کا لفظ بھی خود بعد کی پیداوار ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے عہد میں یہ فلسفیانہ جدلی صورت اختیار نہیں کی تھی جو عہد عباسی میں اسے حاصل ہوئی۔

اس سے پہلے ایمان کا لفظ —— ایمان قرآنی لفظ ہے —— عقلی اور نفسیاتی دونوں معنوں پر مشتمل تھا۔ یہ دونوں رجحانات، یعنی عقلی اور نفسیاتی، ظہور اسلام کے وقت ابتدائی عہد میں ایک دوسرے کے ساتھ ملے جُلے اور

پوری طرح ایک دوسرے میں گتھے ہوئے تھے۔ پھر ہم یکایک دیکھتے ہیں کہ اسلام کی تین الگ الگ شاخیں ہوگئیں۔ ایک شاخ تو فقہ کی تھی، جس کا کام عبادات و معاملات کے سلسلہ میں ظاہری احکام و شعائر سے بحث کرنا تھا۔ دُوسری شاخ وُہ تھی، جو اسلام کے اعتقادِ عقلی کے گوشوں سے بحث کرتی تھی۔ اس کو "علم کلام"، "عقیدہ" یا "علم توحید" کا نام دیا گیا۔ اسلام کی تیسری شاخ قلبی اور اخلاقی گوشوں سے تعلق رکھتی تھی۔ اسے اخلاق یا زہد کہہ لیجئے۔ یہ وہی شاخ ہے، جو صدر اوّل کے بعد تصوف کے نام سے پکاری گئی۔ لہٰذا اس کا ماحصل یہ نکلا کہ اسلام تین شعبوں سے مرکب مانا گیا، جن میں سے ہر ایک شعبہ ایک دوسرے سے الگ تھا۔ فقہ، کلام اور احسلاق۔

اس گزارش سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ فقہاءِ اسلام کو علم کلام سے کوئی واسطہ نہیں تھا یا متکلمین، سب کے سب فقہ سے، بالکل بے بہرہ ہوا کرتے تھے یا زہاد اور واعظ حضرات کو فقہ اور عقاید سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں پر کسی ایک شعبہ کا غلبہ ہُوا کرتا تھا۔ چنانچہ کچھ لوگ متکلم کہلاتے تھے، کچھ فقیہہ کہلاتے تھے اور کچھ زہاد اور صوفی کہلاتے تھے۔ اگرچہ بعض شخصیتیں ایسی بھی گزری ہیں، جو ان تینوں شعبوں کی جامع تھیں۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ اسلام جو کبھی ایک جامع وحدت ہوا کرتا تھا۔ اس کے بعد ان مختلف پہلوؤں میں بٹ گیا، جو ایک دُوسرے سے الگ الگ تھے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ خود اسلام کی اپنی صورت ہی چند گوشوں میں بٹ گئی۔ ایک اسلام تو علم کلام کا ہوگیا، دوسرا اسلام اخلاق کا قرار پایا گیا اور تیسرا اسلام فقہ کا سمجھ لیا گیا۔ حالانکہ اسلام تو اسلام ہی ہے۔ وہ نہ کلام کا اسلام ہے، نہ فقہ کا اسلام ہے اور نہ تصوف کا اسلام ہے۔ میرے نزدیک مختلف پہلوؤں والے اسلام کو ممکن ہی نہیں کہ اسلام کی مکمل اور کامل صورت سمجھا سکے۔ اسلام کے ان مختلف پہلوؤں میں بٹ جانے سے ہوسکتا ہے کہ علمی اور تدریسی اعتبار سے کچھ افراد کے لیے کسی قدر سہولت و کفایت ہوگئی ہو۔ لیکن ظاہر ہے کہ اجزاء سے وہ بات حاصل نہیں ہوسکتی، جو مرکب صورت میں ایک مجموعہ کے اندر ہوسکتی ہے۔ پہلی قسم کا اسلام صدرِ اوّل یعنی صحابہ کرام کا اسلام تھا، جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارد گرد جمع رہتے تھے۔ یہ اسلام ان تینوں اجزاء کو مرتب، متوازن اور زندگی بخش انداز میں جمع کیے ہُوئے تھا۔ لہٰذا یہ بات انتہائی ضروری ہے کہ ہم اسلام کو (فی ذاتہ) ان تصورات سے الگ کرکے دیکھیں، جو مختلف ادوار میں اسلام کو سمجھنے کے سلسلہ میں مسلمانوں نے قایم کیے تھے۔ ایک تو وہ اسلام ہے جو اپنی اصل اور سرچشمہ کے ذریعہ سے یعنی کتاب و سنت کے ذریعہ، جو اس کے اصلی مصادر ہیں، سمجھا جاسکتا ہے اور دوسرے ہر عہد کے مسلمانوں کی اپنی اپنی فہم ہے۔ چنانچہ ہر زمانہ میں بعض مسلمانوں نے اسلام کو سمجھنے میں غلطیاں بھی کی ہیں، لیکن ان غلطیوں سے اسلام کی ذات پر کوئی عیب نہیں لگایا جاسکتا اور نہ ہی اسلام کے اصل مصدر اور اس کی حقیقی صورت پر خورده گیری کی جاسکتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جس فہم کو ہم اسلام کی حقیقی تصویر سے قریب تر سمجھ سکتے ہیں اور جس سے ہم اسلام کو سمجھنے میں مانوس ہوسکتے ہیں، وہ درحقیقت صدرِ اوّل یعنی عہد صحابہ و تابعین ہی کی فہم ہوسکتی ہے۔ میرا مقصد اس بیان سے یہ نہیں ہے کہ بعد کے تمام زمانوں میں مسلمانوں نے اسلام کے متعلق جو کچھ سمجھنے کی کوششیں فرمائیں، میں خدانخواستہ ان کی تنقیص کروں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر زمانہ میں بڑے بڑے علماء، محققین اور ایسے ایسے حقایق کا ادراک کرنے والے پیدا ہوتے ہیں، جن کے حلقے اور سلسلے آج

تک جاری ہیں اور ختم نہیں ہوتے۔ بلکہ میرا مقصد صرف اتنا ہے کہ جب تک ہم اسلام کے رخِ تاباں سے ان حجابات و نقابات کو نہ اٹھائیں خواہ وہ ہمارے زمانہ کے ہوں یا پچھلے زمانوں کے، اسلام کی ذاتی اور حقیقی صورت ہمارے سامنے نہیں آسکتی۔ اسلام درحقیقت ایک نظامِ کامل ہے۔ وُہ اپنے طور پر خود زندگی کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ایک ایسا تصور ہے، جو خود وجود پر بھی حاوی ہے۔ اس کا تعلق صرف سمجھ لینے ہی سے نہیں بلکہ سمجھ کر اس پر یقین کرنا بھی ضروری ہے۔ پھر اس کے ساتھ ہی وہ ایک عملی نظام بھی ہے جس کے سوتے خود اس تصور اور ایمان ہی کے سرچشموں سے پھُوٹتے ہیں۔

اسلامی تصور یا اسلامی مفہوم کا ایک عام خلاصہ یہ ہوگا کہ یہ عالم طبعی جو انسان کو احاطہ کیے ہُوئے ہے اور یہ ساری کائنات جس میں انسان زندگی گزارتا ہے، اس کا اُفق اور اس کی مسافتیں کتنی ہی وسیع کیوں نہ ہو جائیں، یہ حقیقت اپنی جگہ پر اٹل ہے کہ یہ ساری کائنات ایک مخلوق ہے جس کے اُوپر ایک قوتِ خالقہ اور ایک حیاتِ مدرکہ موجود ہے۔ یہ خالق کی قوت ہے۔ اس کائنات اور اس سرزمین میں انسان بذاتہٖ اسی خدائے خالق کا خلیفہ ہے تاکہ وہ اس میں زندگی بسر کرے اور اس میں جو نعمتیں طبعیات اور ارزاق بلکہ حلال اور مشروع لذات کی پائی جاتی ہیں، ان سے استفادہ کرے مگر ساتھ ہی یہ بھی اچھی طرح سمجھ لے کہ اسے اپنی خلافت، استفادہ اور سعی و عمل کا حساب بھی دینا ہے اور اس قوتِ خالقہ، مدرکہ اور محاسبہ کے سامنے ہر بات کی جواب دہی بھی کرنا ہے۔ اس فہم اور ایمان سے عمل اور عبادت کے دو ہموار پہلو اور سوتے پھُوٹتے ہیں، جن میں شدید اتصال پایا جاتا ہے۔ یعنی مثلاً زمین میں کھیتی کرنا اور ساتھ ہی اس قوتِ خالقہ کی صنعت و کاریگری پر غور و فکر کرنا، جس نے زمین کو پیدا کیا اور اس میں انسان کے لیے طرح طرح کی نعمتیں پیدا کیں۔ یہ عمل اور عبادت دراصل ایک ہی قسم کی چیزیں ہیں چنانچہ وہ جب زمین میں ہل چلاتا ہے یا اپنے ہاتھ سے ہل کو حرکت دیتا ہے، تو وہ خدا ہی کی اطاعت کرتا ہے۔ وہ اس طرح جہاں اللہ کا مطیع اور فرمانبردار ہے وہیں اس کا عبادت گزار بھی ہے۔ اسی طرح جب وہ دن کی چند ساعتوں میں تنہائی میں اپنے خالق کا تصور کرتا ہے اور غور کرتا ہے کہ اس موجودہ زندگی کے بعد جواب دہی اور حساب کا مرحلہ بھی پیش آنا ہے، تو وہ اس وقت بھی خدا کا مطیع ہوتا ہے۔ اس فکر یا اس عقیدہ یا اس ایمان کے ماتحت صحیح طور پر کچھ اخلاقی تعلیمات جنم لیتی ہیں۔ یہ تعلیمات ایک طرف تو زندگی کے کچھ واقعی مسائل کو حل کرتی ہیں اور دوسری طرف وہ روحانی ترقی کے لیے بھی کام کرتی ہیں۔ اس طرح وہ اذہان کے لیے ایک وسیع میدان مہیا کر دیتی ہیں۔ انھیں متعین حدود میں کام کرنے کا موقع دیتی ہیں اور ان میں نظم و ضبط پیدا کرتی ہیں۔ اور اس انداز سے کام کرتی ہیں کہ اس کے تمام اعمال اخلاقی اور روحانی ترقی کے ساتھ ہم آہنگ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ میں اس موقعہ پر اسلام کے اخلاقی نظام کی تلخیص اس سے زیادہ الفاظ میں نہیں کر سکتا۔ پھر وہ انسان جو اس طرح کا ایمان رکھتا ہو اور زندگی میں اس انداز پر عمل کرتا ہو، وہ تنہا ایک فرد نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ ایک ایسا انسان ہوتا ہے، جو ایک اجتماعی ہیئت کا حصہ ہوتا ہے اور اسی اجتماع میں زندگی بسر کرتا ہے۔ اسلام ہی اس کے رجحانات، صفات اور افراد کے ایک دوسرے کے ساتھ باہمی تعلقات کی حد بندی کرتا ہے۔ اسلام اس فرد کی تکمیل کا سامان اس حیثیت سے کرتا ہے کہ وُہ ایک معاشرہ یا ہیئت اجتماعیہ کا جزو ہے۔ اس کے لیے ایسے قوانین اور ہدایات صادر کرتا ہے، جس میں فرد کی مصلحت اور جماعت کی مصلحت پورے

اعتدال و توازن کے ساتھ جمع ہو جاتی ہیں۔ وہ اس کے لیے ایک نظامِ اجتماعی قایم کرتا ہے، جو اس کی انسانی یعنی مادی اور روحانی ترقیات کا ضامن ہوتا ہے۔ یہ نظامِ اجتماعی نظامِ حکومت پر بھی مشتمل ہوتا ہے۔ جس کی بنیاد و اساس شوریٰ، مساوات، عدالت اور جواب دہی کے تصور پر قایم ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ نظامِ اجتماعی ایک اقتصادی نظام بھی پیش کرتا ہے، جو ایک طرف عدالت اور انصاف پر مبنی ہوتا ہے اور دوسری طرف باہمی اجتماعی کفالت پر بھی مبنی ہوتا ہے۔ وہ نظامِ اجتماعی ایک ایسے عائلی نظام پر بھی مشتمل ہوتا ہے، جس میں ایک طرف ابتدائی دور کے آزاد فطری رجحانات کا رنگ بھی جھلکتا ہے اور ساتھ ہی ایک تربیت یافتہ سلیم الطبع ہیئت اجتماعیہ کا رنگ بھی منعکس ہوتا ہے۔

یہ ہیئت اجتماعیہ جس کے سیاسی، اقتصادی اور عائلی پہلوؤں کی اسلام تنظیم کرتا ہے، تاکہ انسان اس کے ذریعہ سے سعادت و ارتقاء کی منزلیں طے کر سکے، دراصل چند اخلاقی اور اعتقادی بنیادوں پر ہی قایم ہے۔ جو اس کے نظام کے تنوں اور اس کی عمارت کی بنیادوں کا کام دیتی ہیں۔ چنانچہ اسلامی تشریع، جو اپنے موضوع اور تنظیم کے اعتبار سے چند ظاہری بنیادوں اور موضوعی ضوابط پر مبنی نظر آتی ہے، دراصل خود انسانی نفس میں اس کے اخلاقی بیج اور اعتقادی اصول جاگزیں ہوتے ہیں۔ وہی اسے غذا دیتے، اسے نشوونما دیتے اور استحکام بخشتے ہیں۔ لہٰذا ایک ایسی تشریع جس کا تعلق اخلاق سے منقطع نہ ہو، خواہ ان دونوں کی الگ الگ بنیادیں بھی کیوں نہ ہوں، کسی دوسرے انداز تشریع کے ساتھ ملتبس نہیں ہو سکتی۔ یہ اخلاق، خود بالذات یا عام فلسفہ یا کامل اعتقاد پر منحصر ہوتے ہیں۔

اس طرح اسلامی نظام میں اس کا عقیدہ یا فلسفہ اور اخلاق اور اجتماعی تشریع سب ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ایک مکمل وحدت کی تشکیل کر لیتے ہیں۔ جو زندگی کی وحدت کا سامنا کرتی ہے۔ اسلامی نظام کی یہی سب سے بڑی فضیلت ہے، جو اسے دوسرے نظاموں سے ممتاز کرتی ہے۔ کیونکہ تمام دوسرے نظام زندگی کے پہلوؤں میں سے محض کسی ایک پہلو ہی کی رعایت کرتے ہیں، اور یہ تمام پہلو ایک دوسرے سے الگ الگ ہوتے ہیں۔ وہ زندگی کی طرف اس حیثیت سے غور ہی نہیں کرتے کہ وُہ ایک مکمل وحدت ہے۔ وحدت، توازن، ترتیب و عمومیت ہی وہ خصائص کبریٰ ہیں، جو اسلامی نظام کو دوسرے نظاموں سے ممتاز کرتے ہیں، خواہ وُہ نظام مادی ہوں یا روحانی ہوں یا دینی ہوں۔

اسلامی نظام میں نسبتوں کی تعیین

اسلامی نظام میں وحدت کی خصوصیت کے علاوہ اسی کے پہلو بہ پہلو ایک دُوسری خصوصیت بھی ہے، جو اپنی اہمیت میں کسی طرح بھی وحدت کی خصوصیت سے کم نہیں ہے۔ اور یہ خصوصیت زندگی کے پہلوؤں اور اس کی اقدار کے درمیان نسبتوں کی تعیین ہے۔ چنانچہ مال، لذت، عمل، عقل، معرفت، قوت، عبادت، قرابت، قومیت اور انسانیت وغیرہ زندگی کی اقدار میں سے چند قیمتی اقدار ہیں۔ اسلام نے اپنے نظامِ حیات میں ان سب کا مرتبہ اور مقام متعین کر کے ایک نسبت مقرر کر دی ہے کہ وہ اس سے آگے نہ بڑھنے پائے تاکہ کوئی قدر کسی دوسری قدر پر زیادتی نہ کر سکے۔ چنانچہ ان اقدار کی نسبتوں میں کوئی ایسی تبدیلی عمل میں لانا کہ کوئی قدر اپنی حد سے بڑھ جائے اور کوئی قدر دوسری اقدار کی نسبت سے گھٹ جائے۔ اسلام کے لیے خالص طمع کاری اور فریب ہے۔ جیسا کہ عملاً

ہمارے آخری ادوار میں ہو رہا ہے۔ زندگی کے نظام میں نسبتوں کے درمیان کوئی تبدیلی عمل میں لانا ایسا ہی ہے، جیسے کوئی مصوّر کارٹون بناتے ہوئے جسمانی نسبتوں میں تغیر و تبدّل کر دے، جس میں انسان کے اہم اعضاء اور اجزاء تو سب کے سب موجود ہوں لیکن وہ اس انداز سے ہوں کہ اس سے مسخرا پن اور استہزاء ٹپکتا ہو، یا جیسے کسی مرکب دوا کے اجزاء میں نسبتوں اور اوزان میں تبدیلی کر دی جائے، جس سے دوا کا مقصد ہی فوت ہو جائے اور اس کی ساری صفات اور خصوصیات بدل جائیں بلکہ بسا اوقات وہ بجائے فائدہ رساں ہونے کے ضرر رساں بلکہ مہلک بن جائے۔ لہٰذا اگر ہم زندگی کے مثلاً سو جزو فرض کر لیں، تو ہم دیکھ سکتے ہیں کہ اسلام نے ان میں سے عبادت کے لیے چند اجزاء مخصوص کر دیے ہیں، انفاق، کسب، جہاد، مشروع لذتوں سے استفادہ وغیرہ۔ ہر بات کے محدود حصے مقرر ہیں۔ اگر ہم ان نسبتوں کو بدل دیں اور مثلاً جہاد کی قیمت گھٹا کر عبادت کی قیمت میں اضافہ کر دیں اور مثلاً مال کا حق کسب و انفاق پر دو اعتبار سے گھٹا دیں اور لذتوں کو گراں کر دیں یا انھیں لغو قرار دے دیں، تو اس طرح ہم اسلام کے نظام سے نکل کر کسی اور نظام میں داخل ہو جائیں گے، جو اپنی حقیقت اور رُوح کے اعتبار سے اسلامی نظام کے خلاف ہوگا۔ اس طرح ہم اس توازن کو برباد کر دیں گے، جو اسلام نے زندگی کے مختلف پہلوؤں میں قایم کیا ہے۔ چنانچہ آخری ادوار میں کامل مسلمان اسے سمجھا جاتا تھا، جو ہر وقت عبادت میں مصروف رہے، یہاں تک کہ کسی اور مشغلہ سے اسے سروکار ہی نہ ہو۔ محراب مسجد میں ہر وقت معتکف رہے اور اس سے کبھی جدا ہی نہ ہو۔ اپنے اذکار و اوراد میں چوبیس گھنٹے مصروف رہے۔ یہ صورت حال یقیناً اس صورت سے کوئی مشابہت نہیں رکھتی جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اصحاب نے، جو آپ کے بہترین پیروکار تھے، اپنی زندگی گزاری تھی۔ اگر عبادت ہی ان کی زندگی کا بنیادی جزو ہوتا، تو وہ جہاد کی طرف کبھی بھی مائل نہ ہو سکتے۔ معاشرہ کو فاسد عقاید سے آزاد کرنے کی راہ میں جہاد، صحیح عقاید کو لوگوں کے دلوں میں راسخ کرنے کے لیے جہاد، ظلم و استبداد سے نجات دلانے کے لیے، کمزوروں کی حمایت کے لیے، لوگوں کے درمیان عدل کے قیام کے لیے، جہاد کرنے کے لیے ان کے پاس وقت ہی نہ رہتا۔ بالکل اسی طرح ایسے مسلمانوں کی زندگی بھی، جو ہمہ وقت جہاد اور اصلاح معاشرہ ہی میں مصروف رہیں، اسلام کی مکمل تصویر کے مقابلہ میں ناقص ہی کہلائے گی۔ جب کہ اس کی زندگی عبادت کے عنصر سے بالکل ہی خالی ہو اور خدا کے ساتھ اس کا تعلق کمزور ہو۔

ہمارے فقہائے متقدمین کو اس تصوّر یعنی باہمی نسبتوں کے تصوّر کا پورا پورا احساس تھا۔ چنانچہ انھوں نے ان فرائض وغیرہ کو، جن کا ایک مسلمان سے مطالبہ کیا جاتا ہے، قوت کے اعتبار سے متفاوت درجات میں تقسیم کر دیا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسا کہ انھوں نے ممنوعات اور محرمات کے الگ الگ درجے قرار دیے ہیں۔ چنانچہ گناہ کے اعتبار سے وہ مجاہد اور سرحد کا محافظ جو جہاد کی صف میں اپنی جگہ کو چھوڑ دے اور وہاں دشمن کو گھس جانے کا موقع دے دے، اس شخص کے برابر نہیں ہوتا، جو شراب پی لیتا ہے یا سور کا گوشت کھا لیتا ہے۔ حالانکہ دونوں باتیں از روئے شریعت حرام ہیں۔ قرآن کریم کی آیات اور بے شمار احادیث بھی اس تصور یعنی تعیین مراتب کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

أجعلتم سقاية الحاجّ وعمارة المسجد الحرام كمن آمن بالله واليوم الآخر وجٰهد في سبيل الله لا يستوٗن عند الله ۚ (سورۂ توبہ، آیت ۱۹)

دکیا تم نے حاجیوں کو پانی پلا دینے اور مسجد حرام کو آباد رکھنے کو ان لوگوں کے اعمال کے برابر سمجھ لیا ہے، جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں؛ ہرگز نہیں۔ یہ سب اللہ کے نزدیک برابر نہیں ہوسکتے)

اگر ہم اس نوعیت کی احادیث جمع کرنا شروع کردیں، جو بعض اعمال کی قدروقیمت کچھ دُوسرے اعمال کے مقابلہ میں متعین کردیتی ہیں، تو ہم زندگی کی اقدار کی ریاضی کی کسور کے ساتھ نسبتیں مقرر کرسکتے ہیں۔ مثلاً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ امام عادل کا ایک دن کا عمل ساٹھ سال کی عبادت سے افضل ہوتا ہے[1]۔ نیز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ارشاد ہے کہ ایک عالم کی فضیلت ایک عبادت گزار آدمی پر ایسی ہی ہے، جیسے میری فضیلت تم میں سے کسی ادنیٰ آدمی پر[2]۔ نیز آپؐ ہی کا ارشاد ہے کہ ایک فقیہہ شیطان پر بہ نسبت ہزار عابدوں کے زیادہ گراں ہوتا ہے[3]۔

اس سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہوسکتی ہے، جو اپنی تمام تر توجہات کا رُخ کسی ایک امر کی طرف موڑ دیتے ہیں۔ جو اسلام میں فی ذاتہٖ مطلوب یا ممنوع ہوتا ہے۔ جب کہ اس کے مقابلہ میں دوسرے امور بھی ہوسکتے ہیں، جو اہمیت میں اس سے بڑھے ہوئے ہوں۔ مثلاً آج کل اسلامی ممالک دو بڑے خطرات سے دوچار ہیں۔ ان میں سے ایک استعمار ہے اور دوسرا الحاد۔ جن میں سے ایک زمین پر استیلاء اور غلبہ ہے اور دوسرا عقیدہ پر استیلاء اور غلبہ۔ یعنی اسلامی ممالک کی مادی اور معنوی دونوں قسم کی ثروتوں کا سلب ونہب۔ چنانچہ اگر کسی ملک پر مکمل استیلاء حاصل ہوجائے اور وہاں کے باشندوں کے عقاید کو ختم کردیا جائے اور یہ صورتِ حال کچھ عرصہ تک قایم رہ جائے، تو دینی شعائر کو قایم کرنے، اسلامی اوامر کی تعمیل کرنے، اس کے احکام کے اپنے حالات سے تطبیق دینے کے مواقع ہی کہاں باقی رہ سکتے ہیں۔ لہٰذا لوگوں کے اذہان کو دُوسرے معاملات کی طرف موڑنا اور انھیں اسلامی تنازعات کا محور بنا لینا درحقیقت بنیادی معاملات سے انھیں غافل کردینا ہے۔ ان میں سب سے اہم اور بنیادی چیز اسلامی ممالک پر براہِ راست یا بالواسطہ طور پر مغربی تسلّط و استیلاء ہے۔ اور ان مغربیوں کا مختلف طریقوں اور اسلوبوں سے اسلامی عقاید کی بیخ کنی کرنا اور ملحدانہ افکار و مذاہب کی اشاعت ہے، جس کی صورتیں ہر جگہ مختلف ہیں، تو کیا ایسی صورت میں یہ جائز ہوگا کہ مسلمانوں کو گروہوں میں تقسیم کردیا جائے، جن میں سے کچھ تو یہ کہہ رہے ہوں کہ تراویح کی رکعتیں آٹھ ہیں اور کچھ یہ دعویٰ کرتے ہوں کہ نہیں، یہ بیس ہیں۔ کچھ کا یہ نظریہ ہو کہ ایک مسجد میں دوبارہ جماعت سے نماز پڑھنا جائز ہے اور کچھ ان کے برخلاف اسے ناجائز سمجھتے ہوں۔ یا سنّت اور بدعت کے معرکے ایسے معاملات میں برپا کرنا، جن کا عقاید سے کوئی تعلق نہیں۔ مدعا یہ نہیں ہے کہ ان موضوعات پر علمی انداز سے بھی بحث نہ کی جائے، بلکہ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اس قسم کی تنبیہات اس وقت ضروری ہوسکتی ہیں، جب کہ عقاید و عبادت تک کوئی بات پہنچ جائے،

---

[1] ایک روایت میں ہے، کہ ایک گھنٹے کا عدل وانصاف ساٹھ سال کی عبادت سے افضل ہے۔ یعنی تمام رات کے قیام اور دن بھر کے روزہ سے افضل ہے اور ایک گھنٹے کا ظلم ساٹھ سال کے گناہوں سے زیادہ سخت ہے۔ اس حدیث کو طبرانی نے معجم کبیر اور اوسط میں بیان کیا ہے۔

[2] اس حدیث کو ترمذی نے بیان کیا ہے اور صحیح کہا ہے۔

[3] اس حدیث کو ترمذی نے بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔ صرف ولید بن مسلم اس کا راوی ہے۔

تو ایسی صورت میں عبادت وغیرہ کے متعلق صحیح طریقہ کی طرف متنبہ کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ عبادت کا معاملہ ایسا ہے کہ وہ سب کی سب توقیفی ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ حکم دے دیا ہے یا کر کے دکھا دیا ہے، اس میں نہ کمی کی جا سکتی ہے، نہ زیادتی۔ لیکن اس کے باوجود اگر اس سے بھی کوئی فتنہ پیدا ہوتا ہو یا مسلمانوں کی دو جماعتوں میں خصومت یا عداوت کی آگ بھڑکتی ہو تو میرے خیال میں اسے بھی چھوڑ دینا واجب ہے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے ایک ایسی ناگوار صورت حال پیدا ہونے کا اندیشہ ہے، جو اس اصل منکر (ناپسندیدہ عمل) سے بھی زیادہ منکر ہے۔ موجودہ احوال وظروف میں مسلمانوں کی قوت کو پراگندہ کر دینا اور عظیم بنیادی مقاصد کو چھوڑ کر فروعی باتوں کی طرف متوجہ ہونا کسی صورت جائز نہیں ہو سکتا۔ اس کا نتیجہ تو مسلمانوں کو چھوٹی چھوٹی متعدد ٹکڑیوں میں تقسیم کر دینا ہے، جو ان حالات میں خطرناک ترین جرم ہے۔

اسلام اور جدید مشکلات کا مقابلہ

نصوص کو سمجھنے میں تکلیف

مسلمانوں کو جب اس زمانہ میں مغربی تہذیب کا سامنا کرنا پڑا تو مسلمانوں نے مختلف موقف اختیار کیے۔ کیونکہ انہیں متنوع حالات سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ بعض اوقات مسلمانوں نے اسلام کی پیمائش دوسرے پیمانوں سے اور اس کے مسائل کا اندازہ ان اقدار سے کرنا شروع کر دیا، جو مسلمانوں کے اپنے نہیں تھے بلکہ دوسرے غیر مسلم نظاموں سے مانگے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ ایسے بھی نظر آتے، جو اسلامی نصوص کو سمجھنے میں تکلف برتتے اور الفاظ کے مدلولات کو سمجھنے میں ٹھوکریں کھانے لگے۔ اس کی مثال میں وہ لوگ پیش کیے جا سکتے ہیں، جو مالی ٹیکسوں کے شعبہ کا بالکلیہ انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسلام میں مالی ٹیکسوں کا کوئی وجود ہی نہیں۔ اسلام میں صرف زکوٰۃ ہے اور اس کے سوا کوئی ٹیکس نہیں۔ اگر یہ انکار کرنے والے دقیقہ رس ہوتے اور انہیں ذرا بھی واقفیت ہوتی، تو ان کو یہ بات معلوم ہونی چاہیے تھی کہ ٹیکس کی حقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ وہ مال کی ایک مقررہ مقدار ہوتی ہے، جسے حکومت لوگوں سے جبراً وصول کرتی ہے۔ اس کا ایک متعین طریقہ ہوتا ہے، جو مال کی مجموعی مقدار پر ایک محدود نسبت سے عاید کیا جاتا ہے۔ اگر ہم ٹیکسوں کے سلسلہ میں اسلام کے موقف کا مطالعہ کریں، تو ہم دیکھیں گے کہ اسلام بعض ٹیکسوں کو برقرار رکھتا ہے اور بعض ٹیکسوں کا انکار کرتا ہے۔ خود زکوٰۃ ہی کو لے لیجئے۔ وہ بھی ایک مالی ٹیکس ہے۔ یہی حال مثلاً خراج اور جزیہ کا ہے۔ اگر ہم یہ سوال پیش کریں کہ کیا حکومت کا لوگوں پر ایسے ٹیکس لگانا جائز ہے، جن کے متعلق کوئی شرعی نص وارد نہ ہوئی ہو، تو اس کا جواب یہی ہو گا کہ اسلام نے ایک قانون بنا دیا ہے، جو اس حدیث سے مستنبط ہوتا ہے، جو صحیح ترمذی میں نقل ہوئی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"فی المال حق سوی الزکوٰۃ"

(مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہوتا ہے)

اس حدیث نے حق کی کوئی تحدید نہیں فرمائی۔ اگر ہیئت اجتماعیہ کی مصلحت مال خرچ کرنے کی مقتضی ہو اور بیت المال میں اتنا مال موجود نہ ہو، جو کفایت کر سکے اور یہ مصلحت بھی ضروری ہو۔ مثلاً اسلامی مملکت کا دفاع یا فقرا یا مساکین کی ضرورتیں کو پورا کرنے

کے لیے اگر اموال زکوٰۃ کافی نہ ہو سکتے ہوں اور مزید اموال کی ضرورت ہو تو حکومت اور مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ صاحب مقدرت لوگوں کے اموال میں سے اتنا مال لے لے جو اس ضروری احتیاج کے لیے کافی ہو سکے۔ اس بنا پر یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ٹیکس لگانا فی نفسہ کوئی معیوب بات ہے۔ البتہ اگر حاکم کوئی ایسا مالی ٹیکس لگا دے، جس کا کوئی واقعی جواز موجود نہ ہو یا اس سے لوگوں کی ایک بڑی جماعت پر ظلم و ستم ہوتا ہو، تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ حاکم نے ظلم کا ارتکاب کیا ہے، جسے اسلام قبول نہیں کرتا۔ اس بات کی قطعی کوئی اہمیت نہیں کہ ٹیکس (''ضریبہ'') کا لفظ یا اصطلاح جدید زمانے کی پیداوار ہے۔ یہ لفظ یا اصطلاح قدیم زمانے میں نہیں پائی جاتی تھی۔ اس لفظ یا اصطلاح کے نئے ہونے سے یہ استدلال تو نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا مدلول اور اس کے معنی بھی قدیم زمانہ میں موجود نہ تھے۔ بلکہ حقیقت حال تو اس کے برعکس ہے۔ کیونکہ اس کا مدلول (یعنی رعیت کے مال میں حکومت کی طرف سے اپنے لیے کچھ کم حصہ مقرر کر دینا) قدیم زمانہ میں بھی معروف تھا۔ حتیٰ کہ دراصل زکوٰۃ بھی خود اس وسیع مفہوم کے تحت آتی ہے۔ البتہ زکوٰۃ ٹیکس کی کم سے کم مقدار ہے، جو لامحالہ ضروری ہے اور جب ہم اس حدیث پر غور کریں جو یہ بتا رہی ہے کہ مال میں زکوٰۃ کے سوا بھی دوسرے حقوق ہوتے ہیں اور ساتھ ہی اس دوسری حدیث پر بھی غور کریں، جسے امام مسلم نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے کہ ابو سعید خدریؓ کا بیان ہے کہ'' ہم ایک مرتبہ حضورؐ کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ یکایک ایک آدمی اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر آیا اور دائیں بائیں نظریں گھمانے لگا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس کے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ سواری ہو تو وہ اسے دے دے، جس کے پاس سواری نہیں ہے اور جس کے پاس ضرورت سے زیادہ زادِ راہ ہو، تو وہ اسے دے دے جس کے پاس زادِ راہ نہیں ہے، اور اس کے بعد مال و دولت کی بہت سی اقسام بیان فرمائیں، حتیٰ کہ ہمیں نظر آنے لگا کہ ضرورت سے زیادہ کسی چیز میں بھی ہمارا اپنا کوئی حق نہیں ہے۔'' مجھے عرض کرنے دیجیے کہ جب ہم ان دونوں حدیثوں پر غور و فکر کرتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ حکومت کو یہ حق حاصل ہے (جیسا کہ ہمارے فقہائے کرام نے بھی بیان فرمایا ہے) کہ جب ضرورت مقتضی ہو اور مصلحت عامہ کا مطالبہ ہو، تو وہ لوگوں کے ایسے اموال سے، جو ان کی اصل اور بنیادی ضرورت سے زیادہ ہو، اتنا کچھ لے سکتی ہے، جس سے وہ ضرورت اور مصلحتِ عامہ پوری ہو سکے۔ اس حدیث سے یہ بات بھی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ ضرورت سے زیادہ اموال کی ملکیت کے معنی اسلامی مفہوم میں یہی ہیں کہ وہ اس نوع کی ملکیت ہے، جسے حکومتِ وقت ضرورت اور مصلحت عامہ کے ساتھ محدود کر سکتی ہے۔ البتہ ضرورت اور مصلحت کا اندازہ کرنا حاکم کی خواہشات کے تابع نہیں بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ شریعت کے ان مقاصد کی روشنی میں، جو شرعی نصوص سے مستنبط ہوں، ان کا اندازہ لگایا جائے اور صرف ضرورت ہی کی حد تک رہا جائے، اس سے تجاوز نہ کیا جائے۔ ہمارے فقہائے کرام نے بھی ان حالات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، جن میں حکومت کو مالداروں کے اموال یا لوگوں سے زائد از ضرورت اموال لے لینے کا حق حاصل ہو جاتا ہے تاکہ ان کے ذریعہ ضروری احتیاج کو رفع کیا جا سکے۔

جدید حالات پر شریعت کے قوانین کی تطبیق

زمانے کی رفتار بڑی تیز ہے۔ آئے دن ایسے نئے حالات و واقعات پیش آتے رہتے ہیں، جن کا تقاضا ایسے نئے فیصلے کرنے کا ہوتا ہے جو شریعت کے مبادی پر مبنی اور اس کے نصوص اصول عامہ اور مقاصد سے مستنبط ہوں۔ اس کی مثال ہمارے اس دور میں محنت کشوں کے مسائل ہیں۔ بعض لوگ کہنے لگے ہیں کہ مزدور یا کاریگر سرمایہ دار کا ایک اجیر (اُجرت پر کام کرنے والا) ہوتا ہے۔ اس لیے

اس پر اجارہ کے وہی احکام منطبق ہونے چاہئیں جو کتب فقہ میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں۔ جو معاہدہ مزدور اور کارخانہ دار کے درمیان طے پا چکا ہے، جب تک اس میں شرائطِ اجارہ پوری طرح موجود ہوں، تو ان ہی کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا۔ کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ کارخانہ دار پر یا مزدور پر کوئی دوسری شرط اپنی طرف سے عاید کر سکے۔ مثلاً اجرتوں پر نظرِ ثانی یا اوقاتِ کار کی کوئی نئی پابندی ممکن نہیں۔

اگر ہم اس مسئلہ پر شریعت کی روح کو سامنے رکھ کر غور کریں، تو ہمیں نظر آئے گا کہ یہ خیال بالکل ہی سطحی بلکہ ناقابلِ قبول ہے اور آجکل کے پیچیدہ حالات سے ناواقفیت اور شریعت کی رُوح سے جہالت پر مبنی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مزدور اکثر اپنی ضرورت کی وجہ سے مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ اس اجرت کو قبول کرلے، جو اسے پیش کی جارہی ہے حالانکہ یہ اجرت اکثر و بیشتر اس اجرت سے کم ہوتی ہے جس کا وہ واقعی طور پر مستحق ہے۔ یہ پیچیدگی اس وقت اور بھی شدّت اختیار کر جاتی ہے جب کارخانہ دار کوئی فردِ واحد ہو یا مشترکہ سرمایہ کی کمپنی، یا چند کمپنیوں کا کارٹل، جنھوں نے آپس میں گٹھ جوڑ کر کے یہ طے کر لیا ہو کہ وُہ مزدوروں کو معمولی اور ناقابلِ ذکر اجرت سے زیادہ نہیں دیں گے۔ کیونکہ انھیں تو زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کی حرص ہوتی ہے اور روزگار کی تلاش میں سرگرداں کاریگروں کی شدید احتیاج سے وہ ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ اکثر کارخانہ دار اپنے کاریگروں سے لمبے لمبے گھنٹوں تک پُرمشقت کام لیتے ہیں، جیسا کہ یورپ میں مشینی صنعت کے ابتدائی دور میں ہوتا رہا ہے۔ ان جیسے حالات میں تھوڑے سے مالدار اور با رسوخ لوگ ہزاروں کاریگروں سے جو غریب، حاجت مند اور بے رسوخ ہوتے ہیں، اپنے فیصلوں کو منوانے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

تو کیا ہم ان مزدوروں کو ان کے فقر اور بدحالی میں چھوڑ دیں؟ اسلام اس مشکل کا یہ علاج کر سکتا ہے کہ وہ غریب کاریگروں کو بیت المال سے مالی امداد دے جب کہ ان کا فقر و فاقہ کارخانہ داروں کے ظلم و ستم کا نتیجہ نہ ہو اور اگر بیت المال میں زکوٰۃ کی مد میں اتنا مال و دولت نہ ہو، جو اس ضرورت کو پورا کر سکے، تو حکومت مالداروں پر مزید ٹیکس لگا سکتی ہے تاکہ اس سے ان فقراء کی ضروریات پوری کی جا سکیں، لیکن جب یہ فقر و فاقہ ان کارخانہ داروں کے ظلم و ستم کا نتیجہ ہو، وہ انہیں کے استحقاق سے بہت ہی کم اجرت دیتے ہوں، یا منافع کی تقسیم میں عدالت اور انصاف کا جو تقاضا ہونا چاہیے کارخانہ دار اس کا لحاظ نہ رکھتے ہوں، مزدوروں کو بہت کم اجرت دے کر خود بے اندازہ منافع لے اڑتے ہوں، تو ان صورتوں میں حکومت کا یہ منصب ہے کہ وہ اس معاملہ میں مداخلت کرے اور انصاف و عدالت کے مطابق اجرت کا تعین کر دے۔ فقہی طور پر یہ مسئلہ "باب التسعیر" (نرخ بندی) میں داخل ہے۔ جس طرح سامانِ تجارت اور اشیاءِ صرف کی قیمتیں مقرر کی جاتی ہیں، اسی طرح محنت کی اجرت اور قیمت مقرر کی جا سکتی ہے۔ اگر اشیاءِ خوردنی کی ذخیرہ اندوزی کی جارہی ہو اور اس کی وجہ سے کھانے پینے کی چیزیں ظالمانہ نرخوں پر فروخت کی جارہی ہوں، تو اکثر فقہاء نے صراحۃً حکومت کی طرف سے نرخ مقرر کرنے کا فتویٰ دیا ہے۔ اس فیصلے کو سامنے رکھتے ہُوئے یہ کہنا غلط نہیں کہ محنت بھی دیگر اشیاءِ صرف ہی کی طرح ہے اور اس کی بھی شرح منضبط ہونی چاہیے۔ ایک حدیث میں ہے کہ:

اُعطوا الاجیر اجرہٗ قبل ان یجف عرقہٗ۔

(مزدور کو اس کی مزدوری اس سے پہلے دے دو کہ اس کا پسینہ خشک ہو جائے۔)

ایک اور حدیث میں جو صحیح بخاری میں ہے، یہ مضمون آیا ہے:

ثلثة انا خصمهم یوم القیامة رجل اعطی بی ثم غدر ورجل باع حُرًّا فاکل ثمنه ورجل استاجر اجیرا فاستوفی منه و لم یعطه اجره۔

(تین آدمی ہیں جن سے میں خود قیامت کے دن جھگڑوں گا اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ جب میں جھگڑا کروں گا تو میں غالب بھی آجاؤں گا۔ ایک تو وہ شخص ہے جسے میرا واسطہ دیا گیا اور پھر بھی اس نے عہد شکنی کی ہو۔ دُوسرا آدمی وُہ ہے جس نے کسی آزاد آدمی کو غلام بنا کر فروخت کر دیا ہو اور اس کی قیمت کھا گیا ہو۔ تیسرا آدمی وہ ہے جس نے اجرت پر کسی مزدور کو رکھا ہو اور اس سے کام تو پورا لے لیا ہو مگر اس کی اجرت پوری پوری ادا نہ کی ہو)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دونوں حدیثوں میں اجرت سے مقصود عدل و انصاف پر مبنی اجرت ہے، جس کا مزدور مستحق ہوتا ہے۔ وہ ظالمانہ اجرت نہیں، جسے وُہ شدتِ ضرورت کے تحت بظاہر رضامندی مگر درحقیقت سخت بددلی سے لیتا ہے۔ دوسری احادیث میں اس کی بھی ممانعت آئی ہے کہ بچوں اور باندیوں کو محنت و مزدوری کرنے پر مجبور کیا جائے، کیونکہ وُہ اس طرح چوری کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں:

عن عثمانؓ: قال لا تکلفوا الصبیان الکسب فانکم متی کلفتموهم سرقوا الحدیث۔

اخرجه المالك فی المؤطا۔

جیسا کہ دوسری احادیث میں خدام سے اتنا کام لینے کی ممانعت فرمائی گئی ہے، جو ان کی بساط سے زیادہ ہو:

و لا تکلفوهم من العمل ما یغلبهم -الحدیث- اخرجه الخمسة الا النسائی-

یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ حکومت کو مباحات میں پابندیاں لگانے یا ان پابندیوں کو نافذ کر دینے کا حق ہے، جب کہ اس میں مصلحت عامہ مضمر ہو۔ ان تمام ہدایات میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ انھیں محنت کے نظام کی بنیاد بنایا جا سکے، جس سے لوگوں کے حقوق کی حفاظت ہو سکے۔ خواہ وہ کاریگر ہوں، یا کارخانہ دار، یا سرمایہ دار کیونکہ جس طرح یہ ممکن ہے کہ سرمایہ دار، مزدور اور کاریگروں پر ظلم کرنے لگیں، اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ واقعات اس کے برعکس پیش آنے لگیں۔ یعنی کاریگر اپنی کثرت تعداد، شور و شغب کی شدت اور بعض اوقات حکام پر غلبہ و تسلط پا جانے کی وجہ سے ناحق کے مطالبات پیش کرنے لگیں۔ اگرچہ زیادہ تر حالات میں پہلی ہی صورت وقوع پذیر ہوتی ہے۔ لہٰذا شریعتِ اسلامیہ میں حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ عدل کو قایم کرے اور ہر شخص کو اپنی حدود میں رکھے اور قوانین شریعت کے مطابق ہر شخص کو وہ کچھ دے، جس کا وہ مستحق ہے۔ قوانینِ شریعت میں تین باتیں خصوصیت کے ساتھ ملحوظ رکھی گئی ہیں:

۱۔ مصالح عامہ،

۲۔ لوگوں کے حقوق اور

۳۔ لوگوں کا آپس میں ایک دُوسرے کے ساتھ عدل و انصاف۔

یہاں یہ بات نہیں کہی جا سکتی کہ امور مندرجہ بالا کا تعلق تو تشریع سے ہے اور حکومت کو تشریع کا حق نہیں۔ کیونکہ اسلامی نظام میں تشریع کا حق صرف خدا ہی کی ذات کو حاصل ہے۔ اس قسم کے دعاوی ایک شدید مغالطہ پر مبنی ہیں۔ آجکل تشریع کا لفظ بھی بالکل ہی نئی اصطلاح میں استعمال ہونے لگا ہے۔ وہ حالات جو ہم نے اوپر بیان کیے ہیں۔ مثلاً اجرتوں کی تجدید۔ اوقات کار کی تحدید، اور دوسری پابندیاں، یہ درحقیقت تشریع نہیں بلکہ حالات کو قوانینِ شریعت سے تطبیق دے کر خود شریعت ہی کے احکام کو نافذ کرنا ہے۔ یہ مسائل سیاست شرعیت کے باب سے تعلق رکھتے ہیں، جس کی شارع نے حکومتِ وقت کو اجازت دی ہے تاکہ لوگوں کے درمیان عدل و انصاف قایم رکھا جا سکے۔ اگر آج کچھ لوگ اس کا نام تشریع رکھ لیتے ہیں، تو اس سے یہ چیز ممنوع نہیں ہو جاتے گی۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ ان لوگوں کا یہ نام رکھنا درست ہے یا غلط۔ معتبر وہ مفہوم ہے جس پر کوئی لفظ دلالت کرتا ہے اور وُہ فیصلہ، جو اسلام اس کے بارے میں کرتا ہے، ناموں کا اعتبار نہیں۔

اصطلاحات اور جدید تصنیفات

جن حالات میں اکثر التباس اور غلطی واقع ہو جاتی ہے، جدید اصطلاحی الفاظ کا استعمال بھی ہے۔ نیز اصطلاحات کی جدید تصنیف بھی ہے۔

نئے الفاظ اور اصطلاحات کا استعمال بڑے خطرناک نتائج پر منتج ہوتا ہے اور بسا اوقات انحراف یا نامانوس مفہومات کو داخل کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ بعض اوقات تو محض اصطلاح مقرر کرنے کی بات ہوتی ہے، جس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ مثلاً اگر ہم نکاح و طلاق، نفقہ و وصیت اور میراث کے احکام کو کسی ایک باب میں جمع کر دیں اور اس باب کا نام "احوال شخصیہ" یا "عائلی احکام" رکھ دیں یا ہم ان احکام کو جن کا تعلق دوسری حکومتوں کے ساتھ اسلامی حکومت کے تعلقات سے ہے "علاقات خارجیہ" یا "بین الاقوامی قانون" کے عنوان کے تحت ایک جگہ جمع کر دیں اور اصل احکام میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہ کریں، تو اس طرح ہم اسلام کے احکام اور ان کے مفہومات میں کسی خلل اندازی یا کسی رنگ آمیزی کے مرتکب نہیں ہوں گے۔ خود فقہاء کی مقرر کردہ بہت سی اصطلاحات بھی آغازِ اسلام کے بعد کے عہد کی پیداوار ہیں۔ مگر ان باتوں کے باوجود یہ واقعہ ہے کہ ایسا کرنا بعض اوقات عیوب و آفات سے خالی نہیں ہوتا، کیونکہ بعض مسائل کو دوسرے مسائل سے جُدا کر کے ایک خاص عنوان کے تحت جمع کر دینے سے اکثر ان مسائل کا تعلق دوسرے مسائل سے منقطع ہو جاتا ہے یا کم از کم وہ تعلق مخفی ہو جاتا ہے جو فی نفسہ بعض حالات میں مقصود ہو سکتا ہے۔ اس کی ایک مثال "عقیدہ" کا لفظ ہے۔ میں نے یہ لفظ کتاب اور سنّت کی نصوص میں کہیں نہیں پایا اور میرا خیال ہے کہ یہ لفظ عباسی عہد میں اس معنی کے لیے گھڑا گیا ہے، جس میں آجکل وُہ استعمال ہو رہا ہے۔ جو لفظ قرآن و حدیث میں مستعمل ہے، وہ "ایمان" کا لفظ ہے۔ "عقیدہ" کا لفظ ائمہ اور علماے اسلام میں سے بے شمار لوگوں نے ان بنیادی افکار کے معنی میں استعمال کیا ہے، جن کی تصدیق کرنا، جنھیں قبول کرنا اور جن کا اعتقاد رکھنا دین پر ایمان لانے والے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ چونکہ سلف میں سے ہمارے ائمہ اور علماء نے اس لفظ کو ان معنوں میں استعمال کیا ہے، اس لیے اس بات کی دلیل بھی ہے کہ یہ جائز ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس سے انکار ممکن نہیں کہ ایسا کرنے سے ہمارے

یہاں عقلی عنصر جو عقیدہ کا مفہوم ہے، نفسیاتی عنصر سے بالکل الگ ہو گیا ہے حالانکہ "ایمان" کا مفہوم جو قرآن و حدیث میں مستعمل ہے ان دونوں کا مجموعہ تھا۔ اس طرح عقیدہ کی بحثوں کو ایک خاص علم یعنی علم کلام میں جمع کر دینے سے عقیدہ کا لفظ محض عقلی بحثوں کے ساتھ مخصوص ہو کر رہ گیا قلبی اور نفسیاتی پہلو کے مباحث سے ان کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا قلبی اور نفسیاتی مباحث کے لیے ایک الگ علم مخصوص ہو گیا ہے۔ اصول ایمان اور مسائل اعتقاد کو ایک باب میں "عقیدہ" کے عنوان کے تحت جمع کر دینا بلاشبہ ایک صحیح کام ہے، جس میں کوئی برائی نہیں، عقیدہ کا ایک نیا لفظ گھڑ لینے سے بھی یہ بات نہیں ہوئی کہ اس کا کوئی نیا مفہوم پیدا کر لیا گیا ہو یا اس کے مشمولات میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کر لیا گیا ہو۔ بلکہ اس سے یہ فائدہ بھی پہنچا کہ اعتقادیات کے مسائل ایک مقام میں مجتمع ہو کر دوسرے مسائل سے ممتاز ہو گئے، جس سے ان کی وضاحت میں کافی اضافہ ہو گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ نقصان بھی پہنچا، کہ زندگی کی وہ وحدت جس پر "ایمان" کا ایک لفظ دلالت کرتا تھا، دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ "ایمان" کا لفظ عقل اور جذبات، یا عقل اور قلب دونوں عناصر کو شامل تھا مگر اس تقسیم کے بعد عقلی پہلو نفسیاتی اور قلبی پہلو سے قطعاً الگ ہو کر رہ گیا۔

ایک دوسری صورت بھی ہے، جس میں کسی لفظ کی کسی خاص تعبیر یا کسی خاص لفظ کے استعمال سے بڑا خطرہ اور گہرا اثر مرتب ہو جاتا ہے۔ بعض دفعہ اس سے اصل مفہوم ہی بدل جاتا ہے اور بعض مرتبہ ایسے نئے نئے مفہوم اسلام میں داخل ہو جاتے ہیں، جو اسلام کے لیے نامانوس ہوتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ایک عقیدہ سے کسی دوسرے عقیدہ کی طرف یا ایک مذہب و نظام سے کسی دوسرے مذہب یا نظام کی طرف جب الفاظ کو منتقل کیا جاتا ہے، تو وہ اپنے ساتھ اپنے ان تمام ظاہری رسوم اور باطنی مفہومات کو بھی کھینچ لاتے ہیں، جو اس معاشرہ سے تعلق رکھتے تھے جس میں وہ اب تک استعمال ہوتے رہے تھے۔ مثلاً: جمہوریت، اشتراکیت، حریت و آزادی کے الفاظ خاص فضاؤں اور متعین معاشروں میں پروان چڑھے اور ان میں خاص مفہوم اور خاص نظریات پیدا ہو گئے۔ اس کے بعد جب ہم اسلام کے نظام اور اس کے مفہومات کی تعبیر کرتے ہوئے ان الفاظ کو استعمال کرتے ہیں، تو اگر ہم باریک بینی اور اسلامی احتیاط سے متصف نہ ہوں، تو ہم اسلام کے اندر نامانوس مفہومات کو داخل کرنے یا اسلامی نقطۂ نظر میں انحراف پیدا کرنے کا خطرہ قبول کر لیتے ہیں۔ اس کی وضاحت ہم آگے چل کر ذرا تفصیل کے ساتھ کریں گے۔

ان تعبیرات (EXPRESSIONS) کی مثالیں بہت ہیں۔ جنہیں ہم نے دوسری زبانوں سے اپنے ہاں منتقل کیا ہے اور اس ضمن میں ہم نے ان نقطہ ہائے نظر کو بھی منتقل کر لیا ہے، جن کی یہ تعبیرات حامل تھیں۔ ہمارے بزرگ ان تعبیرات کو اپنی کتابوں میں لکھتے ہیں اور ہمارے بچے ابتدائے عمر سے انھیں سکولوں میں پڑھتے ہیں۔ مثلاً ہم بے تکان بولتے ہیں: "فطرت نے ملک شام کو بڑی زرخیز وادی عطا کی ہے۔ اس کے ساحلی مقامات کو فطرت نے موسلا دھار بارشوں سے شاداب کر دیا ہے۔" یا "فطرت ناراض ہو گئی۔ بارشوں کے سلسلے میں اس نے بخل برتا اور سمندر کی موجوں کو اس نے بے قابو کر دیا۔" یہ اور اس قسم کی دوسری تعبیرات دراصل یورپ کی اٹھارویں صدی کے نقطۂ نظر کی پیداوار ہیں، جس کے سبب انہوں نے خدا کی جگہ فطرت کو براجمان کر کے اسے خدا بنا لیا تھا اور خدا کے وجود سے انکار کر بیٹھے تھے۔ یہ کھلی ہوئی ملحدانہ فکر ہے۔

مبتدیوں کے کانوں میں ان تعبیرات کو بار بار ڈالتے رہنا بالواسطہ طور پر الحاد کے نظریہ کی تلقین کرنا ہے۔ بلکہ لاشعوری طور پر لوگوں میں اس کی ترویج و اشاعت کرنا ہے۔ اسی ضمن میں انبیاء کرام کے لیے "عظیم شخصیت" (HERO) "نابغہ" اور "عبقریت" (GENIUS) وغیرہ الفاظ کا استعمال بھی آجاتا ہے۔ میرا مقصد یہ نہیں کہ میں انبیاء کرام سے ان صفات کی نفی کا قائل ہوں لیکن میری رائے یہ ضرور ہے کہ ان الفاظ کو بکثرت دہراتے رہنے اور ان الفاظ پر اکتفا کرنے سے یہ نتیجہ برآمد ہو رہا ہے کہ "عظمت شخصیت" (HEROISM) نابغگی اور عبقریت کا مفہوم وحی اور نبوت کے مفہوم کی جگہ لیتا جا رہا ہے۔ حالانکہ نبوت اپنی فطرت اور نوعیت کے اعتبار سے ان اوصاف سے کہیں زیادہ ارفع و اعلیٰ ہے۔ یہ صفات اگرچہ نبوت کے منافی نہیں . . . . بلکہ اکثر یہ تمام صفات نبوت کے تحت ہی آجاتی ہیں کیونکہ یہ تو معمولی صفات ہیں، جن کے ساتھ موصوف ہو کر انسانوں کے بعض عام افراد بھی اپنے ارد گرد کے لوگوں سے متمیز ہو جاتے ہیں۔ مثلاً شدت ذکاوت وغیرہ۔ کیونکہ بہر حال یہ سب کی سب وہ بشری صفات ہیں، جو عادۃً انسانوں کو حاصل ہوا ہی کرتی ہیں۔ لیکن نبوت کا مفہوم خدا کے ساتھ انسان کے ایک خاص تعلق پر مبنی ہوتا ہے کہ خدا کسی خاص بشر ہی کو اس تعلق کے لیے منتخب فرماتا ہے۔ یہ تعلق اور اتصال کیسا ہوتا ہے؛ اس کی کیفیت کیا ہوتی ہے؛ اور قدرت الٰہیہ کے ساتھ اس کی حقیقت اور کنہ کیا ہوتی ہے؛ یہ سب باتیں ہم نہیں جان سکتے۔

نئی قسمیں اسی زمرہ میں ان تعبیرات کا استعمال بھی آجاتا ہے، جن سے آج عرب ممالک کے اجتماعات کی ابتدا ہوتی ہے۔ مثلاً بسم اللہ والوطن (خدا اور وطن کے نام سے) یا بسم اللہ والشعب (خدا اور قوم کے نام سے) یا بسم اللہ والعروبۃ (خدا اور عربیت کے نام سے) یا کسی کہنے والے کا یوں کہنا "میں خدا اور وطن کی قسم کھاتا ہوں" یا "میں اللہ اور قومی شرف وعظمت کی یا قومیت کی قسم کھاتا ہوں"۔ یہ تمام تعبیرات دراصل یورپ کے معاشرہ میں پیدا ہوئیں اور وہیں سے ہمارے ہاں آئی ہیں۔ کیوں کہ انہوں نے ان اقدار کو خدا بنا رکھا ہے۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ وہ ان اقدار کی اس قدر تعظیم کرنے لگے ہیں کہ وہ تعظیم تقدس کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ انہوں نے ان اقدار کو خدا کے ساتھ ایک ہی درجہ پر رکھ چھوڑا ہے۔ جب کہ اسلام ان تمام صورتوں میں ایک قسم کا بت پرستانہ رجحان سمجھتا ہے۔ کیونکہ خدا ہی وہ واحد بلند اور مطلق قدر ہے، جس کا مقابلہ کوئی قدر نہیں کر سکتی۔ خدا کے سوا جتنی بھی قدریں ہیں، خواہ وہ کتنی ہی محبوب، معظم اور عزیز کیوں نہ ہوں، وہ خدا کے مقابلہ میں سب کی سب فرعی اور ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کا مرتبہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو جائے مگر خدا کے ساتھ ان کو ملانا جائز نہیں۔ اسی کی ایک مثال "ایمان" کے لفظ کو جگہ بے جگہ استعمال کر لینا بھی ہے مثلاً لوگ کہہ دیا کرتے ہیں "میں تو وحدت یا قومیت یا قبیلہ اور خاندان پر ایمان رکھتا ہوں"۔ ایمان کے لغوی معنی عام طور پر تصدیق کرنے کے ہوتے ہیں اور شریعت میں اس لفظ کو دین کے بنیادی عقاید کی تصدیق کے لیے مخصوص کر لیا گیا ہے۔ چنانچہ آپ کہتے ہیں کہ "میں خدا پر، یوم آخر پر اور نبیوں پر ایمان لاتا ہوں"۔ لہٰذا دوسرے مقام پر اس لفظ کو استعمال کرنا اسی نقطۂ نظر سے پیدا ہوا ہے، جسے ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ وہ ان اقدار کو خدا بنا لینے پر مبنی ہے۔ ایسا کرنا دراصل اس عہد میں پرانے بتوں کی جگہ نئے اصنام کو قائم کرنے کے مترادف ہے۔ سلامت روی کی جو تعبیر اسلامی نقطۂ نظر سے ہم آہنگ ہو سکتی ہے وہ یہی ہو سکتی ہے کہ "میں خدا پر ایمان لاتا ہوں اور اپنے وطن سے محبت کرتا ہوں اور قوم پر اعتماد کرتا ہوں اور وحدت و اتفاق سے تمسک کرتا ہوں۔ خدا ہی کی طرف جھکتا ہوں اور اسی کے لیے کوشش

کرتا ہوں "

یہ دو صورتیں ہیں، جو ہم نے اوپر بیان کی ہیں۔ پہلی صورت تو یہ ہے کہ کچھ الفاظ بطور جدید اصطلاح کے استعمال کیے جائیں اور بس۔ یہ کسی جدید تصور پر مشتمل نہیں ہوتے۔ ان کا استعمال جائز ہے۔ اس کی مثال ہم نے شخصی حالات سے دی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ ہم نے قابلِ غور باتیں بھی بیان کر دی تھیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ الفاظ اور تعبیرات جدیدہ یا منقولہ کو استعمال کر کے ہم اپنے ہاں جدید مفہوموں کو داخل کر لیں اور اجنبی اور مخالف نقطہ ہائے نظر کی طرف جھک پڑیں۔ جو بعض اوقات اصل اور صحیح رجحان سے بنیادی انحراف تک پہنچ جاتا ہے۔

اس کے بعد ایک تیسری صورت بھی ہے، جو ان صورتوں سے زیادہ نازک اور زیادہ خطرناک ہے۔ یہ صورت کسی مذہب یا نظام کے مفاہیم و افکار کو دوسرے مذہب یا نظام میں منتقل کرتے ہوئے پیش آتی ہے۔ کیونکہ ہر دینی یا اجتماعی مذہب، مثلاً اسلام، مسیحیت، اشتراکیت، جمہوریت وغیرہ کے اپنے اپنے مفہوم ہوتے ہیں اور اپنی اپنی قدریں ہوتی ہیں اور ہر مفہوم اور ہر قدر کے لیے ایک خاص تعبیر ہوتی ہے جو اس پر دلالت کرتی ہے۔ اسی طرح ہر زبان کی اپنی اصطلاحات ہوتی ہیں، جو کسی مفہوم اور قدر کے لیے مخصوص ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ اسلامی مفہومات اور احکام کو دوسرے مذاہب کے لوگوں کے لیے جن کی زندگیاں اپنے مخصوص نظاموں اور مذہبوں سے متعلق معاشروں میں ہی گزری ہیں منتقل کرنے لگتے ہیں، تو چونکہ وہ اپنے مفہوموں اور اپنی وضع کردہ اصطلاحوں کے علاوہ اور کچھ نہیں سمجھتے، اس لیے آپ مجبور ہو جاتے ہیں کہ آپ انہی کے الفاظ اور انہی کی اصطلاحات کو استعمال کریں، تاکہ آپ اسلام کے مفہومات اور اسلام کے نظام کو ان تک پہنچا سکیں اور وہ ان کا تصور کر سکیں۔

بلاشبہ اس کارگزاری میں بڑا ہی خطرہ ہے۔ خاص کر اس وقت جب کہ یہ کام ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں پڑ جائے، جن میں نہ کافی حزم و احتیاط ہو نہ دونوں مذہبوں کو سمجھنے اور دونوں رجحاناتِ فکر کا تصور کرنے اور دونوں موقعوں تک پہنچنے کی پوری پوری صلاحیت ہو۔

اس کی مثال یوں سمجھیے کہ اگر ہم روسی اشتراکیت کے معاشرہ میں یا امریکی جمہوریت کے معاشرہ میں اسلام کے مفہوموں اور زندگی کے متعلق اسلام کے نقطہ ہائے نظر کو اس انداز سے منتقل کرنا چاہیں کہ وہ اسلام کے نظام، اس کے احکام اور اس کے فلسفہ کو سمجھ سکیں، تو نرا یہ بات ہے کہ ہم اپنی فقہی اصطلاحات کو جو اسلامی احکام کے لیے مشہور ہیں، استعمال نہیں کر سکتے کہ فلاں چیزیں عبادات میں شامل ہیں اور فلاں چیزیں معاملات میں اور پھر معاملات کو ان کے معروف ابواب میں تقسیم کر کے بتانا۔ اسی طرح علمائے کلام عقیدہ کی اصطلات کو بھی استعمال نہیں کر سکتے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم ان اصطلاحات کے ساتھ ایسے لوگوں کو مخاطب بنائیں، جن کے ہاں دوسری اصطلاحات مروج ہیں اور وجود، اقدار، اعمال بشری اور نظام ہائے اجتماعی کے لیے ان کی اپنی اپنی تعبیرات ہیں۔ ایسے موقعوں پر ہمیں چاہیے کہ ہم پہلے ان کی تعبیرات، ان کی تقسیمات، ان کے مقولات اور مفہومات کو خود اچھی طرح سمجھ لیں۔ اس کے بعد ہم ان کے طریقہ اور اسلوب کو سمجھ کر اسلامی نظام کے مفہومات کو ان کی طرف منتقل کریں۔ اس کے لیے ہمیں کبھی ایک مفہوم کا تجزیہ کر کے دو مفہوم بنانے ہوں گے۔ کبھی دو مفہوموں کو ایک ہی مفہوم میں ادا کرنا ہوگا۔ گویا اس طرح ہمیں اسلام کو ان نئے قالبوں میں اس طرح ڈھالنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ اصل مواد میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہونے پائے۔

جمہوریت اور اشتراکیت

اسلام کے مفہومات اور نظریات کو دوسرے مذاہب کے لوگوں تک ان کے اپنے نقطہ ہائے نظر کے مطابق منتقل کرنے میں کوئی خطرہ نہیں بلکہ اندیشہ تو اس میں ہے کہ ہم اسلام کو چھوڑ کر کسی اور مذہب فکر مثلاً اشتراکیت کی طرف چل پڑیں (خواہ وہ اشتراکیت بزعم پیروان مارکس سائنٹیفک سوشلزم ہو، خواہ اشتراکی کہلانے والے مذاہب فکر میں کا کوئی اور مسلک) یا جمہوریت کی طرف رُخ کریں۔ یعنی انھیں ایک مذہب سمجھ لیں اور ان کا فلسفہ اپنا لیں اور کہنے لگیں کہ یہ اشتراکیت یا یہ جمہوریت خود اسلام کا ہی ایک ہی حصہ ہے۔ اسلام کے بارے میں یہ طرزِ فکر یقیناً ایک فریب اور ملمع کاری ہے۔ جس سے اسلام کے اپنے مفاہیم مجروح ہوتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اشتراکیت اور جمہوریت کے ساتھ اسلام کا کوئی نقطۂ اتصال اور کوئی وجہِ اشتراک نہیں۔

جمہوریت

جمہوریت پسندوں کا خاص رجحان دراصل انفرادی استبداد اور کسی مخصوص طبقہ یا خاندان کی حکومت و سیادت کا مقابلہ ہے۔ یورپ کی تاریخ میں یہ رجحان مطلق العنان بادشاہوں، بالادست با اختیار طبقوں اور با اقتدار علمائے دین کے استبداد کے خلاف ردِ عمل کی شکل میں نمودار ہوا۔ لہذا جمہوریت پوری قوم یا قوم کی اکثریت کو حکومت میں شریک کرنے کی جدوجہد کرتی رہی اور جمہوریت کو عملاً نافذ کرنے کے لیے مختلف قوموں نے مختلف طریقے اختیار کیے۔

یہ سمجھ لینے کے بعد کیا ہمارے لیے یہ کہنا جائز ہوگا کہ اسلام جمہوریت کے منافی ہے؟ کیا ایسا کہنا اسلام کی صورت کو مسخ کر دینا نہیں ہے؟ جن لوگوں کے پیشِ نظر حکومت کے صرف دو نظام ہیں، یعنی استبدادیت یا جمہوریت، کیا ان سے یہ کہنا کہ اسلام جمہوریت کے مخالف ہے، اسلام کو بدترین صورت میں پیش کرنا نہیں ہوگا؟ کیا یہ بات سمجھ میں آ سکتی ہے کہ استبداد کے مقابلے میں اسلام جمہور کا ساتھ نہیں دے گا؟ کیا اسلام کا موقف قطعاً یہ نہیں ہوگا کہ وہ اس محاذ میں شامل ہو جائے، جو انفرادی استبداد اور ترجیحی سلوک کا مقابلہ کر رہا ہو؟

لیکن ہمیں یہ کہنے کا بھی حق نہیں کہ اسلام بغیر کسی شرط کے مطلقاً جمہوری ہے۔ کیونکہ ایک سیاسی نظام کی حیثیت سے جمہوریت افراد اور جماعتوں سے متعلق کچھ ایسے افکار و مفاہیم سے نسبت حاصل کر چکی ہے، جنھیں اسلام تمام تر قبول نہیں کرتا، بلکہ ان سے اکثر مقامات پر متعارض ہوتا ہے۔ چنانچہ جمہوریت کا ایک بنیادی نظریہ یہ ہے کہ ریاست میں اصل اہمیت فرد کی ہے اور دراصل فرد ہی کی مصلحت کے لیے ریاست وجود میں آتی ہے۔ فرد اپنے اعمال میں مکمل طور پر آزاد ہوتا ہے۔ خواہ اس کا تعلق اقتصادی یا نظریاتی امور سے ہو۔ حکومت کا سب سے اہم فرض یہ ہوتا ہے کہ وہ افراد کی آزادی میں توازن برقرار رکھے۔ جمہوریت کا یہ فلسفہ اسلام کے نقطۂ نظر سے بالکل مختلف ہے۔ کیونکہ یہ فلسفہ عقاید میں الحاد اور ایمان کے درمیان تفریق کو قائم نہیں رکھتا اور اجتماعی مصلحت کے لیے ایک طرف بے قید سرمایہ داری کو تسلیم کرتا ہے، دوسری طرف سرمایہ داری پر پابندی عاید کرنے کا بھی قائل ہے۔ اسلام ان تمام رجحانات میں مساوات کا قائل نہیں۔ وہ فرد کو ایسی مطلق آزادی نہیں دیتا، جس سے الحاد، بداخلاقی اور سماجی ظلم و ستم کو تقویت ملے۔ اس کے علاوہ اسلام کا جمہوریت سے ایک اور بنیادی اختلاف بھی ہے۔ اگرچہ اسلام میں قوم کی مصلحت قانون سازی کا مرکزی نقطہ ہے اور حکومت کی بنیاد باہمی مشورے اور حاکم کے جواب دہ ہونے کے اصولوں پر ہے۔ لیکن حاکمیت کا آخری مرجع ذاتِ الٰہی ہے۔ وہی

درحقیقت ریاست کا سرچشمہ ہے۔ اسی کا ارادہ (جس کا مظہر قرآن کریم ہے) حقیقی قوت حاکمہ ہے۔ اس کے برخلاف جمہوریت میں قوم حکومت کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ قوم کا ارادہ اور منشا قطعاً آزادانہ ہوتا ہے اور اسی کا فیصلہ آخری ہوتا ہے۔

اگر قوم کو حکومت کا سرچشمہ قرار دینے سے یہ مراد لی جاتی کہ حکومت قوم کی تفویض کردہ ہے اور حاکم قوم کا نمایندہ ہو کر حکومت حاصل کرتا ہے۔ وہ خود اپنی ذات سے، یا وراثتہً یا براہِ راست خدا کی طرف سے اقتدار حاصل نہیں کرتا، تو اس میں کوئی شبہ نہیں، اسلام اس سے اتفاق کرے گا۔

(۱) لیکن قوم کے افراد میں (خواہ وہ حاکم ہوں یا محکوم) جب کوئی اختلاف پیدا ہو جائے، تو آخری فیصلہ صرف کتاب اللہ کا ہوگا، جس نے ایک راستہ مقرر کر دیا ہے اور نشانات سے اس کی حد بندی فرما دی ہے۔ قوم غلطی بھی کر سکتی ہے اور صحیح فیصلہ بھی کر سکتی ہے چنانچہ افراد قوم، حاکم پر نگران ہوتے ہیں۔ وُہ حق کا مطالبہ اور زیادتی کے خلاف احتجاج کر سکتے ہیں۔ لیکن قرآن کریم کی نصوص کی تعبیر اور اس کے مفہومات کے تعین میں حاکم کی بجائے علمائے کرام کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ اس کی کوئی قید نہیں کہ وہ علما حکومت کے محکموں میں تعینات ہوں یا محض رسمی علماء ہوں۔ جب خوارج نے لاحکم الا للہ اور لاحکم الا للقرآن کا نعرہ لگایا تھا، تو حضرت علیؓ نے ان کی تردید میں یہی فرمایا تھا کہ قرآن کے لیے ترجمان کی ضرورت ہے۔ قرآن کا فیصلہ بہرحال کچھ لوگ بتائیں گے، خود قرآن بتانے کے لیے نہیں آئے گا۔

(۲) یعنی کوئی ایسا آدمی ضروری ہے، جو فیصلہ کرنے کا اہل ہو۔ لہٰذا انسان کا فیصلہ ناگزیر ہے۔ لیکن اس فیصلہ کرنے والے پر لوگوں کی نگرانی ضروری ہے اور ایسے لوگوں کا وجود لابدی ہے جو قرآن کریم اور اس کے مقاصد کی سمجھ رکھتے ہوں اور اس کے احکام کی تطبیق کی اہلیت رکھتے ہوں۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ اگر ہم جمہوریت کو ایک اجتماعی مذہب کی حیثیت سے لیں اور اس کے جُداگانہ وجود کو تسلیم کریں، تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وُہ عین اسلام ہے یا اسلام اس سے کوئی مماثلت رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں مذاہب اپنی اساسیات، اپنے فلسفہ اور نتائج تطبیق کے اعتبار سے بہت مختلف ہیں۔ جب ہم جمہوریت کا ایک ایسے رجحان کی حیثیت سے مطالعہ کرتے ہیں، جو انفرادیت، استبداد اور تفریق و امتیاز کے خلاف جنگ کرتا ہے اور جمہور کی بہبود کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔ انھیں حکومت میں شریک کرتا اور محاسبہ کا حق دیتا ہے، تو بلاشبہ ان معنوں میں اسلام بھی جمہوری انداز نظر رکھتا ہے۔ یا یُوں کہیے کہ اسلام کی اپنی ایک جمہوریت ہے جو اسی کے نظام کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہ جمہوریت حکام کے استبداد کی روک تھام کرتی اور قوم کو ان کی نگرانی اور محاسبہ کا حق دیتی ہے۔

اشتراکیت

دوسری مثال اشتراکیت کی ہے۔ بے شمار محققین نے اس لفظ کو اسلام کے اس تصوّرِ عدل کے بدل کے طور پر استعمال کیا ہے، جو معاشرہ کے تمام افراد کو مساوی حیثیت دیتا ہے۔ اشتراکیت کے ضمن میں ہمارے مؤقف کی وضاحت جمہوریت کے ذیل میں تفصیلی بحث سے ہو چکی ہے۔ اشتراکیت کو جب ایک ایسے مذہب فکر کی حیثیت سے لیا جائے کہ اس کا فلسفہ، اس کے مفہومات، اس کا اقتصادی نظام (جس کی ایک واضح شکل قومی ملکیت ہے)، سب ہی کچھ شامل کیا جائے،

تو اسلام اس سے قطعی جداگانہ چیز ہے۔ دونوں مذاہب کی مبادیات اور اساسیات مختلف ہیں۔

اشتراکیت ہمارے ہاں ایک اور مفہوم میں بھی رائج ہے کہ قوم کے تمام افراد کو منافع اور مصالح میں یکساں شریک کیا جائے۔ منافع کی تقسیم اور منفعت کے امکانات میں مساوات پیدا کی جائے اور اس مقصد کے لیے حکومت کو اقتصادی کارگزاریوں میں مداخلت کا حق دیا جائے۔ اشتراکیت کا یہ مفہوم ہر قسم کی اشتراکیت پر منطبق ہوتا ہے۔ اگرچہ اس منزل تک پہنچنے کے لیے مختلف ملکوں میں طریقِ کار مختلف ہیں۔

اس مفہوم کے اعتبار سے اشتراکیت کوئی مذہب نہیں بلکہ محض ایک رجحان کا نام ہے۔ جو یورپ میں سرمایہ داروں کے استبداد کے ردّ عمل میں پیدا ہوا۔ کیونکہ وہاں سرمایہ دار طبقہ ترجیحی حقوق کا مالک بن بیٹھا۔ یہ دراصل اس آزادروی کا نتیجہ تھا، جو بے قید معیشت کی قائل تھی اور حکومت کی مداخلت کے سراسر خلاف تھی۔ ظاہر ہے اسلام اشتراکیت کے اس رجحان کا مخالف نہیں ہے۔ اسلام کا مقتضا بھی پایانِ کار منافع کی عام تقسیم اور معاشرتی عدل و انصاف کا قیام ہے بلکہ جب مصلحت کا تقاضا ہو تو اسلام حکومت کو اقتصادی بلکہ غیر اقتصادی امور میں بھی مداخلت کا حق دیتا ہے۔ یہ کہنا کہ اسلام اشتراکیت کے اس مفہوم کا سرے سے مخالف ہے۔ سادہ الفاظ میں یُوں کہنا ہوگا کہ اسلام سرمایہ دارانہ ظلم، سرمایہ داروں کے ترجیحی حقوق اور تجاوز کی تائید کرتا ہے۔ اشتراکیت کی بنیاد افراد کی اقتصادی کارگزاریوں کی تحدید، حکومت کی مداخلت اور معاشرہ کی مصلحت کے تحفظ پر ہے۔ اسلام بھی حکومت کی مداخلت کا قائل ہے۔ چنانچہ ذخیرہ اندوزی کا انسداد، قحط کے زمانے میں غذائی سامان کے تاجروں کو عادلانہ نرخ پر فروخت کرنے پر مجبور کرنا اور زمانہ جنگ میں مالداروں پر زکوٰۃ کے علاوہ بار ڈالنا اور اگر معاشرہ میں ایسے نادار موجود ہوں کہ زکوٰۃ سے ان کی کفالت نہ ہو سکے، تو مالداروں سے زکوٰۃ کے علاوہ بھی مال لینا، ایسی مشہور مثالیں ہیں، جن کا تذکرہ فقہاء کی کتابوں میں بالصراحت موجود ہے۔ یہ مثالیں اسی رجحان کی ترجمان ہیں اور اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسلام حکومت کی مداخلت کا قائل ہے تاکہ معاشرتی عدل قایم ہو سکے۔ لہٰذا یہ بات کہنا کہ اسلام اشتراکیت سے مماثلت نہیں رکھتا، نہ صرف اشتراکیت کی حقیقت سے ناآشنائی ہوگی بلکہ اسلامی تعلیمات و احکام سے بھی جہالت ہوگی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

مثل المومنین مثل الجسد اذا اشتکی منہ عضوٌ، تداعی لہ سائر الجسد بالسھر والحمی۔	تمام مسلمان ایک جسم کی مانند ہیں۔ جب ان میں سے ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے، تو رات کو جاگنے اور حرارت کی وجہ سے سارا بدن اس کی اذیت محسوس کرتا ہے۔[1]

آپ ہی کا ارشادِ گرامی ہے:

قوم استھموا علیٰ سفینۃ فی البحر	کچھ لوگ سمندر میں ایک کشتی پر سوار ہوئے۔ ان میں سے

---

[1] صحیح مسلم، جلد چہارم ص ۲۰۰۰، باب ۵۴۔ قاہرہ۔ ۱۹۵۵ء

فاصاب بعضھم اعلاھا و اصاب بعضھم اسفلھا فکان الذین فی اسفلھا یصعدون فیستقون الماء فیصبون علی الذین فی اعلاھا فقال الذین فی اعلاھا لا ندعکم تصعدون فتؤذوننا فقال الذین فی اسفلھا فانا ننقبھا فی اسفلھا ، فنستقی فان اخذوا علی ایدیھم فمنعوا ھم نجوا جمیعا وان ترکوھم غرقوا جمیعا ۔	کچھ اوپر کے حصے میں پہنچ گئے اور کچھ نیچے کے حصے میں ۔ جو نچلے حصے میں تھے ، وہ پانی لینے کے لیے اوپر گئے ۔ اوپر والوں نے روکا کہ اس سے ہمیں دقت ہوتی ہے ۔ نیچے والوں نے کہا کہ ہم نیچے ہی سوراخ کر لیتے ہیں اور پانی حاصل کر لیں گے ۔ اب اگر انھیں روکا نہ جائے تو سب غرق ہو نگے اگر روک دیا تو سب بچ جائیں گے [۱]

یہ مسلمہ امر ہے کہ اسلام اس بات کو ہرگز قبول نہیں کرتا کہ رعایا کا کوئی فرد بھوکوں مرے ۔ خواہ اس کا مذہب کچھ ہی کیوں نہ ہو ۔ جب ایک آدمی اسلامی حکومت کا وفادار شہری ہے ، تو حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کی ضروریات کی کفالت بھی کرے ۔ یہی وجہ ہے کہ خلفائے راشدین کے عہد میں غیر مسلم اور اہل کتاب نادار لوگوں کے لیے ایک مخصوص شعبہ قایم تھا ۔

یہ رجحان کوئی سرسری بات نہیں تھی نہ اخلاقی مواعظ و نصائح تک محدود تھی ۔ بلکہ فقہا نے تفصیل کے ساتھ اس کے احکام مرتب کر دیے تھے جو عملاً نافذ ہوئے تھے ۔ اتنا ہی نہیں بلکہ قواعد عامہ میں بھی ان کی بنیادیں ملتی ہیں ۔ ہمارے اس موضوع سے متعلق اس قسم کے قواعد عامہ تقریباً ہر جگہ مل سکتے ہیں ۔ مثلاً :

الضرر یزال ۔	ضرر کو بہرحال دور کیا جائے گا ۔
لا ضرر و لا ضرار ۔	نہ ضرر برداشت کیا جا سکتا ہے ، نہ پہنچایا جا سکتا ہے ۔
یتحمل الضرر الخاص لاجل دفع الضرر العام ۔	ضرر عامہ کو دور کرنے کے لیے خاص ضرر کو برداشت کیا جائے گا ۔

ان قواعد کی تشریح میں فقہائ نے مختلف مثالیں دی ہیں ۔ مثلاً ایسی ملکیت دیوار جو عام راستے کی طرف جھک رہی ہو ، گرا دینا واجب ہوگا ۔ صاحبین کے نزدیک ایک بیوقوف (سفیہ) آدمی کے تصرفات پر مطلقاً پابندی لگائی جا سکتی ہے تاکہ ضرر عام کی روک تھام ہو سکے [۲] امام ابن تیمیہ تو اس فیصلے میں بہت آگے نکل گئے ہیں ۔ ان کے نزدیک ماہر فن اشخاص کو مفاد عامہ کے پیش نظر کام کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے ۔

جو کچھ ہم نے اب تک کہا ہے ، اس پر اتنا اضافہ اور کرنا چاہتے ہیں کہ اشتراکیت سے ہمیشہ روس ہی کا منافی اسلام مذہب ،

---

[۱] ترمذی ، جلد دوم ، ابواب فتن ، ص ۴۳ ، کانپور ، ۱۳۴۴ھ

[۲] ابن نجیم کی کتاب " الاشباہ والنظائر " میں ان قواعد عامہ کو دیکھا جا سکتا ہے ۔

مراد نہیں ہُوا کرتا۔ بلکہ یہ ایک عام رجحان کے طور پر بھی مستعمل ہے۔ جس میں مختلف مذاہب فکر موجود ہیں۔ چنانچہ خود یورپ میں مسیحی اشتراکی (CHRISTIAN SOCIALISTS) کے نام سے کچھ جماعتیں اُبھر رہی ہیں۔ حالانکہ اگر اشتراکیت کو محض قایم بالذات مذہب تسلیم کیا جائے تو مسیحیت کا اشتراکیت کے ساتھ صفت کے طور پر استعمال ناممکن ہوگا۔

اسلام میں ایسے رجحانات پائے جاتے ہیں، جو جمہوریت اور اشتراکیت سے مطابقت رکھتے ہیں، تاہم ان رجحانات کو مسلمانوں کی زندگی میں شعارِ عام کا درجہ حاصل نہیں۔ نہ یہ ہماری ہیئت اجتماعیہ کا عنوان بن سکتے ہیں۔ یہ اسلامی تہذیب کی بعض صفات کی طرف اشارہ ضرور کرتے ہیں، لیکن دوسری بہت سی صفات اور بنیادی تصورات کو نظرانداز کر دیتے ہیں، جو ان سے کہیں زیادہ اہم ہیں۔

تمام سیاسی اور اقتصادی نظامات کی کچھ نہ کچھ اعتقادی بنیادیں ہُوا کرتی ہیں اور یہ نظامات دراصل اسی عقیدہ یا فلسفہ کے خارجی مظاہر ہوتے ہیں۔ لہٰذا اشتراکیت سے وابستگی دراصل اس عقیدہ سے وابستگی ہوگی کہ پیداوار زندگی کا محور ہے اور وجود کی اصل مادہ (MATTER) ہے۔ اس تصور میں علم اور عقل دونوں محض پیداوار (PRODUCTION) اور مادی زندگی کے خدمت گزار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جس میں فرد انسانی اس بڑی مشین کا ایک حصہ ہوتا ہے جسے ہیئت اجتماعی کہتے ہیں۔ اور جو حکومت کی صورت میں متشکل ہے۔ اگر ہم ان شعاروں کو اپنی نشاۃ ثانیہ کا واحد عنوان قرار دیں، تو ضمناً ہم اس بات کو تسلیم کرلیں گے کہ ہم ان اعتقادات پر ایمان رکھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم اپنے تہذیبی ورثے سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے اور ہمارے نزدیک اپنے افکار کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہے گی۔

اسلام کی اشتراکیت

معاشرتی عدل اور تقسیمِ دولت کے لیے قانون بنانے اور اپنی نشاۃ ثانیہ کے لیے اشتراکیت کو عنوانِ اولیں قرار دینے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اسلام کی اجتماعی تحریک ایمان باللہ کے عقیدے اور افراد کی مساوات سے شروع ہوتی ہے، جس کی غایت معاشرتی عدل کا قیام ہے۔ یہ ہے اسلام کی اپنی اشتراکیت، جس کی غایت محض مال اور اس کی تقسیم نہیں بلکہ یہ دراصل اس روحانی تحریک کی ایک شاخ ہے، جس کا مقصد ایک خاص نظام کے اندر خدا کے بندوں کے مابین عدل و انصاف کا قیام اور حُسنِ سلوک کے ذریعہ رضاءِ الٰہی کی تحصیل ہے۔ غور فرمایئے اسلامی نظام کی تعبیر کے لیے اشتراکیت کے لفظ میں یہ صلاحیت کہاں ہے کہ وہ اس نظام کا صحیح عنوان بن سکے۔ اس ضمن میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہمیں اسلام کے امتیازات کی اس طرح حفاظت کرنا چاہیئے کہ یہ دُوسرے مذاہب فکر کے مفہومات سے مشتبہ نہ ہونے پائیں۔

مفہومات کی تشریح

مشتبہ مفہومات کی تصحیح کا کام اسلام کے ہر دور میں برابر ہوتا رہا ہے۔ اسلامی عقیدہ کے محافظ علماؓ ہر دور میں محدثاتِ امور، عقاید میں درپردہ اضافوں اور جدید انحرافات کی تردید کرتے رہے ہیں۔ بدعات کو علماء نے مختلف قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ جو بدعات عادات سے متعلق ہیں مثلاً کھانا، پینا، لباس وغیرہ کے اسلوب تو یہ چیزیں ناپسندیدہ بدعات میں شمار نہیں ہوتیں بشرطیکہ کوئی چیز براہِ راست نصوص سے متصادم نہ ہو۔ نو ایجاد آلات، وسائل نقل و حمل وغیرہ کے بارے میں بدعت کا لفظ مذموم معنوں میں استعمال نہیں ہوتا بلکہ اس کے برعکس اسے خدا کی نعمت شمار کیا گیا ہے کیونکہ ان میں بنی نوع انسان کی بہبود مضمر ہے۔ سب سے زیادہ خطرناک بدعات عقاید سے متعلق ہوتی ہیں۔ ہماری

رائے ہیں یہ بدعات عقیدہ کے محدود مفہوم تک ہی منحصر نہیں بلکہ یہ تمام بنیادی افکار و رجحانات کو شامل ہیں۔ تیسری قسم کی بدعات وُہ ہیں۔ جو عبادات سے متعلق ہیں۔ ان کے سلسلے میں اصول یہ ہے کہ عبادات سب توفیقی ہیں۔ ان میں کمی یا بیشی نہیں کی جاسکتی۔

یہ تصحیح ہر زمانے میں علماء اور ائمہ اسلام کے ہاتھوں ہوتی رہی ہے۔ وہ اس قسم کے انحرافات سے باخبر رہتے تھے اور نئی داخل شدہ بدعات کی تردید کر کے افکار کی تصحیح کرتے رہتے تھے۔ ان کی ایک واضح مثال دمشق کے فرزند جلیل شیخ الاسلام ابن تیمیہ تھے۔ ان کا بہترین کارنامہ اس رجحان کی تخلیق ہے کہ یونانی عقلیت اور باطنی رجحانات کے مقابلے میں اسلامی افکار کو رواج دیا جائے۔

آج ہمیں اس تصحیح کی زیادہ ضرورت ہے۔ خواہ یہ مفہومات مغربی افکار کے زیر اثر رواج پائے ہوں یا مشرقی عقلیت سے اثر پذیر ہوئے ہوں، خصوصاً ان افکار کی تصحیح نہایت ضروری ہے جو اسلامی عقلیت، یونانی عقلیت اور ایرانی اور ہندی عقلیت کا معجون مرکب ہیں ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی فکر کی از سرِ نو تعمیر کریں اور اپنے ذہنوں کو ان افکار سے صاف کریں، جنھیں ہم آج تک بدیہیات سمجھتے آئے ہیں۔ یہ افکار ہمارے فکری، سیاسی اور اقتصادی ہر شعبۂ حیات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ بہت بڑا کام ہے۔ لیکن ہماری ترقی اسی پر موقوف ہے۔

آجکل انسانیت کا سامنا مذاہب سے ہے۔ ہر مذہب میں اگر ایک پہلو حق کا ہے، تو دُوسرا پہلو باطل کا بھی موجود ہے۔ ان میں سے کوئی مذہب بھی انسانی مشکلات کو بنیادی طور پر توازن کے ساتھ حل کرنے کی صلاحیت اپنے اندر نہیں رکھتا۔ اسلام ہی ایک مذہب ہے جو بیک وقت مادی ترقی اور اخلاقی و روحانی ارتقاء کا ایک توازن کے ساتھ ضامن ہو سکتا ہے۔ نظاماتِ اجتماعی کے لیے اسلام خود انسان کے ضمیر میں اپنی بنیادیں تعمیر کرتا ہے۔ وہ فرد کے لیے ایسا وسیع میدان مہیا کرتا ہے، جس میں وہ استبدادی انداز سے محفوظ ہو کر مادی اور روحانی ترقی کر سکے۔ اسلام زندگی کو ایک وحدت کے اعتبار سے لیتا ہے۔ اس کے تمام پہلو، سیاست، معیشت، اخلاق، عبادت، عقیدہ اور قانون سازی، حیاتی وحدت کے ساتھ ایک نظم میں پیوستہ ہیں۔

مختلف مذاہب کا مطمحِ نظر، خواہ وہ دینی ہوں یا اجتماعی، زندگی کا کوئی ایک اہم مقصد ہوا کرتا ہے۔ مثلاً عدالتِ اجتماعی، حیات روحانی یا فردِ انسانی کی حریت لیکن اسلام نے ان تمام مقاصد میں ترتیب قایم کر کے ان کو اس طرح ہم آہنگ کر دیا ہے کہ یہ تمام مقاصد ایک قوت سے وابستہ ہیں جو خدائے برتر کی ذات ہے۔

شانِ محمدؐ بزبانِ بائیبل

عبدالرحیم منہاج

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم۔ امّا بعد!

مستقبل کے واقعات کی صحیح پیش گوئی خدا کے کلام کی اصلیت اور خدا کی موجودگی کی سب سے بڑی شہادتوں میں سے ایک ہے۔ صدیوں پہلے ایک واقعہ کی پیشگوئی کرنا اور بعدہٗ اس کی صحیح تصویر دیکھنا، الٰہی طاقت کا ایک ایسا بیّن ثبوت ہے کہ جس کی تردید ناممکن ہے۔

اگرچہ کتاب مقدس بائیبل ہر سال تغیر و تبدل کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے، تاہم بائیبل میں ایسے مقامات بھی پائے جاتے ہیں، جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خدا خود انسان کو اپنی طاقت دکھانے کے لیے اس شہادت کا اظہار کرتا ہے۔

یسعیاہ ۴۱ : ۲۲ سے ۲۹ آیت میں خداوند تعالیٰ خود اپنے نبی کی معرفت اپنی عظمت اور برتری کے ثبوت میں آئندہ واقعات کے متعلق پیش گوئی بیان کرتا ہے اور غیر اقوام کے دیوتاؤں کو چیلنج کرتا ہے کہ وہ اپنے علم کے ذریعہ اپنی طاقت کا اظہار کریں، جیسا کہ قرآن کریم نے عیسائیوں کو چیلنج کیا کہ تم اپنے تین خداؤں کے ذریعے اپنی طاقت کا اظہار کرو۔

سیدنا حضور مسیح علیہ السلام نے بھی اپنے پیرؤں کے ایمان کو مضبوط کرنے کے لیے مستقبل کے متعلق پیشگوئیاں کیں۔ جس رات حضرت مسیحؑ دنیا والوں سے جُدا ہونے کو تھے، آپؑ نے اپنے شاگردوں سے کہا:

"اور اب مَیں نے یہ سب باتیں پوری ہونے سے پہلے ہی تمھیں بتا دیں، تاکہ جب پوری ہوں تم یقین کرو۔"

چنانچہ ایک موقع پر آپؑ نے اپنے شاگردوں کو تعلیم دیتے ہُوئے سیدنا حضور محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بشارت اس طرح دی:

"مجھے تم سے اور بہت سی باتیں کہنی ہیں۔ لیکن ابھی تم ان کو برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ (محمدؐ) یعنی رُوحِ حق (سچائی کا روح) آئے گا تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا اور تمھیں آئندہ کی خبر دے گا وہ میرا جلال ظاہر کرے گا۔"

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سیدنا حضور مسیحؑ کے یہ مبارک الفاظ آپ کے ٹھیک چھ سو سال بعد عالمِ وجود میں آئے۔ یعنی کہ ریگستانِ عرب پر پرچمِ محمدؐ لہرایا اور صدق و کذب میں تصادم ہُوا۔ آخر فتح نے سچائی کے قدم چُومے اور رُوحِ حق کی فوج نے باطل کے تمام قلعے مسمار کر دیے۔ ایک جگہ درج ہے کہ:

"یعنی جو لوگ اندھیرے میں بیٹھے تھے، انھوں نے بڑی روشنی دیکھی اور جو موت کے ملک اور سایہ میں

بیٹھے تھے، ان پر روشنی چمکی۔" (متی ۴: ۱۶ ؛ یسعیاہ ۴۲ : ۷)

یہی وجہ ہے کہ آج سیرتِ سرورِ کائنات جناب محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ وسلم نوعِ انسان کے لیے مشعلِ راہ سے بھی بڑھ کر ہے ——— لیکن دنیا کے علماء ہٹ دھرمی اور تعصب کے رتھ پر بھاگے جا رہے ہیں اور سیدنا حضور مسیحؑ کے اس ارشاد کی بے بنیاد تاویل کرتے ہیں۔ پادری صاحبان کہتے ہیں کہ روحِ حق (سچائی کا روح) سے مراد محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ وسلم نہیں بلکہ اس سے مراد وُہ رُوح القدس ہے، جو کہ سیدنا مسیحؑ کے بعد ان کے شاگردوں پر نازل ہوتا تھا۔ میں کہتا ہوں کہ سیدنا حضور مسیح علیہ السلام کے الفاظ میں رُوحِ حق کی شناخت یہ ہے:

"روحِ حق سچائی کا رُوح تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔"

اب آپ کے کہنے کے مطابق جو روح القدس مسیحؑ کے شاگردوں پر نازل ہوا، اس نے شاگردوں یا دیگر عیسائیوں کو کونسی سچائی کی راہ دکھائی بلکہ اعمال ۲۱، ۱ تا ۲۵ ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ جب روح القدس مسیحؑ کے شاگردوں پر نازل ہوا، تو ان سب نے جھوٹ بولنا اور فریب دینا شروع کر دیا۔ جھوٹ بولنے کا دوسرا نام سچائی ہے۔ شاگردوں پر روح القدس نازل ہُوا تو کچھ عرصہ بعد پولوس بھی ان میں آ شامل ہُوا اور سب کا استاد بن گیا۔ پولوس کے نزدیک جھُوٹ بولنا ثوابِ عظیم ہے (رومیوں ۳ : ۵) بلکہ پولوس خود بھی بڑے فخر کے ساتھ جھُوٹ بولا کرتا تھا۔ اگر آپ کو یقین نہیں آتا تو کتاب مقدس بائیبل سے دریافت کریں۔ ایک مقام پر پولوس کہتا ہے کہ میں پیدائشی یہودی ہُوں (اعمال ۲۲ : ۲۲) دوسرے مقام پر کہتا ہے کہ میں پیدائشی رُومی (بُت پرست) ہوں۔ (اعمال ۲۲ : ۲۵ تا ۲۸)

تیسرے مقام پر پولوس کہتا ہے کہ "میں پیدائشی فریسی ہُوں" (اعمال ۲۳: ۶، ۷، ۸)۔

ہم کس طرح یقین کریں کہ ایک آدمی تین متضاد جگہ یا مذاہب میں پیدا ہو سکتا ہے۔ ہم حیران ہیں کہ پولوس پیدائشی رومی (بت پرست) بھی ہے اور پیدائشی یہودی (توحید پرست) بھی ہے اور پیدائشی فریسی (یہودیوں کا ایک فرقہ) بھی ہے۔ یہ کون ہے ——— جو اپنی پیدائش تین مختلف جگہ بتلا رہا ہے۔ یہ عیسائیوں کا سب سے بڑا رسول، جس پر روح القدس نازل ہوا تھا۔ یہ ہو نہیں سکتا۔ اس لیے کہ پولوس جھوٹ بولا کرتا تھا جیسا کہ ہم نے ثابت کیا اور جھُوٹا آدمی رُوحِ حق ہو نہیں سکتا۔

اور سُنیے کہ اس جھوٹ بولنے والے رُوحِ حق کی تعلیم کیا ہی انوکھی ہے جس پر عمل کرنے سے شیطان بھی شرما جاتا ہے۔

ہم کیوں نہ برائی کریں تاکہ بھلائی پیدا ہو۔ (رومیوں ۳ : ۸)

یہی وُہ پولوس ہے (جس پر بقول ان کے روح القدس نازل ہوا تھا) جو خدا تعالیٰ کی پاک شریعت کو لعنت اور شریعت پر عمل کرنے والوں کو لعنتی کہتا ہے۔ (گلیتوں ۳: ۱۱)

خداوند تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

"کیونکہ یہ باغی لوگ اور جھُوٹے فرزند ہیں اور خداوند کی شریعت سے انکار کرتے ہیں اور نبیوں کو کہتے ہیں کہ ہم پر سچی نبوت نہ کرو۔ ہم سے خوشگوار باتیں کرو اور ہم سے جھُوٹی نبوت کرو۔" (یسعیاہ ۳۰ : ۸)

ان تمام حوالوں کے ہوتے ہوئے حضرت پولوس اور اس کے ساتھی رُوحِ حق کے زمرے میں نہیں آتے، اس لیے کہ سب کے سب دغاباز اور جھوٹے اور برائی کی تعلیم دینے والے تھے جیسا کہ ہم نے کتاب مقدس سے ثابت کیا ہے۔ لیکن اس کے برعکس رُوحِ حق حضور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ ہے۔ غور سے ملاحظہ فرمائیے :

"جھُوٹ بولنے والوں پر اللہ کی لعنت ہو" (القرآن)

"رُوحِ حق آئے گا۔ وُہ میرا جلال ظاہر کرے گا" (بائیبل)

اہل یہود کے سب سے بڑے معلم سردار کہن کیفا نے مجرم قرار دے کر کہا، یہ مشرک ہے۔ پولوس نے اس کی تصدیق کی کہ "واقعی مسیح لعنتی ہے"۔ (گلیتوں ۳ : ۱۳)

روحِ حق سیدنا حضور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا :

"یہ دونوں جھُوٹے اور دروغگو ہیں۔ مسیحؑ نہ لعنتی ہے نہ مشرک ہے بلکہ وہ خدا تعالیٰ کا رسُول اور کلمۃ اللہ ہے"۔

سردار کہن کیفا نے کہا :

"مسیح مشرک ہے"۔

پولوس نے کہا :

"مسیح لعنتی ہے"۔

اور روحِ حق محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"مسیحؑ پاک، معصوم اور کلمۃ اللہ ہے"۔

ناظرین اللہ کے لیے انصاف کریں کہ سیّدنا حضور مسیحؑ کا جلال کس نے ظاہر کیا، پولوس نے یا حضور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے! پولوس کو رُوحِ حق تسلیم کرنا کلامِ الٰہی کا جنازہ اٹھانا ہے۔

حضرت یوحنا (یحییٰؑ) نے بردن بار بیتِ عبناہ میں ایک عظیم الشان جلسۂ عام کو خطاب کرتے ہُوئے فرمایا :

"تمھارے درمیان ایک شخص کھڑا ہے، جسے تم نہیں جانتے یعنی میرے بعد آنے والا۔ میں جس کی جُوتیوں کا تسمہ کھولنے کے لائق نہیں"۔ (یوحنا ۱ : ۲۷)

آنحضرتؐ کی نسبت بعض عیسائیوں کی رائے

مولوی علی شبیر

معجزاتِ نبویؐ رہ نوردانِ بادیہ ضلالت کے لیے تاحشر خضرِ طریقت ثابت ہوتے رہیں گے اور کمالاتِ احمدیؐ گم گشتگانِ وادیِ ظلمت کے واسطے مشعلِ ہدایت کا کام دیتے رہیں گے۔ تشنہ کامانِ حقیقت کو وُہ چشمۂ رحمت تاقیامت سیراب کرتا رہے گا اور غواصانِ بحرِ تحقیق اس دریائے معرفت سے ابدالآباد تک گوہرِ مقصود حاصل کرتے رہیں گے۔ حضور سرورِ کائناتؐ کے خصائلِ حمیدہ مخالفین سے اپنی اکملیت ہمیشہ ہمیش تسلیم کراتے رہیں گے اور جناب اکمل الموجوداتؐ کے فضائل برگزیدہ رہتی دُنیا تک منکرین سے اپنی اولیت و افضلیت منواتے رہیں گے۔ وہ وقت آ پہنچا ہے کہ جن کی آنکھوں پر تعصب کی عینک چڑھی ہوئی تھی، وہ اب اسے اتار کر جیبوں میں رکھتے جا رہے ہیں اور جن کی گھٹی میں تنفر شریک تھا، ان کے مزاج کا تنقیہ ہو چلا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اعجاز کسی خاص مکان و زمان تک محدود نہیں ہے بلکہ تاقیامت یُوں ہی یہ دولت تقسیم ہوتی رہے گی۔

کرۂ ارض کے وُہ حصے، جہاں جہالت کی گھنگھور گھٹائیں چھا رہی ہیں اور دنیا کے وُہ ممالک جہاں ابرِ ضلالت سطحِ افلاک کو گھیرے ہُوئے ہے، وہاں بھی اب ہلالِ گنبدِ خضرا کی چاندنی چھٹکے گی اور وہاں کے زمین و آسمان بھی انوارِ ماہتابِ رسالت سے بقعۂ نور بنیں گے۔

اب وہ زمانہ آ رہا ہے کہ وُہ شمع جس کا اجالا چالیس برس تک کوہستانِ بطحٰی کے غاروں میں رہا تھا، اس کی روشنی سے بادشاہانِ روئے زمین کے دربار جگمگا اٹھیں صلی اللہ علیہ وسلم۔ ہمارے خداوند کی ذات ملکی الصفات فنا ہونے والے انسان کی توصیفات و تعریفات سے مستغنی ہے۔ ’آفتاب آمد دلیلِ آفتاب‘۔ یہ بے بضاعت کیا لکھے: ؎

کہ خاصاں دریں رہ فرس رانده اند
بلاحولی از تنگ فرد مانده اند

اور بالفرض کچھ لکھے بھی، تو اس کی سند نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ درویش آخر اسی سرورِ کونینؐ کا ایک بے وفا غلام اور اسی کی خیر الامم کا ایک نالائق فرد ہے۔ البتہ تعریف وہ ہے، جو دشمن کے منہ سے نکلے الفضل ماشھدت بہ الاعداء۔ اس لیے بعض غیر متعصب عیسائی مورخوں کے وہ خیالات یہاں درج کیے جاتے ہیں، جنھوں نے ہمارے مولا اور ہمارے آقا کی نسبت ظاہر کیے ہیں۔ اگرچہ یہ مضمون بھی بہت ہی وسیع اور یہ موضوع نہایت وقیع ہے: ع

سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے

مگر اس درویش کی علالت اور بعض وجوہ طوالت کی اجازت نہیں دیتے: ع

اگر در خانہ کس است یک حرف بس است

آنحضرتؐ کی شکل و شمائل جان ڈیون پورٹ صاحب آں حضرتؐ کے حلیہ مبارک کی نسبت اپنی کتاب "اپالوجی فار محمدؐ اینڈ دی قرآن" میں لکھتے ہیں:

"آپؐ کی شکل شاہانہ تھی، خط و خال باقاعدہ اور دل پسند تھے۔ آنکھیں سیاہ اور منور تھیں۔ بینی ذرا اٹھی ہُوئی، دہن خوب صورت تھا۔ دانت موتی کی طرح چمکتے تھے، رُخسار سُرخ تھے۔ آپ کی صحت نہایت اچھی تھی۔ آپ کا تبسم دلآویز اور آواز شیریں و دلکش تھی۔"

ایڈورڈ گبن صاحب اپنی کتاب "تاریخ روم" میں لکھتے ہیں:

"آں حضرتؐ حسن میں شہرۂ آفاق تھے اور یہ نعمت صرف انہی کو بُری معلوم ہوتی ہے، جن کو اللہ کی طرف سے عطا نہیں ہُوئی۔ پیشتر اس کے کہ آپؐ کوئی بات فرمائیں، آپ کسی خاص آدمی یا گروہ کو متوجہ کر لیا کرتے تھے۔ لوگ آنحضرتؐ کی شاہانہ شکل، نورانی آنکھیں، خوشنما تبسم، بکھری ہُوئی داڑھی اور ایسا چہرہ جو دل کے ہر ایک جذبہ کی تصویر کھینچ دے اور ایسے حرکات و سکنات، جو زبان کا کام دیں، دیکھ دیکھ کر تعریف کیا کرتے تھے۔"

جب یورپین عیسائی مورخ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حُسن و جمال کے متعلق اتنا کچھ لکھیں، تو کسی مسلمان شاعر کی زبان سے یہ شعر نکل جانا زمین و آسمان کے قلابے ملانا نہیں ہے: ؎

تو بدیں جمال و خوبی سرِ طور گر خرامی
ارنی بگوید آنکس کہ بگفت لن ترانی

آنحضرتؐ کا اعزازِ خاندان ڈاکٹر ویٹ صاحب لکھتے ہیں:

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) عرب کے نہایت عمدہ خاندان اور معزز قوم سے تھے۔ آپؐ نہایت شکیل و جمیل اور عادات میں خلیق و بے تکلف تھے۔"

آنحضرتؐ کی فصاحت سر ولیم میور صاحب باوجودیکہ نہایت متعصب عیسائی ہیں، لکھتے ہیں:

"آں حضرتؐ کی گفتگو جزیرہ نمائے عرب کی خوشنما زبان کا خالص ترین نمونہ تھی۔"

آں حضرتؐ کی معرفتِ الٰہی و دیگر خصائل ڈاکٹر اے اسپرنگر صاحب اپنی کتاب "سیرتِ محمدیؐ" میں لکھتے ہیں:

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تیز فہم، نہایت اعلیٰ درجہ کے عالی نظر، صائب الرائے اور بلند خیال تھے۔ گو وہ شاعر کے نام کو پسند نہیں کرتے تھے مگر شاعری کی قابلیت

ان میں بدرجۂ غایت تھی۔ قرآن کی فصیح و بلیغ عبارت اور بلند پایہ مضامین ان کے عمدہ فضائل کے شاہد ہیں۔ اُن کے خیال میں ہمیشہ خدا کا تصور رہتا تھا۔ ان کو نکلتے ہوئے آفتاب، برستے ہوئے پانی اور لہلہاتے ہوئے سبزے میں خدا ہی کا یدِ قدرت نظر آتا تھا۔ ان کو بجلی کی کڑک، ندی کے شور اور پرندوں کے نغموں میں خدا ہی کی آواز سنائی دیتی تھی۔ ان کو سنسان جنگلوں اور پرانے شہروں کے کھنڈروں میں خدا ہی کے قہر کے آثار دکھائی دیتے تھے۔"

واشنگٹن اردنگ صاحب اپنی کتاب لائف آف محمدؐ میں لکھتے ہیں:

آنحضرتؐ کا نبی برحق ہونا "آنحضرتؐ کے اوائل زمانہ سے وسطِ حیات تک کے حالات سے ہمیں کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ اس عجیب و غریب فریب سے جس کا الزام آپ پر (عیسائیوں نے) لگایا ہے، آپ کی کیا غرض تھی؟ اور ایسا پاکھنڈ پھیلانے سے آپ کا کیا مدعا تھا؟ کیا حصولِ مال مقصود تھا؟ نہیں! کیونکہ حضرت خدیجہؓ کے نکاح سے آپ فی الجملہ دولت مند ہو چکے تھے اور دعوائے نبوت سے سالہا سال پیشتر آپ نے صاف کہہ دیا تھا کہ مجھے اپنے مال میں اضافہ کرنے کی خواہش نہیں ہے۔

تو کیا حصولِ جاہ مراد تھی؟ یہ بھی بات نہ تھی۔ کیونکہ وہ پہلے ہی سے اپنے وطن میں عقل و امانت میں رفیع المرتبہ تھے اور قریش کے بزرگ قبیلے اور اس کے معزز و ممتاز طبقہ میں سے تھے۔

تو کیا حصولِ منصب مقصود تھا؟ مگر یہ بھی آپؐ کا خیال نہ تھا، کیونکہ کئی پشتوں سے تولیت کعبہ اور امارت حرم خاص آپؐ ہی کے قبیلے میں تھی اور آپ کو اپنی وقعت و حالات سے اور بھی عالی مرتبہ بننے کا یقین تھا۔ جس دین میں آپ نے نشوونما پائی تھی، اسی پر قائم رہنے سے آپ کے قبیلہ کی جاہ و عزت کا سب دارومدار تھا۔ مگر آپ نے اسی کی بیخ کنی کر کے اپنے تمام فائدوں پر پانی پھیر دیا۔ اس مذہب کی جڑ کاٹ دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کے عزیز و اقربا، سب آپ کے دشمن ہو گئے۔ آپ پر اہلِ شہر کا غیظ و غضب بھڑک اٹھا۔ تمام اہلِ عرب اور جو لوگ کعبہ میں ملکوں ملکوں سے بتوں کی پرستش کے لیے آیا کرتے تھے، سب کو آپ سے عداوت و عناد ہو گیا۔ اشاعتِ دین کے وقت آپ کے سامنے کوئی بھی ایسا کھلم کھلا نفع نہ تھا، جو آپ کی ان تمام مصیبتوں کا کافی معاوضہ ہو سکتا، جو آپ کو خدماتِ نبوت بجا لانے میں پیش آئیں بلکہ برخلاف اس کے ابتدائے رسالت میں تو آپ کو طرح طرح کے خوف و خطر ہی سامنے تھے۔ برسوں تک تو اس میں آپ کو کامیابی ہی نہ ہوئی۔ جیسے جیسے آپ نے اپنی تعلیم کا اظہار کیا اور وحی کو آشکارا کیا، ویسے ہی ویسے لوگوں نے آپؐ کی ہنسی اڑائی اور برا کہنا شروع کیا۔ آخر بڑی بڑی ایذائیں دیں، جس سے آپؐ کی اور آپؐ کے اصحاب کی املاک و جائدادیں برباد ہو گئیں اور آپ کے بعض اقربا و اصحاب غیر ملک میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے اور خود آنحضرتؐ کو بھی اپنے شہر میں چھپ کر رہنا پڑا اور بالآخر ہجرت کرنا پڑی۔ پس آپؐ کو

ایسی کیا غرض تھی کہ آپ اس فریب کو برسوں تک نباہتے جس کے باعث آپ کی تمام دنیوی دولتیں خاک میں مل گئیں۔"

اسی بارہ میں جان ڈیون پورٹ صاحب لکھتے ہیں:

"کیا یہ بات سمجھ میں آ سکتی ہے کہ جس شخص نے اس حقیر و ذلیل بت پرستی کے بدلے، جس میں اس کے ہم وطن یعنی اہلِ عرب مبتلا تھے، خدائے برحق کی پرستش قائم کر کے بڑی بڑی ہمیشہ رہنے والی اصلاحیں کیں۔ وہ جھوٹا نبی تھا؟ کیا ہم اس سرگرم اور پُرجوش مصلح کو فریبی ٹھہرا سکتے ہیں؟ اور یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایسے شخص کی تمام کارروائیاں مکر پر مبنی تھیں؟ نہیں ایسا نہیں کہہ سکتے۔ بے شک محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بجز دلی نیک نیتی و ایمانداری کے اور کسی سبب سے ایسے استقلال کے ساتھ ابتداے نزولِ وحی سے اخیر دم تک مستعد نہیں رہ سکتے تھے۔ جو لوگ ہر وقت ان کے پاس رہتے تھے اور جو ان سے بہت کچھ ربط ضبط رکھتے تھے، ان کو بھی کبھی آپؐ کی ریاکاری کا شبہ نہیں ہوا۔"

ٹامس کارلائل صاحب اپنی کتاب "لکچرز آن ہیروز" میں لکھتے ہیں:

"ہم لوگوں یعنی عیسائیوں میں جو یہ بات مشہور ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک پُرفن اور فطرتی شخص اور جھوٹے دعویدارِ نبوت تھے اور اُن کا مذہب دیوانگی و خام خیالی کا ایک تودہ ہے، اب یہ سب باتیں لوگوں کے نزدیک غلط ٹھہرتی جاتی ہیں۔ جو جھوٹ باتیں متعصب عیسائیوں نے اس انسان (یعنی آنحضرتؐ) کی نسبت بنائی تھیں، اب وُہ الزام قطعاً ہماری روسیاہی کا باعث ہیں اور جو باتیں اس انسان (یعنی آنحضرتؐ) نے اپنی زبان سے نکالی تھیں، بارہ سو برس سے اٹھارہ کروڑ آدمیوں کے لیے بمنزلہ ہدایت کے قائم ہیں۔ اس وقت جتنے آدمی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کلام پر اعتقاد رکھتے ہیں، اس سے بڑھ کر اور کسی کے کلام پر اس زمانہ کے لوگ یقین نہیں رکھتے۔ میرے نزدیک اس خیال سے بدتر اور ناخدا پرستی کا کوئی دوسرا خیال نہیں ہے کہ ایک جھوٹے آدمی نے یہ مذہب پھیلایا۔"

گاڈفری ہگنز اپنی کتاب اپالوجی میں عیسائیوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا رویہ جانچتے وقت تم کہتے ہو کہ وہ شریر و مکار تھے۔ ہم کہتے ہیں کہ وُہ اپنے زمانے کے سقراط تھے۔ جب ہم ان کو برائیوں سے متصف سنتے ہیں، تو ہم ان کے عادات و خصائل پر نظر ڈالتے ہیں۔ جو فریقین (یعنی مسلمانوں اور عیسائیوں) کے قول کے مطابق ابتداے عمر و ایامِ شباب میں رہے ہیں۔ ہم پوچھتے ہیں اس عجیب طرزِ عمل سے آپ کا کیا مقصد تھا۔ تم اس کا یہ جواب دیتے ہو کہ ان کے دو مقصد تھے: ایک تو متعدد عورتوں سے نکاح اور دُوسرے حصولِ جاہ۔ جس سے یہ غرض تھی کہ ایک شہر کے تاجر بن کر اپنے آپ کو بادشاہ بنا دیں۔ اس کے واسطے وہ چودہ برس تک خلق سے کنارہ کشی کر کے گوشہ نشینی کی زندگی

بسر کرتے رہے اور اپنے عادات و اطوار بے عیب رکھتے ہم (یعنی گاڈفری ہیگنز صاحب) دریافت کرتے ہیں کہ دنیا کی کسی تاریخ میں ایسی کوئی اور نظیر بھی پائی جاتی ہے۔ اگر عورتوں سے عشرت مقصود تھی، تو یہ عجیب معاملہ ہے کہ آپ نے پچیس سال کی عمر میں، جو وقت کہ خاص جوشِ جوانی کا خیال کیا جاتا ہے، صرف حضرت خدیجہؓ سے نکاح کیا تھا۔ اگر آپ چاہتے تو اپنے ملک کے رواج کے مطابق بہت سے نکاح کر سکتے تھے۔ مگر آپ اس قاعدے سے مستفید نہ ہوتے اور اس بیوی کے تا حینِ حیات اسی کے ساتھ ستائیس برس تک نباہ کیا۔

اب رہی دوسری بات یعنی حصولِ مرتبہ، تو اس کا یہ جواب ہے کہ آپ نے کوشش و سازش کر کے اپنے کو محافظِ کعبہ کیوں بنا لیا۔ اس عہدے پر آپ کے آباء و اجداد بھی مامور تھے اور جس شخص کے نام یہ عہدہ ہوتا تھا، وہ تمام ملک عرب میں اوّل درجہ کا رئیس شمار ہوتا تھا۔ اگر صرف بلند حوصلگی مقصود تھی، تو بجائے اس کے کہ آپ نے اپنے کو مسیح کا پیرو ظاہر کیا، اگر وہ یہودیوں کا مسیح ظاہر کرتے اور بیت المقدس کو اپنا مسکن قرار دیتے، تو بلاشبہ تمام یہودی ان کے زمرے میں داخل ہو جاتے اور عیسائی بھی کم از کم اتنے تو ضرور آملتے جتنے کہ بحالتِ موجودہ شامل ہو گئے ہیں۔"

تعلیمِ محمدیؐ و اصلاحات

ایڈورڈ گبن صاحب کہتے ہیں:

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مذہب شکوک و شبہات سے پاک و صاف ہے۔ قرآن خدا کی وحدانیت پر ایک عمدہ شہادت ہے۔ مکے کے پیغمبر نے بتوں کی، انسانوں کی اور ستاروں کی پرستش کو معقول دلائل سے رد کر دیا۔ وہ اصول اوّل یعنی ذات باری تعالیٰ جس کی بناء عقل و وحی پر ہے، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شہادت سے استحکام کو پہنچی۔ چنانچہ اس کے معتقد ہندوستان سے لے کر مراکو تک موحد کے لقب سے ممتاز ہیں۔"

سر ولیم میور صاحب اپنی کتاب سیرت محمدیؐ میں لکھتے ہیں:

"ہم بلا تامل اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے ہمیشہ کے واسطے اکثر توہمات باطلہ کو، جن کی تاریکی مدتوں سے جزیرہ نمائے عرب پر چھا رہی تھی، کالعدم کر دیا۔ بلحاظ معاشرت کے بھی اسلام میں کچھ کم خوبیاں نہیں ہیں۔ مذہبِ اسلام اس بات پر فخر کر سکتا ہے کہ اس میں پرہیزگاری کا ایک ایسا درجہ موجود ہے جو اور کسی مذہب میں نہیں۔"

گاڈفری ہیگنز صاحب کہتے ہیں:

"انجیل کی طرح قرآن شریف بھی غریب آدمی کا دوست و غمخوار ہے۔ وہ آدمیوں کی مدارج کے اعتبار سے توقیر نہیں کرتا۔ یہ امر اس کے مصنف کی لازوال نیک نامی کا باعث ہے۔"[1]

---

[1] رسول کریمؐ اس کے مصنف نہیں بلکہ قرآن مجید ان پر نازل ہوا۔ عیسائی دانستہ ایسا لکھتے ہیں۔ (ادارہ)

آنحضرتؐ کی مقرر کردہ اذان

اذان کی نسبت ایک عیسائی مصنف لکھتا ہے کہ :

"مختلف اوقات کی نماز کی اطلاع موذن مسجد کے میناروں پر کھڑے ہوکر اذان دے کر کرتے ہیں۔ ان کی آواز جو ایک بہت سادہ مگر سنجیدہ لہجے میں بلند ہوتی ہے، شہروں کے غل غپاڑے میں مسجد کی بلندی سے دلکش و دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن سنسان رات میں اس کا اثر اور بھی عجیب طور سے شاعرانہ ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اکثر فرنگیوں کی زبان سے پیغمبر صاحب کی تعریف نکل گئی ہے کہ انھوں نے یہودیوں کے معبد کی قرنا اور کلیسائے نصاریٰ کے گھنٹوں کی آواز کے مقابلہ میں انسانی آواز کو پسند کیا۔"

تعلیمِ محمدیؐ کی برکتیں

ایڈورڈ گبن صاحب اس بارے میں لکھتے ہیں :

"حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سیرت میں سب سے آخر بات جو غور کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ ان کی رسالت لوگوں کے حق میں مفید ہوئی یا مضر؟ جو لوگ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سخت دشمن ہیں، وہ بھی اور عیسائی و یہودی بھی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو باوجود پیغمبر برحق نہ ماننے کے اس بات کو ضرور تسلیم کریں گے کہ آنحضرتؐ نے دعوئ نبوت ایک نہایت مفید مسئلہ کی تلقین کے لیے کیا تھا۔ گو وہ یہ کہیں کہ صرف ہمارے ہی مذہب کا مسئلہ اس سے اچھا ہے۔ گویا وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ سوائے ہمارے مذہب کے اور تمام دنیا کے مذاہب سے مذہب اسلام اچھا ہے۔ آنحضرتؐ نے انسان کے خون کے کفارے کو نماز و روزہ و خیرات سے بدل دیا، جو ایک پسندیدہ اور سیدھی سادی عبادت ہے یعنی جو انسان کی قربانی بتوں پر ہوتی تھی، اس کو معدوم کر دیا۔ آنحضرتؐ نے مسلمانوں میں نیکی و محبت کی ایک روح پھونک دی۔ آپس میں بھلائی کرنے کی ہدایت کی اور اپنے احکام اور نصیحتوں سے انتقام کی خواہش اور بیوہ عورتوں پر اور یتیموں پر ظلم و ستم کو روک دیا۔ قومیں جو ایک دوسرے کی جانی دشمن تھیں، وہ اعتقاد و فرمانبرداری میں متفق ہوگئیں اور خانگی جھگڑوں میں جو بہادری بیہودہ طور سے صرف ہوتی تھی، وہ نہایت مستعدی سے ایک غیر ملک کے دشمن کے مقابلے پر مائل ہوگئی۔"

ٹامس کارلائل صاحب کہتے ہیں :

"اسلام کا عرب کی قوم کے حق میں گویا تاریکی میں روشنی کا آنا تھا۔ عرب کا ملک پہلے ہی پہل اس کے ذریعہ سے زندہ ہوا۔ اہل عرب گلہ بانوں کی ایک غریب قوم تھی اور جب سے دنیا بنی ہے، عرب کے چٹیل بیدانوں میں بسر کرتی تھی اور کسی شخص کو اس کا کچھ خیال ہی نہ تھا۔ اس قوم میں ایک اولوالعزم پیغمبر ایسے کلام کے ساتھ بھیجا گیا، جس پر وہ یقین کرتے تھے۔ اب دیکھو، کہ جس چیز سے کوئی واقف ہی نہ تھا، وہ تمام دنیا میں مشہور ہوگئی اور چھوٹی چیز بھی بڑی بن گئی۔ اس کے بعد ایک صدی کے اندر عرب کے ایک طرف غرناطہ اور دوسری طرف دہلی ہوگئی۔"

اسلام بزورِ شمشیر نہیں پھیلا اگرچہ اس مضمون پر ایک مستقل کتاب ٹی ڈبلیو آرنلڈ صاحب پروفیسر مدرستہ العلوم علیگڑھ کی موجود ہے، جس کا اُردو ترجمہ بھی "دعوتِ اسلام" کے نام سے ہو چکا ہے اور اس مسئلہ پر زیادہ کہنے سننے کی اب ضرورت نہیں رہی ہے، تاہم ایک اور مورخ یعنی جان ڈیون پورٹ صاحب کا خیال بھی درج کیا جاتا ہے وہ لکھتے ہیں:

"اس بات کا خیال کرنا بہت بڑی غلطی ہے کہ قرآن میں جس عقیدے کی تلقین کی گئی ہے، اس کی اشاعت بزورِ شمشیر ہوئی کیونکہ جن لوگوں کی طبیعتیں تعصب سے مبرا ہیں، وہ بلا تامل اس بات کو تسلیم کریں گے کہ آنحضرت کا دین جس کے ذریعہ سے انسانوں کی قربانی کے بدلے نماز اور خیرات جاری ہوئی اور جس نے عداوت اور دائمی جھگڑوں کی جگہ فیاضی وحسنِ معاشرت کی ایک روح لوگوں میں پھونک دی، وہ مشرقی دنیا کے لیے ایک حقیقی برکت تھا اور اسی وجہ سے خاص کر آنحضرتؐ کو ان خونریز تدبیروں کی ضرورت نہ ہوئی، جن کا استعمال بلا استثناء اور بلا امتیاز حضرت موسیٰؑ نے بُت پرستی کے نیست و نابود کرنے کے لیے کیا تھا۔ پس ایسے اعلیٰ وسیلہ کی نسبت جس کو قدرت نے بنی نوع انسان کے خیالات و مسائل پر مدت دراز تک اثر ڈالنے کے لیے پیدا کیا ہے، گستاخانہ پیش آنا اور جاہلانہ مذمت کرنا کیسی لغوبات ہے۔"

آنحضرتؐ کا سلوک غیر مذاہب کے ساتھ ایڈورڈ گبن صاحب لکھتے ہیں کہ:

"مسلمانوں کی لڑائیوں کو ان کے پیغمبر نے مقدس قرار دیا تھا مگر آنحضرتؐ نے اپنی حیات میں جو مختلف نصیحتیں کیں اور نظیریں قایم کیں، ان سے خلفا نے دوسرے مذاہب کو آزادی دینے کا سبق حاصل کیا۔ ملک عرب حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خدا کی عبادت گاہ اور ان کا مفتوحہ ملک تھا۔ اگر وہ چاہتے، تو وہاں کے بہت سے دیوتاؤں کے ماننے والوں اور بت پرستوں کو شرعاً نیست و نابود کر سکتے تھے۔ مگر آنحضرتؐ نے انصاف کو کام فرما کر نہایت عاقلانہ تدبیریں اختیار کیں۔"

آنحضرتؐ کی نسبت اتہام مرض صرع اکثر عیسائی مورخوں نے آنحضرتؐ کی سوانحعمری لکھتے وقت اس امر کو بطور اصول موضوعہ کے تسلیم کر لیا ہے کہ آپ عارضۂ صرع یعنی مرگی میں مبتلا تھے اور نزولِ وحی کے وقت اضطرار و غشی لاحق ہونے کے متعلق جو روایتیں مشہور ہیں، قطع نظر اس کے کہ وہ معتبر ہیں یا غیر معتبر، اُن سے عیسائیوں نے یہ خیال کر لیا ہے کہ آنحضرتؐ کو صرع کے دورے ہوتے تھے اور اس وجدانی حالت و کیفیت کو صرع سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس اتہام کی تردید اولاً عیسائی مورخوں کی زبان سے بیان کی جاتی ہے۔ اس کے بعد یہ درویش بھی اس مسئلے پر کچھ روشنی ڈالے گا۔

نہایت مشہور و لایق مورخ گبن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صرعی دوروں کی تکذیب ان الفاظ میں کرتا ہے:

"یہ یونانیوں کا ایک بیہودہ اتہام ہے۔"

اور ایک مقام پر بھی یہی مورخ کہتا ہے :

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے عارضہ صرع، بیہوش کر دینے والی بیماری کو تھیوفینز، رو مارس اور بعض دوسرے یونانی مورخوں نے بیان کیا ہے اور ہالنجر و پریڈو و مارکشی نے اپنے سخت تعصب سے اس کو نعمتِ غیر مترقبہ سمجھ کر نگل لیا ہے۔"

گاڈفری ہیگنز کہتا ہے :

"یہ متواتر بیان کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو عارضہ صرع لاحق تھا، یونانیوں کا ایک ذلیل اختراع ہے جنھوں نے اس عارضہ کو ایک نئے مذہب کے بانی کی طرف اس لیے منسوب کر دیا ہے کہ اس کے اخلاق پر ایک دھبا ہو جائے اور عیسائیوں کو طعنہ زنی و تنفر کا موقع ملے۔"

اگرچہ یورپین مورخوں کی شہادت مذکورہ نفس الزام کی تردید کے لیے کافی ہے مگر اس تصویر کا دُوسرا رُخ بھی دکھایا جاتا ہے۔ غور طلب یہ امر ہے کہ مرگی کا بیمار رسالت جیسے اہم ترین کام کو انجام بھی دے سکتا ہے یا نہیں؟

از روئے تحقیقات طب صرع کا مریض اکثر دیوانہ ہوتا ہے بلکہ دماغ میں کوئی خلقی نقص ہونے کی وجہ ہی سے عموماً یہ عارضہ لاحق ہوتا ہے۔ مرگی کے بیمار کا حافظہ جاتا رہتا ہے۔ اس میں تیزی، چستی و چالاکی نام کو نہیں رہتی۔ سُستی و کاہلی اسے باقاعدہ کوئی کام کرنے نہیں دیتی۔ اس کے تمام قوائے جسمانی و دماغی و ذہنی تقریباً معطل ہو جاتے ہیں۔ اس کی صورت سے دائمی ضعف و نقاہت کے آثار پائے جاتے ہیں۔ کمزوری و مجہولی اس کو محنت و مشقت پر آمادہ نہیں ہونے دیتی۔ جفاکشی و صبر و استقلال اس کے پاس سے رفوچکر ہو جاتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ آثار متذکرہ میں سے آیا کوئی اثر آنحضرتؐ میں پایا جاتا تھا یا نہیں؟ کوئی مورخ خواہ عیسائی ہو یا مسلمان یہ بیان نہیں کرتا کہ ان آثار میں سے ایک بھی اثر آنحضرتؐ میں پایا جاتا تھا بلکہ سب اس پر متفق ہیں کہ آپ نہایت قوی، تندرست و مضبوط تھے۔ تمام عمر آپ کو بڑے بڑے خطرے پیش آئے اور بڑی بڑی تکلیفیں اور صدمے آپ پر گزرے مگر آپ ہمیشہ ثابت قدم رہے اور آپ کے پائے استقلال میں کبھی لغزش نہ آئی۔ یہاں تک کہ جس کام کے واسطے آپ مبعوث ہوئے تھے، اس کو پورا کر دیا۔ لطف یہ ہے کہ وہ کام محض مسیحائی اور کوئی ایسا معمولی کام نہ تھا۔ جس کے انجام دینے کے لیے اوروں کی بھی ہمت پڑتی ہو۔ جیسا کہ خواجہ حافظؒ فرماتے ہیں : ؎

فیض روح القدس ار باز مدد فرماید
دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا مے کرد

بلکہ وہ کام تمام انبیاے سابقین کے مذاہب کی تجدید و تکمیل تھی۔ اللہ اکبر! روحی فداك یارسول اللہ۔ ؎

بہت سے کام چھوڑے تھے ادھورے اگلے نبیوں نے
دقیقہ تم نے کچھ رکھا نہ ختم المرسلینؐ باقی
(شبیر)

بیانِ مذکورہ بالا سے یہ تو بخوبی ثابت ہوگیا کہ آنحضرتؐ میں مرضِ صرع کی کوئی علامت نہ تھی۔ اب ہم آنحضرتؐ کے کارنامے کو پیشِ نظر رکھ کر چند تنقیحات قایم کرتے ہیں تاکہ یہ بھی ثابت ہو جائے کہ جو کام آنحضرتؐ نے کیے، ان کی انجام دہی مرگی کے بیمار سے ممکن ہی نہیں۔

کیا یہ قرینِ قیاس ہے کہ ایک مرگی زدہ آدمی جس کو ہر شخص جانتا ہو کہ یہ اس عارضہ میں مبتلا ہے، اپنی بیماری کے دوران کو آثارِ نزولِ وحی قرار دے کر بطور ثبوت نبوت پیش کرے اور سب اُس کو تسلیم کرلیں۔ وہ اپنے ملک و قوم کے مروجہ دین کے خلاف ایک نئے مذہب کا رستہ دکھائے اور وہ قوم اس کو مان لے۔ وہ بت پرستوں کے سامنے استیصالِ بت پرستی کا وعظ بیان کرے اور بت پرست اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر اس کی آواز پر آمنا و صدقنا کہہ اُٹھیں اور اپنے معبودوں کو توڑ پھوڑ کر پھینک دیں۔ وہ پیغمبری کا دعویٰ کرے اور اس کے عزیز و اقارب و اکابرِ قوم سب اپنے باپ دادا کا مذہب ترک کر کے اس کا کلمہ پڑھنے لگیں، اس کے حکم پر جلاوطنی اختیار کرلیں۔ گھربار، روپیہ پیسہ، زراعت و تجارت چھوڑ دیں۔ اس کے اشارے پر جان دینے کو تیار ہو جائیں اور اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو قتل کرنے سے بھی نہ چوکیں؟

کیا کوئی مرگی زدہ خدائے وحدہٗ لاشریک کی عبادت کی تجدید اس طور سے کر سکتا ہے جیسے کہ آنحضرتؐ نے کی اور جس کی کوئی نظیر آنحضرتؐ سے قبل دنیا میں نہیں پائی جاتی؟

کیا کوئی صرع کا بیمار علم الٰہیات کو ایسے مستحکم و معقول اصول پر قایم کر سکتا ہے جیسے کہ آنحضرتؐ نے قایم کیا اور جس کی مثال دنیا میں معدوم ہے؟

کیا کوئی ضعیف الدماغ یا ناقص الدماغ شخص قوانینِ تمدن و معاشرت و اخلاق کو اس درجہ کمال پر پہنچا سکتا ہے، جہاں آنحضرتؐ نے پہنچا دیا؟

کیا کسی مصروع نے اپنے بنی نوع کی فلاح و بہبود کے واسطے ملکی و مالی و دینی و دنیوی قوانین کا ایسا مجموعہ مرتب کیا ہے جیسا کہ آنحضرتؐ نے مرتب کیا؟ جو اپنی طرز میں بے مثل و بے نظیر ہے۔ کیا کسی مصروع نے اپنی کوششوں سے قلیل مدت میں ایک زبردست جزیرہ نما کو جس کی وسعت تقریباً ہندوستان کے مساوی ہے، فتح و مسخر کیا ہے؟ کیا کسی صرع کے بیمار نے مختلف قبائل کو اخوت کی حبل المتین سے کس کر ایک مضبوط و عظیم الشان قوم بنا دیا ہے؟

کیا کسی مصروع نے دنیا کے علماء و فضلاء و شعراء کے سامنے بطور دلیل نبوت ایسی کتاب پیش کی ہے، جو بلحاظ فصاحت و بلاغت و خوبی مضامین بے مثل ہو اور جس کے مانند آج تک کوئی تصنیف نہ کر سکا ہو۔ حالانکہ وہ کتاب تیرہ سو برس سے چلا چلا کر تمام دنیا کو اشتہار دے رہی ہے کہ اس کتاب کے مثل تم ایک سورۃ ہی بنا لاؤ اور اگر تنہا نہیں بنا سکتے، تو اپنے حمایتیوں کو بلا لو۔ سب مل کے بناؤ۔ کیا یہ سب کام جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیے، ایک ناتواں، لاچار، معذور، ضعیف القویٰ، کمزور دماغ والے شخص سے ظہور میں آنے ممکن ہیں؟

مصروع کو بیمار کو جانے دو۔ کیا دنیا کے کسی صحیح المزاج، اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ و طاقتور آدمی نے بھی اپنی مدت العمر

ین وہ تمام مہمات سر کی ہیں، جو آنحضرتؐ نے کیں؟

معمولی انسان کو بھی چھوڑ دو۔ کیا دوسرے اولوالعزم نبیوں سے بھی یہ سب کچھ ظہور میں آیا تھا، مخالفین کے پاس کوئی ایسی شہادت نہیں ہے، جس سے ہمارے سوالات کا جواب اثبات میں مل سکے۔ اور اس لیے قطعی طور پر یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ وہ کارہائے نمایاں جو بنی اسرائیل کے سب سے بڑے مقنن[1] حضرت موسیٰؑ سے، دنیا کے سب سے بڑے عقلمند حضرت سلیمانؑ سے اور خدا کے اکلوتے فرزند حضرت عیسیٰؑ سے وجود میں نہ آئے ہوں۔ ان کی تکمیل ریگستانِ حجاز میں پرورش پایا ہوا ایک بے پڑھا عرب فرما دے، تو کیوں اس کے افعال و اقوال کو ہم منجانب اللہ نہ سمجھیں اور کیوں اس اُمّی کو ہم سیدالمرسلین و خاتم النبیین نہ کہیں!

اللّٰھم صلّ علیٰ مُحمّد و علیٰ آلہٖ وصحبہٖ وسلّم۔

---

[1] عیسائی حضرت موسیٰؑ کو سب سے بڑا مقنن، حضرت سلیمانؑ کو دنیا میں سب سے زیادہ عقلمند اور حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا اکلوتا بیٹا کہتے ہیں۔ اس فقرے میں یہ تینوں صفات انھیں کی زبان سے بیان کر دی گئی ہیں۔ ۱۲ شبیر

سید الانبیاءؐ

ٹامس کارلائل

ٹامس کارلائل انیسویں صدی کا ایک نامور انگریز مصنف، مورخ اور مفکر تھا۔ اس کے لکچروں کا مجموعہ "ہیرو اینڈ ہیرو ورشپ" بہت مشہور ہے۔ جس میں ایک لکچر حضور رسالتمآبؐ کے متعلق بھی ہے۔ ایک ایسے دور میں جب کہ عیسائی اہلِ قلم اور اہلِ کلیسا اسلام اور بانیِ اسلام پر طرح طرح کے الزامات عائد کر کے اپنے مذہبی تعصب اور تنگ نظری کا ثبوت دیتے تھے۔ کارلائل نے پیغمبرِ اسلامؐ کی عظمت کا اعتراف جس خلوص و دیانت کے ساتھ کیا ہے، وہ خود اس کی بالغ نظری اور روشن ضمیری کی دلیل ہے۔ پیشِ نظر مضمون کارلائل کے اسی لکچر سے ماخوذ ہے۔

ہمارے پیشِ نظر ہیرو (محمدؐ) کو اپنے ابنائے جنس میں خدا نہیں مانا گیا بلکہ ایسا انسان سمجھا گیا ہے، جسے خدا کی طرف سے دی ہوئی یعنی پیغمبر ــــــ کسی بڑے انسان کو خدا سمجھ لینا لوگوں کی نہایت فاش اور ابلہانہ غلطی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہمیشہ یہ مشکل سوال پیش رہا ہے کہ دراصل اسے کیا سمجھنا چاہیے اور کس طرح اس کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔ کسی عہد کی تاریخ میں سب سے اہم چیز یہ ہے کہ اس زمانہ کے لوگوں نے کسی جلیل القدر انسان کا استقبال کس طرح کیا۔ لوگوں کو ہمیشہ ایسے انسان میں صفاتِ ایزدی کا کچھ نہ کچھ پرتو نظر آیا ہے اور یہ نہایت اہم سوال رہا ہے کہ لوگ ایسے شخص کو خدا سمجھیں یا پیغمبر یا کچھ اور ــــــ حضرت محمدؐ میرے خیال میں یقیناً پیغمبرِ صادق ہیں اور میں آپؐ کے وہ اوصاف بیان کر دینا چاہتا ہوں، جو انصاف کے ساتھ بیان کر دینا ضروری ہیں۔ حضرت محمدؐ کے متعلق ہم عیسائیوں کا یہ قیاس بالکل بے بنیاد ہے کہ "آپ دغا باز اور کذبِ مجسم تھے اور آپ کا مذہب محض فریب و نادانی کا ایک مجموعہ ہے"۔ کذب و افترا کا وہ انبارِ عظیم جو ہم نے اپنے مذہب کی حمایت میں اس ہستی کے خلاف کھڑا کیا ہے، خود ہمارے لیے شرمناک ہے۔ اس شخص کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ آج بارہ سو برس سے اٹھارہ کروڑ انسانوں کے حق میں شمعِ ہدایت کا کام دے رہے ہیں۔ یہ اٹھارہ کروڑ انسان بھی ہماری طرح خدائے تعالیٰ کے دستِ قدرت کا نمونہ ہیں۔ بندگانِ خدا کی بیشتر تعداد آج بھی کسی اور شخص کی بہ نسبت محمدؐ کے اقوال پر ایمان رکھتی ہے۔ کیا ہم کسی طرح اسے تسلیم کر سکتے ہیں کہ یہ سب روحانی بازی گری کا ایک ادنیٰ کرشمہ تھا۔ جس پر اتنے بندگانِ خدا ایمان لائے؟ کیا ایک جھوٹا آدمی کسی مذہب کا بانی ہو سکتا ہے، جھوٹا آدمی تو اینٹ اور چونے کا ایک مکان تک نہیں بنا سکتا۔ اگر کسی شخص کو مٹی، چونے اور ان اشیاء کے خواص کا صحیح علم نہ ہو اور وہ ان کا پورا لحاظ نہ رکھے، جو مکان کی تعمیر میں استعمال ہوتے ہیں، تو اس کا بنایا ہوا "مکان" مکان نہ کہلا سکے گا، بلکہ مٹی کا ایک ڈھیر ہوگا۔ ایسا مکان بارہ صدی تک نہیں قایم رہ سکتا اور نہ اس میں اٹھارہ کروڑ انسان سما سکتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ خلوص بڑا گہرا خلوص اور سچا خلوص ہر بڑے انسان کی پہلی خصوصیت ہے اور ایسے شخص کو ہم "اوریجنل انسان" کہتے ہیں۔ اس کی فطرت کسی پہلے مرقع کی نقل نہیں ہوتی!! وہ ایک ایسا قاصد ہے، جو پردۂ غیب سے پیغام دے کر ہمارے پاس بھیجا گیا۔ خواہ ہم اسے شاعر کہیں یا پیغمبر یا دیوتا۔ بہرصورت ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ ساری نوعِ انسان کے الفاظ سے مختلف ہوتے ہیں۔ وہ حقیقتِ اشیاء کی روحِ رواں سے نکلتا ہے اور رات دن اسی میں بسر کرتا ہے۔ اوہام اس سے اس حقیقت کو نہیں چھپا سکتے۔ وہ اندھا ہو، بے خانماں ہو، مصیبت زدہ ہو، روزمرہ کی گفتگو میں منہمک ہو۔ لیکن یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح ہر وقت اس کے پیشِ نظر رہتی ہے۔ کیا اس کے الفاظ فی الحقیقت ایک طرح کی وحی نہیں ہیں؟ جب اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی اور لفظ ہی نہ ہو، تو پھر ہم وحی کے سوا اسے کس نام سے تعبیر کریں؟ ایسے انسان کی ہستی قلبِ کائنات سے ابھرتی ہے اور وہ اشیاء کی بنیادی حقیقت کا ایک جزو ہوتا ہے۔ خدائے تعالیٰ نے اس دنیا میں بہت سے الہام بھیجے ہیں۔ لیکن کیا یہ شخص اس کا آخری اور تازہ ترین مظہر نہیں ہے۔" اس کی عقل وحی کی پروردہ ہوتی ہے۔" ہم کسی طرح حضرت محمدؐ کو حریص و منصوبہ باز اور ان کی تعلیمات کو جہل و نادانی نہیں سمجھ سکتے۔ وہ پیغام جو آپ لے کر آئے تھے، بالکل سچا تھا۔ وہ ایک آواز تھی، جو پردۂ غیب سے بلند ہوئی۔ اس شخص کے نہ اقوال جھوٹے تھے نہ افعال۔ اس میں تنگ ظرفی اور نمائش کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ زندگی کا ایک جادۂ تاباں تھا، جو خاص سینۂ فطرت سے ہویدا ہوا، اور جسے خالقِ عالم نے کائنات کو منور کرنے کے لیے بھیجا تھا۔

آں حضرتؐ نے سنِ شعور کو پہنچنے کے بعد اپنے چچا کے ساتھ تجارت اور دوسرے اغراض کے لیے مختلف سفر کیے۔ لیکن آپ کا اہم ترین سفر وہ ہے، جو سنِ شعور سے چند سال قبل شام کے میلوں میں شرکت کی غرض سے آپ نے اختیار کیا تھا۔ کیونکہ اس موقع پر پہلی دفعہ آپ کو بیرونی دنیا کے دیکھنے کا اتفاق ہوا اور اس عنصر جدید (یعنی مذہب عیسوی) سے واقف ہوئے، جو آپ کے لیے بے انتہا اہم تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس سفر کے اثناء میں حضرت ابوطالب اور آپؐ سرجیس نام ایک نسطوری راہب کے ہاں ٹھہرے تھے، جس نے آپ کو مذہب عیسوی کی تعلیم دی تھی۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنے کم عمر بچے کو کوئی راہب کیا تعلیم دے سکتا ہے۔ غالباً نسطوری راہب کے اس واقعہ میں بہت مبالغہ کیا جاتا ہے۔ کیونکہ آنحضرتؐ کی عمر اس وقت چودہ سال کی تھی، اور آپ عربی کے سوا کوئی اور زبان نہیں جانتے تھے۔

یہ امر کہ آپ نے جوشِ شباب کے ختم ہونے تک بالکل معمولی طریقہ پر اور نہایت سادگی و خاموشی کے ساتھ اپنی زندگی کے دن گزارے، بجائے خود اس خیال کی تکذیب کرتا ہے کہ آپ کی نیت میں کس طرح کا مکر و فریب تھا۔ چالیس سال کی عمر میں آپ نے نبوت کا دعویٰ کیا اور اس وقت تک بھی آپ کی ساری کوشش پاک زندگی بسر کرنے کے لیے تھی اور آپ کی شہرت بہت اچھی تھی اور ہمسائے آپ کے متعلق بہت نیک خیالات رکھتے تھے۔ مخالفوں کا یہ کہنا کہ جب بڑھاپا آ پہنچا، ساری گرمیِ شباب ختم ہوگئی اور آپ کے لیے اس دنیا میں صرف اطمینان و عافیت ہی ایک چیز باقی رہی تو اس وقت آپ کو ہوس پرستی کی سوجھی اور اپنے سارے گزشتہ خصائل و فضائل پر پانی پھیر کر ایک ایسی شے کے لیے مکر و فریب اختیار کیا، جس سے آپ کسی طرح متمتع نہ ہو سکتے تھے، ایک ایسی بات ہے، جس کو میں کبھی تسلیم نہیں کر سکتا۔ اس سیر چشم، پاک طینت اور صاف باطن انسان میں، جسے مادرِ صحرا نے اپنے

آغوشِ شفقت میں پالا تھا، جذبۂ ہوس پرستی اور شہرت طلبی نہ تھی، بلکہ کچھ اور ہی خیالات موجزن تھے۔ یہ اس قسم کی بزرگ و برتر جان پاک تھی، جسے خلوص و صداقت کے بغیر گزر ہی نہیں۔ جس کے خمیر میں خود فطرت اخلاص کو جگہ دیتی ہے۔ جس وقت اور لوگ اوہام میں مبتلا تھے اور اسی پر اڑے رہنے کے لیے جنگ و جدل کر رہے تھے، اس شخص کی عقل پر وہم و گمان کا پردہ نہ پڑ سکا۔ وہ اپنی روح اور حقایق اشیاء کے ساتھ سب سے الگ تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے رازِ ہستی ایک بیم و رجا کے ساتھ روزِ روشن کی طرح عیاں تھا۔ جس کے وجود کو کسی طرح کا وہم و گمان پوشیدہ نہ کر سکا۔ یہ صفت جسے ہم نے "خلوص" کے لفظ سے تعبیر کیا، درحقیقت صفاتِ ایزدی کا ایک پرتو ہے اور ایسے انسان کی آواز دراصل ہاتفِ غیب کی آواز ہے۔ جسے لوگ انتہائی توجہ سے سنتے ہیں اور انہیں سننا چاہیے، کیونکہ اس کے مقابلہ میں دنیا کی ہر چیز ہیچ ہے۔

آنحضرت کی عمر کا چالیسواں سال تھا۔ آپ ماہِ رمضان میں تسبیح و تحلیل اور ان مسائل پر غور و فکر میں بسر کرنے کی غرض سے مکہ کے قریب کوہِ حرا کے ایک غار میں تشریف لے گئے تھے کہ ایک دن آپؐ نے اپنی بیوی خدیجہؓ سے فرمایا کہ فضلِ باری تعالیٰ سے تمام عقدے حل ہو گئے۔ میرے سارے شکوک و شبہات رفع ہو گئے اور میں حقایق و معارف کو بے نقاب دیکھ رہا ہوں۔ یہ تمام اصنام و عقاید مہمل ہیں۔ مٹی کے کھلونے ہیں۔ سارے عالم کا مالک خدائے واحد ہے۔ ہمیں ان تمام بتوں سے منہ موڑ کر اسی ذاتِ واحد کے آگے سر جھکانا چاہیے۔ صرف وہی ایک ذاتِ بزرگ و برتر ہے۔ اس کے سوائے عظمت و رفعت کا کوئی نشایاں نہیں۔ وہ حقیقت ہے۔ یہ بت مجاز۔ اسی نے ہمیں پیدا کیا۔ وہی ہمیں پال رہا ہے اور ہم سب اسی کا پرتو ہیں۔ اسی حسنِ ازل کی ایک عارضی نقاب ہیں۔ "اللہ اکبر" یعنی خدا ہی بزرگ و برتر ہے اور "اسلام" کا مطلب ہے راضی برضائے الٰہی رہنا۔ یہ سمجھنا کہ ہماری قوت اسی کی کامل اطاعت میں مضمر ہے، وہ ہماری دنیا اور آخرت کے لیے جو چاہے کرے۔ جو کچھ ہمارے لیے بھیجے، خواہ وہ موت ہو یا موت سے بدتر کوئی چیز، وہی ہمارے حق میں بہتر ہے۔ ہم اپنے کو اسی کے حوالے کرتے ہیں۔ گوئٹے کہتا ہے کہ "اگر اس کا نام اسلام ہے، تو کیا ہم سب مسلمان نہیں ہیں" اسلام عبارت ہے ایثارِ نفس اور نفس کشی سے۔ یہ عقل کا وہ نقطۂ کمال ہے، جو قدرت اس دنیا پر اب تک منکشف کر سکی۔ اور یہی وہ نور ہے، جو اس اُمّی سیدِ عربی کی روح کو منور کرنے کے لیے ظاہر ہوا تھا۔ حیاتِ سرمدی کے اس مہرِ منور کو جو ظلمت کدۂ موت میں طلوع ہوا تھا۔ آنحضرتؐ نے "وحی" اور "فرشتہ جبرئیل" کے نام سے موسوم کیا۔ کیا آج بھی کوئی بتا سکتا ہے کہ اسے اور کس لفظ سے تعبیر کرنا چاہیے؟ .... آنحضرتؐ کی تبلیغ قدرتاً قریش کو ناگوار گزری، جو کعبہ کے پاسبان اور بتوں کے متولی تھے۔ دو ایک ذی اثر آدمی اسلام لے آئے تھے۔ اسلام گو آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا، لیکن اس کا دائرہ وسیع تر ہوتا جاتا تھا۔ جس سے ہر شخص ناراض ہو رہا تھا اور کہتا تھا کہ "یہ کون ہیں، جو اپنے کو ہم سب سے زیادہ عقلمند سمجھتے ہیں۔ ہمیں احمق اور ہمارے بتوں کو لکڑی کے کھلونے ٹھیراتے ہیں۔" آخر آپ کے خوش صفات چچا ابوطالب نے آپ سے کہا: جانِ عم! کیا تم اس تبلیغ سے باز نہیں آسکتے؟ اپنی حد تک اس عقیدہ کے پابند رہو۔ لیکن اس کا چرچا کر کے دوسروں کو پریشان کرنے، سرداران قبائل کو ناراض کرنے اور ہمیں خود اپنے کو خطرہ میں ڈالنے سے کیا حاصل؟" آنحضرتؐ نے یہ سُن کر جواب دیا کہ "اگر میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند لا کر بھی رکھ دیں اور اس تبلیغ سے باز رہنے کی خواہش کریں، تو بھی میں اس کی تعمیل نہیں کر سکتا۔" اس پیغامِ صداقت میں، جو آپ

لے کر آئے تھے، ایک ایسا فطری عنصر شامل تھا، جو آفتاب و ماہتاب عرض فطرت کی کسی صنعت سے کم نہ تھا۔ یہ عنصر مہ و خورشید اور تمام انسانوں اور اشیاء کی مخالفت کے باوجود اس وقت تک اپنا اظہار کرتا رہے گا، جب تک اسے خدائے تعالیٰ کا حکم ہوگا۔

ہجری سلمہ، عیسوی ۶۲۲ء کے مطابق ہے۔ اس وقت آنحضرتؐ کی عمر ترپن سال کی تھی۔ آپ بوڑھے ہو چکے تھے اور آپ کے احباب ایک ایک کر کے دنیا سے رخصت ہو رہے تھے۔ آپ کا راستہ سنسان اور پُرخطر تھا اور بجز اس کے کہ خود آپ کا دل نورِ امید سے روشن تھا، ظاہری صورتِ حال نہایت تاریک تھی۔ ایسی صورتوں میں سب آدمیوں کا یہی حال ہوتا ہے۔ اب تک آنحضرتؐ نے صرف ترغیب و تلقین کے ذریعہ اپنے مذہب کی اشاعت فرمائی تھی۔ لیکن جب ستم شعار اعداء نے آپؐ کو بے رحمی کے ساتھ وطن سے نکال دیا اور نہ صرف اس پیغام ایزدی کی طرف سے بے اعتنائی کی، بلکہ آپ کی جان کے بھی درپے ہُوئے تو مادرِ صحرا کے اس پُرجوش فرزند نے اس طرح اپنی مدافعت کا تہیہ کیا، جو ایک انسان اور ایک عرب کے شایاں تھا۔ اس نے کہا "اگر قریش اسی پر تلے ہُوئے ہیں، تو یہی سہی۔ یہ لوگ اس پیغام کو نہیں سنتے، جو ان کے اور تمام نوعِ انسان کے لیے بے انتہا اہم ہے اور چاہتے ہیں کہ اسے جبر و تشدد اور قتل و غارت کے ذریعہ دبا دیں۔ اچھا! تو انھیں شمشیر آزمائی بھی کر لینے دو۔"

اس کے بعد آنحضرتؐ کو دس سال ایسے، جو سخت جنگ و جدل اور جد و جہد میں صرف ہُوئے۔ اس شدید کش مکش کا جو نتیجہ نکلا، وہ آج ہمارے پیشِ نظر ہے۔ اسلام کے بزورِ شمشیر پھیلنے کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن اگر ہم کسی مذہب کی صداقت کا معیار اسی کو قرار دے لیں، تو یہ ایک بنیادی غلطی ہوگی۔ تلوار استعمال بے شک ہُوئی، مگر سوال یہ ہے کہ یہ تلوار آئی کہاں سے؟ ہر نیا خیال ابتداءً ایک ہی شخص کے دماغ میں پیدا ہوتا اور اسی میں جاگزیں رہتا ہے۔ ساری دنیا میں صرف ایک انسان اپنے تمام ابنائے جنس کے خلاف اس کا پابند ہوتا ہے۔ اگر وُہ اکیلا تلوار لے کر اس خیال کی اشاعت کرنا چاہے، تو شاید ہی کچھ حاصل ہو۔ اس لیے پہلے تو اسے تلواریں بہم پہنچانی پڑیں گی۔ اس کے معنی یہ ہُوئے کہ ہر خیال خود بخود وسعت اختیار کرتا جاتا ہے۔ مذہب عیسوی کا دامن بھی ہیں انسانی خون کے دھبّوں سے پاک نہیں نظر آتا۔ جب اس کے ہاتھ میں تلوار آئی تو اس نے بھی اس کا استعمال کیا ہے۔ کیا شارلیمین کے عہد میں سکسینیوں کا تبدیل مذہب تبلیغ کا نتیجہ تھا؟ اس لیے زورِ شمشیر کا اعتراض میرے خیال میں کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ میرے نزدیک اس دنیا میں ہر شے کو جد و جہد کا حق حاصل ہے، خواہ وُہ زبان سے ہو یا تلوار سے یا کسی اور ذریعے سے، جو اسے میسر آجائے۔ وُہ ہر چند تبلیغ و تلقین کرے۔ لڑے جھگڑے اور ایڑی چوٹی کا زور لگائے لیکن انجام کار یہ جد و جہد کسی ایسی چیز پر غالب نہ آسکے گی، جو مغلوب ہونے کی مستحق نہ ہو۔ جو چیز اس سے بہتر ہے، وہ اس کو ہرگز زیر نہیں کر سکتی۔ البتہ جو چیز اس سے بدتر ہے، اس پر وہ ضرور قابو پالے گی۔ اس مبارزتِ عظمیٰ میں خود قدرت ثالث ہے، جو کبھی غلطی نہیں کر سکتی اور آخر کار وہی شے فروغ پائے گی، جو سب سے زیادہ مطابق فطرت ہے اور جسے ہم عام طور پر "صادق ترین" کہتے ہیں۔

مادرِ صحرا کے اُس اُمّی فرزند (آنحضرتؐ) نے اپنے پُرخلوص اور روشن ضمیر کے ذریعہ سے جو موت و حیات کی طرح صداقت سے معمور تھا، اور اپنی نگاہ حقیقت آشنا کی بدولت جو بالکل خداداد تھی، عربوں کی لایعنی بُت پرستی، یونانیوں اور یہودیوں کے مذہبی مناظرات، قدیم روایات، رسم و رواج اور فضول کج بحثیوں میں اصل حقیقت کو پا لیا اور فرمایا کہ "بُت پرستی فعل عبث ہے، ان

لکڑی کے بُتوں کو تم لوگ تیل اور موم لگاتے ہو اور انھیں مکھیاں چمٹتی ہیں ۔ یہ لکڑی کے ٹکڑے ہیں، جو تمھارے لیے کچھ نہیں کر سکتے ۔ یہ پوچ اور مہمل کفر و شرک ہے ۔ اگر تم ان کی حقیقت سمجھو، تو اُن کا وجود دہشت خیز اور نفرت انگیز ہو جائے ۔ بقا صرف خدا کی ذات کو ہے ۔ قوت و اقتدار اسی کو حاصل ہے ۔ اسی نے ہم کو پیدا کیا ۔ وہی ہم کو مار اور جلا سکتا ہے ۔ "اللہ اکبر"۔ اللہ بہت بڑا ہے ۔ یہ سمجھ لو کہ تمھارے حق میں وہی بہتر ہے، جو وُہ چاہے ۔ خواہ وہ تمھارے نفس کو کتنا ہی گراں گزرے، لیکن تم اسی کو بہترین پاؤ گے ۔ تم اس کے اختیار کرنے پر مجبور ہو ۔ دنیا اور عقبیٰ میں تمھارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ۔" اگر وحشی بُت پرستوں نے آپ کے اس پیغام کو قبول کر لیا اور اس پر عمل پیرا ہونے کے لیے اسے اپنے حرارت بھرے سینوں میں جگہ دی تو کوئی تعجب کی بات نہیں ۔ میرے نزدیک وہ اسی طرح قبول کیے جانے کے قابل تھا ۔ کسی نہ کسی صورت میں آج بھی یہی ایک ایسا پیغام ہے، جسے ہر شخص کو قبول کرنا چاہیے ۔ اس سے انسان اس معبدِ عالم کا سر نشین بن جاتا ہے ۔ خالقِ جہاں کے احکام کا ہم صفیر ہو جاتا ہے اور ان احکام کی احمقانہ مخالفت کے بجائے اُن کے ساتھ اشتراکِ عمل کرنے لگتا ہے ۔ آج تک مجھے فرض شناسی کی اس سے بہتر تعریف نہ معلوم ہو سکی ۔ مقصدِ کائنات کا ساتھ دینے میں تمام محاسن شامل ہیں ۔ اس سے انسان کو نیکی اور کامیابی حاصل ہوتی ہے، کیونکہ مقصدِ کائنات کا کامیاب ہونا ضروری ہے اور وہ صراطِ مستقیم پر رہتا ہے ۔

آنحضرتؐ سے معجزات ظہور میں نہیں آئے اور آپؐ نے اکثر بلا تامل کہہ دیا "میں معجزے نہیں کر سکتا ۔ میں ہادیِ خلق ہوں، اور میرا کام ان عقاید کو تمام مخلوق تک پہنچانا ہے ۔" اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدا سے آپ کے نزدیک یہ کائنات ایک معجزۂ عظیم رہی ۔ چنانچہ آپؐ فرماتے ہیں کہ "اس دنیا کو دیکھو! کیا وُہ دستِ قدرت کی عجیب و غریب صنعت نہیں ہے؟ یہ ایک نشانی ہے، تمھارے لیے اگر تم دیدۂ بینا رکھتے ہو، یہ زمین خدا نے تمھارے لیے پیدا کی اور اس پر راستے بنا دیے ۔ تم اس پر رہ سکتے ہو اور چل پھر سکتے ہو ۔" عرب جیسے گرم و خشک ملک میں بادلوں کا وجود آنحضرتؐ کے لیے حیرت انگیز تھا ۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ "بادلوں کے یہ پرے، جو سینۂ فلک کی گہرائی سے نکلتے ہیں؟ آخر کہاں سے آتے ہیں؟ سیاہ ابر کے یہ دَل کے دَل آسمان پر جمع ہوتے اور برستے ہیں، جن سے مُردہ زمین جی اُٹھتی ہے، سبزہ لہلہانے لگتا ہے اور کھجوروں سے لدے ہوئے بلند سایہ دار درخت پیدا ہوتے ہیں ۔ کیا یہ ایک معجزہ نہیں ہے؟ تمھارے مویشی بھی اللہ تعالیٰ نے پیدا کیے، جو تمھاری خدمت کرتے اور تمھارے لیے غذا اور لباس بہم پہنچاتے ہیں ۔ وہ شام کے وقت قطار در قطار گھروں کی طرف لوٹتے ہیں اور تمھارے لیے ایک نعمت ہیں ۔" آپ نے اکثر جہازوں کا ذکر بھی ان الفاظ میں کیا ہے: "وہ بڑے متحرک پہاڑ اپنے کپڑوں کے پر پھیلا کر سُرعت کے ساتھ پانی پر چلتے ہیں ۔ آسمانی ہوائیں انھیں چلاتی ہیں اور جب کبھی خدائے تعالیٰ ہوا بند کر دیتا ہے، وہ رُک جاتے ہیں اور حرکت نہیں کر سکتے ۔" معجزات! آپ فرماتے ہیں کہ تم لوگ کیا معجزات دیکھنا چاہتے ہو؟ کیا تمھارا وجود خود ایک معجزہ نہیں ہے؟ خدا نے تمھیں تھوڑی سی مٹی سے پیدا کیا ۔ اس سے پہلے تمھارا وجود بھی نہ تھا ۔ پھر جب تم پیدا ہوئے، تو بہت چھوٹے سے تھے ۔ اس کے بعد تم میں حسن آیا، طاقت آئی اور غور و فکر کی صلاحیت پیدا ہوئی ۔ مگر پھر ایک زمانہ ایسا آتا ہے کہ تم بوڑھے ہو جاتے ہو ۔ تمھارے بال سفید ہو جاتے ہیں ۔ تمھاری طاقت جواب دینے لگتی ہے اور آخر کار تم فنا ہو جاتے ہو ۔

آپ کا یہ جملہ خصوصاً مجھے بہت پسند ہے کہ "خدائے تعالیٰ نے تم میں ہمدردی کا مادہ پیدا کیا۔ اگر یہ نہ پیدا کرتا تو تم لوگوں کا کیا حال ہوتا" یہ ایک نہایت اعلیٰ اور اچھوتا خیال ہے۔ حقیقت اشیاء کی ایک نادر جھلک ہے۔

آپ کی طبیعت میں شاعرانہ کمال اور بہترین و صادق ترین خیالات کے آثار پائے جاتے ہیں۔ آپ ایسی اعلیٰ ذہانت، بصیرت اور دل و دماغ کے مالک تھے کہ شاعر، بادشاہ، مذہبی پیشوا غرض جس قسم کے مشہور انسان بننا چاہتے بن سکتے تھے۔ آپ پر ہمیشہ یہ بات عیاں رہی کہ یہ کائنات سراپا ایک معجزہ ہے، جیسے اس سے قبل بیان ہو چکا ہے۔ اسکینڈی نیویا کے باشندوں اور دوسرے مفکرین کی طرح آپ کی بھی یہ رائے ہے کہ یہ عالم جو بظاہر بالکل حقیقی اور مادی دکھائی دیتا ہے، دراصل ذاتِ باری تعالیٰ کے وجود اور قدرت کا صرف ایک مرئی اور محسوس مظہر ہے۔ فضا کے سینۂ عریاں پر ذاتِ الٰہی کا ایک پرتو ہے اور بس۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ "یہ بڑے بڑے پہاڑ ایک دن بادلوں کی طرح پھٹ کر آسمان میں غائب ہو جائیں گے۔" سیل لکھتا ہے کہ عربوں کے عقیدہ کے مطابق آپ نے زمین کو چوڑی چکل ظاہر کیا، جس کو مستحکم کرنے کے لیے پہاڑ قایم ہیں۔ قیامت کے دن یہ پہاڑ بادلوں کی طرح اڑ جائیں گے اور زمین اس قدر گھومے گی کہ تباہ ہو کر گرد و غبار کی طرح خلا میں غائب ہو جائے گی۔ خدائے تعالیٰ اس کی طرف سے اپنی توجہ ہٹا لے گا اور وہ فنا ہو جائے گی۔

آنحضرتؐ پر اللہ تعالیٰ کا عالمگیر اقتدار ہر وقت عیاں تھا۔ یعنی آپ یہ بخوبی سمجھتے تھے کہ دنیا کی تمام اشیاء کی اصلی طاقت، رُوح اور حقیقت کی حیثیت سے ہر جگہ ایک ایسی ناقابلِ بیان قوت، عظمت اور جبروت موجود ہے، جس کا کوئی نام نہیں رکھا جا سکتا۔ یہی چیز عہدِ حاضر میں قوانینِ قدرت اور نوامیسِ فطرت کے نام سے موسوم کی جاتی ہے اور کوئی آسمانی شے نہیں سمجھی جاتی۔ بلکہ سرے سے ایک شے ہی نہیں سمجھی جاتی بلکہ وُہ اشیاء کا ایسا مجموعہ تصور کی جاتی ہے، جو صفاتِ ایزدی سے معرّا اور ہیچ کارہ ہو۔ موجودہ علوم و فنون کے انہماک میں اس کا احتمال ہے کہ ہم خدا کو بھلا بیٹھیں، حالانکہ اس کو بھولنا نہ چاہیے۔ کیونکہ اگر وہی بھلا دیا جائے تو میں نہیں سمجھتا کہ دنیا میں پھر کون سی چیز یاد رکھنے کے قابل رہے گی۔ اس صورت میں تمام علوم بالکل مہمل، مُردہ اور بے کار ہو جائیں گے۔ اعتقادِ باری تعالیٰ کے بغیر بہترین علوم بھی چوبِ خشک ہوں گے نہ کہ درخت سبز، جس سے ہر دم نئی لکڑی حاصل ہو سکے۔ انسان کسی نہ کسی طریقہ پر خدا کی پرستش کیے بغیر کچھ نہیں جان سکتا۔ اگر یہ نہ ہو، تو اس کا سارا علم و فضل ہیچ ہے۔

۹۲ اسلام کوئی آسان مذہب نہیں۔ اس میں روزہ داری، طہارت، سخت اور پیچیدہ مسائل، دن میں پانچ دفعہ نماز، شراب سے اجتناب، غرض ایسے احکام ہیں، جن پر نظر کرتے ہُوئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ آسان ہونے کی وجہ سے مقبول ہوا اور ایک اسلام پر کیا منحصر، دنیا میں کوئی مذہب یا مذہبی عقیدہ محض سہل ہونے کی وجہ سے نہیں رائج ہو سکتا۔ یہ کہنا کہ انسان تن آسانی، عیش پرستی، صلہ کی امید یا مٹے و انگبیں کی لالچ سے، خواہ وہ اس عالم میں ہو یا دوسرے عالم میں، اعمالِ نیک کی طرف مائل ہوتے ہیں، دراصل نسلِ آدم پر بہتان لگانا ہے۔ ذلیل ترین انسان میں بھی شرافت کا کچھ نہ کچھ جوہر موجود ہوتا ہے۔ ایک غریب سپاہی بھی جو صرف اپنی جان قربان کرنے کے لیے ملازم رکھا جاتا ہے ایک خاص عزت رکھتا ہے، جو اُس کی حقیر تنخواہ اور فوجی قواعد و ضوابط سے مختلف ہوتی ہے۔ نسلِ آدم کا ادنیٰ ترین فرد بھی اپنے دل میں جس چیز کی موہوم سی تمنا

رکھتا ہے، وہ مئے و انگبیں کی لذت نہیں بلکہ اعمال صالح کا شوق اور خدا کے ایک نیک بندہ کی حیثیت سے جنت میں داخل ہونے کی آرزو ہے۔ آپ اسے وہاں تک پہنچنے کا راستہ دکھا دیجیے۔ پھر دیکھیے کہ ایک سُست ترین مزدور بھی آسمانِ شہرت پر چمک جاتا ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ انسان کو تن آسانی کے ذریعہ نیک کاموں کی طرف راغب کیا جا سکتا ہے، وہ بنی نوع انسان پر سخت ظلم کرتے ہیں۔ مصیبت، ایثار، شہادت اور موت ہی وہ موجبات ترغیب ہیں، جن سے قلب انسانی متاثر ہوتا ہے۔ اگر یہ اندرونی شمع حیات روشن کر دی جائے، تو اس سے ایسا شعلہ پیدا ہوگا، جو تمام آلائشوں کو جلا دے گا۔ ادنیٰ طبقہ میں بھی اس کا ثبوت ملتا ہے کہ مسرت و شادمانی ہی کارہائے نمایاں کی ترغیب دلانے کے لیے کافی نہیں بلکہ اس سے اعلیٰ تر ذرائع کی ضرورت ہے۔ کسی مذہب کے پیرؤوں کی تعداد میں اضافہ انسانوں کی شکم پروری سے نہیں ہوتا بلکہ ان اعلیٰ جذبات کے اُکسانے سے جو ہر قلب انسانی میں خوابیدہ ہیں۔

کہنے کو خواہ کچھ ہی کہا جاتے لیکن محمدؐ کے دامن پر کبھی ہوس پرستی کا دھبّا نہیں لگ سکتا۔ یہ انتہائی غلطی ہوگی اگر ہم آپ کو نفس پرست سمجھیں اور یہ خیال کریں کہ آپ کسی طرح کے عیش و عشرت کے عادی تھے۔ آپ کا اثاث البیت بہت ہی ادنیٰ قسم کا تھا۔ آپ کی معمولی غذا جَو کی روٹی اور پانی تھی۔ بعض دفعہ مہینوں آپ کے گھر میں چُولھا تک نہ سُلگتا۔ عرب مورخین بجا فخر کے ساتھ لکھتے ہیں کہ "آپ اپنی نعلین خود درست کرتے اور اپنی عبا پر خود پیوند لگاتے۔" آپ ایک غریب، جفاکش اور تنگدست انسان تھے۔ جنھیں کسی طرح کی محنت و مشقت سے عار نہ تھا۔ غرض آپ میں کسی حیثیت سے کوئی کمی نہ تھی ——— آپ میں تمام خواہشات جسمانی سے اعلیٰ تر ایک جذبہ کارفرما تھا، ورنہ وہ تند خو عرب، جو تیئیس سال آپ کے زیر علم لڑتے رہے اور جنھیں ہر وقت آپ کے ساتھ نشست و برخاست کا موقع ملا، آپ کی اس قدر تعظیم نہ کرتے۔ وہ آتش مزاج لوگ تھے، جو ذرا ذرا سی بات پر بھڑک اُٹھتے اور ہر طرح کا فتنہ و فساد برپا کرنے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ ان پر سچّی قابلیت اور جرأت کے بغیر کوئی شخص حکمرانی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ لوگ آپ کو پیغمبر کہتے تھے حالانکہ آپ ان کے رو برو بالکل صاف و سادہ حالت میں بغیر کسی نقاب وحجاب کے کھڑے تھے۔ انھوں نے آپ کو عبا سیتے، نعلین درست کرتے، لڑتے، مشورہ کرتے، حکم دیتے، غرض ہر حالت میں دیکھا تھا۔ انھیں اس کا اچھی طرح اندازہ ہُوا ہوگا کہ آپؐ کس قسم کے آدمی تھے۔ اس وقت ہم آپ کو جو چاہیں کہہ لیں، لیکن آج تک کسی شہنشاہ نے تاجِ مرصّع پہن کر اس طرح حکومت نہ کی ہوگی، جس طرح اس خرقہ پوش انسان نے کی ہے۔ میرے نزدیک اس کی ذات میں اصلی ہیرو کے وہ تمام صفات موجود تھے، جو اسے تیئیس سال کی سخت اور حقیقی آزمایش میں کامیاب کرانے کے لیے ضروری ہیں۔ آخری الفاظ، جو آنحضرتؐ کی زبان سے نکلے، ایک دُعا ہے، ایک قلب مضطر کے اپنے خالق کی بارگاہ میں چند ٹوٹے پھوٹے جملے ہیں۔ یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ مذہب اسلام کی اشاعت نے آپ کی طبیعت میں کوئی خرابی پیدا کر دی بلکہ اور اچھا اثر کیا۔ آپ کے حالات میں بہت سی عمدہ باتیں لکھی ہیں مثلاً جب آپؐ کی صاحبزادی کا انتقال ہُوا، تو آپؐ نے اپنے طرز میں جو کچھ فرمایا، وہ صداقت سے معمور ہونے کے ساتھ ساتھ عیسوی عقاید سے ملتا جلتا ہے یعنی انّا للہ و انّا الیہ راجعون۔ ہم خدا کی طرف سے آئے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جانے والے ہیں۔ یہی آپؐ نے اس وقت بھی فرمایا، جب

آپ نے آزاد کردہ غلام زیدؓ کی وفات کی خبر سُنی۔ زیدؓ دوسرے مسلمان تھے۔ یہ غزوہ تبوک میں شہید ہُوئے، جو یونانیوں سے آنحضرتؐ کی پہلی جنگ تھی۔ ان کی شہادت کا حال سُن کر آپ نے فرمایا: "اچھا ہُوا کہ زیدؓ راہِ خدا میں کام آئے۔ وُہ اب اپنے مالک سے جا ملے اور ان کا انجام بخیر ہوا۔" لیکن اس کے باوجود حضرت زیدؓ کی صاحبزادی نے آپ کو ان کی نعش پر روتے دیکھا اور عرض کیا: "یا رسول اللہؐ! یہ میں کیا دیکھ رہی ہُوں؟"

آپ نے ارشاد فرمایا: "ایک انسان کو اپنے دوست کی جدائی پر روتا دیکھ رہی ہو۔"

مجھے محمدؐ کا تصنع اور ظاہر داری سے کوسوں دُور رہنا بہت پسند ہے۔ مادرِ صحرا کا یہ سادگی پسند فرزند اپنے بل بوتے پر کام کرتا ہے اور اپنی ذات کے متعلق کوئی غلط ادعا نہیں کرتا۔ اس میں نہ تو غرور و خود نمائی ہے، نہ خوشامد و عاجزی۔ وہ اپنی اصلی حالت میں پایا جاتا ہے۔ ایک طرف تو وہ اپنی عبا پر خود پیوند لگاتا اور اپنی نعلین کی خود مرمت کرتا ہے، دوسری طرف نہایت بے تکلفی سے ایران کے بادشاہوں اور یونان کے شہنشاہوں کو ان کے فرائض پر توجہ دلاتا ہے۔ غرض وُہ اپنے درجہ اور عزت کا پوری طرح علم رکھتا ہے بدوؤں کے ساتھ خونریز معرکہ آرائیوں میں ظلم و ستم کے بغیر گریز نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں رحم و کرم کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ آنحضرتؐ نہ تشدد پر اعتذار کرتے ہیں اور نہ رحم و کرم پر افتخار۔ وُہ دونوں آپ کے دل کی اصلی صدائیں تھیں جو از نجا لاً بلند ہوگئیں۔ آپ نے ہمیشہ شیریں زبانی ہی سے کام نہیں لیا بلکہ وقتِ ضرورت زور اور سختی بھی کی ہے۔ آپ میں لگی لپٹی رکھنے کی عادت نہ تھی۔ غزوہ تبوک کا آپ بار بار ذکر کرتے تھے۔ اس موقعہ پر آپ کے ساتھیوں میں سے بعض نے گرمی کی شدت اور فصل کے خراب ہوجانے کا عذر کیا تھا۔ آپ اس واقعہ کو کبھی نہیں بھول سکے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: "تمھاری کھیتیاں کتنے دن کام آئیں گی؟ ابدتک ان کا کیا حشر ہوگا؟"

محمدؐ کے اخلاقی اصول کا میلان ہمیشہ خیر کی طرف ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسے قلب کے سچے احساسات ہیں، جس کا مطمع نظر صداقت و معدلت رہتا ہے۔ گو اسلام میں مسیحیت کا یہ اصول عفو نہیں پایا جاتا کہ اگر کوئی شخص ایک طمانچہ مارے تو دُوسرا گال بھی اس کے آگے کر دیا جائے بلکہ اسلام میں بدلہ لینے کا حکم ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ شرط ہے کہ حدِ انصاف سے نہ بڑھنا چاہیے۔ اسی طرح اسلام کامل مساوات کا علمبردار ہے۔ جیسا کہ ایک اعلیٰ مذہب اور نباض فطرتِ انسانی کو ہونا چاہیے۔ اس میں ایک مسلمان کی جان دنیا کے تمام تاج و تخت پر بھاری ہے۔ نیز اس کی رُو سے سب بنی آدم یکساں ہیں۔ خیرات دینا اسلام میں صرف جائز ہی نہیں بلکہ لازم ہے۔ اس میں زکوٰۃ کا نصاب بھی مقرر کر دیا گیا ہے اور اگر کوئی شخص نہ ادا کرے، تو وہ اس کا جواب دِہ ہوگا۔ ہر شخص کی سالانہ آمدنی کا دسواں حصّہ (خواہ وہ کتنا ہی ہو) غریبوں، معذوروں اور محتاجوں کا حق ہے۔ یہ تمام اصول نہایت عمدہ ہیں۔ یہ رحم و انصاف اور محبت و انسانیت کے وُہ مطالبات ہیں، جن کی صدائے بازگشت مادرِ فطرت کے اُس اُمی فرزند سے بلند ہوئی۔

عربوں کے حق میں اسلام گویا ظلمت میں نور کا ظہور تھا۔ جس کے اثر سے ملک عرب پہلے پہل بیدار ہُوا۔ ایک غریب گلہ بان قوم، جو ابتدائے آفرینش سے ریگ زاروں میں گمنام پڑی پھر رہی تھی، اس کی ہدایت کے لیے ایک ہیرو پیغمبر کے لباس میں ایسا پیام دے کر بھیجا گیا، جس پر وہ ایمان لا سکی۔

دیکھو! اب وہ گمنام چرواہے دنیا میں مشہور ہو جاتے ہیں اور وہ حقیر شتربان سارے عالم پر چھا جاتے ہیں۔ ایک صدی کے اندر عرب کا سکہ دہلی سے غرناطہ تک جاری ہو گیا اور اس کی شجاعت و ذہانت کا آفتاب مدت تک ایک عالم پر ضوفشانی کرتا رہا۔

ایمان ایک بڑی اور جاں بخش نعمت ہے۔ جہاں کوئی قوم ایمان لائی، تاریخ اس کی عظمت و رفعت کی داستانوں سے معمور ہوئی۔ عربوں کی قوم آنحضرتؐ کی ذات اور ایک صدی کی مدت۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے، گویا ایک چھوٹی سی چنگاری ایسے تودۂ عظیم پر گری، جو بظاہر محض انبار خاکستر تھا۔ مگر وہ انبار آتش گیر مادہ ثابت ہُوا، جس کے شعلے دہلی سے غرناطہ تک بلند ہُوئے اور آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ بڑا انسان ایک برق آسمانی ہوتا ہے اور باقی سب لوگ تودۂ ہیزم کی طرح اس کے منتظر رہتے ہیں، جنھیں وہ آنِ واحد میں شعلۂ روشن بنا دیتا ہے۔

محمدؐ اور عیسیٰؑ

اے۔جی۔بٹّی

پروفیسر اے۔جی ٹمی نے نیشن اینڈ اینتھینیم مورخہ ۲۲ نومبر میں ایک مضمون لکھ کر یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اور حضرت عیسیٰؑ کی کامیابی وشہادت اور ان کی اقوام کی اپنے مذہب سے دوری صرف حالات اور وقت کی بات تھی اور اگر حضرت عیسیٰؑ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جگہ ہوتے یا آنحضرتؐ ان کی جگہ ہوتے تو حضرت عیسیٰ یقیناً کامیاب اور آنحضرتؐ بلاشبہ مصلوب ہوتے۔ چنانچہ مسٹر موصوف تحریر فرماتے ہیں:

"حضرت عیسیٰؑ اور رسولؐ اسلام نے ایک ہی طرح اپنے کام شروع کیے۔ دونوں نے ایک "آسمانی حکومت" کی تبلیغ کرکے، جو اس عہد کے عقاید اور سیاسی مفاد کے خلاف تھا کافی شہرت حاصل کرلی تھی۔ حضرت عیسیٰؑ کو اس کے لازمی نتیجہ سے دوچار ہونا پڑا۔ چند ہی سالوں کے بعد وہ گرفتار ہوئے، مجرم بنے اور شہید کردیے گئے۔ محمدؐ نے عرطبعی حاصل کی۔ ایک حکومت کی بناڈالی، جس نے مشرقی سلاطین کی عظمت کو قایم کرکے ان کو حکومت روم کا شریک و معاصر بنادیا۔ ظاہراً ہم کو حضرت عیسیٰؑ کی زندگی عجیب نظر آتی ہے۔ لیکن درحقیقت آنحضرتؐ کی زندگی حیرت انگیز ہے"

"دونوں پیغمبر رومن حکومت میں پیدا ہوئے۔ لیکن حضرت عیسیٰؑ اندرونی صوبہ میں تھے اور آنحضرتؐ سرحدی صوبہ میں۔ برٹش سلطنت سے اگر تمثیل دوں، تو کہہ سکتا ہوں کہ حضرت عیسیٰؑ کی مثال بنگال کے ایک باغی کی تھی اور حضرت محمدؐ کی قندھار کے ایک حملہ آور کی۔ اس لیے اول الذکر رومی والی ٹائبیریس کے قبضہ میں تھے اور موخرالذکر ہرقل کے مضبوط ہاتھوں سے دور۔ آنحضرتؐ نے جب ہرقل کو خط لکھا تو اس نے نرم و مصلحت آمیز جواب دیا لیکن دوسری طرف حضرت عیسیٰؑ تھے جو ہمیشہ حکومت کی اطاعت کرتے رہے، سخت ترین سزا کے مستحق سمجھے گئے حضرت عیسیٰؑ اگرچہ آنحضرتؐ سے کم نقصان دہ تھے، لیکن چونکہ ان کو آسانی سے پالیا گیا، اس لیے وہ مظالم کے شکار ہوئے انھوں نے قیصر کے سامنے وہی چیز پیش کی، جو اس میں تھی اور مصلوب ہوئے۔ لیکن آنحضرتؐ کے جانشینوں نے قیصر کے صوبے لے لیے۔ پس یہ اختلاف ان کی ذاتوں سے وابستہ نہ تھا، بلکہ حکومت سے مختلف تعلقات پر منحصر تھا۔"

"کوئی شخص بھی اس بات سے انکار نہیں کرسکتا کہ اگر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) حضرت عیسیٰؑ کی جگہ ہوتے، تو یقیناً وہ بھی مصلوب ہوتے۔ کیونکہ جب انھوں نے تبلیغ کا کام شروع کیا تو اپنی جان ہتھیلی پر لیے تھے اور آپؐ کو حضرت عیسیٰؑ سے کہیں زیادہ خطرات کا سامنا تھا کیونکہ آپ نے اپنا فرض ان وحشی قبائل میں

شروع کیا، جو حکومت روم کے متمدن لوگوں سے زیادہ خوفناک، انتقام پسند اور بدخو تھے۔ آپ نے ابتداء میں بہت کم کامیابی بھی حاصل کی، چنانچہ ابتدائی تین سالوں کا نتیجہ صرف تیس اشخاص تک محدود تھا (اور یہ حضرت عیسیٰؑ کی تمام مدت تبلیغ ہے) ساتویں سال حالت نازک ہو گئی۔ مکہ والوں نے اس جماعت سے اپنے تمام تعلقات منقطع کر لیے، اور اگر وہاں کے حالات بھی فلسطین جیسے ہوتے، تو آپؐ کا خاتمہ زیادہ حسرتناک ہوتا۔ جس چیز نے اسلام اور اس کے بانی کو بچا لیا، وُہ عرب کے قبائل کی سیاسی خانہ جنگیاں اور حکومت روم سے دوری تھی اور انھی چیزوں نے اہلِ یثرب کو اس بات پر تیار کر دیا کہ جس شخص کو اہل مکہ نفرت کی نظر سے دیکھتے ہوں اور جس کے خون کے پیاسے ہوں، اس کو عزت سے لاکر اپنی تمام دولت، محبت اس پہ نثار کر دیں محمدؐ نے دنیاوی کامیابی بھی حاصل کی، لیکن یہ صرف واقعات وحالات کی بنا پر تھا۔ ورنہ اگر وہ ایسے واقعات وحالات میں نہ ہوتے، تو دنیا کا کوئی گوشہ بھی ان کے لیے مامن نہ ثابت ہوتا۔ پھر کیا اگر حضرت مسیحؑ ایسے حالات میں ہوتے، تو وہ ایک "حکومت ارضی" کے قیام میں کامیاب نہ ہوتے؟ ہوتے اور یقیناً ہوتے، اور اگر رومی حکومت پیلاطس کی تیغ براں کو نہ روکتی تو آج حواریین تخت حکومت پر جلوہ افروز نظر آتے۔"

"پس ہم دیکھ چکے کہ دونوں کا طریق عام یکساں تھا اور یہ عام عیسائی اعتراض کا ایک اٹل جواب ہے کہ محمدؐ روحانیت سے زیادہ مادیت کے متلاشی تھے اور عیسائیت صرف اپنی خوبیوں کی بنا پر پھیلی اور اسلام بزورِ شمشیر عام ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ صورت اس کے بالکل متضاد تھی۔ اسلام کہتا ہے" اسلام یا جزیہ" لیکن دوسری طرف مسیحیت کا اعلان ہے "مسیحیت یا موت"۔ چنانچہ اسلام کے ابتدائی فاتحین اور مشرقِ وسطیٰ کی تبدیلی مذہب کی تاریخ اس کی شاہد ہے۔ چنانچہ صدیوں تک اگرچہ اسلامی فتوحات کا سیلاب بڑھتا رہا لیکن تبدیلی مذہب کا کوئی سوال سامنے نہ آیا۔ لیکن بعد میں اسلام نے بھی وہی صورت اختیار کر لی، جو اس سے سات سو سال قبل مسیحیت حکومت روم کے مغربی صوبوں میں کر چکی تھی۔ تاہم یہ بات قائم رہ گئی کہ اگرچہ دونوں ایک ہی حالات میں بڑھے لیکن مختلف صورتیں اختیار کر لیں۔"

"کیا دونوں بانیانِ مذاہب کی تعلیمات اور ان کی حیات ہم کو یہی بتاتی ہیں، یا یہ دونوں جماعتوں کے لوگوں کے اضافے تھے؟ دونوں گروہوں کا قاعدہ ہے کہ وہ مخالف جماعت کے بدترین کارناموں کو ایک طرف اور اپنی بہترین تعلیمات کو دوسری طرف رکھ کر مخالف کی صف پر حملہ کرتے ہیں اور یہ ایک ایسا ہتھیار ہے جس کی کاٹ کا کوئی جواب نہیں۔"

"لیکن کیا اس سوال کا جواب بھی یہی نہیں ہے کہ حالات وواقعات نے ان سے یہ سب کچھ کرایا، مثلاً اگر دوسری اور تیسری صدی عیسوی کے بہترین حالات کے بعد ۱۶ء، ۱۷ء کے بدتر حالات یا ۱۹ء، ۲۰ء کے بدترین حالات رونما ہوئے اور انھوں نے مسیحیت کو مغرب کی مادی ترقی کا سیاہ داغ لگا دیا۔ تو یہ سب کچھ حالات وواقعات پر منحصر تھا۔ اسی طرح اسلام کے زوال کے اسباب بھی پیش کیے جا سکتے ہیں۔" ہ

برناڈ شا اور عرب

خالد کمال مبارک پوری

برناڈ شا عصر حاضر کے عالمگیر شہرت یافتہ ائمہ مفکرین میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج اس کی تصنیفات دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیل ہوئی ہیں اور دنیا کی بہت سی زندہ زبانوں میں ان کا ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ اس کے افکار و آراء ہر مذہب اور ملت کے اہل علم طبقہ میں مشہور و معروف ہیں۔ اس کے افکار و آراء کی مقبولیت اس کی فلسفیانہ رنگینی، لطیف نکات، عبارت کی عمدگی اور طرز تحریر کا اچھوتا پن ہے۔ اگر وہ اپنی تحریر میں عام طرز تحریر کا رنگ اختیار کرتا اور اپنے زمانہ کے رائج طریقہ کو اپناتا تو ہرگز اسے یہ مقبولیت حاصل نہ ہوتی اور وہ صرف اہل علم کے مخصوص طبقہ میں ہی منحصر ہو جاتا۔

جب آپ اس کے ڈرامے پڑھتے، تو ان پر جاسوسیت کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔ لیکن اگر آپ غور کریں، تو مصنف کے مقاصد کو بالکل واضح پائیں گے اور آپ کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ اس معلم و مصلح کا مقصد ان ڈراموں سے بلندیٔ اخلاق کا یسا قلعہ تعمیر کرنا ہے، جو فلسفۂ اخلاق کی بنیاد پر قائم ہو۔

برناڈ شا نے اپنے ڈراموں میں صرف ہنسی مذاق اور تفریحی عبارتیں ہی نہیں پیش کی ہیں، بلکہ ہر ڈرامہ کا ایک طویل مقدمہ بھی بالتفصیل بیان کیا ہے، جو اس کے نظریات و افکار کی ترجمانی کرتا ہے اور ہر صاحبِ فہم و فراست کے ذہن پر براہِ راست اثر انداز ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مقدمات کبھی کبھی ڈرامہ سے بھی بڑے ہو جاتے ہیں۔

اس مقالہ کا مقصد برناڈ شا کے دینی، سیاسی، سماجی اور فلسفیانہ نظریات و افکار کا تجزیہ و تشریح نہیں ہے، بلکہ آج ناظرین کرام کے سامنے اس کی تصنیفات سے عرب، بلادِ عرب اور اسلام و مسلمین سے متعلق باتیں پیش کی جائیں گی، جن سے برناڈ شا کی علومِ شرقیہ سے دلچسپی اور فنونِ شرق سے متعلق معلومات کا پتا چلتا ہے۔

برناڈ شا اور الف لیلیٰ دنیائے عرب میں برناڈ شا نے سب سے پہلے جس چیز کو پہچانا، وہ داستان الف لیلہ کے لیے رلیف گیا۔ وہاں اسے الف لیلہ کا ترجمہ مل گیا۔ پھر کیا تھا، دل و جان سے اس کے مطالعہ میں لگ گیا۔ جب اس کی پھوپھی نے دیکھا کہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر اس کے مطالعہ میں غرق ہے تو کتاب اس کے ہاتھ سے چھین لی اور اسے اپنے کپڑوں کے بکس میں بند کر کے رکھ دیا۔ جب برناڈ شا نے ضد کی تو کہا کہ اس کے پڑھنے سے ذہن پر برا اثر پڑتا ہے۔ لیکن برناڈ شا نے عہد کر لیا کہ بغیر اس کو اچھی طرح دیکھے ہوئے چین سے نہیں بیٹھے گا۔ چنانچہ اپنی پھوپھی کو غافل کر کے اس کی تلاش جاری کر دی۔ جو یندہ یابندہ کے مطابق اسے کتاب مل گئی۔ پھر اس کے مطالعہ میں غرق ہو گیا اور اس کے تمام قصے پڑھ ڈالے جن کا اثر اس کے ذہن و دماغ پر چھا گیا۔ اس کا مظاہرہ یوں ہوا کہ ایک مرتبہ جبکہ وہ تورات اور اس کے

اخلاقیات پر مطالعہ کر رہا تھا، نہایت جرأت مندانہ لہجہ میں مسیحیوں کو خطاب کرکے کہا کہ مسیحی حضرات صرف تورات کو مقدس سمجھنے سے باز آجائیں اور تورات کو اپنے کتب خانوں میں الف لیلہ کے پہلو میں رکھا کریں۔

نیز یورتان جو اپنے دین کے معاملہ میں بڑے متشدد قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کے تین ڈراموں کے مقدمہ میں برناڈشا نے انگریزی اور عربی ادب میں محبت کے قضایا کے سلسلہ میں دونوں کو ملا کر دوش بدوش چلنے اور قضایا کا حل دریافت کرنے کی تجویز پیش کی ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے،

"الف لیلہ ایسے قصوں کے مجموعہ پر مشتمل ہے، جو اپنی افادیت اور عمدگی کے لحاظ سے انتہا کو پہنچی ہوئی ہے ہمارے افسانوں اور قصوں میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ کیونکہ عربی ادب میں محبت کا علاج صورت طبیعہ مثلاً احساسات وغیرہ سے کیا گیا ہے۔ لہذا اس کے اندر نہ تو مبادی مقررہ کا وجود ہے نہ سراب نما شخصیت کا فقدان اور نہ ہی اس بات کا مظہر ہے کہ مرد اور عورت دونوں کا شجاعت، محبت، دوستی کی صفت میں متصف ہونا ناممکن ہے۔ ہاں البتہ جب دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کی صفت سے دل چسپی لیتا ہے، تو یہ اور بات ہوتی ہے۔ عربی قصہ نویس، جن کی تقلید میں انگریزی افسانے لکھے جاتے ہیں، یکے بعد دیگر شخصیات کو اجاگر کرتے رہتے ہیں اور ایک سے ایک نئی ایجاد پیش کرتے رہتے ہیں اور انگریزی افسانہ نویس صرف جنسی معاملات ہی میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ یہ جنسی گوشے اس قدر قوی ہو گئے کہ ناشرین و محررین اور پروڈیوسر حضرات اس وقت تک کتاب یا ڈرامے شایع کرنے سے پرہیز کرتے ہیں، جب تک کہ ان کے اندر محبت اور جنسی ادب کا ذخیرہ موجود نہ ہو۔"

برناڈشا اور محمدؐ

برناڈشا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اور اسلامی تعلیمات کا بڑا شیدا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی بعض تصانیف میں لکھا ہے کہ:

"میری بڑی تمنا ہے اور میں اسے واجب سمجھتا ہُوں کہ محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو انسانیت کے نجات دہندہ کی حیثیت سے دیکھوں اور میرا تو یہ اعتقاد ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسی شخصیت کو اگر آج کے عالم جدید کی عنانِ حکومت دے دی جائے، تو دنیا اپنی مشکلات کے حل تلاش کرنے میں کامیاب و بامراد ہو جائے گی اور اس کے اندر امن و سلامتی کی لہر دوڑ جائے گی۔ کاش! دنیا اس جیسے مصلح کی ضرورت کو محسوس کرتی۔"

برناڈشا اپنے ڈرامے میں اولیاء و انبیاءؑ کے متعلق بھی کچھ لکھنا چاہتا تھا، اس نے حضرت مسیحؑ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح لکھنے کی نیت کی تھی، لیکن اس خوف سے کہ حضرت مسیحؑ سے متعلق ڈرامہ عالم مسیحیت میں مقبولیت حاصل نہیں کر سکتا۔ اسی طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ڈرامہ عالمِ اسلام میں مقبول نہ ہوگا۔ اس نے کھل کر دونوں شخصیتوں کا ڈرامہ نہیں لکھا، بلکہ اپنی فکر کو بدل کر ان دونوں شخصیتوں کی زندگی پر اپنے مختلف ڈراموں میں روشنی ڈالی ہے۔ چنانچہ اس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اپنے تین مشہور ڈراموں میں بہت کچھ لکھا ہے۔ اسی طرح اپنے ڈاکٹر سے متعلق ایک ڈرامہ

کے مقدمہ میں برناڈ شا نے پاکیزگی، صفائی اور نظافت کے سلسلہ میں اسلام کو سراہا ہے، چنانچہ مسیحیوں کے انقلاب کی جانب اشارہ کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ:

"یہ کہنا بہت آسان اور ممکن ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ بڑی دور رس اور وسیع تھی، جس کا ثبوت اس سے ہوتا ہے کہ آپ نے نظافت (وضو) کو ارکان اسلام میں داخل فرمایا۔"

اسی طرح اپنے ایک اور ڈرامہ" انڈرو کلس اور سیر" میں لکھا ہے کہ:

"مسیحیوں نے جب دیکھا کہ مسلمانوں کی تہذیب یورپ کی تہذیب سے کئی گنا زیادہ ترقی پر ہے، تو ان وہشت آمیز تعجب کا اندازہ کرنا مشکل ہو گیا۔"

پارلیمنٹ کے ممبروں کے سامنے جو مطبوعات کی رقابت پر بحث کرنے کے لیے جمع ہوتے تھے، برناڈ شا نے جو بیان دیا، اُس میں دین اسلام کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

"ثقافت عامہ کو اپنانے کے سلسلے میں رقابت نے جو گل کھلائے، اس کے سامنے دنیا کی بڑی سے بڑی مصیبتیں بھی ہیچ ہو کر رہ جاتی ہیں، اس کی مثال یوں لیجئے کہ جب فلسفہ کے ارتقائی دور میں ہمارے اور فلسفہ کے درمیان رقابت پیدا ہوئی اور ڈارون، ہکسلی، ٹنڈال، سنبسر، کارمیل سے لے کر رسکن اور تبلز تک یہ کشمکش جاری رہی، تو اس وقت عام مفہوم اور عوام کی اصطلاح میں ان کی کتابوں کو فسق و فجور اور دہریت کی حامل بتلایا جاتا تھا، ہم آج بھی دیکھ رہے ہیں کہ کاتھولیکی اور ارتھوڈکسی فرقے ان کی تصنیفات پڑھنے سے شدت کے ساتھ روک رہے ہیں۔ جب ان سے وجہ پوچھی جاتی ہے، تو یہی کہتے ہیں کہ یہ کتابیں دہریت اور فسق و فجور کی حامل ہیں۔ میں حیران ہوں کہ اگر لوتھر کے راہبہ سے شادی کرنے اور غالیلو کی دہریت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا عبادتِ اصنام کے خلاف علمِ جہاد بلند کرنے اور وحدانیت باری کے لیے کوشش کرنے کے خلاف اگر مسیحیت اور اس کے اخلاق غالب آجاتے ، تو آج دنیا کا کیا نقشہ ہوتا، اسلام اور مسیحیت اپنی وسعت کے باوجود عوام کی نظر میں اپنے ماضی کو زیادہ مضبوط اور مستقل نہ بنا سکے۔ آج انگریز اس لیے مسیحی ہے کہ وُہ انگلینڈ میں پیدا ہوا ہے۔ اگر وہی استنبول میں پیدا ہوتا، تو اس کا مسلمان ہونا ضروری ہوتا۔ لوگ آج اسلام اور مسیحیت کے ان جہادوں سے واقف نہیں ہیں، جو ان دونوں نے بلندیِ اخلاق کے لیے کیے ہیں۔ اسی طرح اسلام اور مسیحیت کے وجود کو قرونِ ماضی کے اخلاق کے سر پر خطرہ ماننے کے لیے بھی تیار نہیں ہو رہے ہیں۔"

برناڈ شا اور تعدد ازواج

اپنے مشہور ڈرامہ" شادی کی تیاری" کے ایک طویل مقدمہ میں برناڈ شا نے شادی پر سماجی، اقتصادی، سیاسی، دینی اور جنسی حیثیت سے سیر حاصل بحث کی ہے اور اس میں مختلف نظریات کو ذکر کرنے کے بعد اپنے نظریہ کی وضاحت ان الفاظ میں کرتا ہے:

"اگر مان لیا جائے کہ جنگ ہمارے تین چوتھائی مردوں کو فنا کے گھاٹ اتار دے، تو اس صورت میں ہمارے لیے لازم ہوگا کہ اسلامی طریقہ کو اپنا یا جائے، جو بیک وقت چار شادی تک کی اجازت دیتا ہے۔ اس کے علاوہ ہم اپنی قوم کو کسی بھی صورت سے خطرہ سے باہر نہیں لا سکتے اور اگر اتفاق سے جنگ کبھی اس کے برعکس تین چوتھائی عورتوں کو ختم کر دے، تو اس صورت میں ہمیں بڑی پریشانیوں کا سامنا کرنا ہوگا اور ہمارا وجود تنگی میں پڑ جائے گا۔ یہیں سے یہ بنیادی نظریہ پیدا ہوتا ہے کہ میدانِ جنگ میں عورتوں کو قتل نہ کیا جائے "تاکہ نسلِ انسانی باقی رہے، صرف شرافت و بہادری کا بقا مقصود نہیں ہے، جیسا کہ عام طور پر یہی خیال کیا جاتا ہے۔"

محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور بُت پرستی

اسی ڈرامہ میں آپ کو یہ عبارت بھی ملے گی:

" ہوچکس نے سومرس راہب کو مخاطب کرتے ہُوئے کہا، میں اپنے ارادے، اپنے تجربہ اور اپنی شرافت کے علاوہ کسی بھی دُوسری چیز سے مطمئن نہیں ہوں۔ تمہاری دینی تعلیم تمہاری پوری پوری موافقت کرتی ہے۔ لیکن وُہ میرے قابل نہیں ہے۔ میں تو نابلیوں کی طرح اسلام کو دُوسرے ادیان کے مقابلہ میں فضیلت دیتا ہوں اور میرا اعتقاد ہے کہ برطانوی شہنشاہیت اس صدی کے آخر میں حلقہ بگوش اسلام ہو جائے گی۔ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت سے بہت زیادہ متاثر ہوں اور مجھے ان کی رائے سے ایک حد تک اتفاق ہے۔ میری یہ بات اے سومرس تمہیں زمین پر ڈال سکتی ہے تمہیں معلوم نہیں کہ دین میں ایک عظیم قوت ہوتی ہے۔ یہ قوت دافعہ حقیقت اور وحدانیت کا بہترین مظاہرہ ہوتی ہے۔ لیکن تم اور تمہارے جوڑی دار اس حقیقت کے سمجھنے سے قاصر ہیں، وہ نہیں سمجھ سکتے کہ تالیف انسانیت کی آسان اور بہتر ترکیب کیا ہے؟ دین و دانش اور ایمان و عقیدت کی چمک دمک لے کر انسان کی طرف بڑھنا یہی اس کے قریب کرنے کا بہترین نسخہ ہے۔ اس حقیقت کو چھوڑ کر تم لوگ یہ چاہتے ہو کہ لوگ تمہاری دیانت داری پر ایمان لائیں؟ اور اس نشہ میں چُور ہو کر تم یہاں تک حماقت کر بیٹھے ہو کہ اپنے علاوہ دوسرے سے علم حاصل کرنے سے بہتر یہ بتلاتے ہو کہ بچہ موت کے ظالم ہاتھوں میں پڑ کر دم توڑ دے۔"

زنجبیہ کی ذات باری سے متعلق بحث والے ڈرامہ میں بعض تقلیدی عادتوں اور ان رسم و رواج پر تنقید کی ہے، جو احکام رسل اور تعلیماتِ انبیاء سے بے تعلق ہیں۔ چنانچہ اسی میں آگے چل کر لکھا ہے کہ:

"نبی عربی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت بڑے عظیم اور جرأت مندانہ اقدام کیے جب توحید بت پرستی کے مقابلہ میں آگئی اور آپ نے دنیا کو ادیان سابقہ کی جانب پلٹ کر غور و فکر کرنے کی دعوت دی اور ایک ذات وحدۃ الوجود کو پہچاننے پر زور دیا۔"

اس کے بعد لکھتا ہے کہ:

"تورات میں مذکور دوسری وصیت، جس میں فرمایا گیا ہے کہ آپ اپنے لیے نہ کوئی تمثال بنائیں، نہ کوئی صورت اور نہ اس کو سجدہ کریں، نہ اس کی عبادت کریں مسلمانوں کے نزدیک زیادہ محترم اور قابلِ عمل ہے۔ اگر مسیحیوں سے اس معاملہ میں موازنہ کیا جائے، تو مسلمان بہت آگے نظر آئیں گے۔"

ہندوؤں کی کتب مقدسہ میں بشارات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

الحاج بشیرالدین پنڈت صاحب

وید ۱۱۳۱ ہیں (مہابھاشیہ پاتنجلی) - ان میں سے کل دس گیارہ دستیاب ہیں، رگوید، یجروید، سام وید - یہ تین قدیم ترین ہیں۔ (منوجی) اتھروید آخری وید ہے۔ ان کا زمانہ تالیف بقول سوامی دیانندجی ایک ارب ۲۱ کروڑ برس ہے۔ لیکن عصر حاضر کے محققین انھیں چار ہزار سال پرانا بتاتے ہیں۔ یہی زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہے۔

اُپ نِشَد ۱۲ قدیم ہیں اور آج ان کی تعداد ۲۰۰ سے اُوپر ہے۔ ان میں سے ایک اللہ اُپ نشد بھی ہے، جس کو اکبر کے زمانہ کا بتایا جاتا ہے۔ اُپ نشدوں کو ویدوں پر فضیلت کا دعوٰی ہے۔

(راجہ رام موہن رائے کے لکچر ملاحظہ ہوں نیز منڈک اُپ نشد کھنڈا منتر ۱ تا ۶ چھاندوگیہ اُپ نشد پرپھاٹک ۷، کھنڈا۔۲، شتپتھ برہمن کانڈ ۱۰ ادھیائے ۳ وغیرہ)

پران مہرشی ویاس جی نے انھیں ۱۸ جلدوں میں تقسیم کیا ہے۔ وید ان کے مصداق ہیں (ملاحظہ ہو اتھروید کانڈ ۱۱ سوکت، منتر ۲۴) رگوید میں بھی یگیہ میں پڑھے جانے والے پران کا ذکر ہے (ملاحظہ ہو رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۲۰ منتر ۶) اس کے علاوہ چھاندوگیہ اپ نشد پرپھاٹک ۷، کھنڈا۔۲ میں بھی پرانوں کا ذکر موجود ہے۔ اس طرح پران بھی ویدوں کے ہمعصر ہیں، جن پرانوں کے وید مصدق ہیں چونکہ انھیں میں حضور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق بشارتیں ہیں، اس لیے بعض لوگ یہ عذر پیش کر دیتے ہیں، کہ یہ نقلی ہیں، اصلی غائب ہوگئے۔ یہ عذر غلط ہے۔ اس لیے کہ پران اہل ہنود میں ویدوں کے مقابلہ میں زیادہ کثیر الاستعمال ہیں۔ تعجب ہے کہ پران جو شروع زمانہ سے آج تک بکثرت پڑھے جاتے ہیں، وہ تو گم ہوگئے مگر وید، جن کو بہت کم لوگ پڑھتے اور جانتے ہیں، وہ باقی رہ گئے۔ یہ خیال بھی غلط ہے کہ پرانوں میں پیش گوئیاں بعد میں شامل کی گئیں۔ اگر ایسا ہوتا تو آج ہندوستان کے کسی گوشہ میں کوئی نہ کوئی پران تو کسی برہمن کے گھر سے ایسا دیکھنے کو ملتا، جو پیش گوئی سے خالی ہوتا۔

۱۔ سام وید میں آنحضرت صلعم کا ذکر

ملاحظہ ہو سام وید پرپھاٹک ۲ ارشتی ۶ منتر ۸:

ترجمہ: "احمد نے اپنے رب سے پرحکمت شریعت کو حاصل کیا۔ میں سورج کی طرح روشن ہو رہا ہوں۔ یعنی میں (رشی وتسہ کنو) اس بشارت کو دیکھتے وقت آفتاب رسالت کے نور سے منور ہو رہا ہوں۔"

قرآن شریف اس منتر کے راز کو اس طرح کھولتا ہے،

یاایھا النبی انا ارسلنٰک شاھداً ومبشراً ونذیراً — اے نبی! ہم نے تجھے شاہد، بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے

وداعیاً الی اللہ باذنہٖ و سراجاً منیرا۔ (۳۳ : ۴۵-۴۶)
اور تو اللہ کی طرف سے اس کے حکم سے بلانے والا اور روشن کرنے والا سورج ہے۔

تشریح روشنی دو طرح کی ہوتی ہے، اجرامِ فلکی کی۔ ایک وہ اجرام جو بذاتِ خود روشن ہیں جیسے سُورج۔ دوسرے وُہ اجرام، جو اس سے روشن ہوتے ہیں، جیسے رات کے وقت چاند، ستارے سورج کی روشنی کی گواہی دیتے ہیں۔ اس لیے رشی ونسہ کا یہ کہنا کہ میں سورج کی مانند روشن ہوں، درحقیقت سراجاً منیرا کے لیے ایک گواہی ہے اور وہ سراجاً منیرا احمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

۲۔اتھروید کے کنتاپ سوکت میں بشارات

اتھروید تینوں ویدوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ اس میں رگوید کی رچائیں (محامد) سام وید کے گانے اور یجروید کی عبادات کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ مہلک امراض سے شفا، جنگ میں فتح و نصرت کے نسخے اور بہشت و دوزخ کے تفصیلی بیانات بھی ہیں۔ اس لیے اس وید کو برہم وید (علم الٰہی) کہا جاتا ہے۔ جس طرح بائبل کا ماخذ الواح بابل ہیں، اسی طرح ویدوں کی اندرونی شہادت سے پتا چلتا ہے کہ اتھروید صحیفہ ابراہیمؑ کی بڑی حد تک نقل ہے۔ رگوید کا ۱/۲ حصہ بائبل کی طرح بابل کے صحائف سے نقل کیا گیا ہے۔ اس میں بابل اور مصر کے بادشاہوں کی جنگوں کا حال بھی ہے۔ (تفصیل کے لیے ڈاکٹر پران ناتھ پروفیسر بنارس ہندو یونیورسٹی کا مضمون دیکھیے، جو ٹائمز آف انڈیا کے جولائی و اگست ۱۹۳۵ء میں چھپا ہے)

اتھروید کے بیسویں باب کے کچھ سوکت کنتاپ سوکت کہلاتے ہیں۔ ان کو طویل یگیوں اور قربانیوں میں ۱۷ پجاری بڑے اہتمام سے پڑھا کرتے تھے اور یہ ہر سال ہُوا کرتا تھا، گویا ایک طرح سے انھیں یاد رکھنے کے لیے ہندو قوم کو توجہ دلائی جاتی تھی۔ کنتاپ کے معنی ہیں پیٹ کی پوشیدہ گلٹیاں۔ یہ نام ان منتروں کا غالباً اس لیے رکھا گیا کہ ان کا راز آیندہ زمانہ میں ظاہر ہونے والا تھا۔ یہ راز نافِ زمین (مکہ) سے تعلق رکھتا ہے۔ مکہ کی زمین کو ام القریٰ (نافِ زمین) الہامی کتب میں بتایا گیا ہے۔ اس لیے کہ یہیں سب سے پہلے پہلا خدا کا گھر بنا اور نسل انسانی کو یہیں سے روحانی غذا ملنا شروع ہُوئی۔ ان اوّل بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبارکا وھدی للعٰلمین (۳: ۹۶) قرآن شریف میں مکہ کے دو نام ہیں، ایک بکہ، دوسرا مکہ۔ بکہ کے معنی ہیں بطن (پیٹ زیرِ ناف) اور مکہ کے معنی ہیں پستان۔ انسان کو اپنی ماں سے غذا دو جگہ سے ملتی ہے: یعنی پیٹ سے (رحمِ مادر سے) اور چھاتیوں سے۔ اسی طرح نسل انسانی کی ابتدائی پرورش کنتاپ (پوشیدہ گلٹیاں۔ رحمِ مادر) یعنی بطن مکہ سے شروع ہُوئی۔ مگر جب بچّہ رحمِ مادر سے مکمل ہو کر باہر آگیا، یعنی وسیع دنیا میں قدم رکھا، تو یہی گلٹیاں چھاتی میں دُودھ بن گئیں۔ اس طرح انسان کی پرورش کا سامان اب مکہ میں یا ماں کی چھاتیوں میں ہے۔ کنتاپ سوکتوں کو لوگ اب تک معمّہ یا پہیلیاں سمجھتے رہے۔ چنانچہ پروفیسر پنڈت راجہ رام پروفیسر میکولر، بلوم فیلڈ وغیرہ نے ایسا ہی سمجھا، لیکن یہ گلٹیاں اب واضح ہو چکی ہیں۔

۱۔کنتاپ سوکت کا پہلا منتر ——— اسم مبارک آنحضرت صلعم

ترجمہ: "اے لوگو! یہ (بشارت) احترام سے سُنو۔ محمدؐ تعریف

کیا جائے گا۔ ساٹھ ہزار اور نوّے دشمنوں میں اس ہجرت کرنے والے (امن پھیلانے والے کو) ہم (حفاظت میں) لیتے ہیں۔

تشریح نراشنسہ یعنی لوگوں میں تعریف کیا گیا۔ کورم یعنی امن پھیلانے والا یا مہاجر۔ شلیسٹی سہسر مکہ کی آبادی اُس وقت ساٹھ ستر ہزار تھی، جیسا کہ ابن اثیر کامل وغیرہ نے لکھا ہے۔

ترجمہ: "اس نے مام رشی کو سو دینار، دس تسبیحیں، تین سو گھوڑے اور دس ہزار گائیں دیں۔"

واضح اسم گرامی (مترجمہ پنڈت کھیکرن و پروفیسر راجہ رام)

تشریح ما یعنی مہا بمعنی بہت زیادہ۔ مح یعنی تعریف کیا گیا۔ عرونام یعنی عربی گھوڑے۔

مطلب پیش گوئیاں بالعموم استعارات پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اس منتر میں سو طلائی دینار وہ صحابہ کرامؓ ہیں، جنھوں نے مکہ کے پُرفتن دور میں مکہ سے حبش کو ہجرت کی۔ سرجہ یعنی گلدستہ تسبیح، سردار (رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۸۴ منتر ۱۲ میں سرجہ بمعنی سہرا) عشرہ مبشرہ مراد ہیں۔ عروہ بمعنی تیزرو یا عربی گھوڑے۔ ان سے مراد اصحاب بدر ہیں، جو تین سو تیرہ تھے۔ گو کا مادہ گم یعنی جنگ کے لیے نکلنا (رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۳۲ منتر ۶) گائے کو رعب و جلال اور ہلاکت کا مظہر قرار دیا گیا ہے (رگوید منڈل ۵ سوکت ۶ د منتر ۳) گائے صلح و اتفاق و اتحاد کی علامت بھی ہے (رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۱۱۲ منتر ۳) ان تشریحات سے ظاہر ہے کہ محمدؐ کے ساتھی گائے کی طرح مقدس اور رحم و محبت کے مجسمہ ہیں اور اندر دیوتا کی طرح بارعب اور خوفناک بھی ہیں۔ اس تضاد کی پہیلی کو قرآن شریف نے اس طرح حل فرمایا:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ۔۔۔۔ الخ (۴۸ : ۲۹)

مکہ کی فتح کے وقت ٹھیک دس ہزار کی قدسی جماعت آپ کے ساتھ تھی۔

مذکورہ بالا منتر میں حسب ذیل باتیں قابلِ غور ہیں:

۱۔ اس منتر میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صفاتی نام جو ذاتی نام سے بھی کسی قدر مشابہ ہے، موجود ہے۔

۲۔ آپؐ کو رشی یا پیغمبر بتایا گیا ہے۔

۳۔ آپؐ کو سو خالص سونے کے طلائی دینار، یعنی سابقون الاولون صحابہ کرام کے دیے جانے کا ذکر ہے۔

۴۔ عشرہ مبشرہ یعنی با اقبال جنت کے دس گلدستوں کا عطیہ۔

۵۔ عابد زاہد عالم جنگجو ۳۱۳ تاریخی اصحاب بدر کا ذکر۔

۶۔ فتح مکہ کے وقت دس ہزار قدسیوں کی جماعت کا ذکر۔

دنیا کی تاریخی روشنی میں یہ ساری خوبیاں اور نشانات صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح حیات میں ملتی ہیں اور یہ نشانیاں ٹھیک اسی ترتیب کے ساتھ ہیں، جیسی کہ بعد کو تاریخی وجود میں آئیں۔ دنیا کے کسی رشی یا پیغمبر کے ساتھ بجز آنحضرتؐ کے ان کی تطبیق نہیں کی جا سکتی۔

۴۔ جنگِ احزاب کا مفصل ذکر اتھروید کانڈ ۲۰ سوکت ۲۱ منتر ۹ حسب ذیل ہے:

ترجمہ: "اے صادقوں کے رب! تجھے ان سرور دینے والوں نے اپنے بہادرانہ کارناموں اور مستانہ ترانوں سے دشمن کی جنگ میں مسرور کیا، کہ جب حمد کرنے والے نیز عبادت کرنے والے کیلئے تُو نے دس ہزار دشمنوں کو بغیر مقابلہ شکست خوردہ کر دیا۔

معنی برزبتے شو، پتے بمعنی صادقوں کے رب۔ اَمَدَن بمعنی مسرور کیا۔ وِرسنسٹریانے ان بہادرانہ کاموں سے۔ سُوماسہ یعنی مستانہ ترانوں نے۔ ورِتر بمعنی دشمن۔ کارُوے بمعنی حمد کرنے والے کے لیے۔ وَرہِشمتے بمعنی عبادت کرنے والے کے لیے۔ اَپرتی بمعنی بغیر مڈ بھیڑ۔ نی وَرہتیہ یعنی تُو نے شکست خوردہ کر دیا۔ ہینتشو یعنی جنگ میں۔

تشریح وید منتر میں اللہ تعالیٰ کو ست پتی یعنی صادقین کی تربیت کرنے والا بتایا ہے۔ صادقین صحابہ کرام کی صفت ہے: من المومنین رجالٌ صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ کونوا مع الصّادقین۔

وید منتر میں دُوسری نشانی یہ ہے کہ سرور دینے والوں نے اپنے بہادرانہ کارناموں اور ترانوں سے اللہ کو راضی کر دیا۔ اس کا نقشہ قرآن پاک میں یُوں کھینچا گیا:

لما رأ المؤمنون الاحزاب قالوا ھذا ما	جب مومنوں نے دشمن کے لشکر کو دیکھا۔ انہوں نے
وعدنا اللہ ورسولہ وصدق اللہ و رسولہ	کہا یہ وُہ ہے جس کا وعدہ اللہ اور اس کے رسول نے
وما زادھم الا ایمانا و تسلیماً۔	کیا تھا (اس نظارہ نے) ان کے ایمان نیز تسلیم و
(۳۳ : ۲۲)	رضا کی ایمانی قوت کو المضاعف کر دیا۔

تیسری نشانی دس ہزار کے لشکر عظیم کو، جو تین ہزار کے مقابل تھا اور ہر طرح سے بڑھ چڑھ کر تھا، شکست خوردہ بتایا۔ قرآن شریف میں یہ آیت جنگ احزاب وقوع پذیر ہونے سے پہلے نازل ہو چکی تھی:

جند ماھنالك مھزوم من الاحزاب۔ (۳۸ : ۱۱)

چوتھی نشانی اسمِ احمدؐ کا ذکر۔ کارُوے یعنی حمد کرنے والے کے لیے یعنی احمد۔ پروفیسر گرفتھ نے اس کا ترجمہ CIBGFR اور پروفیسر پنڈت راجارام نے ستوتا یعنی حمد کرنے والا کیا ہے۔ یہ صفاتی نام ہے، جو اس جنگ کا ہیرو ہے، وہ حمد کرنے والا بھی ہے اور سپہ سالار بھی۔

حمد کرنے والے کی دُوسری صفت لفظ برہشمتے ہے، جس کے معنی ہیں مقدس گھاس، جو ویدی (آتشکدہ) کے کناروں پر بچھائی جاتی ہے۔ استعارۃً مقدس گھاس والا سے مراد عبادت گزار ہوتی ہے۔ دُوسرے معنی اس کے روشن اور نورانی شخص کے بھی ہیں۔ یعنی احمد نہ صرف خدا کی حمد کرنے والے ہیں بلکہ عین میدانِ جنگ میں خدا کی عبادت کرنے والے بھی ہیں۔ یہ وید منتر کی پانچویں نشانی ہے۔ آخری نشانی ہے دشمن کا بغیر مقابلہ کیے فرار ہو جانا۔ اس کی وجہ اسی سوکت کے منتر ۱ تا ۹ نیز ۱، ۷ اور ۸ میں بیان کی ہے۔ ان منتروں میں خطاب ہے اندر دیوتا سے، جو تند و تیز ہوا کا رفیق اور رعد و کڑک کا دیوتا ہے۔ اس جنگ میں دشمن تند ہوا اور کڑک سے

ڈر کر یا اندر دیوتا سے خوف کھا کر بھاگ گیا۔ چنانچہ وید کے اپنے الفاظ ہیں:

"تو نے اے اندر! دس ہزار دشمنوں کو بغیر مڈھ بھیڑ کے شکست خوردہ کر دیا۔"

دشمن کی ہزیمت واقعی ایک حیرت انگیز امر ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مقابلہ دراصل مسلمانوں کے ساتھ نہیں تھا بلکہ اسی خالقِ فطرت کے ساتھ تھا، جس کے ایک ادنیٰ غلام تند ہوا، جھکڑ اور رعد و کڑک سے دشمن خوف زدہ ہو کر فرار ہو گیا۔ قرآن کریم نے اس کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

یا یھا الذین اٰمنوا اذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ جاءتکم جنود فارسلنا علیھم ریحًا وجنوداً لم تروھا وکان اللہ بما تعملون بصیرا۔ (۳۳:۹)

اے لوگو! جو ایمان لاتے ہو اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو یاد کرو، جب تم پر لشکر آ پہنچے، سو ہم نے ان پر ہوا کو اور ایسے لشکروں کو بھیجا، جنھیں تم نہیں دیکھتے تھے اور اللہ اسے جو تم کرتے ہو دیکھتا ہے۔

جنگِ احزاب صداقتِ اسلام کا کھلا معجزہ ہے۔

مسجدِ نبویؐ

محقق ملی حافظ کی تحقیق کے مطابق مسجد شریف کا عہد وار رقبہ مندرجہ ذیل ہے :

۱ - بناء ثانی عہد مبارک حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سنہ ۷ھ	۲۴۷۵	مربع میٹر
۲ - اضافہ حضرت عمر الفاروق رضؓ سنہ ۱۷ھ	۱۱۰۰	"
۳ - اضافہ حضرت عثمان ذوالنورین رضؓ سنہ ۲۹-۳۰ھ	۴۹۶	"
۴ - اضافہ بعہد ولید بن عبدالمالک الاموی سنہ ۸۸-۹۱ھ	۲۳۶۹	"
۵ - اضافہ بعہد مہدی بن منصور العباسی سنہ ۱۶۱-۱۶۵ھ	۲۴۵۰	"
۶ - اضافہ سلطان الاشرف قاتیبائی سنہ ۸۸۷ھ تا سنہ ۸۹۲ھ	۱۲۰	"
۷ - اضافہ سلطان عبدالمجید خان عثمانی سنہ ۱۲۶۵ھ تا سنہ ۱۲۷۷ھ	۱۲۹۳	"
۸ - اضافہ ملک عبدالعزیز آلِ سعود سنہ ۱۳۷۰ھ تا سنہ ۱۳۷۵ھ	۶۰۲۴	"
کل رقبہ	۱۶۳۲۷	مربع میٹر

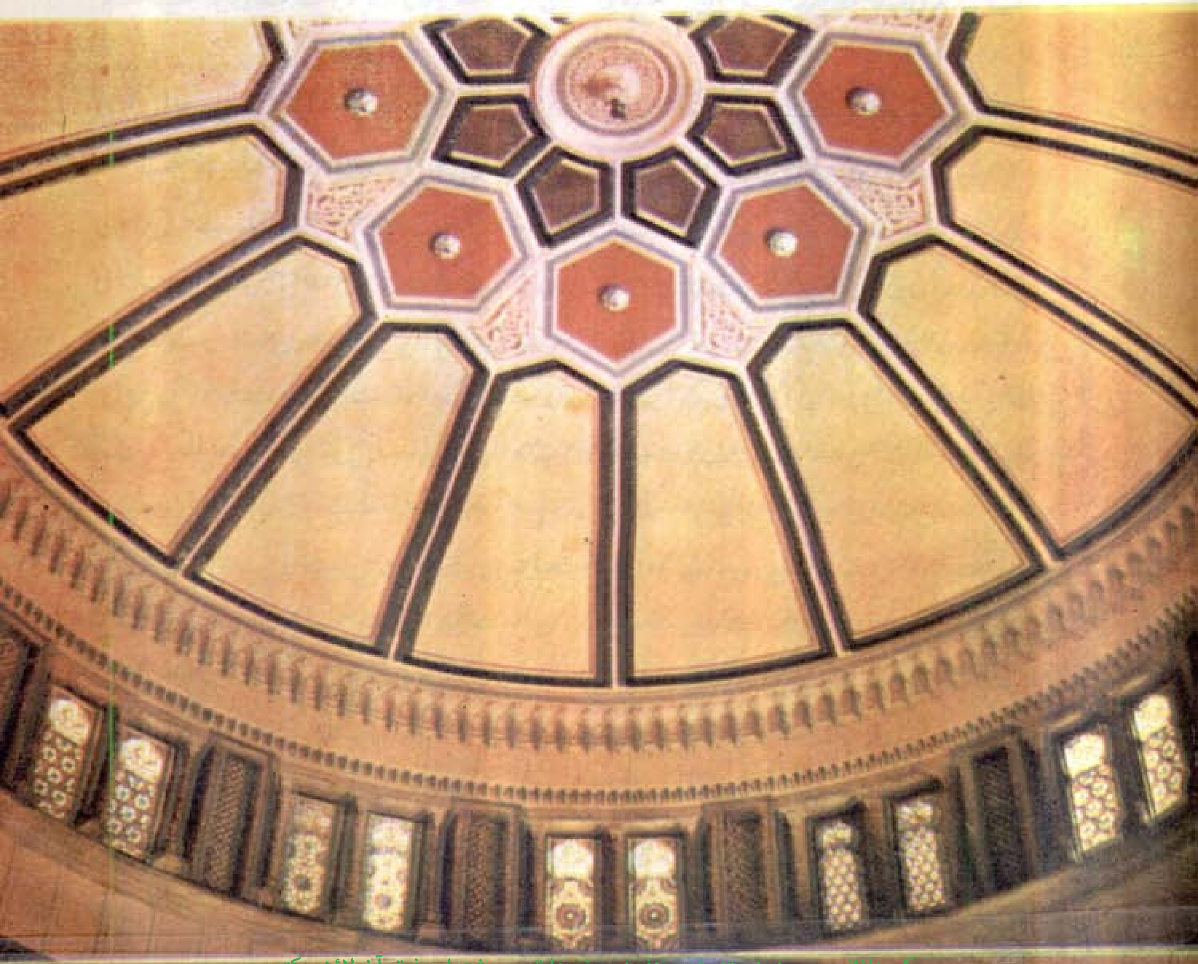
جناب مظہر علی خان لکھنوی (مکتبہ عین القضاۃ مدینہ منورہ) نے مسجد نبویؐ کا خریطہ شائع کیا ہے۔ جس میں شمالاً جنوباً طول ۱۸۰ میٹر اور شرقاً غرباً عرض ۹۶ میٹر دکھایا گیا ہے۔ اس حساب سے کل رقبہ ۱۷۲۸۰ مربع میٹر ہو جاتا ہے لیکن روضہ مبارک کے مشرقی جانب دیوار مطلوبہ عمودی خط سے ذرا اندر کی طرف کم دکھائی دیتی ہے۔ ممکن ہے یہ ۹۵۳ میٹر کا فرق وہ ہو۔

مَالِي وَلِلدُّنيَا وَمَا أنَا وَالدُّنيَا إلّا كَرَاكِبٍ
اِسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَةٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَكَهَا

میرا اور دُنیا کا کیا جوڑ اور تعلق ، میری اور دُنیا کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی مسافر
تھوڑی دیر درخت کے سایے تلے ٹھیر جاتا ہے پھر اسے چھوڑ کر چل دیتا ہے۔

(مشکوٰۃ: کتاب الرقاق)

مُتعلّقاتِ سیرت



خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا بچپن

بریگیڈ میئر گلزار احمد

فخرِ انسانیت ؐ کی ولادت باسعادت ۹ ربیع الاوّل بمطابق ۲۲ اپریل ۵۷۱ء کو مکہ مکرمہ میں صبح صادق کے بعد ہوئی۔ مولود صبح و طلوعِ آفتاب سے کچھ قبل آفتابِ دوجہاں اس جہاں میں تشریف فرما ہوئے۔ یہ دوشنبہ کا دن تھا۔ تاریخ کے عجائبات کے راز کون جان سکتا ہے۔ آپؐ کی ولادت، نبوّت، ہجرت اور وفات، سبھی اہم واقعات دوشنبہ کے دن واقع ہوئے۔

آپؐ کی زندگی کا ہر واقعہ یوں تو معجزہ نظر آتا ہے اور پوری زندگی ایک دلکش معجزہ ہے۔ البتہ طالب علم کے ذہن میں یہ جستجو پیدا ہونا فطری سا امر ہے کہ وہ یہ معلوم کرے کہ آپؐ کا بچپن کس طرح گذرا۔ وہ کون سے واقعات وحادثات تھے، جنھوں نے آپؐ کی زندگی کے خطوط اور سمت متعین کی اور وہ کون کون لوگ تھے جنھوں نے تربیت کے ذریعہ آپؐ کے اخلاق و کردار کو متاثر کیا۔

جس انسان نے اپنی جان کے دشمنوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا جس نے دشمن فوج کے کمانڈرِ اعلیٰ ابوسفیان کو والیٔ نجران کے فرائض انجام دینے کے قابل بنا دیا، جس نے احد کے میدان میں اسلامی فوج کو فتح سے محروم کر دیا تھا اُسے سیف اللہ کے لقب کے شایانِ شان بنایا، جس نے سیدالشہدا حضرت حمزہ ابن عبدالمطلب جیسے جلیل القدر مجاہد کے قاتل کو ایمان کے قابل بنایا۔ اور پھر اُسے مسیلمہ کذاب کے قتل کے ذریعے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کا موقع عطا کیا جس نے مساواتِ انسانی کا وہ سبق دیا کہ آزاد کردہ حبشی غلام کو خلیفۂ وقت کی جانب سے سیّدنا کا خطاب دلوایا اور جس نے لاکھوں انسانوں کے قلب و ذہن میں عجوبہ روزگار تبدیلیاں لائیں۔ اس "امی" ہادیؐ کے بچپن اور اس کی تربیت کے مدارج سے آشنا ہونے کی خواہش ہر دل میں پیدا ہوتی ہوگی۔ اسبابِ علل اور علت و معلول کا عادی انسان جب صحرا کی بدویانہ زندگی میں بچپن گذارنے والے "امی امین" کے حسنِ معاملہ اور عہد و پیمان کی پاسداری اور ایفاءِ وفا کے ایمان افروز واقعات پر نظر ڈالتا ہے یا پھر دوسری طرف بدر و اُحد کے دوران قیادت و سیادت کی بلندیوں کی جانب نگاہ اُٹھاتا ہے یا جیران کے میدان میں اپنے قتل کے خواہشمند مکہ کے قریش سرداروں کو ایک ایک سو اونٹ کا تحفہ دے کر اُن کے سرِ نیاز کو اس یاد سے جھکا دیتا ہے جب انھوں نے ندوہ میں بیٹھ کر اعلان کیا تھا کہ جو اُسے زندہ یا مُردہ لے آئے گا اُس کو ایک سو اونٹ انعام کے طور پر پیش کیے جائیں گے تو گنہگار انسان معلوم کرنا چاہتا ہے کہ آیا یہ سب کچھ ایک انسان کے قلب و ذہن کی واردات کا نتیجہ ہے۔ اگر اللہ کے حکم کے مطابق عمل کرنے والا اور اس پر مکمل ایمان لانے والا[1] اور اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ[2] کہنے والا نورِ مجسّم حدودِ بشریت کے اندر رہ کر یہ سب کچھ اور

---

[1] فَآمِنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمَاتِهِ۔ (الاعراف ۷: ۱۵۸) [2] فصلت ۴۱: ۶

اس سے بھی زیادہ کارنامہ اور فرائض ان حدود کے اندر رہ کر انجام دے سکتا تھا تو عقل و دانش پر بھروسا رکھنے والا انسان یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ وہ کون سا ماحول تھا جس نے اس فوق الانسانیت انسان کے ذہن و بدن کی نشو و نما میں حصّہ لینے کی سعادت حاصل کی تھی۔

آپؐ کا خاندان بنو ہاشم مکّہ کے سب سے بااثر قبیلہ قریش کا حصّہ تھا۔ آپؐ کے دادا عبدالمطلب قریش مکّہ میں اثر و رسوخ رکھتے تھے مگر یہ اثر ان کے بعد نہ رہ سکا۔ شاید اس لیے کہ قبائلی زندگی میں فرد کی عقل و فراست اور تدبّر و تفکّر ہی انسان کو اعلیٰ مقام دیا کرتا ہے۔ اگر آپؐ کے والد حضرت عبداللہ زندہ رہتے تو بہت ممکن تھا کہ وہ حضرت عبدالمطلب کا مقام حاصل کر لیتے مگر وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے چند ماہ قبل مدینہ کے سفر کے دوران مدینہ میں وفات پا گئے تھے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپؐ کے والد بزرگوار کی وفات ان واقعات کی پہلی کڑی تھی جن سے شاید قدرت کو یہ دکھانا مقصود تھا کہ سیّد البشرؐ کسی بشر رشد و ہدایت یا رہنمائی اور مثال کے حاجت مند نہ تھے۔

ہر بچّہ اپنے والد کو انسانیت کا بہترین مظہر سمجھتا ہے۔ وہ اپنے والد کی ہر عادت، ہر طریق کار، اس کی طرزِ گفتگو اور اس کے اخلاق و کردار کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ الٰہ العلمین نے جس ہستی کو قیامت تک کے لیے مثال بنانا تھا اس کے سامنے وہ کوئی مثال نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ ضروری تھا کہ ہادیؐ برحق والا کی جانب سے ہدایت حاصل کرنے سے محروم رہتے۔

اللہ کی عطا کردہ امانت[1] جو آمنہ کو عطا ہوئی تھی۔ اس کے مستقبل کی فکر آمنہ سے بہتر کسے ہو سکتی تھی۔ ماں اپنے لختِ جگر کو تعریف کے قابل دیکھنا چاہتی تھی۔ اس نے نومولودؐ کا نام احمدؐ رکھا۔ دادا کو بھی اپنے منظورِ نظر بیٹے کی اولاد سے پیار فطری بات تھی۔ وہ خود بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ گرد و پیش میں احترام سے دیکھے جاتے تھے۔ انھوں نے محمدؐ نام رکھا۔ دونوں کو شاید یہ معلوم تھا کہ یہ دونوں نام ماقبل کے صحیفوں میں آ چکے ہیں۔ توریت نے اللہ کے آخری پیغام رساں کو محمدؐ اور انجیل نے احمدؐ کے نام سے یاد کیا ہے۔

چند روز چچا ابولہب کی کنیز ثویبہ نے دودھ پلایا۔ اور پھر آٹھ دن کے نومولودؐ نے حلیمہ سعدیہ کی گود میں ایک لاغر سی اونٹنی کی پیٹھ پر صحرا کا رُخ کیا۔ اماں حلیمہ سعدیہ کا کہنا تھا کہ اس روز اس کمزور ترین اونٹنی کی رفتار کا ساتھ باقی قافلہ نہ دے سکا تھا۔ حلیمہ سعدیہ خود بھی چنداں خوشحال نہ تھیں، مگر آج ان کے قلب و ذہن کو کسی نامعلوم وجہ سے سکون و اطمینان محسوس ہو رہا تھا۔ بی بی آمنہ جیسی جلیل القدر ماں کا لختِ جگرؐ اماں حلیمہ کی گود میں تھا۔ طمانیت قلب کیوں نصیب نہ ہوتی۔

صحرائی وسعتوں میں ایک سحر، ایک کشش، ایک مقناطیسی قوت اور ایک جلال ہوتا ہے۔ چشمِ بینا کا صحرا میں وا ہونا اُسے فطرت کے اس قدر قریب لے آتا ہے کہ پھر کسی رہنما، کسی ہادی اور کسی اُستاد کی ضرورت نہیں رہتی اور بنو سعد کے

---

[1] "امین بن کر امانت آمنہ کی گود میں آئی" ابوالاثر حفیظ جالندھری۔

چھوٹے سے قبیلے میں تھا بھی کون جو اس نومولود کو کچھ سکھاتا یا فطرت کے رازہائے سربستہ اس کے سامنے کھول کر رکھ دیتا۔ اس کے سامنے تو صرف صحرا کی وسعتیں تھیں اور آسمان کی بلندیاں۔ نہ حد اِدھر نہ حد اُدھر۔ ذہن رسا کے سامنے فطرت بے نقاب تھی جو قدم قدم پر اور ہر ہر لمحہ نئے خیال کا موجب بن رہی تھی۔

" ذرا نم ہو تو بہت زرخیز" ہوتا ہے صحرا کا یہ ماحول۔ اون کے خیموں میں رہنے والے مطمئن اور صبر وشکر کے عادی صحرائی باشندے اپنے اونٹوں، بکریوں اور بھیڑوں کی محدود دولت کو قیصر وکسریٰ کے خزانوں سے عظیم تر سمجھا کرتے ہیں، ان کے ساتھ ریت کے نرم وگداز ٹیلوں پر لیٹ کر غروب آفتاب سے سحر انگیز منظر کو دیکھتے رہنا اور پھر اول شب کی خاموشی میں تاروں کی چمک ذہن انسانی کو خالق ومخلوق کے تعلقات کے سبھی گوشوں سے شناسا کر سکتی ہے مگر اس کے لیے تجربہ ومشاہدہ بھی ضروری ہے۔ یہ نومولود بچے نے بڑوں کو دن کے وقت گلہ بانی میں مصروف دیکھا ہوگا اور رات کو الاؤ کے گرد بنو سعد کے فصیح وبلیغ مردانِ آزاد کا کاروبارِ زندگی پر تبصرہ کرنا بھی سنا ہوگا۔ مگر ابھی آپؐ کے لیے اس میں کسی طرح کی رہنمائی نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ ماحول البتہ آپؐ کو کسی اُستاد، کسی ہادی اور کسی مرشد کی غیر موجودگی میں ایام طفلگی سے ہی اپنے آپ پر بھروسا کرنے کا خوگر بن گیا ہوگا۔ اس خداداد ماحول نے ضرور فراخیٔ قلب اور تفکر وخیال کی بلندیوں کی بنیاد بھی غیر محسوس طور پر رکھی ہوگی۔ خالقِ ارض وسما نے ہر قدم پر اپنے اس شاہکار کے اندر کردار وا خلاق کے کمال کے سامان خود ہی پیدا کرنے تھے۔ اس لیے کہ اسی ذاتِ بابرکات کے متعلق اُسے ایک دن یہ حکم دینا تھا کہ اس کے ہر قول اور ہر فعل میں تمہارے لیے رہنمائی حاصل کرنے کی نعمت موجود ہے۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۲۱:۳۳)

ممکن ہے کہ عمرانیات کے ماہر اماں حلیمہ سعدیہ کے قلب وذہن کی صلاحیتوں کو ایک شہنشاہِ بے مثل اور رہنمائے نسلِ انسانی کی پرورش کے قابل قرار نہ دیں مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اسی ماں کا دودھ پی کر افضل البشرؐ نے جسمانی نشوونما پائی۔ تاریخ اس کی خدمتِ اولادِ آدمؑ کو کتنا ہی کیوں نہ گوشۂ تاریکی میں رکھے مگر مؤرخ اقرار کرتا ہے کہ جب فاتح بدر وحنین کے سامنے حلیمہ سعدیہ آئیں تو اس لاثانی سپہ سالارؐ نے لپک کر اور "میری ماں، میری ماں" کہتے ہوئے اُس کا استقبال کیا۔

حلیمہ سعدیہ دستور کے مطابق ہر چھ ماہ کے بعد اس عظیم امانتؐ کو اپنی والدہ کی ملاقات کے لیے مکہ لے جاتی تھیں۔ یوں تو دستور تھا کہ اس طرح صحرا کی کھلی فضا کی زندگی کی مدت پانچ سال مقرر کی گئی تھی مگر بی بی آمنہ نے فیصلہ کیا کہ آپؐ کے لیے اس مدت کو ایک سال کے لیے مزید بڑھا دیا جاتے! اب آپؐ کو اپنے رضاعی بھائی بہنوں کے ساتھ ایک سال اور رہنے کا موقع مل گیا اور یوں بھیڑ بکریوں کی گلہ بانی میں عملی طور پر حصّہ لینے کے مواقع ملتے رہے۔ یہ رضاعی رشتہ حنین کی لڑائی کے قیدیوں کے حق میں رحمۃ للعلمینؐ کے ہاتھوں باعثِ رحمت وآزادی ثابت ہوا۔ جب قبیلہ اپنی آزادی حاصل کر کے اور رضاعی بہن شیما خوش وخرم

لہ حضور اقدسؐ فرمایا کرتے تھے کہ آپؐ کی عربی دانی لوگوں سے فصاحت وبلاغت میں بہتر ہے۔ اس لیے آپؐ کا بچپن بنو سعد کے درمیان گذرا ہے۔

تحائف لے کر قبیلہ کے ساتھ اسی صحرا کو لَوٹی جہاں ریت کے ٹیلوں پر وہ اس چاند کو لیے پھرا کرتی تھی جس کے استقبال کے موقع پر یثرب کی لڑکیوں کے لیے "طلع البدر" کا گیت مقدّر ہو چکا تھا۔

چھ سال کے بعد شرق و غرب کے لامتناہی تصوّر کو خیر باد کہہ کے یہ امانتؐ بیت اللہ کے سائے سے متعارف ہونے کے لیے والدہ محترمہ تک پہنچا دی گئی اور اماں حلیمہ سعدیہ انعام و اکرام اور بوجھل سا دل لے کر واپس بنو سعد کے ٹیلوں کو لوٹیں۔

اب تھوڑے سے عرصہ کے لیے آپؐ کو مکّہ کی شہری زندگی کی گہما گہمی دیکھنے کا موقع ملا ہوگا۔ آپؐ کا مولود بازار کے بالکل قریب ہے۔ بیت اللہ بھی دُور نہیں۔ صحرا کی خاموشیوں کی عادی طبیعت پر شہر کے شور و غل کا کیا اثر پڑا ہوگا۔ یہ وہی سمجھ سکتے ہیں جنھیں عرصہ تک کوہ و صحرا کی زندگی گذارنے کے بعد کسی شہر کے مرکز میں زندگی گذارنے پر مجبور ہونا پڑے۔ اس وقت مکّہ جزیرۃ العرب کا معاشرتی، تمدنی، دینی اور تجارتی مرکز تھا۔ اس وجہ سے قریش مکّہ آسودہ حال بھی تھے اور قبائل میں محترم بھی۔ اعیانِ قریش نے مکہ کو باقاعدہ تنظیم کے ذریعہ منضبط کر رکھا تھا۔ زندگی کے شعبے متعین تھے ان شعبوں کے سربراہ مقرر تھے۔ افرادِ قبیلہ کو آزادی رائے اور اس کے بے باکانہ اظہار کے مواقع میسر تھے مگر انضباط کی حدود کے اندر رہنا ضروری ہوتا تھا۔ شوریٰ کے اجلاس کے لیے دارالندوہ موجود تھا۔ البتہ چند سالوں کے بعد "حلف الفضول" کے وجود میں آنے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ شوریٰ کے فیصلوں میں بھی طاقت ور اور کمزور کا عنصر داخل ہو چکا تھا۔ ان باتوں سے طفلِ شش سالہ کو کوئی سروکار نہ تھا مگر آپؐ کا بالآخر "حلف الفضول" میں شامل ہونا اور دورِ رسالت میں اس کی یاد مسرّت سے کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس دور کا عرب عدل و انصاف کی پُرانی روایات سے ہٹ چکا تھا ورنہ غریبوں اور کمزوروں کے حقوق کے تحفظ کے لیے "حلف الفضول" کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ مکّہ کی زندگی کو طفلؐ نووارد نے کچھ اس طرح دیکھا ہوگا جیسے دُھند کے غبار کے اس پار کچھ حرکت ہو رہی ہو اور دیکھنے والا محض چند خاکے دیکھنے اور چند آوازیں سننے کے ماسوا کسی طرح کا معلوماتی استفادہ نہ کر سکا ہو اور پھر جلد ہی توجہ کسی دوسری طرف مبذول کر لی ہو۔

ماں بیٹے کی مُلاقات کے بعد ماں کو خیال ہُوا ہو گا کہ بیٹے نے والد کو تو نہیں دیکھا، والد کے مدفن کو ہی دیکھ لے، اِس لیے بی بی آمنہ نے یثرب کا سفر اختیار کیا۔ یثرب کے مسافر کی عمر اب چھ سال ہو چکی تھی۔ اب مشاہدے میں آنے والے مقامات اور واقعات کے خطوط حافظے پر اپنا نقش چھوڑ رہے تھے۔ ننھے محمدؐ اور احمدؐ کو والدہ کا یثرب لے جانا ہمیشہ یاد رہا۔ یہ بھی یاد رہا کہ والدہ نے اس جوانِ رعنا کا ذکر بھی کیا تھا جو یثرب کے سفر سے مکہ کو لوٹا تھا۔ یہ بات بختگی سے واضح ہوتی ہے کہ خالقِ ارض و سما کا فیصلہ تھا کہ اس کے آخری پیغام کا اوّلین مخاطبؐ اور نسلِ انسانی کا آخری رہبر و ہادیؐ "اُمّی" رہے تاکہ وہ دنیوی اثرات سے محفوظ رہ کر خالصتاً اللہ کا پیغام انسانیت تک پہنچائے۔ اس پیغام نے قیامت تک انسانیت کا ساتھ دینا تھا۔ اسے صدیوں تک بدلتے ہوئے زمانوں اور بدلتے ہوئے مقامات کی بدلتی ہوئی ضروریات کے باوجود غیر متبدل رہنا تھا۔ اس لیے اس پیغام کو کاملاً اللہ کا بھیجا ہُوا پیغام ہونا تھا۔ اگر والد یا کسی اور بزرگ کی نصیحتیں ارشاداتِ عالیہ یا علم و ہنر کے خزینے رسولِ آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلّم کے ذہن پر نقش ہو جاتے تو اللہ کے پیغام کے

متاثر ہونے کے امکانات و خدشات تھے۔ اور رسولؐ پیغامِ ربانی کے لیے ان خدشات سے بچنے کا واحد ذریعہ یہ تھا کہ وہ یتیم[1] بھی ہو اور "امیؐ" بھی ہو۔ والد کا سایہ تو ربِ کعبہ نے اٹھا لیا تھا مگر ان کا مدفن وہ مقام قرار پایا جہاں خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کے آخری دس سال گذار کر خود بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وہیں رونق افروز رہنا تھا۔

یثرب کے سفر اور قیام کے دوران کے واقعات میں آپؐ کو تیرنا سیکھنا اور یثرب کے ہم عمر بچوں کے ساتھ کھیلنا آخر عمر تک یاد رہا۔ واپسی کا سفر یتیمی کو مکمل کرنے والا سفر تھا۔ ابوا کے مقام پر والدہ محترمہ بی بی آمنہ نے انتقال کیا۔ کون جانتا تھا کہ مشیتِ ایزدی اس کم سن کو کس طرح کی زندگی سے دوچار کرنا چاہتی ہے۔ آج چودہ سو سال گزرنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ قدرت نے جو خاکہ مرتب کیا تھا اس میں کسی ایسے قلبی و ذہنی عنصر کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔ جسے ورثہ میں ملی ہوئی تربیت اور تعلیم پر محمول کیا جا سکے۔ والد کے سائے کے اٹھ جانے سے اس کمسنؐ کے لیے ایسی کوئی ہستی نہ رہی تھی جسے وہ فطری طور پر تقلید کے قابل قرار دیتا۔ ماں کی ممتا پیار و محبت، رحم و کرم، لطف و احسان اور بخشش و عطا کی جانب رہبری کرتی ہے۔ ابوا کے پڑاؤ پر وہ بھی اللہ کو پیاری ہو گئی۔ دوسروں پر لطف و کرم کے اسباب سیکھنا تو کجا، جب اللہ کا یہ شاہکارؐ فہم و ادراک کی دہلیز تک پہنچا تو خود اسؐ کے لیے مہر و محبت کا سرچشمہ موجود نہ رہا۔ شاید اس سے یہ مقصود تھا کہ خود اسؐ کے اپنے ذہن پر کسی بشر کی کرم فرمائیوں کے نقش نہ ابھر سکیں۔ اور اسؐ کے تمام فضل و کرم، اسؐ کی جود و سخا اور بخشش و عطا اللہ کی دین ہو۔ جب نصف صدی اور تین سال بعد حرم کعبہ کے صحن میں بیٹھے ہوئے سردارانِ قریش اور اہالیانِ مکہ کو مخاطب کر کے آپؐ نے فرمایا تھا: لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ اور اپنے آپ اور اپنے ساتھیوں پر کیے گئے تمام مظالم اور ان کی یاد کو ذہن کی سطح سے محو کر دیا تھا تو وہ اللہ کی عطا کردہ "رحمت عالمی" کی صفت کا نتیجہ تھا نہ کہ کسی بزرگ کی صحبت میں حاصل کردہ خصوصیت کا پرتو۔ یہ اس خُلقِ عظیم کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ تھا جو خیر البشرؐ کو وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (۴:۶۸) کہہ کے خالقِ کائنات نے یہ اشارہ کیا کہ اس بلند مرتبہ پر قائم کرنے والا وہ خود ہے۔ یہ وہ مقامِ عزت و احترام ہے جہاں رب العزت کے بغیر کوئی ہستی نہیں پہنچا سکتی اور نہ کوئی اس کی جانب رہنمائی کر سکتا ہے۔ یہ انسانوں کے اپنے رہنماؤں کے وعظ و نصیحت یا رشد و ہدایت کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ ممکن ہوتا تو ان گزشتہ چودہ صدیوں میں مثال موجود ہونے کی بناء پر اور اس سے ہدایت حاصل کر کے کوئی ایک انسان تو اس مقام کے قریب پہنچ سکتا۔ "امیؐ" پیغمبرؐ کا یہ خُلقِ عظیم آپؐ کا رحمتِ عالم ہونا، آپؐ کا ہر عمل شفقت و محبّت سے لبریز ہونا اُس رحمان و رحیم کا انعام تھا جس نے قیامت تک آنے والی نسلوں کے ہر فرد کے لیے ایک مثال قائم کرنا تھی، اور پھر اس کا مثیل وجود میں نہیں لانا تھا۔ اس لیے کہ ابؐ فنِ انسانی سنِ بلوغت کو پہنچ چکا تھا اور آئندہ صرف اور صرف اسیؐ مثال کی روشنی میں انسانی زندگی کو مرتب کیا جانا تھا۔

پڑاؤ کی مسافرانہ زندگی، قافلہ اور قافلہ والوں کی بے ترتیب اور پرہیجان زندگی، ہر چہار سو ریت کے ٹیلے اور دُور نیلگوں بے آب و گیاہ پہاڑیوں کا سلسلہ اور عین غربت میں دنیا کے واحد موجود سہارے کا اٹھ جانا۔ چھ سال کے کمسن محمدؐ و احمدؐ کے دل کی کیفیت تصور سے بالاتر ہے۔ وہ بچہ جو والد کی شفقت سے روزِ اوّل سے محروم رہا تھا جس نے بادیہ نشینوں

[1] الم یجدک یتیما (۹۳:۶)

کے خیموں کے سوا کوئی دوسرا مسکن زیادہ عرصہ کے لیے نہیں دیکھا تھا، اور پھر اس ماحول سے بھی علیحدگی ہوگئی تھی۔ اسؐ نے ایک پڑاؤ کی بستی میں واحد سہارے سے جدا ہو کر اپنی والدہ کی کنیز سے کیا کیا سوال کیے یا نہ کیے ہوں گے۔ اماں جان کو کیا ہوا ہے؟ کل تو بول رہی تھیں۔ آج کیوں بات نہیں کرتیں؟ لوگ انھیں کہاں لے جا رہے ہیں؟ وہ کب واپس آئیں گی۔ ہم مکہ کب جائیں گے؟ اور پھر خیمے میں صرف ام ایمن برکہ حبشیہ تھی اور چھ سال کا دریتیمؐ۔ اس یتیمؐ نے ابواؔ کے مقام کو مدنی زندگی کے دور میں دیکھنا تھا مگر اس وقت اس کا کسے خیال ہو سکتا تھا۔ وہ سفر تو سپہ سالارِ افواج مدینۃ النبیؐ کے لیے مقدر ہو چکا تھا ہاں۔ مگر یہ سب حادثات و واقعات ان سفروں کی تیاری کی بنیاد تھے جو فخرِ انسانیتؐ کو پیش آنے تھے۔ بلکہ اس ویرانے کے متعلق بھی کہا جا سکتا تھا کہ "بسودائے تو تنگ است ہنوز" کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس فرض شناس کنیز کو طفل تسلیاں دینے کی ضرورت پیش آئی یا عین محفل میں بھی تنہائی کے عادی بچےؐ نے غم کے اس کوہِ گراں کو بھی معمول کے مطابق حادثہ سمجھ کر کچھ پوچھنے یا سننے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی۔

مکہ مکرمہ پہنچ کر امّ ایمن نے کن الفاظ میں حضرت آمنہ کے آخری الفاظ حضرت عبدالمطلب تک پہنچائے اور بی بی آمنہ کی یہ عظیم امانتؐ کس طرح ان کے سپرد کی ہوگی۔ یہ تخیل اور تصور کا حصہ ہیں۔ انھیں الفاظ کا جامہ پہنا کر قلم کا ورثہ نہیں بنایا جا سکتا۔ اب آپؐ کی کفالت معمر دادا عبدالمطلب کے حصہ میں آئی۔ یہ وہی عبدالمطلب ہیں جن کو چاہ زمزم کو معلوم کرنے اور دوبارہ کھُدوانے کی سعادت نصیب ہوئی۔ آپ کے ذمہ حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمات بھی تھیں۔ دادا نے ننھے یتیم پوتے کے ساتھ جی بھر کر پیار کیا ہوگا۔ کعبہ کے سائے میں گلیم عبدالمطلب پر بیٹھنے کی ہمت اُن کے بیٹے نہ کر سکتے تھے۔ مگر محمدؐ احمدؐ نام پانے والا یتیم پوتا جب بھی بیت اللہ جاتا دادا کی گلیم پر ہی متمکن ہوتا اور دادا جب آتے تو اُسے پیار سے گود میں بٹھا لیتے۔

اللہ نے اپنے آخری نبیؐ کے لیے جو تربیت مقرر کر رکھی تھی، اس میں کسی بزرگ کی بزرگی، اُس کا عام لوگوں سے ملنا جلنا، اس کا کاروبارِ روزمرہ میں رُعب و دبدبہ اور اس کے اصول زندگی کا دخل نہیں ہو سکتا تھا۔ مبادا کہیں اس بزرگ کی صفات کی جھلک یا اس کا رنگ اس اللہ کے فرستادہ ہادیِ نسل انسانی کی طبیعت میں گھر نہ کر جائے تاکہ اس کا خلقِ عظیم، اس کا جلال و جبروت، اس کی سپہ سالاری، اس کا عدل و انصاف اور اس کا مملکت، ریاست اور حکومت کے معاملات کو حل کرنا، مکمل طور پر وحی کی عطا کردہ بصیرت پر منحصر ہو۔ یہی وجہ نظر آتی ہے کہ مدینہ سے لوٹ کر آنے کے جلد بعد جب حضورِ اقدسؐ کا سن بمشکل آٹھ سال کا ہوا تھا تو دادا نے بھی داعی اجل کو لبیک کہا۔

دادا نے بسترِ مرگ پر فیصلہ فرمایا تھا کہ آپؐ کی نگہداشت آپؐ کے چچا حضرت ابوطالب کریں گے۔ ابوطالب کی مالی حالت اتنی اچھی نہ تھی مگر انھوں نے آپؐ کو انتہائی پیار اور شفقت سے رکھا۔ یہ وہ دَور ہے جب آپؐ نے گلہ بانی کے فرائض بھی انجام دیئے۔ ان بھیڑ بکریوں میں دوسروں کے جانور بھی شامل ہوتے تھے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ امانت کی نگہداشت کا آغاز کمسنی میں ہی ہو گیا تھا۔ امانت و دیانت کا یہ معیار بعد ازاں تجارت میں بھی جاری رہا حتیٰ کہ "امی یتیم" کو "امین" کا لقب

اس معاشرے نے دیا جس میں صاف گوئی، آزادیٔ رائے اور بے خوف تنقید کو معمول سمجھا جاتا تھا۔ اس طرح آپؐ کے اُجرت پر بھیڑ بکریاں چرانے سے حضرت ابوطالب کو ضروریاتِ روزمرہ اور گھر کے اخراجات کے سلسلہ میں دشواریوں سے کسی حد تک نجات حاصل ہوگئی ہوگی۔

اڑھائی تین سال بعد جب آپؐ کی عمر بارہ سال کی تھی تو آپؐ نے حضرت ابوطالب کے ہمراہ تجارت کی غرض سے شام کا سفر کیا۔ قریش مکہ جاڑوں میں جنوب کی جانب اور گرمیوں میں شمال کی جانب تجارتی قافلے روانہ کیا کرتے تھے۔ جو لوگ خود نہیں جا سکتے تھے وہ دوسروں کو اپنا مال دے کر روانہ کرتے اور متفقہ فیصلہ کے مطابق منافع میں شراکت یا اُجرت کے اصول پر کام کیا جاتا۔ شام اس وقت بازنطینی حکومت کے تسلط میں تھا۔ بازنطینی حکومت اس وقت ایشیا اور افریقہ کی سب سے بڑی طاقت و حکومت سمجھی جاتی تھی۔ شام کے سفر میں عام معلومات میں اضافہ ضرور ہوا ہوگا مگر بازنطینی مقبوضات کی اخلاقی اور دینی سطح اس قدر گر چکی تھی کہ اس سفر کے دوران بارہ سال کا نوجوان معاشرتی و معاشی امور، کسی مکتبِ فکر، فلسفہ یا دین کے پیچیدہ مسائل کسی فیلسوف یا راہب سے نہیں سیکھ سکتا تھا۔ بحیرہ راہب کا قصہ یوں بھی قابلِ توجہ نہیں، البتہ اس سے مستشرقین نے جو دوراز کار نتائج نکال کر اسلام کی تعلیمات کو ایک راہب کی سرسری ملاقات پر مبذول کیا ہے۔ اہلِ مغرب کی فطرت کو ظاہر کرنے کے علاوہ اس کا کوئی مقام نہیں۔

سنِ بلوغت کے بعد آپؐ نے ضرور ایسے سفر اختیار کیے ہوں گے۔ اور لامحالہ تجارت میں حصہ لیا ہوگا۔ اس لیے کہ "امین" کا لقب معاملات کی حسن کارکردگی پر ہی مبنی ہوگا۔ اسی طرح حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا آپؐ کو مختارِ کل کے طور پر اپنے سامانِ تجارت کے ساتھ روانہ کرنا ماقبل کے تجربہ اور امانت و دیانت میں معروف ہونے کی بنا پر کیا گیا ہوگا۔ یہ کہنا کہ یہ سفر یا گھر کے اخراجات کے لیے اجرت پر بکریاں چرانے کا تجربہ مابعد کی نبوت کا باعث بنا۔ اس قدر غیر منطقی استدلال ہے کہ اس پر غور کرنا ہی تضیع اوقات ہے۔ ایسے تجربے جہانگیری و جہانبانی کی بنیاد قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ نبوت و رسالت تو خالصتاً اللہ کی دین ہے۔ اکمل و کامل دین جس نے قیامت تک کے لیے درست نظامِ حیات کا مقام قائم رکھنا ہے وہ بکریاں چرانے اور چند تجارتی سفر اختیار کرنے کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ یہ فرائض اور ان کی کما حقہ انجام دہی صبر و استقلال اور تدبر و تفکر کی عادت کے موجب بن سکتے ہیں مگر ایک مکمل دین کے جزئیات کا حل اور ایک اُمت کی زندگی کی ہر شعبہ میں ہدایت و دستگیری کرنے کی صلاحیتیں بکریاں چرانے کا نتیجہ نہیں ہو سکتیں۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ باپ، ماں اور دادا کی رہبری سے محروم رکھا جانے والا کمسن بچہ جب شہری زندگی کی کفالت کے ذرائع پیدا نہ کر سکا تو بکریاں چرانے کی وجہ سے اس کے "امّی" رہنے کی مدت اور کیفیت میں مزید اضافہ ہوگیا۔

یہ انسان اور اس کے گرد کی کائنات علیم و خبیر اور سُننے، دیکھنے اور جاننے والے الہ العالمین کی تخلیق ہے۔ یہ نہ از خود وجود میں آئی ہے اور نہ ہی اُسے کھیل تماشے کی غرض یا غلط مقصد کے لیے وجود میں لایا گیا ہے[1]۔ اور نہ ہی اس کائنات

[1] وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۲۱ : ۱۶ ؛ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ ۔ ۴۴ : ۳۹ ۔

کو کسی غلط مقصد یا محض بے کار سی شے بنایا ہے[1] اس کائنات کی تخلیق کا بہت بڑا مقصد تھا۔ اس کے اندر الٰہ العلمین نے بے انداز قوتیں داخل کی تھیں اور پھر ان قوتوں کے عمل اور ردِّ عمل کے نتیجہ میں اس کائنات کے ذرّہ برابر کرّہ ارضی پر پانی کو وجود میں لایا اور پانی کو بلند مقام دیا گیا جو کسی اور شے کو نہیں بخشا گیا تھا۔ خالق العلمین نے اپنا عرش اس پر قائم کیا[2] پانی کو ایک اور اہم خاصیت بخشی۔ اس کے ذریعہ ہر زندہ شے کو پیدا کیا[3]

اور پھر جب اس کرّہ ارضی پر ہر شے کا وجود آ گیا جو خالق العلمین کے شاہکار کے رشتۂ جسم و جاں کو قائم رکھنے کے لیے ضروری تھی تو پھر اپنی اس متوازن تزئین (التین ۹۵ : ۵) کو اپنا نائب بنا کر اس کرّہ ارض پر اُتارا (البقرہ ۲ : ۳۰) گو اسے مٹی سے بنایا گیا تھا مگر اس کے بننے سنورنے میں کوئی کمی روا نہیں رکھی گئی تھی۔ پھر فرشتوں کو حکم دیا کہ جب میں اسے درست کروں اور اس میں اپنی رُوح پھونک دوں تو اس کے آگے سجدے میں گر پڑنا[4]

اللہ تبارک و تعالیٰ کا بشر خاکی کے اندر اپنی رُوح کا پھونکنا عین درست تھا۔ اس لیے کہ اسے اپنا نائب بنا کر اس کرّہ ارض پر بھیجا جا رہا تھا۔ اور یہ رُوح امرِ ربّی کا نتیجہ ہے[5] اس کو سمجھنا اور اس کی انتہائے قوّت کا پتا لگانا ناممکن ہے۔ اس لیے کہ اس کا تعلق الٰہ العالمین سے ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی قوتوں یعنی اس کی صفات کا اندازہ لگانے کے یہ معنی ہیں کہ اس کائنات میں جو کچھ ہے اور جس طرح ان تمام سیاروں، ستاروں، تمام برقی اور مافوق البرقی ذرّوں کا عمل اور ردِّ عمل ہوتا ہے اس پر عبور پالینے سے خالقِ کائنات کی قدرت، قوّت اور اس کی صفات کا علم وسیع تر ہے۔ اگر اس کرّہ ارض کے تمام سمندروں کا پانی روشنائی بنا لیا جائے اور اس کے تمام درختوں سے قلم تراش لیے جائیں تب بھی اس کی قُدرت کے اوصاف گِنائے نہیں جا سکتے[6]

اِس مٹی سے بنے ہوئے انسان کو باقی مخلوق پر ایک فوقیت بھی بخشی۔ اسے روزِ اوّل سے علم الاشیاء عطا فرمایا[7] یہ علم دے کر اسے اس کرّہ ارض پر بطور خلیفہ متمکن کیا[8] اور پھر اسے اس بات سے بھی آگاہ کیا گیا کہ تمہاری خلافت کرّہ ارض کے

---

[1] وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا (ص ۳۸ - ۲۷)

[2] وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ ..... (ھود ۷ : ۱۱)

[3] وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ط : (الانبیاء ۲۱ : ۳۰)

[4] فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ - (ص : ۳۸ : ۷۲)

[5] قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي - (الاسراء ۱۷ : ۸۵)

[6] قُلْ لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّي - (مریم ۱۹ : ۱۰۹)

[7] وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا - (البقرہ ۲ : ۳۱)

[8] إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً (البقرہ ۲ : ۳۰)

لیے ہے مگر اس کے باوجود میں نے ارض و سما کی ہر شے تمھارے لیے مسخر کی ہے[1]۔ اب انھیں استعمال کرنے اور ان سے استفادہ کرنے کے لیے تمھیں ان کی خاصیتیں معلوم کر کے انھیں اپنے قبضے میں لانا ہوگا۔

اس کرۂ ارضی پر انسان کی زندگی لاتعداد مدّو جزر سے گذری ہے۔ شروع کے ایام میں ایک ہی ملت بن کر زندگی گزارتا رہا[2]۔ مگر جوں جوں انسانوں کے علم میں ترقی ہوتی رہی تو بعض انسان علم کی موجودگی کے باوجود گمراہی میں مبتلا ہوتے رہے اور آپس کے اختلافات کی خلیج وسیع کرتے رہے۔ یوں کہیے کہ جب اللہ کی جانب سے علم حاصل ہو جاتا ہے تو پھر علم کے اس غرور کی وجہ سے عجیب و غریب تاویلات کے ذریعہ آپس میں اختلافات شروع کر دیتے۔ اہلِ کتاب علمائے بھی اسی طرح کیا[3]۔ اور یوں انسانیت گروہوں، فرقوں اور حلقوں میں بٹتی گئی۔ درست کہ اگر اللہ چاہتا تو انسان ایک ہی اُمت بنے رہتے[4]۔ مگر مشیت ایزدی کو انسان کی بھلائی میں اس کی اپنی کوشش اور اپنا اختیار استعمال کرنا مقصود تھا۔ اس لیے کہ انسان کو جب روزِ اوّل علم الاشیأ بخشا گیا تھا اور کائنات کی جملہ اشیاء اس کے لیے مسخر کی گئی تھیں تو مقصود یہ تھا کہ یہ خاک کا پتلا جہاں کہیں بھی ہو اپنے خداداد علم کے ذریعہ خود تسخیرِ کائنات پر قدرت حاصل کر کے خلیفۃ اللہ فی الارض کے مقام کی ذمہ داریوں کو کما حقہٗ طور پر نباہ سکے۔ اس کے علم میں اضافہ اور اس کے علم حاصل کرنے کی صلاحیت میں ہر دور میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ جوں جوں انسانی ذہن ترقی کرتا رہا اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے فرستادہ پیغامبروں کے ذریعہ اس کے علم میں اضافہ کرتا رہا ہے۔ کبھی قبائلی سطح پر، کبھی جغرافیائی حدود کے اندر اور کبھی قبیلہ و جغرافیہ دونوں پر مشتمل انسانی گروہوں تک ہدایت بھیجی جاتی رہی۔ انسانوں کا مختلف ادیان میں بٹ جانا اس وجہ سے بھی تھا۔ مگر بالآخر انسانیت کو ایک ہی دین پر قائم ہو کر تسخیرِ کائنات کے ازازل مقررشدہ منتہیٰ مقصود کی جانب سفر اختیار کرنا تھا۔ انسانی سفر کی یہ آخری کڑی ہونی تھی اور اس آخری مدّت سفر کے لیے آخری پیغام اور آخری ہدایت کا آنا ضروری تھا۔ اس آخری پیغام کو عالم انسانی کا مشترکہ دین ہونا تھا۔ یعنی اس کا ہر دور میں ہر مقام کے لیے موزوں ہونا ضروری تھا۔ اس طرح کا زمان و مکان سے بلند تر نظامِ حیات صرف خالقِ کائنات ہی مرتب کر کے انسانوں تک پہنچا سکتا تھا۔ جس پیغام نے قیامت تک کے لیے ہر دور میں اور ہر مقام پر قابلِ عمل ہونا تھا اس میں اصول بھی ضروری تھے اور جزئیات کا ہونا بھی لازمی تھا۔ اس میں اشارات و کنایات، تشبیہہ و تمثیل بھی ہونا تھی اور اس میں بعض پہلوؤں پر باریکیوں اور تفاصیل کا ہونا بھی ضروری تھا۔ اس قدر تنوع، اس قدر ٹھہراؤ، اس ضرورت کے لیے استدلال اور براہین، اس قدر وسیع میدان اور اتنی طویل مدّت کے بدلتے ہوئے حالات کی ضروریات کو ایک ہی کتاب میں

---

[1] وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ ط (الجاثیہ ۴۵ : ۱۳)

[2] وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّآ أُمَّةً وَّاحِدَةً۔ (یونس ۱۰ : ۱۹)

[3] وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ۔ (آل عمران ۳ : ۱۹)

[4] وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَهُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً۔ (الشوریٰ ۸ : ۴۲ ۔ المائدہ ۵ : ۴۸ ، ھود ۱۱ : ۱۱۸)

سمو دیا صرف اور صرف خالق انسان ہی کر سکتا تھا اور جب اس کی نظر میں انسانی ذہن اتنے گہرے اور دقیق پیغام کو سمجھنے کے قابل ہو گیا تو پھر اس نے اس پیغام کو اس انسان صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ انسانیت پوری انسانیت قیامت تک پیدا ہونے والی انسانیت کی جانب روانہ کیا اور واضح الفاظ میں اس سیّد البشرؐ کو مخاطب کر کے فرمایا :-

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا۔ اور (اے محمدؐ) ہم نے تمھیں تمام انسانوں کے لیے خوشخبری سُنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ (سبا: ۳۴: ۲۸)

اِس پیغام نے گو قیامت تک کے لیے قائم اور قابلِ عمل رہنا تھا۔ مگر اس پر مکمل طور پر عمل کر کے مثال پیش کرنے کی ذمہ داری صرف ایک انسانؐ کو دی گئی۔ اس ایک انسانؐ نے عام شہری، تاجر، آجر، پڑوسی، معاشرے کا باعزت انسانؐ امانتوں کا بار اُٹھانے والا مصلح، ہدایت دینے والا خطیب، سپاہی، سپہ سالار اور حکمران بن کر عملاً مثال قائم کرنا تھی، کہ زندگی کے مختلف شعبوں اور مختلف مقامات پر زندگی کو کس طرح گذارنا ہے۔ قرآن خالقِ کائنات کا کلام ہے مگر اس پر عمل انسانوں نے مختلف ادوار میں مختلف جغرافیائی پابندیوں کے تحت کرنا ہے۔ دائمی پیغام کو حدودِ بشریت کے اندر رہ کر زندگی کی ایک ہی مدت میں اس مکمل[1] طور پر پیغام پر عمل کرنا تھا کیونکہ اس عمل کے مطابق رہتی دنیا تک پوری انسانیت نے عمل پیرا ہونا تھا[2]۔ اس لیے اگر عالمِ انسانی میں کوئی معجزہ رُونما ہوا ہے تو وہ یہ مکمل زندگی ہے جس نے اللہ کے عطا کردہ مکمل پیغام کے مطابق عمل کیا ہے۔ اور اس واحد انسان کی اس واحد زندگی نے نمونہ بن کر انسانیت کو تسخیرِ کائنات کی منزل تک لے جانا ہے۔ یُوں محسوس ہوتا کہ کُن کے لمحہ جب کائنات وجود میں آئی، اور اس کائنات کے مختلف حصّوں کے عمل، اور ردِّ عمل کے نتیجے میں اس کُرّۂ ارضی کو حیاتِ انسانی کے قابل بنایا، تو خالقِ کائنات کی نگاہوں میں پورا خاکہ موجود تھا اس حیات کو لاتعداد رہنماؤں کے ذریعہ اس مقام تک لایا گیا جہاں وہ لافانی نظامِ حیات کے مطابق زندگی گذار کر اس کائنات کو مسخر کرنے کی مہم پر چل کھڑا ہو۔ مگر اس لافانی نظامِ حیات کے لیے ایک ہی مثال پیش کی۔ اِس لیے کہ اس مثال کو تیار کرنے میں صدہا صدیاں گزارنی تھیں اور اُسے بچپن سے بعثت تک بیرونی اثرات سے محفوظ رکھ کر صرف اپنے لافانی پیغام پر عمل کرنے کے قابل بنانا تھا۔ اگر اس لافانی انسانؐ نے کسی اُستاد، کسی رہبر یا کسی ہادی سے سبق حاصل کیے ہوتے تو پھر وہ اللہ کے نازل کردہ پیغام کے مطابق بے آمیزش زندگی نہ گذار سکتا۔ اور اس کا ہر قول، ہر فعل اور ہر ردِّ عمل اللہ کی جانب سے قابلِ اِطاعت نہ ہوتا۔ قیامت تک کے لیے رہنے والے احکام کے دوران اطیعوا الرسول کا بار بار اِعادہ اِس بات کو پختہ کرتا ہے کہ اللہ کے آخری رسُولؐ کا رسالت کے سلسلہ کو ختم کرنے کے لیے یہی معنے ہیں کہ اب انسانیت ایک ہی نظام پر عمل کرتی ہے اور آئندہ ادیان میں بٹنا بند ہو جائے ورنہ علّم آدم الاسمآء سے لے کر

---

[1] اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ (المائدہ ۵: ۳)

[2] لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِىْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب ۳۳: ۴)

ارتقا تک جو ترقی ذہن انسانی نے کی تھی۔ وہ رائیگاں جاتی۔ ختم رسالت کا اصول انسانیت کو ایک وحدت میں منسلک ہونے کی منزل کی طرف لے جاتا ہے۔ صرف قرآن ہی نہیں بلکہ سیرت کا ایک ہونا بالآخر انسانیت کا ایک ہی پیغام پر عمل پیرا ہونا یقینی بناتا ہے۔

جب تک عالم انسانی کی انتہائی اور آخری منزل یعنی تسخیر کائنات پر نگاہ نہ رکھی جائے اور اللہ کے آخری پیغام کی اس منزل کی جانب رہبری کو نہ دیکھا جائے اُس وقت تک یہ راز سمجھ میں نہیں آتا کہ حضور سرورِ کونین خاتم الرسل، سیّد البشر صلی اللہ علیہ وسلم کیوں اپنے بچپن کے دوران والد، والدہ، دادا، اور کسی اُستاد و رہبر یا ہادی و مُرشد سے استفادہ کرنے سے خود اللہ کی جانب سے دُور رکھے گئے اور ان معنوں میں "امی" رکھے گئے کہ خود خالقِ کائنات آپؐ کو "امی" کہہ کے پکارنے میں خوشی محسوس کرتا ہے۔ یعنے اس ہستی کو "امی" رکھا جس کو وجود میں لانے کے لیے اور جسے قیامت تک کے لیے مثال بنانے کے لیے صدہا صدیوں پر حاوی ایک آفاقی نظام قائم کیا، اور پھر خود ہی فرمایا:-

لولاک لما خلقت الافلاک۔

خلقِ عظیم

محمد صلاح الدین

انسان اللہ تعالیٰ کی تخلیق کا شاہکار ہے، اسے احسن تقویم پر پیدا کیا گیا، اس کے جسدِ خاکی میں اس کے خالق نے خود اپنی رُوح پھونکی، اس کے وجود پر اپنی لامحدود صفات کا ایک ہلکا سا پرتو ڈالا اور اسے مظہرِ صفاتِ الٰہی بنایا۔ اسے وہ علم عطا کیا جو فرشتوں کو بھی حاصل نہ تھا، اسے اشرف المخلوقات قرار دے کر فرشتوں سے سجدہ کرایا اور ان سے عظمتِ آدم تسلیم کرائی گئی اسے جنّت کی ناقابلِ تصور راحتوں اور نعمتوں سے نوازا گیا اور پھر زمین سے آسمان تک پھیلی ہوئی وسیع بزمِ کائنات سجا کر اور زمین کو کبھی نہ ختم ہونے والے سامانِ زیست کے خزانوں سے بھر کر اسے خلیفۃ اللہ کے عظیم منصب پر فائز کر کے یہاں بھیجا گیا۔ یہ عظمت و رفعت بلا امتیازِ مذہب و ملت ہر انسان کو محض انسان ہونے کی بنا پر حاصل ہے۔

اس گروہِ انسانی میں بعض نفوسِ قدسیہ کو خلافت کے علاوہ ایک اضافی اور خصوصی منصب نبوت کا عطا ہوا جس نے انھیں دوسرے لوگوں کی نسبت بلند تر درجے پر فائز کر دیا۔ اس خصوصی گروہِ انبیاؑ میں اللہ تعالیٰ نے صرف ایک ہستی کو منتخب کر کے اسے خاتم النبیین اور رحمۃ للعالمین قرار دے کر اور وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ کی سند جاری کر کے ازل سے ابد تک آنے والے پُورے عالمِ انسانیت میں بلند ترین مقام پر فائز کر دیا، اس پر خود درود بھیجا، فرشتوں کی ڈیوٹی لگا دی گئی کہ اس عظیم ہستی پر مسلسل درود بھیجتے رہو، اور مسلمانوں کو بتا دیا گیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے بغیر تمھاری نماز مکمل ہوگی نہ قابلِ قبول، اور قیامت تک کے لیے اعلان کر دیا گیا کہ اب نسلِ انسانی میں سے جس کسی کو ہدایت و رہنمائی حاصل کرنی ہے وہ محمدؐ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کرے اور ہر طرف سے منہ موڑ کر صرف اسی نمونۂ کامل کی طرف دیکھے۔

حضورِ اکرمؐ کو یہ مقام و مرتبہ کیوں عطا ہوا؟ اس سوال پر غور کیا جائے اور قرآنِ کریم میں اس کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی جائے تو ایک ہی بات سامنے آتی ہے، اور وہ یہ کہ حضورؐ نے کارِ نبوّت کی تکمیل فرمائی ہے اور یہ کارِ نبوت تھا تکمیلِ اخلاق۔

انسان اپنے طبعی وجود میں دوسری ذی حیات مخلوق سے مختلف نہیں۔ اس کا جبلّی کردار حیوانات کے جبلّی کردار کی طرح خود کار اور احتیاجات، جذبات و عواطف اور احساسات و میلانات کے لحاظ سے یکساں ہے، اسے جو چیز حیوانات کی سطح سے اُوپر اٹھاتی اور اشرف المخلوقات کی بلندی تک پہنچاتی ہے وہ اس کا اخلاقی کردار ہے۔ انبیاءِ کرام اسی اخلاقی کردار کی تعمیر و تشکیل کے لیے بھیجے گئے، کتابیں اسی مقصد کے لیے اتاری گئیں، حکمت اور میزان (شعورِ خیر و شر) کا نزول اسی غرض سے ہوا، انسان نے اخلاق کا پہلا درس خود اپنے خالق و مالک سے حاصل کیا۔ تخلیقِ آدم کے بعد تعلیمِ آدم کا ذکر کرتے ہوئے

فرمایا گیا :

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ۔ (بقرہ : ۳۱)

اور اللہ نے آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے ۔

یہاں نام سکھانے کے مفہوم میں اشیا کے خواص ، نافع و مضر پہلو ، استعمال کے طریقے اور ان کے ساتھ انسان کے تعلق و رویہ کی نوعیت سب شامل ہیں اور لفظ كُلَّهَا سے صاف پتا چلتا ہے کہ یہ علم کامل تھا ، ادھورا نہیں ۔ انسان کو اس دنیا میں زندگی کے آغاز کے لیے اور بحیثیت خلیفہ اپنے مشن کی تکمیل کے لیے جتنے علم کی ضرورت تھی وہ العلیم نے اپنے لامحدود علم سے بقدر ضرورت اسے مہیا کر دیا ۔ گویا جو انسان کا خالق ہے ، وہی اس کا معلّم اوّل بھی ہے اور پھر اس کی بارگاہ سے علم و اخلاق کا خزانہ لے کر اس دنیا میں جو پہلا انسان بھیجا گیا وہ یہاں اپنی اور آئندہ نسل کی تعلیم و تربیت پر مامور کر کے انسانیت کا معلّم اوّل بنا یا گیا ۔ اس کے بعد جتنے انبیاء انسان کی ہدایت و رہنمائی کے لیے مبعوث کیے گئے وہ درحقیقت سب کے سب معلّمِ اخلاق ہی تھے ۔ حضور اکرمؐ نے اپنے مشن کی وضاحت خود ان الفاظ میں بیان فرمائی :

اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا ۔

مجھے معلّم بنا کر بھیجا گیا ۔

اور پھر اس معلّمِ انسانیت نے اپنی تعلیم کا اصل مقصد بیان کرتے ہوئے فرمایا :

اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ ۔

میں مکارمِ اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں ۔

ان دونوں احادیث کو باہم مربوط کر کے دیکھا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ علم کا اصل مقصود اخلاق ہے ۔ اخلاق مطلوب ہے اور علم اس کا ذریعہ ۔ معلّم کا کام محض انتقالِ علم نہیں ، تشکیلِ اخلاق ہے ۔ اب یہ ظاہر ہے کہ کسی بھی کام کی تکمیل کے لیے خود اس میں کامل ہونا ایک لازمی شرط ہے ۔ کمال کے بغیر تکمیل کا تصور محال ہے ۔ حضورِ اکرمؐ کو یہ کمال کس درجہ میں حاصل تھا اس کا اندازہ خالقِ کمال کی جاری کردہ اس سند سے ہو جاتا ہے کہ :

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۔ (القلم : ۴)

اور بے شک اے محمدؐ ! تم اخلاق کے بلند ترین مرتبے پر فائز ہو ۔

یہ اخلاق ، جس کے بلند ترین مرتبے پر فائز ہونے کی سند جاری کی جا رہی ہے ، ہے کیا شے ؟ علم و عمل کی مکمل یکجائی اور قول و فعل کی ایسی کامل ہم آہنگی جس میں علم کا عمل سے اور قول کا فعل سے کوئی فاصلہ نہ ہو ۔ خارجی اعمال کا قلب و ضمیر کی داخلی زندگی سے کہیں ٹکراؤ نہ ہو ۔ شخصیت مربوط و منظم ہو ، منتشر اور منقسم نہ ہو ۔

اس نوعیت کی اخلاقی زندگی کے لیے علم کا درست ہونا ضروری ہے ۔ اگر علم کی بجائے کوئی شخصیت محض ظن و گمان پر مبنی جہل کو اپنے اعمال کی بنیاد بنا بیٹھے اور اس کے اندر قول و فعل کی یکجائی بھی موجود ہو تو ہم اس کے کردار کو اخلاقی کردار قرار

نہیں دے سکتے کیونکہ قول بجائے خود ناقص اور جہل پر مبنی ہے، اس سے مربوط و منسلک اعمال اخلاق کا مظہر نہیں ہو سکتے اور نہ معیارِ اخلاق بن سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو جو اخلاقی کردار مطلوب ہے وہ اسی علم پر مبنی ہونا چاہیے جو خود اس کا عطا کردہ ہے، جسے وہ علم قرار دے وہی علم ہے اور جسے وہ جہل قرار دے وہ سراسر جہل ہے۔

اب اس سوال پر غور کیجیے کہ تکمیلِ اخلاق سے کیا مراد ہے؟ کیا سابق انبیاؑ تعمیرِ اخلاق کے مشن میں ناکام رہے تھے؟ کیا ان کا اپنا اخلاقی کردار کاملیت کے درجے پر پورا نہیں اترتا تھا؟ معاذ اللہ ایسی کوئی بات نہ تھی۔ قرآن تو تمام انبیاؑ کو نہ صرف کامیاب قرار دیتا ہے بلکہ ان کے درمیان فرق قایم کرنے کی ممانعت کرتا ہے:

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ۔ (بقرہ : ۲۸۵)

ہم اللہ کے رسولوں کو ایک دُوسرے سے الگ نہیں کرتے۔

جب انبیاؑ کے درمیان کوئی فرق نہیں تو پھر خلقِ عظیم کی سند جاری کر کے یہ فرق کیوں قایم کیا گیا ہے؟ کیا نعوذ باللہ پچھلے انبیاؑ اخلاق کے معاملہ میں کسی بھی درجے میں کمزور تھے؟ قرآن تو انھیں اپنے دَور کا بہترین انسان قرار دیتا ہے، پھر اس فرق کی اصل حقیقت کیا ہے؟

اس فرق کو ایک مثال سے سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ ہمارا مروّجہ نظامِ تعلیم پرائمری کی ابتدائی جماعتوں سے لے کر یونیورسٹی کی اعلیٰ سطح تک مختلف درجات میں عموداً پھیلا ہُوا ہے۔ اس کے مختلف درجات میں تعلیم دینے والے معلّمین اپنی اپنی جگہ ... اور اخلاق کے لحاظ سے بہترین کردار کے مالک ہیں۔ ان سب کی تعلیم اور طریقۂ کار بنیادی طور پر یکساں ہیں۔ جو حقائق ... ابتدائی جماعتوں میں بچوں کے فہم و شعور کی سطح کے مطابق ذہن نشین کرائے جاتے ہیں وہی اگلی جماعتوں میں علم کی وسعت اور شعور کی بلوغت کے لحاظ سے ... پھیلتے اور واضح ہوتے جاتے ہیں۔ نظامِ اخلاق جن اقدار و عقائد پر مشتمل ہے وہی آخری درجات تک سیرت و کردار کی تشکیل کا ذریعہ بنے رہتے ہیں۔ تعلیم کے کسی بھی مرحلے پر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ معلّم نے کسی بھی درجے میں ضروری علم پہنچانے اور اخلاقی تربیت دینے میں کوئی کوتاہی کی ہے۔ ہم کسی بھی درجے کے معلّم کو کمتر قرار نہیں دے سکتے کیونکہ وہ سب تعلیم و تربیت ہی کا فریضہ انجام دیتے رہے ہیں۔ لیکن ہم یونیورسٹی کی سطح پر تحقیق و تکمیل کے اس مرحلے سے قبل کسی بھی درجے کی تعلیم کو مکمل نہیں کہہ سکتے جو متعلّم کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ اب وہ رسمی تعلیم کے تمام سہاروں سے بے نیاز ہو کر خود اپنی صلاحیت اور مطالعہ و تحقیق کے بل پر سلسلۂ تعلیم تاحیات جاری رکھ سکے۔

یہی صورت اللہ تعالیٰ کے اس نظامِ تعلیم و تربیت میں نظر آتی ہے جو انسان کو ایک اخلاقی وجود بنانے کے لیے مرتب کیا گیا۔ حضرت آدمؑ کو انسانیت کے عہدِ شیر خوارگی میں اس کی تعلیم و تربیت کے لیے جس مقدار علم کی ضرورت تھی وہ انھیں ان کے رب نے مہیا کر دی۔ انھیں زندگی کے بنیادی حقائق، اس کے مقصد اور معروف و منکر کی صورت میں اخلاقی اقدار سے آگاہ کر دیا گیا۔ اب یہ ظاہر ہے کہ انسانیت کو اور اس کے ارد گرد پھیلی ہوئی وسیع دنیا کو اسی عہدِ شیر خوارگی تک محدود نہیں رہنا تھا۔ نمو اور ارتقا کا سلسلہ جاری رہا۔ انسانیت اپنے عہدِ طفولیت اور بلوغت کے مختلف مراحل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ علم و شعور کی بڑھتی ہوئی روشنی اور خدا کی بخشی ہوئی مختلف قوّتوں اور صلاحیتوں کے ذریعہ وہ اپنی دنیا کی تعمیرِ نو

کرتی گئی۔ ارتقا کے مختلف درجات میں اسے نت نئے اور پیچیدہ مسائل سے دوچار ہونا پڑا۔ ان مختلف درجات میں اس کی تعلیم و تربیت کے لیے اضافی علم کے ساتھ انبیاؑ مبعوث کیے جاتے رہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کی ضرورت کے مطابق اسے علم و رہنمائی فراہم کرتا رہا۔ یُوں انسانیت اپنی تعلیم و تربیت کے مختلف مراحل سے گزرتی ہوئی تکمیلِ تعلیم اور پختگیٔ شعور کی اس سطح تک پہنچی جہاں آکر اعلان کر دیا گیا کہ :

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔ (المائدہ : ۳)

آج ہم نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا۔

گویا ایک طرف آخری معلّم کو خلقِ عظیم کی سند جاری کر کے اس کے مشن کی تکمیل پر اظہارِ اطمینان کیا گیا اور دوسری طرف متعلم یعنی انسان کو اس تعلیم کی تکمیل پر سندِ فراغت جاری کر دی گئی جس کا آغاز حضرت آدمؑ کے ابتدائی مدرسۂ تعلیم سے ہوا تھا۔ دین کی یہ نعمت جزواً جزواً مختلف انبیاؑ کے ذریعہ اتاری گئی اور نبی آخرالزماں پر اس کو مکمل کر دیا گیا۔ اسلام کا جو کامل و اکمل نقشۂ حیات حضورؐ کے دَور میں جلوہ گر ہوا اسے انفرادی و اجتماعی زندگی کے لیے سندِ قبولیت عطا کر دی گئی۔ اس تکمیلِ دین کا اصل مقصود چونکہ تکمیلِ اخلاق تھا اور حضورِ اکرمؐ کو اسی کی خاطر مبعوث کیا گیا تھا اس لیے اپنی ذات میں اور اپنے زیرِ تعلیم انسانی گروہ میں اسے درجۂ کمال تک پہنچانے کی بنا پر آپ کو یہ سندِ فضیلت بھی جاری کر دی گئی کہ :

وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ۔ (القلم : ۴)

اور بے شک اے محمدؐ! آپ اخلاق کے بلند ترین مرتبے پر فائز ہیں۔

اور پھر آپ کو رحمۃ للعالمین اور خاتم النبیین قرار دے کر قیامت تک آنے والے ہر زمانے کے لیے ہادی و رہنما بنا کر سلسلۂ وحی منقطع اور مدرسۂ نبوت بند کر دیا گیا اور ہمیشہ کے لیے طے کر دیا گیا کہ اب جس کسی کو اخلاق کے بلند مرتبے پر فائز ہونا ہے وہ اسی نمونہ کامل کا اتباع کرے۔

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ۔ (احزاب : ۲۱)

درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسولؐ میں بہترین نمونہ ہے۔

وہ علم و اخلاق جو حضرت آدمؑ کے کنبے سے شروع ہوا تھا، ان کی نسل کو ایک مخصوص زمانے، ایک مخصوص علاقے اور ایک مخصوص قوم کے محدود دائروں میں منتقل ہوتا اور پھیلتا ہوا آگے بڑھتا رہا اور حضرت محمدؐ کے عہدِ مسعود میں پُوری انسانیت، پُورے کرۂ ارض اور آنے والے ہر زمانے پر محیط ہو گیا۔

اب ایک اور پہلو پر غور فرمائیے۔ علم کا مقصود تھا اخلاق، لیکن اخلاق کیا بجائے خود مقصود تھا؟ اس کی غایت اولیٰ ہے؛ انسان کو اخلاق کی ضرورت کیوں ہے؟ کیا اس کے بغیر وُہ اپنی جبلّی قوتوں کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتا؟

اس کا جواب بھی خالقِ کائنات سے سُن لیجئے :

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔

(الحدید : ۲۵)

ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیوں اور واضح ہدایات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ انسانی معاشرہ عدل پر قائم ہو جائے۔

گویا رسولوں، کتابوں اور معیارِ خیر و شر کی میزان شعور، ان سب کے نزول کا واحد مقصد انسانی معاشرہ کو عدل پر قائم کر دینا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس پوری کائنات کا نظام عدل پر استوار کیا ہوا ہے۔ وہ انسان کی اپنی دنیا کو بھی اسی عدل پر استوار دیکھنا چاہتا ہے لیکن اس کی تنظیم و تشکیل کا کام اس نے اپنے خلیفہ ہی کے ذمّہ رکھا ہے۔ البتہ اس ذمہ داری کی تکمیل کے لیے اس نے انسان کی تعلیم و تربیت کا پورا اہتمام کیا۔ نبی بھیجے، ان پر کتابیں اتاریں، انھیں حکمت اور میزان کی دولت سے نوازا گیا اور معلّم بنا کر انسانیت کی اخلاقی تربیت پر مامور کیا گیا۔ یہ سارا اہتمام کس لیے ہے؟ انسانی معاشرے کو عدل پر قائم کرنے کے لیے۔ اس پورے پس منظر کو ذہن میں رکھا جائے تو صورت یہ بنتی ہے کہ علم ذریعہ ہے تشکیلِ اخلاق کا، اور اخلاق ذریعہ ہے قیامِ عدل کا، عدل کا وجود اخلاق کے بغیر اور اخلاق کا وجود علم کے بغیر محال ہے اور اسی سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جہاں علم ہوگا وہاں اخلاق ہوگا۔ جہاں اخلاق ہوگا وہاں لازماً عدل کی حکمرانی ہوگی۔ عدل سے عاری معاشرہ اخلاق کے وجود سے خالی ہے اور اخلاق سے تہی دامن معاشرہ علم سے بے بہرہ ہے۔ زندگی کی مادی آسائشیں مہیا کرنے والا علم بھی بلاشبہ علم ہے لیکن اسلام حقیقی علم صرف اسی کو تسلیم کرتا ہے جو وسائلِ حیات کو عدل کے تقاضوں کے مطابق تمام انسانوں کے لیے باعثِ راحت و آسائش بنا سکے۔ یہ علم موجود نہیں تو ایک کا عیش لاکھوں کے لیے جہنم کی بھٹی دہکا دینے کا سبب بن جاتا ہے۔ وہ علم جو لیقوم الناس بالقسط کی شرط پوری نہ کرتا ہو جہل ہے، عذاب ہے، شیطنت ہے، آتشِ نمرود ہے، دولتِ قارون ہے، فراستِ ہامان ہے، رعونتِ فرعون ہے، اور انسانیت کے لیے زہر ہے۔ علم کا اخلاق سے اور اخلاق کا عدل سے جو رشتہ ہے اسے سمجھ لینے کے بعد یہ حقیقت از خود واضح ہو جاتی ہے حضورِ اکرمؐ کو خلقِ عظیم کی سند جاری کرنے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ آپؐ نے مقصودِ اخلاق پا لیا یعنی انسانی معاشرہ کو عدل پر قائم کر دیا۔ آپؐ نے اخلاق کے بلند ترین مرتبے پر فائز ہو کر عدل کو اس کے معیارِ مطلوب پر پہنچا دیا۔ اخلاق اور عدل بلندی کی جانب متوازی اور متصل خطوط کی طرح آگے بڑھتے ہیں۔ انسان اخلاقی لحاظ سے جتنا بلند ہوگا عین اسی نسبت سے عادل و منصف بھی ہوگا۔ بے اخلاق عادل نہیں ہو سکتا۔ حضورؐ اخلاق کے جس بلند ترین مرتبے پر فائز ہیں اسی مرتبے پر وہ بحیثیت عادل بھی فائز ہیں۔

خلقِ عظیم کی سند کے سلسلہ میں ایک اور اہم نکتہ پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ قرآن نے جس سورت میں یہ سند جاری کی ہے اس کا عنوان ہے "القلم"۔ اس کی ابتدائی آیات ملاحظہ ہوں :

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ ٥ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ٥ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا

غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ٥ وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ٥

ن ۔ قسم ہے قلم کی اور اس چیز کی جسے لکھنے والے لکھ رہے ہیں (قرآن) تم اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہو اور یقیناً تمھارے لیے ایسا اجر ہے جس کا سلسلہ کبھی ختم ہونے والا نہیں اور بے شک تم اخلاق کے بلند ترین مرتبے پر فائز ہو۔

غور فرمایئے ، اخلاق کے بلند ترین مرتبے پر فائز ہونے کی سند جاری کرنے سے قبل قسم کس چیز کی کھائی جا رہی ہے؟ قلم کی' اور اس سے تحریر ہونے والے حروف و الفاظ کی یعنی ذرائع علم کی ۔ یہ اشارہ ہے اس حقیقت کی جانب کہ قلم اور کتاب کا اخلاق سے کیا تعلق ہے قلم و کتاب کے تقدس اور اخلاق سے ان کے تعلق کی وضاحت کے لیے اس سے حسین پیرایۂ اظہار دنیا کے لٹریچر میں ملنا محال ہے ۔ قلم اور کتاب کی قسم کھا کر اخلاق کی سند جاری کرنے کا مطلب یہ ہے کہ حضورؐ جس علم کے حوالے سے اپنی دعوت پیش کر رہے ہیں وہ کفار و مشرکین کے بہتان کے مطابق کوئی مجذوب کی بڑ یا مجذوب کی خیال آرائی نہیں ہے بلکہ قلم و کتاب سے تعلق رکھنے والا علم ہے ۔ یہ وہی علم ہے جو پہلے نبی اُمی حضرت آدمؑ کو عطا کیا گیا تھا اور اب آخری نبی اُمی حضرت محمدؐ کو بخشا گیا ہے ۔ یہ ظن و گمان پر مبنی نہیں ، لوحِ محفوظ سے منتقل کیا جانے والا علم ہے ۔ کفار و مشرکین علم کا جو تصور اپنے ذہن میں بٹھائے ہوئے تھے اس میں چونکہ قلم اور کتاب کے رسمی ذرائع کو بڑی اہمیت حاصل تھی اس لیے ان دونوں چیزوں کی قسم کھا کر ان کے اس الزام کی پُر زور تردید کی جا رہی ہے کہ محمدؐ نے کبھی قلم ہاتھ میں پکڑا نہ کسی سے کتاب پڑھنا سیکھا اس لیے وہ جو کچھ پیش کر رہے ہیں وہ ان کے دماغ کی اختراع ہے ، کاتبینِ وحی کے ہاتھوں اس علم کا قلم سے تحریر ہونا اس الزام کی تردید کے لیے چونکہ سب سے بڑا ثبوت تھا اس لیے اللہ نے انہی دو چیزوں کی قسم کھا کر کفار کا منہ بند کیا اور اپنے نبی کو اطمینان دلایا کہ تم ان کی الزام تراشیوں سے دل شکستہ نہ ہو، تمھارے صاحبِ علم ہونے کی سب سے بڑی دلیل تو یہ ہے کہ تم اخلاق کے بلند ترین مرتبے پر فائز ہو ۔ یہ مرتبہ علم کے بغیر نہیں مل سکتا ۔ کفار و مشرکین کی بدگوئی ، ایذا رسانی اور طعنہ زنی کے مقابلے میں تم جس صبر و تحمل اور استقامت کے ساتھ اپنی دعوت کا کام انجام دے رہے ہو وہ تمھارے اخلاق کی بلندی کی واضح علامت ہے ۔

حضورِ اکرمؐ کو واقعات کے جس تناظر میں خُلقِ عظیم کی یہ سند جاری کی جا رہی ہے اس سے اسلام کا وہ تصورِ اخلاق بھی واضح ہو جاتا ہے جو بدقسمتی سے بعد میں اپنے حقیقی مفہوم کے ساتھ ہمارے سامنے نہ رہ سکا اور اس کی جگہ ایک ایسا تصورِ اخلاق رواج پا گیا جس کی سب سے بڑی خصوصیت منافقت ہے ۔ داخلی شخصیت سے جُدا ایک ملمع کی طرح چڑھا ہوا مزاظاہر دار بیگ والا خارجی کردار اخلاق کی علامت بن گیا ۔ یہ معرکہ حق و باطل میں انبیاءِ کرام اور ان کے سچے پیرو کاروں کا جوہرِ کردار اور قوت کردار تھا ، ان کے اندر جرات و بیباکی ، عزیمت و استقامت اور اپنے دَور کی بڑی سے بڑی جابر و قاہر قوت کو پرکاہ کے برابر بھی حیثیت نہ دینے کے عزم و حوصلہ کی صفات اسی اخلاق کی بنیاد پر استوار تھیں لیکن اب ایسے لوگوں کو '' صاحبِ اخلاق '' سمجھا جانے لگا جو نہایت دبو ، مریل ، مرنجان مرنج ، حق و باطل کی ہر کش مکش سے گریزاں ، عافیت پسند ، مصلحت اور مصالحت کے اصول پر کاربند ، ہر طاقتور کے سامنے سربسجود ، ہر زور آور کے سامنے دست بستہ اور

ہر قوت کے سامنے سپر انداز ہوں، جو کڑھتے ہوئے دل کے ساتھ لبوں پر مسکراہٹ کے پھول سجا لینے کا فن جانتے ہوں۔ جن کا دل لعنت بھیجے اور زبان قصیدہ پڑھنے میں بیک وقت مصروف رہ سکیں، جو اندیشۂ سُود و زیاں میں ہر وقت لرزتے کانپتے اور ہر لمحہ موجود سے مطابقت پیدا کرتے ہوئے زندگی کے دن کاٹ رہے ہوں۔ ان کی عاجزی اور انکساری جو درحقیقت ان کی بُزدلی اور پست ہمتی کی علامت ہوتی ہے، علامت اخلاق بن جاتی ہے۔

اسلام اس "اخلاق" کے لیے منافقت کی اصطلاح استعمال کرتا ہے، اس کے نزدیک اخلاق اس صفت کا نام ہے جہاں زبان دل کی رفیق ہو، اسی لیے کلمہ طیبہ کو محض زبان سے ادا کر لینے پر کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا۔ قبولِ اسلام کے لیے تصدیق بالقلب ایک لازمی شرط ہے۔ حضور اکرمؐ کے زمانہ میں عبداللہ بن اُبی اور اس کے ساتھیوں کا پُورا گروہ اسی بنا پر منافق قرار پایا تھا کہ وہ زبان سے اسلام کا اقرار کرتا تھا اور تمام ظاہری اعمال کی بجا آوری میں بھی بڑا مستعد تھا۔ لیکن اس کا دل ایمان سے خالی تھا۔ اس کا کردار وحدتِ فکر و عمل کی بجائے عقاید و اعمال کی ثنویت پر مبنی تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فکر و عمل کی کامل وحدت رکھنے والے کردار کو "خلقِ عظیم" قرار دیا اور عبداللہ بن ابی کے گروہ کو اس کے داخلی اور خارجی کردار کے تضاد کی بنا پر "منافق" ٹھہرایا۔ دنیا میں کون ہے جو صداقت، دیانت، امانت، عدل، احسان، رحم دلی، ایثار، عفو و درگزر، حلم، بُردباری، تواضع، استغنا، اعتدال، استقامت، شجاعت، شرم و حیا اور پابندیِ عہد وغیرہ کی اعلیٰ اخلاقی اقدار کا قدر دان و علمبردار نہ ہو یا کم از کم ان خوبیوں کے معروف ہونے کا معترف نہ ہو اور جھوٹ، خیانت، ناانصافی، ظلم، غیبت، بدگوئی، فریب دہی، عہد شکنی، مفاد پرستی، حرص و طمع، فحاشی و بدکاری، ریاکاری، بزدلی، بخل اور دوسری برائیوں کو منکر و مذموم نہ سمجھتا ہو لیکن اصل مسئلہ معروف کو جزوِ زندگی بنانے اور منکر سے نجات پانے کی عملی آزمائش کا ہے۔ دُنیا میں اس کا کوئی جامع اور کامل نمونہ موجود ہے تو صرف ایک ہی ہے ——— محمدؐ کا اسوۂ حسنہ، اور اس اسوۂ حسنہ کے خلقِ عظیم ہونے کا مطلب ہے معروف میں کامل اور منکر سے یکسر پاک شخصیت۔ معروف کو پھیلانے، نافذ کرنے اور منکر کو مٹانے والا ایسا کردار جس کے اندر تضادات کی کسی ادنیٰ سی علامت کا وجود ناممکن بلکہ اس کا تصور تک محال ہے۔ اس نے مساوات کا درس دیا تو غلام آقا بن گئے اور آقا ان کے خادم، اس نے اخوت کا پیغام دیا تو مدینہ میں اجنبی سگے بھائیوں سے بڑھ گئے، ان کی خاطر بیویوں کو طلاق دے کر ان کے گھر بسائے گئے۔ گھر کے برتن، کپڑے، مویشی، کھیت اور کھیتوں کی فصلیں سب تقسیم ہو گئے۔ جس نے یہ تعلیم دی تھی اس نے اپنا کوئی گھر نہ بسایا، خدا کے گھر مسجد ہی کو اپنا مسکن بنا لیا۔ اس کے پاس کبھی دو وقت کی خوراک جمع نہ ہونے پائی۔ اس نے دنیا کے خزانے لُٹائے مگر دنیا کو اس حال میں چھوڑا کہ اس کے گھر میں دو مٹھی جَو موجود نہ تھے۔ ہے دنیا میں اس کا کوئی مثل؟ اخوت اور مساوات کے نعرے دُوسروں نے بھی لگائے اور بڑے زور شور سے لگائے، مگر اقتدار کی باگیں ان کے ہاتھ میں آئیں تو ان کے اسبابِ عیش سے آراستہ بلند و بالا محلات زار کے محل پر بازی لے گئے۔ ان کی قبروں تک کے لیے ایسی وسیع اور عظیم الشان عمارتیں تیار کی گئیں جن کا تصور بادشاہوں کے ہاں ناپید تھا۔ ان کے ٹھاٹ باٹ نے افسانوی شہزادوں اور شہنشاہوں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ محمدؐ نے اپنے ہمعصر شاہانِ روم و ایران اور مصر و شام کے مقابلے میں جیسی سادہ زندگی بسر کی اس کا موازنہ آج کے نام نہاد عوامی رہنماؤں، مساوات کے علمبردار اشتراکی آمروں اور ان کے ہمعصر بادشاہوں سے کیجئے۔ "اخلاق" کے معنی آپ پر

خود بخود واضح ہو جائیں گے اور یہ حقیقت بھی منکشف ہو جائے گی کہ از آدم تا ایں دم پوری نسلِ انسانی میں "خلقِ عظیم" کی سند صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو کیوں جاری کی گئی ہے اور کوئی دوسرا کیوں اس اعزاز کا سزاوار نہ بن سکا۔

اور اب آخری بات ——— خلق عظیم ہونے کا بالکل فطری اور منطقی مفہوم یہ ہے کہ انسانیت کو اس کا خالق جس درجہ کمال پر پہنچانا چاہتا تھا وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت میں جلوہ گر ہو گیا، اب قیامت تک نہ کوئی اس درجہ کمال کو پہنچے گا، نہ لائق اتباع ٹھہرے گا۔ ہر آنے والے کو، خواہ وہ مہدی ہو یا مسیح موعود، محمدؐ کی اتباع کرنی ہوگی، اب نہ کسی کی شریعت چلے گی، نہ کوئی غیر مشروط اطاعت و فرمانبرداری کا مرکز بنے گا، نہ کسی پر وحی نازل ہوگی، نہ کتاب، حکمت اور میزان اُترے گی کیونکہ ان سب کے نزول کا مقصد اسوہ حسنہ اور خلقِ عظیم کی صورت میں پورا ہو گیا۔ اب کوئی نیا نبی آکر کیا کرے گا، کیا وہ انسان کے اخلاق کو اس حد سے آگے لے جا سکے گا جہاں محمدؐ اسے چھوڑ گئے ہیں؟ اگر ایسا نہیں تو پھر نئے نبی کی ضرورت کیا ہے؟ محمدؐ کے بعد نبوت کا ہر دعویدار جھوٹا، مکّار اور فریبی ہے ؎

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین

(۲۱ : ۱۰۷)

قاضی محمد سلیمان منصور پوری

اس آیت مبارکہ کو زیب عنوان کرتے ہی مجھے خیال آیا قرآن مجید دیکھنا چاہیے کہ للعالمین[1] کا لفظ کن کن اشیاء یا اشخاص کے متعلق آیا ہے۔ مجھے مندرجہ ذیل آیات میں یہ لفظ ملا:

۱۔ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ۔ (۶ : ۹۰)

۲۔ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ (۱۲ : ۱۰۴) (۳۸ : ۸۷) (۶۸ : ۵۲)

۳۔ وَمَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ (۶۸ : ۵۲)

۴۔ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ۔ (۲۱ : ۷۱)

۵۔ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ (۳ : ۹۶)

۶۔ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَصْحٰبَ السَّفِيْنَةِ وَجَعَلْنٰهَا اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ (۲۹ : ۱۵)

۷۔ وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَا اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ (۲۱ : ۹۱)

۸۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ۔

آیات بالا پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ آیت نمبر ۱، ۲، ۳ میں قرآن مجید کو ذکر للعالمین فرمایا گیا ہے اور اس میں کلام نہیں کہ یہ خدا کا کلام ہے جو جملہ عالمین کے لیے "ذکر" ہے۔

نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا اسم مبارک تو اس مصدر کے ساتھ مذکر ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَذَكِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ۔ (۸۸ : ۲۱)

آیت نمبر ۴ و ۵ میں اللہ تعالیٰ نے لفظ برکت کا استعمال کیا ہے۔ آیت نمبر ۴ بیت المقدس کے لیے ہے اور آیت نمبر ۵ بیت الحرام کے لیے۔ مسلمان ان دونوں مسجدوں کو اسی ادب و احترام کا مستحق سمجھتے ہیں جو کلام الٰہی میں ان کے لیے ظاہر فرمائے گئے ہیں اور چونکہ لفظ برکت ہر دو کے لیے مشترک ہے اور لفظ ھُدًی بیت الحرام کے لیے خاص اور زائد ہے، اس لیے بیت الحرام کا درجہ بھی بیت المقدس سے زیادہ تسلیم شدہ ہے۔

آیات نمبر ۶، ۷، ۸ میں لفظ آیت کا استعمال ہوا ہے اور اس کا مصداق ان مختلف آیات میں مقصود ہے۔

---

[1] للعٰلمین بعض اور آیات میں بھی استعمال ہوا ہے۔ (ادارہ)

آیت نمبر ۶ میں حضرت نوحؑ کی کشتی کو یا اہل کشتی کو آیت فرمایا گیا ہے۔

آیت نمبر ۷ میں حضرت مریم اوران کے فرزند کو آیت بتایا گیا ہے۔

آیت نمبر ۸ میں نوعِ انسانی کی مختلف زبانوں اور متلون رنگتوں کے اختلاف کو آیت بیان کیا گیا ہے۔ اوران سب کا خلاصہ یہ ہے کہ،

ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ صرف قرآن مجید ہے۔

مُبٰرَكٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ بیت المقدس و بیت الحرام ہیں۔

اٰيٰتٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ اصحاب نوح اور کشتی نوح اور حضرت مریم و حضرت ابن مریم اور اقوام عالم کا اختلاف الوان اور تباین السنہ ہیں۔

اور لفظ رحمت ایسا لفظ ہے جس کا استعمال نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کے لیے ہوا۔ حضور کے سوا کسی دوسرے کے لیے نہیں ہوا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے،

وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ۔ (اعراف) میری رحمت ہر ایک سے زیادہ وسیع ہے۔

پس جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جملہ عالمین کے لیے رحمت بنایا گیا ہے تو ثابت ہو گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت بھی جملہ عالمین کے لیے ہے۔

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ رحمۃ للعالمین وہی وجود مزکّی ٹھہرے گا۔

جس کے اہل عالم بلکہ عالم در عالم کی بہبود و سود، رفاہ و فلاح، خیر و صلاح، عروج و ارتقا، صفا و بہا کے لیے بلا شائبہ غرض اور بلا آمیزشِ طمع اپنی مقدس زندگی کو صرف کیا ہو۔

جس نے بندوں کو خدا سے ملایا ہو۔

جس نے الٰہی جلوہ انسانوں کو دکھایا ہو۔

جس نے دل کو پاک، رُوح کو روشن، دماغ کو درست، طبع کو ہموار بنایا ہو۔

جس کی تعلیم نے امنِ عامہ کو مستحکم اور مصلحتِ عامہ کو استوار کیا ہو۔

جو غریبی و امیری، جوانی و پیری، امن اور جنگ، امید اور تنگ، گدائی و پادشاہی، مستی و پارسائی، رنج و راحت، حزن و مسرت کے ہر درجہ، ہر پایہ اور ہر مقام پر انسان کی رہبری کرتا ہو۔

جس نے فلک کی بلندی، زمین کی پستی، رات کی تاریکی، دن کی روشنی، سورج کی چمک، جگنو کی دمک، ذرہ کی پرواز، قطرہ کی طراوت میں عرفانِ ربانی کی سیر کرائی ہو۔

جس کی تعلیم نے درندوں کو چوپانی، بھیڑیوں کو گلہ بانی، رہزنوں کو جہاں بانی، غلاموں کو سلطانی، شاہوں کو اخوانی سکھائی ہو۔

جس نے خشک میدانوں میں علم و معرفت کے دریا بہائے ہوں۔

جس نے سنگلاخ زمینوں سے کتاب و حکمت کے چشمے چلائے ہوں۔

جس نے خود غرضوں کو محبت قومی کا دردمند بنایا ہو۔
جس نے دشمنوں کو اپنا جگر بند ٹھہرایا ہو۔

وہ ——— غریب کا محب	مسکین کا ساتھی
شاہوں کا تاج	آقاؤں کا آقا
غلاموں کا محسن	یتیموں کا سہارا
بے آسروں کا آسرا	بے خانمانوں کا ماویٰ
دردمندوں کی دوا	چارہ گروں کا دردمند
مساوات کا حامی	اخوت کا بانی
محبت کا جوہری	اخلاص مشتری
صدق کا منبع	صبر کا معدن
خاکساری کا نمونہ	رحمتِ ربانی کا پتلا
اولین انسان	آخرین رسولؐ

اگر رحمۃ للعٰلمین کے لقب سے ملقب نہ ہوگا تو پھر ان جملہ صفات کے جامع کا اور کیا نام ہوگا؟

ہاں رحمۃ للعٰلمین وہی ہے جس نے ملکوں کی دُوری، اقوام کی بیگانگی، رنگتوں کا اختلاف، زبانوں کا تباین دُور کر کے سب کے دلوں میں ایک ہی ولولہ، سب کے دماغوں میں ایک ہی تصور، سب کی زبانوں پر ایک ہی کلمہ جاری کر دیا ہو۔

ہاں رحمۃ للعٰلمین وہی ہے جو یہودیوں کی طرح نذر و منت کی قبولیت کے واسطے نبی لاوی کا واسطہ ضروری نہیں ٹھہراتا۔

جو کاتھلوں کی طرح آسمان کی کنجیاں شخصِ واحد کے ہاتھ میں سپرد نہیں کر دیتا۔

جو، روح کو سرگ یا نرگ میں دھکیل دینے کی طاقت صرف برہمنوں ہی کو عطا نہیں کرتا۔

جو، خاص رقبہ کے باشندوں کو آسمانی یا دشاہت کے فرزند نہیں ٹھہراتا۔

جو، نسلِ واحد کے افراد ہی کو خدا کی برگزیدہ قوم نہیں قرار دیتا۔

جو، یہودیوں، عیسائیوں، زردشتیوں، برہمنوں، جینیوں اور لاماؤں کی طرح اپنے سوا باقی سب پر رحمت و افضال کے بھرپور خزانے بند نہیں کرتا۔

ہاں رحمۃ للعٰلمین وہی ہے جو بندہ کو خدا کی حضوری تک لے جاتا اور اسے ادعونی استجب لکم کی قدسی آواز سے آشنا بناتا ہے اور خدا و بندہ کے درمیان کسی تیسرے کے لیے کوئی رخنہ باقی نہیں چھوڑتا۔

ہاں رحمۃ للعٰلمین وہی ہے جس کے دربار میں:

عداس نینوائی، بلال حبشی، سلمان فارسی، صہیب رومی، ضماد ازدی، طفیل دوسی، ذوالکلاع حمیری، عدی طائی،

اثامہ نجدی، ابوسفیان اُموی، ابوذر غفاری، ابوعامر اشعری، کرز فہری، ابوحارث مصطلقی، سُراقہ مُدلجی پہلو بہ پہلو بیٹھے نظر آتے ہیں اتنی قوموں اور اتنے مختلف الدعاوی سرداروں کا مجمع کسی اور جگہ بھی نظر آتا ہے!

یہاں ہر شخص اپنے اپنے ملک اور اپنی قوم کا حقِ وکالت ادا کر رہا ہے اور ہر شخص اپنے اپنے دامانِ دل کی وسعت کے موافق پھولوں سے جھولیاں بھر رہا ہے اور اپنے اپنے ملک کے مشامِ جان کو ان سے معطر کر رہا ہے۔

ہاں رحمۃ للعالمین وہی ہے، جس کے دربار میں عثمان طلحہ بھی موجود ہے جو کعبہ کا کلید بردار ہونے سے حجازی قوموں میں اسی اعزاز کا مالک سمجھا جاتا تھا جو عزت کلیسائے روما کے مسند نشین کو آسمان کے کلید بردار ہونے کی حیثیت سے حاصل ہے۔

اُس کے دربار میں عبد اللہ بن سلام بھی موجود ہے۔ نسب عالی کے سلسلہ کو دیکھو تو یوسف بن یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام تک منتہی ہوتا ہے۔ قومی وجاہت پر نظر کرو تو یہودان بنو قریظہ و بنو قینقاع و بنو نضیر و خیبر و فدک کا بچہ بچہ انھیں خیرنا و ابن خیرنا کہہ کر یاد کرتا ہے۔

فضیلتِ علمی اور امامت قوم کی بزرگی کا اندازہ کرنا ہو تو سُن لو کہ ربیون اور احبار تک سیدنا و ابن سیدنا کہہ کر ان کو مخاطب کرتے ہیں۔ یہی بزرگوار دربارِ محمدی کے صفِ نعال میں جاگزین ہے اور دل ہی دل میں یہ کہہ کر خوش ہو رہا ہے: ع

تیری مجلس میں جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے

اسی دربار میں صرمہ ابن انس بھی حاضر ہے۔ صُحفِ انبیا کا عالم ہے۔ سوریا اور یروشلم کے متواتر سفر کر چکا ہے۔ توراۃ و انجیل کو قدیم زبانوں میں پڑھا ہے۔ دربار ہرقل میں اس کی بڑی تعظیم کی جاتی ہے اور دربار حبش میں اس کی کرامتوں کا خوب چرچا ہے عیسائیانِ حجاز کا گویا سب سے بڑا بشپ یہی ہے اب وہی مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُولٌ کو بار بار پڑھ رہا ہے اور توحیدِ خالص کی لذت میں مستغرق ہے۔

اسی دربار میں سلمان بھی موجود ہے۔ فارس کے بڑے زمیندار کا اکلوتا بیٹا ہے جو زرتشتی مذہب چھوڑ کر کاتھولکی عیسائی بنا، پھر اطمینانِ قلب نہ پا کر دینِ حقہ کی طلب میں ایران سے شام، شام سے عراق، عراق سے حجاز پہنچا تھا۔ اب تو دل و جان کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قدموں کا فرش بنا چکا ہے۔ کوئی شخص اگر ان سے باپ دادا کا نام پوچھتا ہے تو فرما دیتے ہیں سلمان بن اسلام بن اسلام بن اسلام سبعین مرۃ اسی طرح ستر بار گنتے چلے جاؤ۔

اسی دربار میں خالد بن ولید بھی حاضر ہے۔ بُت پرستی کی تائید اور بُتوں کی حمایت میں شجاعت و مردانگی کے جوہر دکھا چکا ہے اُحد میں اسلامی لشکر کو فاش شکست دے چکا ہے۔ نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ فتح کا غرور اور غلبہ کا سرور اس کے ازدیادِ غفلت اور ترقی رعونت کا سبب بن جائے۔ لیکن رحمتِ عالم کی خاکساری نے اس فاتح کے دل کو بھی فتح کر لیا ہے، وہ خود ہی کھچا کھچا آتا ہے اور لات و عزیٰ کے توڑنے کی خدمت حاصل کرنے کی التجا کر رہا ہے۔

اسی دربار میں شاہِ حبش کا عریضہ پیش ہو رہا ہے، جو سلطنت چھوڑنے اور حاضر خدمت ہو جانے کی اجازت کا خواست گار ہے۔

اسی دربار میں ذوالبجادین موجود ہے جو گھر بار اہل و عیال چھوڑ کر آیا ہے۔ کمبل کا تہبند، کمل کرتہ، جس پر ببول کے کانٹوں سے

بخیہ گری کی ہے، زیبِ تن ہے۔ فرطِ شوق اور جوشِ انبساط سے معلوم ہوتا ہے کہ وُہ آج شاہ کج کلاہ سے اپنے آپ کو برتر سمجھ رہا ہے۔
ہاں رحمۃ للعالمین وہی ہے جو یہودیوں جیسی مخذول و مقہور قوم کے ساتھ ان الفاظ میں معاہدہ کرتا ہے:

ا - ان یہود بنی عوف امۃ مع المؤمنین۔	یہود بھی مسلمانوں کی طرح ایک قوم سمجھی جائے گی۔
ب - وان بینھم النصر علی من حارب۔	جو کوئی ان سے لڑے مسلمان ان کو مدد دیں گے۔
ج - ان بینھم النصح والنصیحۃ والبر دون الاثم۔	مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات خیر اندیشی نفع رسانی نیکی کے ہوں گے۔
د - وان بطانۃ یھود کانفسھم۔	یہودیوں کے حلیف بھی اس معاہدہ میں اس کے ساتھ
ہ - وان النصر للمظلوم[1]	شامل ہیں مظلوم کی ہمیشہ مدد کی جائے گی۔

رحمۃ للعالمین وہی ہے جو خراج گزار اور مفتوح عیسائیوں کے ساتھ ان الفاظ میں معاہدہ کرتا ہے:

۱ - لنجران جوار اللہ و ذمۃ محمد النبی علی انفسھم و ملتھم و ارضھم و اموالھم وغائبھم وشاھدھم وعشیرتھم وتبعھم۔	اہلِ نجران کو خدا کی حفاظت اور محمد رسول اللہ کی ذمہ داری حاصل ہوگی۔ ان کی جان اور مذہب اور ملک اور اموال کے متعلق تمام موجودہ اشخاص اور غیر موجودہ اور ان کی قوم اور اُن کے پیرو اسی ذمہ داری میں شامل ہوں گے۔
۲ - وان لا یغیّروا لما کانوا علیہ۔	ان کی موجودہ حالت تبدیل نہیں کی جائے گی۔
۳ - ولا یغیر حق من حقوقھم۔	اُن کے حقوق میں سے کوئی حق بدلا نہ جائے گا۔
۴ - ولا یغیر کلھا تحت ایدیھم من قلیل او کثیر[2]	اور جو کچھ تھوڑا بہت ان کے قبضہ میں ہے اس میں کوئی تغیر نہ کیا جائے گا۔

رحمۃ للعالمین وُہ ہے جو کافروں کو بھی بہ آوازِ بلند سناتا ہے:

لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ۔	تمھارے لیے تمھارا دین اور میرے لیے میرا دین۔

رحمۃ للعالمین وُہ ہے جو دین اور مذہب کے متعلق کل دُنیا کو یہ اصول سکھاتا ہے:

لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ۔	دین کے معاملہ میں کسی پر بوجھ نہیں ہے۔ تحقیق ہدایت اور گمراہی میں ظاہر و باہر امتیاز ہوگیا ہے۔

پھر اسی سلسلہ میں اپنی حیثیت کو کُھلے لفظوں میں ظاہر کرتا ہے:

مَا عَلَی الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلَاغ۔	رسول کا کام لوگوں کو احکامِ الٰہی کا سنا دینا ہے اور بس۔

رحمۃ للعالمین وہی ہے جو تمام عالم سے نیکی اور عمدہ سلوک کی تعلیم اس طرح پر دیتا ہے:

لَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ	خدا تم کو لوگوں کے ساتھ نیکی اور اچھا سلوک کرنے سے

---

[1] سیرت ابنِ ہشام ج ۱ ص ۱۷۸ [2] فتوح البلدان بلاذری

فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَیْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ۔ (۶۰ : ۸)

نہیں روکتا بلکہ خدا تو ایسے کام کرنے والوں سے محبت کرتا ہے لیکن یہ لوگ ایسے ہوں کہ انھوں نے دین کے لیے تم سے جنگ نہ کی ہو اور دین کے لیے تم کو وطن سے نہ نکالا ہو۔

رحمۃ للعلمین وہی ہے جو دشمنوں کے ساتھ برتاؤ کے طریق کی اس طرح تعلیم دیتا ہے :

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ۔ (فصلت ع ۵)

بدی کا بدلہ نیکی سے دو۔ پھر جس شخص کے ساتھ تمھاری عداوت ہے وُہ تمھارا گرم جوش حامی بن جائے گا۔

رحمۃ للعالمین وُہ ہے جو معاملاتِ انصاف میں عداوت و نفرت کے تاثرات سے ہم کو علٰحدہ رہنے کا حکم دیتا ہے اور خالص انصاف کرنے کا حکم دیتا ہے :

وَلَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۔ (۵ : ۸)

کسی قوم سے مخالفت کا ہونا تمھیں انصاف کرنے کی طرف کھینچ نہ لے جائے، انصاف ہی کرو۔ یہی خداشناسی سے قریب تر ہے اور تقوٰی اختیار کرو۔ تم جو کچھ کرتے ہو خدا خوب جانتا ہے۔

فرمایا :

وَلَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا وَتَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۔ (۵ : ۱۲)

قوم کی یہ مخالفت کہ انھوں نے تم کو مسجد الحرام سے روک دیا تھا۔ تم کو ادھر نہ لے جائے کہ تم ان پر زیادتی کرنے لگو تم تو نیکی اور تقوٰی کے کاموں میں اُن کی مدد کرو اور گناہ و سرکشی کے کاموں میں ان کا ساتھ نہ دو۔ خدا سے ڈرتے رہو۔

رحمۃ للعلمین وہی ہے جو شہادت واقعہ کے لیے لوگوں کو اس طرح تیار کرتا ہے :

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۔ (۵ : ۸)

اے ایمان والو! اللہ کے لیے کھڑے ہو جاؤ اور انصاف کے ساتھ شہادت دیا کرو۔

انصاف کا وجود شہادت ہی پر قایم ہے، اس لیے شہادت کی بابت پھر ان الفاظ میں تعلیم دی گئی :

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ اِنْ یَّكُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰی بِهِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓی اَنْ تَعْدِلُوْا وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ

اے ایمان والو! انصاف کے ساتھ قیام کرنے والے اور اللہ کے لیے گواہی دینے والے بن جاؤ، خواہ تمھاری گواہی خود تمھارے والدین کے خلاف یا اقرباء کے خلاف ہو امیر ہو یا غریب کہ روابیت یا رحم کے خیالات تمھیں آتے ہوں مگر یاد رکھو کہ خدا ان دونوں سے

كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا۔ (۴ : ۱۲۵)	بڑھ کر ہے دیکھو ایسا نہ کرنا کہ سچی شہادت سے عدولی کر دیا دبی زبان سے کوئی بات کہو گواہی سے ٹل ہی جاؤ یہ باتیں تو خواہش نفس پر چلنے کی ہیں اور جو کچھ تم کرتے ہو خدا خوب جانتا ہے۔

ہاں رحمۃ للعالمین وہی ہے، جو ہر انسان کو اس کی بیوی کے متعلق یہ تعلیم دیتا ہے:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ۔ (۳۰ : ۲۱)	خدا کے نشانوں میں سے ایک یہ ہے کہ اُس نے تمھاری بیویوں کو تمھاری جنس کا بنا دیا تاکہ تم اُن سے تسلّی پاؤ پھر تمھارے درمیان محبت اور پیار قایم کر دیا۔ سوچنے والوں کے لیے اس کے اندر بہت سے نشان ہیں۔

رحمۃ للعالمین وہی ہے، جس نے شوہر بیوی کے رشتہ کو اتنا پاک ٹھہرایا کہ بہشت میں جاتے وقت بھی اُس جوڑے کو ایک دُوسرے سے الگ نہ کیا بلکہ یُوں خبر دی:

اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُوْنَ۔ (۴۳ : ۷۰)	تم اور تمھاری بیویاں شادی ونشاط اور نعمت و شادمانی کے ساتھ جنت میں چلے جاؤ۔

رحمۃ للعالمین وُہی ہے جو شوہر اور بیوی کے حقوق کی بابت یہ فیصلہ سناتا ہے:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ۔ (۲ : ۲۲۸)	عورتوں کے حق شوہروں پر ویسے ہی ہیں جیسے شوہروں کے حق عورتوں پر۔

پھر سینارٹی کے متعلق یہ تعلیم فرماتا ہے:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ۔ (۴ : ۳۴)	مرد غالب ہیں عورتوں پر بوجہ اس فضیلت کے جو خدا نے (پیدائش سے) ایک کو دوسرے پر دی ہے اور اس وجہ سے کہ مرد اپنا مال عورتوں پر صرف کرتے ہیں۔

ہاں رحمۃ للعالمین وہی ہے جو ایک انسان کی جان کی قدر و قیمت ان الفاظ میں ظاہر فرماتا ہے:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًاۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا۔ (۵ : ۳۲)	اگر کسی شخص نے ایک انسان کو بھی قتل کر دیا (واجب القصاص اور مجرم اس سے الگ ہیں) گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے ایک شخص کی جان بچائی گویا اس نے تمام انسانوں کی جان بچائی۔

رحمۃ للعالمین وُہ ہے جو خونخوار لڑائیوں کو بند کرتا، حکمرانی کی آرزو یا توسیعِ ملک کی تمنّا یا غلبہ قوت کے اظہار یا جوشِ انتقام کے وفور کے

اصول پر لڑائی کرنے کو قطعاً ممنوع ٹھہراتا ہے۔ وہ جنگ کو صرف مظلوم کی امداد کا آخری ذریعہ، عاجزوں، درماندوں، عورتوں، بچّوں کو ظالموں کے ہاتھ سے چھڑانے کا وسیلہ مذاہب مختلفہ اور ادیان متعددہ میں عدل و توازن قایم کرنے کا آخری حیلہ بتاتا ہے۔ دنیا کا رحم دل سے رحم دل شخص بھی اِن اصولوں کے لیے لڑائی کی ضرورت سے انکار نہیں کر سکتا اور معمولی سمجھ کا انسان بھی ایسی لڑائی کو سراپا رحمت کہنے میں ذرا تامل نہیں کر سکتا۔ اب اصولِ بالا پر رحمۃ للعالمین کے بتائے ہوئے احکام کو سنو:

۱۔ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِيَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ط (۲۲ : ۳۹-۴۰)

جن مسلمانوں سے قتال ہُوا، ان کو جنگ کی اجازت دی گئی ہے کیونکہ وہ مظلوم تھے اور خدا ان کی نصرت پر قدرت رکھتا ہے یہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے بلا کسی وجہ کے نکالے گئے ہیں صرف اس لیے کہ انھوں نے اللہ کو اپنا پروردگار مان لیا ہے اگر (یہ اجازت دے کر) بعض لوگوں دشمنوں کو بعض لوگوں (مسلمانوں کے ذریعہ سے روک نہ دیتا تب عیسائیوں کے گرجے یہودیوں کے معابد پارسیوں کے مندر مسلمانوں کی مسجدیں (جن میں خدا کا بہت نام لیا جاتا ہے) ضرور گرائی جاتیں۔

۲۔ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا۔ (۴ : ۷۵)

تم خدا کی راہ میں اور ضعیف مردوں اور عورتوں اور بچوں کے بچاؤ کے لیے کیوں جنگ نہیں کرتے، حالانکہ وُہ دُعائیں کر رہے ہیں کہ خدایا! ہم کو اس بستی سے نکال جہاں کے باشندے بڑے ظالم ہیں۔

ان احکام سے واضح ہے کہ اسلام میں جنگ کو اختیار کیا گیا ہے تو نہ ملک گیری کے لیے، نہ ہوس حکمرانی کے لیے بلکہ ضعیفوں، عورتوں، بچّوں کو ظالموں کے پنجہ سے رہائی دینے کے لیے جنگ کو اختیار کیا گیا تھا، نہ تلوار کا خوف دلا کر کلمۂ اسلام پڑھوانے کے لیے، بلکہ یہودیوں، عیسائیوں، ترساؤں کے معابد کو حفاظت و حمایت میں مثل مساجد لے کر ان سب کو انہدام سے بچانے کے لیے۔

کیا کسی اور مذہب کی پاک ترین کتاب سے بھی یہ بیان مل سکتا ہے کہ ادیان مختلفہ کے بچاؤ اور ان کی عبادت گاہوں کے قیام کے واسطے کسی قوم نے جنگ کی ہو، اگر نہیں اور ہم کو وثوق کے ساتھ یقین ہے کہ ہرگز نہیں۔ تو سب کو اقرار کرنا پڑے گا کہ یہ رحمۃ للعالمین ہی کی رحمتِ قلبی کا نتیجہ ہے کہ جنگ کا مقصد ایسا مقدس بنایا، جس سے آج دنیا کا کوئی مذہب انکار نہیں کر سکتا۔

ایسی ضروری جنگ کے لیے رحمۃ للعالمین یہ بھی ضروری ٹھہراتے ہیں کہ الٹی میٹم ایک لمبے وقت کا دیا جائے تاکہ اس عرصہ میں باہمی سمجھوتے کی ایسی صُورتیں نکل آئیں جس سے جنگ ٹل بھی جائے۔

قرآن مجید میں ہے: فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ۔ (۹ : ۲) یعنی تم کو چار ماہ کی مہلت ہے۔

جنگ کے لیے اتنی مہلت کا دیا جانا ہی رحمت ہے، لیکن جنگ شروع ہو جانے کے بعد مستثنیات کا خاص طور پر ذکر ہے:

۱۔ اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ۔ جو لوگ ایسی قوم سے تعلق رکھتے ہوں، جن سے تمھارا عہد ہے۔

ب۔ اَوْجَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْيُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ۔

یا وُہ جو حاضر ہو کر ظاہر کر دیں کہ وہ تم سے یا اپنی قوم سے جنگ کرنے میں رُک گئے۔

تو وہ جنگ سے مستثنیٰ ہوں گے۔ چنانچہ صاف لفظوں میں فرمایا :

فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا۔ (۹۰ : ۴)

پھر اگر یہ لوگ علٰحدہ ہو جائیں اور تم سے جنگ نہ کریں اور تم سے صلح کی درخواست کریں۔ تب خدا نے تم کو ان پر کوئی راہ نہیں دی۔

خیال کرو کہ یہ احکام کس طرح ظاہر کرتے ہیں کہ اس جنگ کا مقصد دین کو بجبر قبلوانے کا ہرگز نہیں۔

غور کرو کہ ایک معاہد قوم کا وجود بھی تم کو نظر آئے گا جو مسلمان نہیں، اگر مسلمان ہوتے تو اُن سے مسلمانوں کا تعلق (بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ) ہی کا نہ ہوتا، بلکہ وُہ تو (فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ) کے درجے ہوتے۔

پھر اس معاہد قوم کی بھی اتنی عزت ہے کہ اگر فریقِ جنگ میں سے کوئی شخص اس کے پاس چلا جائے تو وُہ بھی فریقِ جنگ کے حکم سے نکل جائے گا۔

پھر وہ شخص بھی جنگ سے مستثنیٰ ہو جائے گا، جو مسلمانوں سے یہ عہد کر لے کہ وہ نیوٹرل (غیر جانبدار) رہے گا، نہ مسلمانوں کا طرفدار ہوگا نہ اُن کے مخالفین کا۔ دیکھو اگر جنگ کی بنیاد مذہب کا بہ جبر قبلوانا ہوتا تو ان غیر مذاہب والوں کے لیے یہ ضوابط کبھی نہ ہوتے۔

ہاں! رحمۃ للعالمین وُہ ہے جو انسانوں کو اخلاقِ فاضلہ اور فضائلِ محمودہ اور محاسنِ جمیلہ اور صفاتِ کاملہ کی تعلیم دیتا ہے۔

ماں باپ کی بابت سکھایا :

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا۔ (۲۴ : ۱۷)

اُن کے لیے ذلت کے بازوؤں کو زمین پر بچھا دے اور دعا بھی کیا کر اے خدا! ان پر رحم کر جیسا کہ انھوں نے مجھے چھٹپنے سے پالا ہے۔

اس حکم میں فرمانبرداری اطاعت و خدمت گزاری کا بھی حکم دیا اور یہ بھی بتایا کہ ماں باپ کے لیے دعا کرنا بھی ضروری ہے کیونکہ جس طرح بچہ ماں باپ کی تربیت کا محتاج ہے اسی طرح ہر انسان خدا کے رحم کا محتاج ہے۔

قصور والوں کی معافی کے متعلق فرمایا گیا ہے :

وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ط اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ط (۲۲ : ۲۴)

چاہیے تم معافی دیا کرو اور درگزر کیا کرو، کیا تم یہ پسند نہیں کرتے ہو کہ خدا تم کو معاف کر دے۔

معافی دینا انسان کو ذرا مشکل اور شاق گزرتا ہے، اس لیے اسے سمجھایا گیا ہے کہ جب انسان معافی کا خدا سے خواستگار رہے تو کیا وجہ ہے کہ وُہ خود معافی دینے کو پسند نہیں کرتا، گویا یہ اصول بتایا، معاف کرو تم کو بھی معاف کیا جائے گا۔

زنا کی برائی کے متعلق بھی استدلال کا ایسا ہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے :

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَآءَ سَبِيْلًا ۔ (۱۷ : ۳۲) زنا کے قریب بھی نہ جاؤ، یہ تو بے حیائی ہے اور بُرا راستہ ہے۔

بُرے راستہ کے لفظ پر غور کرنا چاہیے۔

ایک عیاش مزاج شاید اپنی شوریدگی طبع کی حالت میں زنا کو کچھ معیوب نہ سمجھتا ہو، مگر اسے غور کرنا چاہیے کہ کسی کی بہو بیٹی کو اپنے بستر پر بلانا تو اسے ناگوار نہیں گزرتا، لیکن کیا اُسے یہ بھی ناگوار نہیں ہے کہ اس کی بہو بیٹی غیر کے بستر پر جائے، اس کی غیرت اسے پسند نہیں کرتی تو اسے سمجھ لینا چاہیے کہ یہ شخص خود اپنے طرزِ عمل سے ایسی ہی بُرائیوں کا رستہ بنا رہا ہے۔ یہ رستہ سب سے پہلے اُس کے گھر تک سیدھی سڑک بن جائے گا۔

رحمۃ للعالمین وُہ ہے، جس نے شراب اور جُوئے کی حرمت کا حکم تمام عالم کو سنایا، شراب کو رجس اور عملِ شیطان اور بنائے عداوت، سببِ بُغض و سرمایۂ غفلت اور ذریعۂ دُوری از خدا بتایا۔ یہ فیصلہ اس زمانہ کا ہے جب تمام دنیا شراب پر لٹو تھی جب بزرگوار پولوس کی ہدایت کے پابند سادہ پانی پینے کو معیوب سمجھتے تھے۔ جب ایران شراب کے پیالہ کو جامِ جم سمجھتا تھا۔ جب ہندوستان دیوتاؤں اور ٹھاکروں کے تقرب کے لیے اس کا استعمال ضروری سمجھتا تھا، جب بہت سے مراسم دینی و دنیوی کی تکمیل شراب کے بغیر نہیں ہو سکتی تھی۔ جب عرب کے کسی شاعر و زبان آور کا کلام اُس کی توصیف سے خالی نہ ہوتا تھا۔ اسلام کے اس حکم کا تیرہ سو برس تک دُنیا نے مقابلہ جاری رکھا، لیکن یورپ کی جنگِ عظیم (از ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) نے اس حکم کی اصلیت کو منکشف کر دیا۔

شاہِ برطانیہ جارج پنجم نے ترکِ مے نوشی میں اوّل قوم کو خود نمونہ بن کر دکھایا۔ پھر روس و انگلستان و فرانس میں ایک حد تک اس پر عمل کیا گیا۔ امریکہ نے شراب تیار نہ کرنے کا عزم ظاہر کیا۔ فی الواقع ترکِ شراب ایک رحمت ہے۔

اور جس وجودِ پاک نے سب سے پہلے دنیا کو اس مسئلہ کی ہدایت کی وہ رحمۃ للعالمین ہے۔ ایسے احکام قرآن مجید اور حدیث پاک سے سینکڑوں کی تعداد میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔

ناظرین غور سے معلوم کریں گے کہ ہم نے اس مضمون میں جن مسائل کا ذکر کیا ہے، یہ خالص ایسے مسائل ہیں کہ مسلم و غیر مسلم ہر دو مساوی طور پر اُن سے مستفید ہو سکتے ہیں، چنانچہ مستفید ہو رہے ہیں۔ ان مسائل کے ترک کر دینے کے بعد تمدن کے قیام اور شائستگی کے وجود کی بقا ہی نہیں رہ سکتی اس لیے دنیا کو ماننا پڑے گا کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فی الواقع رحمۃ للعالمین تھے۔

البتہ اہلِ اسلام کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو التفاتِ خاص ہے اور یہ لوگ اس آفتابِ حقیقت سے زیادہ تر منوّر ہونے کی سعی کیا کرتے ہیں۔ اس لیے رب العالمین نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت میں فرمایا ہے: بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۔

دیکھو رحمت کے ساتھ یہاں رافت کا اضافہ ہو گیا ہے۔

مبارک ہیں وُہ لوگ جو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحمت و رافت سے استفاضہ کرتے ہیں۔

اُردُو احادیث کے محاورے

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں

اللہ پاک کا بے حد شکر و احسان ہے کہ اُس نے انسان کو قوتِ گویائی عطا فرمائی اور اپنے کلام، نیز اپنے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کے ذریعے اُسے بات کرنے کا سلیقہ سکھایا۔ یعنی قرآن و حدیث کے بے شمار الفاظ اور محاورات نے عرب اور غیر عرب ملکوں میں فصاحت اور بلاغت کو چار چاند لگائے اور وہاں کے ادب کو صحیح معنی میں "ادب" بنایا۔

برصغیر پاک و ہند میں چوں کہ فارسی بولنے والوں میں ہماری اردو زیادہ رواج پذیر رہی ہے اس لیے اس زبان میں وہ عربی الفاظ و محاورات بھی داخل ہوئے جو فارسی میں رائج ہو چکے تھے اور وہ بھی شامل ہوئے جو عربی کے علماء اور فضلاء نے براہِ راست اپنی تقریر و تحریر کے ذریعے عام کیے۔ چنانچہ انھی بزرگوں کے قلم سے اردو میں ایسی کتابیں ہزاروں کی تعداد میں نکلی ہیں جن کا تعلق گو کہ دین سے نہیں ہے لیکن وہ دین سے بے تعلق بھی نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کتابوں میں عربی کے بکثرت اقوال، محاورات اور ضرب الامثال کی شکل میں درج ہیں چند مثالوں سے ان کی وضاحت ہو سکے گی۔

عربی کے بعض اقوال اور ضرب الامثال یہ ہیں جو فارسی میں بھی مستعمل ہیں۔ مثلاً:

۱۔ اَلْعِيَانُ لَا تَحْتَاجُ إِلَى الْبَيَانِ	عیاں را چہ بیان
۲۔ اَلدَّارُ ثُمَّ الْجَارُ	اول خویش بعدہٗ درویش
۳۔ اَلْبَلِيَّةُ إِذَا عَمَّتْ طَابَتْ	مرگِ انبوہ جشنے دارد
۴۔ إِذَا حَضَرَ الْمَاءُ بَطَلَ التَّيَمُّمُ	آب آمد تیمم برخاست۔
۵۔ إِنَّ اللَّبِيبَ مِنَ الْإِشَارَةِ يَفْهَمُ	عاقل را اشارہ کافی ست
۶۔ اَلْعَبْدُ يُدَبِّرُ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ	ما درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال
۷۔ اَلْقَلِيلُ يَدُلُّ عَلَى الْكَثِيرِ	مشتے نمونہ از خروارے
۸۔ اَلدَّرَاهِمُ بِالدَّرَاهِمِ تُكْتَسَبُ	کہ زر زر کشد در جہاں گنج گنج
۹۔ اَلْقُلُوْبُ تَشَاهَدُ	دل را بدل رہیست

لے قریب تین سال ہوئے اس موضوع پر مضمون لکھا تھا۔ ایک صاحب مجھ سے لے گئے اور ابھی بتایا کہ وہ ضائع ہو گیا۔ چنانچہ دوبارہ لکھا جا رہا ہے۔ اسی سلسلے کا ایک مضمون "اردو میں قرآنی محاورات" لکھا تھا جو پہلے نیا دور (کراچی ۶۲ء) میں شائع ہوا تھا۔ پھر بینات (کراچی۔ مارچ اپریل ۶۴ء) میں نقل ہوا۔

۱۰۔ اَلْمَرْءُ مَخْفِیٌّ تَحْتَ لِسَانِہٖ — تا مرد سخن نگفتہ باشد عیب و ہنرش نہفتہ باشد

لیکن عربی کے بہت سے اقوال ایسے بھی ہیں جو اُردو میں زیادہ رائج ہیں ۔ مثلاً :

۱۔ اَلْمَاضِیْ لَا یُذْکَرُ — گزشتہ را صلوات

۲۔ تَسْمَعُ بِالْمُعَیْدِیِّ خَیْرٌ مِّنْ اَنْ تَرَاہُ — دُور کے ڈھول سہانے

۳۔ رُبَّ صَلِفٍ تَحْتَ الرَّاعِدَۃِ — جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں

۴۔ سَاَلْتُہٗ عَنْ اَبِیْہِ فَقَالَ خَالِیْ شُعَیْبٌ — زمین کی سُننا ، آسمان کی کہنا

۵۔ صَفْصَفَۃٌ بِنَقْدٍ خَیْرٌ مِّنْ بَدْرَۃٍ بِوَعْدٍ — نو نقد ، نہ تیرہ ادھار

۶۔ عُوْدٌ یُعَلِّمُ الْفَتَحَ — مار کے آگے بھوت بھاگتا ہے

۷۔ فِی الْمَھْدِ یَنْطِقُ عَنْ نَّجَابَۃِ جَدِّہٖ — ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات

۸۔ کُلُّ کَلْبٍ بِبَابِہٖ نَبَّاحٌ — کُتّا اپنی گلی میں شیر ہوتا ہے

۹۔ لَا تُضِیْعُوا الْحِکْمَۃَ عِنْدَ غَیْرِ اَھْلِھَا — اندھے کے آگے روئے اپنی آنکھیں کھوئے

۱۰۔ ھٰذَا کَالنَّقْشِ الْحَجَرِ — یہ بات پتھر کی لکیر ہے

یہ ہیں عام عربی اقوال جو اردو میں بھی کسی نہ کسی شکل میں رائج ہیں ۔ اب ہم حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی وُہ احادیث نقل کرتے ہیں جو اُردو میں محاورات یا ضرب الامثال کی طرح بولی جاتی ہیں ،

۱۔ کُلُّ اَمْرٍ ذِیْ بَالٍ لَمْ یُبْدَءْ بِاسْمِ اللّٰہِ فَھُوَ الْاَبْتَرُ ——— جو بھی اہم کام اللہ پاک کے نام سے شروع نہ کیا جائے وُہ برکت سے محروم ہوتا ہے ۔

اس نام پاک کو اسی لیے ہر کام کی ابتدا میں ادا کیا جاتا ہے ۔

محسن کاکوروی کہتے ہیں :

کہیں جبریل اشارے سے کہ ہاں بسم اللہ
سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل

داغ کا مشہور شعر ہے :

جب کہا میں نے کہ لو مرتا ہُوں میں
بولے بسم اللہ ، اچھی بات ہے

سالک کہتے ہیں :

جو قصے کا ترے انجام ہے قیس
وُہ بسم اللہ ہے یاں داستاں کی

بسم اللہ سے دوسرے محاورات بھی بنائے گئے ہیں۔

۲۔ اَلْحَمْدُ رَأْسُ الشُّکْرِ مَا شَکَرَ اللّٰہَ عَبْدٌ لَا یَحْمَدُہٗ ــــــ حمد کرنا، شکر کی چوٹی ہے۔ اللہ کا شکر اُس بندے نے نہیں کیا جس نے اُس کی تعریف نہیں کی۔

الحمد للہ کہنے کی دوسری احادیث میں بھی ترغیب آئی ہے، اردو میں بہت مستعمل ہے۔

میر کا شعر ہے:

اب حال اپنا اُس کے ہے دل خواہ
کیا پُوچھتے ہو، الحمدُ للہ

وزیر لکھنوی کہتے ہیں:

ہُوا شاہِ دواوین نام بسم اللہ سے دیواں کا
سرِ دیوان پہ ہے الحمد للہ تاج قرآں کا

ذوق کا شعر ہے:

ہوا حمدِ خدا میں دِل جو مصروفِ رقم میرا
الف الحمد کا سا بن گیا گویا قلم میرا

۳۔ حُبُّكَ الشَّیْءَ یُعْمِیْ وَیُصِمُّ ــــــ کسی چیز کی محبت تجھے اندھا اور بہرہ بنا دیتی ہے۔

غالب نے اپنے انداز میں کہا ہے:

عشق نے غالب نکمّا کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

حالی نے ایک موقع پر مسدس میں اس طرح کہا ہے:

نہیں حق سے کچھ اس محبت کو بہرہ
کہ جو تم کو اندھا کرے اور بہرا

(ڈپٹی نذیر احمد نے بھی توبۃ النصوح کے پہلے باب میں یہ حدیث لکھی ہے)

حالی نے (قوم کی پاسداری) اسی طرح پھر کہا ہے:

ہیں محبت میں سب اندھے اپنی اپنی قوم کی
یہ وہ خصلت ہے کہ مجبور اس پہ ہے طبعِ بشر

۴۔ جُعِلَتْ قُرَّۃُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ ــــــ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔

قرۃ العین بہت عزیز چیز کو کہا جانے لگا (اولاد کو بھی)۔

مسرور کا شعر ہے :

آنکھیں جلتی ہیں تپِ فرقت سے
آ مری آنکھ کی ٹھنڈک آ جا

اقبال بھی کہتے ہیں :

وہ صاحبِ تحفۃ العراقین
اربابِ نظر کا قرۃ العین (ضربِ کلیم)

۵ ۔ اَلصَّلٰوۃُ عِمَادُ الدِّیْنِ (دعام الدین) ——— نماز ، دین کا ستون ہے ۔

ستون کا استعارہ اردو میں بھی آتا ہے ۔ منیر شکوہ آبادی کا شعر ہے :

سر پہ اٹھا لیا فلکِ بے ثبات کو
قدِ بشر ستون ہے قصرِ حیات کا

حالی نے مسدس میں کہا ہے :

ستون ، چشمِ بد دور ، ہیں آپ دیں کے
نمونہ ہیں خُلقِ رسولِ امیں کے

۶ ۔ اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْنَ ——— نماز ، مومنوں کی معراج ہے ۔

اردو میں معراج ، انتہائی ترقی کے لیے مستعمل ہے ۔ منیر شکوہ آبادی کہتے ہیں :

اے منجم ہے وہی شرم و حیا کی معراج
جس فلک پر ہے ہلالِ خمِ گردن اُن کا

اکبر الٰہ آبادی بھی کہتے ہیں :

پاتی ہیں قومیں تجارت سے عروج
بس یہی ان کے لیے معراج ہے

۷ ۔ لَا تَجُوْزُ صَلٰوۃٌ لَا یَقْرَاُ فِیْھَا بِفَاتِحَۃِ الْکِتَابِ ——— جس نماز میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی جائے وہ چل نہیں سکتی ۔

چلنا (درست ہونا) اردو میں بھی ہے ۔ اکبر الٰہ آبادی کا شعر ہے :

اُمیدِ حور میں مسلم تو ہو گیا ہوں مگر
خُدا ہی ہے کہ جو مجھ سے یہ ہتھکنڈا نہ چلے

۸ ۔ اُقْتُلُوا الْاَسْوَدَیْنِ فِی الصَّلٰوۃِ الْحَیَّۃَ وَالْعَقْرَبَ ——— مارو دو کالوں کو نماز میں ۔ وہ سانپ اور بچھو ہیں ۔

صرف کالا بھی اردو میں سانپ کے لیے مستعمل ہے ۔ ذوقؔ کہتے ہیں :

ڈسا ہو کالے نے جس کو کاذ تو وہ فسوں کے اثر سے کھیلے
دہان و گیسو کا تیرے مارا ، نہ مُنہ سے بولے ، نہ سر سے کھیلے

آتشؔ کہتے ہیں :

تریاق کا ہے جو ہر اس جسمِ سخت جاں میں
کالا بھی کاٹتا تو مجھ کو اثر نہ ہوتا

داغؔ کا شعر ہے :

گیسوؤں پر ہاتھ رکھ کر ناز سے کہتے ہیں وہ
سامری کو بھی تو ڈس جائیں یہ دو کالے مرے

۹ ۔ اذان دینے کے لیے دونوں ہاتھ کانوں تک لے جاتے ہیں ۔ کانوں پر ہاتھ رکھنا (پناہ مانگنا) محاورہ یہیں سے بنا ہوگا ۔ ذوقؔ کہتے ہیں :

الٰہی کان ہیں کیا اس صنم نے پھونک دیا
کہ ہاتھ رکھتے ہیں کانوں پہ سب اذاں کے لیے

داغؔ بھی کہتے ہیں :

وہ عرضِ وصل سے رکھتے ہیں ہاتھ کانوں پر
اثر یہ خوب تری طرزِ گفتگو نے کیا

یہ قرآنی محاورہ (و یجعلون اصابعھم فی اٰذانھم) سے قریب ہے ۔

۱۰ ۔ رفع یدین (جس میں ائمہ کا اختلاف ہے) اردو میں کسی چیز سے ہاتھ اٹھا لینا " (ترک کر دینا) کا ماخذ ہے ۔ ظفرؔ نے کئی جگہ استعمال کیا ہے :

۱ ۔ ہاتھ اٹھایا سینہ کاوی سے نہ میں نے عشق میں
اے جنوں جب تک نہ میرا ٹوٹ ہر ناخن گیا

۲ ۔ اٹھاؤ ہاتھ بس اب شیوۂ جفا سے ڈرو
کہ ظلم خوب نہیں اے بُتو خدا سے ڈرو

شبلیؔ کہتے ہیں :

تقلیدِ کہن سے ہاتھ اُٹھائیں
تہذیب کے دائرے میں آئیں

۱۱۔ سبّابہ۔ سب بمعنی گالی۔ اسلام سے پہلے عرب لوگ گالی دیتے وقت اُنگلی اُٹھاتے تھے (اسلام میں اشارۂ توحید کیلئے سبّابہ کو سبّاحہ کہا گیا)۔
اسی سے اُنگلی اٹھانا، مطلق اشارہ کرنے کے لیے بھی مستعمل ہے۔
داغ کہتے ہیں :

باغ میں گُل کھِلے جاتے ہیں کہ وُہ آتے ہیں
اُنگلیاں سرو اٹھاتے ہیں کہ وہ آتے ہیں

وزیر کا شعر ہے :

مشورت کچھ قاتلوں میں ہے ہمارے قتل کی
بے طرح اُٹھنے لگی ہیں جانبِ سر اُنگلیاں

اور رُسوائی کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ نذیر احمد لکھتے ہیں :
"ابن الوقت گھر لوٹ کر آیا تو ہر طرف سے انگلیاں اُٹھتی تھیں" (ابن الوقت صفحہ ۹۵)

۱۲۔ نماز ختم کرنے کے لیے سلام پھیرتے ہیں۔
تعلق ختم کرنے کے لیے بھی اُردو میں یہ محاورہ آتا ہے۔ داغ کا شعر ہے :

اے عشق رخصت اے ہوس و آرزو سلام
اپنا مقام آج سے دارِ بقا ہُوا

نذیر احمد لکھتے ہیں :
"سلام ہے ایسے دین کو کہ انسان اپنے آپ سے باہر ہو جائے اور دُنیا کے نیک و بد پر کچھ نظر نہ کرے۔"
(توبۃ النصوح ص ۱۱۹)

لفظ سلام سے اُردو میں اور محاورے بھی بنتے ہیں۔

۱۳۔ اَلدُّعَاءُ یَرُدُّ الْبَلَاءَ ——— دعا، بلا کو ٹالتی ہے۔
مولانا اشرف علی تھانویؒ لکھتے ہیں :
"دُعا، نازل شدہ بلا کو بھی نافع ہے اور اُس بلا کو بھی جو ابھی نازل نہیں ہُوئی ......" (دیباچۂ مناجاتِ مقبول)
"دُعا، ردِّ بلا" اردو میں عام طور پر بولا جاتا ہے۔ اِسی مضمون کو مومن نے اس طرح استعمال کیا ہے :

ایک دشمن کہ چرخ ہے، نہ رہے
تجھ سے یہ اے دعا، نہیں ہوتا

۱۴۔ قُلِ الْحَقَّ وَاِنْ کَانَ مُرًّا ——— سچ کہو اگرچہ وُہ تلخ ہو۔

اَلْحَقُّ مُرٌّ" بھی آتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی :
اِلصِّدْقُ یُنْجِیْ وَالْکِذْبُ یُھْلِکُ ــــــ سچ نجات دلاتا ہے اور جھوٹ تباہ کرتا ہے۔
مولانا حالی نے کلمۂ الحق نظم لکھی ہے جس کے چند اشعار یہ ہیں :

شئے کوئی تجھ سے کڑوی نہ ہوگی
حنظل میں ایسی تلخی نہ ہو گی
ہے ناگواری پہچان تیری
اَلْحَقُّ مُرٌّ ہے شان تیری
ہوتی ہے سچ سے جب سب کو نفرت
تو جھوٹ پروان کرتی ہے لعنت

اسمٰعیل میرٹھی کہتے ہیں :

(سچ اور جھوٹ)

سچ کہو گے تو دل رہے گا صاف
سچ سے ہو جائیں گے قصور معاف
ہے بُرا جھوٹ بولنے والا
آپ کرتا ہے اپنا مُنہ کالا

۱۵۔ مَثَلُ اَصْحَابِیْ فِیْ اُمَّتِیْ کَالْمِلْحِ فِی الطَّعَامِ ــــــ میرے اصحاب کی مثال میری اُمت میں ایسی ہے جیسے کھانے میں نمک۔ (بغیر نمک کے کھانے میں لذت نہیں ہوتی)
سالک کا شعر ہے :

ہزار حصہ بڑھی لذتِ ستم اُن کی
رہا گلہ بھی تو کالملح فی الطعام رہا

۱۶۔ لَمْ یُحْرَمْ مَنْ فُصِدَ لَہٗ ــــــ جس کا کچھ تھوڑا سا بھی مطلب پُورا ہوگیا تو وہ محروم نہیں۔
اسی طرح کی ایک اور حدیث ہے :
اَلْمَاشُ خَیْرٌ مِّنْ لَاشٍ ــــــ گھر کا کچھ بھی سامان ہو، گو کم قیمت سہی، کچھ نہ ہونے سے بہتر ہے۔
اردو میں کئی طرح سے بولتے ہیں۔ مثلاً :
ہونا، نہ ہونے سے بہتر ہے۔ زیادہ نہیں تو تھوڑا سہی۔ کچھ نہیں تو اتنا ہی سہی۔
جیسے غالب کا شعر ہے : قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

فارسی میں کہتے ہیں:

از خرس موئے بس است

انگریزی میں بھی بولتے ہیں:

"Some thing is better than nothing."

"بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہی سہی" ایک اردو کہاوت بھی ہے۔

۱۷۔ لَیسَ الغِنیٰ عَن کَثرَةِ العَرَضِ اِنَّمَا الغِنیٰ غِنَی النَّفسِ ــــــ تونگری، مال کی زیادتی کا نام نہیں بلکہ تونگری دل کی تونگری ہے۔

حضرت سعدیؒ کا مشہور مقولہ ہے:

"تونگری بہ دل است نہ بہ مال و بزرگی بہ عقل است نہ بہ سال"

۱۸۔ ایک اور حدیث ہے:

خَیرُ الغِنیٰ غِنَی النَّفسِ ــــــ بہترین غنیٰ نفس کا غنیٰ ہے۔

درد کہتے ہیں:

ہمت رفیق ہووے تو فقیر سلطنت ہے
آتا ہے ہاتھ یعنی یاں تخت دل کے ہاتھوں

رشک کا شعر ہے:

لازم یہ ہے سوال کو سمجھو سوالِ قبر
ساماں میں فقیر رہو، دل غنی رہے

یوں بھی ایک حدیث آتی ہے:

۱۹۔ اٰفَةُ الدِّینِ الھَوٰی ــــــ دین کی آفت ہوا وہوس ہے۔

حضرت سعدیؒ کہتے ہیں:

ع آنانکہ غنی تراند محتاج تراند

ذوق کا شعر ہے:

حرص کے پھیلتے ہیں پاؤں بقدرِ وسعت
تنگ ہی رہتے ہیں دنیا میں فراغت والے

۲۰۔ اِذَا اَرَادَ اللهُ تَعَالیٰ اِنفَاذَ قَضَآئِهٖ وَقَدَرِهٖ سَلَبَ ذَوَا العُقُولِ عُقُولَھُم حَتّٰی یَنفُذَ فِیھِم قَضَآءُهٗ وَقَدَرُهٗ ــــــ جب اللہ تعالیٰ اپنی قضا و قدر کو نافذ کرنا چاہتا ہے تو عقلمندوں کی عقل کو سلب کر لیتا ہے حتیٰ کہ

ان میں اُس کی قضا و قدر نفوذ کر جاتی ہے۔
حضرت سعدیؒ کہتے ہیں : ع

چوں قضا آید طبیب ابلہ شود

امیر خسروؒ کا شعر ہے :

از سرِ بالینِ من برخیز اے نادان طبیب
دردمندِ عشق را دارو بجز دیدار نیست

میر نے اس شعر کا ترجمہ اس طرح کیا ہے :

بس طبیب اُٹھ جا میری بالیں سے، مت دے دردِ سر
کام یاں آخر ہُوا، اب فائدہ تدبیر کا

۲۱۔ مَنْ اَبْطَأَ بِهٖ عَمَلُهٗ لَمْ يُسْرِعْ بِهٖ نَسَبُهٗ ——— جس کا عمل کسی کو پیچھے رکھے تو اُس کا نسب آگے نہیں بڑھائے گا۔
اقبال کہتے ہیں :

عمل سے زندگی بنتی ہے، جنّت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

۲۲۔ مِلَاكُ الْعَمَلِ خَوَاتِمُهٗ ——— عمل کا حساب اس کے نتائج پر ہے۔
۲۳۔ اس طرح بھی ہے :
اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالْخَوَاتِيْمِ ——— وہی عمل معتبر ہے جس کا خاتمہ بخیر ہو۔
جیسی کرنی ویسی بھرنی، کیے کا پھل پانا وغیرہ محاورات ہیں۔
نوح ناروی کہتے ہیں :

خرّمی مفقود، عشرت گُم، مسرت دُور ہے
جیسی کرنی ویسی بھرنی، یہ مثل مشہور ہے

۲۴۔ ایک اور حدیث ہے :
يُبْعَثُ عَلٰى نِيَّاتِهِمْ ——— ہر شخص کا حشر اپنی نیّت کے مطابق ہوگا۔
یہ حدیث بھی مذکورہ بالا احادیث سے مطابقت رکھتی ہے۔
۲۵۔ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ ——— جیسی نیّت ہو گی ویسا عمل ہوگا۔
بیان میرٹھی کا شعر ہے :

تھی نزاعِ مصلحت آمیز پر رنجش فضول
انما الاعمال بالنیات ہے قولِ رسولؐ

۲۶ - اِذَا لَمْ تَسْتَحْیِ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ ——— جب تجھے حیا نہیں آتی تو جو تیرے جی میں آئے کر۔
اردو میں بولتے ہیں کہ "اُتر گئی لوئی پھر کیا کرے گا کوئی"
یُوں بھی بولتے ہیں کہ "مُنہ کی گئی جو لوئی تو کیا کرے گا کوئی"
میر کا شعر ہے؛

آتی ہے شمع شب کو آگے ترے یہ کہہ کر
مُنہ کی گئی جو لوئی تو کیا کرے گا کوئی

۲۷ - اِنَّ الدِّیْنَ النَّصِیْحَۃُ لِلّٰہِ وَ لِرَسُوْلِہٖ وَ لِکِتَابِہٖ وَ لِاَئِمَّۃِ الْمُسْلِمِیْنَ وَ عَامَّتِھِمْ ——— بے شک دین، نصیحت ہے اللہ کے لیے اور اس کے رسولؐ کے لیے اور اس کی کتاب کے لیے اور مسلمانوں کے حاکموں کیلئے (جب تک وہ شریعت پر چلتے ہوں) اور عام مسلمانوں کے لیے (اُن کے دین اور دنیا کی اصلاح کی فکر کرنا)۔
حالی نے اپنی نظم "فلسفۂ ترقی" میں کہا ہے؛

دین کہتے ہیں جسے وہ خیر خواہی کا ہے نام
ہے مسلمانو! یہ ارشادِ رسولؐ انس و جاں

۲۸ - اَلشَّبَابُ شُعْبَۃٌ مِّنَ الْجُنُوْنِ ——— جوانی، جنون کا ایک شعبہ ہے۔
جوانی دیوانی مشہور ہے۔ حضرت سعدیؒ نے بھی فرمایا ہے کہ:
"در ایامِ جوانی چنانکہ افتد دانی"
قدر کا شعر ہے؛

سچ یہ کہتے ہیں کہ دیوانی جوانی ہوتی ہے
آپ نے دل لے کے مجھ سے جانِ من کیا کر دیا

ریاض خیر آبادیؒ کہتے ہیں؛

ایسی دیوانی جوانی کہ یہ کہنی آئی
لے مبارک ہو تجھے چاک گریباں ہونا

۲۹ - اَلسَّفَرُ قِطْعَۃٌ مِّنَ الْعَذَابِ ——— سفر سقر ہے۔
فسانۂ عجائب میں ہے کہ "سفر اور سقر کی صورت ایک ہے اس سے بچنا نیک ہے...." (نوتے کا بیان)

۳۰ - کُلُّ وَدُوْدٍ اِذَا غَضِبَتْ اَوْ اُوْسِیَ اِلَیْھَا قَالَتْ ھٰذِہٖ یَدِیْ فِیْ یَدِكَ لَا اَکْتَحِلُ بِغَمْضٍ حَتّٰی

تَرْضٰی ——— (جنتی عورتوں کے متعلق فرمایا کہ) ہر ایسی محبت کرنے والی بیوی جب تمہیں غصہ آئے یا اُسے رنج پہنچایا جائے تو وُہ کہہ دے کہ یہ میرا ہاتھ تیرے ہاتھ میں ہے۔ میں اس وقت تک نہیں سوؤں گی جب تک آپ راضی نہ ہوں۔

ہاتھ میں ہاتھ دینا' محاورہ ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد لکھتے ہیں کہ "بے جانے بُوجھے، زندگی بھر کے لیے کسی کے ہاتھ میں ہاتھ دے دینا تو اندھیرے کا نشانہ ہے (ایامیٰ)۔

شوق کا شعر ہے:

میں کہاں ہُوں جو ساتھ دوں تیرا
ہاتھ میں اپنے ہاتھ دُوں تیرا

۳۱۔ رُفِعَ الْقَلَمُ عَنِ النَّائِمِ وَالصَّبِیِّ وَالْمَعْتُوْهِ ——— سونے والے اور بچّے اور مجنوں سے قلم اُٹھا لیا گیا (یعنی وُہ مکلّف نہیں ہیں)۔

درد کہتے ہیں:

مشابہ کوئی ان آنکھوں سے کم ہے
یہ نرگس ہے سو مرفوع القلم ہے

رشک کا شعر ہے:

ہوں وہ سودائی کہ لکھواؤں گا جس سے خطِ شوق
منتشر کیسا کہ مرفوع القلم ہو جائے گا

۳۲۔ جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا هُوَ كَائِنٌ ——— قلم خشک ہو چکا ہے اُس کے متعلق جو ہونے والا ہے۔

مومن کا شعر ہے:

غلط کہ صانع کو ہو گوارا خراشِ انگشتہائے نازک
جوابِ خط کی اُمید رکھتے جو قولِ جفّ القلم نہ ہوتا

۳۳۔ اَهْلُ الْجَنَّةِ بُلْهٌ ——— اہلِ جنت بھولے ہوتے ہیں۔
(بھولے لوگ جنتی کہلائے جاتے ہیں)

رومیؒ کہتے ہیں:

اکثر اہل الجنۃ البلہ اے پسر
بہرِ ایں گفتہ ست سلطان البشرؐ

ذوق کا شعر ہے:

آخر دیکھا تو العلم حجاب الاکبر
عاقبت پایا تو یاں بُلہ کو اہل جنت

۳۴ - تَجِدُوْنَ شَرَّ النَّاسِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ذَا الْوَجْهَيْنِ الَّذِيْ يَأْتِيْ هٰؤُلَاءِ بِوَجْهٍ وَ هٰؤُلَاءِ بِوَجْهٍ۔
تم قیامت کے دن بدترین آدمی دو رُخے کو پاؤ گے جو اُن کے پاس ایک مُنہ سے آتا ہے اور دُوسرے کے پاس دُوسرے مُنہ سے۔

اُردو میں بھی دو رُو، دو رُخا وغیرہ محاورے آتے ہیں۔
شعور کا شعر ہے:

ظُلمتِ کفر ہو زائل شرفِ ایماں سے
نورِ وحدت سے دو رُو جامۂ یک رو ہو جائے

۳۵ - مَنْ طَلَبَ الدُّنْيَا حلالاً استعفافا عن المسئلة و سعياً على اهله و تعطفاً على جاره لقى الله تعالىٰ يوم القيامة و وجهه مثل القمر ليلة البدر ——— جو شخص جائز ذریعے سے دنیا اس لیے کمائے کہ بھیک مانگنے سے بچے اور بال بچوں کے لیے کوشش کرے اور اپنے ہمسایوں پر مہربانی کرے، ایسا شخص قیامت کے دن خدا سے ملے گا اور اس کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن ہوگا۔

حالی نے اس حدیث کو اس طرح پیش کیا ہے:

غریبوں کو محنت کی رغبت دلائی — کہ بازو سے اپنے کرو تم کمائی
خبر تاکہ اس سے ہو اپنی پرائی — نہ کرنی پڑے تم کو در در گدائی
طلب سے ہے دنیا کی گریاں یہ نیت
تو چمکو گے واں ماہِ کامل کی صورت

۳۶ - اِغْتَنِمْ خَمْسًا قَبْلَ خَمْسٍ - شَبَابَكَ قَبْلَ هَرَمِكَ - صِحَّتَكَ قَبْلَ سُقْمِكَ - وَغِنَاءَكَ قَبْلَ فَقْرِكَ وَ فَرَاغَكَ قَبْلَ شُغْلِكَ وَحَيَاتَكَ قَبْلَ مَوْتِكَ ——— پانچ چیزوں کو پانچ سے پہلے غنیمت جان: تیرے بڑھاپے سے پہلے جوانی، بیماری سے پہلے صحت، محتاجی سے پہلے مال داری، مشاغل سے پہلے فراغت اور موت سے پہلے زندگی۔

حالی نے مسدس میں لکھا ہے:

غنیمت ہے صحت علالت سے پہلے — فراغت مشاغل کی کثرت سے پہلے
جوانی بڑھاپے کی زحمت سے پہلے — اقامت مسافر کی رحلت سے پہلے
فقیری سے پہلے غنیمت ہے دولت
جو کرنا ہے کر لو کہ تھوڑی ہے مہلت

۳۷۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَرْفَعُ شَیْئًا مِّنَ الدُّنْیَا اِلَّا وَضَعَہٗ ——— بے شک اللہ پاک اس دنیا کی کسی چیز کو بلند نہیں کرتا مگر اس کو پست کر دیتا ہے۔

ہر کمالے را زوالے۔

ظفر کہتے ہیں :

ہوتا ہے چودھویں کو ہمیشہ خسوفِ ماہ
جو دن کمال کا ہے وہی ہے زوال کا

دُوسرے شعرائنے اپنے اپنے انداز میں لکھا ہے۔ ناسخ کہتے ہیں :

دو روز ایک وضع پہ رنگِ جہاں نہیں
وہ کونسا چمن ہے کہ جس کو خزاں نہیں

شاہ نصیر کا شعر ہے :

نصیر یادِ جوانی عبث ہے پیری میں
کہ ایک رنگ پہ رہتا نہیں جہاں کا رنگ

۳۸۔ کُنْ فِی الدُّنْیَا کَاَنَّکَ غَرِیْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِیْلٍ ——— دنیا میں ایسا رہ جیسے تو ایک مسافر ہے یا راستہ گزرنے والا۔

انشا کا مشہور شعر ہے :

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

اسی مضمون کو رند نے یُوں پیش کیا ہے :

ہمراہی کمر باندھ کے راہی ہوئے یاں سے
آگاہ کرو جلد مرے ہمسفروں کو

ایک اور حدیث ہے :

۳۹۔ کُوْنُوْا فِی الدُّنْیَا اَضْیَافًا ——— دنیا میں مہمان کی طرح رہو۔

اسیر لکھنوی کا شعر ہے :

ہوں رہروِ عدم مجھے دنیا سے کام کیا
دو روز دیکھنے کو یہ میلا، ٹھہر گیا

حالی کہتے ہیں :

دنیا عجب سرائے فانی دیکھی ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی
جو آکے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا جو جاکے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

خلیل لکھنوی کا شعر ہے:

مسافر رہِ نا آشنائے منزل ہیں
مثالِ ریگِ رواں جائیں گے کہاں، دیکھیں

فانی کہتے ہیں:

مہمان جہاں تھے ایک شب کے
شام آئے تھے اور سحر گئے ہم

امیر مینائی بھی کہتے ہیں:

کوئی آتا ہے عدم سے تو کوئی جاتا ہے
سخت دونوں میں خدا جانے سفر کس کا ہے

۴۰۔ مَنِ انْقَطَعَ اِلَى الدُّنْيَا وَكَلَهُ اللّٰهُ اِلَيْهَا ـــــــ جو شخص دنیا کی طرف ہمہ تن مائل ہوگا اللہ پاک اُس کو اُسی کا کر دے گا۔

ولی کہتے ہیں:

نہ پاوے دین کی لذّت جسے دنیا کی ہے خواہش
قُفل ہے لذّتِ دنیا، حقیقت کے خزانے کا

ذوق کا شعر ہے:

مُنہ سے بس کرتے نہ ہرگز یہ خدا کے بندے
گر حریصوں کو خدا ساری خدائی دیتا

ایک حدیث یہ بھی ہے:

۴۱۔ حُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيْئَةٍ ـــــــ دنیا کی محبت تمام خطاؤں کی چوٹی ہے۔

ذوق کہتے ہیں:

سب کو دُنیا کی ہوس خوار لیے پھرتی ہے
کون پھرتا ہے یہ مردار لیے پھرتی ہے

ایک اور حدیث ہے:

۴۲ - اَلدُّنْیَا جِیْفَۃٌ وَّ طَالِبُھَا کِلَابٌ ——— دُنیا مردار ہے اور اس کا طالب کُتّا ہے۔

رِند کہتے ہیں:

غذار ہے سگِ دُنیا کی جیفۂ دُنیا
مجھے تو تیسرے فاقے بھی یہ حلال نہیں

۴۳ - اَلدُّنْیَا مَزْرَعُ الْاٰخِرَۃِ ——— دُنیا آخرت کی کھیتی ہے۔

میر حسن نے اپنی مثنوی سحرالبیان میں کہا ہے:

یہ دنیا جو ہے مزرعِ آخرت
فقیری میں ضائع کرو اس کو مت

۴۴ - مَصِیْرُکُمْ اِلٰی اَرْبَعَۃِ اَذْرُعٍ ——— تم کو آخر کار چار ہاتھ بھر جگہ (قبر) میں جانا ضرور ہے۔

شعور کہتے ہیں:

ہو نہ محتاجِ کفن مقدور یاں اتنا تو ہو
لیجیے دو گز زمین اے آسماں اتنا تو ہو

بہادر شاہ ظفر کا شعر ہے:

کتنا ہے بد نصیب ظفر، دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوے یار میں

ناسخ بھی کہتے ہیں:

کل ہی اِک دو گز زمیں رہنے کو بعد از قبضِ روح
آج گو قبضے میں سارا ربعِ مسکوں ہو گیا

۴۵ - اَلْمَرْءُ عَلٰی دِیْنِ خَلِیْلِہٖ ——— آدمی اپنے دوست کے طریقے پر ہوتا ہے۔

یعنی:-

کند ہم جنس با ہم جنس پرواز
کبوتر با کبوتر، باز با باز

رشک کا شعر ہے:

باغِ سخنوری میں ہوں وہ مُرغِ خوش بیاں
عنقا ہوئی ہے جنس مرے ہم صفیر کی

ایک دوہا مشہور ہے:

اُتم سے اُتم ملے اور ملے نیچ سے نیچ
پانی سے پانی ملے اور ملے کیچ سے کیچ

شبلی نے قریش کے ایک واقعے کو اس طرح نظم کیا ہے:

جنگِ ناجنس سے معذور رہیں ہم آلِ قریش
بھیج اُن کو جو ہیں رُتبے میں ہمارے ہم سر

۴۶۔ لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ اِلَّا اِلٰی ثَلٰثَۃِ مَسَاجِدَ ——— کجاوے نہ باندھے جائیں (سفر نہ کیا جائے) مگر تین مسجدوں کی طرف (برائے تقرب و ثواب)۔

انیس کہتے ہیں:

ہودج بھی کَسے جاتے ہیں محمل بھی ہیں تیار
چلّاتے ہیں دربان کوئی آئے نہ خبردار

مولانا احسن مارہروی کا شعر ہے:

جتنی ہوتی ہے طویل العمر ہوتی ہے قوی
ہے عروجِ ارتقا اس کے لیے شدِّ رحال (رمادرِ گیتی)

۴۷۔ خَیْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُھَا ——— بہتر کام وُہ ہیں جو متوسط ہوں (نہ ان میں افراط ہو نہ تفریط)۔

سحر لکھنوی کا شعر ہے:

خیر الامور اوسطھا پر عمل کیا
رکھا قدم جو راہِ توسط کے درمیاں

منیر شکوہ آبادی کہتے ہیں:

شاگردِ حضرتِ علی اوسط ہو اے منیر
خیر الامور اوسطھا پر نظر رہے

۴۸۔ لَیْسَ الْخَبَرُ کَالْمُعَایَنَۃِ ——— سُنی ہوئی بات آنکھوں دیکھی جیسی نہیں ہوتی۔

میر تقی میر کہتے ہیں:

تجھ سے یُوسف کو کیوں کہ دیں نسبت
کب شنیدہ ہو دیدہ کی مانند
ع شنیدہ کے بُوَد مانندِ دیدہ

رند بھی کہتے ہیں:

ستم کرتا ہے چرخِ سفلہ پرور، اہلِ غیرت پر
جو کانوں سے نہ سُنتے تھے وُہ آنکھوں سے دکھاتا ہے

۴۹ - اَلْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِّنَ الْيَدِ السُّفْلٰى ——— اُوپر کا ہاتھ (دینے والا) نیچے کے ہاتھ (لینے والے) سے بہتر ہے۔

ہاتھ اونچا ہونا، ہاتھ اُونچا کرنا، سخاوت کے لیے مستعمل ہے۔

منیر کا شعر ہے:

عیدِ اضحٰی مرے نوّاب کی سرکار میں ہے
دستِ زر بخش اُٹھا ہے گہر افشانی کو

ایک اور حدیث ہے:

۵۰ - اَسْرَعُكُنَّ لَحَاقًا بِیْ اَطْوَلُكُنَّ يَدًا ——— (حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج سے فرمایا کہ تم میں سے میرے ساتھ جلد تر ملنے والی وُہ بی بی ہے جس کا ہاتھ زیادہ لمبا (سخی) ہے۔ حضرت زینبؓ بنت جحش کا ہاتھ سخاوت میں سب سے بڑھا ہُوا تھا، اس لیے وُہ سب سے پہلے فوت ہُوئیں حالانکہ ہاتھ کی لمبائی حضرت سودہؓ کی سب سے زیادہ تھی) ہاتھ کھلا ہونا بھی محاورہ ہے۔

یدِطولیٰ ہونا یعنی کمال اور مہارت حاصل ہونا کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ سخاوت کے معنی میں ہندی میں بھی آتا ہے:

تُلسی داس غریب کی کوئی نہ پُوچھے بات
مایہ کو مایہ ملے لمبے کر کر ہات

۵۱ - اَلْمُؤَذِّنُوْنَ اَطْوَلُ النَّاسِ اَعْنَاقًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ ——— اذان دینے والے لمبے ہوں گے لوگوں سے گردن میں، قیامت کے دن۔

اونچی گردن، بلندگردن (ممتاز اور معزز) ہونا اردو میں بھی مستعمل ہے اور فارسی میں بھی۔ جیسے حضرت سعدیؒ کہتے ہیں: ع

گردنِ بے طمع بلند شود

علامہ اقبالؒ نے ساقی نامہ (بالِ جبریل) میں کہا ہے:

وہی ناں ہے اس کے لیے ارجمند
رہے جس سے دنیا میں گردن بلند

۵۲ - اَلْجَنَّةُ تَحْتَ اَقْدَامِ الْاُمَّهَاتِ ——— جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔

دبیر کا مشہور مصرع ہے:

زیرِ قدمِ والدہ، فردوسِ بریں ہے

اور یہ مصرع انیس سے منسوب ہے:

ع کہتے ہیں ماں کے پاؤں کے نیچے بہشت ہے

مولانا احسن مارہروی کا شعر ہے:

سچ ہے یہ ارشاد، زیرِ پائے مادر ہے بہشت
منحرف جو ماں سے ہو اچھی نہیں اُس کی سرشت (مادرِ گیتی)

۵۳۔ مَنْ اَصَابَ مَالاً مِّنْ نَهَاوِشٍ اَذْهَبَهُ اللّٰهُ فِيْ نَهَابِرِ —— جس نے ظلم کا مال پایا تو اللہ پاک اس کو بربادیوں میں تلف کر دے گا۔

مالِ حرام بود بجای حرام رفت

آتش کہتے ہیں:

مضموں کا چور ہوتا ہے رُسوا جہان میں
چکھی خراب کرتی ہے مالِ حرام کی

۵۴۔ مَا لَا عَيْنٌ رَاَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ —— کسی آنکھ نے نہیں دیکھا اور نہ کسی کان نے سُنا۔

محسن کاکوروی کہتے ہیں:

آنکھوں سے لکھوں صفت وُہ آنکھیں
ما لا عَیْنٌ رَاَتْ وہ آنکھیں

دوسرے شعرا نے بھی محبوب کے "سراپا" کے لیے یہ مضمون لیا ہے۔

محسن کاکوروی کا ایک اور شعر نعت میں اس طرح ہے:

صفحۂ خدِ مبارک پہ الف بینی ہے
دیکھنا عارضِ انور کا خدا بینی ہے

اس شعر کا مضمون اس حدیث سے ماخوذ ہے:

مَنْ رَاٰنِیْ فَقَدْ رَاَی الْحَقَّ —— جس نے مجھے دیکھا البتہ اس نے حق کو دیکھا۔

سودا کا شعر ہے:

حدیث من رانی دال ہے اس گفتگو اوپر
کہ دیکھا جس نے اُس کو اُس نے دیکھی شکلِ یزدانی

مولانا احمد رضا خاں کہتے ہیں:

کھلے کیا رازِ محبوب و محب مستانِ غفلت پر — شراب قد رای الحق زیبِ جامِ من رانی ہے

۵۵ - مَنْ كَفَّ لِسَانَهٗ عَنْ اَعْرَاضِ النَّاسِ اَقَالَ اللّٰهُ عَثْرَتَهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ——— جو شخص اپنی زبان کو لوگوں کی آبرو ریزی سے روکے گا تو خدا بھی قیامت کے دن اس کی لغزشوں کو معاف کر دے گا۔

ایک اور حدیث ہے:

۵۶ - اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ يَدِهٖ وَلِسَانِهٖ ——— مسلمان وُہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں۔

ایک حدیث یہ بھی ہے:

۵۷ - لَا تَخْرِقَنَّ عَلٰى اَحَدٍ سِتْرًا ——— تم کسی کی پردہ دری نہ کرو۔

پردہ دری اور پردہ داری کے بہت سے محاورات استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً:

مومن کا شعر ہے:

تیرے پروے نے کی یہ پردہ دری
تیرے چھپتے ہی کچھ چھپا نہ رہا

درد کہتے ہیں:

دل تنگ ہے یہ غنچۂ دل، مُنہ نہ کھُلانا
جُوں نکہتِ گل اس میں تری پردہ دری ہے

غالب کہتے ہیں:

بے خودی بے سبب نہیں غالب
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

اصغر گونڈوی کا شعر ہے:

کہہ کے کچھ لالہ و گُل رکھ لیا پردہ میں نے
مجھ سے دیکھا نہ گیا حُسن کا رُسوا ہونا

۵۸ - اَلْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهٗ ——— عقلمند وُہ ہے جس نے اپنے نفس کو مطیع بنایا۔

ع ہُوا جب نفس تابع، مطلب دل ہو گیا حاصل (امیرؔ)

ایک اور حدیث ہے:

۵۹ - اِنَّمَا الشَّدِيْدُ الَّذِىْ يَمْلِكُ نَفْسَهٗ عِنْدَ الْغَضَبِ ——— بہادر وُہ ہے جو غصّے کے وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔

ذوقؔ کہتے ہیں:

جو مارے نفس کو اور کرلے اپنے غصّے کو زیر
بنائے سانپ کا کوڑا وہ شیر پر چڑھ کر

ذوقؔ کا ایک اور شعر (نفسِ امّارہ کے متعلق) ہے:

بڑے موذی کو مارا نفسِ امّارہ کو گر مارا
نہنگ و اژدہا و شیرِ نر مارا تو کیا مارا

تسلیمؔ بھی کہتے ہیں:

مار ڈالا ہم کو اس کم بخت نے
نفسِ امّارہ مگر مرتا نہیں

نفس کو مارنا اور غصّہ پی جانا اردو میں عام ہے۔ داغؔ کہتے ہیں:

اُس نے غیروں کو پلائی بزم میں
رشک سے ہم غصّہ پی کر رہ گئے

۶۰۔ يَعْرِفُ الْفَضْلَ لِاَهْلِ الْفَضْلِ ذُو الْفَضْلِ ——— اہلِ فضل کے درجے کو اہلِ فضل ہی جانتے ہیں۔

ع قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند جوہری

ذوقؔ کا شعر ہے:

گُہر کو جوہری، صرّاف زر کو دیکھتے ہیں
بشر کے دیکھنے والے بشر کو دیکھتے ہیں

۶۱۔ مَنْ كَثُرَ كَلَامُهٗ كَثُرَ سَقَطُهٗ ——— جس کی باتیں زیادہ ہوں گی اس کی غلطیاں زیادہ ہوں گی۔

ایک اور حدیث ہے:

مَنْ صَمَتَ نَجَا ——— جو چُپ رہا اس نے نجات پائی۔

ولیؔ کہتے ہیں:

ہمیشہ لشکرِ آفات سوں رہے محفوظ
نصیب جس کو ہُوا ہے حصارِ خاموشی

مقولہ ہے کہ ایک چُپ لاکھ بلا کو ٹالتی ہے۔ (مولانا حالیؔ کی ایک نظم "چُپ کی داد" عورتوں کی بے زبانی کے سلسلے میں ہے)

عربی کا ایک قول یہ بھی ہے:

اَلْمَرْءُ مَخْفِيٌّ تَحْتَ لِسَانِهٖ۔

اور حضرت سعدیؒ کا مشہور شعر ہے:

تا مرد سخن نگفتہ باشد
عیب و ہنرش نہفتہ باشد

۶۲۔ مَنْ یَدُمْ قَرْعَ الْبَابِ یُوْشَكُ اَنْ یُّفْتَحَ لَهٗ ——— جو دروازہ کھٹکھٹاتا رہے گا ضرور اس کے لیے دروازہ کھولا جائے گا۔

مسدس حالی میں ہے:

وہ بھولے ہوئے ہیں یہ عادت خدا کی
کہ حرکت میں ہوتی ہے برکت خدا کی

اقبال کا فلسفۂ "عشق" بھی یہی ہے۔ ایک ہی شعر ملاحظہ ہو:

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود (ساقی نامہ)

اصغر گونڈوی اپنے انداز میں کہتے ہیں:

وہ موت ہے کہ کہتے ہیں جس کو سکون سب
وہ عین زندگی ہے جو ہے اضطراب میں

شیفتہ بھی کہتے ہیں:

جو جان کھو کے پائیں وہ فوزِ عظیم ہے
وہ چیز ڈھونڈتے ہیں تن آسانیوں میں ہم

۶۳۔ کَادَ الْفَقْرُ اَنْ یَّکُوْنَ کُفْرًا ——— بہت ممکن ہے کہ محتاجی کفر ہو جائے۔

ولی کہتے ہیں:

مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے

سرسید نے ایک جگہ لوگوں کا حال اس طرح لکھا ہے کہ "پیٹ ایسی چیز ہے کہ دین رہے یا جاوے، خدا ملے یا نہ ملے اس کو بھرنا چاہیے۔" (تہذیب الاخلاق صفحہ ۱۵۲۔ لاہور ۱۳۱۲ھ)

نظیر اکبر آبادی کی نظم "مفلسی" کے ایک بند کا شعر ہے:

جو اہلِ فضل عالم و فاضل کہاتے ہیں
مفلس ہوئے تو کلمہ تک بھول جاتے ہیں

ایک اور حدیث ہے:

اَلْبَطَالَۃُ تُقْسِي الْقَلْبَ ——— بے کاری، دل کو سخت بنا دیتی ہے یعنی بے حس اور مردہ۔

ع پراگندہ روزی پراگندہ دل

۶۴ - اِنَّ لِرَبِّكُمْ فِي اَيَّامِ دَهْرِكُمْ نَفَحَاتٍ اَلَا فَتَعَرَّضُوْا لَهَا ——— بے شک تمھارے زمانے کے ایام میں تمھارے رب کی خوشبوئیں پھیلی ہوئی ہیں، سو اُن کو لیتے رہو۔

حالی نے اسی حدیث سے حمد کی ایک غزل میں یہ شعر تیار کیا ہے:

آفاق میں پھیلے گی کب تک نہ مہک تیری
گھر گھر لیے پھرتی ہے پیغام صبا تیرا

۶۵ - مَا امْتَلَأَتْ دَارٌ حَبْرَةً اِلَّا امْتَلَأَتْ عَبْرَةً ——— کوئی گھر خوشی سے نہیں بھرتا لیکن بالآخر وہ آنسوؤں سے بھرے گا (خوشی کے بعد غم)۔

درد کہتے ہیں:

جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا
کہ نہ ہنسنے میں رو دیا ہوگا

جعفر علی حسرت کہتے ہیں:

اپنے لب تو وا نہ کر اے خندۂ زخمِ جگر
چرخ دے گا لاکھ غم اس شادمانی کے سبب

حالی کہتے ہیں:

عشرت کا ثمر تلخ سدا ہوتا ہے
ہر قہقہہ پیغام بکا ہوتا ہے

ظفر کا شعر ہے:

ہے صرصرِ حوادثِ دوراں کا غم بھی ساتھ
کیونکر ہنسے کہیں دل مسرور کا چراغ

شادی اور غمی کے ساتھ شادی مرگ بھی محاورہ آتا ہے۔ مثلاً:

امیر مینائی کا شعر ہے:

میرے مرتے ہی زمانہ درہم و برہم ہوا
ہر خوشی پھیلی کہ شادی مرگ اک عالم ہوا

ایک اور حدیث ہے:

كَثْرَةُ الضَّحِكِ تُمِيْتُ الْقَلْبَ ——— زیادہ ہنسی مُردہ دل بناتی ہے۔

لیکن زندہ دلی، پسندیدہ ہے۔ جیسا کہ ناسخ نے کہا ہے:

زندگی، زندہ دلی کا نام ہے
مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

۶۶۔ هَاجِرُوْا تُوْرِثُوْا اَبْنَاءَكُمْ مَجْدًا ——— تم ہجرت کرو، اپنے بچوں کو ورثے میں بزرگی دو گے۔

اس حدیث سے شعراء نے مضامین تلاش کیے ہیں۔ ذوق کا شعر ہے:

اہلِ جوہر کو وطن میں رہنے دیتا گر فلک
لعل کیوں اس رنگ سے آتا بدخشاں چھوڑ کر

ناسخ کہتے ہیں:

ہو وطن میں خاک میرے گوہرِ مضموں کی قدر
لعل قیمت کو پہنچتا ہے بدخشاں چھوڑ کر

غالباً شہیدی کا شعر ہے:

وہ پھول سر چڑھا جو چمن سے نکل گیا
عزّت اسے ملی جو وطن سے نکل گیا

امیر مینائی نے اس کے برعکس لکھا ہے:

پُوچھا نہ جائے گا جو چمن سے نکل گیا
بے کار ہے جو دانت دہن سے نکل گیا

۶۷۔ اَلْقَرِيْبُ مَنْ تَقَرَّبَ لَا مَنْ تَنَسَّبَ ——— تیرا قریبؔ (رشتہ دار) وُہ ہے جو تیرا قُرب چاہتا ہو (تیرا خیرخواہ ہو) نہ کہ وُہ جو خاندانی رشتہ رکھتا ہو (اور دل میں دشمن ہو)۔

حالی کہتے ہیں:

آ رہی ہے چاہِ یوسفؑ سے صدا
دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

۶۸۔ اِبْدَأْ بِمَنْ تَعُوْلُ وَلَا تُلَامُ عَلٰى كَفَافٍ ——— پہلے ان عزیزوں کی خبرگیری کر جن کی پرورش تجھ سے متعلق ہے اور اگر تیرے پاس تیری احتیاج سے زائد نہ ہو (اور تُو دوسرے عزیزوں کی خبرگیری نہ کرے) تو تجھ پر ملامت نہیں۔

مثل مشہور ہے: اوّل خویش بعدہٗ درویش۔
انگریزی میں بھی ہے کہ: CHARITY BEGINS AT HOME.

۶۹۔ ایک اور حدیث ہے:
خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِاَهْلِهٖ ——— تم میں وُہ بہتر ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے بہتر ہو۔ (محبت اور خبرگیری میں)
اور یُوں بھی مروی ہے جیسا کہ نظم طبا طبائی کا شعر ہے:

لَا يُلَامُ الْمَرْءُ فِيْ حُبِّ الْعَشِيْرَةِ یاد رکھ
پھر ملامت بھی کرے کوئی تو کچھ پروا نہ کر ("پند سُود مند")

۷۰۔ خَيْرُ النَّاسِ اَنْفَعُهُمْ لِلنَّاسِ ——— آدمیوں میں بہتر وُہ ہے جو لوگوں کو نفع پہنچائے۔
ایک اور حدیث ہے:
خَيْرُ النَّاسِ خَيْرُهُمْ لِنَفْسِهٖ ——— لوگوں میں جو بہتر ہے (لوگوں سے بھلائی کرتا ہے) وُہ اپنے ساتھ بھلائی کرتا ہے (کیونکہ جب لوگوں سے بھلائی کرے گا تو لوگ بھی اس کے ساتھ بھلائی کریں گے)۔
ناسخ کا شعر ہے:

رات دن غافل بدوں سے بھی کیا کر نیکیاں
کیا بُرا ہے اس میں کیا تیرا بھلا ہو جائے گا

داغ کہتے ہیں:

یہ کام نہیں آساں، انسان کو مشکل ہے
دنیا میں بھلا ہونا، دنیا کا بھلا کرنا

۷۱۔ اَلرَّاحِمُوْنَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ اِرْحَمُوْا مَنْ فِي الْاَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَآءِ ——— رحم کرنے والوں پر رحمٰن بھی رحم کرتا ہے، تم زمین والوں پر رحم کرو تو تم پر آسمان والا بھی رحم کرے گا۔
حالی کہتے ہیں:

کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر
خدا مہرباں ہو گا عرشِ بریں پر

۷۲۔ مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ فَقَدْ رَفَعَهُ اللّٰهُ ——— جو شخص خدا کے لیے انکساری کرے گا خدا اس کا درجہ بلند کرے گا۔

ایک اور حدیث ہے:
طُوْبٰى لِمَنْ ذَلَّتْ نَفْسُهٗ وَحَسُنَتْ خَلِيْقَتُهٗ ——— تحسین ہے اُس کے لیے جس نے اپنے نفس کو

جھکایا اور جس کے اخلاق اچھے ہوئے۔
ولی کی ایک غزل کے دو شعر ہیں:

نفسِ سرکش پر جو کُئی پایا ہے یاں فتح و ظفر
دارِ عقبیٰ کے بھتر الحق کہ وہ منصور ہے
خاکساری جس کو سلطانی ہے اِس عالم میں
کاسۂ خاکی اُسے جیوں چینیِ فغفور ہے

آتش کا شعر ہے:

غبارِ راہ ہو کر چشمِ مردم میں محل پایا
نہالِ خاکساری کو لگا کر ہم نے پھل پایا

صبا لکھنوی کہتے ہیں:

میری فروتنی مجھے معراج ہو گئی
حاصل ہوا زوال میں رتبہ کمال کا

امیر مینائی کا شعر ہے:

مرتبہ پیشِ خدا ہوتا ہے اتنا ہی بلند
جس قدر ملتا ہے انسان سے انساں جھک کر

۷۳۔ مَنْ تَکَبَّرَ وَضَعَهُ اللّٰهُ ——— جس نے تکبّر کیا اُسے اللہ نے گرا دیا۔
ولی کا شعر ہے:

عجب کچھ بوجھ رکھتے ہیں سرآمد بزمِ معنی کے
تواضع نئیں ہے جس میں اس کوں انساں کر نہیں گنتے

اسی غزل کا مطلع ہے:

بزرگاں کُن جو کُئی اپنے کوں ناداں کر نہیں گنتے
سخن کے آشنا اُن کوں سخنداں کر نہیں گنتے

غرور کا سر نیچا ہوتا ہے۔ مشہور قول ہے۔

۷۴۔ یَبْصُرُ اَحَدُکُمُ الْقَذٰی فِیْ عَیْنِ اَخِیْهِ وَیَدَعُ الْجِزْعَ فِیْ عَیْنِهٖ ——— تم میں سے کوئی اپنے بھائی کی آنکھ کا تنکا دیکھ لیتا ہے اور اپنی آنکھ کے شہتیر کو چھوڑ دیتا ہے۔
سرسید لکھتے ہیں: "تو اُس ذرّہ کو جو تیرے بھائی کی آنکھ میں ہے، دیکھتا ہے اور اپنی آنکھ میں جو شہتیر ہے اُس کو

نہیں دیکھتا......" (خطباتِ احمدیہ۔ وکیل ٹریڈنگ کمپنی۔ امرتسر صفحہ ۶۷۲)

سرسید یوں بھی لکھتے ہیں :

" اگر ہم کسی دوسرے کی آنکھ کی پھلی کو ٹوکیں تو اس سے ہماری آنکھ کا ٹینٹ نہیں چھپتا۔" (تہذیب الاخلاق۔ لاہور ۱۳۱۲ھ ص ۵۵۱)

سودا نے اپنے طور پر یہ مضمون پیش کیا ہے :

محتق اپنے سے اوروں کے ہنر کو جو کہے عیب
کیونکر نہ خطا بینوں کا ہووے ہدفِ تیر

اسی طرح ناسخ نے بھی :

آپ اپنے عیب سے واقف نہیں ہوتا کوئی
جیسے بو اپنے دہن کی آتی ہے کم ناک میں

کسی جدید شاعر کا شعر ہے :

خود اپنی آنکھ کے شہتیر پر نظر رکھیں
ہماری آنکھ کے تنکے نکالنے والے

۷۵۔ اَلحَربُ خُدعَۃٌ" ——— جنگ ایک حیلہ سازی ہے۔

ذوق کا شعر ہے :

سچ ہے الحرب خدعۃ" اے ذوق [1]
نگہ اس کی دغا سے لڑتی ہے

۷۶۔ لَا تُغمِدُوا السُّیُوفَ عَنْ اَعْدَائِکُمْ فَتُوتِرُوا ثَارَکُمْ ——— اپنی تلواروں کو نیام میں مت ڈالو ورنہ تم اپنے دل کے جوش کو اور اپنے حق کو تباہ کر دو گے۔

ناسخ کہتے ہیں :

مر رہا ہوں آپ، تم بدنام ہونے ہو عبث
غصہ جانے دو، کرو تلوار اپنی میان میں

شعور کا شعر ہے :

نہ کر نیام میں تیغِ قضا کو تو اے ترک یہی اشارۂ چشمِ رکاب رہتا ہے

---

[1] ذوق کے لامیہ قصیدے میں بھی " اللہ جمیل ویحب الجمال" اور " الجنس یمیل" الی الجنس" جیسے اقوال نظم کیے گئے ہیں۔

۷۷ - مَنْ فَارَقَ الْجَمَاعَةَ وَاسْتَذَلَّ الْإِمَارَةَ لَقِيَ اللّٰهَ وَلَا وَجْهَ لَهُ عِنْدَهُ ——— جس نے جماعت چھوڑ دی اور امیر کی ذلت کی تو اللہ پاک کی ملاقات کے وقت اس کی کوئی عزت نہ ہوگی۔

ایک اور حدیث ہے:

يَدُ اللّٰهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ ——— اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے۔

حالی نے اسی حدیث سے یہ مضمون لیا ہے:

جماعت کی عزت میں ہے سب کی عزت
جماعت کی ذلت میں ہے سب کی ذلت

۷۸ - اَلْفُرْقَةُ عَذَابٌ ——— تفرقہ عذاب ہے۔

ذوق کہتے ہیں:

پڑے تفرقے یہ جدائی سے تیری
کہ میں ہوں کہیں، دل کہیں، جاں کہیں ہے

۷۹ - اِتَّبِعُوا السَّوَادَ الْاَعْظَمَ فَاِنَّهُ مَنْ شَذَّ شُذَّ فِي النَّارِ ——— بڑی جماعت کی پیروی کرو۔ پس جو علیحدہ ہوگا وہ دوزخ میں ڈالا جائے گا۔

سوادِ اعظم، بڑی تعداد اور بڑی جماعت کے لیے اردو میں بھی بولا جاتا ہے جو حق پر ہو۔

امجد حیدر آبادی کہتے ہیں:

پیروی سے جو سوادِ اعظم کی بہکا وہ کبھی
راہ پائے گا نہیں، یوں ہی بھٹکتا جائے گا

۸۰ - كَفٰى بِالْمَوْتِ وَاعِظًا ——— موت ایک واعظ کے طور پر کافی ہے۔

اسی مضمون کو ذوق نے اس طرح پیش کیا ہے:

موت نے کر دیا ناچار، وگرنہ انسان
ہے وہ خود بیں کہ خدا کا بھی نہ قائل ہوتا

حالی کے یہ دو شعر اسی مضمون سے قریب ہیں:

کھولی ہیں تم نے آنکھیں اے حادثو ہماری
احسان یہ نہ ہرگز بھولیں گے ہم تمہارا
کر دیا چپ واقعاتِ دہر نے
تھی کبھی ہم میں بھی گویائی بہت

اکبرؔ نے اسی سے ملتا جلتا مضمون لیا ہے :

ان مصائب سے کام لے اکبر
غم بڑا مُدرکِ حقائق ہے

۸۱ - اَلْعَيْنُ حَقٌّ ——— نظر کا لگ جانا برحق ہے ۔

نظر لگنا اُردو میں مستعمل ہے ۔ غالبؔ کہتے ہیں :

نظر لگے نہ کہیں اُن کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

داغؔ کا شعر ہے :

کچھ روتے ہیں، کچھ مرتے ہیں، کچھ لوٹ رہے ہیں
کِس کی نظرِ بد تری محفل کو لگی ہے

نظر لگنا اور نظر کا کھا جانا بھی مستعمل ہے ۔ انیسؔ کہتے ہیں :

اٹھارھواں برس تھا کہ موت آ گئی تجھے
اے نُورِ عین کِس کی نظر کھا گئی تجھے

۸۲ - اَلْمُؤْمِنُ مِرْآةُ الْمُؤْمِنِ[1] ——— مومن دوسرے مومن کا آئینہ ہے ۔

آئینہ، حقیقت حال ظاہر کرنے کے معنی میں آتا ہے ۔

آتشؔ کا شعر ہے :

قرار اس کو نہیں آتا ہماری بے قراری سے
زمانہ آئینہ ہے اپنے احوالِ دِگرگوں کا

محسنؔ کاکوروی کہتے ہیں :

فرحت سے ہُوا یہ قلب بے تاب
آئینہ دکھا رہا تھا سیماب

۸۳ - اَلْهَمُّ نِصْفُ الْهَرَمِ ——— فکر آدھا بڑھاپا ہے ۔

ھَم دراصل اُس فکر کو کہتے ہیں جو مصیبت آنے سے پہلے ہو اور اس سے نیند اُچاٹ ہو جائے ۔

اس حدیث سے منیرؔ شکوہ آبادی نے ایک اچھا مضمون پیش کیا ہے :-

---

[1] جناب زکریا مائلؔ نے اس حدیث اور بعض دُوسری حدیثوں کا منظوم ترجمہ، اخبار انجام (کراچی ۔ ۱۹۶۴ء) میں "حکمت کے موتی" کے نام سے شائع کیا تھا ۔

خوفِ خدا سے رہتی ہے نم ، چشم پاک بیں
اطفالِ اشک کیوں نہ ہوں پیرانِ پارسا

۸۴ - تَفَرَّغُوْا مِنْ هُمُوْمِ الدُّنْيَا مَا اسْتَطَعْتُمْ ——— دنیا کے رنج و غم سے جس قدر ممکن ہو فارغ رہو۔
شاعروں نے اس فراغت سے نئے نئے مضامین بنائے ہیں :
انیس کا شعر ہے :

سر کٹ گیا ہمیں تو الم سے فراغ ہے
گر ہے تو بس تمھاری جدائی کا داغ ہے

جلیل کہتے ہیں :

دِل مٹ گیا بلا سے ، فراغت تو ہو گئی
اس بے کسی میں چھوٹ گئے بے لبسی سے ہم

فارسی میں بھی کہا گیا ہے کہ : ع

فارغ از فکر و غم و وسواس باش

۸۵ - اَلْحَزْمُ سُوْءُ الظَّنِّ ——— (خواہ مخواہ کی) احتیاط ، بدگمانی ہے۔
ڈپٹی نذیر احمد لکھتے ہیں : " احتیاط بھی اسی کی مقتضی ہے۔ الحزم سؤالظن " (ابن الوقت ۔ فصل ۲۸)

۸۶ - اَلرَّفِيْقُ قَبْلَ الطَّرِيْقِ ——— سفر سے پہلے رفیقِ سفر ڈھونڈھ لو۔
امیر مینائی کہتے ہیں :

بہ کس کی راہ میں کھوئے گئے کہ ہم سے خضر
طریق پوچھتے ہیں آ کے رھنمائی کا

۸۷ - كَرَمُ الْكِتَابِ خَتْمُهٗ ——— خط کی عزت اُس کی مُہر ہے۔
ولی کہتے ہیں :

اشکِ خون آلودہ ہے سامانِ طغرائے نیاز
مُہرِ فرمانِ وفاداری ہے داغِ عاشقی

ذوق کہتے ہیں : ع

مُہر وُہ کرتا ہے نامے پر مجھے آئے ہے رشک

۸۸ - اِنَّ هٰذِهِ الْقُلُوْبَ لَتَصْدَأُ كَمَا يَصْدَأُ الْحَدِيْدُ ——— بے شک دل بھی زنگ آلود

ہوتے ہیں جیسے لوہا زنگ آلود ہوتا ہے۔
اسی مضمون کو سودا نے اس طرح لیا ہے :

غش بہم پہنچا نہ محرومِ تجلی ، دل کو رکھ
صیقل اس آئینے کی گردِ شکستِ زنگ ہے

ذوق بھی کہتے ہیں :

صفائے دل کی یہی ہے صورت کہ دل میں آنے نہ دے کدورت
کہ بیٹھ جائے گی بالضرورت اس آئینے میں یہ زنگ ہو کر

۸۹ - إِذَا مُدِحَ الْفَاسِقُ غَضِبَ الرَّبُّ تَعَالٰى وَاهْتَزَّ لَهُ الْعَرْشُ ——— جب فاسق کی تعریف کی جاتی ہے تو اللہ پاک غضب ناک ہو جاتا ہے اور عرش بھی اُس کے غضب سے لرز اُٹھتا ہے۔
حالی نے یہیں سے مضمون لے کر مسدس میں کہا ہے :

وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر — عفونت میں سنڈاس سے ہے جو بدتر
زمیں جس سے ہے زلزلے میں برابر — ملک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر
ہوا علمِ دین جس سے تاراج سارا
وہ ہے ہفت نظر علمِ انشا ہمارا

ظفر اپنے انداز میں کہتے ہیں :

کہتے ہیں آپ کو وہ ہنرور زمانے میں
جن پر کبھی پڑا بھی نہیں ہے ہنر کا عکس

۹۰ - اُحْثُوا فِیْ وُجُوْهِ الْمَدَّاحِیْنَ التُّرَابَ ——— مدّاحوں (خوشامدیوں) کے مُنہ میں خاک ڈالو۔
اُردو میں بھی مُنہ میں خاک ڈالنا محاورہ ہے۔ ذوق کہتے ہیں :

زباں کھولیں گے مجھ پر بد زباں کیا بدشعاری سے
کہ میں نے خاک بھر دی اُن کے مُنہ میں خاکساری سے

سید احمد دہلوی لکھتے ہیں : "تمہارے مُنہ میں خاک ، تم ایسی فال تو نکالو"۔ (ہادی النساء صفحہ ۱۲۲ - لاہور ۱۳؁ء)

۹۱ - ایک حدیث اس طرح بھی آتی ہے :

... رَغِمَ اَنْفُ رَجُلٍ .... (مظاہر حق - ۱/۳۰۷ طبع لکھنؤ ۱۳۱۶ھ)
خاک آلودہ ہو ناک اس شخص کی (جس نے درود نہ بھیجا) ۔
خاک آلود ہو ، خاک پڑے وغیرہ محاورے اُردو میں ہیں ۔

رندؔ کہتے ہیں :

ایسے جینے پہ رندؔ خاک پڑے
موت اس زندگی پہ ہنستی ہے

۹۲۔ فَاَسْنَدَ رُكْبَتَيْهِ اِلٰى رُكْبَتَيْهِ وَوَضَعَ كَفَّيْهِ عَلٰى فَخِذَيْهِ .... (مظاہرحق۔ جلد اول۔ ص ۲۴)[1]
(جبریل علیہ السلام حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے) اور لگا دیے اپنے دونوں زانو ، حضورؐ کے دونوں زانوؤں کی طرف اور رکھے اپنے دونوں ہاتھ اپنے دونوں زانوؤں پر ۔

زانو تہ کرنا ، زانوے ادب تہ کرنا ، دوزانو (ادباً) بیٹھنا وغیرہ محاورات یہیں سے بنے ہیں ۔ محسنؔ کاکوروی نے سراپا میں لکھا ہے :

سر بزانوے ادب آ کے سخنگو بیٹھیں
فکرِ عالی کے فرشتے بھی دو زانو بیٹھیں

جوشؔ ملسیانی لکھتے ہیں کہ" اُن کے شاگرد مبارکباد کے مستحق ہیں کہ اُنھیں ایسے بلند پایہ اور گراں مایہ استاد کی خدمت میں زانوے ادب تہ کرنے کا شرف حاصل ہوا۔" (دیباچہ احسن الکلام)

۹۳۔ خَصْلَتَانِ مُعَلَّقَتَانِ فِىْ اَعْنَاقِ الْمُؤَذِّنِيْنَ لِلْمُسْلِمِيْنَ صِيَامُهُمْ وَصَلٰوتُهُمْ (م۔ح ۔ $\frac{1}{۲۳۴}$)
دو چیزیں لٹکی ہوئی ہیں بیچ گردنوں مؤذنوں کے مسلمانوں کے لیے ، اُن کے روزے اور اُن کی نمازیں۔ (یعنی مؤذنوں کے ذمے ہیں مسلمانوں کے روزے اور نمازیں تاکہ صحیح وقت پر ادا کرسکیں)۔

گلے بندھنا اور گلے پڑنا ، ذمے ہونا کے معنی میں ہے ۔

شاہ نصیرؔ کا شعر ہے :

زلفِ خوباں کیوں گلے پڑتی ہے تو
کوئی تیرے دام میں آتے ہیں ہم

بحرؔ کہتے ہیں :

کچھ ایسی گلے پڑ گئی ابرو کی محبت
تلوار کا ڈورا رگِ گردن نظر آیا

۹۴۔ اَبْغَضُ الْبِلَادِ اِلَى اللهِ اَسْوَاقُهَا (م۔ح ۔ $\frac{1}{۲۴۰}$) ـــــــ اللہ کے نزدیک ، شہروں کے بہت مبغوض مکان اُن کے بازار ہیں ۔

---

[1] یہاں سے مظاہرِ حق (تفسیر مشکوٰۃ ۔ طبع لکھنؤ ۱۳۱۶ھ) کے حوالے آئیں گے ۔

اسی حدیث سے اردو میں سوقیانہ ، سوقیانہ پن ، بازاری ، بازاری پن وغیرہ محاورے بن گئے۔
مولانا شبلی لکھتے ہیں : "ابتذال کا معیار ، مذاقِ صحیح کے سوا اور کوئی چیز نہیں۔ مذاقِ صحیح خود بتا دیتا ہے کہ یہ لفظ مبتذل ، پست اور سوقیانہ ہے" (موازنہ انیس و دبیر)
مولانا عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں : "شعرائے لکھنؤ کا عام رنگ معاملہ بندی ہے جس نے حدِ اعتدال سے بڑھ کر بازاری روش اختیار کر لی ہے" (شعر الہند۔ جلد اوّل۔ دہلی اور لکھنؤ اسکول)
قائم چاند پوری کا شعر ہے :

حُسن کو تیرے میں یوسف سے مقابل کرتا
کون روکش ہو پہ ہر سوقی و بازاری سے

۹۵۔ یُظِلُّهُمُ اللّٰهُ فِی ظِلِّهٖ (م ۔ ح ۔ $\frac{1}{230}$) ـــــ سایہ میں رکھے گا ان کو اللہ بیچ سایہ اپنے کے ۔
منیر شکوہ آبادی کہتے ہیں :

شفاعت اُمتِ عاصی کی جب فرمائیں گے حضرت
کرے گا سایہ ہم سب پر ہمارے فضلِ ربانی

شبلی نے اپنے انداز میں کہا ہے :

ہیئت میں بلند پایہ اُس کا
تھا فلسفہ زیرِ سایہ اُس کا

۹۶۔ فَفَاضَتْ عَیْنَاهُ (م ۔ ح $\frac{1}{230}$) ـــــ اللہ کے سایے میں وہ بھی ہو گا جو اُس کو تنہائی میں یاد کرتا ہے اور بہتی ہیں اُس کی آنکھیں۔
سودا کا شعر ہے :

بہنا کچھ اپنی چشم کا دستور ہو گیا
دی تھی خدا نے آنکھ سو ناسور ہو گیا

میر کہتے ہیں :

وہ دن گئے کہ آنکھیں دریا سی بہتیاں تھیں
سوکھا پڑا ہے اب تو مدت سے یہ دوآبہ

شبلی نے یُوں کہا ہے :

اگرچہ آنکھ میں نم بھی نہیں ہے اب باقی
اگرچہ صدمۂ بلقان سے جگر شق ہے

۹۷ - رَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ فَاَخْفَاهَا حَتّٰى لَا تَعْلَمُ شِمَالُهٗ مَا تُنْفِقُ يَمِيْنُهٗ (م - ح ۱/۲۳۸) ———
(اللہ کے سایہ میں وُہ شخص بھی ہوگا کہ) جس نے اللہ واسطے کچھ دیا پس چھپایا اُس کو یہاں تک کہ نہ جانا اُس کے بائیں ہاتھ نے کہ اُس کے داہنے ہاتھ نے کیا خرچ کیا۔

اُردو میں بولتے ہیں کہ داہنے ہاتھ سے اس طرح دو کہ بائیں کو خبر نہ ہو ۔ کسی کا مصرع ہے : ع

دائیں سے دو کہ بائیں کو مطلق خبر نہ ہو

عزیز جے پُوری نے اس حدیث کو اس طرح نظم کیا ہے :

ہے یہ ارشادِ سرورِ بطحا
اپنی اُمّت کے اہلِ ثروت کو
دو اگر ایک ہاتھ سے خیرات
دُوسرے ہاتھ کو خبر بھی نہ ہو

۹۸ - فَوَضَعَ كَفَّهٗ بَيْنَ كَتِفَيَّ (م - ح ۱/۲۴۴) ——— پس رکھا اللہ تعالیٰ نے اپنا ہاتھ میرے مونڈھوں کے درمیان۔
پیٹھ پر ہاتھ رکھنا ، پیٹھ تھپکنا وغیرہ محاورے ہیں ۔ پیٹھ ٹھونکنا بھی آتا ہے ۔ گلزارِ نسیم کا شعر ہے :

لے لے کے بلائیں کاکلوں کی
پیشانی چُومی پیٹھ ٹھونکی

۹۹ - فَاَمِيْتُوْهُمَا طَبْخًا (م - ح ۱/۲۴۴) ——— پس مارو اُن کو پکا کر (یعنی پیاز اور لہسن کی بُو)۔
آتش کا شعر ہے :

بیتاب دِل کو تسکین ہوتی ہے دیدِ خط سے
وُہ بُوٹی ہے یہ جس سے پارے کو مارتے ہیں

ناسخ بھی کہتے ہیں :

تیرے آگے نہ چلے جانِ سیہ مار کے پیچ
زلفِ پیچاں نے اسے مار رکھا مار کے پیچ

ایسی بکثرت احادیث اُردو نثر اور اُردو شعر میں مستعمل ہیں اور یہ ننانوے احادیث اُردو میں بالخصوص رائج ہیں۔
کاش ان کا ابلاغ اِس عاجز کے لیے ذریعۂ مغفرت بن جائے !

گر بد ہیں تو حق اپنا ہے کچھ تجھ پہ زیادہ
اخبار میں "اَلطَّالِحُ لِيْ" ہم نے سُنا ہے (حالی)

دربارِ رسالتؐ کا پیغمبرانہ طمطراق

مولانا محمد زاہد

برے دربار دیکھے اور شہنشاہِ زمیں دیکھے
محمدؐ کی کچہری کے مگر جلوے نہیں دیکھے

دنیا میں بہت سے دربار قایم ہوئے۔ ہر ملک اور قوم کے جلیل القدر فرمانرواؤں اور طنطنہ و جلال کے تاجداروں نے پوری صولت و سطوت دکھائی۔ شاہی مجالس و آئین کے احتشام و عظمت کا تصور کس دماغ میں نہیں۔ درباروں میں جمہور پر رعب و اثر ڈالنے اور اپنے جلال و عظمت کی نمایش کرنے کے لیے کیا کیا اہتمام نہیں کیے جاتے۔ خیل و حشم، نقیب و چاؤش، دربان و سپاہ سبھی کچھ ہوتا ہے۔ سر و سامان کی فراوانی اور دولت و امارت کی درخشانی سے نگران نگاہیں اُونچی نہیں ہوسکتیں، لیکن شہنشاہِ کونینؐ کا ایک دربار ہی اس کرۂ ارض پر قایم ہوا، جس پر بخت نصر، ٹیٹس، خسرو، اسکندر، مامون، منصور، سلیمان اور شاہجہان کے دربار سجائے گئے تھے مگر یہاں نہ وُہ طمطراق تھا، نہ طنطنہ اور نہ وہ شان و شکوہ تھا اور نہ وہ سطوت خیزیاں۔ انتہا یہ ہے کہ کوئی دربان بھی دروازہ پر نہ ہوتا تھا تاہم جلالِ نبوت سے ہر ذی روح ایک پیکرِ تصویر نظر آتا تھا۔ کوئی شخص ذرا جنبش بھی نہ کرتا تھا۔ مجلس میں لوگ بیٹھتے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کے سروں پر چڑیاں بیٹھی ہُوئی ہیں۔ گفتگو کی اجازت میں بھی خاص ترتیب ملحوظ رہتی تھی۔ لیکن نسب و نام اور مال و منال کو اس امتیاز مراتب سے کوئی تعلق نہ تھا بلکہ فضل و استحقاق کی بنا پر اجازت دی جاتی تھی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سب سے پہلے ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے، جن کی طرف اس روز سے پہلے کبھی کسی نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔ اس کی معروضات سُنتے اور حاجت براری کرتے۔ جملہ حاضرین کے سر ادب سے جھکے رہتے تھے۔ آپؐ خود بھی مؤدب ہو کر بیٹھتے تھے کہ فخر و امتیاز کا رنگ پیدا نہ ہونے پائے۔ آپؐ جب کچھ بولتے اور فرماتے تو پوری مجلس پر ایک سناٹا چھا جاتا۔ جب تک کوئی چُپ نہ ہو جاتا، دُوسرے شخص کی مجال نہ ہوتی تھی کہ زبان کھول سکے۔ دربارِ نبوت میں ہر قسم کی بحث و تذکار ہوتے اور آپؐ بھی ان میں حصّہ لیتے۔ مہذب ظرافت اور ہنسی میں بھی آپؐ حصّہ لیتے تھے۔ جس رتبہ کا آدمی ہوتا، اس سے اسی طرح گفتگو کرتے۔

تعیین اوقات تعلیم و ارشاد کے لیے آپؐ نے خاص اوقات کا تعیّن کر دیا تھا۔ یہ صحبتیں بالعموم مسجد نبویؐ میں منعقد ہوتی تھیں۔ آپؐ کی نشست کے لیے کوئی ممتاز جگہ نہ تھی۔ اسی لیے باہر سے جو لوگ آتے انہیں آپؐ کے پہچاننے میں دقّت ہوتی تھی۔ صحابہؓ نے آپؐ کے لیے ایک چھوٹا سا مٹی کا چبوترہ بنا دیا تھا، اسی پر بیٹھ جاتے۔ پھر آپؐ کے ارد گرد صحابہ حلقہ باندھ کر بیٹھ جاتے۔

دربارِ نبوّت میں ہر شخص آسکتا تھا کسی کے لیے کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ بعض وحشی بدّو وحشیانہ طریق پر بھی گفتگو کرتے تھے مگر آپؐ تحمل سے کام لیتے تھے۔ ایک شخص آتا ہے، پُوچھتا ہے محمدؐ کون ہے؟ صحابہ بتاتے ہیں کہ یہ گورے سے آدمی جو ٹیک لگائے بیٹھے ہیں۔

وُہ کہتا ہے:

"اے ابن عبد المطلبؓ! میں تم سے نہایت سختی کے ساتھ گفتگو کروں، خفا نہ ہونا۔"

آپؐ اسے اجازت دے دیتے ہیں۔ اخلاق، مذہب اور تزکیۂ نفس پر گفتگو بحث و تذکار کا مرکزی نقطہ ہوتا تھا۔ بعض لوگ مبتذل اور معمولی باتیں بھی پُوچھتے تھے۔ مگر آپؐ ایسے سوالات ناپسند کرتے تھے۔ جب ایک مسئلہ طے ہو جاتا تھا، تو دُوسرے مسئلہ پر گفتگو شروع ہوتی تھی۔

بحث و گفتگو کے مسائل و موضوعات

فیوض روحانی کا یہ سرچشمہ عموماً صبح کے وقت جاری ہوتا تھا۔ آپؐ نمازِ فجر سے فراغت پاتے ہی بیٹھ جاتے تھے۔ ویسے ہر نماز کے بعد کبھی کبھی تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ جاتے تھے۔ آپؐ ان مجالس میں بڑی بڑی پُر زور تقریریں بھی کرتے تھے اور بصیرت افروز وعظ بھی فرماتے۔ ترمذی میں ہے کہ ایک دن صبح کے وقت آپؐ نے نماز پڑھ کر جو تقریر کی، تو سب کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ آپ وعظ و نصائح کے جلسے درمیان میں ناغہ دے کر منعقد فرماتے اور کبھی اخلاقیات پر گفتگو کرتے، کبھی روحانیت پر بولتے اور کبھی دنیوی مسائل پر ارشاد فرماتے۔ زراعت، باغبانی، تجارت، گھوڑ دوڑ، سیاسیات، صنعیات اور عسکریات پر بھی بحث و تقریر فرمایا کرتے تھے۔

عملیات کی پایہ شناسی

ایک روز آپؐ مسجد میں جو تشریف لائے تو صحابہ کے دو حلقے قائم تھے، ایک حلقہ قرآن خوانی اور ذکر و دعا میں مشغول تھا اور دُوسرے میں علمی باتیں ہو رہی تھیں۔ آپؐ نے فرمایا: دونوں عمل خیر میں مصروف ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے صرف معلّم بنا کر بھیجا ہے۔ یہ کہہ کر آپ علمی حلقہ میں بیٹھ گئے۔

اس سے آپؐ کی بلندی مرتبت اور علم دوستی پر کیسی تیز روشنی پڑتی ہے۔ جن دقیق مسائل کی تہہ تک جمہور عوام کے دماغ کی رسائی نہ ہو سکتی تھی، ان پر بحث و گفتگو کو آپؐ ناپسند فرماتے تھے۔ لوگ شہرت طلبی کو خلوص عمل کے منافی سمجھتے تھے۔ آپؐ نے یہ بتا دیا کہ ثواب کا کام کیا جائے گا، تو لازمی شہرت ہو گی۔ البتہ صرف شہرت ہی مقصود نہ ہونی چاہیے۔ لوگوں کا خیال تقدیر کے متعلق یہ تھا کہ یہ نام ہے قوائے عملیہ کے تعطل کا، جو قسمت میں مرقوم ہو چکا، اسے کوئی عمل اور طاقت نہیں مٹا سکتی۔ آپؐ نے ایک صحبت میں یہ فرما کر اس خیال کی تردید کر دی کہ اعمال تو خود تقدیر ہیں۔ خدائے قدوس انسان کو جن اعمال کی توفیق دیتا ہے، وہی اس کا نوشتۂ تقدیر ہیں۔ اس لیے قوتِ عمل کے بے کار کر دینے کا نام توکّل نہیں۔ چنانچہ ایک روز صحابہ کرام ایک جنازہ کے ساتھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو تشریف لاتے، تو سب آپؐ کے گرد جمع ہو گئے۔ اس وقت آپؐ کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی۔ آپؐ نے اس سے زمین کو کریدا اور فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص بھی ایسا نہیں ہے جس کی جنت یا دوزخ پہلے سے لکھی نہ جا چکی ہو۔ یہ سن کر ایک صحابی کہنے لگے "یا رسول اللہؐ! پھر عمل کی کیا ضرورت ہے اور کیوں نہ ہم اپنی تقدیر ہی پر عمل کر کے عمل کو ترک کر دیں، جس شخص کی قسمت میں سعادت ہو گی، وہ خود بخود اپنے نوشتۂ تقدیر کے مطابق سعادت مندوں میں داخل ہو جائے گا اور جو بدبخت ہو گا، وُہ بدبختوں ہی میں شامل کر لیا جائے گا۔"

آپؐ نے یہ سُن کر جواب دیا کہ سعادت مند وہ لوگ ہیں، جنھیں سعادت مندانہ عمل کی توفیق دی جاتی ہے اور بدبخت وُہ ہیں، جن کے لیے کارہائے شقاوت کے اسباب جمع ہو جاتے ہیں۔ (بخاری، ج ۳)

شگفتہ مزاجی

باوجود اس کے کہ صحابہ دربارِ نبوت میں کان الطیور فوق رؤسھم بیٹھے رہتے تھے، ادب و احترام ہر شخص کو

ملحوظِ خاطر رہتا تھا اور اکثر ہدایت و ارشاد، اخلاق و مذہب، تصفیۂ قلب اور تزکیۂ نفس کی گفتگوئیں ہوتی رہتی تھیں تاہم یہ نہ تھا کہ آپؐ کی مجلس تعیش و خشونت کا ایک زندہ مرقع ہو اور ہمیشہ ہر وقت خشک مسائل پر خشک ہی گفتگو ہوتی رہتی ہو۔ شگفتہ مزاجی اور ظرافت کا رنگ بھی مباحث و کلام میں شامل ہوتا تھا۔ خندہ روئی کے ساتھ گفتگوئیں ہوتی تھیں۔ چنانچہ ایک روز آپ نے فرمایا کہ ایک شخص نے خدا سے جنت میں کھیتی کرنے کی آرزو کا اظہار کیا۔ پوچھا گیا کہ کیا یہ تیری آرزو پوری نہیں ہوئی ہے۔ بولا ہاں مگر چاہتا ہوں کہ میری کھیتی بوتے ہی تیار ہو جائے۔ چنانچہ اس نے اجازت ربانی حاصل کر کے بیج ڈالا۔ فوراً اگا، بڑھا اور کاٹنے کے قابل ہو گیا۔ کہیں ایک بدّو بیٹھا ہوا اس ظرافت آمیز حقائق بیانی کو سُن رہا تھا۔ سُنتے ہی بولا: یا رسول اللہ! یہ سعادت غالباً صرف انصاریوں یا قریش ہی کو حاصل ہو گی کہ یہی لوگ زراعت پیشہ ہیں، ہم لوگ تو نہ کاشت کار ہیں اور نہ اس سے کوئی لگاؤ رکھتے ہیں۔ آپؐ یہ سُنتے ہی ہنس پڑے۔ (بخاری)

دربار نبویؐ میں ایک صاحب حاضر ہوتے ہیں، عرض کرتے ہیں: حضورؐ! میں تو تباہ ہو گیا۔ پوچھا: کیا ہوا، کیوں تباہ ہو گیا؟ بولا: رمضان میں اپنی بیوی سے مقاربت کر لی۔ ارشاد ہوا: تو کیا ہے، جاؤ ایک غلام آزاد کر دو۔ بولا: غریب ہوں، غلام کہاں سے خریدوں۔ فرمایا: اچھا دو مہینے تک مسلسل روزے رکھو۔ عرض کی: مجھ میں یہ طاقت بھی نہیں۔ فرمایا: تو پھر ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ۔ بولا کہ مجھ میں اتنی استطاعت کہاں ہے۔ اسی اثناء میں کہیں سے کھجوروں کی بھری ہوئی زنبیل آ گئی، آپؐ نے یہ اسے دے کر کہا کہ اسے لے جاؤ اور غرباء میں تقسیم کر دو۔ بولا: قسم ہے اس خدائے پاک کی جس نے آپؐ کو پیغمبر بنا کر ہماری ہدایت کے لیے مبعوث کیا ہے، میں تو اتنا غریب ہوں کہ مدینہ بھر میں مجھ سا کوئی ایک بھی نہ ہو گا۔ اس پر آپ کو بے ساختہ ہنسی آ گئی اور فرمایا کہ اچھا تو تم انھیں خود ہی کھا لو۔ (بخاری ص ۸۰۸)

ایک اندھا دربار نبوت میں حاضر ہوتا ہے اور پوچھتا ہے کہ حضورؐ! کیا میری بخشش ہو جائے گی؟ آپؐ جواب دیتے ہیں کہ بھائی اندھا کوئی جنت میں نہیں جائے گا۔ وہ یہ سُن کر رونے لگتا ہے۔ اس پر آپؐ کو اور تمام حاضرین کو ہنسی آ جاتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ بیوقوف روتا کیوں ہے، حضورؐ نے صحیح تو فرمایا: کوئی اندھا اندھے کی حیثیت سے جنت میں نہ جائے گا، اس روز سب کی آنکھیں روشن ہوں گی۔ اسی طرح ایک بڑھیا آ کر سوال کرتی ہے اور آپؐ ویسا ہی جواب دیتے ہیں۔ وہ بھی بیقرار ہو جاتی ہے۔ اس پر سب کو ہنسی آ جاتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں سچ ہے کوئی عورت بوڑھے ہونے کی صورت میں جنت میں نہ جائے گی، سب عورتیں اس وقت جوان ہوں گی۔ وہ بھی ہنسنے لگتی ہے، اور پھر سب کو ہنسی آ جاتی ہے۔ اس قسم کی صدہا ظرافت آمیز باتیں ہوتی رہتی تھیں۔

عورتوں کے لیے انتظام

ان مجلسوں میں بالعموم مرد ہی شریک ہوتے تھے، لیکن عورتیں بھی آتی تھیں مگر بہت کم۔ انھیں آپؐ کے فیض تلقین سے استفاضہ کا بہت کم موقع ملتا تھا۔ عورتیں اب وہ عورتیں تو رہی ہی نہ تھیں، جو جاہلیت کے زمانہ میں تھیں، ان کا رتبہ بھی بلند ہو چکا تھا۔ ان کے دل میں بھی اُمنگیں پیدا ہوتی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے لیے ایک خاص دن کے مقرر کیے جانے کی استدعا کی، جو منظور ہو گئی اور ان کے لیے وعظ و ارشاد کا ایک خاص دن مقرر کر دیا گیا۔ مقررہ دن عورتیں جمع ہو جاتیں۔ آپؐ انھیں فیضیاب ہدایت کرتے۔ انھیں مسائل شرعیہ کے متعلق ہر قسم کے سوالات کرنے کی اجازت تھی اور یہ خاتونانِ حرم برابر وہ مسائل دریافت کرتی رہتی تھیں، جو عورتوں ہی کی ذات سے متعلق ہوتے تھے۔

صحبت نبویؐ کے فیوض صحبت اور پھر ایسے گرامی قدر پیغمبر جلیل کی صحبت۔ ظاہر ہے کہ اثر سے خالی نہیں ہو سکتی تھی۔ بڑے بڑے شقی ازلی چند روز کی صحبت ہی میں سرآمد روزگار بن گئے عرب میں ایک انقلابِ عظیم پیدا ہوا۔ خدا کے بھولنے والے خدا کے پاکباز بندے بن گئے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ جیسے بزرگ تو دنیا اور علایق دنیا ہی سے بیزار ہو گئے اور خدا پرستی ہی میں لطف و سکون پانے لگے۔ اگر آپ رہبانیت و ترک علایق کو مذموم نہ بتاتے، تو ہزارہا انسان خانقاہوں میں ترک تعلق کر کے بیٹھ جاتے۔

لوگ برابر مراحل سعادت اور منازل عرفان طے کرتے چلے جاتے تھے۔ حضرت حنظلہؓ نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں تو منافق ہو گیا ہوں کہ جب تک خدمت میں رہتا ہوں، تو حشر و نشر کا نقشہ آنکھوں کے سامنے رہتا ہے۔ بال بچوں میں گیا اور سب کچھ بھول گیا۔ فرمایا بالکل باہر نکل کر بھی وہی حالت رہتی تو ملائکہ سے مصافحہ کرتے۔ (ترمذی)

اسی طرح حضرت ابوہریرہؓ نے عرض کی کہ آپؐ کے سامنے رہتا ہوں، تو نگاہوں میں دنیا ہیچ معلوم ہوتی ہے لیکن جب ہم بال بچوں میں جاتے ہیں، تو حالت ہی بدل جاتی ہے۔ ارشاد ہوا کہ یکساں حال رہتا، تو تمہاری زیارت کو فرشتے آیا کرتے۔ (ترمذی)

انگلستان کے شہرۂ آفاق مورخ نے اسی بناء پر تو لکھا کہ "محمدؐ کی صحبت و عظمت نے انسانوں کو فلاح و بہبود کا معدن بنا دیا، جو عبادت مقرر کی نہایت سادہ اور دلکش ہے۔ عرب کے بت تختِ خداوندی کے آگے ٹوٹ ٹوٹ کر چکنا چور ہو گئے۔ انسانوں کے قتل و غارت کو آپ نے خیرات و نماز کی صورت میں بدل دیا اور ان میں نیکی کی ایک زبردست رُوح پیدا کر دی۔ بھلائی کرنے کی ہدایت کی اور اپنے پند و نصائح سے انتقام کی خواہش، بیواؤں پر ظلم اور یتامیٰ کی حق تلفی کو آپؐ نے سختی کے ساتھ روکا۔ بلاشبہ آپؐ کا مذہب شکوک و شبہات سے بالاتر ہے۔"

فرزندانِ توحید خدا کے لیے سنبھلو اور سیرت نبویؐ سے وہی سبق حاصل کرو، جو عرب نے حاصل کر کے جنت الفردوس کو خرید لیا۔

ہجرتِ رسولؐ

مقبول احمد نظامی سیوہاروی

ہجرت کے معنی دوُر ہونے کے ہیں اور اگر حقیقتاً خیال کیا جائے تو سب سے زیادہ تکلیف دہ ہجرت اپنے وطن سے علیحدہ ہونا ہے۔ علیحدگی بھی وُہ، جو مجبوری سے ہو۔ دوست، احباب، عزیز، قریب اور سب سے زیادہ اپنا گھر، محلہ کی وُہ گلیاں، جن میں چل پھر کر نشوونما پائی۔ جب عالم خیال میں ان سے جُدا ہونا تکلیف دیتا ہے، تو کیوں آپؐ کو تکلیف نہ ہوئی ہو گی۔ مانا! رسول اکرمؐ تعلقاتِ دنیوی سے پاک تھے۔ تاہم فطرت اور اس کے لوازمات سے آپؐ خالی نہ تھے۔ اسی کا اثر تھا کہ مکہ سے جدا ہوتے وقت آپؐ نے ارشاد فرمایا:

"واللہ! تو خدائے تعالیٰ کی ساری زمین میں مجھے محبوب ہے۔ اگر تیرے لوگ مجھے باہر نہ نکالتے، تو میں ہرگز باہر نہ جاتا"

حقیقت میں یہ آپؐ ہی کا دل گردہ تھا، آپؐ ہی کا استقلال تھا، جس کو دیکھ کر ماننا پڑتا ہے کہ یہ ملکوتی قوت، اور لازمۂ رسالت کا باعث تھا، جو ایسے موقعوں پر بھی آپؐ امرِ حق سے روگردان نہ ہوتے تھے۔

سر ولیم میور جنھوں نے بہت زیادہ اپنی تحریرات میں تعصب سے کام لیا ہے، اپنی کتاب "لائف آف محمدؐ" میں جہاں ابوطالب کی نصیحت اور اپنی مجبوری کو کفار قریش کے مقابلہ میں ظاہر فرما کر سرور کائناتؐ سے اعلانِ حق سے باز رہنے پر اصرار کرتے ہیں اور سرور کائناتؐ جواب دیتے ہیں، تو ان عظمت سے لبریز الفاظ میں فوٹو کھینچتے ہیں:

"اگر منکرین میرے داہنے ہاتھ پر کرۂ آفتاب اور بائیں پر کرۂ
ماہتاب رکھ کر مجھے امرِ حق کے اعلان سے روکنا چاہیں گے، تو
میں (واللہ) باز نہ آؤں گا، تاوقتیکہ مجھے کامیابی نہ ہو یا اس
کوشش میں ہلاک نہ ہو جاؤں۔"

آخر یہ الفاظ کس طاقت نے آپ سے کہلائے اور یہ استقلال اور اولوالعزمی کہاں سے پیدا ہوئی؟ وہی قوتِ رسالت تھی، جو آپؐ کو اس قدر اولوالعزم بنائے ہوئے تھی اور یہی فرضِ رسالت اور احکامِ خدا کی پابندی تھی کہ تمام تکالیف، اور صعوبتیں جنابؐ نے برداشت کیں اور امرِ حق کو نہ چھوڑا۔

جو لوگ ان تکالیف کو کسی دنیاوی نفع پر محمول کریں، ان سے زیادہ کوئی نادان اور کور چشم نہیں۔ وُہ ذاتِ اقدس صفات جس کے اشارۂ ابرو پر لاکھوں فدائی کٹ مرنے کے لئے تیار ہوں، جس کی باج گزاری کو شاہانِ عالم فخر سمجھتے ہیں، وُہ ہو اور ایک بوریا ہو، فاقہ سے ہو، پتھر پیٹ پر بندھے ہوئے ہوں:

رہبر موسیٰؑ، ہادیِ عیسیٰؑ، تارکِ دُنیا، مالکِ عقبیٰ
ہاتھ کا تکیہ، خاک کا بستر صلی اللہ علیہ وسلم

جو سامانِ تعیش میں ایک جزو بھی نہ رکھتا ہو، کیا اس کی نسبت کہا جا سکتا ہے کہ تبلیغ ہدایت سے اس کی اور کوئی غرض تھی؟

انسان بتدریج ترقی کرتا ہے۔ ابتداً اگر وُہ اسباب پیش آمدہ سے مجبور رہتا ہے، تو اپنی آئندہ زندگی میں ان راحتوں کے تلاش کرنے کی سعی کرتا ہے، جو زمانہ مجبوری میں اسے حاصل نہ تھیں۔ لیکن آپ کو تعجب ہو گا کہ ابتداً جب کہ جنابؐ پر احکاماتِ الٰہی نازل نہ ہوئے تھے اور آپؐ کا کوئی ساتھی نہ تھا، ضروریاتِ زندگی سے فارغ البال تھے۔ بخلاف اس حکومت کے زمانہ کے جب کہ دنیا بھر کے اسبابِ تنعم آپؐ کے ادنیٰ اشارے سے حاصل ہو سکتے تھے۔

کیا اس جیسے آزاد، خود مختار زمانے اور ایسی حکومت حاصل شدہ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ایسی کوئی مثال دے سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ چونکہ یہ بحث طویل ہے، اس لئے فی الحال اس کو چھوڑ کر ہم اپنے اصل مضمونِ ہجرت پر متوجہ ہوتے ہیں۔

ہجرت کا باعث

مخالفت کی ابتداء تو اسی زمانہ سے ہوئی تھی، جب کہ لوگ اسلام قبول کرنے لگے تھے اور اُن کے معبودوں کی تذلیل شروع ہو گئی تھی۔ ہم اس زمانہ کا ذکر کر رہے ہیں، جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو تین چار سال گذر چکے تھے۔ اگرچہ ابھی تک علانیہ تلقین اسلام نہ کی گئی تھی۔ خفیہ طور سے لوگ مسلمان ہو رہے تھے اور تمام امور خفیہ ہی رکھے گئے تھے۔ مگر اب وُہ وقت نہ رہا تھا اور زمانہ آ گیا تھا کہ (روحی فداہ) حضورؐ انور علانیہ تبلیغ اسلام کریں۔ آسمانی ندا آ چکی تھی۔

"مشرکوں سے بچو اور علانیہ طور سے اُن امور کی ہدایت کرو، جن کا تم کو حکم دیا گیا ہے۔"

اس کے بعد دوسرا حکم: وانذر عشیرتك الاقربین واخفض جناحك لمن اتبعك من المؤمنین نازل ہُوا اور جنابؐ نے کوہ صفا پر چڑھ کر منادی کی،

کہ یہ قافلہ یاں سے ہے جانے والا
ڈرو اس سے جو وقت ہے آنے والا

قال فاعلموان اللہ بعثنی الیکم رسولا۔ وقراء یایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعًا ۵

یہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی | عرب کی زمین جس نے ساری ہلا دی
نئی اک لگن سب کے دل میں لگا دی | اک آواز میں سوتی بستی جگا دی

پڑا ہر طرف غل یہ پیغامِ حق سے
کہ گونج اٹھے دشت و جبل نامِ حق سے

اہلِ عرب کے دلوں میں آپؐ کی مخالفت کی آگ موجزن ہو گئی اور وہ ہر طرح آپؐ کی ایذا رسانی پر آمادہ ہو گئے انہوں نے سوچ لیا کہ اس تھوڑی سی جماعت کو اپنی طاقت کی افزونی سے کچل ڈالا جائے اور ان پر اس قدر سختیاں توڑی جائیں، کہ دوسروں کو مسلمان بننے کی ہمت نہ پڑے۔

طارق بن عبداللہ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بازار ذی المجاز میں دیکھا کہ آپؐ منادی فرماتے ہیں، لوگو! کہو لا الٰہ الا اللہ، تاکہ تمہاری فلاح ہو۔ یہ سُن کے ایک شخص نے پیچھے سے پتھر مارا، اور کہا (معاذ اللہ) اس کذاب کی باتوں کو نہ سننا۔ میں نے دریافت کیا کہ یہ کون ہے، جو لوگوں کو توحید کا سبق دے رہا ہے؟ اور یہ کون ہے، جو اس کی ایذا کا درپے ہے۔ جواب ملا، ہادی محمدؐ بن عبداللہ ہیں اور ایذا دہندہ اُن کا چچا عبدالعزیٰ (ابولہب)، ہے۔ سچ ہے،

اقارب کالعقارب فی الایذاء فلا تفرح بعمٍ او بخالٍ
فکم عمٍ یکون الغم منہ وکم خالٍ عن الاحسان خالٍ

عزیز مثل بچھوؤں کے ایذا دینے والے ہیں۔ پس کسی چچا ماموں پر ناز نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ کتنے ہی چچا باعث غم ہوتے ہیں اور کتنے ہی ماموں احسان سے خالی ہوتے ہیں۔

آخر نوبت بایں جا رسید کہ حضورؐ انور نے بعض اصحاب کو حبش کی جانب ہجرت کرنے کا حکم دیا۔ یہ ہجرت حضورؐ کی نبوت کے پانچویں سال ماہ رجب میں ہوئی۔ اس پر بھی کفار قریش نہ مانے اور نو مسلموں کے ستانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ حتیٰ کہ مہاجرین حبش کے تعاقب میں پہنچے۔ اگرچہ انہیں ناکام آنا پڑا، لیکن تعاقب کرنے میں کسر نہ رکھی۔

معاہدہ قریش کو دیمک چاٹنے کے بعد رجب کا ذکر بالتفصیل کاتب الواقدی۔ طبری وغیرہ نے کیا ہے، کچھ دنوں کے لئے آنحضرتؐ کو جزئی اطمینان ہو گیا تھا۔ لیکن بی بی خدیجہؓ کی وفات اور آپؐ کے چچا ابوطالب کے انتقال نے وُہ اطمینان مبدّل بہ اضطراب کر دیا۔ کاتب الواقدی لکھتے ہیں کہ جس وقت ابوطالب کی وفات ہونے لگی، حضورؐ انور نے پاس تشریف لے جا کر فرمایا: چچا جان! اب آپ کا آخر وقت ہے۔ کلمہ طیبہ پڑھ لیجیئے تاکہ مجھے شفاعت کا استحقاق حاصل ہو جائے۔ جواب دیا کہ میں تو کبھی کا مسلمان ہو گیا ہوتا لیکن اپنے خاندان اور آبائی مذہب کا خیال ہے۔

اس استقلال اور فرضِ منصب کو دیکھیئے۔ وُہ چچا جس نے تمام عمر آپؐ کی حفاظت کی دم توڑ رہا ہے اور آپؐ، گھبراہٹ جزع فزع کے بدلے میں اپنے منصب کو ادا کر رہے ہیں۔

ابھی نبوت کو دسواں ہی سال تھا کہ ان دو اہم دلخراش واقعات نے پیش آکر آپؐ کو بے چین کر دیا اگرچہ ابوطالب کی وفات کے بعد آپؐ کے چچا ابولہب نے حمایت کا وعدہ کر لیا تھا، لیکن وہ اپنے وعدے پر قائم نہ رہا۔ یہ زمانہ حضورؐ انور کے لئے بڑا نازک تھا اور یہ کیفیت تھی جو مجبور کر رہی تھی کہ یا تو جنابؐ اپنے دعویٰ نبوت سے دستبردار ہو جائیں، یا قریش سے دست بدست جنگ پر آمادہ ہوں۔ مانا صحابہؓ کرام آپؐ پر جان نثار کرتے تھے۔ لیکن اس ٹڈی دل جماعت،

کے مقابلہ پر یہ مٹھی بھر آدمی کیا کر سکتے تھے۔ مزید برآں بیعت عقبہ ثالثہ کا گھاؤ مشرکین کو لگا، جس سے وُہ اور بھی درہم برہم ہوگئے۔ حتیٰ کہ سعد بن عبادہ اور منذر بن عمرو کو جو نومسلموں کے تعلیمی سردار مقرر کئے گئے تھے اور اپنی جماعت سے پیچھے رہ گئے تھے، پکڑ لائے۔ سعد بن عبادہ کو تو اچھی طرح ایذا دی۔ منذر بن عمرو پنجہ سے چھُوٹ گئے۔

جماعت انصار کے جانے کے بعد آنحضرتؐ کے لئے بھی ہجرت کا ارشاد باری تعالیٰ کی جانب سے ہُوا، اور خفیہ طور سے اصحاب رسولؐ مدینہ جانے لگے۔ حضرت عمرؓ بن الخطاب کے بعد جو کہ بڑی دھوم دھام اور اعلان کے ساتھ مدینہ ہجرت کر گئے تھے، سوائے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ اور صدیق اکبرؓ کے اکابر صحابہ میں سے کوئی نہ رہا تھا۔

حضرت عمرؓ کے جانے کے بعد ایک جلسہ مشرکین قریش کا ہُوا جس میں آنحضرتؐ کے متعلق ہر شخص نے اپنی تجویز پیش کی۔ بعض کی رائے تھی کہ آنحضرتؐ کو ایک مکان میں قید کر کے دانے پانی سے ترسایا جائے اور یہاں تک مدت قید کو طول دیا جائے کہ آپؐ ہلاک ہو جائیں۔ لیکن شیطان لعین، جو شیخ نجدی کے بہروپ میں صدر جلسہ تھے، بولے کہ یہ ترکیب ٹھیک نہیں۔ آپؐ کے فدائیوں کو معلوم ہوگا، تو وُہ آپؐ کو نکال لے جائیں گے۔

دوسرے نے تجویز پیش کی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو یہاں سے نکال دو۔ جہاں اس کا جی چاہے چلا جائے۔ شیخ نجدی بولا: یہ تدبیر درست نہیں۔ محمدؐ کی چرب زبانی اور شیریں زبانی اس غضب کا جادو (معجزہ) ہے جس سے ہر جگہ اس کے فدائی پیدا ہو جائیں گے اور پھر وہی خطرہ بدستور قائم ہو جائے گا، جو پیش نظر ہے۔

جب سب اپنی اپنی کہہ چکے، تو ابو جہل بولا: سنو بھائیو! میرا خیال یہ ہے کہ ہر قبیلہ کا ایک ایک جوان منتخب ہو کر محمدؐ سے لڑے اور تاوقتیکہ اس کو قتل نہ کر لیں، پیچھا نہ چھوڑیں۔ اگر ایسا ہو گا تو خون تمام قبائل پر تقسیم ہو جائے گا۔ اور بنی عبد مناف کو تمام قبائل سے لڑنا دشوار ہو جائے گا۔ یہ تجویز باتفاق صدر جلسہ پاس ہو گئی اور سب اپنی اپنی جگہ تکمیل کی فکر میں مشغول ہو گئے۔

اِدھر تو یہ تجویزیں ہو رہی تھیں، اُدھر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر تمام حال آئینہ ہو رہا تھا۔ رتی رتی کی خبریں روح القدس کے ذریعہ سے پہنچ رہی تھیں۔ اُسی وقت ارشاد باری ہُوا، کہ آج آپ بستر استراحت پر، جو روزانہ کی آپؐ کی آرام گاہ ہے، آرام نہ فرمائیں اور کسی اپنے فدائی کو اپنی جگہ پر متعین فرما کر جانب یثرب کوچ فرمائیں۔

جب رات ہو گئی، تو باہمی قرارداد کے مطابق مشرکین نے دولت سرائے نبویؐ کا احاطہ کر لیا اور مستعد ہو گئے کہ جب آپ آرام فرمائیں، تو آپؐ کو شہید کر دیا جائے۔

رسول کریمؐ نے علیؓ ابن ابی طالب سے فرمایا: علی! مشرکین میرے قتل کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ وقت ہے کہ کوئی جان نثار میری جگہ لیٹ جائے۔ تم میرے بستر پر آرام کرو، اور یقین رکھو کہ کوئی تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ یہ وقت سخت آزمائش کا تھا اور حضرت مولا علیؓ کا ہی دل گردہ تھا کہ اِس پُرخطر مقام میں سینہ سپر ہو گئے۔

جان دینے کا جو وعدہ تھا تو حاضر ہے یہ سر　　　　لیجئے آپ کا قرضہ ہے ادا کرتے ہیں

حضرت علیؓ کو بستر پر لٹا کر حضورؐ انور دروازہ سے مشرکین کے قریب میں ہوتے ہوئے گزرے، لیکن کسی نے آپؐ کو نہ دیکھا۔ احادیث میں وارد ہے کہ جاتے وقت سرورِ کائناتؐ نے مشتِ خاک سورہ یٰسین شریف کی نو آیتیں پہلی پڑھ کر کفار پر ڈال دی تھی۔ جس کے اثر سے وُہ آپؐ کو نہ دیکھ سکے: وجعلنا من بین ایدیھم سدا ومن خلفھم سدا فاغشینٰھم فھم لا یبصرون ہ بعض نے سورہ بنی اسرائیل کی پینتالیسویں آیت کو بھی یٰسین کے ساتھ ملا کر بیان کیا ہے واذا قرأت القرآن جعلنا بینک وبین الذین لا یؤمنون بالآخرۃ حجابا مستورا ہ

بہر حال آپؐ بچ کر نکل گئے۔ کچھ دیر تشریف لے جانے کے بعد آپؐ کو ایک کافر ملا۔ لیکن وُہ اپنے کو تنہا سمجھ کر آپؐ کا مقابل نہ ہُوا اور دوڑا ہُوا اس جماعت کے پاس پہنچ کر بولا۔ تم یہاں کس لئے کھڑے ہو۔ تمہارا شکار تو یہاں سے چل دیا۔ یہ سنتے ہی اوّل تو وُہ لوگ سٹ پٹائے۔ لیکن روزنِ مکان سے دیکھا تو بستر پر کسی کو سوتے ہوئے پایا۔ نہایت خوش ہوئے اور دراتہ اندر گھس گئے۔ جب حضرت علیؓ کو کفار نے شور وشغب سے جاگ اٹھنے پر دیکھا، تو یہ لوگ سخت متعجب ہوئے اور سختی کے ساتھ حضرت مولاؓ سے رسول انورؐ کی بابت دریافت کرنے لگے، تو آپ نے فرمایا: واللّٰہ اعلم برسولہٖ کیا تم مجھے نگہبانی پر بٹھا گئے تھے، جو مجھ سے پوچھتے ہو۔ یہ سُن کر وہ تمام لوگ کھسیانے ہوگئے اور حضرت مولاؓ کو قید کر لیا۔ اس پر ابولہب نے کہا: دیوانو! جاہلو!! بھلا علیؓ کے قید کرنے سے تمہیں کیا حاصل ہوگا؟ یہ تو خود تمہاری نگاہوں کا قصور ہے

حضورِ انورؐ یہاں سے صدیق اکبرؓ کے مکان پر پہنچے۔ ایسے وقت تشریف آوری سے صدیق اکبرؓ نے گھبرا کر دریافت کیا۔ روحی فداہٗ خیر تو ہے۔ آپؐ نے ساری کیفیت سنا کر ارشادِ باری سنایا کہ ہجرت کا حکم ہے۔ جھٹ پٹ سامانِ سفر درست کر دیا گیا اور آپؐ صدیق اکبرؓ کی ہمراہی میں غارِ ثور پر تشریف لے گئے۔

یہ راستہ حضورِ انورؐ نے نہایت سختی کے ساتھ کاٹا۔ اس خیال سے کہ کہیں مشرکین عرب پتا نہ لگالیں۔ حضورِ انورؐ نے جُوتے اتار ڈالے تھے، جس سے حضورؐ کے پائے مبارک میں آبلے پڑ گئے اور خون بہنے لگا۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے جب حضورؐ کی یہ حالت دیکھی، تو آپ سے نہ رہا گیا اور اپنے کندھوں پر جنابؐ کو بٹھا کر غارِ ثور پہنچایا۔ غارِ ثور مکہ سے دکھن کی سمت ڈھائی میل کے فاصلے پر تھا۔ اس لئے اعتراض ہو سکتا ہے کہ اس تھوڑے سے سفر میں چھالے اور زخموں تک کیوں نوبت پہنچا دی۔ لیکن نہیں، جو شخص ایسی اندیشناک حالت میں رات کے وقت جنگل کا اور جنگل بھی خار آلود، کا سفر کرے اور جس کو اپنی عمر کے حصہ میں کبھی ایسی حالت نہ پیش آئی ہو، اگر اس سے زیادہ اسے تکلیف پہنچی، تو تعجب نہیں۔

درِ غار پر حضورِ انورؐ کو کھڑا کر کے صدیق اکبرؓ خود اندر گئے اور اس تاریک گڑھے کو ہاتھوں سے صاف کیا تمام سوراخوں کو اپنی قیمتی چادر پھاڑ پھاڑ کر بند کر دیا۔ ایک سوراخ جو رہ گیا تھا، اس کو پیر کے انگوٹھے سے بند کر کے حضورِ انورؐ کو آواز دی کہ اب جنابؐ تشریف لے آئیں۔ اس سوراخ میں سے کئی زہریلے جانوروں نے آپ کو کاٹا، جن کے اثر سے آپ کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ جب حضورِ انورؐ نے صدیق اکبرؓ کی یہ حالت دیکھی تو دعا فرمائی اور آبِ دہن اس مقام پر لگا دیا، جس سے زہر کا اثر اور تکلیف جاتی رہی۔ غار میں مشرکین کے خیالات اور ارادے عبداللہ بن ابوبکر کی معرفت آپؐ کو معلوم ہوتے تھے اور خورد و نوش کا انتظام عامر بن فہیرہ کے متعلق تھا جو رات کو بکریوں کا دودھ پہنچایا کرتے تھے۔

تین دن کے قیام کے بعد حسبِ قرار داد عامر ابن ہیرہ اور عبداللہ ابن اریقط اونٹ ورغار پرلے آئے۔ ایک اونٹ پر صدیق اکبرؓ اور رسول کریمؐ اور دوسرے پر عامر و عبداللہ سوار ہو کر ساحل کے راستہ سے مدینہ روانہ ہو گئے۔ ایک دن ایک رات کہیں قیام نہ کیا۔ دوسرے دن دھوپ کی تیزی اور ریگستانی میدان کی تپش سے مجبور ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صدیق اکبرؓ نے ایک پتھر کی آڑ میں زمین صاف کر کے اپنا پوستین بچھا کر آرام کے لئے عرض کیا۔ تھوڑی دیر آرام فرما کر حضورؐ اور پھر وہاں سے عازمِ سفر ہوئے۔

اس دردانگیز سفر میں ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا کہ سراقہ ابن مالک جو مشرکین کا اعلان حضورؐ کی گرفتاری اور انعام کو سن چکا تھا اور جس کو ایک مسافر کی زبانی معلوم ہو گیا تھا کہ فلاں راستہ سے تین مسافر جا رہے ہیں اور جس نے قیاساً سمجھ لیا تھا کہ درحقیقت یہ مختصر قافلہ رسولؐ اور اصحاب رسولؐ کا ہے۔ جنابؐ کے تعاقب میں چلا۔ اس کا بیان ہے کہ جب میں اس مختصر قافلہ کے قریب پہنچا، میرے گھوڑے نے چراغ پا ہو کر مجھے پٹک دیا۔ چونکہ مجھے چوٹ نہیں آئی تھی، اُٹھ کر پھر سوار ہو گیا۔ حتٰی کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب پہنچ گیا اور آپؐ کی گفتگو کو جو آپؐ صدیق اکبرؓ سے فرما رہے تھے، میں سُننے لگا۔ میں نے تیر مارنے کا ارادہ کیا لیکن ساتھ ہی میرے گھوڑے کے اگلے پیر زمین میں دھنس گئے اور میں گر پڑا۔ چونکہ چوٹ اب کی مرتبہ بھی نہیں آئی تھی، گھوڑے پر سوار ہو کر چاہا کہ اس کو آگے چلاؤں، ممکن نہ ہُوا۔ آخر مجبور ہو کر میں نے کہا کہ یا محمدؐ آپ پر حملہ کرنے کی وجہ سے مجھ پر یہ مصیبت پڑی ہے۔ دعا کیجئے کہ میں اس سے نجات پاؤں۔ جنابؐ نے کچھ التفات نہ کیا۔ جب میں نے قسم کھائی کہ میں آپؐ کے ساتھ دغا نہ کروں گا اور اپنے بے زبان گھوڑے کی ہلاکت کا عذر کیا تو آپؐ نے فرمایا: اللھم ان کان صادقا فاطلق فرسہ فوراً میرے گھوڑے کے پیر زمین سے نکل آئے۔ میں نے اپنے موجود مال و متاع کو پیش کیا، کہ آپؐ اس کو قبول فرمالیں۔ لیکن آپؐ نے اس کو محض بے ضرورت بتایا اور میری التماس پر ایک امان نامہ مجھے لکھ کر دے دیا۔ امان نامہ لے کر میں واپس ہُوا اور جو شخص مجھے ملا، اس سے کہہ دیا کہ میں دُور دُور تلاش کر آیا، کہیں پتا نہیں اور تمام تلاش کرنے والوں کو واپس کر دیا۔

امام بخاری اس روایت کو لکھ کر کہتے ہیں کہ سراقہ نے اس امان نامہ سے جنگِ حنین میں فائدہ اٹھایا تھا اور مسلمان ہو گیا تھا۔

دوسرا واقعہ ام معبد بنت خالد خزاعی کا ہے، جو مسافروں کی خاطر داری کیا کرتی تھیں لیکن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہنچے، تو قحط کا زمانہ تھا اور اس کی بکریاں کچھ مر چکی تھیں اور جو ایک آدھ تھی، وہ مرنے کے قریب تھی۔ دودھ دینا تو کجا۔ آپؐ نے اس بکری سے جو کسی صورت سے دودھ دینے کے قابل نہ تھی، دودھ دوہا اور اپنے اصحاب کو پلا کر خود پیا اور ام معبد کے برتنوں کو بھی دودھ سے بھر دیا۔

تیسرا واقعہ بریدۃ بن الخصیب الاسلمی کا ہے، جو حضور انورؐ کی تلاش میں نکلے تھے اور قریب پہنچنے پر آپؐ کی معجز بیانی کے اثر سے بجائے حملہ کرنے کے مسلمان ہو گئے تھے اور مدینہ تک علم برداری کی خدمت کے لئے تیار ہو گئے۔

اس سے آگے صدیق اکبر کے عزیز طلحہ یا باختلاف روایات زبیر ابن عوام کا قافلہ ملا، جو آپؐ کے ساتھ مدینہ جانا چاہتا

تھا، مگر آپؐ نے یہ کہہ کر کہ تم مکہ ہو کر مدینے آؤ تاکہ مہاجرین کی صف میں شامل ہو جاؤ، ان کو واپس کر دیا۔ راستہ میں حضورؐ انور نے بادِ صرصر کے گرم جھونکوں اور ریگستانی زمین کی تپش سے بہت تکلیف پائی۔ جب سواد مدینہ نظر آنے لگا اور وہاں کے باغات عمارتیں، چھوٹے چھوٹے مکانوں کا سلسلہ پیش نظر ہوا تو آپؐ بہت خوش ہوئے۔

کاتب الواقدی لکھتے ہیں کہ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے اس راستہ سے سفر نہیں کیا تھا، نہ آپؐ کو زیادہ تر لوگ پہچانتے تھے، اس لئے بھی جیسا چاہیئے تھا آپؐ کا سراغ نہ مل سکا۔

اہلِ مدینہ کو پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا اور وہ لوگ روزانہ شہر سے باہر آ کر ان توحید کی منادی کرنے والے مسافروں کا انتظار کیا کرتے تھے۔ جس دن حضورؐ مدینہ میں داخل ہوئے سلہ ۸ رجون ۶۲۲ء تھی۔

اہلِ مدینہ نے آپؐ کی تشریف آوری پر بے انتہا شادمانی کا اظہار کیا اور ہر طرح جان و مال سے ساتھ دینے پر آمادگی ظاہر کی۔ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت سے لوگ ناواقف تھے، اس لئے بعض کو غلط فہمی ہوئی۔ یہ دیکھ کر حضرت ابوبکرؓ نے جس طرف سورج کی شعاعیں پہنچ رہی تھیں، آپؐ کو کھڑا کر دیا۔ چونکہ ذات اقدس واطہر کا سایہ نہ تھا، عام لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ آپؐ رسول خدا ہیں۔

آپؐ کا اصل قیام تو کلثوم ابن الہدمی کے مکان پر تھا لیکن عام نشست کے لئے ابو سعد بن خیثم کا مکان بوجہ اس کے مکان مردانہ ہونے کے تجویز کیا گیا تھا۔ یہ مکان محلہ قبا میں تھا۔ جس میں سب سے پہلے حضورؐ نے مسجد کی بنا ڈالی۔ اس مسجد کی بابت قرآن مجید میں ارشاد ہے لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى (توبہ ۱۰۸)۔ اور یہیں حضرت مولاؓ مکہ سے چھپ چھپا کر پیادہ پائی کی تکلیفیں اٹھاتے ہوئے پہنچے تھے۔

(اختلافِ روایات کو پیشِ نظر رکھ کر) دس روز یا آٹھ روز یا بیس روز کے بعد جنابؐ نے (شہر خاص) مدینہ کی جانب چلنے کی تیاری کی۔ اور مدینہ پہنچ کر ابو ایوب انصاری کے مکان پر قیام فرمایا۔ جس روز حضورؐ مدینہ پہنچے، جمعہ کا دن تھا اور یہی پہلا جمعہ تھا، جو آپؐ نے خطبہ پڑھا اور نماز جمعہ ادا کی۔

قیام کی بابت ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو یہ شرف بخشیں۔ لیکن آپؐ نے فرما دیا تھا کہ میرا ناقہ مامور ہے، جہاں یہ قیام کرے گا، وہیں میرا قیام ہے۔ چنانچہ ناقہ کا پہلا قیام اس مقام پر ہوا، جہاں مسجد نبویؐ ہے اور دوسری مرتبہ وہاں جا کر بیٹھا، جہاں منبر شریف ہے۔ سب سے زیادہ قریب اس مقام سے ابو ایوب انصاری کا مکان تھا۔ جہاں آپؐ نے قیام فرمایا۔

اسی مقام پر عبداللہ ابن سلام جو مشاہیر علمائے یہود اور اولاد حضرت یوسفؑ سے تھے آ کر مشرف باسلام ہوئے۔ ہجرت کے پہلے ہی سال مسجد نبویؐ کی بنیاد پڑی۔ اسی سال اذان کا حکم ہوا۔ اسی سال بیت المقدس سے کعبہ کی طرف نماز پڑھنے کا حکم ہوا۔

مسجد نبویؐ کو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحابؓ نے اینٹیں اور گارا ڈھو کر بنایا ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ مسجد تمام مساجد عالم سے زیادہ بزرگ اور قابل تعظیم مانی جاتی ہے۔

حیاتِ نبویؐ میں غاروں کی اہمیت

سید جلال حامدی

ابتدائے آفرینش سے آج تک انسان کی طبیعت یہ چاہتی رہی ہے کہ اس کو راحت و سکون میسر آئے۔ تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ اکثر انبیاء و رسل نے تلاش سکون اور یکسوئی قلب کے لیے پہاڑوں یا کوہستانی غاروں میں پناہ لی۔ انسان نے سب سے پہلے غاروں ہی کو اپنا پہلا مسکن بنایا تھا اور ان سے انسان کو ہمیشہ کچھ نہ کچھ تعلق رہا ہے۔

پہاڑوں کو تراش کر اپنے معبد اور رہائش گاہیں بنانے میں فراعنہ مصر کو بہت شہرت ہوئی اور آج بھی ان کی عظیم یادگاریں موجود ہیں، جو عجائبات میں شمار ہوتی ہیں۔ قرآن پاک نے بھی فرمایا ہے کہ "وہ لوگ پہاڑوں کو تراش کر رہتے تھے۔" اس طرح ہندوستان اور چین کے رشی منی، اوتار بھی پہاڑوں میں گپھائیں بنا بنا کر رہتے اور گیان دھیان میں مصروف رہتے تھے۔

حضرت آدمؑ کی جب توبہ قبول ہوئی تو "جبل رحمت" پر ہی حضرت حوا سے ان کی ملاقات ہوئی اور اسی کی یادگار وہ جگہ ہے جس کا نام "عرفہ" یا "معرفت" یعنی پہچان کی جگہ ہے۔ حضرت نوحؑ کی کشتی "اراراط" پہاڑ پر جا کر رکی تھی۔ سیدنا موسیٰؑ کو کوہ طور پر ہی تجلی و کلام کا شرف عطا ہوا تھا۔ غرض پہاڑوں کا انسان کی روحانی عظمت و رفعت کی داستان سے بھی گہرا تعلق ہے۔ قرآن پاک میں یارانِ غار (اصحاب کہف) کا تذکرہ دیکھئے۔ سورہ کہف (یعنی غار والی سورۃ) میں فرمایا گیا ہے کہ اصحاب کہف چند صالح اور نیک مرد تھے۔ ان کے زمانہ میں وقیانوس نامی کوئی بادشاہ تھا۔ یہ بڑا ظالم بھی تھا اور شرک کا بھی مرتکب تھا۔ لوگوں سے جبر یہ بتوں کی پوجا کراتا اور جو نہ مانتا، اسے سنگسار کرا دیتا تھا۔ مگر یہ لوگ شرک و بت پرستی سے بیزار ہو چکے تھے اور بادشاہ کے خوف سے ایک غار میں پناہ کے لیے چلے گئے تھے۔

خدا تعالیٰ نے ان پر نیند مسلط کر دی اور ان کے لیے غار ہی میں مکمل حفاظت کا انتظام کیا۔ اس غار میں نہ کوئی اندر جا سکتا اور نہ بارش یا دھوپ ان کو پریشان کر سکتی۔ یہ لوگ قیامت تک اسی غار میں سوتے رہیں گے۔ خدا کے عظیم پیغمبر سیدنا عیسیٰؑ نے بھی بیت المقدس میں کوہ زیتون کی ایک کھوہ میں قیام فرمایا اور وہیں تبلیغ فرماتے تھے یہاں سے ہی آپ کو یہودیوں نے سولی پر چڑھانے کے لیے گرفتار بھی کیا تھا۔ مگر سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ایک ایسے ہادی کی ضرورت تھی جو تمام کائنات کے لیے آخری پیغمبر ہو۔ چونکہ ابھی تک اللہ کے پیغمبر اپنی اپنی آبادیوں میں جماعتوں گروہوں اور برادریوں کی ہدایت کے لیے آتے رہتے تھے، لیکن دنیا کو اب ایسے ہادی کی ضرورت ہو چکی تھی، جو ان تمام ہدایتوں کا جامع ہو۔ اس وقت دنیا میں ہر طرف جہالت، گمراہی نے اپنا اڈہ بنا رکھا تھا، حالانکہ اس وقت کی دنیاوی ترقی کے لحاظ سے لوگ بہت آگے تھے مگر پھر بھی وہ روحانی ترقی کے معاملہ میں پیاسے تھے یا بھٹکتے ہوئے۔ خود عرب میں معاشرہ کی حالت یہ تھی کہ بت پرستی عام تھی اور وہی ہر برائی کی جڑ تھی۔ عرب کے باشندوں پر ان کی اپنی خود مختاری نے بہت برا اثر ڈالا تھا۔ اس خود مختاری سے خود سری اور سرکشی پیدا ہوئی۔ انہوں نے اپنی شجاعت اور جرأت کا نشانہ خود اپنے ہی بھائیوں کو بنا رکھا تھا۔ بیکاری، کاہلی، جوا، شراب عام تھی۔ غیر ممالک سے الگ تھلگ رہنے کی وجہ سے ان کی زبان بے شک بڑی فصیح تھی مگر اس فصاحت کا استعمال زیادہ تر خود ستائی اور اپنے فحش کارناموں کے اظہار کے لیے وقف تھا۔ الگ رہنے کی وجہ

سے معاہرت (سسرالی رشتہ) کی برائیاں غلط طور پر ان کے ذہنوں پر مسلط ہو چکی تھیں۔ مدعیان شرافت بڑی دیدہ دلیری اور فخر سے اپنی بیٹیوں کو زمین میں زندہ دفن کر دیا کرتے تھے۔ جہالت نے بت پرستی کو پیدا کیا اور اس نے وساوس و توہم کو۔ دنیا اس گمراہی اور تاریکی میں گھری ہوئی تھی۔ کہ آفتاب ہدایت طلوع ہوا۔

ربیع الاول کے مہینے میں دوشنبہ کے مبارک دن یہ آفتاب طلوع ہوا۔ ابتدائی عمر حضرت حلیمہؓ سعدیہ کے ہاں صحرانشینی، گلہ بانی میں گزری تاکہ قوت عظمت اور جہاں بانی کی صلاحیتیں پیدا ہوں۔ چار سال کے بعد واپسی ہوئی۔ چھ سال کی عمر میں حضرت آمنہؓ جیسی عظیم ماں بھی اللہ کو پیاری ہو گئیں مگر دنیا میں آپ کے دادا حضرت عبدالمطلب کا سایۂ عاطفت موجود تھا۔ ماں کے دو سال بعد متقدس بزرگ دادا نے بھی رفاقت دنیا چھوڑ دی تو حضرت ابوطالب نے اس عظیم الشان امانت کو سنبھالا اور جواں مرگ بھائی کی موت کا صدمہ اس نورانی بھتیجے کو دیکھ کر دور ہوتا چلا گیا۔ آپؐ کی عمر بارہ سال کی تھی کہ چچا کے ساتھ تجارت کی غرض سے شام بھی تشریف لے گئے۔ اس کے بعد آپ نے بصرہ و یمن کے بھی متعدد سفر فرمائے۔

کون ایسا باکمال مصور ہوگا، جو اپنے موئے قلم سے اس پاکباز، پارسا، باحیا، خوش شکل نوجوان کے کردار کی عظمت، حشمت، امانت، وجاہت، جلالت کی صحیح تصویر کھینچ سکے۔ آپؐ کے حسنِ معاملہ اور مستعدی کو دیکھ کر حضرت خدیجہؓ نے شریکِ زندگی بننے کا اظہار فرمایا۔ خدا پر ایمان اس عظیم الشان رسول کی جان تھی۔ کفر و شرک کی رسموں سے پرہیز ان کی سرشت میں تھا۔ حضورؐ کے سامنے ایک عظیم الشان انقلاب لانے کا کام تھا اور حضورؐ برابر اس مقدس مشن کے لیے کام کر رہے تھے اور دنیا میں ایک نئے معاشرہ کو جنم دے رہے تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بعثت سے سات برس پہلے ایک روشنی اور چمک سی نظر آنے لگی تھی اور آنحضرتؐ اس روشنی کے معلوم ہونے سے خوش ہوا کرتے تھے۔ اس چمک میں کوئی آواز یا صورت بھی نہ ہوتی تھی۔ بعثت کا زمانہ جس قدر قریب ہوتا گیا، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مزاج میں خلوت گزینی کی کشش بڑھتی گئی۔ آپ راتوں کو ایک غار میں چلے جاتے۔ یہ غار مکہ مکرمہ سے تین میل کے فاصلے پر ہے اور جبل نور کی بلندی سے ذرا نیچے اتریں تو کعبہ شریف کی جانب ایک غار ہے۔ اس غار کا طول چار گز اور عرض پونے دو گز کے قریب ہے۔ غار کے قبلہ کی سمت ایک لمبا سا شگاف بھی ہے، جس میں سے کعبہ صاف نظر آتا تھا۔ حضورؐ اس غار میں اکثر زمزم اور ستو وغیرہ لے کر تشریف لے جاتے اور عبادت میں وقت گزارتے۔ اس عبادت میں تحمید و تقدیس الٰہی کا ذکر شامل ہوتا۔ اور قدرت الٰہیہ پر تدبر و تفکر بھی۔ جب تک پانی اور ستو ختم نہیں ہوتے، شہر میں تشریف نہ لاتے۔ غار حرا کی ان سکوت زا تنہائیوں کی کیفیتوں کا صحیح علم تو نبی ہی کو ہو سکتا ہے۔ مگر آج بھی ہم جیسے گناہ گار اور ناچیز امتیوں کو اس غار میں ایک عجیب شان اور عجیب سکون اور رحمت کا احساس حاصل ہونے لگتا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اس غار کو حضورؐ کی ذاتِ اقدس سے نسبت رہی ہے۔

غار حرا میں پہلی وحی

عرب کا روشن ضمیر آتا، غار حرا کی تاریکیوں میں نور کی جھلک دیکھنے لگا۔ اس کے خواب سچے اور الہام صحیح ثابت ہونے لگے پانچ برس تک یہی کیفیت رہی، مگر آپ کی روح اس سے زیادہ بلندی و رفعت کی طلب گار تھی اور وہ جوہر قابل براہ راست اکتساب علم کی صلاحیت بھی رکھتا تھا۔ اس لیے عمر کے اکتالیسویں سال ۱۲ر فروری ۶۱۰ء کو اسے وہ منصب جلیل عطا ہوا، جس کا اہل اس کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ لیلۃ القدر کی اس سعید ساعت کو خدا کا پیامی جبرائیلؑ دنیا کے آخری پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غار حرا میں اللہ کا پہلا پیغام لے کر آیا اور آتے ہی کہا۔

اقرا باسم ربك الذی خلق خلق الانسان من علق o اقرا و ربك الاکرم الذی

علم بالقلم ٥ علم الانسان ما لم یعلم ٥

(پڑھ اس خدا کا نام جس نے کائنات کو پیدا کیا۔ پڑھ تیرا خدا کریم ہے، وہ جس نے انسان کو قلم کے ذریعہ علم سکھایا، وہ جس نے انسان کو وہ باتیں سکھائیں جو اس کو معلوم نہیں تھیں)

روایت ہے کہ جب جبرئیلؑ غار حرا میں ظاہر ہوئے تو کہا "پڑھ" آپؐ نے فرمایا "میں تو پڑھنا نہیں جانتا" تب حضرت جبریلؑ نے آپ کو سینے سے لگا کر خوب زور سے دبایا اور پھر وہی الفاظ دہرائے۔ مگر پھر وہی جواب پایا۔ پھر اسی طرح دبایا۔ بغرض تیسری مرتبہ جواب سننے کے بعد حضرت جبریل نے پانچ آیتیں پڑھیں۔ اس واقعہ سے بے حد متاثر ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم گھر تشریف لائے اور لیٹ گئے حضرت خدیجہؓ سے کہا کہ مجھے کمبل اڑھا دو چنانچہ کمبل اڑھا دیا گیا۔ جب کچھ دیر بعد ذرا سکون خاطر ہوا، تو آپ نے خدیجۃ الکبریٰؓ کو غار حرا کی سرگزشت من وعن کہہ سنائی اور کہا مجھے جان کا خوف ہے۔ بیوی جس کی نظر خاوند کے بلند اخلاق پر تھی، پکار اٹھیں کہ یہ واقعہ آپ کو مبارک ہو۔ خدا ہرگز آپ کو رسوا نہیں کرے گا۔ کیونکہ آپ قرابت داروں سے حسن سلوک کرتے ہیں، ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔ لوگوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، فقیروں مسکینوں کی مدد کرتے ہیں، مسافروں کی مہمانی فرماتے ہیں۔ اچھے کام کرنے والوں کے مددگار ہیں، خدا آپ کو کبھی اندوہگیں نہ کرے گا۔ اب خدیجۃ الکبریٰؓ کو خود بھی اطمینان قلب کی ضرورت ہوئی۔ اس لیے وہ نبیؐ کو ساتھ لے کر اپنے چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں، جو بڑھاپے کی وجہ سے بینائی سے محروم ہو چکے تھے۔ اور کہا۔

"اے بھائی! اپنے بھتیجے کا ماجرا سُن" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غار حرا کا واقعہ سنایا تو ورقہ بن نوفل نے کہا، یہ وہی ناموس ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اترا تھا۔ اے کاش میں اس وقت تک زندہ رہوں، جب کہ تمہاری قوم تم کو نکال دے گی اور کہا۔ ہاں جس کو لے کر تم آئے ہو اس کو لے کر کوئی آدمی نہیں آیا جس سے لوگوں نے دشمنی نہ کی ہو۔ اگر اس زمانہ تک زندہ رہا، تو تمہاری ہر طرح مدد کروں گا۔ افسوس یہ روشن قلب بزرگ جلد ہی فوت ہو گئے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس خوف کا اظہار فرمایا تھا۔ وہ ان معاملات کی ابتدا، اور بشریت کے تقاضے کے باعث تھا۔ کون نہیں جانتا کہ ایک نامعلوم وادی میں پہلا قدم کس قدر جھجک پیدا کرتا ہے۔ پھر غار کی تاریکی میں فرشتے کا زور زور سے بھینچنا سوائے خوف کے اور کیا کیفیت پیدا کر سکتا ہے۔ یہ واقعہ بھی آنحضرتؐ کی سچائی کی دلیل ہے۔ کچھ دنوں کے بعد پھر فرشتہ آیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو، جنہوں نے ابھی تک پڑھنا لکھنا نہیں سیکھا تھا۔ خدا کا وہ پاک نام اور کلام پڑھایا، جو سارے علموں کی کنجی اور ساری حقیقتوں کا خزانہ ہے۔

اس کے بعد روح الامین کوہ میں آئے اور نبیؐ کے سامنے خود وضو کیا اور حضورؐ نے بھی وضو کیا۔ دونوں نے مل کر نماز پڑھی اور روح الامین نے نماز پڑھائی حضرت جبریلؑ کے ظہور اول کے بعد چھ ماہ تک کوئی آیت نہیں اتری۔ وحی کے التوا کا زمانہ زیادہ سے زیادہ چھ ماہ رہا۔ اس کو زمانہ "فترت" کہتے ہیں۔ اس زمانہ میں بھی حضرتؐ برابر غار حرا میں جاتے رہے اور شبستان دل کو نور حق سے منور کرتے رہے۔ طالب صادق کے امتحان کی یہ اول منزل ختم ہو گئی۔ تو ایک دن پھر جب کہ حضورؐ غار حرا سے نکل کر گھر آ رہے تھے، اس فرشتے کا ظہور ہوا۔ آپ پر وہی کیفیت پھر طاری ہوئی مگر تھوڑی ہی مکان پہ پہنچ کر کپڑا اوڑھ کر لیٹ گئے۔ اتنے میں کان میں یہ پر جلال آواز آئی۔

یا ایہا المدثر ٥ قم فانذر ٥ وربک فکبر ٥ وثیابک فطهر ٥ والرجز فاهجر ٥

(اے چادر اوڑھنے والے! اٹھ اور ان لوگوں کو عذابِ الٰہی سے ڈرا اور اپنے رب کی بڑائی اور کبریائی بیان کر۔ اپنے کپڑوں کو پاک کر، نجاست یعنی شرک و بدی سے جدائی اختیار کر)

غور فرمایئے پہلی وحی میں عطائے علم کی بشارت تھی، اس وحی میں اشاعتِ دین کا حکم ہوا۔ یہ دینِ وحی تھا۔

جب تبلیغ دین کا حکم پایا، تو سب سے پہلے گھر سے ہی اس کارِ خیر کو شروع کیا۔ سب سے پہلے خدیجۃ الکبریٰؓ نے دعوت اسلام قبول فرمائی، پھر حضرت علیؓ اور حضورؐ کے غلام حضرت زیدؓ نے دین کی دولت پائی۔ اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ کو یہ عزت نصیب ہوئی جو حضورؐ کے نور سے پہلے ہی مستنیر تھے، وہی پہلے آپ کی صداقت کے قائل ہوئے پھر رفتہ رفتہ حضرت ابوبکرؓ کی سعی و کوشش سے حضرت عثمان غنیؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ، حضرت سعد بن وقاصؓ فاتح ایران اور حضرت طلحہؓ ایمان لائے۔ ان کے علاوہ حضرت عمارؓ، خباب بن الارتؓ، ارقمؓ، سعد بن زیدؓ، عثمان ابن مظعونؓ، عبیدہ ابن جراحؓ، صہیب رومیؓ السابقون الاولون میں سے ہیں۔

اسلام چونکہ امن و سلامتی کا مذہب ہے، اس لیے شر و فساد کے برعکس ہے۔ چنانچہ اس احتمالِ شر کے پیشِ نظر، توحید و رسالت کی تبلیغ کو ابتدا میں عام نہ کیا۔ اس خاموش تبلیغ سے جو تین برس سے ہو رہی تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حلقہ میں مومنین اور مخلصین کی تعداد (مستورات سمیت) کل چالیس جانوں سے زیادہ نہ تھی۔

اب چوتھے سال یہ حکم آیا۔

"فاصدع بما تومر"

(اور جو کچھ تجھ کو حکم دیا گیا ہے، وہ نشگاف کہہ دے)

جونہی یہ حکم آیا، آپ نے کوہ صفا کی چوٹی پر چڑھ کر پکارا "اے اہلِ قریش دوڑو"۔ لوگ حسبِ دستور اس کو یقینی خطرہ کا نشان سمجھ کر دوڑ پڑے جب سب جمع ہو گئے، تو آپ نے دنیا و آخرت کا حقیقی خطرہ بطور استعارہ یوں بیان فرمایا کہ میں اگر تم سے کہوں کہ اس پہاڑ کے عقب میں، ایک لشکرِ جرار تمہاری گھات میں ہے، تو کیا تم میری بات کا یقین کر لو گے سب نے کہا۔ ہاں کیونکہ ہم نے ہمیشہ آپ کو سچ بولتے سنا ہے تو میں کہتا ہوں کہ اگر ایمان نہ لاؤ گے تو سخت عذاب نازل ہوگا۔

لوگ اسے بے حقیقت بات سمجھ کر مذاق اڑاتے رہے اور گالیاں دیتے رہے اب دشواریوں کے سخت مقابلہ کا وقت آگیا۔ حضورؐ پر اور حضورؐ کے عشاق پر طرح طرح کے ظلم و ستم ہونے شروع ہوئے جس کے بیان کرنے کا یارا نہیں۔ آپ کا دشمن اول ابوجہل، عقبہ بن ابی معیط اور اس کے ساتھی تھے۔ جب مشرکوں اور کافروں کے جبر و تشدد کو مسلمانوں پر سہتے ہوئے پورے پانچ برس ہو گئے، تو آنحضرتؐ نے مومنین کی اس جماعت کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت عطا فرمائی اور مہاجرین کی یہ پاک جماعت مکہ سے ہجرت کر کے حبشہ چلی گئی۔

تکالیف و مصائب کا لامتناہی سلسلہ بڑھتا جا رہا تھا کہ نبوت کے دس سال پورے ہوئے، حضورؐ کے عظیم تدبر کے شاہسوار، محسن عاشق، چچا سید ابوطالب بھی سفرِ دنیا طے کر گئے، حضورؐ پر اس صدمہ جانکاہ کا حال بیان سے باہر ہے۔ ابھی حضرت ابوطالب کا کفن میلا بھی نہ ہوا تھا کہ حضورؐ کی پرستار، حضورؐ پر سب کچھ قربان کر دینے والی، شریکِ حیات سیدہ خدیجۃ الکبریٰؓ بھی اس دنیا سے سدھار گئیں۔

اب قیاس کیجئے ان دو صدموں سے حضورؐ کے لیے دنیا کیسی اندھیر ہو گئی ہوگی۔ چنانچہ اس وجہ سے تاریخ اسلام میں اس سال کو عام

حزن یا سال غم کہتے ہیں۔ انہی گھنگور مایوسیوں میں امید کی پہلی کرن پھوٹی کہ آنحضرتؐ ایامِ حج میں تبلیغ دین فرماتے لوگوں کے درمیان میں سے گذر رہے تھے کہ چند سعید و منور روحیں حضور کو نظر آئیں۔ آپ نے ان کا حسب و نسب پوچھا معلوم ہوا کہ مدینہ (پاک) کے رہنے والے، بنی خزرج (قبیلہ) کے لوگ ہیں۔ حضورؐ نے ان کو دعوت دی، کلامِ پاک سنایا، یہ لوگ تہی دست آئے تھے، اب دامنوں کو دولتِ ایمان سے بھر کر واپس ہوئے ادھر کفارِ اسلام کے قلوب تبلیغ دین کی اس کامیابی سے مارے غصّے کے پھنک رہے تھے۔ وہ سخت پیچ و تاب میں تھے اور اس طرح تقریباً ایک سال بیت گیا۔ پھر دوسرا حج آ گیا۔ پھر اہل مدینہ سے چند بزرگ پُر نور ہستیاں آئیں۔ نُور سے مُنوّر ہو کر واپس مدینہ گئیں اور حضورؐ نے ان کو تبلیغ کا حکم دے دیا کہ وہ بھی باقاعدہ تبلیغ کریں۔ حضورؐ نے اہلِ مکہ کی ایذا رسانی کے پیشِ نظر نقل مکانی کا بھی حکم دے دیا۔ مدینہ کے مسلمان ہر چند کہ تنگ دست تھے مگر انہوں نے مظلوموں اور مہاجرین کی دل کھول کر امداد کی جس کی مثال دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ یہ لوگ آہستہ آہستہ سب خطروں سے نکل کر دارالامان مدینہ پہنچ گئے لیکن سالارِ قافلہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ دشمنوں کے زغہ میں پھنسے ہوئے تھے۔ آخر ان بڑی بڑی آزمائشوں کے بعد اللہ تعالیٰ کا خاص انعام جو کسی دُوسرے رسُول و نبی کو نہیں ملا۔ وہ واقعہ معراج پیش آیا اور اب احکم الحاکمین کے حکم کا انتظار تھا۔ قریش بھی ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے کہ مسلمانوں کو ہجرت نہ کرنے دیں۔

اب آنحضرتؐ، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ تھے۔ کفار نے اپنی ایک فیصلہ کن مجلس مشاورت طلب کی۔ اس جلسہ کا سرغنہ ابوجہل تھا۔ مقصود یہ تھا کہ ہر قبیلے سے ایک شخص لیا جائے اور سب یکبار سرکار دو عالمؐ رحمۃ للعالمین پر ٹوٹ پڑیں اور اس شمع کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بجھا دیں۔ اس وجہ سے سرِ شام ہی تمام گھات میں کھڑے ہو گئے کہ جونہی صبح حضورؐ گھر سے نکلیں، سب تلواریں سونت پر ٹوٹ پڑیں۔ مگر اعداد کے اس منصوبے سے قبل ہی پروردگارِ عالم نے اپنے محبوب کو ہجرت کا حکم عنایت فرما دیا تھا۔ ہجرت سے دُو روز پہلے یہ حکم پا کر سردار الانبیاؐ لوگوں کی نگاہوں سے بچتے بچاتے دوپہر کے موزوں وقت صدیق اکبرؓ کے گھر پر تشریف لائے۔ حضرت ابوبکرؓ نے پیشوائی فرمائی۔ آنحضرتؐ نے تخلیہ میں ابوبکرؓ کو نوید ہجرت سنائی۔ نہ معلوم کب سے حضرت ابوبکرؓ ہمرہی کے شرف کے لیے بارگاہ ایزدی میں دعائیں فرما رہے تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت انہی کے لیے وقف فرمائی۔ آپؓ نے فرمایا کہ میرے ماں باپ آپؐ پر فدا ہوں، کیا شرف ہمرہی مجھ کو عطا کیا جائے گا۔ حضورؐ نے فرمایا "ہاں" اس شرفِ عظیم پر صدیق اکبرؓ فرطِ انبساط سے رو پڑے

حضرت ابوبکرؓ نے نہایت عجز سے عرض کیا، کہ اس مبارک دن کے لیے میں نے ببول کی پتیاں کھلا کر دو اونٹنیاں پال رکھی ہیں۔ ان میں سے ایک حضورؐ پسند فرما کر میری عزت افزائی فرمائیں۔ حضورؐ نے ایک کی قیمت ان کو عطا فرما دی۔ حضرت ابوبکرؓ نے پاس ادب سے قیمت قبول کر لی۔

ہر چند کہ ظالم کفار نے اپنی اس سازش کو بہت زیادہ راز میں رکھا تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے حضورؐ پر سب کچھ منکشف فرما دیا تھا۔ آنحضرتؐ کو اُن رات مکہ سے نکل جانے کا حکم مل چکا تھا۔ اس لیے حضرت علیؓ کو طلب فرمایا اور کہا "علیؓ ہمیں ہجرت کا حکم آ گیا ہے۔ تم میرے بستر پر میری چادر اوڑھ کر سو جانا اور صبح کو سب کی امانتیں دے کر تم بھی چلے آنا۔"

سیّد لولاک اس وقت بھی امانت کی حفاظت کے لیے بے چین تھے۔ اس لیے تمام امانتیں حضرت علیؓ کو سپرد کر دیں۔ آج کی رات آنحضرتؐ کے بستر پر سونا موت کے منہ میں جانا تھا۔ مگر جناب علیؓ اسد اللہ تھے اور جرأت و رجالت کے پیکرِ عظیم اس خطرہ کے باوجود جناب امیرؓ حضورؐ کے بستر پر سو گئے۔ ادھر جھُٹ پٹے سے ہی دشمن گھات میں آ بیٹھے تھے۔ آنحضرتؐ آدھی رات کو اللہ کا نام لے کر باہر نکلے۔ حضورؐ کی موت کے خواہاں خود موت کی چھوٹی بہن نیند کی آغوش میں پہنچ چکے تھے۔ آنحضرتؐ سورہ یٰسین تلاوت فرماتے ہوئے بغیر کسی مزاحمت کے صاف نکل گئے کسی نے نبی

علیہ السلام کو جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ یہ واقعہ ۲۷ صفر روز پنج شنبہ کا ہے یعنی ۱۲ ستمبر ۶۲۲ء۔

خدا کے برگزیدہ نبیؐ اپنے پیارے دوست ابوبکرؓ کے گھر پہنچے۔ انہوں نے جلد جلد سفر کا سامان تیار کیا۔ شب کی تاریکی میں دونوں بزرگ چل پڑے۔ مکے سے پانچ چھ میل کے فاصلہ پر کوہ ثور ہے۔ اس کی بلندی بہت زیادہ ہے اور راستہ بہت سنگلاخ۔

نکیلے پتھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پائے مبارک کو زخمی کر رہے تھے اور ٹھوکر لگنے سے تکلیف بھی ہوئی تھی۔ ابوبکرؓ نے حضرتؐ کو اپنے کندھے پر اٹھایا اور آخر ایک غار تک پہنچے۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضورؐ کو باہر ٹھہرایا اور خود اندر جا کر غار کو صاف کیا۔ اپنے تن کے کپڑے پھاڑ پھاڑ کر غارِ ثور کے تمام سوراخ بند کر دیئے۔ ایک سوراخ باقی رہا تھا۔ اس میں اپنا انگوٹھا پھنسا دیا اور حضور انورؐ علیہ السلام سے عرض کیا کہ یا نبیؐ تشریف لے آئیں۔ حضورؐ نے حضرت ابوبکرؓ کے زانو پر سر اقدس رکھ کر آرام فرمایا۔ اس غار میں ایک سانپ زیارت اقدس کا مشتاق تھا۔ اپنا سر صدیق اکبرؓ کے پاؤں پر ملا۔ انہوں نے اس خیال سے کہ جان جائے مگر اپنے محبوب رسولؐ کی نیند میں خلل نہ آنے پائے۔ اپنا پاؤں وہاں سے نہیں ہٹایا۔ آخر اس نے پاؤں میں کاٹ لیا۔ ہر سال وہ زہر عود کر آتا۔ آخر اس سے ہی آپ نے شہادت پائی۔

صبح ہوئی حضرت علیؓ حسبِ معمول خواب سے بیدار ہوئے۔ قریش نے قریب جا کر پہچانا۔ پوچھا محمدؐ کہاں ہیں؟ علیؓ نے جواب دیا مجھے کیا خبر؟ کیا میرا پہرا تھا؟ قریش نے غصّہ میں حضرت علیؓ کو مارا اور گھسیٹ کر خانہ کعبہ تک پکڑ لائے۔ پھر تھوڑی دیر ایک جگہ بند رکھا اور پھر چھوڑ دیا اب وہ ابوبکرؓ کے گھر آئے۔ دروازہ دھڑ دھڑایا۔ اسماءؓ نکلیں۔ ابوجہل نے پوچھا تیرا باپ کہاں ہے؟ آپ نے فرمایا کہ بخدا مجھے نہیں معلوم کہاں ہیں۔ ابوجہل نے اسماءؓ کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا کہ کان کی بالی گر گئی۔ یہاں سے سراغ لگاتے لگاتے وہ لوگ غارِ ثور کے منہ پر پہنچ گئے۔ ان کے پاؤں کی آہٹ پاکر یارِ غار کو تشویش لاحق ہوئی۔ جو تقاضائے بشریت تھا۔ کہا حضورؐ دشمن سر پر آپہنچا ہے۔ صدیق اکبرؓ سرتاپا اضطراب تھے مگر سرکارِ دو عالمؐ ہمہ تن اطمینان۔ جب حضرت ابوبکرؓ کا اضطراب زیادہ بڑھتا ہوا پایا، تو حضورؐ نے فرمایا۔ صدیق غم نہ کرو۔ ہمارے ساتھ ہمارا اللہ ہے۔ جس کو قرآن شریف میں یوں فرمایا ہے۔

الا تنصروہ فقد نصرہ اللہ اذ اخرجہ الذین کفروا ثانی اثنین اذ ھما فی الغار اذ یقول لصاحبہ لا تحزن ان اللہ معنا۔

(کہ ہمتو) اگر تم (اللہ کے) رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدد نہ کرو گے تو اپنا ہی کچھ کھوؤ گے۔ ان کی مدد کے لیے تو اللہ تعالیٰ کی ذات کافی ہے اور یہ موقع تو اس کے نزدیک کچھ بھی نہیں ہے (اس) نے تو ان کی اس وقت مدد کی (تھی) جب کافروں نے انہیں (ان کے وطن مکہ سے اس طرح) نکلنے پر مجبور کیا (کہ نکلتے وقت کل دو آدمی تھے اور) دو میں سے دوسرے رسولؐ تھے۔ اس وقت یہ دونوں (ایک) غار میں (جا کر چھپ رہے) تھے (اور کافر انہیں تلاش کرتے کرتے جب عین اسی غار کے منہ پر پہنچے تو) اس وقت (گھبرا رہے تھے اور) وہ (یعنی رسول) اپنے کو تسلی دے رہے اور ان سے کہہ رہے تھے کہ (صدیقؓ) غم نہ کر (یہ کافر ہمیں کچھ ضرر نہیں پہنچا سکتے) بلاشبہ ہمارے ساتھ (ہمارا) اللہ ہے۔

ایسے خوف کے وقت یہ اطمینان صرف نبیوں ہی کا شیوہ ہے۔ بہادری دوسری چیز ہے خطرے میں اطمینانِ قلب کسی اور کیفیت کی طرف اشارہ ہے۔ رسولِ خدا اور صدیق اکبرؓ کو اللہ پر بھروسا تھا دونوں اس بھروسا کے سہارے خاموش بیٹھے رہے۔ مگر بچانے والے

کے ڈھنگ نیارے ہیں۔ دشمن ادھر ادھر دیکھ بھال کر چلے گئے۔ غار کی تنگی و تاریکی کی وجہ سے ان پناہ گزینوں کا کسی کو گمان تک نہ گزرا۔ یہ دونوں عظیم ہستیاں تین روز تک اسی غار میں رہیں۔ رات کی تاریکی میں اسماءؓ بنت ابوبکرؓ گھر سے روٹی دے جاتیں عبداللہؓ ابن ابوبکرؓ اہل مکہ کی باتیں سُنا جاتے۔ عامر بن فہیرہ حضرت ابوبکرؓ کے غلام تھے جن کے پاس حضرت ابوبکرؓ کا ریوڑ تھا۔ وہ بکریاں بھی وہاں لے آتے۔ نبی علیہ السلام بقدر ضرورت دودھ لے لیتے اور وہ پھر ریوڑ کے نشان قدم سے آنے والوں کے نشانات قدم نامعلوم بنا دیتے تھے۔ چوتھے روز نورِ وحدانیت سے جھلملانے والے ستارے غار کی تاریکیوں سے نکلے۔ حضرت اسماءؓ کھانا لے کر پہنچ گئیں۔ حضرت ابوبکرؓ کے غلام بھی اونٹنیاں لے کر حاضر ہو گئے۔ دونوں مُبارک سوار سبک رفتار اونٹنیوں پر سوار ہو گئے۔ مگر بی بی اسماءؓ کو اچانک خیال آیا کہ توشہ دان کا مُنہ باندھنے کا تسمہ تو گھر ہی بھُول آئی ہوں۔ جھٹ کمر بند کو پھاڑ کر توشہ دان اس سے باندھا۔ آنحضرتؐ بی بی اسماءؓ کی اس فہم سے بہت خوش ہوئے اور انہیں "ذات النطاقین" (دو کمر بند والی) کا لقب دیا۔ یہ عظیم الشان خطاب سرکارِ دو جہاںؐ کا دیا ہوا شرف ہے۔ پھر شمس و قمر پر مشتمل یہ قافلہ مدینہ کی جانب روانہ ہو گیا۔

جب کفار کو آنحضرتؐ کی تلاش میں ناکامی ہوئی تو انہوں نے ذاتِ گرامی کی گرفتاری کے لیے ایک سو اونٹوں کا انعام رکھا۔ بہت سے بیکار قسمت آزمائی کے لیے نکل پڑے۔ ان میں سراقہ بن جعشم بھی تھا۔ عین جس وقت حضورؐ روانہ ہونے والے تھے، سراقہ آپہنچا۔ خدا کی قدرت سے اس کے گھوڑے نے سکندری کھائی اور سوار خود فرشِ راہ ہو گیا۔ تاہم سنبھلا اور ترکش سے فال کے تیر نکالے لیکن قسمت نے جواب نفی میں دیا۔ امید پر تقدیر سے لڑ جانے والا عرب مایوس نہیں ہوا اور پھر باگیں اٹھائیں۔ اب گھوڑا دلدل میں پھنس گیا مگر دل میں ڈرا کہ خدا کی قید میں پھنس گیا ہوں۔ اس لیے نہایت عاجزی سے سرکارِ دو عالمؐ کو آواز دی اور امان کی تحریر مانگی۔ رحمۃ للعالمینؐ۔ صاحب عفو و درگزر تھے۔ چمڑے کے ٹکڑے پر عامر بن فہیرہ سے فرمانِ امن لکھوا کر دے دیا اور فرمایا "تیرے ہاتھ میں کسریٰ کے کنگن دیکھتا ہوں"۔ اس وقت سراقہ نے شاید اس بات کو صرف حوصلہ افزائی سمجھا ہو، مگر حضورؐ کے منہ سے نکلا ہوا فرمان تھا۔

حضرت عمرؓ کے عہد میں جب ایران فتح ہوا، تو غنیمت میں سونے کے دو کنگن بھی آئے۔ پیش گوئی کے مطابق حضرت عمرؓ نے سراقہ کو جو مسلمان ہو چکے تھے، بلا کر ہاتھوں میں پہنا دیئے۔ نبی برحق کی پیش گوئی اس طرح آخر پوری ہوئی۔ واقعہ ہے کہ سراقہ یہ تحریر امن لے کر واپس ہوا، تو راستے میں جو کوئی بھی ملتا، اس کو یہ کہہ کر واپس کر دیتا کہ اس راستہ پر حضورؐ نہیں ہیں۔ چنانچہ مدینہ کے یہ مقدس مسافر قدرے اطمینان سے منزل کی طرف بڑھتے رہے۔

پیغمبر پر سحر

نواب اعظم یار جنگ مولوی محمد چراغ علی خاں

"وقال الظالمون ان تتبعون الا رجلاً مسحوراً" (فرقان)

۱ــــــ کسی سچے مسلمان کا تو یہ کام نہیں کہ جناب پیغمبر کی نسبت ایسا کہے کہ ان پر کبھی ایک منٹ کے لیے بھی جادو کا اثر ہوا۔ یہ بات تو کافروں ہی کو زیبا تھی اور اُنھوں نے ہی کہی تھی کہ یہ نبی تو جادو کا مارا ہُوا ہے۔ اور اس تہمت نالائق کو خدا نے بھی جھٹلایا۔ چنانچہ سورہ فرقان اور اسریٰ کی آیت کو ہم نے اس بیان کے عنوان میں لکھ دیا ہے۔ مگر ایک عرصہ سے مسلمانوں میں سے ایسی حمیت جاتی رہی وہ اس کی تو کچھ پروا نہیں کرتے بلکہ ایسے مضمون کی حمایت کرتے ہیں۔

۲ــــــ مسلمان محدثوں نے اس مضمون کی ایک عجیب وغریب روایت کی ہے کہ ایک یہودی نے جناب پیغمبر پر جادو کر دیا تھا اور وہ چالیس دن تک یا چھ مہینے یا برس دن تک اس میں مبتلا رہے۔ ابی حمزہ کی روایت میں تو چالیس دن ہیں اور وہب کی روایت میں چھ مہینے۔ مگر زہری کی روایت میں برس دن ہے۔ علامہ ابن حجر نے اسی کو معتمد قرار دیا ہے[1] سبحانك هذا بهتان عظيم۔

۳ــــــ اس سحر کا اثر (دروغ برگردنِ راوی) یہاں تک ہو گیا تھا کہ معاذ اللہ جناب پیغمبر کے دماغ میں خلل آ گیا تھا۔ چوں مادہ سحر بسرِ مبارک رسیدہ بود چناں تخیل مے کرد کہ چیزے کہ نکردہ است کردہ می شود و ایں تصرف است از ساحر در طبیعت و مادہ دموی تا آں مادہ بر بطن مقدم دماغ غلبہ کرد و مزاج آں از طبیعت اصلی برگشت (سفر السعادة علامه مجد الدین فیروز آبادی) ص ۱۶۹۔ یہی مضمون ابن القیم نے بھی لکھا ہے۔

۴ــــــ ایسے لغو اور واہی خیالوں کو تو قرآن مجید جھٹلا چکا پس جو روایتیں بھی اس مضمون کی ہوں گی وہ کب لائق التفات ہوں گی وہ راوی بھی اُنھیں کافروں کی کہی ہُوئی کہتے ہیں۔ شیخ الاسلام علامہ امین الدین طبرسی نے تفسیر مجمع البیان میں (ذیل ہاروت وماروت) لکھا ہے:

"ماروی من الاخبار ان النبی سحر فکان یرٰی انه فعل مالم یفعله او انه لم یفعل ما فعله فاختار

---

[1] وفی روایة ابی حمزه عند الاسماعیلی انه صلی الله علیه وسلم اقام اربعین وفی روایة وهب عن هشام عند احمد ستة اشهر وجمع بان ستة اشهر من ابتداء تغیر مزاجه والاربعین یوما من استحکامه لکن فی جامع معمر عن الزهری انه لبث سنة واسناده صحیح۔ قال ابن حجر فهو المعتمد۔ ارشاد الساری شرح صحیح بخاری۔ ج ۸ ص ۳۲۴۔

مدت بقائے ایں عارضہ بقولے چہل روز و در روایتے شش ماہ و در روایتے یک سال بود۔ شرح سفر السعادت۔ عبدالحق دہلوی

مفتعلہ - لا یلتفت الیہا۔[1]

۵ —— اگرچہ جھوٹی روایتیں سچی ہوں تو پھر نبی کی بات پر کیا اعتبار ہوسکتا ہے۔ بہت سی وحی کی باتیں بھی صرف ان کے تغیر دماغ کی وجہ سے خیال میں آگئی ہوں گی۔ حدیث کی شرح کرنے والے ایک عجیب مخمصہ میں گرفتار ہیں نہ تو ان سے اس روایت باطلہ کی تکذیب کرتے بنتا ہے اور نہ منکروں کو جواب دیتے بنتا ہے۔ قاضی عیاض الغرناطی نے (سنہ ۴۷۶ - ۴۴۵ ہجری) کتاب شفا فی تعریف حقوق المصطفٰی میں (ص ۲۹۹ و ۳۰۰) اس اعتراض کے اٹھانے کی کوشش کی ہے مگر یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ جادو کا اثر جناب پیغمبر کے دل اور اعتقاد اور عقل پر نہ تھا صرف ظاہر میں ہاتھ پیر پر ہوا تھا مگر بخاری و مسلم کی روایتوں کے مقابلہ میں وہ تاویلیں پیش نہیں جاتیں اور معہذا اصل سحر کے مان لینے سے کچھ مفر نہیں ملتا۔ اور مسحور وہی ہے جس کی عقل میں خلل آگیا ہو۔[2]

۶ —— ہم نے مناسب جانا کہ اس بحث میں اصل روایتوں پر نظر کی جاوے اور دیکھیں کہ وہ کچھ معتبر ہوسکتی ہیں یا نہیں۔ بخاری نے روایت کی ہے:

حدثنا ابراهیم بن موسٰی اخبرنا عیسٰی بن یونس عن هشام عن ابیه عن عائشة رضی الله عنها قالت سحر رسول الله صلی الله علیه وسلم رجل من بنی زریق یقال له لبید بن الاعصم حتی کان رسول الله یخیل الیه انه کان یفعل الشئ وما فعله الخ۔

حدثنی عبد الله بن محمد قال سمعت ابن عیینه یقول اول من حدثنا به ابن جریج یقول حدثنی ال عروه عن عروه فسالت هشاما عنه فحدثنا عن ابیه عن عایشة رضی الله عنها قالت کان رسول الله صلی الله علیه وسلم سحر حتی کان یری انه یاتی النساء ولا یاتیهن الخ۔

حدثنا عبید بن اسماعیل حدثنا ابو اسامه عن هشام عن ابیه عن عایشة قالت سحر رسول الله صلی الله علیه وسلم حتی یخیل الیه انه یفعل الشئ وما فعله الخ۔

مسلم نے روایت کی ہے:

حدثنا ابو کریب قال حدثنا ابن نمیر عن هشام عن ابیه عن عایشة رضی الله عنها قالت سحر رسول الله صلعم یهودی من یهود بنی زریق یقال له لبید بن الاعصم قالت حتی کان رسول الله صلی الله علیه وسلم یخیل الیه یفعل الشئ وما یفعله الخ۔

ان روایتوں میں یہ قول تو حضرت عائشہ کی طرف منسوب ہے کہ جناب پیغمبر پر ایک یہودی نے جادو کر دیا تھا اور اس قول کے

---

[1] والمسحور الذی قد سحر فاختلط علیه عقله وزال عن حد الاستواء هذا هو القول الصحیح تفسیر کبیر فخر رازی - (اسری)

بعد ایک قصہ ہے کہ جس میں اختلاف الفاظ اور کسی قدر اختلاف مضمون بھی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جناب پیغمبر نے فرمایا کہ دو آدمی میرے پاس آئے، اور ایک نے دوسرے سے پوچھا کہ اس شخص کا (یعنی پیغمبر صلعم کا) کیا حال ہے؟ اس نے جواب دیا کہ یہ شخص مطبوب ہے اس کا ترجمہ حدیث کی شرح کرنے والوں نے مسحور کیا ہے یعنی جادو کا مارا ہے۔ پھر اس نے پوچھا کہ کس نے جادو کیا؟ تب اس نے جواب دیا کہ لبید بن اعصم نے جادو کیا ہے۔ پھر اس نے پوچھا کا ہے سے جادو کیا ہے؟ اس نے کہا کہ کنگھی اور سر کے ٹوٹے ہوئے بال اور کھجور کے درخت کا گابہ۔ پھر اس نے پوچھا وہ کہاں ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ ذروان کے کنوئیں میں۔ تب جناب پیغمبر اور اصحاب وہاں تشریف لے گئے اور وہاں سے آکر حضرت عائشہؓ سے کہا کہ اُس کنوئیں کا پانی سُرخ سا تھا اور درخت وہاں کے ایسے تھے جیسے سانپ کی سر یا بدصورت الخ۔

۷ ——— یہ ایسی روایت ہے کہ جس کو اگر صحیح و قطعی تسلیم بھی کر لیا جاوے تو بھی کسی ذی عقل اور صاف طبیعت آدمی کی نظر میں اس میں کچھ خلافِ حقیقت نہیں ہے مگر جو لوگ جاہلی طبیعت کے ہیں اور دیو، بھوت اور جادو کو مانتے ہیں وُہ اس روایت کے مضمون کو اپنے ڈھنگ پر لے جاتے ہیں اور کچھ تحریف اور تاویل کر کے نبی کو جادو کا مارا ہُوا بنا لیتے ہیں۔ ذالك ظن الذين كفروا۔

۸ ——— اس روایت کی تفسیر ہمارے مذاق پر تو یہ ہے کہ ہم کو اس امر سے تو انکار نہیں ہے کہ کوئی شخص جادو نہیں کرتا یا کوئی شخص کسی کو جادو کا مارا ہوا نہیں سمجھتا بلکہ ہمارا قول صرف یہی ہے کہ ہم کو جادو کے تحقق سے انکار ہے یعنی جادو کبھی چلتا نہیں اس کا اثر کسی پر ہوتا نہیں۔" لا یفلح الساحر حیث اتیٰ" گو وہ لاکھ پڑا کہا کرے کہ مَیں نے اس شخص پر جادو کر دیا ہے اور جس شخص کی نسبت جادو کرنے والا یا جادو کرنے کا دعویٰ کرنے والا یہ کہے کہ مَیں نے اس پر جادو کر دیا ہے تو عرف میں اس کو مسحور یا جادو کا مارا ہوا ہی کہیں گے تو حقیقت میں اس مسحور پر کچھ جادو کا اثر نہوا ہو جیسے عموماً کہتے ہیں کہ فلاں شخص فلاں شخص کا معشوق ہے حالانکہ شخص عاشق کے عشق کا اس پر درحقیقت کچھ بھی اثر نہیں ہُوا کرتا۔

عرب میں اور یہودیوں میں سحر اور ساحری کا بڑا چرچا تھا ایسا ہُوا ہو گا کہ لبید بن اعصم یہودی نے اسی خیال باطل یعنی جادو کے کارگر ہونے کی بنا پر جناب پیغمبر کی نسبت جادو کا عمل کیا ہو اور کنگھی اور سر کے بال کسی درخت کی چھال میں لپیٹ کر ذروان کے کنوئیں میں داب دیے ہوں گے۔ اس معاملہ کا چرچا لوگوں میں ہوتا ہو گا۔ ان میں سے دو آدمی جنھوں نے یہ بات سُنی ہو گی جناب پیغمبرؐ کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتے ہوں گے کہ لبید نے اُن پر (اپنے زعم میں) فلانے کنوئیں میں جادو کیا۔ اس بات کو سن کر جناب پیغمبرؐ اس کنوئیں پر خود گئے یا کسی کو بھیجا ہو۔ کیونکہ اور روایتوں میں ہے (عند ابن سعد من حديث ابن عباس فبعث الى على وعمار فامرهما ان يا تيا البير) کہ اپنے اصحاب کو بھیجا تھا اور یا یہ ہوا ہو کہ اصحاب میں سے کوئی خود ہی چلے گئے ہوں۔

۹ ——— پس اس روایت میں کوئی بات جادو کے تحقق کی نہیں نکلتی۔ سب سے زیادہ مشکل اور باطل قول یہ ہے کہ سحر رسول الله الخ یہ اگر ان معنوں میں لیا جاوے کہ لبید نے پیغمبرؐ کی نسبت جادو کا عمل کیا تو کچھ بھی دقت نہیں ہاں اگر یہ مراد ہو کہ درحقیقت پیغمبر پر کسی کے جادو کا عمل چل گیا اور جادو اُن میں مؤثر ہو گیا اور اُن کے دماغ میں خلل آ گیا اور عقل میں فتور پڑ گیا تو یہ بالکل جھوٹ اور باطل ہے۔ یقیناً راویوں کے دماغ میں فتور آ گیا ہو گا یا محدثوں کی عقل میں خلل آ گیا ہو گا۔ کیونکہ کسی شخص کے جادو کے

مارے ہوئے ہونے پر گواہی دینا ایک ایسے امر پر شہادت دینا ہے جو قابل حس نہیں ہے۔ کسی کو مسحور سمجھنا امر حسی نہیں ہے پس اس پر کوئی گواہی نہیں ہو سکتی۔

۱۰ ——— عوام نے اس روایت کے مضمون سمجھنے میں چند غلطیاں کی ہیں :

اول تو یہ کہ سحر رسول اللہ الخ کو حقیقی اور واقعی سمجھتے ہیں حالانکہ یہ ایسے ہی ثابت ہے کہ کوئی کہے کہ زید پر گولی چلی۔ گو زید اس گولی کے اثر سے بالکل محفوظ ہو۔ یا کوئی کہے کہ ہندہ تو خالد کی معشوق ہے۔ گو ہندہ کو خالد سے کچھ بھی واقفیت نہ ہو یا اس کے عشق کا اثر ذرا بھی اس میں نہ ہوا ہو۔

دوم یہ کہ وہ جو دو شخص پیغمبر کے پاس آ کے بیٹھے تھے اُن میں سے اُن لوگوں نے ایک کو تو جبریل بنا لیا اور ایک کو میکائیل۔ حالانکہ بخاری و مسلم کی روایتوں میں "رجلان" کا لفظ صاف موجود ہے (یعنی دو آدمی) جو روایتیں ان صحیحین کے درجہ سے گھٹی ہوئی ہیں اُن کے راویوں نے اپنے دل سے "رجلان" کی جگہ "ملکان یعنی دو فرشتے" کر دیا۔ جیسا کہ طبرانی کی روایت میں ہے اور جن راویوں نے اور بھی زیادہ آزادی برتی اور روایت بالمعنی پر کفایت نہ کی وہ اس سے بھی بڑھ گئے اور صاف صاف "جبرائیل و میکائیل" ہی کہہ دیا جیسا کہ ابن سعد کی ایک منقطع روایت میں ہے۔

سوم یہ کہ ان دونوں آدمیوں نے جو یقیناً لبید کے ہمراز تھے جناب پیغمبرؐ کو مطبوب بتلایا۔ اس لفظ کو شارحین نے مسحور کے معنی میں قرار دیا ہے حالانکہ یہ بھی ایک زبردستی سی ہے۔ قسطلانی شارح بخاری نے اس کنایہ کو صرف تفاول کے طریق پر قرار دیا ہے اور قرطبی نے کچھ اور ہی لکھا۔ انما قیل للسحر الطب لان اصل الطب الحذق والتفطن له فلما کان کل من علاج المرض والسحر انما یاتی عن فتنة وحذق اطلق علی کل منهما هذا الاسم۔ جب طب کا لفظ ایسا عام ہے تو اس سے خاص مسحور سمجھنا خلل دماغ سے خالی نہیں اصل یہ ہے کہ ان لوگوں نے یہ امر تسلیم کر لیا ہے کہ جادو کا اثر ضرور متحقق ہوتا ہے پس اب جو کوئی خبر جادو کی روایت میں آوے گی وہ ضرور تسلیم کی جاوے گی حالانکہ اس کا تحقق محض ایک وہم اور خیال ہے اور معتزلہ کو جو مسلمانوں میں ایک حکیمانہ خیال کا فرقہ ہے جادو کے تحقق سے انکار ہے۔

۱۱ ——— اگر ضابطہ فن درایت کی رُو سے اس روایت پر نظر کی جاوے تو یہ کسی طرح صحیح و ثابت و یقینی و قطعی نہیں ٹھہر سکتی۔

اوّل تو یہ ایک خبر واحد ہے اور اخبار احاد سے کسی امر کی نسبت جس کی وُہ خبر دیتے ہیں یقین نہیں حاصل ہوتا۔ پس یہ خبر بھی سچی اور یقینی نہیں ہو سکتی۔

دوم یہ کہ اس روایت میں عتعنہ ہے یعنی عیسٰی بن یونس اور ابن نمیر اور ہشام بن عروہ اور عروہ بن زبیر نے حدثنا یا اخبرنا کہہ کر روایت نہیں کی جس سے اتصال پایا جاتا بلکہ عن عن کہہ کر روایت کی ہے جس میں احتمال ہے کہ ایک نے دوسرے سے بگوش خود سُنا ہو یا اوروں سے سُنا ہو جن کا نام ظاہر نہیں کیا اور ایسی روایت جس کا کوئی راوی بھی مجہول یعنی نامعلوم رہ جاوے صحیح اور سندی نہیں ہو سکتی۔

اس باب میں جو کچھ بحثیں اور تقریریں ہیں وہ ہم کو معلوم ہیں۔ علی ابن المدینی (اُستاد بخاری) اور بخاری اور ابو بکر صیرفی اور شافعی کا یہ مذہب ہے کہ روایت معنعن کو متصل سمجھا جاوے گا جبکہ دونوں راوی ایک ہی زمانہ میں ہوں اور اُن میں باہم ملاقات ہونا بھی ثابت ہو اور وُہ لوگ مدلس بھی نہوں اور مسلم وغیرہ کا یہ مذہب ہے کہ دونوں راویوں کا صرف ایک زمانہ میں ہونا چاہیے نا کہ ملاقات ممکن ہو اور ملاقات کا ثابت ہونا شرط نہیں ہے۔ مسلم نے مقدمہ صحیح میں اپنے مخالف کی بڑی فضیحت کی ہے اور ایک طولانی تقریر کی ہے مگر محی الدین نووی نے منہاج شرح صحیح مسلم بن حجاج میں (باب ماتصح به روایة الرواة بعضهم عن بعض) لکھا ہے کہ جس باب کی طرف مسلم گیا ہے محققوں نے اس سے انکار کیا ہے اور اس کو ضعیف بتلایا ہے اور جس بات کو مسلم نے ردّ کیا ہے اُسی کو صحیح قرار دیا ہے[۱] مگر ہماری رائے میں تو ان دونوں مذہبوں میں ایک گونہ سہل انگاری اور مسامحت ہے کیونکہ ان میں سے جس نے زیادہ تشدد کیا ہے وہ صرف یہی کہتا ہے کہ صرف ان دونوں راویوں کا جو عنعنہ کرتے ہیں باہم ملاقات کا ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ایک مرتبہ[۲] شاید تمام عمر میں ملاقات کا ہو جانا بھی ثابت ہونا چاہیے۔ اور یہ اصول پھر بھی ناقص ہے کیونکہ جب تک ہر ہر خبر میں بالمشافہ سنی ہونے کی تصریح نہ ہو گی ہمیشہ وہی احتمال ارسال قایم رہے گا۔ ہم روز کے تجربہ سے یہ بات ثابت پاتے ہیں کہ گو زید و خالد دونوں راوی ایک ہی شہر میں رہتے ہوں اور ملاقات بھی ہوا کرتی ہو تاہم زید کا ہر عنعنہ خالد سے بلاواسطہ اور بالمشافہ نہیں ہوتا چہ جائیکہ کتب احادیث کے راوی جن میں سے ایک تو خراسانی ہے اور ایک بصری اور ایک کوفی ہے تو ایک مصری اور پھر ان کی معنعن روایتیں اتصال پر حمل کی جاتی ہیں یہ عجب قاعدہ ہے۔

مسلم نے اپنے قول کی تائید میں انھیں راویوں کا حوالہ دیا ہے جن پر ہم بحث کر رہے ہیں یعنی هشام بن عروة عن ابیه عن عایشه۔ چنانچہ لکھا ہے بیقین تعلم ان هشامًا قد سمع من ابیه وان اباه قد سمع من عایشة رضی الله عنها الخ مگر جب تک ایک خاص خبر میں بالمشافہ سُننا ثابت نہو تب تک عام طور کا سماع کچھ مفید نہو گا۔

غرض کہ اس میں نہایت شُبہ ہے کہ عیسٰی بن یونس اور ابن نمیر نے ہشام سے یہ روایت بلاواسطہ سنی یا بواسطہ اور ایسے ہی ہشام نے عروہ سے بالمشافہ سُنی یا کسی اور واسطے سے اور ایسے ہی عروہ نے اُمّ المومنین عایشہؓ کے رُوبرو یہ روایت سُنی یا اَور کے ذریعہ سے۔ پس اس وجہ سے یہ روایت ناقابلِ اعتبار ہے۔

سوم یہ کہ اس روایت کا ایک راوی ہشام بن عروہ ہر چند کہ عموماً ممدوح اور ثقہ اور معتبر ہے مگر امام مالک نے اُس کو جھوٹا یعنی کذاب کہا ہے پس یہ راوی مقدوح ٹھہرا اور روایت کم سے کم ضعیف ٹھہرے گی اسماء رجال کی کتاب تهذیب الکمال

---

[۱] وهذا الذی صار علیه مسلم قد انکره المحققون وقالوا هٰذا الذی صار الیه مسلم ضعیف والذی رده هو المختار الصحیح الذی علیه ائمة هذا الفن مثل علی ابن المدینی والبخاری وغیرهما۔ شرح صحیح مسلم للنووی۔

[۲] والمعنعن الذی قیل فیه فلان عن فلان من غیر لفظ صریح بالسماع او التحدیث او الاخبار اتی عن رواة سمین معروفین موصول عند الجمهور بشرط ثبوت لقاء المعنعنین بعضهم ولو مرة الخ۔ ارشاد الساری شرح بخاری للقسطلانی ج ۱ ص ۹۔

میں لکھا ہے:

قال للحافظ ابوبکر الخطیب۔ اخبرنی الرمانی قال حدثنی محمد بن احمد بن عبد الملک الادونی قال حدثنا محمد بن علی الایادی قال حدثنا زکریا بن یحییٰ الساجی قال حدثنا احمد بن محمد البغدادی قال حدثنا ابراھیم بن المنذر قال حدثنا محمد بن فلیح قال قال لی مالک بن انس ھشام بن عروہ کذاب الخ

اگر ہمارے جواب میں یہ کہا جاوے کہ یہ روایت ایک خبر واحد ہے اس پر یقین نہیں ہوتا تو ہم کہیں گے کہ پیغمبر صلعم پر جادو ہوجانے کی روایت بھی تو خبر واحد ہے اس پر بھی یقین نہ کیجیے۔

چہارم یہ کہ حضرت ام المومنین عائشہؓ کا یہ فرمانا کہ سحر النبی الخ ضابطہ فن درایت کے موافق تو قابل قبول نہیں ہے کیونکہ اس میں کسی امر حسی کی خبر نہیں ہے پس جیسا کہ راوی کا ثقہ اور عادل ہونا ضرور ہے۔ ویسا ہی یہ بھی ضرور ہے کہ اس نے امر حسی یا واقعہ چشم دید کی خبر دی ہو نہ کہ امر عقلی یا خیالی یا وہمی اور اعتقادی کی۔ ہم ان راویوں کے مشاہدات پر اعتبار کرتے ہیں نہ اُن کی رائے اور خیالات کو نہیں مانتے۔ رائے تو صرف شخص معصوم صاحب الوحی کی مانی جاتی ہے۔

پس ان وجوہ سے یہ خبر قابلِ قبول اور لائق اعتبار نہیں ہے۔

جنابِ رسالت مآب ﷺ کا ادبی تبصرہ

علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد کی عربی شاعری کی نسبت وقتاً فوقتاً جن ناقدانہ خیالات کا اظہار فرمایا ان کی روشنی صفحاتِ تاریخ کے لیے خطِ پاشاں کا حکم رکھتی ہے۔ لیکن دو موقعوں پر جو تنقیدات آپؐ نے ارشاد فرمائیں ان سے مسلمانانِ ہند کو آج کل کے زمانہ میں بہت بڑا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اس لیے کہ ان کا ادب ان کے قومی انحطاط کے دور کا نتیجہ ہے اور آجکل انھیں ایک نئے ادبی نصب العین کی تلاش ہے۔ شاعری کیسی ہونی چاہیے اور کیسی نہ ہونی چاہیے یہ وہ عقدہ ہے جسے جنابِ رسالت مآب صلعم کے وجدان نے اس طرح حل کر لیا ہے امراء القیس نے اسلام سے چالیس سال پہلے کا زمانہ پایا ہے۔ روایت ہمیں بتاتی ہے کہ جنابِ پیغمبر صلعم نے اس کی نسبت ایک موقع پر حسب ذیل رائے ظاہر فرمائی "اشعر الشعراء وقائدهم الی النار" یعنی وہ شاعروں کا سرتاج تو ہے ہی لیکن جہنم کے مرحلے میں ان سب کا سپہ سالار بھی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امراء القیس کی شاعری میں وہ کون سی باتیں ہیں جنھوں نے حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ رائے ظاہر کروائی۔ امراء القیس کے دیوان پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں شرابِ ارغوانی کے دور عشق و حسن کی ہوشربا داستانوں اور جاں گداز جذبوں، آندھیوں سے اڑی ہوئی پرانی بستیوں کے کھنڈروں کے مرثیوں، سنسان ریتیلے ویرانوں کے دل ہلا دینے والے منظروں کی تصویریں نظر آتی ہیں اور یہی عرب کے دورِ جاہلیت کی کل تخلیقی کائنات ہے۔ امراء القیس قوتِ ارادی کو جنبش میں لانے کی بجائے اپنے سامعین کے تخیل پر جادو کے ڈورے ڈالتا ہے اور ان میں بجائے ہوشیاری کے بے خودی کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حکیمانہ تنقید میں فنونِ لطیفہ کے اس اہم اصول کی توضیح فرمائی ہے کہ صنائع و بدائع کے محاسن اور انسانی زندگی کے محاسن یہ کچھ ضروری نہیں کہ یہ دونوں ایک ہی ہوں۔ یہ ممکن ہے کہ شاعر بہت اچھا شعر کہے لیکن وہی شعر پڑھنے والے کو اعلیٰ علیین کی سیر کرانے کی بجائے اسفل السافلین کا تماشا دکھا دے۔ شاعری دراصل ساحری ہے اور اس شاعر پر حیف ہے جو قومی زندگی کی مشکلات و امتحانات میں دلفریبی کی شان پیدا کرنے کی بجائے وہ فرسودگی و انحطاط کو صحت اور قوت کی تصویر بنا کر دکھا دے اور اس طور پر اپنی قوم کو ہلاکت کی طرف لے جائے۔ اس کا تو فرض ہے کہ قدرت کی لازوال دولتوں میں سے زندگی اور قوت کا جو حصہ اسے دکھایا گیا ہے اس میں اوروں کو بھی شریک کرے نہ یہ کہ اٹھائی گیرہ بن کر جو رہی سہی پونجی ان کے پاس ہے اس کو بھی ہتھیا لے۔

ایک دفعہ قبیلۂ بنو عبس کے مشہور شاعر عنترہ کا یہ شعر حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا گیا: ؎

ولقد ابیت علی الطوی واظلہ

حتی انال بہ کریم المأکل

(ترجمہ) میں نے بہت سی راتیں محنت و مشقت میں بسر کی ہیں، تاکہ اکل حلال کے قابل ہوسکوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن کی بعثت کا مقصدِ وحید یہ تھا کہ انسانی زندگی کو شاندار بنائیں اور اسی کی آزمائشوں اور سختیوں کو خوش آیند اور مطبوع کر کے دکھائیں۔ اس شعر کو سُن کر بے انتہا محظوظ ہُوئے اور اپنے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ "کسی عرب کی تعریف نے میرے دل میں اس کا شوقِ ملاقات نہیں پیدا کیا۔ لیکن میں سچ کہتا ہُوں کہ اس شعر کے نگارندہ کے دیکھنے کو میرا دل بے اختیار چاہتا ہے۔"

اللہ اکبر! توحید کا وہ فرزند اعظم صلی اللہ علیہ وسلم جس کے چہرۂ مبارک پر ایک نظر ڈال لینا نظارگیوں کے لیے دنیوی برکت اور اخروی نجات کی دوگونہ سرمایہ اندوزی کا ذریعہ تھا خود ایک بُت پرست عرب سے ملنے کا شوق ظاہر کرتا ہے کہ اس عرب نے اپنے شعر میں ایسی کون سی بات کہی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عزت عنترہ کو بخشی اس کی وجہ ظاہر ہے۔ عنترہ کا شعر ایک صحت بخش زندگی کی جیتی جاگتی بولتی چالتی تصویر ہے۔ حلال کی کمائی میں انسان کو جو سختیاں اٹھانی پڑتی ہیں، جو کڑیاں جھیلنی پڑتی ہیں ان کا نقش پردۂ خیال پر شاعر نے نہایت خوب صورتی کے ساتھ کھینچا ہے۔ حضور خواجۂ دوجہان صلعم (بابی انت و امی) نے جو اس قدر شعر کی تعریف فرمائی اس سے صنعت کے ایک دُوسرے بڑے اصول کی شرح ہوتی ہے کہ صنعت حیاتِ انسانی کے تابع ہے اس پر فوقیت نہیں رکھتی۔

ہر وہ استعداد جو مبدأ فیاض نے فطرت انسانی میں ودیعت کی ہے اور ہر وُہ توانائی جو انسان کے دل و دماغ کو بخشی گئی ہے ایک مقصدِ وحید اور ایک غایت الغایات کے لیے وقف ہے یعنی قومی زندگی جو آفتاب بن کر چمکے، قوت سے لبریز، جوش سے سرشار ہو، ہر انسانی صنعت اس غایت آخرین کی تابع اور مطیع ہونی چاہیے اور ہر شے کی قدر و قیمت کا معیار یہی ہونا چاہیے کہ اس میں حیات بخشی کی قابلیت کس قدر ہے۔ تمام وہ باتیں جن کی وجہ سے ہم جاگتے جاگتے اونگھنے لگیں اور جو جیتی جاگتی حقیقتیں ہمارے گرد وپیش موجود ہیں (کہ انھیں پر غلبہ پانے کا نام زندگی ہے) ان کی طرف سے آنکھوں پر پٹی باندھ لیں، انحطاط اور موت کا پیغام ہے۔ صنعت گر کو "چنیا بیگم" کے حلقۂ عشاق میں داخل نہ ہونا چاہیے۔ مصورِ فطرت کو اپنی رنگ آرائیوں کا اعجاز دکھانے کے لیے افیون کی چسکی سے احتراز واجب ہے۔ یہ پیش پا افتادہ فقرہ جس سے ہمارے کانوں کی آئے دن تواضع کی جاتی ہے کہ کمال صنعت اپنی غایت آپ ہے۔ انفرادی، اجتماعی انحطاط کا ایک عیارانہ جملہ ہے جو اس لیے تراشا گیا ہے کہ ہم سے زندگی اور قوت دھوکہ دے کر چھین لی جائے۔ غرض یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجدان حقیقی نے عنترہ کے شعر کی خوبیوں کا جو اعتراف کیا اس نے اصل الاصول کی بنیاد ڈال دی کہ صنعت کے ہر کمال کی صحیح ارتقاء کیا ہونی چاہیے۔

محفلِ میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم

علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ

زمانہ ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ انسانوں کی طبائع، ان کے افکار اور ان کے نقطہ ہائے نگاہ بھی زمانے کے ساتھ ہی بدلتے رہتے ہیں۔ لہٰذا تیوہاروں کے منانے کے طریقے اور مراسم بھی ہمیشہ متغیر ہوتے رہتے ہیں اور ان سے استفادہ کے طریق بھی بدلتے رہتے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم بھی اپنے مقدس دنوں کے مراسم پر غور کریں اور جو تبدیلیاں افکار کے تغیرات سے ہونی لازم ہیں ان کو مدِ نظر رکھیں۔

منجملہ ان مقدس ایام کے جو مسلمانوں کے لیے مخصوص کیے گئے ہیں، ایک میلاد النبیؐ کا دن بھی ہے۔ میرے نزدیک انسانوں کی دماغی اور قلبی تربیت کے لیے نہایت ضروری ہے کہ ان کے عقیدے کی رُو سے زندگی کا جو نمونہ بہترین ہو وہ ہر وقت ان کے سامنے رہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے لیے اسی وجہ سے ضروری ہے کہ وُہ اسوۂ رسولؐ کو مدِ نظر رکھیں تاکہ جذبۂ تقلید اور جذبۂ عمل قایم رہے۔ ان جذبات کو قائم رکھنے کے تین طریقے ہیں: پہلا طریق تو درود و صلوٰۃ ہے جو مسلمانوں کی زندگی کا جزو لاینفک ہو چکا ہے وہ ہر وقت درود پڑھنے کے موقعے نکالتے ہیں، عرب کے متعلق میں نے سُنا کہ اگر کہیں بازار میں دو آدمی لڑ پڑتے ہیں، اور تیسرا بہ آواز بلند اللّٰھمّ صلّ علیٰ سیّدنا محمد وبارك وسلم پڑھ دیتا ہے تو لڑائی فوراً رُک جاتی ہے اور متخاصمین ایک دوسرے پر ہاتھ اٹھانے سے فوراً باز آجاتے ہیں یہ درود کا اثر ہے۔ اور لازم ہے کہ جس پر درود پڑھا جائے اس کی یاد قلوب کے اندر اپنا اثر پیدا کرے۔

پہلا طریق انفرادی۔ دوسرا اجتماعی ہے۔ یعنی مسلمان کثیر تعداد میں جمع ہوں اور ایک شخص جو حضور آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح حیات سے پوری طرح باخبر ہو آپ کے سوانح زندگی بیان کرے تاکہ ان کی تقلید کا ذوق شوق مسلمانوں کے قلوب میں پیدا ہو۔

تیسرا طریق اگرچہ مشکل ہے لیکن بہر حال اس کا بیان کرنا نہایت ضروری ہے وُہ طریقہ ہے کہ یادِ رسول اس کثرت سے اور ایسے انداز میں کی جائے کہ انسان کا قلب نبوت کے مختلف پہلوؤں کا خود مظہر ہو جائے یعنی آج سے تیرہ سو سال پہلے کی جو کیفیت حضور سرورِ عالم کے وجودِ مقدس سے ہویدا تھی وہ آج تمہارے قلوب کے اندر پیدا ہو جائے۔ حضرت مولانا رومؒ فرماتے ہیں،

آدمی دید ست باقی پوست است
دید آں باشد کہ دید دوست است

یہ جوہر انسانی کا انتہائی کمال ہے کہ اسے دوست کے سوا اور کسی چیز کی دید سے مطلب نہ رہے۔ یہ طریقہ بہت مشکل ہے۔ کتابوں کو پڑھنے یا میری تقریر سننے سے نہیں آئے گا۔ اس کے لیے کچھ مدّت نیکوں اور بزرگوں کی صحبت میں بیٹھ کر روحانی انوار حاصل کرنا ضروری ہے۔ اگر یہ میسّر نہ ہو تو پھر ہمارے لیے یہی طریقہ غنیمت ہے جس پر ہم آج عمل پیرا ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اس طریق پر عمل کرنے کے لیے کیا کیا جائے؟ پچاس سال سے شور برپا ہے کہ مسلمانوں کو تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔ لیکن جہاں تک میں نے غور کیا ہے تعلیم سے زیادہ اس قوم کی تربیت ضروری ہے اور ملی اعتبار سے یہ تربیت علما کے ہاتھ میں ہے۔ اسلام ایک خالص تعلیمی تحریک ہے۔ صدر اسلام میں اسکول نہ تھے، کالج نہ تھے، یونیورسٹیاں نہ تھیں، لیکن تعلیم و تربیت اس کی ہر چیز میں ہے۔ خطبہ جمعہ، خطبہ عید، حج، وعظ غرض تعلیم و تربیت عوام کے بے شمار مواقع اسلام نے بہم پہنچائے ہیں۔ لیکن افسوس کہ علماء کی تعلیم کا کوئی صحیح نظام قایم نہ رہا۔ اور اگر کوئی رہا بھی تو اس کا طریق عمل ایسا رہا کہ دین کی حقیقی رُوح نکل گئی۔ جھگڑے پیدا ہو گئے اور علماء کے درمیان جنھیں پیغمبر علیہ السلام کی جانشینی کا فرض ادا کرنا تھا، سر پھٹول ہونے لگی۔ مصر، عرب، ایران، افغانستان ابھی تہذیب و تمدن میں ہم سے پیچھے ہیں۔ لیکن وہاں علما، ایک دوسرے کا سر نہیں پھوڑتے۔ وجہ یہ ہے کہ اسلامی ممالک نے اخلاق کے اس معیار اعلیٰ کو پا لیا ہے جس کی تکمیل کے لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام مبعوث ہُوئے تھے۔ اور ہم ابھی اس معیار سے بہت دُور ہیں۔

دنیا میں نبوت کا سب سے بڑا کام تکمیل اخلاق ہے۔ چنانچہ حضورؐ نے فرمایا: بعثت لاتمم مکارم الاخلاق ۔ یعنی میں نہایت اعلیٰ اخلاق کے اتمام کے لیے بھیجا گیا ہوں۔ اس لیے علماء کا فرض ہے کہ وہ رسولؐ اللہ کے اخلاق ہمارے سامنے پیش کیا کریں تاکہ ہماری زندگی حضورؐ کے اُسوۂ حسنہ کی تقلید سے خوشگوار ہو جائے اور اتباع سنت زندگی کی چھوٹی چھوٹی چیزوں تک جاری و ساری ہو جائے۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے خربوزہ لایا گیا تو آپ نے کھانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ مجھے معلوم نہیں رسول اللہ نے اس کو کس طرح کھایا ہے مبادا میں ترکِ سنّت کا مرتکب ہو جاؤں۔ ؎

کامل بسطام در تقلیدِ فرد
اجتناب از خوردنِ خربوزہ کرد

افسوس کہ ہم میں بعض چھوٹی چھوٹی باتیں بھی موجود نہیں ہیں جن سے ہماری زندگی خوش گوار ہو اور ہم اخلاق کی فضا میں زندگی بسر کر کے ایک دُوسرے کے لیے باعثِ رحمت ہو جائیں۔ اگلے زمانے کے مسلمانوں میں اتباع سنت سے ایک اخلاقی ذوق اور ملکہ پیدا ہو جاتا تھا اور وہ ہر چیز کے متعلق خود ہی اندازہ کر لیا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رویہ اس چیز کے متعلق کیا ہو گا۔

حضرت مولانا رومؒ بازار میں جا رہے تھے۔ آپ کو بچوں سے بہت محبت تھی، کچھ بچے کھیل رہے تھے، ان سب نے مولاناؒ کو سلام کیا، اور مولانا ایک ایک کا سلام الگ الگ قبول کرنے کے لیے دیر تک کھڑے رہے، ایک بچہ کہیں دُور کھیل رہا تھا، اس نے وہیں سے پکار کر کہا کہ حضرت! ابھی جائیے گا نہیں، میرا سلام لیتے جائیے۔ تو مولانا نے بچہ کی خاطر دیر تک توقف فرمایا اور اس کا سلام لے کر گئے۔ کسی نے پُوچھا: حضرت! آپ نے بچہ کے لیے اس قدر توقف کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اس قسم کا واقعہ پیش آتا تو حضورؐ بھی یُونہی کرتے۔

گویا ان بزرگوں میں تقلیدِ رسول اور اتباع سنّت سے ایک خاص اخلاقی ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ اس طرح کے بے شمار واقعات ہیں۔ علماء کو چاہیے کہ ان کو ہمارے سامنے پیش کریں۔ قرآن و حدیث کے غوامض بتانا بھی ضروری ہے لیکن عوام کے دماغ ابھی ان مطالب عالیہ کے متحمل نہیں۔ انھیں فی الحال صرف اخلاقِ نبویؐ کی تعلیم دینی چاہیے۔

میرِ حجاز ﷺ

مولانا ظفر علی خاں

واعظ سخن ز سایۂ طوبیٰ فرو گزار
کایں جا سخن ز سروِ روانِ محمدؐ است

جس طرح شبِ تاریک کی ظلمت مہرِ عالم افروز کی آمد کا مژدہ اپنے اندر پنہاں رکھتی ہے اسی طرح طغیان و عصیان کی فراوانی اور فواحش و معاصی کی کثرت دریائے رحمتِ الٰہی کے جوش میں آنے اور کسی ایسے نفسِ قدسی کے دنیا میں جلوہ گر ہونے کی بشارت دیتی ہے جو ایک اشارۂ چشم و ابرو سے عظیم الشان سلطنتوں کے تختے الٹ دیتا ہے۔ جس کی زبانِ حقیقت ترجمان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ کفر و طاغوت کی رگِ گردن کے لیے تیر و نشتر کا حکم رکھتا ہے اور جو چشم زدن میں کارگاہِ حیات کا نقشہ بدل دیتا ہے۔

رحمتِ خداوندی کا ظہور

ان ہادیانِ سرمنزلِ معرفت کی بعثت کا سلسلہ ابتدائے آفرینش کے ساتھ جاری ہوا۔ خاکدانِ گیتی کا ہر گوشہ اور ہر چپہ ان شموسِ ہدایت کے نور سے مستنیر ہوا تا آنکہ ۵۷۱ء میں جب ابنائے آدم تذلل و تسفل کی انتہائی گہرائیوں میں گر چکے تھے، جب خدا کے بندوں کی گردنیں اصنام و اوثان کے سامنے سجدہ ریزی کرنے کے لیے وقف ہو گئی تھیں، جب حریتِ نفس اور آزادیِ ضمیر کا خاتمہ ہو چکا تھا، جب خدا کے بندے فسق و فجور میں مبتلا ہو کر خدا کے احکام سے غافل ہو گئے تھے، جب انسانیت کبریٰ پر بہیمیت و نفسانیت پورے طور پر غالب آ گئی تھی اور جب اس خطۂ غبرا پر جہالت و ضلالت کی تاریکی پورے طور سے مسلط ہو چکی تھی، دنیا کا وہ سب سے بڑا ہادی اور خدا کا وہ سب سے برگزیدہ انسان مبعوث ہوا جس کی جبینِ تابناک سے نورِ حقیقت کی شعاعیں نکل رہی تھیں، جس کے جاہ و جلال کو دیکھ کر قیصر و کسریٰ کے تخت لرز گئے، جس کے فیضان کی اشعۂ لامعہ نے ظلمت آبادِ ارضی کو بقعۂ نور بنا دیا۔ جس کے سرمنزلِ شہود پر قدم رکھتے ہی استعباد و استعمار کی زنجیریں کٹ گئیں۔ تمیزِ رنگ و نسل مٹ گئی۔ انسانیت کا کھویا ہوا وقار قائم ہوا۔ مخلوق خداوندوں کی خداوندی کا خاتمہ ہو گیا۔ اور جس نے چار سوئے گیتی میں یہ اعلان کر دیا کہ شاہی و خسروی وجہِ افتخار و امتیاز نہیں، بلکہ خدا کے نزدیک اسی کا رتبہ سب سے بلند ہے جو تقویٰ میں سب سے بڑھا ہوا ہو۔ عام اس سے کہ وہ افریقہ کے کسی تپتے ہوئے صحرا کا حبشی ہو، یا یورپ کے کسی برفانی خطہ کا سفید فام انسان، یہود اسے دیکھ کر بے ساختہ پکار اٹھے کہ ابراہیمؑ و موسیٰؑ کی دعائیں ممثل ہو کر اس کی شکل میں جلوہ گر ہوئی ہیں۔ نصاریٰ نے کہا

کہ حضرت عیسیٰؑ کی بشارت مجسم ہو کر سالکان مسالکِ شرک وضلالت کو سرمنزل ہدایت وسعادت کی طرف رہنمائی کرنے کے لیے جلوہ گر ہوگئی ہے۔ اہلِ دنیا جو صراطِ مستقیم کو چھوڑ کر پریشان ہو رہے تھے۔ اس کی طرف دوڑے۔ بندوں کو وہ عہد یاد آگیا جو انھوں نے معبودِ حقیقی سے باندھا تھا اور دنیا کے در و بام اس نورِ مثل کی روشنی سے جگمگا اٹھے۔

حُرّیت اور آزادی کا دور

آج کا دن اسی فضل مجسم کے دنیا میں آنے کا دن ہے، جس کی شانِ رحمۃ للعالمینی نے سپید و سیاہ اور اصفر و احمر کو اپنی آغوش میں پناہ دی۔ جس کی رافت وعطوفت کا ابر گھربار تمام دنیا پر برسا اور جس کے نورِ ہدایت سے دنیا کا ہر چھوٹا اور بڑا رہتی دنیا تک فیضیاب ہوتا رہے گا۔ ؎

الذی ردت الیہ الشمس وانشق القمر
کان امیا ولکن عندہٗ ام الکتاب
والذی فی کفہ الکفار لما ابصروا
کلم الحصباء قالوا انما شیئاً عجاب

حضورؐ نے فاران کی چوٹی پر کھڑے ہو کر ایک پیغام دیا، جن رُوحوں نے اس پیغام پر لبیک کہا انھیں خلافت الٰہیہ عطا ہُوئی۔ قیاصرہ واکاسرہ کے تاج ان کے قدموں پر نثار ہُوتے۔ اور جب تک آفتاب عالمتاب مشرق سے طلوع ہو کر مغرب میں غروب ہوتا رہے گا، دنیا اس تیم مکّہ کے اس اعجاز کو نہ بھولے گی کہ اس نے شتر بانوں کو جہانبانی کے گُر سکھائے کہ وُہ دیکھتے ہی دیکھتے رُبع مسکون پر چھا گئے اور مشرق و مغرب میں اُن کے جھنڈے لہرانے لگے۔ خود اُمّی ہونے کے باوجود اپنے متبعین کو علم ومعرفت کے وُہ رموز بتائے کہ وُہ محفلِ علوم کے صدر کہلائے اور تمام دنیا نے ان کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔ تمیزِ آقا و بندہ اس طرح مٹائی اور مساوات کا ایسا بلند معیار قائم کیا جس کا ما فوق متصوّر ہی نہیں، غلامی کی جڑیں اس طرح کاٹیں کہ جب تک حضورؐ کے حلقہ بگوش حضورؐ کی تعلیم پر عمل پیرا رہے، شجرِ غلامی دنیا میں سرسبز نہ ہو سکا۔

عید میلادُ النبیؐ

آج طول وعرض گیتی میں حضور رحمۃ للعالمینؐ کے میلاد کی مجالس قائم ہوں گی۔ حضورؐ کے حلقہ بگوش جو دنیا کو غلامی سے نجات دلانے کے ضامن وکفیل تھے اور جو آج خود نا آشنائے آزادی ہیں اور جن کے دلوں پر آج خوف غیر اللہ مسلط ہے۔ جا بجا جمع ہو کر مجالس میلاد منعقد کریں گے۔ لیکن انھیں سوچنا چاہیے کہ جب تک وہ حضورؐ کی تعلیم پر عمل پیرا نہیں ہوتے، جب تک وہ حضورؐ کے اُسوۂ حسنہ کو اپنا شعار نہیں بناتے، جب تک وُہ اپنے دلوں کو طاغوتی طاقتوں کی گرفت سے نہیں چھڑاتے، اور جب تک وُہ ان مفاسد کے استیصال کے لیے اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر نہیں اُٹھ کھڑے ہوتے، جنھوں نے خدا کی سرزمین کو جہنّم زار بنا دیا ہے،

جب تک وہ شعائرِ دین کے احترام کو اپنا شعار نہیں بنا تے، جب تک وہ اعتصام بحبل اللہ کا بھولا ہوا سبق دوبارہ ازبر نہیں کرتے، اور جب تک وہ اپنے آپ کو حضور رحمۃً للعالمین کے سچے حلقہ بگوش اور جان نثار غلام ثابت نہیں کرتے، اُس وقت تک عید میلاد پر اُن کا خوشیاں منانا یا جھُوم جھُوم کر مجالس و محافل میں نعتیہ اشعار گانا بے معنی ہے۔ اگر ان کے دل میں اپنے آقا و مولا کا حقیقی احترام ہے، اگر انھیں اپنے ہادیِ برحق سے تعلق قلبی ہے، اور اگر انھیں ان ذمہ داریوں کا احساس ہے جو خدائے واحد کے پرستار اور اسلام کے علمبردار ہونے کی حیثیت میں ربِ کعبہ کی طرف سے ان پر عائد ہوتی ہیں تو انھیں عہد کر لینا چاہیے کہ وُہ خدا و رسول کی رضاجوئی پر کسی انسان کی رضاجوئی کو ترجیح نہ دیں گے۔ ان کا جو قدم اُٹھے گا خدمتِ اسلام کے لیے اٹھے گا اور جس طرح ان کے آقا و مولا نے خالق کا پیغام مخلوق تک پہنچانے میں شدائد و مصائب سے مُنہ نہ موڑا۔ اسی طرح وہ بھی اسلام کو سربلند کرنے، تعلیماتِ اسلامی کو جہل آبادِ ارضی میں پھیلانے، خدا کے بندوں کی گردنیں فراعنۂ عصر کے آستانوں سے ہٹا کر معبودِ حقیقی کے سامنے جھکانے اور انسان کو اس کے فطری اور پیدائشی حقوق کے دلانے میں وہ مخاطر و مہالک کو ہرگز خاطر میں نہ لائیں گے اور اپنے ضمیر کی آزادی کو کسی قیمت پر نہ بیچیں گے۔

عید میلاد کی خوشیاں اُن سعید رُوحوں کے لیے ہیں جو یہ عہد ربِ کعبہ کے ساتھ باندھیں اور اپنے حقیقت ناشناس بھائیوں سے اسی قسم کا عہد لیں ورنہ یُوں تو عید میلاد وُہ لوگ بھی منائیں گے جو اپنے دنیوی آقاؤں کی خوشنودی اور رضاجوئی پر شعائر اللہ کی حرمت تک کو قربان کر دینے میں مضائقہ نہیں سمجھتے اور جن کے نزدیک مسلمان کی تعریف یہی ہے کہ وُہ ہر قسم کی ترقی کا سنگِ راہ بنا رہے وطنیت کے احساس سے اس کا دل خالی ہو اور اسبابِ تعبد کو تقویت پہنچانا اس کا مقصدِ حیات ہو۔

حضور اکرمؐ اور تعدّد ازواج

محمد جعفر شاہ پھلواروی

یہ مقالہ لکھنے کا سبب اس وقت یہ مقالہ سپردِ قلم کرنے کی ایک خاص وجہ ہے۔ ایک طرف عموماً مسیحی اور دُوسرے غیر مسلم اور ان کے ہمنوا آزاد خیال حضرات کی نظروں میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بیک وقت نو بیویاں رکھنا بہت کھٹکتا ہے اور دُوسری طرف خود مسلمان حضورؐ کی صحیح پوزیشن کو نہ سمجھنے کے باعث ہر حال میں تعدد ازواج کو ایک "سنّت" قرار دیتے ہیں۔ یہ دونوں نظریے نظرِ ثانی کے محتاج ہیں۔ اس لیے ہم ہر ایک پر الگ الگ بحث کریں گے۔

متعدد شکوک تعدد ازواج پر ایک شُبہ یہ پیدا کیا جاتا ہے کہ ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری سوکن لانا ایک بے رحمی کا پہلو رکھتا ہے۔ کیونکہ عورت اسے کبھی ٹھنڈے دلوں گوارا نہیں کرتی۔ ہم یہاں پہلے ایک عقلی سوال پیش کرنا چاہتے ہیں۔ فرض کیجیے کہ ایک شخص سے، جس کی بیوی موجود ہے اور اسے کوئی دوسری عورت بُری طرح دل دے بیٹھتی ہے۔ اب دیکھیے اگر وہ اسے حبالۂ عقد میں لے آتا ہے، تو بیوی کی دل شکنی ہوتی ہے اور اگر ایسا نہیں کرتا، تو دوسری عورت کی زندگی خراب ہوتی ہے۔ دونوں صورتوں میں ایک ایک خرابی لازم ہے۔ لہٰذا کسی ایک کو اہون البلیتین (LESSER EVIL) کے طور پر اختیار کرنا پڑے گا اور ایسے مواقع پر صحیح راہ عمل یہی ہوگی کہ بیوی کا حق چونکہ مقدم ہے، اس لیے دوسری عورت کی دل شکنی یا اس کی زندگی کی خرابی کو برداشت کرنا پڑے گا۔ اگر خود مرد کا اپنی بیوی کے علاوہ کسی دوسری عورت سے اسی طرح کا قلبی تعلق پیدا ہو جائے، تو اس صورت میں بھی اسے اپنی بیوی کی خاطر اپنے تمام جذبات کو دبانا چاہیے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جس طرح مذکورہ صورت میں بیوی کے مقابلے میں اپنی یا دوسری عورت کی رعایت نہ کرنا اہون البلیتین ہے۔ اسی طرح کسی موقع پر خود بیوی کی رعایت نہ کرنا اہون البلیتین ہو سکتا ہے یا نہیں؛ ہماری عقل کہتی ہے کہ ہو سکتا ہے (یہ ضرورتیں کیا ہو سکتی ہیں ان کا ذکر آگے آئے گا)

دُوسرا شُبہ حضورؐ کے تعدد ازواج پر غیر مسلموں کا ایک ناگفتہ بہ الزام یہ بھی ہے کہ خاکم بدہن اس کا سبب ہوائے نفسانی کا غلبہ تھا۔ ذرا سوچیے:

ا۔ کیا اس انسان کے متعلق ہوائے نفسانی سے مغلوب ہونے کا وہم بھی ہو سکتا ہے، جس نے پچیس سال کا زمانہ تجرد کمال عفت و پاکبازی سے گزارا ہو، اور اس پچیس سال کی عمر میں نکاح بھی کیا ہو، تو ایک ایسی عورت سے، جو اس سے پندرہ سال بڑی یعنی چالیس سال کی ہے، جو پہلے دو شوہروں کی بیوی رہ چکی ہے اور صاحبِ اولاد بھی ہے اور جو خود پیغامِ نکاح دیتی ہے؟

ب۔ اسے ایک دوشیزہ حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہیں کیونکہ وہ خود تندرستی و جمال میں یگانۂ روزگار ہے، ساری قوم کا

محبوب ہے۔ خاندانی وقار کا مالک ہے۔ عرب میں عورت کی کوئی قدر و قیمت نہیں اور جس کا جی چاہے، دس دس عورتیں رکھ لیتا ہے۔

ج - پچاس سال کی عمر تک یعنی پورے پچیس سال اسی ایک بوڑھی صاحب اولاد اور گزشتہ دو شوہروں کو دیکھنے والی عورت کی رفاقت پر قانع رہتا ہے اور اشارۃً بھی کسی دوسری رفیقۂ حیات کی خواہش نہیں کرتا۔

د - اس رفیقہ (حضرت خدیجہؓ) کی وفات کے بعد اپنی عمر کے پچاسویں سال بالکل اپنی ہم سن پچاس سال کی بڑھیا (سودہؓ) سے نکاح کرتا ہے اور اپنی عمر کے پچپن سال تک اسی ایک بوڑھی عورت کا رفیق بنا رہتا ہے اور کسی دوسری کی طرف رُخ بھی نہیں کرتا۔

ہ - اس کے بعد پچپن سال کی عمر سے انسٹھ سال کے درمیان میں جو نو عورتیں حبالہ عقد میں آتی ہیں، ان میں ساری عورتیں ایسی ہیں جو ایک، دو اور تین تین شوہروں کی بیویاں رہ چکی ہیں۔

کیا ان تمام حقایق پر نگاہ رکھتے ہوئے یہ گمان بھی کیا جا سکتا ہے کہ اس انسان میں غلبۂ نفسانی کا کوئی ادنیٰ شائبہ بھی موجود تھا؟ کیا یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ۵۵ سال کی عمر سے پہلے تک اور پھر ۵۹ سال کی عمر کے بعد (۶۳ سال کی عمر تک) تو ہولے نفسانی کا شائبہ بھی موجود نہ ہو اور صرف ۵۵ سے ۵۹ سال تک کے درمیان فقط پانچ سال کے لیے ساری ہوسناکیاں دفعتہً پیدا ہوگئیں؟ کیا نفسانی ہیجان صرف ۵۵ سال سے ۵۹ سال کی عمر تک ہوا کرتا ہے؟ نہ پہلے نہ بعد میں؟

و - پھر یہ بھی سوچنا چاہیے کہ ہوائے نفسانی کی تکمیل کا تو بہترین موقع اسی وقت تھا جب (۵ھ یا ۶ھ نبوی میں) تبلیغ دین روک دینے کے عوض میں ساری قوم دولت، سیادت اور حسین ترین عورتیں پیش کر رہی تھی۔ اس سے بہتر موقع ہوسناکیوں کی تکمیل کا اور کیا ہو سکتا تھا؟ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس وقت حرم سرائے نبوت میں ایک ساٹھ سال کی صاحبِ اولاد بڑھیا (خدیجہؓ) کے سوا اور کوئی بھی موجود نہیں۔

ز - اس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ سارے عرب پر اقتدار و فرمانروائی قایم ہو چکنے کے بعد نو بیویوں پر مزید اضافے سے کیا چیز روک سکتی تھی؟

ح - ایک اور بات بھی قابلِ غور ہے کہ جن لوگوں کو حضورؐ سے واسطہ تھا، ان میں عربی وعجمی، دوست و دشمن، جاہل و متمدن سب ہی قسم کے لوگ تھے۔ حضورؐ میں اگر ادنیٰ سے ادنیٰ شائبہ ہوسناکی کا ہوتا، تو دشمن کو اس سے بہتر پروپیگنڈے کا اور کیا حربہ ہاتھ آسکتا تھا؟ انھوں نے شاعر کہا، مجنون کہا، خواہشمند اقتدار ہونے کا طعنہ بھی دیا۔ سارے الزام لگائے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ کوئی سخت سے سخت دشمن بھی نفسانی ہوسناکیوں کا الزام نہیں لگاتا۔ کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ جن لوگوں کی آنکھوں کے سامنے حضورؐ نے تعدد ازدواج فرمایا تھا، وہ بھی یہ سمجھتے تھے کہ یہ اُونچا انسان مغلوب النفس نہیں ہو سکتا بلکہ اس کی مصلحتیں وہی ہو سکتی ہیں، جو اس کی ساری زندگی کے حرکت و سکون میں جھانکتی ہیں۔

تیسرا شبہ ایک شبہ یہ بھی کیا جاتا ہے کہ اُمت کے لیے تو مثنیٰ و ثلٰث و ربٰع کے نزول کے بعد چار تک کی تحدید کر دی گئی اور جن اُمتیوں کے پاس چار سے زاید بیویاں تھیں، ان سے چار کے علاوہ کو جدا کرا دیا گیا۔ لیکن خود حضورؐ نے اس پر

عمل نہیں فرمایا بلکہ جو نو بیویاں نزولِ آیت کے وقت تھیں، وہ بدستور رہیں۔ اپنے لیے یہ رعایت اور اُمت کو اس رعایت سے محروم رکھنے میں کیا مصلحت ہو سکتی ہے؟

بظاہر تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کے لیے یہ رعایت ہے اور اُمت اس رعایت سے محروم ہے۔ لیکن دراصل معاملہ برعکس ہے۔ مندرجہ ذیل حقایق پر غور فرمائیے؛

ا - ہر مسلمان کے لیے چچا، پھوپھی، ماموں اور خالہ کی بیٹیوں سے نکاح جائز ہے۔ لیکن حضورؐ کے لیے ان سے اسی صورت میں نکاح جائز ہے، جب کہ ان عورتوں نے ہجرت کی ہو۔ ارشادِ خداوندی ہے:

وبنٰت عمك و بنٰت عمّتك و بنٰت خالك و بنٰت خالٰتك التی هاجرن معك۔

یہی وجہ ہے کہ حضورؐ کے سگے اور مہربان چچا ابوطالب کی بیٹی ام ہانی حضورؐ کے لیے حلال نہ تھیں، کیونکہ وہ ایمان ہی فتح مکہ کے بعد لائی تھیں، جب کہ ہجرت ختم ہو چکی تھی۔

ب - ہر امتی بشرطِ عدل و ضرورت چار بیویاں رکھ سکتا تھا۔ لیکن قانوناً وہ ان سب کو یا بعض کو الگ کر کے دوسری عورتوں کو حبالۂ عقد میں لا سکتا تھا، وہ اس طرح قانون سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے سینکڑوں نکاح کر سکتا تھا۔ لیکن رسولؐ کے لیے ان نو عورتوں کے بعد ہمیشہ کے لیے نکاح کا دروازہ بند ہے۔ ارشادِ قرآنی ہے کہ:

لا یحل لك النسآء من بعد و لا ان تبدل بهن من ازواج ولو اعجبك حسنهن۔

(اے رسولؐ! اب ان موجودہ نو ازواج کے بعد آپ کے لیے دُوسری عورتیں حلال نہیں اور نہ ان کو الگ کر کے دُوسری ازواج کرنا حلال ہے۔ اگرچہ ان دوسری عورتوں کا حسن بھی آپ کو بھاتا ہو)

ان آیات سے جو واضح نتیجہ نکلتا ہے، وہ یہ ہے کہ؛

۱- اُمت کا کوئی فرد ایک بیوی کی وفات کے بعد یا ضرورت ہو تو زندگی میں دُوسری، اور یوں ہی تیسری، چوتھی، جتنی بھی چاہے، بیویاں کر سکتا ہے لیکن رسُولؐ کے لیے ام المومنین میمونہؓ کے بعد یہ دروازہ بند ہے۔

۲- اُمت کے لیے بیویوں کو طلاق دے کر اس کی بجائے دوسری بیویاں کرنے کا امکان موجود ہے، لیکن رسولؐ کو اس کی بھی اجازت نہیں۔

۳- اُمت کے لیے ناموافقت مزاج یا کسی دُوسری عورت کی کششِ حسن تبدیل زوج کا بہانہ بن سکتی ہے۔ لیکن رسولؐ کے لیے یہ راہ بھی مسدود ہے۔

ذرا انصاف سے دیکھیے، رعایتیں اُمت کے لیے ہیں یا رسول کے لیے؛ یہاں زیادہ سے زیادہ چار کی تحدید ہے۔ لیکن موتِ زوجہ، ناموافقت مزاج اور کسی کی کششِ حسن تبدیل و تجدید ازواج کے بہانے بن جاتے ہیں۔ لیکن وہاں ایک کے سوا ساری عورتیں سن رسیدہ و بیوہ ہونے کے باوجود نہ تجدید بعد الموت کی اجازت ہے نہ تبدیل بعد الطلاق کی اور نہ نو پر کسی اضافے کی۔ غور سے دیکھیے رعایت اُمت کے لیے زیادہ ہے یا خود رسولؐ کے لیے؛

یہ بتانے کے بعد کہ حضورؐ کے تعدد ازدواج میں ہوائے نفسانی کے غلبے کا کوئی شائبہ تک نہ تھا، اب ہم ان مصالح کا ذکر کریں گے جن کی وجہ سے حضورؐ کو متعدد نکاح کرنے پڑے۔ یہ مصالح ذاتی نہ تھے، سراسر قومی و دینی تھے۔ ان کا افادی پہلو صرف اس قدر نہ تھا کہ کرنے میں ملی فائدے تھے بلکہ اس کا دوسرا پہلو یہ بھی تھا کہ نہ کرنے میں بہت سی خرابیاں بھی پیدا ہوتی تھیں۔ ہم بڑی غلطی یہ کرتے ہیں کہ کسی اہم واقع پر غور کرتے وقت اپنا ماحول پیش نظر رکھتے ہیں حالانکہ ہر واقعے کو اس کے اپنے زمان و مکان اور اپنے احوال و ظروف کی میں رکھ کر دیکھنا چاہیے۔ اب امہات المومنین کے مصالح عقد پر غور کیجیے:

SLITING

۱۔ حضرت سودہؓ: ان کا پہلا نکاح سکران بن عمرو بن عبد ود سے ہوا تھا۔ یہ اپنے شوہر سے پہلے ایمان لے آئی تھیں اور ان ہی کی ترغیب سے ان کے شوہر بھی اسلام لے آئے۔ حضرت سودہؓ نے اپنے خاوند اور والدہ کے ساتھ حبشہ کو ہجرت کی تھی۔ ادھر سکران کا حبش میں اور ادھر حضرت خدیجہؓ کا مکے میں انتقال ہوا۔ اس وقت ان کی عمر بھی پچاس سال کی تھی اور حضورؐ کی عمر بھی اتنی ہی تھی۔ حضورؐ نے ان کی قربانیوں کا لحاظ کرتے ہوئے ان کے مصائب کو ختم کرنے کے لیے اپنے نکاح میں لے لیا۔ ہر ذی عقل سمجھ سکتا ہے کہ ایک پچاس سال کی ہم عمر اور بیوہ عورت سے یہ نکاح صرف سودہؓ اور ان کے خاندان کی قربانیوں، سبقت الی الاسلام اور ہجرت حبشہ وغیرہ ہی سے تعلق رکھتا تھا۔ نفسانیت کا تو اس میں شائبہ بھی نہیں ہو سکتا۔ خود حضرت سودہؓ کا یہ حال تھا کہ انھوں نے صاف لفظوں میں فرما دیا کہ مجھے حضورؐ کی کنیزی کا شرف بہت کافی ہے۔ اس لیے میں اپنی باری عائشہؓ کو دیتی ہوں۔

۲۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ: حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد باوجود اس کے کہ پچاس سال کی بوڑھی حضرت سودہؓ سے نکاح کر لیا تھا۔ لیکن حضرت خدیجہؓ کی جدائی سے حضور اکرمؐ مغموم سے رہتے۔ کیونکہ یہ سن میں حضورؐ سے پندرہ سال بڑی ہونے کے باوجود اول مومنہ تھیں۔ زندگی بھر مالی ایثار کرتی رہیں اور ہر سرد و گرم کو جھیلتی رہیں۔ ایسی رفیقۂ حیات کی جدائی سے حضورؐ کا ملول ہونا قدرتی بات تھی۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے اس کو بھانپ لیا اور اپنی لخت جگر کو حضورؐ کی کنیزی میں دینے کی درخواست کی۔ کیا حضورؐ اس صدیق کی درخواست کو رد فرما سکتے تھے، جس نے اسلام لانے میں سب سے پہلے قدم بڑھایا۔ متعدد سعید روحوں کو اسلام کی رغبت دلائی اور ہر ہر قدم پر ایثار میں سب سے بڑھ کر حصہ لیا اور رفاقت میں "ثانی اسلام و غار و بدر و قبر" ثابت ہوا۔

۳۔ حفصہ بنت عمر بن الخطاب: پہلا نکاح خنیس ابن حذافہ سلمی سے ہوا تھا۔ شوہر کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ کو فطرۃً ان کے عقد ثانی کا خیال ہوا۔ پہلے آپ نے حضرت ابوبکرؓ سے نکاح کر لینے کو کہا، مگر آپ خاموش رہے۔ پھر حضرت عثمانؓ سے ذکر کیا۔ اس وقت حضرت عثمانؓ کی پہلی بیوی رقیہؓ بنت رسول اللہؐ قضا کر چکی تھیں۔ اس لیے حضرت عمرؓ کو خیال تھا کہ شاید یہ ضرور حفصہؓ سے رشتہ کر لیں گے۔ لیکن حضرت عثمانؓ نے ٹال دیا۔ اس سے حضرت عمرؓ کو کچھ ملال ہوا اور حضورؐ سے اس ملال کا ذکر کیا۔ حضورؐ نے ایک عجیب بلیغ جملہ فرمایا کہ: یتزوج عثمان من هو خیر من حفصة ویتزوج حفصة من هو خیر من عثمان۔ یعنی حضرت عثمانؓ کو حفصہؓ سے بہتر بیوی اور حفصہ کو عثمان سے بہتر شوہر ملے گا۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ کا حضورؐ نے اپنی دوسری دختر حضرت ام کلثومؓ سے نکاح کر دیا اور حضرت حفصہ کو اپنی زوجیت میں لے لیا۔ اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ جب تم نے مجھ سے حفصہؓ کا ذکر فرمایا، تو میں خاموش رہا تھا، جس سے شاید تمہیں کچھ خیال پیدا ہوا ہو۔ لیکن بات یہ تھی کہ مجھے پہلے ہی حضورؐ کے عندیے کا پتا چل چکا تھا۔ اس لیے میں خاموش رہا کہ جب تک حضورؐ

صاف لفظوں میں انکار یا اقرار نہ فرمائیں، میں بھی انکار یا اقرار نہ کروں۔ حضرت حفصہؓ بھی اپنے والد بزرگوار کی طرح کچھ تیز مزاج سی تھیں اور حضرت عثمانؓ نے غالباً اسی وجہ سے ان سے نکاح کرنا پسند نہ کیا ہوگا۔ بہرکیف حالات یہ تھے کہ حضرت حفصہ کو کوئی معقول رشتہ نہ ملتا تھا اور باپ کو فطرۃً اس کی فکر تھی۔ باپ بھی ایسا، جو زندگی بھر اسلام کی راہ میں ہر ایثار کے لیے وقف رہا۔ اس کی دلداری کا اس سے بہتر اور کیا سامان ہو سکتا تھا جو حضورؐ نے کر دیا؛

۴۔ حضرت زینبؓ بنت خزیمہ: ان کا پہلا نکاح طفیل بن حارث بن عبدالمطلب سے، دوسرا عبیدہ بن حارث بن عبدالمطلب سے اور تیسرا نکاح عبداللہ بن جحش سے ہوا تھا۔ یہ عبداللہ بن جحش ام المومنین زینب بنتِ جحش (جن کا ذکر آگے آئے گا) کے بھائی اور حضورؐ کے پھوپھی زاد برادر ہیں۔ یہ غزوۂ اُحد میں شہید ہُوئے، تو حضورؐ نے نہ فقط قرابت کا لحاظ فرمایا بلکہ شہادت احد سے پیدا ہونے والی ملی پیچیدگی کو دُور فرمانے کے لیے ان سے نکاح فرما لیا۔ یہ دراصل قدردانی (APPRECIATION) تھی ان جاں نثاروں کی قربانیوں کی تاکہ راہِ خدا میں جان دینے والوں کے اہل و عیال بے سہارا نہ رہیں اور دوسروں کو بھی اس نوع کی قدردانی کی ترغیب ہو۔

۵۔ حضرت ام سلمٰیؓ: ان کا پہلا نکاح ابوسلمہ سے ہوا تھا۔ یہ حضورؐ کے رضاعی بھائی ہیں اور گیارھویں مسلمان ہیں۔ انہوں نے ہجرتِ حبشہ بھی کی تھی اور پھر مکّے واپس آ کر ہجرت مدینہ سے بھی سرفراز ہُوئے۔ جب یہ ہجرت مدینہ کے لیے روانہ ہُوئے تو ان کے بچّے سلمہ کو ان کے خاندان والوں نے اور ان کی بیوی ام سلمہ کو ام سلمہ کے خاندان والوں نے یہ کہہ کر چھین لیا کہ تم جہاں چاہو، جاؤ مگر ہم اپنے خاندان کے کسی فرد کو تمہارے ساتھ نہ جانے دیں گے۔ ابوسلمہ نے اس کے باوجود عزم ہجرت کو پُورا کیا۔ ام سلمہ ہر روز شام کو اس مقام پر آ کر رویا کرتی تھیں، جہاں ان کے شوہر سے ان کو چھینا گیا تھا۔ ایک سال تک وہ اسی طرح روتی رہیں مگر ترکِ اسلام کا کبھی خیال بھی نہ آیا۔ آخر سنگدلوں کے دل بھی پسیج گئے اور وُہ بھی مدینے پہنچ گئیں۔ ان کے شوہر ابوسلمہؓ بدری ہیں اور غزوۂ احد میں بھی شریک ہُوئے، جہاں زخمی ہُوئے اور جانبر نہ ہو سکے۔ وفات کے وقت انہوں نے دعا کی کہ اللھم اخلفنی فی اھلی بخیر (خداوندا میرے کنبے کی اچھی طرح نگہداشت فرما) دو خورد سال لڑکے عمر اور سلمہ چھوڑے اور دو لڑکیاں زینب اور درہ۔ غور کیجئے، رضاعی بھائی ہے، جس نے سبقت الی الاسلام بھی کی اور حبشہ و مدینہ دونوں کی ہجرتوں سے بھی سرفراز ہُوا۔ ہجرتِ مدینہ کے وقت کڑی آزمائشوں میں پڑا اور کھرا اترا۔ وہ چار بچے چھوڑ کر مرتا ہے اور بیوی ام سلمہ کی قربانیاں بھی کم نہیں۔ ابوسلمہ اور ام سلمہ کی ان قربانیوں کا کیا صلہ ہونا چاہیے تھا اور معصوم بچوں کی کفالت کی کیا شکل پیدا کرنی چاہیے تھی۔ جس کے لیے ابوسلمہ نے مرتے وقت دعا بھی کی تھی؛ انہی اہم سوالوں کا جواب تھا ام سلمہ کا ام المومنین بن جانا۔

۶۔ حضرت زینب بنت جحش: یہ حضورؐ کی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ ان کا پہلا نکاح زید بن حارثہ کے ساتھ حضورؐ نے خود کر دیا تھا تاکہ زید کے ساتھ مصنوعی غلامی کی جو حقارت بلا وجہ وابستہ ہے، وہ ختم ہو جائے اور ساتھ ہی خاندانی تفاخر کا بھی خاتمہ ہو جائے۔ زید کا پہلا نکاح ایک حبشی الاصل خاتون حضرت ام ایمن سے ہُوا تھا جو زید سے دو چند بڑی تھیں۔ ان دونوں کی زندگی خوشگواری کے ساتھ گزری۔ لیکن زینب بنت جحش زید کے ساتھ نہ نباہ سکیں۔ نوبت طلاق تک پہنچ گئی۔ حضورؐ اگر زینب سے خود نکاح فرمانا چاہتے تو ہزاروں جان سے زینب اسے منظور فرما لیتیں اور حضور کنوارپنے ہی میں ان سے نکاح فرما لیتے۔ لیکن حضورؐ تو

صرف غلام و آزاد کی اُونچ نیچ کے فرق کو مٹانا چاہتے تھے۔ اس لیے زید سے زینب کو بیاہ دیا لیکن طلاق کی نوبت آنے کے بعد زینب کے ٹوٹے ہُوئے دل کو کس طرح جوڑا جا سکتا تھا؟ اور اس سے زیادہ اہم ایک اور چیز بھی سامنے آگئی۔ عرب کے دستور کے مطابق منہ بولا بیٹا حقیقی فرزند کی طرح حقوق رکھتا تھا۔ وہ وارث بھی ہوتا تھا اور اس کی بیوی حقیقی بہو کی طرح باپ پر حرام سمجھی جاتی تھی۔ حضورؐ کو جہاں زینب کی طلاق کی تحقیر کو عزت سے بدل کر اشک شوئی کرنا تھی وہاں ہمیشہ کے لیے ایک قانون بھی دینا تھا کہ منہ بولے فرزند کا رشتہ حقیقی فرزند جیسا نہیں ہوتا، جو اس کی بیوی منہ بولے باپ پر حرام ہو جائے۔ یہ معاملہ اتنا اہم تھا کہ ازواج مطہرات میں صرف زینب ہی ایسی عورت ہیں جن کے لیے قرآن میں زوجنکہا (ہم نے ان کو تم سے بیاہا ہے) کا لفظ آیا ہے اور تنہا زید ہی ایک ایسے صحابی ہیں، جن کا نام بھی قرآن میں آیا ہے۔ اس بے معنی رسم تبنیت اور اس پر مصنوعی تعمیر قرابت و وراثت وغیرہ کو توڑنے کے لیے ایک زبردست علمی نمونے کی ضرورت تھی اور یہی ضرورت نکاحِ زینب کا باعث ہُوئی۔ ورنہ اگر صرف زینب کی چاہت ہوتی تو نکاحِ زید سے پہلے ہی اس سے کونسی چیز روک سکتی تھی؟

۷۔ حضرت جویریہؓ بنت الحارث: یہ بنو خزیمہ یعنی بنو مصطلق کے خاندان سے تھیں۔ یہ غزوہ مریسیع یعنی غزوۂ مصطلق میں اسیر ہو کر آئی تھیں اور ثابت بن قیس بن شماس کے حصے میں آئیں۔ ان کا پہلا نکاح ایک مصطلقی فرد مسافع بن صفوان سے ہُوا تھا۔ ثابت سے انہوں نے رہا کر دینے کی درخواست کی مگر انہوں نے زرِ فدیہ طلب کیا۔ یہ حضورؐ کے پاس آئیں اور مدارج النبوۃ کی روایت کے مطابق اسلام بھی لے آئیں اور حضورؐ سے عرض کیا کہ میں سردار قوم حارث بن ابی کی بیٹی ہُوں۔ لہٰذا مجھ سے بہتر سلوک کیا جائے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ کیا یہ بہتر سلوک نہ ہوگا کہ میں تمہاری طرف سے زرِ فدیہ دے کر آزاد بھی کر دوں اور تم کو اپنی زوجیت میں لے لُوں؟ حضرت جویریہؓ نے اسے بخوشی منظور کر لیا۔ یہ بھنک پہنچتے ہی تمام لوگوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اگر جویریہؓ کو ام المومنین بننے کا شرف حاصل ہُوا تو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصہار (سسرالی رشتہ داروں) کو بطور اسیر نہیں رکھیں گے۔ بنو مصطلق کے قیدی چھ سو کی تعداد میں تھے، جن میں سینکڑوں جویریہؓ کے رشتہ دار تھے یہاں یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ اگر حضورؐ ان سے نکاح کے خواہشمند ہوتے، تو ثابت بن قیس کے حصے میں ان کو دینے کے بجائے خود ہی اپنے حصے میں لے سکتے تھے۔ لیکن اب معاملے میں پیچیدگی یُوں پیدا ہوگئی کہ اگر ان کو زرِ فدیہ دے کر آزاد کر دیا جاتا ہے، تو یہ تنہا آزاد ہو کر گھر چلی جاتی ہیں۔ لیکن اگر حضورؐ سے نکاح ہو جاتا ہے تو از خود ان کے سینکڑوں رشتے دار اور ساتھ ہی دوسرے قیدی (جن کو ملا کر چھ سو قیدیوں کی تعداد ہوتی ہے) ایک لحظے میں آزادی کی سانس لیتے ہُوئے گھروں کو واپس ہو جاتے ہیں۔ خود سوچیے کہ انسانیت اور اس کی اقدار کی محافظت کا ایسے موقع پر کیا تقاضا ہونا چاہیے تھا؟ یہ نکاح انسانیت کے لیے اتنا بابرکت تھا کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ:

ما رأینا امرأۃ کانت اعظم برکتہ علیٰ قومہا منہا۔ (رواہ ابو داؤد)

(اپنی قوم کے لیے جویریہؓ جیسی بابرکت عورت میں نے کوئی نہیں دیکھی)

۸۔ ام حبیبہؓ: یہ ابو سفیان بن حرب کی صاحبزادی ہیں۔ باپ آخری وقت تک حضورؐ کی دشمنی کرتا رہا، مگر یہ مومنہ تھیں اور اپنے پہلے شوہر عبید اللہ بن جحش کے ساتھ حبشہ کو ہجرت کر گئیں۔ عبید اللہ دائم الخمر تھا اور عیسائیوں کی صحبت میں عیسائی ہو گیا۔

ایک عورت جو محض اسلام کی خاطر خویش و اقارب اور وطن کو چھوڑ کر حبشہ آئی تھی، ارتداد و شوہر کی وجہ سے بے سہارا ہوگئی مگر ترکِ اسلام کا خیال ایک لحظے کے لیے بھی اس کے دل میں نہیں آیا۔ اس غریب الدیار کی ان قربانیوں اور استقامت علی الدین کا اسے کیا صلہ ملنا چاہیے تھا؟ حضورؐ نے اسی خیال سے عمرو بن امیہ ضمری کو بھیجا اور شاہِ حبشہ نے ایک باندی کو بھیج کر حضورؐ کا پیغام دیا۔ ام حبیبہ نے مارے خوشی کے اپنے سارے زیور جو اس وقت زیب تن تھے، اتار کر اس باندی کو انعام میں دے دیئے۔ اب اس سے اس مسرت کا اندازہ کرنا دشوار نہیں، جو انہیں ارتداد شوہر کے صدمے کے بعد بطور تلافی حاصل ہُوئی ہوگی۔

ان کے ایمان اور ادب رسولؐ کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب ان کا باپ ابو سفیان تجدید معاہدہ حدیبیہ کے لیے مدینہ آیا، تو اسے آتا دیکھ کر ام حبیبہؓ نے رسول اللہؐ کا بستر لپیٹ کر الگ رکھ دیا تھا۔ ابو سفیان نے پوچھا کہ تو مجھ کو بستر سے دُور رکھنا چاہتی ہے یا مجھ سے بستر کو ؟ ام حبیبہؓ نے جواب دیا کہ تو ابھی مشرک ہے اور تو اس قابل نہیں کہ رسول اللہؐ کے بستر پر بیٹھ سکے۔

۹۔ حضرت صفیہؓ : ان کا پہلا نکاح سلام بن مشکم سے اور دوسرا کنانہ بن ابی الحقیق سے ہُوا تھا۔ کنانہ غزوۂ خیبر میں مارا گیا تھا اور صفیہ بطور اسیر آئی تھیں اور دحیہ کلبی کی درخواست پر ان کو دینے کا ارادہ فرمایا۔ اس پر لوگوں نے چہ میگوئیاں کیں کہ یہ ایک بڑے یہودی سردار حیی بن اخطب کی بیٹی ہیں، جو بنو قریظہ اور بنو نضیر دونوں کا سردار تھا۔ لہٰذا اسے کسی بڑے سردار ہی کے پاس جانا چاہیے اور حضورؐ سے بڑا سردار کون ہو سکتا تھا۔ اس پر حضورؐ نے صفیہ کو پہلے آزاد کر دیا۔ اس کے بعد ام المومنین ہونے کا شرف بخشا۔

اس دو شوہروں کو دیکھنے والی عورت کو اگر حضورؐ پہلے ہی لینا چاہتے، تو دحیہ کلبی کے حوالے کرنے کا ارادہ بھی نہ فرماتے لیکن بات یہ تھی، ایک اسیرہ جو ایک سردار کی بیٹی بھی ہے اور اس کا شوہر ابھی جنگ میں مارا بھی گیا ہے، کے احترام کو باقی رکھتے ہُوئے اس کے ٹوٹے ہُوئے دل کا اور کوئی سہارا اس کے سوا نہ تھا، کہ وہ ام المومنین بننے کا ابدی شرف حاصل کریں۔ پھر دیکھیے حضورؐ نے انہیں پہلے آزاد فرما دیا۔ جس کے بعد وہ مختار تھیں کہ خواہ حضورؐ کے پیامِ نکاح کو قبول کریں یا نہ کریں۔ اس کے بعد ان کا پیغامِ نکاح کو بخوشی قبول کر لینے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ حضورؐ سے بہتر اور کوئی پناہ گاہ ان کی نظروں میں نہ تھی۔

۱۰۔ حضرت میمونہؓ : یہ عبداللہ بن عباس اور خالد بن ولید کی خالہ ہیں۔ اسماء بنت عمیس (جو یکے بعد دیگرے جعفر طیار، ابوبکر صدیق اور علی مرتضیٰ کی بیوی بنیں) ان کی اخیافی بہن ہیں نیز حضرت حمزہ کی بیوی سلمیٰ بنت عمیس اور ام المومنین زینب بنت خزیمہ کی بھی اخیافی بہن ہیں۔ میمونہ کا پہلا نکاح حویطب بن عبد العزیٰ سے اور دُوسرا ابو رہم بن عبد العزیٰ سے ہوا۔ یہ دُوسرے نکاح کے بعد جب بیوہ ہوگئیں، تو حضرت عباس بن عبد المطلب نے ان کی بیکسی کا ذکر فرمایا اور حضورؐ نے ان سے نکاح فرما لیا۔

نتیجہ

ان تمام نکاحوں پر ایک غائر نظر ڈالیے، تو بات صاف ہو جائے گی کہ:

۱۔ ان میں سے ایک کے سوا ساری عورتیں وُہ ہیں، جس کا ایک یا دو یا تین نکاح پہلے ہو چکے ہیں۔

۲۔ یہ نکاح اس لیے کئے گئے کہ ان عورتوں یا ان کے رشتہ داروں کی قربانیاں فراموش نہیں کی جا سکتی تھیں۔

۳۔ یا اس لیے کہ ان کا روحانی سہارا حضورؐ سے بہتر اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

۴۔ یا اس لیے کہ ان کی اور ان کی اولاد کی معاشی کفالت کا سامان کرنا تھا۔

د۔ یا اس لیے کہ ان کا خاندانی احترام باقی رکھنا مقصود تھا۔

دیگر مصالح لیکن بات یہیں نہیں ختم ہو جاتی۔ مصالح اور بھی ہیں، جن میں ایک حصہ متاہل لوگوں کے لیے درس معاشرت کا ہے اور دوسرا حصہ قیمتی نتائج کا حامل ہے۔ پہلے ان شاندار نتائج کو دیکھیے، جو ان نکاحوں کے بعد ظاہر ہُوئے۔ ان میں چند خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں:

۱۔ توسیعِ دین ازدواج کے بعد اصہار یعنی سسرالی رشتے داروں سے حسنِ تعلقات و ہمدردی کا پیدا ہونا ایک قدرتی بات ہے اور اس سے بڑے بڑے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ حضورؐ کے ان نکاحوں سے یہ فائدہ حاصل ہُوا کہ مختلف قبائل سے راہ و رسم پیدا ہو گئی اور ان کے قریب ہو جانے سے وہ تمام غلط فہمیاں دُور ہو گئیں، جو دشمنوں کے جھوٹے پروپیگنڈے سے یا کھنچے کھنچے رہنے سے پیدا ہو گئی تھیں۔ اس طرح نظامِ حق کی اشاعت و توسیع کے لیے مختصر مدت میں زمین ہموار ہو گئی۔ حضورؐ کی کوئی دُو زوجہ بھی ایک خاندان کی نہ تھیں۔ حضرت ام حبیبہؓ بنت ابو سفیان بنو امیہ سے ہیں اور نسباً سب سے قریب۔ حضرت میمونہؓ بنت حارث بنو عیلان سے ہیں اور نسب میں سب سے زیادہ دُور۔ حضرت خدیجہؓ بنت خویلد بنی عزّیٰ سے ہیں، حضرت سودہؓ بنت زمعہ بنی عامر سے ہیں۔ حضرت عائشہؓ بنت ابی بکر بنی تمیم سے ہیں، حضرت حفصہؓ بنت عمر بنی عدی سے ہیں، حضرت زینبؓ بنت جحش بنی اسد سے ہیں، حضرت ام سلمہؓ بنت ابی اُمیہ بنی مخزوم سے ہیں، حضرت جویریہؓ بنت حارث بنی مصطلق سے ہیں، حضرت صفیہؓ بنت حیی خاندان سیدنا ہارون سے ہیں اور حضرت زینبؓ بنت خزیمہ بنی ہلال سے ہیں۔ عرب کی قبائلیت اور اس کے موثرات سے جو لوگ واقف ہیں، ان کے لیے یہ سمجھنا دشوار نہیں کہ عرب کے اتنے مختلف قبائل اور ان کی شاخوں سے خوشگوار صہری تعلقات قایم ہونے کے بعد ملنے جلنے کے کس قدر مواقع پیدا ہُوئے ہوں گے اور ان صہری تعلقات کی وجہ سے کم سے کم مدت میں نظامِ حق کی توسیع میں کتنی مدد ملی ہوگی۔

۲۔ اصلاح و قیامِ امن اسی کا نتیجہ تھا کہ ام المومنین حضرت ام حبیبہؓ بنت ابی سفیان کے ازدواج ۶ھ کے بعد ابو سفیان کی مخالفت ڈھیلی پڑ گئی اور کچھ دنوں کے بعد یہ اور ان کے دونوں فرزند معاویہ و یزید ایمان لے آئے۔ ام المومنین حضرت جویریہؓ بنت حارث کے نکاح ۵ھ کے بعد حارث اور ان کا سارا خاندانِ مصطلق پیشہ رہزنی سے "تائب" ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہو گیا۔ ام المومنین حضرت صفیہ بنت حیی ہارونیہ کے ازدواج ۷ھ کے بعد یہود نے پھر کسی سازش میں حصہ نہ لیا۔ ام المومنین حضرت میمونہؓ بنت حارث کے نکاح ۷ھ کے بعد نجد کے سارے فتنے ختم ہو گئے۔ غرض جس قبیلے یا ملک کی عورت آئی، وہاں کے فتنے سلامتی سے، وہاں کا افتراق اتحاد و اتفاق سے اور وہاں کی بدامنیاں امن سے بدل گئیں۔ کون ہے جو ان خوشگوار نتائجِ امن و اصلاح کو دیکھتے ہُوئے ان نکاحوں کی اہمیت سے انکار کر سکتا ہے؛

۳۔ آدھی دنیا کی تعلیم ان ازواج مطہرات کے ذریعے جس کے سبب بڑے مقصد کی تکمیل ہُوئی، وہ نصف انسانی دنیا کی تعلیم ہے قرآن نے اصولی طور پر عورتوں کے ضروری مسائل بتا دیے ہیں، لیکن بے شمار جزئیات ایسے ہیں، جن کی تشریح حضورؐ کو فرمانا پڑی۔ تعلیمِ نساء کا یہی انداز بہتر ہو سکتا تھا اور ہُوا کہ امہات مومنین نے حضورؐ سے وہ مسائل معلوم کیے اور ان سے دوسری عورتوں نے حاصل کیے۔ نسائی مسائل کی بہت سی گتھیوں کو سلجھانے میں ازواجِ مطہرات کا غیر معمولی دخل ہے اور ان ہی سے ایسے

بہتیرے مسائل مروی ہیں۔

نصف دین کی تکمیل اب ایک دشواری پر بھی نظر ڈالیے۔ ایک طرف حضورؐ کی حیا کا یہ عالم ہے کہ روایتوں میں ہے کہ حضورؐ کنواری پردہ نشین سے بھی زیادہ باحیا تھے۔ نیز حضورؐ کا ارشاد ہے کہ :

الحیاء شعبة من الایمان ۔

(شرم و حیا ایمان کا ایک حصہ ہے)

روایتوں میں ہے کہ نبوت سے بہت پہلے حضورؐ ایک بار محض بے ستری کے خوف سے بیہوش ہو کر گر پڑے تھے۔ یہ بھی روایت ہے کہ حیاسے نبویؐ حرم سرا کے اندر بھی کبھی بے نقاب نہ ہُوئی۔ کیا اس قدر غیر معمولی حیا کے ہوتے ہوئے حضورؐ سے یہ توقع ہو سکتی تھی کہ برسرِ منبر حضورؐ ان مسائل کو کھول کھول کر بیان فرماتے ہوں گے کہ جن کو پڑھاتے ہُوئے آج بھی طلبہ و مدرسین آنکھیں نیچی کر لیتے ہیں؟ یہ طہارت و نجاست کے مسائل ہیں، حیض و نفاس کے دقایق ہیں، آداب و مواصلت کی پابندیاں ہیں، شکستِ صوم و صلوٰۃ کی نزاکتیں ہیں جن کا جاننا زن و مرد کے لیے ضروری ہے۔ ایک طرف ان مسائل کا علم ضروری اور دُوسری طرف ان کے اظہار سے حیا مانع۔ اس پیچیدگی کا حل اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا تھا کہ ازواجِ مطہرات کے ذریعے عورتوں کو اور ان عورتوں کے وسیلے سے مردوں کو مسائل ضروریہ کی تعلیم حاصل ہو۔ بلاشبہ حرم سرائے نبوت کے اندر بھی حضورؐ کی حیا، اسی طرح پردۂ حجاب میں رہتی تھی۔ لیکن بہرحال اپنی بیویوں سے حیا وارانہ مسائل کا اظہار مشکل نہ تھا۔ آدھے معمورہ عالم اور نصف دنیا کی تعلیم اور نصف دین کی تکمیل کی اس سے بہتر کیا شکل ہو سکتی تھی؟ واقعات شاہد ہیں کہ عبداللہؓ بن عباس کی فقاہت، علی مرتضیٰؓ کی دقیقہ رسی، صدیقؓ و فاروقؓ کی عقدہ کشائی جن مسائل میں آکر اٹک جاتی تھی، وہاں ان کی گرہ کشائی کے لیے بعض ازواج النبیؐ ہی کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا۔ کیونکہ خلوت گاہِ نبوت کا رازدار امہات مومنین کے سوا کوئی دُوسرا نہ تھا۔ شمع نبوت کے پروانے جلوت کی زندگی سے واقف نہ تھے اور امہات مومنین حقایق خلوت کی بھی رازدار تھیں۔ ہم تو یہاں تک دیکھتے ہیں کہ بعض امہات تفسیر و فقہ کے حقایق و دقایق بھی ان واقف کاران جلوت کو بتاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ نصف دین کی تکمیل اور دنیا کی آدھی آبادی کی تعلیم کا یہ عظیم الشان کام ایک دو عورتوں سے نہیں چل سکتا تھا۔

صرف نوؔ کی تعداد کو دیکھ کر جس کا جی چاہے شبہات پیدا کر لے۔ لیکن اس کا یہ روشن و عیاں پہلو ایسا ہے، جس کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کی جا سکتیں۔ کیا دنیا میں کوئی ایسا مصلح بھی گزرا ہے، جس نے اپنی بیوی کو مصلحاتِ امت، مبلغاتِ دین، معلماتِ مسائل اور مدرساتِ فقہ بنا کر پیش کیا ہو اور نصف دین کی تکمیل ان ہی کے ذریعہ کرائی ہو؟

ذرا ان روایات کے اعداد و شمار کو دیکھیے، جو ازواجِ مطہرات سے مروی ہیں۔ حضرت عائشہؓ سے دو ہزار دو سو دس ۲۲۱۰ روایات مروی ہیں۔ حضرت ام سلمہؓ سے تین سو اٹھتر ۳۷۸، حضرت میمونہؓ سے چھہتر ۷۶، حضرت ام حبیبہؓ سے پینسٹھ ۶۵، حضرت حفصہؓ سے ساٹھ ۶۰، حضرت صفیہؓ سے دس ۱۰ اور حضرت سودہؓ سے پانچ ۵ روایتیں مروی ہیں۔ یہ صرف وہ روایات ہیں، جو ہم تک پہنچ سکی ہیں۔ نہ پہنچ سکنے والی روایات کے شمار کا اللہ کو علم ہے۔ پھر زینب بنت جحش کی مرویات اس فہرست میں موجود نہیں ہیں، حالانکہ ۵ھ میں ان کو شرفِ زوجیت حاصل ہوا اور ۲۰ھ تک زندہ رہیں۔ ابطال تبنیت سے متعلق جتنے مسائل ہیں، جو بسلسلۂ واقعۂ زید بن حارثہ ظہور میں آئے، ان سب کا تعلق

ان ہی زینب بنت جحش سے ہے۔ قرآن میں اس واقعہ کا صراحۃً ذکر ہے۔ پھر ان سے کسی روایت کا نہ ہونا مشکل سے سمجھ میں آ سکتا ہے۔ یقیناً دیگر امہات مومنین کی طرح ان سے بھی صحابہ و صحابیات نے بہت کچھ سیکھا ہوگا۔ بہرحال یہ فہرست صرف ان ہی روایات کی ہے، جو ہم تک پہنچ سکی ہیں۔ ان کے علاوہ اور معلوم نہیں کتنی روایتیں ہوں گی جو ہم تک نہ پہنچ سکیں۔ ام المومنین حضرت زینب بنت خزیمہ تو صرف تین ماہ زندہ رہیں اور حضرت خدیجہؓ روایات کے دور سے پہلے ہی رحلت فرما چکی تھیں۔ اس لیے ان دونوں سے روایات کا نہ ہونا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن زینب بنت جحش سے کسی روایت کا نہ ہونا قابل غور ہے۔

بہرکیف کہنا یہ ہے کہ ان روایات میں بے شمار نسائی مسائل بھی ہیں اور بلا شبہ نصف دنیا کی تعلیم اور نصف دین کی تکمیل کا بوجھ ان ہی امہات مومنین کی گردن پر تھا، جس کا اٹھانا ایک دو کے بس کی بات نہ تھی۔ اب دوسری نوع کے مصالح پر غور کیجئے۔

حُسنِ معاشرت کا درس

حضورؐ کی سیرت کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ آپ کی زندگی سراپا عمل ہے۔ محض وعظ و نصائح نہیں۔ حضورؐ کی زندگی سے ہر کہ و مہ، ہر شاہ و گدا، ہر اسود و احمر، ہر عربی و عجمی اور ہر جماعت و فرد یکساں طور پر اپنی زندگی کے لیے نمونۂ عمل حاصل کر سکتا ہے۔ معاشرے کے لیے سب سے پہلا سنگِ بنیاد ازدواجی زندگی ہے۔ جس مصلح میں تاہل اور ازدواجی زندگی کا نمونہ نہ ہو، وہ کامل لیڈر نہیں بن سکتا۔ عیسائی اپنی کمزوری کو محسوس کرنے پر مجبور ہیں۔ کیونکہ سیدنا مسیح علیہ السلام کی زندگی میں ایک متاہل کے لیے کوئی عملی نمونہ موجود نہیں۔ نہ انہوں نے شادی بیاہ کیا، نہ اپنا کوئی گھر بنایا۔ عیسائیوں کو اس خلا کو پُر کرنے اور اسی کمزوری کو چھپانے کی سرف یہی تدبیر نظر آئی کہ حضورؐ کے تعدد نکاح پر تمام مصالح کی طرف سے آنکھیں بند کر کے صرف تعدد پر اعتراضات اور حملے کیے جائیں۔ ان سے پوچھیے کہ اگر نسل انسانی کا خاتمہ مقصود نہ ہو، تو نمونہ کس کی زندگی ہے؛ بے زوج انسان کی یا متعدد ازواج رکھنے والے کی؟ پھر ان سے یہ بھی دریافت کیجیے کہ تم ان انبیا کے متعلق کیا کہتے ہو، جنھوں نے ایک سے زیادہ نکاح کیے؟ ذرا ملاحظہ ہو:

سیدنا ابراہیمؑ کی تین بیویاں تھیں: ہاجرہ، سارہ اور قتورہ (پیدائش ۱۶:۳، ۱۸:۱۵، ۲۵:۱)

سیدنا یعقوبؑ کی چار بیویاں تھیں: لیاہ، زلفہ، زاحل اور بلہاہ (پیدائش ۲۹:۲۳، ۲۴، ۲۸، ۲۹)

سیدنا موسیٰؑ کی بھی چار بیویاں تھیں، صفورہ، حبشیہ، قینی اور بنت حباب (خروج ۲:۲۱، قاضیوں ۱:۱۶، ۴:۱۶)

ان چار کے علاوہ بھی حضرت موسیٰؑ کے متعلق "خداوند اُن کے خدا" کا فرمان سُنیے:

حب تو اپنے دشمنوں سے جنگ کرنے کو نکلے اور خداوند تیرا خدا ان کو تیرے ہاتھ میں کر دے اور تو ان کو اسیر کر لائے ٥ اور اسیروں میں کسی خوب صورت عورت کو دیکھ کر تو اس پر فریفتہ ہو جائے اور اس کو بیاہ لینا چاہے ٥ تو تو اسے اپنے گھر لے آنا اور وہ اپنا سر منڈائے اور اپنے ناخن ترشوائے ٥ اور اپنی اسیری کا لباس اتار کر تیرے گھر میں رہے اور ایک مہینے تک اپنے ماں باپ کے لیے ماتم کرے۔ اس کے بعد تو اس کے پاس جا کر اس کا شوہر ہونا اور وہ تیری بیوی بنے ٥ (استثنا ۲۱:۱۰ تا ۱۳)

سیدنا داؤدؑ کی نو بیویوں کے نام تو سیموئیل ۱ ۱۸ : ۲۷ اور سیموئیل ۲ ۳ : ۲ تا ۵ اور ۱۱ : ۲۶ وغیرہ میں ہیں۔ ان کے علاوہ دس اور حرموں اور جوروؤں کا ذکر سیموئیل ۲ ۵ : ۱۳ میں ہے۔

سیدنا سلیمانؑ کے متعلق بھی کچھ سُن لیجیے :

اس کے پاس سات سو شاہزادیاں اس کی بیویاں اور تین سو حرمیں تھیں۔ (سلاطین ۱ ۱۱ : ۳)

دوسرے غیر مسلم

اسی طرح بدھسٹوں سے دریافت کیجیے کہ ایک متاہل اور صاحب اہل وعیال انسان کے لیے مہاتما بدھ کی زندگی اُسوہ و نمونہ بن سکتی ہے۔ جن کو بال بچوں میں رہ کر تلاشِ حقیقت ناممکن نظر آئی اور جنھوں نے آخرکار اپنی بیوی اور بچے پر ایک آخری حسرت بھری نگاہ ڈال کر جنگل کی راہ لی۔

یونہی ہنود سے سوال کیجئے کہ کیا بال بچّوں والے انسان کے لیے رام چندر جی مہاراج کی زندگی نمونہ بن سکتی ہے، جنھوں نے چوّدہ سال بن میں ساتھ دینے والی وفادار بیوی کو جُدا کر دیا۔ اُن سے یہ بھی پُوچھیے کہ وُہ راجہ دسرتھ کے متعلق کیا کہتے ہیں، جن کی تین بیویاں تھیں: پٹ رانی کوشیلا، رانی ست مہری اور رانی کیکئی۔ اور ان کا کیا خیال ہے سری کرشن جی کی بابت جن کی گوپیوں کی تعداد وہم وخیال سے بھی زیادہ بتائی جاتی ہے؟

ہم اُمید کرتے ہیں کہ یہودی یا عیسائی یا ہنود اگر انھیں اپنے بزرگوں کی تعدادِ ازواج پر کوئی اعتراض نہیں تو ایک ایسے پیغمبر کے احترام کو بھی قایم رکھیں گے، جس کے ساتھ نکاحوں کے بے شمار انسانی مصالح وابستہ ہیں اور جس کے خوشگوار نتائج سے کوئی انصاف پسند آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔ ان کی تشریح کچھ اُوپر گزر چکی ہے اور باقی کا ذکر آگے آتا ہے۔

حسنِ معاشرت کا سبق

اوپر ہم نے ذکر کیا ہے کہ حضورؐ کی زندگی جہاں ہر شعبۂ حیات کے لیے زندہ نمونہ ہے، وہاں ازدواجی زندگی رکھنے والوں کے لیے بھی حُسنِ معاشرت کا اعلیٰ اُسوہ ہے اور چونکہ تاہل کی زندگی ہی معاشرے کا پہلا سنگِ بنیاد ہے، اس لیے کوئی ایسا شخص دنیا کا کامل لیڈر نہیں ہو سکتا، جس کی زندگی اس خاص شعبۂ حیات میں بھی اعلیٰ نمونہ نہ رکھتی ہو۔ حضورؐ کا اسی سلسلے میں ایک دُوسرا کمال دیکھیے کہ کن کن جہتوں سے حضورؐ کی زندگی تمام انسانوں کے لیے واحد نمونہ ہے۔ ایک عفاف پسند مجرد انسان کے لیے حضورؐ کی زندگی نمونہ ہے کہ عرب جیسے بے لگام ملک میں پچیس سال تک کمال عفت و عصمت کی زندگی گزارتے ہیں پھر اپنی اصلی ازدواجی زندگی ایک بیوہ صاحبِ اولاد اور اپنے سے پندرہ سال بڑی عورت (خدیجہؓ) کے ساتھ پچاس سال کی عمر تک گزارتے ہیں اور اس دوران میں اعلیٰ سے اعلیٰ پیشکش کے باوجود کسی دُوسری عورت کی طرف رُخ بھی نہیں فرماتے۔ اس ایک رفیقۂ زندگی کے ساتھ حسنِ سلوک اور حسنِ معاشرت کا اندازہ اس سے کر لیجئے کہ ساری عمر میں کبھی کوئی تلخی نہیں پیدا ہوئی۔ بیوی نہ فقط قربان ہوتی رہی بلکہ حیرت یہ ہے کہ اس فلک نیلگوں کی چھت کے نیچے اور اس زمین کی پشت پر سب سے پہلے جو ہستی حضورؐ کی نبوت پر ایمان لاتی ہے، وہ بھی خدیجہؓ ہے۔ بیوی اپنے شوہر کے تمام رازہائے درون پردہ سے واقف ہوتی ہے۔ اس کی نگاہوں سے شوہر کا کوئی عیب و ہنر پوشیدہ نہیں ہوتا۔ نبوت تو بڑی چیز ہے، وہ تو معمولی ولایت کی بھی کبھی قائل نہیں ہوتی۔ کردار یا معاشرت کی معمولی کمزوری بھی ہو، تو کسی دعوے کے جواب میں عورت دھجیاں بکھیر کر رکھ دے، لیکن ذرا نگاہِ غور سے دیکھیے خدیجہؓ دو شوہروں کو پہلے

بھی دیکھ چکی ہیں اور اب پندرہ سال مسلسل حضورؐ کی ایک ایک ادا کا تجربہ کر چکی ہیں، زندگی کے ایک ایک گوشے میں حضورؐ کو پرکھ چکی ہیں۔ کتنا بلند کردار رکھنے والا اور کیسے عدیم النظیر حسن معاشرت کا مالک ہوگا۔ وہ انسان جس کے متعلق خدیجہؓ صرف انسانیت کی قائل نہیں ہوتی بلکہ نبوت پر ایمان لے آتی ہے اور اپنی عمر کے بقیہ دس سال اس طرح ساتھ دیتی ہے کہ جان و مال سب کچھ قربان کر دیتی ہے۔ ہر امتحان میں کھری اترتی ہے، ہر خطرے کا مقابلہ کرتی ہے اور ایمان میں ایک لمحے کے لیے بھی کبھی تنزلزل نہیں آیا۔ کیا یہ حسن معاشرت انسان کا آخری کمال نہیں، اور کیا ازدواجی زندگی کے لیے یہ سب سے اعلیٰ نمونہ نہیں؛

پھر اس کے بعد دُوسرا نمونہ یہ ہے کہ پیغمبر اس اصلی رفیقۂ زندگی کی رحلت کے بعد نکاح کرتا ہے تو بالکل اپنی ہم عمر پچاس سال کی سودہؓ سے۔ کیا یہ بجائے خود عفاف کا اعلیٰ نمونہ نہیں۔ اس رفیقۂ زندگی کو اپنے شوہر پہ کتنا زبردست اعتماد تھا کہ اس نے اپنے دل سے سوت پن کی تمام آلائشوں کو باہر نکال کر اپنی باری ایک دُوسری بیوی کو بخش دی۔ کیا یہ اعتماد حسنِ معاشرت کے بغیر ہی حاصل ہو گیا۔

آگے چلنے سے پہلے اپنی زندگی کا جائزہ لیجیے۔ اپنی پسند سے ایک بیوی لانے والوں کا بھی یہ حال ہے کہ عمر میں کوئی ہفتہ باہمی نوک جھونک سے خالی نہیں جاتا اور اگر خدانخواستہ ایک سے زیادہ رفیقۂ زندگی ہو، تو ایک کے ہاتھ میں سر کے بال اور دوسری کے ہاتھ میں ڈاڑھی کے بال ہوتے ہیں۔ لیکن اس انسان کی عظمت محبوبیت، کردار بلند اور حسنِ معاشرت کا اندازہ کیجیے، جس کے پاس پچپن سال کی عمر کے بعد نو ایسی بیویاں یکجا ہو جاتی ہیں، جو مختلف عمر کی ہیں، مختلف قبائل کی ہیں، مختلف تمدن کی ہیں، مختلف مزاج کی ہیں اور گھروں میں فقر و فاقہ ایک مسلسل مشغلہ ہے لیکن ساری زندگی میں باہمی تلخی کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ صرف ایک ہی لطیف سی جھلک نظر آتی ہے، جس کے بعد ایلا[1] کا مسئلہ رحمتِ الٰہی بن کر نازل ہوا، ورنہ اس سے پہلے ایلا اور طلاق ایک ہی چیز متصور ہوتی تھی۔

پھر یہ بھی دیکھیے کہ ان ازواج مطہرات میں کس کس نوع کی بیویاں ہیں۔ ان میں عائشہؓ جیسی کنواری بھی ہے۔ ان میں سودہؓ، حفصہؓ، ام سلمہؓ، جویریہؓ اور ام حبیبہؓ جیسی ایک ایک شوہر کی بیوائیں بھی ہیں۔ ان میں خدیجہؓ، صفیہؓ، میمونہؓ جیسی دُو دُو شوہروں کی بیوائیں بھی ہیں۔ ان ہی میں زینبؓ بنت خزیمہ جیسی تین تین شوہروں کی بیوہ بھی ہیں اور ان ہی میں زینبؓ بنت جحش جیسی مطلقہ بھی ہے پھر ان کے قبائل، ان کے تمدن، ان کے مزاج اور ان کی عمریں متفاوت اور مختلف ہیں۔ کسی کو شاہانہ اخراجات نہیں ملتے، بلکہ بعض اوقات کئی کئی مہینے کھجور اور پانی پر گزارا ہوتا ہے۔ اس کے باوجود حُسنِ معاشرت نے یکساں زبردست اعتماد پیدا کر دیا تھا کہ جب کثرتِ غنائم کو دیکھ کر امہاتِ مومنین نے مزید گزارے کا مطالبہ کیا، تو ایک ہی مسئلہ تخییر[2] نازل ہونے کے بعد سب نے اپنے مطالبے

---

[1] اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے پاس نہ جانے کی قسم کھالے، تو اسے "ایلا" کہتے ہیں۔ عرب میں یہ طلاق تصور کی جاتی تھی۔ حضورؐ سے ازواج مطہرات نے ایک بار اضافۂ اخراجات کا مطالبہ کیا، تو حضورؐ کو ناگوار گزرا اور ایک ماہ تک کسی کے پاس نہ گئے۔ ایک ماہ کے بعد حکم نازل ہوا کہ ایلا کرنیوالے اگر چار ماہ گزارنے سے پہلے اپنی قسم توڑ کر کفارۂ قسم ادا کر دیں، تو طلاق واقع نہ ہوگی اور اگر اسی طرح چار ماہ گزر جائیں تو طلاق بائن ہو کر زوجین میں تفریق ہو جائے گی۔ [2] جب ازواج مطہرات نے اضافۂ اخراجات کا مطالبہ کیا تو کچھ دنوں کے بعد آیات تخییر نازل ہوئیں جس کی غرض یہ تھی کہ اگر تم دنیا چاہتی ہو، تو تمہیں بہت کچھ دے کر الگ کر دیا جائے اور اگر رضائے الٰہی چاہتی ہو تو نبوی زندگی پر قناعت کرو۔ اس پر سبؓ نے دنیا کے مطالبات سے دستبرداری دے کر اللہ، رسول اور آخرت کو پسند کیا۔

واپس لے لیے۔ کیا یہ انسانیت کا معمولی کمال ہے؟ اور کیا کسی بڑے سے بڑے انسان کی زندگی میں حُسنِ معاشرت کے ایسے نمونے مل سکتے ہیں کہ ہر نوع کی عورت ایک ساتھ ہونے کے باوجود اس کا حسنِ معاشرت سارے عالم کے لیے نمونہ بن سکے؛ یہ حقیقت آخر کیوں نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا صرف یہی انسان کامل ہے، جو یہ اعلان کر سکے کہ خیرکم خیرکم لاھلہ وانا خیرکم لاھلی (یعنی تم میں بہترین انسان وُہ ہے، جو اپنے اہل و عیال کے لیے سب سے بہتر ہو اور میں اس لحاظ سے تم سب میں بہتر ہوں) ہم نے بڑے بڑے مصلحین کو دیکھا، جو ایک رفیقۂ زندگی سے بھی نہ نباہ سکے، اسے اپنا ہم نوا نہ بنا سکے۔ بعض تو ساری عمر بیوی سے مقدمہ بازی کرتے رہے۔ پس کیا نو مختلف ازواج سے ایسا غیر معمولی نباہ اس انسان کا آخری کمال نہیں اور کیا کسی ایک نوع کی رفیقۂ زندگی رکھنے والے کے لیے حضورؐ کی زندگی ایک بہترین نمونہ نہیں؛ پھر وہ بھی ایسی حالت میں کہ حضورؐ کو تنہا یہی ایک کام نہیں کرنا تھا بلکہ ایک طرف ساری اُمت کی اصلاح کا کمر توڑنے والا بوجھ بھی ہے اور ساری ساری رات خدا کی بندگی کا فرض بھی ادا کرتا ہے۔

خانگی زندگی کی سچّی شہادت

یہ نکتہ کبھی فراموش نہیں ہونا چاہیے کہ حقیقی مصلح وہی ہے، جس کے ظاہری اور باطنی دونوں کردار آئینے کی طرح عیاں ہوں۔ ہمارے موجودہ دورِ قیادت میں پبلک لائف اور پرائیویٹ لائف کے دو حصوں میں زندگی کو تقسیم کر دیا گیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ پبلک سطح پر اپنی زندگی کا کوئی خوشگوار پہلو پیش کر دینا مصلح کے لیے مشکل نہیں۔ مکمل قیادت کا صحیح پتا اس وقت چلتا ہے، جب اس کی اندرونی زندگی بھی آئینے کی طرح سامنے آجائے۔ یُوں تو حضورؐ کی خانگی زندگی کی شہادت کے لیے تنہا خدیجہؓ ہی کافی ہو سکتی تھیں، لیکن اس تنہا شہادت پر بیسیوں شُبہے وارد ہو سکتے تھے مگر ان نو مشاہدات عادلات میں سے کس کس کی گواہی پر شُبہے کیے جا سکتے ہیں؟

اسلام نے کسی بات کے ثبوت کے لیے گواہوں کی جو بڑی سے بڑی تعداد رکھی ہے وہ چار مردوں، دُوسرے لفظوں میں آٹھ عورتوں کی گواہی ہے۔ لیکن جن امورِ شنیعہ کے ثبوت کے لیے گواہوں کی یہ تعداد مقرر کی گئی، ان سے حضورؐ کی پاک ترین اخلاقی زندگی اس درجے بعید ہے کہ تعداد کی برابری بھی سوءِ ادب ہے۔ اس لیے آٹھ عورتوں کی بجائے نو عورتوں کی شہادت تاریخ کے سامنے ہے۔ تاریخ ان نو مشاہدات عادلات سے دریافت کرے کہ حضورؐ کی پرائیویٹ اور خلوتی زندگی کیا تھی۔ خلوتی زندگی کا پتا نہ بیٹی دے سکتی ہے، نہ فرزند، نہ خادم و خادمہ، نہ دوست، نہ دشمن، نہ داماد، نہ بہو، نہ معتقد، نہ شاگرد۔ یہاں سچّی اور کھری گواہی بیوی ہی دے سکتی ہے۔ کیونکہ خلوت کی زندگی کی صحیح رازدار یہی ہوتی ہے۔ یہ بتا سکتی ہے کہ اس کا شوہر کیا کیرکٹر رکھتا ہے؟ اہل و عیال سے اس کا سلوک کیسا ہے؟ اس کی راتیں کس طرح گزرتی ہیں؟ اسے اپنے مقصد کے ساتھ کتنی لگن ہے؟ اس کی زندگی کا کیا نقشہ ہے؟ اپنوں اور پرائیوں کے ساتھ اس کے انسانی تعلقات کیسے ہیں؟ اور خود خدا کے ساتھ اسے کیا وابستگی ہے؟ ان تمام سوالات کا جواب اگر نو شاہدات عادلات یک زبان ہو کر دیں اور وُہ بھی وُہ، جن سے اندرونی زندگی کا کوئی راز چھپا ہُوا نہ ہو، تو دنیا کی کون سی عدالت اسے رد کر سکتی ہے؟ کثیر الازواج مصلحین تو دنیا میں اور بھی بہت سے گزرے ہیں، لیکن کسی ایسے مصلح کا نام لیجئے، جس کی اتنی بیویاں اس کے پرائیویٹ کیرکٹر کی ایسی ہی گواہ ہوں، جن کے نکاح سے ہزار انسانی

مصالح وابستہ ہوں اور جو مصلحاتِ اُمت بنا کر پیش کی گئی ہوں۔

ان تمام تصریحات مذکورہ بالا کے بعد یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ حضورؐ کے تعددِ ازواج کا مقصد کچھ قربانیوں کی قدر دانی وحوصلہ افزائی تھی، یا بیواؤں اور یتیموں کی خبر گیری یا خاندانی احترام کی بقا اور اس کے ساتھ ہی حُسنِ معاشرت کا عملی درس دینا۔ صنف ضعیف کے درجے کو بلند کرنا، اُنھیں معلماتِ امت بنانا، معاشرے کی اصلاح کرنا، صہری تعلقات کے ذریعے دین کی توسیع کرنا اور امن و امان قایم کرنا وغیرہ۔ ان انسانی مصالح کے بغیر ہی مطلق تعددِ ازواج کو سنت قرار دینا درست نہیں۔ سنّت صرف تعددِ ازواج ہی نہیں حضورؐ کی پُوری زندگی ہے۔ حضورؐ کی دُوسری "کڑوی" سنتوں سے اعراض برت کر صرف "میٹھی" سنتوں کو اختیار کرنا معاشرے کو جتنا فائدہ پہنچا سکتا ہے، اس سے زیادہ مفاسد پیدا کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضورؐ کی اصل اور آئیڈیل ازدواجی زندگی وہی ہے، جو حضرت خدیجہؓ کے ساتھ بسر ہُوئی ہے۔ اس کے علاوہ ساری مناکحتیں ایک ہنگامی اور ناگزیر قومی و ملی مصالح کے تحت ہُوئی تھیں اور ایسے وقت میں ہُوئی تھیں، جب کہ حضورؐ اس کی بشری ضرورت نہ رکھتے تھے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ بجز خدیجۃ الکبریٰؓ کے اور کسی ام المومنین سے حضورؐ کی کوئی اولاد نہ ہُوئی۔

ہمیں بعض لوگوں کا یہ انداز دیکھ کر تعجب ہُوا کہ وہ تعددِ ازواج النبیؐ کی تاریخی حقیقت کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ قرآن چونکہ چار سے زیادہ کی اجازت نہیں دیتا اور حضورؐ قرآن کے خلاف نہیں جا سکتے تھے، اس لیے یہ قصہ ہی غلط ہے کہ حضورؐ کی نو بیویاں تھیں۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ تاریخی حقایق کو اس طرح جھٹلانے سے قرآن کی کیا خدمت ہو سکتی ہے۔ واقعہ صرف اتنا ہے کہ قرآن کا رجحان توحدِ زوج ہی کی طرف ہے، کیونکہ وُہ عدل بین النساء کو ضروری قرار دینے کے ساتھ اس عدل کو انسانی طاقت سے باہر بھی بتاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس میں ایسی لچک بھی رکھی ہے کہ ملت کی ہنگامی ضرورتوں کے وقت تعددِ ازواج مستحب بلکہ ضروری بھی ہو جاتا ہے۔ ان ہی ضرورتوں کے تحت حضورؐ نے نو ازواج ایک ساتھ رکھیں اور چونکہ قرآن نے ان کو الگ کرنے کی صریح ممانعت کر دی تھی، اس لیے حضورؐ کا ان سب کو زوجیت میں باقی رکھنا بھی ناگزیر تھا۔ ان مادرانِ امت کو فرزندانِ اُمت کے حوالے نہیں کیا جا سکتا تھا۔

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا نظامِ حیات

محمد ظفیر الدین مفتاحی

موجودہ دنیا جس برق رفتاری سے آگے جا رہی ہے، نہیں کہا جا سکتا کہ کہاں جا کر دم لے گی، مگر سارے جدید انکشافات اور تمام تر تمدنی اور سائنسی ترقیوں کے باوجود یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ دنیا کے کسی گوشہ میں اطمینان و سکون اور امن و سلامتی عوامی خواہش کے مطابق موجود نہیں ہے، گو مختلف ممالک میں مختلف طرزِ حکمرانی کارفرما ہے۔

آج انسان اس تغیر پذیر دنیا میں ایک ایسے نظامِ حیات اور دستورِ زندگی کے لئے سرگرداں ہے جو اس کو تمام شعبہ جات زندگی میں سکون و اطمینان اور خوشحالی و فارغ البالی کی دولت سے نواز دے، جس نظام میں عدل و مساوات، اخوت و محبت اور ہمدردی و رواداری کی فراوانی، معیشت و معاشرت میں ہمواری و توازن اور عفت و عصمت اور جان و مال کا مکمل تحفظ ہو، اسی کے ساتھ اونچ نیچ کی تفریق، رنگ و نسل کا امتیاز اور دھرم و مذہب کے نام پر فتنہ کی گرم بازاری قطعاً نہ ہو۔

ریاست میں حکمرانی کے قوانین و اصول ایسے جاری ہوں، جن میں بدلتے ہوئے سماج اور ان کے سیاسی تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی پوری صلاحیت ہو، اندرونِ ملک امن و سکون ہو اور بیرونی ممالک سے اس کے تعلقات خوشگوار ہوں اور قانون کی نظر میں امیر و غریب اور شاہ و گدا کی کوئی تمیز نہ ہو، معذور و مجبور افراد کے لئے حکومت کی طرف سے قیام و طعام اور ضروریات زندگی کا انتظام ہو، تعلیم و ترقی اور اظہار رائے کی ہر فرد کو پوری آزادی حاصل ہو، ملک کا مالیاتی نظام اور اس کی فوجی طاقت قابلِ اعتماد ہو۔

اسلامی آئینِ حکومت

انسان اگر تعصب و تنگ نظری سے الگ ہو کر غور و فکر کرے، تو اسے ماننا پڑے گا کہ دنیا کے موجودہ نظاموں میں بہتر اور موجودہ پریشانیوں کا مداوا صرف رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا نظام حیات ہے، جو رب العالمین کا عطا کردہ ہے کیونکہ یہ افراط و تفریط اور نقص و غلو ہر ایک انسانی عیب سے پاک ہے اور کائنات انسانی کے لیے باعث راحت و سکون ہے اور اس کے ظاہر و باطن کی پاکیزگی کا ضامن ہے۔

یہ دستورِ زندگی انسانوں کا بنایا ہوا نہیں ہے بلکہ رب الناس کا بخشا ہوا ہے، اس میں ہر ایک طبقہ اور ہر ایک خطہ کے باشندوں کا یکساں لحاظ و پاس ہے، اس دستور کا نزول اُس وقت ہوا جب انسانیت دم توڑ چکی تھی، کائنات انسانی جور و تعدی سے کراہ رہی تھی، عوام و خواص ایک یا چند خاندانوں کے غلام بننے پر مجبور تھے، کمزور و ناتواں پس رہے تھے اور دولت مند و طاقتور دادِ عیش دے رہے تھے، اُس وقت جس قدر بھی قوانینِ سلطنت دنیا میں رائج تھے وہ افراط و تفریط کے شکار تھے، خواہ وہ لائیکرگس کا قانونِ حکومت رہا ہو، یا قدیم مصر کا نظامِ سلطنت، منو مہاراج کا بنایا ہوا قانونِ زندگی ہو، یا زمانۂ جاہلیت کا اصولِ حکمرانی، روم و ایران کا آئین ملکی ہو یا کسی اور ملک و نسل کا دستورِ حیات۔

انسانی عظمت کا اعلان

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم پہلے شخص تھے جنھوں نے مشعل ہدایت دکھائی اور

پروردگارِ عالم کی طرف سے اعلان فرمایا کہ یہ ساری کائنات انسانوں کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ زمین و آسمان، چاند و سورج، حیوانات و جمادات سب کے سب انسانوں کی راحت رسانی میں مشغول ہیں، اور ان سب کی تخلیق اسی لئے عمل میں آئی ہے، ارشادِ ربانی ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومُ مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِهِ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۝ (النحل - ۲)

رات و دن، سورج و چاند کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے کام پر لگا دیا ہے اور ستارے اسکے حکم سے تمہارے کام میں لگے ہوئے ہیں، بیشک اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو سمجھ رکھتے ہیں

اسلام نے انسانوں کو اُس قدیم توہم پرستی سے نکالا جو دیمک کی طرح انھیں چاٹ رہے تھے، اور یقین دلایا کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور اپنی خلقت میں متناسب الاعضاء

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۝ (التین)

بے شبہ ہم نے آدمیوں کو بہترین انداز سے بنایا ہے۔

یہ بھی بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو جو شرف بخشا ہے اس میں اس کا کوئی مدِ مقابل نہیں ہے۔

لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ (بنی اسرائیل)

بیشک ہم نے اولادِ آدم کو عزت و شرف بخش رکھا ہے۔

انسانوں کی عظمت کو ظاہر کرنے کے لئے انھیں مسجودِ ملائک بنایا اور اس کے منکر کو راندۂ درگاہ قرار دیا۔

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ ۝ (البقرہ)

اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ تم آدم کو سجدہ کرو، پس فرشتوں نے سجدہ کیا ابلیس نے البتہ سرتابی بھی کی اور کبر ظاہر کیا۔

پھر انسانوں میں خود اعتمادی پیدا کی اور ان کو بتایا کہ تم سے اوپر صرف خدا کی ذات ہے، کوئی دوسرا نہیں اور تم دراصل اسی ذات کی پرستش کے لئے پیدا ہوئے ہو۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۝ (ذاریات - ۲)

میں نے جن و انسان کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔

دعوتِ توحید

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ذہن نشین کیا کہ انسانوں کا ملجا و ماویٰ ربِ کائنات ہے اور ساری مخلوق اس کی محتاج ہے۔

اس مرکزِ توحید پر لاکر کائناتِ انسانی میں اتحاد و یگانگت پیدا کی، اور ان کے باہمی انتشار و تشتت کو ختم کرنے کی سعی فرمائی، ساتھ ہی دعوت دی کہ آؤ ہم سب مل کر ایک ذات کی عبادت کریں، اہلِ کتاب کو خطاب کرکے اعلان کیا گیا۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ ۝ (آل عمران - ۷)

اے اہلِ کتاب ایک بات کی طرف آؤ جو ہم میں اور تم میں برابر ہے اور وہ یہ کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں اور نہ اس کا کسی کو شریک ٹھہرائیں اور یہ کہ ہم میں کوئی کسی کو اللہ تعالیٰ کے سوا رب نہ بنائے۔

رسالت پر بھی یقین کرنے اور ایمان لانے کی دعوت دی، مگر اس کی وضاحت کر دی کہ رسول اللہ، خدا اور بندوں کے درمیان سفیر ہوتا ہے جو خدا کے احکام و پیامات بندوں تک پہونچاتا ہے، رسول بشر ہوتا ہے، خدا نہیں ہوتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ وہ بھی خدا کے برگزیدہ نبی ہیں اور ساتھ ہی خاتم النبیین،

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ (الکہف)

آپ کہہ دیں میں تو تمہاری طرح ایک بشر ہوں میری طرف وحی الٰہی آتی ہے کہ بلاشبہ تمہارا معبود بس ایک ہے۔

مساوات اور اخوتِ انسانی سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کی باہمی تفریق اور باہمی جنگ و جدال پر یہ اعلان فرما کر خطِ نسخ کھینچ دیا۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا (النساء ۔ ۱)

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور پھر اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سارے مرد اور عورتیں پھیل پڑیں، اس اللہ سے ڈرو جس کے نام پر تم صلہ رحمی کی درخواست کرتے ہو، بےشک اللہ تم سب کا نگراں ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد خداوندی کی مزید تشریح فرمائی اور کھل کر اعلان فرمایا۔

لا فضل لعربي على عجمي ولا لعجمي على عربي ولا لابيض على اسود ولا لاسود على ابيض إلا بالتقوى، الناس من آدم وآدم من تراب (زاد المعاد صفحہ ۲۲ جلد ۲)

نہ کسی عربی النسل کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت ہے اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر، نہ کسی گورے کو کسی کالے پر اور نہ کسی کالے کو کسی گورے پر، ہاں فضیلت خدا ترسی سے ہوتی ہے تمام انسان آدم کی اولاد ہیں۔ اور آدم مٹی سے تیار ہوئے۔

شرافت کا معیار خاندان و قبیلہ دنیا میں تعارف کا ذریعہ ہے، شرافت و رذالت اس میں محصور نہیں، اسلام میں شرافت و بڑائی کا معیار عقاید کی مضبوطی، اخلاق و اعمال کی پاکیزگی اور خدا ترسی ہے، رنگ و روپ اور جغرافیائی تقسیم میں کچھ رکھا ہوا نہیں ہے، قرآن پاک میں صراحت کے ساتھ اعلان ہوا۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (الحجرات ۔ ۲)

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد و عورت سے پیدا کیا اور تم کو خاندان و قبیلوں میں تقسیم کیا تاکہ تم میں جان پہچان رہے، کوئی شبہ نہیں کہ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے معزز وہ ہے جو خدا سے زیادہ ڈرتا ہے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید رضی کی شادی جو نسباً غلام تھے حضرت زینب بنت جحش رضی سے کی، جو آزاد اور خاندان قریش سے تھیں، حضرت بلال رضی غلام تھے لیکن بڑے بڑے خاندانی محترم افراد ان کا نام بڑے ادب و احترام سے لیتے تھے اور ان کی بزرگی پر رشک

کیا کرتے تھے۔

اسلامی عبادت میں مساوات کا مظاہرہ مسجد خانہ خدا ہے دن رات کے پانچ وقتوں میں یہاں باجماعت نماز ادا ہوتی ہے، اس کے داخلہ پر کوئی پابندی نہیں اور نہ کوئی تفریق و تمیز، یہاں ایک ہی صف میں سب کے سب کھڑے ہوتے ہیں، صدر جمہوریہ بھی اور ایک معمولی چپراسی بھی۔ اقبال مرحوم کی زبان میں :

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا اعلان ہے

ان اولیائی المتقون حیث کانوا واین کانوا — میرے ہم کنبہ وہ ہیں جو خدا سے ڈرتے ہیں وہ جہاں کہیں بھی ہوں۔ (زاد المعاد)

نیکو کار کا درجہ خلافت ارضی کے سلسلہ میں بھی فوقیت اور برتری نیکو کار کو دی گئی ہے ارشاد خداوندی ہے :

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ (انبیاء۔ ۷) — ہم نے زبور میں لکھ دیا ہے کہ زمین کی وراثت کے حقدار میرے نیکو کار بندے ہیں۔

یہاں صرف ایمان و ایقان اور عمل صالح معیار قرار پایا اور واقعہ بھی ہے کہ جو ان جوہروں سے خالی ہوگا، وہ سب کچھ ہوگا منصف نہیں ہو سکتا، اور خدا کے عام بندوں سے اُسے محبت جیسی چاہئے نہیں ہو سکتی، اس لئے خلافت ارضی میں ان کو ہی ترجیح دی جانی چاہئے تھی اور ان کو ہی دی گئی۔

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ (النور۔ ۱۲) — اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان نیکو کار سے وعدہ کیا ہے کہ وہ زمین ان کو خلافت سے نوازیں گے۔

انصاف اور عدل اسلام میں عدل و انصاف کی بڑی تاکید ہے تعصب و تنگ نظری کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں، دوست و دشمن کی تمیز نہیں، اپنے پرائے میں امتیاز نہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ (المائدہ۔ ۲) — اے ایمان والو! کھڑے ہو جایا کرو اللہ کے واسطے گواہی دینے انصاف کی۔

بسا اوقات عداوت منصف کے قدم میں جنبش پیدا کر ڈالتی ہے، اور وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی پر مجبور رہا ہوتا ہے۔ اس لئے قرآن مقدس میں خصوصی طور پر تاکید کی گئی۔

لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ (المائدہ۔ ۲) — کسی قوم کی دشمنی کی وجہ سے ہرگز انصاف کا دامن نہ چھوٹنا انصاف کرنا کہ یہ تقویٰ سے بہت قریب ہے۔

انصاف میں کوئی جذبہ حائل نہ ہونے پائے حالات سے مجبور ہو کر عقل و فہم جب عدل و انصاف سے روگردانی پر مجبور کرے اُس وقت،

بھی منصف کو حکم ہے کہ انصاف کا سر رشتہ اسکے ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے، کیونکہ اسلام میں محبت و عداوت دونوں جچی تلی ہوتی ہیں کسی سخت سے سخت موقع پر بھی بے قابو ہونے کی اجازت نہیں ہے، اسلام میں محبت و عداوت کی جگہیں متعین ہیں اور اسی طرح غیض و غضب کے مقامات بھی مذہب اور دین کے نام پر بھی اس قانون میں انصاف سے سر موہٹنے کی اجازت نہیں ہے ارشاد ربانی ہے۔

لا یجرمنکم شنان قوم ان صدوکم عن المسجد الحرام ان تعتدوا (المائدہ)	اس قوم کی دشمنی جس نے تم کو حرمت والی مسجد سے روکا تھا اس کا باعث نہ بننے پائے کہ تم زیادتی پر اتر آؤ

باہمی مدد اور تعاون کا حکم ہے مگر نیک کاموں میں بُرے میں نہیں، جائز میں ناجائز میں نہیں، حلال میں حرام میں نہیں۔

وتعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان واتقوا اللہ ان اللہ شدید العقاب (المائدہ)	تم نیک کام اور پرہیزگاری پر مدد کرو، گناہ اور ظلم کے کام پر مدد نہ کرو اور اللہ سے ڈرو بلاشک اللہ کا عذاب سخت ہے۔

انصاف کے تخت پر بیٹھنے کے بعد کبھی معاملہ بڑا سنگین سامنے آتا ہے اور احترام و اکرام، محبت و شفقت اور خونی رشتہ ارادوں میں کمزوری پیدا کر دیتا ہے اور منصف کا قلم فرد انصاف مرتب کرنے میں کپکپانے لگتا ہے، ایسے وقت کے لئے خصوصی تاکید فرمائی گئی ہے۔

یاایھا الذین امنوا کونوا قوامین بالقسط شھداء للہ ولو علی انفسکم او الوالدین والاقربین (النساء—۲)	اے مومنو! اللہ کے واسطے انصاف کیا کرو اور اس پر قائم رہو گو تمہارا یا تمہارے والدین کا یا تمہارے رشتہ داروں کا نقصان ہو۔

یہ تاریخی حقائق ہیں کہ مسلمان حکمرانوں نے ایسے نازک مواقع پر بھی قانون خداوندی پر ہی عمل کیا، خود ہمارے ہندوستان کی تاریخ میں بھی اس طرح کے واقعات کی کمی نہیں۔

مشورہ کی اہمیت

اسلام میں معاملات ان لوگوں کے مشورے سے طے ہوتے ہیں جو ذی رائے معتمد اور نیک و صالح ہوتے ہیں، انتخاب امیر کا طریقہ بھی یہی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وامرھم شوریٰ بینھم (شوریٰ-۴)	وہ آپس کے مشورہ سے کام کرتے ہیں۔

ایک جگہ اس کا حکم بھی دیا گیا ہے:

وشاورھم فی الامر (آل عمران-۱۷)	معاملات میں ان سے مشورہ کر لیا کرو۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، یا رسول اللہ! اگر ہمارے سامنے کوئی ایسا واقعہ پیش آجائے جس میں شریعت کی کوئی اجازت یا ممانعت وارد نہ ہو تو اس وقت کے لئے آپ کا کیا ارشاد ہے، آپ نے فرمایا:

تشاوروا العلماء والعابدین (طبرانی)	اہل علم اور عبادت گذاروں سے مشورہ کر لیا کرو

ساتھ ہی یہ بھی فرمایا

ولا تمضوا رای خاصۃ (طبرانی)	کسی خاص آدمی کی رائے نافذ نہ کرو۔

سقیفہ بنی ساعدہ میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جو خطبہ دیا تھا اس پر یہ بھی فرمایا تھا:

"اے گروہ انصار- ہم مہاجرین امیر ہیں اور آپ ہمارے وزیر ہیں، آپ کے مشورہ کے بغیر امور طے نہیں کئے جائیں گے۔"

صحابہ کرامؓ کا عمل

چنانچہ خلفائے راشدین کا اسی پر عمل تھا، دارمی میں ہے:

"اگر صدیق اکبرؓ کو کوئی مشکل مسئلہ پیش آجاتا اور کتاب و سنت میں اس کا حکم نہ ملتا تو آپ مسلمانوں کے سرداروں اور علما کو بلا کر مشورہ کرتے اور جب کسی رائے پر متفق ہو جاتے تو اس کے موافق فیصلہ فرماتے، حضرت عمرؓ کا بھی اسی پر عمل تھا، کوئی دشوار مسئلہ سامنے آتا اور کتاب و سنت میں حکم نہیں ملتا تو صدیق اکبرؓ کے فیصلوں میں تلاش کرتے اگر آپ کا کوئی فیصلہ مل جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ فرما دیتے، ورنہ مسلمانوں کے سربرآوردہ لوگوں اور علمائے کرامؓ کو مشورہ کے لیے طلب کرتے اور ان سے مشورہ کرتے اور جب کسی رائے پر متفق ہو جاتے تو فیصلہ فرماتے۔"

امیر جماعت کی اطاعت

جب مشورہ سے کوئی شخص خلیفہ منتخب ہو جائے تو حکم ہے کہ اس کی باتوں پر عمل کرو۔

اسمعوا واطیعوا وان ولی علیکم عبد حبشی (جمع الفوائد)

سنو اور اطاعت کرو گو تم پر کسی حبشی غلام کو والی مقرر کر دیا گیا ہو۔

رسول الثقلین صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ ذمہ داری کا عہدہ اس شخص کے سپرد نہیں فرماتے جو اس کا طلبگار ہوتا، ایک دفعہ ایک شخص نے حاضر خدمت ہو کر عرض کیا کہ مجھے والی بنا دیا جائے یہ سن کر آپ نے فرمایا:

انا واللہ لا نولی ھذا العمل احدا سالہ او احدا حرص علیہ (جمع الفوائد ص ۳۱۷ ج ۱)

بخدا میں اس شخص کو اس کام کا ذمہ دار نہیں بنا سکتا جو اس کے لئے درخواست کرے یا اس عہدہ کا وہ حریص ہو۔

حکمران کے فرائض

حکمران طبقہ کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو اپنے فرائض میں خیانت کرے گا اس پر جنت کی بو بھی حرام ہوگی اور وہ رب العزت کے یہاں ملعون قرار پائے گا۔ (جمع الفوائد صفحہ ۳۱۶ جلد ۱)

اسی وجہ سے حکم ہے کہ ذمہ داری کا عہدہ بہترین افراد کے سپرد کیا جائے، جن کے دلوں میں خدا کا خوف ہو، ایک مرتبہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اذا کان امراکم خیارکم واغنیاءکم سمحاءکم وامورکم شوریٰ بینکم فظھر الارض خیر لکم من بطنھا واذا کانت امراءکم شرارکم واغنیاءکم بخلاءکم وامورکم الی نساءکم فبطن الارض خیر لکم من ظھرھا (جمع الفوائد)

جب تمہارے امرا تمہارے بہترین افراد ہوں اور تمہارے باثروت لوگ سخی اور تمہارا باہمی معاملہ مشورہ سے طے ہو تو اس وقت زمین کی پیٹھ تمہارے لئے اس کے پیٹ سے بہتر ہے، اور جب تمہارے ذمہ دار لوگ تم میں سے بدترین ہو جائیں اور تمہارے مالدار افراد تم میں بخیل شمار کئے جائیں اور تمہارے معاملات تمہاری عورتوں کے ہاتھ میں آجائیں تو پھر تمہارے لیے زمین کا اندرونی حصہ اس کے ظاہری حصہ سے بہتر ہوگا۔

ایک صحابی کی تقریر معاذؓ بن جبل رضی اللہ عنہ ایک جلیل القدر صحابی ہیں یہ ایک مرتبہ بحیثیت سفیر قیصر روم کے دربار میں تشریف لے گئے وہاں ایک موقع پر فرمایا:

"ہمارا سردار ہم میں کا ایک فرد ہے، اگر ہمارے مذہب کی کتاب اور ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کی پیروی کرے تو ہم اس کو اپنا سردار باقی رکھیں گے اور اگر وہ ان کے سوا کسی اور چیز پر عمل کرے، تو ہم اسے معزول کر دیں گے اگر وہ چوری کرے تو ہاتھ کاٹیں، اگر زنا کرے تو سنگسار کریں اور اگر وہ کسی کو بُرا بھلا کہے تو اس کو بھی اسی کا حق ہوگا، اور اگر کسی کو زخمی کرے تو اسے اس کا بدلہ دینا پڑے، وہ ہم سے چھپ کر پردے میں نہیں بیٹھتا، وہ ہم سے غرور کے ساتھ پیش نہیں آتا، مال غنیمت میں اپنے آپ کو ہم پر ترجیح نہیں دیتا، وہ ہم میں ایک معمولی آدمی کا رتبہ رکھتا ہے۔"

(جمع الفوائد)

خلیفہ وقت کا فرض ہے کہ وہ اپنے فرائض حسن و خوبی سے انجام دے، پبلک کے ساتھ نرمی اور شفقت کا برتاؤ کرے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا ہے۔

"اے اللہ! جو ذمہ دار حکومت پبلک اور رعایا پر سختی کرے تو بھی اس کے ساتھ سختی سے پیش آ اور جو نرمی کا معاملہ کرے تو بھی اس پر نرمی فرما۔"

خلیفہ راشد فاروق اعظمؓ کا یہ واقعہ ہر خاص و عام جانتا ہے کہ جب قحط پڑا تو آپ نے قسم کھالی تھی کہ جب تک قحط دور نہ ہوگا دسترخوانِ خلافت پر گھی اور شہد کا استعمال بند رہے گا، اور جب مدینہ منورہ سے بیت المقدس کے لئے روانہ ہوئے تو اونٹ ایک ہی تھا۔ باری باری آپ اور آپ کا غلام دونوں اس پر سوار ہوتے تھے چنانچہ شہر میں داخلہ کے وقت غلام کی باری آ گئی مگر اس کے عرض کرنے کے باوجود آپ نے اونٹ پر اسی کو بٹھایا اور خود نکیل پکڑ کر پیدل چل رہے تھے۔

جنگ و انتقام جنگ اور انتقام کا نام کس قدر خوفناک ہے، یہاں اعتدال کو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا، مگر اسلامی قانون میں یہاں بھی انسانیت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا گیا ہے قتال کا حکم ہے مگر ان لوگوں سے جو ان سے لڑنے کا عزم رکھتے ہوں، ہر کسی سے نہیں اور اس صورت میں بھی ظلم و جور سے منع کیا گیا ہے ارشاد ربانی ہے۔

وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین (بقرہ - ۲۳)

اللہ کے راستے میں ان سے قتال کرو جو تم سے قتال کرتے ہیں اور تعدی نہ کرو بلا شبہ اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔

اسلام میں جنگ پر صلح کو ترجیح دی گئی ہے کہ اسلام نام ہی امن و سلامتی کا ہے ارشادِ الٰہی ہے۔

وان جنحوا للسلم فاجنح لھا وتوکل علی اللہ (انفال - ۸)

اگر وہ لوگ صلح کے لئے مائل ہوں تو تم بھی اس کے لیے آمادہ ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسا کرو۔

فان اعتزلوکم فلم یقاتلوکم والقوا الیکم السلم

اگر وہ تم سے علیحدہ رہیں اور تم سے نہ لڑیں اور صلح پیش کریں۔

فما جعل اللہ لکم علیھم سبیلا (النسآء) تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ نے تم کو ان پر راہ نہیں دی ہے

حکم ہے کہ جہاں جاؤ سوچ سمجھ کر اور تحقیق کے بعد جاؤ۔ اقدام میں عجلت نہ کرو، قتل و خونریزی کوئی اچھی چیز نہیں ہے۔ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یآیھا الذین اٰمنوا اذا ضربتم فی سبیل اللہ فتبینوا (النساء - ۱۳) اے ایمان والو! جب تم جہاد کے لیے نکلو تو تحقیق کر لیا کرو۔

جذبہ صلح و آشتی اگر کوئی زبان سے ایسا کلمہ کہے جو امن و سلامتی کرتا ہو اور ایمان کی نشاندہی کرتا ہو تو حکم ہے کہ اسے تسلیم کرو بحث نہ کرو۔

ولا تقولوا لمن القی الیکم السلام لست مومنا (النساء) جو تم سے سلام علیک کرے اس کو یہ نہ کہو کہ تم مسلمان نہیں۔

قانون اسلام میں برائی کا بدلہ برابر کی برائی سے دیا جاسکتا ہے مگر افضل یہ ہے کہ درگزر سے کام لیا جائے۔

جزآء سیئۃ سیئۃ مثلھا فمن عفا واصلح فاجرہ علی اللہ انہ لا یحب الظلمین ٥ (شوریٰ - ۴) برائی کا بدلہ اس کے برابر برائی ہے پس جو شخص معاف کر دے اور اصلاح کرے تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔

درگذر کا درجہ قرآن مقدس میں درگذر کی تعریف بھی کی گئی ہے اور اس کا فائدہ بھی بتایا گیا ہے ارشاد ہے:-

لا تستوی الحسنۃ ولا السیئۃ ادفع بالتی ھی احسن فاذا الذی بینک و بینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم وما یلقھا الا الذین صبروا وما یلقھا الا ذو حظ عظیم (حم السجدہ - ۴) نیکی اور بدی برابر نہیں، نیک برتاؤ سے بدی کو دفع کریں پھر آپ میں اور جس میں عداوت تھی وہ ایسا ہو جائے گا جیسا دلی دوست ہوتا ہے، یہ بات انہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے مستقل مزاج ہیں اور بڑے صاحبِ نصیب ہیں۔

انسانیت کا لحاظ کمزوروں، نہتوں، عورتوں اور بچوں پر ہاتھ اٹھانے سے روکا گیا ہے، غزوہ احد میں جس خاتون نے حضرت حمزہ کی کچی کلیجی نکال کر چبائی تھی جب حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ کی تلوار ان پر پڑی تو عورت ذات دیکھ کر فوراً روک دی اور فرمایا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ عورتوں پر تلوار نہ چلائی جائے۔

یہی چیز تھی کہ جہاد پر ایک لشکر کو روانہ کرتے ہوئے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے تاکید فرمائی تھی۔

"دیکھو خیانت نہ کرنا، دھوکا نہ دینا۔ مال نہ چھپانا، کسی کے اعضا نہ کاٹنا، بوڑھوں بچوں اور عورتوں کو قتل نہ کرنا۔ کھجور کے درختوں کو نہ جلانا، پھلدار درختوں کو نہ کاٹنا، کھانے کے سوا کسی بکری گائے یا اونٹ کو نہ کاٹنا، تمہارا گذر ایک قوم پر ہوگا جو دنیا چھوڑ کر خانقاہوں میں بیٹھی ہوگی تم ان کو نہ چھیڑنا۔"

دین کے سلسلہ میں زبردستی نہیں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ پہلے اپنے مخالفین پر دولتِ اسلام پیش فرماتے اور اگر اس پر راضی نہ ہوتے تو جزیہ کا مطالبہ کرتے کہ حکومت کے وفادار بن جاؤ اور غداری نہ کرو، اس کو

بھی کوئی نہیں مانتا تو آخری مرحلہ میں جنگ کی بات کرتے، اسلام کا حکم ہے۔

لا اکراہ فی الدین — دین کے بارے میں کوئی زبردستی نہیں ہے

اقتدار تسلیم کر لینے کے بعد غیر مسلموں کو اسلامی حکومت میں وہی حقوق حاصل ہوتے جو مسلمانوں کے لیے ہیں اس کی تفصیل کے لئے خاکسار کی کتاب "اسلام کا نظام امن" مطالعہ کیا جائے۔

آنحضرتؐ کا عمل کون ایسی اذیت ہے جو صنادید قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں پہونچائی اور قتل کی کونسی سازش ہے جس میں وہ شریک نہیں رہے، مگر جب ۸ھ میں آپ مکہ مکرمہ میں فاتحانہ داخل ہوئے تو کس شان سے آپ نے فرمایا:

من دخل دار ابی سفیان فھو امن ومن اغلق بابہ فھو امن ومن دخل المسجد فھو امن (جمع الفوائد صفحہ ۶۲ جلد ۲) — جو ابوسفیان کے گھر میں چلا جائے اس کو امن ہے جو اپنے گھر کا دروازہ بند کرے اسے امن ہے جو خانہ خدا میں داخل ہو جائے اسے امن ہے

ومن القی السلاح فھو امن (ایضاً) — اور جو ہتھیار ڈال دے اسے امن ہے۔

چنانچہ اس پر پورا پورا عمل ہوا۔ فتح مکہ کے بعد تمام صنادید مکہ کعبہ میں جمع کئے گئے وہ آج اس یقین کے ساتھ آئے تھے کہ اسلام کی تلوار انھیں ہرگز معاف نہیں کرے گی، مگر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے جب یہ کلمات انہوں نے اپنے کانوں سے سُنے۔

لا تثریب علیکم الیوم یغفر اللہ لکم وھو ارحم الراحمین — آج کے دن تم پر کوئی ملامت نہیں اللہ تمھیں معاف کریں وہ ارحم الراحمین ہیں۔

کانما نشروا من القبور (شرح معانی الآثار ص ۱۹۲ ج ۲) — گویا وہ قبروں سے زندہ ہو کر نکل رہے ہیں۔

فتنہ ختم ہونے کے بعد امن اسلام کا قانون ہے کہ جب فتنہ دب جائے تو پھر قتال بند کر دیا جائے۔

وقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ ویکون الدین للہ (بقرہ - ۲۴) — ان سے اس وقت تک قتال کرو تا آنکہ کوئی فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لئے ہو۔

جہاد کی اجازت کب ہے جہاں جہاد کی اجازت دی گئی ہے وہاں صراحت موجود ہے۔

اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا وان اللہ علی نصرھم لقدیر الذین اخرجوا من دیارھم بغیر حق الا ان یقولوا ربنا اللہ (الحج - ۶) — جن لوگوں سے ناحق جنگ کی جاتی ہے ان کو اس بنا پر جنگ کی اجازت دی جاتی ہے کہ ان پر ظلم کیا گیا ہے اور بیشک اللہ ان کے غالب کر دینے پر قادر ہے جو بے وجہ اپنے گھروں سے نکالے گئے محض اتنی بات پر کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے۔

جب کسی پر بے جا ظلم و تعدی ہو، اور بے وجہ اپنے گھر سے بے گھر کیا جائے تو وہ اپنی مدافعت اور جور و تعدی کو ختم کرنے کے لئے کیسے ہاتھ پیر مارنے کی سعی نہیں کرے گا جبکہ اسلام نے بتایا ہے کہ جو اپنی جان، اپنی عزت و آبرو یا اپنے مال کی حفاظت کے سلسلہ میں قتل کیا جائے شہید ہے۔

جہاد کا مقصد اللہ تعالیٰ کی عبادت میں رکاوٹ بننے والوں کو دفع کرنا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے

الذین ان مکنّٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ و اٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف و نھوا عن المنکر (الحج - ۶)

یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان لوگوں کو دنیا میں حکومت دیدیں تو یہ لوگ نماز پڑھیں۔ زکوٰۃ دیں اور نیک کام کرنے کو کہیں اور بُرے کاموں سے منع کریں۔

اسی طرح دنیا سے جنگ وجدال کا خاتمہ، انسانیت کا تحفظ اور ان لوگوں کی حوصلہ افزائی بھی ہے جن کا رب العالمین سے صحیح تعلق ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع وبیع وصلوٰت ومساجد یذکر فیھا اسم اللہ کثیرا (الحج - ۶)

اگر ایک کی دوسرے سے مدافعت نہ کرتا تو راہبوں کے خلوت خانے اور یہود و نصاریٰ کے معابد اور مسلمانوں کی مسجدیں جن میں بکثرت اللہ کا نام لیا جاتا ہے سب ڈھا دیئے جاتے۔

دوسری حکومتوں سے تعلقات

اسلام میں خواہ مخواہ لڑنے کا حکم نہیں ہے، بلکہ اجازت مقصد کے تحت ہے چنانچہ جو لوگ فتنہ و فساد کرتے نہیں دیتے، مظالم نہیں ڈھاتے، ان سے اور ایسی غیر مسلم حکومتوں سے تعلقات خوشگوار رکھے جائیں گے۔ جو مسلمانوں سے برسرپیکار نہیں۔ ذیل کی آیت میں اس کی صراحت موجود ہے ارشاد ربانی ہے۔

لا ینھٰکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبرّوھم وتقسطوا الیھم ان اللہ یحب المقسطین۔ (الممتحنہ - ۲)

اللہ تعالیٰ تم کو ان لوگوں کے ساتھ احسان وانصاف سے نہیں روکتا جو دین کے معاملہ میں تم سے نہیں لڑتے اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالتے اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں سے محبت رکھتے ہیں۔

انما ینھٰکم اللہ عن الذین قاتلوکم فی الدین واخرجوکم من دیارکم وظاھروا علی اخراجکم ان تولوھم ومن یتولھم فاولئک ھم الظٰلمون (الممتحنہ - ۲)

صرف ان لوگوں سے تم کو دوستی سے روکتا ہے جو تم سے دین کے بارے میں لڑیں اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالیں اور نکالنے والوں کی مدد کریں جو ایسوں سے دوستی کرے گا وہ گنہ گار ہوگا۔

معلوم ہوا کہ غیر مسلم ممالک میں سے جو ممالک محارب و مخالف کی حیثیت نہیں رکھتے ہیں۔ ان سے تعلقات خوشگوار رکھے جائیں گے

رواداری

اسلام چاہتا ہے دنیا سے ظلم و ستم ختم ہو اور عدل و مساوات کی حکومت قائم ہو، اسلام میں جیسی رواداری ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے باری تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

الیوم احل لکم الطیبات وطعام الذین اوتوا الکتاب حل لکم وطعامکم حل لھم، والمحصنٰت من المومنات والمحصنٰت من الذین اوتوا الکتاب

آج تمہارے لئے حلال چیزیں حلال رکھی گئی ہیں اور جن کو کتاب دی گئی ہے ان کا ذبیحہ تم کو حلال ہے اور تمہارا ذبیحہ ان کو حلال ہے اور مسلمان پارسا عورتیں اور اہل کتاب پارسا عورتیں جب تم ان کو

من قبلکم اذا اٰتیتموھن اجورھن محصنین غیر مسافحین	ان کا معاوضہ دیدو اس طرح سے کہ تم ان کو بیوی بناؤ۔ ان سے
ولا متخذی اخدان ومن یکفر بالایمان فقد	نہ اعلانیہ بدکاری کرو اور نہ خفیہ طور پر اور جو شخص ایمان کے ساتھ
حبط عملہ وھو فی الاٰخرۃ من الخاسرین (المائدہ۔۱)	کفر کرے گا تو اس کا عمل غارت ہو جائے گا اور وہ آخرت میں بالکل
	خسارہ میں رہے گا۔

اسلام میں چھوت چھات کے لئے قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے، اہل کتاب کا ذبیحہ اور ان کی عورتوں سے شادی کی اجازت غیر قوموں سے تعلقات کی استواری کی دلیل ہے۔

رستم کے پوچھنے پر صحابی رسول زہرہؓ نے کہا تھا کہ ہمارا مقصد خدا کے بندوں کو انسانوں کی بندگی سے نکال کر خدا پرستی پر لگانا ہے اس لئے کہ سارے انسان آدم و حوا کی اولاد ہیں اور ایک ماں باپ سے ہونے کی وجہ سے بھائی بھائی ہیں۔

اسلامی ریاست میں اس کا پورا لحاظ و پاس ہے کہ سارے انسانوں کو پیٹ بھر کھانا، ستر پوشی اور پوشاک کے لیے کپڑے اور رہنے بسنے اور گرمی سردی سے بچنے کے لئے گھر میسر ہو، ملک میں کوئی بھوکا، ننگا اور بے گھر نہ ہو، سبھوں کے لیے اس قدر انتظام اسلامی حکومت کا فریضہ ہے۔

محتاجوں اور معذوروں کے لئے انتظام

اسلام میں غریبوں اور محتاجوں کے لئے زکوٰۃ اور صدقات کی مد قائم کی گئی ہے اور اس کی ادائیگی ہر صاحب نصاب پر ضروری قرار دی گئی ہے، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب بعض قبائل نے زکوٰۃ بند کرنے کا ارادہ کیا اور خلیفہ رسول صدیق اکبرؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے اعلان فرمایا کہ ایسے لوگوں کے خلاف تلوار اٹھانا فرض ہے، فاروق اعظمؓ نے عرض کیا کہ جو کلمۂ اسلام کا اقرار کرتا ہے، نماز پڑھتا ہے روزہ رکھتا اور صرف زکوٰۃ روکتا ہے، اس کے خلاف تلوار کیسے اٹھانا درست ہوگا، صدیق اکبرؓ نے جواب میں فرمایا:

واللہ لاقاتلن عن فرق بین الصلوٰۃ والزکوٰۃ	خدا کی قسم میں اس سے جنگ کروں گا جو نماز اور زکوٰۃ میں
فان الزکوٰۃ حق المال واللہ لو منعونی عقالا	فرق کرے گا زکوٰۃ حق مال ہے، اگر کوئی ایک معمولی سی بھی
لقاتلتھم علی منعہ (ریاض الصالحین ص۴۸۰)	رسی کا تو بخدا اس روکنے پر اس سے جنگ کروں گا۔

اسلام اسے برداشت نہیں کرتا ہے کہ کوئی خزانے رکھے اور کوئی ایڑی رگڑ رگڑ کر جان دے، اس کا حکم ہے:

خُذ من اموالھم صدقۃ تطھرھم وتزکیھم بھا	تم ان کے مال سے صدقہ وصول کر کے انھیں پاک کرو اور اس کے
(توبہ۔۱۳)	ذریعہ سے بابرکت بناؤ۔

مال والوں سے ایک مخصوص رقم لی جائے گی اور حاجت مندوں پر جو مستحق قرار پائیں گے تقسیم کی جائے گی رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

ان اللہ افترض علیھم صدقۃ توخذ من اغنیائھم	اللہ نے ان پر زکوٰۃ فرض قرار دی ہے جو ان کے مالداروں
وترد علی فقرائھم۔ (ریاض الصالحین)	سے لی جائے گی اور ان کے محتاجوں کو دی جائے گی۔

نقدی پر چالیسواں حصہ فقراء و مساکین کا ہے، مال تجارت کی قیمت لگائی جائے گی اور سال پورا ہونے کے بعد ڈھائی فی صدی غرباء کے لئے نکالا جائے گا۔ اسی طرح زمین کی پیداوار میں دسواں اور بیسواں حصہ مساکین کے لئے مخصوص ہے سونا چاندی کے زیورات میں بھی زکوٰۃ فرض ہے۔

اس کے ساتھ اسلام کا یہ قانون بھی ہے کہ اگر ضروری مدات کی وصولی اور تقسیم کے بعد بھی خدانخواستہ کچھ لوگ فاقہ سے ہوں اور کچھ لوگوں کے پاس ان کی ضرورت سے زیادہ غلہ یا نقد رقم ہو تو خلیفہ وقت مالداروں سے فاضل رقم لے کر مفلسوں اور بھوکے مرنے والوں پر خرچ کرے گا۔ پھر اُن تمام صورتوں کو اسلام نے ناجائز قرار دیا ہے جن سے غریبوں کا خون چوسا جا سکتا ہے جیسے سود، رشوت، احتکار، اسراف، بخل وغیرہ وغیرہ۔

اسلام کا معاشی نظام اشتراکی نظام سے بہت بہتر ہے اور مفید تر بھی ساتھ ہی مضبوط بھی، زکوٰۃ و عُشر اور صدقات نافلہ کے علاوہ بھی بہت سارے حقوق ایک کے دوسرے پر رکھے گئے ہیں شخصی ملکیت کو جائز قرار دیا گیا ہے تاکہ زرانائی میں فرق نہ آنے پائے اور انسان انسان باقی رہے جانور در کی صف میں لا کر کھڑا نہ کیا جائے، مرنے کے بعد میراث کا قانون ہے کہ مرنے والے کی دولت اور جائداد ورثہ پر تقسیم ہو گی۔

اسلام نے خود رَو پودوں، چشموں، دریاؤں، سمندر کی مچھلیوں اور پرندوں پر کوئی پابندی عاید نہیں کی ہے اس طرح کی چیزوں پر ٹیکس محصول اور ٹھیکہ جائز نہیں ہے،

قانون امن وسلامتی اسلام میں امن و امان اور سکون وسلامتی کے لئے جو قوانین ہیں وہ ایسے ہیں کہ ان کے اجراء کے بعد بدامنی، قتل وخون ریزی، اور چوری ڈکیتی کے لئے کوئی راستہ باقی نہیں رہ جاتا ہے، پہلے اسلام انسان کے دلوں پر مذہب کی راہ سے حکومت قائم کرتا ہے۔عالمگیر اخوت ومحبت کا درس دیتا ہے حقوق کی نشاندہی کرتا ہے اور اس کی اہمیت دلوں میں جاگزین کرنے کی سعی کرتا ہے بغض و حسد اور بدظنی کی مذمت کرتا ہے. لوٹ مار، غارت گری اور چوری ڈکیتی کے نتائج وعواقب پر روشنی ڈالتا ہے، فتنہ وفساد اور مردم آزاری کے نقصانات بتاتا ہے، اور مکارم اخلاق کی تعلیم دیتا ہے۔

اس کے بعد جان کی قدر وقیمت اور اس کی حفاظت، قتل وخونریزی کا وبال اور اس کی سزا، حدود وقصاص کے مسائل واحکام سب کی تفصیل بیان کرتا ہے، باطن وظاہر دونوں راستوں سے انسانوں کی انسانیت کو آواز دیتا ہے۔ارشاد ربانی ہے۔

ولا تقتلوا النفس التی حرم اللہ الا بالحق
(بنی اسرائیل -۳)

جن جانوں کو اللہ نے محترم بنایا ہے ان کو حق کے سوا کسی اور طرح قتل نہ کرو۔

قاتل کے لئے قصاص کا حکم دیا گیا، ارشاد ہے

کتب علیکم القصاص فی القتلی الحر بالحر والعبد بالعبد والانثٰی بالانثٰی (البقرہ -۲۲)

تم پر مقتولوں کے بارے میں قصاص فرض کیا گیا، آزاد آزاد کے بدلے اور غلام غلام کے بدلے اور عورت عورت کے بدلے۔

قصاص کو زندگی سے تعبیر کیا اور قرآن نے بتایا۔

ولکم فی القصاص حیوٰۃ یا اولی الالباب
(البقرہ -۲۲)

اور تمہارے واسطے قصاص میں بڑی زندگی ہے لے عقل مندو

ورثاء مقتولین فاعدہ کے مطابق قصاص میں قاتل کے قتل ہو جانے کے بعد ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں لیکن اگر کوئی وارث مقتول اس کو بنیاد بنا کر پوری فضا خراب کرنے کی سعی کرنا چاہے تو اس کو اختیار نہیں دیا جائے گا ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

فمن اعتدی بعد ذالک فلہ عذاب الیم (البقرہ)	پھر جو اس فیصلہ کے بعد زیادتی کرے تو اس کے لئے دردناک عذاب ہے۔

قتل کی اہمیت جتائی گئی اور اس کے نقصانات کی طرف اشارہ کرکے اعلان کیا گیا

ومن اجل ذالک کتبنا علی بنی اسرآئیل انہ من قتل نفساً بغیر نفس او فساد فی الارض فکانما قتل الناس جمیعا ومن احیاھا فکانما احیا الناس جمیعا (المائدہ - ۵)	اور اسی سبب سے ہم نے بنی پر لکھ دیا کہ جو کوئی کسی ایک جان کو بلا عوض جان کے یا بغیر ملک میں فساد کے قتل کرے تو گویا اس نے سب لوگوں کو قتل کر دیا اور جس نے اس ایک جان کو زندہ رکھا تو گویا اس نے سب لوگوں کو زندہ کر دیا۔

فساد اور ڈاکہ زنی کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ان کو پھانسی دی جائے یا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں کاٹ ڈالے جائیں۔

انما جزآؤ الذین یحاربون اللہ ورسولہ ویسعون فی الارض فساداً ان یقتلوا او یصلبوا او تقطع ایدیھم وارجلھم من خلاف او ینفوا من الارض (ایضاً)	ان کی سزا جو اللہ اور اس کے رسولؐ سے لڑتے ہیں اور ملک میں فساد مچاتے ہیں یہ ہے کہ وہ قتل کئے جائیں یا پھانسی پر چڑھائے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں کاٹے جائیں۔ یا شہر بدر کر دیئے جائیں۔

چور کی سزا یہ تجویز کی ہے کہ اس کے دونوں ہاتھ گٹوں سے کاٹ ڈالے جائیں۔

والسارق والسارقۃ فاقطعوا ایدیھما جزآءً بما کسبا نکالاً من اللہ (المائدہ - ۶)	اور چوری کرنے والا مرد اور چوری کرنے والی عورت ان کے ہاتھوں کو کاٹ ڈالو، ان کے کرتوت کی سزا میں تنبیہہ ہے اللہ کی طرف سے،

حدود و قصاص میں قطعاً کسی کی رعایت درست نہیں ہے، جو بھی جرم کا مرتکب ہوگا اس پر مقرر کردہ سزا مرتب ہو کر رہے گی، ایک مخزومیہ خاتون کی سفارش پر نبی کریمؐ نے برافروختہ ہو کر فرمایا تھا کہ خدا کی قسم اگر محمدؐ کی لاڈلی فاطمہ بھی چوری کرے گی تو اس کا ہاتھ بھی شریعت کے مطابق کاٹا جائے گا۔

عفت و عصمت کا پاس

جان کے برابر بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ قیمت عفت و عصمت اور پاک دامنی کی ہے۔ اسلام میں اس کی حفاظت کا بھی پورا سامان فراہم کیا گیا اور خلاف ورزی پر سخت سزا تجویز کی گئی ہے، اسلام نے حکم دیا۔

وانکحوا الایامیٰ منکم والصالحین من عبادکم وامآئکم ان یکونوا فقرآء یغنھم اللہ من فضلہ (النور - ۴)	تم اپنے بے بیاہوں اور غلاموں اور لونڈیوں کا جو نکاح کے لائق ہوں نکاح کر دو اگر وہ مفلس ہوں گے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان کو مالدار بنا دے گا۔

نکاح ایک عبادت ہے اور زن و شو کی زندگی محبت و پیار کی زندگی ہے۔

ومن آیاتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجاً لتسکنوا الیھا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ (روم - ۳)	اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہاری ہی قسم سے جوڑے بنائے تاکہ تم ان کے پاس چین کرو اور اس نے تم دونوں کے درمیان اس میں پیار اور مہربانی رکھ دی ہے

پاکدامنی کو جو بھی غلط طور پر داغدار کرنے کی سعی کرے گا اسلام میں اس کے لئے سخت سزا ہے۔ چار عینی گواہ پیش نہ کرنے کی صورت میں اَسی دُرّے لگائے جائیں گے۔

والذین یرمون المحصنٰت ثم لم یاتوا باربعة شھدآء فاجلدوھم ثمانین جلدة ولا تقبلوا لھم شھادة ابدا، (نور-۱)	جو لوگ پاک دامن والی عورت کو تہمت لگائیں پھر نہ لائیں چار مرد گواہ تو ان کو اسی دُرّے لگاؤ، اور کبھی ان کی کوئی گواہی قبول نہ کرو۔

زنا سے بچنے کی جو تدبیریں بتائی گئی ہیں اگر کوئی اس کے باوجود زنا کا مرتکب ہوگا، تو غیر شادی شدہ کو سو دُرّے لگائے جائیں گے اور شادی شدہ کو سنگسار کیا جائے گا،

الزانیة والزانی فاجلدوا کل واحد منھما مائة جلدة ولا تاخذکم بھما رأفة فی دین اللہ ان کنتم تومنون باللہ والیوم الاٰخر ولیشھد عذابھما طآئفة من المومنین (نور-۱)	زنا کرنے والی عورت اور مرد ان دونوں میں سے ہر ایک کو سو سو دُرّے مارو اور تم کو ان پر اللہ کا حکم چلانے میں ترس نہ آنے پائے، اگر تم اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہو، اور ان کی سزا مسلمانوں کی ایک جماعت دیکھے۔

تعلیم و تربیت اس نظام میں تعلیم و تربیت پر بھی کافی زور دیا گیا ہے، حدیث میں جگہ جگہ علم کی فضیلت اور ترغیب ہے قرآن پاک کی اولین آیات جو نازل ہوئیں ان کا تعلق جبری تعلیم سے ہے، خود سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم جنھوں نے رسمی تعلیم حاصل نہیں کی تھی، حضرت جبریل علیہ السلام نے اپنی پہلی آمد پر آپ کو پڑھنا سکھایا، اور جب تک آپ نے قرآنی آیات کی تلاوت نہیں کی وہ بار بار تلاوت کے لیے فرماتے رہے؛

اقرأ باسم ربك الذی خلق خلق الانسان من علق (العلق)	اپنے رب کے نام سے پڑھ جو سب کا پیدا کرنے والا ہے، انسان کو جمے ہوئے لہو سے بنایا۔

قرآن پاک میں علم کی فضیلت کے سلسلہ میں ارشاد ہے :۔

ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون (الزمر-۱)	کیا سمجھ والے (اہلِ علم) اور بے سمجھ برابر ہوتے ہیں

کہیں ترغیب کا پہلو اختیار کیا گیا اور فرمایا گیا۔

وما اوتیتم من العلم الا قلیلا	تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے

زیادتی علم کے لیے دعا کا حکم دیا گیا ارشاد ہوا۔

قل رب زدنی علما (طٰہ-۶)	آپ کہیں اے رب مرے علم میں زیادتی عطا فرمادے

علم کی قدر و قیمت، علم والوں کی منزلت کے سلسلہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

فقیہ واحد افضل عند اللہ من الف عابد (مشکوٰۃ)	ایک فقیہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہزار عابد سے افضل ہے

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ طلبہ کی روشنائی شہدا کے خون سے زیادہ قیمتی ہے، کبھی فرمایا کہ طلبہ کے لیے روئے زمین کی ساری چیزیں دعا کرتی ہیں حتی کہ مچھلیاں پانی کے اندر ان کے لیے دعا کرتی ہیں، یہ بھی ارشاد فرمایا علم کا حاصل کرنا ہر مرد و عورت کے لیے فرض ہے اور جہاں سے اور جیسے ممکن ہو علم طلب کرو۔

دنیا میں علم کا ذوق سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ترغیب کا نتیجہ ہے، ابتدا میں مسلمانوں ہی سے علوم وفنون کا چرچا پھیلا اور دنیا کی دوسری قوموں میں علم وفن کا شوق پیدا ہوا، سائنس و فلسفہ کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جو مسلمانوں کا رہینِ منت نہ ہو۔

اخلاق و اعمال کی پاکیزگی

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں زندگی کے دوسرے شعبہ جات کو سنوارا، وہیں آپ نے اخلاق و اعمال کی بلندی و پاکیزگی پر بھی کافی توجہ دی اور یہ واقعہ ہے کہ اعمال و اخلاق پر جو توجہ اسلام نے دی ہے، کہیں وہ موجود نہیں، غیر مہذب قومیں ان تعلیمات کی بدولت مہذب بن گئیں۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق قرآن کریم نے اعلان کیا۔

انک لعلیٰ خلق عظیم (القلم ۱) — بیشک آپ بڑے خلق پر پیدا ہوئے ہیں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی اخلاق و صداقت کا نمونہ تھی، اور اسلام کی اشاعت میں آپ کی صداقت اور آپ کے اخلاق و اعمال کو بڑا دخل ہے آپ کے متعلق ارشادِ خداوندی ہے۔

لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیز علیہ ما عنتم حریص علیکم بالمومنین رؤف رحیم (توبہ - ۱۶)

تم میں سے تمہارے پاس ایک رسول آیا، جس سے تم کو تکلیف پہنچتی ہے وہ اس پر بھاری ہے اور تمہاری بھلائی بہت چاہنے والا ہے اور ایمان والوں پر نہایت شفیق اور مہربان

اس اُمت کو اس کا خصوصی شرف حاصل ہے کہ وہ مبلغ بنا کر بھیجی گئی ہے، اس امت کے سلسلہ میں ارشادِ ربانی ہے۔

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر (آل عمران - ۱۲)

جو امتیں عالم میں بھیجی گئیں ان میں تم سب سے بہتر ہو، اچھے کاموں کا حکم کرتے ہو اور بُرے کاموں سے روکتے ہو،

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متعلق صراحت فرمائی ہے۔

انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق (مشکوٰۃ) — میں اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ مکارم اخلاق کو مکمل کروں۔

زندگی کے مختلف مراحل ہوتے ہیں، اسلام نے ہر مرحلہ میں اس کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے، حسن ادب پر زور دیا ہے اور احترام و اکرام کی تاکید کی ہے۔

آدابِ رسُول علیہ الصلوٰۃ والسلام

مولوی مُحمّد صالح

اللہ تعالیٰ کلام مجید میں متعدد مقامات پر ارشاد فرماتا ہے کہ جو لوگ ایمان لاتے ہیں کلامِ الٰہی کو برحق مانتے ہیں اور خدائے تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پر عمل کرتے ہیں وہ جنت کے مستحق ہوں گے جہاں ہر قسم کے عیش وعشرت کے سامان مہیا ہیں اور جو لوگ دنیا کے عیش وعشرت میں مشغول ہو کر اللہ تعالیٰ کو بھول جاتے ہیں وہ دوزخ میں ڈالے جائیں گے جہاں طرح طرح کے عذاب ہیں۔ چونکہ صحابہ کو خدا اور رسول کے ارشاد پر یقین واثق اور عشق کامل تھا اس لیے وہ ہمیشہ اس کوشش میں رہتے تھے کہ ایسے کام کریں جس کے باعث دوزخ سے محفوظ رہ کر جنت کے مستحق ہو جائیں، جہاں اس محبوب حقیقی کے جمال لایزال کے مشاہدہ سے بہرہ ور ہوں گے۔ یوں تو ہر مسلمان کا دعویٰ ہے کہ میں جو کام کرتا ہوں اچھا ہے اور اپنے آپ کو اچھا ظاہر کرتا ہے حتیٰ کہ ایک بدکردار بھی اپنے آپ کو نیکوکار سمجھتا ہے۔ ؎

ہر کسے خود را نماید بایزید

نیک چوں بینی بماند بایزید

مگر اصحاب کرام کے حالات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ہمارے اور ان کے اعمال و افعال میں کیا نسبت ہے اور اُن کو خدا و رسول کے ساتھ کس درجہ کا عشق تھا اور ہم کو کتنا!

مسلمانو! صحابہ کرام وہ لوگ تھے جن کی افضلیت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود گواہی دی ہے۔ چنانچہ دیلمی نے مسندِ فردوس میں ذکر کیا ہے:

عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ عَزَّوَجَلَّ نَظَرَ فِیْ قُلُوْبِ الْعِبَادِ فَلَمْ یَجِدْ قَلْبًا اَتْقٰی مِنْ قُلُوْبِ اَصْحَابِیْ وَلِذٰلِکَ اخْتَارَھُمْ فَجَعَلَھُمْ صِحَابًا فَمَا اسْتَحْسَنُوْا فَھُوَ عِنْدَ اللّٰہِ حَسَنٌ وَّمَا اسْتَقْبَحُوْا فَھُوَ عِنْدَ اللّٰہِ قَبِیْحٌ۔

یعنی فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی قلب میرے صحابہ کے قلوب سے زیادہ پاکیزہ نہیں دیکھا۔ اس لیے ان کو میری صحابیت کے لیے پسند فرمایا جو کچھ وہ اچھا سمجھیں وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اچھا ہے اور جو بُرا سمجھیں وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بُرا ہے۔

غرض صحابہ کرام کے دلوں میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بڑی عظمت تھی اور وہ آپ کے آداب کی رعایت رکھتے تھے باوجود اس کے اگر کسی سے بمقتضائے بشریت یا سادگی سے کوئی ایسی حرکت ہو جاتی جس میں بے ادبی کا شائبہ ہوتا تو ساتھ ہی کلامِ الٰہی میں تنبیہ اور زجر و توبیخ نازل ہوتی جس سے سب متنبہ اور ہوشیار ہو جاتے۔ غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اصحاب کرام

قلوب میں آپ کی تعظیم و تکریم اس قدر جاگزیں تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رُو برو بات نہ کر سکتے تھے اور اگر ان کو کچھ دریافت کرنا ہوتا تو کئی دنوں تک خاموش رہتے اور موقع کے منتظر رہتے۔ یا کسی بدوی کی فکر میں رہتے کہ وہ آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ پُوچھے اور ہم استفادہ کریں کیونکہ وہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعظیم و اجلال کے باعث خود دریافت نہ کر سکتے تھے اور مجلس شریف میں آکر بیٹھتے تو بالکل بے حس و حرکت سر نیچے کیے بیٹھے رہتے۔ کبھی نگاہ اٹھا کر بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف نہ دیکھتے۔

صحابہ کرام کے آداب کما ینبغی تحریر میں نہیں آسکتے کیونکہ ادب ایک کیفیتِ قلبی کا نام ہے جس سے مختلف اقسام کے آثار و افعال ظہور میں آتے ہیں۔ اس کو بیان کرنا امکان سے خارج ہے۔ مگر چند آثار ارقام کیے جاتے ہیں۔ جن کی غرض یہ ہے کہ مسلمان ان حضرات کی کیفیتِ قلبی کو پیشِ نظر رکھ کر اس قسم کی کیفیت قلبی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

صدیق اکبر رضؓ کا طریق ادبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم صحیح بخاری میں سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبیلہ بنی عمرو بن عوف میں صُلح کرانے کے واسطے تشریف لے گئے۔ جب نماز کا وقت ہُوا تو موذن نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے پوچھ کر اقامت کہی۔ اور انھوں نے امامت کی۔ اس عرصہ میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی تشریف فرما ہوگئے اور صف میں قیام فرمایا۔ جب نمازیوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دیکھا تو دستک دینے لگے، اس غرض سے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ خبردار ہو جائیں کیونکہ ان کی عادت تھی کہ نماز میں کسی طرف نہ دیکھتے تھے۔ جب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے دستک کی آواز سنی تو گوشۂ چشم سے دیکھا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف فرما ہیں لہذا پیچھے ہٹنے کا قصد کیا۔ اس پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اشارہ فرمایا کہ اپنی ہی جگہ پر قائم رہو۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے دونو ہاتھ اٹھائے۔ اور اس نوازش پر کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مجھے امامت کا حکم فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا اور پیچھے ہٹ کر صف میں کھڑے ہوگئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھے۔ جب نماز سے فارغ ہُوئے تو فرمایا کہ اے ابوبکر! جب میں خود تمھیں حکم کر چکا تھا تو تم کو اپنی جگہ پر کھڑے رہنے سے کون چیز مانع ہُوئی تھی۔ عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ابی قحافہ کا بیٹا اس لائق نہیں کہ "اَنْ یُّصَلِّیَ بَیْنَ یَدَیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے بڑھ کر نماز پڑھائے۔

اب یہاں گہری نظر کی ضرورت ہے کہ باوجودیکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو پیچھے ہٹنے سے منع فرمایا مگر اُن سے امتثال نہ ہو سکا حالانکہ اللہ تعالیٰ سورۂ حشر رکوع ۱ میں ارشاد فرماتا ہے:

وَمَا اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰکُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔ یعنی "اور جو حکم دیں تم کو رسول تو اس کو قبول کرو۔ اور جس چیز سے منع کریں اس سے باز رہو۔ اس انکار کی حکمت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حال میں بالتفصیل لکھی گئی ہے۔

کنز العمال میں مروی ہے: قَالَ ابْنُ الْاَعْرَابِیِّ رُوِیَ اَنَّ اَعْرَابِیًّا جَاءَ اِلٰی اَبِیْ بَکْرٍ فَقَالَ اَنْتَ خَلِیْفَةُ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا قَالَ فَمَا اَنْتَ قَالَ الْخَالِفَةُ بَعْدَهٗ۔ یعنی ایک اعرابی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ ہیں؟ آپ نے فرمایا: نہیں۔

اُس نے کہا پھر کیا ہو ؟ آپ نے فرمایا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خالفہ ہوں۔

جوہری نے صحاح میں لکھا ہے کہ خالفہ اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی گھر کے سب لوگوں میں ایسا ہو جس میں کچھ خیر نہ ہو۔ چونکہ خلیفہ جانشین کو کہتے ہیں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو ادب نے اجازت نہ دی کہ اپنے آپ کو اس لفظ کا مصداق سمجھیں۔ اس لیے اُس کو ایسے طور سے بدلا جس میں مادہ خلافت باقی رہے اور ادب بھی ہاتھ سے نہ جائے حالانکہ آپ کی خلافت احادیث صحیحہ سے صراحۃً ثابت ہے۔

جائے غور ہے کہ جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے آپ کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خلیفہ کہنے میں تامل کرتے ہیں تو اب ان لوگوں کو کیا کہیں جو کمال فخر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ برابری اور بھائی چُنے کی نسبت لگاتے ہیں۔ معلوم نہیں کہ اس برابری سے اُن کا مقصود کیا ہے۔ اگر اُن کو اپنی فضیلت ظاہر کرنا منظور ہے تو وہ خصوصیات حضور کہاں ہیں۔ جو نہ کسی نبیِ مرسل کو نصیب ہوئیں اور نہ کسی فرشتۂ مقرب کو ملیں۔

کافراں دیدند احمد را بشر
این نمے دانند کہ آں شق القمر
گر بصورت آدمی انساں بُدے
احمد و بوجہل خود یکساں بُدے

افسوس ان لوگوں کو اتنی سمجھ نہیں کہ ؎

در محفلے کہ خورشید اندر شمارِ ذرہ ہست
خود را بزرگ دیدن شرطِ ادب نباشد

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا اپنے باپ کو آنحضرتؐ کی گستاخی کرنے کے سبب طمانچہ مارنا

ایک دفعہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے والد ابو قحافہ نے کفر کی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کوئی ناشائستہ کلمہ منہ سے نکالا۔ اس پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فوراً ان کے منہ پر طمانچہ کھینچ مارا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا تو عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت میرے پاس تلوار نہ تھی ورنہ ایسی گستاخی پر اس کی گردن اڑا دیتا۔ اُسی وقت آپ کی شان میں یہ آیت نازل ہوئی:

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ط وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ط رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ط اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ط اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (سورہ مجادلہ)

تو نہ پائے گا ان لوگوں کو جو یقین رکھتے ہیں اللہ اور روزِ آخرت پر کہ وہ ایسوں سے دوستی کریں جو مخالف ہوئے اللہ کے اور اس کے رسول کے گو وہ ان کے باپ ہوں یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی ہوں یا ان کے

کہنے کے یہی ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان لکھ دیا ہے اور اُن کی تائید کی اپنے فیضانِ غیبی سے اور ان کو داخل فرمائے گا ایسے باغوں میں کہ بہتی ہیں ان کے نیچے نہریں ہمیشہ وہیں رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی اور وہ اس سے راضی۔ یہ خدائی لشکر ہے خبردار ہو جاؤ اللہ کا لشکر وہی فلاح پانے والے ہیں۔

دیکھیے اس آیت مبارک سے حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی کیسی شان پائی جاتی ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے منبر پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ پر بیٹھنا خلافِ ادب سمجھا

جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آغازِ خلافت میں منبر پر بیٹھ کر خطبہ دینے لگے تو منبر کے جس درجے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ کر خطبہ القا فرمایا کرتے تھے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس سے نیچے کے درجے پر بیٹھے کہ ؏

بجائے بزرگاں نشستن خطا است

پھر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ایامِ خلافت میں اسی منبر پر بیٹھ کر خطبہ دینا چاہا تو اس درجہ سے بھی نیچے کے درجے پر بیٹھے کیونکہ ان کے نزدیک مقام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب کے ساتھ خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام کا ادب بھی واجب تھا۔

از خدا خواہم توفیق ادب
بے ادب محروم ماند از فضل رب

حضرت عمر خطاب رضی اللہ عنہ کا طریقِ ادب رسول صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مکان کی چھت پر ایک پرنالہ تھا ایک روز حضرت عمر رضی اللہ عنہ نئے کپڑے پہنے ہوئے مسجد کو جا رہے تھے جب اس پرنالے کے قریب پہنچے اتفاق سے اس دن حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے گھر دو مرغ ذبح کیے جا رہے تھے یکایک ان کا خون اس پرنالے سے ٹپکا اور اس کے چند قطرے عمر خطاب رضی اللہ عنہ کے کپڑوں پر پڑ گئے آپ نے اس پرنالے کے اکھاڑ ڈالنے کا حکم صادر فرمایا لوگوں نے فوراً اس پرنالے کو اکھاڑ دیا اور آپ گھر واپس آ کر دوسرے کپڑے پہن کر مسجد میں تشریف لائے ادائے نماز کے بعد حضرت عباس رضی اللہ عنہ آپ کے پاس آ کر کہنے لگے یا امیر المومنین! خدا کی قسم اس پرنالے کو جسے آپ نے اکھاڑ ڈالا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے اس جگہ لگایا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ سن کر نہایت مضطرب اور پریشان ہوئے تھوڑی دیر کے بعد آپ نے عباس رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ اے عباس! میں تم کو قسم دیتا ہوں کہ اپنے پَیر میرے کندھے پر رکھ کر اس پرنالے کو جیسا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے لگایا تھا اسی جگہ پر لگا دو۔ چنانچہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی درخواست پر اس کو پہلی جگہ پر لگا دیا۔

دیکھیے حضرت عمر اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کے دل میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کس قدر عظمت اور عزت تھی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا طریق ادب رسول صلی اللہ علیہ وسلم

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قریش کی طرف جنگ حدیبیہ میں صلح کے واسطے بھیجا تو قریش نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو طواف کرنے کی اجازت دی۔ لیکن آپ نے طواف کرنے سے انکار کیا اور اپنے پروردگار کے حکم یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ اپنے آقائے نامدار کا ادب تعظیم مدنظر رکھ کر فرمایا مَا کُنْتُ لَاَفْعَلَ حَتّٰی یَطُوْفَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یعنی میں طواف نہ کروں گا جب تک میرے مولا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طواف نہ کریں گے۔

دیکھیے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیت اللہ شریف کے طواف کرنے کے مقابلے میں جو عبادت میں داخل ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے رعایت ادب کو افضل جانا۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ مدارج النبوت میں لکھتے ہیں کہ کوئی عبادت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رعایت ادب کے برابر نہیں ہے۔

اسی طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وصال کے بعد صحابہ کرام اور تابعین عظام حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حدیث اور کلام کے ذکر کے وقت آپ کی تعظیم و توقیر فرماتے اور آپ کا ادب ملحوظ رکھتے تھے۔ کنز العمال میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے کہا میں اسلام میں چوتھا شخص ہوں اور میرے نکاح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دو صاحبزادیاں یکے بعد دیگرے دی ہیں اور میں نے جب سے اپنا داہنا ہاتھ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دستِ مبارک سے ملایا ہے اُس دن سے میں نے اپنی شرمگاہ کو کبھی نہیں چھوا۔ (کیمیائے سعادت)

ادب کا یہ وہ مرتبہ عظمیٰ ہے جس پر ہر شخص مکلف نہیں بلکہ یہ صرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ہی حصہ تھا اس کی حقیقت یہ ہے کہ حدیث شریف میں آیا ہے:

وَاِذَا اَتَی الْخَلَاءَ فَلَا یَمَسُّ ذَکَرَہٗ بِیَمِیْنِہٖ وَلَا یَتَمَسَّحْ بِیَمِیْنِہٖ۔

یعنی جب کوئی پاخانے جائے تو دائیں ہاتھ سے اپنی شرمگاہ کو نہ چھوئے نہ اس سے نجاست پونچھے۔

دوسری حدیث میں ہے:

کَانَتْ یَدُ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الْیُمْنٰی لِطُھُوْرِہٖ وَطَعَامِہٖ وَکَانَتْ یَدُہُ الْیُسْرٰی لِخَلَائِہٖ وَمَا کَانَ مِنْ اَذًی۔

یعنی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دایاں ہاتھ وضو کرنے اور کھانے کے لیے تھا۔ اور آپ کا بایاں ہاتھ پاخانہ میں ڈھیلا استعمال کرنے اور ہر مکروہ چیز کے لیے تھا۔

ان حدیثوں سے ثابت ہے کہ دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر اس قدر برتری ہے کہ پاخانہ وغیرہ کی حالت میں اسے مکروہ و نجس اشیاء کو چھونے سے بچایا جائے۔ اور اس خدمت کے لیے صرف بائیں ہاتھ کو مخصوص کر لیا جائے۔ مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ

نے اس فضیلت کی بنا پر کہ ان کا ہاتھ ایک مرتبہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ہاتھ سے چھو چکا ہے۔ اُس کے شرف کو اس قدر وسیع اور عام کر لیا کہ خلا وغیرہ کی حالت میں بھی مدت العمر اس سے مس ذکر نہ کیا۔ یعنی دائیں ہاتھ کی جو فضیلت حالتِ خلا میں مسِ ذکر سے مانع تھی۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ کے چھونے کے باعث اس قدر وسیع کر لی کہ غیر خلاء کی حالت میں بھی اس سے مسِ ذکر گوارا نہ کیا۔ یا یُوں سمجھو کہ اگر شرع نے دائیں ہاتھ سے مسِ ذکر کرنے سے اس لیے منع کیا ہے کہ وہ بائیں سے اشرف ہے۔ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کے عدم مسِ ذکر کی علت بجائے اس کے دایاں ہونے کے اس امر کو قرار دیا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ کے ساتھ چھُو چکا ہے۔ فافہم۔

اب ایک اور پہلو پر نظر کرنی چاہیے۔ یعنی اگر اس ہاتھ میں کسی قسم کی برکت پیدا ہوگئی تھی تو شرمگاہ میں کون سی برائی رکھی تھی، جس کو وہ متبرک ہاتھ لگانا مذموم سمجھا گیا۔ حالانکہ احادیث و آثار سے مصرح ہے کہ وہ بھی ایک عضو ہے مثل اور اعضاء کے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

۱۔ عَنْ قَيْسِ بْنِ طَلْقٍ اَنَّ اَبَاهُ حَدَّثَهُ اَنَّ رَجُلاً سَالَ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ رَجُلٍ مَسَّ ذَكَرَهُ اَيَتَوَضَّوءُ قَالَ هَلْ هُوَ اِلَّا بِضْعَةٌ مِنْ جَسَدِكَ۔

یعنی موطا امام محمد میں قیس بن طلق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ کسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کیا آلہ تناسل کے چھونے سے وضو ٹوٹتا ہے۔ فرمایا وہ تو ایک ٹکڑا ہے تیرے جسم کا۔

۲۔ عَنْ عَلِيِّ ابْنِ اَبِيْ طَالِبٍ قَالَ مَا اُبَالِيْ اِيَّاهُ اَمَسُّ اَوْ اَنْفِيْ اَوْ اُذُنِيْ۔

یعنی موطا امام محمد میں مروی ہے کہ علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھے کچھ پروا نہیں کہ ذکر کو مس کروں یا ناک کو یا کان کو۔ یعنی ان تمام اعضاء کے چھُونے کا ایک ہی حکم ہے۔

۳۔ عَنْ اِبْرَاهِيْمَ اَنَّ ابْنَ مَسْعُوْدٍ سُئِلَ عَنِ الْوُضُوْءِ مَنْ مَسَّ الذَّكَرَ فَقَالَ اِنْ كَانَ نَجِسًا فَاقْطَعْهُ۔

یعنی موطا امام محمد میں ابراہیم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ کسی نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے پُوچھا کہ مس ذکر سے وضو ٹوٹتا ہے یا نہیں۔ کہا اگر وہ نجس ہے تو اس کو کاٹ ڈال۔

الحاصل شرعاً بول و براز کی حالت کے سوا دیگر حالت میں مسِ ذکر میں کوئی کراہت نہیں۔ البتہ اگر کراہت ہے تو طبعی ہے۔ پھر اس کراہت طبعی کو ادب نے وہاں اس درجہ بڑھایا کہ مشابہ بلکہ زیادہ کراہت شرعی سے کر دیا جس کی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ عمر بھر اس فعل سے بچتے رہے۔

اِس سے معلوم ہُوا کہ ادب ایک ایسی چیز ہے کہ اپنا پورا اثر کرنے میں نہ منتظرِ امر ہے نہ محتاجِ نظیر۔ بلکہ اہلِ ایمان میں وُہ ایک قوتِ راسخہ ہے جس کو خاص ایمان کے ساتھ تعلق ہے اور اس کا منشا عظمت و قوت اُس شخص یا اُس چیز کی ہے جس کے آگے ادب کرنے والا اپنے کو کم درجہ اور ذلیل سمجھتا ہے۔

صحیح مسلم میں براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا طریق ادبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم مروی ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے جب وہ صلح نامہ لکھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کفار کے درمیان حدیبیہ کے دن ٹھہرا تھا۔ جس میں یہ عبارت تھی:

هٰذَا مَا كَاتَبَ عَلَيْهِ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللهِ۔

تو مشرکوں نے کہا کہ لفظ رسُول اللہ نہ لکھو کیونکہ اگر رسالت مسلّم ہوتی تو پھر لڑائی کیا تھی۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے فرمایا کہ اس لفظ کو مٹا دو۔ انہوں نے عرض کیا کہ میں وہ شخص نہیں ہوں جو اس لفظ کو مٹا سکوں۔ لہٰذا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خود اُس کو اپنے ہاتھ سے مٹایا۔

اب یہاں تعمق نظر کی ضرورت ہے کہ باوجودیکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو لفظ رسول اللہ مٹانے کا امر فرمایا تھا مگر ان سے امتثال نہ ہو سکا حالانکہ اللہ تعالیٰ سورہ حشر رکوع ۱ میں ارشاد فرمایا ہے:

وَمَا آتٰكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔

یعنی اور جو حکم دیں تم کو رسول، تو اُس کو قبول کرو اور جس چیز سے منع کریں اُس سے باز رہو۔

سورۂ احزاب رکوع ۵ میں ارشاد فرمایا ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۝

یعنی اور یہ حق نہیں کسی ایماندار مرد کا نہ عورت کا۔ جب یہ فیصلہ کر دے اللہ اور اس کا رسُول کسی امر کا کہ اُن کو رہے اختیار اپنے معاملہ کا۔ اور جس نے نافرمانی کی اللہ اور اس کے رسول کی۔ سو راہ بھولا صریح چُوک کر۔

امتثالِ امر نہ ہونے کی وجہ: یہاں ایک شبہ پیدا ہوتا ہے جس کے دفعیہ کے لیے تعمق نظر درکار ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس کا تو احتمال ہی نہیں ہو سکتا کہ ان حضرات سے عدول حکمی عمل میں آئے۔ وہ بھی کس موقع میں جبکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس رُوبرو حکم فرما رہے ہیں اور اس کا بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ اُن حضرات میں گویا سرتابی کا مادہ ہی نہ تھا۔ اس سے بڑھ کر انقیاد کیا ہو کہ ایک اشارہ پر جان دینا اُن کے سامنے کوئی بڑی بات نہ تھی۔ اور یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ عدولِ حکمی خلافِ مرضی خدا اور رسول تھی۔ کیونکہ اگر یہ بات ہوتی تو خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ان کو زجر و توبیخ فرما دیتے بلکہ کوئی آیت نازل ہو جاتی، اس لیے کہ اُن حضرات کی تادیب کا لحاظ بیش از بیش مرعی تھا اس وجہ سے کہ وہ حضرات ایک عالم کے مقتداء ہونے اور دنیا کے لیے نمونہ بننے والے تھے۔ بغرض ان تمام امور پر نظر ڈالنے سے پریشانی ہوتی ہے۔ مگر یہ خلجان اس طرح سے دفع ہو سکتا ہے کہ ان حضرات کا پاسِ ادب جو سچے دل سے تھا۔ وہ کچھ ایسا با فروغ تھا کہ اس کے مقابلہ میں وہ عدولِ حکمی قابلِ التفات نہ ہُوئی۔ اگر اس حالت کو خیال کیجیے بشرطیکہ دل میں وقعت و عظمت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل طور پر ہو۔ تو معلوم ہوگا کہ ان حضرات کے دلوں کا اُس وقت کیا حال ہوگا۔ اُدھر خود بنفسِ نفیس سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم بالمواجہ حکم فرما رہے ہیں۔ اور ایک طرف سے

آیات و احادیث بآوازِ بلند کہہ رہی ہیں کہ خبردار امرِ واجب الانقیاد سے سرِمُو انحراف نہ ہونے پائے۔ اور ادھر ادب کا دل پہ اس قدر تسلط ہے کہ امتثال کے لیے نہ ہاتھ یاری دیتے ہیں نہ پاؤں۔ آخر ان بزرگوں کو ادب نے اس قدر مجبور کیا کہ امتثالِ امر ہو ہی نہ سکا۔ اور انہوں نے وہی کیا جو مقتضائے ادب تھا۔ اب ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ جب نصِ قطعی کے مقابلہ میں آخر ادب ہی کی ترجیح ہُوئی تو دین میں اُس کو کس قدر باوقعت اور ضروری چیز سمجھنا چاہیے۔ ؎

شد ادب جُملہ طاعتِ محمود
طاعتِ بے ادب ندارد سُود

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نمازِ عصر کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے باعث قضا کرنا

شفا قاضی عیاض میں مروی ہے کہ جنگِ خیبر کی واپسی میں منزل صہبا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ عصر ادا فرمائی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ جماعت میں شامل نہ ہو سکے تو آپ نے اسی وقت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زانوئے مبارک پر سر رکھ کر آرام فرمایا۔ چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نمازِ عصر نہیں پڑھی تھی اس لیے اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے کہ نمازِ عصر کا وقت گزر رہا ہے جو سب نمازوں سے افضل ہے اور جس کی تاکید قرآن مجید میں بتکرارِ عطف فرمائی؛

حَافِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰی۔ (سورہ بقرہ رکوع ۳۱)

یعنی حفاظت کرو اور نگاہ رکھو تم نمازوں کو۔ اور نمازِ وسطیٰ یعنی نمازِ عصر کو۔

خندق کے دن خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ عصر کے فوت ہو جانے پر کفار کے واسطے یہ بددعا فرمائی؛

حَبَسُوْنَا عَنْ صَلٰوةِ الْوُسْطٰی صَلٰوةِ الْعَصْرِ مَلَأَ اللّٰهُ بُيُوْتَهُمْ وَقُبُوْرَهُمْ نَارًا۔

یعنی اُن کفار نے ہم کو نمازِ وسطیٰ سے یعنی نمازِ عصر سے روکا۔ اللہ تعالیٰ اُن کی قبروں اور گھروں کو آگ سے بھر دے۔

باوجود اتنی تاکید کے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے عمداً نمازِ عصر کو ترک کیا، محض اس خیال سے کہ اگر میں اپنا زانو ہلاؤں گا تو حضور علیہ الصلوٰة والسلام بیدار ہو جائیں گے اور آپ کے خواب میں خلل آجائے گا۔ لہٰذا آپ نے محض حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے باعث زانو کو نہ ہلایا۔ حتیٰ کہ آفتاب غروب ہو گیا اور نمازِ عصر کا وقت جاتا رہا۔ مگر جب حضور علیہ الصلوٰة والسلام بیدار ہوئے تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے نماز کے فوت ہو جانے کا حال عرض کیا۔ حضور علیہ الصلوٰة والسلام نے دعا فرمائی کہ "یا الٰہ العالمین! اگر علی تیری اطاعت میں تھا تو پھر آفتاب کو طلوع کر دے"۔ پس اُسی وقت ڈوبا ہوا آفتاب پلٹ آیا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے نہایت تسکین کے ساتھ نمازِ عصر ادا کی۔ پھر آفتاب حسبِ معمول غروب ہو گیا۔ ؎

ثابت ہوا کہ جملہ فرائض فروع ہیں
اصل الاصول بندگی اس تاجور کی ہے

الغرض اطاعت و فرمانبرداری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر امر میں واجب و لازم ہے۔ جس نے تصدیق رسالت کی، مگر

اتباع و اطاعتِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نہ کی وہ گمراہ ہے۔ اس حدیث کو روایت کیا طحاوی نے مشکل الآثار میں دو طریق سے۔ ایک روایت اسماء بنت عُمَیس سے، دُوسری فاطمہ بنت حسین سے۔ قاضی عیاض نے شفا میں، سیوطی نے الدر المنتثرہ فی الاحادیث المشتہرہ میں۔ اور حافظ ابن سید الناس نے بشری اللبیب میں۔ اور اس حدیث کے دونوں طرق شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ۱۱۴۴ھ ہجری میں مدینہ منورہ میں اپنے استاد شیخ ابوطاہر سے مسلسل فاطمہ بنت حسین تک اور اسماء بنت عُمَیس تک ازالۃ الخفاء میں نقل کیے ہیں۔

ازالۃ الخفاء میں ہے کہ ابن جوزی نے اس حدیث کو موضوع کہا ہے۔ لیکن اس کے جواب میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے مدارج النبوت میں لکھا ہے کہ ابن جوزی حدیثوں کے موضوع کہنے میں بہت جلدی کرنے والے ہیں۔ بہرکیف یہ حدیث صحیح ہے۔

صواعق میں ہے کہ عراق کی ایک جماعت مشائخ ابوالمنصور مظفر بن اُردشیر قنادی رحمۃ اللہ علیہ کے وعظ میں حاضر تھی جبکہ وہ نمازِ عصر کے بعد وعظ فرما رہے تھے۔ اور یہی حدیث اور اہلِ بیت کے فضائل بیان کر رہے تھے کہ یکایک ابر آیا اور آفتاب چھُپ گیا۔ لوگوں نے گمان کیا کہ آفتاب غروب ہوگیا۔ پس آپ نے منبر پر کھڑے ہو کر آفتاب کو اشارہ کیا اور تین اشعار پڑھے جن کا مطلب یہ ہے: ؎

کر رہا ہوں میں بتوفیقِ خدا　　نعت و مدحِ مصطفیٰ و مرتضیٰ

تُو نہ ڈوب اے شمسِ تاباں پُر ضیا　　سُن لے تُو بھی وصفِ آلِ مصطفیٰ

وہ جماعتِ حاضرین کہتی ہے کہ اُسی وقت ڈوبا ہوا آفتاب پھر نکل آیا۔ ؎

اولیاء را ہست قدرت از الٰہ

تیرِ جستہ باز گردانند ز راہ

حضرات قباث عثمان و عباس وغیرہ رضی اللہ عنہم کا ادبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

بیہقی نے دلائل النبوت میں ابی الحویرث رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ عبدالملک بن مروان نے قباث بن اشیم رضی اللہ عنہ سے پُوچھا کہ تم اکبر ہو، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکبر تھے۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَکْبَرُ مِنِّیْ وَ اَنَا اَسَنُّ مِنْہُ۔ انہوں نے جواب دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے بڑے تھے اور میں عمر میں اُن سے زیادہ ہُوں ——— اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ شریف عامِ فیل میں ہے اور مجھے یاد پڑتا ہے کہ میری والدہ صاحبہ اُسی ہاتھی کی لید کے پاس مجھے لے کر کھڑی تھیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی انہی قباث رضی اللہ عنہ سے اِسی قسم کا سوال کیا تھا۔ اور انہوں نے اُن کو بھی

یہی جواب دیا تھا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اکبر تھے اور میری ولادت پیشتر ہے۔ (بیہقی)

عباس رضی اللہ عنہ سے بھی اسی قسم کا سوال ہوا تھا۔ آپ نے بھی یہی جواب دیا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اکبر تھے اور میری ولادت پیشتر ہے۔ (کنز العمال)

کنز العمال میں یزید بن الاصم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے استفسار فرمایا کہ میں بڑا ہوں یا تم؟ عرض کیا کہ آپ اکبر ہیں اور اکرم ہیں، میری عمر زیادہ ہے۔

اِس ادب کو دیکھیے کہ باوجودیکہ اس موقع میں لفظ اکبر اور اسن دونوں کے ایک ہی معنی ہیں مگر اس لحاظ سے کہ لفظ اکبر مطلق بزرگی کے معنی میں بھی مستعمل ہوتا ہے۔ صراحۃً اُس کی نفی کر دی اور مجبوراً لفظ اسن کو ذکر کیا۔ کیونکہ صراحۃً مقصود پر دلالت کرنے والا سوائے اِس کے کوئی لفظ نہ تھا۔ جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ جنکی تعظیم خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے اور حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کا ادب میں یہ حال ہو تو پھر ہم کو کس قدر ادب کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ مگر افسوس ہے آجکل کے بعض بے ادب اور گستاخ فرقوں پر جو شب و روز آیات و احادیث سے کرید کرید کر من گھڑت معانی بنا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقیصِ شان کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان بے ادبوں کو رشد و ہدایت بخشے تاکہ وہ بے ادبی اور گستاخی کے باعث دوزخ کا ایندھن بننے سے محفوظ رہیں۔ ؎

از خدا خواہیم توفیقِ ادب
بے ادب محروم ماند از فضلِ رب

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کا طریقِ ادبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

ابوداؤد میں عبد بن فیروز رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے میں نے پُوچھا کہ کن جانوروں کی قربانی درست نہیں۔ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم لوگوں میں کھڑے ہُوئے اور فرمایا کہ چار قسم کے جانور ہیں جن کی قربانی درست نہیں۔ ایک وہ جس کی آنکھ پھُوٹی ہو۔ دوسرا وہ جو سخت بیمار ہو۔ تیسرا وُہ جس کا لنگ ظاہر ہو۔ چوتھا وہ جو نہایت دُبلا ہو۔ اُس کو آپ نے اپنی انگلیوں کے اشارے سے تشریح فرمائی۔ لیکن میری انگلیاں حضرت کی انگلیوں سے چھوٹی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ میں پہلے دستِ مبارک کے اشارہ سے تعیین فرما دیا کہ چار جانور ہیں جن کی قربانی درست نہیں۔ پھر اُن کی تفصیل۔ براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے جب اِس واقعہ کو بیان کیا تو ادب نے اجازت نہ دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک کی حکایت اپنے ہاتھ سے کی جائے۔ لہٰذا عذر ظاہر کیا کہ میری انگلیاں چھوٹی ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیوں کے ساتھ کچھ نسبت نہیں ہے۔

اب ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ چار کا اشارہ ہاتھ سے کرنے میں مقصود صرف تعیین عدد ہے۔ ظاہراً نہ اس میں کوئی مساوات کا شائبہ ہے نہ سوء ادب کا۔ باوجود اس کے ادب صحابیت نے دستِ مبارک کی حکایت کو بھی گوارا نہ کیا جس سے تشبیہ لازم آجاتی تھی۔ اب دوسرے آداب کو اسی پر قیاس کر لینا چاہیے۔

افسوس ان لوگوں کے حال پر جو باوجود مدعیِ علم ہونے کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بے ادبی کے کلمات کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں فہم سلیم عطا فرمائے تاکہ وہ عذابِ اُخروی سے بچ جائیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا ادبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

صحیح بخاری میں ابو رافع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ایک روز میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ منورہ کے کسی راستہ میں دیکھا۔ چونکہ میں جُنبی تھا اس لیے میں چھپ گیا۔ پھر غسل کر کے حاضرِ خدمتِ اقدس ہوگیا۔ آپ نے فرمایا: اے ابوہریرہ! تم کہاں تھے؟ عرض کیا کہ مجھے نہانے کی ضرورت تھی اس لیے میں نے آپ کے ساتھ بغیر طہارت کے بیٹھنے کو مکروہ سمجھا۔ فرمایا:

سُبْحَانَ اللّٰہِ اِنَّ الْمُؤْمِنَ لَا یَنْجَسُ۔

یعنی پاک ہے اللہ تعالیٰ۔ مومن نجس نہیں ہوتا۔

دیکھیے، ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اس حالت میں جو الگ ہو گئے، تو اس سے ظاہر ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کمال درجہ کی عظمت اُن کے دل میں موجود تھی۔ جس نے ان کی عقل کو مقہور کر کے اُن کے دِل کو اس ادب پر مجبور کر دیا تھا ورنہ وہ جانتے تھے کہ جنابت کا جسم میں سرایت کرنا ایک امرِ حکمی ہے حسی نہیں، جس سے دوسرے کو کراہت ہو۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اُس کا اثر دُوسرے تک متعدی نہیں ہو سکتا۔

ہر چند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسئلہ شرعیہ بیان فرما دیا کہ مسلمان نجس نہیں ہوتا۔ مگر کلام اس میں ہے کہ اس حالت میں حاضر ہونے کو انہیں کون سی چیز مانع تھی۔ اگر نعوذ باللہ طبیعت میں بے باکی ہوتی تو خیال کر لیتے کہ اس حالت میں مجالست سے کوئی ممانعت نہیں بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی خیال آسکتا تھا کہ چل کر تو دیکھیے کہ حضور منع فرمائیں گے تو ایک مسئلہ معلوم ہو جائے گا، خصوصاً اُس زمانہ میں کہ ہر روز نئے نئے مسائل معلوم ہونے کی ضرورت سمجھی جاتی تھی۔ بلکہ دراصل بات یہ ہے کہ ادب نے اُن کو جرأت کرنے نہ دی۔

پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو مسئلہ بیان فرمایا اُس سے بھی مقصود معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسئلہ شرعیہ معلوم ہو جائے۔ علاوہ اس کے اگر ان کی یہ حرکت ناگوارِ طبع مبارک ہوتی تو صاف زجر فرما دیتے۔ خلاصہ یہ ہے کہ وہ محض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب کی وجہ سے حاضر نہ ہو سکے۔

حضرت اسلع بن شریک رضی اللہ عنہ کا ادبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

زرقانی نے شرح مواہب اللدنیہ میں یہ حدیث نقل کی ہے کہ اسلع بن شریک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُونٹنی پر میں کجاوہ باندھا کرتا تھا۔ ایک رات مجھے نہانے کی حاجت ہُوئی اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کوچ کا ارادہ فرمایا۔ اُس وقت مجھے نہایت تردّد ہوا کہ اگر ٹھنڈے پانی سے نہاؤں تو مارے سردی کے مرجانے یا بیمار ہو جانے کا خوف ہے۔ اور یہ بھی گوارا نہیں کہ ایسی حالت میں خاص سواری مبارک کا کجاوہ اُونٹنی

پیر باندھوں۔ مجبوراً کسی شخص انصاری سے کہہ دیا کہ کجاوہ باندھے۔ پھر میں نے چند پتھر رکھ کے پانی گرم کیا اور نہا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے جا ملا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: اے اسلع! کیا سبب ہے کہ تمہارے کجاوہ کو میں متغیر پاتا ہوں۔ عرض کیا، یا رسول اللہ میں نے نہیں باندھا تھا۔ فرمایا: کیوں؟ عرض کیا: اُس وقت مجھے نہانے کی حاجت تھی اور ٹھنڈے پانی سے نہانے میں جان کا خوف تھا۔ اس لیے کسی اور کو باندھنے کے لیے کہہ دیا تھا۔ اسلع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی: یایھا الذین اٰمنوا اذا قمتم الی الصلوٰۃ۔ (سورۂ مائدہ رکوع ۲)

جس سے سفر میں تیمم کرنے کی اجازت ملی۔ (درمنثور و طبرانی وغیرہ)

سبحان اللہ کیا ادب تھا کہ جس کجاوہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف رکھتے تھے اس کی لکڑیوں کو حالتِ جنابت میں ہاتھ لگانا بھی گوارا نہ تھا۔ اگر بنظرِ انصاف دیکھا جائے تو اس کا منشا محض ایمان دکھلائی دے گا۔ جس نے ایسے پاکیزہ خیالات ان حضرات کے دلوں میں پیدا کر دیے تھے ورنہ ظاہر ہے کہ نہ عموماً اس قسم کے امور کی تعلیم تھی نہ صراحۃً ترغیب و تحریص۔

الحاصل جب ان لکڑیوں کا اس قدر ادب کیا گیا تو معلوم ہُوا کہ انبیا و اولیا کا جس قدر بھی ادب کیا جائے تو محمود ہے۔

امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کا طریقِ ادبِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مصعب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ آپ نہایت ہی ہنس مکھ تھے مگر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ان کے رُوبرو کیا جاتا تو ان کا رنگ متغیر ہو جاتا اور میں نے انھیں کبھی بلا وضو حدیث بیان کرتے نہیں دیکھا۔

امام مالک بن انس رضی اللہ عنہ کا طریقِ ادبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم مصعب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت امام مالک بن انس رضی اللہ عنہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتے یا اُن کے پاس حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ذکر کیا جاتا تو اُن کے چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کے باعث جُھک جاتے یہاں تک کہ اُن کے ہم نشینوں پر گراں گزرتا۔ پس آپ سے ایک دن اس کا باعث دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا:

لو رأیتم ما رأیت لما انکرتم علی ما ترون۔

یعنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رفعتِ شان اور عظمتِ مکان جو میں جانتا ہُوں اگر تم اسے جانتے تو ہرگز تم اپنے دیکھے ہُوئے پر انکار نہ کرتے۔ ؎

نمیدانم کدامین نو بہار جلوہ می آید
کہ در پرواز آمد رنگِ روگلہائے بستاں را

مصعب بن عبداللہ سے مروی ہے کہ امام مالک بن انس رضی اللہ عنہ جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کوئی حدیث بیان کرتے تو پہلے وضو کرتے پھر کپڑے وغیرہ پہن کر آراستہ ہوتے پھر حدیث شریف بیان کرتے۔ اور جب کوئی شخص دروازے پر آتا تو لونڈی بھیج کر دریافت فرماتے کہ تم کیوں آئے ہو؟ کوئی حدیث پوچھنے آئے ہو یا مسائل فقہ۔ اگر وُہ کہتا مسائل فقہ پوچھنے آیا ہوں

تو آپ اُسی حالت میں باہر آکر اُسے مسئلہ بتلا دیتے۔ اگر وہ کہتا حدیث پُوچھنے آیا ہُوں تو آپ غسل خانے میں جاکر غسل فرماتے اور نئے کپڑے پہنتے، خوشبو لگاتے، عمامہ باندھتے، سبز چادر اوڑھتے اور ان کے واسطے خاص اس وقت کے لیے ایک کرسی بچھائی جاتی۔ پس آپ آکر اس پر بیٹھتے اور نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ حدیث بیان فرماتے، اور جب تک حدیث بیان کرتے رہتے خوشبو سلگتی رہتی۔

عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں ایک دن امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی خدمتِ اقدس میں حاضر تھا اور آپ حدیث شریف بیان فرما رہے تھے کہ آپ کو بچھّو نے سولہ بار کاٹا اور آپ کے چہرہ کا رنگ زرد ہو گیا۔ مگر آپ نے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی حدیث کا بیان کرنا نہ چھوڑا۔ جب آپ حدیث بیان کرنا ختم کر چکے اور لوگ چلے گئے تو میں نے دریافت کیا۔ فرمایا کہ آج میرے حدیث بیان کرنے میں بچھّو نے سولہ بار کاٹا۔ اور میں نے حدیث کی عظمت و اجلال کے باعث صبر کیا۔ سبحان اللہ ان حضرات کے دلوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کیسا احترام جاگزیں تھا کہ سولہ بار بچھّو کاٹے اور اُف نہ کریں۔ جان جائے مگر نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی توقیر میں خلل نہ آئے بخلاف آج کل کے بعض مدعیانِ علم کے کہ وہ عمداً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقیصِ شان کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کو ہدایت بخشے۔

حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کا طریقِ ادبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

حدیث صحیح میں مروی ہے کہ ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کی پیشانی میں بال اس قدر دراز تھے کہ جب وہ بیٹھتے اور اُن بالوں کو چھوڑ دیتے تو زمین پر پہنچتے۔ لوگوں نے اُن سے پُوچھا کہ تم نے ان بالوں کو اتنا کیوں بڑھایا ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں اس وجہ سے ان کو نہیں کٹواتا کہ ایک وقت ان پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا دستِ مبارک لگا تھا اس لیے میں نے تبرکاً ان بالوں کو رکھا ہُوا ہے۔

خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا طریقِ ادب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

حدیث میں ہے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی ٹوپی میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے چند موئے مبارک تبرکاً تھے۔ ایک جنگ میں آپ کی وُہ ٹوپی گر پڑی آپ نے اس کے حصول کے واسطے سخت جنگ کی۔ حتیٰ کہ چند مسلمان بھی اس جنگ میں شہید ہو گئے۔ صحابہ کرام نے ان کو الزام دیا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے یہ فعل ٹوپی کے واسطے نہیں کیا بلکہ اُن مُوئے مبارک کے واسطے کیا جو اس میں ہیں تاکہ وہ ضائع نہ ہوں اور کفار کے ہاتھ میں نہ جانے پائیں اور مجھ سے اس کی برکت جاتی نہ رہے۔

امیر معاویہ کا ادبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ الخلفاء میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے حال میں لکھا ہے:

وکان عندہ شئ من شعر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وقلامۃ الاظفار فاوصٰی ان تجعل فیہ وعینیہ وقال افعلوا ذٰلک وخلوبینی وبین ارحم الرّاحمین۔

یعنی امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ موئے مبارک اور تراشۂ ناخن محفوظ تھے جب وُہ مرنے لگے تو وصیت کی کہ یہ چیزیں میرے منہ اور آنکھوں میں رکھ دینا اور پھر میرا معاملہ ارحم الراحمین کے سپرد کر دینا۔

اس سے ظاہر ہے کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان متبرک چیزوں کو خدائے تعالیٰ کے حضور میں جاتے وقت اپنی تقصیروں کی معافی کا ذریعہ قرار دیا اور امید کامل باندھ لی کہ ان کی بدولت میری مغفرت ہو جائے گی۔ سبحان اللہ یہ تھا ادبِ رسول اور کمال عقیدہ سچے مسلمانوں کا۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا ادبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا۔ انہوں نے اپنے ہاتھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹھنے کی جگہ پر رکھا پھر اس کو اپنے منہ پر ملا۔

مستدرک حاکم میں عبداللہ بن بریدہ رضی اللہ عنہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ جب ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تو عظمت کے لحاظ سے کوئی شخص حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف سر نہ اٹھاتا۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے رُوبرو تو اس قسم کا ادب ہوتا ہی تھا۔ لیکن وُہ حضرات جب حدیث شریف کے حلقوں میں بیٹھتے تھے تو اس خشوع وخضوع کے ساتھ سر جھکائے بیٹھتے تھے گویا گردنوں پر سر ہی نہیں۔ چنانچہ مستدرک میں ہے کہ عبدالرحمن بن قرط رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ایک بار میں مسجد میں گیا، دیکھا کہ ایک حلقہ ہیں لوگ ایسے سر جھکائے بیٹھے ہیں کہ گویا ان کی گردنوں پر سر ہی نہیں۔ یعنی سب لوگ حدیث شریف سُننے والے کچھ ایسے مودبانہ سر جھکائے بیٹھے تھے کہ گردنوں پر سر نہیں دکھائی دیتے تھے اور ایک صاحب حدیث شریف بیان کر رہے تھے۔ جب غور سے ان کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ حذیفہ رضی اللہ عنہ ہیں۔

اب ذرا زمانہ کے انقلاب اور طبیعتوں کی رفتار کو دیکھیے کہ بعد خیر القرون نے لوگوں کو ان حضرات کے مسلک سے کس قدر دُور کر دیا ہے اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ معاملہ بالکل بالعکس ہو گیا ہے اُس زمانہ میں حالانکہ ان امور کی تعلیم عموماً نہ تھی مگر دل ہی کچھ ایسے مہذب اور مؤدب تھے کہ قسم قسم کے آداب اور طرح طرح کے حسنِ عقیدت پر دلالت کرنے والے افعال خود بخود ان سے ظہور پاتے تھے اور وہ ان کو اصولِ شرعیہ پر منطبق کر دیتے تھے۔ جس کا سمجھنا بھی شاید اس زمانہ میں بآسانی نہ ہو سکے۔ کیوں نہ ہو، ان حضرات کے دل وہ تھے جن کو تمام بندوں کے دلوں پر فضیلت ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے صحابیت کے واسطے منتخب فرمایا تھا۔ چنانچہ دیلمی نے انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے تمام بندوں کے دلوں کو دیکھا تو میرے اصحاب کے دلوں سے پاکیزہ تر کوئی دل نہ پایا۔ اسی واسطے ان کو میرے اصحاب ہونے کے لیے پسند فرمایا۔ جو کام وہ اچھا سمجھتے ہیں اللہ کے نزدیک بھی وُہ اچھا ہے اور جس کو وُہ بُرا جانتے ہیں اللہ کے نزدیک بھی وُہ بُرا ہے۔

غرض وہ ہر قسم کے آداب کے سب سے اعلیٰ مظہر تھے اور اُن پر کوئی اعتراض بھی نہ کرتا تھا، اس لیے کہ اُس وقت

تک بے ادبی کی بنیاد نہ پڑی تھی۔ اور اگر چند خود سروں نے بنیاد ڈالی بھی تھی تو اس وجہ سے کہ اُن کی بداعتقادیوں نے ان کو دائرۂ اتباع سے خارج اور دُوسرے نام کے ساتھ مشتہر کر دیا تھا۔ اُن کی باتیں کسی کی سمعِ قبول تک پہنچی ہی نہ تھیں۔

الحاصل خیر القرون کا یہ حال تھا کہ ہر قسم کے آداب کی بنیاد رکھی جاتی تھی اور اِس آخری زمانہ کا حال یہ ہے کہ باوجودیکہ اُن حضرات نے جن کا اتباع بحسبِ ارشادِ شارع علیہ السلام ضروری ہے طرح طرح کے آداب تعلیم کر گئے۔ اگر کسی سے اِس قسم کے افعال صادر ہو جائیں تو ہر طرف سے اعتراضات کی بوچھاڑ ہونے لگتی ہے۔ اور صرف اعتراض ہی نہیں بلکہ شرک کے الزام تک نوبت پہنچا دی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ادب نصیب کرے۔ ؎

از خدا خواہیم توفیقِ ادب
بے ادب محروم ماند از فضلِ رب

حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و تکریم کا زندگی میں اور بعد وصال یکساں واجب ہونا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و تکریم کرنی جیسی آپ کی زندگی میں واجب و لازم ہے۔ ویسے ہی آپ کے وصال کے بعد بھی واجب و لازم ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے :

عن ابی بکر الصدیق قال لا ینبغی رفع الصوت علی نبی حیا و لا میتا۔

یعنی ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں آواز کو بلند کرنا نہیں چاہیے، نہ زندگی میں اور نہ ہی وصال کے بعد۔

روضۂ مبارک کے قریب میخ گاڑنے پر عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا تہدیدی حکم

روی عن عایشۃ انہا کانت تسمع صوت وتد یوتد والمسمار یضرب فی بعض الدور المنصلۃ بمسجد النبی صلی اللہ علیہ وسلم فترسل الیھم لا توذو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

یعنی عایشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ وہ اس کھونٹی کی آواز جو مسجد نبوی کے ارد گرد گھروں میں گاڑی جاتی تھی اور اس میخ کی آواز جو ٹھونکی جاتی تھی سُنتی تھیں۔ انھوں نے ان گھر والوں کے پاس کہلا بھیجا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت نہ دو۔

روی وما عمل علی مصراعی بابہ یا لمناصع الآ توقیا لذلک وتادبا معہ۔

یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے دروازے کے کواڑ اس وجہ سے بچنے کے لیے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ادب کی خاطر کپڑے کے بنائے ہُوئے تھے۔

مسجد نبوی میں چلّا کر بولنے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تعزیری حکم مسجد نبوی میں اونچی بولنا ممنوع ہے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسجد نبوی میں بلند آواز کرنے والوں کو تنبیہ کی اور ڈانٹا۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:

عن السائب بن یزید قال کنت قائما فی المسجد فحصبنی رجل فنظرت فاذا عمر بن الخطاب فقال اذھب فائتنی بھذین فجئت بھما قال من انتما او من این انتما قال من اھل الطائف قال لو کنتما من اھل البلد لاوجعتکم ترفعان اصواتکما فی مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ (رواہ البخاری)

یعنی صحیح بخاری میں سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا میں ایک بار مسجد نبوی میں کھڑا تھا کہ کسی نے مجھے کنکری ماری۔ دیکھا تو عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ہیں۔ کہا جاؤ اور ان دو شخصوں کو لے آؤ۔ جب ان دونوں کو میں ان کے پاس لے گیا تو پوچھا تم کون ہو؟ کہاں سے ہو؟ انہوں نے کہا ہم طائف کے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تم اس شہر سے ہوتے تو میں تم کو ضرور اذیت پہنچاتا اور مارتا، اس واسطے کہ تم مسجد نبوی میں بلند آواز کرتے ہو۔

اس حدیث سے ظاہر ہے کہ مسجد نبوی میں کوئی شخص آواز بلند نہیں کر سکتا تھا۔ اور اگر کوئی کرتا بھی تو مستحق تعزیر سمجھا جاتا تھا۔ باوجودیکہ سائب بن یزید رضی اللہ عنہ چنداں دُور نہ تھے۔ مگر اسی ادب سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اُن کو پکارا نہیں بلکہ کنکری پھینک کر اپنی طرف متوجہ کیا۔ یہ تمام ادب اس وجہ سے تھے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام وہاں بحیاتِ ابدی تشریف رکھتے ہیں کیونکہ اگر لحاظ صرف مسجد ہونے کا ہوتا تو فی مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔
دُوسرا قرینہ یہ ہے کہ اس تعزیر کو اہلِ شہر کے لیے خاص فرمایا جن کو مسجد شریف کے آداب خوب معلوم تھے۔ اگر صرف مسجد ہی کا لحاظ ہوتا تو اہلِ طائف بھی معذور نہ رکھے جاتے۔ کیونکہ آخر وہاں بھی مسجدیں تھیں۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا خلیفہ ابوجعفر کو مسجدِ نبوی میں چلّا کر بولنے پر ڈانٹنا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے خلیفۂ وقت ابوجعفر کو مسجد نبوی میں ان کے باآواز بلند بولنے پر ڈانٹا۔ چنانچہ درمنظم میں ابن حجر ہیثمی اور شفا میں قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہما نے بسندِ متصل روایت کی ہے:

عن ابن حمید قال ناظر ابوجعفر امیر المؤمنین مالکا فی مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال لہ یا امیر المؤمنین لا ترفع صوتک فی ھذا المسجد فان اللہ تعالیٰ ادب قوما فقال لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی ومدح قوما فقال ان الذین یغضون اصواتھم عند رسول اللہ الآیۃ وذم قوما

فقال ان الذین ینادونك من وراء الحجرات الایۃ وان حرمتہ میتا کحرمتہ حیا فاستکان لہا ابو جعفر وقال یا ابا عبد اللہ استقبل القبلۃ وادعوام استقبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال لم تصرف وجھك عنہ وھو وسیلتك ووسیلۃ ابیك ادم علیہ السلام الی اللہ یوم القیمۃ بل استقبلہ واستشفع بہ فیشفعك اللہ وقال اللہ تعالیٰ ولو انہم اذ ظلموا انفسہم جاؤك فاستغفروا اللہ واستغفر لہم الرسول لوجدوا اللہ توابا رحیما۔

یعنی امیر المؤمنین ابو جعفر منصور نے جو خلفائے عباسیہ سے دوسرے خلیفہ ہیں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ مسجد نبوی میں کسی مسئلہ میں مباحثہ کیا جس میں ان کی آواز کچھ بلند ہوگئی۔ اس پر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اے امیر المومنین! اس مسجد میں آواز بلند نہ کیجیے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تادیب کی ایک قوم کی اس آیت شریف میں یا ایہا الذین امنوا لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی یعنی اے مسلمانو! اپنی آواز نبی کی آواز پر بلند نہ کرو۔ یعنی میرے حبیب کے دربار میں اپنی آواز بلند نہ کرو۔ اور مدح کی ان لوگوں کی جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس آواز پست کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا سورہ حجرات رکوع ا میں ان الذین یغضون اصواتہم عند رسول اللہ اولئك الذین امتحن اللہ قلوبہم للتقوی لہم مغفرۃ واجر عظیم یعنی جو لوگ دبی آواز سے بولا کرتے ہیں رسول ا^صلعم^ یہ وسلم کے پاس وہی لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جانچ لیا ہے ان کے دلوں کو پرہیزگاری کے لیے، ان کے لیے مغفرت اور اجر عظیم ہے۔ اور مذمت کی اس قوم کی جو حجرہ کے باہر سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو پکارتے تھے چنانچہ اسی سورۃ میں ارشاد فرمایا ان الذین ینادونك من وراء الحجرات اکثرھم لا یعقلون ولو انہم صبروا حتی تخرج الیہم لکان خیرا لہم یعنی اور جو لوگ کہ تجھ کو حجروں کے باہر پکارتے ہیں وہ اکثر بیوقوف ہیں اور اگر وہ صبر کرتے یہاں تک کہ تو ان کی طرف از خود نکلتا تو اُن کے حق میں بہتر تھا۔ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حرمت وصال کے بعد بھی وہی ہے جو قبل وصال کے تھی امیر المومنین یہ سنتے ہی متادب اور متذلل ہوگئے۔ پھر پوچھا اے عبداللہ! قبلہ کی طرف متوجہ ہو کر دعا کروں، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجہ ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف سے کیوں منہ پھیرتے ہو وہ تو وسیلہ ہیں آپ کے اور آپ کے باپ آدم علیہ السلام کے قیامت کے روز۔ تو حضرت کی طرف متوجہ ہو کر شفاعت اور سفارش طلب کیجیے کہ اللہ تعالیٰ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شفاعت قبول کرے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ولو انہم اذ ظلموا انفسہم جاؤك فاستغفروا اللہ واستغفر لہم الرسول لوجدوا اللہ توابا رحیما۔ یعنی اور اگر یہ لوگ جب انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا تھا۔ تیرے پاس آجاتے پھر اللہ تعالیٰ سے معافی چاہتے اور رسول اُن کے واسطے معافی چاہتا تو ضرور پاتے اللہ کو توبہ قبول

کرنے والا مہربان۔

یہاں سے صاف ظاہر ہے کہ جو لوگ مراتب تعظیم اور آدابِ رسالت کا لحاظ رکھیں گے وہی اس وعدے میں داخل ہیں، برخلاف ان کے جو بے ادبی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں بولتے ہیں کہ ان کے نیک عمل بھی ضایع ہوجاتے ہیں۔

مسلمانو! ان بزرگوں کے اعتقادوں کو دیکھیے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے آواز بلند کرنے کے باب میں ان آیات پر استدلال کیا: یاایھا الذین اٰمنوا لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی اور ان الذین ینادونک من ورآء الحجرات۔ اور خلیفۂ وقت نے پوچھا تک نہیں کہ فوق صوت النبی اور ینادونک کے معنی یہاں کیونکر صادق آتے ہیں اور اگر اجتہاد کیا گیا تو اس کا طریقہ کیا ہے پھر یہ بھی نہ تھا کہ خلیفۂ موصوف کچھ جاہل تھا بلکہ وہ نہایت کامل العقل، عالم جید اور ادیب اور متدین تھا مگر معلوم نہیں۔ اس استدلال میں کس درجہ کی قوت تھی جس نے خلیفۂ وقت کو عین مباحثہ میں ساکت کر دیا۔ اگر اس زمانہ میں کوئی شخص اس قسم کا استدلال کرے تو اس پر سیکڑوں اعتراض کیے جائیں گے۔ علیٰ ہذا اگر کوئی شخص اس استدلال کی نزاکت کو نہ سمجھ کر اس میں کچھ کلام کرے تو وہ کون سا مسلمان ہوگا جو معترض کی رائے کو امام مالک کی رائے پر ترجیح دے گا کیونکہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ وہ شخص ہیں کہ جن کے شاگردوں کے شاگرد ہونے پر امام بخاری اور مسلم وغیرہ محدثین کو فخر ہے غرض اس استدلال پر حُجت کرنے والا جاہل مطلق اور علم سے بے بہرہ ہے۔

مسلمانو! امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ان آیات سے وہ ادب استنباط کیا کہ اس کی بدولت قیامت میں اہل ایمان بہرہ اندوز اور متمتع رہیں گے۔ (جزاہ اللہ تعالیٰ عنا خیر الجزاء)

صحابہ کرام حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نام مبارک کے ساتھ بابی کہتے

بخاری شریف میں ام المومنین حفصہؓ سے مروی ہے کہ جب کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک کرتیں تو بِابِی کہتیں۔ چنانچہ ام المومنین فرماتی ہیں: وقلّما ذکرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم الا قالت بِابِی۔ معنی اس کے یہ ہیں کہ میرے باپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سے فدا ہوں۔

صحابہ کرام اکثر بِابِی انت وامّی یا رسول اللہ کہا کرتے تھے۔ چنانچہ کتبِ احادیث میں موجود ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ آپ کے اشفاق و مراحم کے روبرو مہرِ مادری اور شفقتِ پدری کی کچھ حقیقت نہیں۔ ان دونوں کو آپ پر سے فدا کرنا چاہیے۔

سبحان اللہ! کیا ادب تھا کہ روبرو و نو روبرو و غائبانہ وصال شریف کے بعد بھی وہ ادب مرعی تھا کہ جب تک ماں باپ کو فدا نہیں کرتے نام مبارک کا ذکر نہیں کرتے تھے۔

آپ کے نام مبارک کا ادب کافر بھی کرتے تھے

کیوں نہ ہو یہ نام مبارک وُہ تھا کہ ذکر میں کفار بھی بسا اوقات متادب ہوجاتے تھے۔ چنانچہ قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ نے مواہب اللدنیہ میں۔ اور زرقانی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح مواہب اللدنیہ میں لکھا ہے کہ ایک جماعت قبیلہ کندہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور وہ الفاظ تحیت کے ادا کیے جو اس زمانہ میں سلاطین کے حضور میں کہے جاتے تھے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ میں بادشاہ نہیں ہُوں بلکہ محمد بن عبداللہ ہوں انہوں نے کہا ہم آپ کا نام لے کر نہیں پکاریں گے۔ آپ نے

فرمایا کہ میں ابو القاسم ہوں۔ اس پر انہوں نے کہا اے ابو القاسم! فرمائیے کہ ہم نے اپنے دل میں کیا چھپایا ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا یہ تو کاہنوں کا کام ہے اور کاہن اور اُن کا پیشہ دوزخی ہے۔ انہوں نے کہا کہ پھر کیونکر معلوم ہو کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں تب آپ نے ایک مٹھی کنکریاں اٹھائیں اور فرمایا کہ دیکھو یہ گواہی دیتی ہیں کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں چنانچہ اسی وقت کنکریاں دستِ مبارک میں تسبیح کرنے لگیں۔ یہ سُن کر حاضرین نے صدقِ دل سے کلمۂ شہادت پڑھا جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم بھی گواہی دیتے ہیں کہ بے شک آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور وہ سب لوگ مشرف با سلام ہوئے۔

ظاہر ہے کہ یہ لوگ قبل امتحان مشرف باسلام نہیں تھے باوجود اس کے نام مبارک لینے میں ترکِ ادب سمجھا۔ کیا تعجب ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہی ادب پسند آگیا ہو اس سے ان کو ابدالآباد کے لیے عزت و شرافت حاصل ہوگئی کہ مسلمان ہو کر جنت الفردوس میں داخل ہوئے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا طریقِ ادبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ جذب القلوب میں ارقام فرماتے ہیں کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ مدینہ طیبہ میں اپنے گھوڑے پر سوار نہ ہوتے تھے کیونکہ وہ فرماتے تھے کہ مجھ کو شرم آتی ہے کہ میں اُس زمین کو گھوڑے کے سُم سے روندوں۔ جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک لگے ہُوئے ہیں۔ فی الحقیقت وہ زمینِ پاک نہایت واجب التعظیم ہے۔ بقول حافظ رحمۃ اللہ علیہ ؎

بمقامیکہ نشانِ کفِ پائے تو بود
سالہا سجدہ گہ صاحب نظراں خواہد بود

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا طریقِ ادبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے حال میں مرقوم ہے کہ آپ صحیح بخاری کے جمع کرنے کے وقت ہر حدیث لکھنے کے واسطے تازہ غسل کیا کرتے اور دوگانہ نماز پڑھتے تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ آبِ زمزم سے غسل کرتے اور مقامِ ابراہیم پہ دوگانہ پڑھتے تھے۔ چونکہ اس طرح انہوں نے حدیثِ نبوی کی تعظیم اور توقیر کی ہے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسا فضلِ عظیم دیا ہے کہ تمام مسلمان ان کو اپنا امام جانتے ہیں اور انکی تعظیم اور انکی کتاب کی وہ قدر ہوئی کہ دنیا میں سوائے قرآن مجید کے کسی اور کتاب کی ایسی قدر و منزلت نہیں ہوئی۔ یہ مقبولیت محض ادبِ حدیث کا سبب تھا ورنہ احادیثِ صحیحہ کی اور بھی بے شمار کتابیں تھیں۔

جمہور علمائے اہل السنۃ والجماعۃ کا اس پر اتفاق ہے کہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ کتاب البخاری، یعنی تمام کتابوں سے زیادہ صحیح کتاب کتاب اللہ کے بعد بخاری کی کتاب ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا طریقِ ادب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امام سیوطیؒ نے تنزیہ الانبیاء عن تشبیہ الاغبیاء میں امام سُبکی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ترشیح سے نقل کیا ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بعض تصانیف میں وہ قصہ نقل کیا جو کسی عورت نے کھال چُرایا تھا اور حضور علیہ الصلوٰۃ

والسلام نے اُس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم فرمایا اور کسی نے سفارش کی۔ پھر وہ حدیث نقل کی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُس وقت فرمایا کہ اگر فلاں عورت بھی (جو ایک شریفہ تھیں) چُراتیں تو اُن کا ہاتھ بھی قطع کیا جاتا۔

امام سُبکی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ادب دیکھو کہ حدیث شریف میں فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نام مصرح ہے۔ اگر بعینہٖ حدیث نقل کر دیتے تو کوئی بیجا اور بے موقع بات نہ تھی لیکن آپ نے ازراہِ کمال ادب صراحۃً نام مبارک کو ذکر نہ کیا۔

سبحان اللہ! کیا ادب تھا حالانکہ الفاظ حدیث کو بعینہٖ نقل کرنا ضروری ہے اور وُہ نام مبارک جو حدیث شریف میں وارد ہے لفظ لَو کے تحت ہیں ہے جو علیٰ سبیل فرض محال آتا ہے مگر با ایں ہمہ چونکہ حدیث شریف میں یہ نام مبارک مقام توہین میں وارد تھا اس لیے ادب نے اجازت نہ دی کہ اُس نام مبارک کو صراحۃً ذکر کریں۔ گو حدیث شریف میں وارد ہے۔ سچ ہے جو مقربین بارگاہ ہوتے ہیں انھی کو ادب نصیب ہوتا ہے۔ ہر کس و ناکس میں وہ صلاحیت کہاں۔ ؎

از خدا خواہیم توفیقِ ادب
بے ادب محروم ماند از فضلِ رب

سلطان محمود غزنوی کا طریقِ ادبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں کہ غازی سلطان محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے غلام ایاز کا ایک بیٹا تھا جو بادشاہ کا ملازم تھا اور اس کا نام محمد تھا۔ ایک دن بادشاہ سلامت نے ایاز کی موجودگی میں اُس سے یُوں خطاب کیا کہ اے ایاز کے بیٹے! وضو کا پانی لاؤ۔ ایاز نے ان الفاظ کو سُن کر دل ہی دل میں خیال کیا کہ نہ معلوم میرے بیٹے نے کیا خطا کی جس کے باعث بادشاہ سلامت نے اس کو نام سے نہیں بُلایا۔ پس جب سلطان محمود وضو سے فارغ ہُوئے تو ایاز کی طرف دیکھا کہ وہ مغموم وملول ہے اس سے غم و رنج کا سبب پُوچھا اس نے دست بستہ کھڑے ہو کر عرض کی کہ عالیجاہا! میرے مغموم ہونے کا باعث یہ ہے چونکہ حضور نے میرے لختِ جگر کو نام لے کر نہیں بلایا۔ اس لیے معاً میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید اس سے کوئی بے ادبی اور گستاخی سرزد ہوئی ہے کہ جس کے باعث آپ اس سے خفا اور ناراض ہیں۔ بادشاہ سلامت نے مسکرا کر کہا اے ایاز! خاطر جمع رکھ، تمہارے صاحبزادے سے کوئی بات میری طبع کے خلاف سرزد نہیں ہوئی اور نہ ہی میں اس سے کسی طرح ناراض یا خفا ہوں۔ اس وقت نام نہ لینے میں یہ حکمت تھی کہ میں اس وقت بے وضو تھا چونکہ یہ آقائے نامدار سرورِ کونین رحمۃ للعالمین کا ہمنام تھا اس لیے مجھے شرم آئی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نام مبارک ایسی حالت میں میری زبان سے گزرے جبکہ میں بے وضو یا بے طہارت ہوں۔

ولنعم ما قیل۔ ؎

ہزار بار بشویم دہن بمشک و گلاب
ہنوز نامِ تو گفتن کمالِ بے ادبی است

مسلمانو! تم کو بھی لازم ہے کہ تم بھی اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعظیم و توقیر کرو جس طرح بزرگان دین کیا کرتے تھے

اور ہر بات میں آپ کا ادب ملحوظ رکھو جس وقت آپ کا ذکر ہو یا آپ کا نام مبارک لیا جائے یا آپ کا کلام پڑھا جائے یا آپ کے فضائل و محامد بیان کیے جائیں تو نہایت متوجہ ہو کر حضورِ قلب کے ساتھ سُنا کرو اور جب تک ایسے مقام میں رہو درود شریف کی کثرت کیا کرو کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی ہے بلکہ حقیقت میں تمہارا اپنا ہی نفع اور بہبودی ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کے دلوں میں حبیبِ خدا اشرف انبیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی عظمت و محبت ڈالے حضور کا سچا تابعدار اور فرمانبردار بنائے اور قیامت میں حضور کی معیت سے شاد کام فرمائے۔ آمین ثم آمین۔ ؎

دیدہ باشی تشنہ مستعجل بر آب
جاں بجاناں ہمچناں مستعجل است

ظہورِ قدسی

چودھری افضل حق

وجدان نے چودہ سو سال کی اُلٹی زقند لگا کر پہلے زمانہ کے واقعات کو تخیل کی نظر سے دیکھا۔ دنیا بداعمالیوں سے ظلمت کدہ بنی ہُوئی تھی۔ کفر کی کالی گھٹائیں ہر طرف تلی کھڑی تھیں۔ عصیاں کی بجلیاں آسمان پر کوندرہی تھیں۔ نیکی نفس کی طغیانیوں میں گھری ہُوئی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ راہ سے بھٹکی ہُوئی نیکی اُس دیاس کی حالت میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھی تاکہ کہیں روشنی کی کرن پھُوٹے اور اسے سلامتی کی راہ مل جاوے۔ وہ کفر کے اندھیرے میں ڈرتے ڈرتے قدم اٹھا رہی تھی۔ دیکھو وُہ چند قدم پر رُک گئی۔ سرِ راہ دوزانو ہو کر عالمِ یاس میں سینہ پر ہاتھ باندھے گردن جھکا کر مصروفِ دعا ہوگئی اور نہایت عجز و الحاح سے بولی: اے نور و ظلمت کے پروردگار! میں غریب اس پُر ہول اندھیرے میں کب تک بھٹکتی پھروں۔ اے آقا! اپنے کرم سے اس نور کا ظہور کر جو ظلمت کدۂ دہر کو منور کر دے، وُہ نور پیدا کر جو بے بصر کو طاقتِ دیدار بخشے۔ اس نے آمین، آمین کہہ کر سر جھکا یا۔

یک بیک اس کے دل میں خوشی کی لہر اُٹھی اور وُہ شگفتہ گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح شاداب ہونے لگی کیونکہ اسے قبولیت دعا کا القاء ہو رہا تھا۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ ستاروں سے زیادہ روشن آنکھیں اٹھائیں۔ کفر کی گھٹائیں چھٹ رہی تھیں۔ افقِ مشرق پر محبت کی کہانی سے زیادہ دلکش پَو پھُوٹ رہی تھی۔

دعائے خلیلؑ اور نویدِ مسیحا

آفتاب ہدایت کے طلوع کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ۲۰۔ اپریل ۵۷۱ء مطابق ۹ ربیع الاول دوشنبہ کی مبارک صبح قدوسی آسمان پر جگہ بجگہ سرگوشیوں میں مصروف تھے کہ آج دعائے خلیلؑ اور نویدِ مسیحا مجسم بن کر دنیا میں ظاہر ہوگی حوریں جنت میں تزئینِ حسن کیے بیٹھی تھیں کہ آج صبح کائنات کا غازہ نمودار ہوگا جس کے عالمِ وجود میں آتے ہی شرک اور ظلمت کی آفت کا فور ہو جائے گی، لوگ اپنے پروردگار کو پہچاننے لگیں گے۔ نسل وخون کے امتیاز کی لعنت مٹ جائے گی۔ غلام اور آقا ایک ہو جاویں گے۔ شبنم نے عالمِ ملکوت کی ان باتوں کو سُنا اور یہ پیغامِ مسرت کرۂ ارض کے غنچوں تک پہنچایا۔ وُہ خوشی سے کھل گئے۔ کلیاں مسکرانے لگیں۔ دن کے دس بجے بی بی آمنہؓ کے بطن سے وُہ لعل جہانتاب پیدا ہُوا جس کے لیے قعرِ ذلت میں گری ہُوئی مخلوق کو اٹھانا، غریب اور غلام کو بڑھانا، عورت کو مرد کے برابر کر دکھانا ازل سے مقدر ہو چکا تھا۔ وہ نومولود، زچہ خانہ میں مسکرایا، اس کائنات ارضی کا ذکر کیا ہے فضائے ملکوت میں بھی مسرت کی لہر دوڑ گئی کیونکہ دنیا کو سچی خوشی کا سبق اس سے ملنے والا تھا۔ کفر سجدہ میں گر گیا۔ ادیانِ باطلہ کی نبض چھوٹ گئی۔ عبداللہ کا بیٹا، آمنہؓ کا جایا دنیا میں کیا آیا دین و دنیا پر مستقل ترقی کے دروازے کُھل گئے۔ کائنات کی خوابیدہ قوتیں بیدار ہو کر

مصروفِ عمل ہوگئیں۔ انسانیت کی تعمیر اخوت و مساوات کی بنیادوں پر شروع ہوئی۔ متلاشیانِ حق کو ایسا عرفانِ الٰہی نصیب ہوا کہ ماسوا اللہ کا خوف خود بخود دل سے جاتا رہا۔ عبدالمطلب کو جب معلوم ہوا کہ عمل و اخلاق کی حد کمال نے انسانی پیکر اختیار کر لیا تو دل میں دعاؤں نے آنکھ کھولی۔ اس خیال سے کہ یہ مولود انسانوں کا ممدوح ہے اس کا نام محمدؐ رکھا۔ انسانیت کے اسی کمال کا عالمِ وجود میں آنا انسانوں کے لیے کس قدر باعثِ برکت ہوا۔ اس کا حال دنیا میں پھیلی ہوئی روشنی اور تہذیب سے پوچھو۔

میلاد النبیؐ

مسلمان اس دن کو یاد کر کے جتنا مسرور ہو کم ہے۔ کیونکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو مسرتوں سے بھر دیا۔ لیکن مسلمانوں نے اس خوشگوار یاد کو تازہ رکھنے کے لیے کیا کیا؟ مولود پڑھا، نعتیں سُن کر رات آنکھوں میں کاٹی۔ جب عین نماز فجر کا وقت ہوا تو سو گئے۔ ہندوستان میں میلاد کی محفلوں پر روپے صرف ہوئے مگر مسلمانوں کے پاس اپنی اور انسانیت کی تعمیر کے لیے پائی تک نہیں۔ کاش! مسلمان اس دن اپنے چندوں سے مرکز قایم کرتے تاکہ اولوالعزم بچے پیدا کر کے تعلیم کو عام کرتے اور دنیا سے اپنا لوہا منواتے۔ دنیا کے سب سے بڑے خادم کی یاد تعمیری کام سے منائی جاتی ہے، صرف نعتیں پڑھ دینے سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کو ترقی نہیں پہنچ سکتی۔ باتوں سے نہیں عمل سے اسلام کا بول بالا کرو، مخلوق کی خدمت کے مواقع تلاش کرو۔ بچے کی صحت کی حفاظت ماں باپ کا مقدس فرض ہے۔ توانا جسم، تندرست رُوح کا مسکن ہے۔ جب جسم توانا اور رُوح تندرست ہو تو ارادہ دنیا کو مسخر کرنے نکلتا ہے ورنہ عزم چند قدم نکل کر مٹی کے ڈھیر پر بیٹھ جاتا ہے اور تیز رو مسافروں کو حسرت کی نظر سے دیکھتا ہے۔

صحرائی تربیت

عرب کی قوت کا انحصار تربیتِ اطفال پر تھا۔ ملک کا دستور تھا کہ قصبات کی بیبیاں بچہ پیدا ہوتے ہی دیہات میں اس کی تربیت کا انتظام کرتی تھیں تاکہ کھلی ہوا اور آزاد فضا میں جسم کی مناسب نشوونما ہو سکے اور ان میں مردانگی کے جوہر پیدا ہوں۔ آپؐ کی والدہ آمنہؓ نے پیدائش کے دو تین روز بعد دودھ پلانے کے لیے آپؐ کو ابولہب کی لونڈی ثوبیہ کے سپرد کر دیا کہ حسبِ دستور قبیلہ ہوازن کی عورتیں شہر میں آئیں تاکہ کوئی بچہ دودھ پلانے کے لیے اجرت پر مل جائے۔ عورتوں میں سے مائی حلیمہ بی بی آمنہؓ کے گھر آئی۔ یتیم جان کر سوچ میں پڑ گئی۔ تقدیر نے کہا: حلیمہ! گدڑی کو نہ دیکھ، اصل کو دیکھ، دین و دنیا کی دولت کو چھوڑ کر خالی ہاتھ نہ جانا۔ اس کے نام سے تیرا نام رہے گا۔ اس کی دایہ بن اور دنیا میں عزت حاصل کر۔ بی بی آمنہؓ نے جگر کے ٹکڑے کو جب مائی حلیمہ کے سپرد کیا ہوگا بیٹے کی جدائی کے تصور نے قلب میں قلق کے کتنے طوفان اٹھائے ہوں گے۔ بی بی آمنہؓ نے نورِ نظر کی صحت و سلامتی کے لیے دعائیں مانگیں۔ خدا کی برکتیں قریش کے گھر سے نکل کر ہوازن کے قبیلہ میں داخل ہوگئیں، جو موتی ریت کی تہہ میں پائے جاتے ہیں وہ دُرِ شاہوار بنتے ہیں۔ مٹی اور پتھروں میں دبے ہوئے ہیرے کوہ نور کہلاتے ہیں۔

آمنہؓ کا لالؐ

دیکھو سعید الفطرت بچہ قدرت کے مکتب میں تعلیم پا رہا ہے۔ اب پانچ برس کی عمر ہے رضاعی بہن شیما کے ساتھ بھولی بھٹکی بھیڑ بکریوں کے ساتھ پھرتا ہے اور انھیں گلہ میں واپس لانے میں مدد دیتا ہے۔ جب ایک بھیڑ بکری کو گھیر کر واپس لاتا ہے تو اسے دنیا مسرت سے بھری ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

کھلی ہوا اور بکریوں کے پیچھے دوڑ دھوپ نے بچے کے ہاتھ پاؤں مضبوط کر دیے۔ جب چھ برس کے بعد بچہ گھر لوٹا تو ماں نازک پودے کو مضبوط پا کر باغ باغ ہو گئی۔ کیونکہ مضبوط بازو ہی تو بچے کی آئندہ کامرانیوں کا عنوان ہے۔ شوہر کی موت کے بعد بیوہ کے لیے دنیا میں اس سے زیادہ خوشی اور اطمینان کی بات کیا ہے کہ وہ اس کی چھوڑی ہوئی نشانی کو ساتھ لے کر خاوند کی قبر کے سرہانے کھڑی ہو اور آنسوؤں کے موتی نذر کر دے۔

یتیمِ مکہ

آمنہؓ چھ برس کے یتیم بچے کو ہمراہ لے کر خاوند کی قبر کی زیارت کو گئیں۔ مہینہ سے زاید مدینہ میں ننھیال رہیں۔ کسی سیرت نگار نے ذکر نہیں کیا کہ کتنی دفعہ اپنے جگر گوشہ کو ساتھ لے کر آنسوؤں کا انمول تحفہ چڑھانے مرقد پر حاضر ہوئیں۔ ہاں صرف اتنا بتایا جاتا ہے کہ عمر میں جوان غم میں بوڑھی بیوہ واپسی پر مقامِ ابوا میں انتقال کر گئیں۔ آمنہؓ کی لونڈی ام ایمن اپنے یتیم آقا اور دوجہان کے سردار کو لے کر مکہ پہنچی اور آنحضرتؐ دادا کے سایۂ عاطفت میں پرورش پانے لگے۔ دو سال کے بعد آپؐ کے دادا عبدالمطلب ۸۲ سال کی عمر میں اس جہانِ فانی سے عالمِ جاودانی کو سدھار گئے۔ آنحضرتؐ فرطِ محبت سے غم کے آنسو روئے، باپ کے بعد ماں، ماں کے بعد دادا بھی وہاں جا رہے ہیں جہاں سے لوٹ کر کوئی نہیں آیا۔ ان چھوڑ کر جانے والوں کے لیے آنسو بہانے کے سوا انسان کے بس میں اور کیا ہے، اس جہان سے جانے والو! تمھارے لیے رونا بھی فضول اور خاموش رہنا بھی ناممکن۔ عبدالمطلب نے مرتے وقت اس گنج گراں بہا کو اپنے بیٹے ابو طالب کے سپرد کر دیا۔ ابو طالب جناب عبداللہ کے ماں جائے بھائی تھے، جواں مرگ بھائی کی موت کا صدمہ بھتیجے کو دیکھ کر دور ہو جاتا تھا۔ ابو طالب کثیر الاولاد اور قلیل المال تھے، اس لیے آپؐ کو بکریاں چرانے پر لگایا گیا۔ یہ پیشہ اکثر نیک لوگوں کے لیے بابرکت ثابت ہوا ہے، یہ دین و دنیا کی فتح مندیوں کی تمہید ہے، نبوت کا حقدار اور نیکی کا حامل وہی ہے، جو مخلوق کی محبت میں سرشار ہو کر عناصر کو فنا کرنے کی قابلیت رکھتا ہو، جو اس کی ترقی اور خوشی میں حائل ہوں اس کے جسم اور روح کی بالیدگی قوموں کی رہنمائی کی ذمہ داری اٹھا سکے، جسم اور روح کی ترقیوں کی حدِ کمال کا نام ہی پیغمبری ہے۔

دینِ حنیف کا آخری معمارؐ

آپؐ کی عمر بارہ برس کی تھی کہ ابو طالب تجارت کی غرض سے شام کے سفر کو چلے آپؐ چچا سے لپٹ گئے ابو طالب کو آپؐ سے

خاص انس تھا۔ چنانچہ ابوطالب نے اس خیال سے کہ بچہ کا دل نہ ٹوٹے، آپؐ کو ساتھ لے لیا، آپؐ نے اس کے بعد شام، بصرہ، یمن کے متعدد سفر کیے۔ جب آپؐ کی عمر بیس سال کی تھی تو قریش اور قیس کے قبیلوں کی مشہور لڑائی میں آپؐ نے شرکت کی لیکن آپؐ نے کسی پر ہتھیار نہیں اٹھایا۔ سیرت کی کتابوں میں مرقوم ہے کہ بعض لوگوں کو کعبہ کی از سرِ نو تعمیر کا خیال ہوا۔ قبائل نے تعمیر کے باہم حصے تقسیم کر لیے۔ حجرِ اسود کا موقع آیا تو اس شرف کو حاصل کرنے کے لیے تلواریں کھنچ گئیں۔ بالآخر دعویداروں نے خون کے بھرے ہوئے پیالوں میں انگلیاں ڈبو ڈبو کر جان لڑا دینے کی قسمیں کھائیں۔ ایک بزرگ نے تجویز کی کہ جو سب سے پہلے حرم میں کل صبح آئے اس کی تجویز مان لی جائے سب سے پہلے حرم پاک میں آپؐ ہی تشریف لائے، آپؐ نے چادر بچھا کر قبیلہ کے ہر سردار کو حجرِ اسود کو اٹھا کر مقررہ جگہ پر رکھنے کے لیے کہا۔ خدا کے گھر کا یہ آخری معمار دینِ حنیف کی عمارت کو بھی پایۂ تکمیل تک پہنچانے والا ثابت ہوا۔ دین کی عمارت اس کے ہاتھوں ایسی مکمل ہوئی کہ دوبارہ نقش و نگار کی ضرورت نہ رہی۔

قدوسیت کا شاہکار

کون ایسا باکمال مصور ہے جو اپنے قلم کی جنبشوں سے عرب کے ایک پاکباز انسانؐ کی تصویر کھینچے، جس سے دنیا پارسائی کا سبق لے۔ جس کے لب قہقہہ سے نا آشنا ہوں، جس کا ہلکا تبسم اندھیرے کو اُجالا کر دے۔ ہاں مصور! رنگوں کی آمیزش میں اعتدال پیدا کرنا کہ پاک صورت میں نیک سیرت اس طرح جھلکتی نظر آئے کہ تصویر نور کی تنویر دکھائی دے۔

کون ایسی تصویر بنائے جو مادیت کی آلودگیوں سے پاک ہو اور اس پر وجدانی کیفیت اور روحانی سکوت طاری ہو، وہ سادہ لباس میں ہو مگر آنکھوں میں قناعت کی کائنات بھری ہو، اس کی بھرپُور جوانی اور مناسب اعضا، اور محتاط عادات محفوظ زندگی کی شہادت دیتے ہوں، قد درمیانہ ہو تاکہ نہ وہ کسی کو کمتر سمجھے اور نہ کوئی اسے حقارت کی نظر سے دیکھے، جس کے رنگ میں اعتدال ہو تاکہ افریقہ کے کالے اور یورپ کے گورے کے لیے اس میں محبوبیت ہو، اور دنیا کا نقشہ پاؤں تلے اس طرح بچھا رکھا ہو کہ رحمت کی ہواؤں سے اس کا دامنِ کرم اڑتا اڑاتا تمام عرب و عجم کو اپنے سایہ میں لے لے، جوانی زندگی کی شگفتہ بہار ہے۔ نقرئی چاندنی کی سرمستی و سرشاری میں حسن دعوتِ لطف اندوزی دیتا ہے، اس زہد شکن موسم میں توبہ بھی پیغمبری ہے، یہ صرف ان انسانوں کا کام ہے جن کی شان ادراک کی سرحد سے پار ہے، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایسی فطرت سعید کے مالک تھے کہ کبھی جذبات بے قابو نہ ہوئے دوست ان کے کیرکٹر کی عظمت کو دیکھ کر دنگ رہ گئے، دشمن ان کی پاکبازی کے معترف ہو گئے۔ جس ملک میں حُسن بے نقاب کو کھلے بندوں متاعِ ایمان پر ڈاکہ ڈالنے کی اجازت ہو، عشق کی کشاکش سے بچ نکلنا خاص سعادت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جوانی شبنمِ صبح کی طرح تمام آلودگیوں سے پاک تھی، اس پاکباز پر بڑھاپے میں الزام نزاشنا مخالفوں کی ذہن دشمنی ہے۔

اُمّی نبیؐ کا مفہوم

پروفیسر عبدالقیوم

قرآن مجید میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بکثرت ذکر آتا ہے کہیں تو آپؐ کے منصب کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ کہیں آپؐ کے اخلاق حسنہ اور خصائل حمیدہ کا ذکر فرمایا، کہیں آپؐ کی عبادات کا تذکرہ کیا، کہیں آپؐ کو رحمت عالم قرار دیا، کہیں گھریلو معاملات کی طرف اشارات کئے، کہیں آپؐ کے جنگی معرکوں کی تفصیلات بیان فرمائیں، کہیں آپ کے القاب کا ذکر فرمایا۔ اسی طرح چند ایک مقامات پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اُمّی لقب سے بھی یاد کیا گیا ہے۔ فرمایا:

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ - الآیۃ (سورۃ الاعراف آیت ۱۵۷)

یعنی وہ لوگ جو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو اُمّی نبی ہیں پیروی کرتے ہیں، جن کے اوصاف کو وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں۔

پھر اسی سورت کی اگلی آیت (۱۵۸) میں فرمایا:

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ الَّذِیْ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ

یعنی اے لوگو! خدا پر اور اس کے رسول اُمّی نبی پر جو خدا پر اور اس کے تمام کلام پر ایمان رکھتے ہیں، ایمان لاؤ اور ان کی پیروی کرو تاکہ تم ہدایت پاؤ۔

سورۃ الجمعۃ میں فرمایا:

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝ (آیت نمبر۲)

یعنی وہی ذات تو ہے جس نے اَن پڑھوں میں، انہی میں سے حضرت محمدؐ کو پیغمبر بنا کر بھیجا جو ان کے سامنے اللہ کی آیات پڑھتے ہیں اور انہیں قرآن و سنت کی تعلیم دیتے ہیں اور اس سے پہلے یہ لوگ صریح گمراہی میں تھے۔

اس کے علاوہ قرآن مجید نے اُمّی کا لفظ سورۃ بقرہ میں آیت نمبر ۷۸ میں ذکر کیا۔ سورۃ آل عمران آیت نمبر ۲۰ اور آیت نمبر ۷۵ میں بھی ذکر فرمایا ارشاد ہوتا ہے:

وَمِنْهُمْ اُمِّیُّوْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِیَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ (البقرہ ۷۸)

یعنی بعض ان میں اَن پڑھ ہیں کہ اپنے خیالاتِ باطل کے سوا خدا کی کتاب سے واقف ہی نہیں اور وہ صرف ظن سے کام لیتے ہیں۔

سورۃ آل عمران کے مقامات بھی ملاحظہ ہوں، آیت نمبر ۲۰ میں فرمایا:

وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ الْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ — یعنی اہل کتاب اور اَن پڑھ لوگوں سے کہو کہ کیا تم بھی اسلام لائے ہو؟

پھر آیت نمبر ۷۵ میں فرمایا:

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ — یعنی اہل کتاب امانت میں خیانت اس لیے کرتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ اُمی لوگوں کے بارے میں ہم سے مؤاخذہ اور بازپرس نہیں ہوگی

ان مقامات کو پیش نظر رکھتے ہوئے لفظ امی کی تشریح و توضیح کے لئے کتب لغت، تفسیر، حدیث اور تاریخ و سیرت کی ورق گردانی کرنی چاہیے۔

عربی زبان کی سب سے مستند اور ضخیم لغت ابن منظور افریقی کی "لسان العرب" ہے۔ یہ لغت اتنی بڑی ہے کہ شاید ہی کسی اور زبان کی لغت اس کی وسعت اور پھیلاؤ کا مقابلہ کر سکے۔ لسان العرب (جلد ۱۲، صفحہ ۳۴) میں اَلْاُمِّیُّ کی تشریح کرتے ہوئے مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اس کا مفاد درج ذیل ہے:

اَلْاُمِّيُّ الَّذِي لَا يَكْتُبُ — یعنی امی وہ ہے جو لکھنا نہ جانے۔

پھر اور وضاحت کی کہ یہ لکھنا اکتسابی ہے۔ بعد ازاں حدیث سے سند پیش کرتے ہوئے عبارت نقل کرتے ہیں:

(۱) اِنَّا اُمَّةٌ اُمِّيَّةٌ لَا نَكْتُبُ وَلَا نَحْسُبُ — یعنی ہم اَن پڑھ لوگ ہیں، نہ لکھنا جانتے ہیں نہ حساب۔

(۲) بُعِثْتُ اِلٰى اُمَّةٍ اُمِّيَّةٍ — یعنی میں ایک اَن پڑھ قوم میں مبعوث ہُوا ہوں۔

پھر لسان العرب کے مصنف لکھتے ہیں کہ عربوں کو اس لئے امی کہتے تھے کہ ان میں لکھنے کا رواج بڑا نادر تھا۔

بعد ازاں اپنی تائید میں بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ والی قرآنی آیت پیش کرتے ہیں اور اس کی تفسیر و تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سیدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اُمّی لقب سے یاد کیا جاتا ہے کیونکہ عرب قوم لکھنا پڑھنا نہیں جانتی تھی اور اللہ تعالےٰ نے آنحضرتؐ کو رسول بنا کر بھیجا اور آپؐ بھی لکھ پڑھ نہیں سکتے تھے۔ وَبَعَثَهُ اللّٰهُ رَسُوْلًا وَ هُوَ لَا يَكْتُبُ وَلَا يَقْرَأُ مِنْ كِتَابٍ۔ سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے ابن منظور لکھتے ہیں کہ البتہ تلاوتِ قرآن آپؐ کا ایک معجزہ تھا۔ جب بھی آپؐ تلاوت فرماتے، نہ تو کبھی الفاظ کا ردّ و بدل ہوتا اور نہ زیر و زبر میں فرق آتا۔

صاحبِ لسان العرب کی اس وضاحت کے بعد آیئے قدیم و جدید اور مشرق و مغرب کے مفسروں سے پوچھیں کہ ان کے ذہن میں اُمّی کا کیا مفہوم ہے؟

ہمارے قدیم ترین مفسروں میں علامہ ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ) کے نام نامی سے کون واقف نہیں۔ ان کی تفسیر "جامع البیان فی تفسیر القرآن" تفسیر علوم کا خزانہ ہے۔ امام ابن جریر طبری اُمِّيُّوْنَ (جمع اُمّیّ کی) کا مفہوم یوں قلمبند کرتے ہیں: اَلَّذِيْنَ لَا يَكْتُبُوْنَ وَلَا يَقْرَءُوْنَ (جلد ۱، صفحہ ۲۵۷) یعنی وہ لوگ جو نہ لکھ سکیں نہ پڑھ سکیں۔ اسی جلد کے صفحہ ۲۵۹ پر لکھتے ہیں اَلْاُمِّيُّ عِنْدَ الْعَرَبِ هُوَ الَّذِيْ لَا يَكْتُبُ یعنی عربوں کے نزدیک امی وہ شخص ہے جو لکھنا نہ جانتا ہو۔

مصر جدید کے دو جید عالم محمود محمد شاکر اور احمد محمد شاکر اتنے فضیلت مآب اور وسیع النظر بزرگ ہیں کہ اس دور میں ان کی نظیر عالم اسلامی

میں طنی محال ہے، یہ عقابی نگاہ رکھنے والے عالمانِ دین تفسیر طبری (طبع جدید) کے حاشیہ میں اس امر کی تحقیقی وضاحت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم لکھنا پڑھنا قطعاً نہ جانتے تھے (ملاحظہ ہو جلد ۱، صفحہ ۲۵۸)

ابن جریر طبری کے بعد علامہ جار اللہ زمخشری (متوفی ۵۳۸ھ) بڑا جید عالم اور عالی مرتبہ مفسر گزرا ہے۔ زمخشری اپنے زمانے میں تفسیر لغت، ادب اور نحو کا امام تھا۔ اس نے اپنی شہرۂ آفاق تفسیر الکشاف میں لفظ اُمّی کی تفسیر یوں کی ہے۔

اَلْاُمِّیُّ مَنْسُوْبٌ اِلَی الْعَرَبِ لِاَنَّھُمْ کَانُوْا لَا یَکْتُبُوْنَ وَلَا یَقْرَءُوْنَ مِنْ بَیْنِ الْاُمَمِ

(تفسیر کشاف جلد ۴، صفحہ ۹ طبع مصر ۱۳۵۴ھ)

یعنی امی کی نسبت عربوں کی طرف ہے کیونکہ وہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔

سورۃ الجمعہ کی اسی آیت کے سلسلے میں (یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ) رقمطراز ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم باقی عربوں کی طرح امی ہونے کے باوجود ان کے سامنے اللہ کی آیات تلاوت کرتے ہیں۔ حالانکہ عربوں کو معلوم تھا کہ آپ پڑھ نہیں سکتے اور نہ کبھی کسی استاد سے پڑھنا سیکھا تھا اور امی آدمی کا پڑھنا سیکھے بغیر تلاوت کر لینا ایک معجزہ ہے (حوالہ مذکور)

اندلس کا شہرۂ آفاق مفسر قرآن امام ابو عبد اللہ محمد بن احمد انصاری قرطبی (متوفی ۶۷۱ھ) اپنی ضخیم تفسیر "جامع الاحکام القرآن" میں وَمِنْھُمْ اُمِّیُّوْنَ (سورہ بقر: ۷۸) کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ اَیْ مَنْ لَا یَقْرَاُ وَلَا یَکْتُبُ واحدھم اُمِّیٌّ، مَنْسُوْبٌ الی الاُمَّۃِ الْاُمِّیَّۃِ ھِیَ عَلٰی اَصْلِ وِلَادَۃِ اُمَّھَاتِھَا، لَمْ تَتَعَلَّمِ الْکِتَابَۃَ وَلَا قِرَاءَتَھَا (تفسیر قرطبی، جلد ۲، صفحہ ۵)

یعنی امّی وہ جو نہ پڑھ سکے، نہ لکھ سکے۔ اُمّی کا لفظ ان پڑھ لوگوں کی طرف منسوب ہے۔ اُمّی وہ لوگ ہیں جو اسی حالت پر ہوں جس حالت میں ماؤں نے انھیں جنم دیا۔ انہوں نے نہ لکھنا سیکھا نہ پڑھنا۔

امام قرطبی سورۂ اعراف کی آیت ۱۵۷ کی تفسیر کرتے ہوئے امّی کی یہی تشریح لکھ کر فرماتے ہیں:

وقال ابن عباس رضی اللہ عنہ: کَانَ نَبِیُّکُمْ صلی اللہ علیہ وسلم اُمِّیًّا لَا یَکْتُبُ وَلَا یَقْرَاُ وَلَا یَحْسُبُ، قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: وَمَا کُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِہٖ مِنْ کِتَابٍ وَّلَا تَخُطُّہٗ بِیَمِیْنِکَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ (قرطبی، جلد ۷، صفحہ ۲۹۸)

یعنی حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ تمہارے پیغمبر اُمّی تھے آپ لکھنے پڑھنے اور حساب سے ناواقف تھے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا کہ اے پیغمبر! تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ لکھنا جانتے تھے، اگر ایسا ہوتا تو اہلِ باطل جو آپ کو جھٹلاتے ہیں ضرور شک کرنے لگتے۔ (سورۃ العنکبوت آیت ۴۸)

امام بیضاوی (قاضی عبد اللہ بن عمر) (متوفی ۶۸۵ھ) اپنی مشہور و معروف تفسیر میں سورۃ الجمعہ والی آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فِی الْاُمِّیّٖن کی توضیح یوں کرتے ہیں: اَیْ فِی الْعَرَبِ لِاَنَّ اَکْثَرَھُمْ لَا یَکْتُبُوْنَ وَلَا یَقْرَءُوْنَ یعنی اللہ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کو عربوں میں مبعوث فرمایا کیوں کہ ان کی اکثریت لکھنا پڑھنا نہ جانتی تھی۔ پھر رَسُوْلًا مِّنْھُمْ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ مِنْ جُمْلَتِھِمْ اُمِّیًّا مِثْلَھُمْ یعنی انہی عربوں میں سے انہی جیسا امّی (تفاسیر اربع ج ۶، صفحہ ۲۵۷، طبع مصر ۱۳۲۰ھ)

تفسیر خازن میں اسی آیت کے ضمن میں فاضل مفسر یوں رقم طراز ہے:

اَلْاُمِّیُّ ھُوَ الَّذِیْ عَلٰی مَا خُلِقَ عَلَیْہِ،
..... لَا تَکْتُبُ وَلَا تَقْرَاُ، وَکَانَتِ الْعَرَبُ اُمَّۃً اُمِّیَّۃً، العرب،

کَاَنَّہٗ مَنْسُوْبٌ اِلٰی اُمِّہٖ
یعنی اللہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عربوں میں مبعوث فرمایا، عرب اَن پڑھ قوم تھی، نہ لکھنا جانتے نہ پڑھنا۔ امی ماں کی طرف منسوب ہے
امی وہ ہے جو پیدائشی صلاحیتوں اور خصلتوں پر قائم رہے۔ پھر رَسُوْلًا مِّنْھُمْ کی تفسیر بیان کرتے ہیں: یعنی محمداً صلی اللہ علیہ وسلم یَعْلَمُوْنَ
نَسَبَہٗ، وَھُوَ مِنْھُمْ۔ وَقِیْلَ اُمِّیًّا مِثْلَھُمْ۔ وَاِنَّمَا کَانَ اُمِّیًّا لِاَنَّ نَعْتَہٗ فِیْ کُتُبِ الْاَنْبِیَاءِ : اَلنَّبِیُّ الْاُمِّیُّ۔ وَکَوْنُہٗ بِھٰذِہٖ
الصِّفَۃِ اَبْعَدُ مِنْ تَوَھُّمِ الْاِسْتِعَانَۃِ بِالْکِتَابَۃِ عَلٰی مَا اَتٰی بِہٖ مِنَ الْوَحْیِ وَالْحِکْمَۃِ (تفاسیر اربع ج ۴ صفحہ ۲۵ مصری)
یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو انہی عربوں میں سے رسولؐ بنا کر بھیجا۔ وہ آپؐ کے حسب نسب سے خوب واقف ہیں۔
نیز انہی جیسا اُمّی، آپؐ امّی اس لیے تھے کہ گزشتہ انبیاء کی کتابوں میں آپ کی ایک صفت "امّی نبی" بھی درج تھی۔ اور آپؐ کا اُمّی ہونا اس بات کی قطعی
شہادت تھی کہ قرآن و سنت وحی الٰہی ہے، آپؐ نے خود نہیں لکھا۔ آپؐ کے امّی ہونے کی وجہ سے خود لکھ لینے کے وہم کا ازالہ ہوگیا۔
تفسیر مدارک میں بھی اسی آیت کے ضمن میں فاضل مصنف نے یوں تحریر کیا ہے:
وَالْاُمِّیُّ مَنْسُوْبٌ اِلٰی اُمَّۃِ الْعَرَبِ لِاَنَّھُمْ کَانُوْا لَا یَکْتُبُوْنَ
اَیْ بَعَثَ رَجُلًا اُمِّیًّا فِیْ اُمِّیِّیْنَ .....
وَلَا یَقْرَءُوْنَ مِنْ بَیْنِ الْاُمَمِ۔ (تفاسیر اربع ج ۴ صفحہ ۲۵۷) یعنی اللہ تعالیٰ نے ایک امّی آدمی کو ان پڑھ لوگوں میں نبی بنایا۔ اور امّی
کی نسبت عرب قوم کی طرف ہے کیونکہ وہ باقی قوموں کی نسبت لکھنے پڑھنے سے ناواقف تھے۔
امام شوکانیؒ نے اپنی قابل قدر تفسیر "فتح القدیر" میں لفظ امّی کی تشریح بھی اسی طرح کی ہے وہ لکھتے ہیں کہ اُمّی کا لفظ "اُمّتِ
اُمِّیَّہ" کی طرف منسوب ہے اور یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو ایسے ہی رہیں جیسے ان کی ماؤں نے انھیں جنم دیا ہو۔ وہ نہ تو لکھنا سیکھیں اور نہ لکھا ہوا
پڑھ سکیں۔ آں حضرتؐ کی حدیث بھی اس طرف اشارہ کرتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا:
اِنَّا اُمَّۃٌ اُمِّیَّۃٌ لَا نَکْتُبُ وَلَا نَحْسُبُ (جلد اول، صفحہ ۸۷)
پھر سورۂ آلِ عمران کی آیت نمبر ۲۰ کی تفسیر کے سلسلے میں لفظ اُمِّیّٖنَ کا مفہوم لکھتے ہوئے حضرت ابن عباسؓ کے حوالہ سے لکھتے ہیں:
ھُمُ الَّذِیْنَ لَا یَکْتُبُوْنَ (جلد اول صفحہ ۲۹۷) یعنی امّی وہ لوگ ہیں جو لکھنا نہیں جانتے۔
اسی طرح شیخ علی المہائمیؒ اپنی نادر تفسیر تبصیر الرحمٰن میں رقمطراز ہیں کہ امّی لوگوں کو رسولؐ کی زیادہ ضرورت تھی اور امّی نبی سے بلند مرتبہ علوم
کا اظہار بطورِ معجزہ تھا تاکہ لوگ یقین کرلیں کہ یہ تعلیم الٰہی ہے، انسان کو اس میں کوئی دخل نہیں (جلد دوم صفحہ ۳۱۴ طبع مصر ۱۲۹۵ھ)
اب تک تو گفتگو نامور متقدمین اور متاخرین مفسروں کے گرد گھومتی رہی اور ان سب کا ایک مرکزی نقطے پر اتفاق ہے۔ آئیے اب
ذرا دورِ حاضر کے جانے پہچانے مفسروں سے بھی استصواب رائے کرلیں۔ بیسویں صدی کی مشہور عربی تفسیروں میں "تفسیر المنار" سرِفہرست ہے
یہ تفسیر درحقیقت مفتی محمد عبدہٗ کی تفسیر ہے جسے ان کے شاگرد رشید سید رشید رضا نے مرتب کیا ہے۔ اس تفسیر میں مرقوم ہے کہ النبی الاُمِّیُّ
نِسْبَۃٌ اِلَی الْاُمِّ وَالْمُرَادُ الَّذِیْ لَا یَقْرَاُ وَلَا یَکْتُبُ (تفسیر المنار جلد ۹ صفحہ ۲۲۴) یعنی امّی کی نسبت اُم (ماں) کی طرف ہے۔
مراد ہے وہ شخص جو لکھ پڑھ نہ سکے۔ پھر صفحہ ۲۲۵ پر فرماتے ہیں:

اَلْاُمِّيَّةُ آيَةٌ مِنْ اَكْبَرِ آيَاتِ نبوتہ

یعنی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اُمّی ہونا آپؐ کی نبوت کا بہت بڑا معجزہ ہے۔

دورِ حاضر کی دوسری مشہور اور ہر دلعزیز تفسیر "تفسیر المراغی" کی ہے۔ علامہ مراغی مرحوم جامع ازھر کے شیخ الشیوخ اور ناظم اعلیٰ رہے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

(۱) اُمِّیٌّ وَھُوَمَنْ لَایَقْرَأُ وَلَا یَکْتُبُ۔

(تفسیر المراغی جلد ۱ صفحہ ۱۴۴)

یعنی امّی وہ ہے جو لکھ پڑھ نہ سکے۔

(۲) فَاِنَّ رُجُلًا اُمِّیًا لَایَقْرَأُ وَلَا یَکْتُبُ وَلَمْ یَتَعَلَّمِ الْعِلْمَ وَلَمْ یُدَارِسْ اِنْسَانًا مَدیٰ حَیَاتِہٖ یَاْتِیْ بِھٰذِہِ الْحِکَمِ وَالْاَحْکَامِ۔

(جلد ۲۱ صفحہ ۴)

یعنی ایک اُمّی آدمی جو نہ لکھ سکے نہ پڑھ سکے اور کوئی علم بھی حاصل نہ کیا ہو اور عمر بھر کسی انسان کے سامنے زانوئے تلمذ بھی تہ نہ کیا ہو، ایسا امّی ایسے حکم احکام لائے تو اس کی نبوت میں کون اور کیوں کر شک کر سکتا ہے۔

جلد ۹ صفحہ ۱۸ پر اُمیّت کو نبوّت کا معجزہ قرار دیا ہے۔

عصرِ حاضر کی ایک مختصر مگر بڑی مقبول تفسیر مصر کے تین علما محمود حمزہ، حسن علوان اور احمد برانق نے "تفسیر القرآن الکریم" کے نام سے شائع کی ہے۔ اس تفسیر میں مرقوم ہے:

اَلْاُمِّیُّ الَّذِیْ لَایَقْرَأُ وَلَا یَکْتُبُ

(جلد ۹ صفحہ ۵۹/۶۰)

امّی وہ ہے جو لکھ پڑھ نہ سکے۔

عصرِ حاضر کا ایک اور نامور مصری عالم اور شہرہ آفاق مصنف استاد ابوزہرہ ہے جو بہت سی کتابوں کا مصنف ہے اور جس کی کئی ضخیم کتابوں کے اُردو تراجم لاہور سے شائع ہو چکے ہیں، مصر کے کلیۃ الحقوق (لا کالج) میں اسلامی فقہ کا مشہور استاد ہے یہ مصری عالم اپنی ایک گرانقدر تصنیف میں ضمناً امّی کے معانی پر بھی روشنی ڈالتا ہے:۔

(۱) فَاَسَاسُھَا اَنَّ الْقُرْآنَ الْکَرِیْمَ تَقُوْلُ فِیْ قَوْمٍ اُمِّیِّیْنَ لَایَقْرَءُوْنَ وَلَا یَکْتُبُوْنَ۔

(مصادر الفقہ الاسلامی صفحہ ۱۳)

اس عبارت میں بھی امّی کا مفہوم یہ بتایا ہے کہ جو لکھ پڑھ نہ سکے۔

(۲) وکُلُّ ھٰذَا جَاءَ عَلٰی لِسَانِ اُمِّیٍّ لَایَقْرَأُ وَلَا یَکْتُبُ، لَمْ یَجْلِسْ اِلٰی مُعَلِّمٍ (حوالہ مذکور صفحہ ۲۱، ۲۳) یعنی یہ سب کچھ اس امی کی زبان سے نکلا جو لکھ پڑھ نہ سکتا تھا اور نہ کسی استاد کے پاس بیٹھا تھا۔)

(۳) وَھٰذَا کُلُّہٗ جَاءَ عَلٰی یَدِ اُمِّیٍّ لَمْ یَقْرَأْ وَلَمْ یَکْتُبْ (صفحہ ۲۵) یہ سب کارنامہ اس امّی کا ہے جو لکھ پڑھ نہ سکتا تھا۔

بخاری، مسلم، ابوداؤد اور نسائی وغیرہ کتب احادیث میں بھی اس امر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اوپر ایک دو احادیث کا ذکر آ چکا ہے۔

اب ذرا سیرت کی کتابوں کا جائزہ لیجیے اور دیکھیے کہ سیرت النبیؐ پر لکھنے والے مؤرخ کس چیز کی شہادت بہم پہنچاتے ہیں۔

ابن حزم اندلسی (۳۸۴ - ۴۵۶ھ) مشہور سیرت نگار، حدیث دان اور فقیہ ہے۔ وہ اپنی سیرت میں یوں رقمطراز ہے:-

وھوصلی اللہ علیہ وسلم اُمّیٌّ لایقرأ ولا یکتب ونشأ فی بلاد الجھل والصحاریٰ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم امی تھے، آپ لکھنا پڑھنا نہ جانتے تھے، آپ نے جاہل ملک اور صحراؤں میں نشوونما پائی۔

(جوامع السیرۃ طبع مصر صفحہ ۴۳)

علامہ سہیلی (متوفی ۵۸۱ھ) مشہور امام، محدث، اور فقیہ ہیں۔ اپنی مشہور و معروف کتاب "الروض الانف" میں صلح حدیبیہ (۶ھ) کے ذکر میں آں حضرت صلعم کے امی ہونے پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آپ نے رسول اللہ کا لفظ اپنے ہاتھ سے مٹا کر محمد بن عبداللہ لکھنے کا حکم دیا۔

(جلد دوم صفحہ ۲۳۰ - طبع مصر ۱۹۱۴ء)

یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ حدیث اور تاریخ کی بعض کتابوں جن میں بخاری اور ابن خلدون بھی شامل ہیں کَتَبَ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ امام سہیلی نے صاف لکھ دیا ہے کہ کَتَبَ کا مفہوم ہے اَمَرَ اَنْ یُّکْتَبَ یعنی جہاں کہیں "لکھا" مرقوم ہے اس سے مراد محض یہ ہے کہ حکم دیا کہ لکھا جائے۔ اس کی تائید امام قرطبی نے بھی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب حدیبیہ کا صلح نامہ لکھا جانے لگا تو قریش کے نمائندہ سہیل بن عمرو نے "محمد رسول اللہ" کے جملے پر اعتراض کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جملہ اپنے ہاتھ سے مٹا دیا۔ اور اس کی جگہ محمد بن عبداللہ لکھا گیا۔

(تفسیر قرطبی جلد ۱۳ صفحات ۳۵۱ - ۳۵۲)

امام ابن حزم نے بھی یہی لکھا ہے کہ آپؐ نے "محمد رسول اللہ" اپنے ہاتھ سے مٹا دیا اور کاتب کو حکم دیا کہ وہ محمد بن عبداللہ لکھے۔

(جوامع السیرۃ صفحہ ۲۰۹)

تمام مورخوں اور سیرت نگاروں کا اس بات پر اتفاق ہے۔

علامہ زرقانی کے شرح مواھب اللدنیہ میں اس موضوع پر بڑی طویل اور عالمانہ بحث کی ہے۔ اس دلچسپ اور محققانہ بحث کا مفاد یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم امّی تھے۔ آپؐ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے صلح حدیبیہ کے موقعے پر حضرت علیؓ کے بتانے پر آپؐ نے "رسول اللہ" کے الفاظ مٹا کر ابن عبداللہ لکھنے کا حکم دیا۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے عبارت یوں بنا دی۔ محمد بن عبداللہ۔

پھر وہ ایک دلچسپ واقعہ لکھتے ہیں کہ امام بخاریؒ کی ایک روایت کے ظاہر الفاظ کی بنا پر اندلس کے ایک عالم ابوالولید باجی (۴۰۳ھ - ۴۷۴ھ) نے اس بات کا اظہار کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے ابن عبداللہ تحریر فرمایا تھا بس اتنا کہنا تھا کہ اندلس میں ایک ہنگامہ بپا ہوگیا اور علمائے اندلس نے اس پر زندیق کا فتویٰ لگاتے ہوئے اس کے اس عقیدے کو قرآن مجید کے صریح خلاف قرار دیا۔ چنانچہ ابوالولید باجی نے اس موضوع پر ایک خط کے ذریعے مصر، شام اور عراق کے علما سے فتویٰ پوچھا۔ اس کے جواب میں جمہور علماء نے یہ فتویٰ دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے قطعاً نہیں لکھا تھا بلکہ بخاری کے الفاظ بطریق مجاز ہیں یعنی لکھنے کا حکم دیا تھا۔

نویں صدی ہجری میں مصر کے مشہور مورخ و سیرت نگار اور محدث و فقیہ علامہ سخاوی بھی اپنی نادر کتاب الاعلام (صفحہ ۱۶) میں امام ابو اسحاق احمد بن محمد الثعالبی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم امّی تھے۔ آپؐ نے کسی مؤدب اور معلم کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ نہیں کیا تھا۔ مکہ مکرمہ سے باہر بھی کسی شخص سے لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے گزشتہ انبیاء اور امم سابقہ کے احوال قرآن مجید میں ذکر کیے تو عرب کے عقلمند

لوگوں نے غور و فکر کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ حالات اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی و الہام آپ پر نازل ہوئے ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ آپؐ پر ایمان لائے اور آپ کی تصدیق کرنے لگے اور یہ بھی معجزات نبوت میں سے ہے۔

ان ساری معروضات کا خلاصہ یہ ہے:-

۱۔ امّی کا مفہوم ہے، ایسا شخص جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو۔

۲۔ عرب قوم کی بھاری اکثریت لکھنے پڑھنے سے عاری تھی۔

۳۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔

۴۔ تمام مفسروں، مؤرخوں اور سیرت نگاروں کا اس بات پر اتفاق ہے۔

ان حالات کے پیش نظر یہ بات کتنی قابل اعتنا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی اَن پڑھ قوم کو کتنے علوم کا حامل بنا دیا۔ علم کا شوق دلایا۔ لکھنے پڑھنے کو رواج دیا۔ علم و ادب اور تہذیب و ثقافت کی بنیاد رکھ کر بام عروج تک پہنچایا۔ نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ علم و فن کا وہ کون سا گوشہ ہے جس میں امّی نبی کی امت نے گہرے نقوش مرتسم نہیں کیے۔

بارگاہِ نبویؐ میں

سیّد ابو الحسن علی ندوی

مورخین اور مصنفین کو خدا معاف کرے، مقدس سے مقدس مقامات اور افضل سے افضل اوقات میں بھی یہ تاریخی ذوق اور طرزِ فکر ان کا ساتھ نہیں چھوڑتا اور وہ چند لمحات کے لئے بھی اس سے آزاد نہیں ہو پاتے، وہ جہاں بھی ہوتے ہیں اپنے علم و مطالعہ کی فضا میں سانس لیتے ہیں اور حال کا رشتہ ہمیشہ ماضی سے جوڑنا چاہتے ہیں، مناظر کو دیکھ کر ان کا ذہن بہت جلد اس تاریخی منظر کی تلاش میں نکل جاتا ہے جن کے نتیجہ میں ان مناظر کا وجود اور نمود ہے۔

مجھے کل روضۂ نبویؐ کی زیارت نصیب ہوئی۔ میرے چاروں طرف نمازیوں اور عبادت گزاروں کا زبردست مجمع تھا ان میں کچھ لوگ سجدے میں تھے اور کچھ رکوع میں تلاوتِ قرآن کی آوازیں فضا میں اس طرح گونج رہی تھیں جس طرح شہد کی مکھیاں اپنے چھتہ میں بھنبھنا رہی ہوں، اس وقت کا سماں کچھ ایسا تھا کہ مجھے تاریخ اور تاریخی شخصیات کو تھوڑی دیر کے لئے فراموش کر دینا چاہئے تھا، لیکن تاریخ کی قدیم یادیں بادلوں کی طرح میرے دل و دماغ پر چھا گئیں اور میرا ان پر کوئی زور نہ چل سکا۔

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس امت کی نامور شخصیتوں اور رہنماؤں کو ایک نئی زندگی عطا کی گئی ہے۔ اور وہ وفود کی شکل میں یکے بعد دیگرے بارگاہِ نبویؐ میں حاضر ہو رہے ہیں اور اسی عظیم مسجد میں فریضۂ نماز ادا کرنے کے بعد اسی عظیم نبیؐ کو ہدیۂ سلام اور خراجِ عقیدت و محبت پیش کر رہے ہیں اور اس کے احسان کا اعتراف کر رہے ہیں اور (طبقاتی اختلاف کے باوجود) اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ یہی وہ نبیؐ ہیں جنھوں نے اللہ کے حکم سے ان کو ظلمت سے روشنی کی طرف، تیرہ بختی سے خوش بختی کی طرف، مخلوق کی عبادت سے خدائے واحد کی عبادت کی طرف اور مذاہب کے ظلم و استبداد سے اسلام کے عدل و انصاف کی طرف اور دنیا کی تنگی سے اس کی کشادگی کی طرف نکالا، وہ اعتراف کر رہے ہیں کہ وہ اسلام ہی کی پیداوار ہیں، اور ان کا سارا وجود اور زندگی نبوت کی مرہونِ منت ہے، اگر خدانخواستہ ان سے وہ سب واپس لے لیا جائے جو اللہ تعالیٰ نے ان کو اس نبیؐ کے ذریعہ عطا کیا تھا اور نبوت کے وہ عطیے ان سے چھین لئے جائیں جنھوں نے دنیا میں ان کو عزت و سرفرازی بخشی تھی تو ان کی حیثیت ایک بے روح اور بے جان ڈھانچے اور چند مبہم اور بے مقصد خطوط و اشکال سے زیادہ نہ رہ جائے گی اور وہ تاریخ کے تاریک ترین عہد جنگلیوں کے قانون اور رہزنوں اور لٹیروں کی حکومت کی طرف واپس چلے جائیں گے اور موجودہ تہذیب و تمدن کا نام و نشان تک مٹ جائے گا۔

اچانک میری نگاہ ایک طرف اُٹھ گئی، میں نے دیکھا کہ بابِ جبریل سے (جو مجھ سے سب سے زیادہ قریب تھا) ایک جماعت داخل ہو رہی ہے، سکون و وقار میں ڈوبے ہوئے ان کی پیشانی سے علم کا نور اور ذہانت کی روشنی

صاف عیاں تھی، وہ باب الرحمۃ اور باب جبریل کے درمیانی حصے میں پھیل گئے، وہ اتنی بڑی تعداد میں تھے کہ ان کے شمار کا کوئی سوال نہیں تھا۔ میں نے دربان سے پوچھا کہ:۔ یہ لوگ کون ہیں؟ اس نے کہا کہ: اس اُمت کے امام اور رہنما انسانیت کے محسن اور نوعِ انسانی کے ممتاز اور قابلِ فخر نمونے ہیں، ان میں سے ہر ایک پوری پوری قوم کا امام، پورے پورے کتب خانہ اور مکتبِ فکر کا بانی اور موسس پوری نسل کا مربی اور ہر علم و فن کا موجد ہے ان کے لازوال آثار اور لافانی شاہکار اور نمونے آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں، ان کے علم و اجتہاد اور تحقیق کی روشنی میں کئی کئی نسلوں نے سفرِ زندگی طے کیا ہے، اس نے عجلت کے ساتھ چند ہستیوں کے نام بھی مجھے بتا دیئے:۔ حضرت مالک بن انسؓ، امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ امام احمد بن حنبلؒ، لیث بن سعد مصری، امام اوزاعی، امام بخاری، امام مسلم، تقی الدین بن تیمیہ، ابن قدامہ، ابواسحاق الشاطبی کمال ابن الہمام، شاہ ولی اللہ دہلوی، یہ لوگ تھے جنہوں نے زمان و مکان کے تفاوت اور فرقِ مراتب اور اختلافِ درجات کے ساتھ بارگاہِ نبویؐ میں خراجِ عقیدت پیش کیا اور اشکِ ندامت نذر کئے۔

میں نے دیکھا کہ سب سے پہلے انہوں نے تحیۃ المسجد کی دوگانہ بہت خشوع و خضوع اور حضوریِ قلب کے ساتھ ادا کی، پھر بہت ادب اور تواضع کے ساتھ قبرِ مبارک کی طرف بڑھے، اور بہت جچے تلے مختصر، معانی سے لبریز، گہرے اور پُر مغز کلمات کے ساتھ سلام پیش کیا، مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی آواز اس وقت بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہے، اُن کی آنکھوں میں آنسو تھے اور آواز میں رقت، وہ کہہ رہے تھے:۔

"یارسول اللہؐ! اگر آپ کی لازوال، وسیع اور جامع، عادلانہ اور کشادہ شریعت نہ ہوتی اور اس کے وہ اصول نہ ہوتے جن سے انسانی ذہن اور انسانی صلاحیت نے نئے نئے گل بوٹے پیدا کئے اور زمین کا دامن بیش قیمت اور عطر بیز پھولوں سے بھر دیا اور اس کا وہ حکیمانہ اور معجزانہ نظام نہ ہوتا جس نے انسانی فکر و تدبر اور اخذ و استنباط کی صلاحیت کو پیدا کر دیا، اور اگر انسانیت کو اس کی احتیاج نہ ہوتی تو نہ اس عظیم فقہ کا کوئی وجود ہوتا نہ اس عظیم اسلامی قانون سے کوئی واقف ہوتا جس سے اس وقت ہر قوم کا دامن خالی تھا، نہ اتنا بڑا اسلامی کتب خانہ وجود میں آتا جس کے سامنے دنیا کا سارا مذہبی لٹریچر ہیچ ہے ———
اگر علم کی اشاعت اور خدا کی نشانیوں اور اس کی قدرتِ کاملہ میں غور و فکر اور استعمالِ عقل کے لئے آپ جدوجہد نہ فرماتے تو یہ شجرِ علم زیادہ دنوں تک برگ و بار نہ لا سکتا، اور نہ اس کی وہ اشاعت ہوتی جو آج نظر آ رہی ہے، عقلِ انسانی پہلے کی طرح پا بہ زنجیر ہوتی اور دُنیا استفادہ سے محروم۔"

میں اس جماعت کو جی بھر کر دیکھ بھی نہ سکا تھا کہ میری نظر ایک دوسرے گروہ پر پڑی جو باب الرحمۃ سے ہو کر اندر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ صلاح و تقویٰ اور زہد و عبادت کے آثار ان کے چہروں سے صاف ظاہر تھے مجھے بتایا گیا کہ اس

جماعت میں حسن بصری، عمر بن عبدالعزیز، سفیان ثوری، فضیل بن عیاض، داؤد الطائی ابن السماک، شیخ عبدالقادر جیلانی، نظام الدین اولیاءؒ اور عبدالوہاب المتقی جیسے حضرات بھی رونق بخش ہیں۔ جنھوں نے اپنے قابلِ رشک پیشروؤں کی یاد تازہ کر دی۔ نماز کے بعد یہ لوگ بھی قبرِ مبارک کے سامنے کھڑے ہوئے اور اپنے نبی و پیشوا اور سب سے بڑے معلم اور رہنما کو درود و سلام کا تحفہ پیش کرنے لگے، وہ کہہ رہے تھے :-

"یا رسول اللہ ! اگر ہمارے سامنے وہ عملی مثال نہ ہوتی جو آپ نے پیش فرمائی تھی اور وہ مینارۂ نور نہ ہوتا جس کو آپ نے بعد کے آنے والوں کے لئے قائم فرمایا تھا، اگر آپ کا یہ قول نہ ہوتا کہ : "اے اللہ! زندگی تو آخرت کی زندگی ہے "؛ اگر آپ کی یہ وصیت نہ ہوتی کہ :" دنیا میں اس طرح زندگی گذارو جس طرح کوئی مسافر یا راہی زندگی گذارتا ہے "؛ اگر زندگی کا وہ طرز نہ ہوتا جس کا ذکر حضرت عائشہؓ نے اس طرح کیا ہے کہ :" ایک چاند کے بعد دوسرا چاند اور دوسرے کے بعد تیسرا چاند نکل آتا تھا اور آپ کے گھر میں نہ آگ جلتی تھی نہ چولھے پر دیگچی چڑھانے کی نوبت آتی تھی "؛ تو ہم دنیا پر اس طرح آخرت کو ترجیح نہ دے سکتے، اور نہ ان ضروریاتِ زندگی پر قناعت کرتے جو زندگی و صحت کی بقا کے لئے ناگزیر ہیں؛ نہ ہم نفس کی ترغیبات پر قابو پا سکتے، اور نہ دنیا کے حسن و جمال اس کی رعنائی و زیبائی اور عہدہ و منصب کی طاقت اور کشش کا اس طرح مقابلہ کر سکتے "۔

ان کے حکیمانہ الفاظ ابھی پوری طرح میرے دل و دماغ میں پیوست بھی نہ ہوئے تھے کہ میری نظر ایک اور گروہ پر پڑی، جو "باب النساء" سے بہت حجاب اور ادب کے ساتھ گزر رہا تھا ظاہری آرائش اور آزادروی کے ان مناظر سے جو اسلامی اصول و آداب کے منافی ہیں یہ گروہ بالکل محفوظ اور خالی تھا، یہ مختلف قوموں اور دور دراز ملکوں کی صالح عبادت گذار اور عفیف خواتین تھیں جو عرب و عجم اور مشرق و مغرب کے مختلف خطوں سے تعلق رکھتی تھیں، بہت دبی زبان میں اور پورا ادب و احترام ملحوظ رکھتے ہوئے وہ اپنے جذباتِ تشکر و عقیدت کا اظہار اس طرح کر رہی تھیں :-

"ہم آپ پر درود و سلام بھیجتے ہیں اے رسول اللہ ! ایسے طبقے کا درود و سلام جس پر آپ کا سب سے بڑا احسان ہے، آپ نے ہم کو خدا کی مدد سے جاہلیت کی بیڑیوں اور بندشوں، جاہلی عادات و روایات، سوسائٹی کے ظلم اور مردوں کی زور دستی اور زیادتی سے نجات بخشی، لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کے رواج کو ختم کیا، ماؤں کی نافرمانی پر وعید سنائی، آپ نے فرمایا کہ جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔ آپ نے وراثت میں ہم کو شریک کیا اور اس میں ماں، بہن، بیٹی اور بیوی کی حیثیت سے ہم کو حصہ دلایا، یوم عرفہ کے مشہور تاریخی خطبہ میں بھی آپ نے ہمیں فراموش نہیں کیا اور کہا کہ :" عورتوں کے

بارے میں خدا سے ڈرو اس لئے کہ تم نے ان کو اللہ کے نام کے واسطہ سے حاصل کیا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف مواقع پر آپ نے مردوں کو عورتوں کے ساتھ حسن سلوک، ادائے حقوق اور بہتر معاشرت کی ترغیب دی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمارے طبقہ کی طرف سے وہ بہتر سے بہتر جزا دے جو انبیاءؑ و مرسلین اور اللہ کے نیک اور صالح بندوں کو دی جا سکتی ہے۔"

یہ نرم آوازیں میرے کانوں میں گونج رہی تھیں کہ ایک اور جماعت نظر آئی جو "باب السلام" کی طرف سے آ رہی تھی، میں ان کی طرف متوجہ ہوا تو دیکھا کہ وہ علوم وفنون کے موجد اور مرتب اور ائمہ نحو ولغت و بلاغت کی جماعت تھی، ان میں ابوالاسود الدولی، خلیل بن احمد، سیبویہ، کسائی، ابوعلی الفارسی، عبدالقاهر الجرجانی، السکاکی، مجدالدین فیروزآبادی سید مرتضیٰ الزبیدی بھی تھے۔ جو اپنے علوم کا سلام پیش کر رہے تھے، اور اپنی شہرت اور مرتبۂ علمی کا خراج ادا کرنے آئے تھے۔ میں نے دیکھا وہ بہت بلیغ اور ادبی الفاظ میں اس طرح گویا ہیں:۔

"یا رسول اللہ! اگر آپ نہ ہوتے اور یہ مقدس کتاب نہ ہوتی جو آپ پر نازل ہوئی اگر آپ کی احادیث نہ ہوتیں اور یہ شریعت نہ ہوتی جس کے سامنے ساری دنیا نے سر تسلیم خم کر دیا تھا، اور وہ اس کی وجہ سے عربی زبان سیکھنے اور اس میں مہارت حاصل کرنے پر مجبور تھی، تو پھر یہ علوم بھی نہ ہوتے جن میں آج ہم کو رہنمائی اور برتری کا شرف حاصل ہے، نحو، بیان اور بلاغت ان میں سے کسی چیز کا بھی وجود نہ ہوتا، نہ یہ بڑی بڑی معاجم اور لغات نظر آتیں، نہ عربی زبان کے مفردات میں یہ نکتہ آفرینیاں اور دقیقہ سنجیاں ہوتیں، نہ ہم اس راستہ میں اتنی زبردست اور طویل جدوجہد کے لئے تیار ہوتے۔ عجم کو (جس کے ہاں زبانوں اور لہجوں کی کوئی کمی نہ تھی) عربی سیکھنے اور اس پر عبور حاصل کرنے کی کوئی خواہش نہ ہوتی اور نہ ان میں وہ مصنفین اور اہلِ قلم پیدا ہوتے جن کے ادبی مرتبہ اور مہارتِ فن کے اعتراف پر ادبائے عرب بھی مجبور ہیں۔ اے رسول اللہ! آپ ہی ہمارے درمیان اور اسلام میں پیدا ہونے والے ان علوم کے درمیان رابطہ اور واسطہ تھے جو آپ کے عہد رسالت اور عہدِ امامت میں پیدا ہوئے۔ درحقیقت صرف آپ ہی عرب وعجم میں رابطہ کا ذریعہ ہیں۔ آپ ہی کی ذات ہے جس نے اس درمیانی خلا کو پُر کیا ہے اور عرب وعجم قریب وبعید کو گھلے ملا دیا ہے۔ آپ کا کتنا احسان ہے ہماری اس ذہانت، طباعی اور تبحر علمی پر، اور آپ کا کتنا کرم ہے علم کی اس ثروت پر، انسانی عقل کی زرخیزی پر اور قلم کی گلکاری پر۔ اے رسول اللہ! اگر آپ نہ ہوتے تو یہ زبان بھی بہت سی

اور زبانوں کی طرح صفحۂ ہستی سے ناپید ہو جاتی۔ اگر قرآن مجید کا معجزہ نہ ہوتا تو اس پر تحریف کا ایسا عمل جراحی ہوتا کہ اس کی صورت ہی مسخ ہو جاتی، جیسا بکثرت دوسری زبانوں کے ساتھ ہوا ہے۔ عجمی لہجے اور مقامی زبانیں اس کو جذب کر لیتیں یا نگل لیتیں اور اس کی فصاحت یکسر ختم ہو جاتی، یہ آپ کے وجودِ مبارک، شریعتِ اسلامی اور اس کتاب مقدس کا فیض ہے جس نے اس زبان کو فنا کے دست برد سے محفوظ رکھا ہے اور عالمِ اسلام کے لئے اس کی عزت و محبت واجب کر دی ہے، اور ہر مسلمان کے دل کو اس کی محبت و عقیدت سے لبریز کر دیا ہے۔ آپ ہی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس زبان کو دوام بخشا اور اس کی بقاء و ترقی کی ضمانت کی، اس لئے ہر اس شخص پر جو اس زبان میں بات کرتا ہے یا لکھتا ہے یا اس کی وجہ سے کوئی بلند مرتبہ حاصل کرتا ہے یا اس کی دعوت دیتا ہے آپ کا احسان ہے اور وہ اس احسان کو ماننے پر مجبور ہے۔"

میں ان کے اس اعتراف اور اظہارِ حقیقت کو غور سے سن رہا تھا کہ اچانک میری نگاہ "باب عبدالعزیز" پر جا کر ٹھہر گئی، اس دروازے سے ایک ایسا گروہ داخل ہو رہا تھا جس پر مختلف قوموں اور مختلف ملکوں کے رنگ نمایاں تھے اس میں دنیا کے بڑے بڑے سلاطین اور تاریخ کے ممتاز ترین بادشاہ اور فرمانروا شامل تھے۔ ہارون رشید، ولید بن عبدالملک ملک شاہ سلجوقی، صلاح الدین ایوبی، محمود غزنوی، ظاہر بیبرس، سلیمان القانونی، اورنگ زیب عالمگیر بھی اس گروہ میں شامل تھے۔ انہوں نے اپنے خادموں اور سپاہیوں کو دروازے کے باہر ہی چھوڑ دیا تھا اور نظریں جھکائے، تواضع و انکساری کا مجسمہ بنے ہوئے بہت آہستہ آہستہ گفتگو کرتے ہوئے چل رہے تھے۔ میری نظر کے سامنے ان سب کی شخصیتیں اور کارنامے اُبھرنے لگے۔ میری آنکھوں میں اس طویل و عریض دنیا کا نقشہ پھر گیا جس پر ان کا سکّہ چلتا تھا، اس غلبہ و اقتدار کی تصویر یکایک میرے سامنے آ گئی جو ان کو دنیا کی بڑی بڑی قوموں، طاقت ور سلطنتوں اور جابر بادشاہوں پر حاصل تھا۔ ان میں وہ شخص[1] بھی تھا جس نے بادل کے ایک ٹکڑے کو دیکھ کر یہ تاریخی جملہ کہا تھا:- "تو جہاں چاہے جا کے برس تیرا خراج آخر کار میرے ہی خزانہ میں آئے گا" وہ شخص[2] بھی تھا جس کی سلطنت کی وسعت کا عالم یہ تھا کہ اگر سب سے تیز رفتار اونٹ، ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جانا چاہتا تو یہ ۱۵ ماہ سے کم میں ناممکن تھا۔ ان میں وہ فرمانروا بھی تھے جو نصف کرۂ ارضی پر حکومت کرتے تھے اور بڑے بڑے بادشاہ ان کو خراج پیش کرنے پر مجبور تھے[3]۔ ایسے

---

[1] ہارون رشید کی طرف اشارہ ہے۔

[2] ولید بن عبدالملک مراد ہے۔

[3] سلیمان قانونی کی طرف اشارہ ہے۔

فرمانروا بھی تھے جن کی ہیبت سے سارا یورپ لرزہ براندام تھا، اور جن کے زمانے میں مسلمانوں کو عزت کا یہ مقام حاصل تھا کہ جب وہ یورپ کے ملکوں میں جاتے تھے تو ان کے دین کے احترام اور ان کے غلبہ و سطوت کے اثر سے گرجوں کے گھنٹے بجنا بند ہو جاتے تھے[1] غرض اسی طرح کے نہ جانے کتنے بادشاہ اور فرماں روا اس مجمع میں موجود تھے، وہ مسجدِ نبوی میں نماز ادا کرنے کے لئے آگے کی طرف بڑھ رہے تھے اور حضور کو درود و سلام کا ہدیہ پیش کرنا چاہتے تھے، اور اس کو اپنے لئے سب سے بڑا شرف و اعزاز اور سب سے بڑی سعادت سمجھتے تھے اور تمنا کرتے تھے کہ کاش اُن کی یہ نماز اور یہ درود و سلام قبول ہو۔ میں نے دیکھا کہ وہ لرزتے ہوئے قدموں کے ساتھ آہستہ آہستہ آگے کی طرف بڑھ رہے ہیں، اُن کے دلوں پر ہیبت طاری تھی۔ یہاں تک کہ وہ "صفہ" کے نزدیک پہنچ گئے جو فقرا صحابہ کا مسکن اور جائے قیام تھا۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے وہاں رک گئے اور عزت و احترام اور شرم و حیا کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اس کو دیکھنے لگے۔ اُس کے قریب ہی انہوں نے تحیۃ المسجد کے طور پر دو رکعتیں پڑھیں اور قبرِ مبارک کی طرف بڑھے اور پھر اُن کی محبت و عقیدت، جذبات و احساسات اور علم و ایمان کی زبان نے جو کچھ کہلوایا وہ انہوں نے اس بارگاہِ نبوی میں عرض کیا لیکن شریعت کے آداب کا خیال رکھتے ہوئے اور توحیدِ خالص کو پیشِ نظر رکھ کر، میں نے سُنا وہ کہہ رہے تھے:

"اے رسول اللہ اگر آپ نہ ہوتے اور آپ کا یہ جہاد اور یہ دعوت نہ ہوتی جو دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئی اور جس نے بڑے بڑے ملکوں کو فتح کر لیا اور اگر آپ کا یہ دین نہ ہوتا جس پر ایمان لانے کے بعد ہمارے آباؤ اجداد گوشۂ عزلت اور قعرِ ذلت سے نکل کر عزت و سربلندی، حوصلہ مندی اور بلند ہمتی کی وسیع زندگی میں داخل ہوئے پھر اس کے نتیجہ میں انہوں نے بڑی بڑی سلطنتیں قائم کیں، دُور دراز ملکوں کو فتح کیا اور اُن قوموں سے خراج وصول کیا جو کسی زمانہ میں اُن کو اپنی لاٹھی سے ہانکتی تھیں اور بھیڑ بکری کے گلّہ کی طرح اُن کی پاسبانی اور حفاظت کرتی تھیں۔ اگر جاہلیت سے اسلام کی طرف اور گوشۂ گمنامی اور تنگ و محدود قبائلی زندگی سے تسخیرِ عالم کی طرف یہ مبارک سفر نہ ہوتا جو آپ کی برکت سے انجام پذیر ہوا تو دنیا میں کسی جگہ بھی ہمارا جھنڈا سربلند نہ ہوتا اور نہ ہماری کہانی کسی جگہ سُنائی جاتی۔ ہم اسی طرح بے آب و گیاہ خشک و ویران صحراؤں اور حقیر وادیوں میں باہم دست و گریبان رہتے۔ جو طاقتور ہوتا وہ کمزور پر ظلم کرتا، بڑا چھوٹے پر زیادتی کرتا۔ ہماری غذا بہت ہی حقیر اور معیار اتنا پست تھا کہ اس سے زیادہ پست کا تصور مشکل ہے، ہم اس گاؤں یا اپنے محدود قبیلہ سے

---

[1] سلیمان بن سلیم العثمانی کی طرف اشارہ ہے۔

آگے بڑھ کر کچھ سوچنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے تھے جس میں ہماری ساری زندگی اور ساری جدوجہد محصور تھی۔ ہماری مثال تالاب کی مچھلیوں اور کنوئیں کے مینڈکوں کی سی تھی۔ ہم اپنے محدود تجربوں کے جال میں گرفتار تھے اور اپنے جاہل اور بے عقل آباؤ اجداد کے گن گاتے تھے۔

آپ نے اے رسول اللہ ﷺ ہم کو اپنے دین کی ایسی روشنی عطا کی کہ ہماری آنکھیں کھل گئیں۔ خیال میں وسعت پیدا ہوئی، نظر کو جلا ہوئی۔ اس کے بعد ہم اس وسیع اور جامع دین اور اس روحانی رشتہ اور رابطہ کو لے کر خدا کی وسیع اور کشادہ زمین میں پھیل گئے۔ ہم نے اپنی تمام خوابیدہ اور جامد صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے شرک و بت پرستی اور ظلم و جہالت کا پوری طاقت سے مقابلہ کیا اور ایسی عظیم الشان حکومتیں قائم کیں جن کے سایہ میں ہم اور ہماری اولاد اور ہمارے بھائی صدیوں تک آرام اور فائدہ اٹھاتے رہے۔ آج ہم آپ کی خدمت میں نذرِ عقیدت پیش کرنے آئے ہیں اور اپنے جذبۂ محبت اور عزت و احترام کا خراج یا ٹیکس اپنی خوشی و مرضی سے ادا کر رہے ہیں اور اس کو اپنے لیے باعثِ فخر اور وسیلۂ شرف سمجھتے ہیں۔

ہمیں پورا اعتراف ہے کہ اس دین کے احکام و قوانین کے نفاذ کے سلسلہ میں (جس سے اللہ تعالیٰ نے ہم کو سرفراز کیا تھا) ہم سے یقیناً بڑی کوتاہی ہوئی۔ ہم اللہ سے استغفار کرتے ہیں بے شک وہ بہت معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔"

میں ان بادشاہوں کی طرف متوجہ تھا۔ میری نظریں اُن کے خاموش اور باادب چہروں پر مرکوز تھیں۔ میرے کان اُن کے ان پُرخلوص، نیازمندانہ الفاظ پر لگے ہوئے تھے جو اس سے قبل میں نے اُن سے کسی موقع پر نہیں سُنے تھے کہ ایک اور جماعت داخل ہوئی اور ان بادشاہوں اور فرماں رواؤں کی پروا کئے بغیر اُن کی صفوں سے ہوتی ہوئی سامنے آگئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان بادشاہوں کے رعب و دبدبہ اور قوت و اقتدار کا اُن پر کوئی اثر نہیں ہے۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ یا تو یہ شاعر ہیں یا انقلابی، یہ اندازہ غلط نہ تھا اس لئے کہ یہ جماعت ان دونوں گروہوں پر مشتمل تھی۔ اس میں سید جمال الدین افغانی امیر سعید حلیم، مولانا محمد علی، امام حسن البنا کے پہلو بہ پہلو ترکی کے مشہور شاعر محمد عاکف اور ڈاکٹر محمد اقبال بھی موجود تھے۔ ترجمانی کے لئے ان لوگوں نے آخر الذکر کا انتخاب کیا اور لائق ترجمان نے ان الفاظ میں اپنے جذباتِ عقیدت کا اظہار کیا :۔

"یارسول اللہ ﷺ میں آپ سے اُس قوم کی شکایت کرنے آیا ہوں جو آج بھی آپ کے خوانِ نعمت سے لطف اندوز ہو رہی ہے اور آپ کے سایۂ رحمت میں زندگی گزار رہی ہے اور آپ ہی کے لگائے ہوئے باغ کے پھل کھا رہی ہے، وہ اُن ملکوں میں جن کو آپ نے

قفس استبداد سے آزاد کرایا تھا اور سورج کی روشنی اور کھلی ہوا عطا کی تھی وہ آج آزادی کے ساتھ اور اپنی مرضی کے مطابق حکومت کر رہی ہے۔ لیکن یہی قوم اسے رسول اللہ آج اسی بنیاد کو اکھاڑ رہی ہے جس پر اس عظیم اُمت کے وجود کا دار و مدار ہے۔ اس کے رہنما اور لیڈر آج یہ کوشش کر رہے ہیں کہ اس اُمتِ واحدہ کو کثیر التعداد قومیتوں میں تقسیم کر دیں، وہ اُسی چیز کو زندہ کرنا چاہتے ہیں جس کو آپ نے ختم کیا تھا، اُسی چیز کو بگاڑ رہے ہیں جس کو آپ نے بنایا تھا۔ وہ اس اُمت کو عہدِ جاہلیت کی طرف دوبارہ واپس لے جانا چاہتے ہیں جس سے آپ نے اُس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکالا تھا اور اس معاملہ میں یورپ کی تقلید کر رہے ہیں جو خود زبردست ذہنی افلاس اور انتشار و بے یقینی کا شکار ہے، وہ اللہ کی نعمت کو ناشکری سے تبدیل کر کے اپنی قوم کو تباہی کے گھر کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ "چراغِ مصطفوی" اور "شرارِ بولہبی" کی معرکہ آرائی آج پھر قائم ہے۔ بدقسمتی سے ابولہب کے کیمپ کی طرف وہ لوگ نظر آرہے ہیں جو اسلام کی طرف اپنا انتساب کرتے ہیں اور عربی زبان بولتے ہیں۔ وہ آج اپنے جاہلی کارناموں اور اصنام پر فخر کرنے لگے ہیں جن کو آپ نے پاش پاش کر دیا تھا۔ یہ لوگ اُن تاجروں میں ہیں جو سودا خریدتے وقت تو زیادہ لینا چاہتے ہیں اور بیچتے وقت کم دیتے ہیں۔ آپ سے انہوں نے ہر چیز حاصل کی اور ہر طرح کی قوت و عزت سے بہرہ مند ہوئے۔ اب وہ اُن قوموں کے ساتھ جن کے وہ حاکم اور نگراں ہیں یہ سلوک کر رہے ہیں کہ اُن کو بالجبر یورپ کے قدموں میں ڈال دینا چاہتے ہیں اور اُس کو جاہلی فلسفوں، نیشنلزم، سوشلزم، کمیونزم کے حوالہ کر رہے ہیں۔

آپ نے جن بتوں سے کعبہ کو پاک کیا تھا وہ آج مسلمان قوموں کے سروں پر نئے نئے ناموں اور نئے نئے لباسوں میں پھر مسلط کئے جا رہے ہیں۔ مجھے عالم عربی کے بعض حصوں میں جن کو آپ کا مرکز اور قلعہ ہونا چاہیئے تھا، ایک عام بغاوت نظر آ رہی ہے لیکن کوئی فاروق (رضی اللہ عنہ) نہیں۔ فکری و ذہنی ارتداد کی آگ تیزی کے ساتھ پھیل رہی ہے اور کوئی ابوبکر (رضی اللہ عنہ) نہیں جو اس کے لئے مردانہ وار میدان میں آئے اور اس آگ کو بجھائے۔

میری طرف سے اور میرے تمام ساتھیوں کی طرف سے جن کی نمائندگی اور ترجمانی کا فخر مجھے حاصل ہوا ہے آپ کو دل کی گہرائیوں سے نکلنے والے اور عقیدت و احترام کے

جذبات میں ڈوبے ہوئے سلام کا تحفہ قبول ہو۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں اور اللہ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ ہم ان تمام لیڈروں اور رہنماؤں سے بری اور بیزار ہیں جنھوں نے اپنا رُخ اسلام کے قبلہ کی طرف سے پھیر کر مغرب کی طرف کر لیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں آپ سے اور آپ کے دین سے کوئی تعلق باقی نہیں رہ گیا ہے۔ ہم آپ کی وفاداری اور اطاعت شعاری کا پھر اعلان کرتے ہیں اور جب تک زندگی ہے اسلام کی اس رسی کو ان شاء اللہ مضبوطی سے پکڑے رہیں گے۔"

یہ بلیغ اور ایمان و یقین سے لبریز الفاظ ختم بھی نہ ہوئے تھے کہ مسجد نبوی کے میناروں سے اذان کی دلنواز صدا بلند ہوئی اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر میں یکبارگی ہشیار ہو گیا اور تخیلات کا یہ حسین سلسلہ جو تاریخ کے سہارے قائم ہوا تھا ٹوٹ گیا۔ میں اب پھر اسی دنیا میں واپس آ گیا تھا جہاں سے چلا تھا۔ کچھ لوگ نماز میں مشغول تھے اور کچھ تلاوت کر رہے تھے۔ عالم اسلام کے مختلف وفود اور جماعتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ہدیۂ سلام پیش کر رہی تھیں۔ زبانوں اور لہجوں کے اختلافات کے ساتھ جذبات و تاثرات کے اتحاد نے ایک عجیب سماں پیدا کر دیا تھا۔

مترجم: مولوی سید محمد الحسنی

تصویرِ ہجرت

ناصر نذیر فراق

بہت آنکھیں ہیں فرشِ راہ چلنا دیکھ کر جاناں
کفِ نازک میں کانٹا چبھ نہ جائے کوئی مژگاں کا

پیغمبر صلوٰۃ اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ کو تیرہواں سال ہے قوم کے سمجھانے میں آپ نے کوئی جتن نہیں چھوڑا مگر ڈھاک کے تین پات قریش نے جس طرح نبوت کے دعوے کے پہلے دن آپ کو جھوٹا کہا تھا آج بھی اسی طرح منہ بھر کے آپ کی شان میں گستاخیاں کرتے ہیں مکہ میں سب سے بڑا جھٹلانے والا گروہ آپ کا کنبہ اور آپ کا خاندان ہے جس کا نام قریش یا بنی ہاشم ہے آپ کو پتھر مارنے والے قریش ہیں آپ کے راستہ میں گندگی اور کانٹے بچھانے والے قریش ہیں مگر اس سال ۶۲۲ء میں قریش کا کینہ حضور صلوٰۃ اللہ علیہ کے ساتھ بڑھ گیا ہے کیونکہ آپ کی نگہبانی کرنے والے چچا جناب مستطاب سلطان الملکہ حضرت ابوطالب اس دنیا سے دار العاقبتہ کی طرف تشریف لے گئے اور ملکہ جہان و جہانیان حضرت خدیجۃ الکبریٰ جو آپ کی مونس و غمگسار تھیں وہ بھی جنت کو سدھار چکی ہیں گھر میں آتے ہیں تو بے ماں کی بچی فاطمہؓ کو دیکھ کر آٹھ آٹھ آنسو روتے ہیں باہر جاتے ہیں تو قریش پتھر برساتے ہیں اور "لست مرسلا لست مرسلا" کی صدائیں لگاتے ہیں جو دل کو پاش پاش کر دیتی ہیں۔ ایک بدمعاش پکار کر کہتا ہے یا محمد میں نے تمہاری ہلاکت کے لیے ایک صبا رفتار گھوڑا خریدا ہے اس پہ سوار ہو کر تمہیں ماروں گا دوسرا بکا۔ الغضب ہے اے احمد میں نے تمہارا سر اتارنے کے لیے ایک تیغ دو دم لی ہے بالفعل کفار کا اس مستعدی سے حضورؐ کے قتل پہ آمادہ ہو جانے کا دوسرا سبب یہ ہے کہ انہوں نے تاڑ لیا تھا کہ گو اسلام کا پودا محمدؐ کے خاطر خواہ پھولا پھلا نہیں ہے مگر ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات محمدؐ کے ساتھی سب کے سب جاں نثار ہیں علی بن ابی طالب اٹھارہ برس کا نوجوان بہادر ذوالفقار لئے ہر دم اس کا پہرہ دیتا ہے۔ ابوبکر بن ابی قحافہ جیسا مالدار پیر تجربہ کار خرچ کے وقت اس کے لیے سونے چاندی کا مینہ برسا دیتا ہے۔ عمر بن الخطاب جیسا جیوٹ جی دار ہر آن اس کے لیے سینہ سپر رہتا ہے حمزہ بن عبد المطلب اس کے پلہ پہ ہے جو شیر کا کلہ چیر ڈالتا ہے ان کے علاوہ جعفر بن ابی طالب اور عثمان بن عفان اور چار سو نوجوان شہر مکہ کے رہنے والے نامی نامدار اور قریب ایک ہزار کے طائف اور نواح طائف کے ساکن اس پر ایمان لا چکے ہیں اور اس کا کلمہ پڑھتے ہیں یثرب یعنی مدینہ کے خاص عام اس کے غلام ہو چکے ہیں اگر اس شخص کی پوری روک تھام نہ ہوئی تو یہ بازی لے جائے گا اور ہمیں تہتر کے بیجوں میں پہنچا دے گا اگر اسے مکہ سے باہر جانے کی سوجھی تو غضب ہی ہو جائے گا اور سونے کی چڑیا ہمارے ہاتھوں سے اڑ جائے گی یہ شخص اپنی جادو بیانی اور شیریں زبانی سے مکہ سے نکل کر ایک عالم کو پرچا لے گا اور اپنے دام میں پھنسا لے گا یہ ٹڈی دل فوجیں لے کر مکہ پر چڑھائی کرے گا اور ہم سب کو پیس کر دھر دے گا اس لیے اب دیر کرنے کا موقع نہیں ہے گھڑی کی چوتھائی میں اس کا کام تمام کر دو مار پیچھے بایاں بچا ہی کرتا ہے بنی ہاشم اس کے قتل پہ کھو ہو لائیں گے مگر ہم سب سے کیا دبا ہوں گے ادھر تو قریش اور مکہ کے سارے قبیلے یہ چرغم جرغم کر ہی رہے تھے ادھر حضورؐ نے بھی ان کی سن گن پالی تھی آپ نے اپنے صحابہ کو جتا دیا تھا اور ان میں سے ایک آدھ گھرانے روزانہ مکہ سے ہجرت کر جاتے تھے بعض صحابہ نے حضورؐ کے

مُنہ پر کہہ بھی دیا تھا کہ حضورؐ ہمیں جو ہجرت کے لئے آمادہ کرتے ہیں تو کیا خود بدولت بھی ہجرت فرمائیں گے۔

حضورؐ۔ بے شک میرا ارادہ بھی ہجرت کا ہے کیونکہ خدا کی مرضی ایسی ہی معلوم ہوتی ہے۔

صحابہؓ۔ حضور اقدسؐ اس ہجرت سے تو جہاد اچھا ہے ہمیں حکم دیجئے تاکہ ان دشمنوں کی دم بھر میں منڈیا مروڑ کر رکھ دیں۔

حضورؐ۔ بے شک تم سب صاحب ارنے مرنے والے ہو مگر خدا نے مجھے رحمت للعالمین بنا کر بھیجا ہے میرا دل گوارا نہیں کرتا کہ اپنے شہر کے باشندوں کو تہ تیغ کروں میں قوم کے برباد کرنے سے یہ بہتر جانتا ہوں کہ میں قوم میں سے نکل جاؤں۔

صحابہؓ۔ جو مرضی مبارک مگر ہمارا جی نہیں پسند کرتا کہ ہم آپ کو کفار کے زغہ میں چھوڑ کر چلے جائیں ایک دن ایک وقت ہیں ہم سب مسلمان اپنے بال بچوں کو اور حضورؐ والا کو اور حضورؐ کی اہلبیت کو ساتھ لے کر مکہ سے نکل جائیں اور مکہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیں۔

حضورؐ۔ تمہارے ساتھ میرا اس طرح جانا بڑی جوکھوں رکھتا ہے کفار جب ہمیں تمہیں کھلے بندوں جاتا دیکھیں گے تو چڑھ جائیں گے اور ہم تم پر پل پڑیں گے حرم پاک کی حدود میں خونریزی ہوگی اور میں یہ بے ادبی کرنی نہیں چاہتا میرا مدعا یہ نہیں ہے کہ میں اپنی قوم کا اپنے ہاتھوں سے ستیاناس کروں اگر قوم کا بنام کرنا مجھے مدنظر ہو تو میرا صرف دعا کے لیے ہاتھ اٹھانا کافی ہے" انک لعلیٰ خلق عظیم" میری نشانی ہے وہ جتنا چاہیں مجھے ستائیں مگر میں ان کا بُرا نہ چاہونگا آپ لوگ خدا و رسول کے کاموں میں جرح و قدح نہ کریں اور جس طرح آپ کو حکم ہو ٹھنڈے دل سے مکّہ سے نکل جائیں۔

ویسے تو کفار ہمیشہ حضور پُر نورؐ کی ذاتِ پاک کے ستانے کے لیے مشورہ کیا کرتے تھے مگر اگست ۶۲۲ء میں سارے شہر کے دارالندوہ کے اندر حضورؐ کے قتل کے لیے برابر مجلسیں گرم ہوتی رہیں اور سب سے اخیر انجمن ۱۲ ستمبر ۶۲۲ء کو ہوئی جس میں ابلیس لعین بھی شیخ نجدی بن کر شریک تھا اس پنچایت میں یہ بات طے پاگئی کہ آج رات کو جب محمدؐ اپنے بچھونے پر خواب استراحت میں ہوں تو تلواروں سے ان کا کام تمام کر دیا جائے

پے مشورت مجلس آراستند

نشستند و گفتند و برخاستند

ہر قبیلہ کے سورما اور بیر اپنے اپنے ہتھیاروں کو مانجھ کر برق دم بنا رہے تھے اور جبرئیلؑ امین یہ آیہ کریمہ حضور والاؐ کے گوش گذار فرما رہے تھے۔ واذ یمکر بک الذین کفروا لیثبتوک اویقتلوک اویخرجوک ویمکرون ویمکر اللّٰہ واللّٰہ خیر الماکرین یعنی کافروں نے ٹھان لی ہے کہ اے محمدؐ آپ کو بندی خانہ میں رکھیں یا آپ کو مار ڈالیں یا آپ کو دیس سے نکالا دیں وہ اپنی گھات میں لگ رہے ہیں اور اللہ اپنی گھات میں ہے اور اللہ اچھے گھات کرنے والوں میں سے ہے۔

اور جبرئیل علیہ السلام نے یہ بھی کہا کہ یا رسول اللہ پہلے جو آپ کی ہجرت کا ارادہ بلاد بحرین اور قنسرون کی طرف تھا وہ اب نہیں ہے۔ رب العزت نے ارشاد کیا ہے کہ آپ سیدھے مدینہ طیبہ کو تشریف لے جائیں اور کچھ خاص خاص ہدایتیں بھی کیں آپ اس وحی کو معلوم کر کے دولت خانہ پر تشریف لئے جاتے تھے اور حضرت علی بھی آپ کے ہمراہ تھے جو آپ نے دیکھا قریش اور ابوجہل ہتھیار لئے گلی کے موڑ پر کھڑے ہیں۔

ابوجہل (اپنے دوستوں سے) یہی تو میاں محمدؐ ہیں جو کہتے ہیں کہ اگر تم میرے کہنے پر چلو گے اور مسلمان ہو جاؤ گے تو عرب اور عجم تمہاری ملکیت ہوں گے اور اگر اس کے خلاف کرو گے تو نیچا دیکھو گے میرے ہاتھ سے مارے جاؤ گے اور جہنم میں ٹھکانا ملے گا۔

حضور والاؐ۔ بے شک میں یہی کہتا ہوں اور جو کہتا ہوں وہ ہو کر رہے گا اور تو جہنم کے اندر پڑا سڑے گا یہ فرما کر آپ اپنے دولتخانہ میں چلے گئے اور حضرت علیؓ کو ہجرت کا مفصل حکم ارشاد فرمایا کہ برادر حکم الٰہی یہی ہے کہ آج رات کو تم میرے بچھونے پر سو رہو اور میں ابوبکر کو ساتھ لے کر مکہ سے نکل جاؤں۔ ڈرنا نہیں کفار تمہارا بال بیکا نہ کر سکیں گے۔

حضرت علیؓ۔ زہے نصیب میرے کہ میں حضورؐ کے بچھونے پر سونے کی سعادت حاصل کروں اور حضورؐ کو روشن ہے کہ مجھے کسی موقع پہ خوف و ہراس نہیں ہوتا۔

حضور والاؐ۔ جیتے رہو خوش رہو۔

ان باتوں کو بی بی فاطمہ علیہا السلام نے بھی سنا اور آپ کا ننھا سا کلیجہ دھڑکنے لگا آپ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے اور آپ نے کھسیانی آواز میں کہا کہ باوا جان آپ مجھ بے ماں کی بچی کو کس پر چھوڑتے ہیں۔

حضورؐ۔ خدا پر گھبرانا نہیں تمہاری بڑی باجی اور تمہاری سوتیلی ماں سودہؓ تمہارے پاس رہیں گی اور تمہارا دل بہلائیں گی

فاطمہؓ۔ باوا جان بغیر آپ کے میرا دل کیونکر بہلے گا۔

حضورؐ۔ میری جان جامع المتفرقین ہمیں تمہیں جلد ملائے گا۔ پیغمبر زادی ہو جفا اور کفا کو سہنا اور اف نہ کرنا۔

دوسری تصویر

کیا ڈھونڈے دشت گم شدگی میں تجھے کہ ہے
عنقا ترے سراغ سے دور اور شکستہ پہ

صفر کی ستائیسویں اور ستمبر کی بارھویں تاریخ ہے رات کا وقت ہے چاند کا کہیں پتہ نہیں ہے چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا ستاروں نے ادب سے اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں اور تاریکی ایسی چھا گئی ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ سوجھائی نہیں دیتا ہے آدھی رات کے قریب حضورؐ نے اٹھ کر وضو کیا اور حضرت علیؓ سے فرمایا برادر ہوشیار رہو جاؤ وقت آ گیا ہے اب تم اٹھ کر دروازہ بند کر لو اور میرے بستر پر لیٹ جاؤ۔

حضرت علیؓ۔ کیا حضورؐ تشریف لئے جاتے ہیں۔

حضورؐ۔ ہاں سے

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

حضرت علیؓ سے

بہ سفر رفتنت مبارک باد
بہ سلامت روی و باز آئی

حضورؐ دروازہ کھول کر باہر آئے اور آپ نے دیکھا کفار دو رویہ گلی میں کھڑے ہیں ہتھیار ہاتھوں میں ہیں مگر خدا نے ان پر نیند کو مسلط کر دیا بے خراٹے لے رہے ہیں حضورؐ نے کھڑے ہو کر سورہ یٰسین شریف کی آیتیں "فھم لا یبصرون" تک پڑھیں اور گلی میں سے خاک اٹھا کر ان کی طرف پھینکی اور غیب سے آواز آئی وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمٰی اور وہ خاک بحکم الٰہی کفار کی آنکھوں اور چند یا پر جا کر پڑی اور آپ بہت اطمینان کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مکان کی طرف چل دیئے راستہ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی آپ کو مل گئے اور اپنے گھر آپ

کو رے گئے وہاں پہنچ کر آپ نے دم لیا اور سارا حال کہا حضرت ابوبکرؓ نے اپنے گھر کی وہ کھڑکی کھول دی جو جنگل کی طرف لگی ہوئی تھی اور حضورؐ اپنے سچے دوست ابوبکرؓ کے ساتھ غارِ ثور کی جانب چل دیئے حضرت ابوبکرؓ کی بیوی بچے حاضر تھے اور دست بستہ کھڑے تھے جب حضورؐ کھڑکی سے نکل گئے تو سب نے کہا کہ اللہ بیلی اللہ نگہبان اور کھڑکی بند کر لی اس رات کی اندھیری ساون کی اندھیری کو مات کرتی تھی غارِ ثور کا حضرت ابوبکرؓ کے مکان سے ڈھائی کوس کا فاصلہ تھا گھپ اندھیرے میں چلنا دشوار تھا قدم قدم پر دونوں صاحب ٹھوکریں کھاتے تھے آخر کار پتھروں اور کانٹوں نے حضورِ والا کے پائے مبارک کو گھائل کر دیا اور حضورؐ مجبور ہو کر زمین پر بیٹھ گئے اس وقت ابوبکرؓ نے اپنی صدق وصفا کا جوہر دکھایا اور نبی آخر الزماں کو اپنی پیٹھ پر چڑھایا اور انگوٹھوں کے بل چل کر خدا کے محبوب کو غار کے دہانہ تک پہنچایا ابوبکرؓ کے کپڑے دھجیاں ہو گئے تھے پاؤں تلوؤں سے لے کر پنڈلیوں تک زخمی ہو گئے تھے خون بہ رہا تھا اس وقت اس ہولناک مقام پر سوائے اندھیرے اور ہوا کے سناٹے کے کون تھا۔ اندھیرے نے کہا ابوبکرؓ آفرین صد آفرین سچ مچ تو رفیق طریق ہے تو صدیق ہے ہوا بولی بیشک تو یارِ غار ہے تو دوست غمگسار ہے اور محب وفادار ہے ابوبکرؓ اپنی جان پر کھیل اس غار میں گھسے اور حتی الوسع اسے اندر سے جھاڑ پونچھ کر صاف کیا اور حضورِ والا کو اس کے اندر بٹھا دیا یہ ۱۲ ستمبر کی رات تھی اس مہینہ میں کوٹھری کیا کمرہ میں مارے گھمس کے بیٹھنا دشوار ہوتا ہے رات بھر برقی پنکھے چلائے جاتے ہیں اور گرمی تابڑ توڑ پڑتی ہے مگر معاذ اللہ گرم پہاڑ کی کھوہ میں بیٹھنا لکھا ہے یہ انھیں حضرات کا کام تھا حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب مدارج النبوۃ میں لکھتے ہیں کہ جب فقیر غارِ ثور کے دیکھنے کے لیے غار میں اترا تو خوف سے بولانے لگا اور میں نے کہا کہ اے باری تعالیٰ محمدؐ کو معراج میں بلا کر قاب قوسین کا رتبہ عطا فرمایا اور پھر اس محبوب کو تو نے اس غار میں جو گیدڑ اور بھیڑیوں کا مسکن ہے داخل فرمایا ہاتف غیبی نے ندا دی کہ "اے عبدالحق تو کیا جان سکتا ہے اس لئے محمد کو جو قاب قوسین او ادنیٰ میں حاصل تھا وہی تنہ ہمارے ساتھ اس بھٹ میں حاصل تھی"۔

حضورؐ کو دولت خانہ سے نکلے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی جو شیطان لعین نے آکر کفار کو چونکایا کہ تم بازی ہار گئے محمد صاف نکل گیا اور تمہارے سروں پر دھول ڈال گیا کفار نے شیطان سے کہا نہ ہم سوئے نہ ہمارے سروں پر محمدؐ دھول ڈال گئے مگر سروں پر ہاتھ پھیرا تو شیطان کا کہنا سچ معلوم ہوا اور جھلا کر دولت خانہ کی دیوار پھاند کر اندر پہنچے اور حضرت علیؓ کو اندر بچھونے پر سوتا دیکھ کر کہا کون سوتا ہے۔

حضرت علیؓ۔ علی بن ابی طالب۔

کفار۔ محمدؐ کہاں ہیں۔

حضرت علیؓ۔ مجھے خبر نہیں۔ کفار نے حضرت علیؓ کے فرمانے کا یقین نہ کیا اور گھر کا کونہ کونہ دیکھ ڈالا مگر جس لعل شب چراغ کو ڈھونڈتے تھے اُسے نہ پایا اور بڑبڑاتے ہوئے گھر سے باہر آئے اور چلا کر کہنے لگے محمدؐ چل دیئے انھیں ڈھونڈو اس صدا نے سارے شہر میں ہلچل ڈال دی رات بھر حضرت کو تلاش کرتے رہے اور اندھیرے میں ٹاک ٹوئیاں مارتے پھرے یہاں تک کہ اس فخر الانبیاءؐ کی جدائی میں فجر اپنا گریبان پھاڑ کر مشرق سے نمودار ہوئی اور شفق رنگین آنسوؤں سے اپنا مکھڑا دھونے لگی مگر ادا اس تھا خاک اڑ رہی تھی کفار اپنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے گے کھوج نکالنے والوں اور سراغ رساں لوگوں کو بلایا حضورؐ کو اور ابوبکرؓ کو زندہ پکڑ کر لانے والوں کو یا سر کاٹ کر لانے والوں کے لیے سو سو اونٹ انعام ٹھہرایا کھوجیا بلا کا پر بین تھا وہ کفار کو غارِ ثور کے دہانہ پر لے پہنچا اور اس نے کہا کھوج آگے نہیں جاتا سو بس وہ محمدؐ اور ابوبکرؓ اس غار کے اندر ہیں اندر اترو اور دونوں کو باندھ

لو کفار غار کے دہانہ پر مکا بکا کھڑے تھے ان میں سے ایک شخص نے کہا پاگل ہوا ہے غار کے مُنہ پر مکڑی کا جالا تنا ہوا ہے غار کے مُنہ پر کبوتر کا گھونسلا ہے گھونسلے میں کبوتری بیٹھی انڈے سے رہی ہے اگر غار میں کوئی جاتا تو نہ جالا سلامت رہتا نہ گھونسلا دوسرے نے کہا میں اس جالا کو محمدؐ کی پیدائش سے پہلے اس دہانہ میں پاتا ہوں محمدؐ یہاں نہیں ہیں آگے چلو اور انھیں چاروں طرف ڈھونڈو دیر کرنی کس نے بتائی ہے خدا نے غار پہ سے کفار کو ٹالا اور سب کے سب ادھر ادھر تتر بتر ہو گئے ۔

تیسری تصویر

جب بہ تقریب سفر یار نے عمل باندھا
طپش شوق نے ہر ذرہ پہ اک دل باندھا

حضور پرنورؐ بارھویں ستمبر سے سولھویں ستمبر تک غار میں رہے رات کے وقت موقع دیکھ کر تھوڑی دیر کے لئے دونوں صاحب باہر آتے تھے عامر بن فہیرہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے آزاد غلام جو بکریاں چرانے کے بہانے سے غار کے آس پاس رہتے تھے آپؐ کو بکریوں کا دودھ پلاتے تھے اور حضرت عبداللہ بن ابی بکرؓ جو بظاہر کفار کے حرگہ میں شامل تھے رات کو آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور کفار کے مشوروں سے آپ کو خبردار کرتے تھے آج ربیع الاول کی پہلی تاریخ سولھویں ستمبر سے مطابق ہے دوشنبہ کی آدھی رات ہے چاند کسی عاشق بیمار کے زار نزار بدن کی طرح اپنا زرد چہرہ دکھا کر غروب ہو گیا اندھیرا چھایا ہوا ہے پہاڑ کے دامن میں سناٹا ہے آسمان پر تارے آنکھیں کھولے اس موقع کو گھور گھور کر دیکھ رہے ہیں ناظرین چشم بصیرت سے دیکھیں گے کہ غار کے دہانہ پر چار اونٹ کجاووں سے آراستہ بیٹھے جگالی کر رہے ہیں ان میں سے اگلا اونٹ عامر بن فہیرہؓ کا ہے جو ہمرکاب رہیں گے دوسرا اونٹ عبداللہ بن اریقط دیلمی کا ہے جو اگوا بن کر چلے گا اور رہبری کرے گا تیسرا اونٹ حضرت ابو بکرؓ کی سواری کا ہے چوتھی اونٹنی حضور پرنورؐ کی ہے جس کا نام قصویٰ ہے جو چار سو درم کے بدلے حضورؐ نے حضرت ابو بکرؓ سے مول لی ہے اس موقع سے چار قدم کے فاصلہ پر ایک عورت سیاہ پوش ہاتھ میں ایک گٹھری لیے کھڑی ہے ۔

ابو بکر صدیقؓ ۔ اسمأؓ لاؤ کھانا مجھے دو تا کہ شکار بند میں باندھ لوں اس سیاہ پوش عورت نے دسترخوان اپنے والد ماجد کے حوالے کیا ۔

ابو بکرؓ واہ بیٹی توشہ تو لائیں مگر توشہ باندھنے کے لئے کوئی رسی نہ لائیں ۔

اسمأؓ اس بات کو سن کر ایک چٹان کی آڑ میں چلی گئیں اور اپنے ازار بند کو دُہرا دُھر کھڑا چیر کرے آئیں ابو بکر صدیقؓ نے اس سے کھانا باندھ کر لٹکا دیا اور حضرت نے فرمایا اے آل ابی بکرؓ تم نے اپنے نبیؐ کی بڑی خدمت کی ہے اللہ تمھیں اس کی جزائے خیر دے ۔

اسمأ بنت ابی بکرؓ ۔ یا رسول اللہ فداک ابی و امی آپ کی جدائی شاق ہے یہ کہہ کر چپکے چپکے سسکیاں لینے لگیں ۔

حضور والا ۔ نہیں بوا ! تم اپنا جی بھاری نہ کرو خدا نے چاہا تو ہم تم سب سے جلد ملیں گے یہ کہہ کر حضور نے دعا پڑھی اور قصویٰ ناقہ پہ سوار ہو گئے اور عبداللہ بن اریقط دیلمی نے رہبری کے لیے اپنا اونٹ آگے بڑھایا اور یہ قافلہ چند ہی قدم چلا تھا جو رات کی تاریکی نے ہماری نظروں سے غائب کر دیا ۔

چوتھی تصویر

کس کا سراغ جلوہ حیرت ہے اے خُدا
آئینہ فرش شش جہت انتظار ہے

دشمنوں کے لحاظ سے آپ کا اگوا مدینہ کی طرف آپ کو معمولی اور مشہور راستہ سے نہیں لے گیا بلکہ سواحل کی غیر معمولی راہ سے اس نے سفر کروایا وہ اپنے اونٹ کو خراماں خراماں لئے جاتا تھا اس نے اونٹ کی مہار چھوڑ دی تھی ایک ہاتھ اس کا تلوار کے قبضہ پر تھا اور دوسرا ہاتھ اس کا علم کو سنبھال رہا تھا۔ اس کے پیچھے حضور کا ناقہ تھا جو مورنی کی طرح ناز و انداز سے ریگزار پر قدم رکھتا چلا جاتا تھا ناقہ کے پیچھے حضرت ابوبکرؓ کا اونٹ اور اس کے پیچھے عامر بن فہیرہ شیردل کا اونٹ تھا یہ حضرات یلغار کرتے چلے جاتے اگر راہ کے مصائب اور معجزات کو حوالہ قلم کیا جائے تو لکھنے کے لئے دفتر درکار ہوں مختصر یہ ہے کہ حضورؐ نے چودہ دن میں اس سفر کو طے کیا ستمبر کی ۲۰ تاریخ اور صبح کا سہانا وقت تھا کہ سامنے شہر مدینہ کی فصیل اور اس کے اِدھر اُدھر کھجوروں کے سرسبز باغ نظر آئے اہل مدینہ کو بھی یہ خبر مل گئی تھی کہ سردار انبیا مکہ سے چل دیئے ہیں اور ہمارے شہر کو آرہے ہیں اس لیے وہ خوشیاں منا رہے تھے اور روز مدینہ سے نکل کر پیشوائی کے لئے دو چار میل آتے تھے اور حضورؐ کو نہ پا کر مایوس چلے جاتے تھے۔ ۲۰ ستمبر کو بھی ناکام پلٹ رہے تھے جو ایک یہودی نے ٹیلہ پر سے حضورؐ کے قافلہ کو دیکھ کر کہا یا معاشر العرب هذا جدکم اس مژدہ کو سنتے ہی انصار پلٹے اور حضورؐ کے ناقہ کے چاروں طرف پروانہ وار گرے کچھ لوگ خوشی کے نعرہ لگاتے ہوئے مدینہ کی طرف بھاگے تاکہ آپ کی تشریف آوری کی خبر سب کو پہنچا دیں پھر کیا تھا چند ہی منٹ میں سارا مدینہ امنڈ پڑا پیر و جوان اور عورتیں اور لڑکے اور لڑکیاں ننھے بچیاں۔ لونڈیاں غلام دوڑے چلے آئے۔

ایک کہتا تھا جاء رسول اللہ دوسرا کہتا تھا جاء نبی اللہ یہاں تک کہ انصار اپنی آنکھیں بچھاتے آپ کو محلہ قبا میں لے پہنچے اور حضورؐ بنی عمرو بن عوف کے ہاں مہمان ہوئے خوشی کے جوش میں نوجوانوں نے نیزہ بازی اور پٹے کے کرتب شروع کر دیے بنی نجار کی لڑکیاں ہاتھوں میں دف لے کر آئیں اور یہ شعر گاتے لگیں ؎

نحن جوار من بنی النجار

یا حبذا محمد من جار

شاہ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ اس فرحت و شادمانی کی اُمنگ میں انصار کی پردہ نشین بیویاں بھی اپنے محل اور حویلیاں چھوڑ کر حضورؐ کے دیدار کو چلی آئیں اور یہ شعر گانے لگیں ؎

طلع البدر علینا من ثنیات الوداع

وجب الشکر علینا ما دعا للہ داع

معتقدین نے جھٹ پٹ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نہلا دھلا کر سفید لباس پہنائے حضورؐ گردن جھکائے مراقبہ میں تھے اور حضرت ابوبکرؓ آپ کے پہلو میں تھے عقیدت مندوں اور آرزو مندوں کا ہجوم دم بدم بڑھتا جاتا تھا دونوں صاحبوں کی صورت ایک سی لباس ایک سا آنے والے یہ نہ سمجھتے تھے کہ پیر کون سے ہیں اور مرید کون سے حضرت ابوبکرؓ نے بات کو بھانپ لیا اور اس لئے آپ نے ایک چادر لے کر دو کونے اپنے ہاتھ میں اور دو کونے کسی دوسرے آدمی کو دیے اور حضورؐ کے سر اقدس پر شامیانہ سا بنا کر کھڑے ہو گئے اب حاضرین اچھی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار سے مشرف ہونے لگے ؎

خوشا وقتے و خرم روزگارے

کہ یارے برخورد از وصل یارے

رسول اللہ ﷺ کے عہد کا اقتصادی اور معاشی نظام

مولانا محمد اشرف خاں

دینِ توحید

ہمارے آقا سید الانبیأ حبیبِ خدا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ تبارک وتعالیٰ کے آخری رسول اور نبوت کا معراج تام ہیں۔ آپ کی بعثت کا دائرہ ہر زمان ومکان کو اپنے دائرۂ عمل وحیطۂ اختیار ونفوذ میں لئے ہوئے ہے۔ آپ جملہ انبیار (علیہم السلام) کے سردار، اپنی تکمیل وجامعیت میں ممتاز، گلشن نبوت کے گل سرسبد اور باعث آفرینش و حاصلِ کائنات ہیں۔

آپ کا دین توحیدِ الٰہی کے ساتھ "وحدت انسانیت" دین و دنیا کی یکجائی، معاش ومعاد کے ارتباط اور دنیا و آخرت کے باہمی ربط وتسلسل کا علمبردار ہے۔ آپ کا دین مسجد و بازار، عبادت ومعاملات خدا پرستی اور دنیا داری کی دوئی کا قائل نہیں بلکہ آپ کے دین وحدت نے انسانی زندگی کو ایک "کل" کی صورت میں پیش کیا۔ جس میں انسان کے جملہ انفرادی و اجتماعی دینی ودنیاوی، قومی وطبقاتی، نجی و عائلی، تجارتی وزراعتی، صنعتی ومعاشی، اقتصادی سیاسی ومعاشرتی و عمرانی احوال ومعاملات کا انتہائی منصفانہ قابلِ عمل حل پیش کر دیا گیا جس میں جملہ طبقات انسانی کے مفادات وضروریات کی رعایت کی گئی ہے۔

رسول کا پیغام اس کا ذاتی نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ اللہ تعالیٰ سے سن کر کہتا اور اللہ تعالیٰ سے دیکھ کر بتاتا ہے۔ اس لئے ہر نبی کے قول وفعل پر الٰہی علم کی مہر لگی ہوتی ہے۔ اور وہ اپنے قول وفعل میں علوم ومرضیات الٰہیہ کا پیام رساں اور نمونہ ہوتا ہے۔ اس کا مخلوق سے تعلق اپنی انسانی نسبت سے کم اور اپنی نبوی اور الٰہی نسبت سے زیادہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ارشاد فرمایا:۔

(ترجمہ) "محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے پیامبر اور اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کا علم رکھتے ہیں۔"

اس آیت کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اے انسانو! حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے تمہارا نسبی تعلق نہیں، اس لئے ان کے کلام و پیام کو ان کی بشری حیثیت سے نہ پرکھو۔ بلکہ ان کے رسول ہونے کی حیثیت سے ان کے ہر پیام و کلام اور ان کے عطا کردہ ہر نظام کو مانو خواہ وہ عبادات سے متعلق ہو۔ یا معاملات سے، معاشرت سے متعلق ہو یا معاشیات سے، اقتصاد سے متعلق ہو یا سیاسیات سے، تدبیر مدن کے متعلق ہو یا عائلی قوانین سے زندگی کے جس طبقے یا جس مسئلے کے متعلق انہوں نے جو حل اور طریقہ بتا دیا۔ ان کا ذاتی تجویز کردہ نہیں۔ بلکہ رسول اللہ ﷺ ہونے کی حیثیت سے انہوں نے اللہ تعالیٰ کے علم و پیام، حکم ومنشار کو آپ تک پہنچایا ہے۔ اس لئے ان کی بات گویا اللہ تعالیٰ کی بات اور ان کی اطاعت گویا اللہ تعالیٰ

کی اطاعت ہے۔ قرآنِ کریم ہمارے اس دعوے کی تصدیق ان آیات پاک سے کرتا ہے:

(ترجمہ) "آپ اپنی خواہش سے کوئی بات نہیں فرماتے بلکہ آپ کی ہر بات اللہ تعالیٰ کی وحی ہے"۔

"جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی۔ اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی"۔

مذکورہ آیت سے دوسری بات یہ ثابت ہوتی ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رتبی اور زمانی اور مکانی لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں۔

نظام حیات

آپ پر نبوت اور رسالت کے ہر جزو وکل کو ختم کر دیا گیا۔ اس لئے اب آپ کا پیغام اور لایا ہوا نظام زندگی اور حیات انسانی کے متعلق بتائے ہوئے جملہ طریقے پوری انسانیت کے لئے قیامت تک اللہ تعالیٰ کا آخری پیام اور انسانی فوز و فلاح، کامیابی اور نجات کا آخری نظام ہے جس میں کسی تبدیلی و تغیر کی کوئی گنجائش نہیں کہ اس پیغام و نظام حیات کی بھیجنے والی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ جو "کَانَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْماً" کی مصداق ہے۔ یعنی ازل میں ابد تک کے احوال و کوائف کی جاننے والی جملہ طبقات انسانیہ کے مفادات کی نگہبان و نگران اور ہر زمانے میں پیش آنے والے انسانی مسائل سے واقف ہے۔ پس جو نظام حیات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا۔ وہ جملہ انسانوں اور ہر طبقہ کے مفادات و ضروریات کا کفیل اور بہترین حل ہے۔ کہ اس کا اصل موجد اور شارع یعنی پیش کرنے والا اللہ تبارک وتعالیٰ ہے۔ اس لئے یہی نظام منصفانہ اور عادلانہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسری شخصیت ایسا نظام حیات نہیں دے سکتی۔ خواہ معاشی و اقتصادی ہو۔ یا خواہ سیاسی و قانونی، جس میں ہر طبقہ اور ہر گروہ کے حقوق کی برابر منصفانہ نگہداشت اور رعایت کی گئی ہے۔ اس لئے غیر اللہ کے کسی طبقہ یا گروہ یا فرد کا مجوزہ نظام یا اس کا کوئی حصہ اسلامی نظام کی نہ جگہ لے سکتا ہے۔ نہ اس کا پیوند اسلام میں لگایا جا سکتا ہے۔ انسانوں کا جو طبقہ یا گروہ یا فرد قانون بنائے گا۔ اس میں انسانی بشری میلانات و تقاضوں کی بنا پر طبقاتی، نسلی و وطنی و قومی و ملکی مفادات خاصہ (VESTED INTERESTS) کی کچھ نہ کچھ رعایت ہو ہی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات خالی ہے جس کے لئے پوری مخلوق بدرجہ عیال کے ہے، حدیث پاک میں آتا ہے "الناس عیال اللّٰہ" (بیہقی فی شعب الایمان) اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے جو قانون بھیجا ہے اور جو نظام عدل، نظام اقتصاد و معاشیات دیا ہے۔ وہ سب انسانیت بلکہ پوری مخلوق کو سامنے رکھ کر اور مستقبل کے تمام احوال و وقائع کو جان کر دیا ہے۔ جس میں کسی طبقہ کی رعایت نہیں۔ نہ کسی کا خوف، عدل میں مانع آیا ہے۔ اس لئے وہ نظام ہر ذاتی مفاد سے خالی ہو کر محض مخلوق پروری اور انسانیت کی داد رسی کے لئے دیا ہے بقول رومی ؎

من نہ کردم خلق تا سودے کنم
بلکہ تا بر بندگاں جودے کنم!

اس میں کسی پر ظلم نہ ہوگا۔ نہ ظلم کی کسی کو اجازت دی جائے گی۔ حدیث قدسی میں رسول انور صلی اللہ علیہ وسلم نقل فرماتے ہیں۔

(ترجمہ) اے میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کیا ہے اور اس کو تمہارے درمیان بھی حرام کیا ہے۔ تو تم آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔ (صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ)

غرض قانون الٰہی میں کسی خاص طبقہ گروہ، جماعت یا فرد کے لئے کسی ظالمانہ مراعات و تحفظات کا کوئی چور دروازہ کھلا نہیں رکھا گیا۔ بلکہ ہر طبقہ انسانی کی فلاح و بہبود کے پیش نظر ایسا عادلانہ و منصفانہ نظام اقتصاد و معاشیات پیش کیا گیا ہے۔ جس میں ہر طبقہ انسانی کے حقوق کی حفاظت اور اس کی دارین کی ترقی کا انتظام ہے اور مختلف طبقات انسانیہ میں الفت و یگانگت و اخوت کا پورا پاس رکھا گیا ہے۔

بنیادی حقوق جیسا کہ عرض کیا گیا کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نظام اقتصاد پیش کیا۔ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیش کیا گیا ہے۔ اور جیسے ہر نظام کا مابعد الطبیعاتی یا فکری پس منظر ہوتا ہے۔ جس کی بنیاد پر اس نظام کی بنیادیں استوار کی جاتی ہیں۔ اسی طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش کردہ نظام اقتصاد و معاش کی چند مابعد الطبیعاتی اور فکری بنیادیں ہیں۔

پہلی بنیاد اللہ تبارک و تعالیٰ کی ربوبیت کبریٰ اور رزاقیت مطلقہ کا تصور ہے کہ اصلاً پوری انسانیت کی پرورش اور ضروریات کی کفالت اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔ قرآن کریم کی بے شمار آیات اور احادیث مبارکہ کا ذخیرہ اس حقیقت پر گواہ ہے ربوبیت الٰہیہ کا یہ نظام گو کائنات کے ذرہ ذرہ میں جاری و ساری و طاری ہے لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق چونکہ انسان نرا حیوان یا بڑھیا حیوان نہیں۔ بلکہ خلیفۂ الٰہی اور انسانی شرف و فضیلت کا حامل ہے۔ اور اس کی زندگی اور ضروریات صرف اس عالم میں ختم نہیں ہو جائیں گی۔ اس لئے اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کے نظام کی بنیاد انسان کے بارے میں چند موٹی موٹی صداقتوں پر رکھی۔

۱۔ اس کی دنیاوی اور معاشی بنیادی ضرورتیں کسی صورت میں نظر انداز نہ کی جائیں اور اس میں مومن و کافر کی تخصیص نہیں۔ چنانچہ قرآن کریم نے حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کے وقت ہی ان ضرورتوں کی کم از کم تحدید فرما کر اعلان فرمایا تھا۔

(ترجمہ) بلاشبہ تمہارا یہ حق ہے کہ تم یہاں نہ بھوکے رہو اور نہ ننگے رہو اور یہ کہ تم نہ پیاسے رہو اور نہ دھوپ کی تپش اٹھاؤ۔

یعنی انسان کے کم از کم بنیادی حقوق چار ہیں۔ روٹی۔ کپڑا۔ پانی۔ مکان۔

۲۔ چونکہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور جملہ انبیاء علیہم السلام کے نزدیک انسان کی ضروریات صرف اس عالم ہی میں منحصر نہیں۔ بلکہ یہ عالم ایک رہگزر ہے جہاں سے چل کر انسان نے اپنے اصلی ٹھکانے پہنچنا ہے۔ جہاں اس کا ہمیشہ ہمیشہ کا قیام ہوگا، اس لئے اس کی پرورش کا نظام اور اس کی دنیاوی جملہ حاجتوں کی کفالت کا حکیمانہ طریقہ وہ مقرر کیا گیا کہ یہاں کی ضروریات بھی بطرز احسن پوری ہوں اور آخرت کی زندگی بھی اس کے ساتھ ساتھ بنتی چلی جائے۔ چنانچہ قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

(ترجمہ) اور نہیں کوئی چلنے والا زمین پر مگر اللہ تعالیٰ کے ذمہ اس کا رزق ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی تھوڑے رہنے کی جگہ اور زیادہ رہنے کی جگہ بھی جانتا ہے۔ (ھود - ۱)

چنانچہ حدیث پاک میں دنیا کو آخرت کی کھیتی قرار دیا گیا کہ انسان کے ہر عمل کا پھل اسے آخرت میں ملے گا۔ اس لئے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جو طریقہ حیات دیا۔ وہ بیک وقت دین و دنیا دونوں کی بھلائی اور کفالت کا ضامن ہے۔

عادلانہ نظام

انسان چونکہ خلیفۃ الٰہی ہے۔ اس لئے اس کے خلافت کے جواہر و خصائص اور کمالات کی بقا کو اس نظام معاش و اقتصاد میں اس کے حیوانی تقاضوں سے بڑھ کر اہمیت دی گئی ہے۔ خلافت کے جواہر سے ہماری مراد انسان کی وہ اعلیٰ اقدار ہیں۔ جو اخلاق فاضلہ، رحم و کرم۔ جود و سخا۔ صبر و شکر۔ قربانی و ایثار۔ اخلاص و بے نفسی، غمگساری و چارہ سازی محبت والفت وغیرہ وغیرہ اوصاف حمیدہ کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں اور جن کی وجہ سے انسان اور حیوان میں امتیاز پیدا ہوتا ہے ان جواہر کی بقا اور آخرت کی زندگی کے بناؤ کے لئے مختلف و متفاوت صلاحیتوں کے انسانوں کے لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا منصفانہ اور عادلانہ نظام معیشت و اقتصاد پیش کیا۔ جس میں ہر فرد و طبقہ اپنی جملہ صلاحیتوں کو بطریق احسن بروئے کار لا سکے۔ اس کی دنیاوی اور معاشی حاجتیں بھی کما حقہٗ پوری ہو جائیں۔ اور اس کے اخلاق فاضلہ کو بھی کوئی گزند نہ پہنچے۔ بلکہ ہر طبقہ اور ہر گروہ کا انسان اس نظام معاش و اقتصاد میں محبت و چین، سکون و اطمینان اور بھائی چارے کی زندگی گزار سکے۔ جس میں طبقاتی کشمکش، گروہی کشاکش اور باہمی جنگ وجدل، رقابت و منافست کے جذبات کارفرما نہ ہوں، بلکہ ہر طبقہ انسانی دوسرے طبقہ کا ہمدرد و غمگسار، معاون و مددگار، خیر خواہ و خدمت گار بن کر زندگی گزارنے کو اپنی نجات و کامیابی کا ذریعہ سمجھے حضرت رسول انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: كُونُوا عِبَادَ اللهِ إِخْوَانًا (بخاری) اللہ کے بندو بھائی بھائی بن کر زندگی گزارو کہ تمہارے ایمان کا نشان یہ بھی ہے کہ جو بھلائی اپنے لئے چاہتے ہو۔ دوسرے انسانوں کے لئے چاہو۔ لا یؤمن احدکم حتی یحب للناس ما یحب لنفسہ (مسند احمد) تم میں سے اس وقت تک کوئی کامل مومن نہیں ہو سکتا۔ جب تک لوگوں کے لئے بھی اس چیز کو نہ چاہے جو اپنے لئے چاہتا ہے (مسند احمد صلہ)

اس لئے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نظام معاش و اقتصاد دیا۔ اس میں مزدور کے مفادات کی نگہداشت کو سرمایہ دار کا دین بنا دیا گیا۔ کاشتکار کے حقوق کی ادائیگی زمیندار کا مذہب قرار دیا گیا۔ مالدار کی جائز حاجتوں کو پورا کرنا مزدور کے لئے عبادت ٹھہری اور زمیندار کے حقوق کی ادائیگی کاشتکار کے لئے نیکی بنا دی گئی۔ حاکم و محکوم، کاشتکار و زمیندار، مزدور و مالدار ہر طبقہ و ہر گروہ کے مفادات کو آپس میں ٹکرایا نہیں۔ بلکہ انسانیت کی بنیاد پر جملہ طبقات کے حقوق کی حفاظت کرتے ہوئے انہیں آپس میں ایک جسد واحد کی طرح جوڑ دیا گیا کہ رب العالمین کے فرستادہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم انسانوں میں منافرت و حقارت، جنگ وجدل کے جذبات کو سازشوں یا انقلابی دعوتوں کے ذریعے بھڑکانے نہیں آئے تھے۔ بلکہ آپ کا پیام باہمی الفت و محبت بھائی چارہ اور یگانگت انسانی، ہمدردی و غمگساری کا تھا۔ بقول عارف رومی انبیاء علیہم السلام توڑتے نہیں آتے جوڑنے آتے ہیں۔ وہ مختلف طبقات کو آپس میں لڑاتے نہیں، جوڑتے ہیں۔

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

قرآن نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اخوت انسانیہ کے انعام کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے :۔

اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ط

سرمایہ دارانہ نظام ۱۔ دنیا میں عموماً معاشی بحران اور اقتصادی فساد جن وجوہ سے پھیلتا ہے ۔ اُن میں سے پہلی وجہ سرمایہ داری کا وہ ظالمانہ و بہیمانہ نظام ہے جسے قرآن نے قارونیت واکتنازیت (اکتناز دولت) کے نام سے یاد کیا ہے ۔ اس کی بنیاد شخصی یا طبقاتی فوائد (VESTED INTEREST) خود غرضی اور ذاتی منافع پر ہے ، سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ دار دولت وزمین کو اپنی پیدا کردہ ذاتی ملکیت سمجھتا ہے ۔ اور اس کے تصرف ونمو کا اپنے کو مختار مطلق گردانتا ہے جس میں وہ کسی خدائی ضابطہ یا حقیقی اخلاقی اقدار کا پابند نہیں ہوتا اور نہ ہی ملت و انسانیت اور دیگر طبقات انسانی کے مفادات کو اپنا ذاتی مفاد اور ان کے نفع وضرر کو اپنا نفع وضرر سمجھتا ہے ۔ قرآن کریم نے سرمایہ دار کے اس ذہن کا اشارۃً قارون اور قوم شعیب کے الفاظ میں بالترتیب اس طرح فرمایا ہے ، قارون کہتا ہے :۔

(ترجمہ) قارون نے کہا یہ سب مال و دولت مجھے اپنی ذاتی ہنرمندی سے ملا ہے ۔ (اس لئے میں اس کا مالک حقیقی ہوں اور اس لئے مجھے اس پر ہر طرح کے تصرف کا حق حاصل ہے) قوم شعیب نے کہا :۔

ترجمہ :۔ کیا تمہاری نماز تمہیں اس بات کا حکم دیتی ہے کہ ہم باپ دادوں کے معبودوں کو چھوڑ دیں ۔ یا اپنے اموال میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کرنا ترک کر دیں (۱۱ - ۸۶)

گویا سرمایہ دار مال و دولت کو صرف اپنی ملک سمجھتا ہے اور اس میں ہر جائز و ناجائز تصرف کو اپنے ذاتی مصالح و مفادات کے ماتحت جائز سمجھتا ہے ۔ خواہ اس کے اس عمل سے دوسرے طبقات کے حقوق کلیتہً یا جزواً سلب ہو جاتے ہوں ۔ قرآن کریم نے سرمایہ دار کی اس ذہنیت کا تذکرہ حضرت داؤد علیہ السلام کے سامنے ایک پیش شدہ مقدمہ کے تذکرہ میں تمثیل کے طور پر کیا ہے کہ ان کے سامنے ایک مقدمہ پیش ہوا ۔ اس میں دو فریق تھے ۔ ایک کے پاس (۹۹) ننانوے دنبیاں تھیں دوسرے کے پاس ایک ۔ ایک دنبی والے نے مرافعہ کیا کہ ۹۹ دنبی والا کہتا ہے کہ یہ ایک دنبی بھی مجھے دے دے کہ میری سو پوری ہو جائیں ۔ ہمارے نزدیک سرمایہ دار کی حرص وآز کا یہی عالم ہے ۔ وہ ہر جائز و ناجائز ذریعہ سے دولت کے جملہ منابع اور ذرائع پر قبضہ کر لیتا ہے اور چند دن میں دولت سمٹ کر چند ہاتھوں میں آجاتی ہے ۔

سرمایہ داری کی بنیاد جن بڑے بڑے ستونوں پر ہے ۔ وہ بے لگام آزاد و باطل نجی ملکیت کے علاوہ سود ، قمار (سٹہ وغیرہ) احتکار یعنی ذخیرہ اندوزی ، رشوت اور دیگر ناجائز آمدنیاں وغیرہ ہیں ۔ اس نظام پر تفصیلی نقد و تبصرہ کی یہاں گنجائش نہیں ورنہ بتایا جاتا کہ یہ ظالمانہ نظام کس طرح انسانیت کے جملہ اخلاقی و عادلانہ تقاضوں کو ختم کر دیتا ہے ۔ اس کے ضمن میں زمینداری کا وہ غیر اسلامی (FEUDAL SYSTEM) بھی ہے ۔ جو کسی خدائی ضابطہ اور حدود وقیود کا پابند نہیں ۔

اشتراکی نظام

سرمایہ دارانہ نظام میں " دولت " کی ناجائز و غلط لوٹ کھسوٹ کے ردِعمل میں وہ منفی نظام جسے اشتراکیت و اشتمالیت انقلابی سوشلزم وغیرہ ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ ہر اس دور میں وجود میں آتا رہا۔ جب بھی سرمایہ کی بدعملی نے نادار طبقات کی زندگی اجیرن کر دی۔ چنانچہ مصر قدیم میں فراعنہ کے عہد میں اس کے نقوش ملتے ہیں، افلاطون نے نظریاتی طور پر اسے کسی حد تک پیش کیا۔ مشہور یونانی مقنن سولن کے عہد میں سپارٹا میں لیکاو گا نے اصولِ اشتراکیت کے مطابق دولت کو مساوی تقسیم کر دیا۔ ایران قدیم میں مزدک نے زن، زر، زمین کے عام ہونے کا نعرہ لگایا۔ اٹھارویں و انیسویں صدی کے یورپ کے حالات نے اس ذہن کو جلا بخشی۔ جس کا سب سے بڑا نمائندہ کارل مارکس ہے۔ جس نے انجلز کے ساتھ مل کر اشتمالیت و اشتراکیت کو ایک مستقل مذہب بنا دیا اور بیسویں صدی میں لینن نے اسے عملی صورت بخشی اور اب روس و مشرقی یورپ کے علاوہ چین میں ماؤزے تنگ کی سرکردگی میں وہ ایک مستقل نظامِ حیات کی صورت میں رائج ہے اور دیگر ممالک میں یہ وبال نکالنے کی کوشش میں مصروف ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ اشتراکیت غلط سرمایہ کاری کا نتیجہ ہے۔ اس لئے اس کا مزاج ہر اس بات کا انکار کرتا ہے جو سرمایہ دارانہ نظامِ معاشں میں ساری و طاری ہے " ردِعمل " کے غیظ و غضب میں وہ سرمایہ دارانہ نظام کے غلط مالی خاکوں کو ہی نہ صرف مٹاتا ہے بلکہ جو چیز وہاں رائج تھی۔ اس کا قلع قمع بھی کر دیتا ہے۔ یورپ کے زمانہ وسطیٰ کے حالات جن کے ردِعمل نے مارکسزم کو جنم دیا۔ اس نظام پر اس طرح اثر انداز ہوئے کہ اس نے نہ صرف اقتصادی نظام کی نفی کی بلکہ بقول اقبال کے :

کردہ ام اندر مقاماتش نگاہ
لا کلیسا لا سلاطیں لا الٰہ

کا وہ منفی نعرہ بلند کر دیا۔ جو اشتراکی نظام کی رگ و پے میں سرایت کر گیا اور اشتراکیت کی بنیاد میں انکارِ خدا، انکارِ آخرت اور انکارِ اقدارِ روحانیہ اور اثبات پیٹ و مادیت سموگئی۔

دین آں پیغمبرِ ناحق شناس
بر مساوات شکم دارد اساس

گویا اب اشتراکیت ایک ایسا ملحدانہ نظامِ زندگی قرار پایا۔ جس میں خدا کی جگہ کارل مارکس نے، صحیفۂ آسمانی کی جگہ کیپٹل نے اور پیغمبر کی جگہ لینن و ماؤزے تنگ نے لے لی۔ اس کے اقتصادی نظام کی بنیاد ہیگل کے جدلیاتی نظریہ۔ ڈارون کے ارتقائی نظریہ کی بنیادوں پر استوار ہونے کے بعد طبقاتی باہمی کشاکش اور مزدور و کسان اور سرمایہ دار و زمیندار کی باہمی آویزش قرار پائی۔ یہ سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی گئی کہ دنیا میں اصل مسئلہ پیٹ اور صرف پیٹ کا ہے، اس بڑھیا حیوان کی حیوانی زندگی کی ضروریات کے جو مصادر و منابع تھے۔ باہمی کشمکش میں سرمایہ داروں نے قوت و حیلوں سے ان پر قبضہ کر کے ایک بڑے طبقہ کو آسائش زندگی سے محروم کر دیا۔ اور سرمایہ دار کے دھوکے اور دجل نے غریب و مزدور کو فریب دینے کے لئے مذہب کا افیون ایجاد کیا اور خدا پیغمبر اور آخرت دغیرہ کے نظریات اور دین کی حدود و قیود میں اسے الجھا کر پیٹ کے اصل مسئلہ سے بیگانہ کر دیا۔ اس لئے اشتراکی نظریہ میں جیسے سرمایہ دار کا وجود گالی ہے۔ اسی طرح نظریاتی اور عملی طور پر اشتراکی سوسائٹی میں خدا، پیغمبر اور دین کا وجود بھی برداشت نہیں کیا جا سکتا وہاں ایک ہی

نظریہ جاری ہوگا اور ایک ہی کی بات چلے گی۔ وہ مارکسی لینزم کی بات ہو۔ یا چیئرمین ماؤزے تنگ کی۔ جیسے ایک مملکت میں دو بادشاہ نہیں سما سکتے اشتراکی مملکت میں "اشتراکی مذہب" کے سوا دوسرا دین عملاً نہیں سما سکتا۔ جو اس کا انکار کرتا ہے۔ وہ حقائق کو جھٹلاتا ہے۔ خصوصاً اسلام جیسا مذہب جو زندگی کے جزو وکل پر حاوی ہے اشتراکی نظریات کی بقا کے ساتھ اس کا وجود قطعاً باقی نہیں رہ سکتا۔

طبقاتی کشاکش اشتراکیت چونکہ مالدار (HAVES) اور نادار (HAVENOTS) کی آویزش کی نقیب ہے۔ اس لئے انسانی آبادی کا وہ کثیر حصہ جسے سرمایہ داری کے ظالمانہ نظام نے قلاش بنا دیا ہے۔ یعنی مزدور، کسان، اس کے مسائل کے حل کرنے کی دعوت کو لے کر وہ آگے بڑھتی ہے۔ گویا وہ ایک "طبقہ" کے مسائل کے حل کی داعی ہے اور پوری انسانیت کے حل کا وہ خود بھی دعویٰ نہیں کرتی۔ اشتراکیت ذرائع آمدن اور مصادر و منابع پیداوار کی عام ملکیت کی قائل ہے۔ اس لئے "نجی ملکیت" کا وہ قطعاً انکار کرتی ہے لیکن عملاً اشتراکی ممالک میں "مصادر و منابع پیداوار" مملکت کی ملکیت قرار پاتے ہیں اور مملکت کی باگ ڈور چونکہ "کمیونسٹ پارٹی" کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ جو کہ ایک "محدود طبقہ پارٹی" ہوتی ہے۔ جس پر صرف چند چوٹی کے لیڈروں کا عملاً اختیار ہوتا ہے۔ اس لئے سب دولت و سرمایہ کے سپید و سیاہ کے مالک و حاکم اور مختار کل "کمیونسٹ پارٹی" بالفاظ دیگر اس کے چند سرکردہ لیڈر قرار پاتے ہیں۔ جن کے خلاف کسی آواز کا اٹھانا بغاوت قرار دیا جاتا ہے۔ اس طرح اشتراکی ممالک میں دولت و زمین غریب، مزدور و کسان کو نہیں ملتی۔ بلکہ سرکاری ملکیت بن کر کمیونسٹ پارٹی کے قبضہ میں چلی جاتی ہے۔ اور اس کے منافع بھی برابر تقسیم نہیں ہوتے۔ بلکہ جیسا کہ روس و دیگر ممالک کی تنخواہوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تنخواہ ۸۰ روبل یعنی ۵۰ روپے سے تیس ہزار روبل یعنی چھ ہزار روپے تک چلی گئی ہے (COMRAD YRON) بحوالہ اکنامکس آف اسلام صفحہ ۹۔

بہر حال اشتراکی تحریک مزدور و کسان اور نوجوان طالب علم کو سبز باغ دکھا کر ایسے نظام میں قید کر دیتی ہے جس سے بدتر آمرانہ نظام تاریخ میں نہیں دیکھا گیا۔ جہاں انسانی بنیادی آزادیوں کا حال یہ ہوتا ہے:

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

اقبالؒ نے سچ کہا ہے:

زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

اسلام نے ظالمانہ سرمایہ دارانہ نظام اور اس کے رد عمل، غیر فطری و باطل اشتراکی نظام کے مقابلہ میں جو نظام اقتصاد و معاشیات دیا۔ وہ انسانی فطرت کے عین تقاضوں کے مطابق ہے اور جملہ طبقات انسانی کی ضرورتوں کا کفیل اور انسانی مادی ضرورتوں اور دنیاوی حاجات کی کار برآری کے ساتھ اس کی روحانیت و آخرت کی کامیابی کا بھی کفیل ہے۔ معاشیات میں سب سے اہم مسئلہ ملکیت "زمین و مال" کا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام بے لگام آزاد نجی ملکیت کا قائل ہے۔ اشتراکیت قطعاً "نجی ملکیت" کی منکر ہے۔

حدودِ الٰہی

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا نظام اقتصاد و معیشت کی بنیاد چونکہ اللہ تعالیٰ کے تصورِ ربوبیت، مالکیت و حاکمیت وغیرہ پر ہے۔ اس لئے اسلام میں اصلاً کوئی انسان کسی چیز کا حقیقی مالک اور متصرف نہیں ہو سکتا۔ کائنات اور اس کی جملہ اشیاء زمین اور اس کی جملہ چیزوں کا مالک و متصرف و مختارِ حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم کی بیشتر آیات کا منشا ہے۔ الارض للہ۔ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ۔ لَهُ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ۔ لیکن اس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ انسانوں کو اپنا خلیفہ اور نائب بنا کر مجازی طور پر اپنے احکام اور نازل کردہ حدود و قیود کی پابندی کے ساتھ مختلف طبقات انسانیہ کو اُن کے مفادات کی رعایت کرتے ہوئے اور اُن کی صلاحیتوں کو روبکار لانے کے لئے جتنا مناسب سمجھے، زمین و دولت کا نجی مالک بنا دے۔ یہ نجی ملکیت آزاد اور انسانی چاہتوں کی پابند نہیں ہوگی۔ بلکہ الٰہی نجی ملکیت کا نظام آمدن و صرف ہر حیثیت سے احکام الٰہی کا پابند اور حدود الٰہیہ سے مقید ہوگا اور اس نجی ملکیت و دولت کا حصول و استعمال ایک امین کی حیثیت سے انسان کرے گا۔ گویا "اسلام" مقید و پابند حدودِ الٰہی نجی ملکیت (DIVINE CONTROLLED PRIVATE PROPERTY) کی اجازت دیتا ہے۔ جس کی ایک ایک پائی کی آمدن و صرف کا حساب اس نے اللہ تعالیٰ کو دینا ہوگا اور اگر وہ اللہ کے احکام کے مطابق آمد و خرچ نہیں کرے گا۔ تو وہ ایسا مجرم ہوگا۔ جس کی عبادات تک بعض اوقات مقبول نہیں ہوں گی کہ حرام کمائی والے کی نماز و حج و زکوٰۃ بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے مطابق مقبول نہیں ہیں۔ غرض حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا نظریہ ملکیت کے بارے میں یہ ہے ؎

در حقیقت مالک ہر شے خدا است

ایں امانت چند روزہ نزد ما است

یہ مال و دولت و نجی ملکیت اصلاً فضیلت و شرف کا سبب نہیں۔ بلکہ حکمتِ الٰہیہ نے اسے دے کر انسان کے اخلاقی جواہر و کمالات کو پرکھنا چاہا ہے کہ کیا انسان خلیفہ الٰہی اور "انسان" کی حیثیت سے اس کا استعمال کرتا ہے۔ یا حیوانوں اور درندوں کی طرح اخلاق کے تقاضوں کو ملیامیٹ کر دیتا ہے کہ اسلام کے نزدیک اصل کمال انسان کا مال و دولت نہیں بلکہ اس کا ایمان و عمل ہے۔

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقید و پابندِ حدودِ الٰہی نجی ملکیت کو اس طرح قائم فرمایا کہ اسلامی نجی ملکیت کی اجازت، ظالمانہ قارونی سرمایہ دارانہ نظام کو جنم نہ دے دے بلکہ دولت کی ایسی عادلانہ تقسیم ہو کہ ایک ہموار معاشی زندگی وجود میں آسکے جس میں ہر طبقہ انسانی کا ہر فرد راحت و چین کی زندگی گزار سکے اور نہ صرف اس کی حاجات ضروریہ ہی پوری ہوں بلکہ وہ معاشرہ میں باوقار اور خود کفیل اور فارغ البال انسان پرور خدا پرست شخص کی زندگی گزار سکے۔

"مقید اسلامی نجی ملکیت" کو ارتکاز دولت کا سبب بننے سے روک کر اسلامی معاشیات کی بنیاد قرار دیا گیا۔ قرآن کریم نے ایک مقام پر فرمایا۔

كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ (الحشر-۱)	تاکہ دولت تمہارے تونگروں میں سمٹ کر ہی نہ آ جائے۔

لیکن اسلام جہاں ارتکاز دولت کو روکتا ہے۔ وہاں انسان کے اخلاق و روحانیت خلافتی کمالات کی بقا کیلئے مساویانہ تقسیم دولت کا قائل نہیں، کہ اگر دولت سب میں برابر تقسیم ہو جائے تو جود و سخا، صبر و شکر، ایثار و قربانی، بھائی چارہ، غمگساری وغیرہ کی انسانی صفات بھی ختم ہو جاتی ہیں اور انسان صرف ایک حیوان یا ایک خود کار مشین بن کر رہ جاتا ہے۔ انسانی قویٰ و صلاحیتوں کے تفاوت کی بناء پر بھی یہ مساوات عادلانہ نہیں۔ کیا آپ کی عقل تسلیم یہ گوارا کرتی ہے۔ کہ ایک مجھ جیسا جاہل گنوار اور ایک یونیورسٹی کا اعلیٰ تعلیم یافتہ ماہر و حاذق استاد مالی اجرت کے لحاظ سے ایک ہی سطح پر لا کر کھڑے کر دیئے جائیں۔ اس لئے اسلامی مساوات کا نعرہ غلط ہے۔ اسلام کے نظام معاشیات میں مساوات نہیں مواسات یعنی ہمدردی و غمگساری ہے کہ ہر انسان کے درد کو اپنا سمجھو اور اس کی ضرورت کو اپنی ضرورت سمجھ کر پورا کرو۔ قرآن کریم نے اس عدم مساوات کا تذکرہ ان الفاظ میں فرمایا ہے:

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا (الاعراف)

ہم نے دنیاوی زندگی میں ان کی روزی کو تقسیم کر رکھا ہے۔ اور ہم نے ایک کو دوسرے پر درجات کے اعتبار سے فوقیت دی ہے تاکہ ان میں سے ایک دوسرے سے کام لے سکے

دوسری جگہ ارشاد ہے:-

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ (النحل)

اور اللہ تعالیٰ نے تم میں بعضوں کو بعضوں پر رزق میں فضیلت دی ہے۔

اسی طرح اسلامی نجی ملکیت کا انکار قرآن کریم کی تقریباً ایک چوتھائی احکام کا ابطال اور اسلام کے پورے نظام معاش کا انکار ہے۔ یہ بات بھی قطعاً غلط اور اسلام کے اصولِ اقتصاد اور انسانی فطرت کے خلاف ہے کہ کسی سے اس کی ساری نجی ملکیت کو طلب یا جبراً سلب کر لیا جائے۔ قرآن کریم اپنے حکیمانہ انداز میں فرماتا ہے:

وَإِنْ تُؤْمِنُوا وَتَتَّقُوا يُؤْتِكُمْ أُجُورَكُمْ وَلَا يَسْأَلْكُمْ أَمْوَالَكُمْ ۝ إِنْ يَسْأَلْكُمُوهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوا وَيُخْرِجْ أَضْغَانَكُمْ ۝ (محمد - ۳۷)

(دیکھو روح المعانی و تفسیر کبیر زیر آیت مذکورہ)

اور اگر تم ایمان و تقویٰ اختیار کرو تو اللہ تعالیٰ تم کو تمہارے اجر عطا کرے گا اور تم سے تمہارا سارا مال طلب نہیں کرے گا اگر تم سے تمہارے مال طلب کرے۔ پھر انتہا درجہ تک طلب کرتا رہے تو تم بخل کرنے لگو اور اللہ تعالیٰ (اس طرح تمہارے مال صرف کرنے کی فطری ناگواری) کو ظاہر کر دے۔

غرض اسلام نے نہ تو نجی ملکیت کو قطعاً ختم کیا نہ اسے بالکل آزاد و بے لگام چھوڑا بلکہ عادلانہ قوانین کے اجرائے سے اسے ایسا مقید و پابند کر دیا کہ دولت کی ناہموار تقسیم ختم ہو گئی۔

گنجِ شائگاں

مولانا ظفر علی خاں

حضورِ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی چالیس احادیث جمع کرنا باعثِ فوزِ عظیم ہے۔ مولانا جامیؒ نے اسی خیال کو پیشِ نظر رکھ کر چالیس احادیث کا منظوم ترجمہ اربعینِ جامیؒ کے نام سے فارسی میں کیا تھا، مولانا ظفر علی خاںؒ نے انھی احادیث کا ترجمہ اردو نظم میں کیا۔ وہ ۱۰ ستمبر ۱۹۲۷ء کے "زمیندار" میں شائع ہوا، وہ "گنجِ شائگاں" تبرکاً تیمناً ہدیۂ قارئین ہے:

۱ــــ لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ

مسلمانو اُسی صورت میں تم ہو اہلِ ایماں سے ۔۔۔ کہ جو الفت ہے اپنے نفس سے ہو اپنے اخواں سے

۲ــــ مَنْ اَعْطٰی لِلّٰہِ وَمَنَعَ لِلّٰہِ وَاَحَبَّ لِلّٰہِ وَاَبْغَضَ لِلّٰہِ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ اِیْمَانَہٗ

عطا و منع و حُبّ و کیں میں جو اللہ والے ہیں ۔۔۔ وہی ایماں میں کامل اور سیدھی راہ والے ہیں

۳ــــ اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِہٖ وَیَدِہٖ

نہ قول اور فعل ایذا نہ دیتا ہو جو مسلم کو ۔۔۔ تو اے مسلم! پہنچ جاتا ہے تو اسلام کی لم کو

۴ــــ خَصْلَتَانِ لَا یَجْتَمِعَانِ فِیْ مُؤْمِنٍ اَلْبُخْلُ وَسُوْءُ الْخُلُقِ

سرشتِ اسلام کی ہے مانعِ بخل و بد اخلاقی ۔۔۔ نہ اقص میں ہمیشہ سے چلی آتی ہے ناچاقی

۵ــــ یُشِیْبُ اِبْنُ اٰدَمَ وَتَشُبُّ فِیْہِ خَصْلَتَانِ اَلْحِرْصُ وَطُوْلُ الْاَمَلُ

ہوا و حرص ہے دسمہ تمہاری زندگانی کا ۔۔۔ بڑھاپے پر اسی سے رنگ چڑھتا ہے جوانی کا

۶ــــ مَنْ لَّمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَمْ یَشْکُرِ اللّٰہَ

وہ انساں جو نہیں منت پذیر انساں کے احساں کا ۔۔۔ ادا حق اُس سے ہو سکتا نہیں ہے شکرِ یزداں کا

۷ــــ مَنْ لَّا یَرْحَمُ النَّاسَ لَا یَرْحَمُہُ اللّٰہُ

نہ آیا رحم جس کو بےکسوں اور ناتوانوں پر ۔۔۔ لگائی مہر اس نے حق کی رحمت کے خزانوں پر

۸ــــ اَلدُّنْیَا مَلْعُوْنَۃٌ وَمَلْعُوْنٌ مَا فِیْھَا اِلَّا ذِکْرُ اللّٰہِ تَعَالٰی

یہ دنیا اور جو کچھ اس میں ہے لعنت کے قابل ہے ۔۔۔ مگر جس کو خدا یاد آئے وہ رحمت کے قابل ہے

۹ــــ دُمْ عَلَی الطَّھَارَۃِ یُوْسَعْ عَلَیْکَ الرِّزْقُ

اگر آلودہ داماں کو طہارت سے گرائش ہو ۔۔۔ تو دن تنگی کے سب کٹ جائیں روزی میں کشائش ہو

۱۰ — لَا يُلْدَغُ الْمُؤْمِنُ مِنْ جُحْرٍ وَّاحِدٍ مَّرَّتَيْنِ

مکرر نیش عقرب کا مزہ عاقل نہیں چکھتا
اُسی سوراخ پر اُنگلی مسلماں پھر نہیں رکھتا

۱۱ — اَلْوَعْدَةُ دَيْنٌ

کسی سے وعدہ کرتے ہو تو لازم ہے وفا کرنا
کہ یہ اک قرض ہے اور فرض ہے اس کا ادا کرنا

۱۲ — اَلْمَجَالِسُ بِالْاَمَانَةِ

کسی محفل میں شامل ہو تو اس نکتہ پہ عامل ہو
کہ راز اس کی امانت ہے بنے تم جس کے حامل ہو

۱۳ — اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ

کسی کو مشورہ دے کر وہی کچھ راز دیں سمجھے
جو اپنے آپ کو اس کے مصالح کا امیں سمجھے

۱۴ — اَلسَّمَاحُ رِبَاحٌ

یقینی نفع ہے جس میں سخاوت وہ تجارت ہے
خدا کی راہ میں دینا نہیں جاتا اکارت ہے

۱۵ — اَلدَّيْنُ شَيْنُ الدِّيْنِ

نہ ڈالو اے مسلمانو! گلے میں قرض کا پھندا
مہاجن کی کرے کیوں بندگی اللہ کا بندہ

۱۶ — اَلْقَنَاعَةُ مَالٌ لَّا يَنْفَدُ

گھٹانے سے نہیں گھٹتا قناعت مال ہے ایسا
ہے رونق اس سے گودڑ کی چھپا یہ لال ہے ایسا

۱۷ — نَوْمُ الصُّبْحَةِ تَمْنَعُ الرِّزْقَ

چڑھے دن تک پڑے لیتے ہیں خراٹے جو بستر پر
نہیں رہتا کوئی حق ان کی روزی کا مقدر پر

۱۸ — آفَةُ السَّمَاحِ الْمَنُّ

کسی پر گر کرو احساں تو بھولے سے نام اُس کا
سخاوت کا یہ ہے سودا اور لینا ہے حرام اس کا

۱۹ — اَلسَّعِيْدُ مَنْ وُّعِظَ بِغَيْرِهٖ

سعادت اس نے کی ہے ایزدِ متعال سے حاصل
ہوئی ہے جس کو عبرت دوسروں کے حال سے حاصل

۲۰ — كَفٰى بِالْمَرْءِ اِثْمًا اَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ

زباں سے کان کی گر پردہ داری ہو نہیں سکتی
بڑی اس سے کوئی لغزش تمہاری ہو نہیں سکتی

۲۱ — كَفٰى بِالْمَوْتِ وَاعِظًا

اجل سے بڑھ کر واعظ کیا کریں گے نکتہ آموزی
جو کرنی ہے تو کر لو موت ہی سے عبرت اندوزی

۲۲ — خَيْرُ النَّاسِ اَنْفَعُهُمْ لِلنَّاسِ

کوئی انساں اُس انساں کے درجہ کو نہیں پہنچا
کہ اس کی ذات سے لوگوں کو نفعِ بہتریں پہنچا

۲۳ ——— اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ السَّھْلَ الطَّلْقَ

خدا رکھتا ہے اُس کو دوست جو ہنس مکھ ہو خوشخو ہو
شگفتہ جس کی فطرت ہو کشادہ جس کا ابرو ہو

۲۴ ——— تَھَادُوْا تَحَابُّوْا

محبت ہدیہ و سوغات دے کر بڑھ ہی جاتی ہے
جو سیلاب آئے ندی میں تو آخر چڑھ ہی جاتی ہے

۲۵ ——— اُطْلُبُوا الْخَیْرَ عِنْدَ حِسَانِ الْوُجُوْہِ

ہے جس کی صورت اچھی اُس سے کرنا ہے سوال اچھا
کہ حال اچھا ہے جس کا غالباً اس کا ہے فال اچھا

۲۶ ——— زُرْغِبًّا تَزْدَدْ حُبًّا

ملاقاتوں میں لطف آتا ہے کچھ مدت کی دوری سے
گھٹا نے کیوں ہو اس کو رات اور دن کی حضوری سے

۲۷ ——— طُوْبٰی لِمَنْ شَغَلَہٗ عَیْبُہٗ عَنْ عُیُوْبِ النَّاسِ

مبارک وہ ہیں جو عیب اپنے رکھتے ہیں نگاہوں میں
نظر جن کی نہیں اُلجھی ہے غیروں کے گناہوں میں

۲۸ ——— اَلْغِنٰی اَلْیَاسُ مِمَّا فِیْ اَیْدِی النَّاسِ

اگر کرنا ہے نکتہ بے نیازی کا تجھے ازبر
تو جو کچھ دوسروں کا ہے نہ رکھ ہرگز نظر اُس پر

۲۹ ——— مَنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُہٗ مَا لَا یَعْنِیْہِ

عیاں ہو جائے گا اسلام کی خوبی کا راز اس سے
کہ جو کچھ بے ضرورت ہو بجا ہے احتراز اُس سے

۳۰ ——— لَیْسَ الشَّدِیْدُ بِالصُّرَعَۃِ اِنَّمَا الشَّدِیْدُ الَّذِیْ یَمْلِكُ نَفْسَہٗ عِنْدَ الْغَضَبِ

صفوں کو تم نے اُلٹا، پہلوانوں کو پچھاڑا بھی
مگر غصہ میں دیو نفس کا لشکر اکھاڑا بھی؟

۳۱ ——— لَیْسَ الْغِنٰی عَنْ کَثْرَۃِ الْعَرَضِ اِنَّمَا الْغِنٰی غِنَی النَّفْسِ

غنی اس کو نہ سمجھو جس کے گھر میں نقد و زر ہو
غنی اس شخص کو کہتے ہیں جو دل کا تونگر ہو

۳۲ ——— اَلْحَزْمُ سُوْءُ الظَّنِّ

اگر ہو تو یہی محتاط ہونے کی نشانی ہو
کہ اپنے اوپر انساں کو ہمیشہ بدگمانی ہو

۳۳ ——— اَلْعِلْمُ لَا یَحِلُّ عَنْہُ صَدٌّ

ہر اک انساں کو حق ہے علم کی دولت سے ہو فائز
کسی کو روکنا اس سے نہیں اسلام میں جائز

۳۴ ——— اَلْکَلِمَۃُ الطَّیِّبَۃُ لِلسَّائِلِ صَدَقَۃٌ

اگر خالی ہو جیب اور مرتبہ سائل کا پہچانو
تو میٹھی بات کو خیرات کا نعم البدل جانو

۳۵ ——— کَثْرَۃُ الضِّحْكِ تُمِیْتُ الْقَلْبَ

ہنسو لیکن نہ اتنا جس سے دل پژمردہ ہو جائے
طبیعت ہو منغّص اور مذاق افسردہ ہو جائے

۳۶ ——— اَلْجَنَّةُ تَحْتَ اَقْدَامِ الْاُمَّهَاتِ

زمیں پھیلی ہوئی ہے جس طرح افلاک کے نیچے ‌ ‌ ‌ یُونہی جنت بھی ہے ماں کے قدم کی خاک کے نیچے

۳۷ ——— اَلْبَلَاءُ مُوَکَّلٌ بِالْمَنْطِقِ

زباں اس کو نہ سمجھو ہے یہ اک آفت کا پر کالا ‌ ‌ ‌ نہ رکھو گے جو قابو میں تو کر دے گی نہ و بالا

۳۸ ——— اَلنَّظَرَةُ سَهْمٌ مَّسْمُوْمٌ مِنْ سِهَامِ اِبْلِیْسَ

نظر کا تیر نامحرم پہ جب تم نے چلایا ہے ‌ ‌ ‌ اُسے ابلیس نے زہرِ ہلاہل میں بجھایا ہے

۳۹ ——— لَا یَشْبَعُ الْمُؤْمِنُ دُوْنَ جَارِهٖ

نہیں ہے شائبہ تک اس میں لے مسلم تری خُو کا ‌ ‌ ‌ کہ خود تو پیٹ بھر کر کھائیں ہمسایہ رہے بھُوکا

۴۰ ——— لُعِنَ عَبْدُ الدِّیْنَارِ وَ لُعِنَ عَبْدُ الدِّرْهَمِ

جہاں میں جس قدر ہیں درہم و دینار کے بندے ‌ ‌ ‌ ہیں ان کے واسطے پھیلے ہوئے پھٹکار کے پھندے

انسانیت کا منشورِ آزادی

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی

ہجرت نبوی کا دسواں سال تھا۔ عیسوی ۶۳۲ء فروری کا مہینہ آیا تو سرور کائنات مفخرِ موجودات رسول اکرم ابی و امی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی بار حج بیت اللہ کا ارادہ فرمایا اور اپنے صحاب کو بھی تیاری کا حکم دیا۔ کیونکہ حج ۹ھ میں فرض ہوا تھا اور عام روایت یہی ہے کہ حضور اکرم نے ایک ہی حج کیا تھا۔ سفر حج کی تیاری کا اعلان ہوتے ہی لوگوں کے انبوہ مدینہ میں جمع ہونے لگے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ آپ ۲۴ ذی قعدہ یعنی ۲۲ فروری ۶۳۲ء جمعرات کو مدینہ سے باہر نکلے اور ذو الحلیفہ میں تشریف لائے۔ وہاں غسل کر کے خطمی اور بالچھڑ (سنبل الطیب) سے سر دھویا، مشک کی خوشبو بالوں میں لگائی۔ حتیٰ کہ سر کے بالوں میں اور ریش مبارک میں سفیدی نظر آنے لگی۔ پھر مسجد میں دو رکعت نماز پڑھی، ایک تہبند اور ایک چادر کا احرام باندھا۔ پھر بلند آواز سے تلبیہ پڑھا۔ لبیک اللھم لبیک لبیک لاشریک لک لبیک ان الحمد والنعمۃ لک والملک لا شریک لک لبیک۔ قافلہ روانہ ہوا تو راستہ میں بھی لوگ اس میں شریک ہوتے گئے۔ مکہ کے قریب پہونچ کر آپ نے ذی طوی میں قیام فرمایا اور صبح کو بالائی حصہ سے مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے۔ بیت اللہ شریف میں تشریف لائے۔ رکن یمانی کو بوسہ دیا۔ پھر سات بار طواف کیا۔ اس طرح کہ تین بار طواف میں سینہ تان کر چلے اور چار بار معمولی انداز سے۔ دونوں رکن ہائے یمانی کے درمیان پہنچ کر آپ یہ دعا پڑھتے تھے۔ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدنیا حسنۃً وفی الاخرۃ حَسَنَۃً وقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ پھر مقام ابراہیم کی طرف تشریف لائے اور یہ آیت باآواز بلند تلاوت کی۔ وَاتَّخِذُوْا من مقام اِبْراھِیْمَ مُصَلّٰی یہاں دو رکعت نماز پڑھی۔ پہلی رکعت میں قل ھو اللہ احد اور دوسری رکعت میں قل یاَیُّھا الکٰفِرُوْنَ کی تلاوت فرمائی۔ پھر رکن یمانی کی طرف آکر اُسے بوسہ دیا۔ اب آپ کوہ صفا پر تشریف لے گئے۔ وہاں یہ آیت پڑھی۔ ان الصفا والمروۃ من شعائر اللہ۔ پہلے آپ کوہ صفا پر اتنی بلندی پر چڑھے کہ بیت اللہ وہاں سے نظر آرہا تھا۔ اس وقت آپ نے بآواز بلند پڑھا۔ لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ لہ الملک ولہ الحمد وھو علی کل شیءٍ قدیر۔ لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ أنجز وعدہٗ ونصر عبدہٗ وھزم الأحزاب وحدہٗ۔ پھر صفا سے اتر کر مروہ کی طرف جاتے ہوئے بطن وادی میں اترے تو تیزی سے چلے اور مروہ کی بلندی پر قدم مبارک آہستہ ہو گئے۔ جو تکبیر صفا پر پڑھی تھی وہی یہاں بھی پڑھی۔

۸ ذی الحجہ کو ترویہ کا دن آیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سواری پر سوار ہو کے منیٰ میں ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور فجر پانچ نمازیں پڑھیں اور اتنی دیر قیام فرمایا کہ آفتاب قدرے بلند ہو گیا ۹ ذی الحجہ کو وہاں سے کوچ کیا، اور مقام نمرہ میں نزول فرمایا۔ جب نمرہ میں خوب دھوپ پھیل گئی تو آپ نے اپنی اونٹنی طلب فرمائی۔ جس کا نام قصواءً تھا۔ اس پہ کجاوہ کسا گیا۔ آپ سوار ہو کر بطن وادی یعنی میدانِ عرفات میں تشریف لائے۔ یہاں حدِ نظر تک انسانوں کا ہجوم تھا۔ سارا میدان کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تمام اصحاب رسولؐ بآواز بلند تکبیر و تہلیل و تسبیح و تقدیس میں مصروف تھے۔

مورخین نے اس مجمع کا اندازہ ایک لاکھ ۴۰ ہزار بتایا ہے بعض نے ایک لاکھ ۲۴ ہزار لکھا ہے۔ یہاں آپ نے وہ عظیم الشان تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا جسے بجا طور پر انسانیت کا منشور آزادی CHARTER OF HUMAN FREEDOM کہا جاسکتا ہے۔

ایک لاکھ سے زائد انسانوں کا مجمع تھا، جن کی خوش نصیب آنکھیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روئے مبارک پر جمی ہوئی تھیں۔ آپ اپنی اونٹنی قصواء پر بیٹھے تقریر فرما رہے تھے۔ سارے میدان عرفات میں ایسا ادب آمیز سکوت تھا کہ ہر شخص کے کانوں تک سرور کائنات کی مبارک شیریں، دلنواز اور سراپا اعجاز آواز پہنچ رہی تھی۔ یوں تو حضور کا ہر فعل اور ہر قول "حدیث" ہے اور اس میں زندگی اور معاشرت کے ہزاروں لاکھوں مسائل اور معاملات کے بارے میں احکام موجود ہیں، لیکن آج ایک ایسا اجتماع تھا جو نہ پہلے کبھی چشم فلک نے دیکھا تھا، نہ یہ دنیا ان قدسی صفات انسانوں کے درمیان ایک شہنشاہ دو عالم رحمت مجسم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے پھر کبھی سن سکے گی۔

آج آپ نے ان احکام کی طرف واضح اشارے کیے جن کا تعلق سارے عالم انسانیت سے تھا۔ خواہ گورے ہوں یا کالے امیر ہوں یا غریب، شریف ہوں یا رذیل، پڑھے لکھے ہوں یا جاہل، غلام اور باندیاں ہوں یا آزاد، آپ نے اس آخری پیغام میں واضح کر دیا کہ انسانوں کی معاشرت کے عائد کیے ہوئے وہ سارے مصنوعی بندھن جو دوسرے انسانوں کے استحصال کے لیے ہیں، توڑے جاتے ہیں۔ انسان کی فطرت اور بنیادی آزادی کو بحال کیا جاتا ہے۔ انسانوں کے وہ حقوق جن پر غاصبوں نے قبضہ کر رکھا ہے اور اللہ کے بندوں کو جو فطرت کی طرف سے مساوی صلاحیتیں اور مساوی انعامات لے کر پیدا ہوئے تھے، کہیں غلام بنا لیا ہے، کہیں ان کا استحصال ہو رہا ہے۔ کہیں انھیں سماج کی طبقہ بندی میں نچلی سطح پر پھینک دیا گیا ہے کہیں وہ پیٹ بھر کھانے سے محروم ہیں کہیں انکے جسم پر پورا لباس بھی نہیں ہے، کہیں عورتوں کو مردوں سے کمتر درجہ کی مخلوق سمجھا جاتا ہے، کہیں حاکموں کو یہ غرہ ہو گیا ہے کہ ان کے محکوم بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکے جا سکتے ہیں اور متاع بازار کی طرح آنکے جا سکتے ہیں کسی کو اپنے نسب اور حسب پر گھمنڈ ہے کسی کو رنگ و نسل کا غرور ہے، کوئی اپنے تئیں خدا کی برگزیدہ مخلوق سمجھ بیٹھا ہے۔ یہ سب وہ طریقے اور مظاہرے ہیں جن میں ایک انسان دوسرے کا استحصال کرتا ہے اس کے حقوق کو پامال کرتا ہے، اور دنیا میں اللہ نے جن نعمتوں کو سب کے لیے عام کر دیا ہے، ان سے ایک کمزور طبقے کو محروم رکھ کر انھیں غریب، پسماندہ اور مفلوک الحال بنا دیتا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ خطبہ رہتی دنیا تک کے لیے عظمت انسانیت کا اعلان کرتا ہے۔ یہ بتاتا ہے کہ تمام نوع بشر کے حقوق برابر ہیں۔ اور کسی کو کمزور طبقے پیدا کرنے، پھر ان کا استحصال کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ آج اقوام متحدہ کی فلک بوس عمارتوں میں بیٹھ کر اقوام عالم کے سینکڑوں نمائندے CHARTER OF HUMAN RIGHTS بناتے ہیں۔ اس پر لمبے چوڑے مباحثے اور سیمینار کرتے ہیں۔ مگر اس کا نفاذ نہیں کر پاتے۔ صحرائے حجاز میں ایک نبی امی نے میدان عرفات میں اونٹنی کی پیٹھ پر بیٹھ کر جو آواز بلند کی تھی وہ چودہ سو برس سے فضائے عالم میں گونج رہی ہے۔ ذرا غور کیجئے اس میں کونسا پہلو ایسا ہے جو تمام بنی نوع انسان کے حقوق کا اور انسانیت کی عظمت و شرف کا اعتراف نہیں کرتا؟ اس سے زیادہ واضح، پرسوز اور اثر انگیز آواز میں کیا آج تک دنیا کے کسی مصلح کسی ریفارمر کسی لیڈر، کسی رہنما کی آواز انسانیت کے کانوں نے سنی ہے؟ سرکار دو عالم نے فرمایا:

"لوگو! مجھے امید نہیں ہے کہ ہم تم پھر کبھی اس جلسہ میں اکٹھے ہو سکیں گے۔ دیکھو تمہارا خون تمہارا مال اور تمہاری آبرو ایک دوسرے پر ایسے ہی حرام ہیں جیسے وہ آج کے دن اس شہر میں اور اس مہینہ میں حرام ہیں۔

— دیکھو تم اپنے رب سے ملوگے تو وہ تم سے تمہارے اعمال کے بارے میں باز پرس کرے گا خبردار میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا۔ کبھی آپس میں ایک دوسرے کی گردن کاٹنے لگو۔

دیکھو جاہلیت کی ہر بری رسم کو میں اپنے پیروں تلے روندتا ہوں۔ دور جاہلی کے تمام خون کا بدلہ اپنے پیروں تلے رکھتا ہوں۔ اور سب سے پہلے میں خود ربیعہ بن الحارث کے بیٹے کا قصاص چھوڑتا ہوں جس نے بنی سعد کا دودھ پیا تھا اور جسے بنو ہذیل نے قتل کیا تھا۔

جاہلی کے دور کے سارے سود بھی ختم اور سب سے پہلے میں اپنے خاندان سے عباس بن عبدالمطلب کا سُود چھوڑتا ہوں۔

لوگو! اپنی بیویوں کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہنا۔ تم نے اللہ کی ذمہ داری پہ انھیں اپنا بنایا ہے۔ اور اللہ کے کلام سے ان کے جسم کو اپنے لئے حلال کیا ہے۔ عورتوں پہ تمھارا حق یہ ہے کہ وہ تمہارے بستر پہ کسی غیر کو نہ آنے دیں اور ان کا حق تم پہ یہ ہے کہ انھیں اچھی طرح کھلاؤ اور پہناؤ۔

دیکھو! میں نے تمہارے درمیان وہ چیز چھوڑی ہے کہ اسے مضبوط پکڑ لوگے تو تم گمراہ نہیں ہوگے۔ وہ اللہ کی کتاب ہے۔

لوگو! یقیناً نہ میرے بعد کوئی نبی آئے گا نہ تمہارے بعد کوئی امت آنے والی ہے۔ دیکھو اپنے رب کی عبادت کرتے رہنا۔ پانچوں وقت نماز پڑھنا۔ ایک مہینہ روزے رکھنا۔ اپنے مال کی زکوٰۃ خوش دلی کے ساتھ ادا کرتے رہنا اور بیت اللہ کا حج کرنا۔ اپنے حاکموں کی اطاعت کرنا تاکہ تم اپنے رَبّ کی جنت میں داخل ہوسکو۔

اور دیکھو! کل قیامت کے دن تم سے میرے بارے میں سوال کیا جائے گا، بتاؤ تم کیا جواب دوگے؟

سب نے کہا! ہم گواہی دیں گے کہ آپ نے اللہ کے احکام پہونچا دیئے اور حق رسالت ادا کیا۔ اور ہماری خیر خواہی کی باتیں ہمیں بتا دیں اس پہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انگشت شہادت آسمان کی طرف بلند کی پھر تین بار فرمایا "اے اللہ گواہ رہیو۔ اے اللہ گواہ رہیو۔ اے اللہ گواہ رہیو۔"

دیکھو! جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ میرا پیغام ان لوگوں تک پہونچا دیں جو اس وقت حاضر نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ ان سننے والوں سے زیادہ سمجھ دار ہوں —"

یہ تھا وہ انسانیت کا منشور آزادی اس میں جو اصول آ گئے ہیں اب ان پہ غور کر لیجئے۔

پہلا اصول: PEACEFUL CO-EXISTENCE کا ہے۔ جیو اور جینے دو۔ اور یہی وہ بنیادی حق ہے جس کے لیے آج تیسری دنیا جدوجہد کر رہی ہے اور عالمی طاقتیں اسے یہ حق دینے پہ تیار نہیں ہیں۔

دوسرا اصول: آپ نے انتقام کے چکر کو ختم کرنے کا اعلان کیا۔ جو افراد اور قوموں کی زندگی میں سب سے بڑی فساد کی جڑ ہے۔ آج کی اصطلاح میں یہ جذبۂ انتقام، توازنِ طاقت BALANCE OF POWER کے خوبصورت نام کی آڑ میں پرورش پاتا ہے۔ اور اسے "نزع سلاح" یعنی DISARMAMENT کی تحریک سے دبانے کی ساری کوششیں ناکام ہو رہی ہیں۔

تیسرا اصول: آپ نے عورتوں کے حقوق کی تاکید فرمائی۔ آج کی دنیا میں WOMENS LIBERTY کی تحریک کا خلاصہ بھی یہی ہے۔ مگر اس نے عورتوں کے فرائض پہ دھیان نہیں دیا۔ اسی لئے مغرب کی میکانکی زندگی میں ازدواجی رشتے اکثر ناکام ہو جاتے ہیں۔ آپ نے مرد

اور عورت دونوں کے حقوق کی وضاحت کر دی ہے اور بتا دیا ہے کہ عورت سے عفت و عصمت اور وفاداری کا مطالبہ کرنا مرد کا حق ہے۔

چوتھا اصول: اس خطبہ میں تصور آخرت کو یاد دلایا، جو اسلامی عقیدہ کی اساس ہے۔ اگر کوئی فرد یا معاشرہ خود کو ACCOUNT ABILITY سے آزاد سمجھنے لگے تو ظاہر ہے کہ اس سے ظلم و شر کے سوا کچھ سرزد نہیں ہوگا اور اسے کسی چیز کی دہائی نہیں دی جا سکتی۔ آج کی اصطلاح میں اسی کو AUTHORITARIANISM اور CHAUVINISM کہا جاتا ہے۔ ایک خدا ترس سوسائٹی میں ظلم و جبر و پنپنے کے لیے مشکل ہی سے سازگار ماحول مل سکتا ہے۔

پانچواں اصول: آپ نے اتفاق و اتحاد کی تلقین فرمائی کہ تم آپس میں ایک دوسرے کی گردن نہ مارنے لگنا۔

چھٹا اصول: اس میں فرسودہ روایات کی بیخ کنی کر کے ایک صحت مند سماجی انقلاب کی دعوت دی گئی ہے اور صاف اعلان فرمایا کہ جاہلی رسمیں، سند نہ سمجھی جائیں یہ RADICALISM کی بنیاد ہے۔

ساتواں اصول: سود کی مخالفت کر کے آپ نے اقتصادی زندگی سے استحصال کا خاتمہ کر دیا۔

آٹھواں اصول: تمام مسلمانوں کو کتاب اللہ کی طرف بلایا۔ جو اسلامی معاشرہ کا بنیادی دستور ہے۔ ختم نبوت کا عقیدہ بھی واضح کر دیا۔ گویا اس دستور میں ترمیم کی گنجائش نہیں ہے۔

نواں اصول - ارکان اسلام ادا کرنے کی تاکید فرمادی۔

دسواں اصول - حاکمانِ وقت کی اطاعت کی تلقین سے یہ مراد ہے کہ لا اینڈ آرڈر کے مسائل اور سیاسی خلفشار پیدا نہ ہو۔ اولوالامر کا انتخاب چونکہ جمہوری طریقہ پر ہوتا تھا، اسے تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ مگر اس کی حکومت کو بدنظمی اور انتشار کا شکار نہ بنایا جائے۔

آخر میں یہ بھی فرما دیا کہ اس CHARTER OF HUMAN RIGHTS کو دنیا کے کونے کونے میں عام اور شائع کر دیا جائے تاکہ ساری انسانیت اپنے حقوق پہچان لے اور ان کے حصول کی جد و جہد اور حصول کے بعد حفاظت کرے۔ اس کے بعد قرآن کریم کی وہ آیت نازل ہوئی۔ الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی۔ آج کے دن میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمتوں کو تمہارے لیے تمام کر دیا۔

حجۃ الوداع

مولانا غلام رسول مہر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا آخری بڑا واقعہ حجۃ الوداع ہے۔ حج فرض ہونے کے بعد یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا اور آخری حج تھا۔ اسی موقع پر دین قیم کی تکمیل ہوئی۔ حضور صلعم نے منیٰ اور عرفات میں جو خطبات ارشاد فرمائے۔ ان میں اسلامی تعلیمات کے متعلق بعض نہایت اہم بنیادی امور کا ذکر تھا۔ سب سے آخر میں یہ کہ حضور صلعم جس فرض نبوت کی بجا آوری کے لیے مبعوث ہوئے تھے، وہ ہر لحاظ سے پایۂ تکمیل پر پہنچ چکا تھا۔ رسالت کا اصل مقصد پورا ہو چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضور صلعم نے حجۃ الوداع کے خطبات میں جو کچھ ارشاد فرمایا، اس نے طبعاً وصایا کی حیثیت اختیار کر لی تھی یہی وجہ ہے کہ حجۃ الوداع کو سیرت طیبہ میں خاص اہمیت حاصل ہے۔

حج ہجرت کے نویں سال فرض ہوا تھا۔ اسی سال حضور صلعم نے حضرت ابو بکرؓ کو امیر الحج بنا کر مکہ معظمہ بھیج دیا پھر سورۂ برأت کی چالیس آئیتیں نازل ہوئیں تو حضرت علیؓ کو یہ آئیتیں دے کر مکہ معظمہ کی طرف روانہ فرمایا تاکہ حج کے موقع پر یہ سب کو سنا دی جائیں۔

حضور صلعم کا عزم حج

ہجرت کے دسویں سال ذی قعدہ کے مہینے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حج کا ارادہ فرمایا یہ خبر مشہور ہوئی تو ہزاروں مسلمان بے تابانہ شرف معیت حاصل کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ حضور صلعم ۲۶ ذی قعدہ ۱۰ھ (۲۳ اپریل ۶۳۲ء) کو ہفتے کے روز مدینہ منورہ سے چلے اور ذوالحلیفہ میں مقام کیا، جو اہل مدینہ کے لیے میقات ہے اور تقریباً چھ سات میل کے فاصلے پر ہے۔ آج کل اس مقام کو "آبادِ علی" کہتے ہیں۔

۲۷ ذی قعدہ کو قافلہ نبوی ذوالحلیفہ سے چلا اور ان الفاظ میں تلبیہ شروع ہوا۔

لبیک لبیک اللّٰھم لبیک لاشریک لک لبیک ان الحمد والنعمۃ لک والملک لک لا شریک لک۔

ہم حاضر ہیں، ہم حاضر ہیں، اے خدا تیرے سامنے حاضر ہیں۔ تیرا کوئی شریک نہیں ہم حاضر ہیں۔ ہر ستائش صرف تیرے لیے ہے اور ہر نعمت تیری ہے۔ سلطنت بھی تیری ہے۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔

موقع کا راوی بتاتا ہے کہ میں نے آگے پیچھے اور دائیں بائیں دیکھا، جہاں تک بصارت مساعدت کرتی تھی، آدمیوں ہی کا جنگل نظر آتا تھا۔ حضور صلعم کی زبان مبارک سے لبیک کی صدا بلند ہوتی تو ہر طرف سے اس کی آواز بازگشت آتی اور گرد کے میدان اور پہاڑ گونج اٹھتے۔

اس واقعہ پر چودہ سو سال گزر چکے ہیں اور ہمارے تمام دینی اعمال کی حیثیت اب بڑی حد تک رسمی سی رہ گئی ہے۔ مگر آج

بھی موسم حج میں مکہ معظمہ کی مقدس فضا کے اندر اور اس متبرک مقام کے تمام راستوں پر عازمین حج کا تلبیہ سن کر ہر انسان خدا پرستی کا ایک نادیدہ پیکر بن جاتا ہے۔ جن خوش نصیبوں نے ۲۷ رذی قعدہ ۱۰ھ کو خود حضور صلعم کے زیر قیادت کم و بیش ایک لاکھ اہل حق کے تلبیہ کا منظر دیکھا ہوگا، کون کہہ سکتا ہے کہ ان کے دلوں اور روحوں کا نقشہ کیا ہوگا۔

تلبیہ کی معنوی حیثیت

پھر تلبیہ کی معنوی حیثیت پر غور فرمایئے۔ اس کی مرکزی روح توحید ہے، جو دین حق کی روح حیات ہے اس کے حرف بہ حرف میں عبودیت و بندگی، عجز و نیاز، بارگاہ باری تعالیٰ میں حاضری کے ذوق و شوق و شیفتگی کے ایمان پرور محسوسات بے تاب و مضطرب نظر آتے ہیں۔ ساتھ ہی موقع اور محل کا تصور فرمایئے۔ کائنات انسانیت کا مقدس ترین وجود تیئس سال میں فرض نبوت کو بوجہ احسن تکمیل پر پہنچا چکا تھا۔ اس کی تعلیمات حقہ کے ثمرات حسنہ ہر طرف نگاہوں کو روشنی اور قلوب کو ایمان کی دولت سے مالا مال کر رہے تھے اور خدائے واحد کے روبرو سرافگندگی و حوالگی کا عشق اس درجہ کمال پر پہنچا ہوا تھا کہ معلوم ہو رہا تھا کہ ایک ایک فرد کے بدن کا روآں روآں شکر و سپاس میں سراپا حمد و ستائش بنا ہوا، اسی کے آگے سجدہ ریزی کی بیتابیوں کا مرجع و محور ہے۔ یہی اسوۂ حسنہ تھا، جس کی پیروی عالم انسانیت کے لیے اس زندگی اور آئندہ زندگی میں واحد فوز و فلاح ہے مسلمان ہوں یا غیر مسلم، جو اس پیروی سے سعادت اندوز نہ ہوں گے، ان کے لیے دونوں جہانوں میں امن و سلام کی امید خیال خام ہوگی۔

مکہ مکرمہ میں داخلہ

۲۷ رذی قعدہ ۱۰ھ کو ذوالحلیفہ سے روانہ ہو کر حضور صلعم منزل بہ منزل ۳ رذی حجہ ۱۰ھ (یکم مارچ ۶۳۲ء) کو سرف پہنچے۔ جہاں سے مکہ معظمہ صرف چھ سات میل ہے۔ یہی وہ مقام ہے، جہاں ام المومنین حضرت میمونہؓ کا مکان تھا اور وہیں ان کا مزار بنا۔ ۴ رذی حجہ (۲ رمارچ ۶۳۲ء) کو اتوار کے دن صبح کے وقت حضور صلعم مکہ مکرمہ معظمہ میں داخل ہوئے۔ خانہ کعبہ کے طواف سے فارغ ہو کر مقام ابراہیم میں دوگانہ ادا کیا۔ پھر سعی کے لیے کوہ صفا پر پہنچے، وہاں سے کعبہ نظر آیا تو فرمایا:

لا الٰه الا الله وحدہٗ لا شریك لهٗ له الملك وله الحمد یحیی و یمیت وهو علی کل شیٔ قدیر۔ لا الٰه الا الله وحدہٗ انجز وعدہٗ و نصر عبدہٗ و هزم الاحزاب وحدہٗ

اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ وہ ایک ہے، کوئی اس کا شریک نہیں۔ سلطنت اس کی ہے اور ستائش بھی اسی کے لیے زیبا ہے۔ وہی جلاتا اور مارتا ہے اور سب چیزوں پر قدرت رکھتا ہے۔ خدا کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں وہ ایک ہے اس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اس نے اپنے بندہ کی مدد فرمائی اور اکیلے تمام گروہوں کو شکست دے دی۔

ایک ارشاد کی توضیح

وعدے کی ایفاء، اپنے بندے کی امداد اور اکیلے تمام گروہوں کی شکست پر عرب کے زمین و آسمان زبان سے شہادت دے رہے تھے۔ تیئس سال پیشتر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ میں تنہا تھے۔ پھر آپ کی دعوت پر ایک ایک دو دو آدمی ساتھ ملتے گئے۔ اس مقدس گروہ نے تیرہ سال تک مکہ مکرمہ میں ایسی خوفناک اذیتیں برداشت کیں جن کا تصور بھی جسموں پر لرزہ طاری کر دیتا ہے۔ پھر سب کو وطن چھوڑنا پڑا۔ اس کے باوجود مخالفوں نے انہیں دکھ دینے اور تباہ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ رزم و پیکار کی ہر قوت اس مقدس ترین وجود اور اس کے جان نثار ساتھیوں کے خلاف بے دریغ

استعمال کی گئی۔ آخر ہر قوت ناکام و نامراد ہو کر اسی راستے پر گامزن ہو گئی، جو حضور صلعم نے آغاز نبوت میں پیش کیا تھا گیا یہ اس حقیقت کا زندہ ثبوت نہ تھا کہ اللہ نے اپنا وعدہ پورا کیا، اپنے مقدس ترین بندے کی امداد فرمائی اور تنہا تمام گروہوں کو شکست دے دی۔

کیفیت حج

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذی الحجہ کی آٹھویں تاریخ (۶ رمارچ ۶۳۲ء) کو جمعرات کے دن تمام مسلمانوں کے ساتھ منیٰ میں قیام فرمایا۔ نویں تاریخ (۷ رمارچ) کو جمعہ کے دن صبح کی نماز ادا کر کے عرفات کی طرف روانہ ہوئے عرفات کے کنارے پر ایک مقام نمرہ ہے، جہاں کمل کے خیمے میں آپ نے قیام فرمایا۔ دوپہر ڈھل گئی تو ناقہ قصواء پر سوار ہو کر میدان میں تشریف لائے اور سواری ہی کی حالت میں خطبہ ارشاد فرمایا۔ ظہر و عصر کی نماز ادا کر کے پھر میدان میں دیر تک قبلہ رو ہو کر مصروفِ دعا رہے۔ سورج ڈوبنے لگا، تو عرفات سے چلے۔ رات مزدلفہ (مشعر الحرام) میں گزاری اور دسویں ذی الحجہ (۸ رمارچ) کو منیٰ میں پہنچ گئے۔ ایام تشریق منیٰ میں گزارے۔ البتہ دسویں تاریخ کو قربانی کے بعد مکہ معظمہ جا کر خانہ کعبہ کا طواف کیا۔ ۱۲ ر ذی الحجہ کو بعد زوال منیٰ سے اٹھے اور خیف بن کنانہ میں مقام کیا۔ رات کے پچھلے پہر خانہ کعبہ کا طواف کیا اور مدینہ روانہ ہو گئے۔

حضور صلعم کے خطبات

یہ حجۃ الوداع کا سرسری خاکہ ہے، جس میں تفصیلات نہیں دی گئیں۔ میرا اصل مقصود یہ ہے کہ خطبات شریفہ میں سے بعض ضروری چیزیں یہاں پیش کروں، جنہیں میرے نزدیک امت کے لیے وصایا کی حیثیت حاصل ہے۔

خطبوں کے متعلق تمام روایات کو یکجا کر کے اہلِ علم و تحقیق اس نتیجے پر پہنچے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں تین خطبے ارشاد فرمائے۔ پہلا ۹ ر ذی الحجہ کو عرفات کے میدان میں، دوسرا ۱۰ ر ذی الحجہ کو منیٰ میں اور تیسرا ۱۱ ر یا ۱۲ ر ذی الحجہ کو منیٰ میں۔ ان میں بعض مطالب کو اپنی اہمیت کے پیش نظر دہرایا مگر انداز مختلف تھا۔ میں انہیں بلحاظ ترتیب یہاں پیش کروں گا۔ مناسب یہی معلوم ہوا کہ عربی عبارتیں نہ لکھوں اور مطالب اردو میں بیان کر دوں۔

عالمگیر مساوات

عرفات کے خطبے میں حضور صلعم نے سب سے پہلے جاہلیت کی تمام بیہودہ رسموں اور تمام نازیبا دستوروں کے خاتمے کا اعلان کیا۔ پھر فرمایا:

"لوگو! سُن لو کہ تمہارا پروردگار ایک ہے اور تمہارا باپ ایک ہے (یعنی آدمؑ)۔ عربی کو عجمی پر یا عجمی کو عربی پر، کالے کو گورے پر یا گورے کو کالے پر کوئی فضیلت و برتری نہیں، مگر صرف تقویٰ اور پرہیزگاری کی بناء پر"

یہ اس حقیقت کا اعلان تھا کہ انسان کی فضیلت نہ خاندان پر موقوف ہے اور نہ نسل، خون یا رنگ پر، نہ کسی خاص ملک یا قوم کا باشندہ ہونا اس بارے میں معیار بن سکتا ہے، نہ اچھا لباس، عالیشان مکان یا دولت و ثروت کے انبار کسی کو بڑا بنا سکتے ہیں محض علم یا عہدہ و منصب بھی بڑائی کا وسیلہ نہیں بن سکتا۔ املاک کی فراوانی بھی اس باب میں قطعاً سودمند نہیں ہو سکتی۔ بڑائی اور بزرگی صرف تقویٰ، پرہیزگاری حسن عمل، اور فضیلت اخلاق پر منحصر ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ اس مختصر سے ارشاد نے عالم انسانیت کے نقطۂ نگاہ میں کتنا عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا، جس کی کوئی مثال اس سے پیشتر نہیں ملتی؟ پہلے انسانوں کا مطمح نظر کیا تھا؟ کسی خاص نسل یا رنگ یا خون سے وابستگی، دولت جمع کرنے کا جنون

عالی شان مکان بنانے کا اضطراب، بڑے عہدے اور منصب حاصل کرنے کے لیے تگ و دو، ملک فتح کر لینے کا زور، ان تمام چیزوں کے لیے کش مکش کے ہنگاموں کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا کہ انسانوں میں تفرقہ، بغض، عداوت اور نفرت پیدا ہو۔ وہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے در پے رہیں۔ اونچے مناصب پر پہنچ جائیں تو اختیار و اقتدار سے فائدہ اٹھا کر دولت سمیٹیں، رشوتیں لیں۔ لاکھوں بے وسیلہ مساکین کچلے جائیں اور دنیا میں امن مفقود رہے۔ قومیں قوموں سے اور ملک ملکوں سے لڑتے رہیں اور کسی کے لیے اطمینان سے سانس لینے کا موقع پیدا ہی نہ ہو۔ لیکن نکوکاری اور پرہیز گاری کو عالم انسانیت کا نصب العین بنا دینے کے بعد سب کی کوشش یہ ہو گی کہ نیکی میں ایک دوسرے سے آگے بڑھیں، خدمت خلق میں ایک دوسرے پر سبقت لے جائیں۔ خدا کے بندوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ پیار کریں۔ ان کے امن و راحت کا خیال رکھیں، حق و انصاف کی پاسداری ہوتی رہے، اور دنیا امن سے بھر جائے کتنے رنج و قلق کا مقام ہے کہ جو قوم اپنے آقا و مولا صلی اللہ علیہ وسلم کے اس پیغام حق کی داعی اور مبلغ بنائی گئی، وہ بھی آج عملاً اس کی پابندی سے منزلوں دور ہے

اسلامی اخوت

پھر فرمایا۔

دیکھو، ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور تمام مسلمان باہم بھائی بھائی ہیں۔

نیز فرمایا۔

ہاں، میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو تمہیں جلد خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے اور تم سے تمہارے اعمال کی باز پرس کی جائے گی۔

دیکھیے، مسلمان نوکر ہوں یا آقا، غریب ہوں یا امیر، مفلس ہوں یا دولت مند، معمولی حیثیت رکھتے ہوں یا اونچے درجے پر فائز ہوں ان میں کوئی امتیاز نہ ہونا چاہیے۔ وہ سب ایک سطح پر ہیں ان سب کے دل میں ایک دوسرے کے ساتھ حقیقی بھائیوں کی سی محبت ہونی چاہیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہاں تک فرما دیا ہے کہ اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ مظلوم ہو یا ظالم۔ عرض کیا گیا۔ حضور! مظلوم کی مدد تو سمجھ میں آگئی۔ مگر ظالم کی مدد کیوں کر ہو؟ فرمایا، جو بھائی ظلم کرے، اسے ظلم سے باز رکھو۔ یہ ظالم بھائی کی امداد ہے۔

مسلمان اس آئینے کو سامنے رکھ کر اپنے اعمال کا محاسبہ کریں، تو نتیجہ اس کے سوا کیا ہو گا کہ شرم و ندامت کے مارے سر نہ اٹھا سکیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے برادرانہ محبت و الفت کے لیے ایک کسوٹی بھی تجویز فرما دی یعنی اپنے بھائی کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کرو، جس کی توقع تم اس سے رکھتے ہو۔

باقی رہا گمراہ ہو کر ایک دوسرے کی گردن مارنے کا معاملہ، تو میں سمجھتا ہوں کہ تاریخ اسلام میں اس کی اتنی شہادتیں موجود ہیں کہ میرے لیے کچھ عرض کرنا قطعاً غیر ضروری ہے اور بے خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان اسی گمراہی کے باعث عزم و شرف کے بلند مقام سے محروم ہوئے جس پر وہ اسلام کی بدولت پہنچے تھے۔

اجتماعی زندگی کی بنیادیں

اجتماعی زندگی کی بنیادیں تین ہیں۔ جان کا پاس، مال کی حفاظت اور آبرو کا احترام انسانوں کے درمیان کشمکشوں اور جھگڑوں، رنجشوں اور مخالفتوں کے جتنے بھی واقعات آپ کے سامنے

آئیں، ان کا تجزیہ کیا جائے، تو یہ ہیں جان، مال اور آبرو کے بارے میں کم یا زیادہ بے احتیاطی کے سوا اور کوئی چیز نہ نکلے گی۔ آج دنیا ان تین بنیادوں پر قائم رہنے کا پختہ عہد کرلے، تو سارے جھگڑے مٹ سکتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تین بنیادی چیزوں کی حفاظت کا معاملہ بھی آخری حد پر پہنچا دیا۔ فرمایا۔

لوگو! تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری آبرو میں قیامت تک کے لیے اسی عزت و حرمت کی مستحق ہیں، جس طرح تم آج کے دن (یوم حج) اس مہینے (ذی الحجہ) اور اس شہر (مکہ مکرمہ) کی حرمت کرتے ہو۔

امن وسلامتی کی راہ

عربوں میں بدلے کا دستور عام تھا۔ ایک خون ہو جاتا، تو انتقام کا لامتناہی سلسلہ چھڑ جاتا۔ صرف عرب ہی نہیں بلکہ دنیا بھر میں خادموں اور غلاموں کے ساتھ حد درجہ بُرا سلوک کیا جاتا۔ عورتوں کے جائز حقوق کا کوئی خیال نہ رکھا جاتا۔ سود در سود نے ضرورت مندوں کے لیے زندگی اجیرن بنا رکھی تھی۔ انہیں وجوہ سے امن وسلامتی کی راہ ظلم و جبر کے اندھیرے میں گم ہو گئی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

۱۔ میں زمانہ جاہلیت کے تمام خون (خون کے بدلے) آج مٹا رہا ہوں اور سب سے پہلے اپنے خاندان میں سے ربیعہ بن حارث کے بیٹے کا خون باطل کرتا ہوں،

۲۔ اپنے غلاموں کا خیال رکھو۔ جو خود کھاؤ وہی انہیں کھلاؤ۔ جو خود پہنو، وہی انہیں پہناؤ۔

۳۔ عورتوں کے بارے میں خدا سے ڈرو۔ جس طرح تمہارے حق عورتوں پر ہیں، اسی طرح عورتوں کے حق تم پر ہیں

۴۔ میں جاہلیت کے تمام سود باطل قرار دیتا ہوں اور سب سے پہلے اپنے خاندان میں سے عباس بن عبد المطلب کا سود ختم کرتا ہوں۔

گمراہی سے بچنے کا طریقہ

پھر فرمایا۔

میں تم میں وہ چیز چھوڑے جاتا ہوں۔ جسے مضبوطی سے پکڑے رہو گے، تو کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ یہ اللہ کی کتاب (قرآن مجید) ہے۔

دیکھیے یہی کتاب مسلمانوں کی ہدایت و سعادت کا سرچشمہ تھی۔ اس کے مطابق عمل نے ملتِ اسلامیہ کو عالمِ انسانیت کی امامت کے درجہ عالیہ پر پہنچایا۔ آج اسی کو مسلمانوں نے پس پشت ڈال رکھا ہے۔ وہ مختلف سہارے ڈھونڈتے ہیں جدھر سے کوئی اچھی صدا اٹھتی ہے یا بطور خود سمجھ لیتے ہیں کہ صدا اچھی ہے، ادھر ہی بیتابانہ دوڑتے ہیں۔ لیکن اس پاک کتاب کی طرف متوجہ نہیں ہوتے، جو انہیں گمراہی سے محفوظ رکھنے کا واحد اور بہترین ذریعہ ہے۔

آخر میں فرمایا۔

لوگو! نہ میرے بعد کوئی اور پیغمبر ہے اور نہ کوئی نئی امت وجود میں آنے والی ہے خوب سن لو اپنے پروردگار کی عبادت کرو، پنجگانہ نماز کے پابند رہو، ماہ رمضان کے روزے رکھو، مال کی زکوٰۃ خوش دلی سے دیا کرو۔ خانۂ خدا کا حج بجالاؤ اپنے اولیائے امور کی اطاعت کرو۔ ان اعمال کی جزا یہ ہے کہ اپنے پروردگار کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

تکمیل دین خطبہ شریف کے اختتام پر فرمایا تم سے میرے بارے میں پوچھا جائے گا، بتاؤ تم کیا جواب دو گے؟ عرض کیا گیا ہم کہیں گے کہ آپ نے خدا کا پیغام پہنچا دیا اور اپنا فرض ادا کر دیا۔ آپؐ نے انگشتِ شہادت آسمان کی طرف اٹھائی اور تین مرتبہ فرمایا۔ اے خدا تو گواہ رہنا پھر لوگوں سے کہا کہ جو اس وقت موجود ہیں، وہ انہیں سنا دیں، جو اس وقت موجود نہیں گویا ہر مسلمان کو دائمی حق دار بنا دیا یعنی اس موقع پر وہ آیت نازل ہوئی جس میں تکمیل دین اور اتمام نعمت کی بشارت دی گئی تھی

اب میں منیٰ کے خطبے یا خطبوں میں سے ایک دو اقتباسات پیش کروں گا۔

دین کامل ہو چکا تھا، نعمت منزلِ اتمام پر پہنچ چکی تھی، وہ امت وجود میں آ چکی تھی جو روئے زمین پر خلافت الٰہیہ کا نادر نمونہ پیش کرنے والی تھی اور جس نے تھوڑی ہی مدت میں زندگی کے ہر دائرے اندر عظیم الشان خدمات کے ایسے انبار لگا دیئے، جن کی کوئی مثال نہ پہلے موجود تھی اور نہ بعد میں سامنے آ سکی۔ عالم انسانیت میں پیشتر بھی بارہا انقلاب آ چکے تھے، مگر ساتویں صدی عیسوی کے دوسرے عشرے سے جس انقلاب کی ابتدا ہوئی تھی، اور حجۃ الوداع پر اس کی تکمیل ہوئی وہ ہر نقطۂ نگاہ سے یگانہ و نادیدہ تھا۔ سید سلیمانؒ مرحوم کے قول کے مطابق ایک نئے نظام، نئی شریعت اور نئے عالم کا آغاز ہو رہا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

زمانہ پھر پھرا کر آج پھر اسی نقطے پر آ گیا ہے، جب اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان پیدا کئے تھے۔

غور کیجئے کہ تاریخ عالم میں جو نیا دور شروع ہو رہا تھا، اس کی تعبیر کے لیے اس سے بہتر صورت کیا ہو سکتی تھی کہ زمانہ پھر اس جگہ آ گیا جب اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی تخلیق فرمائی تھی۔

پھر جان، مال اور آبرو کا موضوع ذہن مبارک میں آ گیا اور اہمیت کے اعتبار سے اسے دہرانا مناسب سمجھا، لیکن اسلوب بالکل نیا اختیار کیا۔ فرمایا۔

"کچھ معلوم ہے آج کون سا دن ہے؟" لوگوں نے عرض کی "خدا اور اس کا رسولؐ بہتر جانتے ہیں"۔ آپ کچھ دیر خاموش رہے اور لوگوں نے سمجھا شاید آپؐ اس دن کا کوئی اور نام رکھ دیں گے۔ سکوت کے بعد فرمایا "کیا یہ قربانی کا دن نہیں؟" لوگوں نے کہا۔ "بے شک" پھر ارشاد ہوا۔ "یہ کون سا مہینہ ہے؟" لوگوں نے پھر کہا "خدا اور اس کا رسولؐ بہتر جانتے ہیں"۔ آپؐ نے پہلے کی طرح سکوت کے بعد فرمایا "کیا یہ ذوالحجہ کا مہینہ نہیں؟" لوگوں نے کہا "بے شک" پھر پوچھا "یہ کون سا شہر ہے؟" لوگوں نے پھر کہا "خدا اور اس کا رسولؐ بہتر جانتے ہیں"۔ اس مرتبہ بھی سکوت کے بعد فرمایا "کیا یہ بلدۃ الحرام نہیں؟" لوگوں نے کہا "بے شک"۔

اس اسلوب خطاب سے مقصود یہ تھا کہ لوگوں کے دل میں قربانی کے دن، حج کے مہینے اور مکہ مکرمہ کی حرمت پیوست ہو جائے۔ یہ ہو چکا، تو فرمایا۔

تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری آبروئیں اس طرح قیامت تک احترام کی مستحق ہیں، جس طرح تمہارے لیے آج کا دن (قربانی کا دن) یہ مہینہ (حج کا مہینہ) اور یہ شہر (مکہ مکرمہ) احترام کے مستحق ہیں۔

حجۃ الوداع کے بعد حضور صلعم نے بہت کم مدت اس دنیا میں گزاری روایات (۹ ذی حج) سے صرف اکیاسی روز بعد وفات پائی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم